تکملہ

تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

للامام النواب محمد صدیق حسن خان القنوجی رحمه الله

تالیف

مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۲۶۲ - ۱۳۴۰ھ)

تصحیح وتنقیح ونظرثانی

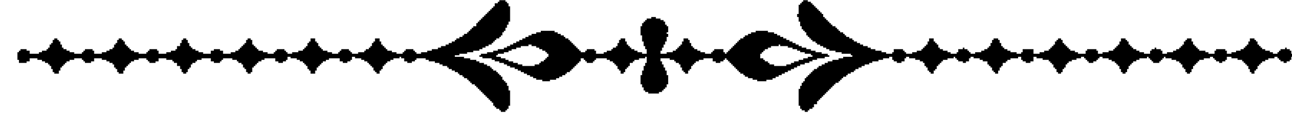
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ | حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

تسہیل: محمد یحیٰی قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد ششم

دار ابی الطیب
للبحث والتحقیق

مکتبہ قدوسیہ



نام کتاب: ______ تکملہ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ______ مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی

قیمت: ______

طبع اول: ______ جون 2023ء



ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

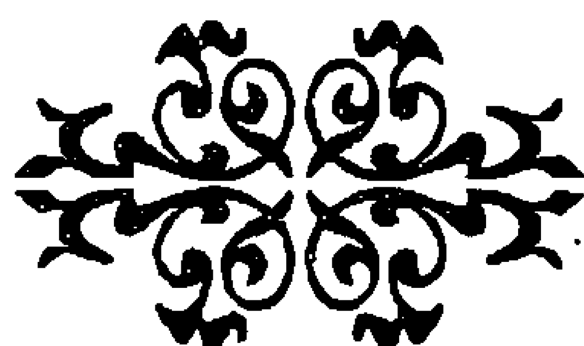
گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com darabitayyab1@gmail.com

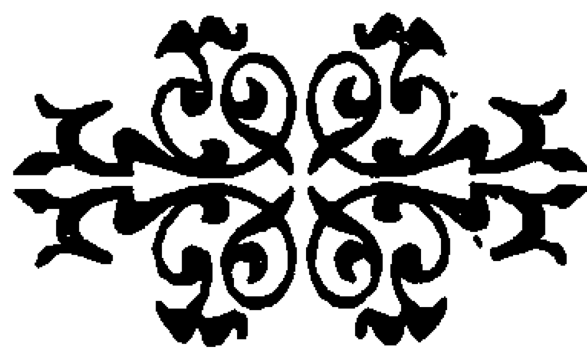
www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست



فہرست مضامین



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق، یعنی بلاخلاف یہ پوری سورت مکی ہے۔[1] بصریوں کے نزدیک اس کی آیتیں ایک سو انیس (۱۱۹) ہیں اور کوفیوں کے نزدیک اس کی ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) آیتیں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے آیت: ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ میں اختلاف کیا ہے کہ آیا وہ ایک آیت ہے یا آیت کا کچھ حصہ ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ایک آیت ہے، اور کوفی اس کو آیت کا حصہ مانتے ہیں۔ امام احمد، مسلم، ابو داود، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ وغیرہم نے عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں صبح کی نماز پڑھی تو سورۃ المومنین کی تلاوت شروع فرمائی، یہاں تک کہ جس وقت موسیٰ و ہارون یا عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانسی نے آلیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کر دیا۔[2] امام بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت پیدا کی تو اس سے فرمایا: بات کر۔ چنانچہ وہ بولی: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾۔[3] اس سورت کی پہلی دس آیتوں کے فضائل میں جو کچھ وارد ہوا ہے، اس کا ذکر عن قریب آتا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: اس سورت میں ۱۸۴۰ کلمے ہیں اور ۴۸۰۲ حرف ہیں۔[4]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ
فٰعِلُوْنَ ۝۴ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا

[1] تفسير القرطبي (۱۲/ ۱۰۲)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۸۲۰) مسند أحمد (۳/ ٤١١)، البتہ سنن ترمذی میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

[3] مستدرك الحاكم (۲/ ٤٢٦) اس کی سند میں ''علی بن عاصم'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۱۲۸۳)

[4] تفسير الخازن (٥/ ۳۰)

مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

مومن یقیناً فلاح پا گئے ① وہ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں ② اور وہ جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں ③ اور وہ جو زکات ادا کرنے والے ہیں ④ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں ⑤ سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ، تو بلاشبہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں ⑥ پھر جو شخص ان کے علاوہ (راستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں ⑦ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں ⑧ اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ⑨ یہی لوگ وارث ہیں ⑩ جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ⑪

شانِ نزول:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام احمد نے عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے روایت کیا ہے کہ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ فرماتے تھے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کی جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کے نزدیک شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی۔ (ابن کثیر کے مطبوعہ نسخے میں اسی طرح ہے، لیکن بے شک یہاں سے کچھ عبارت ساقط ہوئی ہے، چنانچہ فتح البیان اور فتح القدیر میں اس کے بعد یہ ہے۔ "فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَوْمًا فَمَكَثْنَا سَاعَةً فَسُرِّيَ عَنْهُ"[1] امام خازن رحمہ اللہ کے الفاظ بحوالہ ترمذی یہ ہیں: "فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَوْمًا فَمَكَثَ سَاعَةً ثُمَّ سُرِّيَ عَنْهُ فَقَرَأَ: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ إِلَى عَشْرِ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِهَا وَقَالَ: مَنْ أَقَامَ هٰذِهِ الْعَشْرَ آيَاتٍ دَخَلَ الْجَنَّةَ، ثُمَّ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ زِدْنَا... الخ"[2] غرض کہ ضروری الفاظ یہ ہیں: ایک دن اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کی تو ہم گھڑی بھر ٹھہرے رہے، پھر وہ حالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے موقوف ہوگئی۔) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلے کی طرف منہ کیا اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور فرمایا: «اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا

[1] فتح القدير (٣/ ٦٤٦) فتح البيان (٩/ ٩٥) [2] تفسير الخازن (٥/ ٣٠۔ ٣١)

تَنْقُصْنَا، وَأَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا، وَأَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا، وَآثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا، وَارْضَ عَنَّا وَأَرْضِنَا » یعنی الٰہی! تو ہم کو زیادہ کر اور کم مت کر، اور ہمارا اکرام کر اور ہم کو ذلیل مت کر، اور ہم کو دے محروم مت رکھ، اور ہم کو اختیار کر اور ہم پر اختیار مت کر ہمارے غیر کو کہ تو اس کو عزت دے اور ہم کو ذلیل کرے، یعنی ہمارے دشمنوں کو ہم پر غالب مت کر، اور تو ہم سے راضی ہو جا اور ہم کو خود سے راضی کر۔ پھر فرمایا: البتہ مجھ پر دس آیتیں اُتاری گئیں، جو شخص ان کو قائم کرے گا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ کو پڑھا یہاں تک کہ دس آیتوں کو ختم کیا۔ (ورواه الترمذي في تفسيره و النسائي في الصلاة من حديث عبدالرزاق به) ترمذی نے کہا: یہ حدیث منکر ہے، ہم کسی کو نہیں جانتے کہ اس نے اس کو روایت کیا ہو، سوائے یونس بن سلیم کے اور یونس کو ہم پہچانتے نہیں ہیں۔ (نسائی نے بھی یہی کہا ہے: ”لَا نَعْرِفُهُ“[1] (فتح البيان))

امام نسائی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں یزید بن بابنوس سے روایت کیا ہے، کہا ہم نے اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کی کہ رسول اللہ ﷺ کا خلق کیسا تھا تو فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا خلق قرآن تھا۔ (فتح البیان میں یوں ہے کہ پھر فرمایا: تو سورة المومنون پڑھتا ہے؟ پڑھ: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ یہاں تک کہ دس آیتوں کو پہنچا تو فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا خلق ایسا تھا۔[3]) پھر ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ پڑھا، یہاں تک کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ کو پہنچیں۔[2] تو فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا خلق ایسا تھا۔ (آپ کا خلق قرآن شریف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس میں جو اوامر ونواہی ومحاسنِ اخلاق ذکر فرمائے ہیں، ان سب کے ساتھ آپ ﷺ متمسک تھے اور جو مکارمِ اخلاق کسی نبی وولی سے ذکر فرمائے ہیں، یا کسی بات کی رغبت دلائی ہے، یا اس کے کرنے کی طرف دعوت دی ہے تو آپ ﷺ بہ ذاتِ خود اُن سب اُمور اور صفات کے ساتھ متحلّی ومتزین تھے اور جس بات سے منع کیا ہے، آپ ﷺ اس کے نزدیک نہ پھٹکتے تھے۔[4] (كذا في مجمع البحار))

امام کعب احبار، مجاہد اور ابو العالیہ رحمہم اللہ وغیرہم سے مروی ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے جنتِ عدن کو پیدا کیا اور اپنے ہاتھ سے اس کو لگایا تو اس کی طرف نظر کی اور اس سے کہا کہ بول، تو وہ بولی: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومن اس کرامت کے سبب سے کامیاب ہوئے جو اُن کے لیے جنت میں تیار کر رکھی ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی اس بات کو اپنی کتاب میں نازل فرمایا۔[5]

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧٣) سنن النسائي الكبرىٰ (١/ ٤٥٠) اس کی سند میں ”یونس بن سلیم صنعانی“ مجہول راوی ہے۔ السلسلة الضعيفة (١٢٤٢)

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤١٢) [3] فتح البيان (٩/ ٩٦)

[4] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٩٩) [5] تفسير الطبري (١٩/ ٧)

یہی مضمون سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ چنانچہ امام بزار رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا، اس میں ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی لگائی اور اس سے کہا کہ بول، تو وہ بولی: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ پھر اس میں فرشتے داخل ہوئے تو انھوں نے کہا: ''طُوْبٰى لَكِ، مَنْزِلُ الْمُلُوْكِ'' یعنی تجھے خوش خبری ہو کہ تو بادشاہوں کے رہنے بسنے کی جگہ ہے، گویا اسے مبارک باد دی۔ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے بزار کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو بنایا، ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی لگائی اور اس کا گارا مشک کا تھا۔ امام بزار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث میں دوسری جگہ میں نے اس طرح دیکھا کہ جنت کی دیوار میں ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی ہے اور اس کا گارا مشک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ بول، وہ بولی: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ پھر فرشتوں نے کہا: ''طُوْبٰى لَكِ، مَنْزِلُ الْمُلُوْكِ'' پھر امام بزار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ سوائے عدی بن فضل کے کسی نے اس حدیث کو مرفوع کیا ہو اور کہا کہ یہ شخص کچھ حافظ نہیں ہیں اور وہ ایک متقدم الموت شیخ ہیں۔[1] (ایک جگہ عدی بن فضل ہے، دوسری جگہ علی بن فضل۔ والله أعلم)

امام طبرانی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنتِ عدن کو پیدا کیا تو اس میں وہ پیدا کیا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال تک گزرا۔ پھر اس سے فرمایا: بول، تو وہ بولی: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾۔[2] اس حدیث کے راویوں میں بقیہ راوی حجازیوں کی روایت میں ضعیف ہیں۔ امام طبرانی رحمہ اللہ کی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کے دوسرے الفاظ مرفوعاً یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنتِ عدن کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اس کے پھل لگائے اور اس میں نہریں جاری کیں، پھر اس کی طرف نظر کی اور فرمایا: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ فرمایا: مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم کہ تجھ میں کوئی بخیل میرا پڑوسی نہ ہوگا۔[3]

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنتِ عدن کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اس کی ایک اینٹ سفید موتی کی، ایک سرخ یاقوت کی اور ایک سبز زبرجد کی۔ اس کا گارا مشک اور کنکریاں موتی کی اور اس کی گھاس زعفران۔ پھر اس سے فرمایا کہ بول، تو وہ یوں بولی: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم! تجھ میں کوئی بخیل میرا پڑوسی نہ ہوگا۔ پھر

[1] كشف الأستار عن زوائد البزار (٤/ ١٨٩۔ ١٩٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٦٢)

[2] المعجم الكبير (١١/ ١٨٤) اس کی سند میں ''بقیہ'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٢٨٤)

[3] المعجم الكبير (١٢/ ١٤٧) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٢٨٤)

رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾[1] [التغابن: ١٦] ''اور جسے اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

مومنوں کی صفات:

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں: "فَازُوْا وَسَعِدُوْا وَحَصَلُوْا عَلَى الْفَلَاحِ" یعنی ایمان والوں نے فوز (کامیابی) پائی، سعادت حاصل کی۔ یہ وہی لوگ ہیں جن میں وہ وصف پائے جاتے ہیں جو اس سورت کی شروع کی دس آیات میں مذکور ہیں:

عجز و نیاز:

ایک یہ ہے کہ وہ اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ خٰشِعُوْنَ ﴾ کے معنی "خَائِفُوْنَ سَاكِنُوْنَ" ہیں۔ (أخرجه ابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم عنه. فتح القيدر) امام مجاہد، حسن، قتادہ اور زہری سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خشوع قلب کا خشوع ہے۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اُن کا خشوع اُن کے دلوں میں تھا، لہٰذا اس وجہ سے انھوں نے اپنی نگاہوں کو نیچا کیا اور بازو کو پست کیا۔ محمد بن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نماز میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھاتے تھے، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾ تو انھوں نے اپنی نگاہوں کو سجدہ کی طرف پست کیا۔ امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کہا کرتے تھے کہ نماز پڑھنے والے کی نگاہ اس کی نماز کی جگہ سے آگے نہ جائے، پھر اگر اسے آگے نظر کرنے کی عادت ہوگئی ہے تو چاہیے کہ آنکھ بند کرلے۔ (رواه ابن جرير وابن أبي حاتم)

پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے محمد بن سیرین اور عطا بن ابی رباح رحمہما اللہ سے بھی مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ بات کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔[2] نماز سے خشوع اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے، جو اپنے دل کو نماز کے لیے فارغ اور خالی کرلے اور باقی خیالوں کو چھوڑ کر اسی میں مشغول ہو۔ اور نماز کے علاوہ چیزوں کو چھوڑ کر نماز کو اختیار کرے، اس وقت وہ نماز اس کے لیے راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہو جائے گی، جیسا کہ امام احمد اور نسائی رحمہما اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری طرف خوشبو اور عورتیں محبوب کی گئیں اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ٹھہرائی گئی۔[3]

---

[1] صفة الجنة (١/ ٥٦) اس کی سند میں ''بشر بن حسین کلبی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٢٨٥)

[2] تفسير الطبري (١٩/ ٨۔ ٩) [3] مسند أحمد (٣/ ١٢٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٣٩) صحيح الجامع (٣١٢٤)

امام احمد رحمہ اللہ نے سالم بن ابی الجعد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں اپنے والد کے ہمراہ اپنے صہر (صہر بالکسر داماد کے معنی میں ہے، اس کا اطلاق بیوی یا شوہر پر اور زوج کے اقارب پر اور عورت کے اقارب پر بھی ہوتا ہے) پر داخل ہوا، یہ شخص انصاریوں میں سے تھا۔ اتنے میں نماز کا وقت آ گیا تو اس نے لونڈی سے کہا کہ میرے پاس وضو کا پانی لے آ، شاید میں نماز پڑھوں تو راحت پاؤں۔ چنانچہ اس نے ہماری طرف دیکھا کہ ہم نے اس پر اس بات کا انکار کیا تو اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: «قُمْ يَا بِلَالُ! فَأَرِحْنَا بِالصَّلَاةِ»[1] یعنی اے بلال! تو کھڑا ہو (کر اقامت کہہ) اور ہمیں نماز کے ساتھ راحت دے۔

لغویات سے گریز:

لغو سے مراد باطل ہے اور باطل میں شرک بھی شامل ہے، جیسا کہ بعض نے کہا ہے اور اس میں معاصی بھی شامل ہیں، جیسا کہ دوسروں نے کہا ہے۔ اقوال و افعال میں سے اس قول و فعل کو بھی لغو کہا جاتا ہے جس میں کسی طرح کا فائدہ نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ [الفرقان: ٧٢] ''اور جب کسی لغو اور بیہودہ کام سے ان کا گزر ہو تو وہ عزت و وقار سے گزر جاتے ہیں۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے حکم سے اُن کو وہ شے آئی ہے کہ اس نے اُن کو اس سے لاتعلق کر دیا ہے،[2] یعنی وہ اللہ کے کام میں ایسے مشغول ہیں کہ لغو کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

مال و جان کا تزکیہ:

اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ زکات سے اس جگہ اموال کی زکات مراد ہے، اس کے باوجود کہ یہ آیت مکی ہے اور زکات مدینہ منورہ میں ۲ ہجری میں فرض ہوئی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ مدینہ میں جو زکات فرض ہوئی، وہ صاحبِ نصاب پر ایک خاص مقدار میں فرض ہوئی۔ چنانچہ ظاہر یہ ہے کہ زکات کی اصل مکے میں واجب ہوئی تھی۔ اللہ پاک نے سورۃ الانعام میں فرمایا ہے، حالاں کہ وہ مکی سورت ہے: ﴿ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٤١] ''اور ان کی کٹائی اور چنائی کے دن اس (اللہ) کا حق دے دیا کرو۔''

یہ بھی احتمال ہے کہ اس جگہ زکات سے مراد نفس کو شرک اور میل کچیل سے پاک کرنا ہو، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴾ [الشمس: ٩۔ ١٠] ''یقیناً فلاح پا گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔ اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کیا۔'' اور جیسے فرمایا ہے: ﴿ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ﴾ [حمٓ السجدة: ٦۔ ٧] ''اور مشرکین کے لیے ہلاکت ہے۔ جو زکات نہیں دیتے۔'' ان

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٣٧١) اس کی سند صحیح ہے۔ [2] الدر المنثور (٦/ ٨٧)

دونوں اقوال میں سے جو اس کی تفسیر میں کہے گئے ہیں، ایک قول کی بنا پر یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ زکات سے دونوں امر مراد ہوں، یعنی زکاتِ نفوس و زکاتِ اموال؛ اس لیے کے یہ بھی نفوس کے پاک کرنے ہی سے ہے۔ مومن کامل وہی ہے جو یہ بھی کرے اور وہ بھی کرے۔ واللہ أعلم.

شرمگاہوں کی حفاظت اور فحاشی سے پرہیز:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شرمگاہوں کو حرام سے محفوظ رکھا ہے، چنانچہ جس بات سے اللہ نے ان کو منع کیا ہے، جیسے: زنا ولواط (اغلام بازی) اس میں نہیں پڑتے۔ سوائے اپنی بیویوں کے جن کو اللہ نے اُن کے لیے حلال کیا ہے اور لونڈیوں کے جن کے وہ مالک ہیں اور کسی عورت کے پاس نہیں پھٹکتے اور جو شخص وہ کام کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے حلال کیا ہے تو اس پر کسی طرح کی ملامت اور حرج نہیں ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴾۔ ﴿ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے سوائے ڈھونڈے تو ﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴾ یعنی وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ "إِنَّ امْرَأَةً اتَّخَذَتْ مَمْلُوْكَهَا"، یعنی ایک عورت نے اپنے غلام کو خصم بنالیا اور کہا کہ میں نے کتاب اللہ سے ایک آیت کی تاویل کر لی ہے، یعنی ﴿ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ﴾۔ چنانچہ اس عورت کو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس لائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کئی لوگوں نے کہا کہ اس عورت نے کتاب اللہ عزوجل سے ایک آیت کی تاویل کی ہے، اس کے غیر طریق پر۔ راوی کا بیان ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس غلام کو قریب بلایا اور اس کا سر کاٹ دیا اور اس عورت سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ اس کے بعد تو ہر مسلمان پر حرام ہے۔[1] یہ اثر غریب منقطع ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سورۃ المائدہ کی تفسیر کے شروع میں اس کو ذکر کیا ہے، حالاں کہ اس کے ذکر کرنے کی زیادہ صحیح جگہ یہ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جو اس کو مردوں پر حرام کر دیا، لہٰذا اس سے یہ معاملہ اس کے قصد کی نقیض کے ساتھ کیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اور اُن کے موافقین نے اسی آیتِ کریمہ سے استمناء بالید (مشت زنی و انگشت زنی، ہاتھ اور انگلی سے منی نکالنا) کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے، کہا کہ یہ کام ان دو قسموں سے خارج ہے۔ حال یہ ہے کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴾ اور اس حدیث سے بھی استیناس کیا (مدد لی) ہے کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اُن کی طرف اللہ نظر نہ کرے گا اور نہ اُن کو پاک کرے گا اور عالم کے لوگوں کے ساتھ اُن کو جمع

[1] تفسیر الطبري (٩/ ٥٨٦)

نہ کرے گا اور اُن کو جہنم میں پہلے داخل ہونے والے لوگوں میں داخل کرے گا، مگر اس صورت میں کہ وہ توبہ کریں اور جو شخص توبہ کرے تو اللہ اس پر رجوع فرمائے گا۔ وہ سات آدمی یہ ہیں: نکاح کرنے والا (اور والی) اپنے ہاتھ سے (مشت زنی کرنے والا اور انگشت زنگی کرنے والی) اور فاعل اور مفعول بہ اور ہمیشہ شراب کو پینے والا، اپنے ماں باپ کو زدوکوب کرنے والا، یہاں تک کہ وہ فریاد رسی کرنے لگیں اور اپنے پڑوسیوں کو اتنی ایذا دینے والا کہ وہ اس پر لعنت کرنے لگ جائیں اور اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنے والا۔[1] (رواه الإمام أبو الحسن بن عرفه في جزئه المشهور۔ هذا حديث غريب و إسناده فيه من لا يعرف لجهالته. والله أعلم)

وعدوں کی پاسداری اور امانتوں کی حفاظت:

قولہ: ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾ یعنی جب وہ امین بنائے جائیں تو خیانت نہ کریں، بلکہ اس امانت کو امانت والے کی طرف لوٹاتے رہیں، اور جب عہد یا عقد کریں تو اس کو پورا کریں اور منافقوں کی طرح نہ ہوں، جن کے حق میں رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔[2]

نمازوں کی حفاظت:

﴿ يُحَافِظُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ نمازوں پر مواظبت اور مداومت کرتے ہیں، یعنی اُن کو ہمیشہ اُن کے وقتوں میں ادا کرتے ہیں، جیسے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے؟ فرمایا: نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔ میں نے عرض کیا: پھر کونسا؟ فرمایا: والدین سے نیکی کرنا۔ میں نے کہا: پھر کون سا؟ فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد۔[3] (أخرجاه في الصحيحين)

مستدرک حاکم میں اس طرح ہے کہ فرمایا کہ نماز اس کے اول وقت میں۔[4] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور مسروق رحمہ اللہ نے آیتِ مذکور کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد نمازوں کے اوقات ہیں۔ اسی طرح ابوالضحیٰ، علقمہ، قیس، سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں اُن کے اوقات پر اور صحیح رکوع و سجود سے ادا کر کے۔[5] اللہ پاک نے ان اُوصافِ حمیدہ کا ذکر نماز سے شروع کیا اور نماز ہی پر ختم کیا تو یہ بات اس کی فضیلت پر دال ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: استقامت کرو اور ہرگز تم احصا نہ

---

① شعب الإيمان (٤/ ٣٧٨) اس کی سند میں ''مسلمہ بن جعفر اور حسان بن حمید'' مجہول راوی ہیں۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٨٣)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥)

④ مستدرك الحاكم (١/ ٣٠٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ ⑤ تفسير ابن كثير (٣/ ٣١٩)

کرو گے (شمار نہ کرسکو گے۔ ضبط نہ کرسکو گے) اور جان رکھو کہ تمھارے اعمال میں سے بہترین نماز ہے اور محافظت نہیں کرتا ہے وضو پر مگر مومن۔[1] (استقامت اتباعِ حق کو کہتے ہیں، جبکہ اس کا حکم فرمایا اور یہ کام نہایت درجہ سخت تھا، اس لیے از راہِ رحمت و شفقت "لَنْ تُحْصُوْا" سے اس کا تدارک فرمایا، یعنی یہ بات فرما دی کہ اُن سے اللہ تعالیٰ کا حق پوری طرح ادا نہ ہوسکے گا، پھر اُن کو یہ بتایا کہ جو کچھ اُن سے ہوسکے اسی کو کریں، یعنی جب تم کو اس کی طاقت نہیں ہے تو تم پر یہ حق ہے کہ بعض کو تو لازم پکڑو، یعنی نماز اور اس کی حدود کو قائم کرو، خاص کر جو اس کا مقدمہ (یعنی شروع) ہے، جس کو نصف ایمان کہا ہے یعنی وضو۔)

مومن ہی فردوس بریں کے وارث ہیں:

جب اللہ پاک نے مومنین کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ ان اوصافِ حمیدہ اور نیکی کے کاموں پر قائم رہتے ہیں تو یوں ارشاد فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ صحیحین سے یہ ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم اللہ سے جنت کا سوال کرو تو اس سے جنت الفردوس مانگو، کیوں کہ وہ اعلیٰ جنت ہے اور اوسط جنت ہے، یعنی سب سے زیادہ بلند اور بہتر ہے، اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے۔[2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کے لیے دو مکان ہیں: ایک منزل تو جنت میں ہے اور ایک دوزخ میں، پس اگر وہ مرا اور آگ میں داخل ہوا تو اہلِ جنت اس کی منزل کے وارث ہوں گے، لہٰذا یہ وہی اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ ﴿ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴾۔[3] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے "عَنِ اللَّيْثِ عَنِ الْمُجَاهِدِ" روایت کیا ہے: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴾ کہ ہر بندے کے لیے دو منزلیں ہیں: ایک منزل تو جنت میں ہے اور ایک نار میں۔ پس مومن تو اپنا وہ گھر بناتا ہے جو جنت میں ہے اور اپنے اس گھر کو جو نار میں ہے گراتا ہے، اور کافر اپنے اس گھر کو گراتا ہے جو جنت میں ہے اور اسے اپنا گھر بناتا ہے جو نار میں ہے۔[4]

سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے، چنانچہ مومنین کافروں کی منزلوں کے، جو جنت میں ہیں، وارث ہوں گے، کیوں کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، پھر جب یہ مومن لوگ عبادت کے ساتھ قائم رہے، وہ عبادت جو اُن پر واجب ہوئی تھی اور دوسرے لوگوں نے اس چیز کو چھوڑ دیا، جس کا اُن کو حکم ہوا تھا اور اس لیے پیدا کیے گئے تھے تو اُنھوں نے اُن کا حصہ جمع کر لیا، اگر اپنے رب کی اطاعت کرتے۔ اس سے بھی

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٢/ ١٣٥۔ ١٣٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٧٩) [4] تفسير الطبري (١٩/ ١٣)

بلیغ تر یہ بات ہے جو صحیح مسلم میں "عَنْ أَبِي بُرْدَةَ عَنْ أَبِي مُوْسَى عَنْ أَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ" سے ثابت ہوئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن کچھ مسلمان پہاڑوں کی مثل گناہ لے کر آئیں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کے لیے ان گناہوں کو بخش دے گا اور انھیں یہود و نصاریٰ پر رکھ دے گا۔ مسلم کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ ہر مسلمان کو ایک یہودی یا نصرانی دے گا۔ پھر کہا جائے گا کہ یہ آگ سے تیرا چھٹکارا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے سیدنا ابو بردہ رضی اللہ عنہ سے تین بار اللہ وحدہ لا شریک لہ کی قسم طلب کی اس بات پر کہ اس کے باپ نے یہ حدیث اس سے بیان کی۔ راوی نے کہا کہ سیدنا ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے اُن کے لیے قسم کھائی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴾ [مريم: ٦٣] "یہی وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بنائیں گے جو متقی ہو گا۔" اور اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٧٢] "اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے رہے۔" امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت کو رومی زبان میں فردوس کہتے ہیں۔[2] بعض سلف نے کہا ہے کہ باغ کا نام اس وقت تک فردوس نہیں رکھا جاتا جب تک کہ اس میں انگور نہ ہوں۔[3] فاللّٰه أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا واضح بیان یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ قَدْ ﴾ کا نقیض (الٹ) ﴿ لَمَّا ﴾ ہے۔ ﴿ قَدْ ﴾ تو متوقع شے کو ثابت کرتا ہے اور ﴿ لَمَّا ﴾ اس کی نفی کرتا ہے۔ مومنین ایسی بشارت کی توقع رکھتے تھے۔ وہ بشارت اور خوش خبری یہی ہے کہ فلاح کے ثابت ہونے کی ان کو خبر مل جائے۔ چنانچہ اللہ پاک نے اُن سے ایسے الفاظ سے خطاب کیا جو اس اُمید کے ثابت ہونے پر دال ہیں، جس کی وہ توقع رکھتے تھے۔ فلاح، مطلوبہ چیز کے حاصل کرنے میں کامیاب ہونے اور خوف ناک شے سے نجات پانے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو شے طلب کی تھی، وہ پالی اور جس سے ڈرتے اور دوڑتے بھاگتے تھے، اس سے نجات پالی۔[4] (قاله النسفي)

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس چیز کے ثبوت کی پہلے سے توقع کی جاتی تھی، اس کے ثبوت کا فائدہ دینے کے لیے اس جگہ ﴿ قَدْ ﴾ کا کلمہ آیا ہے۔[5] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس جگہ ﴿ قَدْ ﴾ کا کلمہ مومنین کی فلاح کا یقین دلانے کے لیے ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماضی کو حال کے قریب کرنے کے لیے ہو، کیوں کہ ﴿ قَدْ ﴾ ماضی کو حال کے قریب کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کو حال کے حکم سے ملا دیتا ہے۔ کیا تو لوگوں کو نہیں دیکھتا

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٧) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٣) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٣١٦۔٣٢٠)
[4] تفسير النسفي (٣/ ١١٦) [5] تفسير أبي السعود (٦/ ١٢٣)

کہ قیامِ نماز کے حال سے پہلے ”قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ“ کہتے ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ مومنوں کو فلاح حاصل ہو چکی اور فی الحال وہ اس پر ہیں۔[1] شیخ زادہ نے کہا کہ کلمۂ قد برابر ہے کہ ماضی پر داخل ہو یا مضارع پر تحقیق کے لیے مفید ہوتا ہے، اور اس شے کا مخاطب کے لیے متوقع ہونا اس کے ساتھ مل جاتا ہے، اور جب ماضی پر آتا ہے تو زمانۂ حال سے قریب کرنا، ان دو معنی کے ساتھ اور مل جاتا ہے۔

مثال کے طور پر جو شخص امیر کے سوار ہونے کی توقع رکھتا ہے، اس سے کہیں کہ ”قَدْ رَكِبَ الْأَمِيرُ“، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ امیر کے سوار ہونے کی جو تو توقع رکھتا تھا تو وہ توقع حقیقی اور یقینی طور پر عن قریب حاصل ہوگئی اور جب مضارع پر داخل ہوتا ہے تو اکثر ان معنوں کے ساتھ تقلیل کے معنی مل جاتے ہیں، جیسے: ”إِنَّ الْكَذُوبَ قَدْ يَصْدُقُ“، یعنی حقیقتاً کبھی اُس (جھوٹے) سے صدق واقع ہو جاتا ہے، گو قلیل ہو۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ﴿قَدْ﴾ تاکید کا حرف ہے اور محققین نے کہا ہے کہ ﴿قَدْ﴾ ماضی کو حال کے قریب کر دیتا ہے تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ فلاح مومنوں کو حاصل ہو چکی اور فی الحال وہ اس پر ہیں۔[2] چوں کہ مومنین اللہ پاک کے فضل و کرم سے فلاح کی توقع رکھتے تھے، اس لیے اُن کی بشارت کو کلمۂ ﴿قَدْ﴾ سے شروع فرمایا۔

فلاح اور ایمان کا مفہوم:

فلاح کے معنی مراد حاصل کر لینا ہیں، مقصد و مطلب پا لینے میں کامیاب ہونا اور ناپسندیدہ چیز سے نجات پانا۔ کسی نے کہا ہے کہ خیر میں باقی رہنا اور اِفلاح فلاح میں داخل ہونے کو کہتے ہیں، جیسے: اِبشار بشارت میں داخل ہونے کو کہتے ہیں۔ کبھی یہ متعدی بھی آتا ہے، یعنی فلاح میں داخل کرنے کے معنی میں، اسی کی بنا پر طلحہ بن مصرف رحمہ اللہ کی قراءت ”قَدْ أُفْلِحَ“ صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے اور انہیں سے ”أَفْلَحُوا الْمُؤْمِنُونَ“ صیغۂ جمع کے ساتھ بھی مروی ہے۔[3]

اس میں دو وجہ ہیں: یا تو ”أَكَلُونِي الْبَرَاغِيثُ“ (یا حرفِ واو فاعلِ فعل ہے اور ”براغیث“ اس سے بدل ہے یا ”براغیث“ مبتدا موخر ہے اور ”أَكَلُوا“ خبر مقدم جس طرح کہ یہ دونوں احتمال کتبِ نحو میں لکھے ہوئے ہیں۔ (مصحح)۔) کی لغت پر ہے، یعنی حرفِ واو ضمیرِ فاعل نہیں ہے، بلکہ ایک حرف ہے، جو یہ بات بتاتا ہے کہ فاعل جمع ہے یا حرفِ واو ضمیرِ مبہم ہے ”مومنون“ اس کی تفسیر کرتا ہے۔ ورش نے نافع سے ”قَدَ أَفْلَحَ“ روایت کیا ہے، یعنی ہمزے کی حرکت دال پر ڈال دی اور ہمزے کو حذف کر دیا۔[4] پانچویں قراءت یہ ہے کہ کسی نے ”أُفْلِحُ الْمُؤْمِنُونَ“ پڑھا ہے، یعنی واو کو حذف کیا اور حرکتِ ضمہ کو اس کے قائم مقام رکھا۔ ایمان لغت میں تصدیق کو کہتے ہیں اور مومن لغتاً مصدق ہے۔ اور شرعی لحاظ سے مومن وہ ہے، جو زبان سے دونوں شہادتوں کا اقرار کرے، اس حالت میں کہ اس کا دل اس کی زبان کے موافق ہو۔[5] (قاله النسفي) فلاح وغیرہ کے معنی کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔[6]

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٤٤) [2] تفسير البغوي (٥/ ٤٠٧۔ ٤٠٨) [3] فتح القدير (٣/ ٦٤٤)

[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٦) [5] تفسير النسفي (٣/ ١١٦) [6] رقم الآية (٥)

مومنوں کا پہلا وصف خشوع وخضوع سے نماز ادا کرنا:

بالجملہ اللہ پاک نے جن مومنوں کو فلاح کی خوش خبری سنائی تو اُن کے اوصاف بیان فرمائے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حقیقی فلاح صرف زبانی ایمان کے دعوے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ وہ حقیقی ایمان سے حاصل ہوتی ہے، جو ان شرطوں کے ساتھ مقید ہے، جن کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ بندہ نماز کو خضوع، خشوع فروتنی اور عاجزی کے ساتھ ادا کرنے والا ہو۔ خشوع میں اختلاف ہے، بعض نے تو اس کو دل کے افعال میں شامل کیا ہے، جیسے: خوف وڈر اور کسی نے اس کو اعضا کا فعل قرار دیا ہے، جیسے: سکون کا اختیار اور التفات وعبث کا ترک۔ کسی نے ان دونوں کو اس میں شامل کیا ہے۔ زیادہ صحیح یہی قول ہے۔

خشوع وخضوع کا مفہوم اور اہمیت:

لغت میں خشوع کے معنی سکون، تواضع، خوف اور تذلل ہیں۔ پھر خشوع کے نماز کے فرائض میں سے یا فضائل میں سے ہونے میں دو قول پر اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صحیح پہلا قول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دوسرا قول۔ عبدالواحد بن زید رحمہ اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ بندے کے لیے وہی ہے جو اس نے اپنی نماز سے سمجھا ہے۔ امام نیسابوری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کو نقل کیا ہے۔ امام نیسابوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو بات اس قول کی صحت پر دال ہے اس میں سے اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾ [محمد: ٢٤] ''کیا پھر وہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے۔'' بغیر معنی کو جانے ہوئے تدبر کا تصور نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ [طٰہٰ: ١٤] ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔''

ذکر کی ضد غفلت ہے، اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٠٥] ''اور آپ غافلوں میں (شامل) نہ ہوں۔'' نیز فرمایا: ﴿ حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ [النساء: ٤٣] ''یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ تم کہتے ہو۔'' اس میں مدہوش کو نماز پڑھنے سے منع کیا ہے اور جو شخص دنیا کے ہموم وغموم میں ڈوبا ہوا ہے، وہ بھی شراب سے مست ہونے والے کی طرح ہے۔[1] شیخ زادہ رحمہ اللہ نے دونوں امر کو جمع کرنے والی بات کو زیادہ صحیح کہا ہے۔ اس کے بعد اس اولیت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ نماز پڑھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو شے قلب اور جسم سے تعلق رکھتی ہے اور سارے ظاہری اور باطنی اُمور سے اس کو اپنے معبود کے لیے انتہائی خضوع اور تذلل حاصل ہو۔ ظاہری طور پر اور جسم کا خضوع جو سر سے ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کو جھکائے اور جو آنکھ سے ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس

[1] فتح القدير (٣/ ٦٤٥)

کو اِدھر اُدھر دیکھنے سے باز رکھے، گویا وہ اندھی ہے اور جو کان سے ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ سننے کے لیے اس کو ذلیل و مطیع کرے اور جو زبان سے ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ قراءت دل کو حاضر کر کے پڑھے، ہاتھوں سے جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ سیدھا ہاتھ بائیں ہاتھ پر اس طرح رکھے، جس طرح غلام تعظیم کی غرض سے رکھتا ہے، جو پیٹھ سے ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ رکوع میں اس کو برابر جھکائے، شرم گاہ سے جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شہوانی خیالات میں سے کوئی اثر اس میں ظاہر نہ ہو۔ دونوں قدموں سے جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ پر ثابت رہیں اور جو حرکت نماز کے افعال میں سے نہیں ہے، اُس سے سکون میں رہیں۔ رہا باطن کا خشوع تو وہ نفس کا اس طرح سے خشوع ہے کہ اس میں کسی طرح کا خیال نہ آنے دے۔

قلب کا خشوع یہ ہے کہ ذکر کو لازم پکڑے اور ہمیشہ عاجزی کرے۔ سِرّ کا خشوع، یعنی باطنی خشوع مراقبۂ مذکور اور ہر قسم کی چیزوں کی طرف توجہ کا ترک کرنا ہے۔ روح کا خشوع یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے دریا میں مستغرق ہو اور اس کے جمال وجلال کی تجلّی کے وقت فانی ہو جائے۔ امام نے کہا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ آیا یہ خشوع نماز میں واجب ہے تو ہم کہیں گے کہ ہمارے نزدیک واجب ہے، اس پر کئی امور دلالت کرتے ہیں۔ پھر وہی چار آیتوں کا ذکر کیا، جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں، ایک آیت زیادہ لکھی ہے، وہ یہ ہے: قولہ تعالیٰ: ﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴾ [المزمل: ٤] ''اور قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے۔''

اس کے معنی ـ واللہ أعلم ـ یہ ہیں کہ تم اس کے عجائب و معانی پر ٹھہرو۔ اور نبی کریم ﷺ کا قول ہے: ((إِنَّمَا الصَّلَاةُ تُسَكِّنُ وَتَوَضَّعُ))[1] اس میں ''إِنَّمَا'' کا کلمہ حصر کے واسطے ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا فرمان کہ جس شخص کو اس کی نماز فحشاء ومنکر سے باز نہ رکھے تو وہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ سے دور ہی کرے گی۔[2] چنانچہ غافل کی نماز فحشا سے نہیں روکتی اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ کتنے (نماز میں) کھڑے ہونے والے ایسے ہیں کہ کھڑے ہونے میں اُن کا حصہ تھکنا اور محنت اُٹھانا ہے،[3] اس سے مراد غافل کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو اس کے لیے اس میں چھٹا حصہ یا دسواں حصہ نہیں لکھا جاتا۔ نماز سے اس کے لیے جو لکھا جاتا ہے، وہ وہی ہوتا ہے، جو اس نے اس میں سے سمجھا۔[4] یعنی اس نماز میں سے وہی قبول ہوتا ہے، جو اس نے سمجھا بوجھا ہو۔ جواز (روائی) وفساد میں نماز اگرچہ تجزی (جزو جزو ہونا) کو قبول نہیں کرتی، مگر قبولیت میں تجزی کو قبول کرتی ہے، ان دونوں اَمروں کے درمیان میں فرق ہے۔

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

[2] المعجم الکبیر (١١/ ٥٤) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢)

[3] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ اس کے ہم معنی روایت سنن النسائي الکبریٰ (٢/ ٢٣٩) اور سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٦٩٠) صحیح الجامع (٣٤٨٨) میں مروی ہے۔

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٧٩٦) صحیح الجامع (١٦٢٦) البتہ اس کا آخری جملہ (نماز سے اس کے ... سمجھا) نہیں ملا۔

بشر حافی رحمہ اللہ سے مروی ہے، فرمایا کہ جس شخص نے خشوع نہ کیا اس کی نماز فاسد ہوئی۔ حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہر نماز جس میں دل حاضر نہیں ہوتا تو وہ سزا کی طرف جلدی کرنے والی ہے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس شخص نے قصد کر کے اس شخص کو پہچانا جو اس کے بائیں یا دائیں طرف ہے، حالاں کہ وہ نماز میں ہے تو اس کی نماز نہیں ہے۔[1] امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، چناں چہ اس بارے میں حدیث شریف وارد ہوئی ہے[2] اور جو کلام غفلت کے ساتھ ہو، وہ سرگوشی نہیں ہوتا،[3] کیوں کہ مناجات اور سرگوشی اس وقت تک حقیقی نہیں ہوتی، جب تک کہ اس کے دل کی تضرع اور زاری کی تعبیر اس کی زبان نہ کرے۔ بلاشبہہ قرآن و اذکار، حمد و ثنا اور تضرع و دعا کا مقصد خطاب ہے اور مخاطب اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے جب دل پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہو اور وہ اللہ پاک کے جلال اور کبریائی سے غافل ہو، پھر اس کی زبان عادت کے طور پر ہلتی ہے، وہ قبولیت سے دور ہے۔ اسی لیے رکوع و سجود سے مقصود صرف اللہ پاک کی تعظیم اور اس کا حکم بجا لانا ہے اور ان افعال کا تعظیم اور فرماں برداری کے لیے بجا لانا دل کے معبود سے غفلت کر کے ممکن نہیں، حالاں کہ مقصد اس کی تعظیم ہے۔ اگر یہ بات جائز ہو کہ اللہ تعالیٰ سے دل غافل ہونے کے باوجود یہ افعال اللہ پاک کی تعظیم کے لیے ہوتے ہیں تو یہ بات بھی جائز ہوگی کہ یہ کام کسی بت کی تعظیم کے لیے ہوں، جو اس کے پہلو میں ہے اور وہ اس سے غافل ہے۔ جو اُمور اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ نماز میں خشوع و خضوع ضروری ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ یا اکیلے نماز پڑھتے وقت نمازی سلام سے جس شے کی نیت کرتا ہے، فقہاء نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ آیا وہ حضور کی نیت کرے یا غیب و حضور دونوں کی۔ لہٰذا جس وقت سلام کے معنی میں، جو نماز کا آخری فعل ہے، غور و فکر کی حاجت ہوگی تو پھر نماز کے دوران میں جو تکبیر و تسبیح و قراءت واقع ہوتی ہیں، اُن کے معنی میں غور و فکر کی بھی حاجت ہوگی۔

پھر کہا ہے کہ ہمارے نزدیک حضور اجزاء کی شرط نہیں ہے، بلکہ قبولیت کی شرط ہے۔ اجزاء سے مراد یہ ہے کہ قضا واجب نہیں ہوتی ہے اور قبول سے مراد ثواب کا حکم ہے۔ فقہا جو بحث کرتے ہیں، وہ اجزاء کے حکم میں ہے نہ کہ ثواب کے حکم میں اور اس جگہ ہماری غرض یہی ہے۔ پھر کہا ہے کہ ہم نے مانا کہ سارے فقہاء نے اس کے جواز کا حکم کیا ہے، کیا اصولیوں اور اہلِ ورع نے اس میں تنگی پیدا نہیں کی، پھر تو احتیاط کیوں نہیں کرتا۔

حکایت:

بعض علما نے امامت کو اختیار کیا تھا۔ اس بارے میں ان سے کسی نے پوچھا تو جواب دیا: میں ڈرتا ہوں کہ اگر فاتحہ کو چھوڑ دوں تو امام شافعی رحمہ اللہ مجھ پر ناراض ہوں اور اگر امام کے ساتھ اس کو پڑھوں تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ مجھ پر

[1] إحياء علوم الدين (١/ ١٦٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٥١)
[3] إحياء علوم الدين (١/ ١٥٩)

ناراض ہوں۔ لہٰذا اس اختلاف سے بچنے کی خاطر میں نے امامت کو اختیار کیا ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ خٰشِعُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں دل سے ڈرنے والے، اعضا سے سکون کرنے والے۔ کسی نے کہا ہے کہ خشوع نماز میں یہ ہے کہ نماز ہی کی طرف خیال رکھے اور نماز کے علاوہ دوسری چیزوں سے اعراض کرے، اور نمازی کی آنکھ اس کی نماز کی جگہ سے تجاوز نہ کرے اور اِدھر اُدھر نہ دیکھے اور بے فائدہ حرکت نہ کرے اور سدل نہ کرے، یعنی کپڑا نہ لٹکائے اور اپنی انگلیوں کو نہ چٹکائے اور کنکریوں کو اِدھر اُدھر نہ کرے اور سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے اس کے مثل مروی ہے: خشوع یہ ہے کہ اخلاص المقال (اپنے ذکر میں اخلاص ہو) اور اعظام المقام (مقام کی عظمت کو ملحوظ رکھے) اور یقین التام (مکمل یقین ہو) اور جمع الاہتمام[1] (پوری طرح توجہ اور اہتمام ہو)۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کپڑے کے روکنے سے بچے، جمائی لینے، آنکھ بند کرنے، منہ کو ڈھانکنے اور ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالنے سے بچے، ان کے سوا اور باتیں جو نماز میں مکروہ ہیں، ان سب سے احتراز کرے۔

ان آیات کے شانِ نزول کے بارے میں بعض آثار جو فتح البیان اور فتح القدیر میں ذکر کیے گئے ہیں، وہ یہاں لکھے جاتے ہیں: امام ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں، مجھے خبر دی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت نماز پڑھتے تو اپنی نگاہ آسمان کی طرف اُٹھاتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾ (أخرجه سعيد بن منصور و ابن جرير و البيهقي في سننه عنه۔ وأخرجه عبدالرزاق عنه وزاد: فأمره بالخشوع فرمىٰ ببصره نحو مسجده۔ وأخرجه عنه أيضاً عبد بن حميد و أبو داود في المراسيل و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و البيهقي في السنن بلفظ: كان إذا قام في الصلاة نظر هكذا و هكذا يمينا و شمالا فنزلت: ﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾ فحنى رأسه وروى عنه من طرق مرسلا هكذا۔ وأخرجه الحاكم وصححه و ابن مردوية و البيهقي في سننه عنه عن أبي هريرة رضي الله عنه أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم كان إذا صلى رفع بصره إلى السماء فنزلت فطأطأ رأسه)

امام عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے ابن سیرین رحمہ اللہ سے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم نماز میں اپنے سروں کو اور اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف اُٹھاتے تھے اور دائیں بائیں طرف التفات کرتے تھے۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی تو انھوں نے اپنے سروں کو جھکا لیا اور اس کے بعد نماز میں کبھی نگاہوں کو نہ اٹھایا اور نہ دائیں بائیں التفات کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ کسی نے ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ خشوع دل میں ہے اور وہ یہ ہے کہ تو اپنے بازو کو مسلمان مرد کے لیے نرم کرے اور یہ کہ تو اپنی نماز میں التفات نہ کرے، یعنی دائیں اور بائیں طرف نظر کو نہ پھیرے۔[2]

(أخرجه ابن المبارك في الزهد و عبد الرزاق والفريابي و عبد بن حميد و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و الحاكم وصححه والبيهقي في سننه عنه) نماز میں خشوع کے مشروع ہونے اور دائیں بائیں نظر کرنے اور آسمان کی طرف نظر

[1] تفسير النسفي (٣/ ١١٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٨۔ ٩) الدر المنثور (٦/ ٨٣، ٨٤)

کرنے کی ممانعت میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جو کتبِ حدیث میں معروف ومشہور ہیں۔[1]

امام کرخی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ کے نزدیک خشوع نماز کے فرائض میں سے ہے اور بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ واجب نہیں ہے، کیوں کہ خشوع وخضوع کی شرط کرنا فقہا کے اجماع کے خلاف ہے، اس لیے اس کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ انتہٰی۔ امام غزالی رحمہ اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے، جو کچھ ان کا مذہب ہے، وہ اس سے خوب معلوم ہو سکتا ہے۔

﴿فِيْ صَلَاتِهِمْ﴾ ﴿خٰشِعُوْنَ﴾ سے متعلق ہے، اس کی اہمیت کے لیے اس کو پہلے ذکر کیا ہے۔ ﴿خٰشِعُوْنَ﴾ میں چوں کہ فاصلہ واقع ہوا ہے، لہٰذا اس نے تقدیم (پہلے ذکر کرنے) کو حسین کر دیا، اسی طرح اس کے بعد والے الفاظ کا حال ہے۔ صلاۃ کی اضافت مصلین کی طرف کی، اللہ پاک کی طرف نہ کی، جس کے واسطے نماز پڑھی جاتی ہے، اس لیے کہ نماز کا فائدہ اکیلے نمازی ہی کو ہوتا ہے اور نماز اسی کا عدّہ اور ذخیرہ ہے۔ رہا اللہ پاک تو وہ اس سے بے نیاز ہے، اس کو کسی شے کی کچھ حاجت نہیں ہے۔

لغو کا معنی ومفہوم:

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "لَغْو" ہر وہ چیز ہے، جو باطل، لہو، ہزل اور معصیت ہے اور وہ شے جو قول وفعل میں اچھی اور مرغوب نہیں ہے۔ اس کی تفسیر سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں لغو سے مراد شرک ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے معاصی ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ کافروں سے گالی گلوچ کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ لغو باطل ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ لغو سے ہر وہ چیز مراد ہے جو حرام ہے، یا مکروہ ہے یا وہ مباح جس کی طرف کوئی ضرورت اور حاجت نہیں ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغو ہر وہ کلامِ ساقط ہے جس کو لغو کرنا ضروری ہے، جیسے: جھوٹ اور گالی اور ہزل، یعنی اُن کے لیے جِد (کوشش) سے وہ شے ہے، جس نے ہزل سے ان کو باز رکھا۔ جبکہ مومنین کا پہلے یہ وصف بیان کیا کہ وہ اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں تو اس کے بعد یہ وصف بیان کیا کہ وہ لغو سے اعراض کرتے ہیں، تاکہ اُن کے لیے ایک کام کرنا اور دوسرے کا چھوڑنا دونوں جمع ہو جائیں۔ یہ دونوں باتیں نفس پر شاق گزرتی ہیں اور اطاعت کی تکلیف دینے کے یہی دو قاعدے ہیں۔[4]

لغو سے اعراض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے پرہیز کرتے ہیں، اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ظاہر

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٤٧، ٦٤٨) فتح البيان (٩/ ٩٦ـ ٩٧)
[2] فتح القدير (٣/ ٦٤٥)
[3] تفسير الطبري (١٩/ ١٠)
[4] تفسير النسفي (٣/ ١١٦)

اس کا یہ ہے کہ ہر گھڑی اُن میں لغو سے منہ موڑنے کی صفت موجود رہتی ہے تو نماز کا وقت تو اس میں بدخولِ اولیٰ داخل ہوگا، چناں چہ جملہ اسمیہ اور بنائے حکم ضمیرِ ﴿ هُمْ ﴾ پر، اس بات کو مفید ہے۔ اللہ پاک نے ﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴾ فرمایا، "اَلَّذِيْنَ لَا يَلْهُوْنَ" یا "لَا يَلْغُوْنَ" نہیں کہا، اس کے باوجود کہ یہ مختصر جملہ تھا اور اس سے مطلوبہ معنی حاصل ہوتے تھے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی نسبت قرآن کا نظم پانچ وجوہ سے ابلغ (زیادہ موثر) ہے: ایک تو یہ جملہ اسمیہ ہے، جو دوام اور ثبات پر دال ہے۔ دوسری وجہ بنائے حکم ضمیر پر جو بہ سبب تکرارِ حکم کے مضبوطی اور طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔ تیسرے اس کی تعبیر اسم سے کی، جو ثبات پر دال ہے، یعنی ﴿ مُعْرِضُوْنَ ﴾ فرمایا، "يُعْرِضُوْنَ" نہ کہا۔ چوتھے ﴿ عَنِ اللَّغْوِ ﴾ کو اس پر مقدم کیا۔ یہ تقدیم تخصیص کے لیے ہے۔ پانچویں اعراض کو ترک کے مقام پر رکھا، تاکہ وہ اس بات کی دلیل ہو کہ وہ لغو سے بالکل دور ہیں، نہ لغو میں مبتلا ہوتے ہیں، نہ اس کا سبب ہوتے ہیں اور نہ اس کی طرف میلان رکھتے ہیں، نہ اس میں حاضر ہوتے ہیں، کیوں کہ اعراض کی اصل یہ ہے کہ اعراض کرنے والا ایک طرف ہوتا ہے اور جس سے اعراض کیا ہے وہ اس کے سوا دوسری جانب میں ہوتا ہے۔ یہ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے قول کا حاصل ہے۔[1]

فاعلینِ زکات کے معنی:

زکات کے فاعلین ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ زکات کو ادا کرتے ہیں۔ ادا کرنے کی تعبیر فعل سے اس لیے کی کہ ادا کرنا بھی ان اشیا میں سے ہے، جس پر فعل صادق آتا ہے۔ اس جگہ زکات سے مراد مصدر ہے، کیوں کہ فاعل سے صادر ہوا ہے۔ کسی نے کہا: ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد عین ہو بہ تقدیر مضاف "أَيْ: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِتَأْدِيَةِ الزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ"۔ بحر ابو حیان کا حاصل یہ ہے کہ ﴿ فٰعِلُوْنَ ﴾ میں "مُؤَدُّوْنَ" کے معنی شامل ہیں، اس لیے کہ اعیان یعنی سونا چاندی وغیرہ میں سے جس قدر حصہ اپنے مال میں سے مستحقین کے لیے نکالتا ہے، اس کی طرف فعل کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ اور زکات کو مصدر پر محمول کرنا بھی صحیح ہے۔ اس صورت میں فعل کی نسبت مصدر کی طرف بغیر تضمین کے صحیح ہے۔[2]

امام سمین رحمہ اللہ کا بیانِ مبین یہ ہے کہ ﴿ لِلزَّكٰوةِ ﴾ کا حرفِ لام مفعول میں زیادہ کیا گیا ہے، اس لیے کہ مفعول اپنے عامل سے پہلے دیا گیا ہے اور اس لیے کہ عامل یعنی ﴿ فٰعِلُوْنَ ﴾ فرع ہے، کیوں کہ اصل عمل میں فعل ہوتا ہے اور اسم فاعل وغیرہ فرع ہے فعل کی۔ (اسم فاعل عمل میں ضعیف ہے، اسی لیے "هٰذَا ضَارِبٌ لِزَيْدٍ" کہتے ہیں اور "ضَرَبَ لِزَيْدٍ" نہیں بولتے۔) غرض کہ لام کی زیادتی انھیں دو وجہ سے ہوئی ہے۔ اور زکات اصل میں مصدر ہے اور جس قدر مال اعیان سے نکالا جاتا ہے، اس پر بھی زکات کا اطلاق ہوتا ہے۔

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٦۔ ١٤٧)
[2] البحر المحيط (٦/ ٣٦٦)

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: زکات اسمِ مشترک ہے عین و معنی کے درمیان، پس عین تو اس قدر مال کا نام ہے، جس کو زکات دینے والا نصاب سے نکالتا ہے اور معنی زکات دینے والے کا فعل ہے۔ اللہ پاک نے اسی کا ارادہ کیا ہے۔ اس لیے زکات دینے والوں کو اس کا فاعل قرار دیا ہے، اس کے سوا اس میں اور کچھ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ مصدر کی تعبیر فعل کے ساتھ کی جاتی ہے اور اس فعل کے محدث کو فاعل کہتے ہیں، مثلاً: ضارب کو ضرب کا فاعل قاتل کو قتل کا فاعل اور مزکی کو تزکیہ کا فاعل بولتے ہیں۔[1] بالجملہ اللہ پاک نے پہلے تو مومنوں کا یہ وصف بیان کیا کہ وہ نماز میں خشوع و تواضع اور فروتنی کرتے ہیں۔ اس کے بعد اُن کی یہ تعریف کی کہ وہ زکات دیتے ہیں، تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ بدنی و مالی طاعات ادا کرنے اور محرمات سے اور باقی اُن سب چیزوں سے اجتناب کرنے میں، جن سے پرہیز کرنے کو مروت واجب کرتی ہے، انتہائی درجے کو پہنچے ہوئے ہیں۔

شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴾ فرج مرد و عورت دونوں کی شرم گاہ کو کہتے ہیں۔ اس بات سے کہ ''وہ اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھتے ہیں'' مراد یہ ہے کہ عفت اور پارسائی کی وجہ سے جو شے اُن کو حلال نہیں ہے، اس سے ان کو روکتے ہیں۔ کہا ہے کہ جمع کی ضمیر سے اس جگہ خاص طور پر مرد مراد ہیں نہ کہ عورتیں اس قول کی دلیل ہے: ﴿ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ﴾، کیوں کہ اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ عورت کو حلال نہیں کہ اس کا غلام اور مملوک اُس سے وطی کرے۔ ازواج سے مراد وہ بیویاں ہیں جن سے شرعی نکاح ہوا ہے۔

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا کہ کلمۂ ﴿ عَلٰۤى ﴾ کی چار وجوہ ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ حٰفِظُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے اس بنا پر کہ ﴿ حٰفِظُوْنَ ﴾ میں "مُمْسِكُوْنَ" یا "قَاصِرُوْنَ" کے معنی شامل ہیں۔ یہ دونوں کلمۂ ﴿ عَلٰۤى ﴾ کے ساتھ متعدی ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ ﴾ [الأحزاب: ٣٧] ''تو اپنی بیوی (زینب) کو اپنے پاس رکھ۔'' دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ عَلٰۤى ﴾ بمعنی "مِنْ" ہے۔ "أَيْ: مِنْ أَزْوَاجِهِمْ"۔ پس ﴿ عَلٰۤى ﴾ بہ معنی "مِنْ" ایسا ہے، جیسے: "مِنْ" بہ معنی "عَلیٰ" آیا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ﴾ [الأنبياء: ٧٧] ''اور ہم نے اس کی مدد کی اس قوم کے خلاف جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔'' امام فراء رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔[2]

تیسری وجہ یہ ہے کہ موضع نصب میں ہے بنا بر حال۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: "اِلَّا وَالِيْنَ أَوْ قَوَّامِيْنَ عَلَيْهِمْ"، یہ معنی اس محاورے سے ماخوذ ہیں کہ "كَانَ فُلَانٌ عَلٰى فُلَانَةٍ فَمَاتَ عَنْهَا فَخَلَفَ عَلَيْهَا فُلَانٌ"،

---

[1] الکشاف (٣/ ١٧٩)　[2] فتح القدير (٣/ ٦٤٥)

یعنی فلاں مرد فلاں عورت پر والی تھا۔ پھر وہ اس کو چھوڑ کر مر گیا تو فلاں شخص اس پر خلیفہ ہو گیا۔ معنی یہ ہیں کہ وہ سب حالتوں میں اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے حالتِ تزوج میں یا تسری میں (تزوج نکاح کرنے کو کہتے ہیں اور تسری لونڈی رکھنے کو)۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ محذوف سے متعلق ہے، جس پر ﴿ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴾ دال ہے۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: گویا یوں کہا گیا: "يُلَامُوْنَ إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ" یعنی ہر مباشرت پر ملامت کیے جائیں گے، سوائے اس مباشرت کے جو اُن کے لیے حلال کی گئی ہے، کیوں کہ وہ اس پر غیر ملومین ہیں۔[1] انتھی۔ کسی نے کہا ہے کہ استثنا ارسال کی نفی سے ہے، جو حفظ سے سمجھی جاتی ہے، یعنی اپنی فروج کو نہیں چھوڑتے مگر اپنی بیویوں پر۔ یہ پانچویں وجہ ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اُن میں سے تین وجہیں ذکر کی ہیں، پہلی اور تیسری اور چوتھی۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی تین لکھی ہیں، لیکن دوسری تیسری اور چوتھی۔[3] امام محلی رحمہ اللہ نے صرف ایک وجہ ذکر کی ہے، یعنی دوسری۔ تفسیر خازن میں بھی صرف یہی وجہ مذکور ہے۔[4]

﴿ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ﴾ کا جملہ محلِ جر میں ہے اور ﴿ اَزْوَاجِهِمْ ﴾ پر معطوف ہے۔ اس سے مراد اِماء و جواری ہیں، یعنی شرعی لونڈیاں۔ ﴿ مَا مَلَكَتْ ﴾ فرمایا، "مَنْ مَلَكَتْ" نہ کہا، حالاں کہ لونڈیاں ذوی العقول ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں دو چیزیں جمع ہوئی ہیں: ایک تو انوثت، جو عقل کی کمی کو ظاہر کرتی ہے، دوسری اُن کی باقی سامان و اسباب اور حیوانات کی طرح خرید و فرخت کا ہونا، اس لیے ان کو غیر عقلا کے قائم مقام کر کے اُن کے لیے کلمہ ﴿ مَا ﴾ ذکر کیا جو غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مباشرت چوں کہ نفس کو تمام کھیلوں سے بڑھ کر پسند و لذیذ اور مرغوب تھی، اس لیے علاحدہ سے ذکر کیا، اگرچہ ﴿ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴾ کی عمومیت میں اس کا ذکر آ گیا تھا۔

جملہ ﴿ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴾ استثنا کی وجہ ہے اور ضمیر ﴿ حٰفِظُوْنَ ﴾ کی طرف راجع ہے، یا اُن لوگوں کی طرف جن پر استثنا دال ہے، یعنی اگر وہ اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے شرم گاہوں کی حفاظت نہ کریں تو اس پر اُن کو کسی طرح کی ملامت نہیں ہے، جبکہ وہ شرعی طریقے سے ہو، مثلاً: پیچھے سے وطی نہ کرے اور حالتِ حیض و نفاس میں جماع سے باز رہے، اگر ایسا کرے گا تو اگرچہ بیوی ہو تو بھی قابلِ ملامت ہو گا۔

﴿ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ ﴾ میں بیویوں اور لونڈیوں کی طرف اشارہ ہے، یعنی جو شخص اُن کے سوا طلب کرے ﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ ﴾ تو وہی لوگ ہیں اس شے کی طرف تجاوز کرنے والے جو اُن کے لیے حلال نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص اس سے نکاح کرے جو اس کے لیے حلال نہیں تو اللہ پاک نے اس کا نام عادی رکھا ہے۔ اس جگہ

---

[1] الكشاف (٣/ ١٨٠)　[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٧)

[3] تفسير النسفي (٣/ ١١٦۔ ١١٧)　[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٦) تفسير الخازن (٥/ ٣٢)

کلمہ ﴿ وَرَآءَ ﴾ ”سوی“ کے معنی میں ہے اور وہ ﴿ ابْتَغٰى ﴾ کا مفعول ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی ”مَا بَعْدَ ذٰلِكَ“ تو ﴿ ابْتَغٰى ﴾ کا مفعول محذوف ہوگا اور ﴿ وَرَآءَ ﴾ ظرف ٹھہرے گا۔[1]

نکاحِ متعہ اور مشت و انگشت زنی حرام ہیں:

یہ آیت متعہ کے نکاح کے حرام ہونے کی دلیل ہے۔ امام عبدالرزاق اور ابو داود رحمہم اللہ نے اپنے مجموعوں میں قاسم بن محمد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ کسی نے اُن سے متعہ کا حال پوچھا تو کہا کہ میں اس کا حرام کیا جانا قرآن میں دیکھتا ہوں، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ﴾[2] اسی آیت سے بعض اہلِ علم نے استمنا بالید (ہاتھ سے منی نکالنا) کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے، اس لیے کہ وہ ان چیزوں میں سے ہے جو ﴿ وَرَآءَ ﴾ میں آتی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک رسالہ ”بلوغ المنی في حکم الاستمنا“ کے نام سے تالیف کیا ہے اور اس میں ممانعت اور جواز کی دلیلیں ذکر کی ہیں، اُن میں سے ترجیح راجح کی بیان کی ہے۔

امام جمل رحمہ اللہ نے امام رازی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک استمنا بالید حرام ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس کو جائز رکھتے تھے، کیوں کہ منی بدن میں ایک فضلہ ہے اور حاجت کے وقت اس کا نکالنا جائز ہے، جیسے: فصد و سینگی لگانا، لیکن تین شرطوں سے: ایک یہ کہ زنا سے ڈرتا ہے۔ دوسری یہ کہ آزاد عورت کا مہر یا لونڈی کی قیمت نہیں ہے، جس طرح کہ کتاب منتہیٰ میں ذکر کیا ہے۔ تیسری یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے کرے۔ اس کے مفہوم میں تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اپنی بیوی یا لونڈی کے ہاتھ سے ہے تو جائز اور اگر اجنبی مرد یا اجنبی عورت سے ہے تو حرام ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں متعہ اور شہوت کے ارادے سے استمنا بالید کرنے کے حرام ہونے کی دلیل ہے۔[3]

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ استمنا بالید حرام ہے، اکثر علما کا قول یہی ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ سے کسی نے اس کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ مکروہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک قوم حشر کی جائے گی اور اُن کے ہاتھ حاملہ ہوں گے، لہٰذا میں گمان کرتا ہوں کہ وہ یہی لوگ ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: اللہ نے ایک اُمت کو عذاب کیا، وہ لوگ اپنے مذاکیر (شرم گاہوں) سے بیہودہ اور لغو کام کیا کرتے تھے۔[4] شیخ زادہ نے بھی یہی کہا ہے کہ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ استمنا بالید حرام ہے اور یہ قول ہے علما رحمہم اللہ کا، پھر وہی دو قول ذکر کیے ہیں۔ واللہ أعلم.

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٤٦)
[2] مصنف عبد الرزاق (٧/ ٥٠٢)
[3] تفسير النسفي (٣/ ١١٧)
[4] تفسير الخازن (٥/ ٣٢)

عہدوں اور امانتوں کی پاسداری:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾ اصل میں امانت اور عہد دونوں مصدر ہیں۔ پھر اس مصدر کے ساتھ اس شے کا نام رکھا جس پر آدمی امین بنایا جاتا ہے اور اس پر اس سے عہد لیا جاتا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ [النساء: ۵۸] ''بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو واپس کر دو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ ﴾ [الأنفال: ۲۷] ''اور نہ تم آپس کی امانتوں میں خیانت کرو۔'' حالاں کہ جو ادا کیے جاتے ہیں، وہ اعیان ہیں نہ معانی، جس شے پر امین کیا ہے وہ ادا کی جاتی ہے نہ خود امانت۔ جمہور کی قراءت امانات جمع کے صیغے سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امانت مصدر ہے، امانت کی مختلف قسمیں ہونے کی وجہ سے اس کو جمع کے صیغے سے بیان کیا ہے، ورنہ مصدر میں جمع کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی قسمیں یہ ہیں: وضو، نماز، روزہ وغیرہ احکامِ شرعیہ۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امانت واحد کے صیغے سے پڑھا ہے، اس لیے کہ جب اس کی اضافت جمع کی طرف کی گئی تو اب التباس (شک وشبہہ) سے امن مل گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امانت مصدر ہے، اس کو جمع کی حاجت نہیں ہے۔[1]

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ...الخ﴾ میں صیغۂ جمع پر سب کا اجماع ہے۔ یہ حاصل ہے امام کرخی رحمہ اللہ کا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں اور سورۃ المعارج میں واحد کے صیغے سے پڑھا ہے،[2] معنی یہ ہیں کہ جس شے پر اللہ پاک کی طرف سے، یا اس کے بندوں کی طرف سے امین بنائے گئے ہیں اس کو ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح جس شے کا ان سے عہد لیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، یا بندوں کی طرف سے اس کو پورا کرتے ہیں۔ دین و دنیا کے کاموں میں سے جس شے کا انسان ذمے دار ہوتا ہے عہد و امانت میں وہ سب چیزیں جمع ہیں۔ امانت عہد سے زیادہ عام ہے، چنانچہ ہر عہد امانت ہے۔ اب وہ بات وارد نہ ہوگی کہ جو لوگ سات اوصاف کے حامل ہیں، اللہ پاک نے کس طرح اُن پر فلاح کا حکم لگا دیا، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے عباداتِ واجبہ کا پورا ذکر نہیں کیا، جیسے کہ روزہ اور حج ہے۔

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: امانتیں مختلف ہیں، بعض تو وہ ہیں جو بندے اور اللہ پاک کے درمیان ہیں، جیسے: نماز، روزہ، غسلِ جنابت اور باقی عبادات، جن کو اللہ نے بندوں پر واجب فرمایا ہے۔ لہٰذا اُن سب کو پورا کرنا واجب ہے اور بعض اللہ کے بندوں کے درمیان آپس میں ہوتی ہیں، جیسے: ودائع و صنائع (احسان وغیرہ) اور اسرار (راز) وغیرہ، لہٰذا ان کا وفا کرنا بھی واجب ہے۔ ﴿ رٰعُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں ﴿ حٰفِظُوْنَ ﴾۔[3] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے

[1] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٤٨)
[2] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٤٨)
[3] تفسیر الخازن (٥/ ٣٢۔ ٣٣)

کہ ان کی حفاظت اور اصلاح کے ساتھ قائم رہنے والے ہیں۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: راعی وہ ہے کہ کسی شے کی حفاظت اور اصلاح کے لیے مقرر ہوتا ہے، جیسے: بکریوں کا چرواہا۔[2]

نمازوں کی حفاظت کرنا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ یعنی اپنی نمازوں پر مواظبت اور مداومت کرتے ہیں اور اُن کے اوقات میں اُن کو ادا کرتے ہیں۔ چوں کہ نماز میں تجدد و تکرر ہے، اس لیے ﴿ يُحَافِظُوْنَ ﴾ بصیغۂ فعل فرمایا، "مُحَافِظُوْنَ" نہ کہا اور اسی لیے جمہور نے ﴿ صَلَوٰتِهِمْ ﴾ بصیغۂ جمع پڑھا ہے اور سورت کے شروع میں ﴿ صَلَاتِهِمْ ﴾ بصیغۂ مفرد پڑھا، تاکہ اس بات کو مفید ہو کہ خشوع جنسِ نماز میں سے ہے وہ کوئی سی نماز ہو، اور آخر میں جمع کا صیغہ ذکر کیا، تاکہ نمازوں کی تعداد کی حفاظت کا مفہوم ظاہر کرے۔ نمازیں پانچ ہیں اور وتر وسننِ راتبہ ونوافلِ مرویہ۔ حمزہ وکسائی رحمہما اللہ نے اس جگہ مفرد پڑھا ہے اسم جنس مراد لیا ہے اور اسمِ جنس جمع کے معنی میں ہوتا ہے۔[3]

نماز کا جو یہاں ذکر کیا تو یہ تکرار نہیں ہے، اس لیے کہ نماز میں خشوع کرنا اور ہے اور نمازوں پر محافظت کرنا اور اُن کے اوقات میں ان کو ادا کرنا اور چیز ہے۔ رہی یہ بات کہ طہارتوں کا ذکر نہیں کیا، لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ محافظتِ نماز میں وہ داخل ہیں، کیوں کہ وہ شرائطِ نماز میں سے ہیں۔ مومنین کے اوصاف کو نماز سے شروع کیا اور اسی پر ختم کیا، لہٰذا اس میں نماز کی شان کی تعظیم ہے۔ نماز کی محافظت یہی ہے کہ جو وقت جس نماز کے لیے مقرر ہے، اس کو اسی میں پڑھے، رکوع وسجود پورا ادا کرے، قراءت اچھی طرح سے اور مشروع طریقے سے پڑھے، شرعی اذکار کو اپنے موقع ومحل میں ادا کرے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے اُن سے کہا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں نماز کا ذکر بہت کرتا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ [المعارج: ٢٣] "جو اپنی نماز پر ہمیشہ قائم ہیں۔" نیز فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ [المعارج: ٣٤] "اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔" تو فرمایا: "ذٰلِكَ عَلٰى مَوَاقِيْتِهَا" یعنی اس سے مراد نماز کے اوقات کا محفوظ رکھنا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم تو اس سے نماز کا ترک کرنا سمجھتے تھے، فرمایا کہ نماز کو ترک کرنا تو کفر ہے۔[4]

مومن ہی مستحقینِ جنت ہیں:

پھر اللہ پاک نے مومنین کی، جن کے اوصاف بیان ہوئے، یہ تعریف فرمائی کہ ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴾

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٨)
[2] تفسير النسفي (٣/ ١١٧)
[3] تفسير القرطبي (١٢/ ١٠٧)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ٢١٦)

یعنی یہ لوگ جو صفاتِ مذکورہ کے حامل ہیں، وہی اس لائق ہیں کہ ان کا نام وارث رکھا جائے نہ اُن کے علاوہ کوئی اور لوگ۔ مطلب یہ ہے کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴾ اور جو جملے اس پر معطوف ہیں، صفت پر دوسری صفت کے معطوف ہونے کی قبیل سے ہیں، باوجود وحدتِ ذات کے۔ اور صفتوں کے درمیان میں جو واوٗ عاطفہ آیا ہے، اس سے جمع کے معنی نکلتے ہیں اور حصر جو ضمیر فصل سے مستفاد ہوتا ہے، وہ حصرِ کمال کی قبیل سے ہے، یعنی وارث نام رکھے جانے کے مستحق یہی لوگ ہیں۔ وارث وہ شخص ہے جو مورث کے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہتا ہے اور جس بات کا اس کا مورث استحقاق رکھتا ہے، اس کے ساتھ مستعد ہونے میں وہ اس کا قائم مقام ہوتا ہے، چنانچہ جو لوگ ان عبادات اور اَوصاف کے حامل ہیں، اس لحاظ سے کہ اپنے اعمال کے فنا ہو جانے کے بعد جو کہ اعراض کی قبیل سے تھے، باقی رہیں گے تو وہ اُن وارثوں کے مثل ہوئے جو اپنے مورث کے فنا ہونے کے بعد باقی رہتے ہیں، اس لحاظ سے کہ انھیں اعمال نے اُن کو اس ثوابِ جزیل اور اجرِ کثیر کا وارث بنایا ہے، جس کا اللہ پاک نے اُن سے اُن کے عوض وعدہ فرمایا ہے۔ یہ شیخ زادہ کے قول کا حاصل ہے۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حصر اضافی ہے، حقیقی نہیں ہے، کیوں کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اطفال (بچے) ومجانین (دیوانے) و ولدان (چھوٹی عمر میں وفات پانے والے بچے) اور حور عین جنت میں داخل ہوں گے اور اہلِ قبلہ میں سے فاسق لوگ بھی معافی کے بعد اس میں جائیں گے، اس لیے کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨ و ١١٦] ''ہاں شرک کے علاوہ گناہ جس کے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔'' پھر اللہ پاک نے اس شے کا بیان کیا، جس کے وہ وارث ہوں گے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ﴾ فردوس کا کلمہ رومی لغت سے معرب ہے۔ کسی نے کہا: فارسی ہے۔ کسی نے کہا: حبشی ہے۔ کسی نے کہا: عربی ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فردوس وسیع باغ کو کہتے ہیں، جس میں ہر قسم کے پھل جمع ہوتے ہیں۔ قطرب نے کہا ہے کہ اعلی الجنان ہے۔[1] مجمع البحار میں ہے کہ فردوس وہ باغ ہے، جس میں کرم (انگور کی بیل) اور دوسرے درخت ہوتے ہیں۔[2] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اس کی تفسیر میں ثابت ہوا ہے، وہ یہی ہے کہ فردوس اوسط جنت واعلی الجنان ہے،[3] چناں چہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو اعمال آیاتِ مذکورہ میں ذکر ہوئے ہیں، جو شخص اُن پر عمل کرے گا تو وہی وارث ہے کہ جنت میں سے اس عالی مکان کا وارث ہوگا۔ غرض کہ یہ اس شے کا بیان ہے جس کے وہ وارث ہوں گے۔ پہلے وراثت کو مطلقاً ذکر کیا، پھر اس کی تقیید کی۔ پہلے اس کو مبہم بیان کیا، پھر اس کی تفسیر کی، اس سے غرض اس کی تعظیم و تاکید ہے۔ وہ جو فردوس کے مستحق

[1] تفسير النسفي (٣/ ١١٧) [2] مجمع بحار الأنوار (٤/ ١١٥) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧)

ہوئے اپنے اعمال کے سبب سے اور اللہ کے وعدے کے سبب سے، تو اس استحقاق کے لیے وراثت کا استعارہ کیا گیا ہے، اس کا مقصد مبالغہ کرنا ہے۔ یہ تو وراثت کے معنی بطورِ استعارہ تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مومنین کافروں کی ان منازل کے وارث ہوں گے، جو جنت میں اُن کے لیے تھیں اور جن کو انھوں نے اپنی جانوں پر ضائع کیا، کیوں کہ اللہ پاک نے ہر انسان کے لیے ایک منزل جنت میں پیدا کی ہے اور ایک منزل آگ ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ اپنے مساکن کے وارث ہوں گے اور اپنے بھائیوں کے مساکن کے، جو اُن کے لیے تیار کیے گئے تھے، اگر وہ اللہ کی اطاعت کرتے۔[1] (أخرجه عبد الرزاق و عبد بن حميد و ابن جرير و الحاكم و صححه عنه)

امام عبد بن حمید اور ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حسن صحیح اور غریب ہے۔ پھر ایک قصہ ذکر کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْفِرْدَوْسُ رَبْوَةُ الْجَنَّةِ» (رَبْوَةُ الْجَنَّةِ أَيْ: أَرْفَعُهَا، وَهِيَ بِالضَّمِّ وَالْفَتْحِ مَا ارْتَفَعَ مِنَ الْأَرْضِ.[2] مجمع البحار) «وَأَوْسَطُهَا» (اوسط بمعنی افضل) «وَأَفْضَلُهَا»۔[3] اس بارے میں باقی حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔

جملہ ﴿هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾ حالِ مقدرہ کی بنا پر محلِ نصب میں ہے، یا مستأنفہ ہے، اس کا کوئی محل اعرابی نہیں ہے۔ خلود کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، بسیں گے اور کبھی اس سے نہ نکلیں گے اور نہ ہی اس میں انھیں موت آئے گی۔ ضمیر کی تانیث باوجود اس کے کہ فردوس کی طرف رجوع کرتی ہے، اس لیے ہے کہ وہ جنت کے معنی میں ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: یہ اس لیے کہ یہ جنت کا یا اس کے اعلیٰ طبقے کا نام ہے۔[4] چوں کہ اللہ پاک نے اپنے بندوں کو عبادت پر آمادہ کیا اور اس کو بجا لانے پر اُن سے فردوس کا وعدہ فرمایا تو اس کے ضمن میں معادِ اخروی آ گئی، اس لیے تقریرِ مبدأ کی طرف رجوع کیا، تاکہ وہ نفوسِ مکلفین میں ٹھہر جائے، کیوں کہ کسی چیز کو دوہرانے کی نسبت اس کی ابتدا زیادہ سخت ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٢) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٢٧) [2] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٢٨٢۔ ٢٨٣)
[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٥٢) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٨٤)

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿١٦﴾

اور بلاشبہ ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ہے⑫ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ مقرر گاہ (رحمِ مادر) میں نطفہ بنا کر رکھا⑬ پھر ہم نے نطفے کو خون کی پھٹکی بنایا، پھر ہم نے پھٹکی کو لوتھڑے میں ڈالا، پھر ہم نے لوتھڑے سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اسے ایک اور ہی صورت میں بنا دیا، چناں چہ بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے عمدہ بنانے والا ہے⑭ پھر بے شک تم اس کے بعد ضرور مرنے والے ہو⑮ پھر یقیناً تم یومِ قیامت (دوبارہ) اُٹھائے جاؤ گے⑯

تخلیقِ انسانی کے تدریجی مراحل میں سے پہلا مرحلہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک انسان کی پیدائش کی ابتدا سلالۂ طین سے کیے جانے کی خبر دیتا ہے۔ انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں کہ اللہ پاک نے ان کو کھنکھناتے اور سنے ہوئے گارے سے پیدا کیا۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے ”عَنِ الْمِنْهَالِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ أَبِي يَحْيَى عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما“ سے ﴿سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ”مِنْ صَفْوَةِ الْمَاءِ“ یعنی خالص صاف پاک پانی سے اُن کو بنایا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ”﴿مِنْ سُلٰلَةٍ﴾ أَيْ: مِنْ مَنِيِّ آدَمَ“ یعنی اللہ پاک نے آدمی کو آدم علیہ السلام کی منی سے بنایا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: آدم علیہ السلام کا نام طین اس لیے رکھا ہے کہ وہ اسی سے بنائے گئے ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ”أُسْتُلَّ آدَمُ مِنَ الطِّينِ“[1] یعنی آدم علیہ السلام مٹی سے کھینچے گئے، یا نکالے گئے ہیں۔ یہ قول معنی میں زیادہ ظاہر ہے اور سیاق کے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ آدم علیہ السلام ”طین لازب“ یعنی کھنکھناتی مٹی، سنے ہوئے گارے سے بنائے گئے ہیں اور یہ تراب یعنی مٹی سے پیدا کیا گیا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ﴾ [الروم: ٢٠] ”اور (یہ) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اب تم بشر ہو (جو ہر طرف) پھیل رہے ہو۔“ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا جس کو زمین کے مختلف حصوں سے لیا۔ پھر آدم علیہ السلام کی اولاد زمین کے اندازے پر آئی، کوئی اس میں سے سرخ اور سفید ہے اور کوئی سیاہ ہے اور اُن میں کوئی ناپاک ہے، کوئی پاک ہے اور کوئی اُن کے درمیان ہے۔[2] (وقد رواه أبو داود والترمذي من طرق عن عوف الأعرابي به نحوه وقال الترمذي: حسن صحيح)

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٤۔ ١٥)

[2] مسند أحمد (٤/ ٤٠٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٥٥) السلسلة الصحيحة (١٦٣٠)

دوسرا اور تیسرا مرحلہ:

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً ﴾ یہ ضمیر انسان کی طرف راجع ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسٰنِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ [السجدة: ۷۔ ۸] ''اور اس نے تخلیقِ انسان کی ابتدا مٹی سے کی۔ پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے جوہر (نطفے) سے چلائی۔'' یعنی کمزور، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴾ [المرسلت: ۲۰۔ ۲۱] ''کیا ہم نے تمھیں حقیر پانی (منی) سے تخلیق نہیں کیا؟ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ رکھا۔'' یعنی رِحم اس کے لیے تیار و مہیا کیا گیا ہے۔ ﴿ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴾ [المرسلت: ۲۲۔ ۲۳] ''ایک مقرر اندازے (مدت) تک۔ پھر ہم نے اندازہ لگایا تو کیا خوب اندازہ لگانے والے ہیں۔'' یعنی ایک مدتِ مقرر و اجلِ معین تک، یہاں تک کہ مستحکم ہوا اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف اور ایک صفت سے دوسری صفت کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً ﴾ یعنی پھر ہم نے نطفے کو علقہ کر دیا۔ نطفہ اُچھلتے پانی کو کہتے ہیں، جو مرد کی صلب، یعنی پشت سے نکلتا ہے اور عورت کے ترائب، یعنی سینے کی ہڈیوں سے جو ہنسلی کی ہڈی سے لے کر ناف تک ہوتی ہیں۔ پھر وہ ہو گیا سرخ لمبی پھٹکی علقے کی شکل پر۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علقہ خون ہے۔[1]

چوتھا اور پانچواں مرحلہ:

﴿ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً ﴾ مضغہ گوشت کی بوٹی کی طرح ایک ٹکڑا ہے، اس میں نہ کوئی شکل ہے نہ نقشہ۔ ﴿ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا ﴾ یعنی ہم نے اس بوٹی کی شکل بنا دی، اس کو سر والا دو ہاتھ دو پاؤں والا کر دیا، یعنی ہڈیوں، پٹھوں اور رگوں سے یہ چیزیں بنا دیں۔ دوسروں نے اس کو ''فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عَظْمًا'' پڑھا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ عظم سے مراد پشت کی ہڈی ہے۔ صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوائے ''عَجْبُ الذَّنْب'' کے ہر ابن آدم کا جسم بوسیدہ ہو جائے گا۔ وہ اسی سے پیدا کیا گیا اور اسی سے ترکیب دیا جائے گا۔[2] (''عَجْبُ الذَّنْب'' فتح عین مہملہ وسکون جیم اصل ذنب ہے۔ عجب کا حال عجیب ہے، کیوں کہ وہ سب سے آخر میں پیدا کی جاتی ہے اور سب سے پہلے پیدا کی جائے گی۔ امام مظہری نے اسی طرح کہا ہے، اس سے مراد اس کے باقی رہنے کی مدت کا زیادہ ہونا ہے، یہ نہیں کہ وہ اصلاً بوسیدہ ہی نہ ہو گی، کیوں کہ یہ بات خلافِ محسوس ہے۔ عجب ایک لطیف ہڈی ہے، اس کو عجم بھی کہتے ہیں، آدمی میں سب سے پہلے وہی پیدا کی جاتی ہے اور اس میں

[1] الدر المنثور (٦/ ١٠)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٥)

سے وہی باقی رہتی ہے، تاکہ اسی کے اوپر پیدائش کو دہرایا جائے۔ انبیا علیہم السلام اس سے مستثنیٰ ہیں، کیوں کہ اُن کے جسم زمین پر حرام کر دیے گئے ہیں۔[1] كذا في مجمع البحار.)

﴿ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس پر وہ شے کر دی جو ہڈیوں کو چھپا دے اور اُن کو مضبوط اور قوی کر دے۔ ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ﴾ کے معنی ہیں کہ ہم نے اس میں روح پھونک دی تو اس نے حرکت کی اور ایک اور ہی مخلوق ہو گیا جو سننے والی، دیکھنے والی، محسوس کرنے والی اور حرکت اور اضطراب والی ہے۔ ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب نطفے پر چار مہینے گزر جاتے ہیں تو اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے، پھر وہ اس میں روح پھونکتا ہے تین تاریکیوں میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وہی قول ہے: ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ﴾ یعنی ہم نے اس میں روح پھونک دی۔

شکمِ مادر میں تخلیقِ انسانی کے مختلف مراحل:

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس نے روح پھونکی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ﴾ یعنی پھر ہم نے اس میں روح پھونکی۔ اسی طرح امام مجاہد، عکرمہ، شعبی، حسن، ابو العالیہ، ضحاک، ربیع بن انس، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے، یعنی "بِنَقْلِهِ مِنْ حَالٍ إِلَى أَنْ خَرَجَ طِفْلًا" مطلب یہ ہے کہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ طفل ہو کر نکل آیا۔ پھر صغیر رہ کر نشو ونما پاتا رہا۔ پھر بلوغت کو پہنچا، پھر جوان ہوا، پھر اُدھیڑ عمر کا، پھر بوڑھا، پھر بڑا بوڑھا ہوا۔ امام قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ سے اس کی طرح مروی ہے۔ اس میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے، کیوں کہ روح پھونکے جانے کے شروع سے لے کر مختلف حالات سے گزرتا رہا ہے۔[2] واللہ أعلم.

امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صادق و مصدق ہیں، (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم فی نفسہٖ سچے ہیں اور اللہ پاک نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا کیا ہے) کہ بے شک تم میں ایک ایسا ہے کہ اس کی پیدائش جمع کی جاتی، اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن، پھر وہ علقہ کی طرح ہو جاتا ہے، پھر مضغہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی طرف فرشتہ بھیجا جاتا ہے، جو اس میں روح پھونکتا ہے، پھر اس کی چار باتوں کا حکم لکھا جاتا ہے: اس کا رزق، اس کی اَجل، اس کا عمل اور یہ کہ آیا وہ بدبخت ہے یا نیک بخت۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۰۴۷) سنن النسائي، رقم الحديث (۱۳۷۴) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۰۸۵) صحيح الجامع، رقم الحديث (۲۲۱۲) مجمع بحار الأنوار (۳/ ۵۲۲)

[2] تفسير الطبري (۱۹/ ۱۷۔ ۱۸) تفسير ابن كثير (۳/ ۳۲۱)

قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک تم میں سے ایک اہلِ جنت کے سے اعمال کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر اس کی لکھی ہوئی تقدیر آگے آجاتی ہے تو اس کے سبب سے اس کا خاتمہ عملِ اہلِ نار کے ساتھ کیا جاتا ہے، پھر وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے اور بے شک کوئی آدمی اہلِ نار کے اعمال جیسے عمل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور آگ کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، لیکن اس کی لکھی ہوئی تقدیر آگے آجاتی ہے تو اس کا خاتمہ اہلِ جنت کے اعمال کے ساتھ کیا جاتا ہے، پھر وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے۔[1] (أخرجاه من حديث سليمان بن مهران الأعمش)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ نطفہ جس وقت رحم میں واقع ہوتا ہے تو وہ ہر بال اور ناخن میں پھیل جاتا ہے (یعنی نطفہ جب رحم میں پڑتا ہے، پھر اللہ پاک بشر پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ عورت کے چمڑے میں ہر بال اور ناخن کے نیچے اُڑ جاتا ہے، یعنی پھیل جاتا ہے۔ پھر چالیس دن ٹھہرا رہتا ہے، پھر خون ہو کر رحم میں اُترتا ہے، سو یہی اس کا جمع ہونا ہے)۔ پھر وہ چالیس دن ٹھہرا رہتا ہے، پھر رحم میں لوٹ جاتا ہے تو علقہ ہو جاتا ہے۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ ایک یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے بات کر رہے تھے تو قریش نے اس سے کہا: اے یہودی! یہ زعم کرتا ہے کہ وہ نبی ہے تو یہودی بولا: میں اس سے ایسی شے کا سوال کروں گا جس کو نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ راوی نے کہا: پھر وہ یہودی آپ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا۔ پھر کہا: اے محمد! انسان کس چیز سے پیدا کیا جاتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرد اور عورت دونوں کے نطفے سے پیدا کیا جاتا ہے۔ مرد کا نطفہ گاڑھا ہوتا ہے، اس سے ہڈیاں اور پٹھے ہیں اور عورت کا نطفہ رقیق (پتلا) ہوتا ہے، اس سے گوشت اور خون بنتا ہے، اس پر وہ یہودی بولا: اسی طرح وہ لوگ کہتے تھے جو تجھ سے پہلے تھے۔[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے کہ جب نطفہ رحم میں چالیس دن تک قرار پکڑتا ہے تو فرشتہ اس پر اترتا ہے اور کہتا ہے: اے رب! کیا یہ بد بخت ہے یا نیک بخت، نر ہے یا مادہ؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرما دیتا ہے تو وہ لکھے جاتے ہیں (یعنی یہ دونوں باتیں کہ نیک بخت ہے یا بد بخت، نر ہے یا مادہ) اور اس کا عمل اور نقشِ قدم (یعنی کہاں کہاں چلے پھرے گا) اور مصیبت اور رزق، پھر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣) مسند أحمد (١/ ٤١٤)

[2] تفسير الطبري (٦/ ١٦٧)

[3] مسند أحمد (١/ ٤٦٥) اس کی سند میں "عطاء بن سائب" متکلم فیہ راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ٨/ ٤٣٦)

صحیفہ (یعنی تقدیر نامہ) لپیٹ دیا جاتا ہے تو جو کچھ اس میں لکھا جا چکا، اس میں سے نہ کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ۔[1] (وقد رواه مسلم في صحيحه من حديث سفيان بن عيينة عن عمرو هو ابن دينار نحوه من طريق آخر عن أبي الطفيل عامر بن واثلة عن حذيفة بن أسيد أبي سريحة الغفاري بنحوه. والله أعلم)

حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اللہ نے رحم پر ایک فرشتہ مقرر کیا ہے، جو کہتا رہتا ہے: اے رب! نطفہ ہے، اے رب! علقہ ہے، اے رب! مضغہ ہے، پھر جب اللہ تعالیٰ اس کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ فرشتہ کہتا ہے: اے رب! نر ہے یا مادہ، بدبخت ہے یا نیک بخت اور اس کا رزق اور اَجل کیا ہے؟ فرمایا: پس یہ اس کی ماں کے پیٹ میں ہی لکھ دیا جاتا ہے۔[2] (أخرجاه في الصحيحين من حديث حماد بن زيد به)

اللہ تعالیٰ بابرکت اور احسن الخالقین ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ یعنی جب کہ اللہ پاک نے اس نطفے سے پیدا کرنے میں اپنی قدرت اور مہربانی کا ذکر کیا، یعنی نطفے کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کرنے اور ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کرنے کا ذکر کیا، یہاں تک کہ صورت بن کر اچھا خاصا پورا انسان بن گیا تو یوں فرمایا: ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ یعنی بابرکت ہے اللہ تعالیٰ بہتر بنانے والا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اور اس نے مجھ سے چار باتوں میں موافقت کی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ ... الخ﴾ تو خاص میں نے کہا: ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ اس پر ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ نازل ہوئی۔[3]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو یہ آیت املا کرائی: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ﴾ تو سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آیت اسی سے ختم کی گئی ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾[4] اس حدیث کی اسناد میں جابر بن زید جعفی

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٤) مسند أحمد (٤/ ٦)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٦) مسند البزار (١٤/ ٣٤)

(3) المعجم الأوسط (٥/ ٥٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه جابر الجعفي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٧٤)

(4) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٢٢)

انتہائی ضعیف ہیں، ان کی اس حدیث میں سخت نکارت ہے، اس لیے کہ یہ سورت مکی ہے اور زید بن ثابت نے جو وحی لکھی ہے، وہ مدینہ میں تھی۔ اسی طرح معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا اسلام بھی مدینے ہی میں ہوا ہے۔ فاللہ أعلم.

انسان کی موت اور روزِ قیامت دوبارہ جی اٹھنے کا بیان:

﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴾ یعنی اس پہلی پیدائش کے بعد تم موت کی طرف منتقل ہوگے۔ ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴾ آخری پیدائش، یعنی قیامت کے دن اور جب روحوں کو جسموں کی طرف لوٹایا جائے گا تو پھر تمام خلائق کا حساب لیا جائے گا اور ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کا بھرپور بدلہ دیا جائے گا۔ اگر خیر کا عمل ہے تو بدلہ بھی خیر دیا جائے گا ہے اور اگر شر ہے تو بدلہ بھی شر۔[1]

اس آیت کا اس سے پہلی آیات سے ربط یہ ہے کہ اللہ پاک نے اگلی آیت میں عبادات کا امر فرمایا اور یہ بات ظاہر ہے کہ عبادتِ الٰہی میں مشغول ہونا اس وقت تک ٹھیک نہیں ہوتا، جب تک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی معرفت نہ حاصل کر لی جائے۔ لہٰذا اس لیے اللہ پاک نے اس کے بعد اس شے کا ذکر کیا، جو اس کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور اس پر کہ وہ صفاتِ جلال اور وحدانیت کے ساتھ متصف ہے اور تمام دلیلیں جو ذکر فرمائیں، وہ چار قسم کی ہیں:

پہلی قسم تو انسان کی پیدائش کے مختلف مراحل سے استدلال کرنا ہے، یہ مراحل نو ہیں۔ پہلا مرحلہ تو انسان کا ﴿ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴾ ہونا ہے اور آخری مرحلہ ﴿ تُبْعَثُوْنَ ﴾ ہے۔ دلائل کی دوسری قسم آسمانوں کا پیدا کرنا ہے، اس کی طرف ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ﴾ [المؤمنون: ١٧] ''اور بلاشبہ ہم نے تمھارے اوپر سات تہ بہ تہ آسمان پیدا کیے۔'' میں اشارہ کیا ہے۔ تیسری قسم پانی کا اُتارنا ہے، اس کی طرف ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ ﴾ [المؤمنون: ١٨] ''اور ہم نے آسمان سے ایک (خاص) اندازے سے پانی نازل کیا۔'' میں اشارہ ہے۔ استدلال کی چوتھی قسم حیوانوں کے احوال ہیں، اس کی طرف ﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ﴾ [المؤمنون: ٢١] ''اور بلاشبہ تمھارے لیے چوپایوں میں ضرور (سامانِ) عبرت ہے۔'' میں اشارہ ہے۔

حیوانات کے احوال چار ہیں اُن کا ذکر آیت میں ہے۔ اُن سب انواع کا آیندہ اپنے محل و موقع پر ذکر آئے گا۔ غرض کہ پہلی قسم آدمی کا اپنی پیدائش کی مختلف حالتوں میں لوٹ پوٹ ہونا ہے۔ پہلی حالت یہ ہے کہ ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ ﴾ یہ جملہ قسم محذوف کا جواب ہے، یعنی ''وَاللّٰهِ لَقَدْ خَلَقْنَا'' اور جملہ ماقبل پر معطوف ہے، اس لیے کہ دونوں کے درمیان ایک مناسبت ہے۔ یہ مناسبت کچھ تو پہلے اس آیت کی تمہید میں ذکر ہو چکی ہے اور پورے طور پر ابھی مذکور ہوئی۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ یہ ابتدائے کلام ہے اور اس کے

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٢٠۔ ٣٢٢)

شروع میں حرفِ واؤ جملہ کلام کا جملہ کلام پر عطف کرنے والا ہے، گو دونوں جملے معنی کے لحاظ متباین ہوں۔[1] فتح القدیر میں کہا ہے کہ یہ جملہ مبتدا ہے، یا ماقبل پر معطوف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ فتح القدیر کے نزدیک ابن عطیہ کا قول مختار ہے، جب تو اس کو اول لکھا اور دوسرے کو لفظ ''قیل'' کے ساتھ حالاں کہ اس میں کمزوری ہے۔[2] چنانچہ اس قول سے وہی قول بہتر ہے جو پہلے آیت کی تمہید میں گزر چکا ہے، کیوں کہ مناسبت کی وجہ موجود ہے۔

﴿سُلٰلَةٍ﴾ کی تفسیر:

﴿سُلٰلَةٍ﴾ ''فُعَالَةٌ'' کا وزن ہے ''سَلَّ'' سے۔ ''سل'' ایک شے کو دوسری شے میں سے نکالنے کھینچنے کو کہتے ہیں، جس طرح محاورے میں بولتے ہیں: ''سَلَلْتُ الشَّعْرَةَ مِنَ الْعَجِيْنِ وَالسَّيْفَ مِنَ الْغِمْدِ'' یعنی میں نے بال کو آٹے سے کھینچ لیا اور تلوار کو میان سے۔ تو بال نکل آیا اور تلوار نکل آئی۔ اس بنا پر نطفہ سلالہ ہوا اور بچہ سلیل ٹھہرا اور سلالہ بھی۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلالہ وہ مٹی گارا ہے کہ جس وقت تو اس کو نچوڑے تو وہ تیری انگلیوں کے درمیان سے نکل آئے، چنانچہ جو نکلتا ہے سلالہ وہی ہے۔[3]

ابو عوسجہ نے کہا ہے کہ ہر شے سے جو خالص ہوتا ہے، اس کو سلالہ کہتے ہیں۔ امام بیضاوی، نسفی اور محلی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ سلالہ بہ معنی خلاصہ ہے، کیوں کہ وہ کدر (گدلہ پن) کے درمیان سے کھینچا جاتا ہے۔[4] مطلب یہ ہے کہ جو چیز کسی شے سے اس کے کدر میں سے اس کے خالص کرنے کے طریقے پر نکالی جائے، وہ سلالہ ہے۔ فعالہ کا وزن قلت پر دال ہوتا ہے، اس وزن میں ہر جگہ قلت مراد ہوتی ہے، جس طرح کہ لفظ خلاصہ ہے، اس میں بھی قلت ہے، کیوں کہ ہر شے کا خلاصہ اُس شے کی نسبت کم ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس خاک سے آدم علیہ السلام بنے اس کا نام سلالہ اس لیے رکھا ہے کہ وہ ہر خاک سے کھینچے گئے تھے۔ بچے کا نام جو سلالہ رکھا ہے، وہ اس لیے کہ اس کی اصل یعنی پانی ہر بال کے نیچے سے کھینچا جاتا ہے۔

امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ''سُلَالَةٌ: صَفْوُ الْمَاءِ الرَّقِيْقِ الَّذِيْ يَكُوْنُ مِنْهُ الْوَلَدُ''[5] یعنی سلالہ وہ خالص صاف پتلا پانی ہے جس سے بچہ ہوتا ہے۔ سلالہ میں تابعین کے کئی قول ہیں، چناں چہ اس کا پہلا حصہ ذکر ہو چکا ہے۔

لفظ ﴿مِنْ﴾ کا بیان:

کلمۂ ﴿مِنْ﴾ ابتدائیہ ہے اور ﴿مِنْ طِيْنٍ﴾ کا حرف ﴿مِنْ﴾ محذوف سے متعلق ہے، کیوں کہ وہ سلالہ کی صفت ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو خلاصے سے بنایا ہے، ایسا خلاصہ جو طین سے ہے۔ یا ﴿مِنْ﴾ بیانیہ ہے، یعنی ہم نے اس کو خلاصے سے بنایا ہے کہ وہ طین ہے، جس طرح کہ ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ﴾ [الحج: ٣٠]

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٤/ ١٧٧) [2] فتح القدير (٣/ ٤٧٦) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ١٠٩)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٨) تفسير النسفي (٣/ ١١٧) تفسير الجلالين (١/ ٤٤٦) [5] الدر المنثور (٦/ ٩١)

میں ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہے، یعنی تم بچو گندگی سے کہ وہ بت ہیں۔ یا ﴿ مِنْ طِيْنٍ ﴾ کا ﴿ مِنْ ﴾ ﴿ سُلٰلَةٍ ﴾ کے معنی سے متعلق ہے، کیوں کہ "سلالہ" کے معنی "مسلولة" ہیں۔ یعنی ہم نے اس کو خلاصے سے بنایا، ایسا خلاصہ کہ طین سے کھینچا گیا ہے۔ اس صورت میں ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائیہ ہوگا، جس طرح کہ پہلے حصے میں ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائیہ تھا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے تینوں وجہوں کا ذکر کیا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے آخری وجہ کو اختیار کیا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے کہ پہلا ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائیہ ہے اور دوسرا ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ۔[1]

انسان سے کون مراد ہے:

انسان میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ علامہ نسفی اور محلی رحمہما اللہ کا اختیار کردہ قول یہ ہے کہ انسان سے آدم علیہ السلام مراد ہیں۔[2] شیخ زادہ نے اس قول کو ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ اور قتادہ رحمہما اللہ کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وہ قول، جو پہلے جو گزر چکا ہے، اس کے خلاف ہے۔ شاید یہ کوئی دوسرا قول ہو۔ ہاں قتادہ رحمہ اللہ کا یہ قول ہے۔[3] واللہ أعلم۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا بھی پہلا قول یہی ہے، اس لیے کہ وہ اُس خلاصے سے بنے، جو مٹی سے کھینچا گیا، یا اس مٹی سے بنائے گئے جو ہر خاک سے کھینچی گئی، اور اُن کی اولاد نطفے سے بنائی گئی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ انسان سے مراد جنسِ انسان ہے۔[4] یعنی اولادِ آدم۔ اُن کی نسبت مٹی سے پیدا ہونے کی اس لیے ہوئی کہ اُن کے باپ کو تو بے شک خالص مٹی سے بنایا گیا، ان کے ضمن میں گویا یہ بھی مٹی سے پیدا کیے گئے۔ (یا مضاف مقدر ہے یعنی "لَقَدْ خَلَقْنَا أَصْلَ الْإِنْسَانِ وَهُوَ آدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامِ") دوسری وجہ یہ ہے کہ بنی آدم ایسے خلاصوں سے پیدا کیے گئے ہیں، جو پانی اور مٹی سے نکالے جاتے ہیں۔ یہ خلاصے نباتی غذائیں ہیں، پہلے اُن میں سے منہ اور دانت خلاصہ کھینچتے ہیں، پھر معدہ، پھر جگر اور پھر دماغ۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسان نطفے سے متولد ہوتا ہے اور نطفہ فضل ہضمِ رابع سے پیدا ہوتا ہے اور یہ فضل غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے اور غذائیں یا حیوانی ہیں یا نباتی۔ حیوانی غذا کا انتہا بھی نباتی غذا کی طرف ہوتا ہے اور نباتی غذا جو پیدا ہوتی ہے تو اسی زمین اور پانی کے خلاصے سے۔ چنانچہ انسان حقیقت میں مٹی کے خلاصے سے متولد ہوتا ہے۔ پھر یہ خلاصہ جب مختلف فطرت اور خلقت کے اطوار اور ادوار سے گزرتا ہے تو منی بن جاتا ہے۔ امام نے کہا کہ یہ تاویل لفظ کے مطابق ہے اور اس میں تکلفات کی حاجت نہیں رہتی۔[5] تیسری وجہ یہ ہے کہ طین سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، کیوں کہ وہ اسی سے بنے ہیں اور سلالہ سے مراد اُن کا نطفہ ہے، یعنی ہم نے انسان کی جنس کو آدم علیہ السلام کے نطفے سے بنایا، یہ مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے،[6] جو پہلے گزر چکا ہے۔

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٨) تفسير الجلالين (١/ ٤٤٦) تفسير النسفي (٣/ ١١٧)
[2] تفسير النسفي (٣/ ١١٧) تفسير الجلالين (١/ ٤٤٦) [3] تفسير الطبري (١٩/ ١٤)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٨) [5] تفسير الرازي (٢٣/ ٧٤) [6] تفسير الطبري (١٩/ ١٤۔ ١٥)

﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً ﴾ میں ضمیر انسان کی طرف راجع ہے۔ انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہوں گے تو یہاں مضاف مقدر ہوگا، یعنی پھر ہم نے نسلِ آدم علیہ السلام کو نطفہ کیا، یعنی نطفے سے اُن کو بنایا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ کی ضمیر انسان، یعنی آدم علیہ السلام کی طرف بطورِ استخدام (خدمت لینا) پھرے، کیوں کہ انسان کا لفظ آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد دونوں کو شامل ہے۔ تو انسان سے خود آدم مراد لیے اور اس کی ضمیر سے اولادِ آدم۔ اہلِ بدیع کے عُرف میں اس صنعت کو استخدام کہتے ہیں اور اگر انسان سے مراد اولادِ آدم ہوگی تو خود ظاہر ہے، کسی طرح کا اشکال نہیں ہے۔ یا ضمیر سلالہ کی طرف لوٹتی ہے۔ "أَيْ: جَعَلْنَا السُّلَالَةَ نُطْفَةً" یعنی پھر ہم نے ان غذاؤں کو جو مٹی سے نکالی جاتی ہیں نطفہ کر دیا۔ رہی یہ بات کہ سلالہ کی طرف مذکر کی ضمیر کس طرح پھرے گی، لہٰذا سلالہ کی تاویل جوہر یا مسلول یا ماء کریں گے۔ نطفہ وعلقہ ومضغہ کی تفسیر سورۃ الحج میں گزر چکی ہے۔[1]

﴿ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴾ کا مفہوم:

﴿ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴾ محذوف سے متعلق ہے اس بنیاد پر کہ یہ نطفے کی قسم ہے، یعنی ایسا نطفہ جو قرارِ مکین میں ہوتا ہے۔ قرار سے مراد جائے قرار ہے، یعنی رحم۔ قرار مصدر ہے۔ قرارگاہ کو مصدر سے مبالغے کی خاطر تعبیر کیا۔ ﴿ مَكِيْنٍ ﴾ کے معنی ہیں "حصین" محفوظ۔ یہ اس شے کی صفت ہے جو رحم میں قرار پذیر ہوتی ہے۔ رحم کو اس کے ساتھ دو وجوہات کی بنا پر موصوف کیا: ایک تو بطورِ مجاز ہے۔ جس طرح کہتے ہیں طریق سائر، یعنی راہ چلنے والی، حالاں کہ چلنے والا وہ ہے جو راہ میں چلتا ہے، خود راہ نہیں چلتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ رحم خود ایک مضبوط اور محفوظ جگہ ہے کہ اس کو کوئی خلل نہیں پہنچتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴾ کا تعلق "جَعَلْنَا" سے ہو، اس بنا پر کہ قرار سے مراد مرد کی پشت ہو اور ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ کی ضمیر سلالہ کی طرف پھرے اور "جعل" کے معنی تصییر (ہونا) قرار پائے، کیوں کہ انسان کی جنس اُس شے سے پیدا کی جاتی ہے، جو مٹی سے نکالی جاتی ہے اور وہ شے ایک زمانے کے بعد مرد کی پشت میں نطفہ بنتی ہے۔

انسان کی پیدایش کے نو مراحل:

غرض کہ انسان کی پیدایش میں نو مراحل ہیں، ان میں سے دو مرحلے تو بیان ہو چکے، ایک یہ تھا کہ اللہ پاک نے جوہرِ انسان کو پہلے تو مٹی سے پیدا کیا، کیوں کہ اصل آدم علیہ السلام ہیں اور وہ خالص مٹی سے بنے۔ دوسرا طور یہ ہے کہ اُن کی اولاد کو مٹی اور منی سے بنایا۔

اب تیسرا طور ذکر کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً ﴾ یعنی ہم نے نطفے کو اس طرح سے

[1] رقم الآیۃ (٥)

علقہ کر دیا کہ ہم نے سفید نطفے کو جمے ہوئے خون کی حالت کی طرف پھیر دیا۔ پھر چوتھا طور ذکر فرمایا: ﴿ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً ﴾ یعنی پھر ہم نے خونِ بستہ کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا، جس کی کوئی شکل نہ ہو۔ پھر پانچواں طور بیان فرمایا: ﴿ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا ﴾ یعنی پھر ہم نے گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیاں بنا دیا، اس طریقے سے کہ وہ بدن کی عمود ہو جائیں اور حسبِ موقع ومحل اُن کی خاص خاص شکلیں ہوں، کوئی چھوٹی، کوئی بڑی، کوئی سیدھی، کوئی ٹیڑھی، کوئی باریک، کوئی موٹی اور کوئی زیادہ سخت، کوئی کم سخت۔ اب رہی یہ بات کہ وہ گوشت کا ٹکڑا سب کا سب ہڈیاں بن جاتا ہے یا اُن میں اکثر؟ تو ابو السعود رحمہ اللہ نے دونوں قول نقل کیے ہیں۔[1] پھر چھٹا طور بیان کیا ہے، فرمایا: ﴿ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ﴾ یعنی پھر ہم نے ہڈیوں کو گوشت پہنایا، یعنی اس کو اُن کے لباس کی طرح کر دیا۔ یہ گوشت جو ہڈیوں کو پہنایا یا تو وہ ہے جو مضغے سے باقی بچا تھا، وہ اُن کو پہنا دیا، یہ اس قول کی بنا پر کہا ہے کہ اکثر مضغہ ہڈیاں بن گیا اور کچھ بچ رہا، یا اللہ پاک نے ہر ہڈی پر اس کی مقدار کے لائق ومناسب اس مادے سے گوشت بنا دیا، یعنی اُگا دیا، جو اس کو پہنچتا رہتا ہے، دوسرے قول کی بنا پر کہ سارا مضغہ ہڈیاں بن گیا۔

تینوں جگہ پر "خَلَقْنَا" میں "جَعَلْنَا" (ہم نے کر دیا) بہ معنی "صَيَّرْنَا" شامل ہے، اسی لیے دو مفعول کی طرف متعدی ہوا ہے۔ جس طرح کہ ﴿ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ میں "جعل" میں "خَلَقَ" کے معنی شامل ہیں تو ایک مفعول کی طرف متعدی ہوا۔ ابن عامر وابو بکر رحمہما اللہ نے دونوں جگہ "عَظْمًا" بصیغۂ مفرد پڑھا ہے،[2] اس لحاظ سے کہ "عَظْمٌ" اسمِ جنس جمع سے کافی ہو جاتا ہے۔ یا مفرد کو جمع کی جگہ اس لیے رکھا ہے کہ التباس نہیں ہے، کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ انسان میں بہت سی ہڈیاں ہوتی ہیں۔ کسی نے ایک کو مفرد اور دوسری کو جمع پڑھا ہے۔ چوں کہ مختلف ہڈیوں میں کسی میں سختی ہے، کسی میں نرمی اور اُن کی شکلیں بھی جدا جدا ہیں، اس لیے یہ بتانے کے لیے عامہ نے دونوں جگہ ﴿ عِظٰمًا ﴾ بلفظِ جمع پڑھا ہے، اس کے باوجود کہ کلمۂ "عظم" اسمِ جنس ہونے کی وجہ سے جمع ہونے سے بے نیاز ہے۔

پھر ساتواں طور بیان فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ﴾ اس میں ضمیر انسان کی طرف راجع ہے یا مذکور کی طرف، یعنی پھر ہم نے اس کو ایک اور پیدایش میں اٹھا کھڑا کیا کہ وہ پہلی خلق سے بالکل مختلف ہے، اس لیے کہ اس کو حیوان کر دیا، حالاں کہ وہ جماد تھا، اس کو بولنے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا، حالاں کہ پہلے وہ ان صفتوں کی ضد تھا۔ اسی لیے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص انڈا غصب کرے، پھر اس کے پاس وہ انڈا بچہ بن جائے تو وہ انڈے کا ضامن ہوگا اور چوزہ واپس نہ کرے گا، کیوں کہ وہ انڈے سے مختلف ایک اور خلق ہے۔[3] (قاله النسفي)

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ١٢٦) [2] تفسير البغوي (٥/ ٤١٢) [3] تفسير النسفي (٣/ ١١٨)

''خَلْقِ آخَرَ'' کی تفسیر میں کئی قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مراد روح کا پھونکنا ہے، یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بہت سے لوگوں کا ہے،[1] چناں چہ اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کسی نے کہا: بال اُگنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دانت نکلنا ہے۔ بال اور دانتوں کے بارے میں قول امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے بال اُگنے کو قتادہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے اور دانت نکلنے اور بال اُگنے کو امام ضحاک رحمہ اللہ کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا دنیا کی طرف نکلنا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ٹھہرایا ہے۔[2]

امام عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: ''حِينَ اسْتَوَى بِهِ الشَّبَابُ''[3] یعنی جب وہ پورا جوان ہوگیا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ''كَمَالُ شَبَابِهِ'' اور کہا ہے کہ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ان قوتوں کا کامل کرنا ہے، جو اس میں پیدا کی گئی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ایر پھیر کرنا ہے اس کی مختلف حالتوں کا ولادت کے بعد آواز کرنے سے دودھ پینے تک، بیٹھنے کھڑے ہونے تک، دودھ چھڑانے تک، یہاں تک کہ کھانے پینے لگے، یہاں تک کہ بلوغت کو پہنچے، شہروں میں چلے پھرے، اس کے بعد تک۔ امام خازن رحمہ اللہ نے اس کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔[5] واللہ أعلم.

امام قرطبی رحمہ اللہ نے چند قول لکھ کر پھر کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ عام ہے اس میں اور اس کے علاوہ بول چال اور ادراک اور حسنِ محاولہ (شاید معنی حسنِ تقریر و خوبیِ گفتگو ہو۔ واللہ أعلم) اور تحصیلِ معقولات میں یہاں تک کہ مرجائے۔[6] امام کرخی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے: یعنی ہم نے نطفے کو اس کی صفات سے ایسی صفت کی طرف منتقل کر دیا کہ واصفوں کا وصف اس کا احاطہ نہیں کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ بیان کرنے والوں کے بیان سے اس کا بیان باہر ہے، وہ کیسے باہر نہ ہو، کہاں رب العباد کی صنعت کاری اور کہاں آدمِ خاکی کا بیان۔ واقع میں یہ قول اسی لائق ہے کہ سب قولوں کا مسک الختام ہو۔

اسی لیے جناب توفیق غفر اللہ لہ (نواب صاحب رحمہ اللہ) نے فتح البیان میں سب کے بعد اسی کو تحریر فرمایا ہے: ''لِلّٰهِ دَرُّهُ وَعَلَى اللّٰهِ أَجْرُهُ''[7] فی الحقیقت اللہ پاک نے انسان ضعیف البنیان میں جو عجیب وغریب چیزیں امانت رکھی ہیں کسی کی کیا طاقت کہ ان کو بیان کر سکے اور اپنے خاص بندوں کو صرف اپنے فضل وکرم سے اپنے قرب کی جو راہیں بتائی ہیں، وہ بیان سے باہر ہیں۔ کسی نے ''أَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوبُهُمْ'' کے مضمون کو کیا خوب ادا کیا ہے: ؎

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٧) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ١١٠) [3] تفسير الطبري (١٩/ ١٨)

[4] تفسير القرطبي (١٢/ ١١٠) [5] تفسير الخازن (٥/ ٣٣_ ٣٤)

[6] تفسير القرطبي (١٢/ ١١٠) [7] فتح البيان (٩/ ١٠٣)

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل ہے یہ کہ جہاں تو سما سکے

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ لَدَيْكَ وَالْوَاصِلِيْنَ إِلَيْكَ.

نکتہ:

اللہ پاک نے اس آیتِ کریمہ میں پہلے دو جگہ ﴿ ثُمَّ ﴾ سے عطف کیا، پھر تین جگہ حرفِ فا سے، پھر ایک جگہ ﴿ ثُمَّ ﴾ سے، پھر دو جگہ ﴿ ثُمَّ ﴾ سے عطف فرمایا، لہٰذا حروفِ عاطفہ کا یہ اختلاف مختلف حالتوں کے سبب سے ہے، یعنی بعض حالت کا حصول اپنے ماقبل سے بعید ہے، یہ وہی ہے جس کا عطف ﴿ ثُمَّ ﴾ سے کیا ہے۔ جو استبعاد عقلاً یا رتبۃً ہے اس کو بہ منزلۂ تراخی اور بُعد حسی کے ٹھہرایا ہے، اس لیے کہ زمینی اجزا سے نطفے کا حاصل ہونا نہایت عجیب و غریب ہے، اسی طرح سفید نطفے کا سرخ خون کر دینا بھی انتہائی عجیب بات ہے، بہ خلاف اس کے کہ خون کو گوشت کر دینا، حالاں کہ وہ خون کے مشابہ ہے رنگ و صورت میں۔ اسی طرح مضغے کو اتنا سخت کر دینا کہ ہڈی ہو جائے، کیوں کہ ان صورتوں میں جن کا مشاہدہ ہوتا ہے، یہ کبھی دیر میں حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح مضغے کے گوشت کو ہڈی پر اس طرح پھیلا دینا کہ اس کو چھپا دے۔ اس تقریر کی بنیاد پر وہ بات ساقط ہوگئی، جو کسی نے کہی تھی کہ حدیث شریف میں جو ہر حالت کی مدت چالیس دن وارد ہوئی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ سب کا عطف ﴿ ثُمَّ ﴾ سے ہو اگر آخر و اوّل مدت کی طرف نظر کی جائے، یا اس کو مقتضی ہے کہ سب کا عطف حرفِ فا سے ہو اگر صرف آخر مدت کی طرف نظر کریں۔ یہ شہاب رحمہ اللہ کے قول کا حاصل ہے مع تقدیم و تاخیر کے۔[1] یہ بیان تو پہلے کے پانچ جملوں کا تھا۔

رہا ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ ﴾ تو اس کا عطف ﴿ ثُمَّ ﴾ سے دو پیدائشوں کے درمیان فرق کے سبب سے ہے جیسا کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ایک خلق تو یہاں تک ہوئی کہ ہڈیوں پر گوشت پہنا دیا۔ پھر دوسری خلق یہ ہوئی کہ اس میں روح پھونکی، چونکہ ان دونوں کے درمیان تفاوت ہے، اس لیے عطف ﴿ ثُمَّ ﴾ سے کیا۔ واللہ أعلم.

﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ ﴾ یعنی اللہ پاک تعظیم و تعریف کا مستحق ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ برکت سے ماخوذ ہے، یعنی اس کی خیر و برکت کثیر ہوئی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی قدرت و حکمت میں اس کی شان بڑی ہے۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: بڑا ہے امر اس کا اپنی قدرت اور علم میں۔[3] ﴿ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ لغت میں خلق کے معنی تقدیر ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "خَلَقْتُ الْأَدِيْمَ" یعنی میں نے چمڑے کا اندازہ کیا۔ یہ اس وقت کہتے ہیں جب تو اس کا اندازہ کرے، تاکہ اس سے کوئی شے قطع کرے، گویا تقدیر بیونتنے کو کہتے ہیں، اسی کے بارے میں زہیر رحمہ اللہ کا قول ہے ؎

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ٣٢٢)

[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٩) [3] تفسير النسفي (٣/ ١١٨)

وَلَأَنتَ تَفْرِيْ مَا خَلَقْتَ وَبَعْـ ضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَا يَفْرِيْ

مطلب یہ ہے کہ تو جس کام کا اندازہ کرتا ہے تو اس کو کر ڈالتا ہے اور بعض لوگ اندازہ کرتے ہیں، پھر اس کو نہیں کرتے۔ اس بنیاد پر ﴿ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ کے معنی ہیں: ''أَتْقَنُ الصَّانِعِيْنَ الْمُقَدِّرِيْنَ'' یعنی اللہ پاک سب کاری گروں اور اندازہ کرنے والوں سے زیادہ پختہ کار ہے ظاہر میں، ورنہ فی الحقیقت وہ تو سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ ﴿ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ اللہ کے اسم مبارک کی صفت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا بدل ہو، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ مشتق کا بدل ہونا کم ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو، یعنی ''هو أحسن'' اصل عدمِ حذف ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے صفت ہونے کو منع کیا ہے، اس لیے کہ احسن نکرہ ہے، گو معرفہ کی طرف مضاف ہے، اس لیے کہ مضاف الیہ کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ کا عوض ہے۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی بدل یا خبر مبتدائے محذوف کہا ہے اور فرمایا ہے کہ صفت نہیں ہے۔[2] شاید امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے انہی کی تقلید کی ہے۔ اسی طرح سارے ''افعل مِنْ'' کے باب کا حال ہے۔ افعل تفضیل جب مضاف ہوتا ہے تو اس میں دو قول ہیں کہ آیا اضافت اس کی محضہ ہے یا نہیں۔ صحیح پہلا قول ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے جو منع کیا ہے، وہ اُن میں سے ایک قول کی بنا پر ہے۔ معتزلہ نے افعالِ عباد کے خلق ہونے پر اس آیت سے یوں استدلال کیا ہے کہ اگر اللہ پاک کا غیر کبھی خالق نہ ہوتا تو ﴿ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ کہنا جائز نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر اس کے بندوں میں کوئی حاکم اور راحم نہ ہوتا تو درست نہ ہوتا کہ اس کے حق میں احکم الحاکمین اور ارحم الراحمین کہا جاتا۔

امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے اُن کے جواب کی طرف اس طرح اشارہ کیا کہ خالقین مقدرین کے معنی میں ہے، کیوں کہ ﴿ خَلَقَ ﴾ تقدیر کے معنی میں آتا ہے،[3] چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ آیت اُن کے لیے اسی وقت حجت ہوتی، اگر تقدیر کے لفظ کے لازمی معنی ایجاد کرنا ہوتے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں: ''أَحْسَنُهُمْ خَلْقًا وَّتَقْدِيْرًا'' یعنی اندازہ کرنے کی راہ سے سب سے بہتر ہے۔ چوں کہ خالقین ممیز پر دال ہے، اسی لیے اس کو حذف کر دیا ہے، جس طرح کہ ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ ﴾ [الحج: ۳۹] ''جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے، انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے'' میں ''ماذون فيه'' یعنی قتال کو محذوف کیا ہے، اس لیے کہ ''يُقَاتَلُوْنَ'' اس پر دال ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نبی اکرم ﷺ کے واسطے وحی لکھا کرتے تھے، لہٰذا اس سے پہلے کہ آپ اس کو املا کرائیں، اس نے ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ بول دیا، اس پر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ لکھ اسی طرح اتری ہے۔ عبداللہ بولا کہ اگر محمد ﷺ نبی ہیں، اُن کی طرف وحی کی جاتی ہے تو میں بھی نبی ہوں، میری طرف بھی وحی کی جاتی ہے، چنانچہ وہ مرتد ہو گیا، مکے والوں کے ساتھ جا کر مل گیا، پھر فتح مکہ کے دن

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٩) تفسير النسفي (٣/ ١١٨) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٥١) [3] تفسير النسفي (٣/ ١١٨)

اسلام لایا۔ کہا ہے کہ یہ حکایت صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا ارتداد مدینے میں ہوا ہے اور یہ سورت مکی ہے۔ کسی نے کہا: یہ کہنے والے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں یا معاذ رضی اللہ عنہ۔[1] غرض کہ اس قول کے قائل تین ہوئے۔ لہٰذا اُن میں سے عبداللہ کا یہ کہنا ٹھیک نہ ہوا، اسی طرح معاذ کا قائل ہونا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے، اب صرف سیدنا عمر رضی اللہ عنہ باقی رہے اور یہی ٹھیک ہے، کیسے نہ ہو، اُن کے خطاب کے علاوہ اور کس کا خطاب صحیح اور درست ہے۔

یہی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں کہ چار جگہ اللہ احکم الحاکمین اور رب الارباب کے موافق ہوئے، بعینہٖ ان کا قول اللہ پاک نے کتاب میں نازل فرمایا ہے۔ چوں کہ ان کا قول پہلے بیان ہو چکا ہے، اس کے دہرانے کی ضرورت نہ تھی، صرف حوالہ کافی تھا، لیکن اول کی روایت ناقص تھی، اس لیے مکمل فائدے کی خاطر پوری روایت یہاں لکھی جاتی ہے۔ دوسری: ”هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهُ يَتَضَوَّعُ“ تیسری: ”بِذِكْرِ الصَّالِحِيْنَ تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ“ جب صرف صالحین کے ذکر میں برکات کا نزول ہوتا ہے تو پھر سید الصالحین امام الصدیقین خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے دوسرے خلیفہ کے ذکر کا کیا کہنا ہے کہ کس قدر زیادہ برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہوں گی۔ ”اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا مِنْ بَرَكَاتِهِمُ الْحَظَّ الْأَوْفَرَ الَّذِي يَرْبُوْ عَلَى الْعَنْبَرِ وَالْمِسْكِ الْأَذْفَرِ، اَللّٰهُمَّ آمِيْنَ“ امام ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید اور ابن منذر رحمہم اللہ نے صالح ابو الخلیل سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ﴾ تک تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اے عمر! بے شک وہ آیت ان ہی الفاظ کے ساتھ ختم کی گئی، جو تم نے کہے۔[2]

امام طیالسی، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابن عساکر رحمہم اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اپنے رب کے ساتھ چار باتوں میں موافقت کی: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر ہم مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھتے (اصل الفاظ ”لَوْ صَلَّيْنَا خَلْفَ الْمَقَامِ“ ہیں۔ ”لَوْ“، تمنّی کے معنی میں یہاں اچھا معلوم ہوتا ہے، یعنی کاش، اسی واسطے جواب بھی مذکور نہیں ہے۔ شرطیہ بھی ہو سکتا ہے حذفِ جواب کی بنا پر، یعنی کیا اچھا ہوتا۔ واللہ أعلم)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ﴾ [البقرۃ: ۱۲۵] ”اور (حکم دیا کہ) تم مقامِ ابراہیم کو جائے نماز بناؤ“ اور میں نے عرض کیا کہ اگر آپ اپنی بیویوں پر پردہ مقرر کرتے، کیوں کہ آپ پر نیک اور بد داخل ہوتے ہیں۔ (اصل الفاظ ”لَوِ اتَّخَذْتَ“ ہے۔ ”اتخاذ“ بہ معنی گرفتن آتا ہے، یہاں ترجمہ بطورِ حاصل کے ہے)۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ

[1] تفسير النسفي (٣/ ١١٨)
[2] فتح القدير (٣/ ٦٥٣)

﴿ مَتَٰعًا فَسۡـَٔلُوهُنَّ مِن وَرَآءِ حِجَابٍ ﴾ [الأحزاب: ٥٣] ''اور جب تم ان (ازواجِ نبی) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔'' اور میں نے نبی اکرم ﷺ کی بیویوں سے کہا: البتہ تم باز رہو یا البتہ اُن کو تمھارے بدلے میں بہتر بیویاں عطا فرما دے گا۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ عَسَىٰ رَبُّهُۥٓ إِن طَلَّقَكُنَّ أَن يُبۡدِلَهُۥٓ أَزۡوَٰجًا خَيۡرًا مِّنكُنَّ مُسۡلِمَٰتٍ مُّؤۡمِنَٰتٍ قَٰنِتَٰتٍ تَٰٓئِبَٰتٍ عَٰبِدَٰتٍ سَٰٓئِحَٰتٍ ثَيِّبَٰتٍ وَأَبۡكَارًا ﴾ [التحريم: ٥] ''اگر وہ (نبی) تمھیں طلاق دے دے تو شاید اس کا رب اس کو تم سے بہتر بیویاں بدلے میں دے دے، مسلمان، مومن، فرمانبردار، توبہ کرنے والی، عبادت گزار، روزہ دار، شوہر دیدہ اور کنواری عورتیں۔'' اور جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا ٱلۡإِنسَٰنَ مِن سُلَٰلَةٍ مِّن طِينٍ ۝١٢ ثُمَّ جَعَلۡنَٰهُ نُطۡفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝١٣ ثُمَّ خَلَقۡنَا ٱلنُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا ٱلۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا ٱلۡمُضۡغَةَ عِظَٰمًا فَكَسَوۡنَا ٱلۡعِظَٰمَ لَحۡمًا ثُمَّ أَنشَأۡنَٰهُ خَلۡقًا ءَاخَرَ ﴾ تو خود میں نے کہا: ﴿ فَتَبَارَكَ ٱللَّهُ أَحۡسَنُ ٱلۡخَٰلِقِينَ ﴾[1]

پھر اللہ پاک نے آٹھواں مرحلہ ذکر فرمایا: ﴿ ثُمَّ إِنَّكُم بَعۡدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ﴾ یعنی تم ان مذکورہ اُمور کے بعد ضرور موت کی طرف منتقل ہونے والے ہو۔ ﴿ ذَٰلِكَ ﴾ کا اشارہ کسی ایسی محسوس شے کی طرف ہوتا ہے، جو دور ہو، حالاں کہ مذکورہ اُمور غیر محسوس اور قریب ہیں، لیکن چوں کہ مذکورہ اُمور انتہائی عجیب وغریب ہیں اور عالی رُتبہ اور فضل وکمال اور ممتاز ہونے میں بعید المنزلت تھے، اس لیے اُن کو محسوس اُمور کے قائم مقام رکھ کے، جو اسمِ اشارہ اُن کے لیے سمجھا جاتا تھا، اس سے اُن کی طرف اشارہ کیا۔ چوں کہ موت کی طرف جانا ایک لا محالہ اور ضروری امرِ ثابت ہے، اس لیے ''مَيِّتُوْنَ'' صیغہ صفتِ مشبہ کا فرمایا، جو ثبوت کے لیے ہے۔ اسم فاعل کا صیغہ ''مائتون'' نہ کہا، کیوں کہ وہ حدوث کے لیے ہے۔ کسی نے ''مَائِتُوْنَ'' بھی پڑھا ہے۔

پھر نواں مرحلہ بیان فرمایا: ﴿ ثُمَّ إِنَّكُمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ تُبۡعَثُونَ ﴾ یعنی پھر تم قیامت کے دن اپنی قبروں سے اُٹھائے جاؤ گے، محشر کی طرف اور وہاں تمھارا حساب اور جزا اور ثواب وعذاب ہوگا۔ غرض کہ یہ نو اطوار جن پر انسان لوٹا پوٹا کرتا ہے، یعنی منتقل ہوتا رہتا ہے، اُن پر اللہ کے سوا کوئی اور قدرت نہیں رکھتا تو یہ سب اللہ پاک کے وجود اور اس کی قدرت وعلم اور حکمت کے کمال ہونے پر دلیل ہیں۔ سُبۡحَانَهُ مَا أَعۡظَمَ شَأۡنَهُ وَأَبۡهَرَ سُلۡطَانَهُ۔ پھر اللہ پاک نے آسمانوں کی پیدایش سے اس پر استدلال کیا اور فرمایا:

---

[1] مسند الطيالسي (١/ ٩) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآىِٕقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾

اور بلاشبہ ہم نے تمھارے اوپر سات تہ بہ تہ آسمان پیدا کیے اور ہم (اپنی) مخلوق سے غافل نہیں ہیں ⑰

آسمانوں کی پیدائش سے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر دلیل:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کا ذکر کیا تو ساتوں آسمان کی پیدائش کا ذکر اس پر معطوف فرمایا۔ بہت دفعہ اللہ تعالیٰ انسان کی پیدائش کے ساتھ آسمان و زمین کی پیدائش کا ذکر فرماتا ہے، جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ﴾ [المؤمن: ٥٧] ''آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے کہیں زیادہ بڑا (کام) ہے۔'' اسی طرح سورۃ السجدۃ کے شروع میں ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ کو صبح کی نماز میں پڑھا کرتے تھے۔[1]

اس میں پہلے آسمانوں اور زمین کی پیدائش کا ذکر ہے، پھر انسان کو سلالۂ طین سے پیدا کرنے کا بیان ہے اور اس میں قیامت اور جزا وغیرہ کا ذکر ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَبْعَ طَرَآىِٕقَ ﴾ سے مراد ساتوں آسمان ہیں،[2] یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو (مخلوق) ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴾ [نوح: ١٥] ''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے سات آسمان تہ بہ تہ کیسے تخلیق کیے؟'' نیز فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴾ [الطلاق: ١٢] ''اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمینیں بھی ان (آسمانوں) کی مثل، ان کے درمیان اس کا حکم نازل ہوتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے اور بلاشبہ اللہ نے (اپنے) علم سے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔''

اسی طرح اس جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآىِٕقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴾ ''اور بلاشبہ ہم نے تمھارے اوپر سات تہ بہ تہ آسمان پیدا کیے اور ہم (اپنی) مخلوق سے غافل نہیں ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَي الْعَرْشِ ۭ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٠) [2] الدر المنثور (٦/ ٩٤)

يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾

[الحديد: ٤] ''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا۔ وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے، اور جو چیز آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ تمھارے ساتھ ہے۔ اور اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو۔''

اللہ پاک سے کوئی آسمان کسی آسمان کو نہیں چھپاتا اور نہ کوئی زمین کسی زمین کو اور نہ ہی کوئی پہاڑ مگر وہ جانتا ہے جو اس کی دشوار گزار جگہ میں ہے، نہ ہی کوئی دریا مگر وہ جانتا ہے جو اس کی تہہ میں ہے۔ جو کچھ پہاڑوں کے ٹیلوں میں، ریتوں میں، جنگلوں میں اور درختوں میں ہے، ان سب کی گنتی کو جانتا ہے اور فرمایا: ﴿ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (چھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

﴿ لَقَدْ ﴾ میں حرفِ لام قسم محذوف کا جواب ہے، یعنی واللہ! اور جملہ مبتدیہ ہے۔ چوں کہ اللہ پاک نے انسان کی پیدایش کے ابتدا اور انتہائے امر کو ذکر کیا تو اس کے بعد اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور جن چیزوں کی اس کو حاجت ہوتی ہے ان کی پیدایش کا بیان فرمایا۔ من جملہ اُن کے ایک عظیم الشان نعمت اور قدرت یہ ہے کہ اس نے سات آسمان پیدا کیے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فوق سے مراد بلندی کی سمت ہے، یعنی اوپر کی جانب مخاطبین کے لیے اوپر ہونے کے اعتبار کے بغیر، کیوں کہ اُن کے اوپر ہونے کی صورت جو انسانوں کو نظر آتی ہے تو وہ اُن کے پیدا ہونے کے بعد ہے، حالاں کہ آسمانوں کے پیدا کیے جانے کے وقت ہم لوگ تو ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے اور نہ وہ ہمارے اوپر تھے، بلکہ ہم تو بعد میں پیدا ہوئے ہیں۔ انتھٰی.

غور سے دیکھو تو اس باریکی کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ آسمانوں کی پیدایش کے وقت ہم موجود ہوں یا نہ ہوں اس سے کیا بحث، اللہ پاک تو خوب جانتا ہے کہ میں نے آسمان ایک ایسی مخلوق کے واسطے پیدا کیے، جس کو میں بعد میں پیدا کروں گا، آسمان اس کے اوپر ہوں گے۔ آیندہ کے اعتبار سے ﴿ فَوْقَكُمْ ﴾ فرما دیا۔ ﴿ طَرَآئِقَ ﴾ سے مراد آسمان ہیں۔ امام خلیل، فراء اور زجاج رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ آسمانوں کا نام طرائق اس لیے رکھا کہ بعض آسمان بعض کے اوپر رکھے گئے ہیں، مطارقۂ نعل کی طرح، یعنی ﴿ طَرَآئِقَ ﴾ جمع ہے ''طريقة'' کی، طریقہ مطروقہ کے معنی میں آتا ہے، یہ محاورۂ طرق النعل سے ماخوذ ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۲۲۔ ۳۲۳)

یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص جوتے کے بعض تہوں کو بعض کے اوپر رکھے، غرض کہ جس طرح جوتے کے تلے ایک دوسرے کے اوپر رکھے جاتے ہیں، اسی طرح ایک آسمان دوسرے آسمان پر ہے، اس لیے آسمانوں کو طرائق کہتے ہیں۔ امام ابوعبیدہ نے کہا: "طَارَقْتُ الشَّيْءَ" کے معنی یہ ہیں کہ میں نے بعض شے کو بعض کے اوپر کر دیا ہے، جس کے اوپر اسی کی مثل ہو تو عرب لوگ اس کو طریقہ بولتے ہیں۔[1] کسی نے کہا: آسمانوں کو طرائق اس لیے کہتے ہیں کہ وہ چڑھنے اُترنے اور اُڑنے کے لیے فرشتوں کے راستے ہیں۔[2] (قاله الرازي) کسی نے کہا ہے کہ اس واسطے کہ ستاروں کی راہیں ہیں، اُن میں ستاروں کے چلنے پھرنے کی جگہ ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے تینوں قول نقل کیے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اور محلی رحمہ اللہ نے دوسرا قول اختیار کیا ہے۔[3]

﴿ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴾ خلق میں الف اور لام عہدی ہے۔ مراد ساتوں آسمان ہیں اور خلق بہ معنی مخلوق ہے، یعنی ہم اُن کے کام کو مہمل چھوڑنے والے نہیں ہیں، بلکہ ان کو زوال اور اختلال سے محفوظ رکھتے ہیں اور ان کے کام کی تدبیر کرتے ہیں، یہاں تک کہ جو کمال ان کے لیے مقدر کیا گیا ہے، اس کی انتہا کو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے تقاضے کے تحت پہنچیں۔ غرض کہ پہلے تو اللہ پاک نے اپنی قدرت بیان کی کہ اس نے خود آسمانوں کو پیدا کیا، پھر اپنے کمال علم و حکمت کو بیان کیا۔ گویا یوں فرمایا کہ ہم نے تمھارے اوپر اُن کو پیدا کیا اور جو کچھ ہم اُن میں جاری کرتے ہیں، اس سے غافل نہیں ہیں، یا اُن کی حفاظت اور اُن کو روکے رکھنے سے غافل نہیں کہ وہ تم پر گر پڑیں۔

اکثر مفسرین رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ خلق سے مراد ساری مخلوق ہے، آدمی اور سارے جاندار۔ آسمانوں کی پیدائش میں جو حکمت ہے، اس کو بیان کرنا مقصود ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ ہم نے اُن کے اوپر جو آسمانوں کو پیدا کیا تو اس لیے کہ اُن کے واسطے رزق اور برکات کے دروازے کھولیں اور وہ اُن کے منافع سے بہرہ مند ہوں، چنانچہ ہم اُن سے غافل نہیں ہیں نہ اُن چیزوں سے غافل ہیں جو اُن کی درستی اور اصلاح کریں، بلکہ آسمانوں کو گرنے سے اور زمین والوں کو اُن پر آسمان گر پڑنے سے محفوظ رکھا ہے کہ کہیں اُن کو ہلاک نہ کر دیں اور زمین اُن کو لے کر ہل نہ جائے، یا کسی اور سبب سے ہلاک نہ ہو جائیں، من جملہ ان اسباب کے جو اُن کو بالکل ستیاناس کر ڈالیں۔

یا عدمِ غفلت کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے ان کو بغیر امر و نہی کے بے فائدہ نہیں چھوڑ رکھا، بلکہ اُن کو بہت سے اُمور کا حکم کیا ہے اور بہت سی باتوں سے ان کو روکا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم اُن کے اقوال، اعمال، افعال اور خیالات سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم سے کوئی شے مخفی نہیں رہتی۔ بالجملہ یہ استدلال کی دوسری قسم تھی، اللہ پاک کی وحدت اور قدرت پر۔ اب تیسری دلیل ذکر کی۔ چنانچہ فرمایا:

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٥٠) [2] تفسير الرازي (٢٣/ ٧٧)

[3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٠) تفسير النسفي (٣/ ١١٨) تفسير الجلالين (١/ ٤٤٦)

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ ۖۗ وَ اِنَّا عَلٰی
ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ
وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِیْهَا فَوَاكِهُ كَثِیْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾
وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَیْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ
لِّلْاٰكِلِیْنَ ﴿۲۰﴾

اور ہم نے آسمان سے ایک (خاص) اندازے سے پانی نازل کیا، پھر ہم نے اسے زمین میں ٹھہرایا، اور بلاشبہہ ہم اسے لے جانے پر بھی یقیناً قادر ہیں⑱ پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعے سے تمھارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگائے، ان میں تمھارے لیے بہت سے (لذیذ) پھل ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو⑲ اور وہ درخت (زیتون) جو طورِ سیناء میں پیدا ہوتا ہے، وہ کھانے والوں کے لیے تیل اور سالن لیے اُگتا ہے⑳

بارش کے ذریعے حاصل ہونے والی بے شمار نعمتیں:

آسمان سے پانی اُتارنے میں بندوں پر جو بے شمار اور لاتعداد نعمتیں ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کو یاد دلاتا ہے کہ غور سے دیکھو کہ اس نے اس میں تم پر کیا کیا انعام کیے ہیں۔ ﴿ بِقَدَرٍ ﴾ سے مراد حسبِ حاجت ہے، یعنی ضرورت کے مطابق پانی برسایا، نہ زیادہ کہ زمین اور آبادی کو نقصان دے اور نہ اتنا کم کہ کھیتوں اور پھلوں کے لیے کافی نہ ہو، بلکہ کھیتوں کو پلانے اور انسانوں کے پینے اور اس سے نفع لینے کے لیے اس کی جتنی ضرورت ہے اتنا ہی اُتارا، یہاں تک کہ جن کھیتوں کو بہت زیادہ پانی کی ضرورت ہے اور ان کا دِمنہ (دِمنہ کچرے کوڑے وغیرہ کو کہتے ہیں، جو سیلاب میں جمع ہو جاتا ہے، یا اُونٹ بکری اپنے بندھنے کی جگہ پیشاب و گوبر سے لد پد کر دیتی ہیں اور وہ کھاد کی طرح ہو جاتا ہے۔) ان پر پانی برسانے کا متحمل نہیں ہوتا تو اللہ پاک دوسرے شہروں سے پانی کو اُن کی طرف کھینچ لاتا ہے، جس طرح کہ مصر کی زمین میں ہے، ایسی زمین کو ارضِ جُرُز کہتے ہیں (یعنی ایسی زمین جس میں کوئی نبات نہ ہو) اس کی طرف آبِ نیل کو کھینچ لاتا ہے، اس کے ساتھ سرخ مٹی ہوتی ہے۔ بلادِ حبشہ میں بارشوں کے موسم میں وہاں سے وہ مٹی کھود لاتا ہے، پھر وہ پانی اس سرخ مٹی کو اُٹھائے ہوئے آتا ہے اور زمینِ مصر کو پلاتا ہے اور وہ مٹی اُن کی زمین پر جم جاتی ہے، تاکہ وہ اس میں زراعت کریں، کیوں کہ اُن کی زمین شور ہے، اس پر ریت غالب ہو جاتی ہے۔ فَسُبْحَانَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ الرَّحِيمُ الْغَفُوْرُ.

پانی کو تادیر قابلِ استعمال بنانے کے اسباب و ذرائع:

﴿ فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت پانی بادل سے اُترا تو ہم نے اس کو ایسا کر دیا کہ زمین میں ٹھہر جاتا ہے اور زمین میں اس کی قابلیت رکھ دی، وہ اس کو پی لیتی ہے، جو کچھ اس میں دانے اور گٹھلیاں ہوتی ہیں، وہ اس سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ ﴿ وَاِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم چاہتے کہ آسمان پانی نہ برسائے تو البتہ ہم ایسا کرتے۔ اور اگر ہم ایذا دینا چاہتے تو اس کو شور زمینوں اور جنگلوں کی طرف پھیر دیتے اور اگر ہم چاہتے کہ اس کو کھارا کر دیں کہ نہ اس کو پینے کے لیے استعمال کیا جا سکتا اور نہ کھیتی کے سیراب کرنے کے کام آتا تو البتہ ہم کرتے۔ اور اگر ہم چاہتے کہ اس کو ایسا کر دیں کہ زمین میں جذب نہ ہو، بلکہ روئے زمین پر دریا بن جائے تو البتہ ہم کرتے۔ اور اگر ہم چاہتے کہ زمین کی تہ میں وہاں تک نیچے چلا جائے کہ تم اس تک نہ پہنچ سکو، نہ اس سے نفع لے سکو تو البتہ ہم کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ خاص اپنے لطف و کرم سے تم پر بادل میں سے میٹھا پانی اُتارتا ہے، جو خوش گوار ہے، پیاس بجھاتا ہے، پھر اس کو زمین میں ٹھہرا دیتا ہے اور اس کو چشموں کی صورت میں زمین میں جاری کرتا ہے، پھر چشمے اور نہریں کھول دیتا ہے اور اس سے کھیتیوں اور پھلوں کو سیراب کرتا ہے اور اس سے تم اور تمھارے جانور پیتے ہیں اور اس سے نہاتے ہو اور پاک صاف ہوتے ہو۔ جب اس نے اس میں ایسے فوائد اور منافع رکھے ہیں تو اسی کے واسطے حمد ہے اور اسی کا احسان ہے۔

بارش کے پانی سے باغات پیدا کیے:

﴿ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ﴾ یعنی پھر ہم نے تمھارے لیے اس پانی سے جس کو ہم نے آسمان سے نازل کیا، خوبصورت، خوش نما باغ نکالے، جن کو دیکھنے سے جی خوش ہو اور وہ آنکھوں کو بھلے معلوم ہوں۔ ﴿ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان باغوں میں کھجوریں اور انگور ہیں۔ ان دونوں کا ذکر اس لیے کیا کہ حجاز والے ان سے محبت رکھتے تھے۔ کسی شے کے اور اس کی نظیر کے درمیان کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ اسی طرح ہر علاقے کے لوگوں کے لیے اللہ پاک کی نعمت سے ایسے میوے ہیں کہ اس کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ ﴿ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ ﴾ یعنی سارے میووں میں سے جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ﴾ [النحل: ۱۱] ”وہ اسی (پانی) سے تمھارے لیے کھیتی اُگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل۔“ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ گویا معطوف ہے ایک شے مقدر پر۔ تقدیر یہ ہے: ”تَنظُرُونَ إِلَى حُسْنِهِ وَنَضْجِهِ وَمِنْهُ تَأْكُلُونَ“ یعنی تم اس کے حسن اور پکنے کی طرف دیکھتے ہو اور اس میں سے کھاتے ہو۔

زیتون اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ ﴾ شجرہ سے مراد زیتونہ ہے اور طور پہاڑ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ پہاڑ کو طور اسی وقت کہیں گے، جب اس میں درخت ہوں، پھر اگر وہ درختوں سے خالی ہے تو اس کا نام جبل رکھیں گے، طور نہ کہیں گے۔ فاللّٰہ أعلم۔ طورِ سینا طورِ سینین ہے اور طورِ سینین وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کی تھیں اور اس کے آس پاس کے پہاڑ ہیں، جن میں زیتوں کے درخت ہوتے ہیں۔ ﴿ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ ﴾ بعض نے کہا ہے کہ حرفِ با زائد ہے۔ تقدیر اس کی "تُنبِتُ الدُّهْنَ" ہے، چناں چہ عرب کی بول چال میں بولتے ہیں: "أَلْقَى فُلَانٌ بِيَدِهِ أَيْ: يَدَهُ" یعنی فلاں نے اپنا ہاتھ ڈال دیا اور جو شخص فعل کی تضمین کرتا ہے (یعنی ﴿ تَنْبُتُ ﴾ میں "تَخْرُجُ وَتَأْتِيْ" کے معنی شامل ہیں تو اس بنا پر حرفِ با متعدی بنانے کے لیے ہوگا، اسی لیے ﴿ وَصِبْغٍ ﴾ کا عطف ﴿ بِالدُّهْنِ ﴾ پر کیا ہے، یعنی "تَخْرُجُ بِالدُّهْنِ وَبِصِبْغٍ" معنی یہ ہیں کہ تیل نکالتا ہے اور سالن)۔ چنانچہ اس کے قول کی بنیاد پر تقدیر یہ ہے: "تَخْرُجُ بِالدُّهْنِ" یا "تَأْتِيْ بِالدُّهْنِ" اور اسی لیے فرمایا ہے: ﴿ وَصِبْغٍ ﴾ یعنی سالن۔ یہ قول قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔

﴿ لِلْاٰكِلِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں وہ شے ہے جس سے نفع لیا جاتا ہے، یعنی تیل اور روٹی ڈبونا، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے ابو اسید مالک بن ربیعہ ساعدی انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: زیتوں کا تیل کھاؤ اور اس کو لگاؤ، اس لیے کہ وہ مبارک درخت میں سے ہے۔[1] امام عبد بن حمید رحمہ اللہ نے اپنی مسند و تفسیر میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ تم زیت کا سالن بناؤ اور اس کو لگاؤ، کیوں کہ وہ مبارک درخت سے نکلتا ہے۔[2] (رواه الترمذي و ابن ماجه من غير وجه عن عبد الرزاق، قال الترمذي: ولا يعرف إلا من حديثه وكان يضطرب فيه فربما ذكر فيه عمر وربما لم يذكره)

امام ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہما اللہ نے حدیث بیان کی، کہا کہ حدیث بیان کی ہم کو میرے باپ نے، کہا کہ ہم کو حدیث بیان کی سفیان بن عیینہ نے، کہا حدیث بیان کی مجھ کو صعب بن حکیم بن شریک بن نمیلہ نے عن ابیہ عن جدہ، کہا میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مہمان ہوا شبِ عاشورا میں تو انھوں نے مجھے اونٹ کی ٹھنڈی سری اور زیتوں کا تیل کھلایا اور فرمایا: یہ وہ زیت مبارک ہے، جس کا ذکر اللہ نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے۔[3] كذا قال الحافظ ابن كثير. اس سے پہلی آیتِ کریمہ میں اللہ پاک نے ذکر فرمایا تھا کہ ہم مخلوق

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٤٩٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٧٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣١٩)

[3] المعجم الكبير (١/ ٧٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٢٣_ ٣٢٤)

سے اور اس کی مصلحتوں سے غافل نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم خلق کی خوب خبر رکھتے ہیں، ان کے لیے معیشت کے اسباب مہیا کرتے ہیں۔ پھر اس پر دلیل بارش کے برسنے سے لی ہے اور اس سے جو نباتات میں اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ پاک نے اپنی خلق پر جن چیزوں کا انعام کیا ہے اور اس کا احسان رکھا ہے، اُن سب چیزوں میں سے آسمان سے پانی برسانا ہے۔ حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی قدرت، نعمت، برکت اور احسان ہے۔

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ﴾ مفسرین رحمہ اللہ نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ "سماء" سے کیا مراد ہے۔ اکثر مفسر تو اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد یہی مظلۂ خضراء ہے، یعنی یہی سبز قُبہ جو تمام جہاں پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ زمین کے سارے پانی اسی سے نازل ہوتے ہیں۔

اللہ پاک نے زمین کے منافع کو آسمان کے منافع سے ملایا ہے، باوجود اتنی دوری کے جو اُن کے درمیان ہے اور یہ بات بیان فرمائی کہ زمین و آسمان کا موجد اور مدبر تنہا وہی ہے۔ کتابِ عزیز وسنتِ مطہرہ کی تمام تر صراحتیں اور آثار اور احادیثِ صحیحہ اسی قول پر دال ہیں۔ دوسرے لوگ اس طرف گئے ہیں کہ سماء سے مراد بادل ہے۔ بادل کا نام سماء اس کے بلند ہونے کی وجہ سے رکھ دیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے آبی ذرات کو دریاؤں سے آسمان کی طرف چڑھایا، یہاں تک کہ وہ بخارات شیریں اور صاف ہوگئے۔ پھر اس پانی کو اتارا، تاکہ زمین کی تہہ میں پھیل جائے۔ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی أَعْلَمُ بِحَقِيقَةِ الْحَالِ.

جمل نے بحوالۂ خازن یوں لکھا ہے: "رَوَى الشَّيْخَانِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما... الخ" لیکن خازن کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ خازن نے اس حدیث کو بخاری ومسلم کی طرف منسوب نہیں کیا، بلکہ اول یوں کہا ہے: "وَصَحَّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: « سَيْحَانُ وَجَيْحَانُ وَالْفُرَاتُ وَالنِّيْلُ كُلٌّ مِنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ »"[1] (أخرجه مسلم) پھر یہ حدیث لکھی ہے اور بغوی رحمہ اللہ کی طرف اس کو منسوب کیا ہے، معلوم ہوا کہ جمل رحمہ اللہ سے سہو ہوا۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے ؎

دشنام خلق نہ دہم جز دعا جواب ابرم کہ تلخ گیرم و شیرین ثمر دہم

"میں لوگوں کی گالیوں کا سوائے دعا کے کوئی جواب نہیں دیتا، میں تو ایک بادل ہوں کہ کڑوا (پانی) اُٹھاتا ہوں اور میٹھا پھل (بارش) دیتا ہوں۔"

فتح البیان کا بیان:

"ماء" سے مراد "ماء مطر" ہے، یعنی بارش کا پانی، کیوں کہ زمین کی حیات اور جو کچھ جاندار وغیرہ زمین میں ہیں، اُن سب کی زندگی اسی بارش کے برکت والے دامن سے وابستہ ہے اور اسی پانی سے نہروں اور ندیوں کا پانی ہے، جو آسمان سے اترتا ہے اور چشموں اور کنوؤں کا پانی جو زمین کے اندر سے نکالا جاتا ہے، اس کی اصل بھی آسمان کے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٩) تفسير الخازن (٥/ ٣٤۔ ٣٥) تفسير البغوي (٥/ ٤١٣)

پانی سے ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں کہا ہے کہ ”ماء“ سے مراد میٹھا پانی ہے، ورنہ کڑوا پانی تو قحط کے باوجود زمین میں ثابت رہتا ہے اور قحط کے وقت میٹھا پانی کم ہوتا ہے۔ حدیثوں میں مروی ہے کہ آسمان اور زمین کی پیدایش سے پہلے پانی موجود تھا۔ پھر اللہ پاک نے اس پانی میں سے کچھ پانی تو آسمان میں رکھا اور کچھ زمین میں۔[1] انتہی۔

کسی نے کہا ہے کہ اس آیت میں ”ماء“ سے اللہ پاک کی مراد چار ندیاں ہیں: سیحان، جیحان، فرات اور نیل۔

فتح القدیر میں اس قول کو اور آبِ شیریں کے قول کو بے وجہ کہا ہے، کیوں کہ زمین میں جو بھی پانی ہے وہ آسمان سے آیا ہے۔[2] یہ مانا کہ خصوصیتِ سبب کے مقابلے میں عمومیتِ لفظ کا اعتبار ہے، لیکن جب کوئی حدیث خصوصیت کے بارے میں وارد ہو جائے، اگرچہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو، پھر بے وجہ ہونے کی کیا وجہ ہے۔ ہاں اگر تخصیص کے یہ معنی ہیں کہ وہی مراد ہے اور عمومیتِ لفظ مراد نہیں تو بے شک یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ آخری قول کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے جنت سے زمین کی طرف پانچ نہریں نازل کیں: سیحون یہ نہرِ ہند ہے اور جیحون یہ نہرِ بلخ ہے اور دجلہ وفرات یہ دونوں عراق کی نہریں ہیں اور نیل یہ مصر کی نہر ہے، اللہ نے اُن کو جنت کے چشموں میں سے ایک چشمے میں سے نازل کیا ہے، وہ چشمہ جنت کے درجات میں سے نیچے کے درجہ میں ہے، پہلے ان کو جبریل علیہ السلام کے دو پَروں پر اُتارا، پھر اُن کو پہاڑوں میں امانت رکھا اور زمین میں اُن کو جاری کیا اور اُن کو لوگوں کے لیے اُن کے ذرائع معاش میں منافع ٹھہرایا۔

یہ اللہ کا وہی قول ہے: ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ﴾ پھر جب یاجوج ماجوج کے نکلنے کا وقت ہوگا تو اللہ جبریل علیہ السلام کو بھیجے گا، پھر وہ زمین سے قرآن اور علم اور حجرِ اسود کو رکنِ بیت اللہ میں سے اور مقامِ ابراہیم کو اور موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو اس میں جو کچھ ہے، اس کے سمیت اور ان پانچوں نہروں کو اٹھا لے جائیں گے، یہ تمام چیزیں آسمان کی طرف اُٹھا کر لے جائیں گے، چنانچہ یہ وہ قول ہے اللہ تعالیٰ کا: ﴿ وَاِنَّا عَلٰي ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ پھر جس وقت یہ چیزیں زمین سے اُٹھا لی جائیں گی تو زمین والے دنیا وآخرت کی خیر سے محروم رہ جائیں گے۔[3] (أخرجه ابن مردوية والخطيب، قال السيوطي: بسند ضعيف، وقال البغوي: رواه الحسن بن سفيان بن عثمان بن سعيد بالإجازة عن سعيد بن سابق السكندري عن مسلمة بن علي عن مقاتل بن حيان عن عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنهما)

﴿ مِنَ السَّمَآءِ ﴾ کا حرف ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائیہ ہے ﴿ اَنْزَلْنَا ﴾ سے متعلق ہے۔ اصل ترکیب یوں تھی: ”أَنْزَلْنَا مَاءً مِّنَ السَّمَاءِ“، پس اعتنائے مقدم کے لیے اور موخر کا مشاق کرنے کے لیے جار مجرور کو صریح مفعول پر مقدم کر دیا۔ چوں کہ ﴿ سَبْعَ طَرَآئِقَ ﴾ میں ”سماء“ کا ذکر آ گیا ہے تو یوں چاہیے تھا کہ ”أَنْزَلْنَا مِنْهَا“، فرمایا

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٧٠) [2] فتح القدير (٣/ ٦٥٠)

[3] الدر المنثور (٦/ ٩٥) تفسير البغوي (٥/ ٤١٣) امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔

ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انزال (اتارنے) میں ﴿ سَبْعَ طَرَآئِقَ ﴾ کا عنوان معتبر نہیں ہے، بلکہ صرف ان کا بلند ہونا معتبر ہے، اس لیے ﴿ سَبْعَ طَرَآئِقَ ﴾ کی طرف ضمیر نہ پھیری اور صریحاً ﴿ مِنَ السَّمَآءِ ﴾ فرما دیا۔

﴿ بِقَدَرٍ ﴾ یا تو بہ معنی بتقدیر ہے: "أَيْ: إِنْزَالًا مُتَلَبِّسًا بِتَقْدِيْرٍ" اس صورت میں ﴿ بِقَدَرٍ ﴾ صفت ہو گا مفعول مطلق محذوف کا، جیسا کہ شیخ زادہ نے کہا ہے، یعنی ہم نے آسمان سے پانی اُتارا، ایسے کہ اس کے اندازے سے بہت زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے اور نقصان کم ہوتا ہے۔ یا ﴿ بِقَدَرٍ ﴾ بہ معنی مقدار ہے، اس صورت میں "ماء" کی صفت ہو گا، یعنی ایسا پانی جو اتنی مقدار میں ہو گا جو ان کی بہتری کے لیے ہو گا، جس کو ہم جان چکے ہیں۔

امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ بِقَدَرٍ ﴾ اگر تقدیر کے معنی میں ہو گا تو "ماء" کی صفت ٹھہرے گا یا حال ضمیر سے[1] (أَيْ أَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً كَائِناً بِتَقْدِيْرٍ، یا حال ہو گا ضمیر سے۔ ضمیر یہاں صرف "أَنْزَلْنَا" میں متکلم کی ہے، یعنی "أَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُتَلَبِّسِيْنَ بِتَقْدِيْرٍ" مطلب یہ ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی اتارا، حالاں کہ ہم متلبس تھے اندازہ کرنے کے ساتھ۔ غرض یہ ہے کہ اندازہ کر کے پانی برسایا نہ زیادہ نہ کم)۔ اور جب بہ معنی مقدار ہو گا تو ﴿ أَنْزَلْنَا ﴾ کا صلہ قرار پائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے متعلق ہو گا، یعنی اُتارا ہم نے آسمان سے پانی ایک مقدار کے ساتھ۔

یہ دونوں وجہیں معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہیں، لیکن محلی رحمہ اللہ کا کلام دوسری وجہ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے، کیوں کہ ان کا قول یہ ہے: "بِقَدَرٍ مِّنْ كِفَايَتِهِمْ"[2] حاصل یہ ہے کہ خلق کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے اور نقصان کو اس سے دور کرنے کے لیے اللہ پاک نے ایک اندازہ کر کے پانی نازل کیا ہے۔ یا اتنی مقدار میں کہ اس سے کھیتوں، پھلوں کی درستی ہو اور جو پینے کے لیے صحیح ہو، کیوں کہ اگر بہت زیادہ مقدار میں ہو تو اس سے یہ سب چیزیں برباد و ہلاک ہو جائیں۔ اسی جیسی یہ آیت ہے: ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ [الحجر: ۲۱] "اور ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہی ہیں، اور ہم ہر چیز معلوم مقدار ہی میں اُتارتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے پانی کو زمین میں ساکن مستقر ثابت کر دیا، بعض پانی کو اس کی پشت پر رکھا اور بعض کو اس کے شکم میں، جس طرح کہ تالابوں حوضوں وغیرہ میں پانی باقی رہ جاتا ہے، تا کہ ضرورت کے وقت اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں سے اس عظیم نعمت پر شکر طلب کیا اور فرمایا: ﴿ وَاِنَّا عَلٰي ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ یعنی جس طرح ہم اس کے نازل کرنے پر قادر ہیں، اسی طرح اس کے لے جانے پر بھی قدرت رکھتے ہیں، تم کو چاہیے کہ تم اس نعمت کو شکر سے مقید کرو، اگر بالفرض ہم اس کو لے جائیں تو تم سب کے سب جانوروں کے ساتھ پیاس کے مارے مر جاؤ۔ اس میں مخلوق کو ایک سخت جھڑکی ہے۔

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ٣٢٣) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٧)

﴿ ذَهَابٍ ﴾ بالفتح "ذَهَبَ" کا مصدر ہے اور ﴿ بِهٖ ﴾ میں حرف با تعدیت کے واسطے ہے، جس طرح کہ ہمزہ اس کے لیے آتا ہے۔ ﴿ عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ ﴾ متعلق ہے ﴿ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ سے۔ چاہیے تو یہ تھا وہ اس کے بعد ہوتا ہے، لیکن فاصلہ کی رعایت سے اسے پہلے رکھ دیا ہے۔ اب رہی بات کہ ﴿ ذَهَابٍ بِهٖ ﴾ اور "إذهابه" دونوں ہم معنی ہیں۔ "إذهابه" کیوں نہ فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ ذَهَابٍ ﴾ کی تنکیر میں "إِذْهَابٍ" کے بہت زیادہ طریقے ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور پانی کے دور کر دینے میں مبالغہ ہے، یہ تنکیر نہایت خوب موقع میں واقع ہوئی ہے، اسی لیے آیتِ باب کو اس آیتِ کریمہ سے زیادہ موثر ٹھہرایا ہے: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴾ [الملك: ٣٠] "کہہ دیجیے: بھلا بتاؤ تو! اگر تمھارا (کنوؤں کا) پانی گہرا ہو جائے تو تمھارے پاس نتھرا (جاری) پانی کون لائے گا؟" یعنی اس میں اس کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، کیوں کہ اس میں صرف پانی کا غائر ہونا، یعنی نیچے ہونا مذکور ہے اور اس میں پانی لے جانے کی بہت سی صورتیں ہیں، جتنی صورتیں متصور ہو سکتی ہیں، وہ سب شامل ہیں۔

معنی یہ ہیں کہ ہم اس کے اذہاب اور ازالہ پر قادر ہیں، اس طریقے سے کہ اس کو فاسد کر دیں، بگاڑ ڈالیں تو اس سے فائدہ نہ لیا جا سکے، یا اوپر کو چڑھا لے جائیں، یا ایسا گہرا کر دیں کہ اس کا نکالنا مشکل ہو۔ غرض کہ پانی فی نفسہٖ ایک نعمت ہے اور اس کے باوجود اور نعمتوں کے حاصل ہونے کا سبب ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے پہلے تو اس کے نازل کرنے اور باقی رکھنے کا احسان رکھا، پھر اس کے ذریعے سے طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، اُن کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ﴾ یعنی ہم نے اسی پانی سے تمھارے لیے دو مذکور قسموں کے باغ بنائے، یعنی کھجور اور انگور کے باغ۔ ان دونوں کو علاحدہ کر کے اس لیے ذکر کیا کہ اُن کے منافع بہت ہیں، کیوں کہ یہ کھانے اور سالن کے قائم مقام ہوتے ہیں اور خشک میوے ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا: اللہ پاک نے ان پر اس لیے اکتفا کیا ہے کہ طائف اور مدینہ منورہ وغیرہ میں موجود ہیں۔ حافظ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] کسی نے کہا: اس لیے کہ پھل کے لحاظ سے تمام درختوں سے افضل ہیں اور فائدے اور مزے اور لذت کے لحاظ سے سب سے اچھے ہیں۔

﴿ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ میں دونوں ضمیریں ﴿ جَنّٰتٍ ﴾ جنات کی طرف راجع ہیں۔ ضمیر ثانی مضاف ہونے کی وجہ سے "أَيْ: وَمِنْ ثِمَارِهَا وَزُرُوْعِهَا"، یعنی تمھارے لیے انھیں باغوں میں بہت سے میوے ہیں کہ تم اُن کو کھاتے ہو اور انھیں باغوں سے اُن کے پھلوں اور کھیتوں کو موسم گرما اور سرما میں بطورِ غذا کے کھاتے ہو۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دونوں ضمیریں نخیل واعناب کی طرف پھریں، مضاف ہونے کی وجہ سے: "أَيْ: فِيْ ثَمَرِهَا"، یعنی تمھارے واسطے کھجور اور انگور کے پھلوں میں کئی قسم کے میوے ہیں، جو رنگ اور مزے میں مختلف ہیں۔ تر و تازہ پکی

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢١)

کھجور اور تر و تازہ انگور کے دانے اور خشک کھجور اور خشک انگور، یعنی منقی اور عصیر، یعنی افشرۂ انگور اور دِبس یعنی افشرۂ خرما، اس کے سوا اور چیزیں جو اُن سے بنتی ہیں اور طعام جس کو تم کھاتے ہو۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تمھارے لیے ان باغوں میں کھجور اور انگور کے سوا اور بھی میوے ہیں۔

کسی نے کہا: ﴿ تَأْكُلُوْنَ ﴾ کے معنی "تَرْتَزِقُوْنَ وَتَحْصُلُوْنَ مَعَايِشَكُمْ" ہیں، یعنی تم ان باغوں سے اپنی روزی و معیشت حاصل کرتے ہو۔ یہ معنی اس محاورے سے ماخوذ ہیں کہ "فُلَانٌ يَّأْكُلُ مِنْ حِرْفَتِهِ" کہ فلاں شخص اپنے پیشے سے کھاتا ہے، یعنی اس سے اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ اس قول کو فتح القدیر اور فتح البیان میں بعید کہا ہے۔[1] "أکل" کے حقیقی معنی کھانے کی شے کا نگلنا اور اس سے غذا لینا ہے اور کبھی "أکل" کا اطلاق اس شے کو حاصل کرنے پر ہوتا ہے، جس سے آدمی اپنی گزران کرتا ہے، یعنی کھانا پینا پہننا وغیرہ ضروریات جن کی زندگی بسر کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے، یہ اطلاق مجاز مرسل کے طور سے ہے۔ "بِطَرِيْقِ التَّعْبِيْرِ عَنِ الشَّيْءِ بِاسْمِ مُعْظَمِ مَا يُقْصَدُ مِنْهُ" یعنی روزی کھانے سے بہت سی چیزیں مقصود ہوتی ہیں، چوں کہ "أَکل" ان میں سے بڑی شے ہے، اس لیے روزی کمانے کا نام "أکل" رکھ دیا۔ فقہاء نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ لفظ "فاکھه" کا اطلاق کس شے پر کیا جاتا ہے۔ سب سے بہتر جو اس بارے میں کہا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ "فاکھه" کا اطلاق ان میووں پر ہوتا ہے، جن کو لوگ کھاتے ہیں اور وہ اُن کی قُوت نہیں ہیں نہ طعام اور نہ سالن۔ بُقول یعنی ترکاری میں اختلاف ہے، آیا "فاکھه" میں داخل ہے یا نہیں۔

﴿ وَشَجَرَةً ﴾ منصوب ہے اس بنا پر کہ ﴿ جَنّٰتٍ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی ہم نے اسی پانی سے ایک درخت ایجاد کیا۔ کسی نے برفع بھی پڑھا ہے، ابتدا ہونے کی بنا پر، یعنی یہ مبتدا موخر ہوگا اور خبر مقدم محذوف ہوگی۔ "أَيْ: وَمِمَّا أُنْشِئَ لَكُمْ بِهِ شَجَرَةٌ" یعنی ان چیزوں میں سے جو تمھارے لیے اس پانی سے پیدا کی گئیں ایک درخت ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے رفع کو اس تقدیر پر جائز رکھا ہے: "وَثَمَّ شَجَرَةٌ" یعنی شجرہ مبتدائے موخر ہے اور ظرف مذکور خبر مقدم محذوف۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: سارے مفسر کہتے ہیں کہ اس درخت سے زیتون کا درخت مراد ہے۔ خاص طور پر اس کا ذکر اس لیے کیا کہ اس کو پانی دینے کی خبر گیری کوئی نہیں کرتا اور اسی سے تیل نکلتا ہے۔[2] (یہ حصر ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ زیتوں کے علاوہ اور درختوں سے بھی تیل نکلتا ہے۔ شاید مراد یہ ہو کہ اس ملک میں اسی سے نکلتا ہو۔ واللہ أعلم)۔

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد سب سے پہلے یہی درخت اُگا ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیتون کا درخت زمین میں بہت معمر ہوتا ہے۔ یہ قول جمل میں امام حفناوی رحمہ اللہ کا لکھا ہے، لیکن تفسیر خازن

---

(1) فتح القدیر (٣/ ٦٥٠) فتح البیان (٩/ ١٠٨) (2) فتح القدیر (٣/ ٦٥١)

میں بھی ہے۔ بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ اس کی عمر تین ہزار برس کی ہو جاتی ہے۔[1] چوں کہ مذکورہ وجوہ کی بنا پر یہ درخت تمام درختوں میں زیادہ کرم والا، نفع بخش، عام اور زیادہ برکت والا تھا اس لیے اللہ پاک نے اپنے بندوں پر احسان رکھنے کے لیے اس کا خاص کر ذکر فرمایا۔

پھر اللہ پاک نے اس کے پیدا ہونے کی جگہ بیان کی کہ ﴿ تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ ﴾ یعنی وہ درخت طورِ سینا سے نکلتا ہے۔ زیتون اور جگہ میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ پھر طورِ سینا کی کیا خصوصیت ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل اس کی طور سینا سے ہی ہے۔ پھر وہاں سے اور جگہ منتقل کیا گیا۔ زکریا نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ طورِ سینا ایک پہاڑ ہے، جو بیت المقدس میں ہے۔ کلامِ عرب میں طور پہاڑ کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ حسن کے معنی میں ہے، جو نبطی زبان میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حبشی زبان میں۔ کسی نے کہا ہے کہ سریانی زبان میں اور اس کے معنی ہیں کہ درختوں میں لپٹا ہوا پہاڑ۔ کسی نے کہا ہے کہ جس پہاڑ میں میوہ دار درخت ہوں، اس کا نام سینا اور سینین ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''سینا'' ''سنا'' سے ماخوذ ہے۔ ''سنا'' ارتفاع کو کہتے ہیں یعنی بلند پہاڑ۔ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ پہاڑ کا نام ہے، جس طرح جبلِ اُحد کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ فلسطین کا پہاڑ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ پہاڑ ہے جس سے موسیٰ علیہ السلام کو نداء ہوئی تھی، مصر و اَیلہ کے درمیان۔ کسی نے کہا: اس مکان کا نام ہے جس میں یہ پہاڑ ہے۔ کسی نے کہا: سینا ایک معین پتھر یا معین پتھروں کا نام ہے۔ پہاڑ کی اضافت اُن کی طرف اس لیے کر دی گئی ہے کہ وہ اس میں موجود ہیں۔ یہ سب اقوال خازن میں اور فتح البیان میں اور بعض فتح القدیر میں موجود ہیں۔[2]

کوفیوں یعنی عاصم، حمزہ، کسائی، ابن عامر اور یعقوب رحمہم اللہ نے سیناء بفتحِ سین مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قاریوں کی قراءت بکسرِ سین مد کے ساتھ ہے، یعنی نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہم اللہ۔ غیر منصرف اس لیے ہوا ہے کہ بقعہ کا نام قرار دیا گیا ہے، چنانچہ دو سبب ہو گئے: ایک تو علمیت دوسرا تانیث۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: عجمی ہے۔ اب بھی دو سبب ہو گئے: ایک عجمہ اور دوسرا علمیت۔[3]

امام جمل رحمہ اللہ نے بتصرف سمین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ سینا کا غیر منصرف ہونا علمیت اور تانیث کے سبب سے ہے۔ کسر کی قراءت کی بنا پر اس لیے ہے کہ اس میں ہمزہ تانیث کا نہیں ہے، بلکہ قرطاس کے ساتھ ملحق کرنے کے واسطے ہے تو اس صورت میں اس کا ہمزہ حرفِ یا سے یا حرفِ واو سے منقلب (تبدیل) ہوگا۔ پھر جب اس میں الف زائدہ کے بعد حرفِ علت واقع ہوا تو ہمزہ قلب کیا گیا، جیسے: ''رِدَاء و کِسَاء''۔ اب منع صرف اس کا تعریف اور تانیث کے سبب سے ہوا، کیوں کہ سینا بقعہ کا علم ہے۔ کسی نے کہا: تعریف و عجمہ کے سبب سے۔ صحیح یہ ہے کہ ﴿ سَيْنَآءَ ﴾

---

[1] تفسیر الخازن (٥/ ٣٥۔ ٣٦) [2] تفسیر الخازن (٥/ ٣٥) فتح البیان (٩/ ١٠٨۔ ١٠٩) فتح القدیر (٣/ ٦٥١)

[3] فتح القدیر (٣/ ٦٥١)

اسم عجمی ہے۔ عرب لوگ اس کو بولے تو اُن کے لغت اس میں مختلف ہو گئے۔ پس کہا: ﴿ سَيْنَآءَ ﴾ بروزن حمراء اور "سِيْنَاءَ" بروزن عِلباء اور سینین بروزن قندیل ہے۔

رہا اس کا غیر منصرف ہونا قراءتِ فتح کی بنیاد پر تو بسببِ تعریف و تانیث کے ہے، بنظرِ بقعہ کے اور وہ اس صورت میں علم ہوگا پہاڑ کا مرکب مضاف و مضاف الیہ سے، جیسے: "امرئ القیس" پس جس شخص نے اس کو غیر منصرف کیا، اس کے باوجود کہ علم کا جزء ہے تو اس نے اس طرف نظر کی کہ اس کے ساتھ علم کا معاملہ کیا جاتا ہے اور اب الف اس کا تانیث کے لیے نہ ہوگا، بلکہ واو سے تبدیل ہوگا اور حرفِ یا اس کا زائدہ ہوگا اور اس کا وزن فیعال ٹھہرے گا۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے "سِيْنَاءَ" بکسر و قصر پڑھا ہے۔ ﴿ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ ﴾ جمہور کی قراءت بفتح مثناۃ فوقانیہ وضم بائے موحدہ ہے ثلاثی مجرد سے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے بضم مثناۃ فوقانی و کسر بائے موحدہ پڑھا ہے ثلاثی مزید سے۔[1]

پہلی قراءت کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ وہ زیتوں کا درخت فی نفسہٖ اُگتا ہے، درآں حالیکہ اس کے اندر تیل ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ تیل کو لیے ہوئے اُگتا ہے۔ اس صورت میں ﴿ بِالدُّهْنِ ﴾ حال ہے ﴿ تَنْۢبُتُ ﴾ کے فاعل سے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حرفِ با تعدیت کے واسطے ہو، جس طرح کہ "ذَهَبْتُ بِزَيْدٍ" اور ﴿ بِالدُّهْنِ ﴾، ﴿ تَنْۢبُتُ ﴾ کا مفعول بہ غیر صریح ٹھہرے۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ وہ تیل کو اُگاتا ہے، لیکن چوں کہ اُگنا حقیقت میں درخت کی صفت ہے نہ کہ تیل کی اس لیے ﴿ تَنْۢبُتُ ﴾ کو بہ معنی "تَتَضَمَّنُهُ وَتَحْصُلُهُ" ٹھہرائیں گے، یعنی وہ درخت تیل کو اپنے ضمن میں لیتا ہے اور حاصل کرتا ہے۔ دوسری قراءت کی بنا پر ﴿ بِالدُّهْنِ ﴾، ﴿ تَنْۢبُتُ ﴾ کا مفعول ہوگا اور مفعول میں حرفِ با زائد ٹھہرے گا۔ جیسا کہ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ [البقرة: ١٩٥] "اور اپنے ہاتھ ہلاکت (کے کام) میں نہ ڈالو۔" امام ابو عبیدہ بھی قائل زیادت ہیں۔

ومثله قول الشاعر ؎

هُنَّ الْحَرَائِرُ لَا رَبَّاتُ أَحْمِرَةٍ سُوْدُ الْمَحَاجِرِ لَا يَقْرَأْنَ بِالسُّوَرِ

وقال آخر:

نَضْرِبُ بِالسَّيْفِ وَنَرْجُوْ بِالْفَرَجِ

"أَيْ: لَا يَقْرَأْنَ السُّوَرَ" "وَنَرْجُوْ الْفَرَجَ" یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا مفعول محذوف ہو اور ﴿ بِالدُّهْنِ ﴾ اس سے حال ٹھہرے: "أَيْ: تَنْبُتُ زَيْتُوْنُهَا مُتَلَبِّسًا بِالدُّهْنِ" یعنی زیتوں کا درخت زیتون کو اُگاتا ہے، دراں حالیکہ وہ زیتون تیل کے ساتھ متلبس (ملا ہوا) ہے۔ ابو علی فارسی نے کہا: تقدیر یہ ہے: "تُنْبِتُ جَنَاهَا وَمَعَهُ الدُّهْنُ" یعنی وہ اُگاتا ہے اپنے میوے کو اور اس کے ساتھ تیل ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: حرفِ با مصاحبت کے لیے ہے "مع"

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٤/ ١٨٩) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٧)

کے معنی میں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ قراءت "أَنْبَتَ" بمعنی "نَبَتَ" ہے۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نَبَتَ" اور "أَنْبَتَ" ایک ہی معنی میں ہیں۔ اصمعی "أَنْبَتَ" کا انکار کرتے ہیں، لیکن زہیر کا قول اُن کی تردید کرتا ہے: ؎

رَأَيْتَ ذَوِي الْحَاجَاتِ حَوْلَ بُيُوْتِهِمْ قَطِيْنًا لَهُمْ حَتَّى إِذَا أَنْبَتَ الْبَقْلُ

"رَأَيْتَ" صیغۂ خطاب ہے۔ "قَطِيْنٌ" جمع "قَاطِنٌ" ہے۔ مراد خادم اور اتباع ہیں۔ یعنی تو نے دیکھا کہ فقراء اور مساکین اُن کے گھروں کے گرد اپنی حاجات کو پورا کرنے کے لیے مقیم رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب روئیدگی اُگی اور ارزانی کا ظہور ہوا تو اُن کے گرد سے چلے جاتے ہیں۔ یہاں "أَنْبَتَ" بہ معنی "نَبَتَ" ہے۔ اس صورت میں بھی ﴿ بِالدُّهْنِ ﴾ حال ہوگا۔ امام زہری، حسن اور اعرج رحمہم اللہ نے "تُنْبَتُ" بضم مثناۃ فوقانی و فتحِ موحدہ بصیغۂ مجہول پڑھا ہے "أَنْبَتَهَا اللّٰهُ" سے ماخوذ۔ اور ﴿ بِالدُّهْنِ ﴾ حال ہے مفعول "مَا لَمْ يُسَمَّ" فاعلہ سے۔ "أَيْ: مُتَلَبِّسَةً الدُّهْنِ" یعنی وہ درخت اُگایا جاتا ہے، درآں حالیکہ دُھن کے ساتھ متلبس ہے۔ امام زجاج اور ابن جنی رحمہما اللہ نے کہا: "أَيْ: تَنْبُتُ وَمَعَهَا الدُّهْنُ"

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "تَخْرُجُ بِالدُّهْنِ" پڑھا ہے بصیغۂ مضارع "خَرَجَ"۔ کسی نے "تُخْرِجُ الدُّهْنَ" پڑھا ہے بصیغۂ مضارع "أَخْرَجَ" اور بحذفِ حرفِ با۔ زِرّ بن حبیش کی قراءت "تَنْبُتُ الدُّهْنُ" بحذفِ حرفِ جر ہے۔ (زر بن حبیش ابو مریم کوفی مخضرم ہیں۔ سیدنا عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم سے روایت رکھتے ہیں۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ اُن سے راوی ہیں۔ امام ابن معین رحمہ اللہ نے اُن کی توثیق کی ہے۔ ۸۲ھ ہجری میں وفات پائی۔ (قول میسور)) سلیمان بن عبدالملک اور اشہب رحمہما اللہ نے "تَنْبُتُ بِالدِّهَانِ" پڑھا ہے۔[1]

"دِهَانٌ" "دُهْنٌ" کی جمع ہے، جیسے: "رُمْحٌ" کی جمع "رِمَاحٌ" ہے۔ ایک قراءت میں "تُثْمِرُ بِالدُّهْنِ" ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: ہر ذی وَسم شے کے عصارے کو "دھن" کہتے ہیں۔ وسم چکنائی اور عصارہ ہر چیز کا نچوڑ۔ امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے "دُھن" کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا: "هُوَ الزَّيْتُ يُؤْكَلُ مِنْهُ وَيُدَّهَنُ بِهِ"[2] یعنی دہن سے مراد زیتون کا تیل ہے کہ اس سے کھاتے ہیں اور اس کو لگاتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴾ معطوف ہے دہن پر، اس کے اعراب پر جاری ہے، یہ عطف ہے ایک چیز کی دو صفتوں سے، ایک وصف کا دوسرے وصف پر، یعنی وہ درخت ایسی شے لے کر اُگتا ہے، جو اس کے تیل ہونے کے درمیان کہ اس کو لگائیں اور اس سے چراغ جلائیں اور اس کے سالن ہونے کے درمیان کہ اس میں روٹی ڈبو کر کھائی جائے، جمع کرنے والی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پتلی چیزوں کے سالن کو بطورِ استعارہ ﴿ صِبْغٍ ﴾ کہتے ہیں،

[1] فتح القدير (٣/ ٦٥١۔ ٦٥٢) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٢٤)

کیوں کہ جس وقت روٹی اس میں ڈبوئی جاتی ہے تو اس کے رنگ میں رنگین ہو جاتی ہے۔ اگر چہ اس سے مراد بھی وہی تیل ہے، لیکن چوں کہ یہ دونوں دو وصف ہیں، اس لیے دونوں کے مفہوموں کا تغایر (علاحدہ ہونا) دونوں کی ذاتوں کے تغایر کے قائم مقام کر کے ایک وصف کا دوسرے وصف پر عطف کر دیا۔ یہ امام شہاب رحمہ اللہ کا حاصل ہے۔[1]

قراءتِ شاذہ میں "صِبْغًا" بہ نصب پڑھا گیا ہے ﴿ بِالدُّهْنِ ﴾ کے موضع پر عطف کیا ہے۔[2] (قاله أبو البقاء)

جمہور کی قراءت ﴿ صِبْغٍ ﴾ بالکسر ہے۔ ایک قوم نے "صباغ" پڑھا ہے، جیسے کہ لبس ولباس ہے۔ ہر سالن جو سالن بنایا جائے، وہ "صبغ و صباغ" ہے۔ ﴿ صِبْغٍ ﴾ کی اصل وہ شے ہے، جس سے کپڑا رنگا جائے۔ سالن کو رنگ کے ساتھ اس لیے تشبیہ دی کہ روٹی سالن کے ساتھ ایسے ہو جاتی ہے، جیسے: رنگ سے کپڑا رنگین کیا جاتا ہے۔ اللہ پاک نے اس مبارک درخت میں ایسی شے رکھی ہے کہ اس کو بدن سے لگاتے ہیں اور اس سے چراغ جلاتے ہیں اور اس میں روٹی ڈبو کر کھاتے ہیں۔ غرض کہ جب اللہ پاک اپنے وجود و کمالِ علم و قدرت و حکمت پر پانی کے اُتارنے اور طرح طرح کی نباتات نکالنے سے استدلال کر چکا تو اب مختلف حیوانات سے بھی استدلال کیا، یہ استدلال کی چوتھی قسم ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور بلاشبہ تمھارے لیے چوپایوں میں ضرور (سامانِ) عبرت ہے، ہم تمھیں اس میں سے پلاتے ہیں جو ان کے پیٹوں میں (دودھ) ہے، اور تمھارے لیے ان میں کثیر منافع ہیں، اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو (21) اور ان (چوپایوں) پر اور کشتیوں پر تم سوار بھی کیے جاتے ہو (22)

چوپائے بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے اپنی مخلوق کے لیے چوپایوں میں جو منافع رکھے ہیں، ان کا ذکر فرماتا ہے۔ وہ منافع یہ ہیں کہ لوگ اُن کے دودھ پیتے ہیں۔ کون سا دودھ، جو خون اور گوبر کے درمیان سے صاف پاک خوش گوار نکلتا ہے اور اُن کے بچوں سے کھاتے ہیں، اُن کی پشم اور بالوں سے لباس پہنتے ہیں۔ اُن کی پشت پر سوار ہوتے ہیں۔ جو شہر ان سے دور دراز مسافت پر ہوتے ہیں، اُن کی طرف اُن پر بھاری بھاری بوجھ لاد کر لے جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ٣٢٥)

[2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٥٢)

رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [النحل: ۷] ''اور وہ تمھارے بوجھ اٹھا کر ان شہروں تک لے جاتے ہیں، جہاں تم جسمانی مشقت کے بغیر نہیں پہنچ پاتے تھے۔ بے شک تمھارا رب بڑا شفقت والا، بہت رحمت والا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۷۱۔ ۷۳] ''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جو چیزیں بنائیں، ان میں یقیناً ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے؟ پھر وہ ان کے مالک (بن گئے) ہیں۔ اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا، چناں چہ ان میں سے کچھ ان کی سواریاں ہیں، اور ان میں سے کچھ کو وہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لیے ان (چوپایوں) میں (اور بھی) فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں، کیا پھر وہ شکر نہیں کرتے؟''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ چوپائے بھی اللہ عزوجل کی نعمتوں میں سے ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احسان رکھا ہے۔ انعام کی تفسیر سورۃ النحل میں گزر چکی ہے۔ انعام یہی اونٹ گائے بکریاں ہیں۔ امام نیسابوری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ شاید اس جگہ انعام سے خاص اونٹ مراد ہیں، کیوں کہ عادت اسی طرح جاری ہے کہ سواری انھیں پر ہوتی ہے اور اس لیے کہ انعام کو فلک کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اونٹ سفائنِ برّ (خشکی کے سفینے) ہیں، جس طرح کشتیاں سفائنِ بحر ہیں، اسی طرح اونٹ خشکی کی کشتیاں ہیں، جیسا کہ ذوالرمہ نے کہا ہے: ع

سَفَائِنُ بَرٍّ تَحْتَ خَدِّيْ زِمَامُهَا

(فتح البیان وفتح القدیر میں بلفظِ جمع ہے۔ تفسیر بیضاوی ونسفی میں سفینہ بلفظِ مفرد ہے، اس سے مراد شاعر کی اونٹنی ہے)۔[2] شاعر اونٹوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ جنگل کی کشتیاں ہیں، ان کی مہار میرے رخسار کے نیچے ہے۔ اللہ پاک نے بیان فرمایا ہے کہ انعام میں عبرت اور نصیحت ہے، کیوں کہ یہ بھی ان اشیا میں سے ہیں جن کی پیدائش اور افعال سے اللہ کی قدرت کی عظمت پر استدلال کیا جاتا ہے۔ عبرت کے ساتھ خاص طور پر انعام کا ذکر کیا، نبات کا ذکر نہ کیا، اس لیے کہ انعام میں عبرت زیادہ ظاہر ہے۔[3] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[4]

پھر اللہ پاک نے ان نعمتوں کی تفصیل بیان کی، جو اُن چوپایوں میں موجود ہیں، اس عبرت کے بیان کرنے کے بعد جو اُن میں بندوں کے لیے ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا ﴾ ﴿ مَا ﴾ سے مراد دودھ ہیں یا مراد چارہ ہے، کیوں کہ دودھ اسی سے بنتا ہے۔ پہلے مطلب کی بنیاد پر حرفِ ''مِنْ'' تبعیض کا ہوگا اور دوسرے مطلب

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٢٤)
[2] فتح البيان (٩/ ١١٠) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥١) تفسير النسفي (٣/ ١١٩)
[3] فتح البيان (٩/ ١١٠)
[4] تفسير أبي السعود (٦/ ١٢٩)

کی بنا پر ابتدائیہ۔ دودھ کے فائدہ کی جتنی وجوہ ہیں، وہ سب کی سب ﴿مَا فِیْ بُطُوْنِهَا﴾ سے مراد ہیں۔ دودھ کا مطلب لینے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک کے حکم سے پیٹ میں بنتا ہے اور گوبر اور خون کے درمیان سے گزر کر خالص ہو کر اُن کے تھنوں میں جمع ہوتا ہے۔ پھر طہارت اور رنگ اور مزے کی طرف مستحیل ہو جاتا ہے، نہایت خوش رنگ، مزے دار اور خواہش کے موافق ہوتا ہے اور غذا بنتا ہے۔ گھاس اور چارہ جس کو چوپائے کھاتے ہیں، اس کا دودھ بن جانا اور ایسی لذیذ غذا اور نفیس مشروب کی طرف مستحیل ہو جانا، اس میں بڑی سے بڑی عبرت ہے عبرت لینے والوں کے لیے اور بہت بڑی نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے۔ پھر جو شخص اس سے اللہ پاک کی قدرت اور حکمت پر استدلال کرے تو اس کے لیے یہ دینی نعمتوں میں سے ہوگی اور جو کوئی اپنے معاش میں اس سے فائدہ اُٹھائے اس کے لیے یہ دنیوی نعمتوں میں سے ٹھہرے گی۔

نکتہ:

اس جگہ ﴿بُطُوْنِهَا﴾ بلفظِ جمع ذکر فرمایا، یعنی ضمیر مونث راجع طرف جمع کے، اس لیے کہ انعام کی طرف راجع ہے، اس سے مراد جمع ہے اور سورۃ النحل میں ﴿مِمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ﴾ [النحل: ٦٦] صیغۂ واحد سے فرمایا بہ نظر اس کے کہ انعام اسم مفرد ہے۔ زکریا نے متشابہ القرآن میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ کرمانی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ سورۃ النحل میں جو کچھ ہے، اس سے مراد اناث ہیں۔ تقدیر یہ ہے: "وَإِنَّ لَكُمْ فِي بَعْضِ الْأَنْعَامِ" اور وہ بعض اناث ہیں، اس لیے ضمیر مفرد مذکر لائے اور اس جگہ یعنی سورۃ المومنون میں اس سے مراد کل انعام ہیں۔ نر اور مادہ دونوں کو شامل ہیں، اس قول: ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ﴾ میں عطف کی دلیل سے، کیوں کہ یہ اناث کے لیے خاص نہیں اور یہ عطف سورۃ النحل میں مذکور نہیں ہے۔[1]

﴿نُسْقِيْكُمْ﴾ کو بفتح وضمِ نون پڑھا۔ ضمیر متکلم سے مراد اللہ پاک ہے۔ کسی نے "تُسْقِيْكُمْ" بتائے فوقیہ پڑھا ہے، اس لیے کہ ضمیر انعام کی طرف راجع ہے۔ غرض کہ اللہ پاک نے اعتبار کے چار وجوہ، یعنی عبرت حاصل کرنے کے چار وجوہ انعام میں ذکر فرمائے۔ چناں چہ اُن میں سے ایک وجہ تو مذکور ہو چکی۔ اب دوسری وجہ کا بیان کیا اور ان میں جو فوائد ہیں، اُن کا ذکر اجمالی طور پر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ﴾ یعنی تمھارے واسطے اُن کی پیٹھوں میں اور اولاد میں اور پشم میں اور بالوں میں درانحالیکہ وہ زندہ ہیں، بہت سے منافع ہیں۔ پھر تیسری وجہ ذکر کی اور ایک خاص فائدہ بیان فرمایا: ﴿وَمِنْهَا تَأْكُلُوْنَ﴾ یعنی اور بعض کو کھاتے ہو ذبح کرنے کے بعد۔ کھانے کے فائدے کو علاحدہ کرکے، اس لیے ذکر کیا کہ یہ ایک ایسا فائدہ ہے، جو کہ پہلے ذکر کیے فائدوں سے

[1] فتح البیان (۹/ ۱۱۰)

علاحدہ ہے، اس لحاظ سے کہ اُن کے ذبح کرنے کے بعد اُن کی ذات سے فائدہ اُٹھانا ہے پہلے فوائد کے برخلاف، کیوں کہ وہ اُن کی ذات سے الگ تھے، وہ خود زندہ موجود ہوتے اور اُن سے فائدہ لیا جاتا۔ دوسرے یہ کہ کھانے میں ان کے لیے ایک بہت بڑا فائدہ ہے۔

پھر چوتھی وجہ کا ذکر کیا: ﴿ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴾ ﴿ عَلَيْهَا ﴾ کی ضمیر انعام کی طرف راجع ہے۔ پھر اگر اس سے مراد اونٹ گائے اور بکریاں ہیں تو بعض انعام مراد ہوں گے، یعنی خاص کر اونٹ، اور اگر انعام سے مراد خاص اونٹ ہی لیے جائیں تو معنی واضح ہیں۔ امام محلی، خازن اور نسفی رحمہم اللہ نے اُونٹوں ہی کی طرف ضمیر پھیری ہے، کیوں کہ عادتاً سواری اونٹوں ہی پر ہوتی ہے اور اسی واسطے ان کو فلک کا ساتھی قرار دیا ہے، کیوں کہ فلک دریا کی کشتیاں ہیں اور اُونٹوں کو جنگل کی کشتیاں کہا ہے، جیسا کہ ذوالرمہ کے قول میں پہلے گزر چکا ہے۔[1]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ضمیر کو انعام کی طرف پھیرا ہے، اس لیے کہ آیت سے ظاہر یہی ہے۔ وجہ یہ ذکر کی ہے کہ اُن میں سے بعض پر سواری ہوتی ہے، جیسے: اونٹ اور گائے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض کے حال کی کل کی طرف نسبت کی ہے اور امام محلی رحمہ اللہ وغیرہ کے قول کو بلفظِ ''قیل'' ذکر کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ اس میں ضمیر ایسی ہوگی، جیسی کہ ﴿ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ ﴾ [البقرة: ٢٢٨] ''وہ زیادہ حق دار ہیں کہ انھیں اس (مدت) میں لوٹا لیں۔'' ہے۔[2]

یہ قول اس قول کے بعد ہے: ﴿ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ﴾ ''اور مطلقہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔'' جس طرح کہ ﴿ وَبُعُوْلَتُهُنَّ ﴾ کی ضمیر بعض مدلول مذکور کی طرف راجع ہے، کیوں کہ یہ ضمیر بعض مطلقات کی طرف پھرتی ہے، وہ بعض مطلقات وہ ہیں، جن کو طلاق رجعی دی ہے، لہٰذا اسی طرح ﴿ عَلَيْهَا ﴾ کی ضمیر ہے، جبکہ اس سے مراد خاص طور پر اونٹ ہوں۔

﴿ وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴾ کے ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ غالباً انعام پر جنگل میں سواری ہوتی ہے، چوں کہ خشکی کی سواری کا ذکر آ گیا تو اس کے ساتھ اس شے کا بھی ذکر کر دیا، جس پر دریا میں سواری ہوتی ہے۔ اس سے غرضِ نعمت کا پورا کرنا اور احسان کا کامل کرنا ہے۔ پھر جب اللہ پاک توحید کے دلائل بیان کر چکا تو اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کے قصے شروع کیے جس طرح کہ ساری سورتوں میں یہی طریقہ جاری ہے۔ کہتے ہیں کہ قصوں کو بار بار ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ جس قصے کو دوبارہ ذکر کیا ہے، اس میں ایسے الفاظ و فوائد اور نکتے ہوتے ہیں کہ وہ پہلے ذکر میں نہیں ہوتے اور اس کے دوبارہ بیان کرنے میں حجت کی تاکید اور نصیحت کی تجدید ہوتی ہے۔ یہاں جب کہ اللہ پاک نے کشتی کا ذکر کیا تو نوح علیہ السلام کے قصے سے ابتدا کی، کیوں کہ پہلے پہل کشتی انھوں نے ہی بنائی اور جو معاملہ

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٧) تفسير الخازن (٥/ ٣٦) تفسير النسفي (٣/ ١١٩) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٢)

اُن کے ساتھ قوم نے کیا اس کو بیان فرمایا، اس سبب سے کہ اللہ پاک کی مخلوقات میں تفکر کو چھوڑ دیا اور اُن پر جو انعام کیے تھے، اس کو یاد کرنے کو ترک کر دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۲۳ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓىِٕكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝۲۴ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۲۵

اور بلاشبہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں؟ (23) چناں چہ اس کی قوم کے سردار، جنھوں نے کفر کیا، کہنے لگے: یہ تو تم جیسا ہی بشر ہے، وہ چاہتا ہے کہ تم پر فضیلت پائے اور اگر اللہ چاہتا تو (آسمان سے) فرشتے ضرور نازل کرتا، ہم نے اپنے پہلے باپ دادا میں یہ (توحید) نہیں سنی (24) یہ ایک آدمی ہی تو ہے جسے جنون لاحق ہے، لہٰذا تم ایک وقت تک اس کی بابت انتظار کرو (25)

نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا قصہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نوح علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ جس وقت اُن کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، تا کہ انھیں اللہ کے عذاب سے اور اس کے سخت انتقام اور تکلیف سے ڈرائیں، یعنی جو کوئی اللہ پاک کے ساتھ شرک کرے گا، اس کے حکم کا خلاف کرے گا اور اُس کے رسولوں کو جھٹلائے گا تو اللہ ضرور اس سے انتقام لے گا، پس کہا: اے قوم! تم اللہ کو پوجو کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تم جو اس کے ساتھ شرک کرتے ہو تو تمھیں اس میں اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟! ملأ سے مراد قوم کے سردار اور اکابرین ہیں۔ ﴿ يَتَفَضَّلَ ﴾ کے معنی "يَتَرَفَّعُ وَيَتَعَاظَمُ" ہیں، یعنی وہ نبوت کا دعویٰ کر کے تم پر بڑائی کرتا ہے، حالاں کہ وہ تمھاری طرح ایک آدمی ہے۔ پھر اللہ نے اس کی طرف وحی کیوں کی اور تمھاری طرف نہ کی؟!

﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓىِٕكَةً ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس بات کا ارادہ کرتا کہ کسی کو نبی بھیجے تو

اپنے پاس سے کسی فرشتے کو بھیجتا اور وہ بشر نہ ہوتا۔ ﴿ بِهٰذَا ﴾ سے مراد بشر کی بعثت ہے۔ ﴿ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِیْنَ ﴾ سے مراد اُن کے اسلاف و اجداد ہیں، یعنی اُن کے بڑے جو پہلے زمانے میں گزر چکے ہیں۔ ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو زعم کرتا ہے کہ اللہ نے اس کو تمھاری طرف بھیجا ہے اور تم میں سے خاص طور پر اس کو وحی کے لیے چنا ہے تو وہ اس بات میں مجنون ہے۔ ﴿ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِیْنٍ ﴾ کا حاصل یہ ہے کہ تم اس کے لیے موت کا انتظار کرو اور ایک مدت تک اس پر صبر کرو، یہاں تک کہ اس سے راحت پاؤ۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ وَلَقَدْ ﴾ میں حرفِ واو استیناف کا ہے اور حرفِ لام قسم محذوف کا جواب ہے: "أَيْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ". اللہ پاک نے اس سورت میں پانچ قصے بیان فرمائے ہیں: پہلا قصہ تو نوح علیہ السلام کا ہے، جو شروع ہوا ہے۔ اس قصے کو پہلے بیان کرنے کی ایک وجہ تو تمہید میں گزر چکی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس قصے کو پہلے اس لیے رکھا کہ آدم علیہ السلام کے قصے سے متصل ہو جائے، جس کا ذکر ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ﴾ [المؤمنون: ١٢] ''اور بلاشبہہ ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ہے۔'' میں ہو چکا ہے، کیوں کہ نوح علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کے درمیان مناسبت ہے کہ نوح علیہ السلام آدمِ ثانی ہیں، اس لیے کہ آدم علیہ السلام کے بعد نوعِ انسانی کا انحصار نوح علیہ السلام کی نسل میں ہوا ہے۔ دوسرا قصہ ہود علیہ السلام کا ہے، اس کی ابتدا اس طرح ہے: ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ﴾ [المؤمنون: ٣١]۔ تیسرا قصہ یہ ہے: ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ ﴾ [المؤمنون: ٤٢] چوتھا قصہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ہے، جس کا شروع یہ ہے: ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴾ [المؤمنون: ٤٥]۔ پانچواں قصہ عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ شریفہ کا ہے، جس کا شروع یہ ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰیَةً وَّاٰوَیْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ ﴾ [المؤمنون: ٣١] ان قصوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اُن کی قوم کے سوا اور نبیوں کی قومیں بھی اپنے نبیوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتی تھیں، جو اُن کی قوم نے اُن کے ساتھ کیا ہے۔

غرض کہ نوح اُن کا لقب ہے اور امام رازی اور عبداللہ کے قول کی بنا پر ان کا اسمِ مبارک یشکر ہے، علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے قول کی بنا پر۔[2] وہ ایک ہزار پچاس برس زندہ رہے، کیوں کہ چالیس سال کی عمر میں تو رسول ہوئے، پچاس کم ہزار سال اپنی قوم کو دعوت کرتے رہے اور طوفان کے بعد ساٹھ برس زندہ رہے۔ اللہ پاک نے ان کو بھیجا، تاکہ انھیں اکیلے اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دیں۔ اسی لیے علامہ نسفی اور محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اُعْبُدُوا اللّٰهَ ﴾

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٢٤۔ ٣٢٥)
[2] تفسیر الرازي (٢٣/ ٨٠) فتح البیان (٩/ ١١١)

کے معنی ہیں "وَحِّدُوْهُ"[1] یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور اس کی توحید کرو، اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کرو، جیسا کہ آخری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

جملہ ﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ﴾ ماقبل کے لیے تعلیل کے طور پر واقع ہوا ہے۔ ﴿ غَيْرُهٗ ﴾ مرفوع ہے اس لیے کہ لفظ ﴿ اِلٰهٍ ﴾ کی صفت ہے محل کی بنا پر، کیوں کہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ﴿ لَكُمْ ﴾ ہے۔ یعنی کلمۂ ﴿ مَا ﴾ کی اسم وخبر ہیں اور حرفِ من زائد ہے۔ امام کسائی وغیرہ نے بجرِ الہ پڑھا ہے اتباعِ لفظ کی بنا پر۔[2] یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ اور جملہ استیناف ہے، امر بالعبادت کی تعلیل کے قائم مقام ہے، یعنی تم اکیلے اللہ پاک کو پوجو اس لیے کہ اس کے سوا تمھارے معبود کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

پھر جب نوح علیہ السلام نے قوم کو توحید کی طرف دعوت دی اور اُن کو اس دعوت نے کچھ نفع نہ دیا اور وہ غیر اللہ کی عبادت پر جمے رہے تو اُن کو یہ کہہ کر ڈرایا: ﴿ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ تاکہ جس شرک پر وہ جمے ہوئے ہیں اس سے پھر جائیں، یعنی پھر کیا تمھیں اس بات سے ڈر نہیں لگتا کہ تم اپنے اس رب کی عبادت کو چھوڑتے ہو، جس کے سوا نہ تو کوئی عبادت کے لائق ہے اور نہ کوئی تمھارا معبود ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کیا تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ اس نے تم کو جو جو نعمتیں عطا کی ہیں، وہ تم سے چھین لے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا تم اپنی جانوں کو اس کے عذاب سے نہیں بچاتے ہو، جس کا تمھارے گناہ تقاضا کرتے ہیں۔ اس پر اُن کی قوم کے اشرافوں اور سرداروں نے اپنے تابعین اور عوام سے کہا۔

اللہ پاک نے ان کی طرف سے پانچ شبہے نقل کیے ہیں: پہلا شبہہ یہ ہے: ﴿ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ یعنی وہ بشریت میں تمھاری جنس سے ہے، اس میں اور تم میں کوئی فرق نہیں، جو اوصاف تم میں ہیں، اُن میں وہ تمھارا شریک ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہوتا تو اس کے نزدیک معظم ومکرم ہوتا اور ساری مخلوق میں سے درجات اور عزت کے ساتھ اور زیادہ ممتاز ہوتا، تو پھر جب وہ ایسا نہیں تو معلوم ہوا کہ وہ رسول نہیں ہے، اس نے رسالت کا دعویٰ اس لیے کیا ہے کہ ﴿ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی رسالت کا دعویٰ کر کے تم پر فضیلت کا طالب ہے۔

اس طرح سے کہ تمھارا سردار بن جائے اور شریف ہو جائے، تاکہ تم اس کے تابع اور فرماں بردار اور اس کے حکم کے مطیع اور تابع فرمان ہو جاؤ، حالاں کہ وہ رسول نہیں ہے۔ جو صفت آدمی میں نہیں ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس میں وہ پیدا ہو جائے، ایسی صفت کے تکلف کے واسطے "تفعل" کا وزن ہوتا ہے، جیسے: تفقہ وتکرم اور تفعل کی بنیاد اس صفت کے تکلف کے واسطے ہوتی ہے، جو انسان میں نہیں ہے اور نہ وہ خود میں اس کا ہونا چاہتا ہے، جس طرح کہ تعامی وتعارج وتجاہل ہے، یعنی اندھا بننا، لنگڑا بننا اور جاہل بننا۔ پھر تصریح کر دی کہ بشر رسول ہوتا ہی نہیں ہے۔

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١١٩) تفسير الجلالين (١/ ٤٤٧) [2] تفسير القرطبي (٧/ ٢٣٣)

دوسرا شبہہ یہ ہے: ﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ﴾ یعنی اگر اللہ چاہتا کہ کسی رسول کو بھیجے تو البتہ فرشتوں کو بھیجتا۔ ارسال کی تعبیر انزال سے کی۔ (مطلب یہ ہے کہ ارسال کو انزال کے پیرایہ میں ادا کیا، بجائے ارسال کے انزال فرمایا،) اس لیے کہ فرشتوں کو بندوں کی طرف بھیجنے سے، ان کا ان کی طرف نزول لازم آتا ہے۔ ﴿ شَآءَ ﴾ کا مفعول محذوف ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے "أَنْ لَّا یُعْبَدَ غَیْرُہٗ" محذوف نکالا ہے، یعنی اگر اللہ یہ بات چاہتا کہ اس کا غیر نہ پوجا جائے تو اس کے لیے فرشتوں کو نازل کرتا نہ کہ بشر کو۔[1] مفعول مشیت کی شان یہی ہے کہ ﴿ لَوْ ﴾ کے جواب سے اخذ کر کے مقدر کیا جاتا ہے، لیکن امام محلی رحمہ اللہ نے اس جگہ سیاقِ کلام سے اَخذ کر لیا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کی تقدیر یہ ہے: "وَلَوْ شَاءَ اللّٰہُ أَنْ یُّرْسِلَ رَسُوْلًا لَّأَنْزَلَ مَلَائِکَةً رُّسُلًا" علامہ نسفی رحمہ اللہ کی تقدیر بھی اسی کے لگ بھگ ہے: "وَلَوْ شَاءَ اللّٰہُ إِرْسَالَ رَسُوْلٍ لَّأَرْسَلَ مَلَائِکَةً"[2] غرض کہ فرشتوں کے نازل کرنے سے مقصد صحیح طور پر پورا ہوتا ہے بہ نسبت کسی بشر کے نازل کرنے سے، کیوں کہ فرشتوں کی اعلیٰ شان اور اُن کی شدتِ سطوت (دبدبے کی شدت) اور کثرتِ علوم کے سبب سے مخلوق اُن کی مطیع ہو جاتی اور اُن کی رسالت میں شک نہ کرتی، پھر جب اللہ نے ایسا نہ کیا تو ہم نے جان لیا کہ اس نے کوئی بشر رسول نہیں بھیجا۔

پھر تیسرا شبہہ نقل کیا: ﴿ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی جیسا کہ یہ بشر جو مدعیِ نبوت ہے دعویٰ کرتا ہے، ایسا دعویٰ ہم نے اپنے اگلوں میں نہیں سنا ہے۔ یا ﴿ بِهٰذَا ﴾ کے معنی "بِمِثْلِ کَلَامِہٖ" ہیں، یعنی اس کی بات کی طرح ہم نے نہیں سنی، وہ بات یہی اکیلے اللہ کی عبادت کا حکم کرنا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے کسی بشر کو نہیں سنا کہ یہ دعویٰ کرتا ہو۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے: "أَيْ: بِإِرْسَالِ بَشَرٍ رَّسُوْلًا أَوْ بِمَا یَأْمُرُنَا بِہٖ مِنَ التَّوْحِیْدِ وَسَبِّ آلِھَتِنَا"[3] یعنی ہم نے کسی بشر کو رسول بنا کر بھیجنے کے بارے میں نہیں سنا، یا وہ جو ہم کو توحید کا حکم کرتا ہے اور ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے، ایسا ہم نے نہیں سنا۔ حالاں کہ تعجب تو اُن لوگوں پر ہے کہ پتھر کے لیے اُلوہیت کے ساتھ راضی ہوئے اور بشر کے لیے نبوت کے ساتھ راضی نہ ہوئے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بِهٰذَا ﴾ سے اُن کی مراد نوح علیہ السلام ہیں، یعنی ہم نے اس کو نہیں سنا کہ وہ نبی ہے۔[4]

"آباء أولین" سے مراد پہلی اُمتیں ہیں، جو اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بِهٰذَا ﴾ میں حرفِ با زائد ہے۔ "أَيْ: مَا سَمِعْنَا ھٰذَا کَائِنًا فِيْ الْمَاضِیْنَ" وہ لوگ اپنے مذاہب کی ہر بات میں تقلید ہی پر اعتماد کرتے تھے اور آباء کی طرف رجوع ہوتے تھے۔ چنانچہ غور وفکر اور استدلال کی راہ پر نہ چلے صرف تقلید پر قائم رہنے کی بنیاد رکھی۔ اس پر بھی قناعت نہ کی، یہاں تک کہ صریح بہتان اور جھوٹ اس کے ساتھ ملا کر یوں بولے: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ ﴾ یہ چوتھا شبہہ ہے۔

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٧) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٢) تفسير النسفي (٣/ ١٢٠)
[3] تفسير النسفي (٣/ ١٢٠) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٢)

عوام سے کہتے کہ وہ تو ایسا آدمی ہے جس کو جنون ہے، ہم نہیں جانتے وہ کیا کہتا ہے، اس لیے کہ نوح علیہ السلام اُن کے خلافِ عادت کام کیا کرتے تھے تو رؤسا عوام سے کہتے کہ وہ تو مجنون ہے، پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ رسول ہو۔ ﴿ جِنَّةٌ ﴾ کو امام محلی رحمہ اللہ نے بہ معنی حالتِ جنون کہا ہے،[1] یعنی ''فِعْلَةٌ'' کا وزن ہیئت میں استعمال ہوتا ہے، جس طرح کہ ''جِلْسَةٌ'' بیٹھنے کی حالت کو کہتے ہیں اور علامہ نسفی و خازن اور بیضاوی رحمہم اللہ نے بہ معنی جنون لکھا ہے۔[2] صراح میں جنۃ بالکسر کا ترجمہ دیوانگی کیا ہے۔

پھر کہا ہے کہ اسم و مصدر دونوں ایک صورت پر ہیں۔ بالجملہ پانچواں شبہہ یہ ہے: ﴿ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴾ یعنی ایک مدت اس کا انتظار کرو، یہاں تک کہ اس کا حال کھل جائے اس طریقے سے کہ اپنے جنون سے باز آجائے، افاقہ پاجائے تو اس دعوے کو چھوڑ دے، یا یہاں تک کہ مرجائے تو تم اس سے راحت پا جاؤ۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: تم اس کا انتظار کرو، اس کے زمانۂ موت تک۔ یہ کلامِ مستانف ہے۔ بعض بعض سے کہتے ہیں: تم صبر کرو، اگر وہ سچا نبی ہے تو اللہ اس کو نصرت دے گا، اس کے کام کو مضبوط کرے گا، پھر اس وقت ہم اس کی پیروی کر لیں گے اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اسے بے مدد چھوڑے گا اور اس کے کام کو باطل کر دے گا، پھر اس وقت ہم اس سے راحت پا جائیں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ماقبل سے متعلق ہو، یعنی وہ مجنون ہے، لہٰذا تم ایک زمانے تک صبر کرو کہ اس میں اس کے کام کا انجام معلوم ہو جائے۔ پھر اگر اس نے افاقہ پایا فبہا، ورنہ تم اس کو مار ڈالنا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ حِيْنٍ ﴾ سے مراد کوئی معین وقت نہیں ہے وہ تو ایسا ہے، جیسا یہ قول ہے: ''دَعْهُ إِلَى يَوْمٍ مَّا''[3] یعنی تو فلاں کو ایک دن تک چھوڑ دے۔ غرض کہ جب نوح علیہ السلام نے اُن کی گفتگو سنی اور اُن کی سرکشی اور کفر پر جمے رہنے کو پہچان گئے تو اُن کی ہلاکت کی دعا کی:

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝۲۶ فَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۲۷ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۸

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٨) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٢٠) تفسير الخازن (٥/ ٣٦) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٢)

[3] تفسير القرطبي (١٢/ ١١٩)

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾

نوح نے کہا: اے میرے رب! میری مدد کر کہ انھوں نے مجھے جھٹلایا (26) چناں چہ ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا، پھر جب ہمارا حکم آجائے اور تنور اُبل پڑے تو اس میں ہر قسم کے جوڑے سے دو (نر اور مادہ) اور اپنے اہل و عیال داخل (سوار) کر لے، سوائے اس کے جس کے متعلق ان میں سے (ہمارا) قول پہلے ہی آچکا، اور تو مجھ سے ظالموں کے بارے میں بات نہ کرنا، بلاشبہ وہ غرق کیے جائیں گے (27) پھر جب تو اور تیرے ساتھی اطمینان سے کشتی پر سوار ہو چکیں تو کہہ: تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی (28) اور کہہ: اے میرے رب! تو مجھے بابرکت اتارنا اور تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے (29) بے شک اس (واقعے) میں بھی نشانیاں ہیں، اور بلاشبہ ہم ہی آزمانے والے ہیں (30)

قومِ نوح پر عذاب اور مومنوں کے لیے نجات:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نوح علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ انھوں نے اپنے رب کو پکارا، تاکہ اپنی قوم پر اس سے مدد مانگیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے اُن کی طرف سے دوسری آیت میں خبر دی ہے: ﴿ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ [القمر: ۱۰] ''تب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک میں بے بس ہوں، اب تو ہی انتقام لے۔'' اور اس جگہ یوں کہا: ﴿ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴾ چنانچہ اس وقت اللہ پاک نے اُن کو کشتی بنانے کا اور اس کو مضبوط اور محکم کرنے کا حکم دیا اور اس بات کا حکم دیا کہ اس میں سوار کر لیں: ﴿ مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ﴾ یعنی نر و مادہ ہر قسم کے حیوانات، نباتات اور ثمار وغیرہ سے اور اس میں اپنے گھر والوں کو بھی سوار کر لیں۔

﴿ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ﴾ مگر وہ جس پر اللہ پاک کی طرف سے ہلاک ہونے کی بات کہی جا چکی ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اُن کے گھر والوں میں سے اُن پر ایمان نہ لائے، جیسے اُن کا بیٹا اور بیوی۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔ ﴿ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت بارانِ عظیم نازل کیا جائے اور وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو اس وقت تو اپنی قوم کے لیے نرمی، رحمت اور شفقت کے دباؤ میں نہ آجانا اور اُن کے پیچھے رہنے (بچ جانے) کا طمع نہ کرنا کہ شاید وہ ایمان لے آئیں، کیوں کہ میں حکم کر چکا ہوں

کہ جس کفر، طغیان اور سرکشی پر وہ جمے ہوئے ہیں، اس پر اُن کو ڈوبنا ہے، یہ قصہ سورت ہود میں اس قدر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴾ [الزخرف: ۱۲۔ ۱۴] ''اور وہ جس نے تمھارے لیے کشتیاں اور چوپایے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ تاکہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر بیٹھو، پھر جب ان پر متوازن ہو کر بیٹھ جاؤ تو تم اپنے رب کی نعمت یاد کرو اور تم کہو: وہ (اللہ) پاک ہے، جس نے اسے ہمارے تابع کر دیا، ورنہ ہم اسے قابو میں کر لینے والے نہیں تھے اور ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے۔'' نوح علیہ السلام نے اس حکم کی بجا آوری کی، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ﴾ [هود: ٤١] ''اور نوح نے کہا: اس (کشتی) میں سوار ہو جاؤ، اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے۔'' چنانچہ انھوں نے اپنے سفر پر جاری ہونے کے وقت اور سفر کے ختم ہونے کے وقت اللہ کا ذکر کیا اور اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ بے شک اس کام میں یعنی مومنوں کے نجات دینے اور کافروں کے ہلاک کرنے میں نبیوں کی سچائی پر کھلی حجتیں اور دلیلیں ہیں اور اس بات پر کہ اللہ پاک جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ ﴿ وَاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴾ کا حاصل یہ ہے کہ بے شک ہم رسول بھیج کر بندوں کا امتحان کرنے والے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جس وقت نوح علیہ السلام اپنی قوم کے ایمان لانے کی طرف سے ناامید ہو گئے تو کہا: ﴿ رَبِّ انْصُرْنِيْ ﴾ یعنی اے میرے پروردگار! تو میری اُن پر مدد کر، ان سے انتقام لے، جس چیز کے ساتھ تو چاہے اور جس طرح تو ارادہ کرے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: "بِإِهْلَاكِهِمْ" یعنی ان کو ہلاک کر۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے: "بِإِنْجَازِ مَا وَعَدْتَهُمْ مِنَ الْعَذَابِ" یعنی ان سے جو تو نے عذاب کا وعدہ کیا ہے، اس کو پورا کر دے۔ ﴿ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴾ میں حرفِ با سببیت کے واسطے ہے، یعنی بسبب اس کے کہ انھوں نے مجھے جھٹلایا ہے، یا بہ معنی بدل ہے، جیسے: محاورے میں بولتے ہیں: "هٰذَا بِذٰلِكَ" یعنی یہ

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۲۵)

شے اس شے کے بدلے میں ہے، معنی یہ ہیں کہ ان کی تکذیب کے غم کو مجھے ان پر منصور ہونے کی تسلی سے بدل دے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اوّل کو ثانی اور ثانی کو اول ذکر کیا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس کا اُلٹ کیا ہے۔[1]

غرض کہ جب نوح علیہ السلام نے بد دعا کی تو اللہ پاک نے اُن کی دعا کو قبول کرکے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ ﴾ یعنی ہم نے آسمان سے ان کی طرف ایک رسول بھیجا، پھر رسالت اور وحی کی تفسیر کی وہ یہ ہے: ﴿ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ ﴾ یعنی تو کشتی بنا۔ اس بنا پر "أَنْ" مفسرہ ہے، کیوں کہ وحی میں معنی قول کے ہیں، ﴿ اَنِ ﴾ کو مصدریہ ٹھہرانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ ﴿ بِاَعْيُنِنَا ﴾ حال ہے ﴿ اِصْنَعِ ﴾ کی ضمیر مستتر سے اور حرفِ با ملابست کے واسطے ہے، یعنی تو اس کو اس حال میں بنا کہ ہماری نگہبانی اور حفاظت تیرے ساتھ ہے۔ "أَعْيُن" بلفظِ جمع فرمایا، گو عادت یہ ہے کہ دیکھنے والے کی فقط دو آنکھیں ہوتی ہیں، لہٰذا یہ مبالغے کے واسطے ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: تو اس کو اس حال میں بنائے کہ تجھے اللہ کی حفاظت اور رؤیت کا یقین ہو کہ وہ تیری حفاظت کرتا ہے اور تجھے دیکھ رہا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہماری حفاظت اور نگہبانی کے ساتھ اس کو بنا۔ اللہ کی طرف سے تیرے ہمراہ حفاظت کرنے والے ہوں گے، وہ اپنی آنکھوں سے تیری حفاظت کریں گے، تاکہ کوئی تجھ سے رکاوٹ ڈالنے والا نہ ہو اور کوئی فسادی تیرے کام کو بگاڑ نہ دے۔

اسی معنی میں یہ قول ہے: "عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ عَيْنٌ كَالِئَةٌ"[2] یعنی فلاں پر اللہ کی طرف سے ایک محافظ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لفظ "أعین" حفاظت کے لیے استعارہ کیا گیا ہے۔ اللہ پاک کا نوح علیہ السلام کو محفوظ رکھنا، اس کو نگہبانوں کی ایک جماعت سے تشبیہ دی کہ وہ اُن کو اپنی آنکھوں سے نگاہ رکھتے ہیں۔ محافظوں کو اعین اس لیے کہتے ہیں کہ جن چیزوں سے حفاظت کی جاتی ہے، اُن سب سے بڑی یہی آنکھ ہے۔ لہٰذا اس سے گویا وہ خود آنکھیں بن گئیں، اسی واسطے جاسوس کو بھی عین کہتے ہیں۔

امام خازن رحمہ اللہ نے دو قول لکھے ہیں: ایک یہ ہے: "بِمَرْأًى مِنَّا" یعنی ہمارے روبرو، اس کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی لیے فتح البیان میں اس کو اولیٰ کہا ہے۔ دوسرا قول بلفظ "قیل" یہ لکھا ہے: "بِعِلْمِنَا"[3] یعنی تو اس کو بنا ہمارے علم سے۔ ﴿ وَوَحْيِنَا ﴾ کے معنی ہیں: "بِأَمْرِنَا وَتَعْلِيمِنَا" یعنی تو اس کو ہمارے حکم اور تعلیم سے بنا ہم تجھے اس کے بنانے کی کیفیت سکھائیں گے۔ کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے ان کو کشتی بنانا سکھایا۔ پھر دو برس میں اس کو بنایا، اس کا طول تین سو گز رکھا اور عرض پچاس گز، اونچائی تیس گز، اس کے تین طبقے بنائے نیچے کا سباع وہوام (وحشی جانور اور حشرات الارض) کے لیے، درمیان والا طبقہ چارپایوں اور جانوروں کے لیے اور اوپر کا طبقہ آدمیوں کے لیے جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: ان کو وحی کی گئی کہ اس کو پرندے کے سینے کی طرح بنائیں۔[4]

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٢) تفسير النسفي (٣/ ١٢٠) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٢٠)
[3] تفسير الخازن (٥/ ٣٦) [4] تفسير النسفي (٣/ ١٢٠)

﴿ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا ﴾ میں حرفِ فا ما بعد کی ماقبل پر ترتیب کے لیے ہے۔ مراد وہی کشتی بنانا ہے۔ امر سے مراد "أَمْرٌ بِالْعَذَابِ" ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: "عَذَابُنَا بِأَمْرِنَا"[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ کا قول اوّل یہ ہے: "أَمْرُنَا بِالرُّكُوبِ"[2] لیکن امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: یہ مراد نہیں ہے۔ امر سے مراد عذاب ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: ﴿ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾[3] [هود: ٤٣] "آج اللہ کے حکم (عذاب) سے کوئی بچانے والا نہیں۔" عذاب کے آنے سے مراد اس کا بالکل قریب ہونا ہے، یعنی اس کا ابتدائے ظہور۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت کشتی کے مکمل ہو جانے کے بعد ہمارا عذاب آئے۔ ﴿ وَفَارَ التَّنُّوْرُ ﴾ جملہ ماقبل پر معطوف ہے۔ بعطفِ نسق۔ یا عطفِ بیان ہے، یعنی عذاب کا آنا تنور کا جوش مارنا ہے۔ ڈوبنے کا سبب آگ جلنے کی جگہ سے اس لیے نکالا گیا کہ اس سے ڈرانے اور عبرت دلانے میں مبالغہ ہو۔ اس تنور سے مراد وہ تنورِ آدم ہے، جس میں بی بی حوا روٹیاں پکایا کرتی تھیں۔ میراث میں پہنچتے پہنچتے نوح علیہ السلام کو ملا تھا، پتھروں کا تھا۔ تنور کی جگہ میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مسجدِ کوفہ میں۔ کسی نے کہا ہے کہ شام میں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہند میں۔ کسی نے کہا ہے کہ تنور سے مراد روئے زمین ہے۔ مروی ہے کہ نوح علیہ السلام سے کہہ دیا تھا کہ جس وقت تنور سے پانی جوش مارے تو تم اور تمھارے ساتھ والے سوار ہو جاؤ۔ پھر جب تنور سے پانی ابلا تو اُن کی بیوی نے اُن کو خبر دی، وہ سوار ہو گئے۔

﴿ فَاسْلُكْ فِيْهَا ﴾ یعنی جس وقت وہ علامت ظاہر ہو جائے، جو تیرے لیے مقرر کی گئی ہے تو تو کشتی میں داخل کر۔ "سَلَكَ" محاورے میں لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ "سَلَكَ فِي كَذَا" یعنی وہ فلاں شے میں داخل ہوگیا، "وَسَلَكَ غَيْرَهُ" یعنی فلاں نے اپنے غیر کو داخل کر دیا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴾ [المدثر: ٤٢] "(ان سے پوچھیں گے:) تمھیں کس چیز نے جہنم میں ڈالا؟" لیکن لازم و متعدی میں مصدر کا فرق ہے لازم کا مصدر سلوک اور متعدی کا سلک آتا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: "اِجْعَلْ مَعَكَ فِي السَّفِيْنَةِ" یعنی رکھ لے اپنے ساتھ کشتی میں۔[4]

﴿ مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ﴾ عامہ کی قراءت باضافتِ لفظ "كُلِّ" ہے اور عاصم نے حفص کی روایت میں تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔[5] اضافت کی بنا پر ﴿ اِثْنَيْنِ ﴾ ﴿ اُسْلُكْ ﴾ کا مفعول ہوگا، یعنی داخل کر اس میں ہر زوجین سے دو کو۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان ایک مضاف مقدر کیا جائے۔ تقدیر یہ ہوگی کہ "مِنْ كُلِّ أُمَّتَيِ زَوْجَيْنِ" یعنی ہر نر و مادہ کے دو گروہ میں سے داخل کر دو، ہر قسم کے نر و مادہ سے ایک جوڑا، یعنی ایک نر ایک مادہ اور حرفِ "من" ﴿ اُسْلُكْ ﴾ سے متعلق ہے۔

---

(1) تفسير النسفي (٣/ ١٢٠) (2) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٢) (3) تفسير أبي السعود (٦/ ١٣١)
(4) الدر المنثور (٦/ ٩٧) (5) تفسير القرطبي (١٢/ ١١٩)

دوسری قراءت کی بنیاد پر معنی یہ ہیں کہ اس میں ہر نوع میں سے ایک جوڑے کو داخل کر، اس صورت میں "اثنین" "زوجین" کی تاکید ہوگی۔ ہر قسم کے حیوانات سے ایک ایک جوڑا داخل کرنے کا اس لیے فرمایا کہ اس قسم کی نسل منقطع نہ ہو جائے۔ مروی ہے کہ نوح علیہ السلام نے کشتی میں وہی حیوان سوار کیے جو بچے جنتے ہیں یا انڈے دیتے ہیں۔ رہے مچھر، مکھی کیڑے۔ ان کو سوار نہ کیا، کیوں کہ یہ تو مٹی سے نکلتے ہیں عفونات سے پیدا ہو جاتے ہیں، اُن کی نسل منقطع نہیں ہوتی۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: قصے میں مروی ہے کہ اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کے واسطے درندوں اور پرندوں وغیرہ کو جمع کر دیا تھا، وہ ہر نوع میں اپنے دونوں ہاتھ مارتے تو اُن کا سیدھا ہاتھ نر پر پڑتا اور بایاں ہاتھ مادہ پر، پھر وہ اُن کو کشتی میں سوار کر لیتے۔[1] فتح القدیر میں کہا ہے: ﴿ وَاَهْلَكَ ﴾ منصوب ہے فعل محذوف سے، وہ معطوف ہے ﴿ فَاسْلُكْ ﴾ پر، یعنی "وَاسْلُكْ" محذوف کا مفعول ہے اور اس کا عطف ہے ﴿ فَاسْلُكْ ﴾ پر، ﴿ زَوْجَيْنِ ﴾ یا ﴿ اِثْنَيْنِ ﴾ پر معطوف نہیں ہے، دونوں قراءتوں کی بنیاد پر، اس لیے کہ مؤدی ہوتا ہے اختلافِ معنی کی طرف۔[2] لیکن شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِثْنَيْنِ ﴾ پر معطوف ہے قراءتِ اضافت کی بنا پر اور قراءتِ تنوین کی بنا پر ﴿ زَوْجَيْنِ ﴾ ﴿ اِثْنَيْنِ ﴾ پر معطوف ہے۔

اہل سے مراد اُن کے گھر والے ہیں، یعنی ان کی بیوی اور بیٹے اور ان کی بیویاں۔ ان میں سے ان کے بیٹے کنعان اور اس کی بیوی اور اس کی ماں کو نکال لیا، کیوں کہ یہ لوگ کافر تھے، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ﴾ اللہ پاک نے سورت ہود میں فرمایا ہے: ﴿ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴾ [هود: ٤٠] "اس (کشتی) میں ہر قسم (کے جانوروں) کا جوڑا، دو (نر اور مادہ) سوار کر لے اور اپنے گھر والوں کو، سوائے اس شخص کے جس کی بابت پہلے حکم ہو چکا، اور ان کو بھی جو ایمان لا چکے ہیں، اور اس پر تھوڑے ہی لوگ ایمان لائے تھے۔" اللہ پاک نے یہاں ﴿ مَنْ اٰمَنَ ﴾ کا ذکر نہ کیا، اس لیے کہ استثناء کی دلالت کو کافی سمجھا، کیوں کہ وہ اس پر دال ہے کہ جتنے لوگ ان پر ایمان لائے اللہ پاک نے اُن سب کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم فرمایا، گو وہ اُن کے گھر والوں میں سے نہ ہوں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ ﴿ اَهْلَكَ ﴾ سے مراد سارے لوگ ہوں جو اُن پر ایمان لائے خواہ اُن کا نسب نوح علیہ السلام سے متصل ہو یا نہ ہو،[3] اس صورت میں ﴿ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ ﴾ استثنا منقطع ہوگا۔

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ قول بُعد سے خالی نہیں ہے، یہاں کلمۂ ﴿ عَلٰى ﴾ اس لیے لایا گیا ہے کہ امرِ سابق ضار ہے، جس طرح کہ وہاں لام لایا گیا ہے، جہاں امرِ سابق نافع ہے، چنانچہ اس آیت میں: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ﴾ [الأنبياء: ١٠١] "بے شک جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی نیکی اور بھلائی مقدر ہو

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٨) [2] فتح القدير (٣/ ٦٥٥) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٦)

چکی ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۶] ''کسی شخص نے جو نیکی کمائی اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو اس نے برائی کی اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔''

غرض کہ اللہ پاک نے اُن کو حکم دیا کہ کشتی میں اپنے گھر والوں کو سوار کر لو، سوائے اُن کے جن پر ہلاک کرنے کا وعدۂ ازلی سابق ہو چکا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سام و حام و یافث کو اور اُن کی بیویوں کو اور اپنی مومن بیوی کو سوار کر لیا۔ سام عرب کے باپ ہیں اور حام سوڈان کے اور یافث ترک کے باپ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ چھے مرد اور اُن کی بیویاں تھیں، تمام بارہ افراد تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اٹھہتر آدمی تھے آدھے مرد آدھی عورتیں۔ واللہ أعلم۔ پھر جن لوگوں نے شرک اور نافرمانی کرکے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اُن کے لیے دعائے نجات کرنے سے نوح علیہ السلام کو منع کر دیا کہ ﴿ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ﴾ یعنی اُن کی نجات کے بارے میں مجھ سے گفتگو مت کرنا۔

پھر جملۂ مستانفہ سے اس نہی کی وجہ بیان فرمائی کہ ﴿ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴾ یعنی وہ تو شرک اور معاصی کی وجہ سے ضرور ہی ڈوبنے والے ہیں، ان پر اس کا حکم ہو چکا ہے، وہ ہرگز نہ ٹلے گا۔ جس کا یہ حال ہو اس کے لیے نہ کوئی سفارش کرتا ہے، نہ کسی کی سفارش اس کے حق میں قبول ہوتی ہے۔ شیخ زادہ نے کہا ہے: جب کہ اللہ پاک ان پر ڈبونے کا حکم کر چکا اور اس حکم کی خبر دے دی تو اُن کو بعض کے حق میں دعائے نجات کرنے سے منع کر دیا، کیوں کہ اگر اُن کی دعا قبول کرے تو اپنی سچی خبر کو جھوٹا بنائے اور اگر قبول نہ کرے تو اُن کی شان کی تحقیر ہو، اس لیے منع ہی کر دیا کہ تم اُن کے حق میں دعا مت کرو اُن کو یقیناً ڈوبنا ہے۔

ان کے حق میں دعا اور شفاعت کیسے قبول ہو، حالاں کہ اللہ پاک نے تو اُن سے نجات پانے پر نوح علیہ السلام کو حمد و شکر کا حکم فرمایا: ﴿ فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنتَ وَمَن مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجَّانَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴾ یعنی جس وقت تو اور تیرے ہم راہی کشتی پر سوار ہو کر عالی و مستوی و معتدل ہو جائیں تو تُو اس طرح کہہ کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو ظالموں سے اور اُن کے اہلاک سے نجات دی کہ ہم اُن کے ساتھ ہلاک نہ ہوئے۔ یعنی اللہ پاک ہمارے اور اُن کے درمیان حائل ہو گیا اور ہم کو اُن سے خلاصی دی۔ یہ آیت اس آیت کے مثل ہے: ﴿ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ [الأنعام: ٤٥] ''پھر اس قوم کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

اللہ پاک نے جو اُن کے کشتی پر مستوی ہونے کو یقینی طور پر غرق ہونے سے نجات ٹھہرایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک کے علم میں یہ بات سابق ہو چکی تھی کہ وہ ظالموں سے اُن کی نجات کا سبب ہے اور اس عذاب سے اُن کی سلامتی کا موجب ہے، جو عذاب اُن کی قوم کو پہنچا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو اس بات کا حکم کیا کہ اس نعمتِ عظیم

پر اس کی حمد کریں۔ "فَقُلْ" جواب ہے "إِذَا" شرطیہ کا۔ ظاہر یوں تھا کہ صیغۂ جمع کے ساتھ "فقولوا" کہا جاتا، یعنی تو اور تیرے ہمراہی سب حمد کرو، لیکن صرف نوح علیہ السلام کو دعائے مذکور کا حکم فرمایا تو اس میں اُن کی فضیلت کا اظہار کرنا مقصود ہے اور اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ اُن کی دعا اُن کے ہمراہیوں کی دعا کے بجائے کافی ہے، کیوں کہ اُن کی دعا اُن سب کو گھیرے ہوئے ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کو ایسی بات کا حکم کیا، جو اُن کے زیادہ فائدے میں ہے اور اس میں مکمل طور پر فائدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی ذات کے لیے دعا کریں اس طریقے سے کہ کشتی میں سوار ہوتے وقت اور کشتی سے زمین کی طرف اترتے وقت اس طرح کہیں: ﴿ رَبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا ﴾ پہلا احتمال ظاہر تر ہے، اس لیے کہ ان کو اس دعا کا حکم ہوا اس حال میں کہ وہ کشتی میں قرار پذیر ہوں تو وہ کشتی اُن کی منزل ہو نہ اس کا غیر۔ (قاله شيخ زاده رزقه الله الحسنىٰ وزيادة) جمہور کی قراءت بضمِ میم وفتحِ زائے معجمہ ہے، اس بنا پر کہ مصدر میمی بہ معنی انزال ہے۔ یا اسمِ مکان انزال ہے۔ زِرّ بن حبیش نے اور ابوبکر نے عاصم سے اور مفضل نے بفتحِ میم وکسرِ زائے معجمہ پڑھا ہے،[1] اس بنیاد پر کہ اسمِ مکان نزول یا مصدر میمی بہ معنی نزول ہے، مصدر ثلاثی کو قائم مقام مصدر ثلاثی مزید کے کیا ہے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴾ [نوح: ١٧] "تمھیں زمین سے (خاص انداز سے) اُگایا" یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ امام محلی اور نسفی رحمہ اللہ نے جو ان قراءتوں کی تقریر کی ہے،[2] اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ مذکورہ وجہیں صرف قراءتِ اولیٰ کی بنا پر ہیں اور ثانیہ کی بنا پر اسمِ مکان ہونا متعین ہے، حالاں کہ بات یوں نہیں ہے، بلکہ ضم وفتح سے ہر ایک کی بنیاد پر مذکورہ وجہوں کا احتمال ہے۔ (كما ذكره الحفناوي)

چنانچہ پہلی قراءت کے یہ معنی ہیں: اے رب میرے! تو مجھ کو اُتار مبارک اُتارنا، یا اُتار مجھ کو اُتارنے کے مبارک مکان میں۔ دوسرے کی بنا پر معنی یہ ہیں: اُتار مجھ کو مبارک مکان میں اُتارنا، یا اُتار مجھ کو اُتارنا مبارک مکان میں۔ انزال ونزول سے مراد کشتی ہے۔ کشتی کی برکت یہ ہے کہ اس میں نجات ملی اور اس سے اُترنے کے بعد نسل کی کثرت ہوئی، پیہم بھلائی کا حصول ہوا۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مَنْزَلَ" بفتحِ میم و زا ہے اور نزول بہ معنی حلول ہے: "تَقُوْلُ: نَزَلْتُ نُزُوْلًا وَّمَنْزِلًا"[3] کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کو حکم کیا تھا کہ قولِ مذکور کو کہیں کشتی میں داخل ہونے کے وقت۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے نکلنے کے وقت، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے کہ آیتِ مذکور کو اللہ پاک کی طرف سے بندوں کو تعلیم ہے کہ جس وقت وہ سوار ہوں، پھر اتریں تو قولِ مذکور کہیں۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: مفسرین نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کو اس بات کا حکم ہوا کہ اپنی کشتی پر مستوی ہونے

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ١١٩۔ ١٢٠) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٨) تفسير النسفي (٣/ ١٢١) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ١٢٠)

کے وقت الحمد للہ کہیں، اس سے اترنے کے وقت ﴿رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا﴾[1] یعنی تو مجھے ایسا مبارک اتارنا اتار کہ دارین میں مزید خیر کا سبب بن جائے۔ پہلے انھوں نے دعا کی، پھر دعا کے بعد اللہ عزوجل کی ثنا وصفت بیان کی اور یوں کہا: ﴿وَاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ﴾ (یہ منزلین کا مفعول ہے۔ اس سے مراد مصدر ہے یا مکان۔ "أَيْ: الْمُنْزِلِيْنَ الإِنْزَالَ الْمُبَارَكَ أَوِ الْمَكَانَ الْمُبَارَكَ" (كما قاله الحفناوي)) یعنی تو سب سے بہتر اُتارنے والا ہے۔ یہ ثنا اُن کی دعا کے مطابق ہے۔ اللہ پاک نے اُن کو حکم دیا کہ اس ثنا کو دعا کے ساتھ ملائیں، تاکہ اس میں مبالغہ ہو اور دعا کے قبول ہونے کا وسیلہ ہو جائے۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ﴾ یعنی یہ جو اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کا حال اور کشتی کی کیفیت اور کفار کے ہلاک ہونے کا قصہ بیان فرمایا، اس میں ﴿لَاٰيٰتٍ﴾ البتہ اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت پر دلالتیں ہیں اور نشانیاں ہیں، جن سے اس کی شانِ عظیم پر استدلال کیا جاتا ہے اور دانا و بینا لوگ عبرتیں حاصل کرتے ہیں۔ ﴿وَاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ﴾ میں کلمۂ ﴿اِنْ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے اور حرفِ لام اس کے اور شرطیہ وغیرہ کے درمیان فرق کرنے والا ہے، یعنی بے شک شان وقصہ یہ ہیں کہ البتہ ہم نوح کی قوم کو بلائے عظیم و عذابِ شدید پہنچانے والے ہیں، البتہ ہم جانچنے والے ہیں، قومِ نوح کو اُن کی طرف نوح علیہ السلام کو بھیج کر کہ آیا اس کی پیروی کرتے ہیں یا نہیں، اور یہ دیکھنے والے ہیں کہ وہ اس کے وعظ سے نصیحت حاصل کرتے ہیں یا نہیں، یا اپنے بندوں کو ان آیتوں سے آزمانے والے ہیں کہ دیکھیں کون ان سے عبرت اور نصیحت حاصل کرتا ہے، اُن کی طرف رسول بھیج کر اُن کا امتحان لینے والے ہیں، تاکہ اطاعت گزار اور نافرمان لوگ ظاہر ہو جائیں، یا فرشتوں کو ان کا پتا چل جائے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک ان سے ایسا معاملہ کرتا ہے، جس طرح اُن کے احوال جانچنے والا معاملہ کرتا ہے، کبھی رسول بھیج کر، کبھی عذاب سے، تاکہ دیکھے کون عبرت لیتا ہے اور کون نصیحت مانتا ہے، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ [القمر: ۱۵] "اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس (کشتی) کو ایک نشانی (بنا) چھوڑا، پھر کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے؟" امام سمین رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ کلمۂ ﴿اِنْ﴾ نافیہ ہے اور حرفِ لام بہ معنی "إِلَّا"، یعنی نہیں ہیں ہم مگر جانچنے والے۔ پھر اللہ پاک نے دوسرا قصہ شروع کیا۔ چنانچہ فرمایا:

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۳۱ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا
مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۳۲
وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ

[1] فتح القدير (۳/ ٦٥٦)

الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ ۙ یَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَیَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۪ۙ﴿۳۳﴾
وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۙ﴿۳۴﴾ اَیَعِدُكُمْ
اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۪ۙ﴿۳۵﴾
هَیْهَاتَ هَیْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۪ۙ﴿۳۶﴾ اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا
نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۪ۙ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ
افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ
رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ
نٰدِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۱﴾

پھر ہم نے ان کے بعد ایک دوسری امت پیدا کی (31) چناں چہ ہم نے ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیجا کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں، پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ (32) اور اس کی قوم کے سرداروں نے کہا، جنھوں نے کفر کیا اور (ہماری) آخرت کی ملاقات جھٹلائی اور ہم نے انھیں دنیاوی زندگی میں خوش حالی دی تھی کہ یہ تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے، وہ اس میں سے کھاتا ہے جس میں سے تم کھاتے ہو، اور وہ اس میں سے پیتا ہے جو تم پیتے ہو (33) اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے بشر کی اطاعت کی تو بلاشبہ تم اس وقت خسارہ پانے والے ہوگے (34) کیا وہ تمھیں وعدہ دیتا ہے کہ بے شک جب تم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو بلاشبہ تم (زندہ) نکالے جاؤ گے (35) دور ہے، دور ہے وہ جو تم وعدہ دیے جاتے ہو! (36) یہ ہماری دنیاوی زندگی ہی تو (سب کچھ) ہے (جس میں) ہم مرتے اور زندہ رہتے ہیں، اور ہم (دوبارہ) اُٹھائے جانے والے نہیں (37) وہ ایک شخص ہی تو ہے جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہے، اور ہم اس پر ایمان لانے والے نہیں (38) اس (رسول) نے کہا: اے میرے رب! تو میری مدد فرما اس لیے کہ انھوں نے میری تکذیب کی (39) اللہ نے فرمایا: بلاشبہ تھوڑے دنوں میں وہ (اپنے کیے پر) ضرور نادم ہوں گے (40) پھر انھیں واقعی چنگھاڑ نے آ پکڑا، پھر ہم نے انھیں خس وخاشاک کر دیا، چناں چہ دوری ظالم لوگوں کے لیے ہے (41)

قوم عاد یا ثمود کا قصہ:

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ ثمود کا ہے، کیوں کہ چیخ سے وہی مرے ہیں۔ انتہٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے قوم نوح علیہ السلام کے بعد ایک اور قرن اُٹھایا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس قرن سے مراد عاد ہیں، کیوں کہ قوم نوح علیہ السلام کے بعد یہی عاد خلیفہ ہوئے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سے ثمود مراد ہیں، کیوں کہ اللہ پاک نے ﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ ﴾ فرمایا ہے، غرض یہ ہے کہ "صَيْحَه" سے ثمود ہی ہلاک ہوئے تھے۔ اللہ پاک نے ان میں سے ہی اُن کی طرف ایک رسول بھیجا، اس نے ان کو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی طرف بلایا اور انھوں نے رسول کی تکذیب اور مخالفت کی۔ اپنی طرح کا بشر ہونے کی وجہ سے اس رسول کی پیروی اور اتباع کرنے سے انکار کر دیا اور قیامت کے دن اللہ پاک کی ملاقات کو جھٹلایا اور اپنے جسمانی معاد (جسم کے لوٹائے جانے) کے منکر ہوئے اور بولے: ﴿ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴾۔

﴿ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے: "بَعِيْدٌ بَعِيْدٌ ذٰلِكَ" یعنی جس بات کا تم کو وعدہ ملتا ہے، وہ انتہائی بعید ہے۔ غرض یہ ہے کہ وہ بات ہونی نہیں ہے، نرا وعدہ ہی وعدہ ہے۔ (امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں بعید بعید روایت کیا ہے۔ (كذا في الفتحين)[1] ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں پیغامات و ڈراوے اور خبریں تمھارے پاس لے کر آتا ہے، وہ اللہ پر جھوٹ باندھ لایا ہے۔ ﴿ وَمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی ہم تو اس کو ماننے والے نہیں ہیں۔ ﴿ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴾ کا حاصل یہ ہے کہ رسول نے اپنے رب سے ان پر فتح اور نصرت طلب کی۔ لہٰذا اس نے اس کی دعا قبول کی۔ یوں فرمایا: ﴿ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴾ یعنی جس بات کو تو اُن کے پاس لے کر آیا ہے، اس میں تیری مخالفت و دشمنی کرنے کی وجہ سے تھوڑے ہی دِنوں میں پچھتاتے رہ جائیں گے۔

﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے کفر اور سرکشی کی وجہ سے اللہ پاک کی طرف سے اسی بات کے مستحق تھے کہ ان کو چنگھاڑ نے آ پکڑا۔ ظاہر ہے کہ اُن پر چنگھاڑ اور تند و تیز سخت سرد ہوا اکٹھی آگئیں۔ غرض یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں سے اُن کو ہلاک کر ڈالا۔ دوسری جگہ اللہ پاک نے اس ہوا کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ﴾ [الأحقاف: ٢٥] "وہ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر دے گی، پھر وہ ایسے ہوگئے کہ ان کے گھروں کے سوا وہاں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو گرا کر کوڑے کچرے کی طرح ہلاک کر ڈالا۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٣٠) فتح القدیر (٣/ ٦٥٨) فتح البیان (٩/ ١١٨)

﴿ غُثَآءً ﴾ وہ حقیر و بے حقیقت ہلاک ہونے والی شے ہے جس سے کچھ بھی فائدہ نہیں لیا جاتا۔ (امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ غُثَآءً ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ "جعلوا کالشيء المیت البالي من الشجر"[1] یعنی ایسے کر دیے گئے جیسے مردہ بوسیدہ درخت۔) ﴿ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٧٦] ''اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ خود ہی ظالم تھے۔'' یعنی اپنے کفر و عناد اور رسول اللہ کی مخالفت کے سبب سے وہ خود ہی ظالم تھے، اللہ نے ان پر کچھ ظلم نہیں کیا۔ لہٰذا سننے والوں کو چاہیے کہ اپنے رسول کی تکذیب سے بچیں کہ کہیں اُن کا انجام بھی ویسا نہ ہو، جیسا پہلے لوگوں کا ہوا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اَنْشَاْنَا ﴾ کے معنی "خلقنا" ہیں۔ ﴿ بَعْدِهِمْ ﴾ میں مضاف مقدر ہے: "أي: بعد إھلاکھم قرنا" سے مراد قوم ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو مالک رحمہ اللہ سے ﴿ قَرْنًا ﴾ کی تفسیر میں "أُمَّة" روایت کیا ہے۔[3] قوم ہو یا اُمت معنی ایک ہی ہیں، یعنی قومِ نوح کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے ایک اور قوم پیدا کی۔ اس قوم کے بارے میں تین قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد قومِ عاد ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۃ الاعراف، ہود اور شعراء میں ہود علیہ السلام کا قصہ نوح علیہ السلام کے قصے کے بعد آیا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ سورۃ الاعراف میں ہود علیہ السلام کا یہ قول مذکور ہے: ﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ﴾ [الأعراف: ٦٩] ''جب اس نے قومِ نوح کے بعد تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا۔'' اکثر مفسرین کا قول یہی ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے اس کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ علامہ نسفی اور محلی رحمہما اللہ نے اسی پر اکتفا کیا ہے۔[4]

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ثمود ہیں، جو صالح علیہ السلام کی قوم ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ "صَیْحَه" سے ثمود ہی ہلاک ہوئے ہیں اور ﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ ﴾ اس قصے میں مذکور ہے، رہے عاد قومِ ہود تو وہ ریحِ عقیم سے ہلاک ہوئے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ﴾ [الحاقة: ٦] ''اور جو عاد تھے تو یخ تند و تیز بے قابو آندھی سے ہلاک ہوئے۔'' امام بیضاوی رحمہ اللہ نے دونوں قول ذکر کیے ہیں۔[5] اسی طرح امام خازن رحمہ اللہ نے بھی، لیکن پہلے قول کو زیادہ صحیح کہا ہے۔[6] تیسرا قول یہ ہے کہ ان سے مراد اصحابِ مدین ہیں، جو شعیب علیہ السلام کی قوم ہیں، کیوں کہ یہ بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں جو صیحہ سے ہلاک ہوئے۔ فتح البیان اور فتح القدیر میں تینوں قول مذکور ہیں۔[7]

---

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٣٢۔ ٣٣) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٢٣۔ ٣٢٤) [3] الدر المنثور (٦/ ٩٨)
[4] تفسیر النسفي (٣/ ١٢١) تفسیر الجلالین (١/ ٤٤٩) [5] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٥٤)
[6] تفسیر الخازن (٥/ ٣٧) [7] فتح القدیر (٣/ ٦٥٦) فتح البیان (٩/ ١١٦)

﴿ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ ارسال کا فعل کلمۂ "إِلٰی" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے، یہاں کلمۂ "فِيْ" کے ساتھ متعدی ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جو رسول اُن کی طرف بھیجا گیا ہے، اس نے انہیں میں نشو و نما پائی، وہ اُن کے درمیان پلا بڑھا اور بسا۔ وہ لوگ اس کی جائے ولادت اور رہائش کی جگہ کو جانتے تھے، وہ کسی اور جگہ کا آدمی نہ تھا۔ ایسے شخص کو رسول بنا کر بھیجا، کسی اور جگہ کے آدمی کو رسول نہ بنایا، اس لیے کہ اس کی بات کو غیر کی نسبت زیادہ مانیں گے، کیوں کہ وہ انہیں میں رہا بسا ہے، وہ اس کے عادات و اطوار کو خوب جانتے ہیں۔ غرض یہ ٹھہری کہ کلمۂ "فِي" ارسال کا صلہ نہیں ہے، بلکہ یہ ظرفیت کے لیے ہے، جس طرح ان آیتوں میں ہے: ﴿ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْۤ اُمَّةٍ ﴾ [الرعد: ٣٠] "(جیسے پہلے رسول بھیجے تھے) اسی طرح ہم نے آپ کو ایسی اُمت میں رسول بنا کر بھیجا۔" نیز فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ ﴾ [سبا: ٣٤] "اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا (رسول) بھیجا۔" کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ "فِي" کے ساتھ اس لیے متعدی ہوا ہے کہ ﴿ اَرْسَلْنَا ﴾ میں قول کے معنی شامل ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ درست ہے، کیوں کہ ﴿ اَرْسَلْنَا ﴾ میں "قُلْنَا" کے معنی شامل سمجھنے سے یہ لازمی نہیں ہے کہ ﴿ اَرْسَلْنَا ﴾ حرفِ "فِي" سے متعدی ہو۔

﴿ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ﴾ میں حرفِ ﴿ اَنِ ﴾ مصدر یہ ہے: "أَيْ: بِأَنِ اعْبُدُوْا" یعنی ہم نے رسول کو اس بات کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[1] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "أَن" تفسیر کا ہو، کیوں کہ ﴿ اَرْسَلْنَا ﴾ میں قول کے معنی شامل ہیں۔ یعنی ہم نے اُن سے رسول کی زبان پر یہ بات کہی کہ اللہ کی عبادت کرو۔ علامہ نسفی اور بیضاوی رحمہما اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ فتح البیان اور فتح القدیر نے بھی اسی پر اکتفا کیا ہے۔[2] جملہ ﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ﴾ امرِ مذکور کی تعلیل ہے، یعنی تم اللہ کو اس لیے پوجو کہ تمھارا اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ﴿ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ پھر کیا تم اس کے عذاب سے ڈرتے نہیں ہو۔ کون سا عذاب؟ جس کا تمھارا شرک تقاضا کرتا ہے۔

﴿ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ ﴾ "ملأ" سے مراد قوم کے اشراف اور سردار ہیں، یہاں پر "ملأ" کے قول کو جو انھوں نے رسول کے جواب میں کہا تھا حرفِ واو کے ساتھ ذکر کیا اور نوح علیہ السلام کے جواب میں جو قول کہا گیا اسے حرفِ فا کے ساتھ ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے، یہاں پر "ملأ" کا کلام رسول کے کلام کے بعد واقع نہیں ہوا کہ اسے فا کے ساتھ عطف کیا جاتا، بلکہ "ملأ" کا قول باطل اور رسول کا کلام حق دونوں حصول میں جمع ہوئے ہیں، اس لیے حرفِ واو لائے ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ دونوں قول وجود میں اکٹھے ہیں، لیکن خبر کے لحاظ سے الگ ہیں، بخلاف

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٩) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٢١) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٤) فتح القدير (٣/ ٦٥٧) فتح البيان (٩/ ١١٦)

قصۂ نوح علیہ السلام کے کہ اس میں ''ملأ'' کا قول اُن کے قول کے بعد واقع ہوا ہے، اس لیے وہاں تعقیب کا حرف فا آیا ہے۔ رہی یہ بات کے سورۃ الاعراف میں ہود علیہ السلام کی قوم کا قول جو ہود علیہ السلام کے قول کے جواب میں ہے، وہ واو کے بغیر آیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سوالِ مقدر کا جواب واقع ہوا ہے، مثلاً: کسی سائل نے کہا: پھر اُن کی قوم نے کیا جواب دیا؟ تو کہا گیا کہ انھوں نے ایسا ایسا کہا، اس لیے وہاں حرفِ واو نہ لائے۔

پھر اللہ پاک نے ''ملأ'' یا قوم کی یہ صفت بیان فرمائی: ﴿ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ ﴾ ایک وصف تو یہ ہوا کہ وہ منکر ہوئے۔ دوسرا وصف یہ ہے کہ لقائے آخرت کی تکذیب کی، اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جو حساب کتاب اور ثواب و عذاب ہوگا، اس کو جھٹلایا۔ یا جو قبروں سے اُٹھائے جانے کے بعد دوسری زندگی کی طرف لوٹنا ہوگا اس کی تکذیب کی۔ تیسرا وصف یہ ہے: ''وَأَنْزَلْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا'' یعنی ہم نے ان کو دنیا کی زندگی میں نعمت دی اس طرح سے کہ ان کو بہت سا مال و اولاد دی اور دنیا کی نعمتوں میں اُن کے لیے فراخی اور وسعت بخشی۔ جب مال کثرت سے ملا اور زندگی خوب عیش و آرام سے گزرنے لگی تو اِترا گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنے رسول کا یہ وصف کیا کہ وہ بشریت اور کھانے پینے کے لحاظ سے اس کے مساوی ہیں۔ چنانچہ بولے: ﴿ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴾ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے۔ عائد طرف اس کے یا تو جار و مجرور ہے بعد ﴿ تَشْرَبُوْنَ ﴾ کے، بقرینۂ ماقبل اس کو حذف کیا ہے، یعنی ''مِنْهُ''۔ امام فراء رحمہ اللہ کا قول یہی ہے۔[1] یا عائد منصوب محذوف ہے، یعنی ''تَشْرَبُوْنَهُ''۔ یا کلمۂ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہے اس بنا پر کہ عائد کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ (اس صورت میں مصدر موقع مفعول میں واقع ہوگا: ''أَيْ مِنْ مَشْرُوْبِكُمْ'' (قاله الكرخي))

یہ ان کا پہلا شبہہ ہے ﴿ لَّخٰسِرُوْنَ ﴾ تک مکمل ہوگا۔ ان کی غرض یہ ہے کہ وہ بھی تمھاری طرح ایک بشر ہے، اس کو تم پر کسی قسم کی فضیلت نہیں ہے، پھر وہ تمھاری طرح بشر ہو کر کہاں سے اللہ کی رسالت کا دعویٰ کرتا ہے؟! تمھارے لیے ہرگز یہ جائز نہیں کہ تم اس کی اطاعت کرو۔ ﴿ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ﴾ یعنی اللہ کی قسم! اگر تم نے ایک ایسے آدمی کی، جو مذکورہ صفات میں تمھاری طرح ہے، اطاعت کی، یعنی وہ جس بات کا تم کو حکم کرتا ہے وہ مان لی اور جس بات سے تم کو منع کرتا ہے، اس سے باز آ گئے تو: ﴿ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴾ تو بے شک البتہ تم خراب ہوئے، اس لیے کہ اپنے جیسے ایک بشر کے مطیع اور فرماں بردار ہو گئے، اپنی جانوں کو ذلیل کر ڈالا، اپنے معبودوں کو چھوڑ دیا اور ایک ایسے آدمی کی اطاعت کر لی، جس کو تم پر کسی طرح کی فضیلت نہیں ہے۔ ان کی حماقت پر غور کرنا چاہیے کہ اپنے جیسے شخص کی پیروی کرنے سے تو انکار کیا اور جو اُن سے بھی زیادہ عاجز تھا اس کی عبادت کی۔ یہاں حرفِ لام قسم کا اور ﴿ اِنْ ﴾ شرطیہ دونوں جمع ہوئے۔ ﴿ اِنَّكُمْ اِذًا ﴾ قسم کا جواب ہے اور یہی جواب شرط کے جواب سے کفایت کرتا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ

[1] فتح القدير (٣/ ٦٥٧)

نے اسی طرح کہا ہے۔[1] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شرط کے جواب کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لیے کہ اگر شرط کا جواب ہوتا تو مقرون بحرفِ فا ہوتا، کیوں کہ جملہ اسمیہ ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "کُمْ" اسمِ "إِنَّ" ہے اور "خَاسِرُوْنَ" اس کی خبر ہے اور حرفِ لام، لامِ ابتدا ہے، جو خبر کی طرف لڑک گیا ہے۔

کلمۂ ﴿ إِذًا ﴾ ﴿ إِنَّ ﴾ کے اسم اور خبر کے درمیان مضمونِ شرط کی تاکید کے لیے واقع ہوا ہے۔[2] انتہی۔ امام جمل رحمہ اللہ نے کہا: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿ إِذًا ﴾ بہ معنی "إِنْ" شرطیہ ہے اور اس سے متصل جو تنوین آئی ہے تو وہ جملۂ شرط سے عوض ہے۔ اسی لیے امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿ إِذًا ﴾ کے بعد یہ تقدیر کی ہے: "أَيْ: إِنْ أَطَعْتُمُوْهُ"[3] اس صورت میں اس کا کوئی جواب نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو اپنے ماقبل کی تاکید کے لیے ذکر کیا گیا ہے، بطورِ تاکید لفظی کے ("مِنْ قَبِيْلِ إِعَادَةِ الشَّيْءِ بِمُرَادِفِهِ")۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: "إِنْ أَطَعْتُمُوْهُ" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ "إِذًا" مضارع کا ناصب نہیں ہے یہ تو "إِذْ" شرطیہ ہے، جو جملہ کہ اس کی طرف "إِذْ" مضاف ہوتا ہے، اس کو حذف کر دیا ہے اور اس کی جگہ تنوین لے آئے ہیں، جس طرح کہ ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾ میں ہے، اسی لیے اس "إِذًا" کا دخول مضارع پر خاص نہیں ہے، بلکہ ماضی و مضارع دونوں پر داخل ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَإِذًا لَّآتَيْنٰهُمْ ﴾ [النساء: ٦٧] "اور تب ہم ضرور انھیں دیتے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٤٢] "اور بے شک تب تم (میرے) مقربین میں سے ہوگے۔" (قاله الإمام السيوطي في كتابه الاتقان) امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ إِذًا ﴾ جزا ہے واسطے شرط کے، و "جَوَابٌ لِلَّذِيْنَ قَاوَلُوْهُمْ مِنْ قَوْمِهِ" علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[4]

پھر دوسرا شبہہ بعث کے انکار کا ذکر کیا، اس کا اخیر ﴿ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴾ تک ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا أَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴾ ہمزہ انکار کے واسطے ہے۔ پہلے یہ ذکر کیا تھا کہ رسول ان کو جس بات پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اس کے واقع ہونے کا انکار کیا اور اس کو بعید سمجھا اور اسی انکار اور استبعاد کی وجہ سے رسول کی پیروی کرنے کو برا کہا تھا۔ لہٰذا یہ جملہ اسی مضمون کی تقریر و تاکید کرتا ہے۔ نافع، حمزہ، علی اور حفص نے بکسرِ میم "مِتُّمْ" پڑھا ہے۔[5] "مَاتَ يَمَاتُ" سے، جیسے: "خَافَ يَخَافُ"۔ اور لوگوں نے بضمِ میم پڑھا ہے "مَاتَ يَمُوْتُ" سے، جیسے: "قَالَ يَقُوْلُ"۔ معنی یہ ہیں کہ کیا رسول تم کو اس بات کا وعدہ دیتا ہے کہ تم مرجاؤ گے اور تمھارے جسموں کا بعض حصہ مٹی بن جائے گا اور بعض بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گی، جن پر نہ کوئی گوشت ہے نہ پٹھے، تو تم اپنی قبروں سے یا عدم سے دوبارہ وجود کی شکل میں زندہ نکالے جاؤ گے، جس طرح تم پہلے ہوتے تھے اور تمھارا یہ

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٩) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ١٣٣) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٩)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٤) تفسير النسفي (٣/ ١٢٢) [5] تفسير النسفي (٣/ ١٢٢)

زندہ کیا جانا، اس لیے ہوگا کہ تمھارا حساب کتاب ہو اور تمھیں ثواب اور عذاب دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وعدہ ایسا ہے جو واقع نہیں ہوسکتا۔ کسی نے کہا کہ تراب کو اس لیے پہلے ذکر کیا کہ ان کی عقلوں میں یہ بات زیادہ بعید تھی کہ مٹی ہوکر پھر زندہ ہو۔ کسی نے کہا کہ تمھارے پہلے تو مٹی ہوگئے اور پچھلے ہڈیاں رہ گئے۔

﴿ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ ... الخ ﴾ میں چار وجہیں ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ پہلے "أَنَّ" کا اسم ضمیرِ خطاب کی طرف مضاف ہے اس کو حذف کر دیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا۔ خبر ﴿ اِذَا مِتُّمْ ﴾ ہے۔ ﴿ اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴾ تکرار ہے پہلے "أَنَّ" کی تاکید کے لیے اور اس لیے کہ محذوف پر دلالت کرے۔ "أَيْ: أَيَعِدُكُمْ أَنَّ إِخْرَاجَكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ... الخ" دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ مُّخْرَجُوْنَ ﴾ پہلے "أَنَّ" کی خبر ہے اور وہی عامل ہے ﴿ اِذَا ﴾ میں، اور دوسرے "أَنَّ" کو مکرر ذکر کیا تاکید کے لیے، جبکہ اسم اور خبر کے درمیان فصلِ طویل واقع ہوگئی۔ جرمی وفراء ومبرد اسی طرف گئے ہیں، اسی کے مثل امام زجاج رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[1] تیسری وجہ یہ ہے کہ پہلے "أَنَّ" کی خبر حذف کر دی گئی، اس لیے کہ دوسرے "أَنَّ" کی خبر اس پر دال ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أَنَّكُمْ تُبْعَثُوْنَ" اور یہی ظرف میں عامل ہے اور دوسرا "أَنَّ" اسم اور خبر کے ساتھ پہلے "أَنَّ" سے بدل ہے۔ سیبویہ کا مذہب یہی ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ﴿ اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴾ مبتدا ہے اور ظرفِ مقدم اس کی خبر ہے اور یہ جملہ پہلے ﴿ اَنَّكُمْ ﴾ کی خبر ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِخْرَاجُكُمْ كَائِنٌ" اور "مُسْتَقِرٌّ وَقْتَ مَوْتِكُمْ"۔ یہ جائز نہیں ہے کہ "إِذَا" میں عامل ﴿ مُّخْرَجُوْنَ ﴾ ہو، ہر قول کی بنا پر، اس لیے کہ جو شے "أَنَّ" کے تحت میں ہوتی ہے تو وہ اس کے ماقبل میں عمل نہیں کرتی اور نہ اس میں "متم" عمل کرے گا، اس لیے کہ وہ مضاف الیہ ہے۔ ﴿ اَنَّكُمْ ﴾ اور جو اس کے تحت میں واقع ہوا ہے محلِ نصب میں ہے یا محلِ جر میں حذفِ حرف کے بعد، کیوں کہ اصل یہ ہے: "أَيَعِدُكُمْ بِأَنَّكُمْ"۔ یہ بھی جائز ہے کہ حرفِ جر کی تقدیر نہ ہو تو اس صورت میں فقط محلِ نصب میں ہوگا، جیسے: کہتے ہیں کہ "وَعَدْتُ زَيْدًا خَيْرًا" (كذا قاله السمين)

امام محلی اور نسفی رحمہ اللہ نے ان میں سے دوسری وجہ کو اختیار کیا ہے۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی اس کو پہلے لکھا ہے۔ پھر تین وجہیں اور ذکر کی ہیں[3] اور اسی کو شیخ زادہ نے اظہر کہا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دوسرا "أَنَّ" محلِ رفع میں ہے فعلِ مضمر سے "أَيْ: يَحْدُثُ إِخْرَاجُكُمْ"، جس طرح محاورے میں بولتے ہیں: "اَلْيَوْمَ الْقِتَالُ"، یعنی آج کے دن قتال واقع ہوگا۔[4] مطلب یہ ہے کہ ﴿ اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴾ بتاویلِ مصدر ہو کر مرفوع ہوگا، اس بنیاد پر کہ فعلِ مقدر کا فاعل ہے اور یہی فعلِ مقدر جواب ہوگا ﴿ اِذَا ﴾ شرطیہ کا اور ﴿ اِذَا ﴾ شرطیہ معہ اپنے جواب مقدر کے خبر ہوگا۔

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ١٢٢) معاني القرآن (٤/ ١١)
[2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٩) تفسير النسفي (٣/ ١٢٢)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٤)
[4] تفسير القرطبي (٤/ ١٢٢)

پہلے "أَنَّ" کی تقدیر یہ ہے: "أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَقَعَ إِخْرَاجُكُمْ" اس وجہ میں ﴿ إِذَا ﴾ شرطیہ ٹھہرے گا۔

﴿ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ﴾ "هَيْهَاتَ" اسم فعل لازم بہ معنی "بَعُدَ" ہے، اس کے لیے فاعل مرفوع کا ہونا ضروری ہے، لہٰذا فاعل اس کا مضمر ہے۔ ﴿ لِمَا تُوعَدُونَ ﴾ اس سے متعلق ہوتا ہے، یعنی دور ہوئی تصدیق یا صحت اس چیز کے لیے جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا ہے، یا اس کا واقع ہونا بعید ہوا۔ دوبارتاکید کے لیے کہا گیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حرفِ لام بیانِ مستبعد کے لیے ہے اور ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ کا فاعل ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر "مَا تُوعَدُونَ" کررہا ہے، جس طرح کہ "رُبَّهُ رَجُلًا" میں ضمیر مبہم ہے، یعنی بعید ہوئی وہ شے، پھر اس کی تفسیر کی کہ وہ شے "مَا تُوعَدُونَ" ہے۔ گویا انھوں نے جس وقت کلمۂ استبعاد کی آواز نکالی تو کسی نے کہا کہ یہ استبعاد کس چیز کے لیے ہے؟ تو انھوں نے کہا ﴿ لِمَا تُوعَدُونَ ﴾، یعنی یہ استبعاد اس شے کے لیے ہے جس کا تم کو وعدہ ملتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ حرفِ لام زائد ہے اور "مَا تُوعَدُونَ" ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ کا فاعل ہے، یعنی "بَعُدَ مَا تُوعَدُونَ"۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ بہ معنی "اَلْبُعْدُ" یا "بُعْدٌ" ہے۔ اس صورت میں وہ تو مبتدا ہوگا اور اس کی خبر ﴿ لِمَا تُوعَدُونَ ﴾ ٹھہرے گا۔

امام زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں کہ ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ تقدیرِ مصدر میں ہے۔[1] اسم فعل میں خلاف مشہور ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اسم فعل نام ہے لفظِ فعل کا، یعنی اس کے مدلول کا نام لفظِ فعل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اسم فعل اسم ہے مصدر کا، یعنی اس کے مدلول کا اسم لفظِ مصدر ہے، پس اوّل کے تین قول پہلے قول کی بنا پر ہیں اور چوتھا قول دوسرے قول کی بنیاد پر ہے۔ ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ میں دس لغت ہیں، پھر ان کو بیان کیا ہے۔ علمِ نحو میں اُن کو ذکر کیا ہے، بعض لغات کے ساتھ قراءت بھی وارد ہوئی ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ کا بیانِ جامع یہ ہے کہ "هَيْهَاتَ" اسم فعل ہے، اس کے معنی "بَعُدَ" ہیں، تاکید کے لیے دوبار لایا گیا، مسئلہ بابِ تنازع سے نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اپنی ظاہر عبارت میں اس کی تفسیر مصدر کے ساتھ کی ہے۔ چنانچہ یوں کہہ دیا ہے: "اَلْبُعْدُ لِمَا تُوعَدُونَ"

﴿ هَيْهَاتَ ﴾ اسم ہے واسطے فعل لازم کے، فاعل کو رفع دیتا ہے، یہاں جو اس کا فاعل آیا ہے ظاہر میں مجرور بلام ہے، پس بعض نے تو اس کو اس کے ظاہر پر رکھا اور کہا کہ "مَا تُوعَدُونَ" اس کا فاعل ہے، حرفِ لام اس میں زیادہ کیا گیا ہے۔ بعض نے اس کا فاعل مضمر قرار دیا ہے، اس لیے کہ کلام اس پر دال ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "بَعُدَ إِخْرَاجُكُمْ" اور ﴿ لِمَا تُوعَدُونَ ﴾ میں لام بیان کا ہے، جس طرح کہ ﴿ هَيْتَ لَكَ ﴾ [یوسف: ۲۳] "لو آجاؤ" میں واقع ہوا ہے اور دوسرا ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ پہلے کی تاکید لفظی ہے۔ کلامِ عرب میں غیر موکد بھی آیا ہے۔ اس لفظ میں بہت لغت ہیں، چالیس سے زیادہ۔ اس جگہ مشہور لغات ذکر کرتا ہوں اور جن کے ساتھ قراءت وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ مشہور ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ بفتحِ تائے فوقیہ بغیر تنوین کے۔ مبنی اس لیے ہوا کہ مبنی کے موقع میں واقع ہوا ہے، یا حرف سے مشابہ

[1] معاني القرآن (٤/ ١٢۔ ١٣)

ہے۔ عامہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ یہ حجاز والوں کی لغت ہے۔ دوسرا "هَيْهَاتاً" بفتح وتنوین ہے۔ یہ قراءت ابوعمرو رحمہ اللہ کی ہے۔ ہارون کی روایت میں امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس کو خالد بن الیاس کی طرف منسوب کیا ہے۔ تیسرا "هَيْهَاتٌ"، بضم وتنوین ہے۔ ابوحیوہ شامی رحمہ اللہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔

چوتھا "هَيْهَاتُ" ہے بضم اور بغیر تنوین کے۔ یہ ابوحیوہ رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ ابوحیوہ رحمہ اللہ سے اس میں دو وجہ مروی ہیں: اول میں امام ابوالسماک رحمہ اللہ اُن کے موافق ہیں دوسری میں نہیں۔ پانچواں "هَيْهَاتٍ" ہے بکسر وتنوین۔ یہ عیسیٰ اور خالد بن الیاس رحمہما اللہ کی قراءت ہے۔ چھٹا "هَيْهَاتِ" بکسر اور بغیر تنوین کے ہے۔ یہ امام ابوجعفر وشیبہ رحمہما اللہ کی قراءت ہے اور عیسیٰ رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ یہ تمیم و اسد کی لغت ہے۔ ساتواں "هَيْهَاتْ" باسکانِ حرفِ تا ہے۔ عیسیٰ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح پڑھا ہے اور خارجہ نے امام ابوعمرو و اعرج رحمہما اللہ سے روایت کیا ہے۔[1] آٹھواں "هَيْهَاهَ"، بحرفِ ھا در آخر وصل و وقف میں۔ نواں "أَيْهَاتَ"، حرفِ ہا کو ہمزہ سے بدلا ہے مع فتح حرفِ تا کے۔ امام ابوالبقاء رحمہ اللہ نے جو نقل کیا ہے، اس میں ہے کہ بعض قراء نے ان دونوں کو پڑھا ہے۔

چنانچہ یہ نوں لغت ہیں جن کے ساتھ قراءت کی گئی ہے، لیکن اُن میں سے متواتر سوائے پہلی لغت کے اور کوئی نہیں ہے۔ ساری لغات جن کا ذکر ہوا ہے ان میں جائز ہے کہ پہلی ہا کو ہمزہ سے بدل لیں اس بنا پر پوری سولہ لغت ہو جائیں گی۔ سترھواں "أَيْهَانَ" آخر میں نون کے ساتھ ہے۔ اٹھارواں "أَيْهَا" آخر میں الف کے ساتھ ہے۔ مصحف میں بحرفِ ہا لکھا ہوا ہے۔ قاریوں نے اس پر وقف کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے رسم الخط کی پیروی کی اور حرفِ ہاء پر وقف کیا، کسائی اور بزّی نے ابن کثیر سے اس کو روایت کیا ہے۔[2] بعض نے بحرفِ تا وقف کیا۔ یہ لوگ باقی قراء ہیں۔

امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے "هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ مَا تُوْعَدُوْنَ" پڑھا ہے بدون لامِ جر۔[3] یہ قراءت واضح ہے۔ جو شخص قراءتِ عامہ میں حرفِ لام کی زیادتی کا مدعی ہے، اس کی مؤید کلمۂ "ما" ہے "مَا تُوْعَدُوْنَ" میں۔ احتمال ہے کہ مصدریہ ہو، یعنی "لِوَعْدِكُمْ"۔ یہ بھی احتمال ہے کہ بہ معنی "الذي" ہو اور عائد محذوف، یعنی "تُوْعَدُوْنَهُ" انتھٰی۔ شیخ زادہ نے کہا: اس تقدیر پر کہ "هيهات" اسم فعل ہو، منون اور غیر منون کے درمیان فرق ایسا ہے جیسا کہ "صَه وَ صَهٍ و مَه و مَهٍ" کے درمیان فرق ہے، اس بات میں کہ اول میں ان کی تقدیر یہ ہے: "اِفْعَلِ السُّكُوْتَ وَالْكَفَّ"، اور ثانی میں "اِفْعَلْ سُكُوْتاً وَّكَفًّا"۔

امام زجاج رحمہ اللہ سے ﴿هَيْهَاتَ﴾ کی جو تفسیر مروی ہے کہ "اَلْبُعْدُ لِمَا تُوْعَدُوْنَ" اس شخص کے حق میں ہے، جس نے "مَنُوْن" نہیں پڑھا اور "بُعْدٌ لِمَا تُوْعَدُوْنَ" اس کے حق میں جس نے "مَنُوْن" پڑھا۔[4] لہٰذا ﴿هَيْهَاتَ﴾

---

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٧٤) [2] تفسير البغوي (٥/ ٤١٧) [3] البحر المحيط (٦/ ٣٧٥) [4] معاني القرآن (٤/ ١٢۔ ١٣)

کو قائم مقام مصدر معرف و منکر کے کیا ہے۔ (اگر کوئی کہے کہ جب ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ اسم فعل موقع "بَعُدَ" میں واقع نہ ہوا تو فتح پر مبنی کیسے ہوگا؟ تو کہیں گے کہ اصل میں اسم فعل ہے، گو اس جگہ بہ معنی مصدر مستعمل ہوا ہے، اس کی بنا میں اسی قدر کافی ہے۔ کسی نے یوں کہا ہے کہ اس کی بنا کا موجب یہ ہے کہ اصوات کے مشابہ ہے۔ کذا قال زادہ۔)

کسی نے کہا کہ ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ بالفتح لفظ مفرد ہے اور اس کا حرفِ تا واسطے تانیث کے ہے، جس طرح کہ "ظُلْمَةٌ وَّ غُرْفَةٌ" میں ہے، اسی لیے وقف کرنے والا اس کو ہا سے بدلتا ہے، "هَيْهَاه" کہتا ہے اور الف اس کا حرفِ یا سے مقلوب ہے، کیوں کہ اصل اس کی "هَيْهَيَةٌ" ہے، جیسے: "زَلْزَلَةٌ"۔ رہا مکسورہ تو وہ جمع ہے۔ مفتوحہ کی اصل ﴿ هَيْهَاتَ ﴾ ہے، لام کلمہ حذف کر دیا گیا، یعنی حرفِ یائے ثانیہ، اس پر وقف بتائے فوقیہ ہوتا ہے، مثل "مُسْلِمَاتٌ" کے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس نے منون پڑھا ہے، اس نے اس کی تنکیر کا اعتقاد کیا ہے اور مصدر نکرہ کے معنی کا تصور کیا۔ گویا یوں کہا: "بُعداً بُعْداً"۔ اور جس نے بغیر تنوین کے پڑھا ہے، اس نے اس کو معرفہ سمجھا ہے اور مصدر معرفہ کا تصور فرمایا ہے، گویا اس طرح کہا گیا: "اَلبُعد اَلبُعد"۔ چنانچہ اس قول کے قائل نے تنوین کو نکرہ ہونے کی دلیل ٹھہرایا اور عدمِ تنوین کو معرفہ ہونے کی دلیل ٹھہرایا۔ نکرہ کے لیے تنوین دو ہی قسم میں پائی جاتی ہے، اسمائے افعال و اسمائے اصوات اور یہ بھی قیاس نہیں ہے، یعنی تم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اُن میں سے جس کو چاہے اس پر تنوین ڈال دو، بلکہ جس کی تنوین عرب سے سنی گئی ہے، اسی کے نکرہ ہونے کا اعتقاد کیا جائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ جس نے قراءتِ متقدمہ میں بفتح پڑھا ہے، یہ تخفیف کے لیے ہے اور جس نے بکسر پڑھا ہے تو یہ التقائے ساکنین کے قاعدہ کی بنا پر ہے اور جس نے بضم پڑھا ہے تو اس نے "قَبْلُ" و "بَعْدُ" کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جس نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے تو اس لیے کہ اس بنا میں سکون ہے۔ جس نے بحرفِ ہا وقف کیا ہے تو اس نے اسم کا اتباع کیا ہے۔ جس نے بحرفِ تا وقف کیا ہے، لہٰذا یہ بنا بر اصل ہے، برابر ہے کہ تا مکسور ہو یا مفتوح، کیوں کہ ظاہر یہی ہے کہ دونوں برابر ہیں اور جو کچھ ہوا ہے، وہ تغیرِ لغات سے ہوا ہے۔ غرض کہ قوم نے دوبارہ زندہ ہونے کو انتہائی بعید سمجھا، اس لیے کہ اپنی پہلی پیدائش میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا اور اللہ پاک کی قدرت میں غور نہ کیا کہ وہ تو پہلی دفعہ انھیں وجود میں لا چکا ہے۔ اس استبعاد سے غرض یہ ہے کہ پھر زندہ ہونا کبھی نہ ہوگا۔

پھر اللہ پاک نے اُن کی اتراف کو بیان کیا کہ انھوں نے یوں کہا: ﴿ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا ﴾ یعنی اللہ پاک نے دنیا کی زندگی میں ایسا عیش و آرام دیا کہ بالکل اس میں غرق ہوگئے غور و فکر اور عبرت حاصل کرنا چھوڑ دیا۔ نعمتوں کے مارے اِترا گئے اور یوں کہنے لگے کہ ہماری زندگی تو یہی دنیا کی زندگی ہے، غرض یہ کہ دوبارہ زندہ نہ ہوں گے۔ (اتراف کہتے ہیں نعمت دینے کو، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو اُن کو کثرت سے مال و اولاد دی تو وہ مغرور و مست ہوگئے،

ہوش وحواس جاتے رہے، عقل وفہم کھو گئے، سر کی اور دل کی آنکھوں پر چربی چھا گئی، بلکہ ییے کی بالکل پھوٹ گئیں، اب سمجھے بوجھے کون۔ سچ کہا ہے کہ غنا سے حماقت پیدا ہوتی ہے، چنانچہ قولِ مذکور کہنے لگے۔) اصل اس کی یہ ہے: "إِنِ الْحَيَاةُ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا" چنانچہ پہلی حیات کی جگہ میں ضمیر ہی کو رکھا، اس لیے کہ دوسری حیات اس پر دال ہے۔ اس سے غرض دو تین باتیں ہیں: ایک تو تکرار سے بچاؤ ہے۔ دوسری یہ ہے کہ اس بات کا بتانا ہے کہ اس کا تعین اس کی تصریح کرنے سے کفایت کرتا ہے، جس طرح کہ کسی شاعر نے کہا ہے: ؎

هِيَ النَّفْسُ مَا حَمَّلْتَهَا تَتَحَمَّلُ

یعنی یہ نفس ہی ہے کہ جو کچھ تو اس پر لاد دے تو وہ اس کو اُٹھا لیتا ہے (دوسرا مصرع یوں ہے: ؎ وَلِلدَّهْرِ أَيَّامٌ تَجُوْرُ وَتَعْدِلُ) اور جس طرح یہ قول ہے: "هِيَ الْعَرَبُ تَقُوْلُ مَا شَاءَتْ" یعنی یہ عرب ہی ہیں کہ جو چاہتے ہیں کہتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ نہیں ہے کوئی زندگی مگر یہی دنیا کی زندگی، کیوں کہ "إِنْ" نافیہ ہے جو "هِيَ" پر داخل ہوا ہے۔ کون ہے جو حیاۃ کے معنی میں ہے، کونسی حیات جو کہ دال ہے جنس پر۔ پس مثل اسی لا کے ہو گئے، جو اپنے ما بعد کی نفیِ جنس کرتا ہے۔ جملہ ﴿نَمُوْتُ وَنَحْيَا﴾ مفسرہ ہے۔ انھوں نے جو یہ دعویٰ کیا تھا کہ اُن کی حیات صرف حیاتِ دنیا ہی تک ہے، لہٰذا یہ جملہ اس کی تفسیر کرتا ہے، یعنی ہماری حیاتِ دنیا یہی ہے۔ آخرت کی حیات جس کا تو ہم کو وعدہ دیتا ہے، وہ ہم میں سے بعض کا مرنا ہے اور بعض پیدا کیا جاتا ہے، ایک شخص کا مرنا جینا مراد نہیں ہے، کیوں کہ اس سے تو بعث اور دوبارہ زندہ ہو کر لوٹایا جانا لازم آتا ہے، حالاں کہ وہ اس کے انکار کے درپے ہیں۔ یہ قول امام بیضاوی رحمہ اللہ کا ہے۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک قرن پورا ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرا قرن آتا ہے یا اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی "نَحْيٰ وَ نَمُوْتُ"۔ سیدنا ابی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے اسی طرح پڑھا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ایک قوم مرتی ہے اور ایک قوم زندہ ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آبا مرتے ہیں اور ابناء زندہ ہوتے ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "نَحْيٰ بِأَبْنَاءِنا"[3] یعنی ہم مرتے ہیں اور ہمارے بعد ہمارے بیٹے زندہ رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم مر جاتے ہیں اور ہمارے بیٹے ہمارے خلیفہ ہوتے ہیں۔

پھر جب دوبارہ جی کر اُٹھنے، یعنی حشر کے حق ہونے پر طعن کر کے فارغ ہو چکے تو صراحتاً اس کی نفی کی، چنانچہ بولے: ﴿وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ﴾ یعنی ہم موت کے بعد نہیں اُٹھائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اُن کے دونوں شبہے پورے ہو چکے، کیوں کہ ان کا فساد اور کمینگی ظاہر تھی، اس لیے اُن کو جواب نہ دیا۔ پھر جب واضح طور پر دوبارہ جی اُٹھنے کی نفی کر چکے تو اس پر اپنے نبی پر طعن کرنے کے بنا کی اور صراحتاً کہہ دیا کہ وہ جو بعث کا وعدہ دیتا ہے، تو وہ اللہ پر

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٥) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٢٢) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٩)

جھوٹ ہے، چنانچہ بولے: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ِافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴾ یعنی وہ جو نبوت و رسالت و بعث وحشر نشر و حساب کا دعویٰ کرتا ہے، لہٰذا وہ اُن سب باتوں میں مفتری ہے، یعنی اللہ پاک پر جھوٹ باندھتا ہے۔ جب نبی کے دعویٰ کو افترا ٹھہرا چکے اور افترا پردازی ماننے کے قابل نہیں ہوتی تو بولے: ﴿ وَمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی جو کچھ وہ کہتا ہے ہم تو اس میں اس کی تصدیق کرنے والے نہیں ہیں۔ جب ان کے نبی علیہ السلام ان کے ایمان لانے سے نا اُمید ہوگئے اور جان چکے کہ وہ ہرگز تصدیق نہ کریں گے تو اللہ پاک سے دعا کی، عرض کیا: ﴿ رَبِّ انْصُرْنِيْ ﴾ اے میرے رب! تو مجھ کو اُن پر مدد دے اور اُن سے میرا انتقام لے۔ ﴿ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴾ اس وجہ سے کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلایا ہے۔

اللہ پاک نے ان کی دعا قبول کی اور جس بات کی دعا کی تھی اس کے قبول کرنے کا ان سے وعدہ فرمایا: ﴿ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴾ یعنی اُن سے جو یہ اُمور واقع ہوئے کہ رسول کی تکذیب کی، کفر کیا، عناد و دشمنی کی، کفر پر اَڑے رہے، پس وہ تھوڑے دِنوں میں اُن سب باتوں پر پچھتاتے رہ جائیں گے، جس وقت کہ عذاب کو دیکھ لیں گے، یہ کہیں گے: کاش! ہم ایمان لاتے اور رسول کا کہنا مانتے، مگر اب پچھتاوے کیا ہوت ہے، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ آگے کے دن پاچھے گئے ہر سے کیا نہ ہیت۔

﴿ عَمَّا قَلِيْلٍ ﴾ کے معنی میں عن قریب بھی ہے۔ کلمۂ ''عَنْ'' میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ لَيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴾ سے متعلق ہے: ''أَيْ: لَيُصْبِحُنَّ عَنْ زَمَنٍ قَلِيْلٍ نَادِمِيْنَ'' دوسری یہ ہے کہ ﴿ نٰدِمِيْنَ ﴾ سے متعلق ہے۔ تیسری یہ ہے کہ محذوف سے متعلق ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''عَمَّا قَلِيْلٍ نَنْصُرُهُ''، بسببِ دلالت ما قبل یعنی ﴿ رَبِّ انْصُرْنِيْ ﴾ کے اس کو حذف کر دیا ہے، كذا قاله السمين.

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: ''عن'' بمعنی ''بعد'' ہے۔ کلمۂ ''ما'' میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ جار و مجرور کے درمیان زائد ہے، معنی قلت کی تاکید کے لیے، چناں چہ حرفِ باء کے بعد اس آیت میں زائد آیا ہے: ﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ﴾ [آل عمران: ١٥٩] ''پس (اے نبی) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہوگئے۔'' اور اس آیت میں ﴿ مِنْ ﴾ کے بعد: ﴿ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ ﴾ [نوح: ٢٥] ''بسبب اپنے گناہوں کے۔'' اور کلمۂ قلیل محذوف کی صفت ہے، یعنی زمانۂ قلیل۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کلمۂ ''ما'' زائد نہیں ہے، بلکہ نکرہ بہ معنی شے یا زمانہ ہے اور قلیل اس کی صفت ہے (علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بدل کہا ہے)۔[1] اور ﴿ جَآءَ ﴾ متعلق ہے ﴿ لَيُصْبِحُنَّ ﴾ سے (یہ جواب ہے قسم محذوف کا) یہ اس شخص کے قول کی بنا پر ہے جو معمول ما بعد لامِ قسم کی تقدیم کو قسم پر جائز رکھتا ہے اور جو اس کا قائل نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ محذوف سے متعلق ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''نَنْصُرُكَ عَمَّا قَلِيْلٍ'' اس

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٢٢)

واسطے کہ ماقبل اس پر دال ہے۔ پس فراء تو تقدیم معمول ما بعد لامِ قسم کو قسم پر مطلقاً جائز رکھتا ہے اور جمہور بصریین مطلقاً اس کو منع کرتے ہیں۔ بعض نحویوں نے اس کی تفصیل کی ہے ظرف اور عدیلِ ظرف اور ان دونوں کے غیر کے درمیان، چنانچہ ان دونوں میں تو وسعت کے سبب جائز رکھا ہے اور اُن کے غیر میں منع کیا ہے۔ "وَاللّٰهِ لَأَضْرِبَنَّ زَيْدًا" میں "زَيْدًا لَأَضْرِبَنَّ" کہنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ ظرف و عدیل ونظیر ظرف نہیں ہے۔ كذا قاله زاده.

پھر اللہ پاک نے خبر دی کہ چنگھاڑ نے اُن کو پکڑا اور اُن پر عذاب اور غضبِ الٰہی نازل ہوا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ ﴾۔ مفسرین نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے اُن پر ایک چنگھاڑ ماری اس ہوا کے ساتھ جس سے اللہ نے اُن کو ہلاک کیا تو وہ سب کے سب مر گئے۔ کسی نے کہا: صیحہ سے مراد خود وہ عذاب اور ہلاکت ہے جو اُن پر نازل ہوئی، اسی بارے میں کسی شاعر کا یہ قول ہے ؎

صَاحَ الزَّمَانُ بِآلِ بَرْمَكَ صَيْحَةً   خَرُّوْا لِشِدَّتِهَا عَلَى الْأَذْقَانِ

(شیخ زادہ نے اس کے بجائے "قِتَالُ قَوْمِكَ" کہا ہے۔ والله أعلم. تصحیف ہوئی ہے یا وہ صحیح ہے یا یہ۔)

یعنی برمک کی اولاد پر زمانہ ایسا چیخا کہ اس کی شدت کے مارے ٹھوڑیوں کے بل گر پڑے۔ غرض یہ ہے کہ صیحہ سے یہاں مراد مصیبت وشدت ہے، عین صیحہ مراد نہیں ہے۔ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ ﴿ أَخَذَتْهُمُ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی صیحہ نے ان کو ایسی وجہ ثابت کے ساتھ پکڑا کہ اس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں ہے۔ یا ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ کے معنی "بِالْعَدْلِ" ہیں، جیسے بولتے ہیں کہ "فُلَانٌ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ"، یعنی فلاں عدل کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ صیحہ نے ان کو اللہ پاک کی طرف سے عدل کے ساتھ پکڑا، یا "بِالْعَدْلِ" کے معنی ہیں "بِوَعْدٍ صِدْقٍ"۔ محلی رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کو صیحہ عذاب اور ہلاکت نے پکڑا، درآں حالیکہ وہ حق کے ساتھ آیا تھا۔[1] غرض یہ ہے کہ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ صیحہ سے حال اور "كَائِنَةٌ" محذوف سے متعلق ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس حال کی خبر دی جو عذاب نازل ہونے کے بعد ہوا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ﴾ "جَعَلَ"، "تصییر" (کر دینا) کے معنی میں ہے۔ ﴿ غُثَآءً ﴾ اس کا دوسرا مفعول ہے۔ ہلاک کرنے میں ان کی تشبیہ غثائے سیل سے دی۔ ﴿ غُثَآءً ﴾ وہ کوڑا کچرا ہے جس کو پانی کا سیلاب اُٹھا لاتا ہے۔ یعنی ہم نے ان کو ایسا کر دیا جیسا کہ سیلاب کا کوڑا کچرا، کیوں کہ ﴿ غُثَآءً ﴾ کے اوصاف میں خاص وصف یہ ہے کہ اس کو سیلاب لے جاتا ہے، پھر وہ ہاتھ نہیں لگتا، چنانچہ ہلاکت میں ان کی غثائے سیل سے تشبیہ ایک بلیغ تشبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا ایسا ستیاناس کیا کہ پھر اُن کا اتا پتا نہ لگا۔ ہلاکت شدہ شخص کے حق میں عرب لوگ بولا کرتے ہیں۔ "سَالَ بِهِ الْوَادِيْ" یعنی وادی اس کو بہا لے گئی، یعنی وہ پورے طور پر ہلاک ہوگیا، کیوں کہ وادی میں بھی ہونے کا کم پتا لگتا ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ غُثَآءً ﴾ بہ معنی "جُفَاء" ہے۔ ("جفاء"، بضم ومد خاشاک آب آورد۔

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٥٠)

وقولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ﴾ [الرعد: ١٧] "أَيْ بَاطِلًا" یعنی بے کار)۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ غُثَآءً ﴾ درختوں کے بوسیدہ پتے ہیں، جس وقت پانی کا ریلا بہتا ہے تو اس کے ساتھ مل جاتے ہیں۔[1] کسی نے کہا: ہر وہ شے ہے جس کو سیلاب و دیگ ڈال دیتی ہے، اس طرح سے کہ اس سے کچھ نفع نہیں لیا جاتا، اس باب میں ﴿ غُثَآءً ﴾ کے مثل بیان کی جاتی ہے۔ ﴿ غُثَآءً ﴾ کا لام کلمہ واو ہے، کیوں کہ "غَثَا الْوَادِيْ يَغْثُوْ غُثَاءً" سے ہے، اسی طرح "غُثَتُ الْقِدْرَ" ہے۔

"غُثَا" کا حرفِ ثا مشدد و مخفف دونوں طرح آتا ہے، جمع اس کی "أَغْثَاء" ہے، لیکن یہ جمع شاذ ہے، بلکہ قیاس اس کی جمع کا یہ ہے کہ "أَغْثِيَةٌ" ہو، جیسے: "أَغْرِبَةٌ"۔ یا "غِثْيَانٌ"، جیسے: "غِرْبَانٌ وَغِلْمَانٌ"۔ امام محلی نے کہا: "غُثَاءً نَبْتٌ يَبِسَ"[2] یعنی روئیدگی سبز ہونے کے بعد سوکھ گئی، یعنی خشک ہوگئی، ہم نے اس کو خشک روئیدگی کی طرح کر دیا۔ زیادہ واضح یہ تھا کہ اس کی تفسیر میں "هُوَ الْعُشْبُ إِذَا يَبِسَ" کہتے، (یعنی غثاء گھاس ہے، جبکہ سوکھ جائے۔) جس طرح کہ سورۃ الاعلیٰ میں اُن کے کلام سے ماخوذ ہوتا ہے، علامہ نسفی رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ پتے تنکے جو بوسیدہ اور سیاہ پڑ جاتے ہیں، ان میں سے جو سیلاب اُٹھا لے جاتا ہے، وہ ﴿ غُثَآءً ﴾ ہے۔[3]

﴿ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ میں اخبار و بد دعا دونوں کا احتمال ہے، یعنی اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ ہم نے اُن کے لیے رحمت سے دوری لازم کر دی یا بد دعا ہے، یعنی "بَعُدُوْا بُعْدًا" یعنی وہ دور ہوں دور ہونا۔ "بُعْدًا" مصدر ہے "بَعُدَ"، بمعنی "هَلَكَ" کا۔ اس کا نصب مفعول مطلق کی بنا پر ہے۔ یہ ان مصادر میں سے ہے جن کے افعال کا اظہار مستعمل نہیں ہے۔ حرفِ لام میں دو قول ہیں: ظاہر قول یہ ہے کہ بیان کے واسطے ہے، یعنی جن لوگوں پر بعد کی بد دعا کی گئی اُن کے بیان کے لیے ہے۔ مثلاً: کسی نے کہا کہ "بُعْدًا" اور ہلاکت کس کے لیے ہے تو یہ اس کا جواب ہے کہ ظالم لوگوں کے واسطے ہے۔ حرفِ لام محذوف سے متعلق ہے، جس طرح کہ "سَقْيًا لَهُ" اور "جَدْعًا لَهُ" میں ہے۔[4] (قاله الزمخشري) (یعنی "سَقَاهُ اللّٰهُ سُقْيًا" یہ دعا ہے، اللہ اس کو پانی پلائے، مطلب یہ کہ سیراب و تر و تازہ رکھے، "جَدَعَهُ اللّٰهُ جَدْعًا" بد دعا ہے، یعنی اللہ پاک اس کے ناک کان کاٹے، مطلب یہ کہ اس کو ایذا پہنچائے، مصیبت میں مبتلا کرے۔)

دوسرا قول یہ ہے کہ "بُعْدًا" سے متعلق ہے۔ (قاله الحوفي)، لیکن یہ قول مردود ہے اس لیے کہ یہ بات ہرگز محفوظ نہیں ہے کہ یہ لام محذوف ہو اور مصدر کا وصول اس کے مجرور کی طرف ہوا ہو، اسی لیے ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ ﴾ [محمد: ٨] "اور جن لوگوں نے کفر کیا، تو ان کے لیے ہلاکت ہے۔" میں اشتغال کو منع کیا ہے، اس

---

[1] معاني القرآن (٤/ ١٣) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٥٠) [3] تفسير النسفي (٣/ ١٢٣) [4] الكشاف (٣/ ١٩٠)

لیے کہ لام ''تعساً'' سے متعلق نہیں ہوتا، بلکہ محذوف سے متعلق ہے، گو علامہ زمخشری رحمہ اللہ نے اس کو جائز رکھا ہے۔ (كذا قاله السمين)۔ ﴿ لِلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ کو بجائے ﴿ لَهُمْ ﴾ کے رکھا ہے، چنانچہ اسم ظاہر کا موضع ضمیر میں رکھنا تعلیل کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعد اور ہلاکت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظالم تھے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿ اَلظّٰلِمِيْنَ ﴾ کی تفسیر ''مُكَذِّبِيْنَ'' کی ہے۔[1]

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۴۲ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝۴۳ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۴۴

پھر ہم نے ان کے بعد دوسری امتیں پیدا کیں (42) کوئی بھی امت اپنے مقرر وقت سے آگے نہیں نکل سکتی اور نہ وہ پیچھے رہ سکتی ہے (43) پھر ہم لگاتار اپنے رسول بھیجتے رہے، جب بھی کسی امت کے پاس ان کا رسول آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی، پھر ہم ایک کے پیچھے دوسری قوم کو (ہلاک) کرتے رہے، اور ہم نے انھیں افسانے بنا دیا، چناں چہ ان لوگوں کے لیے دوری ہے جو ایمان نہیں لاتے (44)

مزید کچھ امتوں کا ذکر:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کے بعد دیگر اُمتوں اور مخلوق کو پیدا کیا۔ ﴿ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنی کتاب لوحِ محفوظ اور علمِ قدیم میں جو کچھ ان کے لیے مقدر فرمایا ہے، ان کی پیدائش سے بھی پہلے ایک اُمت بعد ایک اُمت کے، ایک قرن بعد ایک قرن کے، ایک گروہ بعد ایک گروہ کے، خلف بعد سلف کے، سب کے سب اسی مقدر کے مطابق پکڑے جائیں گے، اس سے ذرا بھی آگے پیچھے نہ ہو گا۔ ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ﴾ کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: ''يَتْبَعُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا'' یعنی بعض رسول بعض کے بعد آتے رہے۔[2] (أخرجه ابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم وفي لفظ قال بعضهم: على أثر بعض. كذا في فتح القدير)

یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٥٠) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٣٤) فتح القدير (٣/ ٦٦٣)

رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پھر ان میں سے بعض کو اللہ نے ہدایت دی، اور ان میں سے بعض پر ضلالت ثابت ہوگئی۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ كُلَّ مَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس اُمت کے جمہور (''جمہور'' بالضم ''ہمہ مردم'' كذا في الصراح وقال في المختار: "جمهور الناس" جلهم) اور اکثر لوگوں نے اس کی تکذیب کی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [يٰس: ٣٠] ''ہائے افسوس بندوں پر! ان کے پاس جو بھی رسول آیا وہ اس کا مذاق ہی اُڑاتے (رہے)۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اُن کو ہلاک کر ڈالا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ﴾ [بني إسرائيل: ١٧] ''اور ہم نے نوح کے بعد کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ﴾ یعنی ہم نے اُن کو لوگوں کے لیے اخبار یا احادیث کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا، ان کا کوئی پتا اور نشان نہ رہا، صرف لوگوں میں ان کے قصے اور کہانیاں باقی رہ گئیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ﴾ [سبا: ١٩] ''چناں چہ ہم نے انھیں افسانے بنا ڈالا اور انھیں مکمل طور پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔''[1] كذا قال الحافظ ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ قرون سے مراد اُمتیں، قومیں ہیں، یعنی قرنِ اول کے ہلاک کرنے کے بعد ہم نے اَور قومیں اُن کے رسولوں کے ساتھ پیدا کیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ قرون صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کی قومیں ہیں، چناں چہ اُن کے قصے اسی ترتیب سے سورۃ الاعراف و سورت ہود میں وارد ہوئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یونس علیہ السلام اور ایوب علیہ السلام کی قومیں بھی اُن میں شامل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ قرونِ آخرین ہیں، جیسے: بنی اسرائیل کہ ان میں موسیٰ علیہ السلام سے قبل رسول ہوئے ہیں۔ اس قول کو امام کرخی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ یہاں قرون بلفظ جمع فرمایا اور پہلے قرن بلفظ مفرد کہا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہاں متعدد اُمتوں کا ارادہ کیا ہو اور وہاں ایک اُمت کا قصد فرمایا ہو، چنانچہ اللہ پاک نے بندوں کے بارے میں اپنا کمال علم و قدرت بیان کیا۔ ارشاد فرمایا: ﴿ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴾ ﴿ اُمَّةٍ ﴾ فاعل ہے ﴿ تَسْبِقُ ﴾ کا، حرف ﴿ مِنْ ﴾ اس میں استغراق کے لیے زیادہ کیا گیا ہے۔ اُمت سے مراد ایک قرن میں گروہِ مجتمع ہے۔ "أجل" سے مراد وہ وقت ہے، جو اس کے ہلاک ہونے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی کوئی گروہ اپنے وقتِ مقررہ سے نہ آگے ہوتا ہے نہ پیچھے۔ اسی جیسی یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ فَاِذَا

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٢٦)

جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴾ [الأعراف:٣٤] ''اور ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، تو جب ان کا مقررہ وقت آجائے گا تو وہ (اس سے) لمحہ بھر پیچھے ہوں گے اور نہ آگے ہوں گے۔''

﴿ اَجَلَهَا ﴾ میں مؤنث کی ضمیر اُمت کی طرف پھیری اور ﴿ يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴾ میں مذکر کی ضمیر راجع کی۔ لہٰذا اوّل میں تو لفظ کی رعایت کی اور ثانی میں معنی کی رعایت فرمائی، کیوں کہ امت بہ معنی قوم ہے۔ پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ ان قرنوں کے بعد اس کے رسول متواتر اور پیہم آتے رہے اور اُن کی قوموں کی حالت اُن کے جھٹلانے میں ایک رہی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ﴾ یہ جملہ ماقبل کے جملے پر معطوف ہے، ان معنوں کے ساتھ کہ ہر رسول کا بھیجنا اس قرن کے پیدا کرنے کے بعد ہے، جس کی طرف وہ بھیجا گیا نہ اس معنی کی بنا پر کہ سارے رسولوں کا بھیجنا تمام قرون کے پیدا کرنے کے بعد ہو۔ ''تتریٰ'' میں دو وجہیں ہیں: ظاہر وجہ یہ ہے کہ منصوب ہے ﴿ رُسُلَنَا ﴾ کے حال کی بنا پر بہ معنی متواترین، یعنی ہم نے رسولوں کو بھیجا، درآں حالیکہ وہ متواتر آئے، مطلب یہ ہے کہ ایک کو ایک کے بعد بھیجا، یا بہ معنی ''متتابعین'' اس اختلاف کی بنا پر جو اس کے معنی میں ہے، چناں چہ عن قریب اس کا بیان آتا ہے۔ ''تتریٰ'' کی حقیقت یہ ہے کہ مصدر ہے حال کے موقع میں واقع ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے، بایں تقدیر کہ ''إرسالا تترى''یعنی ہم نے اپنے رسولوں کو اس طرح بھیجا کہ وہ متتابع تھا، یا ''إِرْسَالًا أَثَرَ إِرْسَالٍ'' یعنی بھیجنے کے بعد بھیجنا۔ ابن کثیر و ابوعمرو نے ''تَتْرًا'' پڑھا ہے تنوین کے ساتھ۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ کی قراءت بھی یہی ہے۔ باقی قرائے سبعہ کی قراءت ''تتریٰ'' الف صریح کے ساتھ بغیر تنوین کے ہے۔ مشہور لغت یہی ہے، پھر جس نے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ کلمے کا وزن فَعْل ہے، جیسے: ''فَلْس'' تو ''تتراً'' ایسا ہوا، جیسا کہ ''نَصَرْتُهُ نَصْرًا'' ہے۔ اس وجہ کو یوں رد کیا ہے کہ اس کے حرفِ را پر حرکاتِ اعراب کا جاری ہونا محفوظ نہیں ہے۔ یوں نہیں بولتے ہیں کہ ''هَذَا تَتْرٌ رَأَيْتُ تَتْرًا وَمَرَرْتُ بِتَتْرٍ'' جس طرح یہ کہتے ہیں کہ ''هَذَا نَصْرٌ وَرَأَيْتُ نَصْرًا وَمَرَرْتُ بِنَصْرٍ''۔

پھر جب یہ بات محفوظ نہیں ہے تو واجب ہوا کہ اس کا وزن ''فَعْلًا'' ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ الف اس کا جعفر کے ساتھ ملحق کرنے کے لیے ہے، جس طرح کہ ''أَرْطىٰ وَعَلْقىٰ'' میں ہے، چنانچہ اس کا وزن ''فَعْلىٰ'' ہے مثل ''سَکْریٰ'' کے، پھر جب اس کو منون کیا تو التقائے ساکنین کی وجہ سے اس کا الف گر گیا، یہ وجہ ماقبل سے قریب تر ہے اور جس نے بغیر تنوین پڑھا ہے، اس کے واسطے اس میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ حالتِ وقف میں الف تنوین کا بدل ہے۔ دوسری یہ ہے کہ الف الحاق کا ہے مثل ''أَرْطىٰ وَعَلْقىٰ'' کے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ

[1] تفسیر القرطبي (١٢/ ١٢٥)

الف تانیث کا ہے، مثل "دَعْویٰ" کے۔ یہ وجہ زیادہ واضح ہے۔ "تتری" میں اختلاف ہے کہ آیا مصدر ہے "دَعْویٰ" و "ذِکْریٰ" کی طرح، یا اسم جمع ہے "أَسْریٰ" و "شَتّٰی" کی طرح۔ شیخ نے اسی طرح کہا ہے، لیکن اس میں نظر ہے، اس لیے کہ مشہور یہ ہے کہ "أَسْریٰ" و "شَتّٰی" دونوں جمع تکسیر ہیں، اسم جمع نہیں ہیں۔ "تَتْریٰ" کی تائے اول اصل میں واو ہے، کیوں کہ "وَتَر" سے ماخوذ ہے یا "مُوَاتَرَہ" سے، پھر واو کو حرفِ تا سے قلب کر لیا، جس طرح کہ "تخمہ و تراث و تجاء" میں تا سے قلب کیا ہے۔ "تَتْریٰ" کے مدلول میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ اصمعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک کو ایک کے بعد بھیجا اور دونوں کے درمیان مہلت تھی۔ "وَاتَرْتُ كُتُبِي عَلَيْهِ" کے معنی ہیں: "أَتْبَعْتُ بَعْضَهَا بَعْضًا" یعنی میں نے فلاں کو متواتر خط بھیجے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض خط بعض کے پیچھے بھیجے، مگر اُن میں سے ایک کے اور دوسرے کے درمیان کچھ مہلت تھی۔ امام اصمعی رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا ہے کہ مواترہ سے ماخوذ ہے۔ مواترہ کہتے ہیں: بغیر مہلت کے تابع کو، یعنی ایک شے دوسری شے کے بعد آئی اور دونوں کے درمیان مہلت نہ ہو۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا: "اَلتَّوَاتُرُ: تَتَابُعُ الشَّيْءِ وِتْرًا وَّفُرَادیٰ"

قال تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ﴾ (كذا قال السمين) قاموس میں بھی یہی دو قول لکھے ہیں: "وَاتَرَهُ مُوَاتَرَةً وَّوِتَاراً تَابَعَ، أَوْ لَا تَكُونُ الْمُوَاتَرَةُ بَيْنَ الْأَشْيَاءِ إِلَّا إِذَا وَقَعَتْ بَيْنَهَا فَتْرَةٌ، وَإِلَّا فَهِيَ مُدَارَكَةٌ وَّمُوَاصَلَةٌ"[1] یعنی بغیر مہلت ایک شے کے دوسری شے کے بعد آنے کو مواترت کہتے ہیں، یا مواترت اشیا کے درمیان جبھی ہوتی ہے کہ اُن کے درمیان فترہ ہو اور اگر فترہ نہ ہو تو اس کا نام مدارکہ و مواصلہ ہے۔ تنوین کے ساتھ قراءت کی بنا اس پر تھی کہ ﴿ تَتْرَا ﴾ مصدر ہے۔ لہٰذا امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بنا پر جائز ہے کہ "تِتْراً" بکسر تا ہو، کیونکہ ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا ﴾ کے معنی "وَاتَرْنَا" ہیں۔[2]

امام محلی رحمہ اللہ نے دونوں قراءتوں کے یہ معنی لکھے ہیں: "مُتَتَابِعِينَ بَيْنَ كُلِّ اثْنَيْنِ زَمَانٌ طَوِيلٌ"[3] مطلب یہ کہ ﴿ تَتْرَا ﴾ مصدر ہے مثل "شَبْعیٰ" و "دَعْویٰ" کے اور الف تانیث کا ہے اور نصب حالیت کی بنا پر ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ "تَتْریٰ" بروزن "فعلیٰ" ہے، الف تانیث کا ہے مثل "سَكْریٰ" کے، اس لیے کہ رسل جماعت ہے اور اسی لیے اس پر تنوین نہیں آتی، کیوں کہ غیر منصرف ہے۔ مکی و ابو عمرو و یزید کی قراءت تنوین کے ساتھ ہے۔ اس بنا پر کہ الف الحاق کا ہے مثل "أَرْطیٰ" کے اور دونوں قراءتوں میں نصب بنا بر حال ہے، یعنی "مُتَتَابِعِينَ وَاحِدًا بَعْدَ وَاحِدٍ" اور اصل "وَتْریٰ" ہے ماخوذ "وتر" سے۔ وتر کہتے ہیں فرد کو۔ پس واو کو تا سے قلب کیا ہے مثل "تراث" کے۔ اسی کے لگ بھگ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[4]

---

(1) القاموس المحيط (١/ ٦٣١) (2) تفسير القرطبي (١٢/ ١٢٥)

(3) تفسير الجلالين (١/ ٤٥٠) (4) تفسير النسفي (٣/ ١٢٣) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٥_ ١٥٦)

جملہ ﴿ كُلَّ مَا جَآءَ أُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ ﴾ مستأنفہ ہے، ہر رسول کا اپنی امت کے پاس آنا بیان کرتا ہے، اس بنا پر کہ آنے سے مراد تبلیغ ہے، یعنی ہر رسول نے اپنی امت کو اللہ پاک کی رسالت پہنچا دی اور اس نے رسول کی تکذیب کی۔ ﴿ رُسُلَنَا ﴾ میں رسول کی اضافت مرسِل کی طرف کی، کیوں کہ رسولوں کا بھیجنے والا اللہ پاک ہے اور ﴿ رَسُوْلُهَا ﴾ میں اُن کی طرف اضافت کی، جن کی طرف وہ بھیجا گیا، یعنی اُمت۔ چوں کہ رسول کو مرسِل اور جن کی طرف وہ بھیجا گیا، دونوں سے ملابست وتعلق ہوتا ہے اور اضافت بسبب ملابست کے ہوا کرتی ہے، اس لیے رسول کی اضافت دونوں طرف صحیح ہے۔ یہ تو مانا لیکن اس کا عکس کیوں نہ کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ارسال کا ایک مبدأ ہے اور ایک منتہا ہے، چوں کہ ارسال کا مبدأ مرسِل سے ہوتا ہے، اس لیے ارسال کے ساتھ رسول کی اضافت مرسِل کی طرف کی اور منتہا رسول کا مجی (آنا) ہے تو وہ اُن کی طرف ہوتا ہے جن کی طرف وہ بھیجا گیا، اس لیے مجیٔ کے ساتھ رسول کی اضافت مرسل الیہ کی طرف کی۔ ﴿ جَآءَ أُمَّةً ﴾ میں دو قراءتیں ہیں: ایک تو تحقیق ہر دو ہمزہ اور دوسری تسہیل ہمزہ ثانیہ درمیان ہمزہ و واو، یعنی دوسرا ہمزہ ایسا پڑھا جائے کہ ہمزہ اور واؤ کے درمیان متوسط ہو۔

﴿ فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا ﴾ چنانچہ پیچھے کیا ہم نے بعض اُمتوں اور قرون کو بعض کے ہلاک کرنے میں اس عذاب کی وجہ سے جو اُن پر نازل ہوا، یعنی جس طرح ہر امت یکے بعد دیگرے اپنے اپنے رسول کو جھٹلاتی رہی، اسی طرح ہم بھی رسولوں کو جھٹلانے کے سبب سے ایک امت کو دوسری اُمت کے بعد ہلاک کرتے گئے۔ ﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ أَحَادِيْثَ ﴾ یعنی ہم نے اُن کو قصے کہانیاں کر دیا کہ وہ سنی جاتی ہیں اور اُن پر تعجب کیا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اُن کا پتا نہ رہا، صرف اُن کی حکایتیں باقی رہ گئیں، لوگ تعجب کے طور پر اُن کا ذکر کرتے ہیں اور اُن سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احادیث حدیث کا اسم جمع ہے، اسی معنی میں احادیث النبی ﷺ ہیں اور جمع "أُحدوثة" کی بھی ہوتی ہے۔ "أُحدوثة" وہ شے ہے جس کا قصہ لوگ لہو ولعب کے طور پر بیان کرتے ہیں، اس جگہ یہی مراد ہے۔[1]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی اسی کے قریب ذکر کیا ہے۔[2] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احادیث جمع ہے حدیث کی، لیکن شاذ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بلکہ یہ "أحدوثة" کی جمع ہے، جیسے: "أضحوكة"۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احادیث شر ہی میں بولی جاتی ہیں خیر میں نہیں بولی جاتی،[2] کئی الفاظ میں عرب نے شذوذ کیا ہے، ان کی جمع صیغہ مفاعیل پر بنا لی ہے، جیسے: "أباطيل و أقاطيع"۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: احادیث حدیث کا اسم جمع ہے، اسی سے احادیثِ رسول اللہ ﷺ ہیں۔[3] "أفاعيل" اسم جمع کے وزنوں سے نہیں ہے، اس کو تو ہمارے اصحاب نے جموع شاذہ

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٢٣) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٦) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ١٢٥) [3] الكشاف (٣/ ١٩٠)

میں ذکر کیا ہے، جیسے: "قطيع و أقاطيع" جبکہ "عباديد" پر اس بات کا حکم لگا دیا کہ جمع تکسیر ہے، باوجود اس کے کہ اس کے واحد کا تلفظ نہ کیا۔ تو احادیث تو زیادہ تر اس کی مستحق ہیں، حالاں کہ اس کے واحد کا تلفظ کیا ہے، یعنی حدیث۔ پس واضح ہو گیا کہ احادیث جمع تکسیر ہے اسم جمع نہیں ہے، اس وجہ سے جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں۔ انتہٰی.

امام اخفش رحمہ اللہ نے جو کہا تھا کہ احادیث کا استعمال شر ہی میں ہوتا ہے، مثلاً: یوں بولتے ہیں کہ "صَارَ فُلَانٌ حَدِيثًا"، یعنی فلاں شخص عبرت ہو گیا۔ پس علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ کلمہ مسلم نہیں ہے، کیوں کہ کبھی یوں بھی بولتے ہیں۔ "صَارَ فُلَانٌ حَدِيثًا حَسَنًا"، یعنی فلاں شخص قصۂ حسن ہو گیا، نیک نام ہوا۔ اسی باب سے ابن درید کا مقصورہ میں قول ہے ؎

وَإِنَّمَا الْمَرْءُ حَدِيثٌ بَعْدَهُ فَكُنْ حَدِيثًا حَسَنًا لِمَنْ رَوٰى [1]

یعنی آدمی جو ہے سو اپنے بعد ایک قصہ کہانی ہو جاتا ہے، جب یہ بات ٹھہری تو حدیث حسن ہو، اس شخص کے لیے جو اس کی روایت کرے۔ مطلب یہ ہے کہ نیک نام ہونا بہتر ہے کہ لوگ نیکی سے یاد کریں۔ لیکن امام اخفش رحمہ اللہ کی طرف سے یہ جواب ہو سکتا ہے کہ جہاں کہیں حدیث کا استعمال مطلق بلا قید ہوتا ہے، وہاں مراد شر ہی ہوتا ہے۔ چناں چہ قرآن شریف میں احادیث کا لفظ مطلق آیا ہے اور شر میں مستعمل ہوا ہے، ایک تو یہاں اور دوسری آیت میں بھی آیا ہے، چناں چہ وہ آیت پہلے گزر چکی ہے۔

﴿ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ منصوب بفعلِ محذوف ہے اور یہ بد دعا ہے، یعنی "بَعُدُوْا بُعْدًا"، یعنی جو لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں، وہ دور ہوں دور ہونا۔ یہاں قوم کو موصوف بعدمِ ایمان کیا اور سابق میں موصوف بظلم کیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو دونوں وصفوں میں سے ہر ایک وصف ہر ایک گروہ سے صادر ہوا، یا اس لیے کہ اُن لوگوں سے صرف عدمِ تصدیق ہی واقع ہوئی اور اُن لوگوں نے عدمِ تصدیق کے ساتھ سخت باتیں بھی ملائیں، جو کہ سخت ظلم تھیں، اس لیے اُن کو موصوف "بظلم" کیا۔ یہاں تک تیسرا قصہ پورا ہوا۔ اب اللہ پاک نے چوتھا قصہ بیان کیا، یعنی موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو فرعون اور قومِ فرعون کے پاس بھیجنے کے وقت جو کچھ واقع ہوا، اس کو بیان کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ١ۙ۬ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍۙ۝۴۵
اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ىِٕهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَۚ۝۴۶ فَقَالُوْۤا
اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَۚ۝۴۷

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٦٦٠)

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ بھیجا 45 فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف، پھر انھوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے 46 چناں چہ وہ کہنے لگے: کیا ہم اپنی ہی طرح کے دو انسانوں پر ایمان لائیں، جبکہ ان دونوں کی قوم ہماری غلام (ماتحت) ہے 47 پھر انھوں نے ان دونوں کو جھٹلایا، تو وہ ہلاک شدگان میں سے ہو گئے 48 اور بلاشبہہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، تاکہ وہ (لوگ) ہدایت پائیں 49

موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور فرعون کا قصہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ اس نے اپنے رسول موسی علیہ السلام کو اور اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف آیات اور حجج دامغہ (سر توڑنے والی دلیلیں) اور براہینِ قاطعہ (قطعی دلیلیں) دے کر بھیجا اور فرعون اور اس کی قوم نے اُن کی پیروی کرنے اور اُن کا حکم ماننے سے اس وجہ سے تکبر کیا کہ وہ اُن کی طرح کے بشر تھے، جس طرح کہ گذشتہ اُمتوں نے بشر کے رسول ہونے کا انکار کیا تھا۔ ان کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہوگئے۔ پھر اللہ پاک نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو ہلاک کر دیا اور ایک ہی دن میں سب کو غرق کر دیا اور موسی علیہ السلام پر کتاب یعنی تورات نازل کی، اس میں اللہ کے احکام اور اوامر و نواہی ہیں اور یہ اس کے بعد ہوا کہ فرعون اور قبطیوں کو ہلاک کیا اور اُن کو عزیز اور مقتدر کا پکڑنا پکڑا۔ تورات نازل کرنے کے بعد کوئی امت عامتاً ہلاک نہیں کی گئی، بلکہ مومنین کو کافروں سے لڑنے کا حکم دیا، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾[1] [القصص: ۴۳] ”اور بلاشبہہ ہم نے پہلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو ایسی کتاب دی جو لوگوں کے لیے بصیرت افروز دلائل اور ہدایت اور رحمت تھی، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔“

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَخَاهُ ﴾ سے ﴿ هٰرُوْنَ ﴾ بدل ہے۔ ﴿ بِاٰيٰتِنَا ﴾ میں حرفِ با ملابست کے لیے ہے، یعنی ہم نے ان دونوں کو اس حال میں بھیجا کہ ہماری آیتوں کے ساتھ متلبس تھے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو نشانیاں دے کر بھیجا اور وہ اُن کو لیے ہوئے آئے۔ آیات سے مراد وہی نو نشانیاں ہیں جن کا بارہا ذکر ہو چکا ہے، لیکن اس جگہ ان نشانیوں میں

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۲۷)

سے فلقِ بحر (دریا کے پھاڑنے) کو شمار کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ آیات سے مراد وہ نشانیاں ہیں کہ جن کی انھوں نے تکذیب کی اور اُن سے تکبر کیا۔ ﴿ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ سے مراد واضح حجت خصم کو الزام دینے والی ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو پہلے لکھا ہے اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی پر اکتفا کیا۔[1] کسی نے کہا: ﴿ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ سے مراد عصا (لاٹھی) ہے، عطف ایسا ہے، جیسا کہ جبریل کا عطف ملائکہ پر ہے۔ ﴿ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ ﴾ [القدر: ٤] ''فرشتے اور روح (جبریل) نازل ہوتے ہیں۔''

اس آیت میں گو جبریل علیہ السلام ملائکہ میں داخل ہیں، مگر شرافت کے سبب سے ان کا ذکر علاحدہ کیا۔ اسی طرح یہاں علاحدہ کرکے اس کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ اول واصل معجزات ہے، اس سے اور کئی معجزے متعلق ہیں، مثلاً: سانپ بن جانا، جادوگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کو نگل جانا، اس کے مارنے سے دریا کا پھٹ جانا، پتھر سے چشموں کا پھوٹ پڑنا، نگہبانی کرنا، شمع بن جانا، سبز بار آور درخت ہو جانا اور رسیِ ڈول کا کام دینا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ سے مراد معجزے ہیں اور آیات سے مراد حجتیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دونوں سے مراد معجزے ہیں، کیوں کہ وہ نبوت کی نشانیاں ہیں اور نبی کے دعویٰ پر روشن حجت ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ خود وہی نشانیاں ہیں اور عطف اس مصرعہ کے باب سے ہے: ع

إِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وَابْنِ الْهَمَّامِ

(''قرم'' بالفتح بہ معنی سید یعنی سردار، اور ہمام بہ معنی بادشاہ عظیم الہمت، مطلب یہ ہے کہ ملک قرم اور ابن ہمام دونوں ایک ہی شخص ہیں۔ تعددِ صفات کے لیے عطف کیا ہے) یعنی تعددِ اسم کا فائدہ دینے کے لیے ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ کا قول یہی معلوم ہوتا ہے۔[2] کسی نے کہا کہ آیات سے مراد وہ دلائل ہیں جو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے لیے تھے اور ﴿ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ سے مراد وہی نو نشانیاں ہیں۔ ملاء سے مراد فرعون کی قوم کے اشراف ہیں، چناں چہ اس کا بیان بہت دفعہ ہو چکا ہے۔ ﴿ فَاسْتَكْبَرُوْا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ طالبِ کبر ہوئے، کبر کا تکلف کیا، ایمان لانے سے خود کو بڑا سمجھا۔ اپنے آپ کو بلند سمجھنے اور تکبر کی وجہ سے ایمان قبول کرنے سے باز رہے، اللہ پاک پر اور اس کی نشانیوں پر ایمان نہ لائے، حق کے مطیع اور فرماں بردار نہ ہوئے۔ ﴿ وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ متکبر و مترفع تھے، اپنے آپ کو بہ تکلف سب سے بڑا سمجھتے تھے، ظلم وزیادتی سے لوگوں پر قہر اور زبردستی کرتے اُن کو دباتے اور ان پر اپنی برتری چاہتے۔ کبر وعناد و سرکشی کے مارے اپنا غلبہ چاہتے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل پر ظلم کے ساتھ قہر کرتے تھے۔[3]

جملہ ﴿ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا ﴾ جملہ ﴿ فَاسْتَكْبَرُوْا ﴾ پر معطوف ہے اور جو اُن کے درمیان میں

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٧) تفسير النسفي (٣/ ١٢٣) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٥٠) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٥٠)

ہے وہ جملہ معترضہ ہے اور ہمزہ انکار کے واسطے ہے، یعنی ہم اُن آدمیوں کی کیوں تصدیق کریں جو بشریت میں ہمارے جیسے ہیں، اُن سے اُن کی مراد موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ہیں۔ بشر کا اطلاق واحد و تثنیہ و جمع و مذکر و مؤنث سب پر ہوتا ہے۔ واحد کی مثال: ﴿ بَشَرًا سَوِيًّا ﴾ [مریم: ۱۷] ''کامل آدمی بن کر آیا۔'' جمع کی مثال جیسے: ﴿ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا ﴾ [مریم: ۲۶] ''پھر اگر تو انسانوں میں سے کسی کو دیکھے۔'' اور کقولہ تعالیٰ: ﴿ مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ [یٰسٓ: ۱۵] ''تم ہم جیسے بشر ہی تو ہو۔'' اور کبھی مطابق بھی آتا ہے، اسی سے یہ آیت ہے۔ یہاں اس کا تثنیہ پہلے معنی کے لحاظ سے ہے۔ مثل کا تثنیہ نہ کیا، اس لیے کہ مصدر کے حکم میں ہے افراد و تذکیر میں، مصدر کے قائم مقام ہوتا ہے اور مؤنث کبھی نہیں آتا، مثل کلمۂ غیر کے واحد و تثنیہ و جمع و مذکر و مؤنث اس کے ساتھ موصوف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾ [النساء: ۱۴۰] ''ورنہ تم بھی اس وقت یقیناً انھی جیسے ہو گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ۱۲] ''اور زمینیں بھی ان (آسمانوں) کی مثل۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ ﴾ [البقرۃ: ۲۳] ''تو تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ۔''

کبھی تثنیہ کے مطابق آتا ہے، کقولہ تعالیٰ: ﴿ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ ﴾ [آل عمران: ۱۳] ''وہ (کافر) ان (مسلمانوں) کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔'' اور جمع کے مطابق کقولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ﴾ [محمد: ۳۸] ''پھر وہ تم جیسے (نافرمان) نہ ہوں گے۔'' کسی نے کہا ہے کہ مراد بشریت میں مماثلت ہے نہ کہ کمیت میں۔ کسی نے کہا ہے کہ دو سے واحد کے ساتھ اکتفا کیا ہے۔ یہ قصے جس طرح تم دیکھ رہے ہو، اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ منکرینِ نبوت کے شبہوں کی انتہا یہ ہے کہ انھوں نے نبیوں کی حالت کو اپنی حالت پر اس سبب سے قیاس کیا ہے کہ ان کے درمیان حقیقی مماثلت ہے، حالاں کہ ایک صاحبِ بصیرت شخص تھوڑا سا غور کر کے اس قیاس کی خرابی کو جان لیتا ہے۔ نفوسِ بشری اگرچہ اصل قوتوں اور ادراک میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، لیکن انہیں دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے اور جس طرح تم دیکھتے ہو کہ غبی اور کند ذہن لوگوں کو اُن کی سوچ اپنے نقصان میں کسی طرح کا فائدہ نہیں دیتی، اسی طرح ممکن ہے کہ زیادت (فائدے) حاصل کرنے کے لیے بعض لوگ ایسے ہوں کہ اکثر اشیا اور بہت سے حالات میں وہ ایسی شے کو معلوم کر لیں، جس کا ادراک ان کا غیر نہ کر سکے اور وہ ایسی فائدے کی بات جان لیں کہ ان کے علاوہ کسی کا علم وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

اسی مضمون کی طرف اس آیتِ کریمہ میں اشارہ کیا ہے: ﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ [الکھف: ۱۱۰] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تو بس تمھاری ہی طرح بشر ہوں۔'' کیوں کہ یہ آیت اس بات پر دال ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اصل بشریت اور اس کے لوازمات، یعنی قوتوں اور ادراک میں سارے آدمیوں کے ساتھ شریک ہیں۔ اور ﴿ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾ [الکھف: ۱۱۰] ''میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا الٰہ صرف ایک الٰہ ہے۔''

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ ان سے جدا ہیں اور ادراک کی ایک قسم کے ساتھ جو کہ وحی ہے آپ ﷺ ان سے متفرد ہیں۔ اس کے بعد اصل ادراک میں دوسرے انسانوں کے ساتھ شریک ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کے علوم مکتسب نہیں کہ کسی معلم سے اُن کو سیکھ لیا ہو، اس کے برعکس دوسرے لوگوں کے علوم کسبی ہیں، استاد سے سیکھ کر اُن کو حاصل کرتے ہیں۔ یہ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل ہے۔[1] اسی لیے نبی اکرم ﷺ کا لقب اُمی ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے کسی معلم سے کچھ سیکھا پڑھا نہیں۔ اللہ پاک نے محض اپنے فضلِ خاص سے آپ کو اولین اور آخرین کا علم عطا فرمایا، چناں چہ سعدی رحمہ اللہ نے اسی مضمون کو نظم کے پیرائے میں ادا کیا ہے: ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست کتب خانۂ چند ملت بہ شست

''ایسا بے بہرہ کہ جس نے ابھی تک قرآن ہی کو درست نہیں سیکھا، اس نے کتنی قوموں کے کتب خانے صاف کر دیے۔''

اسی طرح حافظ شیرازی رحمہ اللہ نے دوسری طرز پر اس کو نظم فرمایا ہے: ؎

نگارِ ما کہ بمکتب نرفت وخط ننوشت بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

''میرا محبوب جو نہ کسی مدرسے میں گیا اور نہ اس نے کوئی خط لکھا، وہ اپنی آنکھ کے ایک اشارے سے سیکڑوں استادوں کو پوچھی گئی بات کی تعلیم دینے والا بن گیا۔''

جملہ ﴿ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴾ حالیہ ہے، یعنی ہم کس طرح اپنے جیسے آدمیوں کے مطیع ہوں حالت یہ ہے کہ ان کی قوم یعنی بنی اسرائیل ہمارے خادم ہیں اور غلاموں کی طرح ہمارے مطیع اور فرماں بردار ہیں، ہمارے سامنے عاجزی اور فروتنی کرتے ہیں۔ جو کوئی کسی بادشاہ کے لیے عاجزی کرتا ہے اور اس کا مطیع ہوتا ہے تو عرب کے نزدیک وہ اس کا عابد ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عابد مطیع اور عاجزی کرنے والے کو کہتے ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ فرعون الٰہیت کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ لٰہذا اس نے لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلایا تو وہ اس کے مطیع ہوگئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس بنا پر عبادت اپنے حقیقی معنی پر ہوگی۔ ﴿ لَنَا ﴾ میں حرفِ لام فواصل کی رعایت کے سبب ﴿ عٰبِدُوْنَ ﴾ سے پہلے رکھا ہے۔ (فواصل فاصلہ کی جمع ہے قرآن شریف کے قوافی کو فواصل کہتے ہیں۔) ﴿ فَكَذَّبُوْهُمَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان کی تکذیب پر اصرار کیا۔

﴿ فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴾ یعنی پھر وہ ہلاک کیے گئے لوگوں سے ہو گئے، اس طرح سے کہ دریائے قلزم میں ڈوب گئے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اُن کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بعد جو کچھ گزرا، اللہ پاک نے اس کو بیان کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ ﴾ یعنی تورات۔ خاص موسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس لیے کیا کہ تورات شریف کوہِ طور پر انہیں پر نازل کی گئی اور ہارون علیہ السلام اُن کے خلیفہ تھے اُن کی قوم میں۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾ میں ضمیر

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٦۔ ١٥٧)
[2] فتح القدير (٣/ ٦٦٠)

بنی اسرائیل کی طرف راجع ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے، یعنی ہم نے ان کو تورات اس واسطے عطا کی کہ شاید اس کے سبب سے ان کی قوم حق کی طرف راہ پائے اور جو شریعت اور احکام اس میں ہیں، اُن پر عمل کرے۔

چنانچہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینا، اُن کی قوم کو دینا قرار دیا، کیوں کہ اگر چہ وہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی، لیکن وہ انہی کی قوم کی ہدایت کے لیے تھی۔ کسی نے کہا: وہاں مضاف مقدر ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کیا ہے، یعنی "اٰتَيْنَا قَوْمَ مُوْسٰى الْكِتٰبَ"، کسی نے کہا ہے کہ ﴿لَعَلَّهُمْ﴾ کی ضمیر فرعون اور ملائے فرعون کی طرف پھرتی ہے، لیکن یہ قول وہم ہے، کیوں کہ تورات موسیٰ علیہ السلام کو نہیں دی گئی، مگر فرعون اور قومِ فرعون کو ہلاک کرنے کے بعد جیسا کہ اللہ پاک نے خود ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى﴾ [القصص: ٤٣] "اور بلاشبہ ہم نے پہلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو ایسی کتاب دی۔"[1] كذا في فتح البيان وغيره. پھر اللہ پاک نے عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کی طرف اجمالاً اشارہ کیا، یہ پانچواں قصہ ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

اور ہم نے (عیسیٰ) ابن مریم اور اس کی ماں کو عظیم نشانی بنایا اور ایک سکون اور جاری چشمے والی بلند جگہ پر ان دونوں کو ٹھکانا دیا﴿50﴾

عیسیٰ و مریم علیہما السلام کا ذکر:

عیسیٰ علیہ السلام جب ماں سے پیدا ہوئے، اس وقت کے بادشاہ نے نجومیوں سے سنا کہ بنی اسرائیل کا بادشاہ پیدا ہوا ہے، وہ دشمن ہو گیا اور اُن کی تلاش میں لگ گیا۔ ان کو بشارت ہوئی کہ اس کے ملک سے نکل جاؤ، وہ نکل کر مصر میں چلے گئے، وہاں ایک گاؤں کے زمیندار نے مریم علیہا السلام کو اپنی بیٹی بنا کر رکھا۔ جب عیسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے اس وطن کا بادشاہ مر چکا تھا، تب پھر اپنے وطن کو واپس آئے، وہ گاؤں ایک ٹیلے پر تھا اور وہاں کا پانی خوب تھا۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے بندے اور رسول عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی خبر دیتا ہے کہ اس نے ان دونوں کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنایا، یعنی اُن کو اپنی قدرت پر ایک قطعی حجت بنایا کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے، اس کے کرنے پر قادر ہے، کیوں کہ اس نے آدم علیہ السلام کو بغیر باپ اور ماں کے پیدا کیا اور حوا کو نر سے بغیر مادہ کے پیدا کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر مرد کے عورت سے پیدا فرمایا اور باقی لوگوں کو عورت اور مرد دونوں سے پیدا کیا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ربوہ زمین سے بلند جگہ ہے، اس میں روئیدگی سب سے بہتر ہوتی ہے۔ (كذا أخرجه ابن أبي شيبة وابن المنذر و ابن أبي حاتم عنه وكذا تفسير ﴿ذَاتِ قَرَارٍ﴾ ذات خصب ﴿وَمَعِيْنٍ﴾ الماء الظاهر كذا في الفتح)

[1] فتح البيان (٩/ ١٢٢۔ ١٢٤)

امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ "ذَاتِ خَصْبٍ" (فراخ سال وحال) یعنی وہ زمین جس میں روئیدگی و زراعت خوب ہوتی ہے۔ ﴿ مَعِيْنٍ ﴾ کے معنی ہیں "مَاءٍ ظَاهِرٍ"، یعنی روئے زمین پر بہتے ہوئے پانی کو ﴿ مَعِيْنٍ ﴾ کہتے ہیں، جیسے: ندی نالے کا پانی کہ زمین پر بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "رَبْوَةٍ مُسْتَوِيَةٍ" یعنی برابر زمین۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: "ذَاتُ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ اِسْتَوَى الْمَاءُ فِيْهَا" یعنی اس میں پانی برابر جاری تھا۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ معین جاری پانی ہے۔[1] پھر مفسروں نے اس ﴿ رَبْوَةٍ ﴾ کی جگہ میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کونسی زمین تھی، چنانچہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا ہے کہ "ربا" یعنی ٹیلے صرف مصر ہی میں ہوتے ہیں اور جس وقت پانی چھوڑا جاتا ہے تو گاؤں ٹیلوں پر ہوتے ہیں، اگر ٹیلے نہ ہوں تو گاؤں ڈوب جائیں۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے بھی اسی کے لگ بھگ مروی ہے۔ یہ قول نہایت بعید ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن مسیّب سے ﴿ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ دمشق ہے، کہا کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، حسن، زید بن اسلم اور خالد بن معدان رحمہم اللہ سے بھی اس کی مثل مروی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بطریقِ عکرمہ یہ روایت کیا ہے کہ ﴿ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴾ انہارِ دمشق ہیں۔ لیث بن ابی سلیم رحمہ اللہ کے الفاظ مجاہد رحمہ اللہ سے یہ ہیں: ﴿ وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ﴾ کہا کہ عیسی ابن مریم علیہما السلام اور اُن کی ماں نے جس وقت ٹھکانا پکڑا غوطۂ دمشق کی طرف اور جو اس کے اردگرد ہے۔ (غوطہ بالضم دمشق میں ایک جگہ ہے، اس میں پانی اور درخت بہت ہیں۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں چار جنتیں ہیں ان میں ایک غوطۂ شام ہے۔)

عبدالرزاق نے بشر بن رافع سے روایت کیا ہے وہ ابوعبداللہ، جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی ہیں، سے روایت کرتے ہیں، کہا کہ میں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ اس کی تفسیر میں کہتے تھے کہ وہ رملہ ہے (شام میں ایک شہر فلسطین کا۔[2] (فلسطون وفلسطين وقد تفتح فاؤهما شهرستان وناحيه۔ صراح۔ قاله في المختار) كوزة بالشام والكورة المدينة والصقع وهو بالضم الناحية كذا في القاموس۔ غرض یہ ہے کہ فلسطین پرگنہ شام کا رملہ ایک شہر ہے۔)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مرّہ بہزی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص کے لیے فرماتے ہوئے سنا کہ بے شک تو ربوہ میں مرے گا۔ پھر وہ رملہ میں مرا۔[3] یہ حدیث انتہائی غریب ہے۔ اس بارے

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٨۔ ٣٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٢٧) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٣٧)
[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٢٧) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔

میں سب قولوں سے قریب تر وہ قول ہے جس کو امام عوفی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ مَعِيْنٍ ﴾ جاری پانی ہے اور یہ وہ نہر ہے جس کے بارے میں اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴾[1] [مریم: ٢٤] ''تیرے رب نے تجھ سے نیچے (کے علاقے میں) ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔'' اور اسی طرح امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے۔ ﴿ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴾ وہ بیت المقدس ہے۔ پس یہ قول ۔واللہ أعلم۔ ظاہر تر ہے، اس لیے کہ دوسری آیت میں مذکور ہے اور بعض قرآن بعض کی تفسیر کرتا ہے۔ جس شے کے ساتھ تفسیر کی جاتی ہے، اس میں اولیٰ اور بہتر یہی ہے۔ پھر احادیثِ صحیحہ پھر آثار، غرض کہ قرآن کی تفسیر قرآن کے ساتھ سب سے بہتر و برتر ہے۔[2] (یاد آتا ہے کہ سید محمد بن اسماعیل امیر یمنی رحمہ اللہ نے اس قسم کی مستقل تفسیر تالیف فرمائی ہے۔)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام اور والدۂ عیسیٰ علیہما السلام کو ایک نشانی ٹھہرایا کہ وہ ہماری عظیم قدرت اور بدیع صنع، (یعنی کاریگری) پر دلالت کرتی ہے۔ سورۃ الانبیاء کے آخر میں اس آیت کی تفسیر میں اس پر کلام گزر چکا ہے: ﴿ وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩١] ''اور اسے اور اس کے بیٹے (عیسیٰ) کو اہلِ عالم کے لیے (عظیم) نشانی بنا دیا۔'' عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے آیت کی تفسیر میں قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اس کو بغیر باپ کے جنا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ربیع بن انس رحمہ اللہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ آیت سے مراد عبرت ہے۔[3]

مطلب یہ ہے کہ بغیر باپ اور بغیر نطفے کے بچہ پیدا کرنے میں ایک بڑی نشانی اور عبرت ہے۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے عیسیٰ علیہ السلام کو اس طرح نشانی ٹھہرایا کہ ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور پالنے میں چھوٹی عمر میں اُن کو گویا فرمایا اور اُن کے ہاتھ پر مادر زاد اندھے اور کوڑھی کا تندرست کر دینا جاری فرمایا، ان کو مردوں کا زندہ کرنا عطا کیا۔ مریم علیہا السلام کو بھی یوں نشانی بنایا کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر کسی مذکر کے جنا۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مریم علیہا السلام نے اپنی چھوٹی عمر میں بات کی، جبکہ کہا: ﴿ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [آل عمران: ٣٧] ''یہ اللہ کی طرف سے (آئی) ہیں، بے شک اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔'' اور کبھی کسی پستان کو منہ میں نہ لیا۔[4] یا تو یہ زکریا علیہ السلام کا معجزہ تھا یا مریم علیہا السلام کی کرامت تھی۔ یا ارہاص تھا عیسیٰ کا۔ (ارہاص پیدا کرنا کسی امر خارقِ عادت کا ہے، جو دال ہو نبی کی بعثت پر اس کی بعثت سے قبل۔[5] (كذا في تعريفات الجرجاني))

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٨۔ ٣٩) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٢٧۔ ٣٢٨) [3] الدر المنثور (٦/ ٩٩) فتح البيان (٩/ ١٢٤)
[4] تفسير البغوي (٢/ ٣٢) [5] التعريفات (١/ ٢٣٥)

لیکن اللہ پاک نے کلمۂ ﴿ اٰيَةً ﴾ مفرد ذکر فرمایا۔ ''آیتین'' نہ کہا، اس لیے کہ اس بات کا ارادہ نہیں کیا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک علاحدہ آیت ہے، بلکہ یہ بات بیان کرنا مقصود ہے کہ ولادت کے لحاظ سے دونوں ایک آیت ہیں، کیوں کہ عیسی علیہ السلام بغیر مذکر (باپ) کے پیدا ہوئے اور اُن کو اُن کی ماں نے جنا بغیر اس کے کہ اُن کو کوئی مرد چھوئے۔ تو وہ دونوں اس عجیب امر میں شریک ہوئے جو ناقضِ عادت ہے۔ چنانچہ بات ایک ہی ہے اور دونوں کی طرف اس کی نسبت کی گئی ہے، اسی لحاظ سے ﴿ اٰيَةً ﴾ کو مفرد ذکر کیا۔ یا اصل میں اس طرح ہے: ''وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ آيَةً وَّأُمَّهٗ آيَةً'' اول آیت کو دوسری آیت کی دلالت کی وجہ سے حذف کر دیا ہے اور دونوں کے علاحدہ علاحدہ آیت ہونے کی وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے۔

﴿ وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے ان کو بسایا، اتارا، پہنچایا اور اُن کی منزل وٹھکانا ایک بلند زمین کی طرف کر دیا۔ خطیب نے ذکر کیا ہے کہ اس جگہ ٹھکانا بنانے کا سبب یہ ہے کہ اس وقت کے بادشاہ نے چاہا تھا کہ عیسی علیہ السلام کو مار ڈالے، لہٰذا اُن کی والدہ اُن کو لے کر اس بلند زمین کی طرف بھاگ گئیں، بارہ برس وہاں ٹھہری رہیں، یہاں تک کہ وہ بادشاہ مر گیا۔ (شیخ زادہ رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کہا ہے کہ مریم علیہا السلام کو اُن کے چچا زاد بھائی یوسف لے گئے تھے۔ پھر بادشاہ کے مرنے کے بعد اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ آئیں۔)

''ربوۃ'' فتح وضم رائے مہملہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ امام ابن عامر و عاصم کی قراءت بفتحِ راء ہے۔[1] کسی نے ''رباوۃ'' بضم وکسر راء پڑھا ہے۔ ''ربوۃ'' بحرکاتِ ثلثہ را، مرتفع مکان کو کہتے ہیں۔ اسی کی مثل ''رباوۃ'' بضم و کسر ہے۔ ''ربوۃ'' سے مراد بیت المقدس کی زمین ہے، اس لیے کہ وہ بلند زمین ہے، اٹھارہ میل سب زمین سے قریب تر ہے طرف آسمان کے۔ یا مراد دمشق ہے یا رملۂ فلسطین یا مصر، کیوں کہ مصر کے گاؤں ٹیلوں پر ہیں۔ یہ چاروں قول علامہ نسفی اور بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان کیے ہیں اور امام محلی رحمہ اللہ نے تین قول: بیت المقدس یا دمشق یا فلسطین۔[2]

بیت المقدس کے قائل امام قتادہ اور کعب رحمہ اللہ ہیں۔ دمشق کے قائل عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، سعید بن مسیّب اور مقاتل رحمہ اللہ۔[3] ارضِ فلسطین کے قائل امام سدی۔[4] وکیع، فریابی، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن منذر، ابن ابی حاتم، تمام رازی، ابن عساکر اور سیوطی نے کہا: بسندِ صحیح ان سب نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہم کو خبر دی گئی ہے کہ ''ربوہ'' دمشق ہے۔ امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے اسی کے مثل عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ان سے ''وَأَخْرَجَ ابْنُ عَسَاكِرٍ عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ مَرْفُوْعًا نَحْوَهٗ وَإِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ''[5] امام ابن جریر، ابن ابی حاتم اور طبرانی نے اوسط میں اور ابن مردویہ اور ابن عساکر نے مرۃ بہزی رضی اللہ عنہ سے

[1] تفسير القرطبي (٣/ ٣١٦) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٢٤) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٧) تفسير الجلالين (١/ ٤٥٠)
[3] تفسير الطبري (١٩/ ٣٧۔ ٣٨) تفسير القرطبي (١٢/ ١٢٦) [4] تفسير البغوي (٥/ ٤١٩) [5] الدر المنثور (٦/ ١٠١)

روایت کیا ہے۔ کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا فرماتے تھے کہ ربوہ رملہ ہے۔[1] (و أخرج عبد الرزاق و عبد بن حميد و ابن جرير و ابن أبي حاتم والحاكم في الكنىٰ و ابن عساكر عن أبي هريرة، قال: هي الرملة عن فلسطين، و أخرجه ابن مردوية عن حديثه مرفوعا، وأخرج الطبراني وابن السكن وابن منده وأبو نعيم وابن عساكر عن الأقرع بن شفي العكي مرفوعا نحوه)[2]

پھر اللہ پاک نے "ربوة" کی دو صفتیں ذکر فرمائیں: ایک تو ذاتِ قرار، یعنی وہ بلند جگہ قرار والی ہے۔ قرار ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں مفسرین نے قرار کی تفسیر مستقر کے ساتھ کی ہے۔ یعنی قرار پکڑنے کی جگہ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرار گاہ زمین کے برابر تھی، اس میں جو لوگ قرار پذیر ہوتے، اُن کے ٹھہرنے کے لیے لیاقت رکھتے تھے۔ پھر کسی نے کہا ہے کہ "ربوة" کے ذاتِ قرار ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ذاتِ ثمار و ماء تھا، یعنی اس میں میوے تھے اور پانی تھا۔ اس معنی کی بنا پر ذات قرار کنایہ ہوگا، کیوں کہ جگہ کا میوے والی اور پانی والی ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ جگہ قرار پکڑنے والوں کے لیے قرارگاہ ہو۔ چنانچہ لازم بولا، یعنی جگہ کا صاحبِ قرار گاہ ہونا اور مراد ملزوم لیا، یعنی جگہ کا پھلوں اور پانی والی ہونا۔ ان دونوں وجھوں کی بنیاد پر قرار بہ معنی مستقر ہوگا، لیکن دوسری وجہ بطورِ کنایہ کے ہوگی اور پہلی تصریح کے طور پر، یعنی بغیر کنایہ۔ غرض یہ ہے کہ جہاں صاف شیریں پانی ہوتا ہے اور انواع و اقسام کے میوے ہوتے ہیں، وہاں کے رہنے بسنے والے ایسی جگہ میں قرار پذیر ہوتے ہیں ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں — مگس و مرغ و مور گرد آیند

"جہاں کہیں میٹھے پانی کا چشمہ ہوتا ہے، وہاں مکھیاں، پرندے اور چیونٹیاں جمع ہوجایا کرتی ہیں۔"

دوسری صفت ﴿ وَّمَعِيْنٍ ﴾ ہے، یعنی وہ ربوہ ذاتِ مائے معین تھا۔ مطلب یہ کہ اس میں پانی ظاہر جاری تھا۔ ﴿ مَعِيْنٍ ﴾ کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا میم زائد ہے، جس طرح کہ منبع میں زیادہ ہے، اس کی اصل معیون ہے، یعنی آنکھ سے دیکھا گیا، پھر اس میں مبیع کا اعلال کیا گیا۔ محاورے میں بولتے ہیں: "عانه" جبکہ کوئی شخص کسی شے کا آنکھ سے ادراک کرے، جس طرح یہ ہے کہ جس وقت کوئی کسی کے سر کو ایذا پہنچائے تو کہتے ہیں: "رَأَسَهُ" اور اس کے جگر پر ضرب لگائے تو کہتے ہیں: "كَبِدَهُ" اسی لیے خلیل نے اس کو مادہ ع ی ن میں داخل کیا ہے۔ آیتِ کریمہ میں ﴿ مَعِيْنٍ ﴾ صفت ہے، موصوف محذوف کی: "أَيْ: وَمَاءٍ مَعِيْنٍ" اس ربوہ کی یہ تعریف کی کہ روئے زمین پر اس کا پانی جاری ہے۔ اس طرح سے ظاہر ہے کہ آنکھوں سے اس کا ادراک کیا جاتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "هُوَ الْمَاءُ الْجَارِيْ فِي الْعُيُوْنِ" اسی طرح امام فراء رحمہ اللہ نے بھی کہا۔[3]

---

[1] المعجم الأوسط (۷/ ۸) اس کی سند میں "عباد بن عباد" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۳٦٥٤)

[2] الدر المنثور (٦/ ۱۰۱۔ ۱۰۲) [3] فتح القدير (۳/ ٦٦۱)

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا میم اصلی ہے اور وزن فعیل، مشتق ہے ''مَعَنَ'' سے، ''مَعَنَ'' جاری ہونے کو کہتے ہیں، اسراع (تیزی) وابعاد (دوری) کے ساتھ۔ جس وقت گھوڑا دوڑتے ہوئے دور دور قدم رکھتا ہے تو عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: ''مَعَنَ الْفَرَسُ'' اور جب کوئی کسی کا حق لے جاتا ہے تو بولتے ہیں: ''أَمْعَنَ بِحَقِّ فُلَانٍ'' اور جب کوئی اپنی حاجت کی طلب میں جلدی کرنے والا ہو تو کہتے ہیں: ''رَجُلٌ مَعِيْنٌ فِيْ حَاجَتِهِ'' پانی جب جاری ہوتا ہے تو کہتے: ''مَعَنَ الْمَآءُ''۔ پانی بہنے کی جگہ کا نام معیان رکھا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: ''مَعَنَ الْمَاءُ إِذَا جَرَى فَهُوَ مَعِيْنٌ وَمَعْيُوْنٌ'' اسی طرح ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[1] یہ سب معنی جری و سرعت کی طرف جاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ معن تھوڑی چیز کو کہتے ہیں: ''مَاعُوْن'' اسی سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''معن'' اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جب شے کثیر ہو جاتی ہے تو بولتے ہیں: ''مَعَنَ الشَّيْءُ مَعَانَةً'' کسی نے کہا ہے کہ ''ماعون'' سے مشتق ہے۔ ''ماعون'' وہ شے ہے جس کی لوگ عادت میں ایک دوسرے کی معاونت کیا کرتے ہیں، جیسے: کڑاہی، بسولا، ہانڈی وغیرہ۔

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ماعون'' گھر کے منافع کے لیے ایک اسم جامع ہے۔ پانی کا نام بھی ماعون رکھتے ہیں اور ماعون جاہلیت میں ہر منفعت وعطیہ ہے اور اسلام میں طاعت و زکات۔ منفعت موضع نفع کو کہتے ہیں، یعنی جس شے سے نفع لیا جائے، جس طرح کہ مأسدہ و مسبعہ ہے کہ یہ دونوں شیر اور درندے کی جگہ کا اسم ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''معن'' بہ معنی سہل ہے کہ مطیع اور فرماں بردار ہو، نافرمانی نہ کرے اور ''ماعون'' وہ شے ہے کہ اس کے دینے والے پر سہل ہو، یعنی اس کا دینا گراں نہ گزرے، یہ بیان معجون مرکب ہے سمین اور شیخ زادہ رحمہما اللہ سے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا مختصر و جامع بیان، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، یہ ہے کہ معین آبِ ظاہر جاری ہے۔ اس کا وزن فعیل ہے: ''مَعَنَ الْمَاءُ إِذَا جَرَى'' سے ماخوذ ہے۔ اس کی اصل اِبعاد ہے: ''مشی'' میں۔ یا ''ماعون'' سے ماخوذ ہے۔ ''ماعون'' منفعت کے معنی میں ہے، اس لیے کہ پانی بہت فائدہ پہنچانے والا ہے۔ یا اس کا وزن ''عَانَهُ إِذَا أَدْرَكَهُ بِعَيْنِهِ'' سے مفعول ہے، کیوں کہ پانی اپنے ظہور کے سبب سے آنکھوں سے ادراک کیا جاتا ہے۔ ''ربوہ'' کے پانی کا وصف معین کے ساتھ اس لیے کیا کہ معین میں پاکیزگی اور جگہ کی اچھائی ظاہر ہوتی ہے۔[2]

(نسخہ مطبوعہ روم میں ''وَصَفَ مَاءَ هَا بِذٰلِكَ لِأَنَّهُ الْجَامِعُ لِأَسْبَابِ التَّنَزُّهِ وَطِيْبِ الْمَكَانِ'' ہے اور نسخہ مطبوعہ لکھنو میں ''وَصَفَ مَأْوَاهُمَا بِذٰلِكَ... الخ'' ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے ماویٰ ومسکن کی یہ صفت بیان کی کہ وہ ایک بلند جگہ ہے، اس کی زمین برابر ہے، اس پر پانی بہتا ہے، آنکھوں سے نظر آتا ہے، اس میں انواع واقسام کے میوہ دار درخت اور کھیت ہیں۔ یہ وصف اس لیے کیا کہ ایسی جگہ میں مقام کی

[1] فتح القدير (٣/ ٦٦١) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٧)

پاکیزگی کے تمام اسباب ہوتے ہیں، ایسی جگہ کی آب و ہوا نہایت اچھی ہوتی ہے۔) غرض کہ یہاں تک پانچ قصے انبیاء علیہم السلام کے تمام ہوئے، چوں کہ ان کا خاتمہ اس بیان پر ہوا کہ اللہ پاک نے عیسیٰ علیہ السلام کے واسطے نعمتوں کے اسباب مہیا کیے۔ اس لیے خاتم النبیین سید المرسلین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات بیان کی کہ طیبات کا مباح کر دینا کچھ آپ ہی کے لیے خاص نہ تھا، بلکہ یہ تو ایک پرانی شریعت ہے کہ ہر نبی اپنے اپنے وقت میں اس کے ساتھ مخاطب ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُوا۟ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُوا۟ صَٰلِحًا ۖ إِنِّى بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٥١﴾ وَإِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱتَّقُونِ ﴿٥٢﴾ فَتَقَطَّعُوٓا۟ أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٥٣﴾ فَذَرْهُمْ فِى غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٥٤﴾ أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِۦ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴿٥٦﴾

(فرمایا:) اے رسولو! تم پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو میں اسے خوب جانتا ہوں (51) اور بلاشبہ یہ تمھارا دین ایک ہی دین ہے، اور میں تمھارا رب ہوں، لہٰذا مجھ ہی سے ڈرو (52) پھر انھوں نے اپنا معاملہ آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقے کے پاس جو کچھ ہے، وہ اسی پر شاداں وفرحاں ہے (53) چناں چہ (اے نبی!) آپ انھیں ان کی غفلت میں ایک (مقرر) وقت تک چھوڑ دیں (54) کیا وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک ہم جو بھی ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کیے جا رہے ہیں (55) (تو) کیا ہم ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں (نہیں نہیں) بلکہ، وہ (اصل حقیقت کا) شعور نہیں رکھتے (56)

رسولوں کو بھی حلال کھا کر عبادت بجا لانے کا حکم:

یعنی سب رسولوں کے دین میں یہی حکم ایک ہے کہ حلال طریقے سے کما کر حلال کھانا اور نیک کام کرنا۔ نیک کام سب لوگ جانتے ہیں۔ ہر پیغمبر کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے لوگوں کے بگاڑ کو درست فرمایا، بعد کے لوگوں نے جانا کہ اُن کا حکم الگ الگ ہے، آخر ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے تمام بگاڑ کو اکٹھا سنوارا، اب سب دین مل کر ایک دین ہو گیا۔ انتھی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے تمام رسولوں ۔علیھم الصلاۃ والسلام۔ کو حلال کھانے اور اعمالِ صالح پر قائم رہنے کا حکم کرتا ہے، چنانچہ یہ حکم اس بات پر دال ہے کہ حلال عملِ صالح پر مدد ہے۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام نے اس بات کے ساتھ پورا پورا قیام کیا اور قول، عمل، دلالت اور نصیحت کی راہ سے جو خیر تھی، اُن سب کو جمع کیا، اللہ پاک بندوں کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے، سنتے ہو! اللہ کی قسم! اس نے تم کو تمھارے زرد کا حکم نہیں کیا نہ ہی تمھارے سرخ کا، نہ تمھارے شیریں کا نہ تمھارے ترش کا، لیکن فرمایا ہے کہ تم حلال کی طرف رہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے سب چیزوں میں سے تم کو حلال پر توقف کرنے کا حکم دیا ہے، حلال سے آگے مت بڑھو۔[1]

امام سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طیبات سے مراد حلال ہے۔ امام ابو اسحق سبیعی رحمہ اللہ نے ابو میسرہ عمرو بن شرحبیل سے روایت کیا ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اپنی ماں کے سوت سے کھایا کرتے تھے،[2] یعنی سوت کی قیمت سے اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ صحیح میں مروی ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اور آپ نے یا رسول اللہ؟! فرمایا: ہاں اور میں چند قیراط پر مکے والوں کے لیے اُن کو چرایا کرتا تھا۔[3] (اکثر شہروں میں قیراط نصف عشر دینار ہے، یعنی دینار کا بیسواں حصہ اور اہلِ شام کے ہاں دینار کا چوبیسواں حصہ ہے۔ كذا في مجمع البحار)[4] صحیح میں ہے کہ داود علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔[5]

صحیحین میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے اچھی نماز داود علیہ السلام کی نماز ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے اچھا روزہ داود علیہ السلام کا روزہ ہے اور سب سے محبوب قیام، یعنی رات کی نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک داود علیہ السلام کا قیام ہے۔ وہ آدھی رات سوتے تھے اور تہائی رات قیام کرتے اور رات کا چھٹا حصہ سوتے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے اور دشمنوں کے ساتھ جنگ میں جب ملتے، یعنی آمنے سامنے ہوتے تو لڑائی سے بھاگتے نہ تھے، خوب لڑتے۔[6] مطلب یہ ہے کہ اس عبادت سے ان کو ضعف لاحق نہ ہوتا تھا۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ضمرہ بن حبیب سے روایت کیا ہے کہ اُم عبداللہ دختر شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے دودھ کا پیالہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افطار کے لیے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے تھے اور یہ بھیجنا دن کے پہلے حصے سے سخت گرمی میں تھا۔ (اصل الفاظ ”قَدَحُ لَبَنٍ عِنْدَ فِطْرِہٖ“ ہے۔ اس پر محشی مصر نے لکھا ہے کہ اسی طرح ہمارے پاس کے نسخوں میں ہے، شاید اس میں سقط ہوا ہے اور اصل ”یَشْرَبُهُ عِنْدَ فِطْرِہٖ“

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٢٨) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٠) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٤٣)

[4] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٢٥١) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٦)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٩)

یا اس کے مثل ہو۔ انتھی. مجمع البحار میں بھی اسی طرح ہے، کچھ سقط نہیں ہوا ہے۔[1] قرینۂ مقام سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسی محذوف عبارت بلیغ میں اکثر ہوا کرتے ہیں۔ حذف بالقرینہ بلاغت کی ایک قسم ہے۔)

چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے قاصد کو واپس بھیجا اور یہ پوچھا کہ کیا وہ بکری تیری ملک ہے؟ تو اس نے کہلا بھیجا کہ میں نے اس کو اپنے مال سے خریدا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس دودھ میں سے پیا، پھر جب دوسرا دن ہوا تو اُم عبداللہ بنت شداد آپ کے پاس آئی۔ عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے تو دن کی سختی اور گرمی کی شدت میں آپ کی دردمندی کر کے آپ کے پاس دودھ بھیجا تھا، مگر آپ نے اس کے بارے میں قاصد کو میری طرف واپس کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ رسولوں کو اسی بات کا حکم ہے کہ نہ کھائیں مگر پاکیزہ چیزیں اور نہ عمل کریں مگر صالح۔[2] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''لوگو! بے شک اللہ پاک ہے، وہ قبول نہیں کرتا مگر پاک کو اور بے شک اللہ نے مومنین کو اس چیز کا حکم دیا ہے، جس کا حکم اپنے رسولوں کو دیا ہے۔''

لہٰذا کہا: ﴿ يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ نیز فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ [البقرۃ: ۱۷۲] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں رزق کے طور پر دی ہیں۔'' پھر اس شخص کا ذکر کیا کہ دور دراز کا سفر کرتا ہے، پریشان بال، غبار آلود اور کھانا اس کا حرام اور پینا اس کا حرام اور پہننا اس کا حرام اور وہ غذا بھی حرام سے دیا گیا، اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف دراز کرتا ہے اور کہتا ہے: اے رب! اے رب! مگر اس کے لیے دعا کہاں سے قبول کی جائے۔[3] (قد ثبت ذلك في صحيح مسلم و جامع الترمذي و مسند الإمام أحمد واللفظ له من حديث فضيل بن مرزوق عن عدي بن ثابت عن أبي حازم عن أبي هريرة رضي الله عنه وقال الترمذي: حسن غريب لا نعرفه إلا من حديث فضيل بن مرزوق)

توحید ہی تمام رسولوں کا دین ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اے نبیوں کے گروہ! تمھارا دین ایک ہے اور ملت ایک ہے۔ یہ دین اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴾ سورۃ الانبیا میں اس پر کلام گزر چکا ہے۔ ﴿ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ منصوب ہے بنا بر حال۔ ﴿ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ ﴾ یہ لوگ وہ اُمتیں ہیں جن کی طرف نبی بھیجے گئے۔ ﴿ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ جس گمراہی میں ہے اس سے خوش ہے، کیوں کہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ راہ پانے والا ہے۔

---

[1] مجمع بحار الأنوار (۲/ ۲۸۷) [2] مستدرك الحاكم (٤/ ١٤٠) السلسلة الصحيحة (١١٣٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٨٩) مسند أحمد (٢/ ٣٢٨)

اسی لیے اس کو تہدید و وعید سنا کر اور ڈانٹ ڈپٹ کر کے اور دھمکا کے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴾ یعنی تو اُن کو ان کی گمراہی اور بہکاوے میں اُن کے مرنے اور ہلاک ہونے تک چھوڑ دے، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴾ [الطارق: ١٧] ''تو (اے نبی!) آپ ان کافروں کو (ان کے حال پر) چھوڑ دیں، انھیں تھوڑی سی مہلت دیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الحجر: ٣] ''(اے نبی!) انھیں چھوڑ دیجیے، وہ کھائیں (پئیں) اور فائدہ اُٹھائیں، اور (جھوٹی) امید انھیں غفلت میں ڈالے رکھے، پھر جلد ان کو معلوم ہو جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿55﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کیا یہ مغرور لوگ گمان کرتے ہیں کہ ہم جو اولاد و مال ان کو دیتے ہیں، وہ ان کی ہمارے نزدیک کرامت اور عزت کے سبب سے ہے۔ ہرگز ایسی بات نہیں ہے، جیسی وہ اپنے اس قول میں خیال کرتے ہیں: ﴿ نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾ [سبا: ٣٥] ''ہم (تم سے) مال اور اولاد میں زیادہ ہیں اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔'' یقیناً وہ اس بات میں چوک گئے اور اُن کی اُمید بے کار ہوگئی، بلکہ ہم یہ سب کچھ اُن کے ساتھ بطورِ استدراج و انظار و املاء کر رہے ہیں، ان کو مہلت اور ڈھیل دے رہے ہیں کہ خوب گناہوں اور نافرمانیوں میں غرقاب ہو جائیں، پھر اچانک ان کو پکڑ لیں، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾

جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ٥٥] ''چناں چہ ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں، یقیناً اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے انھیں دنیاوی زندگی ہی میں عذاب دے اور ان کی جانیں حالتِ کفر ہی میں نکلیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ﴾ [آل عمران: ١٧٨] ''ہم انھیں جو ڈھیل دیتے ہیں، وہ ان کے لیے بہتر ہے۔ ہم تو انھیں صرف اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿44﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴾ [القلم: ٤٤۔ ٤٥] ''لہٰذا چھوڑ دیجیے مجھے اور اس کو جو اس حدیث (قرآن) کو جھٹلاتا ہے، ہم انھیں آہستہ آہستہ (تباہی کی طرف) لے جائیں گے، اس طرح کہ انھیں علم تک نہ ہوگا۔ اور میں انھیں ڈھیل دیتا ہوں، بے شک میری تدبیر انتہائی پختہ ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ﴿11﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿12﴾ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿13﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿14﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ﴿15﴾ كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴾ [المدثر: ١١۔ ١٦] ''مجھے اور اس کو تنہا چھوڑ دیجیے جسے میں نے اکیلا ہی پیدا کیا۔ اور اسے مال وافر دیا۔ اور حاضر باش بیٹے (دیے)۔ اور اس کے لیے خوب فراخی

کا سامان کیا۔ پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں (اسے) مزید دوں۔ ہر گز نہیں! بلاشبہ وہ ہماری آیات سے سخت عناد رکھتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴾ [سبا: ۳۷] ''اور تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایسے نہیں جو تمھیں درجے میں ہمارے قریب کر دیں، مگر (مقرب وہ ہے) جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے اعمال کا دُگنا بدلہ ہے اور وہ بالا خانوں میں امن سے رہیں گے۔'' اس بارے میں بہت سی آیتیں ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے اسی کی تفسیر میں کہا ہے: واللہ! قوم کے ساتھ مکر کیا گیا، اُن کے اموال واولاد میں۔ اے ابن آدم! تو لوگوں کا اُن کے اموال اور اولاد کی وجہ سے اعتبار نہ کر، بلکہ اُن کے ایمان اور عملِ صالح کی بنا پر ان کا اعتبار کر۔ ①

امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ نے تمھارے درمیان تمھارے اخلاق کو بانٹا ہے، جس طرح کہ تمھارے درمیان تمھارے رزق کو بانٹا ہے۔ (اخلاق جمع خلق، یعنی عادت وخُو۔ ارزاق جمع رزق، یعنی روزی)۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ دنیا دیتا ہے اس شخص کو جسے دوست رکھتا ہے اور اس کو جسے دوست نہیں رکھتا ہے۔ اور دین نہیں دیتا ہے مگر اسی کو جسے دوست رکھتا ہے۔ لہٰذا جس شخص کو اللہ نے دین عطا کیا تو واقعی اس کو دوست رکھا ہے، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! نہیں مسلمان ہوگا کوئی بندہ جب تک کہ مسلمان نہ ہو اس کا دل اور اس کی زبان، اور نہ ایمان لائے گا یہاں تک کہ امن میں ہو اس کا پڑوسی اس کے بوائق سے۔

(بوائق جمع بائقہ بہ معنی داہیہ غوائل وشرور، یعنی آفت و ایذا اور تکلیف دینا ہے۔) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یارسول اللہ! اس کے بوائق کیا ہیں؟ فرمایا: اس کا غشم اور ظلم ہے۔ اور نہیں کماتا کوئی بندہ کچھ مال حرام، پھر وہ اس میں سے خرچ کرتا ہے، پھر اس کے واسطے اس کے مال میں برکت دی جائے، یعنی برکت نہیں دی جاتی اور نہ ہی اس کی کوئی خیرات اس سے قبول کی جاتی ہے، اور جو کچھ وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ جاتا ہے تو وہ اس کا آگ کی طرف توشہ ہو گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا، لیکن برائی کو بھلائی سے مٹاتا ہے، بے شک خبیث نہیں مٹاتا ہے خبیث کو۔ ② (خبیث طیب کی ضد ہے، یعنی پلید۔)

فتح البیان کا بیان:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ ﴾ میں ندا اور خطاب سارے نبیوں سے ہے، اس طرح پر نہیں کہ ان کو ایک دفع خطاب ہوا ہو، کیوں کہ وہ تو مختلف زمانوں میں علاحدہ علاحدہ بھیجے گئے ہیں، بلکہ اس طرح پر ہے کہ ان میں

① الدر المنثور (٦/ ١٠٤) ② مسند أحمد (١/ ٣٨٧) اس کی سند میں ''صباح بن محمد'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ١٦٢٥)

سے ہر رسول کو اپنے وقت میں خطاب کیا گیا اور اُن کو اس کی ندا اور وصیت کی گئی، تا کہ سننے والا یہ سمجھے کہ جس بات کی تمام رسولوں کو ندا اور وصیت ہوئی، وہ اسی لائق ہے کہ اس کو اَخذ کریں اور اس پر عمل کریں۔ عیسیٰ علیہ السلام اس کے تحت بدخولِ اولیٰ داخل ہیں۔ اس معنی کی بنا پر یہ کلام تین باتوں پر آگاہ کرنے کے لیے ہے: ایک یہ کہ نعمتوں کے اسباب کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ پاکیزہ چیزوں کو نبیوں کے لیے مباح کرنا ایک پرانا طریقہ ہے۔ تیسرے یہ کہ رُہبانوں نے جو طیبات کو ترک کیا ہے، اس میں اُن پر حجت قائم کرنا ہے۔ یا عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کو ربوہ میں جگہ دینے کے وقت جو اُن سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہم نے ہر رسول سے اس کے وقت میں یہ کہا کہ طیبات سے کھا اور عملِ صالح کر، تا کہ ان دونوں کو جو روزی دی گئی ہے، اس کے کھانے پینے میں رسولوں کی پیروی کریں۔

چنانچہ اللہ پاک نے یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی، گویا یوں فرمایا کہ ہم نے ان کو ربوہ کی طرف ٹھکانا دیا اور ہم نے اُن کو یہ بات بتائی کہ ہم نے ہر رسول کو اس کے زمانے میں اس طرح مخاطب کیا کہ طیبات سے کھا اور عمل صالح کر۔ لہٰذا یہ متعدد احکام جو رسولوں سے متعلق ہیں، ان کو بیان کرتے وقت اجمالی طور پر اختصار کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ غرض کہ یہ کلام بطورِ ابتدا کے ہو یا بطریقِ حکایت کے، لیکن خطاب تمام رسولوں کو ہے یہ معنی مذکور۔

دوسرا قول یہ ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور جمع کا صیغہ اس بات پر دال ہے کہ سارے رسولوں کو اسی طرح امر کیا گیا ہے۔[1] یا جمع کا صیغہ اس لیے کہا ہے کہ شرف و فضیلت کے سبب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت میں کل رسولوں کے قائم مقام ہیں اور آپ غنیمتوں کے مال سے کھایا کرتے تھے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ خطاب عیسیٰ علیہ السلام کو ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں، اس لیے کہ آیت انھیں کے ذکر سے متصل ہے اور وہ اپنی والدہ ماجدہ کے سوت کی قیمت سے کھایا کرتے تھے اور یہ سب سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جمع کے لفظ سے خطاب ایسا ہے، جیسا تو ایک شخص سے کہے: "كُفُّوْا عَنَّا"[2] یعنی تم ہم سے باز رہو۔ مطلب یہ ہے کہ جمع کا لفظ تعظیم کے لیے ہے۔ امام سعید بن منصور رحمہ اللہ نے حفص فزاری سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اپنی والدہ کے سوت کی قیمت سے کھایا کرتے تھے۔ عبدان نے صحابہ میں حفص رحمہ اللہ سے مرفوعاً اس کو روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے، اس لیے کہ حفص تابعی ہیں۔[3]

"طیبات" سے مراد "مَا يُسْتَطَابُ وَيُسْتَلَذُّ" ہے، یعنی وہ شے جو پاک ولذیذ و مزے دار شمار کی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد حلال ہے۔ امام خازن اور محلی رحمہما اللہ کا یہی قول ہے،[4] یعنی مستلذ ہو یا نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ جس میں دونوں مذکورہ وصف پائے جاتے ہوں۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ١٢٧۔ ١٢٨) [2] فتح القدير (٣/ ٦٦١)

[3] الدر المنثور (٦/ ١٠٢) [4] تفسير الخازن (٥/ ٣٨) تفسير الجلالين (١/ ٤٥٠)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "طیبات" سے مراد وہ شے ہے، جو حلال ہے اور امر تکلیف کے واسطے ہے۔ یا وہ شے جو پاک اور لذیز شمار کی جاتی ہے اور امر ترفیہ و اباحت کے لیے ہے،[1] یعنی فراخیِ عیش و تن آسانی کے لیے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طیبات وہ شے ہے، جو لذیذ شمار کی جاتی ہے اور وہ مباحات میں سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حلال صافی قوام ہے، سو حلال تو وہ ہے جس میں اللہ کی نافرمانی نہیں کی جاتی اور صافی وہ ہے جس میں اللہ بھولا نہیں جاتا اور قوام وہ ہے جو نفس کو روکتا ہے اور عقل کو محفوظ رکھتا ہے۔[2] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طیب کے تین معنی آتے ہیں: طاہر و حلال و مستلذ۔

پھر اللہ پاک نے رسولوں کو طیبات کے کھانے کا حکم کرنے کے بعد اُن کو حکم دیا کہ عملِ صالح کریں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاعۡمَلُوۡا صَالِحًا ﴾ یعنی تم نیک کام کرو، کیوں کہ تم سے مقصود وہی ہے اور وہ تمھارے رب کے نزدیک نفع دینے والا ہے۔ عملِ صالح وہ کام ہے جو شرع کے مطابق ہو۔ تفسیر بیضاوی، مدارک، فتح البیان اور فتح القدیر میں اسی طرح ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرض و نفل کو ادا کرو۔[3] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شے کو شرع واجب کرتی ہے، اس پر استقامت کرو، یعنی جمے رہو۔[4]

پھر اس امر کی وجہ یہ بیان کی کہ ﴿ اِنِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِیۡمٌ ﴾ یعنی جو کچھ تم کرتے ہو، میں اس کو خوب جانتا ہوں، اس میں سے کوئی شے مجھ پر مخفی نہیں رہتی، لہٰذا میں تم کو تمھارے اعمال کے مطابق جزا دوں گا، اگر خیر ہے تو خیر اور شر ہے تو شر۔ اللہ پاک نے جس بات کا ان کو حکم دیا ہے، اس کی مخالفت کرنے سے اس میں خوف اور ڈر دلایا گیا ہے۔ جبکہ رسل کرام کو اُن کی بلند شان کے باوجود یہ ڈراوا ہے تو اُن کے علاوہ دوسرے لوگوں کو یہ ڈراوا تو اور زیادہ ہوگا اور ضرور ہوگا۔ امام حقناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ڈراوا رسولوں کو ہے اور مراد اُن کی اُمتیں ہیں۔ ﴿ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾

کلمہ ﴿ اِنَّ ﴾ میں تین قراءتیں ہیں اور تینوں سبعیہ ہیں: ایک یہ ہے کہ صرف ابو عامر نے "أَنْ" بفتحِ ہمزہ و تخفیفِ نون پڑھا ہے۔ دوسری کوفیوں کی قراءت ہے، ﴿ اِنَّ ﴾ بکسرِ ہمزہ و تشدیدِ نون۔ تیسری باقی قاریوں کی قراءت ہے بفتحِ ہمزہ و تشدیدِ نون۔ اس قراءت کی توجیہ میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اس کے اوّل سے لام تعلیل کا حذف کر دیا ہے، اصل "وَلِأَنَّ هَذِهِ" ہے اور جس کی یہ علت ہے وہ ﴿ فَاتَّقُوۡنِ ﴾ ہے۔ یہ قول سیبویہ کا ہے، یعنی میں تمھارا رب ہوں، لہٰذا تم مجھ سے ڈرو، جماعت سے علاحدہ ہونے میں اور اس واسطے کہ تمھارا دین و ملت ایک

---

(1) تفسير النسفي (٣/ ١٢٤) (2) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٨)

(3) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٨) تفسير النسفي (٣/ ١٤٣) فتح البيان (٩/ ١٢٦) فتح القدير (٣/ ٦٦١) تفسير الجلالين (١/ ٤٥٠)

(4) تفسير الخازن (٥/ ٣٨)

ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''وَاعْلَمُوْا أَنَّ هٰذِهٖ'' یہ قول امام فراء رحمہ اللہ کا ہے،[1] یعنی خطاب رسولوں کو ہے اور معطوف ہے: ﴿ كُلُوْا ﴾ پر، معنی یہ ہیں کہ اے رسولو! اس بات کو جان رکھو کہ تمھارا یہ دین ایک ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ مَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ پر معطوف ہے: ''أَيْ: إِنِّيْ عَلِيْمٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَبِأَنَّ هٰذِهٖ أُمَّتُكُمْ''، خلیل نے کہا: موضع نصب میں ہے، اس لیے کہ حرفِ جار زائل ہو گیا ہے۔[2] معنی یہ ہیں کہ میں خوب جانتا ہوں جو تم کرتے ہو اور اس بات کو کہ یہ دین تمھارا ایک دین ہے، جس کا میں نے تم کو حکم کیا ہے کہ تم اس پر ایمان لاؤ۔ پہلی قراءت جو ابن عامر کی ہے میں ''أَنْ'' مخففہ ہے مثقلہ سے، اس میں یہی تین وجہیں جاری ہو سکتی ہیں۔

اب رہی دوسری قراءت جو کوفیوں کی ہے، لہٰذا اس کی بنا پر حرفِ واو عطف کا نہیں ہے، واو استیناف کا ہے اور جملہ مستانفہ ہے، اپنے ما قبل کی تقریر و تثبیت کرتا ہے۔ اللہ پاک نے رسولوں کو جس بات کا خطاب کیا، بوجہ مذکور یہ جملہ بھی اسی میں داخل ہے۔ اس سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ملتِ اسلام و توحید اس قسم سے ہے کہ سارے رسولوں اور ساری اُمتوں کو اس کا حکم کیا ہے اور کلمۂ اُمت جس طرح جماعت پر بولا جاتا ہے، اسی طرح جماعت کے دین پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور ﴿ هٰذِهٖ ﴾ اسم ''إِنَّ'' ہے اور ﴿ أُمَّتُكُمْ ﴾ اس کی خبر ہے اور ''أمة'' حالِ لازمہ اور ﴿ وَّاحِدَةً ﴾ اس کی صفتِ لازمہ۔

﴿ هٰذِهٖ ﴾ کا اشارہ مشاہد محسوس کی طرف ہوتا ہے، یہاں اس کے ساتھ ملتِ اسلام کی طرف اشارہ کیا، یہ بات بتانے کے لیے کہ صحت و راستی میں ملتِ اسلام کا معاملہ کامل طور پر ظاہر و باہر ہے اور اسی کمال ظہور کے سبب سے اُمورِ مشاہد کے سلک میں منسلک ہو گیا ہے۔ معنی یہ ہیں: اے رسولو! بے شک یہ ملتِ اسلام تمھاری ملت و شریعت ہے، درآں حالیکہ ایک متحد ملت اور شریعت ہے، یعنی یہ دین عقائد اور اصول شرائع میں ایک ہے۔ رہے فرعی احکام تو وہ مختلف شریعتوں میں مختلف ہوتے رہے ہیں۔ اللہ پاک نے جو احکام دے کر اپنے نبی بھیجے اور اُن میں اپنی کتابیں نازل کیں، ان سب میں جو سب سے زیادہ اور بڑی اصل تعلیم ہے، اس کو اس شریعت میں جمع کیا گیا ہے، وہ اصل یہی دعوت ہے اور وہ تمام انبیا کی دعوت ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کی عبادت کی جائے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تمھاری جماعت ایک جماعت ہے، جو ایمان اور توحید پر متفق ہے۔ ﴿ وَاَنَا رَبُّكُمْ ﴾ یعنی میں ہی تنہا تمھارا رب ہوں۔

﴿ فَاتَّقُوْنِ ﴾ میں حرفِ فا ترتیب اور تقویٰ کا امر کرنے کے لیے ہے اپنے ما قبل پر اور ما قبل یہی ہے کہ تمھارا رب اُلوہیت کے ساتھ مختص ہے۔ یعنی وہ کام مت کرنا، جو تم پر میرے عذاب کو واجب کر دے، یعنی میرے ساتھ میرے غیر کو شریک نہ کرنا، یا ایسا نہ کرنا کہ جس بات کا تم کو حکم کیا ہے، یا جس بات سے تم کو منع کیا ہے اس کی مخالفت کرو۔ پھر رسولوں نے اپنی اُمتوں کو جن باتوں کا حکم کیا اور اُن سے اُن کی مخالفت واقع ہوئی، اللہ پاک نے اس کا

[1] تفسیر القرطبي (١٢/ ١٢٩) [2] تفسیر القرطبي (١٢/ ١٢٩)

ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَتَقَطَّعُوٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ﴾ اس میں حرفِ فا عصیان اُمت کی ترتیب کے لیے ہے "أمر بالتقوی" پر اور ضمیر اس شے کی طرف راجع ہے جس پر لفظِ امت دال ہے، یعنی اگر چہ لفظِ امت مفرد ہے، لیکن معنی میں جمیت ہے، اس لحاظ سے اس کی ضمیر جمع کی طرف راجع ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے تو اُن سے یہ کہا تھا کہ جماعت میں تفرقہ نہ ڈالنا، اس میں مجھ سے ڈرتے رہنا، لہٰذا انھوں نے اس حکم کو نہ مانا اور نافرمانی کی، اپنے دین کو باوجود اس کے متحد ہونے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف اور متفرق کر ڈالا۔ "تفعل" کی بنا کبھی متعدی ہوتی ہے، جیسے: "تقدمه" ہے، اسی باب سے "تقطع" ہے اور اسی لیے امام جوہری رحمہ اللہ نے ﴿ فَتَقَطَّعُوٓا اَمْرَهُمْ ﴾ کی تفسیر "اقتسموه" کی ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی "تقطع" کو "قطع" کے معنی میں کہا ہے۔[1]

﴿ اَمْرَهُمْ ﴾ میں مضاف مقدر ہے، یعنی "أَمْرَ دِيْنِهِمْ" اور یہ مفعول ہے "تَقَطَّعُوْا" کا، معنی یہ ہے کہ رسولوں کی اُمتوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اس کے مختلف دین بنا ڈالے، جیسے: یہودیت اور نصرانیت وغیرہ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "تَقَطَّعُوْا" لازم ہو۔ "تَفَرَّقُوْا" و "تَحَزَّبُوْا" کے معنی میں، اس صورت میں ﴿ اَمْرَهُمْ ﴾ منصوب بنزعِ خافض ہوگا، یا بنا بر تمیز۔ معنی یہ ہیں کہ وہ امتیں فرقے فرقے اور گروہ گروہ بن گئیں اپنے دین کے معاملے میں، مثلاً: کوئی یہودی ہوگیا، کوئی نصرانی، کوئی کچھ اور۔ مبرد نے کہا: ﴿ زُبُرًا ﴾ کے معنی ہیں: "فِرَقًا وَّقِطَعًا مُّخْتَلِفَةً" اس کا واحد زَبور ہے۔ زبور فرقہ و طائفہ کے معنی میں ہے، اسی کے مثل "زبرہ" ہے بہ معنی "طائفه"۔ "زبرہ" بروزن غرفہ کے۔ "زبرہ" کی جمع "زبر" بضمِ با آتی ہے، جس طرح یہاں ہے اور بفتحِ با بھی آتی ہے، جیسے سورۃ الکہف میں ہے۔ چنانچہ "زبرہ" کے دو جمع ہیں، جیسا کہ قاموس میں ہے۔[2]

﴿ زُبُرًا ﴾ حال ہے ﴿ اَمْرَهُمْ ﴾ سے، یعنی ٹکڑے کیا انھوں نے اپنے امرِ دین کو اس حال میں کہ وہ امرِ دین ٹکڑے ٹکڑے اور فرقے فرقے ہے۔ یا "تَقَطَّعُوْا" کی واو سے حال ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ کا قول یہی ہے،[3] یعنی انھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا، درآں حالیکہ وہ لوگ ایک دوسرے کے مخالف گروہ گروہ ہیں، جیسے: یہود و نصاریٰ وغیرہم۔ یا "تقطعوا" کا مفعولِ ثانی ہے، اس لیے کہ اس میں "جَعَلُوْا" کے معنی شامل ہیں، یعنی انھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے اور فرقے فرقے کر دیا۔ کسی نے کہا: "زُبُرًا" "زُبُوْرٌ" کی جمع ہے اور "زُبُوْرٌ" "زُبْرَةٌ" بہ معنی کتبہ سے لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اس صورت میں "تَقَطَّعُوْا" کا مفعولِ ثانی ہوگا، یا ﴿ اَمْرَهُمْ ﴾ سے حال ہوگا بر تقدیر مثل کتب۔ معنی یہ ہیں کہ کر ڈالا انھوں نے اپنے دینِ حق کو جو کہ ایک دینِ اسلام ہے مختلف کتابیں، یعنی اپنے دین کے کئی دین کر دیے، ہر فریق نے ایک کتاب کو اپنا دین ٹھہرایا اس کتاب کے سوا، جس کو دوسرے فریق نے اپنا دین قرار دیا۔ کتابوں سے مراد وہ کتابیں ہیں جن کو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا، نہ وہ کتابیں جو آسمان

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٢٤) [2] القاموس المحيط (١/ ٥٠٩۔ ٥١٠) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٥١)

سے نازل کی گئیں، کیوں کہ وہ ان کے بنانے سے نہیں بنائی گئی ہیں۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ "قَطَّعُوا كِتَابَ اللّٰهِ قِطَعًا وَّحَرَّفُوْهُ"[1] یعنی انھوں نے اللہ کی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اس کی تحریف کی۔ خطیب نے کہا ہے کہ ہر قوم نے ایک کتاب کے ساتھ تمسک کیا، چنانچہ اس پر ایمان لے آئے اور اس کے علاوہ کتابوں کا انکار کیا۔ غرضیکہ اللہ پاک نے اُمتوں کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ انھوں نے اختلاف کیا، لہٰذا ایک فرقے نے تو تورات کی پیروی کی اور ایک فرقے نے زبور کا اتباع کیا اور ایک فرقہ انجیل کا پیرو ہوا۔ پھر اُن میں تحریف اور تبدیلی کی اور ایک گروہ مشرک ہوا، ان کے آباء واجداد نے جس گمراہی کی رسم ڈال دی، انھوں نے اس کی پیروی کی۔

﴿ زُبُرًا ﴾ میں تین قراءتیں ہیں: ایک بضمِ زائے معجمہ و بائے موحدہ، یہ جمع ہے "زبرة" کی، "زبرة" اس شے کے ٹکڑے کو کہتے ہیں جو معدنیات متجدہ سے لیا جاتا ہے، جیسے: چاندی لوہا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ﴾ [الكهف: ٩٦] "مجھے لوہے کی چادریں لادو۔" امرِ دین کے لیے اس کا استعارہ کیا گیا ہے۔ امرِ دین کو تعدد واختلاف میں اس ٹکڑے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ ﴿ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴾ یعنی یہ فرقے جو دین کے بارے میں مختلف ہوگئے، فرقے فرقے بن گئے، اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، جو کتاب اور دین اور ہویٰ اور رائے ہر فرقے کے پاس ہے، وہ اس سے خوش ہے، کیوں کہ وہ اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔

﴿ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴾ رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے اور ضمیر مکے کے کفار کی طرف راجع ہے، یعنی جب تم نے اُن کو وعظ ونصیحت کی اور اُن سے اگلی اُمتوں کا حال بیان کیا۔ پھر انھوں نے اس سے عبرت حاصل نہ کی تو تم اُن کو اُن کی جہالت اور گمراہی میں چھوڑ دو، وہ لوگ ہدایت کے قابل نہیں ہیں اور اُن پر عذاب بھیجنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے، اس سے تمھارا سینہ تنگ نہ ہو، کیوں کہ ہر شے کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ اصل میں "غمرة" وہ پانی ہے، جو آدمی کے قد کو ڈبو دے، یعنی اس قدر گہرا پانی کہ تجھے ڈبو دے اور تیرے اوپر ہو جائے۔ یہ مادۂ غطاء و استتار پر دلالت کرتا ہے۔ اسی سے بہت سے پانی کو غمر کہتے ہیں، کیوں کہ وہ زمین کو ڈھانک دیتا ہے اور غمر بالضم ناتجربہ کار کو بولتے ہیں، اس لیے کہ کاموں کی حقیقت اس سے مخفی ہوتی ہے۔ "غمر الرداء" وہ شخص ہے، جو اپنی عطا اور بخشش سے لوگوں کو ڈھانک لیتا ہے۔ "غمر" بالکسر کینہ کو کہتے ہیں، اس لیے کہ قلب کو ڈھانک لیتا ہے۔

"غمرات" شدائد کو بولتے ہیں۔ غامر وہ شخص ہے، جو اپنی جان کو ہلاکت کی جگہوں میں ڈال دیتا ہے۔ پھر استعارے کے طور پر جہالت کو غمرت کہتے ہیں، مثلاً: "فُلَانٌ فِيْ غَمْرَةٍ" یعنی فلاں شخص جہالت میں ہے، یعنی وہ اس میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہاں "غمرت" سے حیرت وغفلت وضلالت مراد ہے۔ اللہ پاک نے مکے والوں کی

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٢٤)

جہالت اور گمراہی کو اس پانی سے تشبیہ دی ہے کہ جو کوئی اس میں گھسے اس کو ڈبو دے، مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اس میں غرق ہو رہے ہیں، اس سے نکلنے کی کچھ اُمید نہیں ہے۔ یہ آیتِ کریمہ مکے والوں کے لیے تہدید اور نبی اکرم ﷺ کے لیے تسلی ہے، یہ کچھ اُن سے باز یا دور رہنے کا آپ کو حکم نہیں ہے، بلکہ آپ کو اس بات کی ممانعت ہے کہ اُن کے لیے عذاب کی جلدی فرمائیں اور اس کی تاخیر سے گھبرائیں۔ کسی نے "فِيْ غَمَرَاتِهِمْ" جمع کے صیغے سے پڑھا ہے۔

﴿ حَتّٰى حِيْنٍ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ تم اُن کو اُن کی گمراہی میں پڑا رہنے دو، یہاں تک کہ ان کے عذاب کا وقت آجائے اور وہ قتل کیے جائیں۔ یا یہاں تک کہ وہ کفر ہی پر مرجائیں تو آگ میں انھیں عذاب کیا جائے۔ ﴿ فِيْ غَمْرَتِهِمْ ﴾ مفعولِ ثانی ہے ﴿ فَذَرْهُمْ ﴾ کا، یعنی "اُتْرُكْهُمْ مُسْتَقِرِّيْنَ فِيْ غَمْرَتِهِمْ" یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ترک کا ظرف ہو اور مفعولِ ثانی محذوف۔ پھر یہ لوگ جنھوں نے تفریق کی، یعنی فرقوں میں بٹ گئے، وہ چوں کہ دنیا میں بڑی بڑی نعمتوں میں تھے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات کا خیال کریں کہ یہ طرح طرح کی نعمتیں اُن کے لیے اُن کے دینوں پر ثواب معجّل کی طرح ہیں۔ اس لیے اللہ پاک نے بیان کر دیا کہ بات اس کے برعکس ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴾ یعنی کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو شے ہم اُن کو اس دنیا میں دیتے ہیں، وہ اُن کے واسطے مدد ہے، یعنی ہم مال و اولاد دے کر اُن کی اس شے میں جلدی سے مدد کرتے ہیں، جس میں اُن کی خیر ہے اور اُن کی عزت و اکرام ہے۔ ہمزہ انکار کے لیے ہے اور اس کا جواب مقدر ہے۔

﴿ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ اس پر دلالت کرتا ہے، کیوں کہ بکلمۂ ﴿ بَلْ ﴾ عطف ہے مقدر پر کہ جس کی طرف کلام کھچ رہا ہے۔ یعنی ہرگز نہیں، وہ یہ خیال نہ کریں۔ ہم ایسا نہیں کرتے، بلکہ وہ اصلاً کچھ بھی شعور نہیں رکھتے، وہ چوپایوں کی طرح ہیں، جو نہ کچھ سمجھتے ہیں، نہ بوجھتے ہیں، کیوں کہ ہم نے ان کو جو نعمتیں عطا کی ہیں اور جن بھلائیوں سے ہم نے اُن کی مدد کی ہے، وہ صرف اُن کے لیے استدراج ہے تاکہ زیادہ گناہ کریں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ﴾ [آل عمران: ۱۷۸] "ہم تو انھیں صرف اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں۔" یہ کوئی اُن کو بھلائی عطا کرنے کی جلدی نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "نُسَارِعُ لَهُمْ بِهٖ فِي الْخَيْرَاتِ"، "به" کو حذف کر دیا ہے اور کلمۂ ﴿ مَا ﴾ ﴿ اِنَّمَا ﴾ میں موصولہ ہے، رابطہ یہی "به" محذوف ہے۔

امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ حرفِ واحد ہے۔ تقدیر رابط کا محتاج نہیں ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ بَنِيْنَ ﴾ پر وقف جائز ہے۔ کسی نے کہا وقف خوب نہیں ہے۔ اس لیے کہ ﴿ يَحْسَبُوْنَ ﴾ دو مفعول کا محتاج ہے، لہٰذا دو مفعولوں کا اتمام "في الخيرات" ہے۔ ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ خطا ہے، اس لیے کہ ما کافہ ہے۔[1]

[1] تفسير القرطبي (۱۲/ ۱۳۱)

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ ﴿ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴾ اس کا بیان واقع ہوا ہے، لہٰذا حق اس کا یہ تھا کہ "أَنَّ" کے نون سے جدا لکھی جاتی، لیکن اس جگہ موصول آئی ہے، واسطے اتباع رسم مصحفِ امام کے (اور کتابت کے بارے میں مصحفِ امام کی متابعت سنت ہے۔ (کذا قال زادہ)۔)

کلمۂ ﴿ مَا ﴾ اسم ہے "أَنَّ" کا اور اس کی خبر جملہ ﴿ نُسَارِعُ لَهُمْ ﴾ ہے اور رابط مقدر ہے، یعنی "بہ"۔ امام سمین رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ ﴿ مَا ﴾ بمعنی "الذي" ہے، "أَنَّ" کا اسم ہے ﴿ نُمِدُّهُمْ بِهٖ ﴾ اس کا صلہ وعائد ہے، ﴿ مِنْ مَّالٍ ﴾ حال ہے موصول سے۔ یا اس کا بیان ہے۔ محذوف سے متعلق ہوگا، یعنی "أَنَّ مَا نُمِدُّ هُمْ بِهٖ كَائِنًا مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ".

﴿ نُسَارِعُ ﴾ خبر ہے "أَنَّ" کی اور عائد اس جملے سے طرف اسم "أَنَّ" کے محذوف ہے، تقدیر یہ ہے: "نُسَارِعُ لَهُمْ بِهٖ أَوْ فِيْهِ" مگر ایسے عائد کا حذف کرنا قلیل ہے۔ کسی نے کہا: ربط دینے والا درمیان اس جملے کے اسم "أَنَّ" کے ساتھ اسمِ ظاہر ہے، جو کہ مضمر کے قائم مقام ہوا ہے، یعنی "فِي الْخَيْرَاتِ"، کیوں کہ اصل "نُسَارِعُ لَهُمْ فِيْهِ" ہے۔ لہٰذا خیرات کو ضمیر کے موقع میں واقع کیا ہے تعظیم کے لیے اور یہ بات بتانے کے لیے کہ جس شے کے ساتھ ہم اُن کی امداد کرتے ہیں، وہ خیرات میں سے ہے۔

یہ بات امام اخفش رحمہ اللہ کے مذہب پر چل جائے گی، کیوں کہ وہ اسمائے ظاہر کے ساتھ ربط کو جائز رکھتا ہے، گو وہ اسماء بلفظِ اول نہ ہوں، چنانچہ وہ "زَيْدُ الَّذِيْ قَامَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ" کو جائز کہتا ہے، جبکہ ابو عبداللہ زید کی کنیت ہو۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے، یہ جائز نہیں ہے کہ "أَنَّ" کی خبر ﴿ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴾ ہو، کیوں کہ اللہ پاک نے جو شے اُن کو عطا کی اور اس کو ان کے لیے مدد ٹھہرایا، وہ مال و بنون سے تھی۔ لہٰذا اس کے خیال کرنے کا اُن پر عیب نہیں لگایا جاتا، جس کا اُن پر عیب لگایا جاتا ہے، وہ یہی ہے کہ انھوں نے اعتقاد کیا کہ یہ ان کے واسطے خیر ہے۔

﴿ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ اضراب ہے ان کے گمان کرنے سے کہ جس سے استفہام تقریعی کیا گیا ہے، یہ اضراب انتقالی ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ مثل بہائم کے ہیں، اُن کو کسی طرح کا شعور نہیں ہے، یہاں تک کہ اس امداد میں فکر کریں کہ آیا وہ استدراج ہے یا خیر میں جلدی ہے۔ یزید بن میسرہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں میں سے کسی نبی کی طرف وحی کی کہ کیا میرا بندہ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ میں اس کے لیے دنیا کو فراخ کروں، حالاں کہ دنیا کی فراخی اس کو مجھ سے بہت دور کرنے والی ہے اور اس بات سے گھبراتا ہے کہ میں اس سے دنیا کو قبض کروں، حالاں کہ یہ قبض کرنا اس کو مجھ سے بہت قریب کرنے والا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ يَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿55﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ﴾ [1]

ابو عبدالرحمٰن سلمی اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ نے "یسارع" بیائے تحتیہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اس کا فاعل

[1] تفسير الرازي (٢٣/ ٩٢)

امداد ہے، جس پر ﴿نُمِدُّهُمْ﴾ دال ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ضمیر اللہ پاک کی طرف راجع ہو، یعنی "يُسَارِعُ اللّٰهُ لَهُمْ"، باقی قراء کی قراءت ﴿نُسَارِعُ﴾ نون کے ساتھ ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا: یہی قراءت صحیح ہے ﴿نُمِدُّهُمْ﴾ کے سبب سے۔[1] (كذا في فتح القدير)

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی نے "يُمِدُّهُمْ" پڑھا ہے بیائے تحتیہ اور اسی طرح "يُسَارِعُ" اور "يُسْرِعُ"۔ احتمال ہے کہ ان دونوں میں ضمیر مد بہ کی ہو اور "يُسَارَعُ" بصیغۂ مجہول بھی پڑھا گیا ہے۔[2] شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ "يُمِدُّهُمْ" میں ضمیر باری تعالیٰ کی طرف راجع ہو، قیاس اس کا یہ ہے کہ "يُسَارِعُ" بھی بیائے غیبت پڑھا جائے اور جس شخص نے ﴿نُمِدُّهُمْ﴾ بنون اور "يُسَارِعُ" بیائے تحتیہ پڑھا ہے احتمال ہے کہ ضمیر باری تعالیٰ کی طرف مسند کرے اور طرف ضمیر مائے موصولہ کے، اور کسی نے "نُسْرِعُ" بنون پڑھا ہے "أَسْرَعَ" سے اور بیائے تحتیہ بھی۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ آیت مسئلہ اصلح میں معتزلہ پر حجت ہے، کیوں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خلق میں سے کسی کے ساتھ نہیں کرتا مگر وہی چیز جو اس کے لیے دین میں اصلح ہے، حالاں کہ اللہ پاک نے خبر دی ہے کہ یہ اُن کے لیے دین میں خیر نہیں ہے اور نہ اصلح ہے۔[3] پھر اللہ پاک نے اُن لوگوں کی صفات بیان کیں جو خیرات میں جلدی کرتے ہیں، یہ لوگ اللہ پاک کے اولیاء و احباب ہیں، ان کی چار صفتیں بیان کیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ هُم
بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٨﴾ وَالَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ﴿٥٩﴾
وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ
رَاجِعُونَ ﴿٦٠﴾ أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ﴿٦١﴾

بے شک جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں (57) اور جو لوگ اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں (58) اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے (59) اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں، تو اس طرح کہ ان کے دل خوف زدہ ہوتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں (60) یہی لوگ بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں اور وہ ان میں باہم سبقت کرنے والے ہیں (61)

نیک لوگوں کی صفات:

ہیبت سے ڈرتے ہیں، یعنی کیا جانے وہاں قبول ہو یا نہ ہو، آگے کام آئے یا نہ آئے۔ دیتے ہیں، یعنی اللہ کی

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٦٣) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٩) [3] تفسير النسفي (٣/ ١٢٥)

راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ انتہی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴾ یعنی وہ لوگ باوجود اپنے احسان (نیکی کرنا، عملِ صالح کو خلوص سے بجا لانا) و ایمان و عملِ صالح کے اللہ پاک سے خائف ہیں۔ اپنے ساتھ اس کے مکر کرنے سے ڈرتے رہتے ہیں، جس طرح کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بے شک مومن نے جمع کیا احسان و خوف کو اور بے شک منافق نے جمع کیا برائی کرنے کو اور بے خوف ہونے کو۔[1]

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک کی کونی و شرعی نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے مریم علیہا السلام کی طرف سے خبر دی ہے: ﴿ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ ﴾ [التحریم: ۱۲] ''اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی۔'' یعنی انھوں نے اس بات کا یقین کیا کہ جو کچھ ہوا، وہ اللہ ہی کی قدر و قضا سے ہوا اور جس شے کو اللہ پاک نے مشروع کیا، پس وہ اگر حکم ہے تو اُن چیزوں میں سے ہے، جن کو وہ دوست رکھتا ہے اور پسند فرماتا ہے اور اگر وہ نہی ہے تو وہ اس قسم سے ہے، جس کو وہ ناپسند کرتا ہے اور اس سے انکار کرتا ہے اور اگر وہ خیر اور بھلائی ہے تو حق ہے، جیسا کہ فرمایا ہے کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی اس کے ساتھ اس کے غیر کو نہیں پوجتے، بلکہ اس کی توحید کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ وحدہ لا شریک لہ۔ نہ اس نے کوئی بیوی رکھی نہ اولاد۔ نہ اس کا کوئی نظیر و مثل ہے نہ کوئی اس کے جوڑ کا ہے۔

نیکیاں کرنے کے باوجود خوفِ الٰہی:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴾ یعنی وہ عطا کرتے ہیں، خیرات دیتے ہیں، حالاں کہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن سے قبول نہ ہو، کیوں کہ ان کو یہ خوف ہے کہ کہیں دینے کی شرطوں میں کوئی قصور نہ ہو گیا ہو، یہ بات ڈر اور احتیاط کے باب سے ہے، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ یہ وہی شخص ہے کہ چوری کرتا ہے، زنا کرتا ہے، شراب پیتا ہے اور وہ اللہ عزوجل سے ڈرتا ہے؟ فرمایا: نہیں اے صدیق کی بیٹی! لیکن یہ وہ لوگ ہیں کہ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، خیرات کرتے ہیں اور اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اُن سے قبول نہ کیا جائے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ﴾ اور اسی طرح ترمذی اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے مالک بن مغول رحمہ اللہ سے مروی حدیث سے اس کے مثل روایت کیا ہے: ''وَرُوِيَ هٰذَا الْحَدِيْثُ مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَعِيْدِ

[1] تفسیر الطبري (۱۹/ ٤٥)

عَنْ أَبِي حَازِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ نَحْوَ هٰذَا"[1] اور اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہما و محمد بن کعب قرظی اور حسن بصری رحمہ اللہ سے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے۔ دوسرے لوگوں نے اس آیت کو یوں پڑھا ہے: "وَالَّذِيْنَ يَأْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ"، یعنی کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں اور وہ خائف ہیں۔ نبی اکرم ﷺ سے مرفوعاً مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو اسی طرح پڑھا ہے۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: ہم کو حدیث بیان کی عفان نے، کہا: ہم کو حدیث بیان کی صخر بن جویریہ نے، کہا: ہم کو حدیث بیان کی اسماعیل مکی نے، کہا: ہم کو حدیث بیان کی ابوخلف مولیٰ بنی جمع نے کہ وہ عبید بن عمیر کے ہمراہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر داخل ہوئے تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: مرحبا ہے ابوعاصم کو، تجھے کونسی چیز منع کرتی ہے کہ تو ہماری زیارت کرے یا ہمارے پاس آئے۔ امام ابو عاصم رحمہ اللہ نے کہا: میں ڈرتا ہوں کہ ہلاک ہو جاؤں، اس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "مَا كُنْتَ لِتَفْعَلَ"، یعنی تو ایسا آدمی نہیں ہے کہ تجھ سے کوئی ہلاک کرنے والا کام ہو۔ امام ابو عاصم نے کہا: میں آیا ہوں، تاکہ آپ سے ایک آیت کے بارے میں پوچھوں کہ اس کو رسول اللہ ﷺ کس طرح پڑھا کرتے تھے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کونسی آیت؟ کہا: "اَلَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا، وَالَّذِيْنَ يَأْتُوْنَ مَآ أَتَوْا"، تو فرمایا، تجھے ان دونوں قراءتوں میں سے کون سی زیادہ پسند ہے؟ میں نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ ان میں سے ایک مجھے ساری دنیا سے زیادہ محبوب ہے یا کہا کہ "دُنْيَا وَمَا فِيْهَا" سے۔ فرمایا: وہ کون سی ہے؟ میں نے عرض کی: "الذين يأتون ما آتوا"، تو فرمایا کہ میں گواہی دیتی ہوں اس بات کی کہ رسول اللہ ﷺ اس کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے اور یہ اسی طرح اُتاری گئی ہے، لیکن ہجا میں تحریف ی گئی ہے۔ اس کی سند میں اسماعیل بن مسلم مکی راوی ضعیف ہے۔[3] (وأخرجه سعيد بن منصور وعبد بن حميد والبخاري في تاريخه وابن المنذر وابن أبي شيبة وابن الأنباري في المصاحف والدارقطني في الأفراد والحاكم وصححه ابن مردويه عن عبيد بن عمير أنه سأل عائشة رضی اللہ عنہا الخ كذا في فتح القدير، لیکن اس روایت میں الفاظ کا تفاوت اور کچھ عبارت کا فرق ہے)۔

پہلی قراءت کی بنا پر معنی زیادہ ظاہر ہیں، یہ قراءت جمہور سبعہ وغیرہم کی ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ أُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴾ لہٰذا ان لوگوں کو "سابقین" سے ٹھہرایا ہے اور اگر معنی دوسری قراءت کی بنا پر ہوں تو قریب ہے کہ وہ "سابقین" سے نہ ہوں، بلکہ مقتصدین سے ہوں یا مُقصِرین سے۔ واللہ أعلم.

---

[1] مسند أحمد (٦/ ١٥٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٢)

[2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٥۔ ٤٦) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٣٠)

[3] مسند أحمد (٦/ ٩٥) فتح القدير (٣/ ٦٦٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه إسماعيل بن مسلم المكي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٧٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کفرہ متنعمین (خوشحال کافروں) سے حقیقی خیرات کی نفی کی تو اس کے بعد اُن لوگوں کا ذکر کیا جو دنیا اور آخرت میں خیرات کے اہل ہیں، پس اُن کی چار صفتیں بیان فرمائیں، پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی خشیت سے مشفقون ہیں، یعنی خوف کھانے والے ہیں۔ اشفاق کے معنی خوف ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَنَا مُشْفِقٌ مِنْ هَذَا الْأَمْرِ" یعنی میں اس امر سے خائف ہوں۔ کسی نے کہا کہ اشفاق بعینہٖ خشیت ہے، پس آیت میں جو ظاہر ہے، اس کو دہرایا ہے۔ کسی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ خشیت عذاب پر محمول ہے۔ یعنی اپنے رب کے عذاب سے خائف ہیں، یہی قول کلبی و مقاتل رحمہ اللہ کا ہے۔[1]

کسی نے یوں جواب دیا ہے کہ اشفاق کمال خوف کو کہتے ہیں، اب کسی طرح کی تکرار نہیں ہے۔ کسی نے یہ جواب دیا ہے کہ اشفاق محمول ہے اس شے پر جو اس کا اثر ہے، یعنی طاعت پر دوام کرنا، معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے اس کی اطاعت پر دوام اور ہمیشگی کرنے والے ہیں، اب بھی کچھ تکرار نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لیے ہے۔ کسی نے کہا کہ اشفاق میں خشیت زیادہ رقت اور ضعف کے ساتھ شامل ہے۔ لہٰذا ان دونوں کو جمع کرنا تاکید کے لیے نہیں ہے، جیسا کہ تقریر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: "مِنْ خَوْفِ عَذَابِهِ حَذِرُوْنَ"[2] یعنی عذابِ رب کے خوف سے حذر کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کے اسباب سے پرہیز کرتے ہیں۔

یہ عبارت تقریرِ مغایرت میں زیادہ تر ظاہر ہے۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا: خوف اسمِ جنس ہے اور خشیت اس سے خاص تر ہے، خشیت وہ خوف ہے کہ جس سے خوف کرتا ہے، اس کی عظمت کے لیے ہو، اسی لیے خشیت کا استعمال اللہ پاک سے ڈرنے کے معنے میں اکثر آیا ہے، جس طرح کہ بندوں کے حق میں خوف کا استعمال زیادہ اور اغلب ہوا ہے۔ شفقت بھی زیادہ تر خوف سے خاص ہے، کیوں کہ شفقت اس خوف سے عبارت ہے کہ جس پر خوف کرتا ہے، اس کے حق میں رقت اور رحمت کے ساتھ ہو، جیسے ماں کی شفقت اپنے بچے پر، اس لیے کہ "خَافَتِ الْأُمُّ أَوْ خَشِيَتْ عَلَى وَلَدِهَا" بہت ہی کم بولتے ہیں، بلکہ "أَشْفَقَتِ الْأُمُّ" کہتے ہیں۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے سورۃ الانبیاء میں زیرِ تفسیر آیہ کریمہ: ﴿ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴾ یوں کہا ہے: "وَهُمْ مِنْ عَظَمَتِهِ وَمَهَابَتِهِ مُرْتَعِدُوْنَ" یعنی فرشتے اللہ پاک کی عظمت و ہیبت کے مارے کانپتے ہیں۔ پھر کہا ہے کہ خشیت کی اصل خوف مع تعظیم ہے، اسی لیے علماء اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور اشفاق خوف ہے مع اعتناء

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٦٤) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٩)

کے، یعنی غم خواری ومہربانی واہتمام کے ساتھ۔ پھر جب حرفِ "من" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو خوف کے معنی اس میں محقق وظاہر ہوتے ہیں اور جب کلمہ "علیٰ" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو اس کے معنی بالعکس ہوتے ہیں۔[1]

سورۃ الانبیاء میں خشیت کو صرف اس شخص کی عظمت پر محمول کیا ہے جس سے ڈرا جائے اور اشفاق کو کمال خشیت پر محمول کیا ہے جو ارتعادِ فرائص کو لازم کرتا ہے (فرائص جمع ہے فریصہ کی، فریصہ شانہ ستور کے گوشت کو اور رگِ ودج کو کہتے ہیں، جو گلے میں ہوتی ہے اور خوف کے وقت کانپنے لگتی ہے)۔ اور جو اس آیت میں ذکر کیا ہے، وہ زیادہ تر اصل معنی کے مطابق ہے، کیوں کہ مخوف منہ (جس سے ڈرا جائے) کی اضافت اللہ پاک کی طرف کر کے اس کی عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے اور حذرون سے رحمت واعتنا کے ساتھ شانِ مخوف کی طرف اشارہ کیا ہے، اس لیے کہ جو شخص اللہ عظیم اور اس کے دردناک عذاب سے خائف ہوگا تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری لازمی طور پر اختیار کرے گا اور اس کی رضا کی طلب اور اس کی معصیت سے بچنے کی انتہائی سعی وکوشش بجا لائے گا، وہ معصیت جو اس کے غصے اور عذاب کی طرف پہنچاتی ہے۔ اس سب سے غرض اپنی جان پر رحمت کرنا ہے اور اس کے حال پر مہربانی فرمانا ہے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ اسم ہے ﴿ اِنَّ ﴾ کا۔ ﴿ هُمْ ﴾ مبتدا ہے، ﴿ مُشْفِقُوْنَ ﴾ خبر۔ ﴿ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ ﴾ متعلق ہے ﴿ مُشْفِقُوْنَ ﴾ سے اور مصدر مضاف ہے مفعول کی طرف۔ اسی طرح اگلے جملوں میں بھی یہی ترکیب جاری ہوگی۔

دوسری صفت یہ ہے کہ اپنے رب کی آیتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ آیات سے مراد تنزیلی آیتیں ہیں، جس طرح کہ امام محلی رحمہ اللہ نے آیات کی تفسیر قرآن شریف سے کی ہے[2] اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں، کتبِ الٰہی کے درمیان تفریق نہیں کرتے، جس طرح کہ اہلِ کتاب نے امرِ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ مراد تکوینی آیتیں ہیں، وہ یہی نشانیاں ہیں جو آفاق میں نصب کی گئی ہیں، یعنی سارے موجودات علوی وسفلی، جو وجودِ صانع پر دال ہیں، عالم کا ہر ہر ذرہ اللہ پاک کے وجود وتوحید کی گواہی دے رہا ہے:

وَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدُ

"ہر چیز میں ایک نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے۔"

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفترے ست معرفتِ کردگار

"ایک باشعور انسان کی نظر میں ہرے درختوں کے پتوں میں ہر پتا اللہ تعالیٰ کی پہچان کی کتاب کا ایک ورق ہے۔"

کسی نے کہا: آیات سے مراد تمام آیاتِ تنزیلی وتکوینی ہیں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا مختار یہی قول ہے۔[4] آیتوں

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٠) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٥١)

[3] تفسير النسفي (٣/ ١٢٥) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٩)

پر ایمان لانے کا مطلب فقط اُن کے وجود کی تصدیق نہیں ہے، کیوں کہ ان کا وجود تو بہ ضرورت معلوم ہے، ان کی تصدیق کچھ تعریف کا موجب نہیں ہے، بلکہ مراد اس بات کی تصدیق ہے کہ وہ آیات دلیلیں ہیں اور اُن کا مدلول حق ہے۔

تیسری صفت یہ ہے کہ اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے مشرکینِ مکہ کی طرح کہ وہ شرک کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے ظاہر و باطن جلی اور خفی شرک کے تارک ہیں۔

چوتھی صفت یہ ہے: "يُؤْتُوْنَ مَآ آتَوا، أَيْ يُعْطُوْنَ مَا أَعْطَوْهُ مِنَ الصَّدَقَاتِ" یعنی دیتے ہیں، جو کچھ کہ دیا صدقہ خیرات سے۔ یہ قراءت عامہ کی ہے۔ ماخوذ "إيتاء" بہ معنی "إعطاء" سے۔ سیدہ عائشہ، ابن عباس رضی اللہ عنہم، امام حسن اور اعمش رحمہم اللہ نے "يَأْتُوْنَ مَآ آتَوا" پڑھا ہے: "إتيان" سے، یعنی کرتے ہیں، جو کچھ کہ کیا ہے طاعات و اعمالِ صالحہ سے۔[1]

﴿ وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ میں حرفِ واو حال کے واسطے ہے اور جملہ حال ہے فاعل ﴿ يُؤْتُوْنَ ﴾ سے، یعنی صدقہ و خیرات دیتے ہیں، یا اعمالِ صالحہ کرتے ہیں، اس حال میں کہ اُن کے دل اس دینے یا اس کرنے سے سخت خائف ہیں، گمان کرتے ہیں کہ کہیں یہ ان کو عذابِ الٰہی سے نجات نہ دے، یا اُن سے قبول نہ ہو اور وجہ لائق پر واقع نہ ہو، تو اُن سے اُن کا مؤاخذہ کیا جائے۔

﴿ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴾ جمہور کی قراءت بفتح "أَنَّ" ہے، حرفِ لامِ جر اس کے اول میں مقدر ہے۔ تقدیر یہ ہے: "لِأَنَّهُمْ"۔ امام محلی، بیضاوی اور نسفی رحمہم اللہ نے یہی وجہ ذکر کی ہے۔[2] غرض یہ ٹھہری کہ ﴿ وَجِلَةٌ ﴾ کی علت ہے، یعنی اُن کے دل اس واسطے خائف ہیں کہ مرجع ان کا اللہ پاک کی طرف ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے اوّل میں حرفِ "من" مقدر ہے: "أَيْ: وَجِلَةٌ مِنْ أَنَّهُمْ" یعنی اُن کے دل اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اُن کا لوٹنا رب کی طرف ہے اور وہ جانتا ہے، اس شے کو جو اُن پر مخفی ہے۔ "وجل" کا سبب یہ ہے کہ وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن کا دیا ہوا یا عملِ صالح مطلوبہ وجہ پر مقبول نہ ہو، نہ صرف اس بات سے کہ اُن کا لوٹنا اللہ پاک کی طرف ہے۔ یہ وجہ امام زجاج رحمہ اللہ کی ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کو بھی ذکر کیا ہے۔[3] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو شخص جزا و حساب کی طرف لوٹ کر جانے کا اعتقاد رکھتا ہے اور یہ بات جانتا ہے کہ جزا دینے والا اور حساب لینے والا اللہ پاک ہی ہے کہ جس پر کوئی مخفی شے پوشیدہ نہیں رہتی ہے تو وہ وجل و خوف سے خالی نہیں رہتا۔

امام اعمش رحمہ اللہ نے "إِنَّهُمْ" بالکسر پڑھا ہے استیناف کی بنا پر، اس صورت میں ﴿ وَجِلَةٌ ﴾ پر وقفِ تام ہوگا یا وقفِ کافی۔[4] "وجل" بھی خوف سے خاص تر ہے، کیوں کہ "وجل" وہ خوف ہے جس میں طمع ملی ہوئی ہو، یعنی

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٤/ ٢٣١) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٥١) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٩) تفسير النسفي (٣/ ١٢٥)
[3] معاني القرآن (٤/ ١٧) تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٩) [4] اللباب في علوم الكتاب (١٤/ ٢٣٢)

حال یہ ہے کہ اُن کے دل اعمال کے رد ہو جانے کے خوف اور قبولیت کی اُمید کے درمیان ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہا کی قراءت کے بارے میں یوں کہا ہے کہ اگر یہ قراءت صحیح ہو جائے تو جماعت کی قراءت کے مخالف نہیں ہے، اس لیے کہ بعض عرب ہمزہ میں الف کو کل حالات میں لازم کرتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: اس قراءت کے معنی "يَعْمَلُوْنَ مَا عَمِلُوْا"[1] ہیں۔ آیتِ باب کے متعلق بعض حدیثیں فتح القدیر میں لکھی ہیں، ان میں سے کچھ تو پہلے مذکور ہو چکیں اور بعض جدید ہیں اور بعض میں الفاظ کا تفاوت ہے، اس لیے اخیر دو قسم کی حدیثیں اس لیے یہاں لکھنا ضروری ہوا کہ ان کا بہت فائدہ ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! "قول الله تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ کیا یہ وہ شخص ہے کہ چوری کرتا ہے، زنا کرتا ہے اور شراب پیتا ہے اور وہ باوجود اس کے اللہ سے ڈرتا ہے، فرمایا: نہیں، لیکن یہ وہ شخص ہے کہ روزہ رکھتا ہے اور صدقہ دیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے اور وہ باوجود اس کے اللہ سے ڈرتا ہے کہ کہیں اس سے قبول نہ کیا جائے۔[2] (أخرجه الفريابي وأحمد وعبد بن حميد والترمذي وابن ماجه وابن أبي الدنيا في نعت الخائفين، وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم و الحاكم وصححه، وابن مردوية والبيهقي في الشعب، وأخرج ابن أبي الدنيا وابن جرير وابن الأنباري في المصاحف وابن مردوية عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: قالت عائشة رضی اللہ عنہا: يا رسول الله، فذكر نحوه)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا: "يُعْطُوْنَ مَا أَعْطَوْا" (أخرجه عبد الرزاق) انھیں سے ﴿ وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا کہ عمل کرتے ہیں ڈرتے ہوئے۔[3] (أخرجه ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ﴿ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا کہ زکات ہے۔ (أخرجه الفريابي و ابن جرير) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ (أخرجه سعيد بن منصور و عبد بن حميد و ابن المنذر)

عبد بن حمید رحمہ اللہ نے امام ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: البتہ یہ کہ ہو یہ آیت جس طرح میں پڑھتی ہوں تو مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ پسند ہے، اس پر عباس رضی اللہ عنہما نے اُن سے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا ﴾ پہلے یہ قراءت اور اس کے معنی گزر چکے ہیں۔ سعید بن منصور رحمہ اللہ نے اور ابن مردویہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا ﴾ پڑھا ہے، یعنی "إتيان" بہ معنی آمدن۔[4]

جملہ ﴿ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ﴾ خبر ہے "إِنَّ" کی اور چار موصول مذکور ایک دوسرے پر عطف

[1] فتح القدير (٣/ ٦٦٤۔ ٦٦٥) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] تفسير الطبري (١٩/ ٤٦) [4] فتح القدير (٣/ ٦٦٨)

کے اعتبار سے اس کے اسم تھے۔ ﴿ اُولٰٓىِٕكَ ﴾ کا اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے، جن میں مذکورہ صفات پائی جاتی ہیں۔ ﴿ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ﴾ کے معنی ہیں "يُبَادِرُوْنَ بِهَا" یعنی مبادرت کرتے ہیں (دوڑ پڑتے ہیں) بھلائیوں کی طرف۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے: "يُنَافِسُوْنَ فِيْهَا"۔ کسی نے کہا: "يُسَابِقُوْنَ" یعنی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کسی نے ﴿ يُسْرِعُوْنَ ﴾ پڑھا ہے،[1] (یعنی جلدی کرتے ہیں۔) امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: اعمالِ صالح کی طرف مبادرت کرتے ہیں۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: رغبت کرتے ہیں طاعات میں بہت زیادہ رغبت تو اُن کی طرف مبادرت کرتے ہیں۔ یا دنیا کی بھلائیاں جن کا اعمالِ صالح پر وعدہ کیا گیا ہے اُن کے پانے میں اعمالِ صالح کی طرف مبادرت کر کے مسارعت کرتے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا ﴾[3] [آل عمران: ۱۴۸] "اللہ نے انھیں دنیا کا ثواب بھی دیا۔" مطلب یہ ہے کہ ﴿ اَلْخَيْرٰتِ ﴾ میں الف و لام مضاف الیہ کا عوض ہے۔

﴿ فِي الْخَيْرٰتِ ﴾ کے معنی ہیں "فِيْ خَيْرٰتِ رَبِّهِمْ" یعنی اپنے رب کی خیرات میں جس کے خوف اور ڈر سے کانپتے رہتے ہیں۔ اور خیرات سے مراد دو امر ہیں: یا تو اُن کی طاعات اور اعمالِ صالحہ ہیں، یا اس سے مراد وہ اجر وثواب ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی وجہ کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ طاعات کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، اس وجہ سے کہ طاعات میں اُن کو بہت رغبت ہے اور دوسری وجہ کی بنا پر مطلب یہ ہے کہ ان کو اعمالِ صالحہ کے بدلے میں جس اجر وثواب کا وعدہ دیا گیا ہے اس کے پانے میں جلدی کرتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کو اجر وثواب کی طرف جلدی کرنے والے ٹھہرایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ اجر وثواب اُن کے لیے ہے، جب اس کی جلدی کی گئی تو یقیناً انھوں نے اس کے پانے میں جلدی کی۔ دوسری وجہ پہلی وجہ سے زیادہ تر موافق ہے، کیوں کہ ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ... الخ ﴾ میں اللہ پاک نے اس بات کی نفی کی ہے کہ کفار مسارعت کریں اس بات کی طرف کہ اُن کے ثوابِ اعمال سے جو شے اُن کے واسطے خیر ہے، اس کی جلدی کی جائے اور مومنین جو اُن کی ضد ہیں، اُن کے لیے اس کا اثبات کیا ہے۔

﴿ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴾ کی ضمیر میں کئی وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ خیرات کی طرف راجع ہے، یہ سب وجوہ سے زیادہ ظاہر وجہ ہے، اس لیے کہ خیرات کا ذکر لفظ میں پہلے آچکا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ جنت کی طرف پھرتی ہے۔ تیسری یہ ہے کہ طاعت کی طرف پھرتی ہے۔ چوتھی یہ ہے کہ ثواب اور مثوبت کی طرف لوٹتی ہے۔ پانچویں یہ ہے کہ سعادت کی طرف پھرتی ہے۔ حرفِ لام میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ اِلٰى ﴾ کے معنی میں ہے: "سَبَقَ لَهُ وَاِلَيْهِ" ایک ہی معنی میں ہیں۔ دوسری یہ ہے کہ تعلیل کے لیے ہے۔ تیسری یہ ہے کہ تقویتِ عامل کے لیے ہے مفعول میں زائد کر دیا گیا ہے، جس طرح کہ "هُمْ لَهَا عَامِلُوْنَ" میں زائد ہے، تقویتِ عامل کے لیے آیا ہے۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٦٥) [2] تفسير الخازن (٥/ ٤٠) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٥٩۔ ١٦٠)

پوری آیت یہ ہے: ﴿ وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٦٣] ''اور اس کے علاوہ بھی ان کے کئی (برے) اعمال ہیں، جنھیں وہ کرنے والے ہیں۔'' جس صورت میں ضمیر خیرات کی طرف راجع ہو اور لام تعلیل کا ہو تو معنی یہ ہوں گے: ''هُمْ لِأَجْلِهَا فَاعِلُوْنَ السَّبْقَ'' یعنی وہ لوگ خیرات ہی کے سبب سے سبقت کرنے والے ہیں۔ (ابی السعود رحمہ اللہ نے اس وجہ کو ''هو الأولیٰ'' کہا ہے)۔[1] اس بنا پر مفعول سبق کا مقدر نہ ہوگا، اس لیے کہ اس جملے کی غرض صرف یہ بتانا ہے کہ ان سے سبقت واقع ہوئی، قطع نظر اس کے کہ کس پر سابق ہوئی۔ اور جس صورت میں ضمیر جنت کی طرف راجع ہو یا طاعت کی طرف یا مثوبت کی طرف یا سعادت کی طرف اور لام ﴿ إِلَىٰ ﴾ کے معنی میں ہو تو مفعول سبق کا مقدر ہوگا اور معنی یہ ہوں گے: ''وَهُمْ سَابِقُوْنَ النَّاسَ إِلَى الْجَنَّةِ وَغَيْرِهَا'' یعنی وہی لوگ جنت کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔ اور جس صورت میں ضمیر خیرات کی طرف راجع ہو اور خیرات سے دنیوی خوبیاں مراد لی جائیں اور لام زائد مفعول میں تقویتِ عامل کے لیے ٹھہرے تو مطلب یہ ہوگا: ''وَهُمْ سَابِقُوْنَهَا'' یعنی وہی لوگ دنیا کی بھلائی کی طرف سبقت کرنے والے ہیں، مطلب ہے کہ ان کو آخرت سے پہلے پائیں گے، کیوں کہ دنیا ہی میں ان کو جلد دے دی گئیں۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اُن کے اعمال کا ثواب جلدی سے دنیا ہی میں دے دیا گیا اور آخرت میں کچھ نہ رہا، بلکہ مراد یہ ہے کہ اُن کی تعظیم اور تکریم کے ظاہر کرنے کے لیے اُن کو دنیا میں بھی دنیوی منافع سے محظوظ فرمایا اور آخرت کی خوبیاں اپنی جگہ پر برقرار ہیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ﴾ [آل عمران: ١٤٨] ''چناں چہ اللہ نے انھیں دنیا میں ثواب دیا اور آخرت میں بہت اچھا ثواب دیا۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [النحل: ١٢٢] ''اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا۔'' امام زمخشری رحمہ اللہ نے تین معنی لکھے ہیں: ''فَاعِلُوْنَ السَّبْقَ لِأَجْلِهَا، أَوْ سَابِقُوْنَ النَّاسَ لِأَجْلِهَا، أَوْ إِيَّاهَا سَابِقُوْنَ''[2] اُن کا حاصل یہ ہے کہ ان سب کی بنا پر ﴿ لَهَا ﴾ کی ضمیر خیرات کی طرف راجع ہے اور لام پہلی دو وجہ میں تعلیل کا ہے اور تیسری میں لام زائد ہے مفعول میں اور اوّل میں مفعول سبق کا مقدر نہیں ہے ثانی میں مقدر ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے زمخشری رحمہ اللہ کی تقلید کرتے ہوئے یہی تین معنی لکھے ہیں، لیکن ثانی میں اتنا زیادہ کہا ہے: ''سَابِقُوْنَ النَّاسَ إِلَى الطَّاعَةِ أَوِ الثَّوَابِ أَوِ الْجَنَّةِ''[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اُن میں سے دو ذکر کیے ہیں: ایک یہ ہے کہ خیرات کے سبب سے جنات کی طرف سبقت کرنے والے ہیں، یا خیرات کے سبب سے انھوں نے لوگوں سے سبقت کی ہے۔[4]

[1] تفسیر أبي السعود (٦/ ١٤٠۔ ١٤١) [2] الكشاف (٣/ ١٩٥)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٦٠) [4] تفسير النسفي (٣/ ١٢٥)

امام ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ان کے لیے اللہ پاک کی طرف سے اُن کی سعادت سابق ہوئی۔[1] امام خازن رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو لکھا ہے اور ''قیل'' کے الفاظ سے ایک قول یہ ذکر کیا ہے کہ اُمتوں میں سے خیرات کی طرف سابق ہوئے۔[2] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ اللہ کے علم میں خیرات کے لیے سبقت کرنے والے ہیں۔[3]

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ ﴿سٰبِقُوْنَ﴾ خبر ہے اور ﴿لَهَا﴾ اس سے متعلق ہے۔ فاصلہ اور اختصاص کے لیے اس پر مقدم کیا گیا ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: جائز ہے کہ ﴿لَهَا سٰبِقُوْنَ﴾ خبر بعد خبر ہو۔[4] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جملہ موکد ہے ماقبل کے جملے کا، یعنی ﴿يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ﴾ کی تاکید کرتا ہے، اس لیے کہ پہلا جملہ تجدد پر دال تھا اور ایک اور ہی معنی دیتا ہے، یعنی ثبوت و استقرار کا فائدہ دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ طاعات اور عبادات میں بہت زیادہ رغبت کرتے ہیں اور ان پر ثابت اور قرار پذیر ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ جن میں چار خصلتیں پائی جاتی ہیں تو یہ ایسی خصلتیں ہیں کہ وسعت اور طاقت میں ہیں، بشری طاقت سے باہر نہیں ہیں، اسی طرح تمام احکام کا حال ہے، جن کے ساتھ اللہ پاک نے اپنے بندوں کو مکلّف کیا ہے اور بندوں کے سارے اعمال کتاب میں ثابت ہیں۔ کسی کے عمل کا بدلہ ضائع نہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

اور ہم کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اور ہمارے پاس ایک ایسی کتاب (نامۂ اعمال) ہے جو (ہر شخص کا حال) ٹھیک ٹھیک بولے گی، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا (62) بلکہ ان (کفار) کے دل اس (قرآن) سے جہالت و غفلت میں ہیں، اور اس کے علاوہ بھی ان کے کئی (برے) اعمال ہیں، جنھیں وہ کرنے والے ہیں (63) حتی کہ جب ہم ان کے خوشحال (عیاش) لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے تو اس وقت وہ چیخ پکار کریں گے (64) (کہا جائے گا:)

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧) [2] تفسير الخازن (٥/ ٤٠) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٥١) [4] الكشاف (٣/ ١٩٥)

آج مت چیخو، یقیناً تم ہماری طرف سے مدد نہیں کیے جاؤ گے ﴿65﴾ تحقیق میری آیات تم پر تلاوت کی جاتی تھیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتے تھے ﴿66﴾ تکبر کرتے ہوئے، (اور) اس کے بارے میں افسانہ خوانی کرتے ہوئے تم بیہودہ گوئی کرتے تھے ﴿67﴾

اللہ تعالیٰ کا عدل و انصاف اور مشرکین کی قلابازیاں:

اللہ پاک اس معاملے میں اپنے عدل کی خبر دیتا ہے، جس کو اس نے اپنے بندوں کے لیے دنیا میں شریعت ٹھہرایا ہے، وہ عدل یہ ہے کہ کسی پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے، جتنا اُٹھانے کی اور اس کے ساتھ قائم رہنے کی طاقت رکھتا ہے اور قیامت کے دن بندوں سے اُن کے اعمال کا حساب لے گا، جن کو کہ کتابِ مسطور میں لکھ رکھا ہے، اس سے کچھ بھی ضائع نہ ہو گا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی کتابِ اعمال۔ ﴿ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ نیکی میں سے کچھ کم نہ ہو گا۔ رہی سیئات سو اپنے مومن بندوں کے لیے اُن میں سے بہت کو معاف کر دے گا، ان سے درگزر فرمائے گا۔

پھر اللہ پاک نے قریش کے کفار و مشرکین پر انکار کر کے فرمایا: ﴿ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ ﴾ یعنی بلکہ اُن کے دل غفلت و گمراہی میں ہیں۔ ﴿ مِّنْ هٰذَا ﴾ یعنی قرآن شریف سے، جس کو اس نے اپنے رسول کریم ﷺ پر نازل فرمایا ہے: ﴿ وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴾ حکم بن ابان رحمہ اللہ نے "عن عکرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما" روایت کیا ہے کہ ﴿ وَلَهُمْ اَعْمَالٌ ﴾ سے مراد اعمالِ بد ہیں۔

﴿ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ ﴾ سے مراد شرک ہے۔ ﴿ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴾ فرمایا ضرور ہے کہ وہ ان کو کریں گے۔ امام مجاہد، حسن اور غیر واحد سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور لوگوں نے کہا کہ اعمالِ بد ان پر لکھے گئے ہیں، ضروری ہے کہ وہ ان کو اپنی موت سے پہلے لا محالہ کریں گے، تاکہ عذاب کا کلمہ ان پر ثابت ہو جائے۔ مقاتل بن حیان، سدّی اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔[1] یہ قول ظاہر و قوی و حسن ہے۔ ہم پہلے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہ الفاظ ذکر کر آئے ہیں کہ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے! بے شک آدمی البتہ کرتا ہے اہلِ جنت کے اعمال، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر کتاب سبقت کر جاتی ہے تو وہ اہلِ نار کا عمل کر لیتا ہے، پھر وہ اس میں داخل ہوتا ہے۔[2]

﴿ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴾ یعنی جو لوگ ان میں سے دنیا میں مال دار اور

---

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٤٩۔ ٥٠) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٣١)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١٥٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٤٣)

آسودہ حال ہیں، جس وقت اُن پر عذابِ الٰہی آتا ہے اور اس کی تکلیف اور سزا ان پر نازل ہوتی ہے، تب وہ چلانے لگتے ہیں اور فریاد رسی چاہتے ہیں، جیسے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ [المزمل: ۱۱۔ ۱۳] ”اور مجھے اور تکذیب کرنے والے آسودہ حال لوگوں کو تنہا چھوڑ دیجیے اور انھیں تھوڑی سی مہلت دیجیے۔ بے شک ہمارے پاس بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے۔ اور گلے میں اٹکنے والا طعام اور دردناک عذاب ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ﴾ [صٓ: ۳] ”ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں تو (عذاب آنے پر) انھوں نے (مدد کو) پکارا جب کہ وہ فرار و خلاصی کا وقت نہ تھا۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو شے تم پر نازل ہوئی ہے، اس سے تم کو کوئی پناہ نہ دے گا تم چلاؤ، یا چپ رہو، دونوں برابر ہیں، نہ کوئی بھاگنے کی جگہ ہے، نہ خلاصی کی جگہ اور نہ کوئی پناہ۔ امر لازم ہوا، عذاب واجب ہو چکا۔ پھر اُن کے گناہوں میں سے جو زیادہ بڑا گناہ تھا، اللہ پاک نے اس کا ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴾ یعنی جس وقت تم بلائے جاتے تو انکار کرتے اور جب طلب کیے جاتے تو باز رہتے۔ ﴿ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴾ [المؤمن: ۱۲] ”(فرمایا جائے گا:) تمھیں یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ بلاشبہہ جب تنہا اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم (اس کی توحید کا) انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم (اس شرک کو) مان لیتے تھے، اب حکم تو اللہ ہی کا ہے جو نہایت برتر اور بہت بڑا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ جس وقت وہ حق سے اُلٹے بھاگتے اور اس کا انکار کرتے تھے، اس سے بڑائی کر کے اور اس کو اور اس کے ماننے والوں کو حقیر جان کر۔ لہٰذا یہ اس وقت اُن کا حال ہے۔ چنانچہ اس قول کی بنا پر ضمیر ﴿ بِهٖ ﴾ میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ حرم کی طرف راجع ہے، یعنی مکہ معظمہ، اُن کی مذمت اس لیے کی گئی کہ وہ اس میں بے ہودہ کہانیاں کہا کرتے تھے۔ دوسرا یہ ہے کہ ضمیر قرآن شریف کی طرف پھرتی ہے، وہ لوگ بات چیت کرتے، قصے کہانی کہتے اور قرآن شریف کا ذکر بے ہودہ باتوں سے کیا کرتے تھے۔ اس کو کہتے کہ سحر ہے، شعر ہے، کہانت ہے، اس کے علاوہ اور باطل اقوال کہتے تھے۔ تیسرا یہ ہے کہ ضمیر نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے۔ اپنے قصوں کہانیوں میں آپ ﷺ کا ذکر اقوالِ فاسد سے کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ کے لیے باطل باطل مثالیں بیان کیا کرتے تھے کہ آپ شاعر ہیں یا کاہن یا ساحر یا کذاب یا مجنون۔ سو یہ سب باتیں باطل ہیں، بلکہ آپ تو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، کون سے رسول جن کو اللہ پاک نے مکے والوں پر غلبہ دیا اور ان کفار کو حرم سے ذلیل و خوار کر کے نکالا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر بیت اللہ شریف کی طرف راجع ہے، اس کے ساتھ فخر کیا کرتے اور اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ اس کے اولیا ہیں، یعنی بیت اللہ کے متولی، حالاں کہ وہ اس کے متولی نہ تھے، جیسا کہ امام نسائی رحمہ اللہ نے اپنی سنن کی کتاب تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ''سَمَرَ'' اسی وقت مکروہ کی گئی جس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴾۔ پس فرمایا کہ تکبر کرنے والے بیت اللہ کے بارے میں کہتے کہ ہم تو اس کے اہل ہیں، یعنی ہم بیت اللہ کے والی ہیں۔ ﴿ سٰمِرًا ﴾ کہا کہ تکبر کیا کرتے اور اس میں قصے کہا کرتے تھے، اس کو آباد نہ رکھتے اور اس کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یہاں طویل کلام کیا ہے، اس کا حاصل یہی ہے۔[2] (کذا قال الحافظ ابن کثیر رحمہ اللہ)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جب ذکرِ اعمالِ مکلفین کی طرف تقدیر کھچی تو اللہ پاک نے اعمال کے واسطے دو حکم بیان فرمائے: پہلا حکم یہ ہے: ﴿ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾۔ ''وسع'' کہتے ہیں طاقت کو۔ سورۃ البقرہ کے آخر میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔[3] ''وسع'' کی تفسیر میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ ''وسع'' بہ معنی طاقت ہے، چناں چہ اہلِ لغت نے اس کی تفسیر یہی کی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ''وسع'' بہ معنی ''دُوْنَ الطَّاقَةِ'' ہے، یعنی طاقت سے کم۔ مقاتل، ضحاک، کلبی اور معتزلہ اسی کے قائل ہیں۔ کہا ہے کہ وسع کا نام وسع اس لیے رکھا ہے کہ اس کے فاعل پر اس کا فعل وسیع وفراخ ہوتا ہے، اس پر تنگ نہیں ہوتا، لہٰذا جو شخص کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے اور جو اس کی بھی طاقت نہیں رکھتا تو اشارے سے پڑھے اور جس کو روزے کی طاقت نہیں ہے تو وہ افطار کرے۔[4] یہ جملہ مستانفہ ہے، اس سے غرض فعلِ طاعات پر آمادہ کرنا ہے، جو کہ کرامات کے حصول کی طرف پہنچایا گیا ہے اور جس کے ساتھ سابقین کا وصف کیا ہے، یہ بات بیان کر کے کہ وہ سہل ہے وسع اور طاقت کی حد سے باہر نہیں ہے۔ یہ اپنے بندوں کی تکلیف میں اللہ پاک کی عادت ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص تکلیف مالا یطاق جائز رکھتا ہے۔ اس پر یہ آیت رد کرتی ہے۔[5]

دوسرا حکم یہ ہے: ﴿ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ ﴾ پہلے جو تکلیف مافوق طاقت کی نفی کی ہے، یہ جملہ اس کے تتمہ سے ہے۔ کتاب سے مراد اعمال کے صحیفے ہیں، یعنی نامہ ہائے اعمال۔ معنی یہ ہیں کہ ہمارے پاس ایک کتاب ہے اس میں تمام مکلفین کے اعمال ثبت کیے گئے ہیں، اس حالت پر جس پر وہ ہیں۔ ﴿ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس سے واقع کے مطابق حق ظاہر ہوتا ہے، بغیر زیادتی اور کمی کے، اس میں سچائی ہی سچائی ہے، کوئی بات خلافِ واقع

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤١٢)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٣١۔ ٣٣٢)
[3] رقم الآية (٢٨٦)
[4] فتح القدير (٣/ ٦٦٥)
[5] تفسير النسفي (٣/ ١٢٥)

نہیں پائی جاتی ہے، اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الجاثیة: ۲۹] ''(کہا جائے گا:) یہ ہماری کتاب ہے، یہ تمھارے متعلق سچ سچ بولتی ہے۔ بلاشبہہ ہم لکھواتے تھے جو تم عمل کرتے رہے تھے۔'' اس میں نافرمانوں کو ڈانٹنا اور دھمکانا ہے اور فرماں برداروں کو اُنس دینا ہے ظلم وجور سے۔ کسی نے کہا کہ کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے، کیوں کہ اس میں ہر شے لکھی گئی ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ کا قول یہی ہے۔ امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے دونوں قول ذکر کیے ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ قرآن شریف مراد ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

﴿ لَدَيْنَا ﴾ بہ معنی ''عِنْدَنَا'' ہے اور عندیت رتبہ اور اختصاص کی ہے۔ آیت میں کتاب کے ساتھ اس شخص کو تشبیہ دی ہے جو بولتا ہے، کیوں کہ کتاب بھی ظاہر کرتی ہے جو اس میں ہوتا ہے، جس طرح کہ ناطق اور حق بیان کرنے والا اظہار کرتا ہے۔ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ کا تعلق ﴿ يَنْطِقُ ﴾ سے ہے، یا محذوف سے ہے اور وہ حال ہے فاعل ﴿ يَنْطِقُ ﴾ سے، ''أَيْ: يَنْطِقُ مُتَلَبِّسًا بِالْحَقِّ'' یعنی وہ کتاب بولتی ہے، اس حال میں کہ حق کے ساتھ متلبس ہے۔ غرض یہ ہے کہ اس کا نطق و بیان و اظہار حالتِ حق وصدق میں ہوگا۔ اللہ پاک نے اپنے بندوں کی جزا میں جو تفضّل اور عدل ذکر فرمایا، اس کو یہ جملہ واضح کرتا ہے: ﴿ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اُن پر ظلم نہ ہوگا کہ ثواب کم کر دیا جائے یا سزا کی زیادتی ہو، بلکہ پورا پورا ثواب اور عذاب ہوگا۔

اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الکھف: ٤٩] ''اور انھوں نے جو عمل کیے تھے حاضر پائیں گے۔ اور آپ کا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔'' چوں کہ نفس سیاقِ نفی میں واقع ہوا ہے اس لیے باعتبارِ عمومِ نفس ﴿ يُظْلَمُوْنَ ﴾ بصیغۂ جمع فرمایا ہے۔ پہلے اللہ پاک نے کفار کا حال ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ ﴾ میں نقل کیا تھا، اب پھر اسی کی طرف رجوع کیا اور فرمایا: ﴿ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا ﴾ اور جملے ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ﴾ سے لے کر ﴿ يُظْلَمُوْنَ ﴾ تک جو کفار سے متعلق ہیں وہ معترضہ ہیں۔ ﴿ قُلُوْبُهُمْ ﴾ کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہے۔ ﴿ غَمْرَةٍ ﴾ سے یہاں پر مراد پردہ وغفلت ہے، یا حیرت واندھا پن، یا جہالت، اس کا بیان قریب ہی گزر چکا ہے ﴿ هٰذَا ﴾ کا اشارہ ہے کتاب ناطق بحق کی طرف، یا اس امر کی طرف جس پر مومنین قائم ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کا قول یہی ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے دونوں قول ذکر کیے ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ قرآن شریف کی طرف اشارہ ہے۔[2] غرض یہ ہے کہ امورِ مذکور سے کفار کے دل ایک ایسے پردہ وغفلت میں ہیں، جو اُن کو ڈھانکے ہوئے ہے، اس وجہ سے ان کو کچھ سوجھتا نہیں ہے۔ امام عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے

---

[1] تفسر الجلالين (١/ ٤٥١) تفسير النسفي (٣/ ١٢٥) تفسير البيضاوي (٤/ ١٦٠)

[2] تفسير النسفي (٣/ ١٢٥) تفسير البيضاوي (٤/ ١٦٠) تفسير الجلالين (١/ ٤٥١)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ غَمْرَةٍ ﴾ سے مراد کفر و شرک ہے۔

﴿ وَلَهُمْ اَعْمٰلٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ ﴾ فرمایا کہ ان کے واسطے شرک کے علاوہ بھی اعمالِ سیئہ ہیں۔ ﴿ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴾ فرمایا کہ وہ ان کو ضرور کریں گے۔[1] امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اُن کے واسطے خطایا ہیں، ضروری ہے کہ وہ ان کو کریں گے سوائے حق کے۔ امام حسن اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اُن کے لیے اعمال ردی ہیں، انھوں نے ان کو کیا نہیں سوائے اُن اعمال کے جن پر وہ ہیں۔ ضروری ہے کہ وہ ان اعمال کو کریں گے۔ پھر اُن کے سبب سے آگ میں داخل ہوں گے۔[2] ان اقوال کی بنا پر ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ یا تو مومنین کے اعمال کی طرف ہوگا، یا کفار کے اعمال کی طرف، یعنی اُن کے لیے اعمال ہیں سوائے مومنین کے اعمال کے جن کا ذکر اللہ پاک نے کیا ہے۔ یا سوائے اعمالِ کفار کے جن کا ذکر ہو چکا ہے کہ ان کے دل امرِ مذکور سے ایک عظیم غفلت میں ہیں، یہ اعمال اُن کی مختلف کفریہ حرکتیں اور نافرمانیاں ہیں۔ ان سب میں سے ایک عمل یہ ہے کہ انھوں نے قرآن شریف میں طعن کیا، جس کا ذکر آیندہ آئے گا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین اور اصحابِ معانی کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ اُن کے اعمالِ خبیث کی خبر دی ہے، جن کو وہ آیندہ کریں گے اور وہ اُن کو لکھا چکے ہیں کہ ضروری ہے کہ وہ ان کو کریں گے۔

جملہ ﴿ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴾ جملہ ما قبل کا مقرر ہے، یعنی ان پر واجب ہے کہ وہ ان اعمال کو کریں گے۔ پھر اُن کے سبب سے آگ میں داخل ہوں گے، کیوں کہ ان کے لیے بدبختی سابق ہو چکی ہے، اس سے ان کو کوئی مفر نہیں نہ کسی طرح کا بچاؤ[3] ؎

در کوچۂ سعادت شان راہ گزر نہ دادند — گر تو نمی پسندے تغییر کن قضا را
آنچہ بودست شود آنچہ نبودہ نشود — تو چہ دانی کہ دریں کار چہ حکمت باشد

”نیک بختی کی گلی میں انھیں داخل نہیں ہونے دیا گیا، اگر آپ اس بات کو پسند نہیں کرتے تو تقدیر کو بدل دیں۔
جو چیز موجود ہے، وہ بعض دفعہ غیر موجود نہیں ہوتی، تجھے کیا معلوم کہ اس کام میں کون سی حکمت پوشیدہ ہے۔“

جمل نے کہا: ﴿ وَلَهُمْ اَعْمٰلٌ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ ان کے واسطے اعمالِ سیئہ ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی لونڈیوں کو زنا میں قائم کرتے ہیں، یعنی اُن سے زنا کرواتے ہیں اور اُن کی خرچی خود کھاتے پیتے ہیں۔ ﴿ دُوْنِ ﴾ سے مراد غیر ہے، یعنی ضد۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے اعمال مومنین کے مخالف و متضاد ہیں، جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن پر ہمیشگی کرنے والے ہیں، یعنی ان اعمال پر جمے ہوئے ہیں، ان کو کیے جاتے ہیں، اُن سے باز نہیں رہتے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وَلَهُمْ

[1] الدر المنثور (٦/ ١٠٧) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩۔ ٥٠) تفسير القرطبي (١٢/ ١٣٤۔ ١٣٥) [3] فتح القدير (٣/ ٦٦٦)

أَعْمَالٌ خَبِيثَةٌ مُتَجَاوِزَةٌ مُتَخَطِّيَةٌ لِذَلِكَ أَيْ: لِمَا وُصِفَ بِهِ الْمُؤْمِنُونَ"[1] یعنی کفار کے ایسے خبیث عمل ہیں کہ مومنوں کے اعمال سے متجاوز ہیں، مطلب یہ ہے کہ انھوں نے مومنوں کے عمل تو چھوڑے اور بدعمل اختیار کیے۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ایک تو یہی معنی لکھے ہیں۔ دوسرے یہ معنی ذکر کیے ہیں کہ اُن کے لیے خبیث اعمال ہیں کہ جس شرک پر وہ قائم ہیں، یہ اعمال اس سے کم رُتبہ ہیں، وہ لوگ اُن کے کرنے کے عادی ہو رہے ہیں۔[2] پھر اللہ پاک نے کفار کے وصف کی طرف رجوع کیا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ﴾ یہ ﴿حَتّٰۤى﴾ وہی ہے جس کے بعد کلام کی ابتدا کی جاتی ہے اور کلام وہی جملہ شرطیہ مذکورہ ہے اور یہ جملہ اپنے ماقبل کی وضاحت کرتا ہے۔ ﴿مُتْرَفِيْهِمْ﴾ کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ "مُتْرَفِيْنَ" سے مراد اُن کے غنی مالدار آسودہ حال لوگ ہیں، جن کی اللہ پاک نے مال و اولاد سے امداد فرمائی تھی، یا مراد اُن کے رئیس اور سردار ہیں۔ عذاب سے مراد وہی عذاب ہے کہ بدر کے دن تلوار سے قتل ہوئے، یا بھوک کا عذاب ہے، جبکہ نبی اکرم ﷺ نے اُن پر ان الفاظ سے بددعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلَى مُضَرَ، وَاجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِي يُوْسُفَ»[3] یعنی الٰہی! تو اپنا دباؤ مُضر پر سخت کر اور تو ان پر سالہائے قحط کر دے یوسف علیہ السلام کے قحط کے سالوں کی طرح۔ تو وہ قحط میں مبتلا ہوئے، یہاں تک کہ کتے اور مردار اور جلی ہوئی ہڈیاں کھا گئے۔ کسی نے کہا: مراد آخرت کا عذاب ہے۔ اس قول کو یوں ترجیح دی ہے کہ ان سے جو جؤار واقع ہوگا، وہ آخرت کے عذاب ہی کے وقت ہوگا، کیوں کہ جؤار اللہ پاک سے استغاثہ و فریاد رسی چاہنا ہے، حالاں کہ اس کا وقوع ان سے نہ بدر کے دن ہوا نہ ہی قحط کے سالوں میں۔ لیکن پہلے قول والوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جؤار لغت میں صراخ کو کہتے ہیں، یعنی چیخنا چلانا۔

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جُؤار مثل خوار کے ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "جَأَرَ الثَّوْرُ يَجْأَرُ"[4] یعنی بیل چلایا، حالاں کہ کفار کو جس وقت بدر کے دن عذاب کیا گیا اور قحط کے سالوں میں بھوک کا عذاب دیا گیا تو ان کے اہل و عیال چیخے اور چلائے اور اس جگہ جؤار اُس جؤار کے ساتھ مقید نہیں، جس کے معنی دعا کے ساتھ آہ و زاری کرنا ہے، تاکہ جو بات اس قائل نے ذکر کی ہے، وہ پوری ہو جائے۔ بالجملہ یہ کفار کی غمرت و حیرت و غفلت و جہالت اور اُن کے اعمالِ خبیث کی انتہا ہے جن کو وہ کر رہے ہیں اور ﴿حَتّٰۤى﴾ کے بعد جملہ شرطیہ ہے، اس کی جزا ﴿اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ﴾ ہے۔ کلمۂ ﴿اِذَا﴾ حرفِ جار کے قائم مقام ہے، یعنی "فَهُمْ يَجْأَرُوْنَ"، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ وہ لوگ اپنے حالِ مذکور سے باز نہ رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ ان کے آسودہ حال لوگوں اور

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٢٥۔ ١٢٦) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٦٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٥) [4] تفسير القرطبي (١٢/ ١٣٥)

سرداروں کو عذاب سے پکڑے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ مُتْرَفِيْهِمْ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ان سے مراد اہلِ بدر ہیں۔①

امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے ﴿ يَجْـَٔرُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: "يَسْتَغِيْثُوْنَ" یعنی فریاد رسی چاہیں گے۔② علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: جؤار، صراخ باستغاثہ ہے،③ یعنی بآوازِ بلند فریاد کرنا ہے، فریاد رسی چاہنے کے ساتھ۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا: آواز بلند کرنا ہے استغاثہ کے ساتھ۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: حتی ایک لفظ ہے کہ اس کے بعد جملے کی ابتدا کی جاتی ہے۔ ﴿ اِذَا ﴾ شرطیہ ظرفیہ ہے ﴿ يَجْـَٔرُوْنَ ﴾ کے واسطے۔ پس وہ اسمِ شرط اپنی شرط کا خافض ہے۔ شرط کے جواب سے منصوب ہے۔ دوسرا ﴿ اِذَا ﴾ حرفِ مفاجات ربط میں فائے جزا کا قائم مقام ہے اور اس کے بعد کا جملہ پہلے ﴿ اِذَا ﴾ کا جواب ہے۔ گویا یوں کہا گیا: "فَهُمْ يَجْأَرُوْنَ"۔ امام سمین رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ یہ ﴿ حَتّٰى ﴾ یا تو حرفِ ابتدا ہے اور اس کے بعد جملہ شرطیہ اس کے ماقبل کی غایت ہے اور دوسرا ﴿ اِذَا ﴾ فجائیہ جواب ہے شرطیہ کا، یا بعض کے نزدیک حرفِ جر ہے۔ امام حوفی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ حَتّٰى ﴾ غایت ہے اور وہ عاطفہ ہے۔ ﴿ اِذَا ﴾ ظرف مضاف ہے اپنے مابعد کی طرف، اس میں معنی شرط ہیں اور دوسرا ﴿ اِذَا ﴾ اوّل کے موضع میں ہے اور معنی کلام کے عامل ہیں ﴿ اِذَا ﴾ میں۔ امام بیضاوی، نسفی اور محلی رحمہم اللہ کا مختار یہی قول ہے کہ ﴿ حَتّٰى ﴾ ابتدائیہ ہے۔④

پھر اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی کہ جس وقت ہم اُن کو عذاب کے ساتھ پکڑیں گے، اس وقت وہ چلائیں گے، چیخیں گے، استغاثہ کریں گے تو اس وقت سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر اُن سے یوں کہا جائے گا: ﴿ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ ﴾ یعنی آج تم مت چیخو چلاؤ اور فریاد رسی مت چاہو۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: جائز ہے کہ یہ قول شرط کا جواب ہو، اس لیے کہ اس سے پہلے قول مقدر ہے اور یہ جملہ اُن کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور نا اُمید کرنے اور اُن کے طمع کو ختم کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔⑤ اللہ پاک نے خاص طور پر "مُتْرَفِيْنَ" کا ذکر کیا، باوجود اس کے کہ عذاب ان سب کو لاحق ہوگا، آسودہ و غیر آسودہ سب لوگوں پر واقع ہوگا، لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے اس بات کا بیان کرنا مقصود ہے کہ ان کے آسودہ لوگ جس عیش اور نعمت میں تھے، اس کے بعد ایسی حالت میں ہوگئے جو پہلی حالت کے مخالف اور متضاد تھی۔ چنانچہ وہ ہر قسم کے عیش و آرام سے بدبختی اور تکالیف کی طرف منتقل ہوگئے۔ ﴿ اَلْيَوْمَ ﴾ کا ذکر خاص کر اس لیے کیا کہ مقصود ان کا ہول، یعنی خوف میں ڈالنا ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کو جؤار سے منع کرنے کی وجہ بیان کی کہ ﴿ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴾ یعنی تم مت

---

① سنن النسائي، الكبرىٰ (٦/ ٤١٣) ② تفسير الطبري (١٩/ ٥٠) ③ تفسير النسفي (٣/ ١٢٦)
④ تفسير البيضاوي (٤/ ١٦٠) تفسير النسفي (٣/ ١٢٦) تفسير الجلالين (١/ ٤٥١) ⑤ تفسير البيضاوي (٤/ ١٦٠)

چلاؤ، اس لیے کہ تمھارا چیخنا چلانا اور فریاد رسی چاہنا، تمھیں ہمارے عذاب سے نہ بچائے گا نہ تمھیں اس سے خلاصی دے گا، نہ تمھارا گھبرانا تم کو کوئی فائدہ پہنچائے گا۔ یہ معنی اس بنا پر ہیں کہ ﴿ مِنَّا ﴾ کا کلمہ ''من'' صلہ ہے ''نَصر'' کا، کونسی نصر، وہ نصر جس میں عذاب کو روکنا اور اس سے حفاظت کرنا شامل ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہماری طرف سے کوئی نصر و مدد تم کو نہ ملے گی کہ جو بلا اور آفت تم پر آپڑی ہے، اس سے تم کو روکے۔ یہ معنی اس بنیاد پر ہیں کہ کلمہ ''من'' ابتدائیہ ہے۔ پھر اللہ پاک نے چیخنے چلانے کے فائدہ نہ دینے کا سبب بیان کیا اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے اُن کی قباحتوں اور عیبوں کا شمار فرمایا۔

چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی آج تم کو تمھارا جزع و فزع کرنا کوئی فائدہ نہ دے گا، یعنی گھبرانا، ڈرنا اور بے صبری وزاری کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، نہ ہماری طرف سے تمھاری کچھ مدد ہوگی، نہ تمھاری فریاد کی شنوائی ہوگی، اس لیے کہ بدر کی لڑائی سے پہلے، یا قحط سالی میں مبتلا ہونے سے پہلے، یا دنیا میں تم پر قرآن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں ﴿ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴾ تو تم اپنے پیچھے لوٹتے تھے۔ ''نکوص'' کی اصل رجعتِ قہقری ہے، یہ چال سب چالوں سے بدتر ہے۔ اس لیے کہ اس کا چلنے والا اپنے پیچھے کو نہیں دیکھتا۔ یہ کنایہ ہے آیتوں سے منہ موڑنے سے۔ اس کی فارسی سپسائگی رفتن ہے، یعنی ایڑیوں کے بل پیچھے کو چلنا، اسی بارے میں شاعر کا یہ قول ہے ؎

زَعَمُوْا أَنَّهُمْ عَلَى الْحَقِّ   وَأَنَا نُكَّصٌ عَلَى الْأَعْقَابِ

یعنی ان کا زعم یہ ہے کہ وہ تو حق کی راہوں پر ہیں اور ہم الٹے پاؤں چلنے والے ہیں ایڑیوں پر۔ یہ تو ''نکوص'' کے اصلی معنی ہیں اور اس جگہ اس کا استعارہ کیا ہے حق سے اعراض کرنے کے واسطے۔ مطلب یہ ہے کہ تم قرآن شریف کی آیتوں کے سننے اور ان کے سچا جاننے ماننے اور اُن پر عمل کرنے سے پیٹھ پھیر کر اعراض کرتے، منہ موڑتے تھے۔ ابن جریر وابن منذر وابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ تَنْكِصُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں ''تُدْبِرُوْنَ''[1] یعنی پیٹھ پھیرتے تھے۔ مختار میں کہا ہے کہ ﴿ تَنْكِصُوْنَ ﴾ باب ''جَلَسَ وَدَخَلَ'' سے آیا ہے،[2] یعنی ''ضَرَبَ يَضْرِبُ'' اور ''نَصَرَ يَنْصُرُ'' دونوں باب سے ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ اسد اللہ الغالب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بجائے ﴿ اَعْقَابِكُمْ ﴾ کے ''أَدْبَارِكُمْ تَنْكُصُوْنَ''، بضم کاف پڑھا ہے۔[3]

﴿ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ﴾ ﴿ تَنْكِصُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے، یا محذوف سے متعلق ہے کہ وہ ﴿ تَنْكِصُوْنَ ﴾ کے فاعل سے حال واقع ہوا ہے۔ ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ ﴾ میں ضمیر ﴿ بِهٖ ﴾ بیتِ عتیق یا حرم کی طرف راجع ہے۔ اگر کوئی کہے کہ بیت اللہ اور حرم کا ذکر پہلے نہیں ہوا کہ ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر اس کی طرف پھرے؟ تو کہیں گے کہ چوں کہ اہلِ مکہ کا

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٢) [2] مختار الصحاح (١/ ٦٨٨) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ١٣٦)

تکبر اور فخر وغرور بیت اللہ کے ساتھ مشہور ومعروف تھا اور وہ اس کی ولایت وخدمت پر فخر کیا کرتے اور کہتے کہ ہم پر کوئی غالب نہ ہوگا، کیونکہ ہم تو حرم کے اہل و خدام ہیں، ہم لوگ امن میں ہیں، بخلاف اُور لوگوں کے کہ وہ اپنے وطن میں خوفزدہ اور ترساں رہتے ہیں، وہ لوگ اس تکبر اور فخر کے ساتھ مشہور تھے، اس لیے بیت اللہ یا حرم کے پہلے ذکر ہونے کی ضرورت نہ رہی۔

اس قول کی سند یہ ہے کہ امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ اللہ کے حرم کے ساتھ تکبر کرنے والے کہ اُن پر اس میں کوئی غالب نہ ہوگا۔[1] جمہور مفسرین بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس قول کو اولیٰ کہا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر ﴿ اٰيٰتِيْ ﴾ کی طرف راجع ہے اس لیے کہ ﴿ اٰيٰتِيْ ﴾ بمعنی "کتبي" ہے، مراد قرآن شریف ہے۔ قرآن کے ساتھ استکبار کرنے کے یہ معنی ہیں کہ مارے تکبر کے اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یا قرآن شریف کا سننا ان کے واسطے تکبر، طغیان وسرکشی پیدا کرتا ہے تو وہ اس پر ایمان نہیں لاتے، چوں کہ استکبار میں تکذیب کے معنی شامل ہیں، اس لیے جس حرف کے ساتھ تکذیب متعدی ہوتی تھی، اس کے ساتھ استکبار بھی متعدی ہوا۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول جید ہے۔[2] تیسرا قول یہ ہے کہ ضمیر کلمہ تکذیب کی طرف راجع ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو اوّل لکھا ہے۔[3] یہ تین قول تو ﴿ بِهٖ ﴾ کے مرجع میں ہیں۔ اب رہی بحث حرفِ با کے متعلق میں اور اس کی اقسام میں تو پہلے قول کی بنا پر یہ ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ ﴾ سے متعلق ہوگا اور حرفِ با سببیہ ہوگا۔ دوسرے قول کی بنیاد پر بھی ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ ﴾ سے متعلق ہوگا، لیکن ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ ﴾ بمعنی "مُكَذِّبِيْنَ" ٹھہرے گا۔ اور حرفِ با تعدیہ کا ہوگا۔ یا سببیہ بایں معنی کہ تکبر کرنے والے ہیں مسلمانوں پر قرآن کے اور اس کے سننے کے سبب سے۔ یا حرفِ با ﴿ سٰمِرًا ﴾ سے متعلق ہوگا اور مصاحبت و ملابست کے لیے ٹھہرے گا، اس لیے کہ مکے والے رات کو بیت اللہ کے گرد جمع ہوتے، قرآن شریف کے ذکر کے ساتھ قصے کہانیاں کہا کرتے، اس کو شعر سحر کہانت وغیرہ کہتے، نبی اکرم ﷺ کی شان میں بے ادبانہ الفاظ بکتے۔ ﴿ بِهٖ ﴾ کو ﴿ سٰمِرًا ﴾ سے پہلے اس لیے لائے کہ اُن کے قصے کہانیاں عام طور پر قرآن کے ذکر میں ہوتے تھے تو گویا وہ یوں قرار دیے گئے کہ اُن کی سمر قرآن شریف کا ذکر اور اس میں طعن کرنا تھی۔ سمر افسانے کو اور افسانہ کہنے کو کہتے ہیں۔

اصل میں سمر سایۂ ماہ کو بولتے ہیں، بسبب اس کے سُمرہ (گندم گونی) کے۔ وہ لوگ چونکہ رات کو چاندنی میں بیٹھ کر قصے کہانی کہتے، بات چیت کرتے تھے اس لیے خود قصے کہانی کا نام سمر رکھ دیا۔ سامر اصل میں مصدر ہے، فاعل

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٥٢) [2] تفسیر القرطبي (١٢/ ١٣٦) [3] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٦١)

کے وزن پر آیا ہے، جیسے: عافیہ، اسی لیے ضمیر ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ ﴾ سے حال واقع ہوا ہے۔[1] امام زمخشری رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح حاضر کا اطلاق جمع پر آتا ہے، اسی طرح سامر بھی جمع پر بولا جاتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ سامر وہ جماعت ہے جو رات کو بات چیت کیا کرتے ہیں۔[2] امام واحدی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[3]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ سٰمِرًا ﴾ اسم جمع ہے، جیسے: حاج، حاضر، راکب اور غائب۔ اب رہی یہ بات کہ ﴿ بِهٖ ﴾ متعلق ہو ﴿ سٰمِرًا ﴾ سے اور ضمیر راجع ہو بیت اللہ یا حرم کی طرف، تو اس صورت میں حرفِ با بہ معنی "فِيْ" ہوگا، یعنی کعبے کے پاس یا حرم میں بیٹھ کر بات چیت قصے کہانی کہا کرتے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ بِهٖ ﴾ ﴿ تَهْجُرُوْنَ ﴾ سے متعلق ہو۔ "ھجر" بہ معنی ہذیان ہے اور حرفِ با بہ معنی "في"، یعنی تم قرآن شریف کی شان میں پریشان باتیں بکتے ہو، جس طرح کہ بیمار اپنی بیماری کی شدت میں بکتا ہے، اس صورت میں ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر قرآن شریف کی طرف پھرے گی۔

تیسرے قول کی بنا پر حرفِ باسببیہ ہوگا، یعنی بسببِ تکذیب کے تکبر کرتے تھے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مستکبرین"، "سامرا" اور "تھجرون" تینوں حال ہیں، یا تو حالِ مترادفہ ہیں "تنکصون" کی واؤ سے، یا متداخلہ ہیں ہر ایک اپنے ماقبل سے حال ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہم اور ابوحیوہ رحمہ اللہ نے "سُمَّرًا"، بضمِ سین و فتحِ میم مشدداً پڑھا ہے۔ زید بن علی و ابو رجاء کی قراءت "سُمَّارًا" ہے۔ یہ قراءت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سَامِرٌ وَسُمَّارٌ وَسَامِرُوْنَ" کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سب صیغے جمع کے ہیں۔

جمہور کی قراءت "تَهْجُرُوْنَ" ہے بفتح تائے فوقیہ وضم جیم۔ اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ماخوذ ہے "ھجر"، بفتحِ ہا وسکونِ جیم بہ معنی قطع و صَدّ سے، یعنی تم اللہ کی آیتوں کو اور اس کے رسول کو چھوڑتے ہو، ان میں بے رغبتی کرتے ہو، ان سے وصل نہیں کرتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہَجَر سے ماخوذ ہے بفتحِ جیم، بہ معنی ہذیان، اس میں مفعول کی حاجت نہیں ہے، یہ وجہ پہلے گزر چکی ہے۔ نافع و ابن محیصن نے بضمِ تا وکسرِ جیم پڑھا ہے ماخوذ "أَھْجَرَ إِھْجَارًا" سے۔ "إِھْجَار" کہتے ہیں بات چیت میں فحش بکنے کو۔ امام زید بن علی، ابن محیصن اور امام ابونہیک نے بضمِ تا وفتحِ ہا وکسرِ جیم مشدد پڑھا ہے مضارع "ھَجَّر" بتشدید کا مبالغے کے لیے۔ ابن ابی عاصم نے مثل جمہور کے پڑھا ہے، مگر اتنا فرق ہے کہ بجائے تائے فوقیہ کے یائے تحتیہ ہے۔ لہٰذا اس میں حاضر سے غائب کی طرف التفات ہوگا۔[4]

امام ابن جریر اور ابن منذر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا: "تَسْمُرُوْنَ حَوْلَ الْبَيْتِ وَتَقُوْلُوْنَ هَجَرًا"۔ ("ھَجر" بفتحِ جیم بہ معنی ہذیان ہے اور بضمِ ہا وسکونِ جیم اسم ہے، بہ معنی قولِ قبیح۔) امام عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ ان سے یہ ہیں: "كَانَتْ قُرَيْشٌ يَتَحَلَّقُوْنَ

---

[1] الکشاف (۳/ ۱۹۶) [2] معاني القرآن (٤/ ١٨) [3] فتح القدیر (۳/ ٦٦٧) [4] فتح القدیر (۳/ ٦٦٧)

حَلَقًا يَتَحَدَّثُوْنَ حَوْلَ الْبَيْتِ‘‘ یعنی قریش حلقہ حلقہ ہو کر بیت اللہ کے گرد بیٹھتے اور بات چیت کیا کرتے تھے۔

امام ابن ابی شیبہ، ابن منذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، حاکم وصحہ اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ’’أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴾ قَالَ: كَانَ الْمُشْرِكُوْنَ يَهْجُرُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِي الْقَوْلِ فِي سَمَرِهِمْ‘‘ [1] ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سمر جب ہی مکروہ کی گئی کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴾ [2] (أخرجه النسائي و ابن أبي حاتم و الحاكم و صححه و ابن مردوية) پھر جب اللہ پاک کافروں کا حال بیان کر چکا، جنھوں نے اپنے دین کو فرقے فرقے کر ڈالا تو یہ بات بیان کر کے اُن پر رد کیا کہ اُن کا اس جہالت اور ضلالت پر پیش قدمی کرنا ضرور ہی ان چار اُمور میں سے کسی ایک کے سبب سے ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾
اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ
بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ
الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ
فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧١﴾ۭ
اَمْ تَسْـَٔــلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ڰ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٧٢﴾
وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا
مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٥﴾

کیا پھر انھوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا، یا پھر ان کے پاس وہ چیز آ گئی جو اُن کے پہلے باپ دادا کے پاس نہیں آئی تھی؟ (68) یا انھوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا، لہٰذا وہ اس کے منکر ہیں؟ (69) یا وہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے؟ (نہیں نہیں) بلکہ وہ ان کے پاس حق لایا ہے اور ان کے اکثر لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں (70) اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں، سب تباہ و برباد ہو جائیں، بلکہ ہم ان کے پاس ان کے لیے نصیحت لائے ہیں اور وہ اپنی ہی نصیحت سے اعراض کر رہے ہیں (71) کیا آپ ان سے

[1] الدر المنثور (٦/ ١٠٨۔ ١٠٩) [2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤١٢) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٢٧)

اُجرت کا سوال کرتے ہیں، چناں چہ آپ کے رب کی اُجرت زیادہ بہتر ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے (72) اور بلاشبہہ آپ انھیں صراطِ مستقیم (اسلام) کی طرف بلاتے ہیں (73) اور بلاشبہہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، وہ یقیناً صراطِ مستقیم سے ہٹ رہے ہیں (74) اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور انھیں لاحق تکلیفیں دور کر دیں تو پھر بھی وہ برابر اپنی سرکشی پر بھٹکتے ہوئے اڑے رہیں (75)

مشرکین کی تردید و مذمت:

بات پر غور وفکر نہیں کیا، یعنی قرآن میں غور نہیں کرتے، نصیحت کرنے والے ہمیشہ آتے رہتے ہیں، پیغمبر ہوئے یا اُن کے تابع ہوئے۔ یعنی ہمیشہ اس پیغمبر کی خو اور خصلت سے واقف ہیں اور اس کی سچائی اور نیکی کو جان رہے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی دعا سے ایک دفعہ مکے کے لوگوں پر قحط پڑا تھا۔ پھر آپ ہی کی دعا سے کھلا۔ شاید یہ اس کا ذکر فرمایا۔ انتہٰی.

مشرکین جو قرآنِ عظیم کو سمجھتے بوجھتے نہیں اس میں تدبر اور غور وفکر نہیں کرتے اور اس سے منہ موڑتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ اس کتاب کے ساتھ خاص کیے گئے ہیں، کونسی کتاب؟ وہ کتاب کہ جس سے زیادہ کامل اُن کو نہ کوئی کتاب پہنچی، نہ ہی کوئی ڈرانے والا اُن کے پاس آیا، لہٰذا اللہ پاک اس بارے میں مشرکوں پر انکار فرماتا ہے۔ ان لوگوں کو لائق یہ تھا کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے اُن کو عطا کی، اس کو قبول کرتے، اس کا شکر کرتے، اس کو سمجھتے بوجھتے، اس کی مقتضا کے مطابق عمل کرتے، رات کی گھڑیوں میں اور دن کے اوقات میں اس طرح سے عمل کرتے، جس طرح کہ اُن کے نُجَبَا اور شرفا نے کیا، جو اسلام لائے اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کی۔ رضي اللّٰه عنهم۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ ﴾ اب واللہ! اگر قوم اس کا تدبر کریں اور اس کو سمجھیں بوجھیں تو قرآن میں اللہ کی معصیت سے ایک زجر کرنے والا پائیں گے، لیکن انھوں نے متشابہ کو پکڑ لیا تو وہ اس وقت ہلاک ہوگئے۔[1]

پھر اللہ پاک نے قریش کے کافروں پر انکار کرکے یوں فرمایا: ﴿ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴾ یعنی کیا پھر یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کو اور اُن کے صدق و امانت و صیانت و پاکیزگی کو پہچانتے نہیں ہیں، جس پر آپ نے ان میں رہتے ہوئے نشو ونما پائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا پھر اس بات کے انکار پر قادر ہیں اور اس میں بہتان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، ہرگز نہیں۔ اسی لیے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے یوں فرمایا تھا: اے بادشاہ! بے شک اللہ نے ہم میں ایک ایسا رسول بھیجا ہے کہ ہم اس کے نسب، سچائی اور امانت کو پہچانتے ہیں۔ اسی طرح سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے نائب کسریٰ سے کہا تھا، جب وہ فارس والوں کے مقابلے میں آئے۔ اسی

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۳۲)

طرح ابوسفیان بن صخر بن حرب رضی اللہ عنہ نے بادشاہِ روم ہرقل سے کہا تھا، جبکہ ہرقل نے ابوسفیان سے نبی کریم ﷺ کے اوصاف ونسب اور صدق وامانت کے بارے میں پوچھا، حالاں کہ وہ ابھی تک کافر تھے، مسلمان نہیں ہوئے اور باوجود اس کے وہ سچ بات کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکے تو اس کا اقرار کیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ﴾ میں مشرکین کے قول کو بیان کیا گیا ہے، جو وہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں کہا کرتے تھے: ''إِنَّهُ تَقَوَّلَ الْقُرْآنَ'' یعنی قرآن کو انھوں نے اپنی طرف سے بنا لیا ہے، یا اُن کو جنون ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں، اس کو جانتے نہیں ہیں۔ اللہ پاک نے مشرکوں کی طرف سے خبر دی کہ ان کے دل قرآن پر ایمان نہیں لاتے، حالاں کہ جو کچھ وہ قرآن کی شان میں کہتے ہیں، اس کے باطل ہونے کو خوب جانتے ہیں، کیوں کہ اللہ کے کلام پاک سے اُن کے پاس ایسی شے آئی ہے کہ اس کی نہ کسی کو طاقت ہے نہ کوئی اس کو دور کر سکتا ہے اور اُن سے اور سارے زمین والوں سے تحدی اور مقابلہ اور منازعہ کیا ہے کہ اگر انھیں طاقت ہے تو اس جیسا کلام لے آئیں، حالاں کہ کبھی نہ لا سکیں گے۔ اسی لیے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴾ احتمال ہے کہ دوسرا جملہ حالیہ ہو، یعنی ان کے پاس حق لے آئے، اس حال میں کہ بہت لوگ حق سے کراہت کرتے تھے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جملہ خبریہ مستانفہ ہو۔ واللّٰہ أعلم.

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک شخص سے ملے تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اسلام لے آ، وہ بولا: بے شک تم البتہ مجھ کو ایسے امر کی طرف بلاتے ہو کہ میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگرچہ تو اسے ناپسند کرنے والا ہے۔ اور ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ ایک آدمی سے ملے تو اس سے فرمایا کہ اسلام لے آ، چنانچہ اس بات نے اس کو مشقت میں ڈالا اور وہ اس پر گراں گزری۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا: تو مجھے بتا، اگر تو کسی دشوار راہ میں ہو، ایسی نرم جگہ میں کہ تیرے پاؤں نیچے گھس جائیں اور تو آسانی سے اس پر نہ چل سکے۔ پھر تو ایک آدمی سے ملے، جس کی وجہ، یعنی ذات اور نسب کو تو پہچانتا ہو۔ پھر وہ تجھے آسان اور کشادہ راہ کی طرف بلائے تو کیا تو اس کی پیروی کرے گا؟ وہ شخص بولا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پس قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! بے شک تو البتہ اس راہ سے زیادہ دشوار گزار راہ میں ہے، اگر تو اس پر ہے اور بے شک میں البتہ تجھ کو اس سے زیادہ سہل راہ کی طرف بلاتا ہوں، جس کی طرف بلایا جائے۔ اور ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک شخص سے ملے تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اسلام لے آ، تو اس کو اس بات نے مشقت میں ڈالا۔

نبی اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تو مجھے بتا کہ اگر تیرے لیے دو جوان آدمی ہوں، یعنی دو غلام، (حدیث میں لفظ فتیان ہے۔ محاورۂ عرب میں فتیٰ غلام کو بولتے ہیں۔) ان میں سے ایک جس وقت تجھ سے بات کہے تو سچ

بولے اور جب تو اس کو امین بنائے تو وہ امانت تجھے پہنچا دے، کیا وہ تجھ کو زیادہ محبوب ہے یا تیرا وہ غلام کہ جب تجھ سے بات کہے تو جھوٹ بولے اور جب تو اس کو امین بنائے تو تیری خیانت کرے؟ اس شخص نے کہا: بلکہ میرا وہ غلام کہ جس وقت وہ مجھ سے بات کہے تو سچ بولے اور جب میں اس کو امین بناؤں تو امانت مجھے پہنچا دے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اسی طرح تم اپنے رب کے نزدیک ہو۔[1]

حق خواہشوں کے تابع نہیں ہوا کرتا:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ﴾ امام مجاہد، ابو صالح اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حق اللہ عزوجل ہے[2] اور مراد یہ ہے کہ اگر اللہ پاک اُن کے دلوں کی خواہشوں کو قبول کرے اور اس کے مطابق شریعت کے احکام دے تو البتہ زمین و آسمان بگڑ جائیں اور جو کچھ اُن میں ہے، وہ بھی ان کی خواہشوں کے فساد اور اختلاف کی وجہ سے بگڑ جائے، چناں چہ اللہ پاک نے اُن کی طرف سے اس قول کی خبر دی ہے: ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [الزخرف: ٣١] ''اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟'' پھر فرمایا: ﴿ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴾ [الزخرف: ٣٢] ''کیا وہ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٠٠] ''کہہ دیجیے: اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو اس وقت تم انھیں خرچ ہو جانے کے ڈر سے ضرور روک لیتے۔ اور انسان نہایت ہی بخیل ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴾ [النساء: ٥٣] ''کیا (وہ سمجھتے ہیں کہ) انھیں بادشاہی کا کچھ حصہ ملا ہے؟ پھر تو وہ اس میں سے لوگوں کو تل برابر بھی نہیں دیں گے۔'' اللہ پاک نے ان سب آیتوں میں بندوں کی عاجزی اور ان کی آراء اور خواہشات کا اختلاف بیان کیا ہے اور وہ اپنی ساری صفات و اقوال و افعال و شرع و تقدیر و تدبیرِ خلق میں ہر لحاظ سے کامل ہے۔ "تَعَالٰی وَتَقَدَّسَ فَلَا إِلٰهَ غَيْرُهُ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ" اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ ﴾ ذکر سے مراد قرآن شریف ہے۔ ﴿ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾

نبی بے لوث خدمت گار رہتا ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا ﴾ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿ خَرْجًا ﴾ کا مطلب ہے "أَجْرًا"۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب ہے "جُعْلًا"۔[4] ﴿ فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم جو ان کو ہدایت

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٣٢۔ ٣٣٣) یہ روایت مرسل ہے۔
[2] تفسیر الطبري (١٩/ ٥٧)
[3] تفسیر الطبري (١٩/ ٥٨)
[4] الدر المنثور (٦/ ١١٠)

کی طرف بلاتے ہو تو اس کے لیے تم اُن سے نہ کچھ اُجرت مانگتے ہو نہ مزدوری، نہ اور کوئی چیز، بلکہ تم تو اس کے لیے اللہ پاک کے پاس ثوابِ جزیل چاہتے ہو، جس طرح اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ﴾ [سبا: ٤٧] ''آپ کہہ دیجیے: میں نے تم سے جو کوئی صلہ مانگا ہو تو وہ تمھارے ہی لیے ہے، میرا صلہ تو اللہ کے ذمے ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴾ [صٓ: ٨٦] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تم سے اس (تبلیغِ دین) پر کوئی اجر نہیں مانگتا اور میں تکلیف (بناوٹی کام) کرنے والوں میں سے نہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ ﴾ [الشوریٰ: ٢٣] ''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: میں تم سے اس (تبلیغِ رسالت) پر کسی صلے کا سوال نہیں کرتا، مگر قرابت داری کی محبت (ضرور چاہتا ہوں)۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ٢٠۔ ٢١] ''اور شہر کے پرلے سرے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا: اے میری قوم! تم رسولوں کی پیروی کرو۔ تم ان کی پیروی کرو جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے، جبکہ وہ (خود) ہدایت یافتہ ہیں۔''

نبی صراطِ مستقیم کا داعی ہوا کرتا ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ امام احمد رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس خواب میں دو فرشتے آئے۔ ان میں سے ایک آپ ﷺ کے دونوں پاؤں کے پاس بیٹھ گیا، اور ایک آپ ﷺ کے سر کے نزدیک بیٹھ گیا، پھر جو آپ ﷺ کے پاؤں کے نزدیک تھا۔ اس نے اس سے کہا جو آپ ﷺ کے سر کے نزدیک تھا کہ اس کی اور اس کی اُمت کی مثل بیان کرو تو اس نے کہا کہ اس کی اور اُس کی اُمت کی مثل ایک مسافر قوم کی طرح ہے جو ایک بیابان میں پہنچی کہ اس کے پاس کوئی توشہ نہ تھا کہ اس سے اس بیابان کو عبور کر جائیں اور نہ ہی وہ شے تھی کہ اس کے سبب واپس چلے جائیں، پھر اسی طرح وہ اس حال میں تھی کہ حلۂ حَبِرَہ (حاشیہ دار چادر) میں ایک شخص اُن کے پاس آیا اور کہا کہ تم بتاؤ اگر تم کو میں ایسے باغوں میں لے جاؤں جو ہرے بھرے ہوں اور اُن میں پانی کے حوض ہوں کہ پینے والوں کو سیراب کر دیں تو تم میری پیروی کرو گے؟ تو وہ مسافر بولے: ہاں، پھر وہ شخص اُن کو لے چلا اور اُن کو ریاضِ معشبہ (ہرے بھرے باغات) اور حیاضِ روا (پانی کے بھرے ہوئے حوض) پر لے گیا۔ چنانچہ انھوں نے کھایا پیا اور خوب موٹے ہو گئے۔

پھر اس شخص نے اُن سے کہا: کیا میں نے تم کو اس حال پر نہیں پایا تھا تو تم نے عہد کیا تھا کہ اگر میں تم کو ریاضِ معشبہ و حیاضِ روا پر لے جاؤں تو تم میری پیروی کرو گے؟ وہ بولے: ہاں۔ کہا کہ تمھارے آگے باغ ہیں، جو

اُن باغوں سے زیادہ تر و تازہ ہیں اور حوض ہیں کہ ان حوضوں سے زیادہ تر سیراب کرنے والے ہیں۔ لہٰذا تم میرا اتباع کرو، کہا: پس ایک گروہ بولا کہ اس نے سچ کہا: واللہ! البتہ ہم ضرور اس کی پیروی کریں گے اور ایک گروہ بولا کہ واقعی ہم اس سے راضی ہوئے۔ اسی پر قائم رہیں گے، یعنی جن باغوں اور حوضوں پر ہم وارد ہیں، ہم یہیں رہیں گے، ہم اُن سے خوش ہیں، آگے نہ جائیں گے۔[1]

حافظ ابو یعلی موصلی رحمہ اللہ نے بسندِ خود "عن عكرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ" روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک میں تمھارے ازار کے نیفوں سے پکڑ کر آگ سے بچانے کے لیے چنگل مارنے والا ہوں اور تم مجھ پر غلبہ کرتے ہو، اس طرح سے کہ بے دھڑک ایک دوسرے کے اوپر گرتے ہو اور آگ میں گرنے والوں میں بے دھڑک گر جاتے ہو۔ (حدیث کے اصل الفاظ: « إِنِّي مُمْسِكٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ » ہیں۔ "حُجَزٌ" جمع ہے "حُجْزَةٌ" کی، بہ معنی نیفۂ ازار ہے)۔ جیسے پروانے، ٹڈیاں یا جھنگر گرتے ہیں۔ (اصل الفاظ: « تَقَاحُمَ الْفِرَاشِ وَالْجَنَادِبِ » ہیں۔ "جَنَادِبُ" جمع ہے "جُنْدُبٌ" کی جندب، ٹڈی کی ایک قسم ہے یا حرّارہ جو گرمی میں چلاتا ہے۔ كذا في البحار)۔

چنانچہ قریب ہے کہ میں تمھارے نیفوں کو چھوڑ دوں اور میں حوض پر تمھارا میرِ سامان ہوں، لہٰذا تم مجھ پر اکٹھے وارد ہو گے اور الگ الگ۔ میں تم کو تمھاری نشانیوں سے اور تمھارے ناموں سے پہچانوں گا، جس طرح کہ آدمی اپنے اُونٹوں میں سے بیگانے اونٹ کو پہچانتا ہے۔ پھر تم کو بائیں طرف لے جائیں گے۔ میں اللہ رب العالمین کو تمھارے بارے میں قسم دوں گا کہ اے رب میری قوم! اے رب میری امت! پس کہا جائے گا: اے پیغمبر! تو اس کو نہیں جانتا، جو تیرے بعد انھوں نے احداث کیا، بے شک وہ تیرے بعد اپنی ایڑیوں پر پھر گئے تھے۔ میں تم میں سے ایک کو پہچانوں گا، جو قیامت کے دن آئے گا، ایک بکری کو اُٹھائے ہوئے اس کے واسطے ثغاء ہوگا (ثغاء بکری کی آواز (مَیں مَیں کرنا) کو کہتے ہیں اور رُغاء اونٹ کی آواز کو اور حمحمہ گھوڑے کی آواز کو کہتے ہیں)۔

وہ پکارے گا یا محمد! یا محمد! تو میں کہوں گا کہ میں تیرے لیے اللہ سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، یعنی میں کوئی اختیار نہیں رکھتا تیری خلاصی کا، میں نے تو اللہ کا حکم پہنچا دیا تھا۔ اور البتہ میں تم میں سے ایک اور شخص کو پہچانوں گا، وہ قیامت کے دن ایک اونٹ کو اُٹھائے ہوئے ہوگا، اس کے لیے رُغاء ہوگا، یعنی آواز، وہ پکارے گا: یا محمد! یا محمد! تو میں کہوں گا، میں تیرے واسطے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں تو پہنچا چکا اللہ کا حکم۔ اور البتہ میں ایک شخص کو تم میں سے پہچانوں گا، جو قیامت کے دن آئے گا، ایک گھوڑے کو اُٹھائے ہوئے اس کے واسطے حمحمہ (یعنی آواز) ہوگا، پس وہ پکارے گا: یا محمد! یا محمد! تو میں کہوں گا، میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں تو پہنچا چکا۔ اور البتہ میں تم میں

[1] مسند أحمد (١/ ٢٦٧) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔

سے ایک شخص کو پہچانوں گا، جو قیامت کے دن ایک اُدھوڑے کی مشک کو اُٹھائے ہوئے آئے گا اور پکارے گا: یا محمد! یا محمد! تو میں کہوں گا کہ میں تیرے واسطے کسی شے کا مالک نہیں ہوں، میں تو پہنچا چکا۔ علی بن مدینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن الاسناد ہے، مگر حفص بن حمید مجہول ہے۔ میں نہیں جانتا کہ سوائے یعقوب بن عبداللہ اشعری عمی کے اور کسی نے اس سے روایت کی ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اشعث بن اسحاق نے بھی اس سے روایت کی ہے۔ یحییٰ بن معین نے حفص کے بارے میں کہا ہے کہ صالح ہے اور نسائی و ابن حبان نے اس کی توثیق کی ہے۔[1]

آخرت سے غفلت کا انجام:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴾ یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، وہ البتہ سیدھی راہ سے عادل (ہٹے ہوئے) مائل، حائر، منحرف ہیں۔ عرب لوگ جس وقت کوئی راہ سے مائل ہوتا ہے تو کہتے ہیں: "نَكَبَ فُلَانٌ عَنِ الطَّرِيْقِ" یعنی فلاں شخص راہ سے مائل ہوگیا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ اللہ پاک کفر میں اُن کی سختی اور شدت کی خبر دیتا ہے کہ اگر وہ ضرر اُن سے دور کر دے اور اُن کو قرآن پاک سمجھا دے تو وہ اس کے فرماں بردار اور مطیع نہ ہوں اور اپنے کفر وعناد، طغیان اور سرکشی پر جمے رہیں۔ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنفال: ۲۳] "اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنا دیتا، اور اگر وہ انھیں سنا دیتا تو بھی وہ ضرور پھرتے اور وہ اعراض کرنے والے ہیں۔"

نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝27 بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝28 وَقَالُوْٓا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴾ [الأنعام: ۲۷۔ ۲۹] "اور اگر آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ آتش پر کھڑے کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: کاش! ایک بار ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اور ہم اپنے رب کی آیات کو ہرگز نہ جھٹلائیں گے، اور ہم مومنوں میں سے ہوں گے۔ (نہیں!) بلکہ ان کے وہ کرتوت ظاہر ہو چکے ہوں گے جنھیں وہ پہلے چھپاتے تھے۔ اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری دنیا ہی کی زندگی ہے، اور ہمیں (دوبارہ) نہیں اُٹھایا جائے گا۔"

چنانچہ یہ علم الٰہی کے باب سے ہے، اس شے کے بارے میں جو نہ ہوگی، اگر ہوتی تو کیوں کر ہوتی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ

[1] مسند البزار (۱/ ۳۱۴) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۳۳۔ ۳۳۴) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۸۶۵)

نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ہر وہ شے جس میں لو ہے تو وہ وہ شے ہے جو کبھی نہ ہوگی۔[1] (کذا قال ابن کثیر رحمہ اللہ) کاتب الحروف عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ امام ابو البقاء کفوی حنفی رحمہ اللہ نے کلیات میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول نقل کیا ہے۔ پھر اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ کلمۂ ﴿ لَو ﴾ حرفِ امتناع ہے، جو اس شے کے وقوع کے محال ہونے کے بارے میں متنبہ کرتا ہے، جس کا ذکر اس کے ساتھ آیا ہے اور اسی طرح ہے جہاں کہیں یہ لفظ سنت میں وارد ہوا ہے، یعنی قرآن پاک اور حدیثِ "لَوْلَاكَ"[2] میں "لَوْ" کا یہی حال ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ کفار کا کفر پر پیش قدمی کرنے کا سبب چار اُمور میں سے ایک امر ہے: پہلا امر یہ ہے کہ ﴿ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ ﴾ ہمزہ انکاری ہے اور حرفِ فا عطف کے لیے ہے مقدر پر۔ اصل ﴿ يَدَّبَّرُوا ﴾ کی "يَتَدَبَّرُوا" ہے، حرفِ تا کو دال سے بدل کر دال میں ادغام کر دیا ہے۔ قول سے مراد قرآن شریف ہے، اس کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾ [محمد: ٢٤] "کیا پھر وہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔" "تدبر" کہتے ہیں اندیشہ کرنے کو، یعنی سوچنے سمجھنے، غور و فکر اور تامل کرنے کو۔ تقدیر یہ ہے: "فَعَلُوْا مَا فَعَلُوْا فَلَمْ يَتَدَبَّرُوا الْقُرْآنَ" یعنی کیا کیا کفار نے جو کچھ کہ کیا، لہٰذا قرآن کو سوچا سمجھا نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو نبی اور قرآن کی تکذیب کی اور اپنی جہالت اور گمراہی پر جمے رہے، اس کا سبب یہ ہے کہ نبی کی دلیلِ نبوت کے بارے میں تامل نہ کیا، وہ دلیل یہی قرآنِ معجز ہے، جس کے الفاظ معجز ہیں اور اس کا مدلول واضح اور ظاہر ہے اور اس میں غور و فکر کرنا لازمی ہے۔ اللہ کارساز کی معرفت اور اس کی وحدانیت کو پہچاننے کے لیے اور جو چیزیں اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے مکلّف پر واجب ہیں، ان سب کی معرفت کو لازم کرتا ہے۔ پھر یہ لوگ اس میں کیوں غور نہیں کرتے، تا کہ باطل کو چھوڑیں اور حق کی طرف رجوع کریں اور جان لیں کہ وہ بے شک ان کے رب کی طرف سے حق ہے، کیوں کہ اگر وہ اس کے معانی میں فکر کریں تو اُن پر اس کی سچائی ضرور کھل جائے گی اور وہ اس پر ہر اس چیز کے ساتھ ایمان لے آئیں، جو اس میں ہے۔

دوسرا امر یہ ہے: ﴿ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ سے مراد رسول اور کتاب ہے، یعنی بلکہ کیا اُن کے پاس وہ رسول آیا، جو اُن کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہ آیا اور وہ کتاب آئی، جو اُن کے پاس نہ آئی۔ لہٰذا یہ بات اس کا سبب ہوئی کہ قرآن کے ساتھ تکبر کیا، مقصود اس بات کا اقرار کرانا ہے کہ اُن کے باپ دادا کے پاس کوئی رسول نہیں آیا۔ چنانچہ اس لیے اس کا انکار کیا۔ اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٣٢۔ ٣٣٤)

[2] امام البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو من گھڑت کہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٨٢)

﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ أُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ ﴾ [یٰسٓ: ٦] ''تا کہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس کے باپ دادا نہیں ڈرائے گئے۔'' کسی نے کہا ہے کہ اُن کے اگلوں کے پاس رسول آئے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو ان کی طرف بھیجا، جس طرح کہ اللہ پاک کا ارسالِ رسل میں طریقہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کی طرف رسول بھیجا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اس بات کو جان چکے ہیں۔ پھر کیوں کر اس قرآن کو جھٹلایا؟! شیخ زادہ رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ انھوں نے یہ اعتقاد کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ایک نئی بات ہے، جو نہ سنی گئی اور نہ اگلی اُمتوں سے نقل کی گئی، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، کیوں کہ یہ لوگ تواتر کے ساتھ جان چکے ہیں کہ رسول پے در پے اُمتوں کی طرف بھیجے جاتے تھے اور ان میں ہر ایک جس رسالت کا مدعی تھا، وہ معجزات کے اظہار کے ساتھ اس کو ثابت کرتا تھا اور اُمتوں کا یہ حال تھا کہ بعض تو رسولوں کو مانتے، لہٰذا وہ نجات پاتے اور بعض تکذیب کرتے تو عذاب کے ساتھ اُن کو ہلاک کر دیا جاتا اور انھیں نیست و نابود کر دیا جاتا اور اُن لوگوں کو بھی جو بات تکذیب کا باعث ہوئی وہ یہی رسلِ کرام۔علیہم الصلاۃ والسلام۔ کی تصدیق نہ کرنا ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ سے مراد عذابِ الٰہی سے بے خوف ہونا ہے، معنی یہ ہیں: بلکہ کیا آیا اُن کے پاس عذابِ الٰہی سے بے خوف ہونا، جو اُن کے اگلے باپ دادا کے پاس نہ آیا، چنانچہ وہ نہ ڈرے، جیسے کہ ان کے آباء و اجداد ڈرے۔ چنانچہ اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی اولاد، پس وہ اللہ پر اور اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائے اور اللہ پاک کے فرماں بردار ہوئے۔ تیسرا امر یہ ہے: ﴿ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ ﴾ اس میں اضراب انتقال ہے توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) مذکور سے اور توبیخ کی طرف بطورِ دیگر، یعنی بلکہ کیا نہ پہچانا اپنے رسول کو ساتھ امانت، صدق، راستی، حسنِ خلق اور کمالِ علم کے باوجود نہ سیکھنے کے کسی سے اُن کے سوا اور صفات جو انبیاء علیہم السلام میں ہوتی ہیں۔

﴿ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ﴾ لہٰذا وہ اس کو اوپرا سمجھتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو رسول اللہ ﷺ کو ان کے رسالت کا دعویٰ کرنے سے پہلے امین و صادق سمجھتے تھے اور جھوٹ اور اخلاقِ ذمیمہ سے پاک و صاف جانتے پہچانتے تھے۔ پھر کیوں آپ کی تکذیب کی اس کے بعد کہ سب کے سب متفق اور یک زبان ہو کر آپ کا نام مبارک امین و صادق رکھتے تھے۔ انکار کے دو معنی ہیں: ایک تو ناشناختن، یعنی نہ پہچاننا اور حرفِ فا سببیت کا ہے اور حرفِ لام تقویت کے لیے ہے۔ اور ضمیر مجرور نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے، ﴿ مُنْكِرُونَ ﴾ کا مفعول ہے۔ فاصلے کی رعایت سے اس کو ﴿ مُنْكِرُونَ ﴾ سے پہلے رکھا ہے، چوں کہ اسم فاعل ضعیف العمل ہے، معمول مقدم میں بوجہِ ضعف عمل نہیں کر سکتا، اس لیے لام تقویت کا لایا گیا ہے، معنی یہ ٹھہرے کہ انھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں، اس لیے اس کو اوپرا سمجھتے ہیں۔ موضح قرآن کا ترجمہ اسی انکار کے معنی پر مبنی ہے۔

اس معنی کی بنا پر جملہ ﴿ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ﴾ اخیر جملے سے متعلق ہو گا۔ انکار کے دوسرے معنی جحود کردن ہیں، یعنی جان بوجھ کر کسی شے کا انکار کرنا۔ حرفِ لام تعلیل کے لیے ہے اور ﴿ مُنْكِرُونَ ﴾ کا مفعول محذوف، یعنی

"مُنْكِرُوْنَ دَعْوَاهُ" اور ﴿ لَهٗ ﴾ کی ضمیر "أَحَدُ هَذِهِ الْوُجُوْهِ" کی طرف راجع ہے۔ ان وجوہ سے مراد وہی تین وجہیں ہیں جو اس جملے سے پہلے مذکور ہوئی ہیں۔ اور حرفِ فا تفریع کا ہے، معنی یہ ہیں: پس وہ لوگ وجوہِ مذکور میں سے کسی وجہ سے آپ کے دعویٰ کا انکار کرتے ہیں، کیوں کہ اُن وجوہ کے علاوہ اور کوئی وجہ انکار کی نہیں ہے۔ اس لیے کہ کسی شے کا انکار قطعی اور یقینی طور پر یا ازراہِ ظن وتخمین اسی وقت درست ہوتا ہے کہ جس وقت اس شے کا امتناع ظاہر ہو جائے۔ بحسبِ نوع یا بحسبِ شخص یا جس بات پر وہ شے دال ہے، اس سے انتہا درجے کی بحث کی جائے، پھر وہ نہ ملے، انکار کی یہی وجوہ ہیں۔ ان کے سوا انکار بے وجہ ہے۔ چنانچہ کفار نے جو قرآنِ کریم اور رسولِ رحیم کا انکار کیا، اُن کا انکار دلیل سے خالی ہے، کیوں کہ قرآن پاک کے لفظوں کا اعجاز اور مدلول کی وضاحت بآوازِ بلند اس کی حقیقت کو بیان کر رہا ہے، زیادہ تر غور وفکر کی بھی ضرورت نہیں، پھر انکار کی کیا وجہ؟!

نبی اکرم ﷺ نے جو نبوت کا دعویٰ کیا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، کیوں کہ پہلے بھی انبیاء اور رسول ہو چکے ہیں اور اُن کو بتواتر معلوم ہو چکا ہے، پھر انکار کی کیا وجہ؟! اگر یہ بات ہو کہ اگلے رسول سچے تھے اور ہمارے نبی میں انبیاء کے اوصاف نہیں ہیں، ہم اُن کو پہچانتے نہیں، اس لیے ان کا انکار کرتے ہیں، یہ بات بھی نہیں۔ دعوائے نبوت سے پہلے اُن کے اوصاف کو خوب پہچانتے تھے۔ پھر انکار کی کیا وجہ؟! چنانچہ معلوم ہوا کہ ضد اور حسد کی وجہ سے اُن کے منکر ہوئے، کیوں کہ انکار کے سب اسباب مفقود ہیں۔ ابو صالح رحمہ اللہ نے خوب کہا ہے کہ انھوں نے اپنے نبی کو پہچانا، لیکن ان پر حسد کیا۔[1]

پھر اللہ پاک نے کفر پر اقدام کرنے کا اور جمے رہنے کا چوتھا سبب ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ﴾ یہ بھی ایک توبیخ (ڈانٹ) سے دوسری توبیخ کی طرف آنا ہے، یعنی بلکہ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو سودا ہے، باوجود اس کے کہ وہ خوب جان چکے تھے کہ اُن کی عقل سب لوگوں سے زیادہ راجح تھی اور اُن کا ذہن سب سے بڑھ کر ثاقب (چمکدار، روشن) تھا، لیکن جب وہ ایسی شے لے کر آئے، جو اُن کی خواہشات کے مخالف تھی، اس لیے اس کو دفع کیا اور تعصب اور حمیت کی وجہ سے ان کے منکر ہوئے۔ پانچواں سبب بعد میں مذکور ہوگا، یعنی ﴿ اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا ﴾۔

پھر اللہ پاک نے اس سب سے ہٹ کر فرمایا: ﴿ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی قرآن و رسول کے حق میں جو انھوں نے خیال کیا بات ویسی نہیں ہے، بلکہ وہ تو اُن کے پاس حق لے کر آیا ہے۔ حق سے مراد دینِ قویم یا قرآنِ کریم ہے، جو توحید اور شریعت اور اسلام کے احکام پر مشتمل ہے۔ ﴿ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴾ یعنی اکثر لوگوں کو حق برا لگتا ہے، اس لیے کہ وہ تعصب پر پیدا ہوئے ہیں اور سیدھے راستے سے انحراف پر اور حق سے بعد پر پیدا ہوئے ہیں

---

[1] الدر المنثور (٦/ ١١٠)

اور پروان چڑھے ہیں، اسی لیے یہ واضح حق ان کو برا لگا۔ یہاں حق سے مراد عام سچی بات ہے، یہی وجہ ہے کہ مضمر کی جگہ مظہر رکھا ہے۔ ظاہر نظمِ قرآنی یہ ہے کہ اُن میں بہت تھوڑے اور کم تر لوگ حق کو مکروہ نہیں رکھتے تھے، یعنی ناپسند نہیں کرتے تھے، لیکن مکروہ رکھنے والوں کے خوف سے انھوں نے اپنے ایمان کو ظاہر نہ کیا، یا اس لیے کہ اُن کی فطنت (دانائی) اور سمجھ بوجھ کم تھی اور غور وفکر نہیں کرتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ حق کو ناپسند کرتے تھے۔

جملہ ﴿ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ مستأنفہ ہے، اس بات کا بیان ہے کہ اگر حق اُن کی خواہش اور ارادے کے مطابق آتا، یعنی اللہ پاک کے لیے شریک اور اولاد ثابت کرنے میں ان سے متفق ہوتا تو یہ ایک بہت بڑے فساد کو مستلزم ہوتا اور دنیا کا نظام صلاح و درستی سے بالکل خارج ہو جاتا۔ ﴿ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ﴾ کے یہی معنی ہیں۔ امام ابن جریج، مقاتل، سدی اور ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حق سے مراد اللہ عزوجل ہے۔[1] معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ اپنے نفس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہراتا، جیسا کہ تم چاہتے ہو تو آسمان و زمین میں فساد ہوتا۔

﴿ وَمَنْ فِيْهِنَّ ﴾ یعنی اور وہ مخلوق جو آسمان و زمین میں ہے۔ خاص کر عقلاء کا ذکر اس لیے کیا کہ غیر عقلاء، عقلاء کے تابع ہوتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "وَمَا بَيْنَهُمَا" پڑھا ہے۔[2] امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا: جائز ہے کہ حق سے مراد قرآن ہو، یعنی جو شرک تم چاہتے ہو، اس کے ساتھ اگر قرآن نازل ہوتو عالم کا نظام بگڑ جائے۔[3] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک کے ساتھ معبودوں کو ٹھہرانا، جس طرح وہ کہتے ہیں، اگر وہ حق ہوتو معبود مختلف ہوں گے، اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ [الأنبياء: ٢٢] "اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو ضرور یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔" کیوں کہ جب کسی شے میں کئی حاکم ہوں گے تو اس میں عادتاً تمانع (ایک دوسرے کی مخالفت) موجود ہوگا۔ ہر حاکم اپنا حکم چلائے گا، دوسرے کو منع کرے گا۔

اوّل قول کی طرف اکثر گئے ہیں، لیکن اس پر یہ بات وارد ہوتی ہے کہ اس جگہ حق سے مراد وہی حق ہے، جو پہلے ﴿ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ میں مذکور ہو چکا ہے اور وہاں حق سے مراد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہیں ہوسکتا، اس لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہاں اور وہاں حق کی تفسیر یوں کی جائے کہ حق سے مراد صدقِ صحیح ہے۔ دینِ خالص سے جو شرعِ الٰہی سے ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر حق اُن کی خواہشات کے مطابق اور اُن کے مقاصدِ فاسد کے تابع وارد ہوتو فساد حاصل ہو جائے۔ بنی آدم کے مکلفین کے فساد کا سبب تو خود ظاہر ہے کہ وہ اُن کے گناہ ہیں اور اُن گناہوں میں سے اُن کی حق کے خلاف خواہشات ہیں۔

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٧) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ١٤١) [3] فتح القدير (٣/ ٦٧٠)

رہا فساد اُن کے علاوہ اور خلق کا، تو وہ اُن کی پیروی کے طور پر ہے، کیوں کہ وہ بھی فاسد ہو گئے۔ پھر اللہ پاک نے ذکر کیا کہ ان پر قرآن کا نزول من جملہ حق ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ ﴾ یہ ﴿ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴾ سے دوسری طرف منتقل ہونا ہے۔ یعنی وہ حق کو کیسے نا پسند کرتے ہیں، اس کے باوجود کہ قرآن شریف تو اُن کی عزت اور تعظیم لے کر آیا ہے۔ لہٰذا ان کو چاہیے کہ وہ تابع فرمان اور مطیع ہوں۔ چنانچہ اس جگہ ذکر سے مراد قرآن ہے، یعنی بلکہ ہم اُن کے پاس وہ کتاب لائے جو ان کا فخر اور شرف ہے، کیوں کہ رسول انہیں میں سے ہے اور قرآن انہی کی زبان میں ہے، اس کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾ [الزخرف: ٤٤] ''اور یقیناً یہ (قرآن) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ایک نصیحت ہے۔''

حاصل معنی یہ ہے کہ ہم اُن کے پاس اُن کا فخر اور شرف لائے، جس کا قبول کرنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا ان پر واجب ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہم اُن کے پاس وہ شے لائے ہیں، جس میں ان کا ثواب اور عذاب مذکور ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ امرِ دین میں سے جس شے کی اُن کو حاجت ہے، اس کے ذکر کو لائے ہیں۔ امام ابن ابی اسحاق اور عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے ''أَتَيْتُهُمْ'' بتائے متکلم پڑھا ہے۔ ابوحیوہ اور جحدری رحمہ اللہ نے بتائے خطاب یعنی ''أَتَيْتَهُمْ يَا مُحَمَّدُ''۔ امام عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے ''بِذِكْرَاهُمْ'' اور قتادہ نے ''نُذَكِّرُهُمْ'' بنون وتشدید بصیغۂ متکلم پڑھا ہے، جو تذکیر سے ماخوذ ہے۔ اس قراءت کی بنا پر جملہ بنا بر حال محلِ نصب میں ہوگا۔ کسی نے کہا: ذکر سے مراد وعظ اور ڈرانا ہے۔[1] کسی نے کہا ذکر سے مراد وہ ہے، جس کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ﴿ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ [الصافات: ١٦٨] ''اگر ہمارے سامنے اگلے لوگوں کا ذکر ہوتا۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ اَتَيْنٰهُمْ ﴾ کے معنی ''بَيَّنَّا لَهُمْ'' ہیں۔[2]

﴿ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ یعنی انھوں نے جو تکبر اور نکوص (اُلٹے پاؤں پھر جانا) کیا تو وہ اس کے سبب اپنے ذکر سے، جو اُن کے لیے خاص تھا، منہ موڑنے والے ہیں۔ اپنے برے اختیار کی وجہ سے کسی بھی حالت میں اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہاں ﴿ عَنْ ذِكْرِهِمْ ﴾ کے بجائے ''عَنْهُ'' کافی تھا، لیکن تاکید اور سرزنش کے لیے اسم ظاہر کو ضمیر کے بجائے رکھا۔ اس ترکیب میں وہ چیز ہے جو اس بات پر دال ہے کہ ان کا منہ پھیرنا، صرف ذکر کے ساتھ خاص ہے، اس کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف تجاوز نہیں کرتا۔

پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت دنیا کے طمع کی خاطر نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا ﴾ یہ پانچواں سبب ہے کفر پر اقدام کرنے کا، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ ہے، معنی یہ ہیں: لیکن وہ خیال کرتے ہیں کہ تو اُن سے اُجرت مانگتا ہے، جس کو تو رسالت پر لیتا ہے، لہٰذا اس لیے وہ نہ

[1] فتح القدير (٣/ ٦٧١) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٥٨)

تجھ پر ایمان لاتے ہیں، نہ اس پر جس کو تو لے کر آیا ہے، باوجود اس کے کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ نہ تو نے اُن سے اُجرت مانگی، نہ اُن سے اس کی طلب کی۔

﴿ فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ﴾ یعنی پس تیرے رب کا رزق جو وہ دنیا میں تجھے دیتا ہے اور اس کا اجر جو آخرت میں تجھے عطا فرمائے گا، وہ تیرے لیے اس چیز سے بہتر ہے، جس کا ذکر ہوا۔ امام حمزہ، کسائی، اعمش اور یحییٰ بن وثاب رحمہ اللہ نے "أَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرَاجًا" پڑھا ہے، باقی قاریوں کی قراءت ﴿ خَرْجًا ﴾ ہے۔ اور ﴿ فَخَرَاجُ رَبِّكَ ﴾ سب نے پڑھا ہے، مگر امام ابن عامر و ابوحیوہ رحمہما اللہ نے "فَخَرْجُ" بغیر الف کے پڑھا ہے۔ "خَرْجٌ" وہ ہے جو "دَخْلٌ" کے مقابل ہوتا ہے، یعنی آمد و خرچ جس چیز کو تو اپنے غیر کی طرف نکالے، اس کو خرج کہتے ہیں اور خراج ضریبہ میں غالب ہے، یعنی جو کرایہ زمین پر لیا جاتا ہے، اس میں خراج کا استعمال اکثر ہوتا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خرج مصدر ہے اور خراج اسم ہے۔

نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ میں نے ابوعمرو بن العلاء سے خرج اور خراج کے درمیان فرق کے بارے میں پوچھا تو کہا: خراج وہ ہے جو تجھ پر لازم ہوا ہے اور خرج وہ ہے جس کے ساتھ تو نے تبرع و احسان کیا ہے۔ یہ بھی ان سے مروی ہے کہ خرج غلاموں سے ہوتا ہے اور خراج زمین سے۔[1] پس خرج خراج سے خاص تر ہے۔ تو یوں بولتا ہے کہ خراج قریہ کا اور خرج کوفہ کا۔ لفظ کی زیادتی معنی کی زیادتی کے لیے ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خراج ابلغ ہے خرج سے، کیوں کہ خرج وہ ہے جو ایک بار دے دیا جائے، اس کی تکرار واجب نہیں ہے اور خراج اس ملتزم کو کہتے ہیں، جس کی تکرار واجب ہے، جیسے: زمین کا خراج۔ چنانچہ جانب عوض کفار میں خرج کا ذکر کیا اور جو کچھ اللہ آپ کو عطا کرے گا، اس کی جانب میں خراج کا ذکر فرمایا، چنانچہ اس میں بہت زیادہ بلاغت ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ تین قراءتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اوّل "خَرْجٌ"، دوسرا "خَرَاجٌ"۔ دوسرے دونوں جگہ "خَرْجًا"۔ تیسرے دونوں جگہ میں "خَرَاجًا"۔ ان میں پہلی سب سے ابلغ ہے۔ دوسرے کی بنا پر ثانی میں "خرج" مشاکلت کے لیے ہے، یعنی مشابہ ہونے کے لیے ہے اور تیسرے کی بنیاد پر ذکر اول کا مشاکلت کے لیے ہے تینوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ جملہ ﴿ فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ﴾ نفیِ سوال کی تعلیل ہے، جو انکار سے سمجھی جاتی ہے، یعنی تو اُن سے اُجرت کا سوال نہیں کرتا ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے جو روزی تجھے عطا کی ہے وہ بہتر ہے۔ جملہ ﴿ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾ مقرر و مثبت ہے اپنے ماقبل کا، وہ یہی ہے کہ اللہ پاک کا رزق، یعنی اس کا اجر و ثواب خیر ہے اور وہ سب دینے والوں سے افضل و بہتر و برتر ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۲/ ۱۴۱۔ ۱۴۲)

پھر جب اللہ پاک نے کافروں کے طریقے کو کھوٹا ثابت کیا تو اس کے بعد اس شے کی صحت بیان کی جس کی طرف رسول نے اُن کو دعوت دی اور جو لوگ اس سے مائل ہوئے (دور ہوئے)، اُن کے مائل ہونے کی وجہ کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ یعنی بے شک تو تو اُن کو ایسی سیدھی اور کھلی راہ کی طرف بلاتا ہے کہ عقلیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ راہِ راست ہے، اس میں کسی طرح کی کجی نہیں۔ ﴿ صِرَاطٍ ﴾ لغت میں طریق کو کہتے ہیں، پھر دین کا نام طریق رکھ دیا، اس لیے کہ راستہ ہی دین کی طرف لے کر جاتا ہے۔ ﴿ صِرَاطٍ ﴾ کو نکرہ بیان کیا اس کی عظمت بتانے کے لیے۔ پھر اللہ پاک نے کافروں کی صفت بیان کی کہ وہ اس کے خلاف پر ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴾ محاورے میں کہتے ہیں: "نَكَبَ عَنِ الصِّرَاطِ، يَنْكُبُ نُكُوْبًا" جس وقت کہ کوئی شخص راہ سے ہٹ جائے اور دوسری راہ کی طرف جھکے۔ "نُكُوْبٌ وَنَكَبٌ" بہ معنی عدول ومیل ہے، اسی مادّے سے "نَكْبَاءُ" اس ہوا کو کہتے ہیں جو دو ہواؤں کے درمیان میں چلتی ہے، اس کا نام "نَكْبَاءُ" اس لیے رکھا ہے کہ "مَهَابّ" سے مائل ہوتی ہے۔ ("مَهَابّ" جمع "مهب" کی ہے، "مهب" ہوا کے چلنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔)

﴿ عَنِ الصِّرَاطِ ﴾ کا تعلق "نَاكِبُوْنَ" سے ہے۔ معنی یہ ہیں کہ یہ جو لوگ ہیں جن کی صفت آخرت پر ایمان نہ لانا ہے، جو دوبارہ زندہ ہونے اور ثواب اور عذاب کے منکر ہیں، وہ اس سیدھی راہ سے یا صراط سے البتہ ہٹنے والے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے بیان کیا ہے کہ وہ کفر پر ڈٹے ہوئے ہیں، جمے ہوئے ہیں۔ کسی حال میں اس سے رجوع نہ کریں گے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ یعنی اگر ہم ان پر رحم کریں اور قحط اور خشک سالی اُن سے دور کر دیں تو البتہ وہ اپنی سرکشی اور گمراہی میں اور بڑھ جائیں گے۔ "لَجَاج" کی اصل تمادی ہے عناد میں۔ اسی مادے سے "لَجّه" بفتح تردد آواز کو کہتے ہیں اور "لُجَّةُ الْبَحْرِ" بالضم اس کے تردد امواج کو بولتے ہیں، (یعنی موجوں کا پے در پے آنا۔) "لُجَّةُ اللَّيْلِ" شب کی گہری تاریکی کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر ہم اُن کو دنیا کی طرف پھیر لائیں اور اُن کو آگ میں داخل نہ کریں اور اُن کو آزمائیں تو البتہ وہ اپنی سرکشی میں اور بڑھ جائیں گے۔ ﴿ يَعْمَهُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ تردد و تذبذب وخبط کریں گے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝٧٦
حَتّٰٓى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ
مُبْلِسُوْنَ ۝٧٧ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝٧٨ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي

الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝٧٩ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ
اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝٨٠ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ
الْاَوَّلُوْنَ ۝٨١ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا
لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝٨٢ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ
اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٨٣

اور بلاشبہ ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا تھا، پھر نہ انھوں نے اپنے رب کے سامنے عاجزی کی اور نہ وہ گڑگڑائے (76) حتی کہ جب ہم نے ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیا تو وہ اس میں نا امید ہوگئے (77) اور وہی (اللہ) ہے جس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل پیدا کیے، تم قلیل ہی شکر کرتے ہو (78) اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا، اور اسی کی طرف تمھیں اکٹھا کیا جائے گا (79) اور وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور رات اور دن کا اختلاف اسی کا (پیدا کیا ہوا) ہے، کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے؟ (80) بلکہ انھوں نے وہی کچھ کہا جو (ان سے) پہلوں نے کہا تھا (81) انھوں نے کہا: کیا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہوگئے، تو کیا ہمیں (دوبارہ) زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ (82) بلاشبہ اسی بات کا ہم سے اور ہم سے پہلے ہمارے آباء واجداد سے وعدہ ہوتا آیا ہے، یہ تو محض پہلے لوگوں کے افسانے ہیں (83)

مصائب اور سختیوں کے وقت بھی کفار میں عاجزی پیدا نہ ہوئی:

عذاب کا دروازہ شاید لڑائیوں کا دروازہ تھا، جسے کھولا گیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ ﴾ یعنی ہم نے ان کو مصیبتوں اور سختیوں سے آزمایا۔ ﴿ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ ﴾ لہٰذا جس کفر و مخالفت میں وہ تھے، اس نے اُن کو اس سے باز نہ رکھا، بلکہ اپنی سرکشی اور گمراہی پر قائم رہے۔ ﴿ مَا اسْتَكَانُوْا ﴾ کے معنی ہیں "مَا خَشِعُوْا"، یعنی انھوں نے فروتنی اور عاجزی نہ کی۔ ﴿ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴾ سے مراد "مَا دَعَوْا" ہے، یعنی دعا نہ کی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ [الأنعام: ٤٣] "پھر جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو انھوں نے عاجزی کیوں نہ اختیار کی؟ لیکن ان کے دل سخت ہوگئے۔" امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے "عکرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما" روایت کیا ہے کہ ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ عرض کیا: یا محمد! میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں اور رحم کی کہ مقرر ہم نے علہز کھایا، یعنی اونٹ کا پشم اور خون، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت

نازل فرمائی: ﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ ... الخ ﴾[1] (وهكذا رواه النسائي عن محمد بن عقيل عن علي بن الحسين عن أبيه به)

اس حدیث کی اصل صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش پر بددعا کی جب کہ وہ نافرمان ہوئے تو فرمایا: «اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلَيْهِمْ بِسَبْعٍ كَسَبْعِ يُوسُفَ»[2] یعنی الٰہی! تو اُن پر میری اعانت فرما یوسف علیہ السلام کے سات سالوں کی طرح سات سال قحط کے اُن پر مسلط کر۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے وہب بن عمر بن کیسان سے روایت کیا ہے، کہا کہ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ قید ہوئے تو اُن کے بیٹوں میں سے ایک شخص نے کہا: اے ابوعبداللہ! کیا میں تمھارے لیے ایک شعر کا بیت نہ پڑھوں؟ تو وہب بولے کہ ہم تو ایک طرح کے عذابِ الٰہی میں ہیں اور اللہ یوں فرماتا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴾ کہا: اور تین دن پیہم وہب نے روزہ رکھا تو کسی نے اُن سے کہا: اے ابوعبداللہ! یہ کیسا روزہ ہے؟ کہا کہ اس نے ہمارے لیے ایک نئی بات کی تو ہم نے بھی نئی بات کی، یعنی اس نے ہمارے لیے قید کا اہتمام کیا تو ہم نے بھی زیادہ عبادت کا التزام کیا۔[3]

نزولِ عذاب کے وقت کفار کی مایوسی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴾ یعنی یہاں تک کہ جب اُن کے پاس اللہ کا امر آئے گا اور اُن کو اچانک قیامت پکڑے گی، اللہ کے عذاب کے ساتھ ایسا عذاب جس کا کبھی انھوں نے سوچا بھی نہ تھا، لہٰذا اس وقت وہ ہر قسم کی خیر اور راحت سے نا اُمید ہو جائیں گے اور اُن کی آرزوئیں اور تمنائیں سب ٹوٹ جائیں گی۔

اللہ پاک کی نعمتوں اور قدرتوں کا بیان:

پھر اللہ پاک نے اُن نعمتوں کا ذکر فرمایا، جو اس نے اپنے بندوں کو عطا کی ہیں؛ وہ یہ ہیں کہ اس نے اُن کے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے ہیں۔ ''أفئدة'' سے مراد عقلیں اور فہم ہیں، جن سے اشیاء کا ادراک کرتے ہیں اور جو نشانیاں دنیا میں اللہ پاک کی وحدانیت کی دلیل ہیں، ان سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور اللہ پاک ہی فاعل اور مختار ہے، یعنی وہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

﴿ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تمھارا شکر بہت کم ہے اس شے کے مقابلے میں جس کا اس نے تم پر انعام فرمایا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [يوسف: ۱۰۳] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔'' پھر اللہ پاک نے اپنی عظیم قدرت اور زبردست غلبے کی خبر دی کہ اس نے مخلوق پیدا کی اور اس کو زمین کی تمام اطراف میں پھیلا دیا، باوجود اس کے کہ وہ

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤١٣) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٢٨) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩٨)

[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٣٥)

جنس اور زبان اور صفت کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ پھر قیامت کے دن اُن کے اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا۔
﴿ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ [الشعراء: ٣٨] ''ایک مقرر دن کو (خاص) وقت پر جمع کر لیے گئے۔'' پھر اُن میں سے نہ کسی
چھوٹے کو چھوڑے گا نہ بڑے کو، نہ نر کو نہ مادہ کو، نہ جلیل کو نہ حقیر کو، مگر اس کو لوٹائے گا جس طرح کہ اس کی ابتدا کی تھی
اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ یعنی وہی زندہ کرے گا بوسیدہ ہڈیوں کو اور اُمتوں کو مارے گا۔

﴿ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حکم سے رات اور دن کی تسخیر ہے، ان میں سے ہر ایک تیزی سے دوسرے کو طلب کر رہا ہے، ایک کے بعد دوسرا آتا رہتا ہے، نہ وہ سست ہوتے ہیں اور نہ اُن کے سوا زمانے سے جدا ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ﴾ [یٰسٓ: ٤٠] ''نہ سورج کے لیے یہ لائق ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیرتا پھرتا ہے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے پھر کیا تمھاری عقلیں نہیں ہیں کہ اللہ عزیز وعلیم کی راہ تم کو بتائیں جس نے ہر شے کو مغلوب کیا ہے اور ہر چیز پر غالب ہوا ہے اور ہر شے اس کے لیے دب رہی ہے۔

مشرکین کا حیات بعد الممات کا انکار:

پھر قیامت کے منکرین کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہ اپنے سے پہلے جھٹلانے والوں کی طرح ہیں۔ ﴿ بَلْ قَالُوْا ءَاِذَا ... لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴾ یعنی بوسیدہ ہو جانے کے بعد زندہ ہونے کو بہت بعید جانتے ہیں۔ ﴿ لَقَدْ وُعِدْنَا ﴾ الآیۃ، یعنی دوبارہ لوٹایا جانا محال ہے، اس کی تو وہی شخص خبر دیتا ہے جس نے اس کو اگلوں کی کتابوں سے اخذ کیا ہے اور ان کے اختلاق وافترا سے مطلب یہ ہے کہ یہ بات حقیقت نہیں ہے، بلکہ اپنی طرف سے تراش لی ہے۔ ان کا یہ انکار اور تکذیب ایسی ہے جس طرح کہ اللہ پاک نے ان کی طرف سے خبر دی ہے: ﴿ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴾ [النازعات: ١١۔ ١٤] ''کیا جب ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو جائیں گے؟ کہتے ہیں کہ اس وقت لوٹنا تو خسارے والا ہے۔ چنانچہ وہ (قیامت) تو صرف ایک (خوفناک) ڈانٹ ہوگی۔ تب لوگ ایک دم کھلے میدان میں (جمع) ہوں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴾ [یٰسٓ: ٧٧۔ ٧٩] ''کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکایک وہ کھلا جھگڑالو ہو گیا۔ اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا: ہڈیوں کو

کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ گلی سڑی ہوں گے؟ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر طرح کے پیدا کرنے کو خوب جانتا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ ﴾ جملہ شرطیہ سابق کی تاکید ہے، اس کی تقریر کے لیے لایا گیا ہے۔ کسی نے کہا: عذاب سے مراد وہ بھوک ہے، جو قحط کے سالوں میں اُن کو پہنچی تھی۔ کسی نے کہا: مرض۔ کسی نے کہا: بدر کے دن کا قتل، زجاج رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[1] کسی نے کہا: گزشتہ اُمتوں کے وہ لوگ مراد ہیں جن پر عذاب آیا۔ ﴿ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے رب کے لیے نہ عاجزی کی نہ فروتنی کی، نہ ذلیل ہوئے نہ دبے، بلکہ اللہ پاک پر جو سرکشی اور تمرد کیا کرتے تھے اور اس کی نافرمانیوں میں ڈوبے رہتے تھے، اسی پر قائم و دائم رہے۔

﴿ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کے واسطے خشوع اور عاجزی نہیں کرتے ہیں، جب ان پر سختیاں آپڑتی ہیں اور نہ ہی اُن کے رفع کے لیے اللہ کو پکارتے ہیں۔ بیہقی وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے کہ ثمامہ بن اُثال حنفی رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور وہ قیدی تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رہا فرمایا تو وہ یمامہ میں جا ملا، پس وہ اہلِ مکہ اور اس غلہ کے درمیان، جو یمامہ سے آیا کرتا تھا، حائل ہوگیا، یہاں تک کہ قریش نے بھوک کے مارے اُونٹ کی پشم خون سے کھائی۔ اس پر ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا کہ کیا تم خیال نہیں کرتے ہو کہ تم عالمین کے لیے رحمت مبعوث ہوئے ہو؟ فرمایا: ہاں۔ عرض کیا: البتہ مقرر تم نے آباء کو تو تلوار سے قتل کیا اور ابناء (بیٹوں) کو بھوک سے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[2]

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ انھوں نے دنیا میں تواضع اور فروتنی نہ کی اور نہ خضوع کیا۔ اگر وہ اللہ کے لیے خضوع کرتے تو وہ اُن کی دعا قبول فرماتا۔[3] ﴿ حَتّٰٓى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴾ ﴿ حَتّٰٓى ﴾ کلمہ ابتدائیہ ہے۔ کسی نے کہا: عذاب سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ کسی نے کہا: بدر کے دن تلوار سے اُن کا قتل ہے۔ (قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما)[4] کسی نے کہا: قحط ہے جو اُن کو پہنچا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ مکہ مکرمہ کی فتح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قیامِ قیامت ہے۔

﴿ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس میں متحیر ہیں، نہیں جانتے کہ کیا کریں۔ ابلاس کہتے ہیں حیرانی کو اور بھلائی سے نا اُمید ہونے کو۔ سلمی نے بفتحِ لام پڑھا ہے "أَبْلَسَهُ" سے ماخوذ، یعنی اس کو ابلاس میں داخل کیا۔[5]

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٧٢) [2] دلائل النبوة للبيهقي (٤/ ٨١) [3] الدر المنثور (٦/ ١١١۔ ١١٢)
[4] تفسير القرطبي (١٢/ ١٤٣) [5] فتح القدير (٣/ ٦٧٢)

اس کی تفسیر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔[1] پھر اللہ پاک نے بعض نعمتوں کا احسان جتلایا جو اُن کو عطا کی ہیں۔ اس سے مقصود کفار کو ڈانٹا ڈپٹنا ہے اور مومنین کو نعمتوں کا یاد دلانا ہے، وہ نعمتیں یہی ہیں یعنی کان، آنکھیں اور دل۔ لہٰذا یہ نعمتیں اُن کو اس لیے عطا ہوئیں کہ وہ نصیحتوں کو سنیں، عبرتوں کو دیکھیں اور دلوں میں غور وفکر کریں۔ مگر انھوں نے اُن نعمتوں میں سے کسی سے فائدہ نہ اُٹھایا، اس لیے کہ کفر پر ڈٹے رہے، حق سے دور ہوئے اور اللہ کا شکر ادا نہ کیا، اس لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴾ یعنی تم بہت ہی قلیل حقیر شکر کرتے ہو، جس کا ایسی ایسی بڑی نعمتوں کے مقابلے میں کچھ اعتبار وشمار نہیں ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ بالکل شکر ہی نہیں کرتے ہیں، نہ یہ کہ اُن کے لیے قلیل شکر ہے، جس طرح کہ نعمت کے منکر کے حق میں بولتے ہیں: "مَا أَقَلَّ شُكْرَهُ" مراد یہ ہے کہ وہ شکر نہیں کرتا۔

اس آیت کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ فَمَآ أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ أَبْصَٰرُهُمْ وَلَآ أَفْـِٔدَتُهُم ﴾ [الأحقاف: ٢٦] ''تو ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں اور ان کے دلوں نے انھیں کوئی فائدہ نہ دیا۔'' اس میں اس بات پر آگاہ کیا گیا ہے کہ جس کام کے لیے یہ اعضا پیدا کیے گئے ہیں، جو شخص اُن کو اس میں استعمال نہیں کرتا تو وہ اس کے مثل ہے، جس کے یہ اعضا نہیں ہیں۔ ﴿ ذَرَأَكُمْ ﴾ کے معنی ہیں "بَثَّكُمْ" یعنی اسی نے تم کو زمین میں بکھیر انسل کے ساتھ، جس طرح کہ دانے بکھیرے جاتے ہیں، تاکہ اُگیں۔ اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ ﴿ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن تمھارے تفرق کے بعد تم جمع کیے جاؤ گے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ﴾ یعنی وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے یہ انفرادی طور پر اور مستقل طور پر خاص اسی کا کام ہے، اس میں کوئی شریک نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ روحوں کو پیدا کر کے اور مضغے میں پھونک کر زندہ کرتا ہے اور روحوں کو فنا کرنے کے ساتھ مارتا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے: "يُحْيِي النَّسَمَ بِالْإِنْشَاءِ وَيُمِيتُهَا بِالْإِفْنَاءِ"[2] اس میں نعمتِ حیات کا یاد دلانا ہے اور حیات سے دارِ آخرت کی طرف منتقل ہونے کا بیان ہے۔ ﴿ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾ یعنی اسی کا کام ہے رات اور دن کا بدلنا خلق اور ایجاد کے طریقے سے۔

مطلب یہ ہے کہ اسی کے پیدا کرنے اور ایجاد سے رات دن بدلتے رہتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: اسی نے ان کو مختلف کیا ہے کہ ایک جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے اور سیاہی اور سفیدی میں دونوں مختلف ہوتے ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ان کا اختلاف یہ ہے کہ ان میں سے ایک کا نقصان اور دوسرے کی زیادتی ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دن کے بعد دن اور رات کے بعد رات کا بار بار آنا ہے۔

﴿ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴾ یعنی پھر کیا تم نہیں بوجھتے ہو اس کی حقیقی قدرت کو اور اس میں غور وفکر نہیں کرتے ہو۔

[1] رقم الآیة (٤٤) [2] تفسیر النسفي (٣/ ١٢٨) [3] فتح القدیر (٣/ ٦٧٢)

پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ دوبارہ زندہ ہونے کا انکار وہ صرف آبائی تقلید کی وجہ سے کرتے ہیں، جس کی بنا صرف استبعاد (ناممکن سمجھنے) پر ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ یعنی اُن کے اگلے باپ دادا اور جو لوگ اُن کے دین میں اُن کے موافق تھے، جیسے: قومِ نوح و ہود و صالح علیہم السلام۔ مطلب یہ کہ جیسے اگلے لوگ بعث کے منکر ہوئے، ویسے ہی انھوں نے بھی اُن کی پیروی کر کے انکار کیا۔ پھر جو اگلوں نے کہا تھا، اللہ پاک نے اس کا بیان کیا: ﴿ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۸۲] ''انھوں نے کہا: کیا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہوگئے، تو کیا ہمیں (دوبارہ) زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟'' چنانچہ یہ صرف استبعاد (ناممکن سمجھنا) ہے، اس میں کسی شبہے سے تعلق نہ کیا۔ پھر اس قول کو اپنے اس قول سے رد کیا کہ ﴿ لَقَدْ وُعِدْنَا نَا مِنْ قَبْلُ ﴾ یعنی ہم کو ہی اس بعث کا وعدہ نہیں ملا ہے، بلکہ ہمارے باپ دادوں کو بھی وعدہ دیا گیا، جو ہم سے پہلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اس کی تصدیق نہ کی، جس طرح انھوں نے اس کو نہ مانا۔ پھر تکذیب کی تصریح کی اور صرف اپنے زعمِ باطل کی طرف بھاگے۔

چنانچہ بولے: ﴿ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی یہ تو اگلوں کی جھوٹی باتیں ہیں، جن کو کتابوں میں لکھ رکھا ہے۔ ﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ جمع ہے ''أُسْطُوْرَةٌ'' کی ''أُحْدُوْثَةٌ'' کی طرح۔ اباطیل و ترہات (خرافات) اور کذب کو ﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ کہتے ہیں۔ ان سب کے معنی بے اصل واہیات قصے ہیں۔ کسی نے کہا: ''أَسْطَارٌ'' کی جمع ہے اور ''أَسْطَارٌ'' جمع ہے ''سَطْرٌ'' کی، پہلا قول زیادہ موافق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس وعدے کو کچھ نہ دیکھا، ہم تو اس کو اگلوں کی کہانیاں خیال کرتے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ مکے والوں سے کئی ایسے اُمور کا سوال کریں کہ اُن کے اقرار کرنے میں اُن کو کوئی عذر نہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ
لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ
وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾
قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾
بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾

(اے نبی!) آپ (ان سے) پوچھیں: اگر تم جانتے ہو (تو بتاؤ) کس کی ہے یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے؟ (84) وہ ضرور کہیں گے: اللہ ہی کی ہے، کہہ دیجیے: کیا پھر تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ (85)

آپ پوچھیں: ساتوں آسمانوں کا رب اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟(86) وہ ضرور کہیں گے: (یہ) اللہ ہی کے ہیں، کہہ دیجیے: کیا پھر تم ڈرتے نہیں؟(87) آپ (پھر) پوچھیں: کس کے ہاتھ میں ہے ہر چیز کی بادشاہی، جبکہ وہی پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کسی کو پناہ نہیں دی جا سکتی، اگر تم جانتے ہو (تو بتاؤ؟)(88) وہ ضرور کہیں گے: (بادشاہی) اللہ ہی کی ہے، کہہ دیجیے: پھر کہاں سے تم پر جادو کیا جاتا ہے؟(89) بلکہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور بلاشبہہ وہ ہی جھوٹے ہیں(90)

مشرکین کے توحیدِ ربوبیت کے قائل ہونے کا ذکر:

اللہ پاک اپنی وحدانیت کو ثابت کرتا ہے اور اپنے استقلال کو بھی کہ پیدا کرنے میں اور اختیار میں اور ملکیت میں وہ مستقل ہے، تاکہ یہ بات بتائے کہ بے شک وہ اللہ ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور نہ عبادت لائق ہے، مگر اسی وحدہ لا شریک لہ کے، اسی واسطے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ مشرکوں سے کہیں، وہ مشرک جو اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو پوجتے ہیں اور اس کے لیے ربوبیت کا اقرار کرتے ہیں، حالاں کہ ربوبیت میں اللہ پاک کا کوئی شریک نہیں ہے، اس کے باوجود انھوں نے الٰہیت میں اس کے ساتھ شریک کیا، چنانچہ اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو پوجا، باوجود اس کے کہ جن کو انھوں نے پوجا ہے، وہ نہ کسی شے کو پیدا کر سکیں نہ کسی چیز کے مالک ہو سکیں، نہ کسی شے کے ساتھ مستقل ہو سکیں، بلکہ یہ اعتقاد کیا کہ وہ اُن کو اللہ کی طرف قریب کر دیں گے۔ چناں چہ خود اُن کا یہ قول ہے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر: ٣] ’’(وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔‘‘ چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ﴾ یعنی تم اُن سے پوچھو کہ زمین کا مالک کون ہے، جس نے اس کو پیدا کیا اور ان مخلوقات کو جو اس میں ہیں، حیوانات، نباتات اور مخلوقات کی تمام اقسام کا خالق کون ہے؟

﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ﴾۔ یعنی وہ تم سے اقرار کریں گے کہ یہ سب اللہ وحدہ لا شریک لہٗ کے لیے ہے۔ لہٰذا جب بات یہ ہے تو تم کہو: پھر تم سوچتے نہیں کہ عبادت تو صرف خالق اور رازق ہی کے لائق ہے نہ کہ اس کے غیر کے لیے۔ ﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ﴾ یعنی تم اُن سے پوچھو کہ عالمِ علوی کا خالق کون ہے اور اس میں جو روشن ستارے ہیں، اُن کو کس نے پیدا کیا ہے اور اس کی تمام اطراف اور کناروں میں فرشتے اللہ پاک کے لیے خضوع اور عاجزی کر رہے ہیں، ان کو کس نے بنایا ہے؟ ﴿وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ یعنی وہ بڑا عرش جو ساری مخلوقات کی چھت ہے، اس کا خالق کون ہے؟ جس طرح کہ حدیث شریف میں آیا ہے، جس کو امام ابو داود نے

روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ کی شان اس سے عظیم تر ہے، بے شک اس کا عرش اس کے آسمانوں پر اس طرح ہے اور اپنے دست مبارک سے اشارہ فرمایا کہ مثل قبے کے۔[1]

دوسری حدیث شریف میں یہ ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور جو کچھ اُن میں ہے اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، کرسی کے مقابلے میں اس طرح ہے، جس طرح کہ ایک جنگل بیابان میں ایک حلقہ (انگوٹھی) پڑا ہو اور بے شک کرسی اور جو کچھ اس میں ہے عرش کے مقابلے میں اس حلقے کی طرح ہے اسی بیابان میں۔[2] اسی لیے بعض سلف نے کہا ہے کہ عرش کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف پچاس ہزار سال کی راہ کے برابر فاصلہ ہے۔ عرش کی بلندی ساتویں زمین سے پچاس ہزار سال کی راہ کے برابر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ عرش کو عرش اس کی بلندی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے کعب احبار سے روایت کیا ہے کہ آسمان عرش میں ایسے ہے، جیسے آسمان و زمین کے درمیان قندیل لٹکی ہوئی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان و زمین عرش کے مقابلے میں ایسے ہیں، جیسے: ایک بیابان میں ایک حلقہ ہو۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ”عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما“ روایت کیا ہے، فرمایا کہ عرش کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا اور ایک روایت میں ہے سوائے اللہ عزوجل کے۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ عرش ایک سرخ یاقوت کا ہے اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾ یعنی بہت بڑا اور آخر سورت میں ﴿ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴾ فرمایا ہے: ”أَيْ: اَلْحَسَنُ الْبَهِيُّ“، یعنی خوبصورت نورانی اور اسی لیے کہا ہے جس نے کہا ہے کہ وہ ایک سرخ یاقوت کا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ تمھارے رب کے پاس نہ رات ہے نہ دن، عرش کا نور اس کے چہرے کے نور سے ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جب تم اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ وہ آسمانوں کا اور بڑے عرش کا رب ہے تو پھر کیا تم اس کے عذاب سے ڈرتے نہیں ہو اور اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجتے ہو اور اس کے ساتھ شرک کرتے ہو، اس بات میں اس کے عذاب سے حذر نہیں کرتے۔ ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی الدنیا قرشی نے ”کتاب التفکر و الاعتبار“ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اکثر ایک عورت کا قصہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ وہ جاہلیت میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر رہا کرتی تھی، اس کا ایک بیٹا اس کے ساتھ تھا جو بکریاں چرایا کرتا تھا، اس کے بیٹے نے اس سے کہا: اماں! تجھے کس نے پیدا کیا؟ وہ بولی: اللہ نے،

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٦) اس کی سند میں ”محمد بن اسحاق“ مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٦٣٩)

[2] تفسير الطبري (٥/ ٣٩٩) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٣٦)

بیٹے نے کہا: پھر میرے باپ کو کس نے پیدا کیا؟ وہ بولی: اللہ نے، کہا: پھر مجھے کس نے پیدا کیا؟ اس نے کہا: اللہ نے۔ کہا: پھر آسمانوں کو کس نے پیدا کیا؟ کہا: اللہ نے۔ کہا: پھر زمین کو کس نے پیدا کیا؟ کہا: اللہ نے۔ کہا: پھر پہاڑ کو کس نے پیدا کیا؟ کہا: اللہ نے۔ کہا: پھر بکریوں کو کس نے پیدا کیا؟ کہا: اللہ نے۔ کہا کہ میں تو اللہ کے لیے ایک شان سنتا ہوں۔ پھر اس نے اپنی جان کو پہاڑ سے نیچے ڈال دیا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ حدیث ہم سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد میں عبداللہ بن جعفر مدینی والد امام علی بن مدینی ہیں، لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔[1] واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ یعنی اس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ ﴿ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ﴾ [هود: ٥٦] ''(زمین پر) چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں، جسے اس نے اس کی پیشانی سے نہ پکڑ رکھا ہو۔'' یعنی وہ ہر دابہ میں تصرف کرنے والا ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے: «لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ»[2] یعنی قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اور جب قسم میں اجتہاد فرماتے، یعنی مبالغے کے ساتھ قسم کھاتے تو فرماتے: «لَا وَمُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ»[3] پس اللہ پاک خالق، مالک اور متصرف ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ عرب کا دستور تھا، جب کوئی ان میں سردار ہوتا، پھر وہ کسی کو پناہ دیتا تو وہ اپنی پناہ دینے میں عہد شکنی نہ کیا جاتا، یعنی سب اس کی پناہ کو مانتے اور جو شخص اس سے رُتبے میں کم ہوتا، اس کے لیے یہ بات نہ تھی کہ اس پر پناہ دے، تا کہ اس کی عہد شکنی نہ کی جائے، اسی لیے اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ﴾ یعنی اللہ ہی عظیم الشان سردار ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے، اسی کے لیے خلق اور امر ہے، اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا کوئی نہیں نہ اس کی کوئی ممانعت کر سکتا ہے نہ مخالفت، جو کچھ اس نے چاہا وہ ہوا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٣] ''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ان (لوگوں) سے باز پرس کی جائے گی۔'' یعنی اس کی عظمت اور کبریائی، غلبہ، قہر، عزت، حکمت اور عدل کے مارے اس کے کیے کا اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا ہے اور ساری خلق سے اُن کے اعمال کی پوچھ گچھ ہو گی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الحجر: ٩٢۔ ٩٣] ''چنانچہ آپ کے رب کی قسم! ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے۔ ان عملوں کی جو وہ کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ﴾ یعنی اب وہ اقرار کریں گے کہ بڑا سردار جو بچا لیتا ہے اور اس سے کوئی

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٣٦۔ ٣٣٧) اس کی سند میں ''عبداللہ بن جعفر مدینی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٢٥٧) [3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٢٤٣)

نہیں بچا سکتا، وہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہے۔ ﴿ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴾ یعنی تمھاری عقلیں کیوں جاتی رہتی ہیں، اس بات میں کہ تم اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجتے ہو، باوجود اس کے کہ تم اس کا اقرار کرتے ہو اور جانتے ہو۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یہ اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ۔ اور ہم اس پر صحیح واضح اور قطعی دلیلیں قائم کر چکے ہیں۔ ﴿ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ یعنی بے شک وہ جھوٹے ہیں غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ پوجنے میں۔ اُن کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، جس طرح کہ آخر سورت میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ١١٧] ''اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو یقیناً اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، بے شک کافر فلاح نہیں پائیں گے۔''

پس مشرکین یہ جو کرتے ہیں، کسی دلیل سے نہیں کہ جس جھوٹ اور بہتان اور گمراہی میں وہ پڑے ہیں، اس کی طرف اُن کو کھینچ لے جائے، وہ تو صرف اپنے آباء و اسلاف جاہلین کی پیروی کے لیے یہ کام کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان کی طرف سے اس مضمون کو بیان فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٢٣] ''بلاشبہہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا، اور ہم تو انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔''[1] کذا في ابن کثیر.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے: ﴿ قُلْ ﴾ یعنی اے پیغمبر! تم کفارِ مکہ سے یہ بات کہہ دو کہ ﴿ لِمَنِ الْاَرْضُ ﴾ زمین کس کی ہے؟ ﴿ وَمَنْ فِيْهَآ ﴾ اور جو کوئی اس میں ہے؟ ﴿ مَنْ ﴾ سے مراد ساری مخلوق ہے۔ کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ سے خلق کی تعبیر کی، کلمۂ ﴿ مَا ﴾ نہ فرمایا، اس لیے کہ ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر تغلیب دی ہے۔ ﴿ لِمَنِ ﴾ خبر مقدم ہے ﴿ اَلْاَرْضُ ﴾ مبتدائے موخر ہے۔

نکتہ:

تقدیم خبر کا اہتمام خبر ہے، کیوں کہ زمین کے ہونے میں کچھ شک نہیں ہے، لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ وہ کس کی ملکیت ہے۔ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ جواب شرط کا محذوف ہے۔ ''أي: فَأَخْبِرُوْنِيْ'' یعنی اگر تم کو کچھ بھی علم ہے تو مجھے بتاؤ۔ اس میں اُن کی جہالت اور غباوت (کند ذہن ہونا) کی زیادتی کی طرف اشارہ ہے، مطلب یہ ہے کہ تم بڑے نادان غبی ہو کہ تم کو اتنی بھی خبر نہیں ہے۔ ﴿ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ﴾ یعنی وہ ضرور یہی کہیں گے، کیوں کہ یہ بات

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٣٦_ ٣٣٧)

بظاہرِ عقل معلوم ہے۔ یہ اللہ پاک کی طرف سے اس چیز کی خبر دینا ہے جو اُن سے جواب میں واقع ہوگی، اس کے وقوع سے پہلے۔ پھر اللہ پاک نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ اُن کے اقرار کر لینے کے بعد اُن کو تدبر اور گہری نظر اور غور وفکر کی ترغیب دینے کے لیے اُن سے یوں کہیں کہ ﴿ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾۔ یعنی پھر کیا تم سوچتے نہیں ہو، کیوں کہ یہ بات ان کو اس طرف کھینچے گی کہ حق کی پیروی کریں اور باطل کو چھوڑ دیں، اس لیے کہ جو پاک ذات زمین وغیرہ کو ابتداءً پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ مردوں کو زندہ کرنے پر ضرور قدرت رکھتا ہے۔

﴿ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝86 سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ﴾ یہاں پر اللہ پاک نے سوال کے معنی کی طرف نظر کر کے حرفِ لام ذکر فرمایا، کیوں کہ یہ قول "مَنْ رَبُّهٗ" اور "لِمَنْ هُوَ" ایک معنی میں ہے، جس طرح یہ کہتے ہیں کہ "مَنْ رَبُّ هَذِهِ الدَّارِ" یعنی اس گھر کا مالک کون ہے؟ تو اس کے جواب میں، مثلاً: یوں کہیں گے "زید" اور یہ بھی کہیں گے "لزید"۔ ابوعمرو اور اہلِ عراق نے "سَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ" لفظ سوال کی طرف نظر کر کے بغیر لام کے پڑھا ہے۔ یہ قراءت واضح تر ہے باقی قراء کی قراءت سے، جو لام کے حرف کے ساتھ ہے۔ لیکن جمہور کی قراءت اس بات کی تاکید کرتی ہے کہ سارے مصاحف میں کلمۂ ﴿ لِلّٰهِ ﴾ حرفِ لام کے ساتھ اور بغیر الف کے لکھا ہوا ہے۔[1]

﴿ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر کیا تم غیر اللہ کے پوجنے سے نہیں ڈرتے ہو، یا اس کے عذاب سے نہیں ڈرتے ہو، یا اس کی دوبارہ زندہ کرنے کی قوت پر تمھیں خوف نہیں آتا کہ تم اس کے ساتھ شرک کرنے سے باز آجاؤ۔ اس میں اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اللہ کے عذاب سے بچاؤ کا طریقہ یہی ہے کہ بتوں کی عبادت کو چھوڑو اور دوبارہ زندہ کیے جانے کے برحق ہونے کا اقرار کرو۔ چنانچہ اس آیت کا اختتام پہلی آیت کے اختتام سے زیادہ مؤثر ہے۔ یعنی بہ نسبت اُس کے اس میں زیادہ مبالغہ ہے، اس لیے کہ اس میں وعید شدید شامل ہے۔ پھر جب اللہ پاک نے اوّل زمین کا ذکر کیا اور پھر آسمان کا بیان فرمایا تو یہاں حکم عام کر کے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾، ﴿ مَلَكُوْتُ ﴾ بہ معنی ملک ہے، حرفِ تا کا اضافہ مبالغے کے لیے ہے، جیسے: جبروت ورحموت ورہبوت۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: مراد ہر شے کے خزائن ہیں۔[2]

﴿ وَهُوَ يُجِيْرُ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک فریاد رسی کرتا ہے اپنے غیر کی جبکہ چاہتا ہے، اور اس کو منع کرتا ہے۔ ﴿ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ﴾ یعنی عذابِ الٰہی کو کوئی کسی سے روک نہیں سکتا، نہ اس کی مدد وفریاد رسی پر قادر ہوتا ہے۔ عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: "أَجَرْتُ فُلَانًا" یعنی میں نے فلاں کو پناہ دی، جبکہ وہ تجھ سے فریاد رسی چاہے تو تو

[1] فتح القدير (٣/ ٦٧٤) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٦٥)

اس کو بچا لے اور ''أُجِرْتُ عَلَيْهِ'' اس وقت کہیں گے جب تو اس کی حمایت کرے، معنی یہ ہیں کہ اللہ حمایت کرتا ہے، بچا لیتا ہے اور اس پر حمایت نہیں کی جاتی کہ اس کے پکڑے ہوئے کو کوئی چھڑا لے۔

﴿ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اگر تم جانتے ہو تو جواب دو۔ ﴿ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ﴾ جمہور نے اس کو سوال کے معنی کی طرف نظر کر کے بحرفِ لام پڑھا ہے، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ابو عمرو اور اہلِ عراق نے لفظ سوال کی طرف نظر کر کے بغیر لام کے پڑھا ہے۔ ﴿ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴾ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی پھر تم کہاں پھیرے جاتے ہو حق سے، اور دھوکا دیے جاتے ہو؟ معنی یہ ہیں کس طرح تمھارے خیال میں حق کو باطل کر کے اور صحیح کو فاسد کر کے ڈالا جاتا ہے، یعنی تم حق کو باطل سمجھتے ہو اور صحیح کو فاسد۔ ان کو دھوکا دینے والا شیطان ہے، یا خواہشاتِ نفس یا دونوں۔[1]

پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ اس نے اُن پر حجت قائم کرنے میں خوب مبالغہ کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی بلکہ ہم تو اُن کے پاس ایسا واضح امر لائے، جس کی پیروی کرنا حق ہے۔ ﴿ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ یعنی اور وہ جس بات کی اللہ پاک کی طرف نسبت کرتے ہیں کہ اس کی اولاد اور شریک ہے تو وہ بے شک اس میں البتہ جھوٹے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اپنی ذاتِ مقدس سے ان دونوں کی نفی کی۔ چنانچہ فرمایا:

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿91﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿92﴾

اللہ نے اپنی کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ اس کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے (اگر ہوتا) تو ہر معبود اس چیز کو، جو اس نے پیدا کی، لے جاتا، اور بلاشبہ ان میں سے ہر ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا، اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿91﴾ وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے، چناں چہ وہ کہیں اعلیٰ ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں ﴿92﴾

اللہ ہر قسم کے عیب و شریک سے پاک ہے:

اللہ تعالیٰ اپنی ذاتِ مقدس کی تنزیہ (عیب سے پاکی) اس سے کرتا ہے کہ اس کی اولاد ہو، یا ملک و اختیار اور عبادت میں اس کا کوئی شریک ہو۔ چنانچہ فرماتا ہے: ﴿ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ یعنی اگر معبودوں کا تعدد فرض کیا جائے تو اُن میں

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٧٤۔ ٦٧٥)

سے ہر ایک اپنی مرضی کے ساتھ منفرد ہوگا تو وجود کا انتظام نہ رہے گا۔ حالاں کہ جو دکھائی دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کا وجود ایک نظم ونسق کے تحت صحیح طور پر چل رہا ہے۔ سارے کاروبار خوب چل رہے ہیں۔ ایک عالمِ سفلی ہے اور دوسرا عالمِ علوی، ایک عالم دوسرے عالم کے ساتھ مرتبط ہے۔ ﴿ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ﴾ [الملك: ٣] ''(اے انسان!) تو رحمان کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں دیکھے گا۔'' پھر یہ ہوتا کہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو مغلوب کرنا چاہتا اور اس کی مخالفت کرتا تو ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔

متکلمین نے یہ بات کی ہے اور اس کی تعبیر دلیلِ تمانع (ایک دوسرے کے خلاف ہونا) سے کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر دو یا زیادہ صانع (کارساز) فرض کیے جائیں تو اُن میں سے کوئی تو ایک چیز کو حرکت دینا چاہے اور دوسرا اس چیز کا ایک جگہ ساکن ہونا چاہے، پھر اگر دونوں کی مراد حاصل نہ ہوئی تو عاجز ٹھہرے، حالانکہ واجب عاجز نہیں ہوتا ہے اور تضاد کے سبب دونوں کی مراد کا اکٹھا ہونا ممکن نہیں، یہ جو مشکل آئی تو صرف ایک سے زیادہ تعداد میں الٰہ فرض کرنے سے آئی۔ تو تعدد محال ہوا۔ پھر اگر ایک کی مراد حاصل ہو اور دوسرے کی نہ ہو تو غالب واجب ہوگا اور مغلوب ممکن ٹھہرے گا، کیوں کہ واجب کی صفت کے لیے یہ لائق نہیں کہ مقہور ہو، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ یعنی اولاد یا شریک کا دعویٰ کرنے میں جو لوگ ظلم و زیادتی کرتے ہیں، حد سے بڑھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے کہنے سے کہیں برتر ہے۔ ﴿ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ یعنی جو شے مخلوقات سے غائب ہے اور جس کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں، اللہ پاک اس سب کو خوب جانتا ہے۔ ﴿ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی ظالم، جاحد منکر لوگ جو کچھ کہتے ہیں، اللہ سبحانہ اس سے منزہ و متقدس و متعالی و عزیز و جلیل ہے۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک کی اولاد نہیں ہے، اس لیے کہ وہ نوع اور جنس سے پاک ہے اور مرد کا بیٹا اس کی جنس سے ہوتا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی معبود ہے کہ اُلوہیت میں اس کا شریک ہو۔ دونوں جگہ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ پھر شریک کا ثابت کرنا، جس کا کفار دعویٰ کرتے ہیں، جو شے اس کو مستلزم ہوتی ہے، اللہ پاک نے اس کا بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا کہ یوں ہوتا تو ہر معبود اپنے بنائے ہوئے کو لے جاتا، کلام میں عبارت محذوف ہے، یعنی اگر اللہ پاک کے ساتھ اور معبود ہوتے تو ہر معبود اپنے خلق کی بنا کے ساتھ منفرد اور مستقل ہوتا اور اس کی ملک دوسرے کی ملک سے ممتاز ہوتی اور ان کے آپس میں جنگ اور تطالب وتغالب واقع ہوتا، یعنی ایک دوسرے

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۳۷)

پر غلبہ پانے کی کوشش ہوتی رہتی، یعنی ہر ایک دوسرے سے مانگتا، لڑتا بھڑتا غلبہ چاہتا۔ ﴿ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ زور آور کمزور پر غالب ہو جاتا، اس کو مقہور کر ڈالتا، دبا لیتا، اس کا ملک لے لیتا جس طرح کہ بنی آدم کے بادشاہوں کی عادت ہوتی ہے۔ اب یہ ضعیف مغلوب اس کے لائق نہیں رہا کہ معبود ہو۔ جبکہ اس بارے میں اُلوہیت میں شرکت کا ناممکن ہونا ثابت ہوا اور ایک عالم کو ایک الٰہ کے سوا کوئی قائم نہیں کر سکتا تو یہ بات متعین ہوگئی کہ وہ ایک ذات اللہ پاک ہی ہے۔ جس طرح یہ دلیل شریک ہونے کی نفی کرتی ہے، اسی طرح اولاد کے نہ ہونے پر بھی دلالت کرتی ہے، کیوں کہ بیٹا بھی اپنے باپ سے اس کی ملکیت میں جھگڑا کرتا ہے۔

﴿ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ غائب و حاضر کے علم کے ساتھ اللہ پاک مختص ہے، رہی وہ خلق جو اللہ کے سوا ہے تو وہ اگرچہ حاضر کو جانتی ہے، لیکن غیب کا اس کو ہرگز علم نہیں ہے۔ یہ وحدانیت پر دوسری دلیل ہے ایک اور انداز سے۔ گویا یوں کہا گیا کہ اللہ پاک تو حاضر و غائب دونوں کو جانتا ہے اور غیر اللہ دونوں کو نہیں جانتا، لہٰذا اس کا غیر معبود نہیں ہو سکتا۔ یہ تقریر شکل ثانی کے قبیل سے ہے۔ نافع و ابوبکر و حمزہ و کسائی نے "عَالِمُ" کو برفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ یعنی "هُوَ عَالِمٌ"۔ باقی قراء کی قراءت جر کے ساتھ ہے، اس بنیاد پر کہ لفظِ اللہ کی صفت ہے یا اس سے بدل ہے۔ یعقوب سے مروی ہے کہ جب وصل کرتے تو جر سے پڑھتے اور جب ابتدا کرتے تو رفع سے پڑھتے۔[1]

﴿ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ معطوف ہے معنیٰ ما قبل پر۔ گویا یوں کہا: "عَالِمِ الْغَيْبِ فَتَعَالٰى"، یعنی اس نے غیب اور شہادت کو جانا، پھر برتر ہوا۔ یہ اس قول کی مثل ہے: "زَيْدٌ شُجَاعٌ فَعَظُمَتْ مَنْزِلَتُهُ، أَيْ: شَجُعَ فَعَظُمَتْ"، یعنی زید بہادر ہے تو اس کا رُتبہ بڑا ہوا، مطلب یہ کہ اس نے بہادری کی تو اس کا رُتبہ بڑا ہوا۔ یا بنا بر اضمارِ قول ہے: "أَيْ: أَقُوْلُ: فَتَعَالَ اللّٰهُ"، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک ملک میں شریک ہونے سے برتر ہے۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿93﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿94﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿95﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿96﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿97﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿98﴾

کہہ دیجیے: اے میرے رب! اگر تو مجھے دکھائے جو انھیں وعدہ دیا جاتا ہے (93) (تو) اے

[1] تفسیر القرطبي (١٢/ ١٤٧)

میرے رب! تو مجھے ظالم لوگوں میں (شامل) نہ کرنا﴿94﴾ اور بلاشبہ ہم اس بات پر کہ آپ کو وہ دکھائیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، ضرور قادر ہیں﴿95﴾ برائی کو اس طریقے سے دفع کیجیے جو احسن ہو، ہم اسے خوب جانتے ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں﴿96﴾ اور آپ کہیں: اے میرے رب! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں﴿97﴾ اور اے میرے رب! میں (اس سے بھی) تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں﴿98﴾

عذاب و سزا کے وقت دعا کا حکم:

شیطان کا وسوسہ یہی ہوتا ہے کہ دین کے سوال و جواب میں غصہ آجائے اور لڑائی ہو پڑے۔ اسی پر فرمایا کہ برے کا جواب اس سے بہتر ہے۔ انتہیٰ۔ اللہ پاک اپنے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم فرماتا ہے کہ عذاب اور سزا کے نزول کے وقت یہ دعا مانگیں: ﴿ رَبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴾ یعنی اے رب! اگر تو اُن کو عذاب کرے اور میں اس کا مشاہدہ کروں تو تو مجھے اُن میں مت کرنا، جس طرح کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے: « وَإِذَا أَرَدْتَّ بِقَوْمٍ فِتْنَةً فَتَوَفَّنِي إِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ »[1] (رواه الإمام أحمد والترمذي وصححه) یعنی جس وقت تو کسی قوم کے ساتھ فتنے کا ارادہ کرے تو تو مجھے اپنی طرف لیجیو اس حال میں کہ مجھے فتنہ نہ پہنچے۔ ﴿ وَاِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ یعنی اگر ہم چاہیں تو البتہ تجھ کو دکھا دیں، وہ سزا، بلا، محنت اور شدت جو اُن پر نازل کریں۔

برائی کا احسن انداز میں دفاع کرنے کا حکم:

پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کو ایک ایسے تریاق کا ارشاد کیا جو لوگوں سے خلط ملط ہونے اور ملنے جلنے میں بہت زیادہ فائدے مند اور سود مند ہے، وہ یہی ہے کہ جو کوئی اُن سے برائی کرے تو وہ اس کے ساتھ نیکی کریں، تا کہ اس کے دل کو کھینچ لیں تو اس کی عداوت صداقت میں بدل جائے اور اس کا بغض محبت ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ﴾ جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿34﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ [حٰم السجدة: ٣٤۔ ٣٥] ’’آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو تو (آپ دیکھیں گے) یکایک وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی ہے، (ایسا ہو جائے گا) جیسے گرم جوش جگری دوست ہو۔ اور یہ (خصلت) انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہو۔‘‘

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٤٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣١٦٩)

یعنی اس وصیت کا یا اس خصلت کا یا اس صفت کا الہام نہیں کیا جاتا، مگر انہیں لوگوں کو جنھوں نے صبر کیا، یعنی لوگوں کی ایذا دہی پر اُن سے اچھا معاملہ کیا، باوجود اس کے کہ وہ اُن سے بری طرح پیش آئے اور اُن کو ایذا پہنچائی۔ ﴿ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ یعنی وہ صفت صرف اسی کو ملتی ہے جو دنیا اور آخرت میں بڑا بہرہ مند اور بختاور ہے۔

شیاطین کے وساوس وغیرہ سے اللہ کی پناہ پکڑنے کا حکم:

پھر اللہ پاک نے آپ کو حکم فرمایا کہ شیاطین سے پناہ مانگیں، کیوں کہ اُن کے ساتھ حیلے تدبیریں نفع نہیں دیتیں، نہ وہ نیکی کرنے سے فرماں بردار اور مطیع ہوتے ہیں۔ ہم تفسیرِ استعاذہ میں پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ کلمے فرمایا کرتے تھے: «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ»[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴾ یعنی میں پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ میرے کسی کام میں حاضر ہوں اور اسی لیے ابتدائے امور میں اللہ کے ذکر کا حکم کیا گیا ہے، شیطان کو دور کرنے کے لیے کھانے پینے کے وقت، جماع کے وقت، ذبح کرنے کے وقت، اس کے علاوہ دوسرے کام ہیں، ان کو شروع کرتے وقت اللہ پاک کا ذکر کریں، تاکہ شیطان پھٹکنے نہ پائے اور اسی لیے امام ابو داود نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَرَمِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَدَمِ وَمِنَ الْغَرَقِ، وَأَعُوْذُ بِكَ أَنْ يَّتَخَبَّطَنِي الشَّيْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ»[2] یعنی الٰہی! میں پناہ مانگتا ہوں ساتھ تیرے بڑھاپے سے اور پناہ مانگتا ہوں میں ساتھ تیرے دب کر مرنے سے اور ڈوبنے سے اور پناہ مانگتا ہوں میں ساتھ تیرے اس سے کہ شیطان مجھ کو مرنے کے وقت مخبوط بنائے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے "عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده" روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو کئی کلمات کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ آپ اُن کو سوتے وقت فرمایا کرتے تھے: «مِنَ الْفَزَعِ» یعنی اس لیے کہ نیند میں ڈر جانے سے امن ہو: «بِسْمِ اللّٰهِ أَعُوْذُ بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَّحْضُرُوْنِ» یعنی اللہ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں میں اللہ کے پورے کلموں کے ساتھ اس کے غضب سے اور اس کے عذاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کی چھیڑ چھاڑ سے اور اس بات سے کہ میرے پاس حاضر ہوں۔ راوی نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اپنی اولاد میں سے جو بالغ ہوتا، اس کو یہ کلمات سکھاتے کہ وہ سوتے وقت اُن کو کہا کرے اور جو کوئی اُن میں سے چھوٹا ہوتا، اس کو ان کلمات کی سمجھ نہ ہوتی تو ان کو

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٣/ ٣٦١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٥٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٥٣٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٢٨٢)

لکھ کر اس کی گردن میں لٹکا دیتے۔[1] (رواه أبو داود و الترمذي والنسائي من حديث محمد بن إسحاق، وقال الترمذي: حسن غريب) كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ رَبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴾ یعنی اگر ضرور ہے کہ تو مجھے ان کا بیخ کن عذاب دکھا دے۔ ﴿ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ تو تو مجھے اُن میں سے نہ کرنا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر تو اُن پر سزا اور عذاب نازل کرے تو تو مجھے اُن سے خارج کر دینا۔[2] مطلب یہ ہے کہ ندا یعنی کلمۂ ﴿ رَبِّ ﴾ معترض ہے شرط و جزا کے درمیان۔ کلمۂ ﴿ رَبِّ ﴾ کو پہلے اور بعد میں دو دفعہ اس لیے ذکر فرمایا کہ تضرع و ابتہال، یعنی زاری و عاجزی میں مبالغہ ہو جائے۔ اللہ پاک نے جو نبی کریم ﷺ کو اس بات کا حکم کیا کہ اللہ پاک سے سوال کریں کہ وہ ظالموں کی قوم میں سے نہ کرے، اس کے باوجود کہ انبیا علیہم السلام اُن کے ساتھ کبھی نہیں ہوتے۔ اس سے غرض نبی اکرم ﷺ کو تواضع، فروتنی اور کسرِ نفسی کی تعلیم دینا ہے، یا اس لیے کہ کفر کی شومی و نحوست کبھی اس کو بھی لاحق ہو جاتی ہے جو اہلِ کفر میں سے نہیں ہوتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ﴾ [الأنفال: ٢٥] ''اور اس فتنے سے ڈرو جو تم میں سے خاص طور پر (صرف) ان لوگوں کو نہیں پہنچے گا جنھوں نے ظلم کیا۔''

پھر جب مشرک لوگ عذاب کا انکار کرتے تھے اور نبی اکرم ﷺ جس وقت اُن سے اس کا ذکر فرماتے تھے تو وہ آپ سے ہنستے، اس لیے اللہ پاک نے اس قول سے اس کی تاکید فرمائی: ﴿ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک اس پر قادر ہے کہ اپنے رسول کو اُن کا عذاب دکھا دے، لیکن وہ عذاب کو مؤخر کرتا ہے، کیوں کہ اس کو اس بات کا علم ہے کہ اُن میں سے بعض ایمان لے آئیں گے، یا اس لیے کہ اللہ پاک اُن کو عذاب نہ کرے گا، اس حال میں کہ رسول اُن میں موجود ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ بدر کے دن اور فتح مکہ کے دن اللہ پاک نے ان کو قوم کا عذاب دکھا دیا۔

پھر اللہ پاک نے آپ کو امر فرمایا کہ یہاں تک صبر کریں کہ مدت مقرر پوری ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ﴾ یعنی تم اس خصلت کے ساتھ دفع کرو جو اس کے غیر کی خصلت سے بہترین ہے، وہ

---

[1] مسند أحمد (٢/ ١٨١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٩٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٢٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٩٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٣٨۔ ٣٣٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کے آخری حصے (سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اپنی اولاد میں ...... دیتے) کے علاوہ باقی روایت کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٤)

[2] معاني القرآن (٤/ ٢١)

خصلت یہی درگزر کرنا اور اعراض ہے، یعنی کفار جو بری خصلت اختیار کرتے ہیں یعنی شرک، تم اس سے درگزر کرو۔ کسی نے کہا: یہ آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفار جو تم کو ایذا پہنچاتے ہیں، تم اس سے اعراض کرو۔[1] امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: سلام سے دفع کرو۔[2] سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ اگر آدمی اپنے بھائی کو ایسی بات کہے جو اس میں نہیں ہے تو وہ اس کا جواب اس طرح سے دے کہ اگر تو جھوٹا ہے تو میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ تجھے بخشے اور اگر تو سچا ہے تو میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے بخشے۔[3] ﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ﴾ یعنی جس بات کے ساتھ کفار تمھارا وصف کرتے ہیں اور تم اس کے برخلاف ہو یا وہ جو شرک، تکذیب اور کفر کی باتیں بناتے ہیں، ہم اس کو خوب جانتے ہیں۔ اس میں ان کو سزا کی وعید ہے۔

اللہ پاک نے جو یہ آپ کو ارشاد فرمایا کہ عفو و درگزر کرو اور برائی کا مقابلہ نیکی سے کیا کرو۔ پھر اس کے بعد وہ بات سکھائی جو اس کو قوت دے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ﴾ "عوذ" سے مراد اعتصام ہے۔ اعتصام کہتے ہیں چنگل مارنے کو، کسی شے کے مضبوط پکڑنے کو، یعنی الٰہی! میں تیرے ساتھ مضبوط پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کی چھیڑوں سے۔ ﴿هَمَزٰتِ﴾ جمع ہے "همزة" کی۔ ہمزہ لغت میں ہاتھ سے یا کسی اور شے سے دھکا دینے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "هَمَزَهُ وَلَمَزَهُ وَنَخَسَهُ" أَيْ: دَفَعَهُ۔ کسی نے کہا ہے کہ "همز" وہ کلام ہے، جو پیٹھ پیچھے ہو اور "لمز" وہ ہے جو روبرو ہو۔ اس جگہ ﴿هَمَزٰتِ﴾ سے مراد شیطان کے وسوسے ہیں، جن کو وہ آدمی کے دل میں ڈالا کرتا ہے۔ اور اس کی چھیڑیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے شیاطین کی نفخ و نفث مراد ہیں۔

﴿هَمَزٰتِ﴾ کو جمع کے صیغے میں اس لیے ذکر کیا ہے کہ شیطان بار بار وسوسے ڈالتا ہے، یا اس لیے کہ اس کے وسوسے طرح طرح کے ہوتے ہیں، یا اس لیے کہ مضاف الیہ متعدد ہیں۔ آیت میں ارشاد ہے اس امت کو کہ شیطان سے اور اس کے وسوسوں سے پناہ مانگیں۔ ﴿هَمَزٰتِ﴾ یہی غصے کے جوش و خروش ہیں، جن میں آدمی کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا۔ پہلے اللہ پاک نے آپ کو ہمزاتِ شیاطین سے پناہ مانگنے کا امر کیا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اُن کے حاضر ہونے سے پناہ مانگیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ﴾ عامل و ندا کا اعادہ کیا مبالغے کے لیے اور اس لیے کہ اس پناہ مانگنے کا زیادہ تر اعتنا و اہتمام کیا جائے۔ معنی یہ ہیں کہ میں تیرے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ وہ میرے ساتھ ہوں کسی بھی حال میں، کیوں کہ جس وقت وہ انسان کے پاس حاضر ہوں گے تو اس کے واسطے کوئی عمل نہ ہوگا، مگر یہی وسوسہ اور شر پر آمادہ کرنا اور خیر سے پھیرنا۔ سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے:

"وَقُلْ رَّبِّ عَائِذًا بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَعَائِذًا بِكَ رَبِّ أَنْ يَّحْضُرُوْنِ"[4]

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٦٨)
[2] الدر المنثور (٦/ ١١٣)
[3] حلية الأولياء (٨/ ٢٥٢_ ٢٥٣)
[4] تفسير القرطبي (١٢/ ١٤٨)

پھر وہی حدیث عمرو بن شعیب کی لکھی ہے، اس کے بعد کہا ہے کہ اس کی اسناد میں محمد بن اسحاق ہیں اور ان میں مقال معروف ہے۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ولید بن ولید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک میں پاتا ہوں وحشت کو، فرمایا: جس وقت تو اپنے بستر پر لیٹے (حدیث کے الفاظ ہیں: « إِذَا أَخَذْتَ مَضْجَعَكَ ») تو کہہ « أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَّحْضُرُوْنِ » پس شیطان تیرے پاس حاضر نہ ہوگا اور امید ہے کہ تجھے ضرر نہ پہنچائے گا۔[2]

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٠٠﴾

حتی کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے گی تو وہ کہے گا: اے میرے رب! مجھے واپس بھیج ﴿99﴾ تاکہ میں اس (دنیا) میں، جسے میں چھوڑ آیا ہوں، نیک عمل کروں، ہرگز نہیں! بے شک یہ ایک بات ہے جو وہ کہنے والا ہے۔ اور ان کے آگے پردہ ہے اس دن تک جب وہ (دوبارہ) اُٹھائے جائیں گے ﴿100﴾

بوقتِ مرگ کفار کی بے کار تمنا:

معلوم ہوا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ آدمی مر کر پھر آتا ہے سب غلط ہے، قیامت کو اُٹھیں گے اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ انتہٰی۔ اللہ پاک اس حالت کی خبر دیتا ہے جو انسان کی موت کے حاضر ہونے کے وقت ہوتی ہے، یہ شخص کفار سے ہو یا مسلمانوں میں سے، جو اللہ پاک کے حکم میں کمی کرتے ہیں، اس کی پوری طرح بجا آوری نہیں کرتے، وہ موت کے وقت دنیا کی طرف لوٹنے کا سوال کریں گے، تاکہ زندگی کے دوران جو غلط کام کیے ہیں، اس کی اصلاح کر لیں۔ اسی لیے یوں کہا: ﴿ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صٰلِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ﴾ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠﴾ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [المنافقون: ١٠۔ ١١] ’’اور تم اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں رزق دیا ہے، اس سے پہلے کہ تم میں

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] مسند أحمد (٤/ ٥٧) فتح البیان (٩/ ١٤٦۔ ١٤٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن حبان رحمہ اللہ نے سیدنا ولید بن ولید رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ البتہ گزشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

سے کسی ایک کو موت آئے، پھر وہ کہے: اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ مدت تک اور کیوں نہ مہلت دی کہ میں صدقہ کرتا اور میں صالحین میں سے ہو جاتا۔ اور اللہ کسی کو ہرگز مہلت نہیں دیتا، جب اس کی اَجل آ جائے اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴾ [إبراهيم: ٤٤] ''اور (اے نبی!) لوگوں کو اس دن سے ڈرائیں جب انھیں عذاب آ لے گا تو ظالم کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی مدت تک مہلت دے (تا کہ) ہم تیری دعوت قبول کریں اور رسولوں کی اتباع کریں۔ (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمھارے لیے کوئی زوال نہیں؟''

نیز فرمایا: ﴿ یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَیَشْفَعُوْا لَنَاۤ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ﴾ [الأعراف: ٥٣] ''جس دن اس کا انجام سامنے آئے گا تو وہ لوگ جو اس سے پہلے اس دن کو بھولے ہوئے تھے، کہیں گے کہ واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے، تو کیا ہمارے لیے کوئی سفارشی ہیں کہ وہ ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم ان اعمال سے ہٹ کر عمل کریں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴾ [السجدة: ١٢] ''کاش! آپ دیکھیں جب مجرم اپنے رب کے حضور سر جھکائے (پیش) ہوں گے، (وہ کہیں گے:) اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، لہٰذا ہمیں واپس بھیج کہ ہم نیک عمل کریں، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا یُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٧- ٢٨] ''اور اگر آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ آتش پر کھڑے کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: کاش! ایک بار ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اور ہم اپنے رب کی آیات کو ہرگز نہ جھٹلائیں گے، اور ہم مومنوں میں سے ہوں گے۔ (نہیں!) بلکہ ان کے وہ کرتوت ظاہر ہو چکے ہوں گے جنھیں وہ پہلے چھپاتے تھے۔ اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَتَرَى الظّٰلِمِیْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ یَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِیْلٍ ﴾ [الشورىٰ: ٤٤] ''اور آپ ظالموں کو دیکھیں گے کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے: کیا واپسی کا کوئی راستہ ہے۔'' نیز فرمایا:
﴿ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗ

اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴾ [المؤمن: ۱۱۔ ۱۲] ''وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور تو نے ہمیں دو بار زندہ کیا، تو ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، پھر کیا (اس عذاب) سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ (فرمایا جائے گا:) تمھیں یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ بلاشبہہ جب تنہا اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم (اس کی توحید کا) انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم (اس شرک کو) مان لیتے تھے، اب حکم تو اللہ ہی کا ہے جو نہایت برتر اور بہت بڑا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴾ [الفاطر: ۳۷] ''اور وہ اس (جہنم) میں چلّائیں گے (اور کہیں گے:) اے ہمارے رب! تو ہمیں (اس سے) نکال، (اب) ہم نیک عمل کریں گے نہ کہ وہ جو (پہلے) کرتے تھے، (اللہ فرمائے گا:) کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو شخص نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا؟ اور تمھارے پاس ڈرانے والا بھی آیا، اب تم (عذاب کا مزہ) چکھو، پس ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔''

اللہ پاک نے ان آیتوں میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ لوٹنے کا سوال کریں گے، لہٰذا اُن کا یہ سوال نہ موت آجانے کے وقت قبول ہوگا اور نہ ''یوم النشور'' (موت کے بعد جی کر اُٹھنے کے دن)، نہ ہی اللہ پر پیش ہونے کے وقت اور نہ اس وقت جب وہ دوزخ پر پیش کیے جائیں گے اور دوزخ کے عذاب کی سختیوں میں ہوں گے۔ اس جگہ جو یہ فرمایا: ﴿ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ﴾ لہٰذا ﴿ كَلَّا ﴾ حرفِ ردع و زجر ہے، یعنی اس نے جو بات طلب کی ہے، ہم اس کو ہرگز نہ مانیں گے، نہ اس سے قبول کریں گے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس بات کو ہر ظالم موت کے وقت کہے گا۔[1]

یہ بھی احتمال ہے کہ ﴿ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ﴾ علت ہو ﴿ كَلَّا ﴾ کی: ''أَيْ: لِأَنَّهَا كَلِمَةٌ''، یعنی سوال کرنا اس کا لوٹنے کے لیے، تاکہ وہ عملِ صالح کرے۔ یہ ایک اس کی بات ہے اور ایک قول ہے کہ اس کے ساتھ کچھ عمل نہیں ہے۔ بالفرض اگر وہ پھر لایا جائے تو عملِ صالح نہ کرے گا اور اپنے اس قول میں کاذب ٹھہرے گا، جیسا کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۲۸] ''اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! اس نے اس بات کی تمنا نہیں کی کہ گھر والوں کی طرف لوٹے، نہ اس کی کہ اپنے کنبے کی طرف رجوع ہو، نہ اس کی کہ دنیا جمع کرے اور خواہشوں کو پورا کرے، لیکن اس نے یہ تمنا کی ہے کہ پھر آئے تو

[1] تفسير الطبري (۱۹/ ۸۰)

اللہ عزوجل کی اطاعت کے ساتھ عمل کرے۔ اللہ رحم کرے اس آدمی کو جس نے عمل کیا، اس بات میں جس کی کافر تمنا کرے گا، جب کہ جہنم کے عذاب کو دیکھے گا۔ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ ﴾ اس پر جبار فرمائے گا: ﴿ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا ﴾ عمر بن عبدالعزیز مولی غفرہ نے کہا ہے کہ جس وقت کافر کہے گا: ﴿ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا ﴾ تو اللہ فرمائے گا: "كَلَّا كَذَبْتَ" یعنی ہرگز نہیں تو نے جھوٹ کہا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی تفسیر میں سیدنا علاء بن زیاد کہا کرتے تھے: تم میں سے ایک اپنی جان کے بارے میں فرض کرے کہ اس کو موت حاضر ہوگئی تو اس نے اپنے رب سے اِقالہ (گناہ معاف کرنے کی درخواست) کیا سو اس نے اِقالہ قبول کیا۔ یعنی اس نے دنیا کی طرف لوٹ جانا چاہا تو اللہ نے اس کو پھیر دیا۔ چاہیے کہ اللہ کی طاعت کے ساتھ عمل کرے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! اس نے تمنا نہیں کی مگر اس کی کہ رجوع کرے تو اللہ کی اطاعت کے ساتھ عمل کرے۔ تم کافر کی تمنا کی طرف نظر کرو، یعنی سوچو۔ پھر اس پر عمل کرو۔ "وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" یعنی عملِ صالح کرنے کی کوئی قوت نہیں ہے مگر اللہ کی مدد کے ساتھ۔ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[1]

امام محمد بن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: جب کافر اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے، پھر جہنم سے اس کا ٹھکانا اسے دکھایا جاتا ہے تو کہتا ہے: اے رب! مجھے پھیر دے کہ میں توبہ کروں اور نیک کام کروں، پھر کہا جاتا ہے: تجھے اتنی لمبی عمر دی گئی تھی، جتنی کہ دی گئی تھی۔ پھر اس کی قبر اس پر تنگ کی جاتی ہے اور وہ مل جاتی ہے، چنانچہ وہ مثل مارگزیدہ کے سوتا ہے اور گھبراتا ہے۔ زمین کے کیڑے اور اس کے سانپ اور بچھو اس کی طرف جھک پڑتے ہیں (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ "كَالْمَنْهُوْشِ يَنَامُ وَيَفْزَعُ" اور فتح القدیر میں "يُنَازِعُ وَيَفْزَعُ" ہیں۔ فتح البیان میں امام ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا کی روایت بھی اسی طرح ہے۔[2] واللہ أعلم)۔ نیز سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ خرابی ہے اہلِ معاصی کے لیے جو وہ قبروں میں ڈالے جاتے ہیں تو اُن پر اُن کی قبروں میں سیاہ سانپ یا "دُهْم" (نہایت درجہ سیاہ یا نہایت سبز) سانپ داخل ہوتے ہیں۔ ایک سانپ اس کے سر کے نزدیک اور ایک اس کے دونوں پاؤں کے نزدیک ہوتا ہے، وہ دونوں اس کو کاٹتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے وسط میں مل جاتے ہیں۔[3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۳۹)

[2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۳۹۔ ٤٤٠) فتح القدیر (۳/ ٦٨١) فتح البیان (۹/ ۱٤۹) الدر المنثور (٦/ ۱۱٤)

[3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ٤٤٠) الدر المنثور (٦/ ۱۱٤)

عالمِ برزخ اور اس کا عذاب:

چنانچہ یہ وہ عذاب ہے برزخ میں جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴾ امام ابو صالح رحمہ اللہ وغیرہ نے ﴿ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ "أَمَامَهُمْ" مراد ہے، یعنی کلمۂ "وَرَآءَ" اضداد میں سے ہے، اس کے معنی آگے پیچھے دونوں ہیں، یہاں مراد آگے ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: برزخ حاجز ہے، یعنی پردہ، وہ زمانہ ہے جو دنیا اور آخرت کے درمیان ہے۔[1] محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: برزخ وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے درمیان ہے۔ وہ لوگ دنیا والوں کے ساتھ نہیں ہیں کہ کھائیں پئیں، نہ آخرت والوں کے ساتھ کہ اپنے اعمال کی جزا دیے جائیں۔ ابوصخر نے کہا: برزخ مقابر ہیں، نہ وہ دنیا میں ہیں نہ آخرت میں، وہ اقامت پذیر ہیں اس دن تک جب اُٹھائے جائیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ﴾ [الجاثية: ١٠] "ان کے آگے جہنم ہے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَمِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴾ [إبراهيم: ١٧] "اور اس کے آگے نہایت سخت عذاب ہوگا۔" قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ بعث کے دن تک اس پر عذاب مستقل و دائم و قائم رہے گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے: « فَلَا يَزَالُ مُعَذَّبًا فِيهَا »[2] "أَيْ: فِي الْأَرْضِ" یعنی وہ زمین میں ہمیشہ معذب رہے گا۔[3] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت تبیان یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ حَتّٰى ﴾ ابتدائیہ ہے، جملہ شرطیہ پر داخل ہوا ہے اور باوجود اس کے اپنے ماقبل کے لیے غایت ہے ﴿ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے یا "يَصِفُوْنَ" سے۔ موت کے آنے سے مراد موت کی علامات کا آنا ہے، یعنی یہاں تک کہ جس وقت آگ میں اپنا ٹھکانا دیکھے گا، یا جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھے گا جو اسے اس وقت ملتا، اگر وہ ایمان لاتا۔ ﴿ قَالَ ﴾ کا فاعل وہی "أحد" ہے جس کو موت حاضر ہوئی ہے، یعنی جو کچھ برائیاں اُس سے ہو چکی ہیں، ان پر حسرت وحزن و رنج کر کے کہے گا: ﴿ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴾ اے رب! تم مجھے دنیا کی طرف پھیر دو۔ جمع کا صیغہ کہا، اس کے باوجود کہ مخاطب ایک ہے۔ لہٰذا مخاطب کی تعظیم کے لیے صیغۂ جمع سے خطاب کیا۔ کسی نے کہا کہ تکرارِ فعل کے معنی کی بنا پر: "أَيْ: اِرْجِعْنِيْ، اِرْجِعْنِيْ، اِرْجِعْنِيْ" یہ قول امام ابوالبقاء رحمہ اللہ کا ہے۔[4] اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴾ [ق: ٢٤] "(حکم ہوگا:) تم دونوں ہر کافر سرکش کو جہنم میں ڈال دو۔" امام مازنی رحمہ اللہ نے کہا: اس کے معنی ہیں: "أَلْقِ، أَلْقِ" یعنی ڈال دے ڈال دے جہنم میں۔ مطلب یہ ہے کہ گو مخاطب ایک ہے، لیکن تکرارِ فعل کی جہت سے تثنیہ کا صیغہ ذکر کیا۔ اسی طرح "امرئ القيس" کے قول میں کہا ہے: ع

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٧١)
[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٤)
[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٣٩۔ ٤٤٠)
[4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٦٠)

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرىٰ حَبِيْبٍ وَّمَنْزِلِ

یعنی ٹھہر جا ٹھہر جا ہم روئیں دوست اور منزلِ دوست کو یاد کرنے کے سبب سے۔

اُسی کے مثل حجاج کا قول ہے: ع "يَا حَرَسِيُّ اِضْرِبَا عُنُقَهُ"

''اے محافظ! اس کی گردن مار دو، اس کی گردن اڑا دو۔''

اسی طرح کسی اور کا قول ہے: ع أَلَا فَارْحَمُوْنِ يَا إِلٰهَ مُحَمَّدٍ[1]

''اے الٰہِ محمد! مجھ پر رحم فرما، رحم فرما، رحم فرما۔''

کسی نے یہ تاویل کی ہے کہ جب انھوں نے اللہ پاک سے استغاثہ کیا تو اُن کے کہنے والے نے ﴿ رَبِّ ﴾ کہا۔ پھر خطاب ملائکہ کی طرف رجوع کیا تو ﴿ اِرْجِعُوْنِ ﴾ کہہ دیا۔ ﴿ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صٰلِحًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی طرف لوٹ کر جاؤں گا تو نیک کام کروں گا، ایمان لاؤں گا اور جو نیک کام ایمان کے تابع ہیں، ان کو بجا لاؤں گا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا: زعم کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مومن جس وقت فرشتوں کو دیکھتا ہے تو وہ کہتے ہیں: کیا ہم تجھے دنیا کی طرف پھیر دیں تو وہ کہتا ہے کہ طرف خانۂ ہموم و احزان کے؟ "بَلْ قَدِّمَا إِلَى اللّٰهِ" یعنی بلکہ تم تو مجھے اللہ کی طرف لے جاؤ۔ رہا کافر تو وہ اُس سے کہتے ہیں ہم تجھے پھیر دیں تو وہ کہتا ہے: ﴿ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صٰلِحًا ﴾[2] یہ حدیث مرسل ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جب انسان کو وفات حاضر ہوتی ہے تو اس کے لیے ہر شے، جو اس کو حق سے روکتی تھی، جمع کی جاتی ہے۔ پھر وہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کی جاتی ہے، پس وہ اس وقت یہ کہتا ہے: ﴿ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ اَعْمَلُ صٰلِحًا ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا کہ میں لا الہ الا اللہ کہوں گا۔[3]

﴿ فِيْمَا تَرَكْتُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس موضع میں جس کو میں نے ضائع کیا، یا منع کیا، یا جس میں میں نے ترکہ چھوڑا، وہ جگہ دنیا ہے، کیوں کہ اس نے دنیا کو چھوڑ دیا اور عقبیٰ کی طرف منتقل ہو گیا۔ غرض کہ جب اس نے رجوع کی تمنا کی، اس لیے کہ عمل کرے تو اللہ پاک نے اس بات کو اس پر ردع و زجر کے کلمے سے اس طرح رد فرمایا کہ ﴿ كَلَّا ﴾ یعنی ہرگز نہیں۔ ﴿ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ﴾ میں ضمیر ﴿ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴾ کی طرف راجع ہے، یعنی یہ کلمہ وہ ضرور کہے گا، اسے نہ چھوڑے گا، نہ اس سے سکوت کرے گا، اس لیے کہ حسرت و ندامت اس پر چھا رہی ہے، حالاں کہ بات یوں نہیں ہے جیسے وہ گمان کر رہا ہے کہ دنیا کی طرف رجوع کرنا اس کے لیے مان لیا جائے گا، یا معنی یہ ہیں کہ اگر اس کی یہ بات قبول ہو جائے تو اس سے یہ وعدہ پورا نہ ہو گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ ﴾ [الأنعام: ٢٨] ''اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا۔''

[1] فتح القدير (٣/ ٦٧٧۔ ٦٧٨) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٦٩) یہ روایت مرسل ہے۔ [3] الدر المنثور (٦/ ١١٥)

کسی نے کہا کہ ﴿هُوَ﴾ کی ضمیر اللہ پاک کی طرف راجع ہے، یعنی اس کی خبر میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے، حالاں کہ وہ ہم کو اس بات کی خبر دے چکا ہے کہ وہ مہلت نہیں دیتا ہے کسی نفس کو جبکہ اس کی اجل آجاتی ہے۔ ﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ﴾ کے معنی ہیں: "مِنْ أَمَامِهِمْ وَبَيْنَ أَيْدِيهِمْ" یعنی اُن کے آگے۔ ضمیر راجع ہے طرف احد کے، جمع معنی کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ "أَحَدٌ"، "كُلُّهُمْ" کے حکم میں ہے، جس طرح کہ پہلی ضمیروں میں مفرد لفظ کی وجہ سے لائے ہیں۔ برزخ کہتے ہیں: دو شے کے درمیان پردے کو۔ امام جوہری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ آیت کے معنی میں اختلاف ہے۔ امام ضحاک، مجاہد اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ موت اور بعث کے درمیان حاجز ہے۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: دونفخوں کے درمیان مدت کو حاجز کہتے ہیں، وہ مدت چالیس برس کا زمانہ ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: وہ اجل ہے۔[1] کسی نے کہا: ان کے اور دنیا کی طرف رجوع کے درمیان کی مدت۔ ﴿إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے۔ یہ دنیا کی طرف رجوع سے بالکل نا اُمید کرنا ہے، کیوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ بعث کے دن کسی طرح کی رجعت نہیں ہے دُنیا کی طرف اور اس میں جو رجوع ہے وہ ایسی زندگی کی طرف ہے جو آخرت میں ہوگی۔[2]

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَآ أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَآءَلُونَ ﴿١٠١﴾ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَٰزِينُهُۥ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٢﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَٰزِينُهُۥ فَأُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ فِى جَهَنَّمَ خَٰلِدُونَ ﴿١٠٣﴾ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ ٱلنَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَٰلِحُونَ ﴿١٠٤﴾

پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن نہ ان میں رشتے داریاں رہیں گی اور نہ وہ باہم سوال کریں گے (101) پھر جس کے پلڑے بھاری ہوگئے تو وہی فلاح پانے والے ہیں (102) اور جس کے پلڑے ہلکے ہوگئے تو وہی ہیں، جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے (103) آگ ان کے چہرے جھلس دے گی، اور وہ اس میں بدشکل ہوں گے (104)

صور میں پھونکنے اور اعمال کا وزن کرنے کا بیان:

بدشکل بننا یہ ہے کہ جلتے جلتے بدن سوج جائے گا، نیچے کا ہونٹ ناف تک اور اوپر کا کھوپڑی تک، اور زبان زمین میں گھسٹتی ہوگی، لوگ اس کو روندیں گے۔ انتھٰی۔ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ جس وقت نشور (قبروں سے اُٹھنے) کی پھونک صور میں پھونکی جائے گی اور لوگ قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے تو اس دن اُن میں ذاتیں نہ ہوں گی، نہ

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٧١) فتح القدير (٣/ ٦٧٨) [2] فتح البيان (٩/ ١٤٩۔ ١٥١)

حسب نسب نفع دیں گے، نہ اس دن ذات پات کچھ کام آئے گی، نہ باپ اپنے بیٹے پر رقت اور رحم کرے گا نہ اس پر متوجہ ہوگا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿10﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ﴾ [المعارج: ۱۰۔ ۱۱] ''اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کو نہ پوچھے گا۔ حالاں کہ وہ انھیں دکھلا بھی دیے جائیں گے۔'' یعنی کوئی قریب اپنے قریب کا حال نہ پوچھے گا، حالاں کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے، اگرچہ اس کے گناہوں کا بوجھ اس قدر ہو کہ اس کی پشت کو بوجھل کر دیا ہو، حالاں کہ دنیا میں وہ اس کو سب سے بڑھ کر عزیز تھا تو وہ اس کی طرف بالکل توجہ نہ کرے گا، نہ اس کے بوجھ میں سے مچھر کے پَر کے برابر بوجھ اپنے اوپر لادے گا۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿34﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿35﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴾ [عبس: ۳۴۔ ۳۶] ''اس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے۔ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے (بھی)۔'' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ اولین اور آخرین کو جمع فرمائے گا۔ پھر ایک پکارنے والا پکارے گا: خبردار! جس شخص کا کوئی مظلمہ یعنی دادخواہی ہو تو وہ آئے اور اپنا حق لے لے تو آدمی اس سے خوش ہوگا کہ اس کا اگر کوئی حق اپنے باپ پر یا بیٹے پر یا بیوی پر ہوگا، اگرچہ ذرا سا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا مصداق اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾[1] (رواه ابن أبي حاتم) امام احمد رحمہ اللہ نے مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرا ایک ٹکڑا ہے، مجھے تکلیف پہنچاتی ہے وہ شے جو اسے تکلیف پہنچاتی ہے، اور خوش کرتی ہے مجھے وہ شے جو اُسے خوش کرتی ہے، اور بے شک قیامت کے دن انساب منقطع ہو جائیں گے، مگر میرا نسب اور میرا سبب اور میرا صِہر[2] (سسرالی رشتہ)۔ اس حدیث کی اصل صحیحین میں ہے، جو مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرا ایک ٹکڑا ہے۔ «يُرِيبُنِي مَا رَابَهَا، وَيُؤْذِينِي مَا أَذَاهَا»[3]

امام احمد نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ اس منبر پر فرماتے تھے کہ ان آدمیوں کا کیا حال ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رِحم یعنی قرابت نفع نہ دے گی ان کی قوم کو۔ ہاں اللہ کی قسم ہے کہ میرا رحم دنیا اور آخرت میں موصول ہے، یعنی ملا ہوا قائم ہے اور اے لوگو! بے شک میں تمھارا میرِ سامان ہوں، جبکہ تم آؤ گے، ایک شخص بولے گا: یا رسول اللہ! میں فلاں فلاں کا بیٹا ہوں تو میں اس سے کہوں گا کہ نسب تو میں نے پہچان لیا، لیکن تم نے میرے بعد نئے کام نکالے اور تم اُلٹے پاؤں پھر گئے۔[4]

[1] الدر المنثور (٦/ ١١٧)
[2] مسند أحمد (٤/ ٣٢٣)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث ٤٩٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤٩)
[4] مسند أحمد (٣/ ١٨)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے مسند امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ میں متعدد طریقوں سے یہ بات ذکر کی ہے کہ جس وقت انھوں نے بی بی اُم کلثوم دختر امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا تو فرمایا سنو: واللہ! مجھے کوئی حاجت نہ تھی، مگر یہ کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ ہر سبب اور نسب یقیناً قیامت کے دن منقطع ہے، مگر میرا سبب اور میرا نسب۔ طبرانی، بزار، ہیثم بن کلیب اور بیہقی رحمہم اللہ نے اس کو روایت کیا ہے اور حافظ ضیاء رحمہ اللہ نے مختارہ میں۔ اور ذکر کیا ہے کہ اُن کی عظمت اور عزت کے لیے اُن کا مہر چالیس ہزار باندھا۔[1]

محمد بن عباد بن جعفر سے مروی ہے کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سنا، فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ہر نسب و صہر منقطع ہو گا، مگر میرا نسب اور میرا صہر۔ (رواه الحافظ ابن عساكر في ترجمة أبي العاص بن الربيع زوج زينب بنت رسول اللهﷺ من طريق أبي القاسم البغوي حدثنا سليمان بن عمر بن الأقطع حدثنا إبراهيم بن عبدالسلام عن إبراهيم بن يزيد عن محمد بن عباد و روى فيها من طريق عمار بن سيف عن هشام بن عرفة عن أبيه عن عبد الله بن عمرو مرفوعا سألت ربي عزوجل أن لا أتزوج إلى أحد من أمتي ولا يتزوج إلى أحد منهم إلا كان معي في الجنة فأعطاني ذلك و من حديث عمار بن سيف عن إسماعيل عن عبد الله بن عمرو)[2] (اصل میں یہاں بیاض ہے)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص کی نیکیاں اس کی برائیوں پر راجح ہوئیں، یعنی زیادہ بھاری ہوئیں، گو ایک ہی نیکی ہو۔ یہ قول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ ﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ تو وہی لوگ ہیں کہ مراد کو پہنچے، آگ سے نجات پائی اور جنت میں داخل کیے گئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ فَازُوْا بِمَا طَلَبُوْا مِنْ شَرٍّ مَا مِنْهُ هَرَبُوْا"[3] یعنی وہی لوگ ہیں کہ جس شے کی طلب کی اس کو پہنچے اور جس کی برائی سے بھاگے تھے، اس سے نجات پائی۔ ﴿ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴾ یعنی جس کی برائیاں بھاری ہوئیں اس کی نیکیوں پر تو یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جانوں کا نقصان کیا، یعنی نامراد ہوئے اور ہلاک ہو گئے اور صفقۂ خاسرہ کو پہنچے۔

حافظ ابوبکر بزار نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، کہا: بے شک اللہ کا ایک فرشتہ میزان پر مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابن آدم لایا جائے گا۔ پھر ترازو کے دونوں پلڑوں کے درمیان ٹھہرایا جائے گا، پھر اگر اس کی میزان بھاری ہوگئی تو ایک فرشتہ ایسی آواز سے پکارے گا کہ اسے تمام خلائق کو سنا دے گا اور کہے گا کہ فلاں نیک بخت ہوا، ایسی نیک بختی کہ اس کے بعد کبھی بد بخت نہ ہوگا اور اگر اس کی میزان ہلکی ہوگئی تو ایک فرشتہ ایسی آواز سے پکارے گا

---

[1] المعجم الكبير (٣/ ٤٥) كشف الأستار (٣/ ١١١) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٦٤) مسند الفارق لابن كثير (١/ ٣٨٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٣٦)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٤١) [3] تفسير الطبري (١/ ٢٥٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٤١)

کہ اسے تمام خلائق کو سنا دے گا اور کہے گا کہ فلاں بد بخت ہوا، ایسی بدبختی کہ اس کے بعد کبھی نیک بخت نہ ہوگا۔[1] اس کی اسناد ضعیف ہے، کیوں کہ داود بن محبر ضعیف متروک ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴾ یعنی وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، پھر کوچ نہ کریں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴾ [إبراهيم: ٥٠] ''اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپتی ہوگی۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٣٩] ''کاش! کافر اس وقت کو جان لیں جب وہ اپنے چہروں سے آگ نہیں ہٹا سکیں گے اور نہ اپنی پشتوں سے، اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک جب لوگ جہنم کے لیے ہانک کر لائے جائیں گے تو اُن کے سامنے جہنم کی لپٹ آئے گی اور ان کو ایک ایسی لپیٹ مارے گی کہ اُن کا سارا گوشت گل کر گر پڑے گا۔[2] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اُن کو ایک ایسی لپیٹ مارے گی کہ اُن کے گوشت ان کی ایڑیوں پر بہ جائیں گے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴾۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مراد ''عَابِسُوْنَ'' ہے، یعنی تیوری چڑھائے ہوئے ترش رو ہوں گے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ﴿ كٰلِحُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ فرمایا: کیا تو نے راس مشیّط کو نہیں دیکھا کہ اس کے دانت تو کھل جاتے ہیں اور اس کے ہونٹ برہم جستہ ہو جاتے ہیں۔[4] مطلب یہ ہی ہے کہ جس طرح بکری کی سری بھوننے اور جلانے کے بعد صورت ہو جاتی ہے اسی طرح اُن کی صورت ہو جائے گی۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ﴿ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴾ فرمایا کہ آگ اس کو بھون دے گی تو اس کا اوپر کا ہونٹ چڑھ جائے گا، یہاں تک کہ سر کے وسط تک پہنچ جائے گا اور نیچے کا ہونٹ لٹک پڑے گا، یہاں تک کہ اس کی ناف کو پہنچے گا۔[5] (ورواه الترمذي عن سويد بن نصر عن عبدالله بن المبارك به وقال: حسن غريب) كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ﴾ کہا ہے کہ اس سے مراد پہلا نفخہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] مسند البزار (١٣/ ٣٣٠) اس کی سند میں ''صالح مری اور داود بن محبر'' سخت ضعیف راوی ہیں۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢/ ٢٢٤)

[2] المعجم الأوسط (٩/ ١٤٤) اس کی سند میں ''محمد بن سلیمان اصبہانی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٣٠٢)

[3] الدر المنثور (٦/ ١١٧) [4] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧)

[5] مسند أحمد (٣/ ٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٤٠۔ ٣٤٢) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب (٢/ ٢٣٨)

اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا: دوسرا نفخہ ہے، یہ قول سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے۔[1] یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ یہ وہی نفخہ ہے جو بعث ونشور کے درمیان ہوگا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جس وقت اجساد میں اُن کی روحیں پھونکی جائیں گی۔ یہ قول اس بنا پر ہے کہ صور صورت کی جمع ہو، قرن مراد نہ ہو۔ اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن رحمہ اللہ کی قراءت دال ہے، کیوں کہ انھوں نے "فِي الصُّوَرِ" بفتح واو مع ضم صاد پڑھا ہے، جمع "صورة" کی۔ ابو رزین نے بفتح صاد و واو پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت بضم صاد اور سکونِ واو ہے۔ صور وہ قرن ہے جس میں پھونکا جائے گا۔[2]

﴿ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ ﴾ "أنساب" جمع ہے نسب کی۔ نسب کہتے ہیں قرابت کو، یعنی اس دن انساب کے ساتھ فخر نہ کریں گے، یا ان کو نفع نہ دیں گے، اس لیے کہ باہم رحمت وعطوفت اس دن زائل ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ جس دن وہ حیرت اور دہشت میں مبتلا ہوں گے، اس کی وجہ سے انساب کو یاد نہ کریں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ یعنی بعض بعض سے انساب کا حال نہ پوچھے گا، کیوں کہ وہ تو اس وقت بڑے مشاغل میں مشغول ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ دوسری آیت میں اس طرح آیا ہے: ﴿ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [الصافات: ٢٧] "اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم پوچھیں گے۔" یہ آیت آیتِ باب کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ یہ اس پر محمول ہے کہ قیامت کے دن مواقف مختلف ہوں گے۔ لہٰذا آپس میں بات چیت کا اثبات بعض مواقف کے لیے ہے اور اس کی نفی دوسرے مواقف کے لیے ہے، چناں چہ اس کے نظائر میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس وقت صور میں پھونکا جائے گا تو کوئی زندہ باقی نہ رہے گا، مگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ۔ یہ بھی اُن سے مروی ہے کہ کسی نے اُن سے اس کا اور ﴿ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ ... الخ﴾ کا حال پوچھا تو فرمایا کہ قیامت کے کئی مواقف ہیں۔ لہٰذا ایک موقف وہ ہے کہ باہم ان کے انساب نہ ہوں گے، نہ باہم سوال کریں گے۔ پس صعقۂ اولیٰ کے وقت باہم ان کے انساب نہ ہوں گے، جب بے ہوش ہو جائیں گے، پھر جب نفخۂ آخرہ ہوگا تب ہی وہ کھڑے ہوئے باہم سوال کریں گے۔ یہ بھی اُن سے مروی ہے کہ کسی نے ان سے ان دو آیتوں کا حال پوچھا تو فرمایا کہ یہ نفخۂ اولیٰ میں ہے، جبکہ زمین پر کوئی شے باقی نہ رہے گی اور وہ جب ہے کہ جنت میں داخل ہوں گے تو بعض اُن کا بعض پر متوجہ ہوگا باہم سوال کریں گے۔[3]

﴿ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴾ میں موازین سے مراد اس کے اعمالِ صالحہ میں سے وہ ہیں جن کا وزن کیا جائے گا، پس موازین موزون کی جمع ٹھہرے گی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میزان کی جمع ہو۔ رہی یہ بات کہ میزان ایک ہے پھر جمع لانے کی کیا وجہ ہے؟ لہٰذا وجہ یہ ہے کہ وزن کی جانے والی چیزوں کی تعداد کے سبب سے جمع کا صیغہ ذکر کیا ہے۔

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٧١۔ ٧٢) [2] فتح القدير (٣/ ٦٧٨) [3] تفسير الطبري (١٩/ ٧١) الدر المنثور (٦/ ١١٦۔ ١١٧)

پس اوّل کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ جس شخص کے عمل بھاری ہوئے جو ترازو سے تولے گئے ہیں۔ ﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ پس وہی لوگ ہیں اپنا پسندیدہ مقصد حاصل کرنے والے اور جن چیزوں کا خوف رکھتے تھے اُن سے نجات پانے والے۔ ﴿ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾ یعنی اور جس کے عملِ صالح ہلکے نکلے، پس وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جانوں کو ضائع کیا اور جو شے اُن کو نافع ہوتی اس کو ترک کیا۔ ﴿ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴾ بدل ہے صلۂ موصول سے یا ''أُولٰئِكَ'' کی خبر ثانی ہے۔ اس آیت کی تقریر پورے طور پر گزر چکی ہے، اس لیے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴾ جملہ مستانفہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حال کی بنا پر محلِ نصب میں ہو۔ یا یہ ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ کی دوسری خبر ہے۔ ''لفح'' کہتے ہیں جلانے کو۔ جب آگ کسی شے کو جلا دیتی ہے تو عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: ''لَفَحَتْهُ النَّارُ'' یعنی آگ نے اس کو جلا دیا اور ضرب کے معنی بھی ہیں۔ جب کوئی کسی کو تلوار سے مارے تو کہتے ہیں: ''لَفَحَهُ بِالسَّيْفِ'' یعنی تلوار سے اس کو مارا۔ کسی نے کہا: لفح زیادہ سخت ''نفح'' کو کہتے ہیں، کیوں کہ ''لفح'' شدت کے ساتھ پہنچنا ہے اور ''نفح'' صرف پہنچنے کو کہتے ہیں۔ (صراح میں کہا ہے کہ ''لفح سوختن گرما و آتش وسموم'' قال الأصمعي: ''ما كان من الريح لفح فهو حر وما كان نفح فهو برد''[1]) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ ﴾ [الأنبياء: ٤٦] ''اور البتہ اگر انھیں آپ کے رب کے عذاب کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی چھو جائے۔'' خاص کر وجوہ کا ذکر اس لیے کیا کہ وجوہ تمام اعضا سے شریف تر ہیں۔ کسی نے کہا: ﴿ تَلْفَحُ ﴾ کا معنی ''تَسْفَعُ'' ہیں۔ (''سفع'' کہتے ہیں: سوختن آتش و بادِ گرم روے را وگردانیدن رنگ را۔) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''تَنْفَحُ''[2] معنی یہ ہیں کہ آگ اُن کے منہ کو جلا دے گی اور اس کے رنگ روپ کو بگاڑ دے گی، یا اُن کے منہ کو مارے گی، یا اُن کے منہ کو لگے گی۔

جملہ ﴿ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴾ بنا برحال محلِ نصب میں ہے، یعنی حال یہ ہے کہ وہ اس میں بدشکل ہو رہے ہیں۔ ''کالح'' وہ ہے جس کے ہونٹ سمٹ گئے ہوں اور دانت کھلے ہوں۔ امام زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[3] ''دَهْرٌ كَالِحٌ'' زمانۂ سخت کو کہتے ہیں۔ اہلِ لغت نے کہا ہے کہ ''اَلْكُلُوْحُ: تَكَشُّرٌ فِيْ عُبُوْسٍ''۔ یعنی کلوح دانتوں کا ترش روئی میں کھلنا ہے، اس کا باب خضع ہے، اسی باب سے کلوحِ اسد ہے، یعنی شیر کے دانت کھولنے کو بھی کلوح بولتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''اَلْكُلُوْحُ: تَقَطُّبُ الْوَجْهِ'' ہے، یعنی ترش رو، چیں بہ ابرو ہونا۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''كَلَحَ الرَّجُلُ كُلُوْحًا وَّكَلَاحًا''

---

[1] مختار الصحاح (١/ ٦١٢) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٧٣) [3] معاني القرآن (٤/ ٢٣)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے دوسرے الفاظ ﴿ كٰلِحُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں یہ ہیں: "كُلُوْحٌ: اَلرَّأْسُ النَّضِيْجُ، بَدَتْ أَسْنَانُهُمْ وَتَقَلَّصَتْ شِفَاهُهُمْ"[1] یعنی اس کی صورت ایسی جلی بھنی ہوگی، جیسے بکری کی سری پکی ہوئی، اُس کے دانت کھلے ہوں گے اور ہونٹ سمٹ گئے ہوں گے۔ غرض کہ دوزخ والوں کی صفت میں اور جو کچھ وہ کہیں گے اور جو کچھ اُن سے کہا جائے گا، ان سب کے بارے میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جو کتبِ حدیث میں معروف ومشہور ہیں۔[2] سیدنا ابو الوفا الصدیق رحمہ اللہ نے کتاب "يقظة أولي الأبصار" میں ان حدیثوں کو جمع فرمایا ہے۔ جزاه الله خيرا۔ یہ کتاب نار واہلِ نار کے حال کے بارے میں بے نظیر ہے۔

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٠٥﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿١٠٧﴾

(کہا جائے گا:) کیا تم پر میری آیات تلاوت نہیں کی جاتی تھیں، پھر تم ان کو جھٹلا دیا کرتے تھے؟ (105) وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آ گئی، اور (واقعی) ہم لوگ گمراہ تھے (106) اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال، پھر اگر ہم لوٹیں (دوبارہ وہی کریں) تو بلاشبہہ ہم ظالم ہوں گے (107)

اہلِ نار کی سرزنش کا بیان:

یہ اللہ پاک کی طرف سے اہلِ نار کو زجر وتوبیخ اور ڈانٹ دھمکانا ہے، اس کفر اور گناہوں اور محارم وعظائم پر، جن کے وہ مرتکب ہوئے اور جنھوں نے اُن کو اس بلا میں ہلاک کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی میں نے تمھاری طرف رسول بھیجے، تمھاری طرف کتابیں نازل کیں، تمھارے شبہوں کو زائل کیا، تمھارے لیے کوئی حجت باقی نہ رہی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ [النساء: ١٦٥] "تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کو الزام دینے کی کوئی گنجایش نہ رہے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥] "اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں۔"

نیز فرمایا: ﴿ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ﴿٨﴾ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧) الدر المنثور (٦/ ١١٨)
[2] فتح البيان (٩/ ١٥١۔ ١٥٤)۔

فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ۝ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴾ [الملك: ۸۔ ۱۱] ''قریب ہے کہ وہ غیظ وغضب سے پھٹ پڑے۔ جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے: کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں! یقیناً ڈرانے والا ہمارے پاس آیا تھا، چناں چہ ہم نے (اس ڈرانے والے کی) تکذیب کی اور ہم نے کہا کہ اللہ نے (کسی پر) کچھ بھی نہیں اُتارا، تم تو بہت بڑی گمراہی میں ہو۔ اور وہ کہیں گے: کاش ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔ پھر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے، چناں چہ دوزخ والوں پر لعنت ہے۔'' اسی لیے اہلِ نار نے یہ کہا کہ ﴿ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ ﴾ یعنی یقیناً ہم پر حجتیں قائم ہو چکیں، لیکن ہم زیادہ تر کمبخت تھے، اس سے کہ ہم اُن کے مطیع اور فرماں بردار ہوتے، ان کی پیروی کرتے۔ لہٰذا ہم اُن سے گمراہ ہوگئے اور وہ ہم کو نہ ملیں۔

دوزخیوں کی دنیا میں دوبارہ لوٹائے جانے کی درخواست:

پھر بولے: ﴿ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا ... الخ﴾ یعنی تو ہم کو دنیا کی طرف پھیر دے، پھر اگر ہم دوبارہ وہی کام کریں، جو ہم سے پہلے ہو چکے تو بے شک ہم سزا کے مستحق ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ ﴾ [المؤمن: ۱۱۔ ۱۲] ''تو ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، پھر کیا (اس عذاب) سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ (فرمایا جائے گا:) تمھیں یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ بلاشبہہ جب تنہا اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم (اس کی توحید کا) انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم (اس شرک کو) مان لیتے تھے، اب حکم تو اللہ ہی کا ہے جو نہایت برتر اور بہت بڑا ہے۔'' یعنی خروج کی طرف کوئی راہ نہیں ہے، کیوں کہ تم نے تو اللہ کے ساتھ شرک کیا، جبکہ مومنین نے اس کی توحید کی۔[1] كذا قال الحافظ ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیات سے مراد قرآن شریف کے قوارع اور زواجر ہیں، یعنی قرآن پاک کے مضامین جو کہ کفر اور نافرمانیوں سے روکنے والے تھے۔ دنیا میں اُن سے تم کو خوف دلایا جاتا تھا، مگر تم اُن کی تکذیب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ جملہ ﴿ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا ﴾ مستانفہ ہے، معنی یہ ہیں کہ ہماری لذتیں، شہوتیں اور خواہشیں ہم پر غالب ہوگئیں۔ لذت وشہوت کا نام شقوت اس لیے رکھا کہ اس کا انجام

[1] تفسير ابن كثير (۳/ ۳٤۲)

شقا (بدبختی) کی طرف ہوتا ہے۔ اہلِ مدینہ وابوعمرو وعاصم نے ﴿ شِقْوَتُنَا ﴾ پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت "شَقَاوَتُنَا" ہے۔ یہ قراءت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے۔[1]

"شقوت و شقاوت" دونوں مصدر ہیں اور ان کے معنی سوئے عاقبت ہیں، یعنی انجامِ بد کو شقاوت کہتے ہیں اور شقا سعادت کی ضد ہے، نیز اس کے معنی سختی وتنگی ہیں۔ ﴿ وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴾ یعنی ہم شقاوت کے سبب سے ہدایت سے گمراہ تھے، کیوں کہ وہ اسی بدبختی کی وجہ سے حق اور صحیح راستے سے گمراہ ہوئے۔ پھر وہ بات طلب کی جو مانی نہ جائے گی، چنانچہ بولے کہ اے رب! تو ہم کو آگ سے نکال لے۔ پھر جس کفر، تکذیب اور عدمِ ایمان پر ہم قائم دائم تھے، اس کی طرف اگر لوٹیں تو ہم اس لوٹنے کے سبب سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔[2]

قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ
عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ
خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ
ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا
صَبَرُوْۤا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اللہ فرمائے گا: اسی (جہنم) میں ذلیل وخوار (پڑے رہو) اور مجھ سے کلام نہ کرو ﴿۱۰۸﴾ بے شک میرے بندوں میں ایک گروہ تھا جو کہتے تھے: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، لہٰذا تو ہماری مغفرت فرما اور ہم پر رحم کر اور تو ہی سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے ﴿۱۰۹﴾ پھر تم نے انھیں ہنسی مذاق بنا لیا تھا، حتی کہ انھوں نے تمھیں میری یاد بھلا دی تھی اور تم ان پر ہنسا کرتے تھے ﴿۱۱۰﴾ بلاشبہ میں نے آج انھیں ان کے صبر کا بدلہ دے دیا ہے کہ بے شک وہی کامیاب ہیں ﴿۱۱۱﴾

جہنمیوں کی درخواست اور اللہ تعالیٰ کا جواب:

یہ اللہ پاک کی طرف سے کافروں کو اس کا جواب ہے جو انھوں نے آگ سے نکلنے اور دنیا کی طرف لوٹائے جانے کا سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾ "أَيْ: امْكُثُوْا فِيْهَا صَاغِرِيْنَ مُهَانِيْنَ أَذِلَّاءَ" یعنی تم اس میں حقیر وخوار اور ذلیل ہو کر پڑے رہو۔ ﴿ وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾ یعنی پھر تم ایسا سوال مت کرنا، کیوں کہ میرے پاس تمھارے لیے کوئی جواب نہیں ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب اُن کا کلام اس سے منقطع ہوا تو رحمان نے اُن کو یہ جواب دیا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما

[1] تفسیر القرطبي (۱۲/ ۱۵۳) [2] فتح البیان (۹/ ۱۵۴)

سے روایت کیا ہے کہ جہنم والے مالک کو پکاریں گے تو وہ چالیس برس اُن کو جواب نہ دے گا۔ پھر اُن کو یہ جواب دے گا: ﴿ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٧٧] یعنی یقینی طور پر تم پڑے رہنے والے ہو۔ کہا کہ ان کا پکارنا خوار ہوا، اللہ مالک پر اور رب مالک پر۔

پھر وہ اپنے رب کو پکاریں گے تو کہیں گے: ﴿ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا... الخ﴾ کہا کہ وہ ان سے سکوت کرے گا اتنی مدت تک جتنی دو بار دنیا کی مدت ہوتی ہے۔ پھر اُن کو یہ جواب دے گا: ﴿ اِخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾ کہا: "فَوَاللّٰهِ مَا أَيْئَسَ الْقَوْمُ بَعْدُ بِكَلِمَةٍ وَّاحِدَةٍ وَّمَا هُوَ إِلَّا الزَّفِيْرُ وَالشَّهِيْقُ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ" یعنی قسم ہے اللہ کی! کیا نا اُمیدی ہوگی ان لوگوں کی اس کے بعد، ایک کلمے کے سبب سے اور وہ دوزخ کی آگ میں زفیر اور شہیق ہے۔ کہا کہ ان کی آوازوں کو گدھوں کی آوازوں سے تشبیہ دی گئی کہ ان کا اول زفیر ہے اور آخر ان کا شہیق ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جبکہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرے گا کہ وہ دوزخیوں میں سے کسی کو نہ نکالے، یعنی دوزخ میں سے تو اُن کے چہروں اور رنگوں کو بدل دے گا۔ پس مومنین میں سے ایک شخص آئے گا، پھر وہ شفاعت کرے گا اور کہے گا: اے رب! اللہ پاک فرمائے گا، جو شخص دوزخ میں کسی کو پہچانے تو وہ اسے نکال لے۔ پس مومنین سے وہ شخص آئے گا اور نظر کرے گا تو کسی کو نہ پہچانے گا تو اس کو ایک شخص پکارے گا: اے فلاں! میں فلاں شخص ہوں تو وہ کہے گا: میں تجھے نہیں پہچانتا ہوں، کہا: تو اس وقت آگ میں وہ لوگ کہیں گے: ﴿ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴾۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ﴿ اِخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾ چنانچہ جب یہ فرمائے گا تو آگ اُن پر بند کر دی جائے گی۔ پھر اُن میں سے کوئی بھی نہ نکالا جائے گا۔[1] پھر کفار نے دنیا میں جو گناہ کیے تھے اور اللہ پاک کے بندوں سے اور اس کے دوستوں سے مذاق کیا کرتے تھے، اللہ پاک نے ان کو اس کی یاد دلائی۔

اللہ کے موحد بندوں کا مذاق اڑانے والوں کا انجام:

لہٰذا ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝١٠٩ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا ﴾ یعنی وہ جو مجھے پکارتے تھے اور میری طرف تضرع وزاری کرتے تھے، لہٰذا تم نے اُن سے ٹھٹھا کیا۔ ﴿ حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ ﴾ یعنی یہاں تک کہ اُن کی دشمنی تمھارے لیے اس کا باعث ہوئی کہ تم میرے معاملے کو بھول گئے۔ ﴿ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴾ یعنی تم ان کے کام اور عبادت سے ہنستے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝٢٩ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴾ [المطففين: ٢٩۔ ٣٠] "بلاشبہ مجرم لوگ (دنیا میں) مومنوں پر ہنستے تھے۔ اور جب وہ ان (مسلمانوں) کے پاس سے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٩۔ ٢٥٠٨)

گزرتے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے۔“

یعنی استہزا کے طریقے سے اُن کے عیب نکالتے تھے، اُن کی غیبت کرتے، آنکھ سے اُن کی طرف اشارہ کرتے۔ پھر اللہ پاک نے خبر دی اس چیز کی جس کے ساتھ اس نے اپنے دوستوں اور اپنے صالح بندوں کو جزا دی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ یعنی انھوں نے جو تمھاری ایذا اور استہزا پر صبر کیا، میں نے ان کے صبر کی وجہ سے آج کے دن ان کو یہ جزا دی کہ انہیں کو سعادت و سلامتی اور جنت کا مستحق اور آگ سے نجات کی مراد پانے والے کیا۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے دنیا کی مدت سے دوگنا مدت گزر جانے کے بعد مالک (داروغۂ جہنم) کی زبان سے کہلوایا۔ بعض نے کہا ہے کہ دنیا کی مقدار سات ہزار سال ہے، سات سیاروں کی تعداد کے برابر۔ کسی نے کہا ہے کہ بارہ ہزار برس ہے، برجوں کی تعدداد کے برابر۔ کسی نے کہا ہے کہ تین سو ساٹھ برس، سال کے ایام کی تعداد کے برابر۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے تذکرہ میں اس کو ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں تحقیق وہ ہے جو ”لقطة العجلان“ (نواب صاحب رحمہ اللہ کی تالیف) میں تحریر فرمائی ہے۔ غرض کہ ایک بڑی مدت کے بعد وہ کتنی ہی ہو اللہ پاک نے اُن کو جواب دیا کہ تم چپ رہو، جہنم میں ذلت اور خواری میں پڑے رہو۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”خسأ“ کسی کو کراہت کے ساتھ دور کرنے کو کہتے ہیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم دور ہو جاؤ دور ہونا خفگی کا اور دور ہو جاؤ دور ہونا کتے کا۔[2] اس بنا پر معنی یہ ہیں کہ تم جہنم میں دور ہو جاؤ، جس طرح کتے سے کہتے ہیں: ”اِخسأ“ یعنی دور ہو۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”خَسَأْتُ الْكَلْبَ خَسْأً“ یعنی ہنکایا میں نے کتے کو ہنکانا۔ غرض کہ ”خسأ“ کے معنی دور کرنے کے ہیں۔ ﴿ وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾ یعنی تم مجھ سے بات مت کرو اپنے آگ سے نکالنے کے متعلق، یا دنیا کی طرف لوٹائے جانے کے متعلق، یا تم سے عذاب ہٹانے کے متعلق کوئی بات نہ کرو۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ تم بالکل مجھ سے مت بولو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ آخری بات ہے جو اہلِ نار کریں گے، اس کے بعد اُن کی چیخ و پکار اور کتے کی طرح بھونکنے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔[3] نعوذ بالله من النار ومن أصحاب النار.

غرض کہ اللہ پاک نے آگ سے نکلنے کی درخواست کرنے سے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔ پھر اس کی یہ وجہ بیان فرمائی: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ ﴾ عباد سے مراد مومنین ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ صحابہ مہاجرین ہیں۔ ان میں سے بلال، صہیب، عمار اور خباب رضی اللہ عنہم ہیں۔ جمہور نے ﴿ اِنَّهٗ ﴾ بکسر ”إِنَّ“ پڑھا ہے بنا بر استیناف تعلیلی کے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٤٢۔ ٣٤٣) [2] فتح القدير (٣/ ٦٧٩) [3] تفسير البغوي (٥/ ٤٣٠۔ ٤٣١)

سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ نے بفتح "أَنَّهُ" پڑھا ہے۔[1] معنی یہ ہیں کہ تم مجھ سے اپنے نکالنے کے بارے میں بات مت کرو، اس لیے کہ میرے بندوں میں سے ایک گروہ یوں کہتا تھا کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو رحم کرنے والوں کا بہترین رحم کرنے والا ہے۔ محط تعلیل کا، یعنی جس بات پر تعلیل کا اُتار ہوتا ہے، وہ یہ ہے:

﴿ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا ﴾ پس تم نے اُن کو ٹھٹھوں میں پکڑا۔ نافع وحمزہ وکسائی نے بضم سین پڑھا ہے۔ باقی قراء نے بکسرِ سین پڑھا ہے۔ یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ امام ابوعمرو نے دونوں میں فرق کیا ہے۔ لہٰذا کسرے کو "ھزو" کی جہت سے ٹھہرایا ہے اور ضمہ کو جہتِ "سخرہ" سے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: اس فرق کو نہ خلیل پہچانتے ہیں، نہ سیبویہ، نہ کسائی اور نہ فراء رحمہم اللہ۔ امام کسائی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ کسرہ بہ معنی استہزاء وسخریہ بالقول کے ہے اور ضمہ بہ معنی تسخیر واستبعاد بالفعل کے۔[2]

﴿ حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ ﴾ یعنی تم نے ان کو یہاں تک ٹھٹھوں میں پکڑا کہ انھوں نے تم کو میری یاد بھلا دی، کیوں کہ استہزاء میں ایسے سخت مشغول ہوئے کہ اللہ کی یاد کو بھول گئے۔ ﴿ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴾ اور تم دنیا میں ان سے ہنستے رہے۔ معنی یہ ہیں: یہاں تک کہ تم میری یاد کو بھول گئے، تمھارے ہنسی اور مذاق میں مشغول ہونے کی وجہ سے۔ اس کی نسبت عباد مومنین کی طرف اس لیے کی کہ وہ اس کے سبب ہوئے۔ ﴿ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا ﴾ جملۂ مستانفہ ہے جو تقریرِ ماسبق کے لیے لایا گیا ہے۔ اس میں مومنین کے اچھے حال کا بیان ہے۔ حرفِ با سببیہ ہے۔ ﴿ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ﴾ امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے بکسرِ ہمزہ پڑھا ہے بنا بر استیناف، باقی قراء کی قراءت بالفتح ہے، یعنی "لِأَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُوْنَ"[3] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ منصوب ہو اس بنا پر کہ فعل کا مفعول ثانی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کہے کہ مومنوں سے جو ہنسی کی گئی اس کی اُن کو کیا جزا ملی؟ تو فرما دیا کہ میں نے اُن کو آج کے دن اُن کے صبر کے سبب سے یہ جزا دی کہ مراد پانے والے وہی ہیں اور اُن سے ہنسی کرنے والے ابدالآباد دوزخ میں پڑے رہیں گے۔

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا
لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا
وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

اللہ فرمائے گا: زمین میں تم کتنے سال رہے؟﴿112﴾ وہ کہیں گے: ہم ایک دن یا دن کا بھی کچھ

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٤/ ٢٦٤) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ١٥٤_ ١٥٥) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ١٥٥)

حصہ رہے، گنتی کرنے والوں سے پوچھ لیجیے ﴿113﴾ اللہ فرمائے گا: واقعی تم (وہاں) تھوڑا سا وقت ہی رہے، کاش! تم (یہ بات دنیا میں) جانتے ہوتے ﴿114﴾ کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے ﴿115﴾ چناں چہ بلند و بالا اللہ حقیقی بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ معزز و مکرم عرش کا رب ہے ﴿116﴾

روزِ قیامت زندگانیِ دنیا کے چھٹاپے کا احساس:

گنتی والوں سے پوچھ لیجیے، یعنی فرشتوں سے جنھوں نے نیکی اور بدی گن رکھی ہے یہ بھی گنا ہوگا۔ زمین میں رہنا، یعنی قبر میں رہنا، یا دنیا کی عمر، یہ سبھی وہاں تھوڑی نظر آئے گی۔ یہ پوچھنا اس لیے کہ دنیا میں عذاب کی جلدی کرتے تھے۔ اب یہ جان لیا کہ جلدی ہی آیا۔ یعنی دنیا میں تو نیکی اور بدی کا اثر نہیں ملتا، اگر دوسرا دن نہ ہو بدی کا تو یہ سب کھیل تھا۔ انتہٰی.

انھوں نے جو دنیا کی تھوڑی عمر میں اللہ سبحانہ کی اطاعت اور توحید کو ضائع کیا تو اللہ پاک انھیں اس سے آگاہ کرتا ہے، اگر وہ دنیا کی تھوڑی مدت میں صبر کرتے تو مراد پاتے، جس طرح کہ اس کے اولیائے متقین نے مراد پائی۔ فرمایا: دنیا میں تم کتنی مدت ٹھہرے؟ بولے: ایک دن رہے یا دن سے کم، تو حساب کرنے والوں سے پوچھ لے۔ ﴿قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ فرمایا: ہر تقدیر پر تم ذرا سی مدت رہے۔ ﴿لَوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی اگر تم جانتے، تو دنیائے فانی کو باقی رہنے والی زندگی، یعنی آخرت پر اختیار نہ کرتے اور نہ اپنی جان کے لیے یہ بری کمائی کرتے، نہ اس ذرا سی مدت میں اللہ پاک کی طرف سے اس کے غصے کے مستحق ہوتے۔

پھر اگر تم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طاعت و عبادت پر صبر کرتے، جیسا کہ مومنوں نے کیا تو تم مراد کو پہنچتے، جس طرح وہ پہنچے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے صفوان سے روایت کیا ہے۔ صفوان نے اَیفع بن عبد الکلاعی رحمہ اللہ سے سنا کہ وہ لوگوں کو خطبہ سنا رہے تھے۔ اَیفع نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اللہ جس وقت اہلِ جنت کو جنت میں اور اہلِ نار کو نار میں داخل کر چکے گا تو فرمائے گا: اے جنت والو! تم برسوں کے حساب سے زمین میں کتنا عرصہ رہے؟ تو وہ عرض کریں گے کہ ہم دن بھر رہے یا دن سے بھی کچھ کم۔ فرمائے گا: «لَنِعْمَ مَا اتَّجَرْتُمْ فِيْ يَوْمٍ أَوْ بَعْضِ يَوْمٍ رَحْمَتِيْ وَرِضْوَانِيْ وَجَنَّتِيْ، امْكُثُوْا فِيْهَا خَالِدِيْنَ مُخَلَّدِيْنَ» یعنی تم نے دن بھر میں یا دن کے کچھ حصے میں میری رحمت اور میری مرضی اور میری جنت کی کیا خوب تجارت کی، تم اس میں ہمیشہ کے لیے رہ پڑو۔ پھر فرمائے گا: اے دوزخ والو! تم زمین میں برسوں کے حساب سے کتنا رہے؟ وہ عرض کریں گے کہ دن بھر یا دن سے کچھ کم۔ پس فرمائے گا کہ تم نے ایک دن یا دن کے کچھ حصے میں میری آگ اور میرے غصے کی کیا بری تجارت کی، اب تم اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پڑے رہو۔[1]

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥١١)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بے کار پیدا نہیں کیا:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا ﴾ یعنی پھر کیا تم نے یہ گمان کیا کہ تم عبث پیدا کیے گئے کہ تم سے نہ کوئی قصد ہو نہ کچھ ارادہ، نہ تمھارے بنانے میں ہماری کوئی حکمت تھی۔ کسی نے کہا: ﴿ عَبَثًا ﴾ کے معنی "لِلْعَبَثِ" ہیں، یعنی کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تم کو اس لیے بنایا ہے کہ تم لعب اور عبث کرو، جس طرح کہ چوپائے پیدا کیے گئے ہیں کہ اُن کے لیے نہ کچھ ثواب ہے نہ سزا، حالاں کہ ہم نے تو تم کو عبادت کے لیے اور اللہ کے احکام کو قائم کرنے کے لیے بنایا ہے۔

﴿ وَاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی اور کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ تم پچھلے گھر میں عود نہ کرو گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴾ [القیامة: ٣٦] "کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی بے کار (بلا حساب کتاب) چھوڑ دیا جائے گا؟" یعنی "هَمَلًا"۔ ﴿ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ﴾ یعنی اللہ پاک متقدس وپاک و برتر ہے، اس بات سے کہ کوئی شے عبث پیدا کرے، کیوں کہ وہ تو سچا بادشاہ ہے، جو عبث سے پاک ومبرا ہے۔ ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴾ عرش کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ ساری مخلوقات کا چھت ہے اور اس کا یہ وصف فرمایا کہ وہ کریم ہے، یعنی "حَسَنُ الْمَنْظَرِ بَهِيُّ الشَّكْلِ" ہے، یعنی خوبصورت نورانی شکل ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴾ [لقمان: ١٠] "پھر ہم نے اس (زمین) میں ہر قسم کی نفیس اور عمدہ چیزیں اُگائیں۔"

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے آلِ سعید بن العاص کے ایک شخص سے روایت کیا ہے کہ آخری خطبہ جو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے سنایا یہ ہے کہ اللہ پاک کی حمد وثنا کی۔ پھر کہا: "أَمَّا بَعْدُ! أَيُّهَا النَّاسُ أَنَّكُمْ لَنْ تُخْلَقُوْا عَبَثًا" (اصل میں کلمہ "لَنْ" ہے ظاہر "لم" تھا، شاید آیندہ کے لوگوں کی تحذیر کے لیے "لَنْ" فرمایا۔ واللہ أعلم) "وَلَنْ تُتْرَكُوْا سُدًى، وَإِنَّ لَكُمْ مَعَادًا يَنْزِلُ اللّٰهُ فِيْهِ لِلْحُكْمِ بَيْنَكُمْ، وَيَفْصِلُ بَيْنَكُمْ، فَخَابَ وَخَسِرَ وَشَقِيَ عَبْدٌ أَخْرَجَهُ اللّٰهُ مِنْ رَّحْمَتِهِ وَحُرِمَ جَنَّةً عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ، أَلَمْ تَعْلَمُوْا أَنَّهُ لَا يَأْمَنُ عَذَابَ اللّٰهِ غَدًا إِلَّا مَنْ حَذِرَ هَذَا الْيَوْمَ وَخَافَهُ وَبَاعَ نَافِذًا بِبَاقٍ، وَّقَلِيْلًا بِكَثِيْرٍ، وَخَوْفًا بِأَمَانٍ، أَمَا تَرَوْنَ أَنَّكُمْ مِنْ أَصْلَابِ الْهَالِكِيْنَ وَسَتَكُوْنُ بَعْدَكُمْ لِلْبَاقِيْنَ حَتّٰى تُرَدُّوْنَ إِلَى خَيْرِ الْوَارِثِيْنَ، ثُمَّ إِنَّكُمْ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ تُشَيِّعُوْنَ غَادِيًا وَّرَائِحًا إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ قَضٰى نَحْبَهُ وَانْقَضٰى أَجَلُهُ حَتّٰى تُغَيِّبُوْهُ فِيْ صَدْعٍ مِنَ الْأَرْضِ، فِيْ بَطْنِ صَدْعٍ غَيْرِ مُمَهَّدٍ وَّلَا مُوَسَّدٍ، قَدْ فَارَقَ الْأَحْبَابَ، وَبَاشَرَ التُّرَابَ، وَوَاجَهَ الْحِسَابَ، مُرْتَهَنٌ بِعَمَلِهِ، غَنِيٌّ عَمَّا تَرَكَ، فَقِيْرًا إِلَى مَا قَدَّمَ، فَاتَّقُوا اللّٰهَ عِبَادَ اللّٰهِ قَبْلَ انْقِضَاءِ مَوَاثِيْقِهِ، وَنُزُوْلِ الْمَوْتِ بِكُمْ"

پھر اپنی چادر کا کنارہ اُٹھا کر اپنے چہرے پر رکھا اور روئے اور آس پاس کے لوگوں کو رُلایا۔[1] خطبہ کا ترجمہ یہ ہے: ''أما بعد'' لوگو! بے شک تم ہرگز عبث نہیں بنائے گئے ہو، نہ ہرگز تم مہمل چھوڑے گئے ہو، یقیناً تمھارے لیے ایک معاد ہے کہ اللہ تمھارے درمیان حکم کرنے اور تمھارے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے اس میں نازل ہوگا۔ چنانچہ جس بندے کو اللہ پاک نے اپنی رحمت سے نکالا تو وہ نا اُمید ہوا، زیاں کار ہوا، بدبخت ہوا اور ایسی جنت سے محروم ہوا، جس کی چوڑائی آسمان و زمین ہے۔ کیا تم نے نہ جانا کہ کل کو اللہ کے عذاب سے امن صرف اسی کو نصیب ہوگا جس نے اس دن کا حذر کیا اور اس سے ڈرا، فانی کو باقی کے بدلے بیچا اور قلیل کو کثیر کے عوض اور خوف کو امن کے بدلے بیچا۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ تم أسلابِ ہالکین میں ہو اور عن قریب وہ تمھارے بعد باقین کے واسطے ہوں گے، یہاں تک کہ تم اللہ پاک کی طرف پھیرے جاؤ گے، جو سب وارثوں سے بہتر وارث ہے۔ (أسلاب جمع ہے سلب کی۔ سلب اس صلاح و سامان کو کہتے ہیں، جو لڑائی میں مقتولوں سے قاتلوں کے ہاتھ میں آتا ہے، لہٰذا دنیا کا ساز و سامان اسی قسم کا ہے کہ لوگ مرتے جاتے ہیں اور وہ سامان زندوں کے ہاتھ آتا رہتا ہے۔ پھر باقی رہنے والوں کو ملتا جاتا ہے۔ مضمون ؎

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت رفت منزل بدیگرے پرداخت

اور ؏

دور مجنوں گزشت و نوبتِ ما ست

کا مصداق پیش آتا رہتا ہے، غرض کہ ساری دنیا متاعِ مستعار ہے، کفار و فجار کے لیے زحمت ونقمت اور ابرار کے واسطے مزرعِ آخرت ہے۔ اللهم غفرا وتوفيقا.)

پھر یہ بات ہے کہ بے شک تم مشایعت (پیروی) کرتے ہو اس شخص کے ساتھ جاتے ہو، جو صبح کو جانے والا ہے اللہ کے پاس یا شام کو جانے والا ہے، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس کی اجل تمام ہوگئی، یہاں تک کہ تم اس کو زمین کی ایک دراڑ میں غائب کرتے ہو، جو کہ شکم میں ایک دراڑ کی طرح ہے کہ جس میں نہ فرش بچھا ہوا ہے، نہ مسند ہے نہ تکیہ لگا ہے، اس کا یہ حال ہے کہ دوستوں سے الگ ہوا مٹی سے جا ملا، حساب کے سامنے ہوا، اپنے عمل میں گروی ہے، جو کچھ پیچھے چھوڑا اس سے غنی اور بے نیاز ہے، جو آگے بھیجا اس کی طرف فقیر اور حاجت مند ہے۔ پس اے اللہ کے بندو! اللہ سے اس کے عہد اور وعدہ پورا ہونے سے یعنی موت کے نازل ہونے سے پہلے ڈرو۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حسن بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر ایک آسیب زدہ شخص کو لے کر گزرے تو انھوں نے اس کے کان میں یہ آیت پڑھ دی: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥١٢۔ ٢٥١٣)

تُرْجَعُوْنَ ﴿١١٥﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا
بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿١١٧﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ
الرّٰحِمِيْنَ ﴾ تو وہ شخص بھلا چنگا ہو گیا۔

پھر اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تو نے اس کے کان میں کیا پڑھا۔ چنانچہ آپ ﷺ کو اس کی خبر دی تو اس سے فرمایا کہ بے شک وہ جس وقت اس کے کان میں پڑھی جائے تو اس کو جلا دے (اصل کے الفاظ یہ ہیں: ''أَنَّهَا إِذَا قُرِئَتْ فِي أُذُنِهِ أَحْرَقَتْهُ'')۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر کوئی یقین کرنے والا آدمی اس کو کسی پہاڑ پر پڑھے تو وہ زائل ہو جائے۔[1]

امام ابونعیم نے محمد بن ابراہیم بن حارث سے روایت کیا ہے، محمد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ایک سریہ (لشکر کا حصہ) میں بھیجا اور ہم کو حکم فرمایا کہ ہم جب کہیں شام کریں اور صبح کریں تو یہ کہیں: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ کہا: چنانچہ ہم نے اس کو پڑھا تو مالِ غنیمت حاصل کیا اور سالم رہے۔[2] (وأخرجه ابن السني وابن مندة وأبو نعيم في المعرفة، قال السيوطي بسند حسن من طريق محمد بن إبراهيم الخ فتح القدير)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: میری امت کے لوگ جب کشتی میں سوار ہوں تو اُن کو غرق ہونے سے امان ہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ الْمَلِكِ الْحَقِّ'' ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [الزمر: ٦٧] ''اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی، جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے، اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے، وہ پاک ہے اور اس شرک سے بالاتر ہے جو وہ کرتے ہیں۔'' اور ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [هود: ٤١] ''اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے۔ بے شک میرا رب البتہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[3] كذا في ابن كثير.

﴿ قٰلَ ﴾ کا قائل اللہ عزوجل ہے، ان کو یہ بات یاد دلاتا ہے کہ جس شے کو انھوں نے ہمیشہ طویل گمان کیا تھا وہ بہ نسبت اس کے جس کا انھوں نے انکار کیا قلیل ہے۔ کسی نے ﴿ قُلْ ﴾ بصیغۂ امر پڑھا ہے، یعنی اے پیغمبر! تم کفار

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥١٣) مسند أبي يعلىٰ (٨/ ٤٥٨) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢١٨٩)

[2] الدر المنثور (٦/ ١٢٢) فتح القدير (٣/ ٦٨٣) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٢٧٤)

[3] المعجم الكبير (١٢/ ١٢٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٤٣۔ ٣٤٥) اس کی سند میں ''نہشل بن سعید'' سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٩٣٢)

سے کہو، یہ قراءت ابن کثیر اور کسائی کی ہے۔ باقی قراء نے ﴿ قٰلَ ﴾ بصیغۂ ماضی پڑھا ہے۔[1] یا فرشتے کو اُن سے سوال کرنے کا حکم ہے، یا تقدیر ﴿ قُوْلُوْا ﴾ ہے، لیکن کلام کو امرِ واحد کے پیرایہ میں ذکر کیا ہے اور مراد جماعت ہے۔ ﴿ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾ ارض سے وہ زمین مراد ہے جس کی طرف رجوع کرنے کا سوال کیا۔ اس سوال سے غرض سرزنش کرنا اور ڈانٹنا ہے، یعنی مقصد اُن کو ڈانٹنا اور ڈرانا دھمکانا ہے، کیوں کہ وہ آخرت کی زندگی کا بالکل انکار کیا کرتے تھے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جتنی مدت وہ دنیا کی زندگی میں اور قبروں میں رہے، اس سب کے بارے میں سوال ہو۔ کسی نے کہا کہ یہ سوال اُن کے قبروں میں رہنے کی مدت کے بارے میں ہے، اس لیے کہ ﴿ فِي الْاَرْضِ ﴾ فرمایا ہے۔ "عَلَى الْأَرْضِ" نہیں کہا، لیکن یہ دلیل اس آیت کی رو سے مردود ہے: ﴿ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ [البقرۃ: ١١] "زمین میں فساد نہ کرو۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴾ منصوب ہے بنا بر تمیز، اس لیے کہ ﴿ كَمْ ﴾ میں ابہام ہے۔ "أَيْ: لَبِثْتُمْ كَمْ عَدَدًا مِنَ السِّنِيْنَ" یعنی تم کتنے عدد برسوں کے رہے۔ "سِنِيْنَ" بفتحِ نون ہے اس بنا پر کہ نون جمع کا ہے۔ بعض اس کو جر و تنوین دیتے ہیں۔ ﴿ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ﴾ چوں کہ جس سخت عذاب میں وہ مبتلا ہوں گے، اس کی عظمت کے مارے اپنے رہنے کی مدت کو کم سمجھے اور اس میں شک کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ دو نفخوں کے درمیان اُن سے عذاب اُٹھا لیا گیا، لہٰذا وہ قبروں کے اندر جس عذاب میں تھے، اسے بھول گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس عذاب میں وہ پہلے نفخے سے لے کر دوسرے نفخے تک تھے۔

چنانچہ اللہ پاک نے اُن کو یہ بھلا دیا۔ پھر وہ جس خطرے، ہول اور خوف میں تھے اس کی شدت کی وجہ سے جو بھول اُنھیں لاحق ہوگئی تھی، جب اس کو پہچانا تو معاملے کو اپنے غیر کے حوالے کیا۔ پس بولے: ﴿ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴾ یعنی تو اُن لوگوں سے پوچھ لے جو گنتی کرنے میں خوب ماہر ہیں، یعنی فرشتے، اس لیے کہ یہ بندوں کے اعمال کے اور عمروں کے خوب جاننے والے ہیں۔ کسی نے کہا: عادین سے مراد حساب دان ہیں، لوگوں میں سے جو گنتی کو خوب جانتے ہیں۔ ﴿ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے یہاں بھی ﴿ قُلْ ﴾ پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت صیغۂ ماضی سے ہے۔ دونوں قراءتوں کی توجیہ بنا بر خبر پہلے گزر چکی ہے، یعنی تم زمین میں تھوڑی ہی مدت رہے۔[2]

اللہ پاک نے ان کی تصدیق و تقریع و توبیخ کے لیے مالک کی زبان سے فرمایا: ﴿ لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ جواب ﴿ لَوْ ﴾ محذوف ہے، یعنی اگر تم کچھ بھی جانا جانتے تو البتہ تم آج اپنے زمین میں یا قبروں میں یا دونوں میں رہنے کی مدت کو آگ میں رہنے کی مدت کے مقابلے میں بہت ہی قلیل ہونا جان لیتے۔ پھر جو بات اس پر دلالت کرتی

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٨٠) [2] فتح القدير (٣/ ٦٨٠)

تھی کہ بعث اور قیامت کا قائم ہونا حق ہے، اس میں غور و فکر کرنے کو انھوں نے ترک کر دیا اور غفلت ہی میں پڑے رہے۔ لہٰذا اللہ پاک نے اس پر اُن کی توبیخ و تقریع میں زیادتی کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا ﴾ ہمزہ توبیخ اور تقریر کا ہے۔ حرفِ فا مقدر پر عطف کے لیے ہے۔ "أَيْ: أَلَمْ تَعْلَمُوْا شَيْئًا فَحَسِبْتُمْ" یا "أَغْفَلْتُمْ وَتَلَاهَيْتُمْ وَتَعَامَيْتُمْ فَحَسِبْتُمْ"، ﴿ عَبَثًا ﴾ منصوب ہے بنا بر حال ضمیرِ متکلم سے۔ "أَيْ: عَابِثِيْنَ" یا علت کی بنا پر منصوب ہے، یعنی مفعول لہ ہے: "أَيْ: لِلْعَبَثِ"۔ اول قول سیبویہ و قطرب کا ہے اور دوسرا ابو عبیدہ کا۔ اور یہ بھی کہا ہے: ہوسکتا ہے کہ منصوب ہو بنا بر مصدریت۔[1]

معنی یہ ہیں: کیا تم نے کچھ نہ جانا، گمان کیا یا تم غافل ہوگئے۔ لا ہے سا ہے اندھے بن گئے۔ لہٰذا تم نے خیال کرلیا کہ ہم نے جو تم کو بنایا ہے تو اس حال میں کہ ہم کھیل کرنے والے ہیں، یا تم کو کھیل کے لیے بنایا ہے، یا ہم نے تم کو پیدا کیا ہے تو ایک قسم کا کھیل کیا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ ہم نے تو تم کو حکمت سے بنایا ہے اور تمھارے بنانے میں قسم قسم کی خوبیاں رکھی ہیں۔ لغت میں عبث کہتے ہیں: لعب کو۔ یعنی کھیل کو اور اس شے کو جس میں کسی طرح کا فائدہ نہ ہو۔ محاورے میں بولتے ہیں: "عَبِثَ يَعْبَثُ عَبَثًا فَهُوَ عَابِثٌ أَيْ: لَاعِبٌ" عرب کی اصل اس قول سے ہے "عَبَثْتُ الْأَقِطَ أَيْ: خَلَطْتُهُ" یعنی اصل میں عبث پنیر کے خلط ملط کرنے کو بولتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ ﴾ پر، یعنی کیا تم نے خیال کیا کہ ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ عَبَثًا ﴾ پر معطوف ہو، اس معنی میں کہ ہم نے تم کو پیدا کیا عبث کے واسطے اور واپس نہ آنے کے واسطے۔ ہرگز نہیں، بلکہ تم بعث اور نشور کے سبب سے ہمارے پاس پھر آؤ گے۔ ہم تم کو تمھارے اعمال کا بدلہ دیں گے۔ امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے ﴿ تَرْجِعُوْنَ ﴾ بفتحِ تائے فوقیہ و کسرِ جیم بصیغۂ معروف پڑھا ہے۔[2] باقی قراء کی قراءت بصیغۂ مجہول ہے۔ ﴿ اِلَيْنَا ﴾ کو پہلے فواصل کی رعایت کے لیے رکھا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنی ذات پاک کی تنزیہ و تقدیس فرمائی۔ ﴿ فَتَعٰلَى اللّٰهُ ﴾ یعنی اللہ سبحانہ اولاد و شرکا سے پاک ہے، یا اس بات سے کہ کوئی شے عبث پیدا کرے۔

﴿ اَلْمَلِكُ ﴾ یعنی وہ ایسا بادشاہ ہے کہ علی الاطلاق وہی بادشاہت کے لائق ہے، وہی ایجاد کرتا ہے، وجود میں لاتا ہے، وہی معدوم کرتا ہے، وہی پہلے پیدا کرتا ہے، وہی دوبارہ پیدا کرے گا، وہ زندہ کرتا ہے، وہی مارتا ہے، وہی عذاب کرتا ہے، وہی ثواب دیتا ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز بالذات اس کی مملوک ہے اور اس کی بادشاہت کے ماتحت ہے، بالعرض مالک ہے، اس کی ملکیت ایک وجہ سے یا دوسری وجہ سے نہیں ہے، یا ایک حالت یا دوسری حالت میں نہیں

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ١٥٦) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ١٥٦)

ہے، بلکہ مستقل ہے۔ ﴿ اَلْحَقُّ ﴾ یعنی وہ اپنے سارے افعال و اقوال میں سچا پکا ہے۔ یہ اللہ پاک کا اور اس کے شئوون کا استعظام (عظمت کا اظہار و اقرار) ہے۔

﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴾ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، رب ہے عرشِ کریم کا، پھر وہ کیسے معبود اور رب نہ ہوگا اس شے کا جو عرشِ کریم کے نیچے ہے، یعنی جو مخلوقات اس کے نیچے ہے اور جس موجودات کا وہ احاطہ کیے ہوئے ہے، کوئی بھی ہو کچھ بھی ہو، سب کا وہی مالک اور رب ہے۔ عرش کی صفت کریم اس لیے کی کہ قرآنِ پاک اور رحمت یا خیر کا نزول اسی سے ہوتا ہے، یا اس ذات کی وجہ سے جو اس پر مستوی ہے، جس طرح بولتے ہیں، بیتِ کریم یعنی خانۂ کریم جبکہ اس کے رہنے اور بسنے والے کریم ہوتے ہیں، یا اس وجہ سے کہ اس کی نسبت اکرم الاکرمین کی طرف ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ اللہ کی مخلوقات میں سے اعظم ترین ہے۔ امام ابوجعفر، ابن محیصن، اسماعیل اور ابان بن ثعلب نے برفع الکریم پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ رب کی صفت ہے۔ باقی قراء کی قراءت بجر ہے، اس بنیاد پر کہ عرش کی صفت ہے۔[1] امام ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث پہلے گزر چکی ہے، لیکن الفاظ کا کچھ فرق ہے۔ اس لیے اس کے الفاظ یہاں لکھے جاتے ہیں: "عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ قَرَأَ فِيْ أُذُنِ مُصَابٍ ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ ﴾ حَتّٰى خَتَمَ السُّوْرَةَ فَبَرِئَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «بِمَاذَا قَرَأْتَ فِيْ أُذُنِهِ» فَأَخْبَرَهُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ رَجُلًا مُوْقِنًا قَرَأَ بِهَا عَلٰى جَبَلٍ لَزَالَ»"[2] (أخرجه الحكيم الترمذي وأبو يعلىٰ وابن المنذر وابن أبي حاتم وابن السني في عمل اليوم والليلة وابن مردوية وأبو نعيم في الحلية عنه)

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝١١٧ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝١١٨

اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو یقیناً اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، بے شک کافر فلاح نہیں پائیں گے (117) اور آپ کہیں: اے میرے رب! میری مغفرت فرما، اور (مجھ پر) رحم فرما اور تو ہی سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے (118)

شرک کی نامعقولیت اور مشرک کی عدمِ فلاح کا بیان:

اللہ پاک اس شخص کو وعید سناتا ہے جس نے اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کیا اور اللہ کے ساتھ اس کے علاوہ بھی کسی کو پوجا اور خبر دیتا ہے کہ جس شخص نے اللہ کے ساتھ شرک کیا ﴿ لَا بُرْهٰنَ لَهٗ ﴾، یعنی اس کے واسطے کوئی

[1] فتح القدير (٣/ ٦٨١) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

دلیل نہیں ہے اس کے قول پر۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾۔ جملہ ﴿ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ﴾ معترضہ ہے، شرط و جزا کے درمیان اور شرط کا جواب اس قول میں ہے۔ ﴿ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ یعنی اللہ محاسبہ کرے گا، اس پر پھر یہ خبر دی۔ ﴿ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی قیامت کے دن اللہ کے پاس کافروں کے لیے نہ کوئی فلاح ہوگی نہ کسی طرح نجات۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا تو کیا پوجتا ہے؟ وہ بولا: میں پوجتا ہوں اللہ کو اور اس کو اور اس کو، یہاں تک کہ کئی بت گن ڈالے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھر اُن میں سے کون ہے کہ جس وقت تجھے کوئی ضرر پہنچے، پھر تو اس کو پکارے تو وہ اس کو تجھ سے دور کر دے؟ کہا: وہ اللہ عزوجل ہے، فرمایا کہ پھر کونسی چیز تیرے لیے اس کی باعث ہوتی ہے کہ تو اللہ کے ساتھ اُن کو پوجتا ہے؟ کیا تو خیال کرتا ہے کہ وہ اس پر غالب آئیں گے؟ کہا: میں نے اُن کے پوجنے سے اللہ کے شکر کا ارادہ کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم جانتے ہو اور وہ نہیں جانتے ہیں۔ پھر کہا اس شخص نے ایمان لانے کے بعد کہ میں ایسے شخص سے ملا کہ حجت میں مجھ پر غالب ہوگیا۔ اس وجہ سے یہ حدیث مرسل ہے۔ وَقَدْ رَوَى أَبُوْ عِيْسَى التِّرْمِذِيُّ فِيْ جَامِعِهِ مُسْنَدًا عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ نَحْوَ ذٰلِكَ.[1]

سورت کے خاتمے پر دعا کی تعلیم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دعا کرنے کی ہدایت ہے۔ پس غفر جب کہا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ گناہ مٹانا اور لوگوں سے اس کا چھپانا۔ رحمت کے معنی یہ ہیں کہ درست اور سیدھا کر دے اس کو اور ٹھیک بنا دے اور اس کو اقوال و افعال میں توفیق دے۔[2] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ پھر جس بات پر اہلِ شرک قائم و دائم تھے، اللہ پاک نے ان کی توبیخ و تقریع کی، اس کے لیے تزئیف بیان کی، یعنی اس کو کھوٹا بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ یعنی جو کوئی غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ پوجے، یا صرف غیر اللہ ہی کو پوجے۔ ﴿ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ﴾ "إِلٰه" کی صفتِ کاشفہ ہے، اس کا کوئی مفہوم نہیں ہے، یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر اللہ کو بے دلیل پوجے تو برا ہے اور دلیل سے پوجے تو اچھا ہے، کیوں کہ اللہ کے ساتھ غیر کو پوجنا یا فقط غیر اللہ کو پوجنا، خود بلا دلیل ہے، اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے، بلکہ سارا عالم اللہ پاک کی توحید پر دلیل ہے اور ہر ذرہ غیر اللہ کو پوجنے کی نفی کی ندا کر رہا ہے، ذرا سا فہم سلیم درکار ہے۔ یا ﴿ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ کی صفتِ لازمہ ہے، تاکید کے لیے لائی گئی ہے، جس طرح کہ "يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ"، "طَائِرٌ" کی صفت ہے۔

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٨٣) اس کی سند میں "شبیب بن شیبہ" ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٤٥)

برہان حجتِ واضح و دلیلِ واضح کو کہتے ہیں۔ شرط کا جواب ﴿ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ ہے، یعنی اللہ پاک اس کو جزا دینے والا ہے، اتنی جزا جس کا وہ مستحق ہے۔ جملہ ﴿ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ﴾ معترضہ ہے شرط و جزا کے درمیان۔ جس طرح کہ یہ قول ہے: "مَنْ أَحْسَنَ إِلَى زَيْدٍ لَا أَحَقَّ مِنْهُ بِالْإِحْسَانِ فَاللّٰهُ مُثِيبُهُ"، یعنی جو شخص زید پر احسان کرے کہ اس سے زیادہ احسان کا مستحق کوئی نہیں ہے تو اللہ اس کو ثواب دینے والا ہے۔ کسی نے کہا: شرط کا جواب خود ﴿ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ﴾ ہے، اس بنا پر کہ فائے جزا محذوف ہے، جس طرح کہ اس مصرع میں فائے جزا حذف کر دی گئی ہے: ع

مَنْ يَّفْعَلِ الْحَسَنَاتِ اللّٰهُ يَشْكُرُهَا

یعنی جو شخص نیکیاں کرے تو اللہ پاک اس کی قدر دانی فرمائے گا۔ یعنی اسے بدلہ دے گا۔ حسن و قتادہ رحمہ اللہ نے "أَنَّهٗ" بفتح ہمزہ پڑھا ہے بنا بر تعلیل۔ باقی قراء کی قراءت بکسرِ ہمزہ ہے بنا بر استیناف جو مفیدِ علت ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے "لَا يَفْلَحُ الْكٰفِرُوْنَ" بفتحِ یا و لام پڑھا ہے۔ مضارع "فَلَحَ"، بہ معنی "أَفْلَحَ"۔ باقی قراء کی قراءت بضمِ یا وکسرِ لام ہے "أَفْلَحَ" سے۔[1] مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک غیر اللہ کے پوجنے والے کو جزا دے گا، اس واسطے کہ منکر لوگ فلاح نہ پائیں گے، یعنی وہ جزا یہی ہے کہ ان کو فلاح و رستگاری نصیب نہ ہوگی، ابدالآباد دوزخ میں پڑے رہیں گے۔

﴿ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ میں دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ اس میں "مَنْ" کے معنی کی رعایت کی ہے، کیوں کہ من معنی جمع میں ہے، چناں چہ پہلی ضمیروں میں اس کے لفظ کی رعایت کی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ضمیر کی جگہ "کافرون" اسم ظاہر لائے صرف ﴿ لَا يُفْلِحُ ﴾ کافی تھا، لہٰذا نکتہ اس میں یہ ہے کہ مقصد یہ ہے کہ اُن پر اس وصفِ قبیح کی ندا کی جائے۔ اس سورت کی ابتدا ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ کو ٹھہرایا اور اس کا خاتمہ ﴿ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ قرار دیا، لہٰذا ابتدا اور خاتمے کے درمیان بڑا فرق ہے، کیوں کہ ابتدا تو یہ ہوئی کہ ایمان والے فلاح کو پہنچے، کام نکال لے گئے، اُن کی مراد حاصل ہوئی۔ خاتمہ یہ ہوا کہ منکر لوگ بھلائی نہ پائیں گے، مراد سے محروم رہیں گے۔

پھر اللہ پاک نے اس سورت کو اس بات پر ختم کیا کہ اپنے رسول ﷺ کو اس امر کی تعلیم کی کہ اللہ پاک کو مغفرت اور رحمت کے لیے پکاریں، یہ دونوں چیزیں اس سے مانگیں۔ پس فرمایا: ﴿ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ اللہ پاک نے خود آپ کو استغفار کا حکم کیا، تاکہ اُمت آپ کی اقتدا کرے۔ کسی نے کہا کہ اُمت کے واسطے استغفار کرنے کا آپ کو حکم دیا۔ اللہ پاک کے ارحم الراحمین ہونے کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ رحمت میں زیادتی ہے مغفرت پر، یعنی گناہ کے بخشنے پر احسان کی زیادتی کو پہنچانا رحمت ہے۔ نیز غفران کبھی بغیر احسان کے ہوتا ہے، جو رحمت کے معنی ہیں۔ اس آیت کی وجہِ اتصال ماقبل سے یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے کفار کے حال کا شرح وار

[1] فتح القدير (٣/ ٦٨١)

بیان کیا تو امر فرمایا کہ سب معبودوں کی طرف سے تعلق منقطع کرکے اس سے جوڑیں اور اس کے غفران اور رحمت کی پناہ لیں، کیوں کہ اس کی رحمت جب کسی کو پالیتی ہے تو اس کو غیر اللہ کی رحمت سے بے نیاز کر دیتی ہے اور غیر اللہ کی رحمت اللہ پاک کی رحمت سے بے نیاز نہیں کرتی۔

اللہ پاک کی رحمت ایسی وسیع ہے کہ اس کی وسعت بشر کے وہم و خیال میں نہیں آسکتی، ہاں ﴿ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ [الأعراف: ١٥٦] اور « رَحْمَتِي سَبَقَتْ عَلَى غَضَبِيْ » کا تصور ہر دم رہتا ہے۔ ”اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ بِرَحْمَتِكَ الَّتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ، وَارْحَمْنَا رَحْمَةً تُغْنِيْنَا بِهَا عَنْ رَّحْمَةِ مَنْ سِوَاكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ وَيَا مُجِيْبَ السَّائِلِيْنَ وَيَا أَكْرَمَ الْأَكْرَمِيْنَ وَيَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ فَصَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِيْنَ، آمِيْنَ، آمِيْنَ، آمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ أَعِنَّا عَلَى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ. اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

الحمد للہ تفسیر سورت مومنین ۱۶ ماہ صفر ۱۳۱۱ھ کو بروز سہ شنبہ (منگل) محلّہ امیر گنج شاہ جہاں آباد میں وقت نمازِ عشاء تمام ہوئی۔ الٰہی سیدی مولائی! جس طرح تو نے اپنے فضل و کرم سے اس کو تمام کر دیا، اسی طرح باقی کو بھی اپنی رحمت و قوت سے لکھوا دے۔ الٰہی! تو حی و قیوم ہے، تیرے ہی حول و قوت سے سب کام ہوتے ہیں، ورنہ بندہ ضعیف البنیان خصوصاً اس ضعیف و ناتواں و تودۂ معاصی کی کیا ہستی ہے کہ وہ ایک حرف لکھ سکے، یہ سب تیرا ہی فضل ہے۔ إِلٰهِيْ سَيِّدِيْ مَوْلَائِيْ! رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ، آمِيْن. مُؤَلِّفُهُ ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی، غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَلِوَالِدَيْهِ، وَأَحْسَنَ إِلَيْهِمَا وَإِلَيْهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِسَيِّدِنَا أَبِي الْوَفَاءِ الصِّدِّيْقِ مَغْفِرَةً ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً لَّا تُغَادِرُ ذَنْبًا وَّلَا تَتْرُكُ حُوْبًا، آمِيْنَ.



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوْرَةُ النُّوْرِ

یہ سورت مدنی ہے۔ اس کی چونسٹھ (٦٤) آیتیں ہیں۔ ابن عباس اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ سورۃ النور مدینے میں اُتاری گئی ہے۔ (أخرجه ابن مردويه) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے کہ مت اُتارو عورتوں کو غرفوں میں (اصل الفاظ یہ ہیں: "لَا تُنْزِلُوْهُنَّ الْغُرَفَ" "غرف" جمع ہے "غرفة" بالضم کی۔ غرفہ بالا خانے اور حجرہ بالائے حجرہ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کو بالا خانے میں مت رکھو۔ جس میں کھڑکیاں اور دروازے راہ کی طرف ہوں کہ اُن میں سے وہ مردوں کو دیکھیں اور مرد اُن کو گھوریں۔) اور مت سکھاؤ ان کو لکھنا (شارع کا امر و نہی ہر گز حکمت سے خالی نہیں۔ صرف فہم کا فرق ہے، اس نہی کی حکمت خوب سنی اور کچھ آنکھ سے بھی دیکھی۔ علمائے زمان کا کسی بات کو اختیار کر لینا، پھر اس کے لیے دلائل قائم کرنا اور اپنی بات کی پچ کرنا، مصلحتِ شرعی و عرفی سے اغماز کرنا خطأً یا عمداً اور بات ہے۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى) اور سکھاؤ ان کو کاتنا اور انھیں سورت نور سکھاؤ (یہ اس لیے فرمایا کہ اس میں عورتوں کے متعلق احکام ہیں۔)۔[1] (أخرجه الحاكم وابن مردويه والبيهقي في الشعب) امام مجاہد رحمہ اللہ سے مرفوعاً مروی ہے، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سکھاؤ اپنے مردوں کو سورۃ المائدہ اور سکھاؤ اپنی عورتوں کو سورۃ النور۔[2] (أخرجه سعيد بن منصور وابن المنذر والبيهقي) یہ حدیث مرسل ہے۔ حارثہ بن مضرب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ہم کو لکھا کہ تم سورۃ النساء اور احزاب و نور سکھاؤ۔[3] (أخرجه أبو عبيد في فضائله)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ۝۱ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ
جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٣٠) شعب الإيمان (٢/ ٤٧٧) اس کی سند میں "عبدالوہاب بن ضحاک" سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٠١٧)

[2] شعب الإيمان (٢/ ٤٦٩) یہ روایت مرسل ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٨٧٩) [3] الدر المنثور (٦/ ١٢٤)

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

(یہ) ایک سورت ہے، ہم نے اسے نازل کیا اور ہم نے اس (کے احکام) کو فرض کیا ہے، اور ہم نے اس میں واضح آیات نازل کیں، تا کہ تم نصیحت حاصل کرو ① زانیہ عورت اور زانی مرد، ان دونوں میں سے ہر ایک کو تم سو کوڑے مارو، اور اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین (پر عمل کرنے) کے معاملے میں تمھیں ان دونوں (زانی اور زانیہ) پر قطعاً ترس نہیں آنا چاہیے اور مومنوں میں سے ایک گروہ ان دونوں کی سزا کے وقت موجود ہونا چاہیے ②

سورت نور کی اہمیت وفضیلت:

اللہ پاک فرماتا ہے کہ یہ ایک سورت ہے، جس کو ہم نے اُتارا ہے۔ اس میں اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ اس کا اعتناء (توجہ) واہتمام کیا ہے۔ یہ اہتمام اس کے علاوہ دوسرے احکام کی نفی نہیں کرتا۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: ﴿ فَرَضْنٰهَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے حلال وحرام و امر و نہی اور حدود کو بیان کیا ہے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے ﴿ فَرَّضْنٰهَا ﴾ پڑھا ہے، وہ کہتا ہے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس کو تم پر اور اُن پر جو تمھارے بعد ہوں گے، فرض کیا ہے۔[2] ﴿ بَيِّنٰتٍ ﴾ کے معنی ہیں: "مُفَسَّرَاتٍ وَّاضِحَاتٍ" یعنی اس میں صاف صاف کھلی کھلی باتیں ہیں۔

زنا کی حد:

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ یعنی اس آیتِ کریمہ میں حکم ہے زانی کو حد لگانے کے بارے میں۔ علما کی اس میں تفصیل اور آپس میں اختلاف ہے، کیوں کہ زانی خالی نہیں ہے یا تو وہ بکر ہوگا۔ بکر وہ ہے جس نے بیاہ نہیں کیا، یا محصن ہوگا۔ محصن وہ ہے جو صحیح طور سے نکاح کرنے کے بعد وطی کر چکا ہے، اس حال میں کہ وہ آزاد بالغ عاقل تھا۔

کنوارے اور شادی شدہ زانی مرد وزن کی حد:

پھر اگر وہ بکر ہے کہ اس نے بیاہ نہیں کیا تو اس کی حد سو چوٹ قمچی (کوڑا) کی ہے جس طرح کہ اس آیت میں آیا ہے۔ اس پر مزید یہ ہے کہ وہ سال بھر کے لیے اپنے شہر سے نکال دیا جائے علمائے جمہور کے نزدیک۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ

① تفسير الطبري (١٩/ ٨٦) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥١٦) ② صحيح البخاري (٤/ ١٧٦٩)

کا اس میں اختلاف ہے، کیوں کہ اُن کے نزدیک سال بھر کے لیے نکال دینا امام کی رائے پر موقوف ہے، وہ چاہے نکالے، چاہے نہ نکالے۔

اس بارے میں جمہور کی حجت صحیح بخاری کی حدیث ہے جو سیدنا ابوہریرہ اور زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور وہ دو بدویوں کے بارے میں ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو ایک نے عرض کی: یا رسول اللہ! میرا یہ بیٹا اس شخص کا مزدور تھا۔ اس نے اس کی جورو سے زنا کیا، پس میں نے اپنے بیٹے کو سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر اس سے فدیہ میں لیا۔ پھر میں نے اہلِ علم سے پوچھا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے پر قمچی (کوڑے) کی سو چوٹ ہیں اور سال بھر کے لیے نکال دینا ہے اور اس کی عورت پر رجم کی سزا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ میں تمھارے درمیان اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔ لونڈی اور بکریاں تو تجھے واپس ہیں اور تیرے بیٹے پر سو چوٹ ہیں اور سال بھر کے لیے نکال دینا۔ قبیلۂ اسلم کا ایک شخص تھا، اس سے فرمایا: اے انیس! صبح کو جا کر اس کی عورت سے پوچھنا، اگر وہ اقرار کر لے تو تُو اس کو رجم کر ڈال۔ انیس صبح کو اس کے پاس گئے تو اس نے اقرار کر لیا تو اس کو رجم کر ڈالا۔

اس حدیث شریف میں اس بات کی دلیل ہے کہ زانی اگر بکر ہو، یعنی وہ کنوارا ہو، اس نے نکاح و بیاہ نہ کیا ہو تو اس کو سو چوٹ یعنی کوڑے لگائے جائیں گے اور جلا وطن بھی کیا جائے گا۔ پھر جبکہ وہ محصن ہو، یعنی جو صحیح نکاح میں وطی کر چکا ہے اور وہ آزاد بالغ عاقل تھا تو بے شک وہ رجم کیا جائے گا۔ جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خطبہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو اللہ پاک کی حمد و ثنا کی۔ پھر فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور اُن پر کتاب نازل فرمائی، لہٰذا جو اُن پر نازل فرمایا، اس میں رجم کی آیت تھی۔ ہم نے اس کو پڑھا اور یاد رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور آپ کے بعد ہم نے کیا۔ اب میں اس سے ڈرتا ہوں کہ لوگوں پر زمانہ طول پذیر ہو تو کوئی کہنے والا کہے کہ ہم اللہ کی کتاب میں رجم کی آیت نہیں پاتے، لہٰذا ایسے لوگ ایک فریضے کو ترک کرنے کی وجہ سے گمراہ ہو جائیں، وہ فریضہ جس کو اللہ تعالیٰ نازل کر چکا ہے۔ پس رجم اللہ کی کتاب میں حق ہے اس پر جس نے زنا کیا، جبکہ وہ محصن ہو مردوں اور عورتوں میں سے، جس وقت کہ گواہ قائم ہو جائیں، یا حمل ظاہر ہو، یا وہ اقرار کر لیں۔[1] (أخرجاه في الصحيحين من حديث مالك مطولاً)

یہ اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس سے اس جگہ ہمارا مقصود ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطبہ سنایا تو میں نے اُن کو یہ کہتے ہوئے سنا: خبردار! کچھ لوگ

[1] الموطأ (٢/ ٨٢٣) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩١)

کہتے ہیں کہ اللہ کی کتاب میں رجم نہیں ہے، اس میں جو ہے وہ سو جَلد (کوڑے مارنا) ہے، حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور آپ کے بعد ہم نے کیا، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ کوئی کہنے والا کہے یا کوئی گفتگو کرنے والا گفتگو کرے کہ عمر نے کتاب اللہ میں وہ شے بڑھا دی جو اس میں نہ تھی تو میں البتہ رجم کی آیت کو ثابت کر دیتا، یعنی قرآن شریف میں اسے لکھ دیتا، جس طرح کہ وہ اتری۔ (وأخرجه النسائي من حديث عبيد الله بن عبد الله)

نیز امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ فرمایا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا تو رجم کا ذکر کیا۔ پھر کہا کہ بے شک ہم رجم سے کوئی چارہ نہیں پاتے، کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد ہے۔ سنتے ہو! بے شک رسول اللہ ﷺ نے باقاعدہ رجم کیا ہے اور آپ کے بعد ہم نے رجم کیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ کہنے والے یہ کہیں کہ عمر نے اللہ کی کتاب میں اس چیز کا اضافہ کر دیا، جو اس میں نہیں ہے تو البتہ میں قرآن کے کنارے میں لکھ دیتا اور عمر بن خطاب اور عبدالرحمٰن بن عوف اور فلاں فلاں اس بات کا گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے باقاعدہ رجم کیا ہے اور آپ ﷺ کے بعد ہم نے رجم کیا ہے۔ خبردار! بے شک تمھارے بعد عن قریب کچھ لوگ ہوں گے جو تکذیب کریں گے رجم کی اور شفاعت کی اور عذابِ قبر کی اور اس بات کی کہ بعض لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اس کے بعد کہ وہ جل بھن کر کوئلہ ہوں گے۔[1] (وروى أحمد أيضا عن يحيى القطان عن يحيى الأنصاري عن سعيد بن المسيب عن عمر بن الخطاب: "إياكم أن تهلكوا عن آية الرجم... الحديث" رواه الترمذي من حديث سعيد عن عمر وقال: صحيح)[2]

حافظ ابو یعلیٰ موصلی نے محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کثیر بن الصلت سے مجھے خبر دی گئی۔ کثیر نے کہا: ہم مروان کے پاس تھے اور ہم میں زید تھے۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم پڑھا کرتے تھے: "اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهَا الْبَتَّةَ" مروان نے کہا: تو نے اس کو مصحف میں کیوں نہ لکھ دیا؟ زید نے کہا ہے کہ ہم نے اس کا ذکر کیا تھا اور ہم میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے تو انھوں نے کہا کہ میں اس سے تمھاری تسلی تشفی کیے دیتا ہوں۔ زید نے کہا کہ ہم نے کہا: پھر کیوں کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، کہا: پھر ایسا ایسا ذکر کیا اور رجم کا ذکر کیا۔ پھر وہ آپ ﷺ کے پاس آیا تو اس شخص نے رجم کا ذکر کیا، پھر عرض کی: یا رسول اللہ! آیتِ رجم کو لکھ دو۔ فرمایا: اب میں اس کی طاقت نہیں رکھتا ہوں، یا اس کے مثل فرمایا۔[3] "وقد روى النسائي من حديث ابن المثنى عن غندر عن شعبة عن قتادة عن يونس بن جبير عن كثير بن الصلت عن زيد بن ثابت به" یہ سب متعدد طرق باہم ایک دوسرے کو قوت دیتے ہیں اور اس پر دال ہیں کہ رجم کی آیت لکھی ہوئی تھی۔ پھر اس کی تلاوت منسوخ ہوئی اور اس کا حکم معمول بہ باقی رہا۔ واللہ أعلم.

[1] مسند أحمد (١/ ٢٣) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (١/ ٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٣١) [3] سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٢٧١)

خود رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کے رجم کا حکم دیا۔ یہ وہی اس شخص کی بیوی ہے جس نے ایک مزدور کو کام پر لگایا، جبکہ اس نے اس مزدور سے زنا کیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ماعز اور غامدیہ کو رجم کیا اور آپ ﷺ سے یہ منقول نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے اُن سب کو رجم سے پہلے کوڑے لگائے ہوں۔ صحیح حدیثیں جو متعدد طرق اور الفاظ سے وارد ہوئی ہیں اور وہ ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں وہ یہی ہیں کہ اس بارے میں آپ ﷺ نے صرف اُن کے رجم کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان میں کوڑے لگانے کا ذکر نہیں ہے۔ اسی لیے جمہور علما کا مذہب یہی ہے۔ اسی طرف امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ گئے ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ محصن زانی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سزا میں آیت کی رو سے کوڑے اور سنت کی رو سے رجم کی سزا کو جمع کیا جائے، جس طرح کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آپ کے پاس سراحہ کو لائے اور اس نے زنا کیا تھا اس حال میں کہ وہ محصن تھا تو آپ نے جمعرات کے دن اس کو کوڑے لگائے اور جمعہ کے دن اس کو رجم کر ڈالا۔ پھر فرمایا کہ میں نے اس کو کتاب اللہ کے حکم سے کوڑے لگائے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے رجم کیا۔[1] سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھ سے لے لو، تم مجھ سے لو۔ بے شک اللہ نے ان کے واسطے راہ کر دی، کنوارا کنواری کے لیے سو کوڑے اور سال بھر کے لیے نکال دینا اور شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کے لیے سو کوڑے اور رجم۔[2]

زانی مرد وزن کو سزا دینے میں نرمی نہ کی جائے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ ﴾ یعنی مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے حکم میں اُن پر نرمی اور رحم مت کرو۔ اللہ کی شریعت میں طبعی نرمی جو حد کے ترک کر دینے پر ہوتی ہے اس سے منع نہیں کیا۔ جس نرمی سے منع کیا ہے وہ یہ ہے کہ حاکم کو ترکِ حد، یعنی حد نہ لگانے کا باعث ہو۔ چنانچہ یہ جائز نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ حدود کے قائم کرنے میں، جبکہ وہ حاکم کے پاس پہنچ جائیں تو وہ قائم کی جائیں، معطل نہ چھوڑی جائیں۔ اسی طرح امام سعید بن جبیر اور عطاء بن ابی رباح رحمہما اللہ سے مروی ہے۔[3]

حدیث شریف میں آیا ہے کہ باہم آپس میں حدوں کو معاف کر لو، پھر جو مقدمہ میرے پاس پہنچ گیا تو وہ حد واجب ہو چکی۔[4] دوسری حدیث شریف میں ہے کہ ایک حد جو زمین میں قائم کی جائے وہ زمین والوں کے لیے اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٢٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٢٦٩) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩٠)

[3] تفسير الطبري (١٩/ ٩١) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥١٨)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٧٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٩٥٤)

سے بہتر ہے کہ چالیس صبح اُن پر پانی برسایا جائے۔[1] کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ تم قائم نہ کرو حد کو جیسے کہ چاہیے سخت مار مار کے جو گناہوں سے ڈرانے والی ہو۔ ایسی مار مراد نہیں جو مبرح (شدید) ہو۔ یعنی ایسی سخت ضرب جس سے ہڈی پسلی ٹوٹ جائے۔ عامر شعبی رحمہ اللہ نے کہا کہ رحمت ہو شدتِ ضرب میں۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: ایسی ضرب جو مبرح نہ ہو۔ سعید بن ابی عروبہ نے حماد بن ابی سلیمان سے روایت کیا ہے کہ قاذف (زنا کی تہمت لگانے والے) کو اس حال میں کوڑے لگائے جائیں کہ اس پر اس کے کپڑے ہوں اور زانی کے کپڑے اُتار لیے جائیں۔

پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَا تَاْخُذْكُمْ ﴾۔ سعید کہتے ہیں: میں نے کہا کہ یہ حکم میں ہے۔ حماد نے کہا: یہ حکم و جلد میں ہے، یعنی حد کے قائم کرنے میں اور شدتِ ضرب میں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبید بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک لونڈی نے زنا کیا تو انھوں نے اس کے دونوں پاؤں کو مارا۔ نافع راوی کہتے ہیں، میں گمان کرتا ہوں کہ امام ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ کو کہ انھوں نے کہا ہے کہ اس کی پیٹھ کو مارا۔ عبیداللہ کہتے ہیں: میں نے کہا: ﴿ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بیٹا تو نے مجھے دیکھا کہ مجھے اس وقت رافت نے پکڑا؟ اللہ نے مجھے یہ حکم نہیں دیا کہ اسے مار ڈالوں، نہ ہی یہ حکم دیا کہ کوڑے اس کے سر پر ماروں، یعنی اس کے سر پر حد لگاؤں۔ میں نے تو اس کو درد میں مبتلا کر دیا، جبکہ اس کو مارا۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ یعنی اگر تم کو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان ہے تو تم یہ کرو اور جس نے زنا کیا ہے، اس پر حدیں قائم کرو اور اس پر مار کو سخت کرو، لیکن ضرب مبرح نہ ہو، تا کہ وہ اس سے باز رہے اور جو کوئی اس جیسا کام کرتا ہے، وہ بھی باز آ جائے۔ مسند میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک میں البتہ ذبح کرتا ہوں بکری کو اور میں اس پر رحم کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرے واسطے اس میں اجر ہے۔[3]

لوگوں کی موجودگی میں حدود کا نفاذ کیا جائے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ اس میں زانیوں کو سزا دینا ہے اور دوسروں کے لیے عبرت کرنا ہے، جبکہ وہ لوگوں کے سامنے مارے جائیں گے، کیوں کہ ان کو ڈرانے کے لیے یہ انتہائی سخت صورت ہے اور اُن کو اس کام سے باز رکھنے میں بہت مفید ہے۔ اس لیے کہ اس میں ملامت و ڈر اور فضیحت اور رسوائی ہے، جبکہ لوگ حاضر ہوں گے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد علانیہ طور پر سزا دینا ہے۔ پھر سیدنا علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ طَآىِٕفَةٌ ﴾ ایک شخص ہے یا اس سے زیادہ ہوں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٣٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣١٣٠)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥١٩_ ٢٥١٨) [3] مسند أحمد (٣/ ٤٣٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦)

کہ ایک شخص ہزار تک علانیہ ہے۔ اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اور اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ طائفہ ایک پر صادق آتا ہے۔ امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا: دو شخص۔ امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

اسی طرح سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چار نفر ہیں یا اس سے زیادہ۔ عبداللہ بن وہب رحمہ اللہ نے کہا کہ امام مالک رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ چار نفر ہیں یا زیادہ، کیوں کہ زنا کی سزا میں چار یا اس سے زیادہ سے کم کی گواہی کافی نہیں ہوتی۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تین نفر یا اس سے زیادہ۔ ربیعہ نے کہا کہ پانچ۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ دس۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے حکم فرمایا ہے کہ ان کے عذاب کو مسلمانوں کا ایک گروہ دیکھے، تاکہ یہ نصیحت و عبرت اور سزا ہو جائے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے نصر بن علقمہ سے روایت کیا ہے کہ یہ فضیحت یعنی رسوائی کے لیے نہیں ہے، یہ تو اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کے لیے توبہ اور رحمت کی دعا کریں۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

سورۃ لغت میں شریف مقام اور رُتبۂ بزرگ کا نام ہے۔ اسی لیے قرآن شریف کی سورت کا نام سورت رکھا ہے۔ اسی معنی میں زہیر کا قول ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَعْطَاكَ سُوْرَةً تَرَى كُلَّ مَلْكٍ دُوْنَهَا يَتَذَبْذَبُ

''کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ پاک نے تجھے ایک ایسا رُتبۂ بزرگ و مرتبۂ سترگ عطا فرمایا ہے کہ جس کے نزدیک ہر ملک کے قویٰ حرکت کرنے لگتے ہیں۔''

جمہور نے ﴿ سُوْرَةٌ ﴾ برفع پڑھا ہے۔ اس میں دو جہتیں ہیں: ایک یہی کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ''أَيْ: هَذِهِ سُوْرَةٌ'' امام زجاج، فراء اور مبرد رحمہم اللہ نے اسی وجہ کو راجح کہا ہے، اس لیے کہ یہ نکرہ سے ہے اور نکرہ سے ہر جگہ ابتدا نہیں کی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ سُوْرَةٌ ﴾ مبتدا ہے۔ نکرہ سے ابتداء اس لیے جائز ہوگی کہ ﴿ اَنْزَلْنٰهَا ﴾ اس کی صفت واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صفت سے تخصیص حاصل ہوگئی۔ خالص نکرہ نہ رہا۔ ایسا نکرہ مبتدا واقع ہوسکتا ہے اور خبر ﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ ﴾ ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کا رجحان اسی طرف ہے۔[2]

معنی یہ ہیں کہ جو سورت اُتاری گئی ذِمی پر لازم کی گئی، وہ ایسی ایسی ہے، یعنی اس میں فلاں فلاں حکم مذکور ہیں، کیوں کہ سورت عبارت ہے آیتوں سے جو بیان کی جاتی ہیں اور اس کا مبتدا اور ختم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سورت یہی ہے کہ چند آیتیں ہوتی ہیں اور اس کا شروع اور ختم ہوتا ہے۔ یہ معنی صحیح ہیں۔ لوگوں نے پہلے جو اس کے

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٩٤۔ ٩٥) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥١٩۔ ٢٥٢١) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٤٥۔ ٣٤٨)

[2] فتح القدير (٤/ ٥۔ ٦) اللباب في علوم الكتاب (١٤/ ٢٧٤)

مبتدا نہ ہونے کی یہ علت بیان کی تھی کہ وہ نکرہ ہے تو یہ بات بے وجہ ہے، کیوں کہ اس کی تو صفت سے تخصیص ہوگئی۔ ایسے نکرہ کے ابتدا ہونے کے جواز پر اجماع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿سُوْرَةٌ﴾ مبتدا ہے، اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ سُوْرَةٌ" یعنی جس چیز کی ہم نے تیری طرف وحی کی اس میں سے ایک سورت ہے۔ اس قول کو یوں رد کیا ہے کہ مقام کا مقتضا اس سورتِ کریمہ کی شان بیان کرنا ہے۔ اس بات کا بیان کرنا نہیں ہے کہ جو شے نبی ﷺ کی طرف وحی کی گئی ہے اس کے جملے میں ایک سورت ہے، جس کی شان ایسی ایسی ہے۔

حسن بن عبدالعزیز، عیسیٰ ثقفی، عیسی کوفی، مجاہد، ابوحیوہ اور طلحہ بن مصرف رحمہم اللہ نے "سُوْرَةً" بنصب پڑھا ہے۔ اس میں چار وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ فعل مقدر کا مفعول ہے۔ "أَيْ: اُتْلُ" یا "اِقْرَأْ سُوْرَةً" یعنی پڑھ تو سورت کو۔ دوسری یہ ہے کہ ﴿أَنْزَلْنَا﴾ مقدر کا مفعول ہے، جس کی تفسیر ﴿أَنْزَلْنٰهَا﴾ کر رہا ہے۔ اس صورت میں یہاں ﴿أَنْزَلْنٰهَا﴾ کا کوئی محل اعراب کا نہ ہوگا، کیوں کہ یہ جملہ مفسرہ ہے، بخلاف وجہ اول کے کہ اس میں محلِ نصب میں ہوگا، اس بنا پر کہ "سُوْرَةً" کی صفت ہوگا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ منصوب ہے بنا بر إغراء، "أَيْ: دُوْنَكَ سُوْرَةً"، یعنی لے تو سورت کو۔ یہ امام زمخشری کا قول ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے اس کو یوں رد کیا ہے کہ "أَدَاةُ الْإِغْرَاء" کا حذف کرنا جائز نہیں ہے۔ چوتھی وجہ ہے کہ منصوب ہے بنا بر حال ﴿أَنْزَلْنٰهَا﴾ کی ضمیر سے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حال ہے ہا سے، اور ضمیر سے جو حال ہوتا ہے تو اس کا ضمیر پر مقدم کرنا جائز ہے۔ اس بنا پر ﴿أَنْزَلْنٰهَا﴾ کی ضمیر سورت کی طرف نہ پھرے گی، بلکہ احکام کی طرف راجع ہوگی۔ گویا یوں کہا کہ "أَنْزَلْنَا الْأَحْكَامَ حَالَ كَوْنِهَا سُوْرَةً مِنْ سُوَرِ الْقُرْآنِ" یعنی ہم نے حکم نازل کیے، اس حال میں کہ قرآن کی سورتوں میں سے ایک سورت ہیں۔

﴿وَفَرَضْنٰهَا﴾ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے بہ تشدیدِ راء پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت بہ تخفیفِ راء ہے۔ تشدید کے ساتھ یہ معنی ہیں: "قَطَعْنَاهَا فِي الْإِنْزَالِ نَجْمًا نَجْمًا" (قاله أبو عمرو) یعنی ہم نے اس کو اتارنے میں ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔ فرض کہتے ہیں قطع کو اور تشدید تکثیر کے لیے ہے، یا مبالغے کے لیے، یا تاکیدِ ایجاب کے لیے، یا اس لیے کہ اس میں فرائض کی کثرت ہے، جیسے: زنا، قذف، لعان، استیذان اور غضِ بصر وغیرہ۔ مخفف کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس کی وحی کی اور اس کو مقطوع کیا، یعنی اس کو قطعی یقینی ٹھہرایا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس پر عمل کرنا تمھارے لیے لازمی کیا۔ کسی نے کہا کہ جو حدود اس میں ہیں ان کو مقدر کیا۔ فرض بہ معنی تقدیر ہے۔ اسی باب سے یہ آیت ہے: ﴿إِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ﴾ [القصص: ٨٥] "بلاشبہ وہ (اللہ) جس نے آپ پر قرآن کا حکم نازل کیا۔"[1] کسی نے کہا: اس کے معنی ہیں کہ ہم نے اس کو بیان کیا، یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس میں جو حکم ہے اُن کو قطعی طور پر واجب کیا، اس میں جو انتہائی تاکید ہے اور فرضیت ظاہر کرتی ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔

[1] فتح القدير (٤/ ٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٩٠)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ ﴾ "أَيْ: فِيْ غُضُوْنِهَا وَتَضَاعِيْفِهَا" یعنی ہم نے اس کے اثناء ومطاوی و پیچیدگیوں میں اور اس کے مضامین کی لپیٹ میں آیاتِ بینات کو اُتارا، یعنی ایسی آیات جن کی دلالت کھلی کھلی ہے۔ ہر حکم صاف صاف ہے۔ اس کے سمجھنے میں کسی طرح کی دقت نہیں۔ ﴿ اَنْزَلْنَا ﴾ کو دوبارہ ذکر کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس سورت کے اُتارنے کا اور اس کی شان کا کمال اہتمام کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس میں فرض احکام دیے گئے ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس سورت کے شروع میں تو کئی قسم کے احکام اور حدود ذکر کیے ہیں اور آخر میں توحید کی دلیلیں ذکر فرمائی ہیں۔ چنانچہ ﴿ وَفَرَضْنٰهَا ﴾ احکام کی طرف اشارہ ہے اور ﴿ اَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ﴾ دلائلِ توحید کی طرف اشارہ ہے جن کا اس سورت میں بیان کیا گیا ہے۔ جملہ ﴿ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ اس بات کی تائید کرتا ہے، کیوں کہ احکام معلوم نہ تھے، اس وقت تک کہ اُن کو یاد کرنے کا ہمیں حکم کیا جائے۔ رہے دلائلِ توحید تو اُن کے ظہور کے سبب سے، وہ ایسی چیز کی طرح تھے، جو معلوم تھی اس لیے اُن کو یاد کرنے کا حکم ہوا۔[1]

کسی نے کہا: ﴿ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ کے معنی "تَتَّعِظُوْنَ" ہیں، یعنی شاید تم نصیحت پذیر ہو۔ کسی نے کہا: قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ ﴾ آیاتِ بینات کی تفصیل ہے، جو مجمل ذکر کی گئیں۔ یہ مرفوع ہے بنا بر ابتدا اور خبر ﴿ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ ہے۔ یا خبر ہے ﴿ سُوْرَةٌ ﴾ کی، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ حرفِ فا کا دخول اس لیے ہے کہ مبتدا متضمن ہے معنی شرط کو امام اخفش کے مذہب کی بنا پر۔ امام سیبویہ کے مذہب پر محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فِيْمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ حُكْمُ الزَّانِيَةِ"[2] پھر اس کا بیان ﴿ فَاجْلِدُوْا ﴾ سے کیا۔

زنا مرد کا عورت سے اس کی فرج میں وطی کرنا ہے بغیر نکاح کے اور بغیر شبہ نکاح کے۔ کسی نے کہا ہے کہ داخل کرنا ہے فرج کو فرج میں، جو طبعاً مشتہی ہے اور شرعاً محرم ہے۔ "اَلزَّانِيَةُ: اَلْمَرْأَةُ الْمُطَاوِعَةُ لِلزِّنَا، اَلْمُمْكِنَةُ مِنْهُ" یعنی زانیہ وہ عورت ہے جو زنا کے لیے فرماں برداری اور موافقت کرتی ہے اور مرد کو اس کی قدرت دیتی ہے، جس طرح کہ صیغہ اس معنی کی خبر دیتا ہے، وہ مکرہہ نہیں ہے، یعنی جس سے زبردستی زنا کیا جاتا ہے اور اسی طرح زانی ہے۔ زانیہ کو زانی سے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ فعل میں اصل وہی ہے، کیوں کہ زنا کا باعث اس میں زیادہ ہے، اگر اس کا قدرت دینا زنا سے نہ ہوتا تو وہ واقع نہ ہوتا۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3] رہی یہ بات کہ یہاں تو عورت کو مقدم کیا اور آیتِ سرقہ میں اس کو مؤخر فرمایا؟! تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا جو متولد ہوتا ہے تو وقاع (جماع) کی شہوت سے پیدا ہوتا ہے اور جماع کی خواہش عورت میں زیادہ قوی اور اکثر ہوتی ہے۔

رہا سرقہ تو وہ دلیری، قوت اور جرأت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ امور مرد میں زیادہ قوی اور اکثر ہوتے ہیں۔ یہ امام کرخی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ کسی نے اس جگہ زانیہ کو زانی سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس وقت زنا

---

[1] تفسير الرازي (٢٣/ ١١٤) [2] فتح القدير (٤/ ٦) [3] تفسير أبي السعود (٦/ ١٥٦)

عورتوں میں اکثر تھا، یہاں تک کہ ان کے جھنڈے تھے، جو اُن کے دروازوں پر نصب کیے جاتے تھے، تاکہ جو کوئی اُن سے زنا کرنا چاہے تو اُن کو پہچان لے۔ کسی نے کہا ہے کہ عورتوں میں عار و ننگ اکثر ہوتی ہے۔ اُن کا موضوع پردہ داری اور بچاؤ ہے۔ چنانچہ سختی اور اہتمام کے لیے اُن کا ذکر پہلے کیا۔

جلد کہتے ہیں مارنے کو۔ عرب کی بول چال میں جب کوئی کسی کی جلد، یعنی چمڑے کو مارتا ہے تو کہتے ہیں: ''جَلَدَهُ'' اسی طرح جب کوئی کسی کے سر و شکم کو مارتا ہے تو بولتے ہیں: ''رَاسَهُ وَبَطَنَهُ''. ﴿ فَاجْلِدُوْا ﴾ میں خطاب اماموں (حکمرانوں) کو ہے اور اُن کو جو اُن کے قائم مقام ہیں۔ کسی نے کہا: سارے مسلمانوں کو ہے، اس لیے کہ حدوں کا قائم کرنا اُن سب پر واجب ہے اور امام اُن کی طرف سے نائب ہوتا ہے، کیوں کہ حدود قائم کرنے پر اُن کا مجتمع ہونا ممکن نہیں ہے۔ عیسیٰ بن عمر ثقفی، یحییٰ بن یعمر، ابو جعفر اور ابو شیبہ رحمہم اللہ نے ''اَلزَّانِيَةَ وَالزَّانِيَ'' کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ کہا ہے کہ سیبویہ کے نزدیک یہ قیاسی ہے، کیوں کہ سیبویہ کے نزدیک یہ ایسا ہے، جیسا کہ ''زَيْداً اِضْرِبْ'' ہے۔

رہے امام فراء، مبرد اور زجاج رحمہم اللہ تو اُن کے نزدیک رفع زیادہ بہتر ہے، جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے۔[1]
غرض کہ یہ حد جو یہاں مذکور ہے وہ مرد کے لیے ہے، جو زانی ہے آزاد، بالغ اور کنوارا ہے اور اسی طرح زانیہ کے لیے ہے۔ سال بھر کے لیے نکال دینا، اس جلد یعنی کوڑے لگانے سے زیادہ ہے۔ سنت سے ثابت ہوا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ تغریب (نکال دینا) امام کی رائے پر ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مرد کو کوڑے لگائے جائیں اور نکالا جائے اور عورت کو کوڑے لگائے جائیں اور نکالی نہ جائے۔ رہے غلام اور لونڈی تو اُن میں سے ہر ایک کو پچاس کوڑے مارے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت: ﴿ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ [النساء: ٢٥] ''پھر جب وہ نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد وہ بدکاری کریں تو ان کی سزا آزاد عورتوں کی سزا کا نصف ہے۔''

یہ صریح حکم ہے لونڈیوں کے بارے میں اور غلام اُن کے ساتھ شامل کیے گئے بسبب عدمِ فارق کے، یعنی ان میں فرق نہ ہونے کی وجہ سے۔ رہا وہ شخص جو آزاد مردوں میں سے شادی شدہ ہے تو اس کی سزا رجم ہے، جو سنتِ صحیحہ متواترہ اور اہلِ علم کے اجماع سے ثابت ہے، بلکہ قرآن سے جس کے لفظ منسوخ اور حکم باقی ہے۔ اہلِ علم کے ایک گروہ نے رجم کے ساتھ کوڑوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس باب میں جو حق ہے، اس کو ''شرح منتقی'' میں ذکر کیا ہے۔[2] حدِ زنا میں پوری طرح کلام گزر چکا ہے۔ یہ آیتِ کریمہ آیتِ حبس و آیتِ اذی کی ناسخ ہے جن کا ذکر سورۃ النساء میں آیا ہے۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے زیادہ کیا ہے کہ تغریب (نکالا جانا) آیت سے منسوخ ہے۔[4] یہ قول

[1] فتح القدير (٤/ ٧) [2] نيل الأوطار (٧/ ١٤٤) [3] رقم الآية (١٥۔ ١٦) [4] تفسير النسفي (٣/ ١٣٤)

صحیح نہیں ہے، کیوں کہ سنتِ صحیحہ نے اس کو ثابت کیا ہے، چنانچہ اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

﴿ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ ﴾ "تأخذ" تا و یا ہر دو کے ساتھ ہے۔ تا تو لفظ ﴿ رَاْفَةٌ ﴾ کی رعایت کے سبب سے ہے اور یا اس لیے ہے کہ ﴿ رَاْفَةٌ ﴾ کی تانیث مجازی ہے۔ دوسرے مفعول اور جار و مجرور کی فصل واقع ہو گئی ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں۔ "رَأَفَ يَرْأَفُ رَأْفَةً" بروزن "فَعْلَةٌ" و "رَآفَةٌ" بروزن "فَعَالَةٌ" جیسے: "نَشْأَةٌ وَنَشَاءَةٌ" دونوں بہ معنی رقت و رحمت کے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ رافت رحمت سے زیادہ رقیق ہے، یعنی رافت میں رحمت کی نسبت رقت زیادہ ہے۔ جمہور نے ﴿ رَاْفَةٌ ﴾ ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "رَأَفَةٌ" بفتح ہمزہ پڑھا ہے اور ابن جریج نے "رَآفَةٌ" بمد بروزن "فَعَالَةٌ" پڑھا ہے۔[1]

دین اللہ سے مراد اطاعت اور حکمِ الٰہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ ﴾ [يوسف: ٧٦] "وہ اس بادشاہ کے قانون کی رو سے تو اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتا تھا۔" معنی یہ ہیں کہ حدود کے پورا کرنے میں تم کو نرمی نہ پکڑے کہ تم ان کو معطل کر دو۔ یہ قول امام مجاہد، عکرمہ، عطاء، سعید بن جبیر، نخعی اور شعبی رحمہم اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تم ضرب کو خفیف کرو۔ یہ قول امام سعید بن مسیّب اور حسن رحمہما اللہ کا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدِ زنا وفریہ (یعنی قذف و بہتان) میں اجتہاد کیا جائے اور شراب کی حد میں تخفیف کی جائے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ زنا کی حد میں اجتہاد کیا جائے اور قذف کی حد میں اس سے تخفیف کی جائے اور اس سے کم حدِ شراب میں تخفیف کی جائے۔

پھر جن لوگوں کو اللہ پاک نے حدود جاری کرنے کا امر فرمایا، ان کی تثبیت کرتا ہے اور حدیں جاری کرنے پر ان کو برانگیختہ فرماتا ہے کہ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ جس طرح کہ کوئی شخص کسی کو کسی کام پر آمادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ اگر تو مرد ہے تو ایسا کر۔ اسی طرح یہ ہے کہ اگر تم توحید و بعث کو مانتے ہو، جس میں اعمال کی جزا ہو گی، تو تم حدوں کو معطل مت چھوڑو۔ اس میں اللہ کے لیے اور اس کے دین کے لیے غیظ و غضب کا بھڑکانا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لانا، اس کا مقتضا ہے کہ اللہ پاک کی اطاعت میں اور اس کے احکام کو جاری کرنے میں چستی و چالاکی کی جائے۔ یومِ آخر کا اس لیے ذکر کیا کہ مقصود اس سزا اور عذاب کا یاد دلانا ہے جو حدودِ الٰہی کو جاری کرنے میں سستی اور درگزر کرنے سے اور اُن کو معطل چھوڑ دینے سے قیامت کے دن ہو گا۔ حاصل یہ ہے کہ مومنوں پر واجب ہے کہ اللہ پاک کے دین میں سخت اور درشت ہوں اور سرعت و تیزی اور سختی کا برتاؤ کریں۔ حدودِ الٰہی کے پوری طرح جاری کرنے میں نرمی و سستی اور کمزوری ان کو نہ پکڑے۔ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کی اقتدا کافی ہے۔ دیکھو! فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں، لیکن حدودِ الٰہی کی تعظیم

---

[1] فتح القدير (٤/ ٧) [2] تفسير الطبري (٩/ ٩١-٩٢)

کے اظہار کے لیے اُن کے حق میں اس طرح ارشاد فرمایا: «لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا»[1]

﴿ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی چاہیے کہ زانی اور زانیہ کی سزا میں مومنین کا ایک طائفہ حاضر ہو، جس وقت کہ اُن پر حد قائم کی جائے۔ یہ حضور "نُدْبًا" ہے۔ حضور کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی سزا میں اُن سے عبرت لینے میں اور اُن کی رسوائی اور عار کے شائع ہونے میں اور اُن کی فضیحت کے مشہور ہونے میں خوب زیادتی ہو۔ طائفہ وہ فرقہ ہے کہ کسی شے کے گرداگرد آنے والا ہو۔ یہ طوف سے ماخوذ ہے۔ طوف گرد پھرنے کو کہتے ہیں۔ طائفہ کی سب سے قلیل تعداد تین آدمی ہیں، کیوں کہ یہ اقل جمع ہے اور قول پہلے گزر چکے ہیں۔ امام پر اور گواہوں پر واجب نہیں کہ وہ رجم کے وقت حاضر ہوں، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ماعز اور غامدیہ رضی اللہ عنہما کے رجم کا حکم دیا اور خود تشریف نہیں لے گئے۔ مومنین کا حاضر ہونا خاص کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس میں زیادہ تر رسوائی ہے اور فاسق شخص قوم کے صالح لوگوں کے درمیان زیادہ تر تخجل (شرمندہ) ہوتا ہے۔ "جَلد" کا نام عذاب رکھا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جَلد سزا ہے۔ پھر اللہ پاک نے ایک ایسی بات ذکر کی جو زانی اور زانیہ کے ساتھ خاص ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾

زانی مرد نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ عورت ہی سے اور زانیہ عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک مرد ہی۔ اور مومنوں پر یہ (زنا کار سے نکاح) حرام ٹھہرایا گیا ہے ③

زانی مرد وزن کی آپس میں زنا ونکاح کی رغبت:

مرد اگر بدکار ہو تو عورت پارسا نہ بیاہ لائے اور اگر نیک ہو تو عورت بدکار نہ لائے۔ دو وجہ سے: ایک یہ کہ اس کا کفو نہیں، اس کو عار ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک سے دوسرے کو علت نہ لگ جائے، لیکن اگر کرے تو درست ہے، مگر مرد کو بدکار عورت درست نہیں، جب تک وہ بدکاری کرتی رہے اور اگر توبہ کر لے تو درست ہے۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے خبر ہے کہ زانی وطی نہیں کرتا، مگر زانیہ سے یا مشرکہ سے، یعنی اس کی زنا کی مراد پر فرماں برداری نہیں کرتی، مگر زانیہ، گنہگار یا مشرک جو زنا کو حرام نہیں سمجھتی، اسی طرح زانی عورت ہے کہ اس سے نکاح نہیں کرتا، مگر زانی، یعنی وہ شخص جو اپنے زنا کی وجہ سے گنہگار ہے یا مشرک جو اس کو حرام نہیں سمجھتا۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ یہ نکاح نہیں ہے یہ تو جماع ہے، معنی یہ ہیں کہ زنا نہیں کرتا، اس سے مگر زانی یا مشرک۔ (وهذا إسناده عنه صحيح وقد روي عنه من غير وجه أيضا) امام مجاہد،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٨٨)

عکرمہ، سعید بن جبیر، عروہ بن الزبیر، ضحاک، مکحول اور مقاتل بن حیان اور بہت سے لوگوں سے اسی طرح مروی ہے۔[1]

﴿ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی اس کام میں غور وخوض کرنا اور زانیہ عورتوں سے نکاح کرانا یا پارسا عورتوں کا فاجر اور بدکار مردوں سے بیاہ دینا ایمان والوں پر حرام کیا گیا ہے۔ امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے بروایت سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ اللہ نے زنا کو مومنین پر حرام کیا ہے۔ امام قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے مومنوں پر زانی عورتوں سے نکاح حرام کیا ہے۔[2] یہ آیت اس آیت کی طرح ہے۔ ﴿ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ﴾ [النساء: ۲۵] ''وہ پاک دامن ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چوری چھپے آشنا بنانے والی ہوں۔''

جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ﴾ [المائدة: ۵] ''نیز انھیں نکاح کی قید میں لانے والے بنو نہ کہ بدکاری کرنے والے اور نہ چھپی آشنائی رکھنے والے۔'' اسی جگہ سے امام احمد رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ پارسا مرد کا زانیہ عورت سے نکاح صحیح نہیں ہے، جب تک کہ وہ زانیہ ہے، یہاں تک کہ اس سے توبہ طلب کی جائے، پھر اگر توبہ کر لی تو نکاح صحیح ہوا اور اگر توبہ نہ کی تو صحیح نہیں اور اسی طرح آزاد پارسا عورت کا نکاح فاجر زانی مرد سے کرانا صحیح نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ صحیح طور پر توبہ کرے۔ اس لیے کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مسلمین میں سے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت کے بارے میں جس کو اُم مہزول کہتے تھے، اذن مانگا، یعنی اس سے نکاح کرنے کے لیے۔ وہ عورت زنا کیا کرتی تھی اور اس کے واسطے یہ شرط کرتی تھی کہ اس پر خرچ کرے، یعنی اس کو اپنی طرف سے خرچہ دے۔ اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اذن طلب کیا، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عورت کا حال ذکر کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ﴾۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت تھی اسے اُم مہزول کہتے تھے اور وہ زنا کیا کرتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک شخص نے چاہا کہ اس سے نکاح کرے، اس پر اللہ عزوجل نے آیتِ باب نازل کی۔[3]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ روایت کیا ہے کہ ایک شخص تھا، اسے مرثد بن ابی مرثد کہتے تھے۔ یہ شخص قیدیوں کو مکے سے لاد کر لاتا، یہاں تک کہ ان کو مدینے میں لے آتا تھا اور ایک زانیہ عورت مکے میں تھی، اسے عناق کہتے تھے۔ یہ عورت اس شخص کی دوست تھی۔ اس نے مکہ کے قیدیوں میں سے ایک شخص سے وعدہ کیا

---

[1] تفسیر الطبري (۱۹/ ۹۹۔ ۱۰۰) تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۵۲۱۔ ۲۵۲۲) [2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۴۹)

[3] مسند أحمد (۲/ ۱۵۸) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٤١٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد ثقات" (مجمع الزوائد: ۷/ ۱۷٦)

تھا کہ اس کو اُٹھالے جائے۔ وہ شخص کہتا ہے کہ میں آیا، یہاں تک کہ چاندنی رات میں مکہ کی دیواروں میں سے ایک دیوار کے سایہ تک پہنچا۔ کہا: پس عناق آئی تو اس نے دیوار کے سائے میں سیاہی دیکھ لی، پھر جب وہ مجھ تک پہنچی تو مجھے پہچان لیا، بولی مرثد تو ہے؟ میں نے کہا: ہاں مرثد ہوں۔ کہا: "مَرْحَباً وَّأَهْلًا" آج کی رات ہمارے پاس بسر کر۔ میں نے کہا: اے عناق! اللہ نے زنا حرام کیا ہے۔ عناق نے کہا: اے خیمہ والو! یہ وہ شخص ہے جو تمھارے قیدیوں کو اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ کہا: آٹھ آدمی میرے پیچھے آئے تو میں نے خندمہ کی راہ لی۔ (ابن کثیر میں اصل خندق ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ ترمذی میں خندمہ ہے یہ ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مکہ کے نزدیک ہے۔[1] كذا في مجمع البحار)

پھر میں ایک غار کی طرف پہنچا تو میں اس میں داخل ہو گیا (کہف پہاڑ میں کولے ہوئے گھر کی طرح یا غار کی طرح ہوتی ہے، مگر اتنی بات ہے کہ کہف فراخ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ چھوٹا ہو تو غار ہے۔ كذا في القاموس) چنانچہ وہ لوگ آئے، یہاں تک کہ وہ میرے سر پر کھڑے ہو گئے، پھر انھوں نے پیشاب کیا، جو میرے سر پر آیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ان کو اندھا کر دیا۔ پھر وہ لوٹ گئے تو میں اپنے صاحب کی طرف آیا اور اس کو اُٹھا لیا، یہ شخص بھاری آدمی تھا۔ جب میں اذاخر (ابن کثیر و ترمذی میں اصل اذخر ہے، لیکن مجمع البحار میں ہے کہ اذاخر حرمین کے درمیان ایک جگہ ہے، اذخر کی جمع کے ساتھ اس کا نام رکھا ہے) تک پہنچا تو میں نے اس کی بیڑیاں (ابن کثیر میں احبلہ ہے اور ترمذی میں اکبلہ ہے جمع کبل بہ معنی قید) کھول دیں۔

پھر میں اسے لادنے لگا، یعنی پیٹھ پر اور وہ مجھے تھکا دیتا تھا، یعنی موٹاپے کی وجہ سے، یہاں تک کہ میں مدینے میں آیا۔ پھر میں رسول ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں عناق سے نکاح کر لوں، میں عناق سے نکاح کر لوں، دو بار کہا۔ رسول اللہ ﷺ رک گئے، مجھے کچھ جواب نہ دیا، یہاں تک کہ ﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ ... الآية﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے مرثد! زانی نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ سے یا مشرکہ سے سو تو اس سے نکاح مت کر۔[2] (ثم قال الترمذي: هذا حديث حسن غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه، وقد رواه أبو داود والنسائي في كتاب النكاح من سننيهما من حديث عبيد الله بن الأخنس به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نہیں نکاح کرتا ہے زانی مجلود (جس کو زنا کی حد ماری گئی ہے) مگر اپنی مثل سے۔[3] (وهكذا أخرجه أبو داود في سننه عن مسدد وأبي معمر عن عبيد الله بن عمر وكلاهما عن عبد الوارث به) امام احمد نے عبداللہ بن یسار مولیٰ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٢/ ١١٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٥١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٢٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٢٩٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٢٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٠٨)

روایت کیا، کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ البتہ میں نے سنا سالم سے، وہ کہتے تھے کہ عبداللہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: تین آدمی ہیں جو جنت میں داخل نہ ہوں گے اور نہ ہی قیامت کے دن اللہ اُن کی طرف نظر کرے گا: اپنے ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا اور زن مترجلہ، یعنی وہ عورت جو مردوں کی مشابہت کرتی ہے اور دیوث۔ اور تین آدمی ہیں کہ قیامت کے دن اللہ اُن کی طرف نظر نہ کرے گا: اپنے والدین کا نافرمان اور ہمیشہ شراب پینے والا اور کوئی چیز دے کر اس کا احسان جتلانے والا۔[1] (رواه النسائي عن عمرو بن علي الفلاس عن يزيد بن زريع عن عمر بن محمد العمري عن عبدالله بن يسار به) نیز امام احمد نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: تین شخص ہیں، جن پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے: ہمیشہ شراب پینے والا اور اپنے والدین کا نافرمان اور وہ شخص جو اپنے اہل میں، یعنی بیوی میں خبث، یعنی زنا کو برقرار رکھتا ہے۔[2]

امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جنت میں دیوث داخل نہ ہوگا۔[3] اس سے ان حدیثوں کے لیے استشہاد کیا جاتا ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔ امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص ارادہ کرے اس بات کا کہ اللہ سے اس حالت میں ملے کہ وہ طاہر اور مطہر ہو تو اسے چاہیے کہ آزاد عورتوں سے نکاح کرے،[4] اس کی اسناد میں ضعف ہے۔ امام ابو نصر اسماعیل بن حماد جوہری نے اپنی کتاب صحاح لغت میں کہا ہے کہ دیوث قنذع ہے۔ قنذع وہ شخص ہے جس کو کچھ غیرت نہیں ہوتی ہے۔[5]

رہی وہ حدیث جس کو نسائی نے اپنی سنن کی کتاب نکاح میں روایت کیا ہے۔ (أخبرنا محمد بن إسماعيل ابن علية عن يزيد بن هارون عن حماد بن سلمة وغيره عن هارون بن زياد عن عبد الله بن عبيد بن عمير وعبد الكريم عن عبد الله بن عبيد بن عمير عن ابن عباس۔ عبد الكريم رفعه إلى ابن عباس وهارون لم يرفعه، قال: جاء رجل... الخ) کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ عرض کی: میرے نزدیک ایک عورت ہے جو سب لوگوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے اور حال یہ ہے کہ وہ کسی چھونے والے کے ہاتھ کو منع نہیں کرتی۔ فرمایا تو اسے طلاق دے دے۔ عرض کی: مجھے اس سے کسی طرح کا صبر نہیں ہے۔ فرمایا کہ تو اس سے نفع لے۔ پھر امام نسائی رحمہ اللہ نے کہا

---

(1) مسند أحمد (٢/ ١٣٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٦٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٧٤)

(2) مسند أحمد (٢/ ٦٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٥٢)

(3) مسند الطيالسي (١/ ٨٩) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ البتہ گزشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

(4) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٦٢) اس کی سند میں "کثیر بن سلیم اور سلام بن سوار" ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٤١٧)

(5) الصحاح للجوهري (٢/ ٣٠٥)

ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ عبدالکریم راوی قوی نہیں ہے اور ہارون اس سے اثبت ہے، عبدالکریم نے اس کو ابن عباس رضی اللہ عنہما تک مرفوع کیا ہے اور ہارون نے مرسل ذکر کیا ہے۔ ہارون ثقہ ہے، اس کی حدیث عبدالکریم کی روایت کردہ حدیث سے اولیٰ بصواب ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالکریم ابن ابی المخارق بصری مؤدب تابعی ضعیف الحدیث ہے اور ہارون بن زیاد نے اس کی مخالفت کی ہے، حالاں کہ وہ تابعی ثقہ مسلم کے رجال سے ہے۔ چنانچہ اس کی حدیث مرسل اولیٰ ہے، جس طرح نسائی نے کہا ہے۔ "وَلٰكِنْ قَدْ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ فِي الطَّلَاقِ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ رَاهُوَيْهِ عَنِ النَّضْرِ ابْنِ شُمَيْلٍ عَنْ حَمَّادِ بْنِ سَلَمَةَ عَنْ هَارُوْنَ بْنِ زِيَادٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُبَيْدِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما مُسْنَداً فَذَكَرَهُ بِهٰذَا الْإِسْنَادِ فَرِجَالُهُ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ إِلَّا أَنَّ النَّسَائِيَّ أَيْضًا وَأَبُوْ دَاوٗدَ عَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ حُرَيْثٍ أَخْبَرَنَا الْفَضْلُ بْنُ مُوْسٰى أَخْبَرَنَا الْحُسَيْنُ بْنُ وَاقِدٍ عَنْ عَمَّارَةَ بْنِ أَبِيْ حَفْصَةَ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فَذَكَرَهُ وَهٰذَا الْإِسْنَادُ جَيِّدٌ"

اس حدیث میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے، بعض نے تو اس کو ضعیف کہا ہے، جیسا کہ امام نسائی رحمہ اللہ سے گزر چکا ہے۔ بعض نے اس کو منکر کہا ہے، جس طرح کہ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے جو ارادہ کیا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ عورت سخی ہے۔ کسی سائل کو منع نہیں کرتی ہے۔ نسائی نے اس قول کو اپنی سنن میں بعض سے نقل کیا ہے: "فَقَالَ: وَقِيْلَ: سَخِيَّةٌ تُعْطِيْ" اس قول کو یوں رد کیا ہے کہ اگر مراد یہ ہوتی تو یوں کہتا: "لَا تَرُدُّ يَدَ مُلْتَمِسٍ" کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ اس کی خصلت یہ ہے کہ وہ کسی چھونے والے کے ہاتھ کو رد نہیں کرتی، یہ مراد نہیں کہ اس سے یہ فعل واقع ہے اور وہ زنا کرتی ہے، کیوں کہ جس عورت کی یہ صفت ہے، اس کو ساتھ رکھنے کی رسول اللہ ﷺ اجازت نہیں دیں گے، کیوں کہ اس حالت میں اس کا خاوند دیوث ہوگا، حالاں کہ اس پر وعید گزر چکی ہے، لیکن چوں کہ اس کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی کہ جو کوئی تنہائی کی حالت میں اس سے زنا کا ارادہ کرے تو اس کی طبیعت میں یہ بات نہ تھی کہ اس کی مخالفت کرے، اسے روک دے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کے جدا کرنے کا حکم دیا، پھر جب اس شخص نے ذکر کیا کہ وہ اسے دوست رکھتا ہے تو آپ نے اس کے ساتھ باقی رہنے کو مباح فرمایا۔ اس لیے کہ خاوند کی اس کے ساتھ محبت تو حقیقی تھی اور اس سے زنا کا وقوع ایک وہم تھا، لہٰذا توہم آجل کی وجہ سے ضررِ عاجل کی طرف منتقل نہیں ہوا جاتا۔ و اللّٰه سبحانه و تعالیٰ أعلم.[2]

(قال في مجمع البحار: فاستمتع بها، أي: لا تمسكها إلا بقدر ما تقضي متعة النفس منها ومن غيرها، وخاف ﷺ أن تتوق نفسه إليها فيقع في الحرام إن طلقها فلم يوجبه عليه،

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٢٩) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٥٠۔ ٣٥١)

وقيل: معناه أنها تعطي من ماله من يطلبه. وهو أشبه لأنه لم يكن ليأمره بإمساكها وهي تفجر، وفيه أن إمساك الفاجرة غير محرم سيما إذا كان مولعا بها ويخاف الاضطرار على نفسه لو طلقها. انتهى.[1] کہا ہے کہ پھر جب توبہ حاصل ہو جائے تو تزویج (نکاح کرنا) حلال ہے، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ شعبہ مولیٰ ابن عباس رحمہ اللہ نے کہا: میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا اور اُن سے کسی شخص نے پوچھا کہ میں ایک عورت سے قریب ہوا کرتا تھا۔ جو اللہ عزوجل نے مجھ پر حرام کیا ہے میں اس سے کیا کرتا تھا۔ پھر اللہ عزوجل نے مجھے اس سے توبہ کی توفیق دی تو میں نے چاہا کہ اس سے نکاح کر لوں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ﴾ اس پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ اس میں نہیں ہے، تو اس سے نکاح کر لے۔ پھر جو گناہ ہوگا تو وہ مجھ پر ہے۔[2] علماء کے ایک گروہ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یحییٰ عن سعید بن مسیّب سے روایت کیا ہے کہ ان کے نزدیک ﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ ...الخ﴾ کا ذکر ہوا تو وہ بولے: کہا جاتا تھا کہ اس کو اس کے بعد کی آیت نے منسوخ کر دیا۔ ﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ [النور: ٣٢] ''اور تم اپنے بے نکاح مردوں، عورتوں کے نکاح کر دو۔'' کہا کہ کہا جاتا تھا کہ ایامی مسلمین میں سے۔[3] اسی طرح امام ابو عبید قاسم بن سلام نے کتاب ناسخ و منسوخ میں اس کو سعید بن مسیّب سے روایت کیا ہے۔ امام ابو عبداللہ محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ نے بھی اس پر نص فرمائی ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ غالب بات یہ ہے کہ جو شخص زنا کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ صالح نیک بی بیوں کے نکاح میں رغبت نہیں کرتا ہے اور زانی بدکار عورت میں صالح نیک لوگ راغب نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک جیسا ہونا علت ہے اُلفت و اتفاق کی اور مخالفت نفرت و افتراق کا سبب ہے۔ اہلِ علم نے اس آیت کے معنی میں کئی قولوں پر اختلاف کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مقصود زنا اور اہلِ زنا کی تشنیع و توبیخ ہے اور زنا مومنوں پر حرام کیا گیا ہے اور نکاح کے معنی وطی ہوں گے نہ کہ عقد، یعنی زانی زنا نہیں کرتا، مگر زانیہ سے اور زانیہ زنا نہیں کرتی مگر زانی سے۔ مشرکہ و مشرک کا ذکر اس لیے زیادہ کر دیا کہ شرک گناہ کے لحاظ سے زنا سے عام تر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس قول کو ایسے رد کیا ہے کہ کتاب اللہ میں نکاح تزویج کے معنی میں معروف ہے۔ اس کا رد یوں رد کیا ہے کہ نکاح تزویج اور وطی کے معنی میں کتاب اللہ میں ثابت ہے۔ اسی بارے میں یہ آیت ہے: ﴿ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ﴾ [البقرة: ٢٣٠] ''جب تک کہ وہ عورت اس کے سوا دوسرے سے نکاح نہ کرے۔''

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٥٠٧)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٢١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٢٤)
[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٤٨_ ٣٥١)

نبی اکرم ﷺ نے بیان فرما دیا ہے کہ اس نکاح سے مراد وطی ہے۔[1] جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ ﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً ﴾ کے معنی "لَا يَزْنِيْ اِلَّا بِزَانِيَةٍ" ہیں، ان میں سے سعید بن جبیر رحمہ اللہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ رحمہ اللہ ہیں، جیسا کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا: یہ نکاح نہیں ہے، لیکن جماع ہے۔ اس سے نہیں زنا کرتا، جب کہ وہ زنا کرتی ہے، مگر زانی یا مشرک۔[2] خطابی رحمہ اللہ نے اس قول کو اُن سے نقل کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت خاص ایک عورت کے حق میں نازل ہوئی ہے جس کو ام مہزول کہتے تھے تو یہ اسی کے ساتھ خاص ہوگی، جیسا کہ خطابی رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما (حافظ ابن کثیر کے الفاظ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بغیر واو کے ہیں) سے مروی ہے کہ زنِ مذکور زنا کیا کرتی تھی اور شرط کرتی تھی کہ جو اس سے زنا کرے، اس کو نفقہ دے۔ (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "وَتَشْتَرِطُ لَهُ أَنْ تُنْفِقَ عَلَيْهِ" یعنی وہ عورت مردِ زانی کا نفقہ اپنے ذمے شرط کر لیتی تھی۔ (مصحح)) چنانچہ ایک صحابی نے چاہا کہ اس سے نکاح کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[3] (أخرجه أحمد والنسائي والحاكم وصححه وغيرهم) یہ قصہ پہلے گزر چکا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ایک مسلمان کے حق میں نازل ہوئی ہے تو اسی کے ساتھ خاص ہوگی۔ (قاله مجاهد)

چوتھا قول یہ ہے کہ اصحابِ صفہ کے بارے میں اتری ہے تو انہیں کے ساتھ خاص ہوگی۔ (قاله أبو صالح)

پانچواں قول یہ ہے کہ زانی اور زانیہ سے مراد وہ ہیں جن پر حد جاری ہو چکی ہے۔ اس قول کو امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے حسن رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے۔ کہا کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے ایک حکم ہے۔ لہٰذا زانی محدود (جس پر حد لگائی گئی ہے) کو جائز نہیں کہ وہ نکاح کرے، مگر زانیہ محدودہ سے۔ اسی کے مثل ابراہیم نخعی سے بھی مروی ہے اور اسی کے قائل امام شافعی رحمہ اللہ کے بعض اصحاب ہیں۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول جس طرح نظر کی راہ سے صحیح نہیں ہے، اسی طرح نقل کی رو سے بھی ثابت نہیں ہوتا ہے۔ چھٹا قول یہ ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس قول سے منسوخ ہے: ﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ [النور: ٣٢] امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر اکثر علماء ہیں۔[4]

ساتواں قول یہ ہے کہ یہ حکم غالب پر بنا کیا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ غالب زانی رغبت نہیں کرتے، مگر اپنے جیسی زانیہ سے نکاح کرنے میں، اور غالب زانی میں رغبت نہیں کرتیں، مگر اپنے جیسے زانی مردوں سے نکاح کرنے میں۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فاسق خبیث، جس کی شان سے زنا ہے، وہ نیک عورت کے نکاح کی رغبت نہیں کرتا، وہ تو اپنے جیسی فاسق عورت کے نکاح میں راغب ہوتا ہے یا مشرکہ عورت میں، اور فاسق عورت نیک مرد کے نکاح میں رغبت نہیں رکھتی، بلکہ اس سے نفرت کرتی ہے، وہ تو اسی شخص میں رغبت کرتی ہے جو

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ١٦٧۔ ١٦٨)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ٩٩۔ ١٠٠)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] تفسير القرطبي (١٢/ ١٦٨۔ ١٦٩)

فاسقوں اور مشرکوں میں سے اسی کی جنس کا ہے، چنانچہ یہ عمومیت اور اغلب کی بنا پر ہے، جس طرح محاورے میں بولتے ہیں کہ خیر نہیں کرتا ہے، مگر مردِ تقی، حالاں کہ جو تقی نہیں، کبھی وہ بھی خیر کرتا ہے، لہٰذا اسی طرح اس جگہ ہے۔ ﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً ﴾ اور ﴿ وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ﴾ کے درمیان یہ فرق ہے کہ پہلا کلام اس پر دال ہے کہ زانی زانیہ ہی کے نکاح میں رغبت کرتا ہے، بخلاف زانیہ کے کہ وہ کبھی غیر زانی کے نکاح میں رغبت کرتی ہے۔ لہٰذا اس بات کو دوسرے کلام سے لازمی طور پر بیان کر دیا۔ مقصود مومنین کو زانی عورتوں کے نکاح سے زجر کرنا ہے، اس کے بعد کہ اُن کو زنا سے زجر کیا۔ یہ قول سب قولوں سے زیادہ تر راجح ہے اور سببِ نزول اس کی شہادت دیتا ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔[1]

نکتہ:

اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس سے پہلے کی آیت میں زانیہ کو زانی سے پہلے رکھا گیا۔ پھر اس آیت میں زانی کو زانیہ سے پہلے رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آیت اُن کی عقوبت کے لیے ذکر کی گئی ہے، اس جنایت (گناہ) کی بنا پر جو انھوں نے کی ہے اور جس مادے سے وہ جنایت پیدا ہوئی ہے وہ عورت ہی ہے، کیوں کہ اگر وہ مرد کو طمع نہ دیتی اور اسے اشارہ نہ کرتی اور اس کو قدرت نہ دیتی تو مرد طمع نہ کرتا، نہ ہی وہ قادر ہوتا۔ لہٰذا جبکہ اسباب میں وہ اصل ٹھہری، اس لیے اس کے ذکر سے ابتدا کی گئی۔ رہی دوسری آیت تو وہ نکاح کے ذکر کے واسطے بیان کی گئی ہے اور نکاح میں مرد اصل ہے، کیوں کہ وہ پیغام کرنے والا ہے اور طلب اسی سے شروع ہوتی ہے، اس واسطے یہاں اس سے ابتدا کی۔

مسئلہ:

جس عورت سے زنا کیا ہے، پھر اس سے نکاح کرنے کا کیا حکم ہے؟ اس کے جواز میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ نکاح کے جواز کے قائل ہیں اور ابن عباس، عمر، ابن مسعود اور جابر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ جائز نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: جبکہ مرد نے عورت سے زنا کیا، پھر اس سے نکاح کیا اس کے بعد تو وہ دونوں ہمیشہ زانی ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2]

﴿ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ زانی عورتوں کا یہ زنا یا نکاح اخیار ابرار مومنوں پر حرام ہے، کیوں کہ اس میں تشبہ ہے فاسقون سے اور متعرض ہونا ہے تہمت وطعن فی النسب سے اور بدگوئی کے لیے سبب بنتا ہے، نیز اس کے سوا اور مفاسد ہیں۔ خطا کار لوگوں کی مجالست و ہم نشینی میں کس قدر اکتسابِ آثام کا متعرض ہونا ہوتا ہے۔ پھر جب زانی قحبہ بدکار عورتوں سے نکاح کیا جائے تو اس کے مفاسد کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ لہٰذا مومن

---

[1] فتح البیان (۹/ ۱٦۷۔ ۱٦۹) [2] فتح القدیر (٤/ ۸)

متدین کو لازم ہے کہ اپنے نفس کو اس عادت میں نہ ڈالے اور اس کو بچائے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ نکاح فقط مکروہ ہے۔ کراہتِ تنزیہ کی تعبیر تحریم سے کی گئی ہے زجر میں مبالغے کے لیے۔ اس آیت میں جو آثار وارد ہوئے ہیں اکثر تو پہلے مذکور ہو چکے، لیکن بعض میں بعض الفاظ کا فرق ہے اور بعض جدید ہیں۔ اس لیے مکمل فائدے کے لیے یہاں لکھے جاتے ہیں:

1 شعبہ مولیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں اُن کے ساتھ تھا کہ ایک شخص اُن کے پاس آیا۔ عرض کی کہ میں ایک عورت کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ پھر میں اس سے اس شے کو پہنچا جو اللہ نے مجھ پر حرام کی ہے اور اب اللہ نے مجھے اس سے توبہ کی توفیق دی ہے۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ اس سے نکاح کر لوں تو لوگوں نے کہا: ﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً ﴾ اس پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ اس آیت کی جگہ نہیں ہے۔ وہ تو عورتیں بغایا متعالیات تھیں (اصل میں اسی طرح ہے۔ کسی روایت میں بغایا معلومات ہے۔ کسی میں بغایا معلنات ہے، حاصل سب کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشہور و معروف رنڈیاں تھیں)، اپنے دروازوں پر جھنڈے کھڑے کرتی تھیں، لوگ اُن کے پاس آتے، اس سے وہ پہچانی جاتی تھیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ تو اس سے نکاح کر لے۔ پھر جو اس میں کوئی گناہ ہوگا تو وہ مجھ پر ہے۔

2 سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا۔ پھر اس نے زنا کیا تو اس پر حد قائم کی گئی۔ پھر اس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس لائے تو آپ نے اس کے اور اس کی عورت کے درمیان علاحدگی کرا دی اور فرمایا کہ مت نکاح کر، مگر اپنے جیسی زنِ مجلود سے، یعنی ایسی عورت سے جس پر حد قائم کی گئی ہو۔

3 امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جاہلیت میں زانیہ عورتیں تھیں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک عورت خوبصورت تھی، اسے اُم جمیل کہتے تھے۔ مسلمانوں میں سے کوئی مرد اُن عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرتا، تاکہ اپنی خرچی سے اس کو نفقہ دے۔ اللہ پاک نے منع فرمایا کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اُن سے نکاح کرے۔ یہ مرسل ہے۔

4 امام عبد بن حمید رحمہ اللہ نے سلیمان بن یسار سے اس جیسی مختصر روایت کی ہے۔

5 امام عطا رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: جاہلیت میں زانیہ عورتیں تھیں بغایا آلِ فلاں، بغایا آلِ فلاں، یعنی یوں مشہور تھیں کہ فلاں قوم کی رنڈیاں، فلاں قوم کی رنڈیاں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً ﴾ فَأَحْكَمَ اللّٰهُ ذَلِكَ فِيْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ. اسی کے مثل تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔

6 ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت کھلم کھلا زنا کرنے والی عورتوں کے حق میں نازل ہوئی ہے، یہ عورتیں جاہلیت میں تھیں اور زانیہ مشرکہ تھیں۔ لہٰذا اللہ پاک نے اُن کا نکاح مومنین پر حرام فرمایا ہے۔

7 امام ضحاک رحمہ اللہ نے اس آیت میں کہا ہے کہ اس نکاح سے جو مراد ہے وہ زنا ہے، تزویج مراد نہیں ہے۔

امام سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمہ اللہ سے بھی اس کی مثل مروی ہے۔

8 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ زانی اہلِ قبلہ کا صرف اپنے قبلہ والی زانیہ سے ہی زنا کرتا ہے، یا مشرکہ غیر اہلِ قبلہ سے زنا کرتا ہے اور اہلِ قبلہ کی زانیہ صرف اپنے قبلہ والے زانی ہی سے زنا کرتی ہے۔ یا غیر اہلِ قبلہ کے مشرک سے زنا کرتی ہے اور زنا مومنوں پر حرام کیا گیا ہے۔

9 عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ عورتیں معلومات تھیں، یعنی لوگ اُن کو جانتے تھے۔ چنانچہ فقرائے مسلمین میں سے کوئی مرد اُن عورتوں میں سے کسی عورت سے نکاح کرتا، تاکہ وہ اس پر خرچ کرے تو اللہ پاک نے اس سے منع فرمایا۔ ان سب کی تخریج فتح القدیر میں مذکور ہے۔[1]

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝٤ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٥

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، پھر وہ چار گواہ نہیں لاتے، تو تم انھیں اَسّی کوڑے مارو، اور تم ان کی شہادت (گواہی) کبھی قبول نہ کرو اور یہی لوگ نافرمان ہیں ④ مگر اس کے بعد جن لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی، تو بلاشبہ اللہ غفور رحیم ہے ⑤

حدِ قذف کا بیان:

پاک دامن عورتیں، یعنی کبھی اُن کو بری بات میں نہیں دیکھا اور یہی حکم ہے جو مرد کو عیب لگائے۔ عیب بدکاری کو کہا ہے۔ انتھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ میں تہمت لگانے والے کو کوڑے مارنے کا حکم ہے، جو پاک دامن عورت کو تہمت لگاتا ہے۔ ”مُحْصَنَةٌ“ بالغ پارسا عورت کو کہتے ہیں۔ پھر جس کو تہمت لگائی ہے، وہ اگر مرد ہو تو اسی طرح اس تہمت لگانے والے کو بھی کوڑے لگائے جائیں گے۔ اس بارے میں علماء کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ پھر اگر تہمت لگانے والا اپنی کہی ہوئی بات کے صحیح ہونے پر گواہ قائم کر دے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ پس تہمت لگانے والا جبکہ اپنے قول کی صحت پر گواہ قائم نہ کرے گا تو اللہ پاک نے اس پر تین حکم واجب فرمائے ہیں: ایک یہ ہے کہ اسّی (۸۰) چوٹ (کوڑے)

[1] فتح القدير (٤/ ٩-١٠)

مارا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کی گواہی ہمیشہ کے لیے مردود ہو۔ تیسرا یہ کہ وہ فاسق ہو گا۔ عادل نہ رہے گا، نہ اللہ کے نزدیک اور نہ لوگوں کے نزدیک۔

مقذوف کی توبہ کا بیان:

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا ﴾۔ علما نے اس استثنا میں اختلاف کیا ہے کہ آیا فقط اخیر جملے کی طرف راجع ہوتا ہے تو توبہ صرف فسق کو رفع کرے گی اور ہمیشہ کے لیے مردود الشہادۃ باقی رہے گا، اگرچہ توبہ کر لی، یا دوسرے تیسرے جملوں کی طرف بھی عائد ہوتا ہے۔ رہی جلد (یعنی کوڑوں کی سزا) وہ تو ہو چکی، برابر ہے کہ توبہ کرے یا اسی پر ڈٹا رہے، اس کے لیے اس کے بعد کوئی حکم نہیں ہے بلا خلاف۔ چنانچہ امام مالک، امام احمد اور امام شافعی رحمہم اللہ اس طرف گئے کہ جس وقت وہ توبہ کر لے گا تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی اور فسق کا حکم اس سے دور ہو جائے گا۔ سعید بن میسّب سید التابعین اور سلف کی ایک جماعت نے بھی اس پر تصریح کی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ استثنا صرف آخری جملے کی طرف راجع ہوتا ہے، لہٰذا توبہ کے سبب سے فسق اس سے دور ہو جائے گا اور مردود الشہادۃ ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا۔ سلف میں سے جو لوگ اس طرف گئے ہیں، ان میں سے یہ حضرات بابرکات ہیں: قاضی شریح، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، مکحول اور عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر رحمہم اللہ۔ شعبی اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس کی گواہی قبول نہ کی جائے گی، گو وہ توبہ کر لے، مگر یہ کہ اپنی جان پر اس بات کا اقرار کر لے کہ واقعی اس نے بہتان کیا تو اس وقت اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔[1] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

اصل لغت میں "رمی" انداختن کو کہتے ہیں، یعنی کسی شے کے ڈالنے پھینکنے کو، جیسے: کھجور کھا کر گٹھلی پھینک دینا، یا تیر پھینکنا یا پتھر پھینکنا، یا ڈھیلا مارنا، لیکن یہاں رمی کا استعارہ کیا ہے فاحشہ زنا کی گالی دینے کے لیے۔ دونوں میں علاقہ و مناسبت یہ ہے کہ جس طرح کسی کو پتھر مار دینا جنایت (جرم) بالفعل ہے۔ اسی طرح کسی کو زنا کی گالی دینا جنایت بالقول ہے۔ نابغہ نے کہا ہے: ع

وَجُرْحُ اللِّسَانِ كَجُرْحِ الْبَدَنِ

یعنی زبان کا زخم بدن کے زخم کی طرح ہے، بلکہ غیرت مند طبیعت والوں کے نزدیک زبان کا زخم بدن کے زخم سے کہیں بڑھ کر ہے، کیوں کہ یہ تو بھر جاتا ہے اور وہ نہیں بھرتا۔ کسی نے کیا خوب کہا: ع

وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ١٠٥۔ ١٠٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٣٠۔ ٢٥٣٢) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٥١۔ ٣٥٢)

یعنی زبان کا زخم نہیں ملتا ہے اور اس کی خلش تیرِ نیمکش کی طرح ہمیشہ قلب میں چبھا کرتی ہے ؂

کوئی مجھ سے آ کے پوچھے ترے تیرِ نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

غرض کہ اس فاحشۂ خاص کو گالی دینے کا نام "قَذْف" بھی رکھا جاتا ہے۔ اصل میں قذف بھی پتھر مارنے کو کہتے ہیں۔ اس میں بھی رَمْی کی طرح استعارہ ہے۔ "مُحْصَنَاتِ" سے مراد پارسا بیبیاں ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ جو لوگ پارسا عورتوں کو گالی دیتے ہیں اور زنا کی تہمت لگاتے ہیں، انھیں فاحشہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح محصنین کا حال ہے۔ محصنین پارسا مرد ہوئے۔ عورتوں کا خاص کر ذکر اس لیے کیا کہ اُن کو تہمت لگانا زیادہ سخت ہے اور عار و ننگ ان میں بہت بڑھ کر ہے، اس حکم میں مرد عورتوں کے ساتھ شامل ہیں۔ علمائے اُمت مرحومہ کے درمیان کسی طرح کا اختلاف نہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک رسالہ تالیف فرمایا ہے۔ بعض علمائے قرن حادیِ عشر (گیارھویں صدی) پر اس سے رد کیا ہے، جب کہ اس بارے میں انھوں نے اختلاف کیا تھا۔ کسی نے کہا کہ آیت مردوں اور عورتوں کے لیے عام ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "اَلْأَنْفُسُ الْمُحْصَنَاتُ"، مطلب یہ ہے کہ محصنات صفت ہے، موصوف مقدر کی، یعنی انفس، اور انفس عام ہے مردوں اور عورتوں کو۔ تو اس بنا پر خود آیت مردوں عورتوں کو شامل ہوگئی۔

﴿ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ ﴾ [النساء: ٢٤] اس قول کا مؤید ہے، کیوں کہ محصنات کا بیان ﴿ مِنَ النِّسَآءِ ﴾ سے کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ محصنات کا لفظ غیر نساء کو بھی شامل ہے، ورنہ بیان کے کچھ بڑے معنی نہ ہوں گے۔ کسی نے کہا کہ محصنات سے مراد فروج ہیں۔ جس طرح کہ یہ آیت ہے ﴿ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ [الأنبياء: ٩١] "اور اس عورت کو (یاد کریں) جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تھی۔" لہٰذا اس بنا پر آیت مردوں عورتوں کو شامل ہوگی۔ کسی نے کہا ہے کہ "مُحْصَنَاتٌ" کا لفظ اگرچہ عورتوں کے لیے ہے، لیکن اس جگہ تغلیباً رجال ونساء دونوں کو شامل ہے۔ اس میں اعتراض ہے کہ تغلیب عورتوں کی مردوں پر عرب کی لغت میں مشہور نہیں ہے۔ سورۃ النساء میں احصان کا اور جن معانی پر اسے محمول کیا جا سکتا ہے ان کا ذکر ہو چکا ہے۔[1]

مقذوف اور قاذف میں جو شرطیں معتبر ہیں اُن کے بارے میں علماء کی لمبی لمبی بحثیں کتبِ فقہ میں پوری طرح پر مذکور ہیں۔ بعض شروط تو دلیل سے ماخوذ ہیں اور بعض صرف رائے ہیں۔ جمہور کی قراءت "مُحْصَنَاتٌ" بفتح صاد ہے۔ یحییٰ بن وثاب نے بکسرۂ صاد پڑھا ہے۔ علماء میں سے جمہور اس طرف گئے ہیں کہ جو شخص کافر مرد یا کافر عورت کو بہتان لگائے تو اس پر کچھ حد نہیں ہے۔ امام زہری، سعید بن مسیب اور ابن ابی لیلیٰ اس طرف گئے ہیں کہ اس پر حد واجب ہے۔ نیز جمہور اس طرف گئے ہیں کہ غلام کو چالیس چوٹ (کوڑے) ماریں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ،

[1] رقم الآية (٢٤)

عمر بن عبدالعزیز اور قبیصہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی کوڑے ماریں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ آزاد غلام کے سبب سے نہ مارا جائے، جبکہ وہ اس پر افتراء کرے، اس لیے کہ دونوں کا مرتبہ الگ ہے۔ صحیح میں ثابت ہو چکا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے غلام کو تہمت لگائے تو اس پر حد قائم کی جائے گی قیامت کے دن، مگر اس صورت میں نہیں کہ وہ غلام ویسا ہو، جیسا اس نے کہا ہے۔[1]

احصان کی پانچ شروط ہیں: اسلام، عقل، بلوغ، حریت اور زنا سے پارسائی۔ حدِ قذف کے واجب ہونے میں محصن محصنہ کی مثل ہے۔ اس باب میں تفصیلی مدلل کلام کتبِ فروع میں مذکور ہے۔ پھر اللہ پاک نے حد قائم کرنے کی ایک شرط کا ذکر کیا جو اس شخص کے لیے ہے جو پارسا عورتوں کو تہمت لگائے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ﴾ یعنی پھر بہتان لگانے والے چار گواہ نہ لائیں کہ وہ اُن عورتوں پر اس بات کی گواہی دیں کہ اُن کے سامنے اُن سے زنا واقع ہوا ہے۔

﴿ ثُمَّ ﴾ کا لفظ اس بات پر دال ہے کہ گواہ کی گواہی غیر مجلسِ قذف میں جائز ہے۔ جمہور اسی کے قائل ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ اس میں مخالف ہیں۔ ظاہر آیت یہ ہے کہ گواہوں کا اکٹھے ہو کر یا علاحدہ علاحدہ گواہی دینا جائز ہے۔ امام حسن و امام مالک رحمہما اللہ اس میں مخالف ہیں، جس وقت پورے چار گواہ نہ ہوں گے تو وہ قاذف ٹھہریں گے، اُن پر حدِ قذف لگائی جائے گی۔ امام حسن اور شعبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ گواہ پر کوئی حد ہے اور نہ اس پر جس پر گواہی دی جائے۔ امام احمد، امام ابوحنیفہ اور امام محمد بن حسن رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں، لیکن یہ قول اس معاملے کے خلاف ہے جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں واقع ہوا ہے کہ تین آدمیوں نے مغیرہ پر زنا کی گواہی دی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اُن پر حد جاری کی، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اس میں اختلاف نہ کیا۔

جمہور کی قراءت "شهداء" کی طرف "أربعة" کی اضافت کے ساتھ ہے۔ عبداللہ بن مسلم بن یسار، ابوزرعہ بن عمرو نے بتنوینِ "أربعة" پڑھا ہے۔ اس قراءت کی بنا پر "شهداء" کے اعراب میں اختلاف ہے۔ لہٰذا کسی نے تو کہا ہے کہ تمیز ہے، لیکن یہ قول مردود ہے، اس لیے کہ تین سے دس تک کا ممیز مضاف اِلیہ عدد کا ہوتا ہے، جس طرح کہ علمِ نحو میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے۔ یہ بھی مردود ہے، اس لیے کہ نکرۂ غیر مخصص سے حال نہیں آتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ محلِ جر میں ہے اس بنیاد پر کہ "أربعة" کی صفت ہے، چوں کہ اس میں الف تانیث کا ہے، اس واسطے غیر منصرف ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ ﴿ شُهَدَآءَ ﴾ بنا بر مفعولیت محلِ نصب میں ہو "أَيْ: ثُمَّ لَمْ يُحْضِرُوْا أَرْبَعَةَ شُهَدَاءَ" یعنی پھر چار گواہ کو حاضر نہ کریں۔ ابن جنی نے اس قراءت کو قوی کہا ہے، لیکن سیبویہ کا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٦٠) تفسير القرطبي (١٢/ ١٧٢۔ ١٧٤)

یہ قول اس کو دفع کرتا ہے کہ عدد کی تنوین اور اس کی اضافت کو ترک کرنا شعر ہی میں جائز ہوتا ہے۔[1] پھر قاذف پر جو حد واجب ہے، اللہ پاک نے اس کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً ﴾ "جلد" ضرب کو کہتے ہیں اور مجالدہ جلود میں مضاربت کو بولتے ہیں۔ یا جلود کے ساتھ، یعنی چمڑے میں یا چمڑے کے ساتھ مارنے کو "مُجَالَدَة" کہتے ہیں۔ پھر لاٹھی اور تلوار وغیرہ کے ساتھ مارنے کے لیے جلد کا استعارہ کیا گیا ہے۔ جلد کا بیان اوپر قریب ہی گزر چکا ہے۔ "ثَمَانِيْنَ" کا انتصاب مصادر کے انتصاب کی طرح ہے اور ﴿ جَلْدَةً ﴾ بنا بر حال منصوب ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو قمچی (کوڑے) کی اسّی (۸۰) چوٹ مارو۔

﴿ وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهٰدَةً اَبَدًا ﴾ معطوف ہے ﴿ فَاجْلِدُوْهُمْ ﴾ پر، "لهم" کا حرفِ لام محذوف سے متعلق ہے اور وہ حال ہے ﴿ شَهٰدَةً ﴾ سے اور اگر وہ اس سے متاخر ہوتا تو اس کی صفت ٹھہرتا۔ ﴿ اَبَدًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جب تک وہ زندہ ہیں، یعنی تم اُن کے لیے دونوں اُمور کو جمع کرو، یعنی اُن کو مارو اور کسی شے میں اُن کی گواہی قبول مت کرو، جب تک وہ زندہ رہیں، کیوں کہ وہ "قذف" کی وجہ سے غیر عدول ہوگئے، بلکہ فاسق ٹھہرے، جس طرح کہ آیت کے آخیر میں اللہ پاک نے ان پر فسق کا حکم لگایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ یعنی جب اُن سے قذف صادر ہوا اور انھوں نے اس پر اصرار کیا اور توبہ کی طرف رجوع نہ کیا تو اس سب کے بعد اُن کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا کہ وہ فاسق قرار پائے، کیوں کہ انھوں نے گناہ کبیرہ کیا۔

یہ جملۂ مستانفہ مقرر مضمون ماقبل ہے، اور امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ بنا بر حال محلِ نصب میں ہو۔[2] فسق طاعت سے نکلنے کو کہتے ہیں اور معصیت اور نافرمانی کے سبب سے حد سے آگے بڑھ جانے کو۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ قذف کبیرہ گناہوں میں سے ہے، کیوں کہ اسم فاسق کا اطلاق کبیرہ گناہ کرنے والے پر ہی ہوتا ہے۔ پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ یہ تابید (یعنی ہمیشہ کے لیے شہادت کا قبول نہ ہونا) اسی صورت میں ہے کہ توبہ نہ کرے، چنانچہ فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ﴾ یہ جملہ بنا بر استثناء محلِ نصب میں ہے اس لیے کہ کلام موجب سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر بدلِ موضعِ جر میں ہے۔

﴿ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ قذف کا گناہ کرنے کے بعد۔ اصلاحِ اعمال کے یہ معنی ہیں کہ اپنے اعمال کی اصلاح و درستی کی، جن میں سے گناہ قذف ہے اور توبہ سے اس کا تدارک کیا، حد کے لیے فرماں بردار اور مطیع ہوگئے۔ جملہ ﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ تعلیل ہے اس شے کی جس کو استثناء متضمن ہے، یعنی قاذف کے توبہ کر لینے کے بعد اس سے مؤاخذہ نہ کرنا اور رحمان و رحیم کی طرف سے وہ مغفور اور مرحوم ہوگیا۔ فاسق رہا نہ مردود الشہادۃ رہا اور نہ مدفوع العدالہ، اس لیے کہ اللہ پاک تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ١١۔ ١٢)
[2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٦٤)

اہلِ علم کا اس استثناء میں اختلاف ہے کہ آیا پہلے کے دونوں جملوں کی طرف راجع ہوتا ہے، یعنی عدمِ قبولِ شہادت اور حکمِ فسق، یا جملہ اَخیرہ کی طرف عائد ہوتا ہے اور یہ اختلاف اس کے بعد ہے کہ علما کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ استثناء جملۂ جلد کی طرف راجع نہیں ہے، بلکہ تائب کو بھی اصرار کرنے والے کی طرح کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ نیز اس اجماع کے بعد ہے کہ استثناء جملہ حکم بفسق کی طرف راجع ہے، چنانچہ محلِ خلاف یہ ہے کہ آیا جملہ عدمِ قبولِ شہادت کی طرف عائد ہوتا ہے یا نہیں۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ استثناء دونوں جملوں کی طرف راجع ہے۔ لہٰذا جب تہمت لگانے والا توبہ کر لے گا تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی اور فسق اس سے دور ہو جائے گا، کیوں کہ شہادت کے رد کیے جانے کا سبب یہی ہے کہ وہ قذف کی وجہ سے فسق کے ساتھ متصف تھا۔ پھر جب فسق بالاجماع توبہ سے زائل ہوگیا تو اس کی گواہی مقبول ہوگی۔

قاضی شریح، ابراہیم نخعی، حسن بصری، سعید بن جبیر، مکحول، ابن زید، سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ استثناء جملہ حکم بفسق کی طرف عائد ہوتا ہے، جملہ شہادت کے قبول نہ ہونے کی طرف راجع نہیں ہے۔ چنانچہ بہ سبب توبہ کے قاذف سے فسق کا وصف رفع ہو جائے گا اور اس کی گواہی اصلاً مقبول نہیں ہوگی۔ امام شافعی اور ضحاک رحمہما اللہ تفصیل کی طرف گئے ہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اگرچہ وہ توبہ کرے، مگر یہ کہ اپنی جان پر اس بات کا اقرار کرے کہ واقعی اس نے بہتان کیا تھا تو اس وقت اس کی گواہی قبول ہوگی۔

صاحبِ فتح القدیر اور فتح البیان رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جمہور کا قول حق ہے، کیوں کہ خاص کرنا تقیید کا جملہ اَخیر کے ساتھ بغیر اس کے ماقبل کے، باوجود اس کے کہ کلام ایک ہے، ایک ہی واقعہ شرعیہ میں ہے اور ایک ہی متکلم سے ہے، لغتِ عرب کے مقتضا کے خلاف ہے۔ رہی یہ بات کہ جملہ اَخیر جو کہ قید سے متصل ہے، اس کا اولیٰ ہونا اس بات کے ساتھ کہ وہ قید اسی اَخیر جملے کی ہو، چنانچہ یہ اولیٰ ہونا اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ وہ قید اس جملے کے ماقبل کے واسطے قید ہو۔ غایۃ الامر یہ ہے کہ اخیر جملے کا اس قید کے ساتھ مقید کرنا جو اس سے متصل ہے، زیادہ ظاہر ہے، اس سے کہ اس کے ماقبل کو اس قید کے ساتھ مقید کریں اور اسی لیے وہ مجمع علیہ ہوا ہے اور اس کا زیادہ ظاہر ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کے ماقبل میں ظاہر ہو، جو قید کہ کئی جملوں کے بعد واقع ہوتی ہے۔[1]

اصول والوں نے اس میں جو طول طویل کلام کیا ہے وہ اس فن کے عارف کے نزدیک معروف و مشہور ہے اور حق یہی ہے، اور اس بات سے حجت پکڑنا کہ قیود میں سے کوئی قید تو کبھی سارے جملوں کی طرف عائد ہوتی ہے، جو اس سے پہلے ہیں اور کبھی بعض جملوں کی طرف راجع ہوتی ہے۔ ایسا جو واقع ہوا ہے تو اس حجت پکڑنے کے ساتھ کوئی حجت قائم نہیں ہوتی ہے اور نہ یہ استدلال کے لیے صلاحیت رکھتا ہے، کیوں کہ کبھی تو یہ بہ سبب کسی دلیل کے ہوتا ہے،

[1] فتح القدير (٤/ ١٣) فتح البيان (٩/ ١٨٥۔ ١٨٦)

جس طرح کے یہاں اجماع و اتفاق ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا واقع ہوا ہے اس پر کہ یہ استثناء جملہ جلد کی طرف راجع نہیں ہے۔ لہٰذا قاذف سب کے نزدیک جلد کیا جاتا ہے، خواہ توبہ کی یا نہ کی۔ ہم نے جو بات ثابت کی ہے اس کی تائید و تقویت یہ بات کرتی ہے کہ شہادت کے قبول کرنے سے جو مانع تھا، یعنی فسق جو قذف سے متسبب ہوا تھا، وہ زائل ہو گیا، اب شہادت کے رد کرنے کا کوئی موجب باقی نہیں رہا۔

رہا قاذف کے توبہ کرنے کی صورت میں جو علما کا اختلاف ہے تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، امام شعبی اور ضحاک رحمہما اللہ اور اہلِ مدینہ نے کہا ہے کہ اس کی توبہ نہیں ہوتی، مگر اسی صورت میں کہ جو قذف اس سے واقع ہوا ہے اور اس کے سبب سے اس پر حد قائم کی گئی ہے، اس میں اپنے نفس کو جھوٹا کرے۔ ایک فرقے نے جس میں امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ ہیں، یوں کہا ہے کہ اس کی توبہ اس طرح ہوتی ہے کہ اپنے حال کو اچھا کرے اور اپنے عمل کی اصلاح و درستی کرے اور جو گناہ اس سے ہو گیا ہے اس پر نادم اور شرمندہ ہو۔ اللہ پاک سے اس کی بخشش مانگے، ایسا کام دوبارہ نہ کرنے کا پکا ارادہ کرے، اگرچہ اپنے نفس کی تکذیب نہ کرے اور نہ اپنے قول سے پھرے۔ اُمت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے، گو کفر ہی کیوں نہ ہو، جو گناہ کفر سے کم درجے کا ہے، اس کو بالاولیٰ مٹا دے گی۔ اس اجماع کو قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے اپنے غیر کو زنا کی تہمت لگائی وہ جرم میں مرتکبِ زنا سے بڑھ کر نہیں ہے، حالاں کہ زانی جب توبہ کر لیتا ہے تو اس کی گواہی مقبول ہوتی ہے، کیوں کہ گناہ سے توبہ کرنا اس کی طرح ہے، جس کے لیے کوئی گناہ نہیں اور جب اللہ پاک بندے سے توبہ قبول کر لیتا ہے تو بندے اولیٰ تر بقبول ہیں، باوجود اس کے کہ ایسا استثناء قرآن شریف میں کئی جگہ موجود ہے۔

ان میں سے ایک یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ﴾ [المائدة: ۳۳۔ ۳٤] ”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں، ان کی سزا تو صرف یہ ہے کہ انھیں قتل کیا جائے یا سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا انھیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ دنیا میں ان کے لیے ذلت ہے اور آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کر لیں۔“ بلاشک یہ استثناء سب کی طرف راجع ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہتان لگانے والا جرم میں کافر سے زیادہ سخت نہیں ہے۔ چنانچہ اس کا حق یہ ہے کہ جب وہ توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو اس کی گواہی قبول کی جائے۔

کہا کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اَبَدًا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جب تک وہ قاذف ہو۔ جس طرح یوں کہتے ہیں کہ کافر کی شہادت قبول نہ کی جائے گا ﴿ اَبَدًا ﴾ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جب تک وہ کافر رہے گا۔[1] انتہٰی۔ آیت کے متعلق بعض آثار یہ ہیں: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا کہ "تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ الْفُسُوْقِ وَأَمَّا الشَّهَادَةُ فَلَا تَجُوْزُ"، یعنی اللہ نے فسق سے تو اُن کی توبہ قبول کی، رہی گواہی تو وہ جائز نہیں ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ابو بکرہ سے فرمایا کہ اگر تو توبہ کرے گا تو میں تیری گواہی قبول کروں گا۔ یہ بھی اُن سے مروی ہے کہ ان کی توبہ اُن کا اپنی جانوں کو کاذب کرنا ہے۔ لہٰذا اگر وہ اپنی جانوں کو کاذب کریں گے تو اُن کی گواہی قبول کی جائے گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس نے توبہ کی اور اصلاح کی تو اس کی گواہی اللہ کی کتاب میں مقبول ہے۔ اور اس بارے میں تابعین سے روایتیں ہیں۔[2] (كذا في فتح البيان و فتح القدير) پھر جب اللہ پاک قذف کا حکم علی العموم بیان کر چکا تو اس کے بعد ایک خاص قسم کی قذف کا ذکر کیا، یعنی خاوند کا اپنی بیوی پر بہتان لگانا، جو اس کے عقدِ نکاح میں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٦ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٧ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٨ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٩ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝١٠

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور ان کے پاس اپنے سوا کوئی گواہ نہ ہوں، تو ان میں سے ایک کی شہادت اس طرح ہوگی کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بے شک وہ سچوں میں سے ہے⑥ اور پانچویں بار یہ کہے: اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو⑦ اور عورت سے سزا کو (یہ شے) ٹالتی ہے کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بلاشبہہ وہ (اس کا خاوند) جھوٹوں میں سے ہے⑧ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ (اس کا خاوند) سچوں میں

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ١٨١) [2] فتح القدير (٤/ ١٥) فتح البيان (٩/ ١٧٥)

سے ہو تو اس (عورت) پر اللہ کا غضب ہو ⑨ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو جھوٹوں کو سزا ملتی) اور یہ کہ بلاشبہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور خوب حکمت والا ہے ⑩

لعان کا بیان:

اس آیتِ کریمہ میں کشایش (سہولت) اور بڑی نکاسی ہے خاوندوں کے لیے، جب کہ کوئی خاوند اپنی بیوی کو عیب لگائے اور اس کے لیے گواہوں کا قائم کرنا مشکل ہو تو وہ بیوی سے ملاعنہ کرے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے حکم دیا ہے۔ لعان یہ ہے کہ جورو کو امام کے روبرو حاضر کرے، پھر جس بات کا اس کو عیب لگایا ہے اس پر دعویٰ کرے تو حاکم خاوند کو حلف کرائے، اللہ کے نام کی چار گواہی (قسم) چار گواہوں کی جگہ اس بات کی قسم کہ بے شک وہ سچا ہے، یعنی اس تہمت میں جو اس نے اپنی بیوی کو زنا کی لگائی ہے اور پانچویں گواہی یہ کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ جھوٹا ہے۔ پھر جس وقت خاوند نے یہ کہہ دیا تو امام شافعی رحمہ اللہ اور علماء کے ایک کثیر گروہ کے نزدیک وہ عورت اس لعان کے ساتھ اس سے جدا ہو گئی، اور وہ عورت ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہو گئی۔ اس کا مہر اسے دے ڈالے اور عورت پر زنا کی حد متوجہ ہو گی۔ اس سے حد کی سزا صرف اسی صورت میں دور ہو سکتی ہے کہ وہ ملاعنہ کرے۔ چنانچہ چار گواہی (قسمیں) دے اللہ کے نام کی کہ بے شک وہ جھوٹا ہے، یعنی اس بات میں جس کی اسے تہمت لگائی اور پانچویں اللہ کے نام کی گواہی یہ دے کہ اگر وہ سچا ہے تو اس پر اللہ کا غضب ہو۔ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ ﴾ یعنی حد دور ہو جائے گی: ﴿ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾

عورت کو غضب کے ساتھ خاص کیا، چناں چہ غالب یہی ہے کہ مرد اپنی بیوی کو رسوا کرنے اور اس کو زنا کی تہمت لگانے کا تکلف نہ کرے گا، مگر اسی حالت میں کہ وہ صادق و معذور ہو گا۔ جس بات کی اسے تہمت لگائی ہے، عورت اس میں اس کی سچائی کو جانتی ہو گی، اسی لیے پانچویں گواہی اس کے حق میں یہ ٹھہری کہ اس طرح کہے کہ اس پر اللہ کا غضب ہو، اگر مرد سچا ہے۔ مغضوب علیہ وہی شخص ہوتا ہے کہ حق کو خوب جانتا ہے، پھر اس سے کنارہ کرتا ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنی نرمی اور رحم کا ذکر کیا جو اپنی خلق پر فرمایا کرتا ہے اس حکم میں جو اُن کے لیے مشروع کیا ہے، جس سخت تنگی میں وہ مبتلا ہوتے ہیں تو اس سے ان کی کشایش کر دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی مہر نہ ہوتی تو تم تنگی میں پڑ جاتے اور تمھارے بہت سے کام تم پر شاق اور دشوار ہو جاتے اور اللہ بڑا رجوع کرنے والا ہے اپنے بندوں پر۔ اگرچہ یہ حلف اور سخت قسموں کے بعد ہو۔ حکمت والا ہے اس شے میں جس کو مشروع فرماتا ہے اور اس کا حکم کرتا ہے اور اس سے منع فرماتا ہے۔

آیاتِ لعان کا سببِ نزول:

اس آیت کے مطابق جو عمل ہوا ہے اور جس کے حق میں یہ نازل ہوئی ہے اور اس کا سببِ نزول، اس سب کے بارے میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں:

1 امام احمد رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: جبکہ آیت ﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ﴾ نازل ہوئی تو سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ انصار کے سردار بولے: یا رسول اللہ! کیا یہ اسی طرح نازل کی گئی ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے انصار کے گروہ! کیا تم نہیں سنتے ہو، جس بات کو تمھارا سردار کہہ رہا ہے۔ انصار بولے: یا رسول اللہ! آپ ان کو ملامت نہ فرمائیں، وہ تو ایک غیور مرد ہیں۔ واللہ! انھوں نے کسی عورت سے نکاح نہیں کیا کبھی پھر ہم میں سے کسی مرد نے یہ جرأت کی ہو کہ اس سے نکاح کرے، اُن کی سخت غیرت کی وجہ سے۔ سعد رضی اللہ عنہ بولے: واللہ یا رسول اللہ! بے شک میں خوب جانتا ہوں کہ آیت البتہ حق ہے اور وہ اللہ کی طرف سے ہے، لیکن میں نے اس سے تعجب کیا ہے کہ اگر میں کسی لکاع، یعنی گندی نالائق بد ذات عورت کو اس حال میں پاؤں کہ کوئی مرد اس کو اپنی رانوں میں دبائے ہوئے ہے تو مجھے یہ بات جائز نہ ہو کہ میں اسے برانگیختہ کروں اور اس کو حرکت دوں، یہاں تک کہ چار گواہ لاؤں، پس واللہ! بے شک میں اُن کو نہ لاؤں گا یہاں تک کہ وہ اپنی حاجت پوری کر لے گا۔

کہا: پھر نہ ٹھہرے مگر تھوڑا زمانہ، یہاں تک کہ ہلال بن اُمیہ آیا، یہ اُن تین آدمیوں میں سے ہے جن کی توبہ قبول کی گئی۔ ہلال اپنی زمین سے عشاء کے وقت آیا تو اپنی بیوی کے پاس ایک مرد کو پایا۔ اس نے اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا اور اپنے دونوں کانوں سے جماع کی آواز کو سنا، پھر اسے برانگیختہ نہ کیا، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ وہ صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، عرض کی: یارسول اللہ! میں عشاء کے وقت اپنی بیوی کے پاس آیا تو اس کے نزدیک ایک مرد کو پایا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا۔ جو قصہ وہ لے کر آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مکروہ جانا اور آپ پر گراں گزرا۔ انصار آپ کے پاس جمع ہوئے اور کہا کہ سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے جو کہا تھا، ہم اس کی وجہ سے مبتلا ہو گئے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کو ماریں گے اور اس کی گواہی لوگوں میں باطل کر دیں گے تو ہلال نے کہا: واللہ! بے شک میں البتہ اُمید کرتا ہوں کہ اللہ میرے واسطے اس سے راستہ نکالے گا اور کہا: یارسول اللہ! جس قصے کو میں لے کر آیا، اس سے جو بات آپ پر گراں گزری ہے میں اسے دیکھ رہا ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک میں البتہ سچا ہوں۔ واللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارادہ فرماتے تھے کہ اس کے مارنے کا حکم دیں کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کی اور جس وقت آپ پر وحی نازل کی جاتی تھی تو صحابہ اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کے تغیر میں پہچان لیتے تھے، یعنی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رک جاتے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے فارغ

ہو جاتے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ ﴾

پھر وہ حالت رسول اللہ ﷺ سے دور ہو گئی تو فرمایا: خوش ہو جا اے ہلال! اللہ نے تیرے لیے کشایش و نکاسی کر دی۔ ہلال بولا کہ میں تو اپنے رب عزوجل سے اُمید رکھتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کی طرف آدمی بھیجو، چنانچہ اس کی طرف آدمی بھیجا، وہ آئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو دونوں پر پڑھا۔ پھر ان کو وعظ و نصیحت فرمائی، اس بات کی خبر دی کہ آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے زیادہ سخت ہے۔ ہلال بولا: واللہ یا رسول اللہ! البتہ مقرر میں نے اس پر سچ کہا ہے۔ عورت بولی: اس نے جھوٹ کہا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لعان کرو اُن کے درمیان۔ ہلال سے کہا گیا کہ تو گواہی دے تو اس نے چار گواہیاں دیں اللہ کے نام کی کہ بے شک وہ سچا ہے۔ پھر جب پانچویں گواہی آئی تو ہلال سے کہا گیا: اے ہلال! تو اللہ سے ڈر، کیوں کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے زیادہ آسان ہے اور یہ گواہی تجھ پر عذاب کو واجب کرنے والی ہے۔ ہلال بولا: واللہ! اللہ مجھ کو اس پر عذاب نہ کرے گا جس طرح کہ اس نے مجھ کو جلد نہ کیا، یعنی کوڑوں کی سزا سے بچایا۔ پھر پانچویں گواہی یہ دی کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اُس پر اللہ کی لعنت ہو۔ پھر عورت سے کہا گیا کہ تو چار گواہیاں اللہ کے نام کی دے کہ بے شک وہ جھوٹا ہے۔ پھر پانچویں گواہی کے وقت اس سے کہا اور اس کو ٹھہرایا کہ تو اللہ سے ڈر، اس لیے کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے زیادہ آسان ہے اور یہ گواہی ایسی ہے جو عذاب کو تجھ پر واجب کر دے گی تو اس نے گھڑی بھر توقف کیا اور اقرار کا ارادہ کیا۔ پھر بولی: واللہ! میں اپنی قوم کو رسوا نہ کروں گی۔ پھر پانچویں گواہی یہ دی کہ اس پر اللہ کا غضب ہو، اگر وہ سچا ہو۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے اُن کے درمیان تفریق کرا دی اور حکم دے دیا کہ اس کا لڑکا باپ کا نہ کہلایا جائے اور نہ اس کے لڑکے کو تہمت لگائی جائے اور جو کوئی اس عورت کو یا اس کے لڑکے کو عیب لگائے، اس پر حد ہے اور یہ حکم دیا کہ اس کے لیے قُوت نہیں ہے، یعنی نان نفقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ دونوں بغیر طلاق یا بغیر وفات کے جدا ہوئے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اگر وہ اس بچے کو لائے سرخ سیاہی مائل چھوٹے چوتڑ والا، باریک پنڈلیوں والا تو وہ ہلال کا ہے۔ اور اگر وہ اس کو لائے گندم گوں، پر گوشت، کندہ بدن، موٹی پنڈلیوں والا، گوشت سے بھرے چوتڑوں والا تو اس کا ہے جس سے عیب لگائی گئی۔ چنانچہ وہ اسی صفت کا بچہ لائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر قسمیں نہ ہوتیں تو میرے اور اس کے لیے ایک شان ہوتی۔ شان کے معنی خطب و امر و حال کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ کا حکم لعان کا نہ آتا تو میں اس پر حد قائم کرتا، کیوں کہ بچہ اسی سے مشابہ ہے جس کے ساتھ بدنام ہوئی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: اس کے بعد وہ لڑکا مصر پر امیر ہوا اور وہ اپنی ماں کا کہلایا جاتا تھا باپ کا نہیں کہلایا جاتا تھا۔[1] (ورواه أبو داود عن أنس عن الحسن بن علي من يزيد بن هارون نحوه مختصراً)

[1] مسند أحمد (١/ ٢٣٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٥٦)

صحاح وغیرہ میں اس حدیث کے بوجوہِ کثیرہ بہت سے شواہد ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے جس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے بروایتِ عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ہلال ابن اُمیہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شریک بن سحماء سے عیب لگایا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گواہ لا، یا تیری پیٹھ پر حد لگائی جائے گی۔ ہلال نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب کوئی کسی مرد کو اپنی بیوی پر دیکھے تو گواہ ڈھونڈنے کے لیے جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی فرمانے لگے کہ گواہ لا، یا تیری پشت پر حد ہے۔ ہلال نے عرض کی: یا رسول اللہ! قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! بے شک میں البتہ سچا ہوں اور البتہ نازل فرمائے گا اللہ وہ شے جو میری پشت کو حد سے بری کر دے گی۔

جبریل علیہ السلام اُترے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت اُتاری: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ ﴾ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پڑھا یہاں تک کہ ﴿ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ تک پہنچے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چلے گئے۔ پھر دونوں کی طرف آدمی بھیجا تو ہلال آیا، پھر گواہی دی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: بے شک اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے۔ تو کیا ہے تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا؟ پھر عورت کھڑی ہوئی تو اس نے گواہی دی۔ پھر جب پانچویں گواہی میں ہوئی تو اسے ٹھہرایا اور کہا کہ بے شک وہ واجب کرنے والی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس نے توقف کیا اور پیچھے ہٹی، یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ وہ رجوع کرے گی۔ پھر وہ بولی کہ میں اپنی قوم کو اُن کی مدتِ عمر کے سارے دنوں میں رسوا نہ کروں گی۔ پھر اس نے پانچویں گواہی دے دی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس کو دیکھو، اگر وہ اس بچے کو لائے سرگیں آنکھوں والا، بڑے بڑے سرین والا، پر گوشت پنڈلیوں والا تو وہ شریک بن سحماء کا ہے، چنانچہ وہ اس کو اسی طرح لائی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ شے نہ ہوتی جو کتاب اللہ سے گزر چکی ہے تو البتہ اس کے لیے اور میرے لیے ایک حال ہوتا، یعنی میں اس پر حد قائم کرتا۔[1] (انفرد به البخاري من هذا الوجه وقد روى من غير وجه عن ابن عباس رضی اللہ عنہما وغيره)

2 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس نے اپنی بیوی کو کسی آدمی کے ساتھ عیب لگایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مکروہ جانا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تردید فرماتے رہے، یہاں تک کہ اللہ پاک نے یہ آیت اُتاری: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ آپ نے اس کو پڑھا یہاں تک کہ دونوں آیتوں سے فارغ ہوئے تو دونوں کی طرف آدمی بھیجا اور انھیں بلایا۔ پھر فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھارے بارے میں قرآن نازل فرمایا ہے۔ پھر مرد کو بلایا، اس پر پڑھا تو اس نے اللہ کے نام کی چار گواہیاں دیں کہ بے شک وہ سچا ہے۔ پھر اس کو حکم دیا تو اس کا منہ روکا گیا۔ پھر اسے وعظ کیا۔ پھر اس سے

[1] صحیح البخاري، رقم الحديث (۱۷۷۲)

فرمایا کہ تجھ پر اللہ کی لعنت سے ہر شے آسان تر ہے۔ پھر اس کو چھوڑ دیا تو اس نے کہا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ پھر عورت کو بلایا تو اس پر پڑھا تو اس نے اللہ کے نام کی چار گواہیاں دیں کہ بے شک وہ جھوٹا ہے۔ پھر اس کو حکم دیا تو اس کا منہ روکا گیا، پھر اسے وعظ کیا اور فرمایا: تیری خرابی ہو! اللہ کے غضب سے ہر شے زیادہ آسان ہے۔ پھر اس کو چھوڑ دیا تو اس نے کہا کہ اگر وہ (اس کا خاوند) سچا ہے تو اس پر اللہ کا غضب ہو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خبردار! اللہ کی قسم! « لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا قَضَاءً فَصْلًا » یعنی البتہ میں تمھارے درمیان تمھاری چکوتی (علاحدگی) کا فیصلہ کروں گا۔ راوی نے کہا: پھر وہ عورت جنی تو میں نے کسی بچے کو مدینے میں نہیں دیکھا کہ وہ اس سے اکثر ہو، (یعنی اس بچے میں جھگڑا واقع ہوا تھا اور نبی اکرم ﷺ نے اس کی نشانیاں بتلا دی تھیں۔ اس لیے اس کو دیکھنے کے لیے لوگ بہ کثرت جمع ہوئے کہ ایسے کبھی کسی بچے کی ولادت میں جمع نہ ہوئے تھے۔ یہاں کچھ تقدیم و تاخیر معلوم ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کنائی الفاظ میں بھی کچھ فرق ہے۔ فتدبر۔) آپ ﷺ نے فرمایا کہ « إِنْ جَاءَتْ بِهِ لِكَذَا وَكَذَا فَهُوَ لِكَذَا، وَإِنْ جَاءَتْ بِهِ لِكَذَا وَكَذَا فَهُوَ لِكَذَا » پھر وہ اس کو اسی شخص کے مشابہ لائی جس سے وہ عیب لگائی گئی تھی۔[1]

3 امام احمد رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی امارت میں کسی نے مجھ سے متلاعنین کے بارے میں پوچھا کہ آیا اُن کے درمیان تفریق کی جائے تو میں نے نہ جانا کہ میں کیا جواب دوں۔ پھر میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے گھر کی طرف گیا اور کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! کیا متلاعنین کے درمیان تفریق کی جائے تو وہ بولے: سبحان اللہ! پہلے پہل جس نے اس کا سوال کیا وہ فلاں بن فلاں ہے۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! آپ مجھے اس شخص کے بارے میں بتائیں کہ وہ اپنی بیوی کو فاحشہ (زنا) پر دیکھ رہا ہے۔ پھر اگر وہ بولے تو ایک بڑی بات بولے اور اگر چپ رہے تو ایسی بات پر چپ رہے؟! آپ ﷺ نے خاموشی اختیار کی، اس کو جواب نہ دیا۔ پھر کچھ وقت اس کے بعد گزرا تو وہی شخص آپ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی کہ جس بات کا میں نے آپ سے پوچھا تھا، اس کے ساتھ میں مبتلا ہوگیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں یہ آیتیں نازل فرمائیں: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ ﴾ یہاں تک کہ ﴿ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ تک پہنچے۔

پھر مرد سے شروع کیا تو اس کو وعظ و نصیحت کی اور اس کو بتایا کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب کی نسبت زیادہ آسان ہے تو وہ بولا: قسم ہے اس کی جس نے حق کے ساتھ آپ کو بھیجا ہے! میں نے جھوٹ نہیں کہا ہے۔ پھر عورت سے فرمایا اور اس کو وعظ و نصیحت کی اور اس کو بتایا کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب کی نسبت زیادہ آسان ہے تو وہ بولی: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! بے شک وہ البتہ جھوٹا ہے۔ راوی

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٣٤)

نے کہا: مرد سے شروع کیا تو اس نے چار گواہیاں اللہ کے نام کی دیں کہ بے شک وہ سچا ہے اور پانچویں یہ کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہو۔ پھر عورت سے کہا تو اس نے اللہ کے نام کی چار گواہیاں دیں کہ بے شک وہ جھوٹا ہے اور پانچویں گواہی یہ کہ اس پر (عورت پر) اللہ کا غضب ہو اگر وہ (مرد) سچا ہو پھر اُن کے درمیان تفریق کر دی۔[1] (ورواه النسائي في التفسير من حديث عبد الملك بن أبي سليمان به وأخرجاه في الصحيحين من حديث سعيد بن جبير عن ابن عباس رضي الله عنهما)

4 امام احمد رحمہ اللہ نے بروایتِ علقمہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم جمعہ کے روز عشیہ کے وقت، یعنی بعد از زوال مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انصار کے ایک شخص نے کہا کہ ہم میں کوئی اگر اپنی عورت کے ساتھ کسی غیر مرد کو دیکھے تو اگر وہ اس کو مار ڈالے تو تم اسے مار ڈالو گے اور اگر وہ بولے تو تم اس کو کوڑے لگاؤ گے اور اگر چپ رہے تو غصے میں چپ رہے۔ واللہ! البتہ اگر میں نے صحت و تندرستی کی حالت میں صبح کی تو میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھوں گا۔ کہا: پھر اس نے پوچھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! اگر ہم میں سے ایک جبکہ اپنی بی بی کے ساتھ کسی مرد کو دیکھے، اگر وہ اسے مار ڈالے تو تم اس کو مار ڈالو گے اور اگر وہ بولے تو تم اس کو کوڑے مارو گے اور اگر چپ رہے تو غصے پر چپ رہے۔ الٰہی تو حکم کر! کہا: پھر لعان کی آیت نازل ہوئی۔ پھر وہ شخص سب سے پہلے اس میں مبتلا ہوا۔[2] (انفرد بإخراجه مسلم فرواه من طرق عن سليمان بن مهران الأعمش به)

5 نیز امام احمد رحمہ اللہ نے سہل بن سعد سے روایت کیا ہے، کہا کہ عویمر عاصم بن عدی کے پاس آیا تو اس سے کہا کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کہ آپ مجھے اس شخص کے بارے میں بتائیں کہ اس نے اپنی بیوی کے پاس کسی مرد کو پایا تو اسے مار ڈالا تو کیا وہ اس کے بدلے میں مارا جائے گا یا کس طرح کرے؟ عاصم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسائل کا عیب کیا، یعنی بلا ضرورت ایسے مسائل پوچھنے کو مکروہ سمجھا۔ (دوسرے یہ بے شرمی کی بات ہے، جو عورت کے ستر کے بارے میں ہے، اس لیے آپ نے برا جانا) کہا: پھر عاصم سے عویمر ملا تو پوچھا: تو نے کیا کیا؟ عاصم نے کہا: میں نے کچھ نہیں کیا، بے شک تو میرے پاس خیر نہیں لایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسائل کا عیب کیا۔ عویمر بولا: واللہ! میں البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آؤں گا تو ضرور اُن سے پوچھوں گا۔ پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا کہ آپ پر اسی مسئلے میں قرآن نازل کیا گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو بلایا اور اُن کے درمیان لعان کیا۔ عویمر نے کہا: یا رسول اللہ!

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٩٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٧٣) مسند أحمد (٢/ ١٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٩٥) مسند أحمد (١/ ٤٢١)

اگر میں اس عورت کو لے جاؤں تو گویا میں نے اس پر جھوٹ کہا۔ چنانچہ عویمر نے اس عورت کو جدا کر دیا، اس سے پہلے کہ رسول اللہ ﷺ اس کو حکم دیں۔ پھر یہ علاحدگی متلاعنین کا طریقہ ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس عورت کو دیکھو! اگر وہ اس بچے کو سیاہ فام، سخت سیاہ آنکھوں والا، بڑی سرین والا لائی تو میں گمان نہیں کرتا ہوں عویمر کو، مگر بلاشبہہ اس نے سچ کہا اور اگر وہ اس کو سرخ رنگ لائی، گویا وَحرہ ہے، یعنی بامہنی یا بیر بہوٹی تو میں گمان نہیں کرتا ہوں اس کو مگر جھوٹا۔ پھر وہ اس کو اس شکل پر لائی جو مکروہ تھی۔[1] (أخرجاه في الصحيحين وبقية الجماعة إلا الترمذي و رواه البخاري أيضا من طرق عن الزهري به)

6 امام بخاری رحمہ اللہ نے بروایتِ زہری عن سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے اس آدمی کے بارے میں بتائیں جس نے اپنی عورت کے ساتھ ایک مرد کو دیکھا، آیا وہ اسے مار ڈالے تو تم اسے مار ڈالو گے، یا پھر وہ کس طرح کرے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے حق میں تلاعن نازل کیا، جو قرآن میں مذکور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تیرے اور تیری بیوی کے بارے میں فیصلہ کیا گیا۔ کہا: پھر میاں بیوی دونوں نے باہم لعان کیا اور میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا۔ پھر مرد نے اس کو جدا کر دیا۔ پھر یہ طریقہ ہو گیا کہ متلاعنین کے درمیان علاحدگی کی جائے۔ وہ عورت حاملہ تھی۔ خاوند نے اس کے حمل کا انکار کیا اور وہ لڑکا اسی عورت کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ پھر میراث میں یہ سنت جاری ہوئی کہ وہ لڑکا اس عورت کا وارث ہو اور وہ عورت اس لڑکے کی وارث ہو، اس حصے کی جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔[2]

7 حافظ ابوبکر بزار نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اگر تو ام رومان کے ساتھ کسی مرد کو دیکھے تو تم کیا کرنے والا ہو؟ عرض کی: واللہ! میں تو اس کے ساتھ برائی کرنے والا ہوں۔ فرمایا: پھر تو اے عمر! کیا کرے گا، عرض کی: اللہ کی قسم! میں تو اسے قتل کرنے والا ہوں۔ میں تو کہا کرتا تھا: اللہ تعالیٰ اس خبیث پر لعنت کرے۔ کہا: تو نازل ہوئی: ”﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ ﴾ ثُمَّ قَالَ: لَا نَعْلَمُ أَحداً أَسْنَدَهُ إِلَّا النَّضْرُ بْنُ شُمَيْلٍ عَنْ يُوْنُسَ بْنِ أَبِيْ إِسْحَاقَ، ثُمَّ رَوَاهُ مِنْ حَدِيْثِ الثَّوْرِيِّ عَنْ أَبِيْ إِسْحَاقَ عَنْ زَيْدِ بْنِ يُثَيْعٍ مُرْسَلًا“.[3] فالله أعلم.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٩٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٤٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٦٦) مسند أحمد (٥/ ٣٣٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٩)

[3] مسند البزار (٧/ ٣٤٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله ثقات“ (مجمع الزوائد: ٧/ ١٧٧)

8 حافظ ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے بروایت ابن سیرین عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: البتہ پہلا لعان جو اسلام میں ہوا ہے، یہ ہے کہ ہلال بن اُمیہ نے اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی۔ پھر اس بات کو رسول اللہ ﷺ کی طرف پہنچایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ چار گواہ پیش کرو، ورنہ پھر تیری پشت پر حد ہے۔ ہلال نے عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک اللہ جانتا ہے کہ البتہ میں سچا ہوں اور البتہ اللہ آپ پر وہ چیز اُتارے گا جس کے سبب سے وہ میری پشت کو حد سے بری کر دے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے لعان کی آیت نازل فرمائی: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ ﴾ پھر نبی اکرم ﷺ نے اس کو بلایا تو فرمایا کہ تو اللہ کے نام کی گواہی دے کہ بے شک تو البتہ اس بات میں جس کا تو نے اسے زنا کا عیب لگایا ہے، سچا ہے۔ چنانچہ اس نے چار دفعہ اس کی گواہی دی۔ پھر پانچویں میں اس سے فرمایا: تجھ پر اللہ کی لعنت ہو، اگر تو جھوٹا ہے اس بات میں جس کا تو نے عیب لگایا، یعنی زنا کا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کہا، پھر رسول اللہ ﷺ نے عورت کو بلایا تو اس سے فرمایا کہ تو کھڑی ہو اور اللہ کے نام کی گواہی دے کہ بے شک وہ البتہ اس شے میں جھوٹا ہے جس کی تجھے زنا کی تہمت لگائی۔ اس نے اس کی چار گواہیاں دیں، پھر اس سے فرمایا: پانچویں گواہی میں یہ کہہ کہ تجھ پر اللہ کا غضب ہو، اگر وہ اس شے میں، جس کا تجھے زنا سے عیب لگایا، سچا ہے۔

پھر جب چوتھی یا پانچویں گواہی ہوئی تو اس نے ایک سکتہ کیا، یہاں تک کہ لوگوں نے گمان کیا کہ وہ اب اقرار کر دے گی۔ پھر وہ بولی کہ میں اپنی قوم کو اس کی مدتِ عمر کے لیے فضیحت نہ کروں گی، یعنی بدنام نہ کروں گی تو اس نے پانچویں گواہی بھی دے دی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اُن کے درمیان جدائی کرا دی اور فرمایا: دیکھو! اگر وہ ایسا بچہ جنے، جو « جَعْدًا حَمْشَ السَّاقَيْنِ »، یعنی گُندہ بدن، گھونگرے بالوں والا، باریک پنڈلیوں والا ہو تو وہ شریک بن سحماء کا ہے اور اگر وہ ایسا بچہ لائے جو سفید رنگ گورا، سیدھے بالوں والا، چھوٹی آنکھوں والا تو وہ ہلال بن اُمیہ کا ہے۔ پھر وہ اس کو لائی « جَعْدًا حَمْشَ السَّاقَيْنِ » تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ کا حکم جو اُن کے بارے میں نازل ہوا ہے نہ ہوتا تو البتہ میرے اور اس کے لیے ایک شان ہوتی۔[1]

كذا قال الحافظ ابن كثير رحمه الله.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں بخاری اور ترمذی میں مذکورہ احادیث میں سے ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ذکر کیا ہے۔ پھر یہ کہا ہے کہ بخاری و مسلم وغیرہما نے اس قصے کی تخریج کی ہے اور نہ مرد کا نام لیا ہے نہ عورت کا۔ آخر قصے میں یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا: تو جا تجھ کو اس پر کوئی راہ نہیں ہے، تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! میرا مال؟ تو

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٩٦) مسند أبي يعلىٰ (٥/ ٢٠٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٥٢ـ ٣٥٦)

آپ ﷺ نے فرمایا: تیرا کچھ مال نہیں ہے، اگر تو نے اس پر سچ کہا تو وہ مال اس کے بدلے میں ہے کہ تو نے اس کی فرج سے حلال کیا اور اگر تو نے اس پر جھوٹ کہا تو وہ مال تیرے لیے اس سے بعید تر ہے۔ پھر عویمر کا قصہ ذکر کیا ہے۔[1]

اس کے بعد کہا ہے کہ عبدالرزاق رحمہ اللہ نے سیدنا عمر، علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ اُن سب نے فرمایا کہ متلاعنین کبھی جمع نہیں ہوں گے۔[2] پھر کہا کہ ازواج جمع ہے زوج کی۔ زوج بہ معنی زوجہ ہے۔ اس لیے کہ اس سے تا کا حرف حذف کرنا زیادہ ترفصیح ہے اس کے اثبات سے مگر فرائض میں، کیوں کہ وہاں التباس کے سبب سے حرفِ تا ضرور لاتے ہیں۔ یہاں ازواج میں محصنات کی قید نہ لگائی تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لعان محصنہ اور غیر محصنہ کے قذف میں مشروع ہے۔ چنانچہ لعان محصنہ کی قذف میں زوج سے حد کو ساقط کر دیتا ہے اور غیر محصنہ کے قذف میں تعزیر کو ساقط کرتا ہے۔ مثلاً: وہ ذمیہ ہو یا لونڈی یا ایسی صغیرہ کہ وطی کا احتمال رکھتی ہے، بخلاف اس صغیرہ کے جو وطی کا احتمال نہیں رکھتی ہے اور بخلاف اس کبیرہ کے جس کا زنا گواہوں سے یا اقرار سے ثابت ہوا ہے، کیوں کہ اُن دونوں کے قذف میں تعزیر واجب ہے، لیکن خاوند لعان نہ کیا جائے گا بہ سبب دفع کرنے تعزیر کے، جس طرح کہ کتبِ فروع میں ہے۔ بی بی کو زنا کا عیب لگانا تو یہ قصہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے واقع ہو چکا ہے، جیسے: ہلال بن اُمیہ و عویمر عجلانی و عاصم بن عدی، اُن سب کے قصے پہلے گزر چکے ہیں۔

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس زنا کی بیویوں کو تہمت لگائی ہے، اس کے لیے خاوندوں کے پاس گواہ نہ ہوں کہ گواہی دیں۔ ﴿ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ ﴾ مگر وہ خود۔ یہ مرفوع ہے بنا بر بدل ﴿ شُهَدَآءُ ﴾ سے۔ زمخشری نے اس کے سوا اور وجہ ذکر نہیں کی۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ شُهَدَآءُ ﴾ کی نعت ہے اس بنا پر کہ ﴿ اِلَّآ ﴾ بہ معنی غیر ہے۔ کسی نے کہا: نصب بھی جائز ہے، اس بنیاد پر کہ خبر ہو ﴿ يَكُنْ ﴾ کی، یا استثناء کی بنا پر بروجہ مرجوح۔ اس قید کا کوئی مفہوم نہیں ہے، بلکہ خاوند لعان کیا جائے گا، گو گواہوں کا پانے والا ہو، جو عورت کے زنا کی گواہی دیں واسطے نفیِ ولد کے اور واسطے وضعِ عقوبتِ حد یا تعزیر کے۔ ﴿ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ ﴾ کوفیوں نے برفع ﴿ اَرْبَعُ ﴾ پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ ﴿ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ ﴾ کی خبر ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی گواہی ایک تمھاری کے جو اس سے حدِ قذف کو زائل کر دے چار گواہیاں ہیں۔ اہلِ مدینہ و ابو عمرو نے "أَرْبَعَ" بہ نصب پڑھا ہے بنا بر مصدر۔ اس صورت میں ﴿ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ ﴾ مبتدائے محذوف کی خبر ہوگا، یعنی واجب گواہی دینا ہے، ان کے ایک کی چار گواہیاں دینا۔ یا مبتدا محذوف الخبر ہو گا، یعنی "فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ وَاجِبَةٌ" یا "كَائِنَةٌ"۔ کسی نے کہا ہے کہ "أَرْبَعَ" بایں تقدیر منصوب ہے کہ

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] الدر المنثور (٦/ ١٣٩) [3] الكشاف (٣/ ٢٢٠)

"فَعَلَيْهِمْ أَنْ يَّشْهَدَ أَحَدُهُمْ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ" ۔ "بِاللّٰهِ" متعلق ہے[1] "شَهَادَةٌ" سے یا ﴿ شَهٰدٰتٍ ﴾ سے اور جملہ ﴿ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ مشہود بہ ہے، یعنی جس بات کی گواہی دی جاتی ہے وہ یہی بات ہے کہ بے شک وہ سچا ہے۔ اصل عبارت یہ تھی: "عَلَى أَنَّهُ" پس "عَلَى" جار کو حذف کر دیا اور "إِنَّ" کو کسرہ دے دیا اور عامل کو اس سے معلق کر دیا۔

﴿ وَالْخَامِسَةُ ﴾ مرفوع ہے بنا بر ابتدا اور خبر اس کی ﴿ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ ہے۔ امام ابوعبدالرحمٰن، طلحہ اور عاصم رحمہم اللہ نے ایک روایت میں "وَالْخَامِسَةَ" بہ نصب پڑھا ہے بنا بر ایں معنی: "وَيَشْهَدُ الشَّهَادَةَ الْخَامِسَةَ"، جمہور نے ﴿ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ ﴾ بہ تشدید ﴿ اَنَّ ﴾ پڑھا ہے اور نافع نے بہ تخفیف "أَنْ"، اس قراءت کی بنا پر اسم "أَنَّ" کا ضمیرِ شان ہے اور ﴿ لَعْنَتَ اللّٰهِ ﴾ مبتدا اور ﴿ عَلَيْهِ ﴾ خبر اور جملہ خبر "أَنَّ" کی۔ جمہور کی قراءت کی بنا پر ﴿ لَعْنَتَ اللّٰهِ ﴾ "أَنَّ" کا اسم ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَنَّ" کلام میں تخفیف نہیں کیا جاتا ہے اور بعد اس کے اسم ہوں، مگر اسی حال میں کہ تو ارادہ ثقیلہ کا کرے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: میں نہیں جانتا ہوں ثقیلہ کو، مگر اجود عربیت میں۔ ﴿ وَيَدْرَؤُا ﴾ کے معنی ہیں: "يَدْفَعُ عَنْهَا الْعَذَابَ"۔ عذاب سے مراد دنیا کا عذاب ہے، یعنی حد اور ﴿ يَدْرَؤُا ﴾ کا فاعل ﴿ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ ﴾ ہے۔

﴿ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ معنی یہ ہیں کہ عورت سے حد کو دفع کر دیتا ہے اس کا اس بات کی گواہی دینا کہ اس کا خاوند جھوٹا ہے، اس زنا میں جس کی اس نے مجھے تہمت لگائی۔ ﴿ وَالْخَامِسَةَ ﴾ حفص، حسن، سلمی، طلحہ اور اعمش رحمہم اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اَرْبَعَ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی "وَتَشْهَدَ الْخَامِسَةَ"، باقی قراء کی قراءت برفع ہے بنا پر ابتدا اور خبر اس کی ﴿ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ ہے۔ عورت پر تغلیظ (سختی) کرنے کے لیے غضب کے ساتھ اس کو خاص کیا ہے، کیوں کہ اصل و مادہ فجور کا وہی ہے اور اس واسطے کہ عادت میں عورتیں لعنت بہت کیا کرتی ہیں، کثرت کی جہت سے اُن کے دلوں میں لعنت کی کچھ ایسی بڑی وقعت نہیں ہے، بخلاف غضب کے کہ یہ ان کے نزدیک ایک بڑی شے ہے۔[2]

﴿ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ ﴾ میں صیغۂ غیب سے صیغۂ حاضر کی طرف تبدیلی ہے اور خطاب دونوں فریق کو ہے، یعنی عیب لگانے والوں کو اور جن کو عیب لگایا گیا۔ چنانچہ "عَلَيْكُمْ وَعَلَيْكُنَّ" چاہیے تھا، لیکن مذکر کے صیغے کو مونث کے صیغے پر تغلیب دی ہے۔ ﴿ لَوْ لَا ﴾ کا جواب محذوف ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم سب پر نہ ہوتی تو جو اُن میں سے جھوٹا ہوتا، اس کو بڑا عذاب پہنچتا۔[3]

[1] فتح القدير (٤/ ١٤) [2] فتح القدير (٤/ ١٤) [3] معاني القرآن (٤/ ٣٣)

یہ معنی ہیں کہ جلدی سے تم پر عذاب بھیج دیتا، لیکن اپنے فضل اور رحمت کے سبب سے تم پر پردہ پوشی کی اور لعان کی وجہ سے حد کو تم سے دور کر دیا، یا یہ معنی ہیں کہ البتہ وہ تم کو رسوا کر دیتا۔

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ ﴾ یعنی اللہ پاک توبہ کا بڑا قبول کرنے والا ہے اور بڑا رجوع ہونے والا ہے اس پر جو توبہ کرے اور معاصی سے رجوع کرے۔ یہ معصیت ہو یا اور کوئی جب بندہ سچی توبہ کرتا ہے تو وہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور اس کے گناہ بخش دیتا ہے اور اس نے جو اپنے بندوں کے لیے لعان مشروع کیا ہے اور اُن پر حدیں فرض کی ہیں، اس سب میں وہ حکمت والا ہے، جو کام وہ کرتا ہے وہ حکمت سے کرتا ہے، حکمتِ بالغہ اسی کے لیے ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿11﴾

بے شک جو لوگ (عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے، وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہیں، تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا، اور ان میں سے وہ شخص جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اُٹھایا، اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿11﴾

واقعۂ افک کا بیان:

یہ ایک طوفان کا ذکر ہے جو نبی اکرم ﷺ کے وقت میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر اُٹھا۔ پیغمبر ایک جہاد سے لوٹ کر آرہے تھے، رات کے وقت کوچ ہوا، نفیری اور نقارہ نہ تھا، اُم المومنین رضی اللہ عنہا جنگل میں قضائے حاجت کے لیے گئی ہوئی تھیں، پیچھے رہ گئیں۔ ایک مسلمان لشکر کے پیچھے چلتا تھا، نبی اکرم ﷺ کے حکم سے، تاکہ کوئی گری پڑی چیز ہو تو اس کو اُٹھا لے، اس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ اکیلی رہ گئی ہیں، اُن کو اونٹ پر سوار کیا اور خود مہار پکڑ کر لشکر میں لا پہنچایا۔ کمبخت منافق لوگ اپنے منہ سیاہ کرنے لگے، ایک مہینے تک اس بات کا چرچا رہا۔ پیغمبر بھی سنتے اور بغیر تحقیق کچھ نہ کہتے، لیکن دل میں خفا رہتے۔ مہینے کے بعد جب اُم المومنین نے سنا، اُن کو بہت غم اور صدمہ ہوا، تین دن تک روتی رہیں، دم نہ لیا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں دو رکوع تک۔

تم کو بہتر ہے اس واسطے کہ اللہ کے فرمانے سے تم کو اور بزرگی ملی اور جنھوں نے یہ بات پھیلائی، انھوں نے صرف گناہ ہی کمایا، یعنی بعض خوشیاں کر کے کہتے، بعضے افسوس کر کے کہتے، بعض چھیڑنے کی غرض سے مجلس میں چرچا کرتے، آپ ﷺ چپکے سنا کرتے۔ بعضے سن کر سوچ میں پڑ جاتے اور چپ رہ جاتے اور بعض صاف جھٹلا دیتے، ان

پچھلوں کو پسند کیا اور سب کو تھوڑا بہت الزام دیا اور بڑا بوجھ اُٹھانے والا عبداللہ بن ابی تھا، منافقوں کا سردار۔

یہ دس آیتیں سب کی سب اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازل ہوئی ہیں، جب کہ منافقوں میں سے جھوٹی تہمت اور بہتان لگانے والوں نے اُن کو صرف جھوٹ اور بہتان کے ساتھ عیب لگایا۔ اللہ عزوجل نے اُن کے لیے اور اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غیرت کی اور اُن کی آبرو بچانے کے لیے براءت و پاکیزگی اور نزاہت نازل کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ﴾ یعنی اِفک والی ایک جماعت ہے تم میں سے، مطلب یہ کہ وہ نہ ایک ہے نہ دو، بلکہ ایک جماعت ہے۔ اس بہتان میں آگے آگے سردار عبداللہ بن ابی ابن سلول منافقین کا سردار تھا۔ چنانچہ وہ اس کو جمع کرتا اور منتشر کیا کرتا تھا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی داخل ہوگیا تو انھوں نے اس بارے میں بات چیت کی اور ان میں سے دوسروں نے اس کو جائز رکھا۔ مہینے بھر کے قریب بات اسی طرح رہی، یہاں تک کہ قرآن شریف نازل ہوا، اس کا بیان صحیح حدیثوں میں وارد ہوا ہے:

1 امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم کو حدیث بیان کی عبدالرزاق رحمہ اللہ نے، کہا: ہم کو حدیث بیان کی معمر نے زہری سے، زہری نے کہا کہ مجھ کو خبر دی سعید بن مسیّب نے اور عروہ بن زبیر و علقمہ بن وقاص و عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود نے، حدیث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی، جبکہ افک والوں نے اُن کے لیے کہا جو کچھ کہا، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو بری فرمایا۔ اُن سب نے اُن کی حدیث کا ایک ٹکرا مجھ سے بیان کیا اور اُن میں سے بعض لوگ زیادہ تر حافظ تھے اُن کی حدیث کے بعض سے، اور اس کے بیان کرنے میں زیادہ تر پکے تھے بعض سے، اور میں نے اُن میں سے ہر ایک شخص سے اس حدیث کو یاد رکھا جو اس نے مجھ سے بیان کی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے، اور بعض حدیث اُن کی تصدیق کرتی ہے بعض کی۔ اُن سب نے ذکر کیا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ جس وقت آپ کسی سفر میں نکلنے کا ارادہ فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے، پھر جس بی بی کا سہم نکلتا تو آپ (سہم مفرد ہے سہام کا، سہام اصل میں قمار کے پانسوں کو کہتے ہیں۔ پھر سہم کے معنی یہ ہوئے کہ نصیب اور حصے کو کہنے لگے، یہاں مراد یہ ہے کہ جس بی بی کا نام قرعہ کے ذریعے سے نکلا، اسی کو ساتھ لے گئے) اس بی بی کو اپنے ہمراہ لے چلتے تھے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے درمیان قرعہ ڈالا کسی غزوے میں جانے کے لیے جس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چڑھائی کی تو اس میں میرا سہم نکلا اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلی اور یہ سفر پردے کا حکم نازل ہونے کے بعد تھا۔ لہٰذا میں اپنے ہودج میں اُٹھائی جاتی تھی (ہودج ایک زنانی سواری ہے، جس کو اونٹ پر کسا کرتے ہیں) اور ہودج ہی میں اُتاری جاتی تھی۔ چنانچہ ہم چلے یہاں تک کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غزوے سے فارغ ہو چکے اور لوٹے اور ہم واپسی میں مدینے سے قریب ہوئے تو ایک رات کوچ کا اعلام

کیا، یعنی کوچ کرنے کا اظہار کیا۔ جس وقت کوچ کا اعلام کیا تو میں چلی، یہاں تک کہ لشکر سے آگے بڑھ گئی، پھر جب میں اپنا کام پورا کر چکی تو اپنی منزل کی طرف متوجہ ہوئی تو میں نے اپنے سینے کو چھوا تو اچانک ظفار کے منکوں کا میرا ہار ٹوٹ پڑا تھا۔ (ظفار یمن کے ایک شہر کا نام ہے۔ وہاں کے منکوں کا ہار تھا) پھر میں لوٹی تو میں نے اپنا ہار تلاش کیا۔ اس کی تلاش نے مجھے روکے رکھا اور وہ جماعت آئی جو میرے ہودج کو کسا کرتے تھے تو اُنھوں نے میرے ہودج کو اُٹھا لیا، پھر اسے میرے اُونٹ پر کس دیا جس پر میں سوار ہوا کرتی تھی، وہ یہ خیال کرتے تھے کہ میں ہودج میں ہوں۔ فرمایا کہ اس زمانے میں عورتیں ہلکی پھلکی تھیں، موٹی نہیں ہوتی تھیں اور نہ اُن کو گوشت نے ڈھانکا تھا، یعنی اُن پر گوشت نہیں چڑھا تھا، صرف ذرا سا کھانا کھاتی تھیں، لہٰذا انھوں نے ہودج کے ہلکا ہونے کو اوپرا نہ سمجھا، یہاں تک کہ اس کو اُٹھایا اور لاد دیا اور میں ایک نوعمر لڑکی تھی، پھر اُنھوں نے اُونٹ کو اُٹھایا اور چل دیے۔ اس کے بعد کہ لشکر گزر گیا تھا میں نے اپنا ہار پا لیا۔

پھر میں لشکر کی فرودگاہ میں آئی، حالاں کہ اس میں نہ کوئی پکارنے والا تھا نہ کوئی جواب دینے والا، مطلب یہ ہے کہ وہاں کوئی نہ تھا۔ پھر میں نے اپنی منزل کا قصد کیا، جس میں تھی اور خیال کیا کہ لوگ مجھے ابھی گم پائیں گے تو میری طرف لوٹ کر آئیں گے۔ اس دوران میں کہ میں اپنی منزل میں بیٹھی ہوئی تھی، آنکھوں نے مجھ پر غلبہ کیا تو میں سو گئی اور صفوان بن معطل سلمی ثم الذکوانی لشکر کے پرے آخر رات کو راحت لینے کے لیے اُتر پڑا تھا۔ پھر وہ پچھلی رات کو چلا تو اس نے میری منزل کے نزدیک صبح کی تو اس نے ایک سوتے آدمی کا نشان دیکھا، وہ میرے پاس آیا، پھر اس نے مجھے پہچان لیا جب مجھے دیکھا، اور پردے سے پہلے وہ مجھ کو دیکھ چکا تھا، میں نے اپنی چادر سے اپنا منہ ڈھانک لیا۔ واللہ! اس نے مجھ سے کچھ بات نہیں کی، نہ میں نے اس سے کوئی بات سنی، سوائے ”اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ“ کہنے کے، جبکہ اس نے اپنی سواری بٹھائی۔

پھر اس نے سواری کا اگلا پاؤں دبایا تو میں اس پر سوار ہو گئی، پھر وہ میری سواری کو کھینچتے ہوئے چلا، یہاں تک کہ ہم لشکر میں آ گئے، اس کے بعد کہ وہ اُتر چکے تھے، اس وقت ٹھیک دوپہر ہونے والی تھی۔ پھر میرے بارے میں ہلاک ہوا جو ہلاک ہوا اور جس نے اس کا بڑا بوجھ اُٹھایا وہ عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا۔ پھر ہم مدینے میں آئے۔ پھر جس وقت ہم مدینے میں آئے تو میں مہینا بھر بیمار رہی اور لوگ بہتان والوں کی بات میں بحث کرتے تھے اور میں اس میں سے کچھ نہیں سمجھتی تھی اور مجھے میری بیماری میں یہ بات شک میں ڈالتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ سے وہ لطفِ کرم نظر نہیں آتا تھا جو اس سے پہلے جب میں بیمار ہوتی تھی، محسوس ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جب داخل ہوتے تو سلام کرتے، پھر فرماتے: « كَيْفَ تِيْكُمْ » یعنی تم کیسی ہو؟ چنانچہ یہ وہ بات ہے جو مجھے شک میں ڈالتی تھی اور شر کو میں نہیں جانتی تھی، یہاں تک کہ میں نکلی اس کے بعد کہ کمزور ہو گئی تھی اور مسطح

کی ماں میرے ہمراہ نکلی مَنَاصع کی طرف (جو مدینے کے باہر ایک جگہ ہے) یہ جگہ ہماری قضائے حاجت کی جگہ تھی اور ہم ایک رات سے دوسری رات تک نہیں نکلتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ قلتِ طعام کی وجہ سے قضائے حاجت کی ضرورت کم ہوتی تھی۔ ایک رات کو ہو آئے۔ پھر کہیں دوسری رات کو جانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اور مناصع کی طرف جانا اس سے پہلے ہوتا تھا، جبکہ پاخانے ہمارے گھروں کے قریب بنائے جائیں۔ جنگل کے پاخانے جانے میں ہماری حالت عرب کے پہلے لوگوں کی طرح تھی۔ ہمیں اس بات سے تکلیف ہوتی تھی کہ پاخانے گھروں میں بنائیں۔ پھر میں اور مسطح کی ماں چلی۔ مسطح کی ماں ابورہم بن مطلب بن عبدالمطلب بن عبد مناف کی بیٹی ہے اور اس کی ماں بیٹی ہے صخر بن عامر کی، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ۔ اور اس کا بیٹا مسطح فرزند ہے اثاثہ بن عباد بن عبدالمطلب کا۔ میں اور ابو رُہم کی بیٹی مسطح کی ماں میرے گھر کی طرف آئی، جب کہ ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے تو مسطح کی ماں نے اپنی چادر میں لغزش کھائی تو بول اُٹھی: "تَعِسَ مِسْطَحٌ" یہ بد دعا ہے، یعنی مسطح ہلاک ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ تو نے برا کہا، تُو ایسے شخص کو گالی دیتی ہے جو بدر میں حاضر ہوا تو وہ بولی: اے عورت! کیا تو نے نہیں سنا جو اس نے کہا ہے۔ (اصل کے الفاظ "يَا هَنْتَاهُ" ہیں، اس کے معنی ہیں "يَا هَذِهِ" یعنی اے عورت "يَا بَلْهَاءُ" ہیں، یعنی اے بھولی بھالی!) میں نے کہا: کیا کہا ہے؟ کہا: پھر اس نے مجھے بہتان والوں کی بات کی خبر دی تو میں نے اپنی بیماری پر اور زیادہ بیماری کی۔

پھر جب میں اپنے گھر لوٹ کر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر داخل ہوئے تو سلام کیا۔ پھر فرمایا: کیسی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے عرض کی: آیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں اپنے ماں باپ کے پاس جاؤں؟ کہا: میں اس وقت یہ ارادہ کرتی تھی کہ اُن کی طرف سے خبر کا یقین حاصل کروں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت دی تو میں اپنے ماں باپ کے پاس آئی۔ میں نے اپنی ماں سے کہا: اماں لوگ کس چیز کی بات چیت کرتے ہیں؟ تو وہ بولیں، بیٹی! "هَوِّنِي عَلَيْكِ" یعنی تو اس کا کچھ خیال مت کر، تُو تو سہل انگاری کر، قسم ہے اللہ کی! البتہ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کوئی عورت خوبصورت ہو کسی مرد کے نزدیک اور وہ اسے محبوب رکھتا ہو اور اس عورت کی سوکنیں ہوں، مگر وہ اس پر بہت کچھ طوفان کرتی ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ پھر میں نے کہا: "سُبْحَانَ اللّٰهِ أَوَ قَدْ تَحَدَّثَ النَّاسُ بِهَا" یعنی انھوں نے اس سے تعجب کیا کہ ایسا معاملہ اُن کے حق میں واقع ہوا ہے اور لوگوں نے اس بارے میں گفتگو کی، اور باوجود اس کے کہ اُن کی براءت ماں کے نزدیک یقینی تھی، پھر ماں نے اپنی بیٹی کو اس کی خبر نہ کی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: پھر میں اس رات روتی رہی، یہاں تک کہ میں نے صبح کی، نہ میرا آنسو تھمتا تھا نہ میں سرمہ کش خواب کی ہوتی تھی، یعنی رنج و غم کے مارے روتے روتے میں نے صبح کی۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بلایا، جبکہ وحی

نے دیر کی، آپ ﷺ اُن سے پوچھتے تھے اور اپنی بیوی کی جدائی میں اُن سے مشورہ لیتے تھے۔ چنانچہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جو آپ ﷺ کی بیوی کی براءت جانتا تھا اور اپنے جی میں اُن کی دوستی کو جانتا تھا، آپ ﷺ کو اسی کا مشورہ دیا۔ عرض کی: یا رسول اللہ! وہ آپ کی بیوی ہیں اور ہم تو اُن کے بارے میں خیر ہی جانتے ہیں۔ رہے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تو وہ بولے: یا رسول اللہ! اللہ نے آپ پر تنگی نہیں کی ہے، عورتیں اس کے سوا بہت ہیں، مگر آپ لونڈی بریرہ سے پوچھ لیں گے تو وہ آپ کو سچ خبر دے گی، یعنی سچ کہہ دے گی۔ (سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی غرض یہ تھی کہ نبی اکرم ﷺ کو سخت قلق ہے تو اُن کی یہ رائے ہوئی کہ اُن کی جدائی سے آپ کا قلق سکون پذیر ہو جائے گا، پھر جب اُن کی براءت ثابت ہو جائے گی تو اُن سے رجوع فرما لیں گے، کسی طرح سے آپ کی بے چینی تو رفع ہو جائے، یہ بات اس لیے کہی تھی نہ کہ اس لیے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کوئی دشمنی تھی۔ معاذ اللہ۔) فرمایا: پھر رسول اللہ ﷺ نے بریرہ کو بلایا تو فرمایا کہ اے بریرہ! آیا تو نے کوئی چیز دیکھی جو تجھے عائشہ سے شک میں ڈالے؟ بریرہ نے کہا: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا! میں نے اس پر کبھی کوئی امر نہیں دیکھا کہ اس کا عیب اس پر لگاؤں، سوائے اس کے کہ وہ ایک نو عمر لڑکی ہے، اپنے گھر کے گوندھے ہوئے آٹے سے سو رہتی ہے تو گھر کی پلی بکری آتی ہے تو اسے کھا جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اسی دن کھڑے ہوئے، یعنی خطبہ پڑھنے کے لیے، "فَاسْتَعْذَرَ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أُبَيٍّ ابْنِ سَلُوْلَ" یعنی آپ نے یوں فرمایا کہ کون شخص میرا عذر قبول کرتا ہے اس کے حق میں اگر میں اسے اس کی برائی کی تادیب کروں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس حالت میں کہ آپ منبر پر تھے: اے مسلمانوں کے گروہ! کون شخص میری مدد کرتا ہے یا میرا عذر قائم کرتا ہے، اس شخص سے کہ جس سے مجھے میرے اہل کے بارے میں تکلیف پہنچ چکی ہے؟ قسم ہے اللہ کی! کہ میں نے اپنے اہل میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانا اور البتہ لوگوں نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا ہے جس میں مَیں نے سوائے خیر کے اور کچھ نہیں جانا اور وہ میرے اہل پر میرے ساتھ ہی داخل ہوتا تھا۔ سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں آپ کی مدد کرتا ہوں اس معاملے میں، اگر وہ شخص قبیلہ اوس سے ہے تو ہم اُس کی گردن مار دیں گے اور اگر وہ ہمارے بھائیوں قبیلہ خزرج سے ہے تو آپ ہم کو حکم دیں گے تو ہم آپ کے حکم کی بجا آوری کریں گے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ پھر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑا ہوا اور یہ شخص خزرج کا سردار تھا اور نیک مرد تھا، لیکن حمیت نے اس کو برانگیختہ کیا تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا: تو نے جھوٹ کہا، قسم ہے اللہ کی! تو اسے قتل نہ کرے گا، نہ اس کے قتل پر قادر ہو گا اور اگر وہ تیری جماعت سے ہو تو میں پسند نہیں کرتا کہ قتل کیا جائے۔ پس اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، یہ شخص سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چچا زاد ہیں تو سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے کہا: تو نے جھوٹ کہا: اللہ کی قسم!

البتہ ہم اس کو قتل کریں گے، بے شک تو منافق ہے، منافقوں کی طرف سے جھگڑتا ہے۔ پھر اوس اور خزرج کے دونوں قبیلے کھڑے ہوگئے، یعنی غصے کے مارے یہاں تک کہ قصد کیا کہ لڑ پڑیں اور رسول اللہ ﷺ منبر پر تھے۔ آپ ﷺ اُن کو چپ کراتے تھے یہاں تک کہ وہ چپ ہوگئے اور رسول اللہ ﷺ نے سکوت فرمایا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں اس دن روتی رہی، میرے آنسو نہ تھمتے تھے، نہ میں نیند کا سرمہ لگاتی تھی، میرے ماں باپ گمان کرتے تھے کہ رونے سے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ فرمایا اس دوران میں کہ میں رو رہی تھی اور وہ دونوں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انصار کی ایک عورت نے مجھ سے اِذن مانگا تو میں نے اُسے اِذن دیا تو وہ بیٹھ کر میرے ساتھ رونے لگی۔ پھر ہم اس حالت میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہم پر داخل ہوئے اور سلام کیا، پھر بیٹھ گئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ ﷺ میرے پاس نہیں بیٹھے جب سے کہ کہا گیا جو کچھ کہ کہا گیا اور آپ ﷺ مہینا بھر ٹھہرے رہے۔ آپ ﷺ کی طرف میری شان میں کچھ وحی نہیں کی گئی۔ فرمایا: پھر رسول اللہ ﷺ نے خطبہ پڑھا، جبکہ آپ بیٹھے۔

پھر فرمایا: ((أَمَّا بَعْدُ!)) اے عائشہ! بے شک مجھ کو تمھارے بارے میں ایسی ایسی بات پہنچی، چنانچہ اگر تو بَری ہے تو تجھے عن قریب اللہ بَری کر دے گا اور اگر تو کسی گناہ میں آلودہ ہوئی ہے تو تو اللہ سے مغفرت طلب کر اور اس کی طرف رجوع ہو، کیوں کہ بندہ جس وقت اپنے گناہ کا اقرار کرتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے تو اللہ اس پر رجوع فرماتا ہے، یعنی اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: پھر جب رسول اللہ ﷺ اپنی بات پوری فرما چکے تو میرے آنسو رک گئے، یہاں تک کہ میں اس سے ایک قطرے کا بھی احساس نہیں کرتی تھی۔ پھر میں نے اپنے والد سے کہا کہ تم میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو جواب دو تو وہ بولے: واللہ! میں نہیں جانتا کہ میں رسول اللہ ﷺ سے کیا کہوں۔ پھر میں نے اپنی ماں سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کو جواب دو تو وہ بولیں کہ میں نہیں جانتی کہ رسول اللہ ﷺ سے کیا کہوں۔ فرمایا: پھر میں نے کہا: حالاں کہ میں ایک نو عمر لڑکی تھی، بہت سا قرآن بھی نہیں پڑھا تھا، واللہ! البتہ میں جان چکی تھی کہ البتہ تم اس قصے کو سن چکے ہو، یہاں تک کہ وہ تمھارے دلوں میں قرار پذیر ہو چکا ہے اور تم اس کی تصدیق کر چکے ہو۔ پھر البتہ اگر میں تم سے کہوں کہ بے شک میں بَری ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک میں بَری ہوں تو تم مجھے سچا نہ سمجھو گے اور البتہ اگر میں اقرار کرلوں اس امر کا، حالاں کہ اللہ جانتا ہے کہ بے شک میں بَری ہوں تو البتہ تم میری تصدیق کر لو گے۔ واللہ! میں نہیں پاتی اپنے واسطے اور واسطے تمھارے کوئی مثال، مگر ویسی جیسے یوسف علیہ السلام کے باپ نے کہی ہے کہ ﴿ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴾ [یوسف: ۱۸] ''لہٰذا صبر ہی بہتر ہے اور اس پر اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے جو تم بیان کرتے ہو۔''

کہا: پھر میں وہاں سے اُٹھ آئی تو اپنے بچھونے پر لیٹ رہی۔ فرمایا: اور میں واللہ! اس وقت جانتی تھی کہ بے شک میں بَری ہوں اور بے شک اللہ تعالیٰ میری براءت کے ساتھ مجھے بری کرنے والا ہے، لیکن واللہ! میں یہ گمان نہیں

کرتی تھی کہ میری شان میں وحی نازل ہو کہ وہ پڑھی جائے اور البتہ میرے جی میں میری جان اس سے حقیر تر تھی کہ اللہ میرے حق میں ایسے امر کے ساتھ کلام کرے کہ اس کی تلاوت کی جائے، لیکن میں یہ اُمید کرتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نیند میں کوئی خواب دیکھ لیں گے، جس سے اللہ مجھ کو بری کر دے گا۔ فرمایا: قسم ہے اللہ کی! نہیں مفارقت کی رسول اللہ ﷺ نے اپنی مجلس سے اور نہ کوئی گھر والوں سے، یعنی حاضرینِ مجلس سے نکلا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر قرآن شریف کی آیات نازل کیں، لہٰذا آپ ﷺ کو پسینہ آ گیا، جیسا کہ آپ ﷺ کو نزولِ وحی کے وقت آ جاتا تھا، یہاں تک کہ البتہ آپ ﷺ سے پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپکتے تھے اور آپ ﷺ سرد دن میں ہوتے، اس قول کی گرانی کے سبب جو آپ ﷺ پر نازل کیا گیا۔ فرمایا: پھر وہ حالت رسول اللہ سے دور ہو گئی اور آپ ﷺ ہنستے تھے، تو پہلا کلمہ جس کے ساتھ آپ ﷺ نے تکلم کیا وہ یہ تھا کہ فرمایا: خوش ہو جا اے عائشہ! اللہ عزوجل نے بلاشبہ تجھ کو بری کر دیا۔ کہا: پھر مجھ سے میری ماں نے کہا کہ تو اُن کی طرف کھڑی ہو جا تو میں نے کہا: واللہ! میں اُن کی طرف کھڑی نہیں ہوں گی اور نہ حمد کروں گی مگر اللہ عزوجل کی کہ وہی ہے جس نے میری براءت نازل فرمائی اور اللہ عزوجل نے ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ﴾ کل دس آیتیں اُتاریں۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے میری براءت میں یہ نازل کیا تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا، اور وہ مسطح بن اُثاثہ کو اس کی قرابت اور محتاجی کی وجہ سے نفقہ دیا کرتے تھے: واللہ! میں اس کے بعد اس پر کبھی کچھ خرچ نہ کروں گا، کیوں کہ اس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ایسا کہا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [النور: ۲۲] ''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بولے: ''بَلٰى وَاللّٰهِ'' بے شک میں البتہ دوست رکھتا ہوں کہ اللہ مجھے بخشے، پھر جو نفقہ مسطح کو دیا کرتے تھے وہ دینے لگے اور کہا: واللہ! میں اس نفع کو اس سے کبھی نہ کھینچوں گا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ زینب بنت جحش سے، جو نبی اکرم ﷺ کی زوجہ تھی، میرا حال پوچھا کرتے تھے، فرماتے: اے زینب! تو نے کیا جانا یا دیکھا؟ تو وہ کہتیں: یا رسول اللہ! میں اپنے کان اور آنکھ کو بچاتی ہوں، واللہ! میں نے نہیں جانی مگر خیر۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یہ زینب وہی بی بی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بیویوں میں سے میرا مقابلہ کیا کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور پرہیز گاری کی وجہ سے اس کو بچا لیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس علو و بہرہ مندی کی میں نبی اکرم ﷺ سے طالب تھی، اسی کی وہ بھی طالب تھی، میرا اور اس کا مقابلہ رہا کرتا تھا۔ باوجود اس کے وہ افک میں شریک نہ ہوئی اور اس کی بہن

حمنہ بنت جحش اس کے واسطے لڑنے لگی، چنانچہ جو لوگ ہلاک ہوئے اُن میں وہ بھی ہلاک ہوئی۔ امام ابن شہاب رحمہ اللہ نے کہا: چنانچہ یہ وہ شے ہے جو ہم کو اس گروہ کے حال کے بارے میں پہنچی۔[1] (أخرجه البخاري و مسلم في صحيحيهما من حديث الزهري، وهكذا رواه ابن إسحاق عن الزهري كذلك، قال وحدثني يحيىٰ بن عباد بن عبد الله بن الزبير عن أبيه عن عائشة وحدثني عبدالله بن أبي بكر بن محمد بن عمرو بن حزم الأنصاري عن عمرة عن عائشه رضی اللہ عنہا بنحو ما تقدم. والله أعلم)

2 پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: "وقال أبو أسامة عن هشام بن عروة قال: أخبرني أبي عن عائشه رضی اللہ عنہا" سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جبکہ میرا قصہ ذکر کیا گیا جو ذکر کیا گیا اور مجھے اس کا علم نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے بارے میں خطبہ پڑھنے کو کھڑے ہوئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد پڑھا۔ پھر اللہ کی حمد و ثنا کی اس شے کے ساتھ جس کے وہ لائق ہے۔ پھر فرمایا: ((أَمَّا بَعْدُ!)) تم مجھے اُن لوگوں کے بارے میں مشورہ دو جنھوں نے میرے اہل کو تہمت لگائی ہے اور قسم ہے اللہ کی! میں نے اپنے اہل میں کوئی برائی نہیں جانی اور ایسے شخص کے ساتھ اُن کو تہمت لگائی اور قسم ہے اللہ کی! میں نے اس میں کبھی کوئی برائی معلوم نہیں کی اور نہ ہی وہ میرے گھر میں میری عدمِ موجودگی میں کبھی داخل ہوتا ہے اور نہ وہ کسی سفر میں غائب ہوا، مگر میرے ہمراہ غائب ہوا۔ سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے اجازت دیں کہ ہم اُن کی گردنیں ماریں، پھر ایک شخص قبیلہ خزرج کا کھڑا ہوا، حسان کی ماں اسی شخص کے گروہ سے تھیں، وہ بولا کہ تو نے جھوٹ کہا۔ خبردار واللہ! اگر وہ لوگ اوس کے ہوں تو تو میں دوست نہیں رکھتا کہ ان کی گردنیں ماری جائیں۔ اتنی بحث ہوئی کہ قریب تھا کہ مسجد میں اوس اور خزرج کے درمیان شر ہو جائے اور مجھے معلوم نہیں۔

پھر جب اس دن کی شام ہوئی تو میں اپنی بعض حاجت کے لیے نکلی اور میرے ساتھ مسطح کی ماں تھی۔ لہٰذا اس نے ٹھوکر کھائی تو کہا: "تَعِسَ مِسْطَحٌ"، یعنی مسطح ہلاک ہو! میں نے اس سے کہا: اے ماں! تو اپنے بیٹے کو گالی دیتی ہے تو وہ چپ ہو رہی۔ پھر دوبارہ لغزش کھائی تو کہا: "تَعِسَ مِسْطَحٌ" پھر میں نے اس سے کہا: اے ماں! تو اپنے بیٹے کو گالی دیتی ہے۔ پھر تیسری بار لغزش کھائی تو کہا: "تَعِسَ مِسْطَحٌ" میں نے اس کو جھڑکا تو وہ بولی: واللہ! میں اس کو گالی نہیں دیتی ہوں مگر تیرے بارے میں، تو میں نے کہا: میری کس بات میں؟ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ پھر مسطح کی ماں نے مجھ سے کھول کر قصہ بیان کیا تو میں نے کہا: کیا واقعی یہ ہوا ہے؟ کہا: ہاں، واللہ! پھر میں اپنے گھر کی طرف لوٹ آئی، گویا جس کام کے لیے نکلی تھی اس سے نہ تھوڑا پاتی تھی نہ بہت اور مجھے تپ چڑھ گیا، مطلب یہ کہ رنج کے مارے پاخانے کی حاجت جاتی رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے عرض کی کہ آپ مجھے میرے باپ کے گھر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٠) مسند أحمد (٦/ ١٩٤)

بھیج دیں، چنانچہ آپ ﷺ نے میرے ہمراہ غلام کو بھیجا، پھر میں گھر میں داخل ہوئی تو میں نے اُم رومان رضی اللہ عنہا (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ) کو نیچے پایا اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گھر کے اُوپر، وہ پڑھ رہے تھے۔ اُم رومان رضی اللہ عنہا نے کہا: بیٹی تجھے کونسی چیز لائی ہے؟ تو میں نے اُن کو خبر دی اور قصہ اُن سے بیان کیا، میں نے محسوس کیا کہ اس بات کا صدمہ اور تکلیف جتنی مجھے پہنچی تھی، ویسی اُن کو نہیں پہنچی تو وہ بولیں: ”يَا بُنَيَّةُ خَفِّفِي عَلَيْكِ الشَّأْنَ“ یعنی بیٹی تو اس بات کو ہلکا جان، رنج مت کر، اس لیے کہ واللہ! ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کبھی کوئی خوبصورت عورت کسی مرد کے پاس ہوتی ہے اور اس کی سوکنیں ہوتی ہیں، مگر وہ اس پر حسد کرتی ہیں اور اس کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے۔

ناگاہ اس کا جو صدمہ مجھے پہنچا تھا، وہ اُن کو نہیں پہنچا تو میں نے کہا کہ کیا میرے باپ کو اس کا علم ہو چکا ہے؟ کہا: ہاں، میں نے کہا: اور رسول اللہ ﷺ کو بھی؟ کہا: ہاں، اور رسول اللہ ﷺ کو بھی اس کی خبر ہو چکی ہے۔ اس پر میں آنسو بھر لائی اور روئی، چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میری آواز سنی اور وہ گھر کے اوپر پڑھ رہے تھے تو وہ اُتر آئے اور میری ماں سے کہا کہ اس کا کیا حال ہے؟ ماں نے کہا ہے کہ جو قصہ اس کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا اسے علم ہوا ہے تو اُن کی آنکھیں جاری ہو گئیں۔ پھر کہا: اے بیٹی! میں تجھ کو قسم دیتا ہوں کہ تو اپنے گھر لوٹ جا، لہٰذا میں لوٹ آئی اور البتہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر تشریف لائے تو میری خادمہ سے میرا حال پوچھا تو اس نے کہا: یا رسول اللہ! واللہ! میں نے اس پر کوئی عیب نہیں جانا۔ سوائے اس کے کہ یہ سو جاتی ہے، یہاں تک کہ بکری داخل ہوتی ہے تو اس کے خمیر یا عجین کو (گندے ہوئے آٹے کو) کھا لیتی ہے۔ آپ ﷺ کے بعض اصحاب نے اس کو ڈانٹا کہ تو رسول اللہ ﷺ سے سچ کہہ دے: ”حَتَّى أَسْقَطُوا لَهَا بِهِ“ یعنی یہاں تک کہ قصۂ افک کے سبب سے اس لونڈی کو گالیاں دیں، اس سے پوچھ پاچھ کرنے میں اور جھڑکنے میں اُسے برا بھلا کہا۔ یا قصۂ افک کی تصریح کر دی، کھول کر اس سے پوچھا تو لونڈی نے کہا: ”سُبْحَانَ اللّٰهِ! وَاللّٰهِ! مَا عَلِمْتُ عَلَيْهَا إِلَّا مَا يَعْلَمُ الصَّائِغُ عَلَى تِبْرِ الذَّهَبِ الْأَحْمَرِ“ (یعنی جب خادمہ سے افک کی تصریح کی تو اس نے تعجب کیا کہ سبحان اللہ! یہ بات ایسی پاک دامن بی بی سے کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر کہا کہ میں نے اُن پر کوئی عیب نہیں جانا، مگر وہ عیب کہ سنار خالص زرِ سرخ پر جانتا ہے۔ ”تبر“ کہتے ہیں خالص سونے کو، اس سے قبل کہ اس کی اشرفیاں بنائی جائیں، یعنی جس طرح سنار خالص سونے میں کوئی عیب نہیں جانتا، اسی طرح میں بھی اُن میں کوئی عیب نہیں جانتی، نہایت مبالغے سے بے عیبی کو ادا کیا، مطلب یہ ہے کہ وہ تو خالص کندن ہیں، اُن میں عیب اور نقص کی کیا موجودگی ہے۔) اور افک کی خبر اس شخص کو پہنچی جس کے واسطے کہا گیا تھا تو اس نے کہا: ”سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا كَشَفْتُ كَنَفَ أُنْثَى قَطُّ“ یعنی میں نے کسی عورت کا پردہ نہیں کھولا، مطلب یہ کہ جماع نہیں کیا۔ (کنف بکسرِ کاف و فتحِ نون بھی جائز ہے، معنی اس کے جانب ہیں۔ کسی نے کہا کہ صفوان حصور تھے، عضوِ

مخصوص مثل ہدیۂ ثوب تھا۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ کسی عورت سے حرام نہیں کیا۔) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: پھر وہ اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔ فرمایا کہ میرے ماں باپ صبح کو میرے نزدیک آئے اور اس وقت تک رہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ مجھ پر داخل ہوئے اور آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی۔ پھر داخل ہوئے اس حال میں کہ میرے ماں باپ مجھے دائیں اور بائیں جانب سے گھیرے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے اللہ کی حمد وثنا کی۔

پھر فرمایا: اے عائشہ! اگر تو کسی گناہ کے قریب ہوئی ہو یا تو نے ظلم کیا ہو تو تو اللہ کی طرف رجوع ہو، کیوں کہ اللہ اپنے بندوں سے توبہ قبول کر لیتا ہے۔ فرمایا: انصار کی ایک عورت آئی تو وہ دروازے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے کہا: کیا آپ اس عورت سے شرماتے نہیں ہیں کہ کسی شے کا ذکر کریں؟! تو رسول اللہ ﷺ نے وعظ کیا۔ پھر میں نے اپنے باپ کی طرف توجہ کی اور اُن سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ جواب دیں، وہ بولے: میں کیا کہوں۔ پھر میں نے اپنی ماں کی طرف توجہ کی اور اُن سے کہا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں، وہ بولیں: میں کیا کہوں۔ جب انھوں نے جواب نہ دیا تو میں نے تشہد پڑھا۔ پھر اللہ کی وہ حمد وثنا کی جس کے وہ لائق ہے۔ پھر میں نے کہا: امابعد! پس قسم ہے اللہ کی! اگر میں تم سے کہوں کہ میں نے نہیں کیا اور اللہ عزوجل شاہد ہے کہ میں البتہ سچی ہوں تو یہ بات تمھارے نزدیک مجھے فائدہ نہ دے گی، تم تو اس میں گفتگو کر چکے ہو اور تمھارے دل اس کو پلا دیے گئے ہیں اور اگر میں کہوں کہ واقعی میں نے کیا ہے اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کیا تو تم البتہ کہو گے کہ واقعی اس نے اپنی جان پر اس کا اقرار کر لیا اور بے شک میں واللہ! نہیں پاتی ہوں، اپنے لیے اور تمھارے لیے کوئی مثال اور میں نے یعقوب علیہ السلام کا نام تلاش کیا تو مجھے اس پر قدرت نہ ہوئی، مگر یہی آیا کہ ابو یوسف، جبکہ انھوں نے کہا تھا: ﴿ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴾ اور اللہ نے اپنے رسول ﷺ پر اسی گھڑی وحی نازل کی تو ہم خاموش ہوگئے۔ پھر آپ ﷺ سے وہ حالت جاتی رہی اور میں البتہ آپ ﷺ کے چہرے پر ظاہر خوشی دیکھتی تھی اور آپ ﷺ اپنی پیشانی کو پونچھتے تھے اور فرماتے تھے: خوش ہو جا اے عائشہ! اللہ نے واقعی تیری براءت نازل کر دی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں حد درجہ کے غصے میں تھی، مجھے میرے ماں باپ نے کہا کہ تو اُن کی طرف کھڑی ہو، میں نے کہا: میں ان کی طرف کھڑی نہ ہوں گی، نہ اُن کی حمد کروں گی نہ تم دونوں کی حمد کروں گی، لیکن میں اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گی جس نے میری براءت نازل کی۔ البتہ تم نے اس کو سنا اور نہ تم نے اس کا انکار کیا نہ اس کو تغیر دیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ زینب بنت جحش کو تو اللہ نے بہ سبب اپنے دین کے بچا لیا، چنانچہ اس نے نہ کہی مگر بھلائی اور اس کی بہن جو حمنہ بنت جحش تھی، تو وہ ہلاک ہوئی، اُن کے ساتھ جو ہلاک ہوئے۔ اور جو لوگ افک کی گفتگو اور بات چیت کرتے تھے یہ ہیں: مسطح، حسان بن ثابت اور عبداللہ بن ابی ابن سلول منافق۔ اور یہی شخص اس کو منتشر کرتا اور جمع کرتا تھا اور یہ وہی ہے جس نے اُن میں سے اس کا بڑا بوجھ اُٹھایا، یہ اور حمنہ۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

نے فرمایا: سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ مسطح کو کبھی کوئی نفع نہ پہنچائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:
﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴾۔ ﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ ﴾ یعنی ابوبکر ﴿ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى وَالْمَسَاكِينَ ﴾ یعنی مسطح کو۔ إلى قوله: ﴿ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴾ پس سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: بلی واللہ! اے رب ہمارے! ہم بلا شک البتہ چاہتے ہیں کہ تو ہم کو بخش دے اور جو کچھ دیا کرتے تھے، وہ پھر دینے لگے۔[1] (هكذا رواه البخاري من هذا الوجه معلقا بصيغة الجزم عن أبي أسامة أحد الأئمة الثقات و قد رواه ابن جرير في تفسيره عن سفيان بن وكيع عن أبي أسامة مطولاً به مثله أو نحوه، ورواه ابن أبي حاتم عن أبي سعيد الأشج عن أبي أسامة ببعضه)

3 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: جبکہ میرا عذر آسمان سے اترا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس کی خبر دی تو میں نے کہا: "نَحْمَدُ اللّٰهَ لَا نَحْمَدُكَ"[2]

4 امام احمد رحمہ اللہ نے بروایتِ عمرہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: جبکہ میرا عذر اترا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، یعنی خطبہ پڑھنے کے لیے تو اس کا ذکر کیا اور قرآن پڑھا، پھر جب منبر سے اُترے تو دو مردوں اور ایک عورت کو حد مارنے کا حکم دیا اور اُن کو حد ماری گئی۔[3] (ورواه أهل السنن الأربعة، وقال الترمذي: هذا حديث حسن، ووقع عند أبي داود تسميتهم حسان بن ثابت و مسطح بن أثاثة وحمنة بنت جحش، فهذه طرق متعددة عن أم المؤمنين عائشة رضي الله عنها في المسانيد و الصحاح و السنن وغيرها و قد روي من حديث أمها أم رومان رضي الله عنها)

5 امام احمد رحمہ اللہ نے بروایت مسروق اُم رومان رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، کہا: اس دوران کہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک تھی کہ اس پر ایک انصار کی عورت داخل ہوئی تو اس نے کہا: "فَعَلَ اللّٰهُ بِابْنِهَا وَفَعَلَ" یعنی اپنے بیٹے کو بد دعا دی اور کوسا، تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ کیوں اسے کوس رہی ہے؟ تو اس نے کہا کہ وہ اُن لوگوں میں تھا جنھوں نے بات بیان کی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: کونسی بات؟ تو اس نے کہا: "كَذَا وَكَذَا" یعنی افک کا قصہ بیان کیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچ چکی ہے؟ کہا: ہاں، کہا: اور ابوبکر کو بھی پہنچ چکی ہے؟ تو کہا: ہاں۔ پس سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا غش کھا کر گر پڑیں۔ پھر اُن کو جب ہوش آیا تو لرزے سے اُن کو تپ چڑھا ہوا تھا۔ اُم رومان رضی اللہ عنہا نے کہا: پھر میں کھڑی ہوئی تو میں نے اس کو کپڑا اُڑھا دیا، کہا: پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ فرمایا: اس کا کیا حال ہے؟ تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس کو لرزے سے تپ چڑھ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٧٩) تفسير الطبري (١٩/ ١٢٥۔ ١٢٧) [2] مسند أحمد (٦/ ٣٠)

[3] مسند أحمد (٦/ ٣٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٧٤۔ ٤٤٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٨١) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٣٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٦٧)

آیا ہے۔ فرمایا: «فَلَعَلَّهُ فِي حَدِيثٍ تُحُدِّثَ بِهِ» یعنی شاید اس قصے کے سبب سے ہے جس کا ذکر ہوا ہے۔ کہا: عائشہ برابر ہوکر بیٹھ گئی تو کہا: واللہ! البتہ اگر میں تمھارے لیے قسم کھاؤں تو تم میری تصدیق نہ کرو گے اور البتہ اگر میں تم سے عذر کروں تو تم میرا عذر قبول کرو گے۔ میری مثال اور تمھاری مثال یعقوب علیہ السلام اور اُن کے بیٹوں کی مثال کی طرح ہے، جبکہ اُنھوں نے کہا: ﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ﴾ [یوسف: ۱۸] ''لہٰذا صبر ہی بہتر ہے اور اس پر اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے جو تم بیان کرتے ہو۔'' کہا: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا عذر نازل کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ آئے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اُن کے ہمراہ تھے۔ پھر داخل ہوئے تو فرمایا: اے عائشہ! واقعی اللہ نے تیرا عذر نازل کیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''بِحَمْدِ اللّٰهِ لَا بِحَمْدِكَ'' اس پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتی ہے؟ کہا: ہاں۔ اُم رومان رضی اللہ عنہا نے کہا کہ جن لوگوں نے اس قصے کا ذکر کیا، اُن میں سے ایک شخص تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی خبر گیری کیا کرتے تھے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھا لی کہ اس سے صلہ رحمی نہ کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بَلٰی'' پھر اس سے صلہ رحمی کی۔[1] (تفرد به البخاري دون مسلم من طريق حصين، وقد رواه البخاري عن موسى بن إسماعيل عن أبي عوانة وعن محمد بن سلام عن محمد بن فضيل كلاهما عن حصين به، وفي لفظ أبي عوانة حدثتني أم رُومان وهذا صريح في سماع مسروق منها، وقد أنكر ذلك جماعة من الحفاظ منهم الخطيب البغدادي وذلك لما ذكره أهل التاريخ أنها ماتت في زمن النبي ﷺ، قال الخطيب: وكان مسروق يرسله فيقول سئلت أم رومان ويسوقه، فلعل بعضهم كتب سئلت بألف فاعتقد الراوي أنها سألت فظنه متصلًا، قال الخطيب: وقد رواه البخاري كذلك ولم تظهر له علته كذا قال، والله أعلم)

بہتان بازوں کی سرزنش اور پاک باز لوگوں کی عزت افزائی:

قولہ تعالیٰ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ﴾ افک کذب و بہتان و افتراء کو کہتے ہیں۔ ﴿عُصْبَةٌ﴾ بہ معنی جماعت ہے۔ ﴿لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَكُمْ﴾ یعنی اے آلِ ابوبکر! تم اس کو برا مت گمان کرو۔ ﴿بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ﴾ یعنی بلکہ وہ تمھارے واسطے دنیا اور آخرت میں بہتر ہے۔ سچا ذکر ہے دنیا میں اور آخرت میں منازل اور درجات کی بلندی ہے اور اُن کے لیے شرف اور بزرگی کا ظاہر کرنا ہے، اس بھروسے اور اہتمام کے سبب سے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اللہ پاک کے ساتھ کیا اس انداز سے کہ اللہ پاک نے قرآنِ عظیم میں اُن کی براءت نازل فرمائی، کون سا قرآن وہ قرآن: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ [حم السجدة: ٤٢] ''باطل اس کے پاس پھٹک

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٠٨۔ ٣٩١٢) مسند أحمد (٦/ ٣٦٧)

بھی نہیں سکتا، اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے۔'' یعنی جس کے نہ آگے سے باطل آتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔

اسی لیے جب ابن عباس رضی اللہ عنہما عائشہ رضی اللہ عنہا پر داخل ہوئے اور وہ نزع کی حالت میں تھیں تو اُن سے فرمایا، تم خوش ہو جاؤ، کیوں کہ بے شک تم رسول اللہ ﷺ کی بیوی ہو اور وہ تم کو محبوب رکھتے تھے اور سوائے تمھارے کسی کنواری سے انھوں نے نکاح نہیں کیا اور تمھاری براءت آسمان سے اتری۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے محمد بن عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سیدہ عائشہ اور زینب رضی اللہ عنہما نے باہم فخر کیا تو بی بی زینب بولیں کہ میں وہ ہوں کہ میری تزویج آسمان سے نازل ہوئی، بی بی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بولیں، میں وہ ہوں کہ میرا عذر اللہ کی کتاب میں نازل ہوا، جبکہ صفوان بن معطل نے سواری پر مجھ کو سوار کیا تو بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے اُن سے کہا: اے عائشہ! جب تم سوار ہوئیں تو تم نے کیا کہا تھا، کہا: میں نے کہا تھا: ''حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' ''کافی ہے مجھ کو اللہ اور بہتر کام بنانے والا ہے۔'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے کہا کہ یہ مومنین کا کلمہ ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ﴾ یعنی جن لوگوں نے اس قضیہ میں گفتگو کی اور اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو کچھ بھی فاحشہ کا عیب لگایا تو اُن میں سے ہر ایک کو عذاب کا ایک بڑا حصہ ملے گا۔

﴿ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ ﴾ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جس نے اس کی ابتدا کی۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ہے جو اس کو جمع کرتا اور اس کو پریشان کرتا اور اس کی اِذاعت (مشہوری) اور اشاعت کیا کرتا تھا، اس کے لیے اس پر بہت بڑا عذاب ہے۔ اکثر لوگ اس بات پر ہیں کہ اس سے جو مراد ہے وہ عبداللہ بن ابی ابن سلول ہے۔ ''قَبَّحَ اللّٰهُ وَلَعَنَهُ'' حدیث میں پہلے اسی پر نص گزر چکی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ اور بہت سے لوگوں نے یہی کہا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے: بلکہ اس سے مراد حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ قول غریب ہے، جو بات اس قول پر دال ہے، اگر وہ صحیح بخاری میں واقع نہ ہوتی تو اس کے لانے میں کوئی بڑا فائدہ نہ ہوتا، کیوں کہ حسان رضی اللہ عنہ تو اُن صحابہ میں سے ہیں جن کے فضائل و مناقب و مآثر ہیں۔ اُن کی خوبیوں میں سے بہترین یہ ہے کہ وہ اپنے اشعار کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دفاع کیا کرتے تھے۔ یہ وہی شخص ہیں جن کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تو اُن کی ہجو کر اور جبریل علیہ السلام تیرے ساتھ ہیں۔[4]

امام اعمش رحمہ اللہ نے ''عن أبي الضحى عن مسروق'' روایت کیا ہے، کہا: میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا کہ سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ داخل ہوئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا تو اُن کے لیے تکیہ ڈالا گیا، پھر جب وہ نکل گئے تو میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم یہ کیا کرتی ہو، کیا تم اس کو اذن دیتی ہو کہ وہ تم پر داخل ہو، حالاں کہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٧٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١١٨_ ١١٩) [3] تفسير الطبري (١٩/ ١١٩_ ١٢٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٨٦)

اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اور کون سا عذاب زیادہ سخت ہے نابینائی سے۔ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کی بینائی جاتی رہی تھی۔ شاید اللہ وہ عذابِ عظیم اسی نابینائی کو کر دے۔ پھر فرمایا کہ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دفاع کیا کرتے تھے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ جس وقت سیدنا حسان رضی اللہ عنہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تھے، تو یہ شعر اُن کی مدح میں پڑھا:

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِیْبَةٍ وَتُصْبِحُ غَرْثَی مِنْ لُحُوْمِ الْغَوَافِلِ

یعنی عفیف پارسا ہیں، باوقار ہیں۔ کسی تہمت و معصیت کے ساتھ متہم نہیں کی جاتیں ہیں اور صبح کو اُٹھتی ہیں، بھوکی غافل بیبیوں کے گوشت سے، یعنی غیبت نہیں کرتیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تو تو ایسا نہیں ہے۔ ایک روایت میں یہ ہے، لیکن تو ایسا نہیں ہے،[1] یعنی تو نے اُن کی غیبت کی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بروایتِ عامر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا: میں نے کوئی شعر نہیں سنا کہ وہ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کے شعر سے خوب ہو اور میں اس کو نہیں پڑھتی ہوں، مگر اس کے واسطے جنت کی اُمید رکھتی ہوں۔ وہ اس کا ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب سے یہ قول ہے:

هَجَوْتَ مُحَمَّداً فَأَجَبْتُ عَنْهُ وَ عِنْدَ اللّٰهِ فِيْ ذَاكَ الْجَزَاءُ
فَإِنَّ أَبِيْ وَوَالِدَهُ وَعِرْضِيْ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْكُمْ وِقَاءُ
أَتَشْتِمُهُ وَلَسْتَ لَهُ بِكُفْءٍ؟ فَشَرُّكُمَا لِخَيْرِكُمَا الْفِدَاءُ
لِسَانِيْ صَارِمٌ لَا عَيْبَ فِيْهِ وَبَحْرِيْ لَا تُكَدِّرُهُ الدِّلَاءُ

پھر کسی نے ان سے کہا: اے ام المومنین! کیا یہ لغو نہیں ہے؟ فرمایا: نہیں، لغو تو وہ ہے جو عورتوں کے پاس کہا جاتا ہے۔ کسی نے کہا: آیا اللہ تعالیٰ یوں نہیں فرماتا: ﴿ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴾؟ فرمایا: کیا اس کو عظیم نقصان نہیں پہنچا، کیا اس کی بینائی نہیں جاتی رہی اور تلوار سے نہیں مارا گیا ہے۔[2] اُن کی مراد وہ چوٹ ہے جو صفوان بن معطل نے حسان کو لگائی تھی، جبکہ حسان سے اس کو یہ بات پہنچی کہ وہ اس بارے میں ظلم کرتا ہے تو صفوان رضی اللہ عنہ تلوار لے کر اُن پر چڑھ دوڑے اور قریب تھا کہ صفوان رضی اللہ عنہ حسان رضی اللہ عنہ کو مار ڈالیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیان یہ ہے کہ ﴿ عُصْبَةٌ ﴾ خبر ہے ﴿ اِنَّ ﴾ کی اور ﴿ مِنْكُمْ ﴾ صفت ہے ﴿ عُصْبَةٌ ﴾ کی۔ کسی نے کہا کہ خبر ﴿ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ﴾ ہے اور ﴿ عُصْبَةٌ ﴾ بدل ہے فاعل ﴿ جَآءُوْ ﴾ سے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول انسق ہے معنی میں اور اکثر ہے فائدہ میں اس قول سے کہ ﴿ عُصْبَةٌ ﴾ خبر ہو۔[3] (نسق

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٧٧۔ ٤٤٧٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٨٨)

[2] تفسیر الطبري (١٩/ ١١٧۔ ١١٨) [3] فتح القدیر (٤/ ١٧)

بہ تحریک سخن ترتیب دادہ و بسکون سخن را بریک سیاقت راندن۔ غرض یہ ہے کہ یہ قول عبارت کی ترتیب کی راہ سے دوسرے قول سے زیادہ اچھا ہے۔)

جملہ ﴿ لَا تَحْسَبُوْهُ ﴾ اگرچہ طلبیہ ہے، لیکن اس کا خبر ٹھہرانا بتقدیر صحیح ہے، جس طرح کہ اس کے نظائر میں ہوتا ہے۔ غرض کہ یہاں سے ان آیتوں کا آغاز ہے جو افک سے متعلق ہیں۔ یہ کل اٹھارہ آیتیں ہیں، ان کی انتہا ﴿ أُولَٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ ﴾ ہے۔ افک بدترین وقبیح ترین جھوٹ کو کہتے ہیں۔ افک اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ "أَفَكَ الشَّيْءَ" اس وقت بولتے ہیں، جب کہ کسی شے کو اس کی وجہ سے قلب کر دے، الٹ دے۔ تو افک حدیثِ مقلوب ہوئی، کیوں کہ وہ حق سے پھیری ہوئی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ افک بہتان ہے۔ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ آیت میں جو افک ہے یہ وہی افک ہے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر واقع ہوا۔ اللہ پاک نے جو اس کا وصف افک کے ساتھ کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حال سے جو بات معلوم تھی وہ اس کے خلاف تھی۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: اس حدیث میں، جس کو یہ لوگ لائے، قلب کے معنی یہ ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جس پارسائی، شرف، عقل، دیانت، علوِ نسب اور سبب پر تھیں، اس کے سبب سے وہ اس لائق تھیں کہ اُن کی ثنا وصفت کی جاتی، اس کی مستحق نہ تھیں کہ اُن کو عیب لگایا جائے، لہٰذا جن لوگوں نے اُن کو برائی کی تہمت لگائی انھوں نے بات کو اس کے طریق سے الٹ دیا، چنانچہ یہ افک قبیح ہے اور واضح جھوٹ ہے۔

﴿ عُصْبَةٌ ﴾ دس سے چالیس تک کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہاں اُن سے مراد یہ لوگ ہیں: رأس المنافقین عبداللہ بن ابی، زید بن رفاعہ، حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ، حمنہ بنت جحش اور جو لوگ اُن کے مساعد ومعاون تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ عصبہ تین تک ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دس سے پندرہ تک۔ اصل اس کی لغت میں وہ جماعت ہے جو ایک دوسرے کے لیے تعصب کرتی ہے۔ جملہ ﴿ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ﴾ اگر خبر ہے ﴿ إِنَّ ﴾ کی تو تو ظاہر ہے اور اگر خبر ﴿ عُصْبَةٌ ﴾ ہے، جس طرح کہ گزر چکا ہے تو یہ جملہ مستانفہ ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو، ابوبکر رضی اللہ عنہ کو، صفوان بن مُعطّل رضی اللہ عنہ کو، جن کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ عیب لگایا گیا، اُن سب کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا اور اُن کے لیے تسلی ہے۔ ضمیر منصوب افک کی طرف راجع ہے۔ شر وہ ہے جس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہو اور خیر وہ ہے جس کا نفع اس کے ضرر سے زیادہ ہو۔ اور وہ خیر جس میں کسی طرح کا شر نہیں ہے وہ جنت ہے اور وہ شر جس میں کوئی خیر نہیں ہے دوزخ ہے۔ افک کا اُن کے لیے خیر ہونا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سبب سے اُن کو ثوابِ عظیم حاصل ہوگا۔ باوجود اُم المومنین کی براءت کے بیان کے اور باوجود اُن کے قصے کے مشہور ہو جانے کے یہ انتہا درجے کا فضل اور شرف ہے اور اس میں اس کے لیے تہویل و وعید ہے جس نے اُن میں کلام کیا اور اس شخص کی تعریف اور صفت ہے جس نے اُن سے حسنِ ظن رکھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ ﴾ امام حسن، زہری، ابو رجا، حمید الاعرج، یعقوب، ابن ابی عبلہ، مجاہد اور عمرہ بنت عبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے بہ ضمِ کاف پڑھا ہے۔ امام فراء نے کہا یہ وجہ جید ہے، کیوں کہ عرب اپنے محاورے میں بولتے ہیں۔ "فُلَانٌ تَوَلّٰی عُظْمَ كَذَا وَكَذَا، أَيْ: أَكْبَرَهٗ"[1] یعنی فلاں نے فلاں شے کا بڑے سے بڑا بوجھ اُٹھایا۔ باقی قراء کی قراءت بہ کسرِ کاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دونوں دولغت ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "كُبْرَهٗ" بہ ضمِ کاف معظم افک ہے اور بہ کسرِ افک کی ابتدا کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ كِبْرَ ﴾ بہ کسر بہ معنی اثم ہے، معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے اس جماعت میں سے معظم افک کو اُٹھایا، اس کے لیے دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں میں عذابِ عظیم ہے۔

اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون ہے، چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ وہ عبداللہ بن ابی ہے۔ کسی نے کہا: حسان رضی اللہ عنہ ہیں۔ صحیح پہلا قول ہے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے افک میں دو مردوں اور ایک عورت کو حد لگائی، یہ لوگ مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہم ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عبداللہ بن ابی، حسان اور حمنہ کو کوڑے لگائے مسطح کو کوڑے نہیں لگائے، اس لیے کہ اس نے بہتان کی تصریح نہیں کی تھی، لیکن وہ سنتا اور اشاعت کرتا تھا، بغیر تصریح کے۔ کسی نے کہا ہے کہ اُن میں سے کسی کو کوڑے نہیں لگائے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو خبروں سے مشہور اور علماء کے نزدیک معروف ہے، وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو حد ماری گئی وہ یہ ہیں: حسان، مسطح اور حمنہ رضی اللہ عنہم۔

عبداللہ بن اُبی کی حد کے بارے میں سنا نہیں گیا، اس کی تائید ابو داود کی وہ حدیث کرتی ہے جو گزر چکی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مردوں اور ایک عورت کے بارے میں حکم دیا تو اُن کو حد ماری گئی، اُن کا نام لیا ہے کہ وہ حسان اور مسطح اور حمنہ رضی اللہ عنہم تھے۔[2] عبداللہ بن اُبی کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حد نہیں لگائی تو اس کی وجہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس لیے نہیں لگائی کہ آخرت میں اس کو عذابِ عظیم پورا پورا ہو۔ اس کے سوا اور لوگوں کو حد لگائی تا کہ یہ حد ان کے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔ چنانچہ حدود کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا ہے کہ حدود ان کے لیے کفارہ ہیں جن پر وہ قائم کی گئیں۔[3] کسی نے کہا: عبداللہ بن ابی کی حد کو اس لیے ترک کیا کہ اس کی قوم کے ساتھ الفت کرنا اور اس کے بیٹے کا احترام منظور تھا، اس لیے کہ وہ مومنین صالحین میں سے تھا اور فتنے کی آگ کا بجھانا مقصود تھا، کیونکہ فتنے کی ابتداء کا ظہور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ والوں سے ہوا تھا جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔[4]

بخاری و ابن منذر و طبرانی و ابن مردویہ و بیہقی نے دلائل میں زہری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ میں ولید بن عبدالملک

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٧)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٩)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٠) تفسير القرطبي (١٢/ ٢٠١۔ ٢٠٢)

کے پاس تھا تو اس نے کہا کہ ﴿ اَلَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ مِنْهُمْ ﴾ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں تو میں نے کہا: نہیں۔ سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، علقمہ بن وقاص، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے مجھے حدیث کی، اُن سب نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا، وہ کہتی تھیں کہ ﴿ اَلَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ مِنْهُمْ ﴾ عبداللہ بن ابی ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ولید نے مجھ سے کہا: پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا جرم کیا تھا تو میں نے کہا کہ تیری قوم کے دو شیخوں ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام نے مجھے حدیث کی ہے کہ ان دونوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا کہ وہ کہتی تھیں کہ وہ میرے امر میں بری رائے رکھتے تھے۔ یعقوب بن شیبہ نے اپنی مسند میں کہا ہے کہ سلیمان بن یسار ہشام بن عبدالملک پر داخل ہوئے تو ہشام نے اُن سے کہا: اے سلیمان! ﴿ اَلَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ ﴾ کون ہے؟ تو سلیمان نے کہا: ابن اُبي ہے۔ ہشام بولا: تو نے جھوٹ کہا، وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ زہری رحمہ اللہ نے: "أَنَا أَكْذِبُ، لَا أَبَا لَكَ؟!" یعنی میں جھوٹ بولوں گا تیرا باپ نہ ہو! قسم ہے اللہ کی! اگر کوئی منادی آسمان سے ندا کرے کہ بلاشبہ اللہ نے کذب کو حلال کر دیا ہے، تب بھی میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ امام عروہ، سعید، عبداللہ اور علقمہ رحمہم اللہ نے مجھے حدیث بیان کی ہے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ ﴿ اَلَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ ﴾ عبداللہ بن ابی ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے خطاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اُن لوگوں سے جو آپ کے ساتھ تھے، مومنین کی طرف پھیرا بطور التفات کے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۲﴾ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾

جب تم نے یہ (جھوٹ) سنا تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ تو صریح بہتان ہے⑫ وہ اس (الزام) پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ پھر جب وہ گواہ نہیں لائے تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں⑬

بہتان کے پھیلانے میں مسلمانوں کی سرزنش:

مسلمانوں کو چاہیے کہ جب لوگ ایک نیک شخص پر بری تہمتیں لگا دیں تو اُن کو جھٹلا دیں۔ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی پیٹھ پیچھے اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے اللہ پیٹھ پیچھے اس کی مدد کرے گا اور بلا تحقیق تہمتیں لگانا ایمان سے بعید ہے۔ انتھٰی۔

---

[1] الدر المنثور (٦/ ١٥٧)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قصے میں تادیب ہے، جبکہ بعض لوگوں نے ایسی بری بات میں، یعنی افک کے بارے میں، جس کا ذکر ہو چکا ہے، خوض کیا۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ﴾ یعنی کیوں نہیں جبکہ تم نے اس بات کو سنا، جس کے ساتھ اُم المومنین رضی اللہ عنہا کو عیب لگایا گیا ﴿ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ﴾ یعنی اس بات کا اپنی جانوں پر قیاس کرتے، چنانچہ اگر ایسی بات اُن کے لائق نہیں ہے تو اُم المومنین تو بطریقِ اولیٰ اس قسم کی بات سے بَری ہونے کی زیادہ مستحق ہیں۔ کہا ہے کہ یہ آیت ابو ایوب انصاری اور اُن کی بیوی رضی اللہ عنہا کے حق میں نازل ہوئی، جیسا کہ امام محمد بن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ ابو ایوب خالد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ سے اُن کی بی بی اُم ایوب رضی اللہ عنہا نے کہا: اے ابو ایوب! کیا تو سنتا ہے جو لوگ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں کہہ رہے ہیں؟ تو کہا: ہاں، اور یہ جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب! کیا تو ایسا کام کرنے والی ہے؟ کہا: "لَا وَاللّٰهِ!" میں ایسا کام کرنے والی نہیں ہوں، کہا: پھر سیدہ عائشہ واللہ! تجھ سے بہتر ہے۔ پھر جب قرآن نازل ہوا تو اللہ عزوجل نے اُن لوگوں کا ذکر کیا جنھوں نے فاحشہ میں کہا تھا جو کچھ کہا تھا۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ﴾ یہ لوگ حسان اور اُن کے ساتھی تھے، جنھوں نے کہا جو کچھ کہا، پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی جیسا کہ ابو ایوب اور اُن کی بیوی نے کہا۔[1] محمد بن عمر واقدی رحمہ اللہ نے افلح مولیٰ ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اُم ایوب رضی اللہ عنہا نے ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا تو نہیں سنتا ہے جو کچھ لوگ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟ کہا: ہاں، اور یہ جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب! کیا پھر تو ہوتی؟ بولی: "لَا وَاللّٰهِ!" کہا: پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا واللہ! تجھ سے بہتر ہے۔ پھر جب قرآن نازل ہوا اور افک والوں کا ذکر کیا تو اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّ قَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴾ مراد ابو ایوب رضی اللہ عنہ ہیں، جبکہ اُم ایوب رضی اللہ عنہا سے کہا جو کہا۔[2] کہتے ہیں کہ یہ بات ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہی تھی۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ ... الخ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ مومنین بھلائی کا گمان کرتے، کیوں کہ اُم المومنین خیر کی اہل ہیں اور خیر کی زیادہ مستحق ہیں، یہ تو وہ ہے جو باطن سے متعلق ہے۔

واقعۂ افک عقلاً بھی صریح بہتان ہے:

﴿ وَ قَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی اپنی زبانوں سے کہتے کہ اُم المومنین رضی اللہ عنہا پر یہ واضح جھوٹ ہے، کیوں کہ جو بات حقیقتاً تھی وہ ایسی نہ تھی جس پر تہمت لگائی جائے، اس لیے کہ اُم المومنین رضی اللہ عنہا کا صفوان بن معطل کی سواری پر دن کی روشنی میں دوپہر کے وقت ایسی حالت میں آنا کہ سارا لشکر اس کا مشاہدہ کر رہا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے

[1] تفسیر الطبري (۱۹/ ۱۲۹) [2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۶۳)

درمیان میں ہیں، یہ کچھ تہمت کی بات نہیں ہے اور اگر اس بات میں کچھ تہمت ہوتی تو اس طرح کھلم کھلا نہ ہوتا اور نہ وہ دونوں ایسی حالت پر سب کے سامنے آتے، بلکہ اگر فرض کیا جائے تو یہ عمل خفیہ اور چھپ کر ہوتا۔ لہٰذا یہ بات متعین ہوگئی کہ بہتان والے جو کچھ لائے اور جس کی تہمت لگائی، وہ خالص جھوٹ، قولِ زور، رعونت، فاحشہ، فاجرہ اور صفقہ خاسرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَوْ لَا ﴾ أَيْ: هَلَّا جَاؤُا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ. یعنی جو بات انھوں نے کہی، اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے کہ وہ اُن کی بات کی سچائی کی گواہی دیتے۔ ﴿ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے حکم میں وہی کاذب اور فاجر ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ لَوْ لَا ﴾ تحضیضیہ ہے بہ معنی "هَلَّا"، یعنی کیوں نہیں، تاکیدِ توبیخ وتقریع کے لیے لایا گیا ہے اور اُن کے عتاب میں مبالغے کے لیے ہے۔ اللہ پاک نے یہاں سے اُن کی توبیخ وتعییر کو شروع کیا ہے، یعنی اُن کو ڈانٹنا اور ملامت کرنا شروع کیا ہے اور نو زواجر سے اُن کو زجر کیا ہے: ایک تو یہی ہے۔ دوسرا ﴿ لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَيْهِ ﴾، تیسرا ﴿ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ ﴾، چوتھا ﴿ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ ﴾، پانچواں ﴿ وَلَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ﴾، چھٹا ﴿ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ ﴾، ساتواں ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ ﴾، آٹھواں ﴿ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ﴾ اور نواں ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۚ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ معنی یہ ہیں کہ مومنین نے جس وقت اہلِ افک کی گفتگو سنی تھی تو اُن کو یہ لائق تھا کہ اس کا قیاس اپنی جانوں پر کرتے۔ پھر اگر وہ اُن میں بعید ہوتا تو اُم المومنین میں تو اور زیادہ بعید ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ صرف اس کے سننے پر ہی تم کو لائق تھا کہ اُم المومنین رضی اللہ عنہا میں حسنِ ظن کرتے، چہ جائے کہ تم اس کے سننے میں تمادی کرو (انتہا کو پہنچو)، پھر سننے کے بعد اس پر مصر ہو۔

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ﴿ بِاَنْفُسِهِمْ ﴾ کے معنی "بِأَهْلِ دِيْنِهِمْ" ہیں، کیوں کہ مومنین مثل نفسِ واحد کے ہیں،[1] کل کے ایمان میں شریک ہونے کے سبب سے۔ کیا تم اس آیت کو نہیں دیکھتے: ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ [النساء: ٢٩] "اور تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔" امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اسی طرح جو قوم کہ ایک دوسرے کو مارتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں کو قتل کرتے ہیں۔ امام مبرد نے کہا: اسی کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ [البقرة: ٥٤] "اپنے کو آپس میں قتل کرو۔" امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بِاَنْفُسِهِمْ ﴾ کے معنی "بِإِخْوَانِهِم" ہیں۔[2] کسی نے کہا: "بِأَبْنَاءِ جِنْسِهِمْ"، چنانچہ اللہ پاک نے مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ جب کسی شخص کو سنیں کہ وہ کسی کو

[1] تفسير البغوي (٦/ ٢٣) [2] فتح القدير (٤/ ١٨)

تہمت لگاتا ہے یا برائی کے ساتھ اس کو یاد کرتا ہے اور وہ اس برائی کو اس میں نہیں جانتے تو اس کا انکار کریں اور اسے جھٹلا دیں۔ خطاب کے صیغے سے غائب کے صیغے کی طرف عدول کیا اور ضمیر سے ظاہر کی طرف اور "ظَنَنْتُمْ بِأَنْفُسِكُمْ خَيْرًا وَّقُلْتُمْ" نہ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بطریق التفات کے توبیخ میں مبالغہ ہو، لفظِ ایمان کی تصریح اس بات پر دلالت کرے کہ ایمان میں شریک ہونا اس کو مقتضی ہے کہ کوئی مومن اپنے بھائی پر عیب اور طعن کرنے والے کی بات کی تصدیق نہ کرے، نہ ہی کوئی مومن عورت اپنی بہن پر۔

یہ بات حسنِ ادب میں سے ہے۔ اس کے ساتھ قائم رہنے والے اور اس کی حفاظت رکھنے والے لوگ کم ہیں۔ کاش! تو ایسے آدمی کو پائے کہ سنے تو چپ ہو جائے اور جو بات اپنے بھائیوں کے بارے میں سنے تو اس کی اشاعت نہ کرے۔ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ تمام سنی سنائی باتوں کو بیان کر دے۔ علما نے فرمایا ہے کہ آیتِ باب اس بات پر دلیل ہے کہ ایمان، عفت اور پارسائی کے درجے کو، ایک ایسی خبر جو محتمل ہو، زائل نہیں کرتی، گو وہ شائع اور ذائع، یعنی خوب مشہور ہو۔ ﴿ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ مومنین افک سننے کے وقت یوں کہتے ہیں کہ یہ ظاہر، واضح اور کھلا ہوا جھوٹ ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جملہ ﴿ لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ﴾ تتمہ قول مومنین سے ہے، یعنی کہتے ہیں کہ افک میں گفتگو کرنے والے چار گواہ کیوں نہیں لائے کہ اُن کے قول کی گواہی دیتے۔ ﴿ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ افک میں گفتگو کرنے والے اللہ پاک کے حکم وقضائے ازلی میں یا اس کی شرح میں جس کی بنیاد ظاہر محکم دلیلوں پر رکھی گئی ہے، وہی ہیں تہمت لگانے والے جو جھوٹ اور بہتان طرازی میں کامل اور پورے ہیں۔ یہ قول زواجر کے باب سے ہے۔

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿14﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿15﴾

اور اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم جن باتوں میں پڑ گئے تھے اس پر تمھیں بہت بڑا عذاب آ لیتا (14) جب تم اسے ایک دوسرے سے اپنی زبانوں کے ساتھ لیتے تھے اور اپنے مونہوں سے (وہ بات) کہہ رہے تھے جس کا تمھیں علم نہ تھا اور تم اسے معمولی سمجھ رہے تھے، جبکہ وہ اللہ کے ہاں بہت بڑی بات ہے (15)

بہتان باندھنے والوں پر توبہ کی توفیق کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے فضل کا بیان:

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس امت کو پیغمبر کے طفیل دنیا کے عذابوں سے بچایا ہے، نہیں تو یہ بات عذاب کے لائق

تھی۔ انتھٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت میں نہ ہوتی تو اُن لوگوں کو جنھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں جھوٹی تہمت کا چرچا کیا اور اس میں گفتگو کی، ایک بڑا عذاب پہنچتا، مگر اللہ نے تمھاری توبہ اور انابت قبول کی اور تمھارے ایمان اور دارِ آخرت پر یقین کے سبب سے تم سے درگزر فرمایا۔ یہ اس شخص کے حق میں ہے جس کے پاس ایمان ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ توبہ قبول کر لیتا ہے، جیسے: مسطح، حسان اور حمنہ بنت جحش خواہر زینب بنت جحش رضی اللہ عنہم۔ اب رہا وہ شخص جس نے افک میں چرچا کیا منافقوں میں سے، جیسے: عبداللہ بن ابی ابن سلول اور اس جیسے دوسرے منافق تو یہ لوگ اس آیت میں مراد نہیں ہیں، کیوں کہ ان کے پاس ایمان اور عملِ صالح میں سے وہ شے نہیں ہے جو اس کی برابری کرے اور اس کے بدلے میں ہو اور اسی طرح اس وعید کا حال ہے جو کسی فعلِ معین پر مطلق وارد ہوتی ہے تو وہ توبہ نہ کرنے کے ساتھ مشروط ہوتی ہے، یا جو عملِ صالح کہ اس کے مقابل ہے، اس کے برابر ہو یا اس پر راجح ہو۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ ﴾ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روایت کرتا ہے بعض تمھارا بعض سے، یہ شخص کہتا ہے کہ میں نے اس کو فلاں سے سنا، اور فلاں نے ایسا کہا، اور بعض نے ایسا ذکر کیا۔[1] دوسرے لوگوں نے اس کو "تَلِقُوْنَه" پڑھا ہے۔ صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ اس کو اسی طرح پڑھا کرتی تھیں اور فرماتیں کہ یہ ماخوذ ہے "وَلَقُ الْكَذِبِ" سے۔[2] "وَلْقٌ" سے مراد وہ جھوٹ ہے، جس پر اس کے کہنے والا مستمر رہتا ہے۔ عرب لوگ بولتے ہیں: "وَلَقَ فُلَانٌ فِي السَّيْرِ" جبکہ کوئی شخص چلنے میں استمرار کرتا ہے، چلتا جاتا ہے۔ پہلی قراءت زیادہ مشہور ہے اور جمہور اسی پر ہیں، لیکن دوسری اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کو اپنے غیر سے زیادہ جانتی تھیں۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کو کہتے ہو جو جانتے نہیں ہو۔ پھر فرمایا: ﴿ وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴾ یعنی تم اُم المومنین کی شان میں کہتے ہو جو کچھ کہتے ہو اور اس کو سہل و آسان سمجھتے ہو، اگر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی نہ ہوتیں تو بھی وہ بات آسان نہ ہوتی، پھر وہ کیوں کر سہل ہوگی، حالاں کہ وہ تو نبی امی خاتم الانبیا سید المرسلین کی بی بی ہیں، چنانچہ جو کچھ اس کے نبی و رسول کی بی بی کی شان میں کہا گیا، وہ اللہ کے نزدیک بہت ہی بڑا ہے۔ پس اللہ پاک اس کے لیے غیرت کرتا ہے اور وہ کسی نبی کی بی بی پر اس بات کو مقدر نہیں کرتا ہے۔ حاشا و کلا۔ اور جب کہ یہ بات نہیں ہے تو پھر وہ کیوں کر سیدۂ نسائے انبیاء کے حق میں ہوگی اور زوجۂ سید ولد آدم کی شان میں جو علی الاطلاق یعنی تسلیم شدہ ہیں کہ دنیا و آخرت میں سب

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٤٨) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩١٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩١٣) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٤٨)

کے سردار ہیں۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا کہ تم اس کو آسان سمجھتے ہو اور وہ اللہ کے نزدیک بڑی بات ہے۔ صحیحین میں ہے کہ بے شک آدمی البتہ بولتا ہے کوئی بات اللہ کے غصے کی، وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں پہنچے گی، وہ بات اس کو آگ میں اتنی دور تک گرا دیتی ہے، جتنی مسافت آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ ایک روایت میں "لَا یُلْقِي لَهَا بَالًا" یعنی وہ کچھ اس بات کی پروا نہیں کرتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ یہ خطاب سننے والوں کو ہے اور اس میں بہت بڑی ڈانٹ ہے۔ ﴿ لَوْلَا ﴾ کا کلمہ امتناعِ شے کے لیے ہے اس شے کے غیر کے وجود کے سبب سے۔ "أَفَاضَ وَانْدَفَعَ وَخَاضَ فِي الْحَدِيْثِ" ان سب کے ایک معنی ہیں۔ یعنی کسی بات میں یا قصہ میں خوض کرنے کو اور اس کا چرچا کرنے کو افاضہ واندفاع وخوض بولتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اگر میں تم پر دنیا میں فضل کا حکم نہ کرتا، یعنی ان نعمتوں کا حکم نہ کرتا، جن میں سے توبہ کی توفیق دینا اور آخرت میں عفو کے ساتھ رحمت کرنا ہے تو البتہ تم کو عذاب کی جلدی کرتا، اس بات پر جس میں تم نے خوض کیا، یعنی قصۂ اِفک۔ یا حرفِ فی سببیہ ہے، یعنی بسبب اس شے کے جس میں تم نے خوض کیا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو دنیا اور آخرت دونوں میں تم کو البتہ عذابِ عظیم چھوتا، لیکن اللہ پاک نے دنیا میں تمھاری پردہ داری کی اور آخرت میں جو کوئی توبہ کر کے اس کے پاس آئے گا تو اس پر رحم کرے گا۔

اللہ پاک نے ﴿ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ ﴾ فرمایا، "فِي حَدِيْثِ الْإِفْكِ" نہ کہا، حالاں کہ حاصل یہی ہے، چنانچہ اس کی وجہ یہ ہے کہ شانِ افک کی ہولنا کی کے لیے ابہام کیا ہے۔ غرض یہ کہ جس بات کا تم نے چرچا کیا ہے، وہ بڑی ہولناک چیز ہے۔ ﴿ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ ﴾ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ ظرفیہ ہے ﴿ لَمَسَّكُمْ ﴾ سے یا ﴿ اَفَضْتُمْ ﴾ سے متعلق ہے۔ جمہور کی قراءت ﴿ تَلَقَّوْنَهٗ ﴾ ہے "تَلَقِّيْ" سے ماخوذ ہے، اصل اس کی "تَتَلَقَّوْنَهٗ" تھی، ایک حرفِ تا حذف کر دیا گیا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: "تَلَقِّيْ" یہ ہے کہ افک والوں میں سے ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملتا تو کہتا کہ مجھے ایسی ایسی بات پہنچی ہے: "وَيَتَلَقَّوْنَهٗ تَلَقِّيًا" امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کو تمھارا بعض ڈالتا ہے طرف بعض کے۔ محمد بن سمیفع نے بہ ضمِ تا وسکونِ لام وضمِ قاف پڑھا ہے۔ القاء سے اس کے معنی ظاہر ہیں۔ اُبی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے "تَتَلَقَّوْنَهٗ" پڑھا ہے "تَلَقِّيْ" سے۔ یہ قراءت جمہور کی قراءت کی طرح ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ حرفِ تا کو حذف نہیں کیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس، عائشہ رضی اللہ عنہم، عیسی بن عمر، یحییٰ بن یعمر اور زید بن علی رحمہم اللہ نے بہ فتحِ تا وکسرِ لام وضمۂ قاف پڑھا ہے۔ یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے: "وَلَقَ الرَّجُلُ يَلِقُ وَلْقًا إِذَا كَذَبَ" ابن سیدہ نے کہا ہے کہ

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦١١٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٨٨) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٦٣۔٣٦٤)

متعدی کو شاہد لائے غیر متعدی پر۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: میرے نزدیک یہ ہے کہ مراد "تَلِقُوْنَ فِيْهِ" ہے۔ پھر حرف جر، یعنی کلمۂ "فِيْ"، کو حذف کر دیا تو ضمیر فعل سے متصل ہوگئی، یعنی جب کہ تم جھوٹ بولتے تھے قصۂ افک میں۔ خلیل اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وَلَقَ" کی اصل "إِسْرَاع" ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "جَاءَتِ الْإِبِلُ تَلِقُ"، یعنی اُونٹ آئے جلدی کرتے ہوئے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے، لیکن اتنا اور زیادہ کہا ہے کہ "اَلْوَلْقُ هُوَ الْإِسْرَاعُ بِالشَّيْءِ بَعْدَ الشَّيْءِ كَعَدَدٍ فِيْ أَثَرِ عَدَدٍ وَكَلَامٍ فِيْ أَثَرِ كَلَامٍ"

امام زید بن اسلم اور ابو جعفر رحمہ اللہ نے "تَأْلِقُوْنَهُ" پڑھا ہے، بہ فتح تا و سکونِ ہمزہ و کسرِ لام وضم قاف جو "أَلَقَ" بمعنی "كَذَبَ" سے ماخوذ ہے۔ یعقوب نے "تِيْلَقُوْنَهُ" پڑھا ہے، بکسرِ تا و سکونِ یای تحتیہ و فتحِ لام وضمِ قاف۔ یہ مضارع ہے: "وَلِقَ" مکسور اللام کا۔[1] "تَلْقى وَتَلَقُّفُ وَتَلَقُّنُ" یہ تینوں لفظ معنی میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ اول میں معنی استقبال کے ہیں اور دوسرے میں "خَطْف" کے معنی اخذ بسرعت، یعنی کسی شے کو جلدی سے جھپٹ لینا اور تیسرے میں معنی حذق و مہارت کے۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے: "تَلَقُّنُ" میں حذق ہے تناول میں اور "تَلَقُّفُ" میں حیلہ گری ہے تناول میں۔ تناول کسی شے کے لینے کو کہتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَقُوْلُوْنَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تمھاری یہ بات خاص ہے منہ سے، اس کے بغیر کہ خارج میں واقع ہو اور دلوں میں اس کا اعتقاد ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ افواہ کا ذکر تاکید کے واسطے ہے، جیسا کہ ﴿ يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ ﴾ [الأنعام: ٣٨] وغیرہ میں آیا ہے۔ ﴿ وَتَحْسَبُوْنَهٗ ﴾ کی ضمیر اس قصے کی طرف راجع ہے جس میں خوض ہوا اور اس کو شہرت دی گئی۔ ﴿ وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا برحال، یعنی تم تو اس کو ایک ہلکی شے سمجھتے ہو کہ تمھیں اس میں کوئی گناہ لاحق نہ ہوگا، حالاں کہ اللہ پاک کے نزدیک اس کا گناہ اور سزا بڑی ہے۔ ذکر کیا ہے کہ ان میں سے بعض کو مرتے وقت گھبراہٹ ہوئی تو اُن سے اس بارے میں کہا گیا، یعنی گھبرانے کا سبب پوچھا تو کہا کہ میں اس گناہ سے ڈرتا ہوں کہ میرے دل پر اس کا کچھ خطرہ نہ تھا، یعنی میں اسے بے حقیقت سمجھتا تھا، حالاں کہ اللہ کے نزدیک وہ بڑا تھا۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿١٦﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧﴾ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٨﴾

اور جب تم نے اسے سنا تھا تو کیوں نہ کہا: یہ ہمارے لائق نہیں کہ ہم اس کے متعلق بولیں

[1] فتح القدير (٤/ ١٩)

(یا اللہ!) تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے⑯ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دوبارہ کبھی بھی اس جیسی بات نہ کرنا⑰ اور اللہ تمھارے لیے (اپنی) آیات بیان کرتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا، خوب حکمت والا ہے⑱

بہتان بازوں کی دوبارہ سرزنش اور اصلاح کی دعوت:

یعنی بیان فرمارہا ہے کہ یہ طوفان کس نے اُٹھایا، معلوم ہوا کہ منافقوں نے، جو چھپے دشمن تھے، اگلی آیت میں پتا بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے حسنِ ظن کی تادیب فرمائی تھی۔ اس کے بعد یہ دوسری تادیب فرمائی کہ جس وقت نیک لوگوں کے حق میں بری بات کی جائے تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اُن کے ساتھ نیک گمان کریں اور حسنِ ظن کے سوا اور کوئی بات اپنے دل میں نہ سمجھیں اور اگر بری بات وسوسہ یا خیال کے طور پر دل میں چپک جائے تو چاہیے کہ اس کو زبان سے نہ بولیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے واسطے اس چیز سے درگزر کیا ہے جس کے ساتھ اُن کے جی باتیں کرتے ہیں، جب تک کہ اس کو زبان سے نہ کہا جائے یا عمل میں نہ لایا جائے۔ صحیحین میں اس کو روایت کیا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ﴾ یعنی ہم کو لائق نہیں ہے کہ ہم اس بات کو منہ سے نکالیں اور کسی سے اس کا ذکر کریں۔ ﴿ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک ہے اس سے کہ اس کے رسول وخلیل کی بی بی پر یہ بات کہی جائے۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا ﴾ یعنی اللہ تم کو وعید سنا کر منع کرتا ہے کہ اس بات کی طرح کی کوئی بات آیندہ زمانے میں تم سے واقع ہو اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی اگر تم اللہ پر اور اس کی شریعت پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے رسول ﷺ کی تعظیم کرتے ہو۔ رہا وہ شخص جو متصف بہ کفر ہے تو اس کا اور حکم ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ﴾ یعنی اللہ پاک تمھارے لیے تمھارے شرعی احکام اور حکمتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ خوب جانتا ہے اس شے کو جو اس کے بندوں کو سیدھا اور درست کر دے اور اپنی شریعت وقدر میں بڑا حکمت والا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ یہ سارے مومنوں کو عتاب ہے کہ جب تم نے افک کا قصہ سنا تھا تو جو لوگ اس میں گفتگو کرنے والے اور اس کا اختراع کرنے والے تھے تو اُن کو جھٹلانے کے لیے انھوں نے ایسا کیوں نہ کہا، جب

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧)

انھوں نے پہلی دفعہ یہ قصہ سنا، کہ ہم کو لائق نہیں ہے اور نہ ہم سے ممکن ہے کہ ہم اس قصے کو زبان سے نکالیں، نہ وہ ہم سے کسی طرح صادر ہو۔

﴿ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴾ تعجب ہے افک والوں سے۔ ﴿ سُبْحٰنَكَ ﴾ کی اصل اللہ پاک کی تنزیہ ہے۔ پھراس کی کثرت ہوئی، یہاں تک کہ ہر تعجب والی چیز میں اس کا استعمال کیا گیا۔ بہتان یہ ہے کہ انسان میں وہ بات کہی جائے جو اس میں نہیں ہے۔ یعنی یہ بڑا جھوٹ ہے، اس لیے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کے حق میں کہا گیا ہے۔ اور ایسی بی بی سے اس کا صادر ہو جانا شرعاً محال ہے۔ پھر اللہ پاک نے اُن لوگوں کو وعظ فرمایا کہ جنھوں نے افک کا چرچا کیا: ﴿ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ ﴾ یعنی اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے یا تم پر حرام کرتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "يُحَرِّجُ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ"[1] یعنی اللہ تم پر تنگی کرتا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تم کو منع کرتا ہے۔ ﴿ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا ﴾ اس بات کی کراہت کی وجہ سے کہ تم اس میں عود کرو، یا اس سے کہ تم پھر کرو، یا تم اس قسم کے بہتان میں عود کرو، یا اپنی زندگی میں بہتان کا قصہ سنو اگر تم ایمان والے ہو، کیوں کہ ایمان اس بات کا مقتضی ہے کہ جب تک زندہ رہو ایسی بات میں نہ پڑو۔

اس قول میں تہییج عظیم وتقریعِ بالغ ہے، (یعنی برانگیختہ کرنا اور ڈانٹنا دھمکانا ہے) اور اللہ تمھارے واسطے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے، یعنی اپنے امر اور نہی بیان کرتا ہے، تاکہ تم ان پر عمل کرو اور اللہ پاک سے آداب سیکھ لو اور اس کے محارم میں پڑنے سے باز رہو۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ خوب جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ یا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حال کو اور صفوان رضی اللہ عنہ کے کام کو۔ ﴿ حَكِيْمٌ ﴾ یعنی وہ اپنی خلق کے لیے جو تدبیریں کرتا ہے، ان میں بڑا حکمت والا ہے۔ یا دونوں کی براءت کے حکم میں حکیم ہے۔ پھر اللہ پاک نے بہتان لگانے والوں کو اور اُن لوگوں کو جو یہ چاہتے ہیں کہ لوگ مومنین کے عیب اور گناہوں کو سنیں، بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ چنانچہ ارشاد کیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝19

بے شک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ⑲

بے حیائی پھیلانے والوں کی سرزنش:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تیسری تادیب ہے، اس شخص کے لیے جو کچھ بری بات سنے، پھر اس میں

سے کچھ اس کے ذہن میں قائم ہو جائے اور اس کو زبان سے نکال دے تو اس کی کثرت نہ کرے اور اس کو شہرت نہ دے۔ چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ... الخ﴾ یعنی جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ مومنین کی طرف سے بری بات کا ظہور ہو تو ان کے لیے دُکھ کی مار ہے۔ دنیا میں حد کے ساتھ اور آخرت میں ﴿ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ کے ساتھ۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، تو سارے کام اسی کو سونپو تم راہ یاب ہو جاؤ گے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ کے بندوں کو ایذا مت دو اور ان کو عار مت دلاؤ اور اُن کے عیب مت تلاش کرو، کیوں کہ جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کا عیب تلاش کیا تو اللہ اس کے عیب کو تلاش کرے گا، یہاں تک کہ اس کو اس کے گھر میں رسوا کر دے گا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ "فَاحِشَة" سے مراد زنا ہے اور بری بات۔ "تَشِيْعُ" اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جب کوئی شے ظاہر اور منتشر ہو جاتی ہے تو اس وقت بولتے ہیں: "شَاعَ الشَّيْءُ يَشِيْعُ شُيُوْعًا وَشَيْعًا وَشَيَعَانًا" مراد شیوعِ فاحشہ سے اس کی خبر کا شیوع ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ فاحشہ کا قائل اور وہ شخص جس نے اس کو شائع کیا، گناہ میں برابر ہیں۔[2] ﴿ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد محصن، پاک دامن اور پارسا لوگ ہیں۔ یا ہر وہ شخص جو صفتِ ایمان کے ساتھ متصف ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ ﴾ یعنی اللہ پاک جانتا ہے ساری معلومات کو، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تہمت لگانے کے گناہ کی عظمت اور اس کا ارتکاب کرنے والے کی سزا کو جانتا ہے۔ ﴿ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی تم نہیں جانتے ہو، مگر جو تم کو معلوم کرا دیا اور جس کا تمھارے واسطے کشف کر دیا۔[3]

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو اللہ بہتان لگانے والوں کو فوراً عذاب دیتا) اور یہ کہ بلاشبہ اللہ نہایت شفقت کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے (20) اے ایمان والو! تم

---

(1) مسند أحمد (٥/ ٢٧٨) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٦٤۔ ٣٦٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٨/ ١٦٤)

(2) الأدب المفرد (١/ ١٢٠) (3) فتح البيان (٩/ ١٨٧)

شیطان کے قدموں کی اتباع نہ کرو، اور جو کوئی شیطان کے قدموں کی اتباع کرتا ہے تو بلاشبہہ وہ (شیطان) تو بے حیائی اور برے کام ہی کا حکم دیتا ہے، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک کبھی بھی پاک نہ ہوتا، لیکن اللہ جسے چاہے پاک کرتا ہے اور اللہ خوب سننے والا، بڑا جاننے والا ہے ﴿21﴾

اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کی پھر سے یاد دہانی:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوتا، یعنی اللہ کا فضل و رحمت و رافت و رحم تو کوئی اور امر ہوتا، لیکن اللہ پاک اپنے بندوں کے ساتھ نرمی کرنے والا ہے، ان پر مہربان ہے، لہٰذا اس نے اس شخص کی توبہ قبول کی جس نے اس کی طرف رجوع کیا اس معصیت سے، اور اُن میں سے پاک کیا جس کو پاک کیا اس حد کے سبب جو اس پر قائم کی گئی۔

اتباعِ شیطان سے ممانعت:

پھر فرمایا اللہ پاک نے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... الخ﴾ خطواتِ شیطان سے مراد اس کے طرائق و مسالک ہیں، یعنی اس کی راہیں اور جس بات کا وہ حکم کرتا ہے۔ یہ اللہ پاک کی طرف سے فصیح و بلیغ اور مختصر اور حسین عبارت کے ساتھ شیطانی راہوں سے نفرت دلائی گئی ہے اور ڈرایا گیا ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ خطواتِ شیطان عملِ شیطان ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی نزغات، یعنی چھیڑیں ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی معصیت ہے، وہ خطواتِ شیطان سے ہے۔ ابومجلز نے کہا ہے کہ معاصی میں دوڑنا خطواتِ شیطان سے ہے۔ امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک شخص نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ میں نے حرام کر لیا ہے کہ ایک کھانا کھاؤں، اور اُس کھانے کا نام لیا تو فرمایا کہ یہ نزغاتِ شیطان سے ہے، تو اپنی قسم کا کفارہ دے ڈال۔ اور کہا امام شعبی رحمہ اللہ نے ایک شخص کے بارے میں کہ جس نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کو ذبح کر ڈالے کہ یہ نزغاتِ شیطان سے ہے اور اس کو فتویٰ دیا کہ ایک دُنبہ ذبح کر دے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام ابو رافع سے روایت کیا ہے، کہا کہ میری بی بی مجھ پر خفا ہوئی تو کہا کہ وہی عورت ایک دن یہودیہ ہو اور ایک دن نصرانیہ ہو اور ہر غلام اس کا آزاد ہو، اگر تو نے اپنی بیوی کو طلاق نہ دی، چنانچہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ تو نزغاتِ شیطان سے ہے اور اسی طرح زینب بنت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔ یہ بی بی اس وقت مدینے میں سب عورتوں سے بڑھ کر فقیہ تھیں اور اسی کے مثل عاصم بن عمر نے کہا۔[1]

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا﴾ اگر اللہ توبہ کی توفیق نہ دیتا، اس شخص کو جس کو چاہتا ہے اور نفوس کو ان کے شرک و فجور و میل کچیل اور ردی عادتوں سے جو اُن

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٥٢_ ٢٥٥١)

میں موجود ہیں، اُن سے ہر ایک کو اسی کی پاکی کے موافق پاک نہ کرتا تو کوئی بھی اپنے نفس کے لیے نہ پاکی حاصل کرتا نہ کسی طرح کی بھلائی۔ ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ لیکن اللہ ہی اپنی خلق سے جس کو چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور گمراہی اور ضلالت کی جائے ہلاکت میں اس کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے بندوں کی باتوں کو خوب سنتا ہے۔ ﴿ عَلِيْمٌ ﴾ ہے، یعنی اُن میں سے جو شخص ہدایت یا گمراہی کا مستحق ہے، اس کو خوب جانتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ ﴾ یہ آیت پہلے گزر چکی ہے، اس کو دوبارہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے اللہ پاک کے احسان کا یاد دلانا ہے اس بات میں کہ وہ اپنے بندوں پر احسان کرتا ہے، جلدی سے اُن پر سزا نازل نہیں کرتا۔ ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ معطوف ہے ﴿ فَضْلُ اللّٰهِ ﴾ پر۔ ﴿ لَوْلَا ﴾ کا جواب محذوف ہے، ما قبل سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کو حذف کر دیا ہے: ''أَيْ: لَعَاجَلَكُمْ بِالْعُقُوْبَةِ'' یعنی اگر اللہ پاک کا فضل، رحمت، مہربانی اور رحم نہ ہوتا تو جلدی سے تم پر عقوبت آ جاتی۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی میں سے یہ ہے کہ بندوں کے گناہوں کے سبب سے عذاب کی جلدی نہیں کرتا ہے اور من جملہ رحمت یہ ہے کہ ایسا اعذار و انذار (یعنی عذر ختم کرنا اور ڈرنے کی چیز) پہلے سے اُن کی طرف بھیجتا ہے۔ ''خطوات'' جمع ہے ''خطوۃ'' کی۔ خطوہ اس مسافت کو کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان ہوتی ہے اور ''خَطْوَة'' بہ فتحِ خاء مصدر ہے۔ جمہور کی قراءت بفتحِ خاء و طاء ہے۔ عاصم اور اعمش نے بضمِ خاء وسکون طاء پڑھا ہے۔[2] کسی نے بضمِ ہر دو پڑھا ہے یہ دونوں قراءتِ سبعیہ ہیں۔ یعنی شیطان کے مسالک و مذاہب و آثار کی پیروی مت کرو اور اس کی راہوں میں مت چلو، جن کی طرف وہ تم کو بلاتا ہے۔

﴿ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ﴾ جوابِ شرط محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''فَقَدْ غَوٰى'' یعنی جو کوئی شیطان کی راہوں میں چلے گا تو وہ گمراہ ہوگا۔ کسی نے کہا: جزائے شرط محذوف ہے اور جو اس کی علت ہے اس کو اس کے قائم مقام کر دیا ہے، یعنی ﴿ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾ یعنی تو مقرر اس نے بے حیائی و بری بات کا ارتکاب کیا، کیوں کہ شیطان کی عادت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے غیر کو فحشاء و منکر کا حکم کیا کرتا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ اس میں شیطان کی خاصیت ہو جاتی ہے، وہ خاصیت یہی امر کرنا ہے فحشاء و منکر کا۔ فحشاء وہ ہے کہ اس کی قباحت افراط کے درجے کو پہنچی ہو، یعنی بہت زیادہ ہو اور منکر وہ ہے جس کا شریعت انکار کرتی ہے۔ ﴿ اِنَّهٗ ﴾ کی ضمیر شیطان کی

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳٦٥) [2] فتح القدیر (٤/ ۲۰)

طرف پھرتی ہے۔ کسی نے کہا: ضمیر شان کی ہے، اولیٰ یہ ہے کہ ضمیر "مَنْ" کی طرف عائد ہو، کیوں کہ جس شخص نے شیطان کی پیروی کی تو وہ فحشاء ومنکر کے کرنے میں اس کا مقتدی ہوا اور آیت ہر ایک کے حق میں عام ہے، کیوں کہ ہر مکلّف اس سے منع کیا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ ﴾ کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿ لَوْلَا ﴾ کا جواب ﴿ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ﴾ ہے، یعنی اگر اللہ پاک کی طرف سے تفضّل و رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی مدۃ العمر اپنے نفس کو اس کے میل کچیل سے پاک صاف نہ کرتا۔ جمہور کی قراءت ﴿ زَكٰى ﴾ بہ تخفیف ہے۔ امام اعمش، ابن محیصن اور ابو جعفر رحمہ اللہ نے بتشدید پڑھا ہے، یعنی اللہ اس کو پاک نہ کرتا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَا زَكٰى ﴾ کے معنی ہیں: "مَا صَلُحَ"، یعنی وہ راست و درست نہ ہوتا۔ اور اولیٰ تفسیر ﴿ زَكٰى ﴾ کی تطہر اور تطہیر کے ساتھ ہے۔ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے اسی کو ذکر کیا ہے۔[1] ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ خلائق میں سے کوئی کسی خیر کی طرف راہ یاب نہ ہوتا۔[2] آیت علی العموم ہے۔ کسی نے کہا: خاص ہے اُن لوگوں کے ساتھ جنھوں نے افک میں خوض کیا اور وہ پاک ہو گئے اور انھوں نے توبہ کر لی سوائے عبداللہ بن اُبی کے، کیوں کہ وہ بدبختی پر جما رہا، یہاں تک کہ مر گیا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ﴾ جملہ معترضہ ہے اور ﴿ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ﴾ جواب ہے اول و ثانی ﴿ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ ﴾ کا۔[3] تخفیف کی قراءت زیادہ راجح ہے اس قول کی وجہ سے: ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس پر تفضّل و رحمت کر کے پاک فرماتا ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک سنتا ہے جو بندے کہتے ہیں، علیم دانا ہے ساری معلومات کا۔ اس میں حثِّ بالغ ہے اخلاص پر اور تہییجِ عظیم ہے بندگانِ تائبین کو، یعنی اُن لوگوں کو جو توبہ کرنا چاہتے ہیں انھیں اخلاص اور توبہ کرنے پر اُبھارنا ہے اور اس شخص کو وعیدِ شدید ہے جو شیطان کی پیروی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں فاحشہ کی اشاعت ہو اور اپنے نفس کو اللہ پاک کے ڈراوے سے زجر نہیں کرتا ہے۔[4]

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢﴾

اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر

[1] فتح القدير (٤/ ٢١)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ١٣٥) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٥٣)
[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٠٧)
[4] فتح البيان (٩/ ١٨٧۔ ١٨٨)

کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ﴿22﴾

اہلِ فضل و وسعت کو سخاوت کرتے رہنے کا حکم:

جب طوفان اُٹھانے والے جھوٹے پڑے اور اُن کو اسّی کوڑے حد ماری گئی، اُن میں دو تین مسلمان تھے۔ ایک شخص مسطح تھا جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھانجا تھا اور مفلس تھا، یہ اس کی خبر گیری کرتے تھے۔ اب قسم کھائی کہ اس کو کچھ نہ دوں گا۔ اللہ نے اس کی سفارش کر دی۔ وہ مہاجرین میں سے اور اہلِ بدر میں سے تھا۔ بڑائی والے کہا صدیقِ اکبر کو، جو اُن کی بڑائی نہ مانے وہ اللہ سے جھگڑے۔ پھر انھوں نے قسم کھائی کہ جو دیتا تھا وہ کبھی بند نہ کروں گا۔ انتھٰی.

﴿ يَأْتَلِ ﴾ ماخوذ ہے "اَلِیة" سے۔ "اَلِیة" قسم کو کہتے ہیں۔ فضل سے مراد طول وصدقہ واحسان ہے، (طول بمعنی منت نہادن ہے، لیکن مناسب یہ ہے کہ مال اور غنا کا مقام ہے۔) "سعة" سے مراد تونگری ہے، یعنی تم میں سے مال وغنا وخیرات اور احسان وتونگری والے اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے مسکین رشتہ داروں اور مہاجرین سے صلہ نہ کریں گے۔ "وَهَذَا فِيْ غَايَةِ التَّرَفُّقِ وَالْعَطْفِ عَلَى صِلَةِ الْأَرْحَامِ" یعنی اللہ پاک نے نہی حاضر کو جو نہی غائب میں ادا فرمایا تو اس میں انتہا درجے کی نرمی ہے اور صلہ رحمی کی طرف موثر طریقے سے مائل کرنا ہے۔ صریح طور پر ممانعت کرنے کی نسبت اس میں زیادہ اثر ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ﴾ یعنی اُن سے جو برائی وایذا دہی گزر چکی ہے، اس کو معاف کر دینا اور درگزر کرنا چاہیے۔ یہ بات اللہ پاک کے حلم وکرم اور لطف سے ہے کہ اپنی خلق کے ساتھ لطف ونرمی کرتا ہے، اس کے باوجود کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

آیتِ کریمہ کی شانِ نزول:

یہ آیتِ کریمہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے، جبکہ انھوں نے قسم کھالی تھی کہ مسطح بن اُثاثہ رضی اللہ عنہ کو کبھی کوئی نفع نہ پہنچائیں گے، اس کے بعد کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اس نے کہا جو کچھ کہا، چناں چہ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے۔ پھر جب اللہ پاک نے اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل کی اور ایماندار نفوس خوش ہوئے اور چین پکڑا اور مومنوں میں سے جس شخص نے اس میں بات چیت کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کی اور جس پر حد قائم ہونی تھی اس پر حد قائم ہولی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے، اور یہ اسی کا فضل واحسان ہے، اس بات کو شروع کیا کہ صدیق رضی اللہ عنہ کو اُن کے قریبی رشتہ دار اور نسبت والے کی طرف مائل کرے کہ اس کے ساتھ پہلے کی طرح حسنِ سلوک کریں، کیوں کہ وہ اُن کی خالہ کا بیٹا تھا۔ یہ شخص مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ ہے اور ایک مفلس اور مسکین آدمی تھا۔ اس کے پاس کچھ مال نہیں تھا، مگر وہی جو صدیق رضی اللہ عنہ ہی اسے نفقہ دیا کرتے تھے اور وہ اللہ کے راستے میں ہجرت

کرنے والوں میں سے تھا۔ بس ایک لغزش کھا گیا تھا جس سے اللہ نے توبہ قبول کی اور اسے حد بھی لگائی گئی تھی۔ صدیق رضی اللہ عنہ خیرات واحسان میں مشہور ومعروف آدمی تھے، اپنے قریبیوں اور ساتھ والوں پر اُن کے احسانات تھے۔

چنانچہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ اور جزا جنسِ عمل سے ہوتی ہے، لہٰذا جس طرح تو درگزر کرے، اسی طرح تجھ سے درگزر کیا جائے، تو اس وقت صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بَلَى إِنَّا نُحِبُّ أَنْ تَغْفِرَ لَنَا يَا رَبَّنَا'' یعنی ہاں اللہ کی قسم ہے ہمارے رب! ہم بے شک پسند کرتے ہیں کہ تو ہم کو بخشے۔ پھر جو نفقہ مسطح کو دیا کرتے تھے وہ دینے لگے اور کہا: ''وَاللّٰهِ لَا أَنْزِعُهَا مِنْهُ أَبَدًا'' یعنی واللہ! کبھی اس کو بند نہ کروں گا۔ یہ بات اس قول کے مقابلے میں کہی: ''وَاللّٰهِ لَا أَنْفَعُهُ بِنَافِعَةٍ أَبَدًا'' یعنی واللہ! کبھی کوئی نفع اس کو نہ پہنچاؤں گا۔ چنانچہ صدیق رضی اللہ عنہ اسی واسطے صدیق ہوئے۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ لَا ﴾ ناہیہ ہے اور فعل مجزوم بحذفِ یا ہے، کیوں کہ معتل یائی ہے وزن اس کا ''يَفْتَعِلُ'' ہے ''أَلِيَّةٌ'' بروزن ''هَدِيَّةٌ'' سے ماخوذ ہے، اس کی جمع میں بولتے ہیں: ''أَلِيَّةٌ'' و ''أَلَايَا'' جیسے: ''هَدِيَّةٌ وَهَدَايَا'' اس کے معنی یمین ہیں، یعنی قسم۔ عرب کی بول چال مین جب کوئی قسم کھاتا ہے تو کہتے ہیں: ''اِئْتَلٰى يَأْتَلِي'' بروزن ''اِنْتَهٰى يَنْتَهِيْ'' اسی باب سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ﴾ [البقرة: ٢٢٦] ''جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں۔'' ایک فرقے نے کہا ہے کہ اس محاورے سے ماخوذ ہے: ''أَلَوْتُ فِيْ كَذَا إِذَا قَصَرْتَ'' اسی معنی سے یہ قول ہے: ''لَمْ آلُ جُهْدًا، أَيْ: لَمْ أَقْصُرْ''. اسی طرح اس مادے سے یہ آیت ہے: ﴿ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ﴾ [آل عمران: ١١٨] ''دوسرے لوگ تمھیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔'' شانِ نزول کی دلیل سے پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس بات کی قسم نہ اُٹھاؤ کہ کسی کو نفع نہ پہنچاؤ۔[2] امام ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے افک والوں میں سے افک کا بڑا بوجھ اُٹھایا اور وہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رشتے دار تھے اور اُن کے عیال میں تھے۔ اس لیے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ ان کو کبھی خیر نہ پہنچائیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

کہا: پھر ان کو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عیال کی طرف رجوع کر لیا اور کہا کہ میں قسم نہیں کھاتا ہوں کسی چیز پر، پھر دیکھتا ہوں کہ اس چیز کے علاوہ اس سے بہتر ہے تو اس قسم کو کھول دیتا ہوں،[3] یعنی کفارہ ادا کر کے اس کام کو کرتا ہوں جو بہتر ہے۔ یہ قصہ چند طرق سے تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ کچھ لوگوں نے اصحابِ رسول اللہ ﷺ میں سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٦٥۔ ٣٦٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٣٧) [3] الدر المنثور (٦/ ١٦٢)

برائی کی تہمت لگائی تھی اور اس کا افشا کیا تھا اور اس میں گفتگو کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے، جن میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ شامل ہیں، اس بات کی قسم کھائی تھی کہ اس آدمی پر خیرات نہ کریں گے، جس نے اس میں سے کچھ بھی بات چیت کی اور نہ ہی اس سے صلہ رحمی کریں گے تو اللہ پاک نے فرمایا کہ تم میں سے بڑائی والے اور آسودہ حال لوگ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے ارحام سے صلہ رحمی نہ کریں اور اُن کو اُن مالوں میں سے نہ دیں جس طرح پہلے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے امر کیا کہ اُن کو بخشا جائے اور معاف کیا جائے۔[1] فضل سے مراد غنا اور مال میں فراخی ہے۔

﴿ اَنْ يُّؤْتُوْٓا ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یہ "عَلَى أَنْ لَّا يُؤْتُوْا" ہے۔ کلمۂ "لَا" حذف کر دیا گیا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: اضمارِ "لَا" کی حاجت نہیں ہے۔[2] ﴿ يَاْتَلِ ﴾ اس بنا پر کہ "أَلية" بمعنی قسم سے ماخوذ ہوگا تو معنی یہ ہوں گے کہ اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ ان لوگوں پر احسان نہ کریں گے جو احسان کے مستحق ہیں، ان لوگوں میں سے جو ان صفات کے جامع ہیں کہ رشتہ دار ہیں، مسکین ہیں، اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑے ہوئے ہیں۔ دوسری وجہ پر معنی یہ ہیں کہ اس بات میں تقصیر (کمی) نہ کریں کہ اُن کی طرف احسان کریں گو اُن کے اور اُن کے درمیان کسی ایسے گناہ کے سبب سے جو انھوں نے کیا ہو، کینہ اور عداوت ہو۔ امام ابو حیوہ رحمہ اللہ نے التفات کی بنا پر تائے خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔[3]

پھر اللہ پاک نے اُن کو ایک اور ادب سکھایا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلْيَعْفُوْا ﴾ یعنی چاہیے کہ ان کے اس گناہ سے درگزر کریں جو انھوں نے اُن پر کیا ہے اور اُن کے جرم سے تجاوز کریں جو انھوں نے کمایا ہے۔ یہ "عَفَا الرَّبْعُ" سے ماخوذ ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب مکان کے نشان مٹ جاتے ہیں۔ مراد گناہ کا محو کرنا ہے، یہاں تک کہ وہ مٹ جائے، جس طرح کہ مکان کا نشان مٹ جاتا ہے۔

﴿ وَلْيَصْفَحُوْا ﴾ اور چاہیے کہ درگزر کریں اس طریقے سے کہ مجرم سے چشم پوشی کریں، اس کے گناہ اور جرم سے اغماض (چشم پوشی) فرمائیں، اس کے ملامت کرنے سے منہ موڑیں، کیوں کہ عفو یہ ہے کہ مجرم سے تجاوز کرے اور صفح یہ ہے کہ اس کے جرم کو بھلا دے۔ کسی نے کہا کہ عفو فعل سے ہوتا ہے اور صفح دل سے۔ کسی نے دونوں فعلوں کو تائے فوقیہ پڑھا ہے۔ پھر جو شخص عفو و صفح کرتا ہے اللہ پاک نے اس کے لیے ایک بہت بڑی ترغیب کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ یعنی کیا تم دوست نہیں رکھتے ہو کہ تمھارے ساتھ جنھوں نے برائی کی اور تم نے اُن سے عفو و صفح کیا تو اس کے سبب سے اللہ پاک تمھاری مغفرت کرے؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: "بَلٰى، أَنَا أُحِبُّ أَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لِيْ"، یعنی ہاں میں دوست رکھتا ہوں کہ اللہ میری مغفرت فرمائے۔ پھر مسطح کو

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٣٧) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٠٩) [3] فتح القدير (٤/ ٢٣)

دینے لگے جو دیا کرتے تھے۔ ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے بندوں کے واسطے بڑی مغفرت و رحمت والا ہے، باوجود اُن کے گناہوں کی کثرت کے۔ پھر بندے کیوں کر برائی پہنچانے والوں کے ساتھ عفو وصفح نہ کریں۔[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ يَوْمَىِٕذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿٢٥﴾

بلاشبہ جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے (23) جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر اُن کے خلاف، ان اعمال کی گواہی دیں گے، جو وہ کرتے تھے (24) اس دن اللہ انھیں پورا پورا، ان (کے حساب کتاب) کا ٹھیک بدلہ دے گا (جس کے وہ مستحق ہیں) اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی واضح حق ہے (25)

پاک دامن مومن عورتوں پر تہمت لگانے والوں کے لیے وعید کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن لوگوں کے لیے وعید ہے جو محصنات غافلات کو تہمت لگاتے ہیں۔ مومنات کا حکم مخرج غالب میں خارج ہوا ہے۔ چنانچہ ہر محصنہ سے اس آیت میں داخل ہونے کی اُمہاتِ مومنین بدرجۂ اولیٰ مستحق ہیں۔ خاص کر وہ اُم المومنین جو آیت کا سببِ نزول ہیں، یعنی عائشہ بنت صدیق رضی اللہ عنہما۔ علماء رحمہم اللہ نے قاطبۃً اس بات پر اجماع کیا ہے کہ جو کوئی اُن کو گالی دے اور اُن کو عیب لگائے اس بات کا جس کا اُن کو عیب لگایا، اس کے بعد جو اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے تو بے شک وہ کافر ہے، کیوں کہ وہ قرآن شریف کا معاند ہے اور باقی اُمہاتِ مومنین میں دو قول ہیں، اُن میں سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ بے شک وہ بھی انہیں کی مثل ہیں۔ واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ اس آیتِ کریمہ کے مثل ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾ [الأحزاب: ٥٧] ''بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں، اللہ نے ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے رسوا کن عذاب تیار کیا ہے۔'' بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ یہ آیت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خاص ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایتِ سعید بن جبیر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ خاص

[1] فتح البیان (۹/ ۱۸۹۔ ۱۹۰)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح امام سعید بن جبیر و مقاتل بن حیان رحمہما اللہ نے کہا ہے۔
امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے راوی ہیں، فرمایا کہ میں عیب لگائی گئی اس شے کے ساتھ جس شے کے ساتھ عیب لگائی گئی اور میں غافل بے خبر تھی۔ پھر اس کے بعد مجھے یہ خبر پہنچ گئی۔ فرمایا: پھر اس دوران کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی گئی۔ فرمایا کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی جاتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہیئتِ سُبات کے پکڑ لیتا تھا، یعنی نیند سی آ جاتی تھی اور بے شک ان کی طرف وحی کی گئی اور وہ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اپنے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگے اور فرمایا: اے عائشہ! خوش ہو جا۔ فرمایا: میں نے کہا: "بِحَمْدِ اللّٰهِ لَا بِحَمْدِكَ"، یعنی میں اللہ کی حمد کروں گی، تمھاری نہ کروں گی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ ﴾ یہاں تک کہ اس آیت تک پہنچے: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ [1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ اس حدیث کو اسی طرح لائے ہیں۔ اس میں یہ بات نہیں ہے کہ حکم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خاص ہے، اس میں جو ہے سو یہی ہے کہ وہ سببِ نزول ہیں نہ اور کوئی بی بی اُن کے سوا، اگرچہ حکم اُن کو عام ہے مثل ان کے غیر کے اور شاید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد بھی یہی ہو اور اُن کی بھی جو ان کے قول کی طرح کہتے ہیں۔ واللہ أعلم۔ امام ضحاک، ابو الجوزاء اور سلمہ بن عبیط نے کہا ہے کہ اس سے مراد خاص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بیاں ہیں نہ کہ اُن کے سوا دوسری عورتیں۔[2] امام عوفی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ آیت ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہیں۔ اہلِ نفاق نے ان کو عیب لگایا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے لعنت اور غضب واجب کیا اور وہ اللہ کا غصہ لے کر پھرے۔

لہٰذا یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بیوں کے بارے میں ہے۔ پھر اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ تو اللہ نے جلد (کوڑوں کی سزا) اور توبہ نازل کی، سو توبہ تو مقبول ہے اور شہادت مردود۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بنی اسد کے ایک شیخ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۃ النور کی تفسیر بیان فرمائی، پھر جب اس آیت پر آئے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ ... الخ ﴾ تو فرمایا کہ یہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور ازواجِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے اور یہ آیت مبہم ہے اور اُن لوگوں کے لیے توبہ نہیں ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی:

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٣٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٥٦ ـ ٢٥٥٧)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ١٣٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٥٧)

﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا...الخ﴾ فرمایا: ان لوگوں کے لیے توبہ ٹھہرائی اور جن لوگوں نے ان کو عیب لگایا اُن کے واسطے توبہ قرار نہیں دی۔ شیخ اسدی نے کہا: بعض قوم نے، یعنی بعض حاضرینِ مسجد نے قصد کیا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف کھڑے ہوں تو اُن کے سر مبارک کو بوسہ دیں، اس وجہ سے کہ انھوں نے سورۃ النور کی تفسیر خوب کی۔[1] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو لفظ مبہم فرمایا تھا تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ آیت ہر محصنہ کو تہمت لگانے کے بارے میں اور دنیا اور آخرت میں اس کی لعنت کے حکم کے بارے میں عام ہے۔

اسی طرح عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حق میں ہے اور نیز اس شخص کے حق میں ہے جو آج مسلمانوں کی عورتوں کے بارے میں ایسا کرے تو اس کے لیے وہی ہے جو اللہ پاک نے فرمایا ہے، لیکن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس بارے میں اصل ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کے عموم کو اختیار کیا ہے[2] اور یہی صحیح ہے۔ اور اسی عموم کو وہ حدیث تقویت دیتی ہے جس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بچو تم سات ہلاک ہونے والی باتوں سے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور سحر یعنی جادو، اور اس جان کا قتل کرنا ہے جس کو اللہ نے حرام کیا مگر حق کے ساتھ، اور سود کا کھانا، اور یتیم کا مال کھانا، اور لڑائی کے دن پیٹھ دینا، اور پارسا بے خبر ایمان دار بی بیوں کو عیب لگانا۔[3] (أخرجاه في الصحيحين من حديث سلمان بن بلال به) حافظ ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پارسا عورت کو عیب لگانا سو برس کے عمل کو ضائع کر دیتا ہے۔[4]

زبان اور دیگر اعضاء کی قیامت کے دن مجرموں کے خلاف گواہی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایتِ سعید بن جبیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ مشرک لوگ جب دیکھیں گے کہ جنت میں سوائے نماز والوں کے کوئی لوگ داخل نہیں ہوتے تو وہ کہیں گے: آؤ یہاں تک کہ انکار کریں۔ پھر وہ انکار کریں گے تو اُن کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اُن کے ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے اور اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔[5] نیز امام ابن ابی حاتم اور ابن جریر رحمہما اللہ نے سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٣٩۔ ١٤٠) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٣٩۔ ١٤٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٥٦)

[4] المعجم الكبير (٣/ ١٦٨) اس کی سند میں "ابو اسحاق" مدلس راوی ہے اور عن کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ نیز "لیث بن ابی سلیم" متکلم فیہ راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣١٨٥) . [5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٥٨)

فرمایا ہے کہ قیامت کا دن ہوگا تو کافر کو اس کا عمل پہنچوایا جائے گا تو وہ انکار کرے گا اور جھگڑے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ یہ تیرے پڑوسی تجھ پر گواہی دیتے ہیں، کہے گا: جھوٹ کہا۔ پھر کہا جائے گا کہ تیرے گھر والے تیرے رشتے دار، تو کہے گا کہ جھوٹ کہا، پھر کہا جائے گا: قسم کھاؤ تو قسم کھالیں گے۔ پھر اللہ اُن کو چپ کرا دے گا تو اُن کے ہاتھ اور اُن کی زبانیں اُن پر گواہی دیں گے۔ پھر اُن کو آگ میں داخل کر دے گا۔[1]

نیز امام ابن ابی حاتم نے بروایتِ شعبی انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچلیاں ظاہر ہوگئیں۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو میں کس بات سے ہنستا ہوں؟ ہم نے عرض کی: اللہ اور رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: بندے کے اپنے رب سے جھگڑنے پر مجھے ہنسی آتی ہے۔ وہ قیامت کے دن کہے گا کہ اے رب! کیا تو نے مجھ کو ظلم سے پناہ نہیں دی؟ اللہ فرمائے گا: ہاں۔ وہ کہے گا کہ میں صرف اپنے نفس سے گواہ چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ﴿ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ شَهِيدًا ﴾ ''آج تیرا ہی نفس تجھ پر گواہ کافی ہے۔'' اور کرام کاتبین تجھ پر گواہ ہیں۔ پھر اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی اور اس کے اعضاء سے کہا جائے گا کہ بولو تو وہ اس کا عمل بول دیں گے۔ پھر اس کے اور اس بات کے درمیان تخلیہ کر دیا جائے گا، یعنی بولنے کا حکم ملے گا تو کہے گا: ﴿ بُعْدًا لَّكُنَّ وَسُحْقًا فَعَنكُنَّ كُنتُ أُنَاضِلُ ﴾ یعنی تم دور ہو، میں تو تمھاری ہی طرف سے جھگڑتا تھا![2] (وقد رواه مسلم و النسائي جميعا عن أبي بكر بن أبي النضر عن أبيه عن عبد الله الأشجعي عن سفيان الثوري به، ثم قال النسائي: لا أعلم أحدا روى هذا الحديث عن سفيان الثوري غير الأشجعي و هو حديث غريب والله أعلم، هكذا قال)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اے ابن آدم! واللہ! بے شک تجھ پر البتہ تیرے بدن کے ایسے گواہ ہیں جن پر غلط بیانی کا اتہام نہیں ہوگا۔ ''فَرَاقِبْهُمْ'' یعنی تو اُن کا لحاظ رکھ اور اپنے پوشیدہ اور ظاہر میں اللہ سے ڈر، کیوں کہ اس پر کوئی پوشیدہ شے مخفی نہیں ہے۔ تاریکی اس کے نزدیک روشنی ہے اور پوشیدہ اس کے نزدیک ظاہر ہے۔ جو شخص اس کی طاقت رکھتا ہو کہ وہ مرے تو اللہ کے ساتھ نیک گمان رکھتا ہو تو چاہیے کہ وہ ایسا گمان کرے اور نہیں ہے کوئی طاقت مگر اللہ کے ساتھ۔[3]

قیامت کے دن لوگ وہی کاٹیں گے جو بویا ہوگا:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ دِينَهُمْ ﴾

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٤٠۔ ١٤١) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٥٥٨) اس کی سند میں ''دراج عن أبي الهيثم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٧٠٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٥٠٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٥٩)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٥٨۔ ٢٥٥٩)۔

سے مراد "حِسَابُهُمْ" ہے اور قرآن میں جہاں کہیں "دِيْنَهُمْ" ہے، اس سے مراد "حِسَابُهُمْ" ہے اور اسی طرح غیر واحد نے کہا ہے۔ جمہور کی قراءت بنصبِ ﴿ الْحَقَّ ﴾ ہے۔ اس بنا پر کہ ﴿ دِيْنَهُمْ ﴾ کی صفت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے برفع پڑھا ہے۔ اس بنیاد پر کہ اسم مبارک اللہ کی صفت ہے۔ بعض سلف نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اس کو یوں پڑھا ہے: "يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ الْحَقُّ دِيْنَهُمْ"[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی اللہ پاک کا وعدہ وعید وحساب وہی عدل ہے کہ اس میں کسی طرح کا ظلم نہیں ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ "مُحْصَنٰتِ" سے مراد عفیف اور پارسا بی بیاں ہیں۔ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے، ہم ذکر کر آئے ہیں کہ حدِ قذف میں پارسا مردوں کا حکم بھی پارسا عورتوں کے حکم کی طرح ہے۔ "غَافِلَاتِ" سے مراد وہ عورتیں ہیں کہ فاحشہ، یعنی زنا سے ایسی غافل ہیں کہ اس کا خیال تک اُن کے دل میں نہیں گزرتا ہے، نہ وہ اس کو جانتی ہیں، نہ اُن کو اس کا ہوش ہے۔ اس لفظ میں کمال نزاہت ہے (یہ کنایہ ہے عفت و پاکی و پارسائی سے) اور پاک دامنی پر وہ دلالت ہے کہ لفظِ محصنات میں نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ غافلات وہ بی بیاں ہیں جن کا سینہ برائی سے بچا ہوا اور صحیح سالم ہے۔ اُن کے دل پاک صاف ہیں، نہ اُن میں زیرکی و کاروانی ہے نہ کسی قسم کا مکر، کیوں کہ انھوں نے نہ اُمور کا تجربہ کیا نہ حالات کی آزمایش۔ لہٰذا جس بات کو تجربہ کار، ہوشیار اور پختہ کار جانتے بوجھتے ہیں، وہ اس کو نہیں سمجھتیں، غرض بھولی بھالی ہیں۔ دنیا داری کے کاموں سے محض ناواقف ہیں۔ اسی طرح بھولے بھالے مردوں کا حال ہے، جن پر سلامتِ صدر (سینے کی سلامتی) غالب ہے اور لوگوں کے ساتھ نیک گمان رکھنا، کیوں کہ انھوں نے اپنے دنیا کے کام کو غافل کر دیا ہے۔ لہٰذا اس میں دانائی کے تصرف کرنے سے نادان ہو رہے ہیں اور اپنی آخرت پر متوجہ ہیں، اپنے نفوس کو اسی میں مشغول کر دیا ہے۔ مومنات وہ عورتیں ہیں کہ اللہ پاک پر اور اس کے رسولِ کریم پر ایمان رکھتی ہیں۔

اس آیت میں اختلاف ہے کہ آیا یہ خاص ہے یا عام۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ خاص ہے اس شخص کے بارے میں جس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت لگائی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن ابی رأس المنافقین کے ساتھ خاص ہے۔ امام ضحاک اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ سیدہ عائشہ اور باقی ازواجِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے نہ دوسرے مومنین اور مومنات کے حق میں۔ چنانچہ جو شخص اُمہاتِ مومنین میں سے کسی ایک کو عیب لگائے تو وہ اس آیت کے لوگوں میں سے ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٤١) تفسير ابن أبي حاتم (٢٥٥٩ـ ٢٥٦٠) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٦٦ـ ٣٦٨)

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کے احکام سے ایک یہ ہے کہ جو شخص اُمہاتِ مومنین میں سے کسی ایک کو عیب لگائے تو اس کے لیے توبہ نہیں ہے اور جو کوئی اُن کے علاوہ کسی کو تہمت لگائے تو اللہ نے اس کے لیے توبہ ٹھہرائی ہے، جس طرح کہ ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ﴾ میں گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت اس شخص کے ساتھ خاص ہے جس نے قذف پر اصرار کیا اور توبہ نہیں کی۔ کسی نے کہا ہے کہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ خاص ہے، کیوں کہ جس وقت کوئی عورت ہجرت کر کے نکلتی تو اس سے کہتے کہ وہ صرف اس لیے نکلی ہے کہ فجور کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر تہمت لگانے والے کے لیے اور پاک دامن مردوں اور پاک دامن عورتوں میں ہر اس مرد و عورت کے لیے ہے جس پر تہمت لگائی جائے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور یہی قول اُس بات کے مطابق ہے جو اصول والوں نے قرار دی ہے کہ عمومیتِ لفظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔[1]

علماء نے کہا ہے کہ اگر اس آیت سے مراد وہ مومنین ہیں جو تہمت لگانے والے ہیں تو لعنت سے زبان پر ایسے مومنوں کی تعریف کو دور کرنا اور انھیں حد لگانا اور باقی مومنوں کا اُن کو چھوڑ دینا اور اُن کا رُتبۂ عدالت (گواہی دینے اور انصاف کا مرتبہ) زائل ہو جانا ہے اور دوسرے اہلِ ایمان کا اُن سے وحشت کرنا مراد ہے۔ اور اگر آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے خاص طور پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت لگائی تو یہ اُمور، یعنی دنیا و آخرت میں لعنت اور عذابِ عظیم عبداللہ بن ابی راس المنافقین کی طرف ہوں گے۔ اور اگر آیت مشرکینِ مکہ کے حق میں ہے تو وہ دنیا اور آخرت میں ملعون ہیں۔

جملہ: ﴿ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ ... الخ ﴾ اس سے پہلے جملے کی تقریر و تثبیت کرتا ہے اور اُن پر عذابِ عظیم اُترنے کا وقت بیان کرتا ہے۔ ﴿ يَوْمَ ﴾ کی تعیین اس لیے فرمائی ہے کہ جو عذاب اس دن میں ہوگا، جس کا وصف و بیان احاطہ نہیں کر سکتا ہے، اس کے ساتھ تہویل (ڈراوا، دہشت) زیادہ ہو جائے۔ جمہور کی قراءت ﴿ تَشْهَدُ ﴾ بتائے فوقیہ ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ، کسائی اور خلف رحمہم اللہ نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اسی قراءت کو اختیار کیا ہے۔ اس لیے کہ جار و مجرور اسم اور فعل کے درمیان حائل ہو گیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جس دن بعض زبانیں بعض پر گواہی دیں گی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ خود انہیں کی زبانیں انہیں پر گواہی دیں گی، اس دن میں اس بات کی جس کے ساتھ انھوں نے تکلم کیا ہے اور اُن کے ہاتھ اور اُن کے پاؤں اس فعل کی گواہی دیں گے جو انھوں نے دنیا میں اپنے ہاتھ پاؤں سے کیا۔ اللہ پاک اعضاء کو زبان عطا فرمائے گا تو وہ بولیں گے اور قول و فعل کی گواہی دیں گے، جس چیز کی گواہی دیں گے، وہ محذوف ہے، یعنی اُن کے معاصی اور گناہ جو انھوں نے کیے ہیں: ﴿ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ ﴾ یعنی جس دن اُن کے اعضاء اُن کے

[1] فتح القدير (٤/ ٢٤) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢١٠)

قبیح اعمال کی اُن پر گواہی دیں گے تو اس دن اللہ پاک ان پر ان کو پوری پوری جزا دے گا۔ اس جگہ دین سے مراد جزا ہے اور حق سے مراد ثابت ہے، یعنی ایسی جزائے ثابت ہے کہ اس کے ثبوت میں کسی طرح کا شک نہیں ہے۔

امام زید بن علی رحمہ اللہ نے "یُوْفِیہِم" مخفف پڑھا ہے "أَوْفیٰ" سے اور اُن کے علاوہ اور لوگوں نے بہ تشدید پڑھا ہے "وَفّٰی" سے۔ امام ابوحیوہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے "اَلْحَقُّ" بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اسمِ پاک اللہ کی صفت ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ باقی قاریوں نے بہ نصب پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿ دِيْنَهُمُ ﴾ کی صفت ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر لوگوں کی مخالفت کی کراہت نہ ہوتی تو رفع دو وجہ سے بہتر ہوتا: ایک یہ کہ اسمِ اللہ عزوجل کی صفت ہو جاتا، دوسرے یہ کہ اُبی رضی اللہ عنہ کی قراءت کی موافقت ہو جاتی۔ جریر بن حازم نے کہا ہے کہ میں نے ابی رضی اللہ عنہ کے مصحف میں یوں دیکھا ہے: "یُوَفِّیھِمُ اللّٰہُ الْحَقُّ دِیْنَھُمْ"

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو عبیدہ کی یہ بات دو وجہ سے پسندیدہ نہیں ہے: ایک یہ ہے کہ ایسی شے کے ساتھ حجت پکڑی ہے جو سوادِ اعظم کے مخالف ہے۔ دوسرا یہ کہ اس میں کوئی حجت بھی نہیں ہے، کیوں کہ اگر یہ بات صحیح ہی ہو جائے کہ مصحف ابی رضی اللہ عنہ میں اسی طرح ہے تو یوں ہو سکتا ہے کہ ﴿ دِيْنَهُمُ ﴾ بدل ہو ﴿ الْحَقَّ ﴾ سے۔[1] بہز بن حکیم نے عن ابیہ عن جدہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں پڑھا ہے: "یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیھِمُ اللّٰہُ الْحَقَّ دِیْنَھُمْ"[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی جس وقت وہ معاینہ کریں گے کہ اعضاء گواہی دے رہے ہیں اور پوری جزاء مل رہی ہے اور قرآن شریف میں جو بات لکھی تھی، اس کا وقوع ہو رہا ہے تو اس وقت جان لیں گے کہ اللہ پاک اپنی ذات وصفات وافعال میں حق اور ثابت ہے، وہ اشیاء کو اسی طرح ظاہر کرنے والا ہے جس طرح وہ اپنی ذات میں ہیں۔ اللہ پاک کا نام "حق" اس واسطے رکھا ہے کہ عبادت اسی کی حق ہے نہ کہ اس کے غیر کی۔ کسی نے کہا ہے کہ حق بہ معنی موجود اس لیے نام رکھا ہے کہ حق کا نقیض باطل ہے اور باطل معدوم ہے اور اللہ سبحانہ موجود ہے۔

﴿ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴾ کی یہ تفسیر کہ اس کی اُلوہیت ظاہر ہے اور کوئی دوسرا اُلوہیت میں شریک نہیں ہے اور اس کے علاوہ کسی کو ثواب اور عذاب پر قدرت نہیں ہے۔ اس تفسیر کو مقام سے کچھ بڑی مناسبت نہیں ہے۔ غرضیکہ اللہ پاک نے قرآن شریف میں کسی گناہ پر اتنی سختی نہیں فرمائی، جیسے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بہتان لگانے میں سختی کی ہے۔ چنانچہ اس باب میں ایجاز و اشباع (خوب زیادہ) کیا۔ اجمال و تفصیل کی تاکید و تکرار فرمائی۔ یہ وہی بات ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس شخص نے کوئی گناہ کیا، پھر اس سے توبہ کر لی تو اس کی توبہ مقبول ہے، مگر وہ شخص جس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے معاملے میں خوض کیا۔[3]

[1] فتح القدير (٤/ ٢٥) [2] فتح القدير (٤/ ٢٦) الدر المنثور (٦/ ١٦٧) [3] تفسير الرازي (٢٣/ ١٦٨)

یہ بات جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی، یہ افک کے معاملے میں تعظیم اور مبالغہ ہے۔ اللہ پاک نے چار آدمیوں کی چار شے سے براءت کی: یوسف علیہ السلام کو ﴿ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَآ ﴾ [یوسف: ٢٦] "اور اس (عورت) کے خاندان میں سے ایک شاہد نے گواہی دی۔" سے بری فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس پتھر سے جو اُن کے کپڑے لے کر بھاگا۔ مریم علیہا السلام کو اُن کے فرزند سے کہ انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں بات کی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی کتاب معجز میں ان آیاتِ عظام سے جو صفحۂ دہر (ہر زمانے) پر پڑھی جاتی ہے۔ اس قدر مبالغے کے ساتھ بری فرمایا، غور کرو، اُن سب کی براءت کے درمیان کتنا فرق ہے کہ اُن (عائشہ رضی اللہ عنہا) کے لیے نہ کسی بچے کی براءت پسند فرمائی، نہ نبی کی براءت، یہاں تک کہ خود اپنے کلامِ معجز نظام سے ان کو بری کیا اور تہمت اور بہتان کے چرک (غلاظت) سے ان کی طہارت و براءت فرمائی اور یہ صرف اس لیے کیا کہ اپنے رسولِ کریم رؤف رحیم کے بلند مرتبے کا اظہار کرے اور آپ کے اعلیٰ مرتبے پر آگاہی بخشے۔ صلی اللہ علیه وآله وصحبه أجمعین وبارك وسلم تسلیماً کثیرا عدد ما علم وزنة ما علم و مِلء ما علم۔ پھر جو آیتیں اہلِ افک کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، اللہ پاک نے ایک جامع کلمہ سے اُن کو ختم کیا۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے، اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے، یہ (پاکیزہ) لوگ ان باتوں سے بَری ہیں جو وہ (خبیث لوگ ان کی بابت) کہتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت اچھا رزق ہے ⑳

سب سے پاک باز انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی عائشہ رضی اللہ عنہا پاک باز خاتون ہیں:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کسی پیغمبر کی عورت بدکار نہیں ہوئی، یعنی اللہ ان کی ناموس کی نگہبانی کرتا ہے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ گندی باتیں گندوں کے واسطے ہیں اور گندے گندی باتوں کے واسطے ہیں اور ستھری باتیں ستھروں کے لیے ہیں اور ستھرے لوگ ستھری باتوں کے لیے ہیں۔ فرمایا:

[1] فتح البیان (٩/ ١٩٠۔ ١٩٤)

یہ آیت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں اور اہلِ افک کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اسی طرح امام مجاہد، عطاء، سعید بن جبیر، شعبی، حسن بن ابی الحسن البصری، حبیب بن ابی ثابت اور ضحاک رحمہ اللہ سے مروی ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ قبیح بات قباحت والوں کے لیے زیادہ مناسب ہے اور پاک بات پاک لوگوں کے لیے زیادہ لائق ہے۔ منافق لوگوں نے جو بات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کی تھی، وہی لوگ اس کے زیادہ تر مستحق تھے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اُن کی نسبت براءت اور پاکیزگی کی زیادہ مستحق تھیں۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ أُولَٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ﴾

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔[1] یہ قول بھی لزوماً اسی قول کی طرف راجع ہے جو پہلے لوگوں نے کہا ہے، یعنی کہ اللہ پاک ایسا نہیں ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی ٹھہرائے، مگر اسی حال میں کہ وہ طیب طاہر اور پاک صاف ہوں، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر کے ہر طیب و پاک سے زیادہ طیب اور پاک ہیں اور بالفرض اگر وہ ناپاک ہوتیں تو شرح و تقدیر کی رو سے، وہ ہرگز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائق نہ ہوتیں۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ أُولَٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ﴾ یعنی یہ لوگ اس بات سے جو اہلِ افک اور دشمن لوگ کہتے ہیں اس سے بہت دور ہیں۔

﴿ لَهُم مَّغْفِرَةٌ ﴾ ان کے واسطے بخشش ہے بسبب اس کے کہ اُن کے حق میں جو جھوٹ کہا گیا۔ ﴿ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴾ اور عزت کی روزی ہے اللہ پاک کے نزدیک جناتِ نعیم میں۔ اس میں اس بات کا وعدہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں جنت میں ہیں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یحییٰ بن جزّار سے روایت کیا ہے کہ اسیر بن جابر عبداللہ کی طرف آئے تو کہا کہ البتہ میں نے واقعی آج ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے ایک ایسی بات سنی کہ اس نے مجھے تعجب میں ڈالا، یعنی مجھے بہت پسند آئی تو عبداللہ بولے کہ مومن مرد کے دل میں پاک بات ہوتی ہے، جو اس کے سینے میں حرکت کرتی رہتی ہے، جمتی نہیں، یہاں تک کہ وہ اسے بول دیتا ہے تو وہ شخص اس کو سن لیتا ہے جو اس کے پاس ہے، وہ اس کو ڈال رکھتا ہے، پھر اس کو اپنے پاس جمع کر رکھتا ہے۔ فاجر مرد کے دل میں ناپاک بات ہوتی ہے، جو اس کے سینے میں حرکت کرتی رہتی ہے، قرار نہیں پکڑتی، یہاں تک کہ وہ اسے بول دیتا ہے تو جو شخص اس کے پاس ہے اسے سن لیتا ہے، اسے ڈال رکھتا ہے اور پھر اسے اپنے پاس جمع کر رکھتا ہے۔

پھر سیدنا عبداللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ ۖ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ١٤٢۔ ١٤٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٦٠۔ ٢٥٦٣)

﴿وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ [1] اسی کے مشابہ وہ حدیث ہے جسے امام احمد رحمہ اللہ نے مسند میں مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اس شخص کی مثال جو حکمت کو سنتا ہے، پھر اس کو بیان نہیں کرتا، مگر اس شے سے بدتر کو جس کو سنا ہے، اس شخص کی مثال کی طرح ہے کہ بکریوں والے کے پاس آیا اور کہا کہ تو مجھے ذبح کے قابل ایک بکری دے تو اس نے کہا کہ تو جا اور جس بکری کا چاہے کان پکڑ لے، وہ گیا اس نے بکریوں کے کتے کا کان پکڑ لیا۔[2] دوسری حدیث میں یہ ہے کہ حکمت مومن کی گمی ہوئی چیز ہے، جہاں اس کو پایا لے لیا۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں پہلا قول ذکر کیا ہے، اس کے بعد فرمایا ہے کہ قتادہ رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے اور اسی طرح تابعین کی ایک جماعت سے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول تمام اقوال سے بہترین ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ گندی باتیں نہیں بولتا، کوئی مردوں اور عورتوں میں سے مگر وہی جو گندا ہے اور ستھری باتیں نہیں بولتا مگر وہی جو مردوں اور عورتوں میں سے ستھرا ہے۔ یہ اُن کی مذمت ہے جنھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو برائی کی تہمت لگائی اور تعریف ہے ان کی جنھوں نے اُن کی براءت کی۔[4] دوسرے قول کو اس طرح ادا کیا ہے کہ یہ آیت بنا کی گئی ہے ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً﴾ پر۔ لہٰذا ''خَبِیْثَات'' تو زانی عورتیں ہیں اور ''طَیِّبَات'' پارسا بی بیاں ہیں اور اسی طرح گندے اور ستھرے مرد۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازل ہوئی ہے، جبکہ منافقوں نے اُن کو بہتان اور جھوٹی تہمت لگائی۔

پھر اللہ پاک نے اُن کو اس سے بری فرمایا۔ ابن اُبی ہی خبیث تھا اور وہی اس کے زیادہ لائق تھا کہ اس کے لیے گندی عورت ہو اور وہ اس کے لیے ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پاک تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پاک بی بیاں ہوں اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پاک تھیں اور اس بات کے لیے زیادہ مناسب تھیں کہ اُن کے لیے پاک مرد ہو۔[5]

﴿اُولٰٓئِكَ﴾ کا اشارہ طیبین وطیبات کی طرف ہے۔ ﴿مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ﴾ یعنی یہ لوگ اس سے مبرا ہیں جو ''خبیثین و خبیثات'' کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ازواجِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صرف عائشہ رضی اللہ عنہا اور صفوان کی طرف اشارہ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمع کا صیغہ ایسا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ﴾ [النساء: ١١] ''اور اگر اس

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٦١)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٧٢) مسند أحمد (٢/ ٣٥٣) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة: ١٧٦١)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٦٩) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٦٨۔ ٣٦٩)

[4] فتح القدير (٤/ ٢٥) [5] تفسير الطبري (١٩/ ١٤٤)

(مرنے والے) کے (ایک سے زیادہ) بھائی بہن ہوں۔'' حالاں کہ مراد دو بھائی ہیں۔[1] ابن زید نے کہا ہے کہ اس جگہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بری کی گئیں۔[2]

﴿ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ ﴾ یعنی یہ لوگ جو بری کیے گئے اُن کے واسطے عظیم بخشش ہے، کیوں کہ بشر گناہوں سے خالی نہیں رہتا ہے۔ ﴿ وَرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ سے مراد رزقِ جنت ہے۔ مروی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کئی چیزوں پر فخر کیا کرتی تھیں جو اُن کے سوا اور کسی عورت کو عطا نہیں ہوئیں، ایک یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام ریشمی کپڑے میں اُن کی صورت لائے تھے اور کہا یعنی رسول اللہ ﷺ سے کہ یہ آپ کی بیوی ہیں۔ دوسری یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے اُن کے سوا کسی کنواری عورت سے نکاح نہیں کیا اور آپ ﷺ کی وفات شریف اُن کی گود میں ہوئی اور اُن کی باری کے دن میں اور آپ ﷺ اُن کے گھر میں مدفون ہوئے اور آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی اور وہ آپ ﷺ کے ساتھ لحاف میں ہوتیں اور اُن کی براءت آسمان سے نازل ہوئی اور وہ صدیق رضی اللہ عنہ اور خلیفۂ رسول اللہ ﷺ کی دخترِ نیک اختر ہیں اور پاک پیدا کی گئیں اور مغفرت اور رزقِ کریم کا ان کو وعدہ ملا۔ مسروق رحمہ اللہ جس وقت ان سے حدیث بیان کرتے تو یوں کہتے: ''حَدَّثَتْنِي الصِّدِّيْقَةُ بِنْتُ الصِّدِّيْقِ حَبِيْبَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُبَرَّأَةُ مِنَ السَّمَاءِ'' یعنی مجھ کو حدیث بیان کی صدیقہ بنت صدیق محبوب رسول اللہ ﷺ نے جن کی براءت آسمان سے اتری۔ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ نے عذر گزار ہو کر اُن کی شان میں یہ اشعار عرض کیے:

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيْبَةٍ ... وَتُصْبِحُ غَرْثٰى مِنْ لُحُوْمِ الْغَوَافِلِ
حَلِيْلَةُ خَيْرِ النَّاسِ دِيْناً وَّمَنْصِباً ... نَبِيُّ الْهُدَى وَالْمَكْرُمَاتِ الْفَوَاضِلِ
عَقِيْلَةُ حَيٍّ مِنْ لُؤَيِّ بْنِ غَالِبٍ ... كِرَامِ الْمَسَاعِيْ مَجْدُهَا غَيْرُ زَائِلِ
مُهَذَّبَةٌ قَدْ طَيَّبَ اللّٰهُ خِيْمَهَا ... وَطَهَّرَهَا مِنْ كُلِّ شَيْنٍ وَّبَاطِلِ[3]

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنَّا وَأَرْضَاهَا وَجَعَلَ جَنَّةَ الْفِرْدَوْسِ مَنْزِلَهَا وَمَأْوَهَا. جبکہ اللہ پاک زنا اور بہتان کے ذکر سے فارغ ہوا اور ان سے زجر کر چکا تو یہ بات شروع کی کہ گھروں میں اجازت مانگے بغیر داخل نہ ہوں اور اس سے زجر کیا، اس لیے کہ اس میں مردوں کی عورتوں سے مخالطت (میل جول) ہو جاتی ہے۔ پھر کبھی یہ میل جول اُن دو معاملوں میں سے جن کا ذکر ہوا ہے، کسی ایک معاملے کی طرف لے جاتا ہے اور نیز یہ بات ہے کہ آدمی اپنے گھر میں اور مکان میں خلوت میں ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ کسی غیر کا اسے اس حالت میں دیکھنا اچھا نہیں لگتا، اس لیے اللہ پاک نے غیر کے گھروں میں داخل ہونے سے منع کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[4]

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢١١) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٤٤)
[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٠٠) [4] فتح البيان (٩/ ١٩٤۔ ١٩٦)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى
تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۷ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى
يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى
لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ
اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ
يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ۝۲۹

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، حتیٰ کہ تم اجازت لے لو، اور ان گھر والوں کو سلام کرو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو 27 پھر اگر تم ان میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں داخل نہ ہو، حتیٰ کہ تمھیں اجازت دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ آؤ، یہ تمھارے لیے بہت پاکیزہ (عمل) ہے اور جو تم عمل کرتے ہو، اللہ اسے خوب جانتا ہے 28 تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان گھروں میں داخل ہو، جہاں رہایش نہ ہو (اور) ان میں تمھارے لیے کوئی فائدہ ہو اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو 29

دوسروں کے گھروں میں داخلے کے وقت اجازت وغیرہ کے آداب کا بیان:

یعنی کسی کے گھر میں بغیر بتائے ہوئے نہ گھس جائے، کیا جانے وہ کس حال میں ہے، پہلے آواز دے اور سب سے بہتر آواز سلام کی ہے۔ کوئی گھر میں نہ ہو اور اجازت دے رکھی ہو تو خالی گھر میں چلے جاؤ اور نہ دی ہو تو نہ جاؤ اور لوٹ جانے کو کہنے سے برا نہ مانو، اس میں آپس کی ملاقات صاف رہتی ہے، ایک کا دوسرے پر بوجھ نہیں پڑتا۔ شاید سننے والوں کے دل میں آیا ہوگا کہ جس گھر میں کوئی نہیں رہتا تو کس سے اجازت لے۔ یہ ہر وقت پوچھ کر جانا جدی گھر والوں کو ہے اور جو ایک گھر کے لوگ ہیں، جیسے: لونڈی غلام یا اُولاد، ان کو ہر وقت اجازت لینا اور پوچھنا ضروری نہیں، مگر تین اوقات میں جو خلوت کے ہیں۔ ان کا بیان اس سورت کے آخر میں ہے۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ شرعی آداب ہیں۔ اللہ پاک نے اپنے مومن بندوں کو ان سے مؤدب فرمایا ہے، یہ ادب اجازت طلب کرنے میں ہے۔ ان کو اس بات کا حکم دیا کہ اپنے گھروں کے سوا غیر کے گھروں میں نہ گھسیں یہاں تک کہ داخل ہونے سے پہلے اجازت مانگیں اور اس کے بعد سلام کریں۔ بہتر یہ ہے کہ تین دفعہ

اجازت طلب کرے۔ پھر اگر اسے اجازت ملے تو بہتر وگرنہ لوٹ جائے، جیسا کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ نے جب کہ عمر رضی اللہ عنہ پر داخل ہونے کا تین بار اذن مانگا، اُن کو اذن نہ ملا تو لوٹ گئے۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں نہیں سنتا ہوں عبداللہ بن قیس کی آواز کہ وہ اجازت طلب کر رہا ہے؟ اس کو اجازت دو، پھر اُن کو ڈھونڈا تو نہ پایا، وہ چل دیے تھے۔ پھر جب اس کے بعد سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ آئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تجھے کون سی چیز لوٹا کر لے گئی؟ وہ بولے کہ میں نے تین بار اذن طلب کیا تو مجھے اذن نہ ملا اور بلاشبہہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس وقت تم میں سے کوئی تین دفعہ اِذن مانگے پھر اسے اذن نہ ملے تو چاہیے کہ واپس لوٹ جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چاہیے کہ تم اس بات پر میرے پاس کوئی گواہ لاؤ، ورنہ میں مار کر تجھے درد پہنچاؤں گا۔ سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ انصار کی ایک جماعت کی طرف گئے اور اُن سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا تو وہ بولے کہ ہم میں سے سب سے چھوٹا اس بات کی گواہی دے گا۔ پھر اُن کے ساتھ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کی خبر دی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مجھے بازاروں میں خرید و فروخت کی مصروفیت نے اس حدیث شریف کے سننے سے روکا۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے یا ان کے غیر سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ پر اذن طلب کیا تو فرمایا: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“ ! سعد نے کہا: ”وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ سنا یہاں تک کہ تین بار سلام کیا اور سعد رضی اللہ عنہ نے تین بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کا جواب دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہ سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ گئے۔ پھر سعد رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے آئے تو عرض کی: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر سے قربان ہوں آپ نے کوئی سلام نہیں کیا مگر وہ میرے کان میں تھا اور میں نے آپ پر سلام لوٹایا اور میں نے آپ کو نہیں سنایا اور چاہا کہ آپ کے سلام سے آپ کی برکت سے کثرت حاصل کروں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر کے اندر لے گئے۔ پھر منقیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھائی، پھر جب فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا پڑھی: « أَكَلَ طَعَامَكَ الْأَبْرَارُ، وَصَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَأَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ »[2] یعنی نیک لوگ تمھارا کھانا کھاتے رہیں، فرشتے تمھارے واسطے بخشش مانگتے رہیں اور روزے دار تمھارے پاس افطار کرتے رہیں۔

امام ابو داود اور نسائی نے قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ملاقات کے لیے ہمارے گھر میں تشریف لائے تو فرمایا: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“ سعد رضی اللہ عنہ نے آہستہ سے سلام کا جواب دیا۔ قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذن نہیں دیتے ہو؟ تو سعد رضی اللہ عنہ نے کہا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥٣)

[2] مسند أحمد (٣/ ١٣٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٢٢٦)

کہ تو چھوڑ اُن کو کہ کثرت سے ہم پر سلام کریں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“، پھر سعد رضی اللہ عنہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“، پھر آپ ﷺ لوٹ گئے اور سعد رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے گئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک میں آپ کے سلام کرنے کو سنتا تھا اور آپ پر آہستہ سے سلام لوٹاتا تھا، تاکہ آپ ہم پر کثرت سے سلام کریں۔ قیس رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ سعد رضی اللہ عنہ کے ہمراہ لوٹ آئے تو سعد رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے لیے آبِ غسل کا حکم دیا، پھر آپ ﷺ نے غسل فرمایا، پھر آپ کو ایک خمیصہ زعفران یا ورس کی رنگی ہوئی دی (خمیصہ، یعنی گلیم سیاہ چہارسو ہر دو سر علم۔ كذا في الصراح. قطیفہ چادر در پیچیدہ مجمع البحار میں ”خمیصہ جونیہ“ کی شرح میں یوں لکھا ہے: ”ثَوْبُ خَزٍّ أَوْ صُوفٍ مُعْلَمٍ وَقَيَّدَ بَعْضُهُمْ بِالسَّوَادِ وَجَمْعُهَا اَلْخَمَائِصُ“ اور ”قطیفہ“ کی شرح میں ہے کہ ”كِسَاءٌ لَهُ خَمَلٌ“[1]۔ ورس ایک زرد گھاس ہے، اس سے کپڑے رنگتے ہیں) لہٰذا آپ نے اس کو اوڑھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں دست مبارک اُٹھائے اور آپ فرماتے تھے: ”اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَاتَكَ وَرَحْمَتَكَ عَلَى آلِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ“ یعنی الٰہی! تو اپنی مغفرت اور رحمت سعد کے گھر والوں پر کر۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے کھانا تناول فرمایا۔ پھر جب آپ ﷺ نے لوٹنے کا ارادہ کیا تو سعد رضی اللہ عنہ آپ کے نزدیک گدھا لائے اس پر ایک قطیفہ ڈال کر اسے نرم کر دیا۔ پھر آپ ﷺ اس پر سوار ہوئے تو سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: قیس! تو رسول اللہ ﷺ کی سواری کے ہمراہ جا۔ قیس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سوار ہو جا تو میں نے انکار کیا۔ پھر فرمایا کہ تو سوار ہو یا لوٹ جا۔ قیس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر میں لوٹ آیا۔[2] یہ حدیث بوجوہِ دیگر روایت کی گئی ہے، چنانچہ یہ جید قوی حدیث ہے۔ والله أعلم.

پھر جاننا چاہیے کہ جو شخص گھر والوں سے اذن چاہے، اسے چاہیے کہ دروازے کے سامنے منہ کر کے کھڑا نہ ہو، لیکن چاہیے کہ دروازہ اس کی دائیں جانب ہو یا بائیں جانب، اس لیے کہ امام ابو داود نے عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت کسی قوم کے دروازے پر آتے تو اپنے منہ کی طرف سے دروازے کا سامنا نہیں فرماتے تھے، لیکن اس کے دائیں کونے سے یا بائیں سے سامنا کرتے اور فرماتے: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ“ یہ اس لیے تھا کہ اس زمانے میں گھروں پر پردے نہ تھے۔[3] (انفرد به أبو داود)

امام ابو داود رحمہ اللہ نے ہزیل سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک شخص آیا، ابو داود کے استاد عثمان بن ابی شیبہ نے کہا ہے کہ وہ سعد تھے۔ نبی ﷺ کے دروازے پر کھڑے رہے۔ اذن مانگتے تھے، چنانچہ دروازے پر قائم ہوئے۔ عثمان نے کہا ہے کہ دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے تو نبی اکرم ﷺ نے اُن سے فرمایا: ”هٰكَذَا عَنْكَ أَوْ هٰكَذَا“

[1] مجمع بحار الأنوار (٢/ ١١٤) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٨٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٨٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٨٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٦٣٨)

یعنی دروازے سے اِدھر اُدھر کھڑا ہو، اذن مانگنا جو ہے، نظر سے ہے۔[1] (وقد رواه أبو داود الطيالسي عن سفيان الثوري عن الأعمش عن طلحة بن مصرف عن رجل عن سعد عن النبيﷺ رواه أبو داود من حديثه)

صحیحین میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر کسی آدمی نے تجھ پر جھانکا بغیر اذن کے، پھر تو نے اس کو ایک کنکری ماری۔ پھر اس کی آنکھ پھوڑ ڈالی تو تجھ پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔[2] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس اس قرض کے مقدمے میں آیا جو میرے باپ پر تھا۔ پھر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کون ہے؟ تو میں نے کہا: ''أَنَا'' یعنی میں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَنَا أَنَا» (یعنی میں میں کہنے سے معلوم نہیں ہوتا کہ کون ہے) گویا آپ ﷺ نے اس کو مکروہ جانا۔[3] اس کو اس لیے مکروہ جانا کہ یہ لفظ اپنے صاحب کی پہچان نہیں کراتا، جب تک کہ اس کا صریح نام نہ لیا جائے یا اس کی کنیت جس کے ساتھ وہ مشہور ہے، وہ نہ بولی جائے، ورنہ پھر آدمی اپنے آپ کو ''أَنَا کے ساتھ تعبیر کرتا ہے، پھر تو جو استیذان، یعنی اجازت لینے کا مقصد ہے وہ اس کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا، یعنی استیناس (پہچان) جس کا آیت میں حکم فرمایا ہے۔

امام عوفی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ استیناس استیذان ہے، اسی طرح اور لوگوں نے کہا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بروایتِ سعید بن جبیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ تو کاتبوں کی خطا ہے۔ حق ''تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا'' ہے۔ (وهكذا رواه هشيم عن أبي بشر و هو جعفر بن إياس عن سعيد عن ابن عباس بمثله) اتنا اور زیادہ کہا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما یوں پڑھا کرتے تھے۔ ''حَتّٰی تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا'' اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت پر پڑھا کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ قول انتہائی غریب ہے۔ امام ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں یوں ہے۔ ''حَتّٰی تُسَلِّمُوا عَلٰی أَهْلِهَا وَتَسْتَأْذِنُوا'' (قال هشيم أخبرنا مغيرة عن إبراهيم) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ ایک روایت ہے۔[4] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[5]

امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ صفوان بن اُمیہ نے فتح مکہ کے زمانے میں کلدہ بن حنبل کو لباء و جدایہ و ضغابیس دے کر بھیجا (لباء پیوسی کو کہتے ہیں، جدایہ ہرن کا چھے یا سات مہینے کا بچہ جو نر ہو یا مادہ، اور ضغابیس ذرا ذرا سی ککڑیاں جمع ضغبوس کی۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک سبزی ہے جو اصول تمام میں اُگتی ہے ہلیون کے مشابہ ہوتی ہے) اور نبی اکرم ﷺ وادی کی بلند جانب تھے۔ کلدہ نے کہا کہ میں نبی اکرم ﷺ پر داخل ہوا اور میں نے نہ سلام کیا اور

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٧٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠١٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥٥)

[4] تفسير الطبري (١٩/ ١٤٥) [5] تفسير الطبري (٩/ ١٤٩)

نہ اذن طلب کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تو لوٹ جا۔ پھر کہہ: السلام علیکم! کیا میں داخل ہوں؟ یہ قصہ اس کے بعد تھا کہ صفوان مسلمان ہو چکے تھے۔[1] (ورواه أبو داود والترمذي والنسائي من حديث ابن جريج به، وقال الترمذي: حديث غريب لا نعرفه إلامن حديثه)

امام ابو داود رحمہ اللہ نے ربعی سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک شخص بنی عامر کے قبیلے کا آیا، رسول اللہ ﷺ پر اس نے اذن طلب کیا اور آپ ﷺ اپنے گھر میں تھے تو اس شخص نے کہا: کیا میں داخل ہوں؟ آپ ﷺ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ تو اس شخص کی طرف نکل اور اس کو اجازت طلب کرنا سکھا، اس سے کہہ کہ وہ اس طرح کہے: ''السلام علیکم، کیا میں داخل ہو جاؤں؟'' پس اس شخص نے سنا اور اسی طرح کہا: یعنی السلام علیکم، کیا میں داخل ہو جاؤں؟ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کو اذن دیا تو وہ داخل ہوا۔[2]

ہُشَیم نے کہا کہ ہم کو منصور نے ابن سیرین سے خبر دی اور ہم کو خبر دی یونس بن عبید نے عمرو بن سعید ثقفی سے اس بات کی کہ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ پر اذن مانگا تو کہا: ''أَأَلِجُ أَوْ أَنَلِجُ؟'' یعنی کیا میں داخل ہوں یا ہم داخل ہوں؟ تو آپ ﷺ نے اپنی روضہ نام لونڈی سے کہا: تو اس شخص کی طرف کھڑی ہو، تو اس کو تعلیم کر، کیوں کہ وہ اچھی طرح سے اذن مانگنا نہیں جانتا۔ پھر اس سے کہہ کہ وہ اس طرح کہے: السلام علیکم! کیا میں داخل ہوں؟ اس شخص نے اس کو سن لیا تو کہا: السلام علیکم! کیا میں اندر داخل ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: داخل ہو۔[3] امام ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سلام کلام سے پہلے ہے۔ ترمذی نے کہا ہے: ''عَنْبَسَةُ ضَعِيفُ الْحَدِيثِ ذَاهِبٌ، وَمُحَمَّدُ بْنُ زَاذَانَ فِي إِسْنَادِهِ نَكَارَةٌ وَضُعْفٌ''[4]

ہشیم نے کہا: مغیرہ نے کہا ہے کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حاجت سے آئے اور گرم کنکروں نے اُن کو تکلیف دی تھی۔ پھر قریش کی ایک عورت کے خیمے پر آئے، کہا: السلام علیکم! کیا میں داخل ہوں؟ اس نے کہا: داخل ہو ساتھ سلامتی کے۔ پھر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے دوہرا کر کہا. تو اس نے بھی دوہرا کر کہا، حالاں کہ وہ دونوں قدموں کے درمیان مراوحہ کرتے تھے، یعنی گرم کنکروں کے مارے ایک قدم کو اُٹھاتے دوسرے کو زمین پر رکھتے تھے، کہا: تو یوں کہہ کہ تو داخل ہو۔ اس نے کہا: داخل ہو، پھر داخل ہوئے،[5] غرض یہ ہے کہ باوجود گرمی کی شدت کے شریعت کے ادب کا پورا پورا خیال رکھا۔

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٤١٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧١٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ١٦٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨١٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٧٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٣٩٧) [3] تفسير الطبري (١٩/ ١٤٦)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٩٩) اس کی سند میں ''عنبسہ بن عبدالرحمٰن اور محمد بن زاذان'' سخت ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٧٣٦) [5] تفسير الطبري (١٩/ ١٤٦)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے خالد بن ایاس سے روایت کیا ہے۔ خالد کہتے ہیں کہ مجھے میری دادی اُم ایاس نے حدیث بیان کی، کہا: میں چار عورتوں میں تھی۔ ہم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر اذن مانگتے تھے۔ کہا کہ ہم داخل ہوں؟ تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نہیں، تم اپنی صاحبہ سے کہو کہ وہ اذن طلب کرے۔ پس اس نے کہا: السلام علیکم! کیا ہم داخل ہوں؟ فرمایا: داخل ہو۔ پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ آیت پڑھی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾[1]

ھشیم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم پر لازم ہے کہ تم اپنی ماؤں اور بہنوں پر داخل ہونے کے لیے اذن مانگو۔ اشعث استاد ھشیم نے عدی بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ انصار کی ایک عورت نے عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک میں اپنے گھر والوں میں اس حال پر ہوتی ہوں کہ نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے اس حال میں دیکھے نہ والد نہ ولد اور حال یہ ہے کہ ہمیشہ مجھ پر میرے گھر والوں سے کوئی مرد داخل ہوتا رہتا ہے اور میں اس حال پر ہوتی ہوں۔ امام عدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پس یہ آیت اتری: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا ﴾۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے عطاء بن ابی رباح کو سنا، وہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے خبر دیتے تھے۔ فرمایا: تین آیتیں ہیں کہ لوگوں نے اُن کا انکار کیا ہے: اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٣] ''بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے۔'' اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اُن میں اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے جو گھر کے لحاظ سے سب سے عظیم تر ہے، یعنی جس کا گھر سب سے بڑا ہے، وہی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت ہے۔ فرمایا: اور کُل ادب کا لوگوں نے انکار کر رکھا ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے عرض کی کہ کیا میں اپنی یتیم بہنوں پر اذن مانگوں جو میری پرورش میں میرے ساتھ ایک گھر میں ہیں؟ فرمایا: ہاں، پھر میں نے ان پر رد کیا، یعنی بات دوبارہ کی تاکہ مجھے رخصت دے دیں تو انکار کیا۔ پھر فرمایا: کیا تو چاہتا ہے کہ ان کو ننگا دیکھے؟ میں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: تو پھر اذن مانگ، کہا: پھر بھی میں نے اُن سے تکرار کی تو فرمایا: کیا تو دوست رکھتا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرے؟ میں نے کہا: ہاں، فرمایا: تو پھر اذن مانگ۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ امام ابن طاؤس نے مجھے اپنے باپ سے خبر دی، کہا کہ مجھے اس سے زیادہ ناپسند کوئی بات نہیں کہ میں کسی عورت کی شرم گاہ دیکھوں یا ایسا عضو دیکھوں جس کا دیکھنا مرد کو درست نہیں ہے، خواہ وہ عورت ذات محرم ہو، یعنی جس سے شرعاً پردہ نہیں ہے، جیسے ماں، بہن، بھانجی اور بھتیجی وغیرہ۔ کہا: وہ اس بارے میں سختی کرتے تھے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے زہری رحمہ اللہ سے روایت کی ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے ہزیل بن شرحبیل اُودی اعمیٰ کو سنا، ہزیل نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ تمھارے لیے لازمی ہے کہ اپنی ماؤں پر داخل ہونے کے لیے بھی اذن مانگو۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے عطاء سے کہا: کیا مرد اپنی بیوی پر داخل

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٦٩)

ہونے کے لیے اذن طلب کرے؟ کہا: نہیں۔[1] یہ قول اس پر محمول ہے کہ اذن طلب کرنا واجب نہیں ہے، ورنہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کو اپنے داخل ہونے کی اطلاع کر دے اور اچانک اس کے پاس نہ چلا جائے، کیوں کہ اس بات کا احتمال ہے کہ بی بی ایسی حالت میں ہو کہ اس حالت میں وہ پسند نہیں کرتی کہ اس کا خاوند اسے دیکھے۔

امام ابو جعفر ابن جریر نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ بی بی زینب سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ جس وقت کسی ضرورت کے لیے آتے، پھر دروازے تک پہنچتے تو کھنکارتے اور تھوکتے، کیوں کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ ہم پر اچانک ایسی حالت میں آ جائیں جو اُن کے لیے مکروہ ہو۔[2] اسناد اس کی صحیح ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو ہبیرۃ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ جس وقت گھر میں داخل ہوتے تو استیناس کرتے، بات کرتے اور اپنی آواز بلند فرماتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "حَتّٰی تَسْتَأْنِسُوْا: قَالَ: تَنَحْنَحُوْا أَوْ تَنَخَّمُوْا" یعنی یہاں تک کہ کھنکارو یا ناک سنکو۔[3] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جس وقت مرد اپنے گھر میں داخل ہو تو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ کھنکارے یا اپنی جوتیوں کو حرکت دے دے۔

مطلب یہ ہے کہ کھنکارنے سے یا جوتے کی آواز سے گھر والوں کو اطلاع ہو جائے تو وہ درست اور ہوشیار ہو جائیں اور اسی لیے صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے منع فرمایا ہے کہ مرد اپنے گھر والوں پر رات کو آئے۔ (اصل الفاظ یہ ہیں: «نَهٰى أَنْ يَّطْرُقَ الرَّجُلُ أَهْلَهُ طُرُوْقًا» طروق کہتے ہیں رات کے آنے کو، مطلب یہ ہے کہ کہیں سفر میں گیا ہو تو رات کو بغیر اطلاع اپنے گھر نہ آئے۔) ایک روایت میں یہ ہے: تاکہ ان کو خیانت کی طرف منسوب نہ کرے۔[4] دوسری حدیث شریف میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں دن کو تشریف لائے تو مدینے کے باہر اُونٹ بٹھائے اور فرمایا: انتظار کرو، یہاں تک کہ ہم آخر دن میں داخل ہوں، تاکہ پریشان بالوں والی عورت کنگھی کر لے اور جس کا خاوند غائب رہا ہے تو وہ استرہ کر لے۔[5] مطلب یہ ہے کہ عورتیں بناؤ سنگھار کر لیں، تاکہ خاوندوں کی نظر میں بھلی معلوم ہوں تو باہمی محبت وانس زیادہ ہو۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ سلام، یعنی اس کو تو ہم سمجھ گئے۔ پھر استیناس کیا ہے؟ فرمایا: مرد کلام کرے ایک تسبیح کے یا ایک تکبیر کے یا ایک تحمید کے ساتھ اور کھنکارے تو گھر والوں کو آگاہ کر دے۔ تفسیر ابن کثیر میں اسی طرح ہے، لیکن فتح البیان اور فتح القدیر میں بروایت ابن ابی شیبہ اور طبرانی وغیرہما اس طرح ہے: "قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَأَيْتَ قَوْلَ اللّٰهِ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوْا

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٤٧۔ ١٤٨) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٤٨) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٦٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١٥)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١٥)

وَتُسَلِّمُوْهَا عَلَى أَهْلِهَا، هَذَا التَّسْلِيْمُ قَدْ عَرَفْنَاهُ فَمَا الِاسْتِئْنَاسُ؟" الخ یہ حدیث غریب ہے۔[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے ﴿ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ تین بار اذن طلب کرنا ہے، لہٰذا جس شخص کو ان میں سے اذن نہ ملے تو چاہیے کہ لوٹ جائے۔ "أَمَّا الْأُوْلَى: فَلْيُسْمِعِ الْحَيَّ، وَأَمَّا الثَّانِيَةُ: فَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ، وَأَمَّا الثَّالِثَةُ: فَإِنْ شَاءُوْا أَذِنُوْا وَإِنْ شَاءُوْا رَدُّوْا" یعنی پہلی بار کا اذن مانگنا اس لیے ہے کہ قبیلے کو سنائے۔ دوسرا اس واسطے ہے کہ اپنا بچاؤ لے لیویں، یعنی درست و مہیا ہو جائیں۔ تیسرا اس لیے ہے کہ چاہیں اذن دیں، چاہیں پھیریں۔ اور مت ٹھہر تو اُن لوگوں کے دروازے پر جنھوں نے تجھے پھیر دیا اپنے دروازے سے، کیوں کہ لوگوں کی ضروریات اور شغل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ عذر قبول کرنے میں اولیٰ تر ہے۔

امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ جاہلیت میں آدمی جس وقت اپنے دوست سے ملتا تو اس کو سلام نہ کرتا اور کہتا: "حُيِّيْتَ صَبَاحًا وَحُيِّيْتَ مَسَاءً" یعنی تو زندہ رہے صبح کو اور زندہ رہے شام کو۔ اُن کے درمیان قوم کا سلام یہ تھا۔ ان میں جب کوئی اپنے دوست کی طرف جاتا تھا تو اذن طلب نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ بے دھڑک داخل ہو جاتا اور کہتا کہ میں داخل ہوگیا۔ یہ بات آدمی پر شاق گزرتی تھی اور شاید وہ اپنی بی بی کے ساتھ ہوتا تو اللہ پاک نے اس سب کو ستر اور پاک دامنی میں تبدیل کر دیا اور میل کچیل و گندگی سے اس کو صاف پاک ستھرا کر دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا ﴾[2] اور یہ بات جو مقاتل رحمہ اللہ نے کہی بہتر ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ یعنی اذن طلب کرنا بہتر ہے تمھارے لیے اس معنی میں کہ وہ طرفین کے لیے بہتر ہے، یعنی اذن مانگنے والے کے لیے اور گھر والوں کے لیے ﴿ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ تا کہ تم یاد رکھو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ﴾ یہ اس لیے ہے کہ اس میں دوسرے کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف ہے۔ پس اگر وہ چاہے اجازت دے چاہے نہ دے۔ ﴿ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا ﴾ یعنی جس وقت وہ تم کو دروازے سے پھیریں اذن سے پہلے یا اذن کے بعد تو تم پھر جاؤ۔ ﴿ هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ﴾ یعنی یہ تمھارا پھر جانا تمھارے واسطے پاک تر ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "قَالَ بَعْضُ الْمُهَاجِرِيْنَ: لَقَدْ طَلَبْتُ عُمْرِيْ كُلَّهُ هَذِهِ الْآيَةَ فَمَا أَدْرَكْتُهَا: أَنْ أَسْتَأْذِنَ عَلَى بَعْضِ إِخْوَانِيْ فَيَقُوْلُ لِيْ: اِرْجِعْ، فَأَرْجِعُ وَأَنَا مُغْتَبِطٌ لِقَوْلِهِ: ﴿ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾۔

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٠٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٧٢) فتح البيان (٩/ ١٩٧) فتح القدير (٤/ ٢٩) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٦٧) اس کی سند میں "ابوسورۃ اور واصل بن سائب" سخت ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة: ٦٣٧٠)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٦٥۔ ٢٥٦٦)

(فتح القدیر میں اس کو بہ تخریج ابو یعلی و ابن جریر و ابن مردویہ بروایتِ انس رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، مگر اتنا فرق ہے کہ اس میں "فِيْ هٰذِهِ الْآيَة" اور "أَنَا مُغْتَبِطٌ لِقَوْلِهِ" ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ قتادہ نے کہا: بعض مہاجرین نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی ساری عمر اس آیت پر عمل کرنے کی خواہش کی۔ پھر میں نے اس کو نہ پایا، یعنی یہ کہ میں اپنے بعض بھائیوں سے اذن طلب کروں۔ پھر وہ مجھ سے کہے کہ لوٹ جا۔ پھر میں لوٹ آؤں، خوش ہوتا ہوا اللہ پاک کے اس قول سے ﴿وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ... الخ﴾[1] از مصحح سلمه الله تعالیٰ۔) امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم لوگوں کے دروازوں پر مت ٹھہرو۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ﴾ یہ آیتِ کریمہ اگلی آیت سے خاص تر ہے، کیوں کہ یہ اس کی مقتضی ہے کہ جن گھروں میں کوئی نہیں ہے اُن میں بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے، جبکہ اُن میں اس کے لیے متاع ہو، جیسے: وہ گھر جو مہمانوں کے لیے تیار کیا گیا ہے، جبکہ پہلی دفعہ اس میں داخل ہونے کا اذن دے دیا ہے تو کافی ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تم داخل نہ ہو کسی گھر میں سوائے اپنے گھر کے۔ پھر اس کو منسوخ کیا اور استثناء فرمایا کہ ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ ... الخ﴾ اسی طرح امام عکرمہ اور حسن بصری رحمہما اللہ سے بھی مروی ہے۔[3] دوسروں نے کہا ہے کہ اُن گھروں سے تاجروں کے گھر مراد ہیں، جیسے: مسافر خانے اور مکہ مکرمہ کے گھر وغیرہ۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور ایک جماعت سے اس کی حکایت کی ہے۔[4] پہلا قول ظاہر تر ہے۔ واللہ أعلم۔ امام مالک نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ بیوتِ شعر ہیں۔[5]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم اُن گھروں میں داخل نہ ہو جن کے تم مالک نہیں ہو اور نہ اُن میں رہتے بستے ہو، نہ اُن پر تمھارا شرعی قبضہ ہے۔ رہا کرایہ پر لینے والا اور عاریتاً لینے والا تو یہ دونوں اپنے گھر میں داخل ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کرایہ کا گھر یا عاریت کا گھر اگرچہ کرایہ پر لینے والے اور عاریتاً لینے والے کی ملکیت نہیں ہے، لیکن چوں کہ قبضہ شرعی ہے، اس لیے گویا وہ اسی کا گھر ہے تو وہ اس میں بے اذن داخل ہوگا۔ معنی یہ ہیں کہ غیر کے گھروں میں تم مت داخل ہو اس غایت تک اور وہ یہ ہے کہ ﴿حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا﴾۔ استئناس استعلام و استخبار کو کہتے ہیں، یعنی یا طلبِ علم و طلبِ خبر کرنا، یعنی یہاں تک کہ طلبِ علم کرو اس شخص کا علم جو گھر میں ہے۔ معنی یہ ہیں:

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ١٥٠) فتح القدیر (٤/ ٣٠) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٦٨) [3] تفسیر الطبري (١٩/ ١٥٣)
[4] تفسیر الطبري (١٩/ ١٥٢) [5] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٦٩۔ ٣٧٣)

یہاں تک کہ تم اس بات کو جان لو کہ گھر والے کو تمھارا علم ہو گیا ہے اور جان لو کہ اس نے تمھارے داخل ہونے کا اذن دے دیا ہے، پھر جب تم اس بات کو جان لو تو داخل ہو جاؤ۔

اسی معنی میں یہ آیت ہے: ﴿ فَإِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا ﴾ [النساء: ٦] ''پھر اگر تم انھیں سمجھ دار پاؤ۔'' خلیل نے کہا ہے کہ استیناس استکشاف کو کہتے ہیں، یعنی طلبِ کشف کرنا، ماخوذ ہے اس محاورے سے کہ جب کوئی شخص کسی شے کو دیکھ لیتا ہے تو بولتے ہیں: ''أَنِسَ الشَّيْءَ'' جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ إِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ﴾ [القصص: ٢٩] ''بے شک میں نے آگ دیکھی ہے۔'' امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گردانِ فعل کی اس سے منع کرتی ہے کہ ''أَنِسَ'' سے ہو۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَسْتَاْنِسُوْا ﴾ بہ معنی ''تُؤنِسُوْا أَنْفُسَکُمْ'' ہے، یعنی تم اپنی جانوں کو مانوس کرو۔ اس قول کے معنی یہ ہیں کہ ﴿ تَسْتَاْنِسُوْا ﴾ اس استیناس سے ہے جو خلافِ استیحاش ہے، کیوں کہ جو شخص غیر کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ اس کو اذن ملے گا یا نہیں، لہٰذا وہ مثل متوحش کے ہے، یہاں تک کہ اسے اذن ملے۔ پھر جب اذن ملا تو وحشت جاتی رہی، وہ مانوس ہو گیا۔ چنانچہ اللہ پاک نے اُن گھروں میں داخل ہونے سے منع فرمایا، یہاں تک کہ داخل ہونے والے کو اذن دیا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''اُنس'' سے ماخوذ ہے۔ ''اُنس'' یہ ہے کہ اس بات کو معلوم کرے کہ وہاں کوئی آدمی ہے یا نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ استیناس کے معنی استیذان ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کی جماعت نے کہا ہے کہ ''حَتّٰی تَسْتَأْذِنُوْا'' امام قرطبی رحمہ اللہ نے جو ابن عباس، ابی رضی اللہ عنہم اور امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے حتی ''حَتّٰی تَسْتَأْذِنُوْا'' پڑھا ہے تو یہ اس کا مؤید ہے کہ استیناس بہ معنی استیذان ہے۔ امام ابن وہب رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے کہ ہم جو دیکھتے ہیں اس میں استیناس۔ واللہ أعلم۔ استیذان ہے، یعنی ہماری رائے میں استیناس بہ معنی استیذان ہے۔[1]

امام طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ استیناس یہ ہے کہ تو خادم کو پکارے، حتی کہ گھر والے مستانس ہو جائیں، جن پر تو سلام کرتا ہے۔[2] صحیحین وغیرہما میں حدیث سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں ایک سوراخ میں سے جھانکا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مِدریٰ (مدریٰ کے معنی سیخ کے ہیں یا شاخ باریک کہ زنان بوے موئے سر راست کنند۔ (کذا في الصراح) مجمع البحار میں یوں ہے: ''شَيْءٌ یُعْمَلُ مِنْ حَدِیْدٍ أَوْ خَشَبٍ عَلٰی شَکْلِ سِنٍّ مِنْ أَسْنَانِ الْمُشْطِ أَوْ أَطْوَلَ مِنْهُ یُسَرَّحُ بِهِ الشَّعْرُ الْمُتَلَبِّدُ وَیَسْتَعْمِلُهُ مَنْ لَّا مُشْطَ لَهُ''[3]) تھا، جس سے آپ اپنے سر مبارک کو

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٧) تفسير القرطبي (١٢/ ٢١٣)

[2] المعجم الكبير (٤/ ١٧٨) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجۂ ضعف ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٣٧٠)

[3] مجمع بحار الأنوار (٢/ ١٧٠)

کھجا رہے تھے۔ فرمایا: اگر میں جانتا کہ تو دیکھ رہا ہے تو البتہ میں تیری دونوں آنکھوں میں اس سے جونکا لگاتا۔ اذن طلب کرنا جو ٹھہرایا گیا ہے تو وہ دیکھنے کے واسطے ہے۔ ایک لفظ میں یوں ہے: «إِنَّمَا جُعِلَ الْإِذْنُ مِنْ أَجْلِ الْبَصَرِ»[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ سلام کا بیان خود نبی اکرم ﷺ نے یوں فرمایا ہے کہ کہے: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَ أَدْخُلُ؟» ایک بار یا تین بار۔[2] اس کا ذکر پہلی حدیثوں میں ہو چکا ہے۔ اس میں اختلاف کیا ہے کہ آیا استیذان سلام پر مقدم کیا جائے یا سلام استیذان پر۔ چنانچہ کسی نے یوں کہا ہے کہ استیذان پہلے کرے سلام سے، اس طرح کہے: "أَ أَدْخُلُ؟ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ" اس لیے کہ آیت میں استیناس پہلے آیا ہے سلام سے۔ اکثر کا قول یہ ہے کہ سلام کو استیذان سے پہلے یوں کہے: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَ أَدْخُلُ؟"، حق یہی ہے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کا بیان اسی طرح مروی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر اس کی نگاہ کسی انسان پر پڑ جائے تو سلام کو مقدم کرے، ورنہ استیذان کو پہلے کرے۔

﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ کا اشارہ استیناس اور سلام کرنے کی طرف ہے، یعنی تمھارا داخل ہونا استیذان وسلام کے ساتھ۔ ﴿ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ تمھارے واسطے بہتر ہے، بے دھڑک اچانک بغیر اجازت داخل ہونے سے۔ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی شاید تم یاد رکھو اس بات کو کہ تمھارے لیے اذن طلب کرنا بہتر ہے۔ یہ جملہ متعلق ہے مقدر سے "أَيْ: أُمِرْتُمْ بِالْاِسْتِئْذَانِ" اور تذکر سے مراد نصیحت پذیر ہونا ہے اور جس کا اُن کو حکم ہوا ہے اس پر عمل کرنا۔

﴿ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ ﴾ یعنی اگر تم نہ پاؤ اُن گھروں میں جو تمھارے غیر کے ہیں ﴿ اَحَدًا ﴾ کسی کو ان لوگوں میں سے جن پر اذن طلب کیا جاتا ہے اور وہ اذن دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یا کوئی ایسا ہو، لیکن اذن نہ دے، یا بالکل اُن میں کوئی نہ ہو۔ ﴿ فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ﴾ تو تم اُن میں مت داخل ہو، یہاں تک کہ تم کو اذن دیا جائے داخل ہونے کے لیے، اس شخص کی طرف سے جو اذن کا مالک ہے، کیوں کہ داخل ہونے کی ممانعت صرف پوشیدہ چیزوں پر مطلع ہونے کی وجہ سے ہی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ لوگ عادتاً جس بات کو مخفی رکھنا چاہتے ہیں اس پر مطلع ہونے کی بھی ممانعت ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک یہ بات ہے کہ کسی غیر کی ملکیت پر اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا، یعنی اس پر اختیار رکھنا ممنوع ہے۔ اس سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ گھر میں آگ لگی ہے، یا کوئی ڈوب رہا ہے، یا اس میں کوئی ممنوعہ چیز، یا اس کے مثل کوئی اور چیز ہے تو بغیر اذن جانا درست ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اگر تمھارے لیے اُن میں کوئی متاع نہ ہو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو ضعیف کہا ہے[3] اور یہ ضعف کے لائق بھی ہے، کیوں کہ لفظِ احد

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥٦)

[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسير الطبري (١٩/ ١٥٠)

سے مراد آیت میں مذکور گھر والے ہیں، جو غیر کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں، گھر کی طرف داخل ہونے والوں کا فائدہ مراد نہیں ہے۔ ﴿وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا﴾ یعنی اگر گھر والے تم سے کہہ دیں کہ لوٹ جاؤ تم تم لوٹ جاؤ۔ دوبارہ ان سے اذن مت مانگو اور اس کے بعد کہ وہ تم سے لوٹ جانے کو کہہ چکے تو تم اذن دینے کا انتظار مت کرو اور دروازے پر چمٹے ہوئے مت ٹھہرو۔

پھر اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ لوٹ جانا اس سے بہتر ہے کہ استیذان پر اصرار اور تکرار کیا جائے اور وہ دروازے پر بیٹھا رہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ﴾ یعنی لوٹ جانا تمھارے واسطے افضل اور زیادہ پاک ہے، اس سے کہ داخل ہونے کے لیے جھگڑا کر کے اپنی آبرو وعزت کو داغ دار کرو اور اصرار وعناد کرو اور دروازوں پر جمے رہو، کیوں کہ لوٹ جانے میں سینے کی صفائی ہے اور تہمت سے دوری ہے اور دناءت و رذالت وخست سے بھاگنا ہے۔ اور جس وقت کوئی شخص دروازے کی طرف آئے، پھر اذن طلب نہ کرے اور دروازے پر منتظر بیٹھ جائے تو جائز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما انصار کے گھروں پر حدیث کی طلب میں آیا کرتے تھے تو دروازے پر بیٹھ جاتے اور اذن طلب نہ کرتے، یہاں تک کہ وہ شخص اُن کی طرف نکلتا، پھر اُن کو دیکھتا اور کہتا: اے ابنِ عم رسول اللہ ﷺ کاش! آپ مجھے اپنے موجود ہونے کی خبر فرماتے۔ وہ کہتے کہ ہم اسی طرح حکم کیے گئے ہیں کہ علم کو طلب کریں۔[1] ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ یعنی تمھارے اعمال سے کوئی مخفی شے بھی اللہ پاک پر پوشیدہ نہیں ہے اور اُن میں سے داخل ہونا ہے اذن سے اور بغیر اذن کے۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ﴾ یعنی تم پر اُن گھروں میں بغیر اذن کے داخل ہونے میں کوئی گناہ نہیں جو کسی خاص طائفہ کے رہنے کے لیے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ وہ اس لیے موضوع ہیں کہ وہ جس حاجت کے لیے ہیں، وہ حاجت جس کسی کو ہو تو وہ اُن میں داخل ہو۔ لوگوں نے اختلاف کیا ہے کہ اُن گھروں سے کیا مراد ہے۔ چنانچہ محمد بن حنفیہ، قتادہ اور مجاہد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ وہ فنادیق ہیں (جمع "فُنْدُق" بروزن "قُنْفُذ" دکانِ راہ) جو چلتے ہوئے راستوں میں مسافروں کے لیے بنائے جاتے ہیں، راہ گیر اُن میں پناہ لیتے ہیں۔ امام ابن زید اور شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دکانہائے قیساریات وخانہائے تجار و دکانہائے تجار ہیں بازاروں میں اور رباطین، یعنی سرائیں۔

امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس واسطے کہ تاجر لوگ بیع کا سامان لاتے ہیں اور اُن میں رکھتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں: آؤ۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: ان گھروں سے مراد اُجاڑ گھر ہیں، جن میں لوگ پیشاب و پاخانے کے واسطے داخل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس میں بھی ایک متاع ہے، یعنی منفعت۔ کسی نے کہا ہے کہ مکہ مکرمہ کے گھر ہیں۔ یہ قول محمد بن حنفیہ سے بھی مروی ہے اور یہ اس شخص کے قول کے مطابق ہے جس نے کہا ہے کہ لوگ مکے کے گھروں میں شریک ہیں،

[1] تفسير البغوي (٦/ ٣١)

لیکن اللہ پاک نے اُن گھروں کو جن کا ذکر اس جگہ کیا ہے اس بات کے ساتھ مقید فرمایا ہے کہ وہ غیر مسکونہ ہیں۔

﴿ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ﴾ اہلِ لغت کے نزدیک متاع منفعت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اُن میں تمھارے واسطے منفعت ہو، مثلاً: گرمی سردی سے بچاؤ حاصل کرنا، کجاووں اور سامان کا رکھنا، خرید وفروخت کرنا۔ اسی معنی سے "وَمَتِّعُوهُنَّ" ہے اور عرب کا قول "أَمْتَعَ اللّٰهُ بِكَ"، یعنی اللہ تجھ سے نفع دے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے اپنے کلامِ متقدم میں متاع کی تفسیر اعیان کے ساتھ کی ہے، یعنی سامان بیع کا جو بیچا جاتا ہے۔ جابر بن زید نے کہا ہے کہ مراد متاع ہے "جھاز"، نہیں ہے، ("جھاز" بالفتح والکسر رخت عروس و مسافر و مردہ) لیکن اور حاجت جو اس کے سوا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول بہتر ہے لغت کے موافق ہے۔[1] (كذا في الصراح) غرض یہ ہے کہ متاع سے یہاں مراد خاص سامان مسافر وتجار وغیرہ نہیں ہے، بلکہ مطلق منفعت مراد ہے۔ کسی قسم کا نفع ہو۔)

﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴾ یعنی اللہ جانتا ہے جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو چھپاتے ہو۔ اس میں اس شخص کے لیے وعید ہے جو غیر کے گھروں میں داخل ہونے کے لیے اللہ پاک کے بتائے ہوئے آداب کا خیال نہیں کرتا۔ پھر جب اللہ پاک نے اذن طلب کرنے کا حکم بیان فرمایا تو اس کے بعد نظر کے بارے میں بالعموم حکم کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد کیا:[2]

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿٣٠﴾

(اے نبی!) آپ مومن مردوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے بہت پاکیزہ (عمل) ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں، بلاشبہ اللہ اس سے خوب باخبر ہے (30)

مومنوں کو نظریں پست رکھنے کا حکم:

تھامتے رہیں ستر، یعنی نہ کسی کا ستر دیکھیں نہ اپنا ستر دکھائیں اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے، یعنی اللہ کو ان باتوں کی خبر ہے جو وہ کفریہ رسمیں کرتے ہیں۔ انتہٰی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے اپنے مومن بندوں کو اس بات کا حکم ہے کہ اپنی آنکھوں کو اس چیز سے پست کریں جس کو اُن پر حرام کیا ہے۔ لہٰذا وہ نہ نظر کریں، مگر صرف اس شے کی طرف جس کی طرف نظر کرنا اُن کو مباح فرمایا ہے اور اپنی آنکھیں حرام کی گئی چیزوں سے نیچی کریں۔ پھر اگر اتفاقاً کسی محرم پر نظر پڑ جائے بغیر ارادے کے تو چاہیے کہ جلدی اپنی نگاہ کو اس سے پھیر لے، جس

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٨)
[2] فتح البيان (٩/ ١٩٦۔ ٢٠٠)

طرح کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک کی نظر کا پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے امر فرمایا کہ اپنی نگاہ کو پھیر لو۔[1] (رواه الإمام أحمد عن هشيم عن يونس بن عبيد به، و رواه أبو داود والترمذي و النسائي من حديثه أيضا، وقال الترمذي: حسن صحيح)

بعض کی روایت میں یوں ہے کہ "أَطْرِقْ بَصَرَكَ"، یعنی تو اپنی نگاہ کو نیچا کر لے۔ مراد یہ ہے کہ زمین کی طرف نظر کر لے۔ لفظ "صرف" "إطراق" سے عام تر ہے، کیوں کہ "صرف" کبھی زمین کی طرف ہوتا ہے اور کبھی اور سمت کی طرف، یعنی "إطراق" کے برعکس کہ وہ زمین ہی کی طرف ہوتا ہے۔ واللہ أعلم۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «يَا عَلِيُّ! لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ» اے علی! تو تابع مت کر نظر کو نظر کے، کیوں کہ تیرے واسطے پہلی نظر ہے اور نہیں ہے تیرے لیے دوسری نظر۔ مطلب یہ ہے کہ اول نظر جو اتفاق سے پڑ گئی، وہ معاف ہے، اس کے بعد پھر نظر کرے گا تو پکڑ ہوگی۔[2] (ورواه الترمذي من حديث شريك وقال: غريب لا نعرفه إلا من حديثه)

صحیح میں سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ عَلَى الطُّرُقَاتِ» یعنی تم راہوں میں بیٹھنے سے بچو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم کو تو اپنی مجلسوں کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہم اُن میں بیٹھتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم مانتے نہیں ہو تو راستے کو اس کا حق دو۔ عرض کی کہ راستے کا حق کیا ہے، اے اللہ کے رسول؟! فرمایا: نیچے کرنا نگاہ کا، روکنا ایذا کا، یعنی ایذا دینے والی چیز کا راستے سے ہٹا دینا، سلام کا جواب دینا، نیک بات کا حکم کرنا اور بری بات سے منع کرنا۔[3]

امام ابو القاسم بغوی رحمہ اللہ نے فضل بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ میں نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ کو سنا، کہتے تھے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے کہ تم مجھے چھ چیزوں کی ضمانت دے دو تو میں تمھارے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں: جب تم میں سے کوئی بات کرے تو جھوٹ نہ بولے اور جب وہ امین بنایا جائے تو خیانت نہ کرے اور جب وعدہ کرے تو خلاف نہ کرے اور نیچی کرو تم اپنی آنکھوں کو اور روکو اپنے ہاتھوں کو اور تھامتے رہو تم اپنی شرم گاہوں کو۔[4] صحیح بخاری میں ہے کہ جو شخص مجھے اس چیز کی ضمانت دے جو اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان ہے اور اس چیز کی جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے تو میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔[5]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥٩) مسند أحمد (٤/ ٣٥٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٨) سنن الترمذي (٢٧٧٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٧٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٥٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٢١)

[4] المعجم الكبير (٨/ ٢٦٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٢٢٥) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٨)

عبدالرزاق رحمہ اللہ نے بروایت ابن سیرین عبیدہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ہر وہ شے جس کے ساتھ اللہ کی نافرمانی کی جائے، وہ کبیرہ ہے اور اللہ پاک نے دو طرفوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: کہہ دے مومنوں کو کہ نیچی کریں اپنی آنکھیں۔[1] اور چوں کہ نظر فسادِ قلب کی طرف بلانے والی تھی، جیسا کہ بعض سلف نے کہا ہے کہ نظر دل کی طرف زہر کا تیر ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے شرمگاہوں کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے۔ جس طرح کہ آنکھوں کی حفاظت کا حکم کیا ہے جو اس کی طرف جانے کا باعث ہیں۔

چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ﴾ اور شرم گاہ کی حفاظت کبھی تو یوں ہوتی ہے کہ اس کو زنا سے روکے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ٥۔ ٦] ''اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ، تو بلاشبہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں۔'' اور کبھی اس طرح ہوتی ہے کہ اس کی طرف دیکھنے سے اس کو محفوظ رکھے، جیسا کہ مسند احمد وسنن کی حدیث میں آیا ہے کہ تو اپنے ستر کو محفوظ رکھ، مگر اپنی بی بی سے اور اپنی ملک یمین، یعنی لونڈی سے۔[2]

﴿ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ﴾ یعنی آنکھوں کا نیچے رکھنا اور ستر کا محفوظ رکھنا اُن کے دلوں کو بڑا پاک رکھنے والا ہے۔ اور اُن کے دین کو نہایت صاف رکھنے والا ہے، چناں چہ کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی نگاہ کو محفوظ رکھتا ہے تو اللہ اس کو اس کی بصیرت میں ایک نور کا وارث کرتا ہے۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ اس کے دل میں ایک نور کا وارث کرتا ہے۔ امام رحمہ اللہ (ابن کثیر رحمہ اللہ میں اسی طرح ہے شاید لفظِ احمد رحمہ اللہ رہ گیا ہو)[2] نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے کوئی مسلمان کہ کسی عورت کے محاسن کی طرف، یعنی اس کی خوبیوں اور اس کے حسن وجمال کی طرف نظر کرے۔ پھر اپنی نگاہ کو نیچا کرلے، مگر اللہ اس کے واسطے خلیفہ کرے گا، یعنی اس کے عوض میں دے گا ایک ایسی عبادت کہ وہ اس کی مٹھاس پائے گا۔ یہ حدیث ابن عمر، حذیفہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً بھی روایت کی گئی ہے، لیکن اس کی سندوں میں ضعف ہے، مگر یہ حدیثیں ترغیب میں ہیں اور ترغیب میں ایسے ضعف سے درگزر کی جاتی ہے۔[3]

طبرانی میں سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: « لَتَغُضُّنَّ أَبْصَارَكُمْ، وَلَتَحْفَظُنَّ فُرُوجَكُمْ،

---

[1] مصنف عبد الرزاق (١٠/ ٤٦٠)

[2] مسند أحمد (٥/ ٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠١٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٦٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٢٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٣)

[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٧٤) [4] مسند أحمد (٥/ ٢٦٤) حلية الأولياء (٦/ ١٠١) مستدرك الحاكم (٤/ ٣٤٩)

وَلَتُقِيمُنَّ وُجُوهَكُمْ أَوْ لَتُكْسَفَنَّ وُجُوهُكُمْ» [1] یعنی البتہ تم نیچی کرو اپنی آنکھوں کو، اور البتہ تھامتے رہو اپنے ستر کو اور البتہ قائم کرو اپنے مونہوں کو، (یعنی راہ چلنے میں اپنے منہ سیدھے رکھو، اِدھر اُدھر مت دیکھو، جس طرح کتا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، شیر کی طرح آنکھیں پست کیے ہوئے منہ سیدھا رکھے ہوئے چلو۔ واللہ أعلم۔) ورنہ البتہ تغیر کر دیے جائیں گے تمھارے منہ۔ طبرانی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر ہے، جو شخص اس کو میرے خوف سے چھوڑ دے، «أَبْدَلْتُهُ إِيمَانًا» تو میں اس کے بدلے میں ایمان دوں گا کہ وہ اپنے دل میں اس کی مٹھاس پائے گا۔ [2] (حدیث قدسی معلوم ہوتی ہے، گو یہاں تصریح نہیں فرمائی ہے۔ واللہ أعلم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴾ مثل اس آیتِ کریمہ کے ہے: ﴿ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ﴾ [المؤمن: ۱۹] ''وہ جانتا ہے خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور اسے بھی جو سینے چھپاتے ہیں۔'' صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابن آدم پر زنا سے اس کا حصہ لکھا گیا ہے وہ اس کو ضرور پائے گا، چنانچہ آنکھوں کا زنا نظر ہے اور زبان کا زنا بولنا ہے اور کانوں کا زنا سننا ہے اور ہاتھوں کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا قدم ہے (اصل حدیث کا لفظ ''خُطی'' ہے ''خُطی'' جمع ہے ''خُطْوَةٌ'' کی۔ ''خُطْوَةٌ'' وہ مسافت ہے جو دو قدم کے درمیان ہوتی ہے، حاصل اس کا ''مشی''، یعنی چلنا ہے، لیکن ''مَشْی'' اور ''خَطَا'' میں ایک فرق ہے، جو غور کرنے سے خوب معلوم ہو سکتا ہے) اور نفس تمنا کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس کو سچا کرتی ہے یا جھوٹا کرتی ہے۔ [3] (رواه البخاري تعليقاً و مسلم مسنداً من وجه أخر بنحو ما ذكر)

سلف میں سے بہت لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اس بات سے منع کیے جاتے تھے کہ مرد اپنی نظر کو نوجوان بے ریش (بغیر ڈاڑھی) لڑکے کی طرف تیز کرے اور ائمہ صوفیہ صافیہ میں سے بہت لوگوں نے اس بارے میں سختی کی ہے اور اہلِ علم کے ایک گروہ نے اس کو حرام کیا ہے، اس لیے کہ اس میں فتنہ میں پڑنا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس بارے میں بہت ہی سختی کی ہے۔ امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن ہر آنکھ رونے والی ہے، سوائے اس آنکھ کے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے نیچی کی گئی، اور وہ آنکھ جو اللہ کی راہ میں بیدار رہی، اور وہ آنکھ جس سے اللہ عز وجل کی خشیت سے مکھی کے سر کے برابر پانی نکلا (یعنی آنسو)۔ [4]

---

[1] المعجم الكبير (۸/ ۲۰۸) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہِ ضعف ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٤٦٥٣)

[2] المعجم الكبير (۱۰/ ۱۷۳) اس کی سند میں ''عبدالرحمٰن بن اسحاق'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ۲/ ۱)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۸۸۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۶۵۷)

[4] حلية الأولياء (۳/ ۱۶۳) تفسير ابن كثير (۳/ ۳۷۳۔ ۳۷۵) اس کی سند میں ''عمر بن صہبان'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱۵۶۲)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ﴾ کے تحت میں یہ بھی مندرج ہے کہ جو شخص کسی کے دروازے پر اذن مانگنے کے لیے کھڑا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی آنکھیں نیچی کرے جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ اجازت لینا دیکھنے ہی کی جہت سے ٹھہرایا گیا ہے۔[1] باوجود اس کے کہ نگاہ نیچی رکھنا غیر مومنین پر بھی واجب ہے، پھر خاص کر مومنین کا ذکر کیوں کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن اپنے غیر سے اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ اُن کے لیے زنا کے ذریعوں کو قطع کیا جائے، جن میں سے ایک نظر ہے اور مومن لوگ اس کے زیادہ لائق ہیں اپنے علاوہ سے، یعنی غیر مومنین سے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ کفار شرعی احکام کے ساتھ مخاطب نہیں ہیں، جیسا کہ بعض اہلِ علم کہتے ہیں، یعنی کفار کو ایمان کا خطاب ہوتا ہے نہ کہ فروعی احکام کا، اسی لیے تو اللہ پاک نے نگاہ نیچی رکھنے کا حکم خاص طور پر مومنین کو فرمایا۔ یہاں عبارت میں حذف ہے۔

تقدیر یہ ہے: ﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ غُضُّوا ﴿ يَغُضُّوا ﴾ یعنی تم مومنوں سے کہہ دو کہ آنکھیں نیچی کرو کہ وہ نیچی کریں اپنی آنکھوں کو۔ غضِ بصر کے معنی پپوٹے کا آنکھ پر اس طرح سے بند کرنا ہے کہ دیکھنے کو روک دے۔ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ ہے۔ اکثر لوگ اس طرف گئے ہیں اور قاضی نے بھی کشاف کی طرح اسی پر اکتفا کیا ہے۔[2] تبعیض کا بیان یوں کیا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ نگاہ کا اس شے سے بند کرنا جو حرام ہے اور قصر کرنا نگاہ کا اس چیز پر جو حلال ہے۔ کسی نے کہا کہ تبعیض کی وجہ یہ ہے کہ ناظر کے واسطے پہلی نظر معاف کی جاتی ہے، جو بغیر ارادے کے پڑتی ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے، سیبویہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جنس کے بیان کے واسطے ہے، اس کے قائل امام ابو البقاء رحمہ اللہ ہیں، لیکن اس پر یوں اعتراض کیا گیا ہے کہ کوئی مبہم پہلے مذکور نہیں ہوا، تا آنکہ اس کی تفسیر کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ سے کی جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ ابتدائے غایت کا ہے۔ یہ قول امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کا ہے۔[3]

امام ابو حیان رحمہ اللہ نے نہر میں اسی پر اقتصار کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "غض" کے معنی نقصان کے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "غَضَّ فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ" "أَيْ: وَضَعَ مِنْهُ" یعنی فلاں نے فلاں سے کم کیا۔ چنانچہ نگاہ جب کہ اپنے عمل سے قدرت نہ دی جائے تو اس سے کم کیا گیا اور نقصان کیا گیا، اس معنی کی بنیاد پر کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ صلہ ہوگا "غض" کا اور چار معنی جو پہلے مذکور ہوئے اُن میں سے کسی معنی کے لیے نہ ہوگا۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ جس شخص کی طرف نظر کرنا حلال ہے اس کے سوا اور کی طرف نظر کرنا حرام ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٨٣) الكشاف (٣/ ٢٣٤) [3] فتح القدير (٤/ ٣١)

﴿ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے، یعنی "مِنْ شَهَوَاتِهِمْ مِمَّا يَكْرَهُ اللّٰهُ"[1] حاصل اس کا یہ ہے کہ جن خواہشوں کو اللہ ناپسند کرتا ہے، ان سے اپنی آنکھوں کو بند کریں۔

﴿ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان پر واجب ہے کہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اس شے سے جو اُن پر حرام ہے اور اُن کے لیے حلال نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ اپنی شرم گاہ کو اس شخص سے چھپانا جس کے لیے اس کا دیکھنا حلال نہیں ہے۔ اگر دونوں معنی مراد لیے جائیں تو کوئی ممانعت نہیں ہے، ہر ایک مطلب شرم گاہ کی حفاظت میں داخل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أَبْصَارِ" میں کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ آیا ہے اور "فروج" میں نہیں آیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نظر میں وسعت کی گئی ہے، کیوں کہ نظر میں سے صرف وہی حرام ہے جس کے استثناء کو بیان کیا گیا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ محارم بی بیوں کے بالوں کی طرف دیکھنے میں کچھ برائی نہیں ہے، نہ اُن کے سینوں کی طرف نظر کرنے میں کچھ خوف ہے۔ اسی طرح وہ لونڈیاں جو بیع کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

بخلاف حفظِ فرج کے کہ اس میں تنگی کی گئی ہے، کیوں کہ فرج سے حلال صرف وہی ہے جس کا استثنا کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کُل غضِ بصر متعذر و مشکل کے مثل ہے بخلاف حفظِ فرج کے، کیوں کہ یہ علی الاطلاق ممکن ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہاں کہیں قرآن شریف میں شرم گاہ کی حفاظت کا ذکر ہے تو اس سے مراد اس کو زنا سے محفوظ رکھنا ہے مگر اس جگہ میں، کیوں کہ یہاں اس سے مراد پردہ کرنا ہے، یہاں تک کہ غیر کی نگاہ اس پر نہ پڑے۔[2] ﴿ ذٰلِكَ ﴾ غضِ بصر اور حفظِ فروج کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿ اَزْكٰى لَهُمْ ﴾ یعنی یہ کام اُن کو تہمت کی تکلیف سے انتہائی پاک کرنے والا ہے اور انھیں اس رذیل خصلت کے ساتھ آلودہ اور متلبس ہونے سے صاف کرنے والا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴾ یعنی اُن کے کام میں سے کچھ بھی اس سے چھپا ہوا نہیں ہے تو وہ اس پر اُن کو جزا دے گا اور اس میں وعید ہے، اس شخص کو جو اپنی نگاہ کو نیچے نہیں کرتا اور نہ اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھتا ہے۔[3]

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ
وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ
عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ
اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ
اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧١) [3] فتح البيان (٩/ ٢٠٠_ ٢٠٢)

الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

اور آپ مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، مگر جو (از خود) اس میں سے ظاہر ہو اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں اور اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ کریں، مگر اپنے خاوندوں پر یا اپنے باپ دادا پر یا اپنے خاوندوں کے باپ دادا پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں (سوتیلے بیٹوں) پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی (مسلمان) عورتوں پر یا اپنے دائیں ہاتھ کی ملکیت (کنیزوں) پر یا عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے نوکر چاکر مردوں پر یا ان لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں (کی چیزوں) سے واقف نہ ہوں اور وہ (عورتیں) اپنے پاؤں (زور زور سے) زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے، وہ (لوگوں کو) معلوم ہو جائے، اور اے مومنو! تم مجموعی طور پر اللہ سے توبہ کرو، تا کہ تم فلاح پاؤ ﴿31﴾

مومن عورتوں کو نگاہ نیچی رکھنے کا حکم اور پردے کے احکام و مسائل کا بیان:

زینت میں سے ظاہر چیز یا ایسی چیز کو کہا، جیسے: چٹے کپڑے اور نئی جوتی، یا یہ کہا کہ عورت کو ناچاری کی حالت میں تھوڑا سا منہ اور ہاتھ کی انگلیاں اور پاؤں کا پنجہ کھولنا درست ہے۔ پھر ہاتھ کی منہدی کھلے یا آنکھ کا کاجل یا انگلی کا چھلّا اور باقی بدن اور زیور کو ڈھانکنا ضروری ہے غیر سے، مگر اپنے محرموں سے چھاتی سے زانوں تک۔ اور اپنی واقف عورتیں جو نیک چال کی ہوں، اُن سے بھی اتنا ضروری ہے۔ اور بدراہ عورتوں سے کنارہ کشی کرنا چاہیے اور وہ کمیرے (نوکر چاکر) جن کو کھانے اور سونے کے سوا اور کوئی غرض نہیں اور شوخی نہیں رکھتے۔ اور دس برس تک کی عمر کا لڑکا اور اپنا غلام بھی محرم ہے بہت سے علما کے نزدیک۔ اور پاؤں کو زور سے مارنے سے گھونگرو وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور باریک کپڑا جس سے بدن نظر آئے ننگے کے برابر ہے، اور اتنا بھی نہ کھلے تو بہتر ہے۔ انتھی[1]۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے مومن بی بیوں کو حکم ہے اور اس کی طرف سے اُن کے خاوندوں کو جو اس کے مومن بندے ہیں غیرت دلائی گئی ہے اور اُن عورتوں کے لیے جاہلیت کے زمانے کی عورتوں کی صفت اور مومن عورتوں کی صفت میں فرق بیان کیا ہے۔ اس آیت کا شانِ نزول وہ ہے جو مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ کہا: واللہ أعلم. ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما نے حدیث بیان

کی کہ اسماء دختر مرشدہ اپنی جگہ میں تھی۔ (ابن کثیر میں الفاظ یہ ہیں: "كَانَتْ فِي مَحَلٍ لَّهَا فِي بَنِي حَارِثَةَ" لیکن اس میں تضعیف معلوم ہوتی ہے کیوں کہ فتح البیان وغیرہ میں "فِي نَخْلٍ لَّهَا فِي بَنِي حَارِثَةَ" ہے، یعنی وہ اپنے خرما کے باغ میں تھیں جو قبیلہ بنی حارثہ میں تھا۔ واللہ أعلم)۔ یہ جگہ قبیلہ بنی حارثہ میں تھی۔ عورتیں ان پر داخل ہونے لگیں، اس حالت میں کہ اپنے تہ بند خوب کس کر نہیں باندھے تھے تو اُن کے پاؤں میں جو پائلیں تھیں وہ کھل جاتی تھیں اور اُن کے سینے اور اُن کی مینڈیاں ظاہر ہوتی تھیں۔ اسماء نے کہا: یہ کیا بری بات ہے، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ ... الآية ﴾[1]

فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے جو اُن پر غیر خاوندوں کی طرف نظر کرنے کو حرام کیا ہے، اس سے اپنی آنکھیں نیچی رکھیں۔ اسی لیے بہت سے علماء اس طرف گئے ہیں کہ عورت کو جائز نہیں ہے کہ وہ اجنبی مردوں کی طرف شہوت کے ساتھ یا بغیر شہوت کے نظر کرے۔ اصلاً نظر کرنا ہی درست نہیں ہے۔ ان علماء میں سے بہت سوں نے اس حدیث سے حجت لی ہے کہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اور میمونہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے پاس تھیں۔ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اس دوران میں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھیں کہ ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ آئے اور آپ ﷺ پر داخل ہوئے، یہ قصہ اس کے بعد تھا کہ ہم کو پردے کا حکم ہو چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے پردہ کرو تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ تو اندھا ہے نہ ہم کو دیکھتا ہے نہ ہم کو پہچانتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم دونوں بھی اندھی ہو، کیا تم اس کو نہیں دیکھتی ہو؟![2] (رواه أبو داود و الترمذي من حديث الزهري عن نبهان مولى أم سلمة أنه حدثه أن أم سلمة حدثته الخ ثم قال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح)

دوسرے علماء اس طرف گئے ہیں کہ عورتوں کا اجنبی مردوں کی طرف بغیر شہوت کے نظر کرنا جائز ہے، جیسا کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حبشیوں کی طرف دیکھنے لگے اور وہ عید کے دن مسجد میں اپنی برچھیوں سے کھیل رہے تھے اور اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے ورے سے، یعنی آپ ﷺ کی اُوٹ سے اُن کی طرف دیکھتی تھیں اور آپ ﷺ اُن کو اُن سے چھپاتے تھے، یہاں تک کہ وہ ملول ہو گئیں اور لوٹ گئیں۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ ﴾ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محفوظ رکھیں اپنے ستر کو فواحش سے۔ قتادہ وسفیان نے کہا کہ اس چیز سے محفوظ رکھیں جو اُن کو حلال نہیں ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زنا سے۔ امام

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١١٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٧٨) اس کی سند میں "نبہان مولیٰ ام سلمہ" مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٩٥٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩٢)

ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر آیت جو قرآن میں نازل ہوئی، جس میں شرم گاہوں کی حفاظت کا ذکر ہے تو وہ زنا سے حفاظت ہے، مگر یہ آیت کہ اس میں شرم گاہوں کی حفاظت سے یہ مراد ہے کہ اُن کو کوئی نہ دیکھے۔[1] یہ قول پہلے بھی گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾ یعنی اپنی زینت میں سے کسی شے کو اجنبی مردوں کے لیے ظاہر نہ کریں، مگر وہ زینت جس کا چھپانا ممکن نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جیسے چادر اور ثیاب۔ مراد وہ کپڑے ہیں جن کا استعمال عرب کی عورتیں کیا کرتی ہیں، یعنی اوڑھنی جو اُن کے کپڑوں کو ڈھانک لیتی ہے اور جو کپڑے اس کے نیچے ہیں وہ ظاہر ہوتے ہیں، اس میں اُن پر کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ اُن کے لیے اس کو چھپانا ممکن نہیں ہے۔ اور اس کی نظیر عورتوں کے کپڑوں میں سے چادر ہے جس کا چھپانا ممکن نہیں۔ اس قول کے قائل حسن و ابن سیرین و ابو الجوزاء و ابراہیم نخعی وغیرہم بھی ہیں۔

امام اعمش رحمہ اللہ نے بروایت سعید بن جبیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ اس کا وجہ، یعنی چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں اور انگوٹھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، امام عطاء، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو الشعثاء، ضحاک اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی اسی طرح مروی ہے اور اس بات کا احتمال ہے کہ تفسیر ہو زینت کی جس کے ظاہر کرنے سے ان کو نہی کی گئی ہے۔ جس طرح کہ امام ابو اسحق سبیعی نے "عن أبي الأحوص عن عبد الله" روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ﴿ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ زینت بالی ہے اور بازو بند اور خلخال، یعنی پازیب و قلادہ، یعنی گردن بند و حمیل۔ ایک روایت میں اسی سند سے اُن سے یہ ہے کہ زینت دو ہیں: ایک زینت وہ ہے کہ نہیں دیکھتا ہے اس کو مگر خاوند، وہ انگوٹھی ہے اور کنگن۔ اور ایک وہ زینت ہے جس کو اجنبی دیکھتے ہیں، وہ یہی ظاہر کپڑے ہیں۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن لوگوں کے لیے زینت ظاہر نہ کریں جن کا اللہ پاک نے نام لیا ہے، جن کے لیے عورت حلال نہیں ہے، مگر کنگن اور اوڑھنیاں اور بالیاں بغیر کھولنے کے۔ رہے عام لوگ تو ظاہر نہیں ہوتی ہیں زینت میں سے مگر انگوٹھیاں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے زہری سے روایت کیا ہے ﴿ إِلَّا مَا ظَهَرَ ﴾ ان میں سے انگوٹھی ہے اور خلخال۔ اور احتمال ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اُن کے تابعین نے ﴿ مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾ کی تفسیر میں وجہ اور کفین (چہرہ اور ہتھیلیاں) شامل کرنے کا ارادہ کیا ہو۔[2] جمہور کے نزدیک یہی ہے اور اس کے واسطے اس حدیث کے ساتھ استیناس کیا جاتا ہے جسے ابو داود نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ اسماء بنت صدیق رضی اللہ عنہما نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧١_ ٢٥٧٢)

[2] تفسیر الطبري (١٩/ ١٥٥_ ١٥٨) تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٣_ ٢٥٧٥) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٧٥_ ٣٧٦).

خدمت میں حاضر ہوئیں اور اُن پر باریک کپڑے تھے تو آپ ﷺ نے ان سے اعراض فرمایا اور ارشاد کیا: اے اسماء! بے شک عورت جس وقت حیض کو پہنچ جاتی ہے تو لائق نہیں ہے کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے، مگر یہ اور یہ، اور اپنے چہرہ مبارک اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔[1] لیکن امام ابو داود اور ابو حاتم رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ خالد بن دریک نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا نہیں ہے۔ واللّٰہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ خمر سے مراد عورتوں کے واسطے مقانع (مونگریاں) ہیں۔ وہ ایسی تنگ بنائی جائیں کہ ان کے سینوں پر آ پڑیں، تاکہ اپنے نیچے والی چیز کو چھپا لیں، یعنی ان کے سینے کو اور سینے کی ہڈیوں کو۔ چاہیے کہ جاہلیت کی عورتوں کے طریقوں کی مخالفت کریں، کیوں کہ وہ ایسا نہیں کرتی تھیں، بلکہ اُن کی عورتیں اپنے سینے کو کھولے ہوئے، مردوں کے درمیان سے گزرتی تھیں۔ اپنے سینے کی کوئی شے چھپاتی نہ تھیں اور بسا اوقات اپنی گردن کو اور بالوں کی مینڈیوں کو ظاہر کرتی تھیں اور اپنے کانوں کی بالیوں کو کھول دیتی تھیں۔ لہٰذا اللہ پاک نے مومن بی بیوں کو اس بات کا حکم دیا کہ اپنی ہیئات اور احوال میں ستر پوشی کریں۔

جیسا کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ﴾ [الأحزاب: ٥٩] ''اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں، یہ (بات اس کے) زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انھیں ایذا نہ پہنچائی جائے۔'' اور اس آیتِ کریمہ میں یوں ارشاد کیا ہے: ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ ''خمر'' ''خمار'' کی جمع ہے۔ خمار وہ ہے جس سے سر ڈھانکا جاتا ہے، یہ وہ ہے جس کا نام لوگ مقانع رکھتے ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ''﴿ وَلْيَضْرِبْنَ ﴾ وَلْيَشْدُدْنَ بِخُمُرِهِنَّ'' یعنی اپنی اوڑھنیاں کس کر باندھیں۔ ﴿ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ ''يَعْنِيْ عَلَى النَّحْرِ وَالصَّدْرِ'' یعنی اپنے پیش سینے پر، اور سینے پر، چنانچہ نہ دیکھی جائے اس سے کوئی شے۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ رحم کرے اگلی ہجرت کرنے والی عورتوں پر! جبکہ اللہ نے ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ نازل کیا تو انھوں نے اپنی صوف کی چادر کو پھاڑ ڈالا، پھر اس سے خمار بنایا۔[3] بخاری کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ جب یہ آیت اتری، یعنی آیتِ مذکور تو انھوں نے اپنی تہبندوں کو لیا، پھر اُن کو حواشی کی جانب سے پھاڑا، پھر اُن کا خمار بنایا۔[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٠٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٢٠٣)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٥۔ ٢٥٧٦) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٠) [4] صحيح البخاري (٤٤٨١)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے صفیہ بنت شیبہ سے روایت کیا ہے کہ ایک وقت ہم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے، ہم نے قریش کی عورتوں کا اور اُن کی فضیلت کا ذکر کیا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بے شک قریش کی عورتوں کے لیے البتہ فضل ہے اور بے شک واللہ! میں نے انصار کی عورتوں سے زیادہ سخت اللہ کی کتاب کی تصدیق کے لیے نہیں دیکھا اور نہ ہی ازروئے ایمان ان سے زیادہ اللہ کے نازل کردہ احکام کے بارے میں زیادہ کسی کو دیکھا۔ بلاشبہہ نازل کی گئی سورت نور ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ تو مرد اس آیت کو پڑھتے ہوئے اُن کی طرف لوٹ گئے اور مرد اپنی بیوی اور بیٹی اور بہن پر اور اپنی ہر رشتہ دار عورت پر وہ آیت پڑھتا جو نازل کی گئی، تو ان میں سے کوئی عورت نہ تھی، مگر اُٹھ کھڑی ہوئی اپنی مرط مرحّل کی طرف (مرط صوف کی چادر اور مرحل، یعنی اس پر کجاوؤں کی صورتیں منقوش تھیں یا مرجل بہ جیم ہے، یعنی اُن پر دیگوں کی صورتیں منقش تھیں) پھر اس کے ساتھ اعتجار کیا، یعنی سر پر ڈالنے کے لیے اس کی اوڑھنی بنائی، اس شے کی تصدیق کرتے ہوئے اور اس پر ایمان لاتے ہوئے جو کچھ اللہ نے اپنی کتاب میں سے نازل فرمایا۔

وہ صبح کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آئیں، اس حال میں کہ اوڑھنیاں اوڑھے ہوئے تھیں، گویا ان کے سروں پر کوے ہیں، (چونکہ سروں پر سیاہ کمبل کی اُوڑھنی ڈالے ہوئے تھیں، اس لیے ان کی صورت ایسی معلوم ہوتی تھی، جیسے ان کے سروں پر کوے بیٹھے ہیں)۔[1] (و رواه أبو داود من غير وجه عن صفية بنت شيبة به) امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ ہیں کہ اللہ رحم کرے اگلی ہجرت کرنے والی عورتوں پر کہ جس وقت اللہ نے آیت: ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ نازل فرمائی تو اُنھوں نے اپنی صوف کی چادروں میں سے زیادہ موٹی چادر کو پھاڑا، پھر اس کی اوڑھنی بنائی۔[2] (و رواه أبو داود من حديث ابن وهب به)

عورت جن لوگوں کے سامنے زینت ظاہر کر سکتی ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ﴾ یہ سب لوگ عورت کے محرم ہیں، اس کو جائز ہے کہ بغیر تبرج کے اپنی زینت ان پر ظاہر کرے۔ (تبرج کہتے ہیں: خاوند کے علاوہ لوگوں کے لیے زینت ظاہر کرنا۔) امام ابن منذر رحمہ اللہ نے شعبی اور عکرمہ رحمہما اللہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اس کو پڑھا، یہاں تک کہ اس سے فارغ ہوئے اور کہا کہ چچا اور ماموں کا ذکر نہیں کیا، اس واسطے کہ یہ دونوں اپنے بیٹوں سے نعت کرتے ہیں، یعنی اس کا حلیہ اُن سے بیان کرتے ہیں۔ عورت اپنی اوڑھنی نہ اُتارے چچا اور ماموں کے نزدیک (لیکن یہ احادیثِ صحیحہ کے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٠١)

[2] تفسير الطبري (١٩/ ١٥٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٠٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ''حسن'' کہا ہے۔ دیکھیں: جلباب المرأة المسلمة (١/ ٥٦)

خلاف ہے) رہا خاوند تو یہ سب کچھ اسی کے واسطے ہے، چنانچہ اس کے لیے بناؤ کرے، اس چیز کے ساتھ جو غیر کے سامنے نہیں ہوتی ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ ﴾ یعنی عورت اپنی زینت کو مسلمان عورتوں کے لیے بھی ظاہر کرے۔ ذمیوں کی عورتوں کے لیے اظہارِ زینت نہ کرے، تاکہ وہ اپنے مردوں سے اس کی صفت نہ کریں، اگرچہ اس بات کا خوف سب عورتوں میں ہے، مگر ذمیوں کی عورتوں میں زیادہ ہے، کیوں کہ ان کو اس سے کوئی مانع نہیں ہے۔ رہی مسلمان عورت تو وہ جانتی ہے کہ یہ بات حرام ہے تو وہ اس سے باز رہے گی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ عورت عورت سے مباشرت نہ کرے کہ اس کا بیان اپنے خاوند سے اس طرح کرے کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ (مباشرت: معاشرت و ملامست کو کہتے ہیں، یعنی ایک عورت دوسری عورت کے بدن کو چھوئے، یعنی ایک کا بدن دوسرے سے لگے۔[2])

(أخرجاه في الصحيحين عن ابن مسعود)

امام سعید بن منصور رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں حارث بن قیس سے روایت کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابوعبیدہ کو خط لکھا: اما بعد! بے شک مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ مسلمانوں کی عورتوں میں سے کچھ عورتیں اہلِ شرک کی عورتوں کے ہمراہ حماموں میں داخل ہوتی ہیں، لہٰذا تو اپنی طرف سے منع کر دے، کسی عورت کے لیے حلال نہیں ہے جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لاتی ہے، یہ بات کہ اس کی خفیہ چیزوں کی طرف نظر کرے، مگر اس کی اہلِ ملت کی عورت، یعنی مسلمان عورت۔[3]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ نِسَآىِٕهِنَّ ﴾ مسلمان عورتیں ہیں۔ مشرک عورتیں ان کی عورتوں سے نہیں ہیں۔ مسلمان عورت کو جائز نہیں ہے کہ مشرک عورت کے سامنے بے ستر ہو جائے۔[4] عبد بن حمید رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں "عن الكلبي عن أبي صالح عن ابن عباس" ﴿ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ جو مسلمان عورتیں ہیں وہ کسی یہودیہ اور کسی نصرانیہ کے لیے اپنے جسم کے یہ حصے ظاہر نہ کریں۔ نحر یعنی پیش سینہ اور بالی اور وِشاح یعنی حمیل حلال نہیں ہے کہ اس کو دیکھے مگر محرم۔[5]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسلمان عورت اپنی اوڑھنی کسی مشرک عورت کے سامنے نہ اتارے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ نِسَآىِٕهِنَّ ﴾ چنانچہ وہ ان کی عورتوں سے نہیں ہے۔[6] امام مکحول و عبادہ بن انس (عبادہ بن نسی معلوم ہوتے ہیں۔ ابن کثیر میں نسی ہے، واللہ اعلم) سے مروی ہے کہ انھوں نے اس بات کو مکروہ رکھا ہے کہ نصرانیہ و یہودیہ و مجوسیہ مسلمان عورت کا بوسہ لے۔ رہی وہ حدیث جس کو ابن ابی حاتم نے ابن عطاء عن ابیہ سے روایت کیا ہے کہ جس

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٧٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٤٣) [3] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٩٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٧) [5] الدر المنثور (٦/ ١٨٣) [6] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٩٥)

وقت اصحابِ رسول اللہ ﷺ بیت المقدس میں آئے تو ان کی بی بیوں کی دائی جنائیاں یہودی نصرانی عورتیں تھیں، تو اگر یہ صحیح قرار پائے تو حالتِ ضرورت پر محمول ہوگی۔ یا یہ ہے کہ یہ بات بابِ امتہان (یعنی ذلت خواری) سے ہے۔ پھر یہ بات ہے کہ اس میں کچھ کشفِ عورت نہیں ہے بالضرور۔ واللہ أعلم.

﴿ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ﴾ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی مشرکوں کی عورتوں سے۔ چنانچہ عورت کو جائز ہے کہ اپنی زینت اُن سے ظاہر کرے گو وہ مشرک ہے، اس لیے کہ وہ اس کی لونڈی ہے۔ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں،[1] اور اکثر لوگوں نے کہا ہے، بلکہ اس کو جائز ہے کہ اپنے غلام اور لونڈی پر ظاہر کرے۔ اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس کو ابو داود نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک غلام لائے، آپ ﷺ اس کو انھیں ہبہ فرما چکے تھے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ایک کپڑا تھا کہ جس وقت وہ اس کو اپنے سر پر ڈالتی تھیں تو اُن کے پاؤں کو نہیں پہنچتا تھا اور جب اس سے اپنے پاؤں ڈھانکتی تھیں تو اُن کے سر کو نہیں پہنچتا تھا۔ جب نبی اکرم ﷺ نے اس حالت کو دیکھا جو انھیں پیش آ رہی تھی تو فرمایا: بے شک نہیں ہے تم پر کچھ خوف «إِنَّمَا هُوَ أَبُوكِ وَغُلَامُكِ» یعنی یہاں جو حاضر ہیں وہ تیرے والد ہیں اور تیرا غلام ہے۔[2]

حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ترجمہ خدیج حمصی مولیٰ معاویہ کے ذیل میں ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعدہ فزاری سیاہ فام سخت گندم گوں تھا اور نبی اکرم ﷺ نے اس کو اپنی دختر نیک اختر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے ہبہ فرمایا تھا، چنانچہ انھوں نے اس کو پالا، پرورش کیا، پھر اس کو آزاد کر دیا۔ پھر وہ اس سب کے بعد جنگِ صفین کے دن میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ لڑنے کے لیے میدانِ جنگ میں آیا اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر سب لوگوں سے زیادہ سخت تھا۔[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، انھوں نے ذکر کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جبکہ اُن میں سے کسی کا کوئی مکاتب غلام ہو اور اس کے پاس وہ چیز ہو جس کو وہ ادا کرے تو چاہیے کہ اس سے پردہ کرے۔[4] (ورواہ أبو داود عن مسدد عن سفيان)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ﴾ یعنی جیسے مزدور لوگ اور اَتباع فرمانبردار جو ہمسر نہیں ہیں اور باوجود اس کے ان کی عقلوں میں بے خودی اور سرگشتگی ہے اور اُن کو عورتوں کی طرف کسی طرح کا وہم، فکر اور خیال نہیں ہے اور نہ وہ اس کی خواہش رکھتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ مغفل ہے جس کو کچھ شہوت نہیں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٧) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٧٧۔ ٣٧٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٠٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٦٨)

[3] تاريخ دمشق (١٢/ ٢٣٩)

[4] مسند أحمد (٦/ ٢٨٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٢٨) اس کی سند میں ''نبهان مولیٰ ام سلمہ'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٥٠)

ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: وہ ابلہ ہے، یعنی نادان، سلیم دل، غافل از شر۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مخنث ہے جس کو شہوت نہ آتی ہو۔[1] اور اسی طرح سلف میں سے بہت سوں نے کہا ہے۔ صحیح میں حدیث زہری عن عروہ عن عائشہ سے مروی ہے کہ ایک مخنث رسول اللہ ﷺ کی بیویوں پر داخل ہوا کرتا تھا اور وہ اس کو ﴿ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ ﴾ سے شمار کیا کرتی تھیں۔

جب رسول اللہ ﷺ داخل ہوئے تو وہ ایک عورت کا وصف بیان کر رہا تھا، کہتا تھا کہ وہ ایسی ہے، جس وقت منہ کرتی ہے تو چار بٹ لے کر منہ کرتی ہے اور جب پیٹھ پھیرتی ہے تو آٹھ بٹ لے کر پیٹھ پھیرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں آیندہ اس کو یہاں نہ دیکھوں۔ یہ اس شے کو جانتا ہے جو اس جگہ ہے، یعنی عورتوں کی کیفیت سے واقف ہے۔ یہ ہرگز وہ تم پر داخل نہ ہو، پھر اس کو نکال دیا تو وہ بیداء مقام میں رہا، ہر جمعہ کے روز کھانا مانگنے کے لیے داخل ہوتا تھا۔[2] امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اُن پر داخل ہوئے اور اُن کے پاس عبداللہ بن اُمیہ رضی اللہ عنہ تھا اور مخنث کھڑا کہہ رہا تھا: اے عبداللہ! اگر اللہ پورے طائف کو تم پر فتح کر دے تو تو غیلان کی بیٹی کو لینا، کیوں کہ وہ چار بٹ لے کر منہ کرتی ہے اور آٹھ بٹ لے کر پیٹھ پھیرتی ہے۔ راوی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو سن لیا تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: یہ تجھ پر ہرگز آیندہ داخل نہ ہو۔[3] (أخرجاه في الصحيحين عن هشام بن عروة به)

امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ ہیں کہ ایک مخنث مرد نبی اکرم ﷺ کی ازواج پر داخل ہوا کرتا تھا اور وہ اس کو ﴿ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ ﴾ سے شمار کیا کرتی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ داخل ہوئے اور وہ آپ ﷺ کی بعض بیویوں کے پاس تھا اور وہ ایک عورت کا وصف بیان کر رہا تھا، چنانچہ اس نے کہا کہ وہ جب منہ کرتی ہے تو چار بٹ لے کر منہ کرتی ہے اور جب پیٹھ پھیرتی ہے تو آٹھ بٹ لے کر پیٹھ پھیرتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نہ دیکھوں اس کو کہ یہ اس شے کو جانتا ہے جو اس جگہ ہے، یہ ہرگز تم پر داخل نہ ہو، چنانچہ اس سے پردہ کیا۔[4] (ورواه مسلم وأبو داود من طريق عبدالرزاق به عن أم سلمة)

قولہ تعالیٰ: ﴿ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ﴾ یعنی کم سنی کی وجہ سے عورتوں کے احوال کو نہیں سمجھتے اور اُن کے بھیدوں کو نہیں جانتے، مثلاً: عورتوں کی نرم نرم باتیں اور اپنی چال اور حرکات وسکنات میں نرمی کرنا، ناز و ادا سے چلنا، اُٹھنے بیٹھنے میں مٹکنا، اس کے سوا اور اُمور جن کو مرد جانتے ہیں، بچے ان سے واقف نہیں ہوتے۔ لہٰذا جب لڑکا اُن باتوں کو نہ سمجھے تو عورتوں پر اس کے داخل ہونے کا کوئی خوف نہیں ہے۔ پھر اگر وہ مراہق (بالغ ہونے کے قریب) یا مراہق ہونے کے قریب ہو، اس طرح سے کہ وہ ان اُمور کو پہچانتا ہے اور اُن کو

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٨۔ ٢٥٧٩) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٠٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨٠) مسند أحمد (٦/ ٢٩٠)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٠٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٩٥) مسند أحمد (٦/ ١٥٢)

سمجھتا ہے اور بدصورت اور خوبصورت عورت کے درمیان فرق کرتا ہے تو اس کو عورتوں پر داخل ہونے کی قدرت نہ دی جائے۔ صحیحین میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: تم بچو عورتوں پر داخل ہونے سے۔ کسی نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! "أَفَرَأَيْتَ الْحَمْوَ" یعنی آپ ہمیں دیور کے بارے میں خبر دیں۔ فرمایا: «اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ»[1] یعنی دیور تو موت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے ضرور پردہ کرنا چاہیے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ ﴾ زمانۂ جاہلیت میں عورت جب راہ میں چلتی اور اُس کے پاؤں میں ٹھوس خلخال ہوتی، یعنی پازیب ہوتی جس کی آواز معلوم نہ ہوتی تو اپنے پاؤں کو زمین پر مارتی تو مرد اس کی آواز کو سن لیتے تھے۔ اس پر اللہ پاک نے ایسی بات سے منع فرمایا۔ اور اسی طرح جب کوئی شے اس کی زینت سے مستور ہو، پھر وہ کوئی حرکت کرے، تاکہ جو پوشیدہ ہے اس کو ظاہر کرے تو وہ بھی اس نہی میں داخل ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ﴾ اسی باب سے یہ ہے کہ عورت منع کی گئی ہے عطر ملنے، خوشبو لگانے سے اپنے گھر سے نکلنے کے وقت، تاکہ مرد اس کی خوشبو کو نہ سونگھیں۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر آنکھ زانی ہے اور عورت جس وقت عطر ملے، پھر کسی مجلس پر گزرے تو وہ ایسی ایسی ہے، یعنی زانیہ ہے۔[2] (قال: وفي الباب عن أبي هريرة رضي الله عنه وهذا حسن صحيح ورواه أبو داود والنسائي من حديث ثابت بن عمارة به)

امام ابو داود نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان کو ایک عورت ملی تو اس سے خوشبو سونگھی اور اس کے دامن کا ایک بگولا تھا تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے جبار کی لونڈی! تو مسجد سے آئی ہے؟ کہا: ہاں۔ اس سے کہا: تو نے خوشبو لگائی؟ کہا: ہاں۔ کہا: بے شک میں نے خود اپنے دوست ابو القاسم ﷺ کو سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ اللہ اس عورت کی نماز قبول نہیں کرتا جس نے اس مسجد میں جانے کے لیے خوشبو لگائی، یہاں تک کہ وہ واپس جائے، پھر غسل کرے غسلِ جنابت کی طرح۔[3] (و رواه ابن ماجه عن أبي بكر بن أبي شيبة عن سفيان هو ابن عيينة به) نیز ترمذی نے میمونہ بنت سعد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ رافلہ (رافلہ وہ عورت ہے جو اپنے لباس میں اکڑ کر ناز سے چلتی ہے۔ رِفل دامن کو کہتے ہیں۔ مجمع) زینت میں اپنے غیر اہل میں تاریکی کے مثل ہے روزِ قیامت کو کہ اس کے واسطے کسی طرح کا نور نہیں ہے۔[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٧٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٨٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٥١٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٢٣)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٧٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٣١)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦٧) المعجم الكبير (٢٥/ ٣٨) اس کی سند میں "موسیٰ بن عبیدہ" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٨٠٠)

نیز اسی باب سے یہ ہے کہ عورتوں کو راستے کے درمیان میں چلنے سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ اس میں تبرج ہے، یعنی خاوند کے سوا غیر کے لیے زینت کا ظاہر کرنا۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے ابو اسید انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا اور آپ مسجد سے نکلنے والے تھے اور راہ میں مرد عورتوں کے ساتھ مل جل گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورتوں سے کہ تم پیچھے ہٹ جاؤ، پس بے شک تمھارے واسطے یہ بات نہیں ہے کہ تم راہ کو مجعد یعنی تنگ کرو، تم تو راہ کے کناروں کو لازم پکڑو، پھر عورت دیوار سے چپک جاتی، یہاں تک کہ اس کا کپڑا اس کے دیوار کے ساتھ چپکنے کی وجہ سے دیوار کے ساتھ اُلجھ جاتا تھا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتُوبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک نے جو تم کو ان صفاتِ جمیلہ و اخلاقِ جلیلہ کا حکم فرمایا ہے، تم اُن کو بجا لاؤ اور جن اخلاق و عادات پر اور صفاتِ رذیلہ پر اہلِ جاہلیت قائم تھے، اُن کو چھوڑ دو، کیوں کہ ہر قسم کی فلاح اسی کام کے کرنے میں ہے جس کا اللہ اور رسول نے حکم دیا ہے اور اس کام کو چھوڑنے میں ہے جس سے انھوں نے منع فرمایا ہے۔[2] والله سبحانه و تعالیٰ هو المستعان وعليه لا علىٰ غيره في جميع الأمور التكلان، إنه هو الحي القيوم، أستغفره و أتوب إليه، اللهم اغفر لنا و تب علينا إنك أنت التواب الرحيم. آمين.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو عورتوں کو اس خطاب کے ساتھ خاص فرمایا تو یہ بطورِ تاکید کے ہے، کیوں کہ وہ مومنین کے خطاب میں تغلیباً داخل ہیں، جس طرح کہ سارے خطاباتِ قرآنیہ میں وہ داخل ہوتی ہیں۔ کلمۂ ﴿ يَغْضُضْنَ ﴾ میں تضعیف ظاہر ہوئی اور ﴿ يَغُضُّوْا ﴾ میں نہ ہوئی، اس واسطے کہ فعل اول کا لام متحرک ہے اور ثانی کا ساکن ہے اور دونوں فعل موضع جزم میں ہیں، اس بنا پر کہ امر کے جواب میں ہیں۔ اللہ پاک نے دونوں جگہ غض کے ساتھ ابتدا کی، حفظِ فرج سے قبل، اس لیے کہ نظر وسیلہ ہے طرف عدمِ حفظِ فرج کے (یعنی شرمگاہ کی حفاظت نہ ہونے کا) اور وسیلہ متوسل الیہ پر مقدم ہوتا ہے۔ غرضیکہ اللہ پاک نے مومنین اور مومنات کو نظر نیچی کرنے کا حکم فرمایا ہے، چنانچہ مرد کو حلال نہیں ہے کہ عورت کی طرف نظر کرے اور نہ عورت کو حلال ہے کہ مرد کی طرف نظر کرے، کیوں کہ عورت کا علاقہ مرد سے ویسا ہی ہے جیسا کہ مرد کا عورت سے ہے اور اس کا مقصد اس سے ویسا ہی ہے، جیسا اس کا مقصد اس سے ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت عورت منہ ننگا کرتی ہے تو ابلیس اس کے سر پر بیٹھتا ہے۔ پھر اس کو زینت دیتا ہے اس شخص کے لیے جو نظر کرتا ہے اور جب پیٹھ پھیرتی ہے تو اس کی سرین پر بیٹھتا ہے، پھر اس کو زینت دیتا ہے اس شخص کے لیے جو دیکھتا ہے۔[3]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٧٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٩٢٩)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٧٥۔ ٣٧٩)　[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٢٧)

اس آیتِ کریمہ میں پچیس ضمیریں مؤنث کی ہیں؛ کوئی مرفوع تو کوئی مجرور۔ قرآن شریف میں اس کی نظیر نہیں پائی گئی۔ شرمگاہ کی حفاظت کے بارے میں بخاری و اہلِ سنن وغیرہم نے بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ سے روایت کیا ہے۔ کہا کہ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! "عَوْرَاتُنَا مَا نَأْتِيْ مِنْهَا وَمَا نَذَرُ؟" یعنی ہم ستروں کو کس سے ستر کریں، کس سے کشف کریں؟ فرمایا: محفوظ رکھ اپنی عورت کو، یعنی ستر کو، مگر اپنی بیوی سے اور لونڈی سے۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! جبکہ قوم بعض بعض میں ہوں، یعنی ازدحام ہو تو کیا کروں؟ فرمایا: اگر تو اس کی طاقت رکھے کہ کوئی اس کو نہ دیکھے تو چاہیے کہ اس کو نہ دیکھے۔ میں نے عرض کی: جبکہ ہم میں سے کوئی تنہا ہو؟ فرمایا: اللہ اس بات کا لوگوں سے زیادہ حق دار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔[1] اس بارے میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، چنانچہ بعض پہلے گزر چکی ہیں۔ زینت وہ شے ہے جس کے ساتھ سنگار کیا جاتا ہے زیور وغیرہ سے، جیسے: خلخال (پازیب)، پائل اور منہدی پاؤں میں، کنگن پہنچوں میں، بالی کان میں اور قلائد گردن میں۔ چنانچہ عورت کو ان چیزوں کا ظاہر کرنا جائز نہیں ہے، نہ اجنبی کو اُن کا دیکھنا درست ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس نہی سے ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کو استثناء فرمایا، یعنی جس شے کے ظاہر ہونے پر عادت و جبلت وطبیعت جاری ہوئی ہے، اس کے اظہار کا مضائقہ نہیں ہے۔ لوگوں نے ظاہر زینت میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کپڑے ہیں۔ سعید نے منہ کو زیادہ کیا ہے۔ امام عطاء اور اوزاعی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ منہ اور دونوں ہتھیلیاں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ اور مسور بن مخرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ سرمہ وانگوٹھی اور کنگن اور منہدی کا رنگ ہے ہتھیلی میں نصف ساق تک اور مثل اس کے، لہٰذا عورت کو جائز ہے کہ ان کو ظاہر کرے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عورت اپنی زینت میں سے کسی شے کو ظاہر نہ کرے اور ہر شے کو اپنی زینت میں سے مخفی رکھے اور زینت سے جو شے ظاہر ہو جاتی ہے، اس میں استثناء بحکمِ ضرورت واقع ہوا ہے۔[2]

مخفی نہ رہے کہ نظمِ قرآنی کا ظاہر زینت کو ظاہر کرنے کی ممانعت ہے، سوائے اس کے جو اس میں سے ظاہر ہو جائے، جیسے: چادر، اوڑھنی اور مثل اُن کے زیور وغیرہ سے جو ہتھیلی اور دونوں قدموں میں ہوتا ہے۔ اگر زینت سے مراد زینت کی جگہیں ہوں گی تو استثناء اس شے کی طرف راجع ہوگا جس کو چھپانا عورت پر مشکل ہوتا ہے، جیسے: ہتھیلیاں اور دونوں قدم اور ان کے مثل۔ اور اسی طرح جب خطاب کے مضمون کے مطابق اظہارِ زینت کی ممانعت مواضعِ زینت کے اظہار کو مستلزم ہوگی تو بھی استثناء انہیں دو جگہوں پر محمول ہوگا جن کا ذکر ہم نے کیا ہے۔ اور جب

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠١٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٦٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٢٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو "حسن" کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٢١٢)

[2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٢٨۔ ٢٢٩)

زینت سے مراد زینت کی جگہیں ہوں اور وہ اشیاء جن سے عورتیں زینت کرتی ہیں تو بات ظاہر اور استثناء سب سے ہو گا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ زینت دو قسم کی ہے: ایک تو خلقی ہے، یہ زینت عورت کا منہ ہے، کیوں کہ اصل زینت یہی ہے۔ دوسری زینت مکتسبہ ہے، یہ وہ زینت ہے جو خود عورت اپنی خلق کو حسین بنانے میں کرتی ہے، مثلاً: لباس و زیور و سرمہ و منہدی سے اپنے آپ کو خوبصورت بناتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ ﴾ [الأعراف: ۳۱] "اپنی زینت اختیار کرو" اسی باب سے ہے۔[1] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: زینت کنگن، بازو بند، پازیب، بالی اور گردن بند ہے۔ ﴿ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾ فرمایا: کپڑے ہیں اور چادر۔ دوسری روایت میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ زینت دو ہیں: ایک ظاہر زینت اور ایک باطن زینت جس کو سوائے خاوند کے اور کوئی نہیں دیکھتا ہے۔ رہی ظاہر زینت تو وہ کپڑے ہیں اور باطن زینت سرمہ و کنگن و انگوٹھی ہے۔ ان سے تیسری روایت میں یہ ہے کہ ظاہر زینت کپڑے ہیں اور مخفی زینت دونوں پائل اور بالیاں اور کنگن ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: سرمہ، انگوٹھی، بالی اور گردن بند۔ ان کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ہتھیلی کی منہدی اور انگوٹھی ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا کہ ظاہری زینت منہ ہے اور دونوں ہتھیلیاں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس کا منہ ہے اور دونوں ہتھیلیاں اور انگوٹھی۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ رقعہ وجہ (صفحۂ چہرہ) اور ہتھیلی کے اندر کا حصہ۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے ظاہری زینت کا پوچھا تو فرمایا قلب و فتخ ہے اور کنارۂ آستین کو ملا لیا۔[2] (قلب کنگن اور فتخ جمع ہے فتخہ کی، فتخہ بڑی انگوٹھی کو کہتے ہیں جو ہاتھ میں پہنی جاتی ہے یا بے نگ کی انگوٹھی۔) غرضیکہ عورت کو جو اس قدر بدن کھولنے میں رخصت دی گئی تو وہ اس لیے کہ اس کو اس سے چارہ نہیں ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کام کاج کرے، اسی طرح منہ کھولنے سے بھی بچت نہیں ہے، خصوصاً گواہی و محاکمہ و نکاح میں۔ نیز وہ راستوں میں چلنے کے لیے مجبور ہوتی ہے اور قدموں کو کھولنے کے لیے مضطر و مجبور ہوتی ہیں، خاص کر جو عورتیں فقیر محتاج ہیں، ان کو تو اس کے بغیر زندگی بسر کرنا انتہائی مشکل ہے۔ علامہ محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فَيَجُوْزُ نَظَرُهُ" یعنی عورت سے جو شے ظاہر ہوتی ہے، اجنبی کو اس کی طرف نظر کرنا جائز ہے، اگر فتنے کا خوف نہ ہو ایک وجہ میں دو وجہوں سے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نظر حرام ہے، اس لیے کہ فتنے کا مظنہ (شک کی جگہ) ہے اور اسی وجہ کو ترجیح دی گئی ہے تا کہ نظر بازی کا دروازہ بند کر دیا جائے۔[3]

﴿ وَلْيَضْرِبْنَ ﴾ کو جمہور نے لامِ امر کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عمرو نے بکسرِ لام پڑھا ہے اصل کی بنا پر،

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٢٩) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٥٥۔ ١٥٧) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٣۔ ٢٥٧٥)
[3] تفسير الجلالين (١/ ٤٦٢)

کیوں کہ لامِ امر کی اصل کسرہ ہے۔ یہ قراءت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[1] ﴿ بِخُمُرِهِنَّ ﴾ کو جمہور نے بضمتین پڑھا ہے اور طلحہ بن مصرف نے بسکون میم۔ "خمر" جمع ہے "خمار" کی، "خمار" وہ ہے جس سے عورت اپنے سر کو ڈھانکتی ہے۔ اسی مادے سے ہے "اِخْتَمَرَتِ الْمَرْأَةُ وَتَخَمَّرَتْ" یعنی عورت نے اپنے سر کو اوڑھنی سے ڈھانکا۔ ﴿ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ کو جمہور نے بضمِ جیم پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور بعض کوفیوں نے بکسرِ جیم، بہت سے متقدم نحوی اس قراءت کو جائز نہیں رکھتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: جائز ہے کہ ضمہ سے کسرہ بدلا جائے۔ رہی وہ بات جو حمزہ سے مروی ہے کہ ضم اور کسرہ کے درمیان جمع کیا جائے تو یہ محال ہے، انسان اس کے بولنے کی قدرت نہیں رکھتا، مگر بطریقِ ایماء کے۔[2]

"جیوب" "جیب" کی جمع ہے۔ "جیب" درع و قمیص سے موضعِ قطع کو کہتے ہیں جو بمعنی قطع "جَوْب" سے ماخوذ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ جیب سے مراد جیب کی جگہ ہے اور وہ گردن ہوئی، ورنہ جیب اصل میں کُرتے کے طوق کو کہتے ہیں۔ یہاں "ضرب" کو کلمۂ ﴿ عَلٰى ﴾ سے متعدی کیا ہے، اس واسطے کہ "ضرب" میں القاء کے معنی شامل ہیں۔ القاء ڈالنے کو کہتے ہیں اور القا کے صلہ میں ﴿ عَلٰى ﴾ آتا ہے، لفظِ ضرب میں مبالغہ ہے لفظِ القاء میں جس کے معنی الصاق کے ہیں، یعنی چپکانا۔ غرض یہ ہے کہ اُوڑھنی کو خوب چپکا کر کس کر ڈالیں کہ بدن کو اچھی طرح چھپا دے، کھلے نہیں۔[3]

﴿ بِخُمُرِهِنَّ ﴾ میں حرفِ باء زائد ہے یا تبعیض کے لیے ہے، یعنی بعض اوڑھنی کو اپنے گریبان پر ڈال لیں۔ مفسرین نے کہا ہے کہ جاہلیت کی عورتیں اوڑھنیاں اپنے پیچھے لٹکا دیا کرتی تھیں اور اُن کے گریبان آگے سے وسیع ہوتے تھے تو اُن کے سینے کی ہڈیاں اور گردن بند کھل جاتے تھے، اس لیے مومن عورتوں کو حکم ہوا کہ اپنی اوڑھنیاں گریبانوں پر ڈال لیں، تا کہ جو شے اس سے کھل جاتی تھی، وہ چھپا دی جائے۔ جمہور نے "جیوب" کی وہی تفسیر کی ہے جو ہم ذکر کر آئے ہیں۔ "جیوب" کے حقیقی معنی وہی ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ "جیوب" سے مراد صدور، یعنی سینے ہیں۔[4] تو اس بنا پر آیت میں مضاف محذوف ہو گا۔ "أَيْ: عَلَى مَوَاضِعِ جُيُوْبِهِنَّ" یعنی اوڑھنیوں کو گریبانوں کی جگھوں پر ڈالیں، وہ عورتوں کے سینے ہوئے۔

﴿ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ ﴾ یعنی زینتِ باطنہ کی جگھوں کو ظاہر نہ کریں۔ یہ جگہیں منہ اور ہتھیلیوں کے سوا ہیں، جیسے: سینہ اور پنڈلی اور سر اور اس جیسے اور اعضاء۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پوشیدہ زینت ہے جس کا عورتوں کو نماز میں کھولنا مباح نہیں ہے، نہ اجنبی مردوں کے لیے کھولنا مباح ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہی (وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ) کو اس لیے دوہرایا گیا ہے کہ اس سے بعض جگھوں کا استثناء کرنا منظور ہے

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٣٠) [2] فتح القدير (٤/ ٣٣)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٦) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٦)

جن کی رخصت دی گئی ناظر کے اعتبار سے اس کے بعد کہ بعض موارِ ضرورت کا استثناء باعتبارِ منظور کے کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ إِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ﴾ یعنی چادر اور اوڑھنی کو نہ اُتاریں، مگر اپنے خاوندوں کے لیے۔[1]

عرب کے کلام میں بَعل: خاوند، سید اور مالک کو کہتے ہیں۔ خاوندوں کا ذکر سب سے پہلے اس لیے کیا کہ انہیں کے لیے زینت کی جاتی ہے اور اس واسطے کہ بی بی اور لونڈی کا کل بدن خاوند کے لیے حلال ہے۔ اسی جیسی یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ إِلَّا عَلٰٓى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ٥۔ ٦] ''اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ، تو بلاشبہہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں۔''

پھر جب اللہ پاک نے خاوندوں کا استثناء کیا تو اس کے بعد ذوی الارحام کا استثناء فرمایا۔ چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ أَوْ اٰبَآئِهِنَّ أَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَآئِهِنَّ أَوْ أَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِيْٓ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِيْٓ أَخَوٰتِهِنَّ ﴾ لہٰذا عورتوں کے لیے جائز کیا کہ ان لوگوں سے زینتِ باطنہ ظاہر کریں، کیوں کہ اُن کے اور عورتوں کے درمیان کثرت سے میل جول ضروری ہوتا ہے اور اُن کی جانب سے فتنے کا خوف نہیں ہوتا، اس لیے کہ طبیعتوں میں قریبی رشتے دار عورتوں کو چھونے سے نفرت واقع ہوئی ہے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اُمہاتِ مومنین کی طرف نظر نہیں فرماتے تھے، کیوں کہ وہ اس طرف گئے کہ خاوندوں کے بیٹوں کا ذکر اس آیت میں نہیں آیا ہے، جو کہ ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے۔ وہ آیتِ کریمہ یہ ہے: ﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ أَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ إِخْوَانِهِنَّ وَلَآ أَبْنَآءِ إِخْوَانِهِنَّ وَلَآ أَبْنَآءِ أَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴾[2] [الأحزاب: ٥٥] ''عورتوں پر اپنے باپوں اور اپنے بیٹوں اور اپنے بھائیوں اور اپنے بھتیجوں اور اپنے بھانجوں اور اپنی عورتوں اور جن (لونڈیوں) کے مالک ہوئے ہیں ان کے دائیں ہاتھ (ان کے سامنے آنے میں) کوئی گناہ نہیں، اور (اے عورتو!) تم اللہ سے ڈرتی رہو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔'' ﴿ أَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ ﴾ سے مراد خاوندوں کے لڑکے ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ أَوْ أَبْنَآئِهِنَّ ﴾ میں اولاد کی اولاد داخل ہے، اگرچہ نیچے درجے کے ہوں اور بیٹیوں کی اولاد اگرچہ نیچے درجے کی ہوں اور اسی طرح خاوندوں کے باپ اور باپوں کے باپ اور ماؤں کے باپ اگرچہ اوپر درجے کے ہوں اور اسی طرح خاوندوں کی بیٹیاں، اگرچہ نیچے درجے کی ہوں اور اسی طرح بھائی بہنوں کے بیٹے۔ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ چچا اور ماموں دوسرے محرموں کی طرح ہیں، اُن کے لیے بھی وہی جوازِ نظر ہے جو دوسروں کے لیے ہے۔ امام شعبی اور عکرمہ رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ چچا اور ماموں محرموں سے نہیں ہیں۔[3] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے

[1] تفسیر أبي السعود (٦/ ١٧٠) [2] تفسیر القرطبي (١٢/ ٢٣٢) فتح القدیر (٤/ ٣٣) [3] تفسیر القرطبي (١٢/ ٢٣٣)

کہ چچاؤں اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ زیادہ تر احتیاط یہی ہے کہ ان سے پردہ کریں، اس خوف سے کہ اپنے بیٹوں سے ان کا وصف بیان کریں گے۔ معنی یہ ہیں کہ سارے رشتہ دار جن کا ذکر کیا گیا، وہ باپ اور بیٹے کے ساتھ مشترک ہیں محرم ہونے میں، مگر چچا اور ماموں کے بیٹے۔ یہ ان پر نسبی لحاظ سے احتیاط کے ضروری ہونے کے سلسلے میں قوی دلیلوں میں سے ہے۔ رہی یہ بات کہ آیت میں رضاع کا ذکر نہیں، یعنی ان رشتوں کا جن کا تعلق رضاعت سے ہے۔ لہٰذا رضاع نسب کی طرح ہے۔

﴿ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ عورتیں جو اُن سے خاص ہیں، اس لحاظ سے کہ ایمان میں مشترک ہیں۔ اُن سے خدمت یا صحبت کا تعلق رکھتی ہیں۔ لونڈیاں اس میں داخل ہیں اور کفار کی عورتیں اس سے خارج ہیں، وہ ذمی ہوں یا غیر ذمی۔ مسلمان عورتوں کو حلال نہیں ہے کہ اپنی زینت ان سے ظاہر کریں، کیوں کہ وہ اس بات میں کوئی حرج نہیں سمجھتیں کہ اپنے مردوں سے ان عورتوں کے اوصاف بیان کریں، اس مسئلے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔

﴿ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ﴾ یعنی غلاموں کو اپنی مالک بی بیوں کو دیکھنا جائز ہے، مگر وہ جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہے، چنانچہ خاوندوں کے علاوہ کسی کو اس کا دیکھنا حرام ہے۔[1] (قاله المحلي)۔ ظاہر آیت غلاموں اور لونڈیوں کو بغیر فرق کے شامل ہے، یعنی وہ مسلمان ہو یا کافر کوئی فرق نہیں، اہلِ علم میں سے ایک جماعت اس کی قائل ہے اور اسی طرف سیدہ عائشہ اور ام سلمہ و ابن عباس رضی اللہ عنہم و امام مالک رحمہ اللہ گئے ہیں۔ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت تم کو دھوکے میں نہ ڈالے، اس سے جو مراد ہیں وہ لونڈیاں ہیں۔ غلام اس سے مراد نہیں ہیں۔ امام شعبی رحمہ اللہ اس بات کو مکروہ جانتے تھے کہ غلام مملوک اپنی مالک بی بی کے بالوں کو دیکھے۔

یہ قول امام عطا، مجاہد، حسن اور ابن سیرین رحمہم اللہ کا ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ابن جریج رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کچھ خوف نہیں ہے کہ غلام اپنی مالک بی بی کے بال دیکھے۔[3] سلیمان جمل رحمہ اللہ نے اپنے شیخ سے نقل کیا ہے کہ عورتوں کو جائز ہے کہ غلاموں کے واسطے اپنا بدن کھولیں، سوائے اس جگہ کے جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہے اور غلاموں کو بھی جائز ہے کہ اس کو دیکھیں اور اُن کے واسطے اپنے بدن کھولیں، سوائے ناف اور گھٹنے کی درمیانی جگہ کے، بشرطیکہ دونوں طرف سے عفت اور پارسائی ہو اور شہوت نہ ہو۔

﴿ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ﴾ جمہور نے کلمۂ ﴿ غَيْرِ ﴾ کو بجر پڑھا ہے اور ابوبکر و ابن عامر نے بہ نصب، استثنا کی بنا پر۔[4] کسی نے کہا ہے کہ بنا بر قطع۔ اور ﴿ مِنَ الرِّجَالِ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ "إِرْبَةٌ وَإِرَبٌ وَمَأْرِبَةٌ" کے اصل معنی حاجت ہیں۔ جمع اس کی "مَآرِبُ" آتی ہے، یعنی حوائج۔ اسی باب سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴾ [طٰهٰ: ١٨] "اور اس میں میرے لیے اور بھی مقاصد ہیں۔" کسی نے

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٦٢) [2] فتح القدير (٤/ ٣٣) [3] الدر المنثور (٦/ ١٨٣) [4] فتح القدير (٤/ ٣٣۔ ٣٤)

کہا ہے کہ ﴿ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ﴾ سے مراد احمق لوگ ہیں، جن کو عورتوں میں کچھ حاجت نہیں ہوتی۔ کسی نے کہا: ابلہ لوگ، صاف سینہ، صاف دل۔ کسی نے کہا ہے کہ "عَنِيْن" یعنی نامرد (عنین وہ ہے جس کا ذکر جماع کے وقت مڑ جاتا ہے، جماع پر قدرت نہیں رکھتا ہے۔ خصی وہ ہے کہ جس کے خصیے کچل دیے ہیں اور ذکر باقی ہے۔ مخنث وہ ہے کہ بتکلف عورتوں کے مشابہ بنتا ہے، بات چیت اور لباس وغیرہ میں۔ مجبوب وہ ہے جس کا ذکر کاٹ دیا گیا اور خصیے باقی ہیں)۔ کسی نے کہا ہے کہ خصی۔ کسی نے کہا ہے کہ مخنث۔ کسی نے کہا ہے کہ بہت بوڑھا۔ کسی نے کہا ہے کہ مجبوب۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جس سے عورتیں شرماتی نہیں ہیں۔ اُن کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ وہ شخص ہے کہ قوم کے تابع رہتا ہے اور اپنی عقل میں مغفل ہے، عورتوں کی پروا نہیں کرتا اور نہ اُن کی خواہش رکھتا ہے۔ اُن کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ زمانۂ اول میں ایک شخص کسی شخص کے تابع ہوتا، اس پر عار و ننگ نہ کرتا، اور نہ عورت اس سے ڈرتی کہ اپنی اوڑھنی اس کے نزدیک اُتارے، یہ وہ احمق ہے جس کو عورتوں میں کوئی حاجت نہیں ہے۔

چوتھا لفظ ان کا یہ ہے کہ وہ مخنث ہے جس کا ذکر کھڑا نہیں ہوتا۔[1] شامل میں کہا ہے کہ خصی کو حلال نہیں ہے نظر کرنا، یہاں تک کہ بوڑھا ہو جائے۔ ہَرم (بڑھاپے) کو پہنچ جائے اور اس کی شہوت جاتی رہے۔ اسی طرح مخنث کا حال ہے۔ اسی کے قائل قاضی ابوالطیب صاحبِ شامل کے شیخ ہیں۔ ابومخلد بصری نے خصی و مخنث میں دو وجہ کا اطلاق کیا ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ اور شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تابعین سے مراد وہ لوگ ہیں، جو قوم کے تابع ہوتے ہیں۔ پھر ان کے کھانے پر گزارہ کرتے ہیں، اس کے سوائے اُن کا اور کوئی قصد نہیں ہوتا اور عورتوں میں اُن کو کچھ حاجت نہیں ہوتی۔ فتح البیان و فتح القدیر میں خاص قولوں کے ذکر کے بعد یوں کہا ہے کہ اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ آیت سے مراد ظاہر آیت ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ گھر والوں کا بچا کھچا کھانا کھاتے ہیں اور عورتوں میں اُن کی کوئی حاجت نہیں ہوتی اور نہ اُن سے یہ حاجت کسی حال میں حاصل ہوتی ہے، چنانچہ جو شخص اس صفت کا ہے تو وہ اُن میں داخل ہے اور جو اس صفت کا نہیں ہے وہ ان سے خارج ہے۔[2]

﴿ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ﴾ طفل کا اطلاق مفرد و مثنی و مجموع پر ہوتا ہے، یا اس جگہ اس سے مراد جنس ہے جو موضع جمع میں رکھی گئی ہے۔ اس پر یہ بات دال ہے کہ طفل کو جمع کے وصف کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ مصحفِ ابی رضی اللہ عنہ میں "اَوِ الْاَطْفَالِ" بصیغۂ جمع ہے۔ انسان طفل ہوتے ہیں جب تک کہ وہ سنِ بلوغت کے قریب نہ ہوں۔ ﴿ لَمْ يَظْهَرُوْا ﴾ کے معنی "لم يُطْلِعُوْا" ہیں۔ ظہور بہ معنی اطلاع سے ماخوذ ہے۔ یہ قول ابن قتیبہ کا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ شہوت کی حد کو نہیں پہنچے۔ اس کے قائل امام فراء اور زجاج رحمہما اللہ ہیں۔

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٦٢۔ ١٦١) الدر المنثور (٦/ ١٨٤)
[2] فتح القدير (٤/ ٣٤) فتح البيان (٩/ ٢١٠)

محاورے میں جب تو کسی شے پر غالب و قاہر ہو تو یوں کہے گا: "ظَهَرْتُ عَلَيْهِ" یعنی میں اس شے پر غالب اور قاہر ہو گیا۔ معنی یہ ہیں کہ وہ مطلع نہیں ہوئے ہیں عوراتِ نساء پر اور جماع کے لیے اُن کا کشف نہیں کیا ہے، یا جماع کے واسطے حدِ شہوت کو نہیں پہنچے، یا چھوٹی عمر کی وجہ سے انھوں نے ستر اور غیر ستر کو نہیں پہچانا۔ کسی نے کہا ہے کہ وطی پر قادر ہونے کے زمانے کو نہیں پہنچے۔ یہ معنی اس محاورے سے ماخوذ ہیں کہ جب کوئی کسی پر قوی ہو جاتا ہے تو بولتے ہیں: "ظَهَرَ عَلَى فُلَانٍ"۔ کسی نے کہا ہے کہ بالغ نہیں ہوئے ہیں۔ جمہور کی قراءت "عَوْرَات" بسکون واؤ ہے، حرفِ علت کی تخفیف کے لیے۔ یہ عامہ عرب اور جمہور کی لغت ہے۔ ابن عامر نے ایک روایت میں بفتحِ واو پڑھا ہے اور ابن ابی اسحاق و اعمش نے بھی اسی طرح پڑھا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ قراءت مروی ہے۔ یہ لغت ہے ہذیل بن مدرکہ کی۔[1] "عورات" "عورة" کی جمع ہے۔ "عورة" بدن میں وہ شے ہے جس کو چھپانے کا آدمی ارادہ کرتا ہے۔ پھر عورۃ کا استعمال قُبل و دُبر (شرم گاہ آگے کی طرف سے اور پیچھے کی طرف سے) میں زیادہ تر کیا گیا ہے۔

علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ سوائے منہ اور ہتھیلیوں کے بدن کے دوسرے حصے کو اطفال سے چھپانا واجب ہے یا نہیں، (یعنی خود اطفال کا سترِ عورت واجب ہے یا نہیں۔) کسی نے کہا کہ لازم نہیں ہے، اس واسطے کہ اس پر تکلیف نہیں ہے۔ یہی قول صحیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ لازم ہے، کیونکہ عورت کبھی خواہش کرتی ہے۔ اسی طرح شیخ کبیر کی عورت میں اختلاف ہے، جس کی شہوت ساقط ہو چکی ہے۔ زیادہ صحیح بات اس کی حرمت کا باقی رہنا ہے، جیسے کہ پہلے تھی۔ چنانچہ اس کی عورت کی طرف نظر حلال نہیں ہے اور نہ ہی اس کو حلال ہے کہ اپنی عورت کو کھولے رکھے۔ عورت کی حد میں علما کا اختلاف ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسلمانوں نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ دونوں شرم گاہیں، یعنی اگلی اور پچھلی عورت ہیں مرد اور عورت کی اور عورت سب کی سب عورت ہے، سوائے اس کا منہ، اور دونوں ہاتھ اس اختلاف کی بنا پر جو اس میں ہے۔ اکثر کا قول یہ ہے کہ مرد کے ناف سے دونوں گھٹنوں تک عورت (ستر) ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ وہ زینت جس کو عورت ان لوگوں کے واسطے ظاہر کرے، وہ اس کی بالیاں اور گردن بند اور کنگن ہیں۔ رہا اس کا خلخال (پازیب) و معضد (بازو بند) ونحر (پیشِ سینہ) اور بال تو ان کو صرف اپنے خاوند کے لیے ظاہر کرے۔ اللہ پاک نے جن لوگوں کا اس آیت میں استثناء فرمایا ہے وہ تمام بارہ اقسام ہیں۔

﴿ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ ﴾ یعنی عورت اپنے پاؤں سے دھمک نہ دے، تاکہ اس کی پازیب کی آواز کو مردوں میں سے کوئی سنے اور جان جائے کہ وہ پازیب والی ہے، کیوں کہ یہ آواز اُن چیزوں میں سے ہے جو مردوں میں عورتوں کی طرف میلان پیدا کرتی ہے اور اس بات کا وہم ڈالتی ہے کہ ان عورتوں کا مردوں کی طرف میلان ہے۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ محرمات کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ اور احوط کی تعلیم ہے،

[1] فتح القدير (٤/ ٣٤)
[2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٣٧)

ورنہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک عورتوں کی آواز عورت نہیں ہے، پھر اُن کی پازیب کی آواز کا کیا ذکر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس زینت کی آواز کا سننا اس کے ظاہر کرنے سے بھی زیادہ شہوت کا محرک ہوتا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں جو فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ ایک خلخال کو دوسرے سے کھڑکائے مردوں کے نزدیک، یا اس کے پاؤں میں کئی خلخال ہوں تو ان کو مردوں کے نزدیک حرکت دے۔

لہٰذا اللہ پاک نے اس سے منع فرمایا ہے، کیوں کہ یہ شیطان کے عمل سے ہے۔[2] اور زینت کی آواز سننا اظہارِ زینت کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے زیور کی آواز کا نام وسواس رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس سے آگاہی بخشی اس بات پر کہ جس کے واسطے اس کی ممانعت کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ جو زیور وغیرہ اُن پر ہے، اس کا اس کو علم ہو جائے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ عورتوں میں سے جو کوئی عورت اس کام کو کرے اپنے زیور سے خوش ہو کر تو یہ کام مکروہ ہے اور جو کوئی اس کو مردوں کے لیے تبرج اور تعرض کی خاطر کرے تو حرام اور مذموم ہے۔ اسی طرح جو کوئی مرد اپنی جوتی سے زمین کو مارے، اگر عجب (تکبر) کی راہ سے کرے گا تو حرام ہے، کیوں کہ عجب کبیرہ گناہ ہے اور اگر تبرج و اظہار کے واسطے کرے گا تو حرام نہیں ہے۔[3] انتہٰی

پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں کو گناہوں سے توبہ کرنے کی ہدایت کی اور فرمایا: ﴿ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی ممنوعہ نظر وغیرہ کی طرح کے جو گناہ تم سے سرزد ہوئے ہیں، تم سب مل کر اُن سے توبہ کرو۔ اس آیت میں توبہ کا حکم ہے۔ مسلمانوں کے درمیان توبہ کے وجوب کے بارے میں اختلاف نہیں ہے اور اس بات میں کہ وہ دین کے فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بندہ سہو سے بچ نہیں سکتا اور اللہ پاک کے اوامر ونواہی میں قصور اور فتور کرتا رہتا ہے، اگرچہ کتنی ہی سعی وکوشش بجا لائے۔ اسی لیے اللہ پاک نے سب کو توبہ کی وصیت فرمائی ہے۔

سوۃ النساء میں توبہ پر کلام گزر چکا ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ توبہ سے مراد اُن کاموں سے توبہ کرنا ہے جو جاہلیت میں کیا کرتے تھے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ سنت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام پہلے کاموں کو ختم کر دیتا ہے، یعنی اسلام لانے سے پہلے کے گناہ اسلام لانے کے بعد نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ توبہ کے حکم اور استکثار (کثرت) میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ سب سے بڑھ کر توبہ کا نیاز مند وہ شخص ہے جو یہ وہم کرتا ہے کہ اس کو توبہ کی طرف کوئی حاجت نہیں ہے۔ آیت کا ظاہر اس پر دال ہے کہ عصیان سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی۔

پھر اللہ پاک نے اس بات کا ذکر کیا جو بندوں کو توبہ میں راغب کرے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ یعنی شاید تم دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کرو، یا توبہ قبول ہونے کی وجہ سے نظر وغیرہ کے عذاب سے

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٣٨) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٦٤) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٣٨) [4] رقم الآية (١٧)

نجات پاؤ۔ اس آیت میں تغلیب ہے ذکور کی اناث پر، یعنی مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے۔ جبکہ اللہ پاک نے نگاہ نیچی رکھنے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے کا حکم دیا تو اس کے بعد نکاح کا ارشاد فرمایا، جو بندوں کے لیے حلال کام ہے اور جس سے شہوت کی حاجت پوری ہوتی ہے اور زنا کا باعث ساکن ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ساری محرمات سے آنکھوں کا نیچے کرنا آسان ہو جاتا ہے اور حرام سے شرم گاہ محفوظ رہتی ہے۔[1] لہٰذا ارشاد فرمایا:

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾

اور تم اپنے بے نکاح مردوں، عورتوں کے نکاح کر دو اور (ان کے بھی) جو تمھارے غلام اور لونڈیاں نیک ہوں، اگر وہ فقیر ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے گا اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے (32)

نکاح کا حکم:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! تین کام میں دیر نہ کر: فرض نماز کا جب وقت آئے، جنازہ جب موجود ہو اور بیوہ عورت جب اس کی ذات کا مرد مل جائے۔[2] جو کوئی دوسرا خاوند کرنے پر عیب دے تو اس کا ایمان سلامت نہیں اور جو لونڈی غلام نیک ہوں، یعنی بیاہ کر دینے میں مغرور نہ ہو جائیں کہ تمھارا کام ہی چھوڑ دیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ نکاح کرنے کے بارے میں حکم ہے۔ علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ نکاح ہر اس شخص پر واجب ہے جو اس پر قدرت رکھتا ہے۔ اس حدیث شریف کے ظاہر سے حجت پکڑی ہے: «يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ» یعنی اے جوانوں کے گروہ! جو شخص تم میں سے نکاح کی طاقت رکھے تو چاہیے کہ نکاح کرے، بے شک نکاح بہت نیچی کرنے والا ہے نگاہ کو اور بہت محفوظ رکھنے والا ہے شرم گاہ کو، اور جو شخص طاقت نہ رکھے تو اس پر لازم ہے روزہ، بے شک روزہ اس کے لیے خصی ہونا ہے۔[3] (أخرجاه في الصحيحين من حديث ابن مسعود)

سنن وغیرہ میں کئی وجہ سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم نکاح کرو بہت جننے والی عورت سے

---

[1] فتح البيان (۹/ ۲۰۳۔ ۱۲)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۷۱) اس کی سند میں "سعید بن عبداللہ" مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة: ۵۷۵۱)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۷۷۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۴۰۰)

اورنسل بڑھاؤ، بے شک میں تمھارے ساتھ دوسری اُمتوں پر قیامت کے دن فخر کرنے والا ہوں۔[1] ایک روایت میں اس طرح ہے: یہاں تک کہ ادھورے بچے کے ساتھ۔[2] ﴿ اَلۡاَیَامٰی ﴾ "اَیم" کی جمع ہے۔ "اَیم" اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو اور اس مرد کو جس کی بیوی نہ ہو، اور برابر ہے کہ اس نے نکاح کیا ہو، پھر علاحدگی اختیار کی ہو، یا اُن میں سے کسی نے نکاح ہی نہ کیا ہو۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے اہلِ لغت سے اس کو نقل کیا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "رَجُلٌ أَیِّمٌ، وَامْرَأَۃٌ أَیِّمٌ" یعنی مرد اور عورت دونوں پر "أیم" کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ ﴾ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ نے بندوں کو نکاح میں ترغیب دی ہے اور آزاد مردوں کو اور غلاموں کو اس کا حکم دیا ہے اور اس پر اُن سے غنا کا وعدہ کیا ہے، چنانچہ فرمایا: اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ اُن کو غنی کر دے گا اپنے فضل سے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن عبدالعزیز سے روایت کیا ہے، کہا: مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ تم اللہ کی اس شے میں اطاعت کرو جس کا اس نے تم کو حکم دیا ہے، یعنی نکاح کرو، وہ تمھارے لیے اس شے کو پورا کرے گا، جس کا اس نے تم سے وعدہ کیا ہے، یعنی غنا۔ قال تعالیٰ: ﴿ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ﴾[3]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے تم غنا کو نکاح میں تلاش کرو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ﴾[4] (رواہ ابن جریر و ذکر البغوي عن عمر نحوہ) لیث نے بسندِ خود سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: تین آدمی ہیں کہ اللہ پر اُن کی مدد کرنا حق ہے: نکاح کرنے والا جو پارسائی کا ارادہ کرتا ہے اور غلام مکاتب جو ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور غازی اللہ کی راہ میں۔[5] (رواہ الإمام أحمد والترمذي و النسائي و ابن ماجه)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا نکاح کرایا جس کے پاس صرف اپنا ایک تہبند تھا، اور ایک لوہے کی انگوٹھی پہنانے کی بھی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ایک عورت سے نکاح کر دیا اور اس پر اس کا مہر یہ ٹھہرایا کہ اس کو وہ قرآن سکھا دے جو اس کے پاس ہے،[6] یعنی جتنا قرآن اس کو یاد ہے وہ اس عورت کو سکھا دے۔ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے یہ بات معلوم ہے کہ اس کو اس قدر روزی عطا کرے گا کہ وہ مرد اور عورت کے لیے کافی

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۰۵۰) سنن النسائي، رقم الحدیث (۳۲۲۷) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۹٤۰)

(2) المعجم الکبیر (۱۹/ ٤١٦) اس کی سند میں "علی بن ربیع" مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ۳۲٦۷)

(3) تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۵۸۱۔ ۲۵۸۲)

(4) تفسیر الطبري (۱۹/ ١٦٦) تفسیر البغوي (٦/ ٤٠)

(5) مسند أحمد (۲/ ۲۵۱) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱٦۵۵) سنن النسائي، رقم الحدیث (۳۱۲۰) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۵۱۸) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۰۵۰)

(6) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤۷۹۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٤۲۵)

ہوگی اور بہت سے لوگ جو یہ حدیث لاتے ہیں کہ «تَزَوَّجُوا فُقَرَاءَ يُغْنِكُمُ اللّٰهُ» سو اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور نہ میں نے اس کو اب تک قوی یا ضعیف اسناد سے دیکھا ہے۔ قرآن شریف میں اور اسی طرح ان حدیثوں میں جو ہم نے وارد کی ہیں، وہ اس حدیث سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔[1] وللّٰه الحمد والمنة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ "أَيِّمٌ" بہ تشدید وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ ہو اور وہ مرد ہے جس کی بیوی نہ ہو، چنانچہ لفظ "أَيِّمٌ" غیر شادی شدہ مرد و عورت کو شامل ہے۔ اس کی جمع "ایامٰی" آتی ہے اور اصل "ایامٰی" کی "أيايم" ہے۔ امام ابو عمرو اور کسائی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ لغت نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ "أيم" اصل میں وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ ہو، خواہ وہ کنواری ہو یا ثیب۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا کہ مرد اور عورت کو "أيم" کہتے ہیں۔ "أيم" کا استعمال اکثر عورتوں میں ہوتا ہے۔ مردوں میں بطور استعارے کے ہے۔[2] آیت میں خطاب آزاد عورتوں کے ولیوں کو اور لونڈیوں کے مالکوں کو ہے۔ کسی نے کہا کہ خاوندوں کو ہے۔ پہلا قول زیادہ راجح ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ عورت اپنے نفس کا نکاح نہ کرے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کسی عورت نے اپنے ولی کے اِذن کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔ اس کلمے کو تین بار فرمایا۔[3] (أخرجه أبو داود والترمذي)

انہیں دونوں نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے نکاح مگر ولی کے ساتھ۔[4] امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ انھوں نے عورت کے لیے اپنا نکاح خود کرنا جائز رکھا ہے۔ علماء نے نکاح کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا مباح ہے یا مستحب یا واجب۔ امام شافعی وغیرہ پہلے قول کی طرف گئے ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دوسرے قول کی طرف گئے ہیں۔ (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ نکاح سنتِ موکدہ ہے اور شہوت کی شدت کے وقت واجب ہے۔ کذا یستفاد من کتب الفقه، مصحح سلمه الله تعالٰی.)

تیسرے قول کی طرف بعض اہلِ علم گئے ہیں، اس تفصیل کی بنا پر جو انھوں نے اس بارے میں کی ہے۔ چنانچہ کہا کہ اگر ڈرتا ہے کہ اس کا نفس معصیت میں پڑ جائے گا تو اس پر نکاح واجب ہے، ورنہ واجب نہیں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ جو لوگ اباحت اور استحباب کے قائل ہیں باوجود اس خوف کے وجوب میں مخالف نہیں ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۸۰) [2] تفسیر القرطبي (۱۲/ ۲۳۹۔ ۲۴۰)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۰۸۳) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۰۲) صحيح الجامع، رقم الحديث (۲۷۰۹)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۰۸۵) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۰۱) صحيح الجامع، رقم الحديث (۷۵۵۵)

نکاح باوجود معصیت کا خوف نہ ہونے کے سنتِ موکدہ ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے نکاح کی ترغیب کے بعد یوں فرمایا ہے: ((وَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ))[1] یعنی جو شخص میری سنت سے منہ موڑے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ لیکن سنت جب ہی ہے کہ نکاح پر اور اس کے خرچ وغیرہ پر قدرت رکھتا ہو۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ میں نے اس مرد کی مثل نہیں دیکھا کہ اس نے نکاح میں غنا تلاش نہ کی، حالاں کہ اللہ نے اس میں وعدہ کیا ہے جس بات کا کہ وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾[2] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم نکاح کرو عورتوں سے، بے شک وہ تمھارے پاس مال لائیں گی۔[4] (أخرجه البزار والدارقطني، أخرجه أبو داود في مراسيله عن عروة مرفوعاً)

مطلق نکاح کی ترغیب میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، یہ جگہ ان کے ذکر کی نہیں ہے۔ غرض کہ اس جگہ "أَيَامٰى" سے مراد آزاد مرد اور آزاد عورتیں ہیں۔ رہے لونڈی غلام تو اُن کا بیان اس قول میں فرمایا: ﴿وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآىِٕكُمْ﴾ جمہور کی قراءت ﴿عِبَادِكُمْ﴾ ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے "عَبِيْدِكُمْ" پڑھا ہے۔ اور امام فراء نے "إِمَاءَكُمْ" بہ نصب جائز کہا ہے۔ اس لیے کہ اس کا عطف صالحین پر کیا ہے۔[5] صلاح سے مراد ایمان ہے۔ کسی نے کہا: قائم ہونا ہے حقوقِ نکاح کے ساتھ، یہاں تک کہ غلام اس چیز کے ساتھ قیام کرے جو جورو کے واسطے لازم ہے اور لونڈی قیام کرے اس شے کے ساتھ جو خاوند کے واسطے لازم ہے۔ یا صلاح سے مراد یہ ہے کہ کم سن نہ ہو کہ وہ نکاح کی حاجت نہ رکھتی ہو۔

خاص کر صالحین کا ذکر اس لیے کیا کہ نکاح ان کے دین پر نگاہ رکھے اور اُن کی نیکوکاری کو اُن پر محفوظ رکھے اور اس واسطے کہ غلاموں میں سے صالحین وہی ہیں کہ اُن کے مالک ان پر شفقت رکھتے ہیں اور محبت ومودت میں اُن کو اولاد کی جگہ پر سمجھتے ہیں اور یہی صالح وصیت اور اہتمام کا مقام تھا کہ ان کے بارے میں وصیت کی جائے اور اُن کے ساتھ اعتناء (مہربانی) اور اہتمام ہو اور جو صالح نہیں ہے تو اس کا حال اس کے برعکس ہے۔ اللہ پاک نے صلاح کا ذکر غلام لونڈیوں میں کیا، آزاد لوگوں میں صلاح کا ذکر نہ فرمایا۔ اس لیے کہ آزاد مردوں میں غلاموں کی نسبت صلاح غالب ہوتی ہے۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ غلام اپنا نکاح خود نہ کرے، اس کا نکاح تو اس کا مالک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

[2] الدر المنثور (٦/ ١٨٨)

[3] تفسير الطبري (١٩/ ١٦٦)

[4] كشف الأستار (٢/ ١٤٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٤/ ٤٦٩)

[5] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٤٠)

کرائے اور اس کے نکاح کا وہی متولی ہو۔ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ مالک کو جائز ہے کہ اپنے غلام اور لونڈی کو نکاح کے لیے زبردستی کرے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زبردستی کرنا جائز نہیں ہے۔

پھر اللہ پاک نے آزاد لوگوں کے بیان کی طرف رجوع کیا تو فرمایا: ﴿ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ یعنی تم آزاد لوگوں کا نکاح کرانے سے اس وجہ سے باز نہ رہو کہ مرد و عورت مفلس ہیں، یا اُن میں سے ایک محتاج ہے یا ہو جائے گا، کیونکہ اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ پاک اپنے فضل و کرم سے ان کو غنی کر دے گا، اس لیے کہ اللہ کے فضل میں مال سے کفایت ہے، کیوں کہ مال کا تو یہ حال ہے کہ صبح کو آیا شام کو گیا اور باقی اور ہمیشہ رہنے والا تو اللہ ہی کا فضل ہے، اسی سے سب کام بنتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے نکاح پر آمادہ کیا ہے اور اس بات کی خبر دی ہے کہ وہ فقر کو دور کرنے کا سبب ہے۔[1] اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر فقیر کو نکاح کرنے کے بعد غنا حاصل ہو جائے گا، کیوں کہ یہ اللہ کی مشیت کے ساتھ مقید ہے۔ کبھی بہت سے فقیر ایسے پائے جاتے ہیں کہ جب وہ نکاح کرتے ہیں تو اُن کو غنا حاصل نہیں ہوتی۔ کسی نے کہا ہے کہ غنی کر دے گا، ان کو غنائے نفس کے ساتھ، یعنی قناعت دے گا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر وہ نکاح کے محتاج ہوں گے تو اُن کو اپنے فضل سے حلال کے ساتھ غنی کر دے گا اور وہ زنا سے پارسا ہو جائیں گے۔

وجہ اول زیادہ بہتر ہے اور اس پر دال ہے اللہ پاک کا یہ قول: ﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ﴾ [التوبة: ٢٨] ”اور اگر تمھیں تنگ دستی کا خوف ہے تو اگر اللہ چاہے گا تو تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔“ چنانچہ محمول ہوگا مطلق، جو اس جگہ ہے، اس مقید پر جو وہاں ہے۔ کسی نے کہا: غنا جمع ہونا ہے دو رزق کا ایک رزق خاوند کا اور ایک رزق بی بی کا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ نے نکاح کے ساتھ اور علاحدگی کے ساتھ غنا کا وعدہ کیا ہے، وہ آیت کریمہ یہ ہے: ﴿ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ﴾ [النساء: ١٣٠] ”اور اگر وہ دونوں (میاں بیوی) ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ اپنے فضل سے ہر ایک کو (دوسرے سے) بے نیاز کر دے گا۔“

جملہ ﴿ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ یقیناً اپنے ماقبل کا مؤکد ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ پاک بڑی وسعت والا ہے، اس کی ملکیت کی وسعت اس شخص کی غنا کو کم نہیں کرتی جس کو وہ اپنے بندوں میں سے غنی کرتا ہے۔ اپنے خلق کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے، جس کو چاہتا ہے غنی کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے فقیر کرتا ہے۔ پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کی حالت کا ذکر کیا جو نکاح سے عاجز ہیں، ان کی مناکحت کے جواز کو بیان کرنے کے بعد، اس لیے کہ جو بات زیادہ صحیح اور افضل ہے اس کی طرف اُن کو ارشاد کرے۔[2] چنانچہ فرمایا:

---

[1] معاني القرآن (٤/ ٤٠) [2] فتح البيان (٩/ ٢١٣۔ ٢١٦)

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

اور جو لوگ نکاح (کی طاقت) نہیں پاتے، انھیں پاک دامن رہنا چاہیے، حتی کہ اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے۔

نکاح کی استطاعت نہ رکھنے والوں کو پاک دامنی اختیار کرنے کا حکم:

یہ اللہ کی طرف سے حرام سے بچنے کا حکم ہے، اس شخص کے لیے جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ»[1] (الحدیث) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ آیت مطلق ہے اور جو آیت سورۃ النساء میں ہے، وہ اس سے زیادہ خاص ہے۔ یعنی قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ [النساء: ۲۵] ''اور تم میں سے جو شخص آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، وہ تمھاری ملکیت مومن لونڈیوں میں سے کسی لونڈی سے نکاح کر لے، اور اللہ تمھارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے، تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو (تم میں برتری کا معیار صرف ایمان ہے) پس تم ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لو اور انھیں دستور کے مطابق ان کے مہر دو، جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چوری چھپے آشنا بنانے والی ہوں، پھر جب وہ نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد وہ بدکاری کریں تو ان کی سزا آزاد عورتوں کی سزا کا نصف ہے۔ یہ (اجازت) تم میں سے اس کے لیے ہے جسے گناہ کی راہ پر چلنے کا اندیشہ ہو اور یہ کہ تم صبر کرو، تمھارے لیے بہتر ہے۔''

یعنی لونڈیوں سے نکاح کرنے سے تمھارا صبر کرنا بہتر ہے تمھارے لیے، کیوں کہ بچہ غلام پیدا ہوگا۔ ﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے: یہ وہ شخص ہے کہ عورت کو دیکھتا ہے تو گویا اس کی خواہش کرتا ہے، اگر اس کی بیوی ہے تو اس کے پاس جائے اور اس سے اپنی کارروائی کر لے اور اگر اس کی بیوی نہیں ہے تو آسمان و زمین کے ملک میں نظر کرے، یہاں تک کہ اللہ اس کو مقدور دے۔[2] مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی عجیب و غریب چیزوں میں غور کرے۔ اللہ پاک کی قدرتِ تامہ کو ملاحظہ کرے، تاکہ خیال اس طرف ہو جائے اور جماع کی فکر جاتی رہے۔[3] (كذا في ابن كثير)

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٠)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٨٢) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٨٠۔ ٣٨١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جب کوئی شخص عفیف و پارسا ہونا چاہے تو عرب کی بول چال میں کہتے ہیں "اِسْتَعَفَّ"، یعنی اس نے پارسائی طلب کی۔ معنی یہ ہیں کہ جس شخص کے پاس اتنا مال نہیں ہے کہ وہ اس کے نکاح کرنے کا سبب بن سکے تو اسے چاہیے کہ زنا و حرام کے بجائے عفت اور پارسائی طلب کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ نکاح سے مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ عورت سے نکاح کیا جاتا ہے، یعنی حق مہر و نفقہ جس طرح کے لحاف (اُوڑھنے کی چیز) اور پہننے کا لباس وغیرہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ جو شخص نہیں پاتا، یہ چیزیں اسے چاہیے کہ نکاح کر لے، بے شک اللہ عن قریب اس کو غنی کر دے گا۔[1] اللہ پاک نے اس نہی کو اس نتیجے کے ساتھ مقید کیا تھا کہ ﴿ حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ یعنی یہاں تک کہ اللہ اُن کو ایسی روزی عطا فرمائے کہ جس کے سبب سے وہ مستغنی ہو جائیں اور اس کی وجہ سے نکاح پر قادر ہوں۔

اس آیت میں وہ شے ہے جو دال ہے اس بات پر کہ جملہ اولیٰ یعنی ﴿ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ مشیت کے ساتھ مقید ہے، جس طرح کہ ہم ذکر کر آئے ہیں، کیوں کہ اگر وہ وعدہ غنا حاصل کرنے میں حتمی اور ضروری ہوتا تو غنا اور نکاح دونوں باہم متلازم (یعنی لازم و ملزوم) ہوتے۔ اب فقیری کے ساتھ پاک دامنی کے حکم کا کچھ ایسا بڑا فائدہ نہ ہوتا، کیوں کہ وہ تو نکاح کرنے کے وقت لامحالہ غنی ہو جائے گا تو اس کے نکاح کرنے کا ایک مقصد مفلسی میں غنا حاصل کرنا ہے، مگر ہاں اس طرح کہیں کہ استعفاف، یعنی پاک دامنی کا حکم اس شخص کو ہے جو نکاح کے لیے ابتدائی اشیاء کے حاصل کرنے سے عاجز ہے اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ نکاح کے بعد اس کو غنا حاصل ہو جائے، کیونکہ اس پر یہ بات صادق آ چکی کہ اس نے نکاح کو اس لیے نہ پایا کہ اس کو نکاح کرنے کے لیے ضروری اسباب، یعنی مال حاصل نہیں تھا۔ اس جگہ ذرا غور کرنا چاہیے کہ اللہ پاک نے ان احکام کو کس طرح پر ترتیب وار ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ پہلے تو ایسی شے کا امر کیا جو فتنے سے بچائے، گناہ کے واقع ہونے سے دور رکھے، یعنی نگاہ کا نیچے کرنا۔ پھر نکاح کا حکم فرمایا جو دین کو محفوظ رکھتا ہے، حرام سے بے نیاز کرتا ہے۔ پھر یہ حکم کیا کہ نفس کو، جو برائی کی طرف راغب کرنے والا ہے، شہوت کی طرف نظر بڑھانے سے بچائے، جب وہ نکاح کرنے سے عاجز ہو، یہاں تک کہ اسے نکاح کی استطاعت حاصل ہو جائے۔ کس حسن و جمال کے ساتھ سارے احکام کو ترتیب وار ذکر فرمایا: "سبحانك ما أحسن بيانك"، الٰہی سیدی مولائی یہ تیرا ہی کام ہے، کیوں کہ تو سارے فصیح اور بلیغ لوگوں کا خالق ہے:

---

[1] الدر المنثور (٦/ ١٨٩)

نہ کوئی ذات میں تیرا شریک و ہمتا ہے نہ کوئی بات میں تیرا شبیہ و ہمسر ہے

پھر جب اللہ پاک صالح لونڈی و غلاموں کے نکاح کرانے میں ترغیب دلا چکا تو اب مالکوں کو ایک ایسے طریقے کا ارشاد کیا جس سے غلام آزاد لوگوں کی طرح ہو جاتا ہے۔[1] لہٰذا فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰكُمْ ۭ

اور جن (لونڈیوں یا غلاموں) کے تمھارے دائیں ہاتھ مالک بنے ہیں مکاتبت کرنا (آزادی کی تحریر لکھانا) چاہیں، اگر تمھیں ان میں کوئی بھلائی معلوم ہو تو تم ان سے مکاتبت کر لو اور تم انھیں اللہ کے اس مال میں سے دو، جو اس نے تمھیں دیا ہے۔

غلام لونڈیوں سے مکاتبت کا حکم:

آزادی کی تحریر کرانا چاہے، یعنی کسی کا غلام یا لونڈی کہے کہ میں اتنی مدت میں تجھ کو کما کر اتنی رقم دے دوں تو مجھ کو آزاد کر دینا، یہ اقرار لکھا لیں اس کو کتابت کہتے ہیں، جو اس میں نیکی دیکھے تو لکھ دے۔ نیکی یہ کہ قید سے آزاد ہو کر چوری بدکاری نہ کرے گا۔ دولت مندوں کو فرمایا کہ ایسے غلاموں اور لونڈیوں کی مال سے مدد کرو، تاکہ آزاد ہو جائیں۔ ان کی مدد خواہ مالِ زکات سے کرو، خواہ خیرات سے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مالکوں کو حکم ہے کہ جس وقت اُن کے غلام اُن سے آزادی کی تحریر کرانا چاہیں تو وہ اُن کو کر دیں، بشرطیکہ اس غلام کے لیے کوئی ذریعۂ معاش ہو اور جس مال کی اپنے مالک سے شرط کی ہے اس کو ادا کرے۔ بہت سے علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ حکم ارشادی و استحبابی ہے، حتمی اور واجب کا حکم نہیں ہے، بلکہ مالک کو اختیار دیا گیا ہے کہ جب اس کا غلام اس سے مکاتبت طلب کرے تو اگر چاہے تو اس کو مکاتب کرے، چاہے نہ کرے۔ امام ثوری نے عن جابر عن الشعبی روایت کیا ہے، اگر چاہے اس کو مکاتب کرے چاہے نہ کرے۔ اسی طرح ابن وہب نے عطاء بن ابی رباح سے روایت کیا ہے اور اسی طرح مقاتل بن حیان اور حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] دوسرے لوگ اس طرف گئے ہیں کہ مالک پر واجب ہے کہ جب اس کا غلام کتابت طلب کرے تو اس کو مکاتب کر دے، انھوں نے اس امر کے ظاہر الفاظ کو لیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رَوح نے امام ابن جریج رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عطاء سے کہا: کیا مجھ پر واجب ہے کہ جب میں جان لوں کہ غلام کا مال ہے تو اس کو مکاتب کروں؟ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: میں اس کو واجب ہی گمان کرتا ہوں۔ عمرو بن دینار رحمہ اللہ نے کہا: میں نے

---

[1] فتح البیان (٩/ ٢١٦)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٨٣)

امام عطاء رحمہ اللہ سے کہا: کیا تو اس بات کو کسی سے نقل کرتا ہے؟ کہا: نہیں۔ پھر مجھے یہ خبر دی کہ موسیٰ بن انس نے اس کو اس بات کی خبر دی کہ امام سیرین رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مکاتبت کا سوال کیا اور وہ بہت مال والا تھا تو انس نے نہ مانا۔

پھر سیرین عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ تو اس کو مکاتب کر دے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے انکار کیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو درّے سے مارا، وہ یہ آیت پڑھتے تھے: ﴿ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ﴾ پس سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے سیرین کو مکاتب کر دیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی طرح اس کو معلق ذکر کیا ہے۔[1] (ورواه عبدالرزاق، أخبرنا ابن جريج، قال: قلت لعطاء: أواجب علي إذا علمت له مالا أن أكاتبه؟ قال: ما أراه إلا واجبا) امام ابن جریج نے بروایتِ قتادہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیرین نے چاہا کہ اس کو مکاتب کر دیں تو انس رضی اللہ عنہ نے اس پر توقف کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: البتہ تو اس کو مکاتب کر دے۔[2] یہ اسناد صحیح ہے۔ سعید بن منصور نے ضحاک سے روایت کیا ہے، کہا کہ ''هِيَ عَزْمَةٌ''، یعنی کتابت واجب ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قولِ قدیم بھی یہی ہے۔ قولِ جدید میں اس طرف گئے ہیں کہ واجب نہیں ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی مرد مسلمان کا مال حلال نہیں ہے مگر جی کی خوشی سے۔[3] امام ابن وہب نے کہا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک بات یہ ہے کہ غلام کے مالک پر یہ لازم نہیں ہے کہ جب وہ اس سے سوال کرے کہ اسے مکاتب کر دے تو وہ کر دے۔ میں نے ائمہ میں سے کسی کو نہیں سنا کہ کسی کو اس بات پر مجبور کیا ہو کہ اپنے غلام کو مکاتب کر دے۔ یہ تو اللہ پاک کی طرف سے ایک امر ہے اور لوگوں کے لیے اذن ہے، ولجب نہیں ہے۔ اسی طرح ثوری رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہم نے کہا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے آیت کے ظاہری الفاظ کے سبب سے وجوب کے قول کو اختیار کیا ہے۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ﴾ بعض نے کہا ہے کہ خیر سے مراد امانت ہے۔ کسی نے کہا: صدق۔ کسی نے کہا: مال۔ کسی نے کہا: حیلہ وکسب۔ امام ابو داود نے مراسیل میں یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ﴾ فرمایا: اگر تم اُن میں کوئی ہنر جانو اور اُن کو لوگوں پر بار نہ چھوڑو۔[5] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاٰتُوْهُمْ ﴾ میں مفسروں کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اُن کے لیے کتابت میں سے کچھ کم کر دو۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک چوتھائی مقدار۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک تہائی۔ کسی نے کہا: نصف۔ کسی نے کہا ہے کہ بغیر کسی حد کے کتابت کا ایک حصہ کم کر دو۔ دوسروں نے کہا ہے کہ بلکہ اس سے مراد وہ حصہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢/ ٩٠٢)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ١٦٧)
[3] مسند أحمد (٥/ ٧٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦٦٢)
[4] تفسير الطبري (١٩/ ١٦٧۔ ١٦٨)
[5] سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ٣١٧) یہ روایت مرسل ہے۔

ہے جو اللہ پاک نے اُن کے لیے اموالِ زکات میں سے مقرر کیا ہے۔ یہ قول امام حسن، عبدالرحمن بن زید بن اسلم، زید بن اسلم اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ کا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ لوگوں کو اس پر رغبت دلائی ہے، وہ اس کا مالک ہو یا کوئی اور۔ اسی طرح بریدہ بن حصیب اسلمی اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ رقاب (غلام آزاد کرانے) میں اعانت کریں،[1] وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین آدمی ہیں کہ اللہ پر اُن کی مدد کرنا حق ہے۔ ان میں سے مکاتب کا ذکر کیا ہے جو ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔[2] پہلا قول مشہور تر ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا ہے کہ انھوں نے اپنے ایک غلام کو مکاتب کیا، جس کی کنیت ابو اُمیہ تھی، وہ اپنی قسط لے کر آیا، جبکہ اس کا وقت آیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابو اُمیہ! تو جا اس سے اپنی مکاتبت میں مدد لے۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین! اگر آپ اس کو رکھ چھوڑیں، یہاں تک کہ یہ آخر قسط ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اس وقت کو نہ پاؤں۔

پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ ﴾ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ اول قسط ہے جو اسلام میں ادا کی گئی۔[3] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب کسی کو مکاتب کرتے تو اس کی پہلی قسطوں میں سے کچھ معاف نہیں کرتے تھے، اس خوف سے کہ وہ عاجز ہو جائے تو اُن کا صدقہ انھیں کی طرف لوٹ آئے، لیکن جب وہ اپنی مکاتبت کے آخر میں ہوتا تو اس میں سے جو چاہے معاف کر دیتے۔[4] علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ فرمایا: "ضَعُوْا عَنْهُمْ" یعنی "مِنْ مَّكَاتَبَتِهِمْ" یعنی ان کی مکاتبت سے کچھ معاف کر دو۔ اسی طرح امام مجاہد، عطاء، قاسم بن ابی بزہ، عبدالکریم بن مالک جزری اور سدی رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو یعنی صحابہ کو یہ بات پسند آتی تھی کہ آدمی اپنے مکاتب کے لیے اس کی مکاتبت سے ایک حصہ چھوڑ دے۔[5] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: چوتھا حصہ کتابت کا چھوڑ دو۔[6] (هذا حديث غريب رفعه منكر، والأشبه أنه موقوف على علي رضي الله عنه كما رواه أبو عبد الرحمن السلمي رحمه الله)

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٧٣) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٨٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٥٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥١٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٥٠)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٨٧) [4] تفسير الطبري (١٩/ ١٧٢) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٨٧_ ٢٥٨٨)

[6] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٨٦_ ٢٥٨٧) تفسير الطبري (١٩/ ١٧٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٨١_ ٣٨٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ کتاب مصدر ہے "کَاتَبَ" کا مثل "مکاتبت" کے۔ عرب کے لوگ یوں بولتے ہیں: "کَاتَبَ یُکَاتِبُ مُکَاتَبَۃً" جیسے یوں کہتے ہیں: "قَاتَلَ یُقَاتِلُ قِتَالًا وَّمُقَاتَلَۃً" کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ کتاب ایک اسمِ معین ہے اس خط کے لیے جس میں کوئی چیز لکھی جاتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگ جب غلام کو مکاتب کرتے تو ایک تحریر کرتے، جو مالک اور مکاتب غلام کے لیے موثر ہوتی۔ اس بنا پر معنی یہ ہوں گے: وہ لوگ جو مکاتبت کی تحریر طلب کرتے ہیں۔ شرع میں مکاتبت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے غلام کو مکاتب کرے، اس مال پر جس کو وہ قسط وار ادا کرے گا، پھر جس وقت اس کو ادا کر دے گا تو وہ آزاد ہے۔ عبداللہ بن صبیح نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ کہا: میں حویطب بن عبدالعزیٰ رضی اللہ عنہ کا غلام تھا، میں نے اس سے کتابت کا سوال کیا تو اس نے نہ مانا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَكَاتِبُوهُمْ ﴾ کا ظاہر یہ ہے کہ غلام جس وقت اپنے مالک سے مکاتبت طلب کرے تو اس پر واجب ہے کہ اس کو مکاتب کر دے۔ اس شرط کے ساتھ، یعنی ﴿ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا ﴾۔ خیر سے مراد کتابت کی رقم ادا کرنے کی قدرت ہے۔ گو بالفعل اس کے پاس مال نہ ہو۔ کسی نے کہا: مراد صرف مال ہے۔ اس طرف امام مجاہد، حسن، عطاء، ضحاک اور طاؤس رحمہم اللہ گئے ہیں[2] اور یہ قول سیدنا علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد امانت اور پورا کرنا ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ اگر تو اپنے مکاتب کو جانے کہ وہ ادا کر دے گا۔ ان کا تیسرا قول یہ ہے کہ مراد حیلہ ہے اور تم اُن کا بوجھ مسلمانوں پر مت ڈالو۔ امام نافع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس بات کو مکروہ سمجھتے تھے کہ اپنے غلام کو مکاتب کریں، جبکہ اس کے پاس کوئی ہنر اور پیشہ نہ ہوتا اور کہتے کہ تو مجھے لوگوں کے میل کچیل سے کھلائے گا۔[3] مراد یہ ہے کہ جب کوئی پیشہ نہ ہوگا جس سے کتابت کی رقم ادا کرے تو لوگوں سے صدقہ خیرات مانگ کر قسط میں دے گا۔ پہلے قول کی طرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور ابن زید رضی اللہ عنہ گئے ہیں اور اسی کو امام مالک اور امام شافعی، فراء اور زجاج رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے کہ اگر تم اُمید رکھو گے کہ کتابت کی شرط کے مطابق اس کو پورا کرنے اور مال ادا کرنے کی صلاحیت ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: جبکہ اللہ پاک نے ﴿ فِيهِمْ ﴾ کا کلمہ فرمایا ہے تو ظاہر یہ ہے کہ خیر سے مراد کمائی کرنا اور امانت کو پورا کرنا اور ادا کرنا ہو۔ امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خیر دین اور امانت ہے، اسی کے مثل امام حسن رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اقامتِ نماز مراد ہے۔ امام

[1] الدر المنثور (٦/ ١٨٩) [2] فتح القدير (٤/ ٤٠) [3] سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ٣١٨١)

طحاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے کہا ہے کہ خیر مال ہے، ہمارے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ غلام تو خود اپنے مولیٰ کا مال ہے۔ پھر اس کا مال کیونکر ہوگا۔ ہمارے نزدیک معنی یہ ہیں کہ تم اُن میں دین داری اور سچائی جانو۔

امام ابو عمر بن عبدالبر نے کہا ہے کہ جو شخص اس کا قائل ہے کہ خیر سے مراد یہاں مال نہیں ہے اس نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ یوں کہیں: ''إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ مَالًا''۔ محاورے میں جو بولتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ میں نے فلاں میں خیر و صلاح و امانت کو پایا، یوں نہیں بولتے کہ میں نے اس میں مال پایا۔ یہ اس اختلاف کا حاصل ہے جو اہلِ علم کے درمیان خیر مذکور کی تعبیر میں واقع ہوا ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو چکی تو جاننا چاہیے کہ ظاہر وجوب کی طرف، جس کا امرِ مذکور مقتضی ہے، امام عکرمہ، عطاء، مسروق، عمرو بن دینار، ضحاک اور اہل ظاہر رحمہم اللہ گئے ہیں۔ کہا ہے کہ مالک پر واجب ہے کہ اپنے غلام کو مکاتب کرے، جبکہ وہ اس سے مکاتبت طلب کرے اور اس میں خیر جانے۔

جمہور اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ واجب نہیں ہے۔ انھوں نے اس اجماع سے تمسک کیا ہے جو اس بات پر ہوا ہے کہ اگر غلام اپنے مالک سے سوال کرے کہ اسے دوسرے کو بیچ ڈالے تو اس پر بیع کرنا واجب نہیں ہے اور نہ اس پر جبر کیا جائے گا۔ اسی طرح کتابت ہے، کیوں کہ یہ بھی معاوضہ ہے۔ یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیے کہ یہ ایک واہی حجت ہے اور شبہہ مائل از حق ہے۔ حق وہی قول ہے جو اول لوگوں نے کہا ہے اور سیدنا عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اسی کے قائل ہیں اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور سیرین کا قصہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک دو قسط سے کم پر کتابت جائز نہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ایک قسط تک اس کو جائز رکھا ہے۔ کسی نے کہا کہ حکم مطلق ہے، پس حالاً و مؤجلاً اور منجم و غیر منجم ہر طرح جائز ہے۔ پھر اللہ پاک نے مالکوں کو حکم کیا کہ مکاتب غلاموں پر احسان کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ﴾ اس میں مالکوں کو حکم ہے کہ مکاتبوں کی مالِ کتابت پر مدد کریں۔ یہ اعانت یا تو اس طرح کریں کہ مال میں سے کچھ ان کو دے دیں، یا کتابت کا جو مال مقرر ہوا ہے اس سے کچھ کم کر دیں۔

ظاہر آیت یہ ہے کہ اس کی کوئی مقررہ مقدار نہ ہو۔ مقدار کے بارے میں تین قول پہلے گزر چکے ہیں۔ کسی نے کہا: تیسرا حصہ۔ کسی نے کہا: چوتھا حصہ۔ کسی نے دسواں حصہ کہا ہے۔ شاید مالکوں کے ساتھ اس امر کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انہیں کے بارے میں گفتگو ہے اور سیاقِ کلام بھی انہیں کے ساتھ ہے، کیونکہ کتابت کا حکم انہیں کو ہے۔ امام حسن، امام نخعی اور بریدہ رحمہم اللہ نے یہ کہا ہے کہ ﴿ وَاٰتُوْهُمْ ﴾ کا خطاب سارے لوگوں کو ہے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خطاب حکام کو ہے کہ مالِ صدقہ سے مکاتبوں کو اُن کا حصہ دیں، جس طرح کہ اللہ پاک کے اس قول میں ہے: ﴿ وَفِي الرِّقَابِ ﴾ [البقرة: ۱۷۷] ''اور گردنیں چھڑانے کے لیے۔''[2] مکاتب کے لیے احکام معروف

[1] فتح القدير (٤/ ٤٠۔ ٤١)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ١٧٣)

اور مشہور ہیں، جبکہ وہ کتابت کی قیمت میں سے کچھ ادا کر دے۔

﴿ اٰتُوْهُمْ ﴾ کا حکم اللہ پاک کی طرف سے یہ بتانے کے لیے ہے کہ یہ کچھ فرض نہیں ہے، لیکن اس میں اجر ہے۔ صاحبِ جمل نے کہا ہے کہ امر وجوب کے لیے ہے۔ شاید یہ قول انھیں لوگوں کے قول کی بنا پر ہے کہ جو وجوب کے قائل ہیں۔ پھر جب اللہ پاک نے مالکوں کو صالح غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کی طرف ارشاد کیا تو مسلمانوں کو اس بات سے ممانعت کی جس کو جاہلیت والے کیا کرتے تھے، یعنی اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرتے اور اُن سے زبردستی زنا کرواتے اور اس کی خرچی کھاتے۔[1] لٰہذا فرمایا:

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

اور تمھاری لونڈیاں اگر پاک دامن رہنا چاہیں تو تم دنیاوی زندگی کا سامان تلاش کرنے کی خاطر انھیں بدکاری پر مجبور نہ کرو اور جو کوئی انھیں مجبور کرے تو بے شک ان کے مجبور کیے جانے کے بعد اللہ (ان کے لیے) غفور رحیم ہے ﴿33﴾

لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرنے کی ممانعت:

مال کمانے کے لیے لونڈیوں سے بدکاری کرانا بڑا وبال ہے۔ وہ خوش ہوں یا ناخوش۔ ناخوشی پر زیادہ وبال ہے، وہ مال سب ناپاک ہے اور ناخوشی میں لونڈی بے گناہ ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جاہلیت والوں کی یہ عادت تھی کہ جب اُن میں سے کسی کی لونڈی ہوتی تو اس کو چھوڑ دیتا کہ زنا کرے اور اس پر ایک اُجرت مقرر کر دیتا، ہر وقت اس کو اس سے لیا کرتا تھا۔ پھر جب اسلام دنیا میں رونق بخش ہوا اور کفر و شرک اور گمراہی کی تاریکی کو دنیا سے دور کیا تو اللہ پاک نے مومنین کو اس سے ممانعت کر دی۔ سلف و خلف کے بہت سے مفسروں نے جو ذکر کیا ہے، اس میں اس آیتِ کریمہ کا سببِ نزول یہ بیان ہوا ہے کہ یہ عبداللہ بن ابی ابن سلول منافق کے حق میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ اس کی لونڈیاں تھیں، یہ اُن کی خرچی کی خاطر اور اُن کی اولاد کی رغبت کی خاطر اُن کو بدکاری پر مجبور کرتا تھا، تاکہ اُن کی زیادہ اولاد سے ریاست حاصل کرے، یہ بات اس کے گمان میں تھی۔ اس بارے میں جو آثار وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

① حافظ ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق بزار نے زہری سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی ابن سلول کی ایک

---

[1] فتح البیان (۹/ ۲۱۶۔ ۲۱۹)

لونڈی تھی، اس کو معاذہ کہتے تھے، وہ اس کو زنا پر زبردستی کیا کرتا تھا، پھر جب اسلام آیا تو یہ آیت نازل ہوئی:
﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا ﴾[1]

④ اعمش نے عن ابی سفیان عن جابر روایت کیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی ابن سلول کی ایک لونڈی کے حق میں نازل ہوئی ہے، اس کو مسیکہ کہتے تھے، فجور پر اس کو زبردستی کیا کرتا تھا، اس لونڈی میں کوئی برائی نہ تھی تو وہ انکار کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾[2] ۔ (وروى النسائي من حديث ابن جريج عن أبي الزبير عن جابر نحوه)

③ امام ابو داود طیالسی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی ابن سلول کی ایک لونڈی جاہلیت میں زنا کیا کرتی تھی تو اس نے زنا سے اولاد جنی۔ پھر اس سے کہا: تجھے کیا ہے تو زنا نہیں کرتی، وہ بولی: واللہ! میں زنا نہیں کروں گی، لہٰذا اس کو مارا، اس پر اللہ عزوجل نے آیتِ مذکور نازل فرمائی۔[3]

④ نیز بزار نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن اُبی کی ایک لونڈی تھی، اس کو معاذہ کہتے تھے، زنا پر اس کو زبردستی کیا کرتا تھا۔ پھر جب اسلام آیا تو آیتِ مذکور نازل ہوئی۔[4]

⑤ عبدالرزاق رحمہ اللہ نے زہری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ قریش کا ایک شخص بدر کے دن قید ہوا اور عبداللہ بن اُبی قید تھا۔ اس کی ایک لونڈی تھی، اس کو معاذہ کہتے تھے، قریشی مرد اس سے زنا کرنا چاہتا تھا اور وہ لونڈی مسلمان تھی، اپنے اسلام کی وجہ سے زنا سے رُکتی تھی۔ عبداللہ بن اُبی اس کو زنا پر زبردستی کرتا تھا اور اسے مارتا تھا اس اُمید پر کہ قریشی کا اسے حمل رہ جائے تو اس کے بچے کا فدیہ طلب کرے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾[5]۔

⑥ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ عبداللہ بن ابی ابن سلول رأس المنافقین کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کی ایک لونڈی تھی، اسے معاذہ کہتے تھے، عبداللہ کے پاس جب کوئی آتا تو اس کو مہمان کی طرف بھیج دیتا، تاکہ وہ اس سے جماع کرے۔ "إِرَادَةَ الثَّوَابِ مِنْهُ وَالْكَرَامَةِ لَهُ" یعنی یہ کام دو وجہ سے کرتا تھا: ایک یہ کہ

---

① مسند البزار (١٣/ ٤٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه محمد بن الحجاج اللخمي وهو كذاب" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٩٢)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٢٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤١٩)

③ المعجم الكبير (١١/ ٢٨٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال الطبراني رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٩٢)

④ مسند البزار (١٣/ ٤٣) ⑤ تفسير الطبري (١٩/ ١٧٥) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٨٩۔ ٢٥٩٠)

اس سے اُجرت حاصل ہو۔ دوسرے مہمان کی تعظیم وتکریم ہو۔ پھر وہ لونڈی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف آئی تو اُن سے اس کی شکایت کی۔ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کے روک رکھنے کا حکم دیا۔ عبداللہ بن ابی چلایا کہ کون ہماری مدد کرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ وہ ہماری لونڈی پر غلبہ کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے ان کے حق میں یہ آیت نازل کی۔

⑦ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: واللہ اعلم، مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ یہ آیت دو شخصوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اپنی دو لونڈیوں پر زبردستی کیا کرتے تھے: ایک کا نام مسیکہ تھا، یہ انصار کی تھی اور اُمیمہ اُمِ مسیکہ، یہ عبداللہ بن ابی کی تھی اور معاذہ واروی اسی رُتبے میں تھیں۔ مسیکہ اور اس کی ماں دونوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ ﴾ یعنی زنا پر مجبور نہ کرو۔[1] (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے حاشیہ پر مصحح مطبع نے یہ لکھا ہے: ''وَكَانَتْ أُمَيْمَة... الخ'' (كذا بالنسخ بأيدينا و حرر انتهى) غرض اس سے یہ ہے کہ ہمارے پاس کے نسخِ موجودہ میں اسی طرح ہے اور اس میں شبہہ ہے اس کو صاف کرو۔ واللہ أعلم۔ وہ کیا شبہہ ہے، ہاں البتہ یہ شبہہ معلوم ہوتا ہے کہ اول روایتوں میں یہ ذکر ہے کہ عبداللہ کی دو لونڈیاں تھیں: ایک مسیکہ دوسری معاذہ اور اس روایت میں مسیکہ کو انصار کی لونڈی کہا ہے اور اُمیمہ مسیکہ کی ماں کو عبداللہ کی لونڈی کہا ہے اور معاذہ واروی کو اسی منزلہ میں ٹھہرایا ہے، یعنی جس طرح مسیکہ و اُمیمہ ہیں کہ مسیکہ بیٹی اور اُمیمہ اس کی ماں ہے، اسی طرح شاید معاذہ بیٹی اور اروی اس کی ماں ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ﴾ یہ قید خارج مخرجِ غالب ہے، یعنی احترازی قید نہیں ہے، بلکہ واقع میں اسی طرح تھا، اس لیے یوں ذکر کر دیا، اس کا کوئی مفہوم مخالف نہیں ہے، کیوں کہ زنا ہر طرح حرام ہے خوشی سے ہو یا ناخوشی سے۔ ﴿ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ سے مراد لونڈیوں کا خراج ومہر واولاد ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگی لگانے والے کی کمائی سے اور زانیہ کی خرچی اور کاہن کی اُجرت سے ممانعت فرمائی ہے۔[2] ایک روایت میں یوں ہے: زانیہ کا مہر خبیث ہے اور حجام (سینگی لگانے والے) کی کمائی خبیث ہے اور کتے کی قیمت خبیث ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک لونڈیوں کے واسطے بخشنے والا ہے، جس طرح کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے۔ (یہ حوالہ جو دیا ہے تو پہلے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی دو روایتیں

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٦٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦٨)

گزری ہیں، اُن میں اس کی تصریح نہیں ہے۔ واللہ أعلم۔) امام ابن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، پھر اگر تم نے کیا تو بے شک اللہ اُن کے واسطے غفور رحیم ہے اور اُن کا گناہ اس پر ہے جس نے ان پر زبردستی کی۔ امام مجاہد، عطاء خراسانی، اعمش اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1] ابو عبیدہ نے بسندِ خود حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: "لَهُنَّ وَاللّٰهِ! لَهُنَّ وَاللّٰهِ!" یعنی واللہ! وہ اُن کو بخشنے والا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: بخش دیا اس کو جس پر وہ زبردستی کی گئیں۔

زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: غفور رحیم ہے ان لونڈیوں کے واسطے جن پر زبردستی کی گئی۔[2] امام ابن منذر رحمہ اللہ نے ان سب کو اپنی تفسیر میں بہ سندِ خود روایت کیا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: "فَإِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ لَهُنَّ وَإِثْمُهُنَّ عَلَى مَنْ أَكْرَهَهُنَّ"[3] مرفوع حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت سے اُٹھا لیا گیا خطا اور نسیان (بھول) اور وہ شے جس پر زبردستی کی گئی۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اس جگہ فتیات سے مراد لونڈیاں ہیں۔ اگرچہ فتیٰ و فتاۃ کا اطلاق دوسری جگہوں میں کبھی آزاد لوگوں پر بھی ہوتا ہے۔ اور فتیٰ جواں مرد کو کہتے ہیں اور فتاۃ جواں عورت کو۔ بغاء بہ کسر و مد مصدر ہے: "بَغَتِ الْمَرْأَةُ تَبْغِيْ بَغْيًا" کا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب عورت زنا اور فجور کرے۔ کلمۂ "بغاء" عورتوں کے زنا کے ساتھ خاص ہے۔ مرد جب زنا کرے تو اس کے لیے یہ لفظ "بَغِي" نہیں بولتے۔ یہ قول امام ازہری رحمہ اللہ کا ہے۔ "بَغِيّ" زانیہ عورت کو کہتے ہیں، اس کی جمع "بغایا" آتی ہے۔ اور "بغی" بولتے ہیں قینہ کو۔ قینہ گانے والی عورت کو کہتے ہیں، گو وہ پارسا ہو فجور کے ثبوت نہ ہونے کے سبب سے اس کے اصل میں۔ یہ قول امام جوہری رحمہ اللہ کا ہے۔ اس سے مراد گالی نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ وہ تو لقب کی طرح ایک نام قرار دیا گیا ہے۔

غرضیکہ اللہ پاک نے ﴿لَا تُكْرِهُوْا﴾ کی نہی کو ﴿اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ سے اس لیے مشروط کیا ہے کہ "إکراہ" کا تصور اسی وقت ہوتا ہے کہ وہ "تحصن" کا ارادہ کریں، کیوں کہ جو عورت تحصن کا ارادہ نہیں کرتی تو یہ کہنا درست نہیں کہ وہ زنا پر زبردستی کی گئی ہے۔ اس جگہ تحصن سے مراد پاک دامنی اور تزوج ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ قید "أیامی" کی طرف راجع ہے۔ امام زجاج اور حسن بن فضل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر یہ ہے:

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩١۔ ٢٥٩٢) [2] تفسیر الطبري (١٩/ ١٧٦) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩١)

[4] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (٢٠٤٣) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٨٢۔ ٣٨٤) صحیح الجامع، رقم الحدیث (١٧٣١)

"وَأَنْكِحُوا الْأَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَآءِكُمْ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا"[1] کسی نے کہا: یہ شرط ملغیٰ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شرط اس بات کے اعتبار سے ہے جس پر وہ لوگ قائم تھے، کیونکہ وہ لونڈیوں پر سختی کیا کرتے تھے اور وہ پارسائی کا ارادہ کرتی تھیں۔ مجبور کرنے کی ممانعت صرف اس صورت کے لیے خاص نہیں کہ جب وہ پارسائی کا ارادہ کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شرط خارج مخرجِ غالب ہے۔ چنانچہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس لیے غالب بھی یہ ہے کہ زبردستی نہیں ہوتی مگر اسی وقت جب پارسائی کا ارادہ ہو۔

چنانچہ اس سے زبردستی یا مجبور کرنے کا جواز اس وقت لازم نہیں آتا، جب پارسائی کا ارادہ ہی نہ ہو۔ یہ وجہ تمام وجوں سے زیادہ قوی ہے۔ اس لیے کہ لونڈی کبھی نہ حلال کا ارادہ کرنے والی ہوتی ہے نہ حرام کا، جیسے وہ لونڈی جس کو نکاح میں کسی طرح کی رغبت نہیں ہے اور کم سن لونڈی، تو اس کا وصف یوں کیا جاتا ہے کہ وہ زنا کے لیے زبردستی کی گئی، باوجود اس کے کہ اس کا ارادہ پارسائی کا نہیں ہے، چنانچہ وہ بات جو کی گئی تھی کہ جبر کا تصور نہیں کیا جا سکتا، مگر اسی وقت جب کہ ارادۂ پارسائی ہو تو وہ تمام نہیں ہوتی، مگر یوں کہا جائے کہ اس جگہ "تحصن" سے مراد صرف پاک دامنی ہے اور جو عورت نکاح کا ارادہ رکھتی ہے، اس پر یہ بات صادق نہیں آتی کہ وہ پارسائی کا ارادہ کرنے والی ہے اور یہ بات بعید ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ تحصن سے مراد تعفف (پاک دامنی) اور تزوج (نکاح) ہے اور اس پر اُن کے غیر نے اُن کی متابعت کی ہے۔[2] امام مسلم، سعید بن منصور اور ابن ابی شیبہ رحمہم اللہ وغیرہم نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی اپنی کسی لونڈی سے کہتا کہ چلی جا اور ہمارے واسطے کچھ کما لا اور وہ ناخوش ہوتی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی ایک لونڈی تھی، اسے مسیکہ کہتے تھے۔ (اس روایت میں مسیکہ و اُمیمہ دونوں کو عبداللہ کی لونڈیاں ٹھہرایا ہے) اور دوسری کو اُمیمہ اور وہ چاہتا تھا کہ وہ زنا کریں تو انھوں نے اس کی شکایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[3]

پھر اللہ پاک نے اس ممانعت کی وجہ یہ بیان فرمائی: ﴿ لِتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ عرض سے مراد وہ مال ہے جس کو لونڈی اپنی شرم گاہ سے کماتی ہے۔ یہ علت بھی خارج مخرجِ غالب ہے۔ معنی یہ ہیں کہ یہ عرض وہی ہے جو اُن کو لونڈیوں پر زنا کی زبردستی کرنے کا باعث ہوتا ہے، کیوں کہ دانش مند لوگ بغیر کسی فائدے کے اپنی لونڈیوں کو زنا کے لیے مجبور نہیں کرتے، لہٰذا یہ علت اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کو لونڈی پر زبردستی کرنا جائز ہے، جبکہ اس پر جبر سے دنیا کا مال طلب کرنا مقصود نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ تعلیل اکراہ کے لیے اس اعتبار سے ہے کہ ان کی عادت

[1] فتح القدير (٤/ ٤١) [2] فتح القدير (٤/ ٤١) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٢٩)

اسی طرح تھی، نہ یہ کہ مدار ہے واسطے نہی عن الاکراہ کے۔ یہ معنی پہلے معنی کے برابر ہیں، اس کے مخالف نہیں ہیں۔

جملہ ﴿ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ ما قبل کا مقرر و موکد ہے، معنی یہ ہیں کہ جبر کرنے کی سزا زبردستی کرنے والوں کی طرف راجع ہے نہ کہ اُن کی طرف جن پر زبردستی کی گئی، چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ کی قراءت اسی بات پر دال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس تفسیر میں بُعد ہے، اس لیے کہ جب عورت پر زنا کے لیے زبردستی کی گئی وہ گناہ گار نہیں ہے۔ اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اگرچہ اس پر زبردستی کی گئی ہے، پھر بھی زنا کے دوران مطاوعت (فرمانبرداری) کے شائبہ سے خالی نہیں رہ سکتی، یا تو جبلت بشری کے سبب سے یا اس وجہ سے کہ اکراہ حدِ الجاء (اکراہ: زبردستی کرنا، الجاء: مضطر کرنا) سے قاصر ہو جو اختیار کو بالکل زائل کر دے۔ یا غفور رحیم اس لیے فرمایا کہ اس سے زنا کو انتہائی ہولناک ظاہر کرنا ہے اور مجبور کی گئی عورتوں کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ خود زنا سے یکسو ہونے پر ثابت قدم رہیں اور زبردستی کرنے والوں کو ڈرانے میں سختی کریں۔ یہ بات بیان کر کے کہ لونڈیاں عقوبت کا نشانہ ہوتیں، اگر اُن کو اللہ پاک کی مغفرت اور رحمت نہ پالیتی، باوجود اس کے کہ اُن کے حق میں عذر قائم ہے۔ پھر استحقاقِ عذاب میں اس شخص کا کیا حال ہے جو اُن پر زبردستی کرتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک زبردستی کرنے والوں کے لیے غفور رحیم ہے، یا تو مطلقاً یا بشرط توبہ کے۔ جبکہ اللہ پاک احکامِ مذکورہ کے بیان سے فارغ ہوا تو قرآن شریف کی تعریف شروع کی، پھر اس کے تین وصف بیان کیے۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (٣٤)

اور بلاشبہ ہم نے تمھاری طرف کھول کر بیان کرنے والی آیات اور ان لوگوں کے کچھ حالات و واقعات بھی جو تم سے پہلے گزر چکے اور متقین کے لیے نصیحت نازل کی (34)

قرآنِ مجید کے تین اوصاف کا بیان:

یعنی پہلی اُمتوں پر بھی ایسے ہی حکم تھے۔ انتھٰی. آیاتِ بینات سے مراد قرآن پاک ہے، یعنی اللہ پاک نے اس میں واضح مفسر آیتیں نازل کی ہیں اور گذشتہ اُمتوں کی اس میں خبر ہے اور انھوں نے جو احکامِ الٰہی کی مخالفت کی اور اس کے سبب سے اُن پر عذاب نازل ہوا، قرآن شریف میں اس کا حال ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٥٦] ''تو یوں ہم نے انھیں گئے گزرے کر دیا اور پچھلوں کے لیے (عبرت کی) مثال بنا دیا۔''

---

[1] فتح البیان (۹/ ۲۱۹۔ ۲۲۱)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ یعنی قرآن پاک گناہوں اور حرام کاموں کے ارتکاب سے اُن لوگوں کو دھمکانے والا اور باز رکھنے والا ہے، جو اللہ پاک سے ڈرتے ہیں اور اس کا خوف رکھتے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے قرآن شریف کی صفت میں فرمایا ہے: "فِيْهِ حُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ، وَخَبَرُ مَا قَبْلَكُمْ، وَنَبَأُ مَا بَعْدَكُمْ، وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزَلِ، مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ، وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى مِنْ غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللّٰهُ"[1] (كذا في ابن كثير) یعنی قرآن میں ان معاملات کے احکام ہیں جو تمھارے آپس میں واقع ہوتے ہیں، اور خبر ہے اس کی جو تم سے پہلے واقع ہو چکا ہے، اور پیشین گوئی ہے اس کی جو تمھارے بعد ہوگا، اور وہ چکوتی ہے ہنسی مذاق نہیں ہے، جو کوئی جبار سرکش اس کو چھوڑ دے گا تو اللہ اس کا ناس کر دے گا اور جو کوئی اس کے غیر سے ہدایت ڈھونڈے گا تو اللہ اس کو گمراہ کر دے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ پہلی صفت یہ ہے کہ قرآن آیاتِ بینات ہے، یعنی فی نفسہ وہ کھلی کھلی آیتیں ہیں۔ پہلی کتابیں اور عقلِ سلیم ان کی تصدیق کرتی ہیں۔ یا وہ واضح کرنے والی اور بیان کرنے والی ہیں۔ لہٰذا جو آیتیں اس سورت میں مذکور ہیں، وہ بدخولِ اولیٰ اُن میں داخل ہیں۔ دوسری صفت یہ ہے کہ یہ ایک عجیب خبر ہے، یعنی یہ گزرے ہوئے لوگوں کی امثال ہیں، وہ یہی عجیب قصے اور امثال ہیں، جو اُن کے لیے پہلی کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں، کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قصے سے ایسا تعجب ہے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام، مریم علیہا السلام کے قصے سے ہے اور اس سے جس کی ان کو تہمت لگائی گئی، پھر اس کا باطل ہونا اور اُن کی براءت ظاہر ہوگئی۔ قرآن کی تیسری صفت اس کا نصیحت ہونا ہے کہ جس سے خالص متقی لوگ مستفید ہوتے ہیں، کیوں کہ غیر متقیوں کے دلوں پر اللہ پاک نے مہر کر دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اس لیے وہ نصیحتوں کو سننے اور پہلے قصوں سے عبرت حاصل کرنے اور اس بات کے سمجھنے سے محروم ہیں، جس پر آیاتِ بینات مشتمل ہیں۔ جبکہ اللہ پاک نے اپنے کلام قدیم کا وصف بیان کیا تو اس کے بعد اپنی ذاتِ قدیم کا وصف بیان فرمایا کہ وہ انتہائی کمال اور نہایت جمال میں ہے۔[2] چنانچہ ارشاد کیا:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ
اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ
شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا
يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٨٤) [2] فتح البيان (٩/ ٢٢٢)

لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ۙ۳۵

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال (یوں ہے) جیسے ایک طاق ہو، جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشے (کی قندیل) میں ہو، شیشہ جیسے چمکتا ستارہ ہو، وہ (چراغ) ایک مبارک درخت زیتون (کے تیل) سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، یوں لگے جیسے اس کا تیل خود بخود روشن ہو جائے گا، اگرچہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو، (وہ) نور علی نور ہے۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (35)

نورِ الٰہی کی مثال:

یعنی اللہ سے زمین اور آسمان کی رونق اور بستی ہے۔ اس کی مدد نہ ہو تو سب ویران ہو جائیں۔ اللہ کی روشنی کی کہاوت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح کہی کہ یہ مومن کے دل میں روشنی ہے۔ کہتے: پردوں میں ایک سے ایک تیز روشنی رکھتا ہے، سب کے اندر تاروں کی طرح ہیں اور زیتون کا نہ مشرقی ہونا نہ مغربی، یعنی باغ کے درمیان کا، نہ وہ صبح کی دھوپ کھائے اور نہ شام کی، خوب ہرا بھرا اور اچھا رہے۔ یا پیغمبر کو فرمایا کہ اُن سے دل کا نور ملتا ہے، وہ ملک عرب میں پیدا ہوئے، نہ مشرق میں نہ مغرب میں۔ اس کا تیل بغیر آگ کے سلگنے کو تیار ہے، یعنی مومن کے دل میں ان کی صحبت سے بغیر ریاضت کے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ آگے فرمایا کہ وہ روشنی اس طرح ملتی ہے کہ جن مسجدوں میں کامل لوگ عبادت کرتے ہیں، صبح و شام وہاں لگا رہے۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ آسمان والوں اور زمین والوں کا ہدایت کرنے والا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام مجاہد رحمہ اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین میں اور اُن کے تاروں میں اور اُن کے سورج اور چاند میں اپنے امر کی تدبیر کرتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بروایتِ فرقد انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ فرماتا ہے: "نُوْرِيْ هُدَايَ" یعنی میرے نور نے ہدایت کی یا میرا نور ہدایت ہے۔ اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوجعفر رازی رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ مومن ہے جس کے سینے میں اللہ پاک نے ایمان و قرآن رکھا ہے۔

اللہ پاک نے اس کی مثل بیان فرمائی تو یوں کہا کہ ﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ پس اپنی ذات کے نور

سے ابتدا کی۔ پھر مومن کے نور کا ذکر کیا تو فرمایا کہ اس شخص کی طرح جو اس پر ایمان لایا۔ راوی نے کہا ہے کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ یوں پڑھتے تھے: "مَثَلُ نُوْرِ مَنْ آمَنَ بِهٖ" چنانچہ وہ مومن ہے، جس کے سینے میں اللہ نے ایمان و قرآن رکھا ہے۔ اسی طرح امام سعید بن جبیر اور قیس بن سعد رحمہما اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کو یوں پڑھتے تھے: "مَثَلُ نُوْرِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ"[1] (عن ابن عباس رضی اللہ عنہما: مثل نور من آمن بالله كمشكاة وهي الكوة، وعنه قال: هي خطأ من الكاتب هي أعظم من أن يكون نوره مثل نور المشكاة، بل مثل نور المؤمن كالمشكاة كذا في فتح البيان و فتح القدير)[2] بعض نے اس طرح پڑھا ہے کہ "اَللّٰهُ نَوَّرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" اسی طرح امام ضحاک رحمہ اللہ سے مروی ہے۔[3]

امام سدی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: اس کے نور سے آسمان اور زمین روشن ہوگئی۔[4] محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے جس حدیث کو سیرت میں روایت کیا ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں فرمایا، جس دن طائف والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچائی: «أَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ أَنْ يَحِلَّ بِيْ غَضَبُكَ أَوْ يَنْزِلَ بِيْ سَخَطُكَ، لَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ»[5] یعنی میں تیرے نورِ وجہ کی پناہ میں آیا کہ جس کے واسطے تاریکیاں چمک اُٹھیں اور جس پر دنیا اور آخرت کا کام ٹھیک ہوگیا۔ اس بات سے کہ نازل ہو مجھ پر تیرا غصہ، یا اترے مجھ پر تیری خفگی میری خوشی کی طرف، پھر آنا تیرے ہی لیے ہے، یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے۔ نہیں ہے بازگشت گناہ سے اور اطاعت کی طاقت مگر اللہ کی مدد سے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ پاک کے نورِ وجہ کی پناہ میں آئے تو آپ کے نور کا کیا ٹھکانا ہے۔ نور ہی نور تھے۔

صحیحین میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت رات کو اُٹھتے تو فرماتے: «اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، أَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ، وَلَكَ الْحَمْدُ، أَنْتَ قَيُّوْمُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ»[6] (الحديث) یعنی الٰہی! تیرے ہی لیے حمد ہے، تو نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور اُن کا جو اُن میں ہیں، اور تیرے ہی واسطے حمد ہے، تو تھامنے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور اُن کا جو اُن میں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ بے شک تمھارے رب کے ہاں نہ رات ہے نہ دن۔ عرش کا نور اس کے چہرے کے نور سے ہے۔[7]

قولہ تعالیٰ: ﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ﴾ کی ضمیر میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی طرف پھرتی ہے، یعنی اللہ کی

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٧٧_ ١٧٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٣_ ٢٥٩٤)
[2] فتح البيان (٩/ ٢٢٤) فتح القدير (٤/ ٥٠)
[3] تفسير البغوي (٦/ ٤٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٣)
[5] السيرة النبوية لابن هشام (٢/ ٢٦٨)
[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٦٩)
[7] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٨٤_ ٣٨٥)

ہدایت مومن کے دل میں طاق کی مثل ہے۔[1] (قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما) دوسرا قول یہ ہے کہ مومن کی طرف راجع ہے، جس پر سیاقِ کلام دال ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ مثل نورِ مومن کی، جو اس کے دل میں ہے، مثل طاق کے ہے، مشبہ مومن کا دل ہے، اور ہدایت جس پر اس کی فطرت اور پیدایش کی گئی ہے، اور قرآن جس کو وہ لیتا ہے اور وہ جو اس شے کے مطابق ہے، جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ﴾ [هود: ١٧] ''کیا بھلا جو شخص اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہو اور اس کے بعد اللہ کی طرف سے ایک گواہ (قرآن) بھی آجائے، جب کہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی راہنما اور رحمت (رہی) ہو (وہ قرآن کا انکار کرسکتا ہے؟)۔'' اور مشبہ بہ صاف شفاف جوہری شیشے کا قندیل ہے اور عمدہ صاف چمکتا ہوا تیل، جو معتدل ہے اور اس میں کسی طرح کی میل نہیں ہے، نہ کسی قسم کا انحراف۔ مومن کا دل جو فی نفسہٖ صاف ہے، اس صفائی میں اس کی تشبیہ اس قندیل سے دی ہے اور قرآن و شریعت سے جو وہ مدد لیتا ہے، اس کی تشبیہ اس تیل سے دی ہے۔

چنانچہ قولہ تعالیٰ: ﴿ كَمِشْكٰوةٍ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، محمد بن کعب رحمہ اللہ اور بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ مشکاۃ بتی کی جگہ ہے قندیل سے۔[2] (فتح القدیر اور فتح البیان میں ہے: "عن ابن عباس رضي الله عنهما في الآية مثل نوره أي: هداه في قلب المومن كمشكاة يقول موضع الفتيلة و في إسناده مقال"[3]) مشہور یہی قول ہے اسی واسطے اس کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ﴾۔ مصباح وہ بتی ہے جو روشن ہوتی ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کہا کہ اللہ کا نور آسمان کے پرے سے کیسے پہنچتا ہے؟ اس پر اللہ پاک نے اپنے نور کے لیے اس کی مثال بیان فرمائی۔

لہٰذا ارشاد فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ ﴾ مشکاۃ کوہ خانہ کو کہتے ہیں، (یعنی روزنِ خانہ) فرمایا: یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے اپنی طاعت کے واسطے بیان کی ہے۔ چنانچہ اپنی طاعت کا نام نور رکھا ہے۔ پھر اس کی مختلف انواع کے نام رکھے۔[4] امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ مشکاۃ حبشی زبان میں روزن کو کہتے ہیں، بعض نے اتنا زیادہ کہا ہے کہ مشکاۃ وہ روزن ہے جس کا کوئی منفذ (راستہ، گزرنے کی جگہ) نہیں ہوتا۔

ایک روایت میں امام مجاہد رحمہ اللہ سے یہ مروی ہے کہ مشکاۃ حدائد ہیں جن سے قندیل لٹکایا جاتا ہے۔[5] (حدائد حدیدہ کی جمع ہے، حدیدہ حدید سے خاص ہے، یعنی حدید مطلق لوہا ہوا اور حدیدہ خاص وہ شے ہے جو لوہے سے کسی

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٧٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٥) [3] فتح القدير (٤/ ٥٠) فتح البيان (٩/ ٢٢٤)
[4] تفسير الطبري (١٩/ ١٨٢) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٥)

کام کے لیے بنائی جاتی ہے۔ مثلاً: کڑا یا آنکڑا جس سے قندیل لٹکاتے ہیں۔) قولِ اول اولیٰ ہے، وہ یہی تھا کہ مشکاۃ بتی کی جگہ کو کہتے ہیں جو قندیل میں ہوتی ہے اور اسی لیے ﴿ فِيهَا مِصْبَاحٌ ﴾ کہا ہے۔ مصباح وہ نور ہے جو بتی میں ہوتا ہے۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: مصباح نور ہے اور وہ قرآن و ایمان ہے جو اس کے سینے میں امانت رکھا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مصباح سراج ہے، یعنی چراغ۔

﴿ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ ﴾ یعنی یہ روشنی چمکنے والی ہے ایک صاف شیشے میں۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیر واحد، یعنی بہت سوں نے کہا ہے کہ زجاجہ قلبِ مومن کی نظیر ہے۔[1] ﴿ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ ﴾ بعض نے اس کو بضمِ دال بدون ہمزہ پڑھا ہے "دُرٌّ" سے ماخوذ، یعنی گویا وہ ایک تارا موتی کا ہے۔ دوسرے لوگوں نے "دِرِیء و دُرِیء" بکسر وضمِ دال پڑھا ہے "دَرء" سے ماخوذ۔ "دَرء" دفع کرنے کو کہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تارا جس وقت پھینکا جاتا ہے تو اس وقت اس کی روشنی سب حالتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ تاروں میں جو تارے پہچانے نہیں جاتے عرب لوگ اُن کو "دَرارِي" کہتے ہیں۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "کَوکَبٌ مُضِيءٌ"، یعنی چمکتا ہوا تارا۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مُضِيءٌ مُبِينٌ ضَخمٌ"، یعنی چمکتا ظاہر بڑا۔[3]

﴿ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ ﴾ یعنی وہ مدد لیتا ہے شجرۂ مبارکہ کی زیتون کے تیل سے۔ ﴿ زَيْتُونَةٍ ﴾ بدل ہے یا عطفِ بیان ہے۔ ﴿ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ ﴾ یعنی وہ اپنی جگہ کے شرقی جانب میں نہیں ہے کہ دن کے شروع کا آفتاب اس کو نہ پہنچے اور نہ اس کے مغربی جانب میں ہے کہ غروبِ آفتاب سے پہلے اس سے سایہ سمٹ جائے، بلکہ وہ درمیانی جگہ میں ہے، شروع دن سے لے کر آخر دن تک دھوپ اسی پر رہتی ہے، اس کو صاف کیا کرتی ہے، اس لیے اس کا تیل صاف معتدل چمکتا ہوا آتا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایتِ عکرمہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ وہ جنگل میں ایک درخت ہے کہ اس پر درخت سایہ نہیں کرتے اور نہ کوئی پہاڑ نہ کوئی غار اور نہ کوئی اور شے اس کو چھپاتی ہے، یہ بات اس کے تیل کو بہت عمدہ کرنے والی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جنگل میں ہے، یہ اس کے تیل کو نہایت صاف کرنے والا ہے۔ (رواه يحيى بن سعيد القطان عن عمران بن جرير عنه)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ عکرمہ رحمہ اللہ سے یہ ہیں کہ کسی نے ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ وہ بیابان میں ایک زیتون ہے، جب سورج نکلتا ہے تو اس پر نکلتا ہے، پھر جب ڈوبتا ہے تو اس پر ڈوبتا ہے۔ یہ تیل سب تیلوں سے زیادہ صاف ہوتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شرقیہ نہیں ہے کہ جب سورج طلوع ہو تو اس کو نہ پہنچے، اور غربیہ نہیں ہے کہ جب سورج غروب ہو تو اس کو نہ پہنچے، بلکہ اس کو سورج پہنچتا ہے جب طلوع کرتا ہے اور جب ڈوبتا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٨١) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٨١)

٣_تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٨)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے ﴿ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ بہترین روغن ہے۔ کہا ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو مشرق کی جانب سے اس کو پہنچتا ہے۔ پھر جب غروب ہونے لگتا ہے تو اس کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ صبح و شام اسے سورج پہنچتا ہے، لہٰذا یہ درخت نہ شرقی شمار کیا جاتا ہے نہ غربی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شرقی نہیں ہے کہ مشرق اس سے گزر جائے اور نہ غربی ہے کہ مغرب اس سے گزر جائے، لیکن وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ہے یا کسی جنگل میں کہ سارا دن اُسے دھوپ لگتی ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ شرقی غربی نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ درختوں کے درمیان میں ہے، نہ وہ مشرق کے لیے ظاہر ہوتا ہے نہ مغرب کے لیے۔

امام ابوجعفر رازی رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ سبز نرم نازک ہے، کسی حال پر اسے دھوپ نہیں لگتی، نہ طلوع کے وقت، نہ غروب کے وقت۔ کہا: اِسی طرح یہ مومن ہے کہ وہ اس سے بچایا گیا ہے کہ اس کو فتنوں میں سے کوئی شے پہنچے اور کبھی اُن میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کو ثابت قدم رکھتا ہے تو وہ چار خصلتوں کے درمیان ہے: اگر کہتا ہے تو سچ بولتا ہے، اور اگر حکم کرتا ہے تو انصاف کرتا ہے۔ اور اگر مبتلا ہوتا ہے تو صبر کرتا ہے، اور اگر اسے دیا جاتا ہے تو شکر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام لوگوں میں اس زندہ شخص کی طرح ہے، جو کہ مردوں کی قبروں میں چلتا ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ درختوں کے بیچ میں ہے، سورج نہ اس کو شرقاً پہنچتا ہے نہ غرباً۔ امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ درختوں کی جگہ میں ایک درخت ہے۔ اس کے پھلوں کا سایہ اس کے پتوں میں دکھائی دیتا ہے اور یہ اُن درختوں میں سے ہے جن پر نہ سورج طلوع کرتا ہے نہ غروب کرتا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایتِ سعید بن جبیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ شرقیہ نہیں ہے، اس میں شرق نہیں ہے اور نہ غربیہ ہے، اس میں غرب نہیں ہے، لیکن وہ شرقیہ غربیہ ہے۔ امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ قبلیہ ہے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شام ہے۔ سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ کوئی درخت زمین میں ہوتا تو البتہ شرقی ہوتا یا غربی، لیکن یہ تو ایک مثال ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اپنے نور کے لیے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے ﴿ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: مرد صالح ہے۔ ﴿ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ﴾ فرمایا کہ نہ وہ یہودی ہے نہ نصرانی ہے۔[2] ان سب قولوں سے اولیٰ پہلا قول ہے اور وہ درخت ہموار زمین میں فراخ ظاہر کھلی ہوئی جگہ میں ہے، سورج کے واسطے کھلی ہوئی جگہ ہے دن کے شروع سے لے کر آخر تک۔ سورج اسے مارتا رہتا ہے، تا کہ یہ سارے دن کا دھوپ میں رہنا اس کے تیل کو زیادہ صاف اور لطیف کرنے والا ہو، جس طرح کہ اگلے لوگوں میں سے بہت سوں نے کہا ہے اور اسی لیے اللہ پاک

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٠٠_ ٢٦٠١)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٩_ ٢٦٠٢)

نے یوں فرمایا ہے: ﴿ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ﴾ امام عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "لِضَوْءِ إِشْرَاقِ الزَّيْتِ"[1] یعنی بسبب چمکنے تیل کی روشنی کے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ﴾ امام عوفی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد بندے کا ایمان و عمل ہے۔ امام مجاہد اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد آگ کا نور اور تیل کا نور ہے۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ﴿ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ﴾ چنانچہ وہ لوٹتا پوٹتا ہے پانچ نوروں میں: کلام اس کا نور ہے، عمل اس کا نور ہے، اور مدخل اس کا نور ہے، اور مخرج اس کا نور ہے اور بازگشت اس کی نور کی طرف ہے قیامت کے دن جنت کی طرف۔ شمر بن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کعب احبار کی طرف آئے تو کہا کہ تو مجھ سے اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ﴾ کا بیان کر۔ امام کعب رحمہ اللہ نے کہا: لگتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے واسطے ظاہر ہو جائیں، اگرچہ خود نہ کہیں کہ وہ نبی ہیں، جس طرح لگتا ہے کہ یہ تیل روشن ہو جائے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے ﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ نور آگ کا اور نور تیل کا، جبکہ یہ دونوں جمع ہو جاتے ہیں تو آگ روشن ہو جاتی ہے، یا یہ کہ ایک بغیر دوسرے کے روشن نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح نور قرآن کا اور نور ایمان کا ہے، جبکہ یہ دونوں جمع ہو جائیں تو اُن میں سے ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی اللہ راہ بتاتا ہے اپنی ہدایت کی طرف اس شخص کو جس کو پسند کرتا ہے، جیسا کہ اس حدیث میں مروی ہے جس کو امام احمد نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے: بے شک اللہ نے پیدا کیا اپنی خلق کو تاریکی میں، پھر اُن پر اس دن اپنے نور میں سے ڈالا، پھر اس دن جس شخص پر اس کا نور پڑا تو اس نے ہدایت پائی اور جو شخص چوک گیا اس سے تو وہ گمراہ ہوا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ قلم اللہ عزوجل کے علم پر سوکھ گئے۔[3] امام بزار رحمہ اللہ نے بطریقِ دیگر عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے کہ بے شک اللہ نے اپنی خلق کو تاریکی میں پیدا کیا۔ پھر اُن پر اپنے نور میں سے ایک نور ڈالا، وہ شخص جس کو اس کے نور میں سے پہنچا تو اس نے ہدایت پائی اور جو شخص اس سے چوک گیا تو وہ گمراہ ہوا۔[4] (ورواه البزار عن عبدالله بن عمرو من طريق آخر بلفظه وحرفه)

جبکہ اللہ پاک نے اپنے نورِ ہدایت کی مومن کے دل میں یہ مثال ذکر کی تو آیت کو اس قول سے ختم فرمایا: ﴿ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک خوب جانتا ہے، اس شخص کو جو ہدایت

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٠٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٠٢ـ ٢٦٠٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٢) مسند أحمد (٢/ ١٧٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٦٤)

[4] كشف الأستار عن زوائد البزار (٣/ ٢١ـ ٢٢)

کا مستحق ہے، اس شخص سے جو گمراہی کا مستحق ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ دل چار ہیں: ایک تو قلبِ اَجرد ہے۔ (اَجرد وہ ہے جس کے بدن پر بال نہیں ہوتے، یہاں یہ مراد ہے کہ اس میں کسی طرح کا غل وغش نہیں ہے، اصل فطرت پر ہے، اس لیے اس پر ایمان کا نور چمکتا ہے) اس میں چراغ کی طرح چمک ہے، اور ایک قلب اغلف ہے، (یعنی حق کے سننے اور قبول کرنے سے اس پر پردہ ہے) اس کے غلاف پر بندش کی گئی ہے، اور ایک قلب منکوس ہے (یعنی اوندھا) اور ایک قلبِ مصفح ہے (مصفح: صفح بہ معنی وجہ و ناحیہ ہے، یعنی اس کی دو جہتیں ہیں: ایک جہت سے تو اہلِ کفر سے ملتا ہے اور ایک جہت سے اہلِ ایمان سے ملتا ہے) چنانچہ قلبِ اجرد تو مومن کا قلب ہے، اس کا چراغ ہے، اس میں اس کا نور ہے، اور قلبِ اغلف کافر کا دل ہے، اور قلبِ منکوس منافق کا دل ہے کہ اس نے پہچانا، پھر انکار کیا، اور قلبِ مصفح وہ دل ہے کہ اس میں ایمان اور نفاق ہے اور ایمان کی مثال اس میں بقلہ کی، یعنی سبزی کی مثال ہے کہ پاک پانی اس کو مدد دیتا ہے (اصل الفاظ یہ ہیں: "يُمِدُّهَا الْمَاءُ الطَّيِّبُ" مراد میٹھا پانی ہے، جو نبات اور سبزی کا مادہ ہے) اور اس میں نفاق کی مثال پھوڑے کی مثال ہے کہ خون اور پیپ اس کو مدد دیتا ہے۔ پھر جونسا مِدہ (مدہ بالکسر بہ معنی ریم ہے، یہاں معلوم ہوتا ہے کہ مراد مطلق مادہ ہے، تاکہ دونوں کو شامل ہو جائے۔ واللّٰہ أعلم) دونوں میں سے دوسرے پر غالب ہوا، وہی اس پر غالب ہوتا ہے۔[1] (إسناده جيد و لم يخرجوه)

فتح البیان کا بیان:

اسم شریف اللہ مبتدا ہے اور ﴿ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ خبر ہے اور جملہ مستانفہ ہے تقریر ما قبل کے لیے لایا گیا ہے، کیونکہ پہلے یہ ذکر کیا ہے کہ اس نے ظاہر ظاہر کھلی کھلی آیتیں نازل کی ہیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ جب اس کے کلام کا یہ وصف ہے تو اس کی ذات بابرکات کا کیا وصف ہوگا؟ گویا اس کا یہ جواب دیا کہ جس طرح اس کا کلام پاک ظاہر و باہر و مفسر و مبین ہے، اسی طرح اس کی ذاتِ برکت سمات انتہائی کمال اور نہایت جمال میں ہے، آسمان و زمین کا نور ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نور اصل میں ایک کیفیت ہے، جس کا ادراک قوتِ باصرہ پہلے کرتی ہے اور اس کے واسطے سے ساری مبصرات (وہ اشیا جو آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں) کا ادراک کرتی ہے، جیسی وہ کیفیت ہے، جو سورج چاند سے کثیف جسموں پر فائز و واصل ہوتی ہے، کون سے جسم جو کہ سورج چاند کے برابر و مقابل ہوتے ہیں۔ اس معنی میں نور کا اطلاق اللہ پاک پر صحیح نہیں ہے، مگر ہاں بہ تقدیرِ مضاف درست ہے:[2] "أَيْ: ذُوْ نُوْرِ

---

[1] مسند أحمد (٣/ ١٧) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٨٤۔ ٣٨٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ "ابو البختری" کا سماع سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ نیز "لیث بن ابی سلیم" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥١٥٨)

[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٨٧)

السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ‘‘ یعنی اللہ پاک صاحب و مالک ہے آسمان و زمین کے نور کا جس طرح کے ’’زَیْدٌ عَدْلٌ‘‘ یعنی زید صاحبِ عدل ہے۔ یا مراد اللہ پاک کے وصف میں مبالغہ ہے کہ وہ اپنے کمال جلال وظہورِ عدل و وسعتِ احکام کے سبب سے نور ہے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص نورِ بلد ہے، قمرِ زمن ہے، شمسِ عصر ہے، اسی باب سے نابغہ کا یہ قول ہے:

فَإِنَّكَ شَمْسٌ وَالْمُلُوْكُ كَوَاكِبُ إِذَا ظَهَرَتْ لَمْ يَبْقَ فِيهِنَّ كَوْكَبٌ

یعنی بے شک تو آفتاب ہے اور بادشاہ ستارے ہیں، جب سورج ظاہر ہوتا ہے تو کوئی تارا ان میں باقی نہیں رہتا۔

کسی اور نے کہا ہے:

هَلَّا قَصَدْتَّ مِنَ الْبِلَادِ لِمُفْضِلٍ قَمَرِ الْقَبَائِلِ خَالِدِ بْنِ يَزِيْدَ

یعنی تو نے شہروں سے صاحبِ فضل وجود کے واسطے کیوں نہیں قصد کیا۔ وہ قبیلوں کا چاند ہے اور وہ شخص خالد بن یزید ہے۔

اسی قبیل سے یہ قول ہے:

إِذَا سَارَ عَبْدُ اللّٰهِ مِنْ مَرْوَ لَيْلَةً فَقَدْ سَارَ مِنْهَا نُوْرُهَا وَجَمَالُهَا

یعنی جس وقت عبداللہ بن مبارک ایک رات مرو سے چلے جائیں تو یقیناً اس سے اس کا نور و جمال چلا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لغت میں نور کے معنی ضیاء ہیں، یعنی روشنی۔ یہی روشنی اشیا کو ظاہر کرتی ہے اور بینائیاں جس شے کو دیکھتی ہیں، یہی روشنی اس کی حقیقت ان کو دکھاتی ہے۔ اللہ پاک پر نور کا اطلاق تعریف کے طور پر جائز ہے اور اس لیے کہ اللہ پاک نے اشیائے منورہ (روشن کرنے والی) کو ایجاد کیا ہے اور ان کے نوروں کو وجود میں لایا ہے اور ان کو روشن فرمایا ہے۔ اس معنی پر زید بن علی و ابوجعفر وعبدالعزیز مکی کی قراءت دال ہے۔ ان لوگوں نے ’’اَللّٰهُ نَوَّرَ السَّمٰوٰتِ‘‘ بصیغۂ فعل ماضی پڑھا ہے اور فاعل اس کا ضمیر راجع ہے اللہ کی طرف اور ﴿ اَلسَّمٰوٰتِ ﴾ اس کا مفعول ہے، لہٰذا ﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک نے آسمانوں اور زمین کو روشن کر دیا ہے اس طرح سے کہ آسمان و زمین والوں کے احوال کو سیدھا کیا ہے اور اُن کو ٹھیک بنایا ہے اور اُن کی لوگوں کے واسطے کامل تدبیر کی ہے، جس طرح کہتے ہیں کہ بادشاہ نورِ بلد ہے۔ اسی طرح امام حسن، مجاہد، ازہری، ضحاک، قرظی رحمہ اللہ نے اور امام ابن عرفہ و ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہم نے کہا ہے۔ اسی کے مثل کسی شاعر کا یہ قول ہے:

وَأَنْتَ لَنَا نُوْرٌ وَغَيْثٌ وَعِصْمَةٌ وَنَبْتٌ لِمَنْ يَّرْجُوْ نَدَاكَ وَرِيْفٌ

یعنی تو ہمارے واسطے روشنی ہے اور مینہ اور بچاؤ ہے خوف وخطر سے اور اس کے لیے روئیدگی ہے جو امیدوار ہے تیری عطا کا اور کھیتی ہے۔

ہشام جوالیقی اور فرقۂ مجسمہ کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک ایک نور ہے نہ مثل نوروں کے اور ایک جسم ہے نہ مثل جسموں کے۔[1] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ ہادی ہے آسمانوں کا اور زمین کا، چنانچہ وہ اسی کے نور سے حق کی طرف راہ پاتے ہیں اور اسی کی ہدایت سے گمراہی کی حیرت سے نجات پاتے ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے آسمان کو فرشتوں سے منور کیا اور زمین کو انبیا سے روشن فرمایا۔ کسی نے کہا ہے کہ آسمان و زمین کو زینت بخشنے والا ہے، آسمان کو تو سورج چاند ستاروں سے زینت دی اور زمین کو انبیاء وعلمائے مومنین سے زینت بخشی۔ کسی نے کہا ہے کہ زمین کو روئیدگی اور درختوں سے زینت دی۔ کسی نے کہا ہے کہ سارے نور اسی کی طرف سے ہیں۔ ﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ﴾ مبتدا ہے، اس کی خبر ﴿كَمِشْكٰوةٍ﴾ ہے، یہ جملہ اس سے ماقبل کی وضاحت اور تفسیر ہے۔ اس لیے اس کا کوئی محل اعراب سے نہیں ہے اور یہاں مضاف مقدر ہے، یعنی "كَمَثَلِ مِشْكَاةٍ" معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک کے نور کی صفت جو نور اس سے فائز اور اشیاء پر ظاہر ہوتا ہے صفتِ مشکاۃ کے مانند ہے۔ مشکاۃ دیوار میں روزن کو کہتے ہیں، جس کا کوئی منفذ (گزرنے کی جگہ) نہ ہو۔

غرض یہ ہے کہ دیوار کے پار نہ ہو، جیسے دیوار میں طاق ہوتا ہے، جس طرح کے امام واحدی رحمہ اللہ نے جمیع مفسرین سے اور قرطبی رحمہ اللہ نے جمہور مفسرین سے نقل کیا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ حبشی لغت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قندیل کا ستون ہے، جس میں بتی رکھتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ قندیل کے وسط میں نلکی ہے۔ کسی نے کہا: وہ لوہا یا سیسہ ہے، جس میں تیل رکھا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ستون ہے جس کے سر پر مصباح رکھتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ لوہے کی شے ہے، جس میں قندیل لٹکاتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خود قندیل ہے۔[4] ان میں سے بعض قول پہلے گزر چکے ہیں۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ مشکاۃ کے خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مصباح یا غیر مصباح سے جو اس میں روشنی ہوتی ہے، وہ اس روشنی کا خوب جامع ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ مومن کے دل میں اللہ عزوجل کے نور کی طرح، اور یہ وہ نور ہے جس سے وہ ہدایت پاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نور سے مراد قرآن شریف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نور سے مراد طاعت ہے۔

اللہ پاک نے اپنی طاعت کا نام نور رکھا ہے اور شرف اور تعظیم کے لیے اُن نوروں کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کے دلائل کی صفت جن کو وہ مومن کے دل میں ڈالتا ہے دلائل کا نام نور رکھا جاتا ہے۔[5] (قاله القرطبي) اس تشبیہ میں اختلاف ہے کہ آیا یہ تشبیہ مرکب ہے یا غیر مرکب۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں مثال کے ایک حصے کا مقابلہ مشل بہ کے ایک حصے کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ اس

[1] فتح القدير (٤/ ٤٥) [2] تفسير البغوي (٦/ ٤٥) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٥٧)
[4] تفسير الطبري (١٩/ ١٨٣) [5] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٥٧)

میں ایک جملے کی تشبیہ دوسرے جملے کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔

﴿ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ﴾ مصباح سراج ضخم کو کہتے ہیں، یعنی بڑا چراغ۔ ﴿ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ﴾ زجاجہ واحد ہے زجاج کا، یعنی قندیل۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نور شیشے میں ہے اور آگ کی روشنی شیشے میں زیادہ ظاہر ہوتی ہے اور اس کی روشنی شیشے میں بڑھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیشہ جو کہ ایک شفاف جسم ہے، اس میں نور کا ظہور پوری طرح ہوتا ہے۔ پھر اللہ پاک نے شیشے کا وصف کیا کہ ﴿ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ ﴾ یعنی گویا شیشہ اور اس میں نور ایک تارا ہے چمکتا ہوا۔ ﴿ دُرِّيٌّ ﴾ اس جہت سے "در" کی طرف منسوب ہے کہ تارے میں حسن اور روشنی موتی کے مشابہ ہوتی ہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ ﴾ زہرہ ہے۔[1] امام ابو عمرو نے "دِرِّيٌّ" بکسرِ دال پڑھا ہے۔ کہا: میں نے کسی اعرابی کو سوائے "كَاَنَّهٗ كَوْكَبٌ دِرِّيٌّ" بکسرِ دال کہتے نہیں سنا۔ اس کو اس محاورے سے لیا ہے کہ جس وقت تارے مندفع، یعنی دور ہو جاتے ہیں تو بولتے ہیں: "دَرَأَتِ النُّجُوْمُ تَدْرَأُ"، حمزہ نے بضمِ دال مہموز پڑھا ہے۔ امام فراء، زجاج اور مبرد رحمہم اللہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر دال کو پیش دیا جائے تو واجب ہے کہ مہموز نہ ہو، کیوں کہ یہ کلامِ عرب میں نہیں ہے۔ "دراري" تاروں میں سے مشہور تارے ہیں، جیسے: مشتری، زہرہ، مریخ اور جو ثابت تاروں میں سے اُن کے مشابہ ہیں۔[2] سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: ﴿ دُرِّيٌّ ﴾ کے معنی "مُضِيْءٌ" کے ہیں،[3] یعنی روشن، ماخوذ ہے "دَرء" بہ معنی دفع سے، اس لیے کہ چمکتا تارا اندھیرے کو دفع کرتا ہے۔

پھر اللہ پاک نے مصباح کا وصف ﴿ يُّوْقَدُ ﴾ بیائے تحتیہ وتخفیفِ قاف وضمِ دال سے فرمایا۔ یہ قراءت شیبہ، نافع، ایوب، سلام، ابن عامر، اہلِ شام اور حفص کی ہے۔ کسی نے "تَوَقَّدَ" بصیغۂ فعل ماضی پڑھا ہے "تَفَعَّل" سے۔ یہ قراءت حسن، سلمی، ابو عمرو بن العلا اور ابو جعفر کی ہے۔ ان دونوں قراءتوں میں ضمیر مصباح کی طرف راجع ہے۔ کسی نے "تُوْقَدُ" بتائے فوقیہ پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ ضمیر زجاجہ کی طرف راجع ہے۔ یہ قراءت کوفیوں کی ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں، کیوں کہ دونوں میں ضمیر مصباح کی طرف راجع ہے اور اس وصف کے ساتھ زیادہ تر مشابہ مصباح ہی ہے، کیوں کہ منیر ومضي اور روشن وہی ہوتا ہے۔ اور زجاجہ جو ہے تو وہ اس کا ظرف ہے۔ کسی نے "تَوَقَّدُ" پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ فعل مضارع ہے، اس کی اصل "تَتَوَقَّدُ" ہے۔ یہ قراءت نصر بن عاصم کی ہے۔[4]

﴿ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائیہ ہے، یعنی چراغ کے روشن کرنے کی ابتدا درخت مبارک

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٨) [2] فتح القدير (٤/ ٤٦)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٩٨) [4] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٦٢)

سے ہے۔ یا مضاف مقدر ہے: "أَيْ: يُوقَدُ مِنْ زَيْتِ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ" یعنی وہ چراغ مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے۔ ﴿مُبٰرَكَةٍ﴾ کے معنی ہیں: "كَثِيْرُ الْمَنَافِعِ وَالْبَرَكَةِ" یعنی اس کا نفع اور برکت بہت ہے۔ کسی نے کہا: ﴿مُبٰرَكَةٍ﴾ بہ معنی "منماة" ہے۔ "نما" حیوانات ونباتات کی بالیدگی اور بڑھنے کو کہتے ہیں۔

﴿زَيْتُوْنَةٍ﴾ یعنی وہ مبارک درخت زیتون کا درخت ہے۔ زیتون کا درخت سب درختوں سے زیادہ بڑھتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی برکتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نیچے سے اوپر تک کی ٹہنیوں میں پتے لگتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ زیتون ''ادام'' ہے، یعنی سالن۔ اس میں روٹی ڈبو کر کھاتے ہیں اور ''دِہان'' ہے۔ بدن سے اس کو مَلتے ہیں۔ ''دباغ'' ہے چمڑے اس سے پکاتے ہیں۔ ''وقود'' ہے اس کی روشنی کرتے ہیں، اس کی ہر شے میں فائدہ ہے۔ سارے تیلوں سے اس کا تیل زیادہ تر صاف و روشن ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ زیتون وہ پہلا درخت ہے جو طوفانِ نوح کے بعد انبیاء علیہم السلام کی منازل میں اُگا۔ اس کے واسطے ستر نبیوں نے برکت کی دعا کی ہے۔ ان میں سے ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ ہیں۔ یہ ایک ایسا درخت ہے کہ اس کے پتے گرتے نہیں ہیں۔ اسید بن ثابت یا ابو اسید انصاری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کھاؤ زیت کو اور اس کو لگاؤ، بے شک وہ مبارک درخت سے ہے۔[1] (رواہ الترمذي) (سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اصل مبارک کی اللہ وحدہ کے لیے اخلاص اور اس کی عبادت کے لیے اخلاص ہے)[2]

پھر اللہ پاک نے اس درخت کا یہ وصف فرمایا ہے کہ ﴿لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ بہ جر شجرہ کی صفت ہے۔ حرفِ لانفی کے معنی دینے کے لیے داخل ہوا ہے۔ کسی نے برفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ یعنی "لَا هِيَ شَرْقِيَّةٌ وَّلَا هِيَ غَرْبِيَّةٌ" اس وصف کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے۔ امام عکرمہ اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ شرقیہ وہ ہے جس کو سورج پہنچے طلوع کے وقت اور غروب کے وقت اس کو نہ پہنچے، اس لیے کہ اس کے واسطے پردہ ہے۔ غربیہ وہ ہے کہ اس کو غروب کے وقت سورج پہنچے اور طلوع کے وقت اس کو نہ پہنچے، اس لیے کہ اس کے واسطے پردہ ہے۔[3] زیتون کا یہ درخت کسی جنگل میں ہے یا کھلی ہوئی زمین میں بایں طور پر کہ اس کو سورج سے کوئی چیز چھپاتی نہیں ہے نہ تو طلوع کے وقت نہ غروب کے وقت، جو زیتون ایسا ہوتا ہے تو اس کے پھل نہایت عمدہ اور نہایت پختہ ہوتے ہیں اور اُن کا تیل بالکل صاف ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ وہ درخت کسی بڑے درخت میں ہے کہ اس نے اس کو گھیر لیا ہے تو وہ نہ مشرق کی جانب سے کھلا ہوا ہے نہ مغرب کی طرف سے۔ اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔[4]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٥١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٤٩٨) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٨١)
[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٥٨۔ ٢٥٩) [4] تفسير الطبري (١٩/ ١٨٦)

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن سے یہ قول صحیح نہیں ہے، کیوں کہ جو درخت اس صفت کا ہوتا ہے تو اس کے پھل فاسد ہوتے ہیں۔ یہ امر وجود میں مشاہد ہے۔ امام فراء اور زجاج رحمہما اللہ نے پہلے قول کو راجح کہا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ درخت دنیا کے درختوں میں سے نہیں ہے۔ یہ تو ایک مثال ہے جو اللہ نے اپنے نور کے لیے بیان فرمائی ہے، اگر وہ دنیا میں ہوتا تو یا شرقی ہوتا یا غربی۔ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا: قرآن نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ دنیا کے درختوں سے ہے، کیوں کہ ﴿ زَيْتُوْنَةٍ ﴾ بدل ہے ﴿ شَجَرَةٍ ﴾ سے۔

ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شام کے درختوں سے ہے، کیوں کہ شام نہ شرقی ہے نہ غربی اور شام ہی مبارک زمین ہے اور اس کے درخت افضل ہیں۔[1] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ مقناۃ میں نہیں ہے کہ سورج اسے نہ پہنچے اور نہ وہ مضحاۃ میں ہے کہ سایہ اس کو نہ پہنچے، پس وہ ایسا ہے کہ نہ دھوپ اسے ضرر رساں ہے نہ سایہ۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ معتدل ہے، نہ شرق میں ہے کہ گرمی اسے ضرر دے، نہ غرب میں ہے کہ سردی اس کو نقصان پہنچائے۔ سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس کی مثال اس درخت کی مثال کی طرح ہے جس کو درخت لپیٹ لیں۔ وہ سبز اور نرم ہو، سورج اس کو لگتا نہیں ہے کسی حال پر ہو، نہ طلوع کے وقت نہ غروب کے وقت۔ چنانچہ اسی طرح یہ مومن ہے کہ پناہ میں رکھا گیا ہے اس بات سے کہ کوئی فتنہ اس پر سایہ افگن ہو۔[2]

پھر اللہ پاک نے اس ﴿ زَيْتُوْنَةٍ ﴾ کا دوسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ ﴿ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ﴾ جمہور نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے، اس لیے کہ ﴿ نَارٌ ﴾ کا کلمہ عربی میں مونث سماعی ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اس کے سوا اور کوئی قراءت نہیں جانتے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے کہ سدی نے عن ابی مالک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ انھوں نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ اس لیے کہ ﴿ نَارٌ ﴾ کی تانیث حقیقی نہیں ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ تیل اپنی صفائی اور روشن ہونے میں ایسے لگتا ہے کہ خود بہ خود روشن ہو جائے، اس کے بغیر کہ اس کو آگ چھوئے۔

﴿ نُوْرٌ ﴾ مرفوع ہے اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: هُوَ نُوْرٌ"، ﴿ عَلٰى نُوْرٍ ﴾ محذوف سے متعلق ہے۔ وہ محذوف ﴿ نُوْرٌ ﴾ کی صفت موکدہ ہے۔ ﴿ نُوْرٌ ﴾ کے معنی یہ ہیں: "هُوَ نُوْرٌ كَائِنٌ عَلَى نُوْرٍ"، کسی نے کہا: "نُوْرُ اللّٰهِ" یعنی اللہ کی ہدایت مومنوں کے لیے ایمان کے نور پر نور ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلنَّارُ عَلَى الزَّيْتِ" مراد ہے، یعنی پہلے نور سے مراد آگ ہے اور دوسرے نور سے مراد تیل ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک نور مصباح ہے اور ایک نور زجاجہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک نور تیل کی وجہ سے ہے اور اس کے ساتھ ایک نور آگ کے ساتھ ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ایمان کا نور اور قرآن کا نور۔[3] کسی نے کہا ہے کہ نور دو گنا

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٥٩) فتح القدير (٤/ ٤٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٨١) [3] فتح القدير (٤/ ٤٧)

ہونے والا ہے، بڑھنے والا ہے کہ جس کے بڑھنے کی کوئی حد معین نہیں کی ہے۔ نورِ مشکاۃ کے ساتھ جو اس نور کی مثال دی ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے تو اس نورِ مشکاۃ کے مراتب اور اس کے دوگنے ہونے کی حد بیان کی ہے، کیوں کہ عادت میں نور بڑھنے کے مرتبوں میں سے یہ مرتبہ پرلے سرے کا مرتبہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ عادتاً جو مثال انتہا درجے کے نور بڑھنے کی ہوتی ہے وہی مثال ہے جو مذکور ہوئی اور وہ محدود ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ﴾ یعنی وہ نور اس سے بھی بڑھا ہوا ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں۔

﴿ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ اس ہدایت سے مراد خاص ہدایت ہے، جو مطلوب کی طرف پہنچا دیتی ہے، یہاں ہدایت سے مراد صرف دلالت اور راہ بتانا نہیں ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿ نُوْرٌ ﴾ سے مراد دینِ اسلام ہے اور وہ نورِ بصیرت ہے،[1] معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، خاص ہدایت فرماتا ہے، جو اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے، کیوں کہ اس کی مشیت کے بغیر اسباب فضول ہیں۔ اس لیے کہ اسباب کی تکمیل مشیت ہی سے ہوتی ہے۔

﴿ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ﴾ یعنی اللہ پاک اشیا کا بیان اُن کی تشبیہات اور نظیروں سے کرتا ہے۔ اس لیے کہ مثل اور نظیر کے ساتھ اشیا کو بیان کرنا اُن کے سمجھنے کو آسان کر دیتا ہے، کیوں کہ کسی عقلی چیز کا حسی حیثیت میں ظاہر کرنا اور محسوس کی صورت میں کسی عقلی چیز کا تصور کرنا، اس کی وضاحت اور بیان کو زیادہ کرتا ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک کے علم سے کوئی شے غائب نہیں ہوتی، وہ معقول ہو یا محسوس، ظاہر ہو یا باطن اور من جملہ اس کے مثالوں کا بیان کرنا ہے۔

فتح البیان میں آیتِ باب سے متعلق بعض آثار ذکر فرمائے ہیں۔ ان میں سے بعض کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، لیکن چونکہ اجمال و تفصیل اور بعض الفاظ کا فرق ہے۔ اس لیے مزید بصیرت کے لیے یہاں لکھے جاتے ہیں، گو فی الجملہ تکرار ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ اللہ کا نور آسمان کے پرے سے کیسے پہنچتا ہے؟ اللہ نے اس کی مثال اپنے نور کے لیے بیان کی، فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ ﴾ مشکاۃ گھر کا طاق ہے۔ ﴿ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ﴾ یعنی چراغ جو شیشے میں ہوتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے کہ اللہ نے اپنی طاعت کے واسطے بیان کی ہے۔ چنانچہ اپنی طاعت کا نام نور رکھا۔ پھر اس کا نام مختلف انواع کا رکھا۔[2]

﴿ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ﴾ فرمایا کہ وہ درخت درختوں کے بیچ میں ہے۔ اس کو سورج نہیں پہنچتا نہ طلوع کے وقت اور نہ غروب کے وقت۔ یہ تیل سب تیلوں سے زیادہ عمدہ ہے۔ ﴿ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ ﴾ یعنی لگتا ہے کہ

---

[1] تفسير البغوي (٦/ ٤٩) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٨٢)

تیل اس کا روشن ہو جائے بغیر آگ کے۔ ﴿ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ﴾ اس سے مراد بندے کا ایمان و علم ہے۔ (فتح القدیر و فتح البیان میں اسی طرح ہے اور ابن کثیر میں بجائے علم کے عمل پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ أعلم)

﴿ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یہ مومن کی مثال ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا کہ مشکاۃ نبی کریم ﷺ کا جوف (پیٹ) ہے اور زجاجہ آپ ﷺ کا قلب مبارک ہے اور مصباح وہ نور ہے جو آپ ﷺ کے قلب شریف میں ہے اور شجرہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ﴿ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ﴾ نہ یہودیت ہے نہ نصرانیت ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾[1] [آل عمران: ٦٧] ''ابراہیم تو نہ یہودی تھے نہ نصرانی تھے، بلکہ وہ تو یک طرفہ (خالص) مسلمان تھے، وہ مشرک بھی نہ تھے۔'' شمر بن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کعب احبار کی طرف آئے تو کہا کہ تو مجھ سے اللہ کے قول کو بیان کر، یعنی اس آیت کو۔ کعب رحمہ اللہ نے کہا: مثل نور محمد ﷺ کی مثل طاق کے ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال بیان کی ہے آپ ﷺ کے دہان مبارک کی۔ ﴿ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ﴾ مصباح آپ ﷺ کا قلب شریف ہے اور زجاجہ آپ کا سینۂ مبارک۔

﴿ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ ﴾ نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارک کو تشبیہ چمکتے تارے سے دی ہے۔ پھر مصباح آپ کے قلب کے مشابہ ہوا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ ﴾ کہا: قریب ہے کہ نبی اکرم ﷺ لوگوں کے واسطے ظاہر ہو جائیں، اگرچہ یہ اعلان نہ فرمائیں کہ آپ نبی ہیں، جس طرح قریب ہے کہ تیل روشن ہو جائے اگرچہ اس کو آگ نہ لگے۔[2] ابن العربی نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یہ اللہ کے نور و ہدایت کی مثال ہے مومن کے دل کی طرح، جس طرح لگتا ہے کہ صاف تیل روشن ہو جائے اس سے پہلے کہ اس کو آگ لگے اور اگر آگ لگ جائے تو اس کی روشنی اور زیادہ ہو جاتی ہے، اسی طرح مومن کا دل ہے، لگتا ہے کہ وہ ہدایت کے ساتھ عمل کرے، اس سے پہلے کہ اسے اس کا علم ہو۔ پھر جب علم آ جائے تو ہدایت پر ہدایت بڑھ جائے اور نور پر نور، قلبِ ابراہیم علیہ السلام کی مثل، اس کے قبل کہ اُن کو معرفت آئی تو کہا: ﴿ هٰذَا رَبِّيْ ﴾ پہلے اس سے کہ کوئی اَور اُن کو اس بات کی خبر دے کہ اُن کا ایک رب ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ وہ ان کا رب ہے تو ہدایت زیادہ ہو گئی۔ ﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾[3] [البقرة: ١٣١] ''جب کبھی بھی انھیں اُن کے رب نے کہا: فرمانبردار ہو جا۔ انھوں نے کہا: میں نے رب العالمین کی فرماں برداری کی۔''

فتح البیان اور فتح القدیر میں اقوالِ مذکور کے بعد کہا ہے کہ نظم قرآنی کے ساتھ اس کی تفسیر اور اس کی مثل جو سیدنا ابی بن کعب، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے گزر چکا ہے، وہ لغتِ عرب کے مطابق نہیں ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ سے وہ بات ثابت ہوئی ہے، جو عربی معانی سے اُن معانی کی طرف عدول کرنے کو جائز کر دے، کون

[1] المعجم الكبير (١٢/ ٣١٧) [2] الدر المنثور (٦/ ١٩٨۔ ١٩٩) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٦٤)

سے معانی جو اَلغاز وتعمیہ (چیستان) سے مشابہ ہیں، لیکن یہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور جو لوگ اُن کے موافق اُن کے بعد آئے، انھوں نے اللہ پاک کے نور کی تمثیل کو بعید جانا کہ اس کے نور کی مثال طاق میں رکھے چراغ کے نور سے دی جائے اور اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں فرمایا کہ اللہ پاک اس سے برتر ہے کہ اس کا نور طاق کے نور کے مثل ہو، چنانچہ ان کا یہ قول ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، حالاں کہ اس کو بعید جاننے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیوں کہ ہم پہلے بحث میں ایسے معنی ذکر کر آئے ہیں، جو اشکال کو دور کرتے ہیں اور جو مراد ہے اس کو احسن طریقے اور موثر اسلوب کے ساتھ واضح کرتے ہیں اور لغتِ عرب کا جو مقتضا ہے اور فصحا کا کلام بھی جس کو مفید ہے، اسے خوب ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر سے عدول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، نہ کتاب اللہ سے نہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، نہ لغت سے۔

رہی وہ بات جو کعب احبار رحمہ اللہ سے اس بارے میں منقول ہے، جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں تو اگر وہ سبب ہے ان جلیل الشان صحابہ رضی اللہ عنہم کے عدول کرنے کا ظاہر سے آیت کی تفسیر میں تو کعب رحمہ اللہ جیسے آدمی اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کی ایسی بات میں پیروی کی جائے۔ ہم پہلے آپ کو آگاہ کر چکے ہیں کہ صحابی کی تفسیر جس کی سند اہلِ کتاب کی روایت ہو اور اس کا وقوع بہت ہوتا ہے تو اس کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوتی ہے، نہ اس کے واسطے عربی تفسیر سے عدول جائز ہوسکتا ہے۔ ہاں اگر سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت صحیح ہو جائے تو وہ اُن تفاسیر کی سند قرار پائے گی، جو ظاہر کے خلاف ہیں اور مراد کو بیان کرنے والی زیادت ٹھہرے گی اور اگر وہ قراءت صحیح نہ ٹھہرے گی تو جو جمہور سبعہ کی قراءت کا اور جو لوگ اُن سے پہلے یا اُن کے بعد ہیں اُن کی قراءت کا مقتضا ہوگا، اسی پر وقوف متعین ٹھہرے گا۔[1]

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝٣٦ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءِ الزَّكٰوةِ ۽ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۤۙ ۝٣٧ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝٣٨

یہ (چراغ اور قندیلیں) ان گھروں میں ہیں (جن کی بابت) اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے (اور) وہ وہاں صبح وشام اس کی تسبیح کرتے ہیں (36) وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت، اللہ کے ذکر اور نماز قائم کرنے اور زکات دینے سے

[1] فتح القدير (٤/ ٥١) فتح البيان (٩/ ٢٢٢ ـ ٢٢٩)

غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں اُلٹ پلٹ جائیں گی ﴿37﴾ (وہ یہ کام کرتے ہیں) تاکہ اللہ انھیں ان کے اعمال کی بہترین جزا دے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے ﴿38﴾

مساجد کی تعمیر، صفائی اور آبادکاری کا حکم:

ایمان کی برکت سے مومن کے لیے نیک عمل کا بدلہ ہے اور بدعمل معاف، اور کفر کی شامت سے کافر کو بدعمل کی سزا ہے اور نیک عمل خراب۔ یہی مطلب ہے بہترین بدلے کا۔ انتھٰی۔

جبکہ اللہ پاک نے مومن کے دل کی مثال بیان کی اور اس علم اور ہدایت کی جو اس میں ہے، جیسے قندیل کہ اس میں چراغ ہے اور چراغ صاف شیشے میں ہے اور وہ چراغ ایک پاک صاف عمدہ تیل سے روشن ہو رہا ہے تو اس کے بعد اس قندیل کا محل ذکر کیا۔ وہ محل یہی مسجدیں ہیں، جو اللہ پاک کو زمین کے ٹکڑوں میں سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ یہ اس کے گھر ہیں، جن میں اس کی عبادت اور توحید کی جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ﴾ یعنی اللہ پاک نے ان گھروں کی خبر گیری کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان میں میل کچیل اور لغو کام اور باتیں صحیح نہیں ہیں، اُن سے اُن کو پاک صاف کرو، جس طرح کہ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ پاک نے ان میں لغو کرنے سے نہی فرمائی ہے۔

اسی طرح امام عکرمہ، ابو صالح، ضحاک، نافع بن جبیر، ابوبکر بن سلیمان بن ابی خیثمہ اور سفیان بن حسین رحمہم اللہ وغیرہم علمائے مفسرین نے کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ یہی مسجدیں ہیں کہ اللہ پاک نے ان کے بنانے اور آباد کرنے اور پاک صاف رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ ہم سے ذکر کیا گیا ہے، امام کعب رحمہ اللہ کہا کرتے تھے: تورات میں لکھا ہوا ہے کہ بے شک زمین میں میرے گھر مسجدیں ہیں اور بے شک جو شخص وضو کرے، پھر اپنا وضو اچھا کرے، پھر میری زیارت کرے میرے گھر میں تو میں اس کی عزت کروں گا اور مزور پر (یعنی جس کی ملاقات کو جاتے ہیں) زائر کی عزت کرنا حق ہے۔[1] (و رواه عبدالرحمن بن أبي حاتم في تفسيره)

مساجد کے فضائل و آداب:

مسجدوں کی بنا (تعمیر کرنا) و احترام و تعظیم اور عزت اور پاکیزگی و تبخیر میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، اس کے لیے ایک علاحدہ مقام ہے، جس میں وہ ذکر کی جائیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان حدیثوں کو ایک علاحدہ جز میں لکھا ہے۔ وللّٰه الحمد والمنة. اور ہم بعون اللہ تعالیٰ ان میں سے کچھ یہاں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ،

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٠٤_ ٢٦٠٥)

اسی پر اعتماد ہے اور اسی پر بھروسا ہے:

① امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے: جو شخص کوئی مسجد بنائے اس حال میں کہ وہ اس سے اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے تو اللہ اس کے لیے ویسا ہی گھر جنت میں بنائے گا۔[1] (أخرجاه في الصحيحين)

② امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی مسجد بنائے کہ اس میں اللہ کے نام کا ذکر ہو تو اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنائے گا۔[2] (وللنسائي عن عمرو بن عبسة مثله) حدیثیں اس بارے میں بسیار تر از بسیار ہیں۔

③ اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اَمر فرمایا ہے کہ گھروں میں مسجدیں بنائیں اور اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ پاک صاف کی جائیں اور اُن میں خوشبو لگائی جائے۔[3] (رواه أحمد وأهل السنن إلا النسائي ولأحمد وأبي داود عن سمرة بن جندب نحوه)

④ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ تو لوگوں کے واسطے ایسی شے بنا جو اُن کو بچائے، (یعنی گرمی سردی سے ان کا بچاؤ ہو جائے) اور اس سے بچ کہ اسے سرخ یا زرد رنگ کرو تو تو لوگوں کو فتنے میں ڈالے۔[4]

⑤ امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی قوم کا کوئی عمل برا نہیں ہوا، مگر یہ کہ انھوں نے اپنی مسجدوں کو مزخرف کیا۔[5] (زخرف اصل میں سونے کو اور کمال حسن شے کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد نقش و نگار کرنا ہے اور سونے کا ملمع کرنا ہے، اس کی ممانعت اس لیے ہے کہ نماز پڑھنے والے کو مشغول کریں۔) اس کی اسناد میں ضعف ہے۔

⑥ امام ابو داود رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے تشیید مساجد کا حکم نہیں کیا گیا۔ (تشیید سے مراد اونچی عمارت بنانا ہے۔[6] (كذا في مجمع البحار)) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: واللہ! تم اُن کو مزخرف کرو گے، جس طرح کہ یہود و نصاریٰ نے مزخرف کیا۔[7]

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٣)

② سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٣٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨٨) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٦٦)

③ مسند أحمد (٦/ ٢٧٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٥٩) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٦٨)

④ صحيح البخاري (١/ ١٧١)

⑤ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤١) اس کی سند میں ''جبارہ بن مغلس'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٤٤٤٧)

⑥ مجمع بحار الأنوار (٢/ ٤٣٠)

⑦ سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٥٥٠)

⑦ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی، یہاں تک کہ لوگ مسجدوں میں فخر کریں گے۔[1] (رواه أحمد و أهل السنن إلا الترمذي)

⑧ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے مسجد میں طلب کیا، یعنی سوال کیا تو کہا: کون شخص ہے جو میرے گم شدہ سرخ اُونٹ کے بارے میں بتائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نہ پائے، مسجدیں جو بنائی گئی ہیں تو اسی شے کے لیے کہ جس کے واسطے بنائی گئی ہیں، یعنی نماز و ذکر اللہ اور تلاوت کے لیے۔[2] (رواه مسلم)

⑨ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہی فرمائی ہے، مسجدوں میں بیچنے اور خریدنے اور شعر پڑھنے سے۔[3] (رواه أحمد وأهل السنن وقال الترمذي: حسن)

⑩ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم اس شخص کو دیکھو جو مسجد میں خرید و فروخت کرتا ہے تو کہو کہ اللہ تمھاری تجارت کو سود مند نہ کرے۔ اور جب تم دیکھو اس شخص کو جو مسجد میں کسی گمی ہوئی شے کو تلاش کرتا ہے تو کہو کہ اللہ اس کو پھیر کر نہ لائے۔[4] (رواه الترمذي وقال: حسن غريب)

⑪ ابن ماجہ وغیرہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ کئی باتیں ہیں کہ جن کو مسجد میں کرنا صحیح نہیں ہے: اس کو راہ گزر نہ بنایا جائے، اس میں ہتھیار ننگا نہ کیا جائے، اس میں آواز بلند نہ کی جائے، اس میں کمانیں نہ پھیلائی جائیں، اس میں تیر نہ پھیلایا جائے، اس میں کچا گوشت نہ لے جایا جائے، اس میں حد نہ ماری جائے اور نہ قصاص لیا جائے، اس کو بازار نہ بنایا جائے۔[5]

⑫ سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ہماری مسجدوں کو اپنے بچوں اور دیوانوں سے بچاؤ اور اپنی خرید و فروخت سے اور اپنے جھگڑوں سے اور اپنی آوازیں بلند کرنے سے اور اپنی حدود قائم کرنے سے اور اپنی تلواریں برہنہ کرنے سے اور اُن کے دروازوں پر مطاہر، یعنی طہارت خانے بناؤ اور اُن کے جمعوں میں تجمیر کرو، یعنی خوشبو سے معطر کرو۔[6] (و رواه ابن ماجه أيضاً وفي إسنادهما ضعف)

---

① مسند أحمد (٣/ ١٣٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٣٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٥٥٠)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٦٩)

③ مسند أحمد (٢/ ١٧٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٧٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٧١٤_ ٧١٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو ''حسن'' کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٧/ ٣٦٣)

④ سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٧٣)

⑤ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤٨) اس کی سند میں ''زید بن جبیرہ'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٤٩٧)

⑥ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٥٠) اس کی سند میں ''حارث بن نبہان'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب (١/ ٤٧)

یہ جو فرمایا کہ وہ راہ نہ ٹھہرائی جائے تو بعض علماء نے مسجد میں سے گزرنے کو مکروہ کہا ہے، مگر حاجت کے واسطے جبکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ اور اثر میں ہے کہ فرشتے اس شخص پر تعجب کرتے ہیں، جو مسجد سے گزرتا ہے اور اس میں نماز نہیں پڑھتا۔ یہ جو فرمایا کہ اس میں کوئی ہتھیار ننگا نہ کیا جائے اور نہ آواز کی جائے اس میں کمان اور نہ بکھیرے جائیں اس میں تیر تو یہ ممانعت اس خوف سے ہے کہ کہیں ہتھیار اور تیر کسی کو لگ نہ جائیں، کیوں کہ مسجد میں لوگوں کی کثرت ہوتی ہے اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ جس وقت کوئی شخص تیر لے کر گزرے تو ان کی بھالوں کو پکڑے، تاکہ کسی کو ایذا نہ پہنچائے۔[1] جس طرح کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے۔ کچا گوشت لے کر مسجد میں گزرنے کی جو ممانعت فرمائی ہے تو اس خوف سے کہ کہیں اس سے خون کے قطرے ٹپکیں، جس طرح حیض والی عورت کو مسجد میں گزرنے سے منع کیا گیا ہے، جب کہ مسجد کے گندہ کرنے سے ڈرے۔

رہی یہ بات کہ اس میں حد نہ ماری جائے، نہ قصاص لیا جائے تو اس میں اس بات کا خوف ہے کہ جس کو حد کی سزا ماری جائے یا قصاص میں قطع کیا جائے تو کہیں اس میں سے نجاست نہ ظاہر ہو جائے۔ مسجد کو بازار ٹھہرانے سے جو منع کیا ہے تو اس لیے کہ اس میں خرید و فروخت کرنے کی ممانعت پہلے گزر چکی ہے، کیوں کہ وہ تو اس لیے بنائی گئی ہے کہ اس میں اللہ کی یاد ہو اور نماز پڑھی جائے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اس بدوی سے فرمایا تھا جس نے مسجد کے ایک حصے میں پیشاب کر دیا تھا کہ مسجدیں اس واسطے نہیں بنائی گئیں، وہ تو اللہ کے ذکر کے لیے بنائی گئی ہیں اور اس لیے کہ ان میں نماز قائم ہو۔ پھر آپ ﷺ نے ایک ڈول پانی لانے کا حکم دیا جو اس کے پیشاب پر بہا دیا گیا۔[2]

دوسری حدیث میں جو یہ فرمایا ہے کہ تم اپنی مسجدوں کو اپنے بچوں سے بچاؤ تو اس لیے منع کیا ہے کہ وہ اس میں کھیلیں گے اور یہ اُن کے لیے مناسب نہیں ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب بچوں کو مسجد میں کھیلتے ہوئے دیکھتے تو اُن کو مخفقہ، یعنی درے سے مارتے۔ وہ عشاء کے بعد مسجد کا گشت کرتے تو اس میں کسی کو نہ چھوڑتے۔ دیوانوں سے بچانے کا اس لیے حکم دیا کہ اُن کی عقلیں ضعیف ہیں، لوگ اُن سے ہنسی دل لگی کریں گے تو یہ مسجدوں میں لعب کرنے کا باعث ہوگا اور اس خوف سے کہ کہیں وہ مسجد کو گندہ کر دیں اور اس جیسی اور کوئی بات ہو۔ خصومات سے بھی منع فرمایا۔ مراد اس سے مسجد میں حاکم کے پاس جھگڑا لے جانا ہے، نہ حاکم اس میں فیصلہ کرے۔ اسی لیے بہت سے علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ حاکم مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے مسجد میں نہ بیٹھے، بلکہ اس کے سوا کسی اور جگہ میں بیٹھے، کیوں کہ اس میں کثرت سے مقدمات پیش ہوتے ہیں اور اُن میں ایسے اختلافات اور الفاظ واقع ہوتے ہیں کہ مسجد کے شایان نہیں ہوتے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۶۱۵) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۵)

اسی لیے اس کے بعد یوں فرمایا ہے کہ مسجدوں کو اپنی آواز اونچی کرنے سے بچاؤ۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سائب بن یزید کندی سے روایت کیا ہے، کہا: میں مسجد میں کھڑا ہوا تھا کہ مجھے کسی شخص نے کنکر مارا، میں نے نظر کی تو دیکھا کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ فرمایا: تو جا میرے پاس اُن دو آدمیوں کو لے آ۔ میں اُن کو اُن کے پاس لے آیا۔ فرمایا: تم کون ہو؟ یا کہاں سے ہو؟ وہ بولے: طائف والوں سے۔ فرمایا: اگر تم اس شہر والوں سے ہوتے تو میں ضرور تمھیں سزا دیتا، تم اپنی آوازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں بلند کرتے ہو!![1]

امام نسائی رحمہ اللہ نے ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد میں کسی شخص کی آواز سنی تو فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ تو کہاں ہے؟[2] یہ بھی صحیح ہے۔ آپ کا یہ قول کہ مسجدوں کو حدود قائم کرنے سے اور اپنی تلواروں کے کھینچنے سے بچاؤ تو یہ دونوں باتیں گزر چکی ہیں اور آپ کا یہ قول کہ اُن کے دروازوں پر مطاہر بناؤ۔ مطاہر سے مراد طہارت خانے ہیں، یعنی پاخانے، غسل خانے، جن سے وضو اور قضائے حاجت پر مدد لی جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے قریب کئی کنویں تھے۔ اُن میں سے لوگ پانی بھرتے تھے تو پیتے تھے اور طہارت کرتے، وضو کرتے تھے، اس کے سوا اور کام بھی۔ یہ قول کہ "جَمِّرُوْهَا فِي الْجُمَعِ" اس سے مراد یہ ہے کہ جمعے کے دنوں میں مسجدوں میں بخور جلاؤ، اس لیے کہ اس دن لوگ بہت جمع ہوتے ہیں۔ حافظ ابو یعلیٰ موصلی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ ہر جمعے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کو بخور کیا کرتے تھے۔[3] (إسناده حسن لا بأس به، والله أعلم)

(13) صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرد کی نماز با جماعت اس کی اپنے گھر کی نماز اور اپنے بازار کی نماز سے پچیس گنا زیادہ ثواب رکھتی ہے اور یہ اس لیے کہ جس وقت اس نے وضو کیا، اچھا وضو کیا، پھر وہ مسجد کی طرف نکلا اور اس کی غرض صرف نماز کا ادا کرنا ہو تو اس کے ہر قدم پر اس کا ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور اس سے ایک گناہ گرایا جاتا ہے۔ پھر جب اس نے نماز پڑھی تو فرشتے اس پر درود بھیجتے رہتے ہیں، جب تک کہ وہ اپنی نماز کی جگہ میں ہے اور کہتے ہیں: الٰہی! تو اس پر درود بھیج۔ الٰہی! تو اس پر رحم فرما اور وہ اس وقت تک نماز ہی میں رہتا ہے جب تک کہ نماز کا انتظار کرتا ہے۔[4]

(14) امام دارقطنی رحمہ اللہ کے نزدیک مرفوعاً یہ ہے کہ مسجد کے پڑوسی کی نماز سوائے مسجد کے نہیں ہے۔[5]

(15) سنن میں ہے کہ تو اندھیروں میں چل کر مسجدوں کو جانے والے لوگوں کو قیامت کے دن روشنی کی خوش خبری سنا۔[6]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٨) [2] سنن النسائي الكبرىٰ، ط: مؤسسة الرسالة (١٠/ ٤٠٤)

[3] مسند أبي يعلىٰ (١/ ١٧٠) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٩)

[5] سنن الدارقطني (١/ ٤٢٠) اس کی سند میں "سلیمان بن داود" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٨٣)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٨١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٢٣)

16 اس شخص کے لیے جو مسجد میں داخل ہو، یہ مستحب ہے کہ سیدھے پاؤں سے ابتدا کرے اور یہ کہے جو صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تو فرماتے: «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ» فرمایا: جب وہ یہ کہتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ دن کے باقی حصے میں وہ مجھ سے محفوظ رکھا گیا۔[1]

17 امام مسلم رحمہ اللہ نے بسندِ خود ابو حمید یا ابو اسید رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم میں جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو کہے: «اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ» اور جب نکلے تو چاہیے کہ کہے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ»[2] (ورواه النسائي عنهما عن النبيﷺ)

18 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ پر سلام کرے اور کہے: «اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ» اور جب نکلے تو چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ پر سلام بھیجے اور کہے: «اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِيْ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ»[3] (ورواه ابن ماجه، وابن خزيمة و ابن حبان في صحيحيهما)

19 سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت مسجد میں داخل ہوتے تو درود پڑھتے محمد ﷺ پر اور سلام بھیجتے، پھر فرماتے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ، وَافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ» اور جب نکلتے تو محمد ﷺ پر درود وسلام بھیجتے، پھر فرماتے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ، وَافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ فَضْلِكَ»[4]
(رواه الإمام أحمد عن عبد الرحمن بن حسين عن أمه فاطمة بنت حسين عن جدتها بنت رسول اللهﷺ، ورواه الترمذي وابن ماجه، وقال الترمذي: هذا حديث حسن و إسناده ليس بمتصل لأن فاطمة بنت الحسين الصغرىٰ لم تدرك الكبرىٰ)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جو ہم نے ذکر کیا ان حدیثوں کے ساتھ جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں اور ہم نے انھیں طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا، وہ سب اس قول پاک میں داخل ہیں: ﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ ﴾

مساجد میں ذکرِ الٰہی، ان کی تعمیر کا واحد مقصد:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ٣١] ''اے بنی آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو۔'' اور یہ آیت: ﴿ وَاَقِيْمُوْا

---

1 سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٦) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٢١) البتہ صحیح بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔
2 صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٧٢٩)
3 سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٧٣) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٣١) صحيح ابن حبان (٥/ ٣٩٥) صحيح الجامع (٥١٤)
4 مسند أحمد (٦/ ٢٨٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧١)

﴿ وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ [الأعراف: ۲۹] ''اور (یہ کہ) ہر نماز کے وقت اپنے منہ سیدھے (قبلہ رخ) کرلو، اور خالص اسی کی اطاعت کرتے ہوئے اسی کو پکارو۔'' نیز یہ فرمان: ﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ۱۸] ''اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں، لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی کو بھی نہ پکارو۔'' دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسجدیں اللہ کی ملکیت ہیں تو اُن میں اسی کی عبادت کرنی چاہیے نہ کہ غیر کی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ''يُتْلٰى كِتَابُهٗ'' [1] یعنی ان مسجدوں میں اللہ پاک کی کتاب تلاوت کی جاتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ یعنی اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں مسجدوں میں صبح کے وقت اور شام کے وقت۔ ''أصال'' ''اَصیل'' کی جمع ہے۔ ''اَصیل'' پچھلے دن کو کہتے ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قرآن شریف میں ہر تسبیح نماز ہے۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے اُن سے روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ ''غُدُوّ'' سے مراد صبح کی نماز ہے اور ''أصال'' سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ان ہی دونوں نمازوں کو فرض کیا تھا، چنانچہ پسند فرمایا کہ ان کا ذکر کرے اور اپنے بندوں کو وہ یاد دلائے۔ اسی طرح امام حسن اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز ہے۔ [2] قاریوں میں سے جس قاری نے ''يُسَبَّحُ'' کو بفتحِ باء بصیغۂ مضارع مجہول پڑھا ہے تو اس نے ﴿ وَالْاٰصَالِ ﴾ پر وقف تام کیا ہے اور ﴿ رِجَالٌ ﴾ سے ابتدا کی ہے۔ گویا یہ مفسر ہے فاعل محذوف کا، جس طرح کہ اس شعر میں ہے:

لِيُبْكَ يَزِيْدُ ضَارِعٌ لِخُصُوْمَةٍ وَمُخْتَبِطٌ مِمَّا تُطِيْحُ الطَّوَائِحُ

یعنی چاہیے کہ یزید رویا جائے، گویا کسی نے کہا کہ اسے کون شخص روئے؟ کہا کہ روئے اس کو وہ شخص جو کہ خصومت کے سبب سے آہ وزاری کر رہا ہے اور وہ شخص جو کہ خبطی اور دیوانہ ہو رہا ہے، وہ اس سبب سے روئے کہ حوادثِ زمانہ اس کو ضائع و حیران کر رہے ہیں۔ اسی طرح آیتِ باب میں ہے۔ جب یوں کہا ہے کہ مسجدوں میں اللہ پاک کی تسبیح کی جاتی ہے صبح و شام تو گویا کسی نے کہا ہے کہ اس کی تسبیح کون کرتا ہے تو اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ اس کی تسبیح کرتے ہیں وہ مرد جن کی ایسی ایسی صفت ہے اور جس نے ''يُسَبِّحُ'' بکسرِ باء بصیغۂ معروف پڑھا ہے تو اس نے اس کو فعل ٹھہرایا ہے اور ﴿ رِجَالٌ ﴾ کو اس کا فاعل قرار دیا، اب وقف صحیح نہیں ہوگا مگر فاعل پر، کیوں کہ وہاں کلام ختم ہوتا ہے۔

﴿ رِجَالٌ ﴾ میں اس بات کی خبر دینا ہے کہ وہ بڑے مرد ہیں جو مرد ہونے میں کامل ہیں، ان کی ہمتیں سامی ہیں، ان کی نیتیں اور عزم و ارادے بلند ہیں، جن کے سبب سے وہ مسجدوں کو آباد کرنے والے ہو گئے، کونسی مسجدیں جو زمین سے اللہ پاک کے گھر ہیں اور اس کی عبادت، شکر، توحید اور پاکی بیان کرنے اور تقدیس کی جگہ ہیں۔ جیسا کہ

[1] تفسیر الطبري (۱۹/ ۱۹۱) [2] تفسیر الطبري (۱۹/ ۱۹۱۔ ۱۹۲)

اللہ پاک نے دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ [الأحزاب: ٢٣] ''مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چناں چہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پا گئے)، اور ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

عورتوں کی نماز گھروں میں افضل ہے:

یہ تو مردوں کا حال ہے۔

(1) رہیں عورتیں تو ان کے لیے اُن کی نماز اُن کے گھروں میں افضل ہے، اس لیے کہ امام ابو داود رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عورت کی نماز اس کے گھر میں افضل ہے اس کے حجرے کی نماز سے، اور اس کی نماز اپنے مخدع میں افضل ہے اس کی نماز سے اس کے گھر میں۔[1] (یہاں تین لفظ ہیں: ایک بیت، دوسرا حجرہ اور تیسرا مخدع۔ بیت مطلق گھر کو کہتے ہیں۔ "حُجرہ" بالضم بہ معنی خانۂ خرد کو۔ اور مخدع بضم میم وبفتح نیز، وہ گھر ہے جس میں بہتر اسباب چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ وہ خزانہ ہے بڑے گھر کے اندر۔ یہاں بیت سے مراد کوٹھری معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس کی نماز کو حجرے سے افضل فرمایا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ گھر میں حجرے سے زیادہ ستر ہے، پھر گھر سے افضل مخدع کو فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس میں گھر سے بھی زیادہ ستر ہے تو گویا مخدع تہ خانہ ہوا گھر کے اندر، گھر میں اس سے زیادہ ستر والی جگہ اور کوئی نہیں ہے۔)

(2) امام احمد رحمہ اللہ نے اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کی بہتر مساجد ان کے گھروں کے قعر ہیں (یعنی گھر کے اندر وہ جگہ جو نہایت درجہ ستر کی ہو)۔[2]

(3) نیز امام احمد رحمہ اللہ نے ام حمید ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہما کی بی بی سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔ عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ فرمایا: بے شک میں نے جان لیا کہ تو میرے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہے اور حالت یہ ہے کہ تیری نماز اپنی قوم کی مسجد میں بہتر ہے میری مسجد میں تیری نماز سے۔ راوی نے کہا: اس بی بی نے حکم دیا تو اُن کے لیے اُن کے گھر کے پرلے سرے میں دوسرے گھروں سے پرے ایک مسجد بنائی گئی، واللہ! وہ اس میں نماز پڑھتی تھیں، یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملیں۔[3] (لم یخرجوه)۔ یہ تو افضل کا بیان تھا۔

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٣٣)

(2) مسند أحمد (٦/ ٢٩٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٣٢٧)

(3) مسند أحمد (٦/ ٣٧١) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٨٢)

عورتوں کا مسجد میں آ کر باجماعت نماز ادا کرنا جائز ہے:

اب رہا جواز تو عورت کو مردوں کی نماز میں حاضر ہونا جائز ہے، بشرطیکہ مردوں میں سے کسی کو اپنی زینت اور خوشبو ظاہر کر کے ایذا نہ دیں:

1 جیسا کہ صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ کی لونڈیوں کو اللہ کی مسجدوں سے منع نہ کرو۔[1] (رواہ البخاري و مسلم) امام احمد اور ابو داود رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ ان کے گھر ان کے لیے بہترین ہیں۔[2] ایک روایت میں یہ ہے اور چاہیے کہ نکلیں اور وہ تفِلات ہوں، یعنی اُن کے لیے خوشبو نہ ہو۔[3]

2 صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب رضی اللہ عنہا سے ثابت ہوا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ جس وقت تم میں سے کوئی مسجد میں حاضر ہو تو خوشبو نہ ملے۔[4]

3 صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ مومنوں کی بیویاں فجر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر ہوا کرتی تھیں۔ پھر اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی لوٹتیں، اندھیرے کے مارے پہچانی نہیں جاتی تھیں۔[5]

4 صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شے کو پاتے جو عورتوں نے نئی نکالی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو مسجدوں میں آنے سے منع فرما دیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتیں منع کی گئیں۔[6]

اللہ کے بندے تجارت کے باعث ذکر اللہ سے غافل نہیں ہوتے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الجمعة: ٩] ''اے ایمان والو! جب اذان دی جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن، تو تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید وفروخت کرنا چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔'' اللہ پاک فرماتا ہے کہ دنیا اور اس کی زیب و زینت اور خرید و فروخت اور تجارت کی جگہ اُن کو اپنے رب کی یاد سے غافل نہیں رکھتی، کونسا رب؟ جو اُن کا خالق اور رازق ہے۔ جو لوگ اس ثواب کے لیے عمل کرتے ہیں جو اللہ پاک کے پاس ہے، وہ اُن کے لیے زیادہ بہتر اور نفع مند ہے اس شے سے جو ان کے ہاتھ میں ہے، کیوں کہ جو کچھ اُن کے پاس ہے وہ فانی

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٨٥٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٤٢)

[2] مسند أحمد (٢/ ٧٦) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٦٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحیح أبي داود (٣/ ١٠٣)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٦٥) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٧٤٥٧) [4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٤٣)

[5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٥٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٤٥)

[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٨٣١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٤٥)

ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لَا تُلْهِيْهِمْ ﴾ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی طاعت، مراد اور محبت کو اپنی آپس کی مراد و محبت پر مقدم رکھتے ہیں۔

ہشیم نے سیار سے روایت کیا ہے کہ مجھ کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے ایک قوم کو بازار والوں میں سے دیکھا کہ جب فرض نماز کی اذان دی گئی تو اپنی خرید و فروخت کے معاملات کو چھوڑ دیا اور نماز کی طرف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ انہیں لوگوں میں سے ہیں جن کا ذکر اللہ پاک نے اپنی کتاب میں کیا ہے: ﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ اسی طرح عمرو بن دینار قہرمانی نے ''عن سالم عن عبد الله بن عمر'' روایت کیا ہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بازار میں تھے کہ نماز کھڑی کی گئی تو اُن لوگوں نے اپنی دکانوں کو بند کر دیا اور مسجد میں داخل ہوئے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہیں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ اس کو ابن ابی حاتم و ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابوعبد رب سے روایت کیا ہے کہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ میں اس دَرَج پر کھڑا رہا، اس پر خرید و فروخت کیا کرتا تھا (دَرَج راستے کو کہتے ہیں)۔ ہر روز مجھے تین سو دینار کا نفع ملتا تھا۔ ہر دن مسجد میں نماز میں حاضر ہوتا تھا۔ خبردار! میں نہیں کہتا کہ یہ حلال نہیں ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں اُن میں سے ہوں جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾۔ عمرو بن دینار اعور نے کہا ہے کہ میں سالم بن عبداللہ کے ہمراہ تھا، ہم مسجد جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ پھر ہم بازار میں سے گزرے اور لوگ نماز کی طرف کھڑے ہو چکے تھے اور اپنے سامان کو ڈھانک دیا تھا۔ سالم نے اُن کے سامان کی طرف دیکھا تو اس کے پاس کوئی نہ تھا، سالم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ پھر کہا: یہ وہ لوگ ہیں۔

اسی طرح امام سعید بن ابی الحسن اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ان کو تجارت اور خرید و فروخت نماز کے لیے جانے سے باز نہیں رکھتی۔ مطر ورّاق نے کہا ہے کہ وہ خرید و فروخت کر رہے ہوتے تھے، لیکن اُن میں کوئی جس وقت اذان سنتا تھا اور ترازو اس کے ہاتھ میں ہوتی تھی تو وہ اس کو نیچے رکھ دیتا اور نماز کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد فرض نماز ہے۔ امام مقاتل بن حیان اور ربیع بن انس رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد باجماعت نماز ہے۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٩٢) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٠٧)

کا حاصل یہ ہے کہ مراد نماز میں حاضر ہونا اور اس کا قائم کرنا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا ہے اور اس کے وقتوں کی پابندی کرنا اور نماز میں سے جس شے کی محافظت کرنا اللہ نے چاہا ہے اس کی حفاظت کرنا۔[1]

فکرِ آخرت ہی انسان کو دین کا پابند بناتی ہے:

﴿ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ﴾ اس دن سے مراد یومِ قیامت ہے، جس دن دل اور آنکھیں بھی مارے گھبراہٹ اور ہولنا کیوں کے اُلٹے جائیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴾ [المؤمن: ١٨] ''اور آپ انھیں قریب آنے والے دن (قیامت) سے ڈرائیں، جبکہ غم سے بھرے کلیجے حلقوں کو آ رہے ہوں گے، ظالموں کے لیے نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ کوئی سفارشی کہ جس کی بات مانی جائے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴾ [إبراهيم: ٤٢] ''وہ تو انھیں اس دن تک مہلت دیے ہوئے ہے، جس دن آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ۝ وَ جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا ﴾ [الدهر: ٨۔ ١٢] ''اور وہ کھانا، اس کی محبت کے باوجود، مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں:) بس ہم تو تمھیں اللہ کی خاطر کھانا کھلاتے ہیں، ہم تم سے جزا اور شکر گزاری نہیں چاہتے۔ ہم اپنے رب سے چہرے بگاڑ دینے والے نہایت سخت دن کا خوف کھاتے ہیں۔ پھر اللہ نے انھیں اس دن کے شر (عذاب) سے بچا لیا اور تازگی اور سرور سے نوازا۔ اور ان کے صبر کے عوض انھیں جنت اور ریشمی لباس کا بدلہ عطا فرمایا۔''

آخرت کی بہتر جزاء کا بیان:

اس جگہ اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے: ﴿ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا ﴾ یعنی یہ لوگ اُن لوگوں میں سے ہیں جن کی نیکیاں قبول کی جائیں گی اور اُن کی برائیوں سے درگزر کیا جائے گا۔ ﴿ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک اُن سے نیک کام کو قبول فرمائے گا اور اس کو اُن کے سامنے کئی گنا کر دے گا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٤٠] ''بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے اور اپنی

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٠٧۔ ٢٧٠٩)

طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٦٠] ’’جوشخص (وہاں) ایک نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے دس گنا (ثواب) ہوگا، اور جوشخص ایک برائی لے کر آئے گا تو اسے بس اس کے برابر ہی سزا دی جائے گی۔ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۚ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [البقرة: ٢٤٥] ’’کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے؟ پھر اللہ وہ مال اس کے لیے کئی کئی گناہ بڑھا دے اور اللہ ہی تنگی کرتا اور فراخی کرتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ [البقرة: ٢٦١] ’’اور اللہ جس کے لیے چاہے (اجر) بڑھا دیتا ہے۔‘‘

اور یہاں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے پاس دودھ لایا گیا تو اُنھوں نے اپنے ہم نشین لوگوں میں سے ایک ایک پر اس کو پیش کیا، تو سب نے اس کو نہ پیا، اس واسطے کہ وہ روزہ دار تھے۔ پھر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کو لے لیا اور اس کو پی گئے، ان کا روزہ نہ تھا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا... الآية﴾[1] (رواه النسائي و ابن أبي حاتم من حديث الأعمش عن إبراهيم عن علقمة عنه)

نیز سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا بنت یزید بن سکن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس وقت اللہ اگلوں اور پچھلوں سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا، پھر ایک منادی آئے گا تو ایسی آواز سے ندا کرے گا کہ تمام خلائق کو سُنا دے گا، عن قریب مجمع والے جان لیں گے کہ کون سا شخص زیادہ کرم کا مستحق ہے، وہ یہ آواز کرے گا کہ وہ لوگ کھڑے ہو جائیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے مشغول نہیں کرتی ہے۔ چنانچہ وہ کھڑے ہو جائیں گے اور وہ ساری خلائق میں تھوڑے سے ہوں گے، پھر ساری خلائق سے حساب لیا جائے گا۔[2] طبرانی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ﴾ [الفاطر: ٣٠] ’’تاکہ وہ (اللہ) انھیں ان کے اجر پورے دے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے۔‘‘ کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أُجُوْرَهُمْ: يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ، وَيَزِيْدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ الشَّفَاعَةَ لِمَنْ وَجَبَتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ، لِمَنْ صَنَعَ لَهُمُ الْمَعْرُوْفَ فِي الدُّنْيَا»[3] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ﴾ میں اختلاف ہے کہ کس سے متعلق ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ماقبل سے متعلق ہے۔ پھر اس میں

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨٤٥) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٠٩)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦١٠) اس کی سند میں ’’عبدالرحمن بن اسحاق‘‘ ضعیف راوی ہے۔

[3] المعجم الكبير (١٠/ ٢٠١) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٨٧۔ ٣٩٣) اس کی سند میں ’’اسماعیل بن عبداللہ کندی‘‘ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: مجمع الزوائد (٧/ ٧٤)

اختلاف ہے کہ ماقبل کے کس لفظ سے متعلق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ ''مشکاۃ'' سے متعلق ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''کَمِشْکَاۃٍ فِيْ بَعْضِ بُیُوْتِ اللّٰہِ'' یعنی مساجد، گویا یوں کہا گیا کہ اس کے نور کی مثال ایسی ہے، جیسے: مسجد میں مشکوۃ کا نور دکھائی دیتا ہے، جس کی صفت ایسی ایسی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مصباح سے متعلق ہے۔ کسی نے کہا: زجاجہ کی صفت ہے۔ ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے ابو العباس کو سنا، وہ کہتے تھے کہ ﴿ فِيْ بُيُوْتٍ ﴾ حال ہے مصباح و زجاجہ وکوکب کا۔ گویا یوں کہا گیا کہ یہ تینوں بیوت میں ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يُوْقَدُ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی وہ چراغ بیوت میں روشن کیا جاتا ہے۔ ان قولوں کی بنا پر ﴿ عَلِيْمٌ ﴾ پر وقف نہ ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ ''مشکاۃ'' سے متعلق ہو یا ''مصباح'' سے یا ''یُوْقَدُ'' سے اس کی کیا وجہ ہے کہ ''مصباح و مشکاۃ'' کو صیغۂ واحد میں ذکر کیا اور ''بیوت'' کو جمع، حالانکہ ایک مشکاۃ اور ایک مصباح تو ایک ہی گھر میں ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ من جملہ اس خطاب کے ہے، جس کا اول واحد سے شروع کیا جاتا ہے اور خاتمہ جمع سے ہوتا ہے، جس طرح کہ یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ ﴾ [الطلاق: ۱] ''اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو انھیں ان کی عدت کے (آغاز) وقت میں طلاق دو۔'' اور اس جیسی اور آیات۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فِيْ بُيُوْتٍ ﴾ کے معنی ''فِيْ کُلِّ وَاحِدٍ مِنَ الْبُیُوْتِ'' ہیں تو گویا یوں کہا ہے کہ ہر گھر میں، یا گھروں سے ہر ایک میں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مابعد سے متعلق ہے، یعنی ''یُسَبِّحُ رِجَالٌ فِيْ بُیُوْتٍ'' اس قول کی بنا پر کلمۂ ﴿ فِيْهَا ﴾ کی تکرار تاکید وتذکیر کے لیے ہوگی اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لیے ہوگی کہ یہ تقدیم اہتمام کے لیے ہے نہ کہ اس لیے کہ تسبیح کو محدود کیا جائے اس بنا پر کہ تسبیح صرف گھروں میں کی جاتی ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ محذوف سے متعلق ہے: ''أَيْ: سَبِّحُوْہُ فِيْ بُیُوْتٍ'' یعنی تسبیح کرو اللہ کے گھروں میں۔ ان دونوں قولوں کی بنا پر ﴿ عَلِيْمٌ ﴾ پر وقف کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ چھے وجہیں ہیں جن کا ذکر سمین وغیرہ نے کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ماقبل سے منفصل ہے۔ گویا اللہ پاک نے یوں فرمایا: ''اَللّٰہُ فِيْ بُیُوْتٍ أَذِنَ اللّٰہُ أَنْ تُرْفَعَ''۔ حکیم ترمذی نے کہا: ''وَبِذٰلِكَ جَاءَتِ الْأَخْبَارُ أَنَّہُ مَنْ جَلَسَ فِيْ الْمَسْجِدِ فَإِنَّمَا یُجَالِسُ رَبَّہُ''[2] یعنی حدیثوں کا ورود اسی معنی پر ہے، من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں بیٹھے تو وہ اپنے ہی رب کی ہم نشینی کرتا ہے۔ بیوت میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے کئی قول پر، ایک یہ ہے کہ ساری مسجدیں ہیں۔

یہ قول امام مجاہد اور حسن رحمہ اللہ وغیرہما کا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ کے گھر زمین میں روشن ہوتے ہیں آسمان والوں کے لیے، جس طرح زمین والوں کے لیے تارے روشن ہوتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد خانہ ہائے بیت المقدس ہیں، یہ قول امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر ہیں، یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ

[1] تفسیر القرطبي (۱۲/ ۲٦٥) [2] تفسیر القرطبي (۱۲/ ۲٦٥)

سے مروی ہے۔ چوتھا یہ ہے کہ سارے گھر ہیں، یہ قول امام عکرمہ رحمہ اللہ کا ہے۔ پانچواں یہ ہے کہ چار مسجدیں ہیں: کعبہ مکرمہ، مسجد قبا، مسجد مدینہ منورہ اور مسجد بیت المقدس، یہ قول ابن زید رحمہ اللہ کا ہے۔ پہلا قول ظاہر تر ہے اس قول کے سبب سے: ﴿ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾۔ ﴿ بُيُوْتٍ ﴾ بیوت کا حرفِ باء مضموم اور مکسور دونوں طرح آتا ہے، یہ سب لغت میں ثابت ہے۔

﴿ اَذِنَ اللّٰهُ ﴾ کے معنی "أَمَرَ وَقَضیٰ" ہیں۔ ﴿ اَنْ تُرْفَعَ ﴾ کے معنی ہیں: "تُبْنَى" اس کے قائل امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ وغیرہما ہیں، یعنی اللہ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ گھر بنائے جائیں، اسی معنی سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ ﴾ [البقرة: ۱۲۷] "اور (یاد کرو) جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے۔" حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ "تُرْفَعُ" کے معنی "تُعْظَمُ" ہیں، یعنی اللہ پاک نے حکم فرمایا ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے، چنانچہ اُن میں بے ہودہ بات ذکر نہ کی جائے اور اُن کی شان بلند کی جائے، نجاستوں اور گندگیوں سے اُن کو پاک صاف رکھا جائے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس قول کو راجح کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ رفع سے مراد مجموعی طور پر یہ باتیں ہیں۔ ﴿ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ﴾ کے معنی ہیں کہ اللہ عزو جل کا ہر ذکر۔ کسی نے کہا ہے کہ ذکر سے مراد توحید ہے۔ کسی نے کہا: قرآن شریف کی تلاوت۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے مسجد میں بچوں کی تعلیم کو مکروہ رکھا ہے، اس لیے کہ گندگیوں اور میل کچیل سے وہ پرہیز نہیں کرتے تو یہ بات مساجد کی عدمِ تنظیف کا باعث ہوگی۔[2] ﴿ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ ﴾ ابن عامر اور ابوبکر رحمہما اللہ نے ﴿ يُسَبِّحُ ﴾ کو بفتح بائے موحدہ بصیغۂ مجہول پڑھا ہے۔[3] باقی قاریوں نے بکسر صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ مگر ابن وثاب وابوحیوہ نے بتائے فوقیہ وکسر بائے موحدہ پڑھا ہے۔ یہ تین قراءتیں ہوئیں۔ چنانچہ پہلی قراءت کی بنا پر نائب فاعل تین مجروروں میں سے کوئی ایک ہوگا، یعنی ﴿ لَهٗ ﴾ یا ﴿ فِيْهَا ﴾ یا ﴿ بِالْغُدُوِّ ﴾ اور ﴿ رِجَالٌ ﴾ مرفوع ہوگا، دو میں سے ایک وجہ سے: یا تو فعل مقدر کا فاعل ہوگا، گویا جواب ہے سوال مقدر کا، مثلاً: کسی نے کہا ہے کہ "مَنْ يُّسَبِّحُهٗ"، تو اس کے جواب میں یوں کہا کہ "يُسَبِّحُهٗ رِجَالٌ" دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ رِجَالٌ ﴾ مبتدائے محذوف کی خبر ہوگی۔ دوسری قراءت کی بنا پر ﴿ رِجَالٌ ﴾ فاعل ٹھہرے گا ﴿ يُسَبِّحُ ﴾ کا۔

تیسرے کی بنا پر بھی فاعل ہوگا۔ فعل کی تانیث اس لیے ہے کہ بعض احوال میں جمع مکسر کے ساتھ مؤنث کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس تسبیح میں اختلاف کیا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے، چنانچہ اکثر نے تو اس کو فرض نماز پر محمول کیا ہے، کہا ہے کہ "غُدُوّ" صبح کی نماز ہے اور "آصال" ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں، کیوں کہ اسم "آصال" ان کو شامل ہوتا ہے۔ ﴿ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ کے معنی "بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ" ہیں، یعنی اس کے لیے نماز پڑھتے ہیں،

[1] فتح القدير (٤/ ٤٧۔ ٤٨) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٧٠) [3] فتح القدير (٤/ ٤٨)

صبح کے وقت صبح کی اور عشی کے وقت میں ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی۔ "غُدُوّ" مفرد اس لیے ذکر کیا ہے کہ اس کی ایک نماز ہے اور "اٰصال" میں کئی نمازیں ہیں۔ "اَصال" "اُصبل" کی جمع ہے اور "اُصل" "أصيل" کی جمع ہے۔ "أصيل" "عشي" کو کہتے ہیں۔ (عَشِيّ وَعَشِيّة و عشاء بالکسر والمد مغرب وعشاء کے درمیانی وقت کو کہا جاتا ہے۔ ایک قوم کا یہ خیال ہے کہ سورج ڈھلنے سے طلوعِ فجر تک کا وقت عشاء ہے) کسی نے کہا ہے کہ نمازِ صبح اور عصر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صلاۃِ ضحیٰ مراد ہے، یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔

دوسرا لفظ ان کا یہ ہے کہ ضحیٰ کی نماز۔ البتہ قرآن میں ہے کہ غوطہ نہیں لگاتا اس پر، مگر غوطہ لگانے والا اس آیت میں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ تسبیح سے اس کے حقیقی معنی مراد ہیں اور وہ اللہ پاک کی پاکی بیان کرنا ہے اس شے سے جو اُس کی ذات، صفات اور افعال میں اس کے لائق نہیں ہے۔ اس کے بعد صلات اور زکات کا ذکر اس قول کی تائید کرتا ہے اور یہ قول اپنے پہلے والے قول سے زیادہ راجح ہے، اس لیے کہ یہ معنی حقیقی ہیں، باوجود دلیل کے جو اس قول کے خلاف پر دال ہے جس کی طرف پہلے قول والے گئے ہیں، دلیل وہی ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان مساجد میں خاص مردوں کا ذکر اس لیے کیا کہ عورتوں پر مسجد میں حاضر ہونا لازمی نہیں، جمعہ اور جماعت کے لیے۔

﴿ لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ یہ جملہ ﴿ رِجَالٌ ﴾ کی صفت ہے، یعنی وہ ایسے مرد ہیں کہ ان کو سفر میں تجارت اور حضر میں خرید وفروخت اللہ کی یاد سے مشغول نہیں کرتی۔ تجارت کا ذکر خاص کر اس لیے کیا کہ آدمی سب کاموں سے بڑھ کر اس میں مشغول ہوتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تجارت اہلِ جلب (گاؤں دیہاتوں سے غلہ بیچنے کے لیے آنے والے) کے لیے ہے اور بیع وہ ہے جس کو آدمی اپنے ہاتھوں پر بیچتا ہے۔ ایک قوم نے اس جگہ تجارت کو خریدنے کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اس لیے کہ بیع کا ذکر اس کے بعد ہے۔ امام واقدی رحمہ اللہ نے بھی امام فراء رحمہ اللہ کے قول کی طرح کہا ہے کہ تجار جلاب مسافر ہیں اور باعہ مقیم لوگ ہیں۔[2]

﴿ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ کے وہی معنی ہیں جو ﴿ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ﴾ میں گزر چکے ہیں، یعنی اللہ پاک کو زبان و دل سے یاد کرنا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد اذان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کا ذکر ہے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ، یعنی وہ اللہ پاک کی توحید وتمجید کرتے ہوئے اکیلے اسی کی پوجا کرتے ہیں، اس کی بزرگی بیان کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد نماز ہے۔ اس قول کو یہ بات رد کرتی ہے کہ اس ذکر کے بعد نماز کا ذکر کیا ہے۔ امام ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں سفر کرتے ہیں اور اللہ کا فضل تلاش کرتے ہیں۔[3]

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٠٦) [2] فتح القدير (٤/ ٤٨)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٠٧) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

امام ابن مردویہ اور دیلمی رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:
﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ لوگ اللہ کا فضل تلاش کیا کرتے تھے، خرید و فروخت کرتے رہتے، پھر جب نماز کی اذان سنتے تو اپنے ہاتھوں میں جو کچھ ہوتا اس کو ڈال دیتے اور مسجد کی طرف اُٹھ کھڑے ہوتے، پھر نماز پڑھتے۔ اُن کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے ﴿كَمِشْكٰوةٍ﴾ کی مثال اُن لوگوں کے لیے بیان فرمائی ہے جن کو اللہ کی یاد سے نہ کوئی تجارت مشغول کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت۔ یہ لوگ سب لوگوں سے بڑھ کر تجارت کرنے والے اور بیع کرنے والے تھے، لیکن اللہ کے ذکر سے نہ ان کو تجارت مشغول کرتی تھی اور نہ خرید و فروخت۔[1]

امام بیہقی اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ وغیرہما نے اسماء بنت یزید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ قیامت کے دن لوگوں کو ایک جگہ میں اکٹھا کرے گا، ان کو ایک پکارنے والا پکارے گا تو اُن کی نظریں اس طرف لگ جائیں گی۔ پھر ایک پکارنے والا کھڑا ہوگا اور یہ آواز دے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جو خوشی و تکلیف میں اللہ کی حمد کیا کرتے تھے، چنانچہ وہ کھڑے ہو جائیں گے اور وہ قلیل ہوں گے، پھر وہ جنت میں بغیر حساب داخل ہو جائیں گے۔ پھر دوبارہ آواز دے گا کہ کہاں ہیں وہ لوگ جن کی کروٹیں بچھونوں سے جدا ہو جاتی تھیں تو وہ کھڑے ہو جائیں گے اور وہ تھوڑے ہوں گے، پھر وہ بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ پھر وہ آواز دے گا کہ وہ لوگ کھڑے ہو جائیں جن کو تجارت اللہ کی یاد سے مشغول نہیں کرتی تھی اور نہ خرید و فروخت تو وہ کھڑے ہو جائیں گے اور وہ قلیل ہوں گے۔ پھر وہ جنت میں بغیر حساب داخل ہوں گے۔ پھر باقی لوگ کھڑے ہوں گے تو ان کا حساب ہوگا۔[2]
(وأخرجه الحاكم وصححه وابن مردويه عن عقبة بن عامر مرفوعاً) سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کی حدیث پہلے گزر چکی ہے، لیکن ناقص تھی۔ اس لیے یہاں کامل ذکر کر دی گئی۔

﴿اِقَامِ الصَّلٰوةِ﴾ سے مراد نماز کا اس کے وقتوں میں قائم کرنا ہے بغیر تاخیر کے اور اس کو جماعت کے ساتھ وقت پر ادا کرنا ہے۔ اس لیے کہ نماز میں تاخیر کرنے والا اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جو نماز کے قائم کرنے والے ہیں۔ ﴿اِقَامِ﴾ سے حرف تا اس لیے حذف کر دیا گیا کہ اس کی اضافت قائم مقام ہوگئی ہے۔ یہ حذف تین کلموں میں آیا ہے۔ کسی شاعر نے ان کو یوں نظم کیا ہے ؎

ثَلٰثَةٌ تُحْذَفُ تَاآتُهَا مُضَافَةً عِنْدَ جَمِيْعِ النُّحَاةِ
وَهِيَ إِذَا شِئْتَ أَبُوْ عُذْرِهَا وَلَيْتَ شِعْرِيْ وَإِقَامُ الصَّلَاةِ

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٠٧) [2] الدر المنثور (٦/ ٢٠٨۔ ٢٠٩)

حرفِ تا جو آیت میں حذف ہوا ہے، فراء نے اس کے استشہاد میں یہ شعر پڑھا ہے:

إِنَّ الْخَلِيْطَ أَجِدُّوا الْبَيْنَ وَانْجَرَدُوْا وَأَخْلَفُوْكَ عِدَ الْأَمْرِ الَّذِيْ وَعَدُوْا

یعنی "عِدَةُ الْأَمْرِ" اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ حذفِ تا مع الاضافت کچھ انہیں تین جگہوں کے ساتھ خاص نہیں ہے، کیوں کہ اُن کے سوا یہ ایک اور جگہ نکلی کہ جہاں حذفِ تا ہوا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے تا کے حذف کی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ محاورے میں "أَقَمْتُ الصَّلَاةَ إِقَامَةً" بولتے ہیں۔ اصل "إقامة" کی "إقوام" تھی، لیکن واو الف سے قلب ہوا تو دو الف جمع ہوئے۔ پھر بوجہ التقائے ساکنین کے ایک الف حذف ہوا تو "إقام" رہا۔ پھر محذوف کے عوض حرفِ ہا داخل کیا گیا اور اضافت اس جگہ عوض کرنے میں قائم مقام ہائے محذوف کے ہوگئی۔[1] جس شخص نے ذکر اللہ کو فرض نماز پر محمول کیا ہے تو وہ اس کا نیاز مند ہوگا کہ ﴿ اِقَامِ الصَّلٰوةِ ﴾ کو نماز کے ادا کرنے پر اس کے وقت میں محمول کرے، تا کہ تکرار سے گریز ہو، حالاں کہ اس کی طرف کوئی ملجا نہیں ہے، بلکہ ذکر اپنے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے، جس طرح کہ پہلے ہم ذکر کر آئے ہیں۔

﴿ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ﴾ سے مراد فرض زکات ہے۔ کسی نے کہا: مراد طاعتِ الٰہی اور اخلاص ہے، کیوں کہ ہر مومن کے پاس مال نہیں ہوتا۔ ﴿ يَخَافُوْنَ يَوْمًا ﴾ سے مراد روزِ قیامت اور ﴿ يَوْمًا ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ مفعول فعل کا ہے، اس کا ظرف نہیں ہے، یعنی یہ لوگ اگرچہ اللہ پاک کے ذکر و طاعات میں مبالغہ کریں اور اچھی طرح سے اُن کو بجا لائیں، پھر بھی وہ اس کشش اور کوشش کے باوجود ڈرتے لرزتے رہتے ہیں، کیوں کہ وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ انھوں نے اللہ عزوجل کی ایسے عبادت نہیں کی، جیسا کہ اس کا حق ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس دن کا یہ وصف ذکر فرمایا کہ ﴿ تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴾ یعنی وہ دن جس کا ان کو خوف لگا ہوا ہے، ایسا دن ہے کہ دل ہول اور گھبراہٹ کے مارے مضطرب و متحول (بے چین) ہو جائیں گے۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر حلقوم کی طرف آ جائیں گے، پھر نہ تو اپنی جگہ کی طرف لوٹیں گے اور نہ نکل پڑیں گے اور آنکھیں اس دن کے خوف و ڈر سے اوپر کو چڑھ جائیں گی۔ کسی نے کہا: ان کے تقلب سے مراد یہ ہے کہ اندھی ہو جائیں گی، اس کے بعد کہ بینا تھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ تقلبِ قلوب سے مراد یہ ہے کہ وہ نجات پانے کے طمع اور ہلاکت کے خوف کی درمیانی کیفیت میں لوٹ پوٹ کریں گے۔

رہا تقلب آنکھوں کا تو وہ یہ ہے کہ آنکھیں نظر کریں گی کہ دیکھیے کون سی طرف سے پکڑے جاتے ہیں اور کس کنارے کی طرف جاتے ہیں، یعنی کس طرف بازگشت ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تحول قلوب و ابصار سے یہ مراد ہے کہ جس چیز میں انھیں ہمیشہ شک رہا اس پر یقین ہو جائے گا۔ اسی کی طرح یہ آیتِ کریمہ ہے:

---

[1] معاني القرآن (٤/ ٤٦)

﴿ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴾ [ق: ٢٢] ''تو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا، چناں چہ آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔'' لہٰذا جس شے کو دنیا میں گمراہی خیال کرتا تھا اس کو آخرت میں ہدایت یقین کر لے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ جہنم کے انگاروں پر لوٹنا پوٹنا ہے۔ اس کے سوا اور معنی بھی کیے گئے ہیں۔ نعوذ باللّٰه من النار ومن أصحاب النار.

﴿ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا ﴾ میں لام، عاقبت وضرورت کا لام ہے۔ علتِ باعثہ کا لام نہیں ہے، یعنی وہ لوگ تسبیح و ذکر اللہ اور اقامتِ نماز اور ایتائے زکات سے کرتے ہیں جو کچھ کہ کرتے ہیں، انجامِ کار اس کا یہ ہوگا کہ اللہ پاک ان کو اُن کے اعمال کے موافق بہترین جزا دے گا۔ اس وعدے کے مطابق جو اُن سے کیا ہے، یعنی ان کی جزا کو دس گنا اور سات سو گنا تک بڑھائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت میں جو بات ہے، اس سے مراد وہ شے ہے جس کا اللہ پاک اُن پر تفضّل فرمائے گا اس سے بھی زیادہ جس کا وہ استحقاق رکھتے ہیں۔

پہلا قول زیادہ درست ہے، اس لیے کہ آگے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ کیوں کہ اس سے مراد اُن پر اس چیز کا فضل کرنا ہے جو اس جزا سے بھی اوپر ہے، جس کا اُن سے وعدہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک ایسی چیزوں کا تفضّل فرمائے گا جن کی خصوصیات کا یا ان کی مقدار کا ان سے وعدہ نہیں کیا۔ اور اُن کی کیفیات اور مقدار کا خیال تک اُن کے دل میں نہیں گزرا، بلکہ اُن کا وعدہ اجمالی طور پر کیا گیا ہے، جس طرح کہ اس آیت میں اجمالی وعدہ فرمایا ہے: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ﴾ [یونس: ٢٦] ''جن لوگوں نے نیک کام کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید (دیدارِ الٰہی) ہے۔'' اور اس حدیثِ شریف قدسی میں: «أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ»[1] یعنی میں نے اپنے نیک بندوں کے واسطے وہ شے تیار کر رکھی ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال گزرا۔

اس کے سوا اور اچھے وعدے جن میں سے ایک یہ ہے: ﴿ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ کیوں کہ یہ جملہ زیادتِ مذکور کی ایک تذییل مقرر ہے اور اس بات کا وعدۂ کریم ہے کہ اللہ پاک اُن کے اجورِ اعمال کے سوا بھلائیوں میں سے اُن کو ایسی شے عطا فرمائے گا کہ اس کا حساب نہیں ہو سکے گا، یعنی بے حساب دے گا۔ حساب تو محدود شے کا ہوتا ہے غیر محدود کا کیا حساب و کتاب ہو سکتا ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو شے اس کو عطا کرے گا اس پر اس کا محاسبہ نہ فرمائے گا۔

نکتہ:

﴿ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ فرمایا۔ ''يَرْزُقُهُمْ'' نہ کہا، حالاں کہ پہلے سب ضمیریں جمع کی ہیں، یہاں بھی اسی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٤)

طرح ضمیر جمع کی ہوتی، لیکن موصول یعنی کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ کو ضمیر جمع کے بجائے رکھا، اس لیے کہ منظور آگاہ کرنا ہے اس شے سے جو صلہ کے حیز میں ہے اس بات پر کہ رزق مذکور کا دار و مدار محض اللہ پاک کی مشیت پر ہے، کچھ ان کے اعمال پر اس کا دار و مدار نہیں جن کا ذکر فرمایا اور یہ اللہ سبحانہ کی کمال قدرت اور کمال سخاوت اور وسعتِ احسان سے آگاہ فرمانا ہے۔[1] اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ.

آیتِ نور کامل طور پر یہاں تمام ہوئی۔ اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ قَلْبِيْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ، وَنَقِّ قَلْبِيْ عَنْ حُبِّ مَا سِوَاكَ، یَا نُوْرُ، وَصَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَیْهِ، وَعَلٰی آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَأَوْلِیَاءِهٖ وَأَحِبَّائِهٖ عَدَدَ مَا عَلِمْتَ وَزِنَةَ مَا عَلِمْتَ وَمِلْءَ مَا عَلِمْتَ آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ یَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔ الٰہی چند بیت دلِ دردمند سے مترشح ہوئے ہیں تیری مناجات میں عرض کرتا ہوں، تو قبول فرما اور دل جو معصیت کدہ ہو رہا ہے کدورتِ غیر سے، اس کو پاک صاف کر کے اس کو اپنے نورِ فیض ظہور سے طاعت کدہ کر دے:

الٰہی تو بڑا مالک ہے سچا — مجھے تجھ پر بھروسا ہے گا پکا
گناہوں کو میرے بالکل مٹا دے — ہمیشہ یاد میں اپنی لگا دے
محبت غیر کی مجھ سے چھڑا دے — مجھے تو اپنا ہی جلوہ دکھا دے
مرے دل میں تو کردے ایسا روزن — کہ دل ہو جائے جس سے سارا روشن
الٰہی! تو مجھے اپنا بنا لے — ٹھگوں کے شہر سے تو مجھ کو بچا لے
مروں جس دم تو ہو لب پر یہ جاری — الٰہی سیدی مولای و باری

آمین اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا لَا تَحْوِیْهِ الْعِبَادَاتُ، وَلَا تَكْفِیْهِ الْإِشَارَاتُ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمَوْجُوْدَاتِ، وَعَلٰی آلِهِ السَّادَاتِ، وَصَحْبِهٖ ذَوِي الدَّرَجَاتِ الرَّفِیْعَاتِ. بالجملہ جبکہ اللہ پاک مومنوں کا حال اور مآل ذکر کر چکا تو کافروں کی مثال بیان کی۔ چنانچہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَـيْــــًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ۙ

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال چٹیل میدان میں ریت کی طرح ہیں، پیاسا اس (ریت) کو پانی سمجھتا رہا، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے وہاں کچھ بھی نہ پایا اور

[1] فتح البیان (۹/ ۲۲۹۔ ۲۳۵)

اللہ کو اپنے پاس پایا، پھر اللہ نے اس کا حساب پورا پورا کر دیا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے ﴿39﴾

کفار کی دوقسم کی مثالوں کا بیان:

کافر دو طرح کے ہیں ایک غیب کی طرف تاکتے ہیں، پھر بہک کر اللہ کا دین چھوڑ دیتے ہیں، غلط راہیں پکڑتے ہیں، یہ اُن کی کہاوت ہے۔ ریت کو پانی سمجھ کر دوڑے، وہاں پانی نہ ملا۔ آخرت میں اپنے گناہوں کی سزا ملی۔ دوسرے وہ ہیں جو دنیا میں غرق ہیں، یا پتھر پوجتے ہیں، ان کی کہاوت آگے فرمائی۔ ان کے پاس ریت بھی نہیں، اندھیرے میں بند ہو رہے ہیں۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ دو کہاوتیں ہیں کہ اللہ پاک نے اُن کو دو قسم کے کفار کے لیے بیان فرمایا ہے، جس طرح کہ سورۃ البقرہ کے شروع میں منافقوں کی دو مثالیں بیان کی ہیں: ایک ناری اور ایک مائی (پانی سے متعلق) اور جس طرح سورۃ الرعد میں دو مثالیں؛ یعنی آبی اور آتشی بیان فرمائی ہیں۔ اس لیے کہ لوگوں کو ہدایت وعلم حاصل ہو جو دلوں میں قرار پذیر ہوتا ہے۔ میں نے ہر ایک مثال پر اپنی اپنی جگہ میں کلام کیا ہے۔ اس طرح سے کہ دوبارہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وللہ الحمد والمنۃ۔ چنانچہ ان دو مثالوں میں سے پہلی مثال اُن کفار کی ہے جو اپنے کفر کی طرف دعوت دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اعمال اور اعتقادات کے لحاظ سے کسی شے پر ہیں، حالاں کہ حقیقت میں وہ کسی شے پر نہیں ہیں۔ لہٰذا اس باب میں اس کی مثال سراب کی مثل کی طرح ہے، جو ہموار زمینوں میں دور سے دکھائی دیتا ہے، گویا وہ ایک دریائے موجزن ہے۔ ”قِیعَةٌ“ جمع ہے ”قَاعٍ“ کی، جیسے ”جِیرَةٌ“ جمع ہے ”جَارٍ“ کی اور نیز ”قَاع“ واحد ہے ”قِیعَانٌ“ کا جس طرح کہ ”جَارٌ وَجِیرَانٌ“ بولتے ہیں۔ ”قاع“ برابر فراخ بچھی ہوئی زمین کو کہتے ہیں۔ سراب اسی میں ہوتا ہے اور سراب جو ہوتا ہے تو بعد دوپہر کے۔

رہا آل تو وہ صرف دن کے پہلے حصے میں ہوتا ہے، وہ دکھائی دیتا ہے گویا آسمان و زمین کے درمیان ایک پانی ہے۔ پھر جس شخص کو پانی کی حاجت ہے وہ جس وقت سراب کو دیکھتا ہے تو اس کا قصد کرتا ہے، اس کو پانی خیال کرتا ہے، تاکہ اس سے پیے۔ پھر جب وہ اس تک پہنچتا ہے تو اس کو کچھ نہیں پاتا۔ لہٰذا اسی طرح کافر ہے، وہ یہ خیال کرتا ہے کہ واقعی اس نے کوئی عمل کیا ہے اور اس نے کچھ حاصل کر لیا ہے، پس قیامت کے دن جس وقت وہ اللہ کے پاس آئے گا اور اللہ پاک اس پر اس کا محاسبہ کرے گا اور اس کے افعال پر باز پرس فرمائے گا تو اپنے واسطے بالکل کوئی شے نہ پائے گا۔ کہا ہے کہ یا تو عمل میں اخلاص نہ ہونے کے سبب سے، یا شریعت کے مطابق عمل نہ ہونے کے سبب سے، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان: ۲۳] ”اور انھوں نے جو (بظاہر نیک) عمل کیے ہوں گے، ہم ان کی طرف متوجہ ہو کر ان کو اڑتا ہوا پراگندہ گرد و غبار بنا دیں گے۔“

اور یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ اسی طرح سیدنا ابی بن کعب و ابن عباس رضی اللہ عنہم، مجاہد، قتادہ رحمہ اللہ اور غیر واحد سے مروی ہے کہ صحیحین میں ہے کہ قیامت کے دن یہود سے کہا جائے گا: تم کیا پوجتے تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ ہم عزیر، یعنی اللہ کے بیٹے کو پوجتے تھے۔ کہا جائے گا: تم نے جھوٹ کہا: اللہ کا کوئی بیٹا نہیں۔ تم کیا چاہتے ہو؟ وہ کہیں گے: اے رب! ہم پیاسے ہیں تو ہمیں پانی پلا، کہا جائے گا: تم وارد کیوں نہیں ہوتے ہو، پھر اُن کے لیے آگ کی صورت میں بنائی جائے گی، گویا وہ سراب ہے کہ بعض اس کا بعض کو توڑ رہا ہے۔ چنانچہ وہ چلیں گے، پھر اس میں گر پڑیں گے۔[1] (اصل روایت کے الفاظ «يتهافتون فيها» ہے۔ "تَهَافُت" پارہ پارہ افتادن کو کہتے ہیں اور "تهافت" بہ معنی "تساقط" ہے، یعنی ایک دوسرے پر گر پڑیں گے، جس طرح پروانے شمع پر گر پڑتے ہیں۔) یہ مثال اُن کی ہے جو جہلِ مرکب میں مبتلا ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اس جگہ اعمال سے مراد من جملہ اعمالِ خیر ہیں، جیسے: صدقہ و خیرات کرنا، غلام لونڈی کا آزاد کرنا، وقف و صِلات، قیدی کو چھڑانا، بیت اللہ کا آباد رکھنا، حاجیوں کو پانی پلانا۔ سراب وہ شے ہے جو سخت گرمی کے دن میں سورج چمکنے سے پانی کی طرح جنگلوں میں دکھائی دیتی ہے اس شخص کو جو اُسے دیکھتا ہے۔ اس کو سراب اس لیے بولتے ہیں کہ "سرب" کے معنی ہیں جاری ہونا، چونکہ وہ پانی کی طرح بہتا ہے، اس لیے اس کا نام سراب ہوا۔ محاورے میں بولتے ہیں: "سَرَبَ الْفَحْلُ، أَيْ: مَضَى وَسَارَ فِيْ الْأَرْضِ"۔ سراب کو آل بھی کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آل وہ ہے جو چاشت کے وقت پانی کی طرح ہوتا ہے، مگر وہ زمین سے بلند ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ گویا وہ آسمان و زمین کے درمیان ہو جاتا ہے۔ ﴿بِقِيْعَةٍ﴾ میں حرفِ با بہ معنی "في" ہے۔ "قِيْعَةٌ" جمع ہے "قَاعٍ" کی۔ "قَاعٍ" اس نیچی جگہ کو کہتے ہیں جس میں پانی قرار پکڑتا ہے۔ مثل "جِيْرَةٌ وَجَارٍ" (قاله الهروي)

امام ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ "قِيْعَةٌ" اور "قَاعٍ" ایک ہے۔ (حكاه النحاس) امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قَاعٍ" زمین سے جائے برابر ہے۔ اس کی جمع "أَقْوُعٌ وَأَقْوَاعٌ وَقِيْعَانٌ" آتی ہے۔ کسرہ ماقبل کی وجہ سے واؤ یاء ہو گیا۔ "قِيْعَةٌ"، مثل "قَاعٍ" کے ہے۔[3] بعض کہتے ہیں کہ وہ جمع ہے۔ "قَاعٍ" وہ شے ہے جو زمین پر بچھی ہوئی ہو اور فراخ ہو اور اس میں روئیدگی نہ ہو۔ سراب اسی میں ہوتا ہے۔ مسلمہ بن محارب نے "بِقِيْعَاة" بہ تائے مدوّرہ پڑھا ہے، جس طرح کہ "رَجُلٌ عَزْهَاة" بولتے ہیں۔[4] ("عَزْهَاة" بالکسر والقصر و "عَزْهَاءَة" بالکسر والمد و "عِزْهىً" منون، وہ شخص ہے جو طرب و جماع کو پسند نہیں کرتا۔) اُن سے یہ بھی مروی ہے کہ بقیعات بتائے مبسوطہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٩٣)
[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٨٢)
[4] فتح القدير (٤/ ٥٤)

پڑھا ہے۔ کسی نے کہا جائز ہے کہ اول کی بنا پر الف متولد ہو عین کے اشباع سے اور ثانی کی بنا پر جمع ہو "قیعة" کی۔

﴿ يَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ﴾ سراب کی دوسری صفت ہے۔ "ظَماٰن" بہ معنی "عطشان" ہے، یعنی پیاسا۔ نافع و ابو جعفر و شیبہ سے مروی ہے کہ انھوں نے "ظَمان" کو بغیر ہمزہ پڑھا ہے اور مشہور ان سے ہمزہ ہے۔[1] تخصیص "ظَماٰن" کے ساتھ باوجود اس گمان کے کہ ریّان و سیراب بھی اس کو اسی طرح خیال کرتا ہے، اس سے غرض تشبیہ کا محقق کرنا ہے، جس کی بنا طمع پر رکھی گئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پیاسا بنسبت اس کے جو پیاسا نہیں ہے، اس کی طرف زیادہ محتاج ہے، چنانچہ اس کے ساتھ تشبیہ دینا زیادہ تمام اور مکمل ہے۔ ﴿ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ ﴾ یعنی یہاں تک کہ جس وقت پیاسا اس کے پاس آیا جس کو پانی خیال کیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے پاس کیوں آیا، حالانکہ وہ تو کوئی شے نہیں ہے؟ اس لیے مراد یہ ہے کہ اس جگہ آیا جس میں اس کو (پانی) خیال کرتا تھا۔

﴿ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا ﴾ تو اس کو کوئی ایسی چیز نہ پایا جس کا اندازہ و خیال و گمان کیا تھا اور نہ ہی کوئی اور چیز پائی، معنی یہ ہیں کہ کفار اپنے اعمال پر بھروسا کرتے ہیں، جن کو من جملہ خیر سمجھتے ہیں اور اُن کے اجر و ثواب میں طمع کرتے ہیں۔ پھر جب وہ اللہ کے پاس آئے تو اپنے اعمال میں سے کوئی شے نہ پائی، کیونکہ کفر نے ان کو اکارت کر دیا اور اُن کا نشان مٹا دیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، یہ ایک مثال ہے کہ اللہ پاک نے اس کو بیان کیا ہے۔ اس شخص کی طرح جو پیاسا ہو اور اس کی پیاس سخت ہوئی۔ پھر اس نے سراب کو دیکھا تو اسے پانی خیال کیا، پھر اس کو طلب کیا تو گمان کر بیٹھا کہ اس پر قادر ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اسے کچھ نہ پایا اور اس کے پاس قبض کیا گیا (روح قبض کی گئی)۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسی طرح کافر ہے کہ اس کو جس وقت موت آئے گی تو اپنے عمل میں سے کچھ نہ پائے گا، جو اس کو کفایت کرے اور وہ اس کو ایسا نفع دے گا، جیسا سراب نے پیاسے کو دیا۔[2]

پھر اللہ پاک نے وہ بات بیان کی جس سے کفار کی زیادہ حسرت کی دلیل ملتی ہے اور اُن کے کام کا انجام سراسر نقصان اور زیان ہوا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ ﴾ یعنی اللہ کو اپنے پاس گھات میں پایا۔ ﴿ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ﴾ تو اس نے اس کے عمل کی بھرپور جزا اس کو دے دی، جیسا کہ امرئ القیس نے کہا ہے:

فَوَلّٰى مُدْبِرًا يَهْوِيْ حَثِيْثًا وَأَيْقَنَ أَنَّهُ لَاقِيْ الْحِسَابَا

کسی نے کہا ہے کہ اللہ کے وعدے کو اپنے عمل کی جزا کے طور پر پایا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کے امر کو اپنے حشر کے وقت پایا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کے حکم و قضا کو آنے کے وقت پایا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پر آیا۔ کسی نے کہا ہے کہ عمل کے نزدیک آیا۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "وَفّٰاهُ حِسَابَهٗ" کے یہ معنی ہیں کہ اس کے عمل مذکور کا پورا اور مکمل حساب اور اس کی جزا عطا فرمائی، کیوں کہ یہ اس کا جو اعتقاد تھا کہ بغیر

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٨٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦١١۔ ٢٦١٢)

ایمان لانے کے عمل کرنا اور کفر کی حالت میں عمل کرنا اسے فائدہ دے گا تو یہ تو صریحاً کفر ہے اور یقیناً موجبِ عذاب ہے۔ ﴿ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا ﴾ کی طرف جو دو ضمیریں پھرتی ہیں، ان کو مفرد ذکر کیا، یا تو ارادہ جنس کا ہے مثل "ظمان" کے جو تمثیل میں واقع ہوا ہے، یا اُن میں سے ہر ایک پر محمول کیا ہے۔ اسی طرح جو ضمیر اُن کے اعمال کی طرف راجع ہوتی ہے اس کو مفرد ذکر کرنے کا حال ہے۔

﴿ وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے بندوں سے جلد حساب لینے والا ہے۔ خواہ وہ ایمان لائے یا کفر کیا۔ امام سدی رحمہ اللہ "عن أبيه عن أصحاب النبي ﷺ" روایت کرتے ہیں کہ کفار قیامت کے دن پیاسے مبعوث ہوں گے تو کہیں گے: پانی کہاں ہے۔ پھر اُن کے لیے سراب کا نمونہ بنایا جائے گا تو اس کو پانی خیال کریں گے۔ پھر اس کی طرف چلیں گے تو اللہ کو اس کے پاس پائیں گے۔ پھر وہ ان کو ان کا حساب دے گا۔ ﴿ وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴾[1] (أخرجه ابن أبي حاتم و عبد بن حميد و ابن المنذر و في إسناده السدي عن أبيه و فيه مقال معروف) پھر اللہ پاک نے دوسری مثال اُن لوگوں کی بیان فرمائی جو کھلی جہالت والے کافر ہیں، یہ لوگ کفر میں غرق ہیں اور کفر کے پیشواؤں کی دلیرانہ رایوں کے مقلد ہیں، بہرے گونگے ہیں، کچھ سمجھتے نہیں، ان کی مثال ایسی ہے، جیسی اللہ پاک نے ارشاد فرمائی ہے۔

اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ
مِّنْ فَوْقِہٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُہَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ
اَخْرَجَ یَدَہٗ لَمْ یَکَدْ یَرٰىہَا ۭ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا
لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾

یا (کافروں کے اعمال) گہرے سمندر میں اندھیروں کی طرح ہیں، جسے ایک موج ڈھانپتی ہو، اس کے اوپر ایک اور موج ہو، اس کے اوپر بادل ہو، (غرض) اوپر تلے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہوں، جب وہ اپنا ہاتھ نکالے تو لگتا نہیں کہ اسے دیکھ سکے، اور جس کے لیے اللہ نے نور نہیں بنایا تو اس کے لیے (کہیں بھی) کوئی نور نہیں ﴿۴۰﴾

اعمالِ کفار کی دوسری مثال:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ ﴾ یعنی گہرا سمندر۔[2] ﴿ لَمْ یَکَدْ یَرٰىہَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ سخت اندھیرے کی وجہ سے اس کے دیکھنے کے قریب نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ مثال ہے کافر، جاہل اور مقلد کے دل کی، جو اس کو

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦١١) الدر المنثور (٦/ ٢١٠) فتح البيان (٩/ ٢٣٥۔ ٢٣٦)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ١٩٨)

کھینچے لیے جاتا ہے۔ اس کے حال کو نہیں جانتا اور نہ ہی یہ جانتا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے، بلکہ جس طرح جاہل سے پوچھیں کہ تو کہاں جاتا ہے؟ تو جواب دیتا ہے کہ اُن کے ہمراہ جاتا ہوں، پھر پوچھیں کہ وہ کدھر جاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے ﴿ يَغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ﴾ اس سے مراد وہ پردہ ہے جو دل، کان اور آنکھ پر پڑا ہے۔

یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ [البقرة: ٧] ''اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [الجاثية: ٢٣] ''کیا پھر آپ نے اسے دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا اور اللہ نے اسے گمراہ کر دیا، جبکہ اسے (حق کا) علم تھا اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، پھر کون ہے جو اللہ کے بعد اسے ہدایت دے؟ کیا پھر تم نصیحت نہیں پکڑتے؟'' سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ﴿ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ وہ پانچ قسم کی اندھیریوں میں لوٹتا پوٹتا ہے۔ چنانچہ کلام اس کا ''ظُلْمَةٌ'' (اندھیری) ہے اور عمل اس کا تاریکی ہے اور اس کے داخل ہونے کی جگہ اندھیری ہے اور نکلنے کی جگہ اندھیری ہے اور قیامت کے دن اس کا لوٹنا آگ کی تاریکیوں کی طرف ہے۔ امام سدی اور ربیع بن انس رحمہما اللہ نے بھی اس کی مثل کہا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ یعنی جس شخص کو اللہ پاک ہدایت نہ کرے تو وہ ہلاک ہونے والا، جاہل اور حیران و پریشان ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ﴾ [الأعراف: ١٨٦] ''جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔'' یہ اس کے مقابلے میں ہے جو مومنین کی مثال میں فرمایا ہے۔ ﴿ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النور: ٣٥] فَنَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ أَنْ يَّجْعَلَ فِيْ قُلُوْبِنَا نُوْرًا وَّعَنْ أَيْمَانِنَا نُوْرًا وَّعَنْ شَمَائِلِنَا نُوْرًا وَّأَنْ يُّعْظِمَ لَنَا نُوْرًا آمين.[2] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ ﴾ معطوف ہے ﴿ كَسَرَابٍ ﴾ پر۔ اللہ پاک نے اعمالِ کفار کی ایک اور مثال بیان فرمائی ہے، یعنی جس طرح وہ ''سراب'' سے مشابہ ہیں، جو کہ مذکورہ صفات کا حامل ہے، اسی

[1] تفسير الطبري (١٩/ ١٩٧۔ ١٩٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦١٤۔ ٢٦١٥) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٩٣۔ ٣٩٤)

طرح وہ "ظلمات" سے بھی مشابہ ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس بات سے آگاہ فرمایا ہے کہ اگر کفار کے اعمال کی مثال کسی ایسی چیز کے ساتھ دی جائے جو دکھائی دیتی ہے تو وہ ان تاریکیوں کی طرح ہیں جن کی صفت بیان کی گئی ہے اور اگر اُن کی مثال اس چیز کے ساتھ دی جائے جو موجود ہے تو اُن کی مثال سراب کی طرح ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ اگر تو چاہے تو سراب سے مثال دے اور چاہے تو ان تاریکیوں سے مثال دے۔ اسی معنی کی بنا پر کلمۂ ﴿ أَوْ ﴾ اباحت کے واسطے ہوگا۔ یا تخییر کے واسطے ہوگا، اس تقریر کے مطابق جو "أَوْ كَصَيِّبٍ" میں گزر چکی ہے۔ جرجانی نے کہا ہے کہ پہلی آیت میں کفار کے اعمال کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں ان کے کفر کا ذکر ہے۔ ان کے کفر کا عطف ان کے اعمال پر اس لیے کیا ہے کہ وہ بھی من جملہ اُن کے اعمال کے ہے۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ زجاج رحمہ اللہ کے نزدیک یہ تمثیل کفار کے اعمال کے لیے واقع ہوئی ہے اور جرجانی کے نزدیک کفار کے کفر کے لیے یہ تمثیل ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ أَوْ ﴾ دو وقتوں کے لحاظ سے تقسیم کے لیے ہے، کیوں کہ دنیا میں تو وہ سراب کی طرح ہیں اور آخرت میں ظلمات کی طرح۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ أَوْ ﴾ تنویع کے لیے ہے، یعنی اُن کے اعمال کی قسمیں بیان کی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اُن کے اعمال اچھے ہیں تو سراب کی طرح ہیں اور اگر برے ہیں تو ظلمات کی طرح۔

﴿ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ ﴾ "لُجَّة" معظمِ آب کو کہتے ہیں، اس کی جمع "لُجٌّ وَلُجَجٌ" ہے۔ ﴿ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ ﴾ وہ ہے جس کی گہرائی معلوم نہیں، یعنی اس کی گہرائی نہیں ملتی۔ پھر اللہ پاک نے اس دریا کا ایک وصف بیان فرمایا ہے کہ ﴿ يَغْشٰىهُ مَوْجٌ ﴾ یعنی ایک وصف تو اس کا یہ ہے کہ گہرائی کی وجہ سے اس کا تھاہ نہیں ملتا ہے۔ دوسرا وصف یہ ہے کہ اس پر موج چڑھتی ہے تو بالکل اُسے چھپا لیتی ہے، ڈھانک دیتی ہے۔ موج وہ شے ہے جو پانی سے بلند ہو جاتی ہے۔ پھر اس موج کا یہ وصف کیا کہ ﴿ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ ﴾، یعنی جو موج کہ اس دریا کو چھپا لیتی ہے، اس کے اوپر ایک دوسری موج ہے کہ ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی ہے۔ اس میں امواج کی کثرت کی طرف اشارہ ہے کہ بہت سی موجیں ہیں، ایک دوسرے پر سوار ہیں، گھچ پچ ہو رہی ہیں۔ پھر اس دوسری موج کی یہ صفت بیان کی کہ ﴿ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ﴾، یعنی ایک تو موجوں کی کثرت، پھر اس پر طرہ یہ کہ اس پر بادل۔ چنانچہ اس وقت اُن پر کئی خوف جمع ہوتے ہیں: ایک تو دریا کا خوف، دوسرے اس کی موجوں کا اور تیسرے بادل کا جو اس کے اوپر بلند ہو رہا ہے۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ ڈھانکتی ہے اس کو موج کے بعد موج، چنانچہ موج یکے بعد دیگرے آتی رہتی ہے، یہاں تک کہ گویا بعض موج بعض کے اوپر ہو رہی ہے۔ دریا کا حال زیادہ خوفناک اس وقت ہوتا ہے کہ اس کی موجیں پیہم آتی ہیں۔ پھر جب اس کے ساتھ اس کے اوپر بادل آ جائے تو خوف اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ ستاروں کو چھپا دیتا ہے جن سے دریا والے راستہ پاتے ہیں۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٥٤)

پھر جب کہ وہ بادل برس پڑے اور ہوا چلے کہ غالبًا اس کے چلنے کے وقت مینہ برستا ہے تو مت پوچھو کہ کیا کچھ تکاثفِ ہموم وترادفِ غموم، یعنی کتنا بڑا غم واندیشہ پیدا ہوتا ہے اور رنج وتکلیف اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا کہ ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ یعنی وہ تاریکیاں یا وہ اندھیریاں ایک دوسرے کے اوپر سوار ہیں، بعض بعض میں خلط ملط ہو رہی ہیں اندھا دھند ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس جملے میں شدت اور معاملے کی سختی کا بیان ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ یہ سختی پرلے درجے کو پہنچ چکی ہے۔ اس کے بعد شدت اور سختی کا کوئی درجہ باقی نہیں رہا ہے۔ الٰہی سیدی! تیرے بیان وادا کے قربان! اب اس سے بڑھ کر اور کیا بیان ہوگا! عربی زبان میں اگر گنجایش ہوتی اور اس کے الفاظ بیانِ شدت کے لیے وفا کرتے تو اللہ پاک اور مبالغہ فرماتا، کیوں کہ یہ جگہ انتہائی مبالغے کی ہے، لیکن عربی زبان قاصر ہے، اس سے زیادہ اس میں گنجایش نہیں ہے کہ شدت کا بیان کیا جائے، اس لیے یہاں انتہا کے درجے میں ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ فرمایا اور نور کے بیان میں آخر درجہ ﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ﴾ فرمایا۔

معلوم ہوا کہ اب نہ ﴿نُوْرٌ﴾ کے بیان میں کوئی درجہ باقی ہے اور نہ ﴿ظُلُمٰتٌ﴾ کے بیان میں کوئی دقیقہ۔

سُبْحَانَكَ مَا أَحْسَنَ بَيَانَكَ وَأَجْمَلَ تِبْيَانَكَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، وَنَوِّرْ بَصَرِيْ وَبَصِيْرَتِيْ بِنُوْرٍ مِنْ نُوْرِكَ الَّذِيْ أَشْرَقَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ، وَأَضَاءَ لَهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ، وَأَنَارَتْ لَهُ الْجِنَانُ، وَأَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ، وَأَجِرْنِيْ مِنْ وُرُوْدِ النِّيْرَانِ، يَا نُوْرَ النُّوْرِ وَيَاغَايَةَ الظُّهُوْرِ آمِيْنَ، وَصَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِيْنَ إِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ.

غرض یہ کہ وجہ شبہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے تین قسم کی تاریکیاں ذکر فرمائی ہیں: ایک تو دریا کی ظلمت، دوسری موجوں کی تاریکی اور تیسری بادل کی اندھیری۔ اسی طرح کافر کے لیے بھی تین اندھیریاں ہیں: اعتقاد کی ظلمت، قول کی تاریکی اور عمل کی اندھیری۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ظُلُمٰتٌ﴾ سے مراد اعمال ہیں اور ﴿بَحْرٍ لُّجِّيٍّ﴾ سے مراد انسان کا قلب اور ﴿يَغْشٰىهُ مَوْجٌ﴾ سے مراد وہ پردہ ہے جو دل اور کان اور آنکھ پر ہے۔[1] تفاسیر کے غرائب میں سے یہ ہے کہ اللہ نے ﴿ظُلُمٰتٌ﴾ سے اعمالِ کافر کا ارادہ کیا ہے اور ﴿سَحَابٌ﴾ سے مراد رین، یعنی زنگ وختم وطبع (مہر) ہے اس کے دل پر۔ یہ تفسیر ایسی ہے کہ لغتِ عرب سے بہت دور جگہ میں پڑی ہے۔ امام ابن محیصن اور بزّی رحمہ اللہ نے ”سَحَابُ ظُلُمٰتٍ“ پڑھا ہے، ”سحاب“ کی ”ظلمات“ کی طرف اضافت کے

[1] تفسیر القرطبي (۱/ ۱۹۷۔ ۱۹۸)

ساتھ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریکیوں کے وقت سحاب بلند ہوتا ہے، لہٰذا اس تعلق کی وجہ سے اس کی طرف مضاف کیا گیا۔ باقی قراء کی قراءت بقطع اضافت وتنوین ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے مذکورہ تاریکیوں میں مبالغہ کیا تو فرمایا: ﴿ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ﴾، فاعل ﴿ اَخْرَجَ ﴾ کا ضمیر راجع ہے مقدر کی طرف جس پر مقام دال ہے، یعنی جس وقت نکالے دیکھنے والا، یا جو شخص ان تاریکیوں میں حاضر ہے، یا جو ان میں مبتلا ہے، اپنے ہاتھ کو، باوجود اس کے کہ سب سے بڑھ کر اس کے قریب ہے، تو وہ اس کے دیکھنے سے قریب نہیں ہوتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی "لَمْ يَرَهَا وَلَمْ يَكَدْ" ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كَادَ" زائد ہے، معنی یہ ہیں کہ جب اپنے ہاتھ کو نکالے تو اسے نہ دیکھے، جس طرح بول چال میں تو کہتا ہے: "مَاكِدْتُ أَعْرِفُهُ"، یعنی میں اس کو نہیں پہچانتا ہوں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: مراد یہ ہے کہ شدتِ ظلمت کی وجہ سے وہ سخت محنت اور کوشش کے بعد نظر آئے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں سب قولوں سے زیادہ صحیح یہ قول ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اس کو دیکھنے کے قریب نہیں ہوتا تو اب نہ اس کو قریب دیکھنا دیکھ سکتا ہے نہ بعید۔

جملہ ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ مقرر ہے اپنے ماقبل کا۔ ماقبل کا مضمون یہی تھا کہ کفار کے اعمال صفتِ مذکور پر ہیں۔ چنانچہ اس جملے نے اس کی تقریر وتثبیت کی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دنیا میں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک جس کو ہدایت نہیں کرتا ہے تو وہ راہ نہیں پاتا ہے۔[2] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جس کے لیے اللہ روشنی نہ کرے، جس میں وہ قیامت کے دن چلے تو اس کے لیے وہ روشنی نہیں ہے کہ جس سے وہ جنت کی طرف راہ پائے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس کے لیے دین و ایمان نہ ٹھہرائے تو اس کے واسطے کوئی دین نہیں ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جس کے واسطے ہدایت مقدر نہ کرے اور نہ اس کے اسباب کی اس کو توفیق دے تو اس کے لیے کوئی نور نہیں ہے۔ برخلاف اس کے جس کو توفیق دی گئی کہ اس کے لیے روشنی پر روشنی ہے۔ آیت سارے کفار کے حق میں عام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسی کے حق میں خاص ہے، جس کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ شخص عتبہ بن ربیعہ تھا، جاہلیت میں دین تلاش کیا کرتا تھا اور ٹاٹ پہنتا، پھر جب اسلام اس بزمِ جہاں میں رونق افروز ہوا تو اس نے کفر وعناد کو اختیار کیا، پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔[3]

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝41 وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝42

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ کی تسبیح کرتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے،

[1] فتح القدير (٤/ ٥٤) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٨٥ـ ٢٨٦) [3] فتح البيان (٩/ ٢٣٧ـ ٢٣٩)

اور (فضا میں) پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی، ہر ایک نے اپنی نماز (عبادت) اور اپنی تسبیح جان لی ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے ﴿41﴾ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی، اور اللہ ہی کی طرف (سب کی) واپسی ہے ﴿42﴾

کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کناں ہے:

اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ جو کوئی آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں، وہ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ یعنی فرشتے اور انسان وجن وحیوان، یہاں تک کہ جمادات، یہ سب کے سب اللہ پاک کو یاد کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو (مخلوق) ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ نہایت حوصلے والا، بہت بخشنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پرندے اُڑنے کی حالت میں اپنے پالن ہار کی تسبیح کرتے ہیں اور ایسی تسبیح سے اس کی عبادت کرتے ہیں جس کا اللہ پاک نے ان کو الہام فرمایا اور ہدایت دی اور اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۗ ﴾ یعنی اللہ پاک نے ہر ایک کو اس کے طریقہ ومسلک کی راہ بتا دی ہے، اللہ عزوجل کی عبادت میں۔ پھر یہ خبر دی کہ وہ اس سب کا عالم ہے، اس میں سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔

اس لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴾۔ پھر یہ خبر دی کہ اس کی حکومت ہے آسمان اور زمین میں، چنانچہ وہی حاکم، متصرف، الٰہ اور معبود ہے کہ عبادت اس کے علاوہ کسی کے لائق نہیں ہے، اس کے حکم کو کوئی پیچھے ڈالنے والا نہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، یعنی قیامت کے دن۔ وہ جو چاہے گا اس دن میں حکم کرے گا: ﴿ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴾ [النجم: ٣١] ''تاکہ وہ ان لوگوں کو جنھوں نے برے کام کیے، ان کے اعمال کی سزا دے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اچھائیاں کیں، اچھا بدلہ دے۔'' چنانچہ وہی دنیا وآخرت میں خالق، مالک، الٰہ اور فیصلہ کرنے والا ہے اور اسی کے لیے دنیا اور آخرت میں سب تعریفیں ہیں۔[1]

كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اس قسم کی آیت کی تفسیر سورت سبحان کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ میں

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٩٤)

ہر اس شخص کو خطاب ہے جس میں نظر کرنے اور غور وفکر کرنے کی لیاقت ہے۔ یا نبی اکرم ﷺ کو خطاب ہے اور آپ ﷺ نے اسے استدلال کے طور پر جان لیا۔ ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ کے معنی "أَلَمْ تَعْلَمْ" ہیں اور ہمزہ تقریر کے واسطے ہے، یعنی مقرر تم نے یقینی طور پر جان لیا جو مشاہدے کی طرح ہے اور جس کی تائید وتوثیق وحی سے کی گئی ہے۔ اس کا ظاہر یہ ہے کہ استعارہ ہے اور نحویوں کے کلام کا تقاضا یہ ہے کہ رائی (دیکھنے والا) علمیہ حقیقت ہے۔ یہ بات شہاب نے کہی ہے۔[1] تسبیح کا مطلب ہے کہ اللہ پاک کی ذاتِ تقدس آیات وافعالِ باکمال وصفاتِ برکت سمات میں پاکی بیان کرنا، یعنی ہر اس چیز سے اس کی پاکی بیان کرنا جو اس کے لائق نہیں ہے۔

﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو عقلا اور غیر عقلا ان میں قرار پذیر ہیں۔ غیر عقلا کی تسبیح تو اُن کی آوازیں ہیں، جو سنائی دیتی ہیں اور وہ کاریگری جو اُن میں دیکھی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ عقلا کی تسبیح تو نماز ہے اور غیر عقلا کی تسبیح تنزیہ ہے۔ کہا ہے کہ یہ آیت حیوانات اور جمادات کو شامل ہے اور جمادات کے وجود میں اللہ کی کاری گری کے آثار اس بات کی زبانِ حال سے خبر دے رہے ہیں کہ اللہ پاک جلال وکمال کی صفات کا حامل ہے اور نقص اور زوال کی صفات سے پاک اور منزہ ومبرا ہے۔ اس میں کافروں کو ڈانٹ ڈپٹ ہے، اس لیے کہ جن جمادات کی شان سے اللہ پاک کی پاکی اور تقدیس کرنا چاہیے، کفار نے ان کو ہی اللہ پاک کا شریک ٹھہرایا ہے، اللہ عزوجل کی عبادت کی طرح اُن کو پوجتے ہیں۔ بالجملہ یہ ضروری ہے کہ تسبیح اسی ذات کی کی جائے جو تمام قسم کی مخلوقات میں سے اس کے لائق ہے بطور عموم مجاز کے۔

جمہور نے ﴿ وَالطَّيْرُ ﴾ کو بہ رفع اور ﴿ صٰٓفّٰتٍ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ وَالطَّيْرُ ﴾ معطوف ہے ﴿ مَنْ ﴾ پر اور ﴿ صٰٓفّٰتٍ ﴾ منصوب بنا بر حال ہے۔ امام اعرج رحمہ اللہ نے "وَالطَّيْرَ" کو بہ نصب پڑھا ہے۔ بنا بر مفعول معہ اور ﴿ صٰٓفّٰتٍ ﴾ کو منصوب بنا بر حال۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت زیادہ تر بہتر ہے رفع سے۔ حسن اور خارجہ رحمہما اللہ نے نافع سے "وَالطَّيْرُ صَافَّاتٌ" برفع ہر دو پڑھا ہے۔ بنا بر مبتدا وخبر۔ ﴿ صٰٓفّٰتٍ ﴾ کا مفعول محذوف ہے، "أَيْ: أَجْنِحَتَهَا"، یعنی پرندے ہوا میں اپنے پروں کو کھولنے والے ہیں۔[2] "طیر" کا ذکر خاص طور پر کیا، اس کے باوجود کہ ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ میں شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین میں اُن کا قرار پکڑنا مستقل طور پر نہیں ہے اور وہ بکثرت ہوا میں رہتے ہیں اور ہوا نہ آسمان سے ہے نہ زمین سے۔

خاص طور پر ذکر کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اُن میں ایک ایسی کاریگری عجیب ہے کہ کبھی تو وہ اُڑنے پر قادر ہوتے ہیں اور کبھی چلنے پر، اس کے برعکس وہ حیوانات جو ان کے سوا ہے، وہ یہ صلاحیت نہیں رکھتے۔ رہی یہ بات کہ پرندوں کے بارے میں یہ ذکر کیا کہ اُن سے تسبیح اس حالت میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے پروں کو کھولے ہوئے ہوتے ہیں، اس

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ٣٨٩۔ ٣٩٠) [2] فتح القدير (٤/ ٥٥)

لیے کہ یہ حالت اُن کی نہایت عجیب وغریب اور نادر ہوتی ہے، کیوں کہ ہوا میں اُن کا قرار پکڑنا اور پروں کو ہلائے بغیر تسبیح کرنا اور زمین پر قرار پکڑے بغیر تسبیح کرنا، اللہ کی بڑی کاریگریوں میں سے ہے، جس نے ہر شے کو اتقان و اِحکام بخشا ہے۔

پھر اللہ پاک نے بیان میں اضافہ فرمایا: ﴿ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ﴾۔ ﴿ عَلِمَ ﴾ میں ضمیر راجع ہے ﴿ كُلٌّ ﴾ کی طرف۔ معنی یہ ہیں کہ ان تسبیح کرنے والوں میں سے ہر ایک نے اپنی صلاۃ اور تسبیح کو جان لیا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہر صلاۃ کرنے والے اور تسبیح کرنے والے نے اپنی صلاۃ اور تسبیح کو جان لیا ہے۔ سمین نے کہا: یہ قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ اس میں ضمیریں ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ کسی نے کہا کہ اس جگہ صلاۃ تسبیح کے معنی میں ہے تاکید کے لیے دوبارہ لائی گئی ہے۔ صلاۃ کا نام کبھی تسبیح رکھ دیتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ یہاں اس سے مراد دعا ہے، یعنی ہر ایک نے اپنی دعا اور تسبیح کو جان لیا ہے۔ اس بات کی خبر دینا کہ ہر ایک نے اس کو جان لیا ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس تسبیح کا واقع ہونا علم سے ہے کہ اللہ پاک نے یہ علم ان کو دیا ہے اور اس کا الہام ان کو کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ تسبیح ان سے اتفاقاً اور بغیر ارادے اور فکر کے ہوتی ہے، اس میں زیادہ تر اللہ پاک کی عجیب کاریگری اور عظیم شان پر دلیل ہے کہ اس نے پرندوں کو اپنی تسبیح کرنے والا کیا ہے اور اُن سے جو صادر ہوتا ہے اس کے جاننے والا اُن کو ٹھہرایا ہے، نہ یہ کہ وہ اس کو جانتے ہی نہ ہوں۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صلاۃ انسان کے لیے ہے اور تسبیح انسان کے علاوہ دوسری مخلوق کے لیے ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ پرندوں کا پر مارنا اُن کی نماز ہے اور آواز کرنا ان کی تسبیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اُن تسبیح کرنے والوں میں سے ہر ایک کی نماز کو اور تسبیح کو جان لیا ہے، یعنی اس کے علم میں ہے۔ ﴿ عَلِمَ ﴾ میں ضمیر اللہ سبحانہ کی طرف راجع ہے، لیکن پہلا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ اس لیے کہ سب قاریوں نے ﴿ كُلٌّ ﴾ کی رفع پر اتفاق کیا ہے۔ اگر ضمیر اللہ پاک کے لیے ہوتی تو ﴿ كُلٌّ ﴾ کا نصب زیادہ مناسب ہوتا۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿ عَلِمَ ﴾ میں ضمیر ﴿ كُلٌّ ﴾ کی طرف راجع ہے اور ﴿ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ﴾ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے، یعنی ہر ایک نے اللہ کی صلات کو اور اللہ کی تسبیح کو جان لیا، مطلب یہ ہے کہ اس صلات اور تسبیح کو جان لیا ہے، جس کا اللہ پاک نے حکم فرمایا ہے اور اس کے کرنے کا امر فرمایا ہے، جس طرح کہ خلق کی اضافت خالق کی طرف ہوتی ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ قراء کی ایک جماعت نے ''عُلِمَ'' بصیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ جملہ ﴿ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴾ مقررِ ماقبل ہے، یعنی اللہ پر نہ اُن کی طاعت مخفی ہے نہ اُن کی تسبیح۔ اس کے علم سے کوئی شے غائب نہیں ہوتی۔

[1] یہ قول سدی رحمہ اللہ کے بجائے مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: تفسير الطبري (١٩/ ٢٠٠) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦١٦) الدر المنثور (٦/ ٢١١)

پھر اللہ پاک نے بیان کیا ہے کہ اسی سے مبدا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی اللہ ہی کے واسطے ہیں بارش، رزق اور پیداوار کے خزانے، کیوں کہ وہ آسمان و زمین کا خالق ہے، اس کے سوا اُن کا کوئی مالک نہیں ہے۔ اور جو کوئی کسی شے کا مالک ہوا ہے تو اسی کے مالک بنانے سے مالک بنا ہے۔ ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی موت کے بعد اسی کی طرف رجوع ہے نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔ پھر اللہ پاک نے آثارِ علویہ میں سے ایک اور دلیل ذکر کی۔[1] چنانچہ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ؕ﴿43﴾ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿44﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ ہی بادل چلاتا ہے، پھر وہ انھیں باہم ملاتا ہے، پھر انھیں تہ بہ تہ کر دیتا ہے، پھر آپ دیکھتے ہیں کہ ان (بادلوں) کے درمیان میں سے مینہ نکلتا ہے اور وہ اس آسمان کے اندر کے پہاڑوں سے اولے برساتا ہے، پھر وہ انھیں (اس پر) پہنچاتا ہے جس پر وہ چاہتا ہے اور جس سے چاہے پھیر دیتا ہے، لگتا ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں (کی روشنی) کو اُچک لے جائے گی ﴿43﴾ اللہ ہی رات اور دن کو اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ بلاشبہہ ان (نشانیوں) میں اہلِ نظر کے لیے (سامانِ) عبرت ہے ﴿44﴾

بادلوں کے پیدا کرنے میں قدرتِ الٰہی سے تنبیہ کا ایک نمایاں پہلو:

اللہ تعالیٰ ذکر فرماتا ہے کہ وہ بادل کو اپنی قدرت سے ہانک کر لاتا ہے۔ پہلے جو اس کو پیدا کرتا ہے تو وہ ضعیف کمزور ہوتا ہے۔ ﴿ ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ﴾ یعنی اس کے متفرق ہونے کے بعد اس کو جمع کرتا ہے۔ ﴿ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا ﴾ یعنی پھر اس کو متراکم کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض بعض پر سوار ہو جاتا ہے۔ ﴿ فَتَرَى الْوَدْقَ ﴾ پھر تو دیکھے مطر کو، یعنی مینہ کو ﴿ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ کہ نکلتا ہے اس کے خلل سے یعنی ابر کی کشادگیوں اور رخنوں سے مینہ نکلتا ہے۔ (خَلَل بہ فتحتین کشادگی ورخنہ۔ اس کی جمع خلال ہے۔ "وَهِيَ فُرَجٌ فِي السَّحَابِ يَخْرُجُ مِنْهَا

[1] فتح البیان (۹/ ۲۳۹۔ ۲۴۱)

اَلْمَطَرُ»، خلال وخلل دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ (كذا في الصراح) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک رحمہ اللہ نے «من خَلَلِهٖ» پڑھا ہے۔ عبید بن عمیر لیثی نے کہا ہے (یہ مکی واعظ مخضرم ہیں۔ اُبی وعمر رضی اللہ عنہما سے روایت رکھتے ہیں۔ ثابت نے کہا ہے کہ پہلے پہلے جس شخص نے وعظ کہا، وہ عبید بن عمیر ہیں۔ امام ابوزرعہ رحمہ اللہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ ۶۴ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ) کہ اللہ مثیرہ کو بھیجتا ہے تو وہ زمین کو اچھی طرح جھاڑتی ہے۔ پھر ناشئہ کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو اُٹھاتی ہے۔ پھر اللہ مؤلفہ کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کے درمیان میل کرتی ہے۔ پھر اللہ لواقح کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو باردار کرتے ہیں۔[1] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير) (یہاں چار قسم کی ہوا کا ذکر کیا ہے: مثیرہ برانگیختہ کرنے والی، ناشئہ بادل کو اٹھانے والی، مولفہ بادل کو جوڑنے والی اور ملقحہ بادل کو حاملہ کرنے والی۔)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ ﴾ بعض نحویوں نے کہا ہے کہ پہلا ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کا ہے اور دوسرا تبعیض کا اور تیسرا بیانِ جنس کا۔ یہ بات اسی شخص کے قول پر بنے گی جو مفسرین میں سے اس طرف گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آسمان میں اولوں کے پہاڑ ہیں، اللہ اس سے اولے اُتارتا ہے اور جو شخص اس جگہ جبال کو بادل سے کنایہ ٹھہراتا ہے تو اس کے نزدیک دوسرا ﴿ مِنْ ﴾ بھی ابتدائے غایت کا ہو گا، لیکن وہ اول ﴿ مِنَ ﴾ سے بدل ٹھہرے گا۔ واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَيُصِيبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ﴾ اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ آسمان سے دو چیزیں نازل ہوتی ہیں: ایک بارش، دوسرے اولے تو ان میں سے ایک قسم مراد ہے، یعنی بارش۔ لہٰذا ﴿ فَيُصِيبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جس کو چاہتا ہے اس پر رحمت کرنے کے لیے بارش پہنچاتا ہے۔ ﴿ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی تاخیر کرتا ہے بارش کی، جس سے چاہتا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿ فَيُصِيبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ انتقام اور عذاب کے لیے، جس پر چاہتا ہے اولے برساتا ہے، کیوں کہ اس سے ان کے پھل گر جاتے ہیں، ان کی کھیتیاں متفرق و پریشان ہو جاتی ہیں۔ اور درخت تباہ ہو جاتے ہیں۔ اور جس سے چاہتا ہے رحمت کرنے کے لیے اولوں کو پھیر دیتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴾ یعنی لگتا ہے کہ اس کی بجلی کی روشنی اس کی شدت کی وجہ سے آنکھوں کو جھپٹ لے جائے جب کہ وہ اس کا پیچھا کریں اور اس کو دیکھیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک رات اور دن میں تصرف فرماتا ہے تو اس کے طول میں سے لے کر اس کے قصر میں ڈال دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ برابر ہو جاتے ہیں، پھر اس میں سے لیتا ہے تو جو چھوٹا تھا طویل ہو جاتا ہے اور جو طویل تھا وہ چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اللہ پاک ہی اپنے امر و قہر و عزت و علم سے اس میں متصرف ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٠٢۔ ٢٠١) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦١٧)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ بے شک اس میں البتہ آنکھ والوں کے لیے اللہ پاک کی عظمت و بزرگی پر روشن دلیل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۰] ''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور رات اور دن کے اختلاف میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔'' اور اس کے مابعد کی آیاتِ کریمہ۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ''ازجاء'' ذرا ذرا ہانکنے کو کہتے ہیں، اسی معنی سے نابغہ کا قول ہے:

إِنِّي آتَيْتُكَ مِنْ أَهْلِي وَمِنْ وَطَنِي   أُزْجِي حَشَاشَةَ نَفْسٍ مَا بِهَا رَمَقُ

(''حشاشة'' بقیۂ جان در بیمار۔ ''رمق'' بالتحریک باقی جان۔) معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک بادل کو ہانک لے جاتا ہے نرم ہانکنا جس طرف چاہتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''زَجَّى الشَّيْءَ تَزْجِيَةً'' یعنی دفع کیا شے کو نرمی سے ''وَتَزَجَّى بِكَذَا'' یعنی فلاں شے کے ساتھ کفایت کی۔ ''أَزْجَى الْإِبِلَ'' یعنی اونٹوں کو ہانک لے گیا۔ ''مُزْجَى'' قلیل شے کو کہتے ہیں۔ بضاعتِ مزجاۃ مایۂ قلیل کو بولتے ہیں۔ ''وَالرِّيحُ تُزْجِي السَّحَابَ'' یعنی ہوا بدلی کو ہانک لے جاتی ہے۔ ''وَالْبَقَرَةُ تُزْجِي وَلَدَهَا'' یعنی گائے اپنے بچے کو ہانک لے جاتی ہے۔

اللہ سبحانہ کے قول: ﴿ ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر اللہ پاک تالیف کرتا ہے، اجزائے سحاب کو جوڑتا ہے، اس کے بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیتا ہے اور اس کے متفرق ہونے کے بعد اس کو جمع کرتا ہے، تاکہ بادل قوی اور متصل ہو جائے اور سطبر و گندہ بن جائے۔ اصل تالیف میں ہمزہ ہے۔ ورش و قالون نے ''يُولِفُ'' بواو پڑھا ہے تخفیف کے واسطے۔ کلمۂ ''سَحَاب'' لفظ میں واحد ہے، لیکن اِس کے معنی جمع ہیں، اسی لیے کلمۂ ''بَيْنَ'' کا اس پر داخل ہوا ہے، کیوں کہ بادل کے اجزا اس کے مفردات کے حکم میں ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بَيْنَهٗ ﴾ میں ضمیر جملہ ''سحاب'' کی طرف راجع ہے، جس طرح کہ تم محاورے میں بولتے ہو۔ ''اَلشَّجَرُ قَدْ جَلَسْتُ بَيْنَهُ''[2] یعنی میں درختوں کے درمیان بیٹھا، کیوں کہ شجر جمع ہے، اور ﴿ بَيْنَهٗ ﴾ میں ضمیر مفرد لفظ کے اعتبار سے لائی گئی ہے۔ ''رُكَام'' بہ معنی ''متراکم'' ہے کہ بعض بعض پر سوار ہوتا ہے۔ ''رَكْم'' شے کے جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''رَكَمَ الشَّيْءَ يَرْكُمُهُ رَكْمًا'' یعنی اس شے کو جمع کیا اور اس کے بعض کو بعض پر ڈالا۔

''وَارْتَكَمَ الشَّيْءُ وَتَرَاكَمَ'' یعنی وہ شے جمع ہو گئی۔ ''رَكْمَةُ'' جمع کی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں اور رکام رمل متراکب کو کہتے ہیں، یعنی ریت کا ڈھیر بعض پر بعض چڑھا ہوا۔ ''وَدْق'' جمہور مفسرین کے نزدیک مطر ہے، یعنی بارش۔

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۹۴۔ ۳۹۵)   [2] فتح القدیر (٤/ ٥٦)

محاورے میں بولتے ہیں۔ "وَدَقَتِ السَّحَابُ فَهِيَ وَادِقَةٌ" یعنی برس پڑی بدلی تو وہ برسنے والی ہے۔ "وَوَدَقَ الْمَطَرُ يَدِقُ أَيْ: قَطَرَ يَقْطُرُ" یعنی باران قطرہ زن ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ ودق بمعنی برق ہے، اسی باب سے کسی شاعر کا یہ قول ہے:

أَثَرْنَ عَجَاجَةً وَخَرَجْنَ مِنْهَا خُرُوجَ الْوَدْقِ مِنْ خَلَلِ السَّحَابِ

یعنی انھوں نے غبار اُٹھایا اور اس سے نکلیں، جس طرح کہ بجلی بدلیوں کے رخنوں سے نکلتی ہے۔

لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "وَدَق" مطر ہے ضعیف ہو یا شدید۔ "تَرٰی" میں رویت بصری ہے، یعنی یہاں رویت سے مراد آنکھ کا نظر کرنا ہے، علم کے معنی میں نہیں ہے۔ جملہ ﴿ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ محلِ نصب میں ہے، بنا بر حال۔ ﴿ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ کے معنی ہیں "فُتُوقُ السَّحَابِ" یعنی بادل کے شگاف جو قطرے (یعنی بوندیں) نکلنے کی جگہ ہیں۔ "من خَلَله" مفرد پڑھنے میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابو العالیہ بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شریک ہیں۔ خلال میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ آیا وہ حجاب کی طرح مفرد ہے یا جبال کی طرح جمع ہے۔[1] امام کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سحاب" مطر کی چھلنی ہے، اگر سحاب نہ ہو جس وقت مطر نازل ہوتا ہے تو وہ اس زمین کو جس پر وہ پڑے بگاڑ ڈالے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ ﴾ سماء سے مراد بلندی ہے، کیوں کہ سماء کا اطلاق کبھی بلندی پر بھی ہوتا ہے۔ ﴿ جِبَالٍ ﴾ کے معنی ہیں بڑے بڑے ٹکڑے جو پہاڑوں کے مشابہ ہیں۔ لفظ ﴿ فِيْهَا ﴾ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے۔ ﴿ مِنْۢ بَرَدٍ ﴾ میں حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے اور وہ ﴿ يُنَزِّلُ ﴾ کا مفعول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مفعول محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "يُنَزِّلُ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ بَرَدًا" کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْۢ بَرَدٍ ﴾ کا ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے۔ تقدیر یہ ہے: "يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا بَرَدٌ" کسی نے کہا ہے کہ کلام میں مضاف محذوف ہے، یعنی "يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ قَدْرَ جِبَالٍ أَوْ مِثْلَ جِبَالٍ مِنْ بَرَدٍ إِلَى الْأَرْضِ" امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ دونوں جگہ زائد ہے اور "الجبال" اور "البرد" موضع نصب میں ہیں۔ یعنی "يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ بَرَدًا يَكُوْنُ كَالْجِبَالِ"[3]

حاصل یہ ہے کہ ﴿ مِنَ السَّمَآءِ ﴾ کا ﴿ مِنْ ﴾ بلا اختلاف اور باتفاق مفسرین ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ اور ﴿ مِنْ جِبَالٍ ﴾ کے ﴿ مِنْ ﴾ میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ ابتدائے غایت کا ہے، چنانچہ وہ اور اس کا مجرور بدلِ اشتمال ہوگا اول ﴿ مِنْ ﴾ سے باعادۂ جار۔ دوسرے یہ ہے کہ تبعیض کا ہے، چنانچہ اس بنا پر وہ اور اس کا مجرور محلِ نصب میں ہوگا، اس بنیاد پر کہ انزال کا مفعول ٹھہرے گا، گویا یوں کہا: "وَيُنَزِّلُ بَعْضَ جِبَالٍ"۔ تیسری یہ

[1] فتح القدير (٤/ ٥٧) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٨٩) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٨٩)

ہے کہ زائد ہے "أَيْ: يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ جِبَالًا"۔ رہا ﴿ مِنْ بَرَدٍ ﴾ کا ﴿ مِنْ ﴾ سو اس میں چار وجہ ہیں: تین تو وہی ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ چوتھی یہ ہے کہ یہ بیانِ جنس کے لیے ہے۔ اس وجہ کی بنا پر تقدیر یہ ہوگی: "وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ بَعْضَ جِبَالِ الَّتِي هِيَ الْبَرَدُ، قَالَهُ الْحَوْفِيُّ وَالزَّمَخْشَرِيُّ" چنانچہ منزّل برد ہے، کیوں کہ بعض بَرَد بَرَد ہوتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں: "وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالِ بَرَدٌ فِيهَا" جس طرح کہ تو کہے: "هَذَا خَاتَمٌ فِي يَدِيْ مِنْ حَدِيدٍ"[1] یعنی انگوٹھی لوہے کی میرے ہاتھ میں ہے، کیوں کہ جس وقت تو نے یوں کہا کہ "هَذَا خَاتَمٌ مِنْ حَدِيدٍ وَخَاتَمُ حَدِيدٍ" تو ایک ہی معنی ہوں گے۔ اس بنا پر ﴿ مِنْ بَرَدٍ ﴾ موضع جَر میں ﴿ جِبَالٍ ﴾ کی صفت ہوگا، جس طرح کہ "مِنْ حَدِيدٍ" خاتم کی صفت تھی اور ﴿ يُنَزِّلُ ﴾ کا مفعول ﴿ مِنْ جِبَالٍ ﴾ ہوگا اور ﴿ جِبَالٍ ﴾ کے ﴿ بَرَدٍ ﴾ ہونے سے لازم آئے گا کہ منزّل برد ہو۔

ابو البقاء نے ذکر کیا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "شَيْئًا مِنْ جِبَالٍ" پس موصوف حذف ہو گیا اور صفت پر کفایت ہوئی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ آسمان میں اولوں کے پہاڑ ہیں، جس طرح کہ زمین میں پتھر کے پہاڑ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ جِبَالٍ ﴾ کے ذکر سے مراد کثرت ہے، جس طرح کہ محاورے میں بولتے ہیں: "فُلَانٌ يَمْلِكُ جِبَالًا مِنْ ذَهَبٍ وَفِضَّةٍ" مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے مال کی کثرت کا بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص سونے چاندی کے پہاڑوں کا مالک ہے۔

﴿ فَيُصِيبُ بِهِ ﴾ کی ضمیر "مَا يُنَزِّلُ مِنَ الْبَرَدِ" کی طرف راجع ہے۔ یعنی پہنچاتا ہے اولوں کو کہ جن کو اتارتا ہے۔ ﴿ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ اس شخص کے پاس جس کے پاس پہنچانا چاہتا ہے۔ ﴿ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ﴾ اور جس شخص سے ان کو باز رکھنا چاہتا ہے، ان کو باز رکھتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان کو اس شخص کے مال کے پاس پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے اور اُن کو اس شخص کے مال سے باز رکھتا ہے، جس کو چاہتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں اسی کی مثل پر کلام گزر چکا ہے۔

﴿ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴾ عامہ کی قراءت ﴿ سَنَا ﴾ بقصر ہے اور ﴿ بَرْقِهٖ ﴾ بہ فتحِ با و سکونِ راء اور ﴿ يَذْهَبُ ﴾ بہ فتحِ یا و ہا ہے "ذهاب" سے۔ "سَنا" "ضوء" کو کہتے ہیں، یعنی روشنی۔ "سَنا" وادی ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "سَنَا يَسْنُو سَنًا" "أَيْ: أَضَاءَ يُضِيءُ" اور "سنا" بمد بمعنی رفعت ہے۔ یہ قول مبرد وغیرہ کا ہے۔ طلحہ بن مصرف و یحییٰ بن وثاب نے "سَنَاءُ بُرَقِهِ" بمد پڑھا ہے، اس بنا پر کہ روشنی و صفائی کی شدت میں مبالغہ ہو، اس لیے رفعت و شرف کا اسم اس پر اطلاق کر دیا گیا اور نیز طلحہ و یحییٰ نے "بُرَقه" کو بہ ضمِ با و فتحِ را پڑھا ہے۔ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا ہے کہ یہ لفظ اس قراءت کی بنا پر "بَرْق" کی جمع ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بُرَقِهِ" بہ ضم برق کی ایک مقدار کو کہتے ہیں اور "بَرْقه" بہ فتح ایک چمک کو بولتے

[1] معاني القرآن (٤/ ٤٩)
[2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٧٥)

ہیں۔ معنی یہ ہیں: لگتا ہے کہ برق کی روشنی جو اس بدلی میں ہے، اپنی چمک کی شدت کی وجہ سے اور روشنی کی تیزی کی وجہ سے آنکھوں کو لے جائے۔

کقوله تعالیٰ: ﴿ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ﴾ [البقرة: ٢٠] ''قریب ہے کہ بجلی اُچک لے جائے ان کی آنکھیں۔'' جحدری و ابن قعقاع نے ''يُذهِب'' بہ ضم یاء و کسرِ ہاء پڑھا ہے ''إذهاب'' سے۔ امام اخفش و ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس قراءت کو خطا کہا ہے۔[1] ''أبصار'' بصر کی جمع ہے۔ بصر بمعنی ناظرہ و چشم ہے۔ حرفِ باء جمہور کی قراءت کی بنا پر ''إلصاق'' کے واسطے ہے، یا تعدیہ۔ اور ''إذهاب'' کی بنا پر زائد ہے۔ کسی نے کہا بہ معنی ''مِن'' ہے اور مفعول محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''يُذْهِبُ النُّوْرُ مِنَ الْأَبْصَارِ''.

فَسُبْحَانَ مَنْ يُّخْرِجُ الْمَاءَ وَالنَّارَ وَالنُّوْرَ وَالظُّلْمَةَ مِنْ شَيْءٍ وَّاحِدٍ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ''

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴾ یعنی اللہ پاک رات اور دن کے درمیان تعاقب کرتا ہے، ایک کو دوسرے کے بعد لاتا ہے۔ رات لاتا ہے دن لے جاتا ہے، دن لاتا ہے رات لے جاتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھ کو ابن آدم ایذا دیتا ہے، وہ زمانے کو گالی دیتا ہے اور میں دہر ہوں، میرے ہاتھ میں کام ہے، میں رات اور دن کو لوٹتا پوٹتا ہوں۔[2] (أخرجه البخاري و مسلم) کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ایک میں زیادہ کرتا ہے اور دوسرے کو کم کرتا ہے۔ کسی نے کہا: رات اور دن کو بدلتا ہے، خیر و شر کے اور نفع و نقصان کے اختلاف کی وجہ سے جن کو ان میں مقدر کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو گرمی سردی سے بدلتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد دن کو کبھی اندھیری بدلی سے اور کبھی سورج کی روشنی کے ساتھ بدلنا ہے اور رات کو کبھی بدلی کی تاریکی سے اور کبھی چاند کی روشنی سے بدلنا ہے۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ ﴾ یعنی بدلی کے ہانکنے میں اور مینہ کے اتارنے اور رات دن کے بدلنے میں ﴿ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ آنکھوں والوں کے لیے عبرت ہے۔ البتہ دلالت واضح و ظاہر ہے کہ جس کے سبب سے اعتبار حاصل ہوتا ہے، اس شخص کے واسطے جس کی بصر ہے کہ جس سے وہ دیکھتا ہے، چنانچہ یہ اللہ پاک کے وجود و صفات پر کھلی دلیلیں ہیں، جس کو نظر، تدبر، فکر اور دھیان ہے۔ پھر اللہ پاک نے من جملۂ عجائب خلقِ حیوان و بدیع صنعتِ (کاریگری) ربِ رحمان کی تیسری دلیل کا ذکر کیا۔[3] چنانچہ ارشاد فرمایا:

[1] فتح القدير (٤/ ٥٨) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٦)
[3] فتح البيان (٩/ ٢٤١-٢٤٤)

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤٥﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤٦﴾

اور اللہ نے (زمین پر) چلنے پھرنے والا ہر جاندار پانی سے پیدا کیا، پھر ان میں سے کوئی اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے، اور ان میں سے کوئی دو (پاؤں) پر چلتا ہے، اور ان میں سے کوئی چار (پاؤں) پر چلتا ہے، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، بلاشبہ اللہ ہر شے پر خوب قادر ہے ﴿45﴾ بلاشبہ ہم نے کھول کر بیان کرنے والی آیات نازل کیں، اور اللہ جسے چاہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے ﴿46﴾

مخلوقات کی پیدائش میں قدرتِ الٰہی کی دلیل کا ذکر:

اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ تامہ اور سلطانِ عظیم کا ذکر فرماتا ہے کہ اس نے مختلف قسموں کی مخلوقات کو پیدا کرنے میں، جو اپنی شکلوں اور رنگوں اور حرکات وسکنات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، کیا عجیب کاری گری کی ہے کہ باوجود اس اختلاف اور ایک دوسرے سے الگ ہونے کے ان سب کو ایک پانی سے پیدا کیا ہے۔ پھر ان میں سے کوئی تو اپنے پیٹ پر چلتا ہے، جیسے: سانپ اور اس کے ہم شکل اور جانور، کوئی دو پاؤں پر چلتا ہے، جیسے: انسان اور پرندے، اور کوئی چار پاؤں پر چلتا ہے، جیسے: چار پائے جانور اور حیوانات۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴾ یعنی اللہ اپنی قدرتِ باہرہ سے جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، کیوں کہ اس کی شان تو ایسی مضبوط اختیار والی ہے کہ جو اس نے چاہا، وہ ہو گیا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ اور اسی لیے یہ فرمایا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ پھر اللہ پاک اس بات کو بیان کرتا ہے کہ اس نے اس قرآنِ پاک میں بہت سے حکم اور حکمتیں اور کھلی کھلی مثالیں اور پختہ پختہ کہاوتیں نازل فرمائی ہیں اور جو لوگ عقل و بصیرت والے ہیں ان کو اُن کے سمجھنے کی راہ بتاتی ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

یحییٰ بن وثاب، اعمش، حمزہ اور کسائی نے ''خَالِقَ كُلِّ دَابَّةٍ'' پڑھا ہے۔ باقی قاریوں کی قراءت ﴿ خَلَقَ ﴾

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٩٥)

ہے، دونوں معنی صحیح ہیں۔[1] ﴿دَآبَّةٍ﴾ ہر وہ حیوان ہے جو زمین پر چلے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''دَبَّ يَدِبُّ فَهُوَ دَابٌّ،، حرفِ ہاء مبالغے کے لیے ہے۔ ''دَبٌّ وَّدَبِيْبٌ،، نرم رفتن کو کہتے ہیں، یعنی دبے پاؤں چلنا، آہستہ چلنا۔ ﴿مَآءٍ﴾ سے مراد نطفہ ہے، یعنی منی۔ جمہور نے اسی طرح کہا ہے۔ پھر جو مخلوقات مختلف ہونے کے درمیان نطفے سے پیدا کی گئی، بعض تو اس میں سے ھوام ہیں اور بعض اس میں سے چوپائے ہیں۔ (ہوام جمع ہے ہامہ کی، ہامہ خزندۂ گزندہ۔ دابہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔) ایک جماعت نے کہا ہے کہ مراد یہی معروف پانی ہے، کیوں کہ آدم علیہ السلام پانی اور مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر دابہ کی پیدائش نطفے سے اس طرح سے ہے کہ وہ اغلب ہے زمین کے حیوانات کی پیدائش میں جن کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ورنہ فرشتے نور سے بنے ہیں، جو کہ تعداد میں سب مخلوقات سے زیادہ ہیں اور جن آگ سے بنے ہیں، حالاں کہ وہ تسعہ اعشار اِنس ہیں، یعنی انسانوں سے نو گنا ہیں، جس طرح کہ کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نو حصے جن ہیں اور ایک حصہ انسان۔ اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنے اور عیسیٰ علیہ السلام اس ہوا سے جس کو جبریل علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کے گریبان میں پھونکا۔ اور کیڑے پھلوں اور عفونات سے پیدا ہوئے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے ہر جانور کے احوال کی تفصیل فرمائی ہے کہ بعض تو اپنے شکم پر چلتے ہیں یہ سانپ، ہوام، مچھلیاں، کیڑے اور اُن کی طرح کے اور جاندار ہیں۔ پیٹ پر زحف کرنے کا نام مشی رکھا ہے استعارے کے طور پر جس طرح کے مِشفر کا استعارہ شفتہ کے لیے کیا گیا ہے اور شفتہ کا مشفر کے لیے، یعنی اصل میں مشفر اونٹ کے ہونٹ کو کہتے ہیں، پھر استعارے کے طور پر حبشی کے ہونٹ کو گندہ ہونے کی وجہ سے کہنے لگے۔ اسی طرح جو کام ہوتا رہتا ہے، اس کو محاورے میں یوں کہتے ہیں کہ ''قَدْ مَشَى هٰذَا الْأَمْرُ،، یعنی یہ کام چلا۔ ''وَفُلَانٌ مَا يَمْشِيْ لَهُ أَمْرٌ،، یعنی فلاں کا کام نہیں چلتا۔ (مشابہ ہونے) کے طور پر کہہ دیا ہے، کیوں کہ رینگنے والے کا ذکر چلنے والے کے ساتھ کیا۔ اور دو پاؤں پر چلنے والے انسان اور پرندے ہیں اور نعام، یعنی شتر مرغ۔ اور چار پاؤں پر چلنے والے جیسے جانور چوپائے اور باقی حیوانات۔ پہلے اس کو بیان کیا جو زیادہ معروف ہے قدرت میں، یعنی چلنے والے اعضا پاؤں وغیرہ کے بغیر چلنے والا، پھر دو پاؤں پر چلنے والے کا ذکر کیا، پھر چار پر چلنے والے کا۔

کلمہ ''مَنْ،، کا فرمایا ''مَا،، کا نہ کہا، غیر عاقل پر عاقل کی تغلیب کے لیے، اس لیے کہ نفیس کو اصل ٹھہرانا اور خسیس کو تابع قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہر شے سوائے انسان کے چار پاؤں پر چلتی ہے۔[2] فتح البیان اور فتح القدیر میں کہا ہے کہ یہ پرندے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے دو پاؤں پر چلتے ہیں اور اسی طرح پرندوں کے علاوہ جیسے شتر مرغ، کیوں کہ وہ دو پاؤں پر چلتا ہے، حالانکہ وہ پرندوں میں سے نہیں ہے۔ چنانچہ یہ کلیہ جو اُن سے مروی ہے ٹھیک نہیں ہے[3] (سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا کلیہ اگر ان سے صحیح طور پر ثابت ہو تو

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٩١) [2] الدر المنثور (٦/ ٢١٣) [3] فتح البيان (٩/ ٢٤٥) فتح القدير (٤/ ٥٩)

اس کو اس پر محمول کریں گے کہ اُن کی مراد یہ ہے کہ ہر شے جس کی شان سے صرف پاؤں پر چلنا ہے نہ اور کچھ تو وہ صرف انسان ہی ہے، جو ایسا ہو کر دو پاؤں پر چلے۔ یہ امر واقع کے موافق ہے، اس کے خلاف کا دنیا میں مشاہدہ نہیں ہوتا۔

رہے پرندے سو اُن سے اس میں کچھ تعرض نہیں ہے۔ اور شتر مرغ متکلمین کے نزدیک حیوان کی طرح پر ہے، پرندہ نہیں ہے، اگرچہ اس کے انڈے ہوتے ہیں اور اس کے بازو اور پر ہیں اور خفاش، یعنی چمگادڑ کو پرندہ ٹھہراتے ہیں گو وہ حاملہ ہوتی ہے اور بچے دیتی ہے اور اس کے کان باہر ہوتے ہیں اور پر نہیں ہوتے اس لیے کہ اس میں اڑنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ﴾ [المائدة: ١١٠] ''اور جب تو میرے حکم سے گارے سے پرندے کی سی مورت بناتا تھا'' اور دجاجہ، یعنی مرغی کو پرندہ کہتے ہیں، گو وہ اُڑتی نہیں، پس شتر مرغ اگر متکلمین کے نزدیک حیوان کی طرز پر ہے، طائر نہیں ہے، مگر یہ ایک فرد ہے اور اُن کا کلیہ بر طریق اغلب و اکثر افراد کے ہے۔ والله سبحانه أعلم. (حافظ مولوی محمد عبدالعزیز نائب افتا سلمہ اللہ تعالیٰ))

اور جو چار سے زیادہ پر چلتا ہے اس سے تعرض نہیں کیا بسبب اس کی قلت کے۔ کسی نے کہا: وجہ یہ ہے کہ چلنا فقط چار ہی پر ہوتا ہے اگرچہ پاؤں بہت سے کیوں نہ ہوں۔ کسی نے کہا کہ جو چار سے زیادہ پر چلتا ہے، اس کا کچھ اعتبار و شمار نہیں ہے۔ اس قول کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیوں کہ اس بیان سے بدیع صنعت پر آگاہ کرنا مراد ہے اور کمالِ قدرت پر تنبیہ مقصود ہے۔ پھر جو چار سے زیادہ پر چلتا ہے اس کا اعتبار اور شمار میں نہ آنا کیوں کر کہا جائے، بلکہ اس میں تو ایک اور ہی عجیب و غریب قدرت کا اظہار ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن شریف میں وہ بات نہیں ہے جس سے اس بات کی دلیل لی جائے کہ چار سے زیادہ پاؤں پر چلنے والا کوئی جانور نہیں، کیوں کہ قرآن پاک نے اس کی نفی نہیں کی ہے، نہ اس میں کوئی ایسی شے ہے کہ جو حصر کی مقتضی ہو، یعنی جس سے ایک خاص تعداد ہی میں جانوروں کے چلنے والے اعضاء کو محصور کیا جائے، بلکہ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کے مصحف میں یوں ہے: ''وَمِنْهُمْ مَنْ یَّمْشِیْ عَلٰی أَكْثَرَ''[1] لو اب تو جو چار سے زیادہ پر چلتے ہیں، اس اضافے سے یہ آیت ان سب کو عام و شامل ہوگئی، جیسے: کیکڑا اور مکڑیاں اور وہ حیوان جو معروف بہ اُمِ اربع و اربعین ہے، شاید یہ کنکھجورا ہو اور بہت سے زمین کے کیڑے مکوڑے، جیسے: بچھو وغیرہ۔ کسی نے کہا ہے کہ اس قسم کا صرف اس لیے خاص ذکر نہیں کیا کہ وہ تو ﴿یَخْلُقُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ﴾ کے تحت میں داخل ہے، یعنی اللہ پاک پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے ان اشیاء سے جن کا یہاں ذکر کیا ہے اور ان چیزوں سے جن کا اس جگہ ذکر نہیں فرمایا ہے، جیسے: جمادات مرکب و بسیط و نامی و غیر نامی اپنی صورتوں، اعضاء، ہیأت، حرکات، طبائع، قویٰ و افعال کے مختلف ہونے کے باوجود عنصر میں متحد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے تقاضے کے تحت ان کا ذکر نہیں فرمایا، کیوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے کر سکتا ہے کوئی شے اس کو عاجز نہیں کر سکتی اور نہ کوئی مانع اسے روک سکتا ہے، بلکہ سب کے سب اس کی مخلوقات میں داخل ہیں۔ اسی وحدہ لاشریک لہ کی قدرت کے تحت ہیں۔ سبحانه ما أعظم شانه وما أبهر سلطانه.

[1] تفسیر القرطبي (١٢/ ٢٩٢)

﴿اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ﴾ بہ کسر و فتح یائے تحتیہ دونوں قراءتِ سبعیہ ہیں۔ اسی طرح کلامِ مجید میں جہاں کہیں یہ جمع واقع ہوئی ہے۔ اس میں یہی دو قراءتیں ہیں۔ ان آیات سے مراد قرآنِ پاک ہے، کیوں کہ وہ ہر شے کے بیان پر مشتمل ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: ٣٨] ''ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)۔'' آیت میں غائب سے متکلم کی طرف التفات ہے۔ اس قسم کا بیان بہت جگہ گزر چکا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک جس کو چاہتا ہے راہ بتاتا ہے، یعنی اسے صحیح نظر کی توفیق دیتا ہے۔ صحیح اور سچے غور و فکر کی طرف اس کی راہنمائی فرماتا ہے۔ ﴿صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ سے مراد سیدھی اور برابر راہ ہے۔ جس میں کسی طرح کی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اس سے پوری خیر کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ کامل خیر نعیم جنت ہے۔[1] (كذا في فتح البيان مع وضاحة التبيان) پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کا بیان شروع کیا جن کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ۭ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ۧ﴾

اور وہ (منافق) کہتے ہیں: ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، اور ہم نے اطاعت کی، پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فریق (اطاعت سے) پھر جاتا ہے اور وہ لوگ مومن ہی نہیں (47) اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے، تو اچانک ان میں سے ایک فریق منہ موڑ لیتا ہے (48) اور اگر ان کے لیے حق (فائدہ) ہو تو وہ اس کی طرف فرمانبردار ہو کر چلے آتے ہیں (49) کیا ان کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے یا وہ شک میں پڑے ہیں یا خوف کھاتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کریں گے۔ (نہیں) بلکہ وہ لوگ خود ہی ظالم ہیں (50)

[1] فتح البیان (٩/ ٢٤٤۔ ٢٤٦)

منافقوں کی صفات کا بیان:

دل میں روگ یہ کہ اللہ اور رسول کو سچ مانا، لیکن حرص نہیں چھوڑتے کہ کہے پر چلیں، جیسے بیمار چاہتا ہے کہ چلے لیکن پاؤں نہیں اُٹھتے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک منافقوں کی صفات کی خبر دیتا ہے جو ظاہر کرتے ہیں اس بات کے خلاف کہ جس کو چھپاتے ہیں، صرف اپنی زبان سے اس طرح کہتے ہیں: ﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ یعنی اپنے اقوال کی اپنے افعال سے مخالفت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ ﴿ وَمَاۤ اُولٰٓىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ طبرانی نے عن الحسن عن سمرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کیا ہے: «مَنْ دُعِيَ إِلٰى سُلْطَانٍ فَلَمْ يُجِبْ فَهُوَ ظَالِمٌ لَا حَقَّ لَهُ»[1] یعنی جو کوئی سلطان کی طرف بلایا جائے، پھر وہ نہ آئے تو وہ ظالم ہے، اس کے لیے کچھ حق نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ ہدایت کی پیروی کرنے کی طرف طلب کیے جائیں، یعنی اس شے کی طرف جس کو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے تو اس سے منہ موڑیں اور اس کے اتباع سے اپنی جانوں میں تکبر کریں۔ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴾ [النساء: ٦١] ”(اے نبی!) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ بے شک وہ اس پر ایمان لائے ہیں، جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ شیطانی چیلوں سے کرائیں، حالاں کہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ ایسے شیطانوں کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمراہ کر کے دور پھینک دے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا، اور آؤ رسول کی طرف، تو آپ منافقوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف آنے سے کتراتے ہیں۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جس وقت حکم اور فیصلہ ان کے حق میں ہو اور اُن کے خلاف نہ ہو تو سنتے مانتے ہوئے آ جائیں۔ ﴿ مُذْعِنِيْنَ ﴾ کے یہی معنی ہیں اور جب حکم اور فیصلہ اُن کے خلاف ہو تو منہ موڑ لیں اور غیر حق کی طرف بلائیں اور چاہیں کہ غیر نبی کی طرف جا کر فیصلہ کرائیں،

[1] المعجم الکبیر (٧/ ٢٢٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٦٧٤)

تا کہ وہاں اُن کا باطل چل جائے۔ ان کا پہلے مان لینا کچھ اس اعتقاد سے نہ تھا کہ حق وہی فیصلہ ہے، بلکہ اس واسطے تھا کہ وہ ان کی خواہشات کے مطابق پڑ گیا اور اسی لیے جبکہ حق ان کے ارادے اور خواہشات کے خلاف ہوا تو اس سے منہ موڑ کر غیر حق کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ یعنی ان کا حال اس سے باہر نہیں ہے: یا تو اُن کے دلوں میں بیماری ہے جو اُنھیں پکڑے ہوئے ہے، یا اُن کو دین میں شک لاحق ہو گیا ہے، یا انھیں ڈر ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان سے بے انصافی کریں گے اپنے فیصلے میں۔ ان میں سے کوئی سی بات ہو تو وہ محض کفر ہے۔ اللہ پاک اُن میں سے ہر ایک کو بہ خوبی جانتا ہے اور ان صفات کو بھی جانتا ہے جو اس کے دل میں پوشیدہ ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ بَلْ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ بلکہ ظالم فاجر بے انصاف وہی ہیں، اللہ اور رسول اس بات سے بَری ہیں جس کا وہ گمان اور وہم کرتے ہیں کہ وہ ظلم اور بے انصافی کریں گے۔ اللہ اور رسول تو اس بات سے مبرا و منزہ و برتر ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ﴾ کہنے والے منافق لوگ ہیں جو ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور کفر کو چھپاتے ہیں۔ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں ہے، کیوں کہ وہ ایسے ہیں جیسے اللہ پاک نے اُن کے بارے میں یہاں بیان کیا ہے کہ وہ صرف زبان سے ایمان باللہ وبالرسول اور اللہ اور رسول کی اطاعت اور فرماں برداری کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ صحیح اعتقاد سے ایسا نہیں کرتے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ منافقوں میں سے کچھ لوگ ہیں کہ ایمان و اطاعت کا اظہار کیا، حالاں کہ وہ اس میں اللہ کی راہ سے اور اس کی اطاعت سے روکتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جہاد کرنے سے روکتے ہیں۔[2] ﴿ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ﴾ پھر ان منافقوں میں سے ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے جو یہ بات کہتے ہیں۔ ﴿ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس کے بعد کہ ان سے ایمان اور اطاعت کا دعویٰ صادر ہوا جس کو انھوں نے اپنی جانوں کی طرف منسوب کیا تھا۔

پھر اللہ پاک نے ان پر بے ایمان ہونے کا حکم لگا کر یہ فرمایا: ﴿ وَمَآ اُولٰٓىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی یہ لوگ جو اس بات کے قائل ہیں حقیقت میں مومن نہیں ہیں کہ ان کے دل ان کی زبانوں کے موافق ہوں۔ چنانچہ بے ایمانی کا حکم ان سب کو شامل ہوگا۔ جو اس بات کے قائل ہیں اور جن لوگوں نے منہ موڑا ہے وہ بھی انہیں لوگوں میں شامل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اُولٰٓىِٕكَ ﴾ کا اشارہ منہ موڑنے والوں کی طرف راجع ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ یہ کلام دو حکموں پر مشتمل ہے: پہلا حکم یہ ہے کہ ان میں سے بعض پر ''تَوَلِّيْ'' کا حکم لگایا ہے، دوسرا حکم یہ ہے کہ سب پر

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٩٥۔ ٣٩٦) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٢١)

بے ایمانی کا حکم کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "مَن تَوَلّٰی" سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کا حکم قبول کرنے سے منہ موڑا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد منافقوں کے سردار ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس فریق کے اعراض کرنے سے مراد اس کا باقی لوگوں کی طرف رجوع ہونا ہے۔ یہ آیت اپنے الفاظ کے اعتبار سے جس بات پر محمول کی جاتی ہے، وہ اس کے ورود کو سببِ خاص پر مانع نہیں، چناں چہ سببِ نزول کا ذکر آیندہ ہوگا۔

پھر اللہ پاک نے ان منافقوں کی یہ صفت بیان کی کہ ان میں سے ایک گروہ اپنے جھگڑوں میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کی دعوت کو قبول کرنے سے اعراض کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ یعنی جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، وہ رسول جو اللہ کے احکام پہنچانے والا ہے۔ ﴿ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ﴾ تا کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ ضمیر رسول کی طرف راجع ہے، کیوں کہ وہ حکم کا مباشر (کرنے والا) ہے، گو حقیقت میں حکم اللہ پاک کا ہی ہے، اس کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ﴾ [التوبة: ٦٢] "حالاں کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہے (اس کا) کہ وہ راضی کریں اس کو۔" ﴿ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ "إذا" فجائیہ ہے، یعنی تب ہی اُن میں سے ایک فریق اپنا جھگڑا اللہ اور رسول کی طرف لے جانے سے، یا ان کے فیصلے کو قبول کرنے سے اور اُن کی طرف آنے سے اعراض کرنے والا ہے۔

پھر اللہ پاک نے یہ بات ذکر کی کہ ان کا اعراض صرف اسی وقت ہوتا ہے جب جھگڑے میں حق ان کی طرف نکلتا ہو اور جب حق اُن کے لیے ہو تو اس وقت وہ جلد مان لیتے ہیں، کیوں کہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فیصلہ حق کے مطابق ہی کریں گے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ ﴾ یعنی اگر ان کا اپنے غیر پر حق ہو تو ﴿ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴾ تو رسول کی طرف مطیع اور فرماں بردار ہو کر آئیں، اپنے حق کے بارے میں اس کا فیصلہ طلب کرنے کے لیے، نہ کہ اس لیے کہ اپنے رسول کے حکم سے راضی اور خوش ہوں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اذعان طاعت کے ساتھ جلدی کرنے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَذْعَنَ لِيْ بِحَقِّيْ" یعنی فلاں نے میرے واسطے اس شے کی جس کا میں اس سے التماس کرتا تھا موافقت کی اور مان لیا اور اس کی طرف جلدی کرنے لگا۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2]

امام اخفش اور ابن اعرابی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُذْعِنِيْنَ ﴾ بہ معنی "مُقِرِّيْنَ" ہے، یعنی اقرار کرنے والے۔ نقاش نے کہا: "خَاضِعِيْنَ" یعنی عاجزی و فروتنی کرنے والے۔[3] معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات کو خوب پہچانتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس صرف تلخ حق ہی ہے اور صرف عدل ہے، اسی لیے آپ ﷺ کے پاس اپنا جھگڑا لانے سے باز رہتے ہیں، جبکہ حق اُن کی گردن پر سوار ہوتا ہے، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اس حق کو اُن کی آنکھوں سے کھینچ نہ لیں،

[1] معاني القرآن (٤/ ٥٠) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٢٠٥) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٩٣)

اُن کے دشمنوں کے حق میں فیصلہ کر کے۔ اور اگر ان کا حق کسی دشمن پر ثابت ہو تو دوڑ کر آپ کے پاس آئیں اور صرف آپ ہی کے فیصلے کو پسند کریں، تاکہ اپنے دشمن کے ذمے ان کا جو حق واجب الادا ہے، وہ آپ انھیں دلا دیں۔

پھر وہ لوگ جو نبی اکرم ﷺ کے فیصلے سے اعراض کرتے ہیں، جبکہ اُن کے ذمے حق ہوتا ہے تو اللہ پاک نے اس بارے میں تین قسمیں بیان کیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے اعراض کرنے کے تین سبب ہیں، لہٰذا یا تو یہ ہے کہ ﴿ اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ میں ہمزہ ڈانٹ ڈپٹ کا ہے اور مرض سے مراد نفاق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کفر ہے اور ظلم کی طرف مائل ہونا ہے، یعنی کیا یہ اعراض جو انھوں نے کیا اس نفاق کی وجہ سے ہے جو اُن کے دلوں میں موجود اور قرار پذیر ہے، یا یہ ہے کہ ﴿ اَمِ ارْتَابُوْٓا ﴾ بلکہ کیا انھوں نے شک وشبہہ کیا ہے نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے معاملے میں، یا فیصلے میں اُن کے عدل کے بارے میں، یا ان سے کوئی ایسی تہمت دیکھ لی ہے جس سے اُن پر ان کا اعتماد، وثوق اور یقین زائل ہو گیا ہے۔ یا یہ ہے کہ ﴿ اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ حیف کہتے ہیں فیصلے میں مائل ہونے کو۔ محاورے میں کہتے ہیں: "حَافَ فِيْ قَضِيَّتِهِ" یعنی فلاں نے جس بات کا حکم و فیصلہ کیا ہے، اس میں جھک گیا ہے، برابر نہیں رہا۔ معنی یہ ہیں: بلکہ کیا اس سے ڈرتے ہیں کہ ان پر اللہ اور اس کا رسول بے انصافی کرے گا۔

پھر اللہ پاک نے ان تمام باتوں سے اعراض فرمایا جن کے شروع میں استفہامِ انکاری ذکر کیا تھا اور یوں ارشاد کیا: ﴿ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ یعنی ان کا اعراض مذکورہ امور کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کے عناد اور ظلم کی وجہ سے ہے، کیوں کہ اگر اعراض ان اُمور میں سے کسی امر کے سبب سے ہوتا تو وہ اُن کے مطیع ہو کر دوڑے نہ آتے، جب کہ اُن کا حق کسی غیر پر نکلتا ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اضراب آخری دو قسموں سے ہے، اس لیے کہ پہلی قسم تو حقیقت ہے اور ثابت ہے۔ تقسیم کی وجہ یہ ہے کہ ان کا باز رہنا یا تو کسی خلل کی وجہ سے ہے جو اُن میں یا حاکم میں ہے۔ دوسری شق خالی نہیں ہے یا تو وہ خلل ان کے نزدیک حقیقی ہے یا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ دونوں باطل ہیں اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا منصبِ نبوت اور آپ کا امانت میں پختہ ہونا اس بات سے مانع ہے تو وہی پہلی شق ہی متعین رہی اور اُن کا ظلم عام ہے، اُن کے عقیدے میں خلل کی وجہ سے اور اُن کی جانوں کے اُن کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے۔ فصل کی ضمیر، یعنی "هُمْ" اس کے لیے اُن کے غیر سے نفی کے لیے ہے، خاص کر وہ شخص جو آپ ﷺ کے حکم کی طرف بلایا جائے۔[1] (قاله البيضاوي)

سببِ نزول:

یہ ہے جو سیدنا حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اگر ایک آدمی کا کسی اور شخص کے

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٩٦)

ساتھ کوئی جھگڑا اور تنازعہ ہوتا تو جس وقت اسے نبی اکرم ﷺ کی طرف بلایا جاتا اور وہ محق (حق دار) ہوتا تو مطیع ہو کر دوڑا آتا اور جانتا کہ نبی کریم ﷺ ابھی اس کے حق میں فیصلہ کر دیں گے اور جب چاہتا کہ ظلم کرے، پھر نبی مکرم ﷺ کی طرف فیصلے کے لیے بلایا جاتا تو اعراض کرتا اور کہتا کہ فلاں کی طرف چل۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿48﴾ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿49﴾ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی کے اور اس کے بھائی کے درمیان کوئی چیز ہو، پھر وہ اس کو کسی مسلم حاکم کی طرف فیصلے کے لیے بلائے اور وہ نہ آئے تو وہ ظالم ہے۔ اس کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔ (أخرجه عبد بن حميد و ابن المنذر و ابن أبي حاتم) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس متن کے ذکر کے بعد یوں کہا ہے: "هذا حديث غريب و هو مرسل"[1] امام ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حدیث باطل ہے (یہ ابن العربی امام مالکی صاحب شرح موطا ہیں)۔

رہا یہ قول کہ "فَهُوَ ظَالِمٌ" تو کلام صحیح ہے اور یہ قول "فَلَا حَقَّ لَهُ" صحیح نہیں ہے۔ احتمال ہے کہ مراد یہ ہو کہ وہ غیر حق پر ہے۔[2] انتھی۔ فتح البیان و فتح القدیر میں کہا ہے کہ حدیث مذکور کا مرسل ہونا ظاہر ہے۔ رہا اس کے باطل ہونے کا دعویٰ تو یہ دلیل کا محتاج ہے، ائمۂ حدیث میں سے تین اماموں نے اس کی تخریج کی ہے، جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ یہ لوگ ایسی حدیث پر اتفاق کریں جو باطل ہو، حالانکہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی اسناد میں کوئی وضاع و کذاب نہیں ہے۔ اسناد یہ ہے: امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حدثنا أبي حدثنا موسى بن إسماعيل حدثنا مبارك حدثنا الحسن الخ". اس کی شہادت وہ حدیث دیتی ہے جس کو طبرانی نے "عن الحسن عن سمرة" روایت کیا ہے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔[3]

اس آیت میں اس قاضی کی بات کو قبول کرنے کے لازمی ہونے کی دلیل ہے، وہ حاکم یا قاضی جو اللہ پاک کے احکام کا عالم ہے اور اپنا فیصلہ کرنے میں عادل ہے، کیوں کہ علماء نبیوں کے وارث ہیں۔ اسلام کے قاضیوں میں سے کسی قاضی کا فیصلہ جو اللہ کے احکام کو جاننے والا ہو اور سنت کو پہچانتا ہو اور فیصلہ کرنے میں عادل ہے، ایسا فیصلہ ہے جو اللہ اور رسول کا فیصلہ ہے۔ لہٰذا جو کوئی شخص اپنے جھگڑے کو ایسے قاضیوں کے پاس لے جانے کی دعوت دیتا ہے تو اس نے واقعی اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا، یعنی ان کے فیصلے کی طرف۔ ابن خوازمنداد نے کہا ہے کہ ہر اس شخص کے لیے واجب ہے جو کسی حاکم کے پاس جانے کے لیے بلایا جائے کہ اس کے پاس آئے، جب تک اسے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٢٣) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٩٦) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٩٤)
[3] اس کی تخریج زیر تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

یہ معلوم نہ ہو کہ وہ حاکم فاسق ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں حاکم کی طرف بلائے جانے کی دعوت کو قبول کرنے کے واجب ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے ایسے شخص کی مذمت فرمائی ہے جو اس کے رسول کی طرف اس لیے بلایا جائے، تا کہ وہ اس کے اور اس کے دشمن کے درمیان فیصلہ کرے، پھر وہ اعراض کرے۔

اللہ پاک نے ایسے شخص کی بہت سخت مذمت کی ہے، چنانچہ یوں فرمایا ہے: ﴿ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾[1] پھر اگر قاضی مُقصّر ہو، (یعنی تقصیر کرنے والا ہو، مراد وہ شخص ہے جس کو قرآن وسنت کا پورا علم نہیں۔) وہ کتاب وسنت کے احکام نہ جانتا ہو نہ اللہ کی حجتوں کو اور نہ کلام اللہ اور کلامِ رسول کے معانی کو جانتا بوجھتا ہو، بلکہ بالکل جاہل بہ جہلِ بسیط ہو، یہ وہی شخص ہے کہ امورِ مذکور سے اس کو کسی شے کا علم نہ ہو۔ یا جہلِ مرکب کا حامل ہو، یہ وہ شخص ہے جس کے پاس امورِ مذکور کا علم نہیں ہے، لیکن اس نے مجتہدین کے بعض اجتہادات کو جانا ہے اور کسی قدر رائے کا علم رکھتا ہے تو حقیقت میں ایسا شخص جاہل ہے، گو وہ اس بات کا اعتقاد رکھے کہ وہ کچھ علم جانتا ہے، کیوں کہ یہ اس کا اعتقاد باطل ہے۔ قاضیوں میں سے جو شخص ایسا ہو تو اس کی طرف جانے کی دعوت کو قبول کرنا واجب نہیں، کیوں کہ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جو اللہ اور رسول کے حکم کو جانتے ہیں، تا کہ جو دو جھگڑنے والے اس کے پاس آئے ہیں تو اُن کے درمیان اس حکم کے مطابق فیصلہ کر دے، بلکہ وہ تو طاغوتی قاضیوں میں سے ہے۔ (طاغوت بہ معنی بت و شیطان ہے اور جو کچھ اللہ کے سوا پوجا جائے اور ہر وہ شے جو حق سے باز رکھتی ہے۔) اور باطل حکام میں سے ہے، اس لیے کہ رائے کا اسے جو کچھ علم ہے، اس پر عمل کرنے کی رخصت صرف اس مجتہد کو دی گئی ہے جس کی طرف یہ شخص منسوب ہے۔ کتاب وسنت کی دلیل کے نہ ہونے کے وقت مجتہد کے سوا اور علماء کو اس میں رخصت نہیں دی گئی، جو اس کے بعد آئیں گے۔

جب یہ بات تمھارے نزدیک ثابت ہو چکی اور تم نے اس کو خوب سمجھ بوجھ لیا تو تم کو معلوم ہو کہ علماء میں سے کسی عالم کی تقلید کرنا اور اسی کی طرف منسوب ہونا نہ کہ اس کے غیر کی طرف اور جو کچھ روایت اور رائے وہ لایا ہے، اس سب کے ساتھ متعبد ہونا، (یعنی اُن کے موافق عبادات و معاملات میں برتاؤ کرنا) اور اس کے ماسوا کو مہمل (بے کار) چھوڑ دینا بہت بڑی بدعت ہے جو مضلہ (گمراہ کرنے والی) وفواقرِ موحشہ (وحشت میں ڈالنے والی سختی) میں سے ہے جو ملتِ اسلامیہ میں پیدا ہوئی ہے۔ فإنا للّٰه و إنا إليه راجعون۔

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ نے کتاب جُنّہ میں اور شوکانی رحمہ اللہ نے قولِ مفید اور ادب الطلب میں، ان کے سوا اور لوگوں نے اپنی تالیفات میں اس بحث کو خوب واضح کر کے تحریر فرمایا ہے، لہٰذا جو کوئی اس کی حقیقت سے واقف ہونا چاہے تو وہ کتبِ مذکور کی طرف رجوع فرمائے۔ مخفی نہ رہے کہ قاضیانِ عدل و حاکمانِ شرع شریف جو اس صفت کے حامل ہیں، جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے، یہ لوگ دین کے سلاطین ہیں اور کتاب وسنت کے مترجم ہیں اور لوگوں کے

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٩٤)

لیے اس چیز کی وضاحت کرنے والے ہیں جو اُن کی طرف نازل کی گئی ہے۔ بالجملہ پھر جس بات پر اہلِ نفاق جمے ہوئے تھے، اللہ پاک جب اس کا ذکر کر چکا تو اس کے بعد اس بات کا ذکر کیا جس کا ذکر کرنا مومنوں پر واجب ہے جس وقت وہ اللہ اور رسول کے حکم کی طرف بلائے جائیں۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٥٢﴾

بس مومنوں کی تو بات ہی یہ ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے، تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی، اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں (51) اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اور اللہ سے ڈرے اور اس کا تقویٰ اختیار کرے تو وہی لوگ کامیاب ہیں (52)

مومنوں کی ایک نمایاں خوبی کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پھر اللہ پاک نے مومنین کی صفت بتائی جو اللہ کا اور اس کے رسول ﷺ کا حکم مانتے ہیں اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے سوا کوئی دین تلاش نہیں کرتے۔ وہ صفت یہ ہے کہ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو اُن کا جواب یہی ہوتا ہے کہ کہتے ہیں: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ "أَيْ: سَمْعًا وَّطَاعَةً" یعنی ہم نے سنا اور حکم مانا۔ اسی لیے اللہ پاک نے ان کو فلاح کے ساتھ موصوف فرمایا ہے۔ فلاح کہتے ہیں مراد و مطلوب پا لینے کو اور خوف مرہوب (ڈر) سے سلامت رہنے کو۔ لہٰذا یوں ارشاد فرمایا: ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ یعنی مراد پانے والے یہی لوگ ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو جس وقت موت حاضر ہوئی اور یہ عقبی بدری ایک سردار تھے انصار کے سرداروں میں، (یعنی بیعتِ عقبہ اور جنگِ بدر میں حاضر ہوئے تھے۔) انھوں نے اپنے بھتیجے جُنادہ بن اُمیہ سے کہا: کیا میں تجھے اس بات کی خبر نہ دوں کہ تجھ پر کیا ہے اور تیرے واسطے کیا ہے، یعنی تیرے فرائض کیا ہیں اور تیرے لیے اجر کیا ہے؟ جنادہ نے کہا: ہاں، خبر دیجیے، فرمایا: بے شک تجھ پر ہے سننا اور ماننا، تیری تنگی میں اور آسانی میں، تیری خوشی اور ناخوشی میں اور تجھ پر اختیار کرنے میں۔ تجھ پر یہ ہے کہ تو اپنی زبان کو عدل

---

[1] فتح البیان (۹/ ۲٤٦۔ ۲٥١)

کے ساتھ قائم کرے اور یہ کہ اہلِ امر سے امر کے بارے میں جھگڑا نہ کرے، مگر اس وقت کہ وہ ظاہری طور پر تجھے اللہ کی معصیت کا امر کریں۔ پھر جس شے کا تجھے حکم دیا جائے، وہ کتاب اللہ کے خلاف ہو تو کتاب اللہ کا اتباع کر۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اسلام نہیں ہے، مگر اللہ کی اطاعت کے ساتھ، اور نہیں ہے کوئی خیر مگر جماعت میں اور اللہ کے واسطے اور اس کے رسول اور خلیفہ کے اور عامۃ المسلمین کے واسطے خیر خواہی کرنے میں۔ کہا: اور ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ عروۂ اسلام، یعنی اسلام کا کڑا اس بات کی گواہی دینا ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور قائم کرنا ہے نماز کا اور دینا ہے زکات کا اور طاعت ہے اس شخص کے لیے جس کو اللہ نے مسلمانوں کے امر کا والی و حاکم بنایا ہے۔[1] (روله ابن أبي حاتم) کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین اور اماموں (امراء) کی اطاعت، جبکہ وہ اللہ کی اطاعت کا حکم دیں، اس کے وجوب کے بارے میں جو احادیث اور آثار ہیں، ان کا یہاں پر احاطہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اس بات میں جس کا انھوں نے حکم کیا ہے اور جس بات سے انھوں نے منع کیا ہے اسے چھوڑ دے۔ ﴿ وَيَخْشَ اللّٰهَ ﴾ اور اللہ سے ان گناہوں کے بارے میں ڈرے، جو گزر چکے ہیں۔ ﴿ وَيَتَّقْهِ ﴾ اور اس سے آیندہ زمانے میں بچ کر چلے۔[2] ﴿ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ﴾ یعنی یہ وہی لوگ ہیں جو ہر خیر اور نیکی کے ساتھ ظفر مند ہوئے اور دنیا اور آخرت میں ہر برائی سے امن پایا۔

جمہور کی قراءت بہ نصب ﴿ قَوْلَ ﴾ ہے، اس بنا پر کہ ﴿ كَانَ ﴾ کی خبر ہے اور اس کا اسم ﴿ اَنْ يَّقُوْلُوْا ﴾ ہے۔ علی، حسن اور ابن ابی اسحاق نے "قَوْلُ" بہ رفع پڑھا ہے۔ اس بنیاد پر کہ ﴿ كَانَ ﴾ کا اسم ہے اور ﴿ اَنْ ﴾ مصدریہ ہے اور جو اس کے تحت میں ہے، وہ خبر ہے۔[3] پہلی قراءت کی ترجیح اس طرح دی کہ نحویوں کے نزدیک یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جب دو معرفے جمع ہو جائیں اور اُن میں سے ایک اَعرف ہو تو جو اعرف ہے وہی اسم ٹھہرایا جائے گا۔ رہے سیبویہ تو انھوں نے اختیار دیا ہے ہر دو معرفوں کے درمیان اور یہ تفرقہ نہیں کیا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

﴿ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ بالجملہ دعوت الی اللہ و رسولہ سے مراد کتاب عزیز و سنتِ مطہرہ کی طرف دعوت ہے۔ ﴿ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ یہی بات کہتے ہیں نہ اور کوئی بات۔ یہ جملہ گو بطور خبر ہے، لیکن اس سے مراد خبر نہیں ہے، بلکہ مراد ادبِ شرعی کی تعلیم ہے، جبکہ باہم جھگڑنے والے ایک دوسرے کو بلائیں۔ معنی یہ ہیں کہ مومنوں کو لائق ہے کہ ایسے ہوں کہ جس وقت مذکور دعوت کو سنیں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٢٣۔ ٢٦٢٤) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٢٤) [3] فتح القدیر (٤/ ٦٢)

تو اس کا جواب اطاعت و فرماں برداری اور قبول کرنے کے ساتھ دیں، یعنی بلا تکلف اس کو مان لیں، دوڑتے ہوئے جلد چلے آئیں۔ مقاتل وغیرہ نے کہا: کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بات سن لی اور آپ کے حکم کو مان لیا، گو یہ حکم اس بات میں ہو جس کو وہ ناپسند کرتے ہوں اور اُن کو نقصان پہنچائے۔ یہ آیتِ کریمہ باوجود نہایت مختصر ہونے کے ہر اس شے کو حاوی ہے جس کا کرنا مومنوں کے لائق ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کی تعریف وصفت فرمائی: ﴿ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ یعنی جن مومنوں نے یہ بات کہی وہ نجات پانے والے ہیں اور دنیا و آخرت کی خیر و خوبی کو حاصل کرنے والے ہیں۔ پھر اس کے بعد ہی ایک اور تعریف فرمائی کہ ﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُونَ ﴾ یہ جملہ ما قبل کا مقرر و مثبت ہے۔ ما قبل میں بھی مومنین کا اچھا حال مذکور تھا اور اس میں بھی ان کی خوبی کا حال اور مآل کا ذکر ہے اور دوسرے لوگوں کو اس بات کی ترغیب ہے کہ وہ اُن کے شمار اور قطار میں شامل ہوں اور اللہ و رسول کی اطاعت میں اور کتاب و سنت کے ماننے اور اللہ عزوجل سے خوف، خشیت اور تقویٰ رکھنے میں ان مومنین کی متابعت اور پیروی کریں۔ چنانچہ یہی لوگ جن میں اطاعتِ الٰہی، خشیت اور تقویٰ کی صفات ہیں، دنیا اور آخرت کی نعمتوں کو حاصل کرنے والے ہیں نہ کہ ان کے سوا اور لوگ۔

حکایت:

کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ نے ایسی آیت کے بارے میں پوچھا جو کافی وافی شافی ہو تو اس کے لیے یہی آیت پڑھی گئی۔ یہ آیتِ کریمہ کامیابی اور فلاح حاصل کرنے کے لیے کامل شامل اور اس بارے میں جامع ہے۔ وباللّٰہ التوفیق، وهو المستعان و عليه لا على غيره في إصلاح جميع أمور الدنيا والآخرة حسن الاعتماد والتكلان، اللهم أصلح حالنا ومآلنا في كل ما نأتي ونذر، وأجرنا يا الله يا رحمن من التي لا تبقي ولا تذر، وصل وسلم وبارك عليه وعلى آله وصحبه ما اتصلت عين بنظر و أذن بخبر آمين.

امام حفص نے "وَيَتَّقْهِ" بہ سکونِ قاف پڑھا ہے بنا بر نیتِ جزم۔ باقی قاریوں کی قراءت بہ کسرِ قاف ہے، کیوں کہ جزم اس فعل کا بحذف حرفِ آخر ہوتا ہے۔ ابو عمرو و ابو بکر نے حرفِ ہاء کو ساکن کیا ہے۔ یعقوب و قالون نے نافع سے اور مثنی نے ابو عمرو اور حفص سے اختلاسِ کسرہ کیا ہے۔ باقی قراء نے کسرۂ ہاء کا اشباع۔ ابن انباری نے کہا ہے کہ حفص کی قراءت اس شخص کی لغت پر ہے، جس نے یوں کہا ہے: "لَمْ أَرْ زَيْدًا وَلَمْ أَشْتَرْ طَعَامًا" یہ لوگ حرفِ یا کو بوجہ جزم کے گرا دیتے ہیں، پھر حرفِ ما قبلِ یاء کو ساکن کرتے ہیں۔[1] غرضیکہ اللہ پاک نے منافقوں سے یہ بات نقل کی کہ جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کو مکروہ جانا تو یہ قسم کھائی کہ اگر وہ ان کو غزوے کی طرف نکلنے کا حکم دیں گے تو وہ نکلیں گے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

---

[1] فتح القدير (٤/ ٦٢)

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

اور انھوں نے اپنی پکی پکی اللہ کی قسمیں کھائیں کہ اگر آپ انھیں حکم دیں گے تو وہ (جہاد پر) ضرور نکلیں گے، کہہ دیجیے: تم قسمیں نہ کھاؤ (تمھاری) اطاعت معروف ہے، بلاشبہ جو عمل تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے (53) کہہ دیجیے: اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم پھرو گے تو اس رسول کے ذمے صرف وہ ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے اور تمھارے ذمے صرف وہ ہے جو تم پر بوجھ ڈالا گیا، اور اگر تم اس (رسول) کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول کے ذمے صرف کھلا کھلا پہنچا دینا ہے (54)

منافقوں کے اپنی قسموں کو ڈھال بنانے کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اہلِ نفاق کی خبر دیتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے لیے قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر وہ انھیں غزوے میں نکلنے کا حکم دیں تو سب کچھ چھوڑ کر نکلیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو کہہ دے کہ تم قسمیں مت کھاؤ۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تمھاری طاعت ایک طاعتِ معروف ہے، یعنی تمھاری طاعت صرف زبانی زبانی ہے، اس کے ساتھ فعل نہیں ہے اور جب کبھی تم قسم کھاتے ہو تو جھوٹے ہوتے ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [التوبة: ٩٦] ''وہ تمھارے لیے قسمیں کھائیں گے، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم ان سے راضی ہو بھی جاؤ تو بھی اللہ ان (لوگوں) سے راضی نہیں ہوتا، جو نافرمان ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [المجادلة: ١٦] ''انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے، پھر انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، لہٰذا ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔''

چنانچہ ان کی عادت اور طبیعت سے جھوٹ بولنا ہے، یہاں تک کہ اس بات میں جس کو وہ اختیار کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَىِٕنْ

اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾ لَىِٕنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَىِٕنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَىِٕنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ [الحشر: ۱۱۔ ۱۲] ''(اے نبی!) کیا آپ نے وہ لوگ نہیں دیکھے، جنھوں نے منافقت کی؟ وہ اپنے ان بھائیوں سے، جو اہلِ کتاب میں سے کافر ہوئے، کہتے ہیں: اگر تم (مدینہ سے) نکالے گئے تو ہم ضرور تمھارے ساتھ نکلیں گے، اور ہم تمھارے معاملے میں کبھی کسی کی اطاعت نہیں کریں گے، اور اگر تم سے لڑائی کی گئی تو ہم ضرور تمھاری مدد کریں گے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ اگر وہ (یہود) نکالے گئے تو یہ (منافقین) ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی کی گئی تو یہ اُن کی مدد نہیں کریں گے، اور اگر ان کی مدد کو پہنچے بھی تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔''

کسی نے کہا ہے کہ ﴿ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں: چاہیے کہ امر تمھارا طاعتِ معروف ہو، یعنی دستور کے موافق بغیر حلف وقسم کھانے کے جس طرح کہ مومنین اللہ اور رسول کی اطاعت بغیر حلف کے کرتے ہیں، لہٰذا تم بھی ان کے مثل ہو جاؤ۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اور اس کو جو اطاعت کرتا ہے اور جو نافرمانی کرتا ہے خوب جانتا ہے۔ چنانچہ قسم کھانا اور اطاعت کا اظہار کرنا اور باطن اس کے برخلاف رکھنا گو مخلوق پر چل جائے، مگر خالق تو پوشیدہ کو اور پوشیدہ سے پوشیدہ کو خوب جانتا ہے، اس پر کوئی دھوکا نہیں چلتا، بلکہ وہ تو بندوں کے جی کی باتوں سے بھی واقف ہے، گو وہ اس کے خلاف ظاہر کریں۔

کتاب وسنت کی پیروی کا حکم:

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ یعنی تم کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی پیروی کرو۔ ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا ﴾ یعنی پھر اگر تم اس سے اعراض کرو گے اور جو کچھ وہ لے کر آیا ہے، اس کو چھوڑ دو گے تو ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ ﴾ یعنی اس پر تو صرف رسالت کا پہنچا دینا اور امانت کا ادا کرنا ہے۔ ﴿ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ﴾ اور تم پر اس کو قبول کرنا اور اس کی تعظیم کرنا اور اس کے مقتضا کے مطابق قائم ہونا اور عمل کرنا ہے۔ ﴿ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ﴾ یعنی اور اگر اس کا کہا مانو تو راہ پاؤ، اس واسطے کہ اس کا یہ حال ہے، جو اللہ پاک نے دوسری آیت میں ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الشوریٰ: ۵۲] ''اور بلاشبہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔'' ﴿ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴾ [الشوریٰ: ۵۳] ''اس اللہ کے راستے کی طرف جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے۔ آگاہ رہو! اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ اس آیت کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ [الرعد: ٤٠] ''آپ کے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہی ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿21﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ [الغاشية: ٢١۔ ٢٢] ''چنانچہ آپ نصیحت کیجیے، آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر کوئی فوج دار نہیں۔'' امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے (وهب بن منبه بن كامل انبارى صنعاني أبو عبد الله أخباري عن ابن عباس وجابر وأبي سعيد رضی اللہ عنہم وثقه النسائي قتله يوسف بن عمر سنة ١١٠هـ) کہ اللہ نے انبیائے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی کی طرف وحی کی، ان کو شعیا کہتے تھے: ''أَنْ قُمْ فِيْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ فَإِنِّيْ سَأُطْلِقُ لِسَانَكَ بِوَحْيٍ. فَقَامَ فَقَالَ: يَا سَمَاءُ! اِسْمَعِيْ وَيَا أَرْضُ! اِنْصِتِيْ، فَإِنَّ اللّٰهَ يُرِيْدُ أَنْ يَّقْضِيَ شَأْنًا، وَيُدَبِّرَ أَمْرًا هُوَ مُنَفِّذُهُ، إِنَّهُ يُرِيْدُ أَنْ يُّحَوِّلَ الرِّيْفَ إِلَى الْفَلَاةِ، وَالْآجَامَ فِي الْغِيْطَانِ (اَلْآجَامُ جَمْعُ أُجُمٍ بِمَعْنٰى حِصْنٍ وَالْآجَمَةُ: اَلشَّجَرُ الْمُلْتَفُّ) وَالْأَنْهَارَ فِي الصَّحَارِيْ، وَالنِّعْمَةَ فِي الْفُقَرَاءِ، وَالْمُلْكَ فِي الرُّعَاةِ، وَيُرِيْدُ أَنْ يَّبْعَثَ أُمِّيًّا مِنَ الْأُمِّيِّيْنَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ وَلَا صَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ، لَوْ يَمُرُّ عَلَى السِّرَاجِ لَمْ يُطْفِئْهُ مِنْ سَكِيْنَتِهِ، وَلَمْ يَمْشِيْ عَلَى الْقَصَبِ الْيَابِسِ لَمْ يُسْمَعْ مِنْ تَحْتِ قَدَمَيْهِ، أَبْعَثُهُ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا'' (حاشیہ ابن کثیر پر مصحح مصر نے لکھا ہے۔ قوله: أبعثه الخ كذا بالنسخ و حرر انتهى. اس میں ان کو یہ شبہ ہوا کہ اول ضمائر غائب ہیں تو یہ ضمائر متکلم کیوں کر آ گئیں؟ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ ساری تقریر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری کی ہے۔ پہلے کی تقریر بطور غائب ہے اور یہاں سے آخر تک بصیغۂ متکلم گویا اول بیان بصیغۂ متکلم ہے، پھر متکلم سے غائب کی طرف التفات کیا، پھر غائب سے متکلم کی طرف، والله أعلم) لَا يَقُوْلُ الْخَنَا، أَفْتَحُ بِهِ أَعْيُنًا عُمْيًا، وَآذَانًا صُمًّا، وَقُلُوْبًا غُلْفًا، وَأُسَدِّدُهُ بِكُلِّ أَمْرٍ جَمِيْلٍ، وَأَهَبُ لَهُ كُلَّ خُلُقٍ كَرِيْمٍ، وَأَجْعَلُ السَّكِيْنَةَ لِبَاسَهُ، وَالْبِرَّ شِعَارَهُ، وَالتَّقْوٰى ضَمِيْرَهُ، وَالْحِكْمَةَ مَنْطِقَهُ، وَالصِّدْقَ وَالْوَفَاءَ طَبِيْعَتَهُ، وَالْعَفْوَ وَالْمَعْرُوْفَ خُلُقَهُ، وَالْحَقَّ شَرِيْعَتَهُ، وَالْعَدْلَ سِيْرَتَهُ، وَالْهُدٰى إِمَامَهُ، وَالْإِسْلَامَ مِلَّتَهُ، وَأَحْمَدَ اسْمَهُ، أَهْدِيْ بِهِ بَعْدَ الضَّلَالَةِ، وَأُعَلِّمُ بِهِ مِنَ الْجَهَالَةِ، وَأَرْفَعُ بِهِ بَعْدَ الْخَمَالَةِ، وَأُعَرِّفُ بِهِ النَّكِرَةَ، وَأُكَثِّرُ بِهِ بَعْدَ الْقِلَّةِ، وَأُغْنِيْ بِهِ بَعْدَ الْعَيْلَةِ، وَأَجْمَعُ بِهِ بَعْدَ الْفُرْقَةِ، وَأُؤَلِّفُ بِهِ بَيْنَ أُمَمٍ مُّتَفَرِّقَةٍ، وَقُلُوْبٍ مُّخْتَلِفَةٍ، وَأَهْوَاءٍ مُّتَشَتِّتَةٍ، وَأَسْتَنْقِذُ بِهِ فِئَامًا مِنَ النَّاسِ عَظِيْمًا مِنَ الْهَلَكَةِ، وَأَجْعَلُ أُمَّتَهُ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ، وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، مُوَحِّدِيْنَ مُؤْمِنِيْنَ مُخْلِصِيْنَ، مُصَدِّقِيْنَ، بِمَا جَاءَتْ بِهِ رُسُلِيْ''[1] (رواه ابن أبي حاتم)

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٢٦) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٩٧۔ ٣٩٨)

یعنی تو کھڑا ہو بنی اسرائیل میں، میں ابھی تیری زبان کو وحی سے بلواؤں گا، پھر وہ نبی کھڑے ہوئے تو کہا: اے آسمان! تو سن اور اے زمین! تو چپ رہ، اس لیے کہ بے شک اللہ ارادہ کرتا ہے کہ ایک کام جاری کرے اور ایک امر کی تدبیر فرمائے اور وہ اس کا نافذ اور جاری کرنے والا ہے۔ بے شک وہ ارادہ کرتا ہے کہ کھیتی کی زمین کو بیابان کی طرف منتقل کرے اور نیستانوں کو پست زمینوں اور گڑھوں میں اور نہروں کو جنگلوں میں اور نعمت کو فقیروں میں منتقل کرے اور ملک کو یعنی سلطنت کو چرواہوں میں اور ارادہ کرتا ہے کہ اُمیوں میں سے ایک اُمی کو معبوث کرے جو درشت خو نہیں ہے، نہ سخت گو ہے، نہ بازاروں میں چیخنے چلانے والا ہے، اگر چراغ پر گزرے تو اس کو بجھا نہ دے اپنی آہستگی کی وجہ سے اور اگر سوکھی زمین پر چلے تو اپنے قدموں کی آواز نہ سنائے، بھیجوں گا میں اس کو خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا، وہ بے ہودہ بات نہیں کرے گا۔

اس سے اندھی آنکھوں کو کھولے گا اور بہرے کانوں اور بند دلوں کو، اور میں اس کو مسدَّد (اچھی گفتار والا) کروں گا ہر اچھے کام کے ساتھ، یعنی کردار و گفتار میں اس کو درستی اور راستی کی توفیق دوں گا اور خلق کریم اس کو بخشوں گا، یعنی ہر شریف خصلت اس کو عطا کروں گا اور سکینہ و آہستگی کو اس کا لباس کروں گا اور بر و نیکی کو اس کا شعار اور تقویٰ کو اس کا ضمیر، یعنی اس کے دل کی چھپی ہوئی شے اللہ کا ڈر ہوگا اور حکمت اس کی بات ہوگی، یعنی جو بات وہ کرے گا سراپائے حکمت وعقل وعلم کی بات ہوگی اور صدق و وفا کو اس کی طبیعت کروں گا، یعنی وہ بات کرنے میں سچا ہوگا اور دوستی اور وعدے کو پورا کرنے والا ہوگا اور عفو و معروف کو اس کا خلق ٹھہراؤں گا، یعنی وہ جرم سے درگزر کرنے والا اور نیکی کرنے والا ہوگا اور حق کو اس کی شریعت اور عدل کو اس کی سیرت اور ہدایت کو اس کا امام و پیشوا اور اسلام کو اس کی ملت قرار دوں گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔

اس کے سبب سے گمراہی کے بعد ہدایت کروں گا اور جہالت کے بعد اس کے سبب سے علم عام کروں گا اور گمنامی کے بعد اس سے نام بلند کروں گا اور ناشناسائی کے بعد اس کے سبب سے شناسائی کروں گا اور قلت کے بعد کثرت کروں گا اور اس کے سبب سے مفلسی کے بعد غنی کروں گا اور اس کی وجہ سے فرقوں کو جمع اور متحد کروں گا اور اس کی وجہ سے مختلف اُمتوں میں اُلفت پیدا کروں گا اور مختلف دلوں اور متفرق خواہشوں میں بھی اُلفت پیدا کروں گا اور اس کے سبب سے لوگوں کے بڑے گروہوں کو ہلاکت سے چھڑواؤں گا اور اس کی اُمت کو ایسی بہترین اُمت بناؤں گا جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، وہ نیک بات کا حکم کریں گے اور بری باتوں سے منع کریں گے، موحد ہوں گے، یعنی اللہ کو وحدہ لاشریک لہ ماننے والے مومن مخلص ہوں گے۔ جن چیزوں کو میرے پیغمبر لے کر آئے ہیں، ان کی تصدیق کریں گے، یعنی ان کو سچا جانیں گے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع فصاحتِ عنوان یہ ہے کہ ﴿ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ﴾ منصوب ہے اس بنا پر کہ فعل محذوف کا مصدر موکد ہے جو اس کا ناصب ہے، یعنی اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں اور اپنی قسموں میں خوب کوشش کرتے ہیں۔ ﴿ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جتنی ان کو قسمیں کھانے کی قدرت و طاقت ہے، اتنی قسمیں کھاتے ہیں، یہ معنی اس محاورے سے ماخوذ ہیں کہ "جَهَدَ نَفْسَهٗ"۔ یہ اس وقت بولتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کام میں طاقتِ نفس کو پہنچے اور اپنے پرلے سرے کی طاقت وقوت کو خرچ کر دے، پوری سعی و کوشش بجا لائے۔ کسی نے کہا ہے کہ منصوب ہے بنا بر حال، تقدیر یہ ہے کہ "مُجْتَهِدِيْنَ فِيْ أَيْمَانِهِمْ"، یعنی انھوں نے قسمیں کھائیں، اس حال میں کہ اپنی قسموں میں کوشش کرنے والے ہیں، جس طرح کہ یوں بولتے ہیں: "اِفْعَلْ ذٰلِكَ جَهْدَكَ وَطَاقَتَكَ"، یعنی تو اس کام کو اپنی پوری قوت و طاقت سے کر۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے دونوں وجھوں کو ملا کر ایک کر دیا ہے۔[1] کسی نے کہا: "جَهْدَ الْيَمِيْنَ" کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کی قسم کھائے اور اس پر کچھ زیادہ نہ کرے۔ جملہ ﴿ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ ﴾ قسم ہے اور ﴿ لَيَخْرُجُنَّ ﴾ قسم کا جواب ہے، یعنی قسم ہے اللہ کی! اگر تو اُن کو جہاد کی طرف نکلنے کا حکم دے تو البتہ وہ سب کچھ چھوڑ نکلیں اور چڑھائی کریں، چونکہ ان کی یہ بات جھوٹی تھی اور قسمیں ان کی جھوٹی تھیں اس لیے اللہ پاک نے زجر و توبیخ کر کے اُن پر یوں ردفرمایا کہ ﴿ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ﴾ یعنی جو تم طاقت وفرماں برداری کا اور غزوے کی طرف نکلنے کا زعم کرتے ہو، اگر تم کو اس کا حکم ہو تو تم اس بات پر قسم مت کھاؤ۔ اس جگہ کلام پورا ہو گیا۔

پھر ابتدا کر کے فرمایا: ﴿ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ﴾ یہ مرفوع ہے اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یعنی "طَاعَتُهُمْ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ" مطلب یہ ہے کہ ان کی طاعت طاعتِ معروف ہے، یعنی نفاقی طاعت ہے اعتقادی نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ طَاعَةٌ ﴾ مبتدا ہو اس لیے کہ صفت سے اس کو تخصیص حاصل ہو گئی ہے اور خبر مقدر ہو: "طَاعَةٌ مَعْرُوْفَةٌ أَوْلٰى بِكُمْ مِنْ أَيْمَانِكُمْ" یعنی طاعتِ معروف تم کو تمھاری قسموں سے زیادہ بہتر ہے۔ کسی نے کہا: فاعل ہے فعل محذوف کا: "أَيْ: لِتَكُنْ مِنْكُمْ طَاعَةٌ أَوْ لِتُوْجَدْ"، یعنی چاہیے کہ تم سے طاعت ہو، یا چاہیے کہ طاعت تم سے پائی جائے۔ اس وجہ میں ضعف ہے اس لیے کہ فعل کو حذف نہیں کرتے، مگر اس وقت کہ پہلے کوئی شے اس کی مشعر اور مخبر ہو۔ کسی نے کہا کہ معنی "أَمْرُكُمْ طَاعَةٌ"، ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے، بلکہ واسطی نے کہا ہے کہ اولیٰ یہی وجہ ہے، اس واسطے کہ خبر مقصود بالذات

---

[1] الکشاف (٣/ ٢٥٤۔ ٢٥٥)

اور جملے کا مفید حصہ ہوتی ہے، جملے کا اتار اسی پر ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر معنی یہ ہیں کہ امر تمھارا جو تم سے مطلوب ہے، وہ طاعتِ معروفہ معلومہ ہے کہ جس میں شک وشبہہ نہ کیا جائے۔ زید بن علی و یزیدی نے "طَاعَةً" بہ نصب پڑھا ہے اس بنا پر کہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ "أَيْ: أَطِيْعُوْا طَاعَةً"[1] یعنی تم اطاعت کرو اطاعت کرنا۔ جملہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ تعلیل ہے ماقبل کی کہ اُن کی طاعت طاعتِ نفاق ہے، یعنی تم جو عمل کرتے ہو اور زبان سے جو بولتے ہو، اس کے خلاف دل میں چھپاتے ہو اللہ پاک کو اس سب کی خبر ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ ان کو اللہ اور رسول کی طاعت کا حکم کریں، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ یعنی تم اللہ اور رسول کی اطاعت ظاہر و باطن، خلوصِ اعتقاد اور صحیح نیت سے کرو۔ دوبارہ جو ﴿ اَطِيْعُوا ﴾ فرمایا تو یہ وجوبِ اطاعت کی تاکید کے لیے ہے، کیوں کہ ﴿ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ﴾ حکم میں اطاعت کے امر میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تکرار تاکید کے لیے نہیں ہے، بلکہ دونوں جملے مختلف ہیں، پہلا تو نہی ہے بطور ردّ و توبیخ کے اور دوسرا حکم ہے بطریق تکلیف کے کہ اُن کو اطاعت کا مکلّف کیا اور طاعت کو ان پر واجب فرمایا۔ ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا ﴾ مامورین کو خطاب ہے۔ اصل اس کی "تَتَوَلَّوْا" ہے، ایک تا کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کے خطاب سے رجوع کر کے خود ان کو خطاب کیا، اس سے غرض ان کو امر کی تاکید کرنا ہے اور اُن کو اطاعت و فرماں برداری کی ہدایت کرنے میں مبالغے کے طور پر اہتمام کرنا ہے۔ شرط کا جواب ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ ﴾ ہے، یعنی نبی پر صرف اس چیز کا پہنچا دینا ہے جس کا ان کو حکم ہے اور وہ یہ کام کر چکے۔

﴿ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ﴾ اور تم پر اطاعت کرنا اور اُن کی دعوت کو قبول کرنا ہے، جس کا تم کو حکم ہے۔ یہ ان کے لیے وعید ہے۔ گویا اُن سے کہا کہ اگر تم نے منہ موڑا تو واقعی تم بڑا بھاری بوجھ اُٹھانے والے ہوئے، اس میں صنعتِ مشاکلت ہے۔ ﴿ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ﴾ اور اگر تم نے اس کا کہا مانا اس بات میں جس کا اس نے تم کو امر کیا اور جس بات سے نہی کی تو تم حق کی طرف راہ پاؤ گے اور خیر و بھلائی کی طرف راہ یاب ہو گے اور اجر و ثواب حاصل کرو گے۔ کسی نے کہا: جائز ہے کہ ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا ﴾ ماضی ہو اور واو ضمیر غائبین ٹھہرے اور یہ جملہ شرطیہ من جملہ اس بات کے ہے جس کا رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ اس کو کہیں۔ ان سے کلام میں التفات ہو خطاب سے غائب کی طرف، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور اس کا موید ﴿ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ﴾ کا صیغۂ خطاب ہے اور ﴿ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ﴾ کا صیغۂ خطاب ہے اور نیز اس کی مؤید بزّی کی قراءت ہے "فَاِنْ تَّوَلَّوْا" بہ تشدیدِ تا اگرچہ ضعیف ہے، اس سبب سے کہ اس میں دو ساکن کے درمیان جمع ہے۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٦٣)

امام مسلم و ترمذی رحمہ اللہ وغیرہما نے علقمہ بن وائل حضرمی عن ابیہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قدوم کیا تو کہا: آپ مجھے خبر دیں کہ اگر ہم پر ایسے امیر ہوں کہ ہم سے اپنا حق لیں اور ہم کو ہمارا حق نہ دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ﴾ [1] ''جو ذمے داری ان پر ڈالی گئی اس کا بوجھ ان پر ہے اور جو تم پر ڈالی گئی اس کا بوجھ تم پر ہے۔'' سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کسی نے ان سے پوچھا کہ اگر مجھ پر کوئی فاجر امام ہو، پھر میں اس کے ساتھ اہلِ ضلالت سے ملوں تو کیا میں لڑوں یا نہیں؟ تو فرمایا کہ تو اہلِ ضلالت کو جہاں کہیں پائے ان سے لڑ، امام کے ذمے ہے جو اُس پر بوجھ رکھا گیا اور تمھارے ذمے ہے وہ بوجھ جو تم پر ڈالا گیا۔[2]

جملہ ﴿ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ مقرر ہے اپنے ماقبل کا۔ ﴿ اَلرَّسُوْلِ ﴾ میں الف لام یا تو عہدی ہے، چنانچہ رسول سے مراد ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ یا جنسی ہے تو مراد ہر رسول ہوگا۔ بلاغِ مبین کے معنی تبلیغِ واضح ہیں، یعنی کھلا ہوا پہنچانا یا تبلیغِ موضح، یعنی ایسا پہنچانا جو وضاحت کرنے والا ہو۔ معنی یہ ہیں کہ رسول کے ذمے جو کچھ تھا وہ اس کو پہنچا کر ادا کر چکا، اب تم بھی اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو، جو تمھارے ذمے واجب ہے۔[3]

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی، اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین محکم و پائیدار کر دے گا جو اس نے ان کے لیے چنا، اور یقیناً ان کی حالتِ خوف کو بدل کر وہ ضرور انھیں امن دے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں (55)

اللہ تعالیٰ کا ایمان والوں کو حکومت دینے کا وعدہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے لوگوں کو خطاب کیا کہ جو اُن میں نیک ہیں، بعد میں اُن کو حکومت دے گا اور جو

---

(1) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٤٦) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢١٩٩) (2) تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٢٥_ ٢٦٢٦)
(3) فتح البیان (٩/ ٢٥٢_ ٢٥٤)

دین پسند ہے، وہ اُن کے ہاتھ سے قائم کرے گا اور وہ بغیر شرک بندگی کریں گے۔ یہ چاروں خلیفوں سے ہوا پہلے خلیفوں سے اور زیادہ۔ پھر جو کوئی اس نعمت کی ناشکری کرے ان کو فاسق فرمایا، جو کوئی اُن کی خلافت سے منکر ہوا، اس کا حال سمجھا گیا۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے اپنے رسولِ کریم رؤف رحیم ﷺ کو اس بات کا وعدہ ہے کہ عن قریب اُن کی اُمت کو زمین کے خلفاء کر دے گا، یعنی ان کو لوگوں کا امام بنائے گا، ان کو ان پر والی اور حاکم بنا دے گا۔ شہر اُن سے صحیح اور درست ہوں گے۔ اللہ کے بندے اُن کے واسطے فروتنی کریں گے اور اس کے بعد کہ وہ لوگوں سے ڈرتے تھے، ان کے عوض میں ان کو امن دے گا اور اُن میں حکومت عطا کرے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حسبِ وعدہ یہ کام کر دیا۔ وله الحمد والمنة.

فتوحاتِ نبویہ:

نبی اکرم ﷺ نے اس عالم سے انتقال نہیں فرمایا، یہاں تک کہ اللہ پاک نے مکہ مکرمہ، خیبر، بحرین اور تمام جزیرہ ہائے عرب اور یمن کی پوری سرزمین کو آپ ﷺ پر مفتوح کر دیا اور آپ ﷺ نے مجوسِ ہجر اور بعض اطرافِ شام سے جزیہ لیا۔ ہرقل بادشاہِ روم اور مصر اور اسکندریہ کے حکمران یعنی مقوقس اور عمان کے بادشاہ اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی، جو اصحمہ کے بعد بادشاہ ہوا، رحمه الله و أكرمه، ان سب نے آپ کو تحائف بھیجے۔

خلفائے راشدین کے دور میں مشارق و مغارب تک اسلامی حکومت:

پھر جب اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کو اس دارِ فانی سے وفات دی اور جو عزت و تکریم اپنے پاس ہے، اسے آپ ﷺ کے لیے پسند فرمایا تو آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلیفہ ابوبکر رضی اللہ عنہ خلافت پر قائم ہوئے، پس آپ ﷺ کی وفات کے بعد جو شے ضعیف اور کمزور ہوگئی تھی، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کے تفرق کو اجتماع بخشا اور جزیرۂ عرب کو لے لیا اور اس کا نظم و نسق فرمایا۔ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ اسلام کے لشکر بلادِ فارس کی طرف روانہ کیے تو انھوں نے اس کا ایک کنارہ فتح کیا اور اس کے لوگوں میں سے ایک خلق کو قتل کر ڈالا۔ ایک اور لشکر سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ اور جو امرا اُن کے تابع تھے ان کے ہمراہ سرزمینِ شام کی طرف روانہ فرمایا۔ تیسرا لشکر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ہمراہ بلادِ مصر کی طرف بھیجا تو اللہ پاک نے لشکرِ شامی کے ہاتھوں اُن کے وقت میں بصرہ اور دمشق کو فتح کر دیا اور اُن دونوں کے اردگرد کے گاؤں اور قصبے جو بلادِ حوران کے تھے، ان کو بھی فتح کر دیا۔

پھر اللہ عزوجل نے ان کو وفات دی اور اُن کے لیے وہ عزت و تکریم پسند کی جو اس کے پاس ہے۔ اللہ پاک نے اہلِ اسلام پر یہ احسان کیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو الہام کیا کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ کریں تو اُن کے بعد وہ

پورے طور پر خلافت پر ایسے قائم ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد فلکِ دوّار نے ان جیسا عادل، باکمال اور با سیرت و کردار شخص نہیں دیکھا۔ اُن کے زمانے میں بلادِ شامیہ پورے کے پورے فتح ہوگئے اور سارے بلادِ مصر اور اقلیمِ فارس کی اکثریت مفتوح ہوگئی اور کسریٰ کو توڑ پھوڑ ڈالا اور اس کو انتہائی ذلیل وخوار کیا کہ وہ اپنی مملکت کے پرلے سرے کی طرف لوٹ گیا۔ قیصر کو مقصور و عاجز کیا اور بلادِ شام سے اس کا قبضہ کھینچ لیا اور وہ قسطنطنیہ کی طرف اتر گیا اور اس کے اموال کو اللہ پاک کی راہ میں خرچ کیا، جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے خبر دی تھی اور اس کا وعدہ فرمایا تھا۔ صلی الله عليه وسلم عليه من ربه أتم سلام و أزكى صلاة۔

پھر جب دولتِ عثمانیہ ہوئی تو ممالکِ اسلامیہ مشرق اور مغرب کے آخری حصوں تک دراز ہوئے۔ چنانچہ بلادِ مغرب مفتوح ہوئے، وہاں کے پرلے سرے تک اندلس و قبرص و بلادِ قیروان و بلادِ سبتہ، جو بحرِ محیط سے متصل ہیں، اور مشرقی کنارے سے بلادِ چین تک قبضے میں آئے اور کسریٰ مارا گیا اور اس کا ملک بالکل ہلاک ہوا۔ عراق اور خراسان و اہواز کے شہر فتح ہوئے اور ترک سے مسلمانوں نے ایک بڑی لڑائی کی اور اللہ نے اُن کے ملکِ اعظم خاقان کو ذلیل وخوار کیا۔ مشارق و مغارب سے بارگاہِ عالی جاہ امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی طرف خراج لایا گیا۔ انھوں نے جو قرآنِ پاک کی تلاوت و دراست کی اور امت کو فرقانِ مجید پر جمع کیا، یہ سب اسی کی برکت سے ظہور میں آیا اور اسی لیے صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اللہ پاک نے میرے لیے زمین کو جمع کر دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا اور عن قریب میری امت کا ملک اس زمین تک پہنچے گا جو میرے لیے جمع کی گئی ہے۔[1] پس سنتے ہو! ہم اس شے میں لوٹ پوٹ رہے ہیں جس کا ہم سے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے وعدہ فرمایا ہے اور سچ کہا اللہ نے اور اس کے رسول نے صلى الله عليه وعلىٰ آله وصحبه وبارك وسلم إلى يوم الدين، فنسأل الله سبحانه الإيمان به وبرسوله والقيام بشكره على الوجه الذي يرضيه عنا ۔

خدا بن مانگے کیا کیا نعمتیں دیتا ہے بندوں کو — ترا دستِ دعا ضامن ہے جب سے کل کے مقصد کا
بٹیں گے جس گھڑی سامانِ عشرت بزمِ جنت میں — کھلے گا حال اُمت پر ترے انعامِ بے حد کا

امام مسلم بن حجاج رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا ہے، آپ ﷺ فرماتے تھے لوگوں کا امر ہمیشہ جاری، یعنی چلتا ہوا رہے گا، جب تک کہ بارہ مرد والی ہوں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک کلمہ فرمایا کہ وہ مجھ سے مخفی رہا تو میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا؟ تو میرے والد نے کہا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «كُلُّهُمْ مِّنْ قُرَيْشٍ» ''یعنی وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے۔''[2] (ورواه البخاري من حديث شعبة عن عبد المالك بن عمير به)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢١)

صحیح مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ نے عشیہ رجم ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ میں یہ حدیث بیان فرمائی اور اس کے ساتھ اور حدیثیں ذکر کیں۔[1] (عِشیہ: یعنی دن کا پچھلا پہر۔) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ بارہ خلفائے عادل کا ہونا لازمی ہے اور یہ لوگ شیعہ کے بارہ امام نہیں ہیں، کیوں کہ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ ان کے لیے امر سے، یعنی خلافت سے کوئی شے نہیں ہوئی۔

رہے یہ لوگ جن کا حدیث شریف میں ذکر ہے تو یہ قریش سے ہوں گے، والی ہوں گے اور عدل کریں گے، ان کی بشارت پہلی کتابوں میں آئی ہے۔ پھر یہ شرط نہیں ہے کہ وہ پے در پے ہوں، بلکہ ان کا وجود اُمت میں ہوگا پے درپے اور متفرق، ان میں سے چار خلیفہ تو یکے بعد دیگرے پائے گئے، یعنی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ، پھر عثمان رضی اللہ عنہ، پھر علی رضی اللہ عنہ، پھر ان کے بعد فترت واقع ہوئی، پھر اُن میں سے وجود میں آیا، جس کو اللہ نے چاہا، پھر جو اُن میں سے باقی رہا ہے، وہ اس وقت میں پایا جائے گا جس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اُن میں سے مہدی ہیں، جن کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے مطابق ہے اور اُن کی کنیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت کے مطابق ہے، وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے، جس طرح کہ وہ جور وظلم کے ساتھ بھر گئی ہو گی۔ امام احمد، ابو داود، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ نے حدیث سعید بن جمہان سے عن سفینہ مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میرے بعد خلافت تیس برس ہے، پھر ملک عضوض ہو گی۔[2] (عضوض بروزن فعول بفتح اول عضّ سے ماخوذ ہے، عضّ کسی شے کو دانتوں سے پکڑنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سلطنت میں رعیت پر جور وظلم ہوگا، گویا اس میں دانتوں سے کاٹیں گے، جبر واستبداد اور تغلب ہوگا۔)

ربیع بن انس نے ابو العالیہ سے ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب تقریباً دس برس تک مکہ مکرمہ میں رہے، اللہ وحدہ کی طرف دعوت دیتے اور اسی وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی طرف پوشیدہ طور پر بلاتے تھے اور وہ خائف تھے، لڑائی کرنے کا حکم نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ اس مدت کے بعد ان کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ہوا تو مدینے میں آئے۔

پھر اللہ پاک نے ان کو جنگ کرنے کا حکم فرمایا تو وہ مدینے میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے، شام ہتھیاروں میں کرتے اور صبح بھی ہتھیاروں میں کرتے۔ چنانچہ وہ اس حال میں رہے، جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم ہمیشہ اسی طرح ڈرتے رہیں گے۔ کیا ہم پر کوئی ایسا دن

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢٢)

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٢٠) سنن أبي داود (٤٦٤٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٢٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٤٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٩٩)

نہ آئے گا جس میں ہم بے خوف ہوں اور ہتھیار رکھ دیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم ہرگز صبر نہ کرو گے، مگر تھوڑا (ابن کثیر میں "لن تصبروا" ہے اور فتح القدیر و فتح البیان میں "لن تغبروا" ہے، یعنی تم ہرگز باقی نہ رہو گے، بہتر یہی ہے، واللہ أعلم) یہاں تک کہ تم میں سے ایک مرد بڑے مجمع میں گوٹ مار کر بیٹھے گا، اس میں کوئی لوہے کی شے نہ ہوگی (ابن کثیر میں "فیہ" اور فتح القدیر اور فتح البیان میں "فیھم" ہے، ٹھیک یہی معلوم ہوتا ہے، واللہ أعلم) اور اللہ پاک نے یہ آیت نازل کی۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نبی ﷺ کو جزیرۂ عرب پر غالب کیا تو وہ امن میں ہوگئے اور ہتھیار رکھ دیے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے نبی ﷺ کی روح قبض فرمائی تو لوگ اسی طرح بے خوف رہے سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی امارت میں یہاں تک کہ وہ ان فتنوں میں واقع ہوئے جن میں واقع ہوئے تو اُن پر خوف داخل کیا گیا، (فتح البیان اور فتح القدیر میں ہے: "وکفروا النعمة فأدخل الله علیهم الخوف الذي کان رفع عنهم) پس انھوں نے حجرہ و شرط رکھے، (یعنی پہرہ چوکی کے لوگ حفاظت اور نگاہ بانی کرنے والے) انھوں نے تغیر کیا تو اُن کے ساتھ بھی تغیر کیا گیا۔[1]

بعض سلف نے کہا ہے کہ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت اللہ تعالیٰ کی کتاب میں حق ہے، پھر یہ آیت پڑھی۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی اور ہم سخت خوف میں تھے[2] اور یہ آیتِ کریمہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٢٦] "اور یاد کرو جب تم بہت تھوڑے تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، تم اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں اچک (نہ) لے جائیں تو اللہ نے تمھیں ٹھکانا دیا، اور اپنی نصرت کے ساتھ تمھاری تائید کی، اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، تاکہ تم (اس کا) شکر کرو۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ ایسا ہے جیسا کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے نقل فرمایا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا: ﴿ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٩] "امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمھیں زمین میں جانشین بنا دے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔" نیز جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴾ [القصص: ٥۔ ٦] "اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٢٩) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٩٩) فتح القدیر (٤/ ٦٧) فتح البیان (٩/ ٢٥٦)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٢٨)

زمین میں ضعیف جان (کر دبا) لیا گیا تھا اور انھیں پیشوا بنائیں اور انھیں (ملکِ مصر کے) وارث بنائیں۔ اور (یہ کہ) ہم انھیں زمین (شام وفلسطین) میں اقتدار بخشیں اور ہم فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکروں کو ان (کمزور لوگوں کے ہاتھوں) سے وہ چیز دکھائیں، جس سے وہ ڈرتے تھے۔"

نیز فرمایا: ﴿ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ ﴾ (آیتِ باب) جس طرح کہ نبی اکرم ﷺ نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا، جب کہ وہ آپ کے پاس آئے: کیا تو حیرہ کو پہچانتا ہے؟ عرض کی: میں اس کو نہیں پہچانتا، لیکن میں نے اس کو سنا ہے۔ (حیرہ بالکسر کوفہ کے نزدیک ایک شہر ہے) فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اللہ تعالیٰ پورا کرے گا اس امر کو یہاں تک کہ زنانی سواری حیرہ سے نکلے گی، یہاں تک کہ بیت اللہ کا طواف کرے گی کسی کی پناہ کے بغیر اور البتہ کھولے جائیں گے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے، میں نے عرض کی کہ کسریٰ بن ہرمز کے خزانے؟ فرمایا: ہاں، کسریٰ بن ہرمز کے خزانے اور البتہ خرچ کیا جائے گا مال یہاں تک کہ اس کو کوئی قبول نہ کرے گا۔

سیدنا عدی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پس یہ زنانی سواری حیرہ سے نکلتی ہے۔ پھر بغیر کسی کی پناہ کے بیت اللہ کا طواف کرتی ہے، اور البتہ میں ان لوگوں میں مقرر تھا جنھوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانوں کو کھولا، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ پوری ہوگی تیسری بات بھی، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ اس کو فرما چکے ہیں۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بشارت دی اس امت کو سنا، رفعت، دین، نصر اور زمین میں تمکین کی، (یعنی میری امت کو خوش خبری سناؤ، اللہ کے نزدیک بلند درجات اور قدر و منزلت اور تمکین کی، یعنی زمین میں جم جانے کی اور حکومت کی۔) پس جو کوئی اُن میں سے آخرت کا عمل کرے دنیا کے واسطے تو اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ﴾ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے ان کو حدیث بیان کی، کہا: اس دوران کہ میں رسول اللہ کے پیچھے گدھے پر سوار تھا اور میرے اور آپ ﷺ کے درمیان صرف پالان کی لکڑی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! میں نے عرض کی: "لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ" یعنی میں آپ کی مدد کے لیے حاضر اور مستعد ہوں۔ کہا: پھر گھڑی بھر چلے، پھر فرمایا: اے معاذ بن جبل! میں نے عرض کی: "لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ" فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا: اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں۔ پھر گھڑی بھر چلے، پھر فرمایا: اے معاذ بن جبل! میں نے عرض کی: "لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ" فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ اللہ پر بندوں کا کیا حق ہے، جبکہ وہ ایسا کریں؟ میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٠٠) [2] مسند أحمد (٥/ ١٣٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٢٥)

نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: پس بے شک بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب نہ کرے۔[1] (أخرجاه في الصحيحين من حديث قتادة)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر جو کوئی میری اطاعت سے نکل گیا اس کے بعد تو یقیناً وہ اپنے رب کے امر سے نکل گیا اور یہ بڑا گناہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جبکہ سب لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو قائم کرنے والے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور سب سے بڑھ کر اللہ پاک کے مطیع اور فرماں بردار تھے تو اُن کی نصرت و مدد اُن کے موافق تھی۔ انھوں نے اللہ کے کلمے کو زمین کے مشارق و مغارب میں ظاہر اور غالب کیا اور اللہ کا بول بالا فرمایا، اللہ نے اُن کی بڑی تائید فرمائی، سارے بندوں اور ملکوں میں انھوں نے حکومت کی، جبکہ اُن کے بعد لوگوں نے بعض معاملات میں تقصیر کی (کمی کی) قصور وفتور کا برتاؤ کیا تو اُن کا ظہور اور غلبہ اس کمی کے موافق کم ہوگیا۔ لیکن صحیحین میں چند وجوہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کے ساتھ غالب رہے گا، ان کو وہ شخص کچھ ضرر نہ پہنچا سکے گا جو ان کو مخذول کرے گا اور نہ ہی وہ شخص جو اُن کی مخالفت کرے گا قیامت کے دن تک۔ ایک روایت میں اس طرح ہے: یہاں تک کہ آ جائے گا اللہ کا امر اور وہ اسی طرح ہوں گے۔[2] ایک روایت میں یہ ہے، یہاں تک کہ وہ لڑیں گے دجال سے۔[3] ایک روایت میں یوں ہے: یہاں تک کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نازل ہوں گے اور وہ غالب ہوں گے۔[4] یہ سب روایتیں صحیح ہیں۔ ان کے درمیان میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے۔[5]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ مِنْكُمْ ﴾ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان مومنین کو خطاب ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں۔ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ بیان کا ہے۔ کسی نے کہا: تبعیض کا۔ ماقبل میں یہ ذکر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ان کی ہدایت کا سبب ہے، سو جملۂ ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ ﴾ اس کی تقریر کرتا ہے اور یہ اللہ پاک کی طرف سے اُن لوگوں کے لیے وعدہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کیے، اس بات کا کہ ان کو حاکم بنائے گا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾ حرفِ لام قسم محذوف کا یا وعدے کا جواب ہے، وعدہ کو قائم مقام قسم کے اس لیے کیا کہ وہ ضرور ہی پورا ہونے والا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک ان کو زمین میں کفار کے بدلے خلیفہ بنا دے گا، وہ اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠) مسند أحمد (٥/ ٢٤٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠ـ ١٩٢١)

[3] مسند أحمد (٤/ ٤٣٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٨٤)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦) مسند أبي يعلىٰ (٤/ ٥٩)

[5] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٩٨ـ ٤٠٠)

میں ایسا تصرف کریں گے، جیسا بادشاہ اپنے مملوکات میں کرتے ہیں۔ یہ وعدہ ساری اُمت کو عام طور پر شامل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وعدہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص ہے، یہ قول بلاوجہ ہے، اس لیے کہ ایمان اور عملِ صالحات کچھ صحابہ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ اس کا وقوع اس امت کے ہر فرد سے ممکن ہے اور جس کسی نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ پر عمل کیا تو یقیناً اس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی اور جس کسی نے یہ کہا ہے کہ آیت خلفائے اربعہ کے ساتھ، یا مہاجرین کے ساتھ خاص ہے، یا ارض سے مکہ مکرمہ کی زمین مراد ہے تو وہ بہت دور جا پڑا۔ تم خوب جان چکے ہو کہ اعتبار عمومِ لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔

امام ابن العربی نے کہا ہے کہ مراد عرب وعجم کے علاقے ہیں۔ صحیح قول یہی ہے، اس لیے کہ مکہ مکرمہ کی زمین مہاجرین کے لیے محرم تھی۔[1] دیکھو حدیث شریف میں یہ وارد ہوا ہے: «لَكِنِ الْبَائِسُ سَعْدُ بْنُ خَوْلَةَ يَرْثِي لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ تُوُفِّيَ بِمَكَّةَ»[2] ''یعنی رسول اللہ ﷺ سعد کے واسطے حزن فرماتے تھے، اس وجہ سے کہ انھوں نے مکے میں وفات پائی۔'' (بائس وہ ہے جس کو بؤس پہنچا ہو، یعنی ضرر۔ یہ کلمہ مذمت اور ترحم دونوں کے لیے آتا ہے۔ کسی نے کہا کہ سعد نے مکے سے ہجرت نہیں کی، یہاں تک کہ اسی میں مرے تو یہ مذمت ہے۔ اکثر کا قول ہے کہ ہجرت کی اور مکے میں حجۃ الوداع میں مرے اس بنا پر یہ کلمہ ترحم کا ہے۔ ''يَرْثِيْ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ...الخ'' یعنی آپ اس لیے رقت وترحم فرماتے تھے کہ جس زمین سے ہجرت کی، اسی میں مرے اور وہ وہاں کے مرنے کو مکروہ جانتے تھے، پس ان کی تمنا پوری نہ ہوئی، كذا في مجمع البحار) اور یہ بھی صحیح میں فرمایا ہے کہ مہاجر اپنے ارکانِ حج ادا کرنے کے بعد مکہ میں تین دن رہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ کا ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کو اللہ پاک نے اپنی زمین میں خلیفہ بنایا۔ چنانچہ یہ بنی اسرائیل کے ساتھ خاص نہیں ہے، نہ ہی گذشتہ اُمتوں میں سے کسی اُمت کے ساتھ خاص ہے نہ اور کوئی۔ جمہور نے ﴿ اِسْتَخْلَفَ ﴾ بفتحِ تائے فوقیہ بصیغۂ معروف پڑھا ہے۔ عیسیٰ بن عمر وابوبکر ومفضل نے عاصم سے بضمِ تا بصیغۂ مجہول پڑھا ہے۔[4] کاف کا محل نصب ہے مصدریت کی بنا پر، یعنی ''استخلافا كما استخلف.'' جملہ ﴿ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ ﴾ معطوف ہے ﴿ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ ﴾ پر، اس کے حکم کے تحت میں داخل ہے، من جملہ جوابِ قسم ہے۔ اس جگہ تمکین سے مراد تثبیت وتقریر ہے، یعنی اللہ پاک ان کے دین کو ثابت ومقرر کرے گا اور شہروں میں ان کے لیے وسعت اور فراخی دے گا تو وہ ان کے مالک ہوں گے اور ان کے دین کو سب دینوں پر غالب وقاہر کر دے گا۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٩٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٨)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٢) [4] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٩٩_ ٣٠٠)

یہاں دین سے مراد دینِ اسلام ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ﴾ [المائدة: ٣] ''اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔'' اللہ پاک نے جو پہلے اُن کے خلیفہ کرنے کا ذکر کیا، وہ یہی ان کا بادشاہ کرنا ہے اور ثانیاً تمکین کا ذکر فرمایا، چنانچہ اس نے اس بات کا فائدہ دیا کہ یہ ملک عروض وطرُوّ کے طور پر نہیں ہے، بلکہ بطریقِ استقرار وثبوت ہے اس طریقے سے کہ اُن کے لیے اور اُن کے بعد اُن کی اولاد کے لیے ہوگا۔ جملہ ﴿ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ﴾ ما قبل جملہ پر معطوف ہے۔ ابن کثیر، ابن محیصن، یعقوب اور ابوبکر نے بہ تخفیف پڑھا ہے ''أَبْدَلَ'' سے۔ یہی قراءت امام حسن رحمہ اللہ کی ہے، اسی کو امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، باقی قراء کی قراءت بہ تشدید ہے ''بَدَّلَ'' سے۔ ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کو پسند کیا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں، لیکن بنا کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے تو اس بنیاد پر تخفیف کی نسبت تشدید کی قراءت زیادہ رائج ہوگی۔ (لیکن محققین کے نزدیک ایسے امور مرجح قراءت نہیں ہوتے۔ از مصحح سلمہ)

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احمد بن یحییٰ ثعلب کا زعم یہ ہے کہ دونوں کے درمیان فرق ہے اور ''بَدَّلْتُهُ'' کو ''غَيَّرْتُهُ'' کے معنی میں کہتے ہیں، یعنی کسی شے کی تبدیلی اس کی تغییر کو بولتے ہیں اور ''أَبْدَلْتُهُ'' کے معنی ''أَزَلْتُهُ'' ہیں، یعنی ابدال کسی شے کے زائل کرنے کو کہتے ہیں اور اس شے کے بجائے دوسری شے کو اس کی جگہ پر رکھنے کو کہتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول صحیح ہے،[1] معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک دشمن کے اس خوف کے بجائے، جس میں وہ تھے اُن کے لیے امن اور بے خوفی کر دے گا۔ اور جس خوف میں وہ تھے، اس کے اسباب کو اُن سے اس طرح دور کر دے گا کہ وہ صرف اللہ پاک ہی سے ڈریں گے اور اس کے غیر سے کوئی اُمید نہ رکھیں گے۔ مسلمان لوگ ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد کچھ مدت تک مشرکوں سے سخت خوف میں مبتلا تھے، بغیر ہتھیاروں کے باہر نہ نکلتے تھے اور شام اور صبح انھیں اس بات کا خدشہ ہوتا تھا کہ کافروں کی طرف سے انھیں کوئی ضرر پہنچے۔ پھر وہ انتہائی درجے کے امن اور راحت میں ہوگئے۔ اللہ پاک نے شیاطین مشرکین کو اُن کے لیے ذلیل اور مطیع کر دیا اور شہر اُن کے لیے مفتوح فرما دیے، ان کے لیے زمین ہموار اور درست کر دی اور اُن کے سب کام درست کر دیے اور اُن کو قدرت اور غلبہ واختیار دے دیا۔ اُن کو اچھی طرح سے زمین میں جما دیا۔ فللّٰه الحمد والمنة.

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف لائے اور انصار نے ان کو ٹھکانا دیا تو عرب نے ایک کمان سے ان کو مارا، یعنی سب کے سب ان کی ایذا دہی پر متفق ہوگئے۔ چنانچہ وہ رات بھی ہتھیاروں میں بسر کرتے تھے اور صبح بھی ہتھیاروں میں رہتے تھے۔ مطلب یہ کہ دشمنوں کے خوف سے رات دن

[1] فتح القدير (٤/ ٦٤۔ ٦٥)

ہتھیار لگا کر مستعد رہتے تھے۔ پھر کہا (یعنی صحابہ نے): کیا تم دیکھتے ہو کہ ہم زیست کریں، یہاں تک کہ بے خوف اور مطمئن ہو کر رات بسر کریں، سوائے اللہ کے کسی سے نہ ڈریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

اللہ پاک نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اور اُن کو جزیرۂ عرب پر غالب کر دیا اور انھوں نے دور ترین بلادِ مشرق و مغرب کو فتح کر لیا۔ کسریٰ کے ملک کو چیر پھاڑ دیا، ان کے خزانوں کے مالک بن گئے، دنیا پر حاکم اور غالب ہو گئے۔ آیتِ کریمہ میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اور اُن کے بعد خلفائے راشدین کی خلافت کے صحیح ہونے پر واضح دلیل ہے، کیوں کہ وہ مستخلفین جو ایمان لائے اور عملِ صالح کیے، وہ یہی حضرات بابرکات ہیں۔ ان کے عہدِ سعادت مہد میں عظیم فتوحات ہوئیں۔ کسریٰ اور دوسرے بادشاہوں کے خزانے مفتوح ہوئے، امن و امان اور دین کو غلبہ اور برتری حاصل ہوئی۔ سفینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میرے بعد خلافت تیس برس ہے، پھر بادشاہت ہو گی۔ پھر کہا "أَمْسِكْ" (یعنی سفینہ رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگرد سعید سے کہا: "أَمْسِكْ") یعنی انگلیوں کو پکڑ اُن سے شمار کر۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت دو برس اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت دس برس اور عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت بارہ برس اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چھے برس۔ "قال علي: قلت لحماد: القائل لسعيد أمسك سفينة؟ قال: نعم" (یعنی علی راوی نے اپنے استاد حماد سے پوچھا کہ "أمسك" کا کہنے والا سعید سے سفینہ ہے؟ حماد نے کہا: ہاں) (أخرجه أبو داود و الترمذي)[2]

سیدنا ابو الوفاء الصدیق رحمہ اللہ (نواب صدیق حسن رحمہ اللہ) نے فرمایا ہے کہ اس میں اجمال ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت دو برس تین ماہ تھی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت دس برس چھے مہینے تھی اور عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت بارہ برس اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چار برس اور نو مہینے تھی۔ اس بنا پر چاروں خلفا کی مدتِ خلافت انتیس برس چھے مہینے ہوتی ہے۔ تیس برس سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے پورے ہو گئے، ان کی خلافت چھے مہینے رہی، پھر خود خلافت سے اتر پڑے۔ واللہ سبحانه أعلم و علمه أتم.

جملہ ﴿ يَعۡبُدُونَنِي ﴾ بنا بر حالِ محلِ نصب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مستأنفہ ہو، ان کی تعریف اور صفت کے لیے لایا گیا ہو۔ اس میں سات وجہیں ہیں، امام سمین رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کیا ہے۔ جملہ ﴿ لَا يُشۡرِكُونَ بِي شَيۡـًٔا ﴾ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے ﴿ يَعۡبُدُونَنِي ﴾ کے فاعل سے، یعنی میری عبادت کریں گے، اس حال میں کہ میری عبادت کے ساتھ کسی بھی شے کو شریک نہ کریں گے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ میری عبادت کے ساتھ کسی شے کی ریا نہ کریں گے۔ کسی نے کہا: میرے سوا کسی سے نہ ڈریں گے۔[3] (قاله ابن عباس) کسی نے کہا ہے کہ میرے غیر کو دوست نہ رکھیں گے۔

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٣٤) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] الدر المنثور (٦/ ٢١٦)

﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ یعنی جو کوئی اس صحیح وعدے کے بعد ان نعمتوں کی ناشکری کرے یا کفر پر جما رہے یا ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائے تو یہی کافر اپنے فسق میں پورے کامل ہیں۔ فسق طاعت سے نکلنے کو کہتے ہیں اور کفر میں سرکشی اور طغیان کرنے کو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فاسقون" بمعنی "عاصون" ہے، یعنی نافرمان۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفر سے مراد اس نعمت کی ناشکری کرنا ہے۔[1] اللہ کے ساتھ کفر کرنا نہیں ہے، اسی لیے "فاسقون" فرمایا "کافرون" نہ کہا۔ اہل تفسیر نے کہا ہے کہ پہلے پہل جس نے اس نعمت کی ناشکری کی اور اس کے حق کا انکار کیا وہ لوگ ہیں جنھوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر ڈالا، پھر جب وہ ان کو قتل کر چکے تو جس امن و بے خوفی میں وہ تھے، اللہ پاک نے اس کو بدل ڈالا اور اُن پر خوف مسلط کر دیا، یہاں تک کہ وہ ایسے ہوگئے کہ آپس میں لڑنے لگے، اس کے بعد کہ ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ یہ قصہ مشہور و معروف ہے۔[2]

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝۵۶ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝۵۷

اور تم نماز قائم کرو اور زکات دو اور رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے (56) اور کافروں کی بابت آپ یہ خیال نہ کریں کہ وہ زمین میں (اللہ کو) عاجز کر دینے والے ہیں، اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور بلاشبہہ وہ (واپسی کی) بری جگہ ہے (57)

نماز، زکات اور اطاعت کا حکم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے بندوں کو نماز قائم کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ نماز اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت ہے۔ ایتائے زکات کمزور فقیر محتاج مخلوق پر احسان کرنا ہے اور اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع اور فرماں بردار ہوں، یعنی آپ کی پیروی کریں، اس بات میں جس کے کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم فرمایا ہے اور اس شے کو چھوڑنے میں جس سے ان کو منع کیا ہے۔ شاید اس وجہ سے اللہ ان پر رحم فرمائے۔ بے شک جو کوئی ایسا کرے گا تو اللہ پاک عن قریب اس پر رحم فرمائے گا۔ جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ﴾ [التوبة: ۷۱] "یہی لوگ ہیں جن پر اللہ عن قریب رحم فرمائے گا۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿لَا تَحْسَبَنَّ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اے پیغمبر! تم مت گمان کرو کہ جن لوگوں نے تمھاری مخالفت کی ہے اور تم کو جھٹلایا ہے، وہ ملک میں تھکا دینے والے ہیں، یعنی وہ اللہ پاک کو تھکا نہ سکیں گے، بلکہ اللہ پاک ان پر

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٢١٦) [2] فتح البیان (٩/ ٢٥٤۔ ٢٥٧)

قادر ہے، وہ عن قریب اس پر ان کو سخت ترین عذاب کرے گا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ﴾ یعنی دارِ آخرت میں ان کا ٹھکانا آگ ہے۔ ﴿ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ اور البتہ کافروں کا برا مآل ہے۔ یعنی کافروں کے لوٹ کر جانے کی جگہ بہت ہی بری ہے اور بری قرار گاہ ہے اور برا بچھونا ہے۔[1] أعاذنا الله من النار، ومن موجبات النار آمين يا أرحم الراحمين ؎

الٰہی آگ سے ہم کو بچا لے ردائے رحم میں ہم کو چھپا لے
عمل کچھ بھی نہیں ہم پاس یا رب کر اپنا فضل ہم پر خاص یا رب

اَللّٰهم صل وسلم و بارك على سيدنا و مولانا محمد وآله وصحبه.

فتح البیان کا بیان:

جملہ ﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ معطوف ہے مقدر پر، جس پر کلامِ متقدم دال ہے، گویا ان سے یوں کہا گیا: "فَآمِنُوْا وَاعْمَلُوْا صَالِحاً وَّأَقِيمُوْا الصَّلَاةَ" یعنی تم ایمان لاؤ اور نیک کام کرو اور نماز قائم کرو۔ کسی نے کہا ﴿ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور نماز قائم کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "فَلَا تَكْفُرُوْا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ" یعنی تم کفر مت کرو اور نماز قائم کرو۔ رسول کی اطاعت کا ذکر دوبارہ کیا تاکید کے لیے۔ خاص کر رسول کی اطاعت کا ذکر اس لیے کیا کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ رہی یہ بات کہ جس شے میں رسول کی اطاعت کریں، اس کا ذکر نہ کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود تعمیم ہے، یعنی عام اطاعت، چناں چہ حذف سے یہ بات واضح ہو رہی ہے۔ علم معانی میں ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا حذف تعمیم کو مشعر ہوتا ہے۔

﴿ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جن اُمور کا ذکر ہوا، یعنی نماز کا قائم کرنا، زکات دینا، رسول کی اطاعت کرنا، ان کاموں کو تم کرو، اس حالت میں کہ تم اس بات کی اُمید رکھنے والے ہو کہ اللہ پاک تم پر رحم کرے۔ ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ ﴾ کو ابن عامر و حمزہ و ابوحیوہ نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے، اس معنی میں کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ اس کا فاعل ہے۔ باقی قاریوں کی قراءت بتائے فوقیہ ہے اور خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور موصول مفعول اول ہے اور دوسرا مفعول ﴿ مُعْجِزِيْنَ ﴾ ہے، کیوں کہ "حُسبان" (فعل حَسِبَ يَحْسَبُ) دو مفعول کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ یہ قول امام زجاج، فراء اور ابوعلی رحمہ اللہ کا ہے۔[2] ﴿ مُعْجِزِيْنَ ﴾ کے معنی "فَائِتِيْنَ" ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "سَابِقِيْنَ"[3] یعنی اے نبی! تم مت خیال کرو کہ منکرین اللہ سے سبقت کر جائیں گے۔

رہی پہلی قراءت تو اس کی بنا پر پہلا مفعول محذوف ہو گا۔ "أَيْ: لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنْفُسَهُمْ مُعْجِزِيْنَ" یعنی منکر لوگ اپنی جانوں کو فوت ہونے والی خیال نہ کریں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جتنے بصریوں

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٠١) [2] فتح القدير (٤/ ٦٥) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣١)

اور کوفیوں کو میں جانتا ہوں، وہ سب حمزہ کی قراءت کو منسوب بہ خطا کرتے ہیں۔[1] ﴿ وَمَأْوٰىهُمُ النَّارُ ﴾ جملہ خبریہ ہے اور ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ ﴾ انشائیہ تھا تو خبر کا عطف انشا پر ہوا، یا یوں کہیں کہ ایسا نہیں ہے، اس کا عطف جملۂ مقدر پر ہے، وہ یہ ہے: "بَلْ هُمْ مَقْهُوْرُوْنَ مُدْرَكُوْنَ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ"، یعنی تم منکر لوگوں کو فوت ہونے والے خیال نہ کرو، بلکہ وہ تو مقہور اور عاجز ہوں گے، اللہ پاک ان کو پا لے گا اور اُن کا ٹھکانا آگ ہے۔ (كذا في فتح البيان مع بعض التفصيل) غرضیکہ اللہ پاک جبکہ توحید کے دلائل کے ذکر سے فارغ ہو چکا تو استیذان کی طرف رجوع کیا جس کا ذکر فرما رہا تھا، چنانچہ اس کو اس جگہ خاص توجہ پر ذکر کیا۔[2] پس ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۵۸

اے ایمان والو! جن (غلاموں اور لونڈیوں) کے تمھارے دائیں ہاتھ مالک بنے ہیں اور (ان لڑکوں اور لڑکیوں کو) جو تم میں سے بلوغت کو نہ پہنچے ہوں، (انھیں) چاہیے کہ تم سے تین بار اجازت مانگیں (پھر گھر میں داخل ہوں)، نمازِ فجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو کپڑے اتارتے ہو اور نمازِ عشا کے بعد، (یہ) تین (وقت) تمھارے لیے پردے (کے) ہیں، ان (اوقات) کے بعد (بلا اجازت آنے سے) نہ تم پر اور نہ ان پر کوئی گناہ ہے، تم ایک دوسرے کے پاس بہ کثرت آیا جایا ہی کرتے ہو، اللہ اسی طرح تمھارے لیے (اپنی) آیات بیان کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے (58)

غلاموں اور بچوں کے اجازت لینے کے اوقات:

ان تین وقتوں میں لڑکوں کو اور غلام لونڈی کو بھی اجازت لینی چاہیے اور سارے وقتوں میں ضروری نہیں۔ انتھٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ آیاتِ کریمہ اجازت لینے کے بارے میں احکام پر مشتمل ہے، یعنی بعض

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٠١) [2] فتح البيان (٩/ ٢٥٧۔ ٢٥٨)

قریبی جب بعض پر داخل ہوں تو اجازت لیں۔ اللہ پاک نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ ان سے ان کی خدمت کرنے والے لوگ اجازت مانگیں، جو ان کے غلام لونڈی اور نابالغ لڑکوں میں سے ہیں، وہ تین حال، یعنی ان اوقات میں اجازت مانگیں: پہلی حالت یہ ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے، کیونکہ لوگ اس وقت اپنے بچھونوں میں سوئے ہوتے ہیں۔ دوسری حالت یہ ہے کہ جب تم دوپہر کے وقت قیلولہ کرنے کے لیے اپنے کپڑے اُتار رکھتے ہو، کیوں کہ اس حالت میں کبھی آدمی اپنے کپڑے اُتار رکھتا ہے اور اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے۔ تیسری حالت یہ ہے کہ نمازِ عشا کے بعد، کیوں کہ یہ وقت نیند کا ہے، اس لیے خادموں کو اور لڑکوں کو یہ حکم ہے کہ ان حالتوں میں بے دھڑک گھر والوں پر نہ آ جائیں، کیوں کہ اس بات کا ڈر ہے کہ مرد اپنی بیوی پر ہو یا اس جیسا کوئی اور کام ہو۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ﴾ یعنی یہ تین اوقات تمھارے بے پردہ ہونے کے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جب وہ ان حالتوں کے سوا اور کسی حال میں داخل ہوں تو تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ تم ان کو آنے کی قدرت دو اور نہ ان پر گناہ ہے کہ ان حالتوں کے سوا وہ کسی شے کو دیکھ لیں، کیوں کہ ان کو تو بے دھڑک آنے کی اجازت مل چکی ہے اور اس لیے کہ وہ تو تم پر پھرا ہی کرتے ہیں، یعنی خدمت وغیرہ اور کام کاج کے لیے آیا جایا کرتے ہیں۔ جو بات طوافین میں معاف ہے وہ ان کے غیر میں معاف نہیں ہے۔ اسی لیے امام مالک، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اہلِ سنن نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بلی کے حق میں فرمایا ہے کہ وہ نجس نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو تم پر پھرنے والوں میں سے ہے، یا تم پر پھرنے والیوں سے ہے۔[1]

چونکہ یہ آیت محکم ہے اور کسی شے سے منسوخ نہیں ہوئی ہے اور اس پر لوگوں کا عمل بہت ہی کم ہے، اس لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے لوگوں پر اس کا انکار کیا، جس طرح کہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایت سعید بن جبیر روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ لوگوں نے تین آیتوں کو چھوڑ دیا تو اُن پر عمل نہ کیا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ ﴾ (آیتِ بات) اور وہ آیت جو سورۃ النساء میں ہے: ﴿ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴾ [النساء: ۸] ''اور جب تقسیم کے وقت حاضر ہوں (دور کے) رشتہ دار، یتیم اور مسکین تو انھیں بھی اس میں سے کچھ دے دو، اور ان سے اچھی بات کہو۔'' اور وہ آیت جو سورۃ الحجرات میں ہے: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ [الحجرات: ۱۳] ''بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے۔'' نیز ایک روایت میں ان سے یوں مروی ہے کہ شیطان لوگوں پر تین آیتوں پر غالب ہوگیا، چنانچہ انھوں نے ان پر عمل نہ کیا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

[1] الموطأ (۱/ ۲۲) مسند أحمد (۵/ ۲۹۶) سنن أبي داود، رقم الحديث (۷۵) سنن الترمذي، رقم الحديث (۹۲) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳٦۷) صحيح الجامع، رقم الحديث (۲٤۳۷)

﴿ لِيَسْتَأْذِنْكُمُ ﴾[1]. هذا من حديث إسماعيل بن مسلم و هو ضعيف عن عمرو بن دينار عن عطاء ابن أبي رباح عن ابن عباس.

ابو داود کی روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہ لائے۔ آیت اجازت لینے کے بارے میں ہے اور میں البتہ اپنی اس لونڈی کو حکم کرتا ہوں، وہ مجھ پر داخل ہونے کے لیے اذن طلب کرتی ہے (فتح البیان اور فتح القدیر میں ہے کہ یہ ان کی پستہ قد لونڈی کی طرف اشارہ ہے، جو ان کے سر پر کھڑی ہوئی تھی)۔ وكذلك رواه عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما يأمر به.[2]

امام ثوری رحمہ اللہ نے موسیٰ بن ابی عائشہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے شعبی سے ﴿ لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ کے بارے میں پوچھا تو امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا کہ منسوخ نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ لوگ اس پر عمل نہیں کرتے تو امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا کہ "اَللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ" یعنی اللہ پاک سے اس بارے میں مدد مانگنی چاہیے۔[3] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ دو آدمیوں نے ان سے استیذان کے متعلق پوچھا کہ ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ ﴾ میں، جن کا اللہ پاک نے امر فرمایا ہے، استیذان سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا ستر والا ہے ستر کو پسند کرتا ہے۔ لوگوں کے پاس ان کے دروازوں پر پردے نہ تھے اور نہ ان کے گھروں میں چھپر کھٹ تھے، بسا اوقات آدمی کا خادم اچانک اس کے پاس آ جاتا یا اس کا لڑکا یا اس کے زیرِ کفالت یتیم آ جاتا اور وہ اپنی بیوی پر ہوتا تھا، اس لیے اللہ پاک نے ان کو اس بات کا حکم دیا کہ ان کے پردے کے اوقات میں اجازت طلب کیا کریں، جن کا اللہ نے نام لیا ہے، پھر اللہ نے اس کے بعد انھیں پردے لگانے اور چھپر کھٹ رکھنے کی طاقت دی، یعنی رزق و روزی کی فراخی فرمائی۔ لوگوں نے خیال کیا کہ یہ ان کے لیے استیذ ان سے کفایت کر گیا ہے، جس کا ان کو حکم ہوا ہے۔ یہ اسناد ابن عباس رضی اللہ عنہما تک صحیح ہے۔[4] (و رواه أبو داود عن القعنبي عن الدراوردي عن عمرو بن أبي عمرو به)

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ ان اوقات میں اپنی بیویوں سے صحبت کریں، تاکہ نہائیں پھر نماز کی طرف نکلیں، اس لیے اللہ نے ان کو حکم دیا کہ اپنی لونڈی غلاموں اور لڑکوں کو حکم دیں کہ ان اوقات میں ان سے اجازت لیے بغیر اُن پر داخل نہ ہوں۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم کو۔ واللہ أعلم۔ یہ بات پہنچی ہے کہ انصار کے ایک شخص اور اس کی بیوی اسماء بنت مرشدہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھانا تیار کیا، پھر لوگ بغیر اجازت داخل ہونے لگے تو سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا: یا رسول اللہ! یہ کیا بری بات ہے

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣٢)
[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٩١) فتح البيان (٩/ ٢٦٠) فتح القدير (٤/ ٧٤)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣٣)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٩٢)

کہ کوئی شخص، یعنی کسی کا خادم عورت اور اس کے خاوند پر ایسے وقت میں داخل ہوتا ہے جب وہ ایک کپڑے میں ہوتے ہیں اور اذن نہیں لیتا، اس پر اللہ پاک نے اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾۔[1] جو اُمور اس پر دال ہیں کہ یہ آیت محکم ہے اور منسوخ نہیں ہوئی، ان میں سے ایک یہ آیت ہے کہ ﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس کے بیان کی منت رکھی ہے تو معلوم ہوا کہ آیت محکم ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ مومنین کو خطاب ہے اور مومن عورتیں اس میں تغلیباً داخل ہیں، جس طرح کہ اَور خطابات میں داخل ہوا کرتی ہیں۔ علماء نے فرمایا کہ یہ آیت بعض اوقات کے ساتھ خاص ہے۔ ﴿ لِيَسْتَاْذِنْكُمُ ﴾ میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ اس میں کئی قول ہیں: ① منسوخ ہے، یہ قول سعید بن مسیب رحمہ اللہ کا ہے۔ ② سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں امر ندب و استحباب کا ہے، یعنی مستحب ہے واجب نہیں۔ ③ کسی نے کہا ہے کہ یہ واجب تھا، جبکہ ان کے گھروں کے دروازے نہ تھے، اب اگر وہی حالت پھر ہو جائے تو اس حکم کا وجوب بھی عود کر آئے گا، یعنی واجب ہو جائے گا۔ اس کو مہدوی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا ہے۔ ④ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ حکم وجوب کے لیے ہے اور آیت محکم غیر منسوخ ہے اور اس کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں پر ثابت ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول اکثر علما کا ہے۔ ⑤ سلمی نے کہا ہے کہ یہ عورتوں کے لیے خاص ہے۔ ⑥ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مردوں کے ساتھ خاص ہے نہ کہ عورتوں کے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ سے مراد غلام اور لونڈیاں ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ ﴾ سے مراد بچے ہیں، یعنی نابالغ بچے۔ ﴿ مِنْكُمْ ﴾ سے مراد احرار آزاد لوگ ہیں۔ امام حسن اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے ایک روایت میں "الحلُم" بسکون لام پڑھا ہے، باقی قراء کی قراءت بضم لام ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا حلم ہے "حَلَمَ الرَّجُلُ" بفتحِ لام سے اور "حَلِمَ" سے۔ "حلُمَ" بضمِ لام "یَحْلِمُ" بکسرِ لام ہے۔[4] اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ احتلام بلوغ ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ جب پندرہ برس کو پہنچ جائے اور محتلم نہ ہو تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ بالغ نہ ہوگا یہاں تک کہ اٹھارہ برس کو پہنچے اور ان کو کامل کرلے اور لڑکی سترہ برس کو۔ امام شافعی اور امام ابو یوسف و امام محمد و امام احمد رحمہم اللہ نے لڑکے اور لڑکی کے حق میں پندرہ برس کا فرمایا ہے کہ وہ مکلّف ہو جاتے ہیں اور اُن پر احکام جاری ہوتے ہیں گو محتلم نہ ہوں۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣٣ـ ٢٦٣٤) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٠١ـ ٤٠٢)

[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٠٢ـ ٣٠٣) فتح القدير (٤/ ٦٨) [4] فتح القدير (٤/ ٦٨)

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ﴾ کے معنی ہیں: رات دن میں تین وقت۔ اوقات کو مرات کے پیرایہ میں ادا کیا، اس لیے کہ استیذان کے واجب ہونے کا اصل سبب اذن طلب کرنے والوں کا ان اوقات میں مخاطبوں کے پاس جانا ہے، نفسِ اوقات نہیں ہے۔ ﴿ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ﴾ کا نصب مصدریت کی بنا پر ہے، یعنی "ثَلَاثَ اِسْتِئْذَانَاتٍ"۔ امام ابوحیان رحمہ اللہ نے اس کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ ظاہر یہی ہے، اس لیے کہ جب تو اس طرح کہے گا: "ضَرَبْتُكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ"، تو اس سے تین ضربیں ہی سمجھی جائیں گے۔[1] لیکن اس کو یوں رد کیا ہے کہ قرینہ مذکور کی وجہ سے ظاہر اس جگہ متروک ہے۔ وہ قرینہ یہی ﴿ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ﴾ کی تفسیر ہے "ثَلَاثَ أَوْقَاتٍ" کے ساتھ۔ تو اس کا نصب بنا پر ظرفیتِ زمانی ٹھہرے گا۔

پھر اللہ پاک نے ﴿ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ﴾ کی یہ تفسیر فرمائی: ﴿ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ﴾۔ اس وقت اس لیے اذن مانگنا چاہیے کہ یہ وقت بچھونوں سے اُٹھنے کا ہے اور نیند کے کپڑوں کو اتار کر بیداری کے کپڑے پہننے کا۔ کبھی آدمی برہنہ ہوتا ہے یا ایسی حالت پر ہوتا ہے کہ وہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا اس کو دیکھے۔ محل اس کا اس بنا پر نصب ہے کہ ﴿ ثَلٰثَ ﴾ سے بدل ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ موضع رفع میں ہو، اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو، یعنی "هِيَ مِنْ قَبْلِ... الخ"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ ﴾ معطوف ہے محل پر ﴿ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ﴾ کے۔ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ بیان کا ہے، یا "فِيْ" کے معنی میں ہے، یا بہ معنی لام۔ یہ دوسرے وقت کا ذکر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جس وقت گرمی کی شدت سے تم وہ کپڑے جو پہنے ہوتے ہو اتار دیتے ہو دوپہر کے وقت۔ یہ وقت نصف النہار کا ہے۔ وہ لوگ قیلولے کے واسطے کپڑے اُتار ڈالتے تھے۔ کبھی برہنہ ہو جاتے تھے۔ پھر اللہ نے تیسرے وقت کا ذکر کیا: ﴿ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ﴾۔ اس وقت اذن اس لیے طلب کرنی چاہیے کہ یہ وقت دن کے لباس اتارنے کا ہے اور بی بی کے ساتھ تنہا ہونے کا ہے اور رات کے لباس اور سونے کا ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان تینوں وقتوں کا اجمال کیا ان کی تفصیل کے بعد، چنانچہ فرمایا: ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ﴾ جمہور نے برفع ﴿ ثَلٰثُ ﴾ پڑھا ہے۔ حمزہ و ابوبکر نے عاصم سے بہ نصب بنا بر بدل ﴿ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ﴾ سے۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدل جو صحیح ہوتا ہے، لہٰذا بہ تقدیر "أَوْقَاتُ ثَلَاثِ عَوْرَاتٍ" کے مضاف محذوف ہوا اور مضاف الیہ اس کا قائم مقام کیا گیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ نفس ﴿ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ﴾ مبالغے کے لیے نفس ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ ﴾ ٹھہرایا گیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ ﴾ اوقاتِ مذکورہ سے بدل ہو، یعنی ﴿ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ﴾ سے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ منصوب ہو باضمارِ فعل، یعنی "أَعْنِي" اور اس کی طرح اور کوئی فعل۔ رہا رفع تو وہ اس بنا پر ہے کہ

[1] البحر المحیط (٦/ ٤٣٣)

مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یعنی ''هُنَّ ثَلَاثٌ''۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نصب ضعیف و مردود ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع مجھ کو زیادہ اچھا لگتا ہے، کہا کہ رفع کو میں نے اس لیے پسند کیا ہے کہ معنی یہ ہیں: ''هٰذِهِ الْخِصَالُ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ''

امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ ﴾ مرفوع بابتدا ہے اور خبر مابعد اس کا ہے۔ کہا کہ ﴿ عَوْرٰتٍ ﴾ وہ اوقات ہیں جن میں عورت ہوتی ہے، (یعنی جن وقتوں میں آدمی بے ستر ہوتا ہے، کھلتا ہے۔) امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: ''لِيَسْتَئْذِنُكُمْ أَوْقَاتَ ثَلَاثِ عَوْرٰتٍ'' یعنی چاہیے کہ تم سے تین وقتوں میں اجازت مانگیں۔ مضاف یعنی ''أَوْقَاتَ'' کو حذف کر دیا اور مضاف الیہ اس کے قائم مقام کیا گیا۔ ﴿ عَوْرٰتٍ ﴾ ''عَوْرَةٌ'' کی جمع ہے۔ عورت اصل میں خلل کو کہتے ہیں، یعنی رخنہ کو، جس طرح کہ شہر کے ناکے کو عورت کہتے ہیں۔ پھر عورت کا غلبہ دیا گیا اس خلل میں جو واقع ہوتا ہے اس شے میں جس کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہے اور اس کا چھپانا متعین ہوتا ہے، یعنی وہ ایسے تین وقت ہیں کہ ان میں ستر خلل پذیر ہوتا ہے۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے ''عَوَرَات'' بفتح واو پڑھا ہے۔ یہ لغت ہذیل وتمیم کی ہے، کیوں کہ یہ لوگ ''فَعَلَات'' کے عین کو فتح دیتے ہیں، برابر ہے کہ وہ واو ہو یا یاء۔[1]

کلمۂ ﴿ لَكُمْ ﴾ محذوف سے متعلق ہے، وہ ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ ﴾ کی صفت ہے۔ ''أَيْ: كَائِنَةٌ لَّكُمْ''، یعنی وہ ایسے تین وقت کھلنے کے ہیں جو تمھارے لیے ہونے والے ہیں اور جملہ مستانفہ ہے، جو اجازت لینے کے واجب ہونے کی وجہ بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ ان وقتوں میں اجازت مانگنا کیوں واجب ہے؟ تو یہ اس کا جواب دیا اور سبب بیان کر دیا کہ اس لیے واجب ہے کہ یہ اوقات تمھارے بے ستر ہونے کے ہیں۔

عبداللہ بن سوید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ ﴾ کا پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت بعد دوپہر کے میں اپنے کپڑے اُتار رکھوں تو خادموں میں سے سب اور وہ لوگ بھی جو عقل کی حد کو پہنچے ہوئے نہیں ہیں اور نہ ہی آزاد لوگوں میں سے کوئی شخص جو عقل کی حد کو نہیں پہنچا، مجھ پر بلا اجازت داخل نہ ہوں۔ اسی طرح جب میں نمازِ عشا کے بعد اور نمازِ صبح سے پہلے اپنے کپڑے اُتار رکھوں تو اس وقت کوئی بغیر اجازت مجھ پر داخل نہ ہو۔[2] (أخرجه ابن مردويه عن ثعلبة القرظي عن عبدالله، وأخرجه عبد بن حميد والبخاري في الأدب عن عبدالله من قوله، وأخرج نحوه أيضا ابن سعد عن سويد بن النعمان)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نمازِ عشاء کے بعد جس وقت مرد اپنی بیوی کے ساتھ خلوت میں ہو تو اس پر نہ کوئی بچہ داخل ہو اور نہ خادم، مگر اس کی اجازت سے یہاں تک کہ صبح کی نماز پڑھے۔ اور جب اپنی بیوی کے ساتھ ظہر کے وقت خلوت میں ہو تو اسی طرح اجازت لے۔ ان دونوں اوقات کے درمیان بغیر اجازت کے داخل

---

[1] فتح القدير (٤/ ٦٩)

[2] الدر المنثور (٦/ ٢١٧۔ ٢١٨)

ہونے کی رخصت دی گئی، وہ اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ ﴾. پھر رہا وہ شخص جو عقل کی حد کو پہنچ چکا تو وہ ہر حال میں مرد پر اور اس کی بیوی پر اجازت لے کر ہی داخل ہو۔ اس سلسلے میں قول یہ ہے: ﴿ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ ﴾[1]

(أخرجه ابن المنذر و ابن أبي حاتم و البيهقي و في السنن عنه في الآية)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول جو گزر چکا ہے کہ یہ حکم مردوں کے لیے ہے عورتوں کے لیے نہیں ہے، اس کو ابن ابی شیبہ اور بخاری رحمہ اللہ نے ادب میں اور ابن جریر و ابن منذر رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔[2] فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیوں کہ ان وقتوں میں عورات پر جس طرح مردوں کے مطلع ہونے کو آدمی مکروہ سمجھتا ہے، اسی طرح عورتوں کے مطلع ہونے کو بھی مکروہ سمجھتا ہے۔[3] ابوعبدالرحمٰن سلمی کا قول گزر چکا ہے کہ یہ آیت خاص طور پر عورتوں کے بارے میں ہے، یہاں اتنا زیادہ ہے کہ مرد تو رات اور دن میں ہر حال میں اذن مانگے۔ اس کو فریابی و ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور ابن منذر رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔[4]

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ واللہ! منسوخ نہیں ہوئی، لیکن وہ اس قسم سے ہے کہ لوگوں نے اس کے ساتھ تہاون و سستی کی ہے۔[5] ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے بعض ازواج نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت عورتوں کے حق میں نازل ہوئی ہے کہ وہ ہم پر اذن مانگیں۔[6] (أخرجه ابن مردويه) سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مراد عورتیں ہیں، کیوں کہ مرد تو اذن مانگتے ہیں۔[7] (أخرجه الحاكم و صححه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ﴾ یعنی غلاموں پر اور لڑکوں پر ان اوقات کے علاوہ بغیر اجازت کے داخل ہونے پر کوئی گناہ نہیں، کیوں کہ اس صورت میں حکم کی مخالفت نہیں اور نہ ہی عورات پر مطلع ہونا ہے، جو گناہ کا موجب ہوتا ہے۔ ﴿ بَعْدَهُنَّ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان تینوں عورات سے ہر ایک کے بعد۔ وہ وقت وہ ہے جو ان ہر اوقات کے درمیان ہوتا ہے تینوں وقتوں میں سے۔ یہ جملہ مستأنفہ ان حالتوں میں خاص کر اذن لینے کے حکم کے متعلق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ محلِ رفع میں ہو اور قراءت رفع کی بنا پر ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ ﴾ کی صفت ٹھہرے۔ امام ابوالبقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بَعْدَهُنَّ ﴾ کی تقدیر یہ ہے: "بَعْدَ اِسْتِيْذَانِهِمْ فِيْهِنَّ" پھر جار و مجرور یعنی "فِيْهِنَّ" کو حذف کر دیا۔ تو "بَعْدَ اِسْتِيْذَانِهِمْ" باقی رہا۔ پھر مصدر کو اور ضمیر کو جو اس سے متصل تھی حذف کر دیا۔[8] اس قول کو یوں رد کیا ہے کہ اس تقدیر کی کوئی حاجت نہیں ہے، بلکہ معنی یہ ہیں کہ نہیں ہے کوئی گناہ تم پر نہ ان پر یعنی غلام لونڈیوں اور لڑکوں پر اگر وہ ان مذکورہ اوقات کے بعد اجازت نہ مانگیں اور داخل ہو جائیں۔

---

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٩٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٢١١) [3] فتح القدير (٤/ ٧٤) فتح البيان (٩/ ٢٦١)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣٣) [5] تفسير الطبري (١٩/ ٢١٣) [6] الدر المنثور (٦/ ٢١٩)

[7] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٣٤) [8] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٧٧)

﴿ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ ﴾ مرفوع ہے اس بنا پر کہ خبر ہے مبتدائے محذوف کی، یعنی "هُمْ طَوَّافُوْنَ" اور یہ جملہ مستأنفہ اس عذر کو بیان کرتا ہے جو اذن نہ لینے کی رخصت دینے والا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یہ ایسا ہے جیسا کہ تم محاورے میں بولتے ہو: "هُمْ خَدَمُكُمْ وَطَوَّافُوْنَ عَلَيْكُمْ" یعنی وہ تو تمھارے خادم ہیں، تم پر پھرتے رہتے ہیں۔ نیز امام فراء رحمہ اللہ نے "طوافین" کا نصب جائز رکھا ہے، اس لیے کہ یہ نکرہ ہے اور ﴿ عَلَيْكُمْ ﴾ میں ضمیر معرفہ ہے، اور بصری لوگ یہ جائز نہیں سمجھتے کہ ان دو مضمر سے حال ہو، جو ﴿ عَلَيْكُمْ ﴾ اور ﴿ بَعْضُكُمْ ﴾ میں ہیں، دونوں عامل کے مختلف ہونے کی وجہ سے۔[1]

﴿ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ تم پر پھرتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تمھارے خادم ہیں، پس کچھ ڈر نہیں ہے کہ وہ تم پر ان وقتوں کے علاوہ داخل ہوں بغیر اجازت کے۔ ﴿ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ بعض تمھارا بعض پر پھرتا ہے یا پھرنے والا ہے اور جملہ بدل ہے ماقبل سے یا اس کا مؤکد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تم میں سے ہر ایک اپنے صاحب پر پھرتا ہے، غلام مالکوں پر اور مالک غلاموں پر، اللہ پاک نے جو بغیر اجازت کے ان تین وقتوں کے علاوہ داخل ہونے کو جائز فرمایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عادت یہ تھی کہ ان وقتوں کے علاوہ وہ اپنی عورات کا کشف نہیں کرتے تھے، یعنی اپنے پردے کی جگہوں کو کھولتے نہیں تھے۔

﴿ كَذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ مصدر فعل کی طرف ہے، جو اس کے بعد ہے، جس طرح کہ سب جگہ کتاب عزیز میں ہوتا ہے، یعنی مثل اس بیان کرنے کے ﴿ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ﴾ بیان کرتا ہے اللہ تمھارے لیے آیتوں کو جو ان حکموں پر دال ہیں، جن کو اللہ نے تمھارے لیے مشروع فرمایا ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک کثیر العلم ہے معلومات کے ساتھ، حکیم کثیر الحکمت ہے اپنے افعال میں۔ جبکہ اللہ پاک ان اطفال کا ذکر فرما چکا جو عقل کی حد کو نہیں پہنچے تھے تو اب یہاں آزاد اطفال کا ذکر کیا جو عقل کی حد کو پہنچ چکے ہیں۔[2] چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝59

اور جب تم میں سے لڑکے (اور لڑکیاں) بلوغت کی حد کو پہنچ جائیں تو انھیں چاہیے کہ وہ بھی اسی طرح اجازت مانگیں جس طرح ان سے پہلے (ان کے بڑے) اجازت مانگتے رہے ہیں، اللہ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا، خوب حکمت والا ہے (59)

بچوں کو بالغ ہونے پر بڑوں کی طرح ہر حال میں اجازت طلب کرنے کا حکم:

ویسی اجازت، یعنی ہر وقت جیسے دوسرے گھر والے ہر وقت خبر کر کے آئیں۔ انتھی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٠٦) [2] فتح البيان (٩/ ٢٥٨۔ ٢٦٣)

ہیں، یعنی جس وقت تم میں لڑکے عقل کی حد کو پہنچ جائیں، وہ لڑکے جو صرف عوراتِ ثلث میں اجازت مانگ کر آتے تھے، پھر جب وہ عقل کی حد کو پہنچ جائیں تو اُن پر واجب ہے کہ وہ ہر حال پر اجازت مانگیں، یعنی اجنبیوں کی طرح اور ان حالتوں کی طرح جن میں کہ آدمی اپنی بیوی کے ساتھ خلوت میں ہوتا ہے، اگر چہ وہ ان تین حالتوں میں نہ ہو۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت لڑکا رباعی (اصل روایت کے الفاظ "إِذَا كَانَ الْغُلَامُ رُبَاعِيًا" ہے۔ غلام کہتے ہیں "صبي" کو پیدا ہونے سے بلوغ تک اور مرد "مستحكم القوة" کو بھی بولتے ہیں اور انثیٰ کو غلامۃ کہتے ہیں۔[1] (كذا في مجمع البحار) رباعیہ بالفتح مثل ثمانیہ چار دانت کو کہتے ہیں، جو ثنایا اور انیاب کے درمیان ہوتے ہیں) ہو جائے تو وہ ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ ﴾ میں ماں باپ کے پاس جانے کے لیے اجازت مانگے، پھر جب وہ عقل کی حد کو پہنچ جائے تو تو چاہیے کہ ہر حال میں اجازت مانگے۔ اسی طرح سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے اور ﴿ كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے، یعنی جس طرح مرد کی اولاد میں سے بڑے لوگ اجازت لیتے رہے اور اس کے قریبی رشتے دار اجازت لیتے رہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جس وقت آزاد لوگوں کے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ تم پر داخل ہوتے وقت اجازت مانگیں تمام اوقات میں۔ حرف کاف نعت ہے مصدر محذوف کی۔ "أَيْ: اِسْتِيْذَانًا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ" اور موصول عبارت ہے ان لوگوں سے جن کے حق میں یہ فرمایا: ﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [النور: ٢٧] "اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، حتی کہ تم اجازت لے لو، اور ان گھر والوں کو سلام کرو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔" معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جو عقل کی حد کو پہنچ گئے ہیں، تمام اوقات میں اجازت مانگیں ان آزاد بڑے لوگوں کی طرح جن کو بغیر کسی استثناء کے اجازت مانگنے کا حکم ہوا ہے۔

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں پر، جب وہ بالغ ہو جائیں اجازت طلب کرنا واجب ہے، آزاد ہوں یا غلام۔[3]

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا مرد اپنی ماں پر داخل ہونے کے لیے اجازت طلب کرے؟ فرمایا: ہاں، اگر تو ایسا نہ کرے گا تو تو اس سے وہ شے دیکھے گا جس کو تو مکروہ سمجھے گا۔[4] امام زہری اور سعید بن مسیّب رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آدمی اپنی ماں پر اذن طلب کرے، اسی بات کے لیے یہ آیت نازل ہوئی ہے۔[5] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: تم پر لازم ہے کہ اپنی ماؤں پر داخل ہونے کے لیے اذن مانگو۔[6] ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مرد اجازت

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٦٠) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣٨) تفسیر ابن كثیر (٣/ ٤٠٢) [3] تفسیر الطبري (١٩/ ٢١٥)
[4] سنن البیهقي الكبریٰ (٧/ ٩٧) [5] تفسیر الطبري (١٩/ ٢١٥) فتح البیان (٩/ ٢٦٣) [6] سنن البیهقي الكبریٰ (٧/ ٩٧)

طلب کرے اپنے باپ اور ماں اور بھائی اور بہن پر داخل ہونے کے لیے۔[1] (أخرجه البخاري في الأدب و عن جابر نحوه)

امام عطا رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: کیا میں اپنی بہن پر داخل ہونے کے لیے اذن طلب کروں؟ فرمایا: ہاں، میں نے عرض کی: وہ تو میری گود میں، یعنی میری پرورش میں ہے اور میں اس پر خرچ کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ ایک ہی گھر میں ہے، میں اس پر اذن طلب کروں؟! فرمایا: ہاں، بے شک اللہ فرماتا ہے: ﴿ لِيَسْتَـْٔذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ ﴾ پس یہ لوگ صرف اس عوراتِ ثلاث میں اذن لینے کے لیے حکم کیے گئے، کہا: ﴿ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَـْٔذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ پس اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں کے لیے اذن لینا واجب ہے۔[2] (أخرجه سعيد بن منصور و البخاري في الأدب و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و ابن مردويه)

امام عطاء بن یسار رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اجازت طلب کروں اپنی ماں پر؟ فرمایا: ہاں، عرض کی کہ میں تو اس کے ساتھ ہوں ایک ہی گھر میں۔ فرمایا: اذن مانگ۔ اس پر عرض کی کہ میں تو اس کا خادم ہوں، پھر میں کیا اس پر اذن مانگوں، ہر دفعہ جب میں اس پر داخل ہوں؟ فرمایا: کیا تو چاہتا ہے کہ اس کو ننگا دیکھے؟ عرض کی: نہیں۔ فرمایا: تو پھر اذن مانگ اس پر۔ یہ حدیث مرسل ہے۔[3] (أخرجه ابن جرير و البيهقي في السنن)

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ اللہ پاک نے تاکید کے لیے اس کو دوبارہ ذکر فرمایا۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ سبحانہ اپنے خلق کے اُمور کو خوب جانتا ہے، ان حکموں میں جن کو بیان فرماتا ہے۔ ﴿ حَكِيْمٌ ﴾ حکمت والا ہے مصالحِ خلق میں، جن کی اس نے تدبیر فرمائی ہے اور ان کو مشروع کیا ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ۭ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۶۰

اور (گھروں میں) بیٹھ رہنے والی (عمر رسیدہ) عورتیں جو نکاح کی اُمید نہیں رکھتیں، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (پردہ داری کے) کپڑے اُتار دیں، جبکہ وہ (اپنی) زیب و زینت ظاہر کرنے والی نہ ہوں اور ان کا اس سے بھی بچنا ان کے لیے بہت بہتر ہے، اور اللہ بڑا سننے والا، خوب جاننے والا ہے (60)

بوڑھی عورتوں پر پردہ نہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے:

یعنی بوڑھی عورتیں گھر میں تھوڑے کپڑوں میں رہیں تو درست ہے اور پورا پردہ رکھیں تو اور بہتر ہے۔ انتھیٰ۔

---

[1] الأدب المفرد (۱/ ۳٦۵) [2] الأدب المفرد (۱/ ۳٦۵) تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲٦۳۷) الدر المنثور (٦/ ۲۲۰)

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (۷/ ۹۷) یہ روایت مرسل ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام سعید بن جبیر، مقاتل بن حیان، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ ﴾ وہ عورتیں ہیں جن سے حیض منقطع ہو گیا ہے[1] اور بچے پیدا ہونے سے نا اُمید ہو چکی ہیں۔ ﴿ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان کو نکاح کرنے کی طرف تشوف (بناؤ سنگار کرنا) باقی نہیں رہا۔ ﴿ فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ان عورتوں پر تستر (پردہ) کرنے میں ایسی روک نہیں ہے، جیسا کہ ان کے سوا اور عورتوں پر ہے۔ ابو داود نے عن یزید نحوی (يزيد نحوي أبو سعيد قرشي مولاهم النحوي ونحو بطن من الأزد أبو الحسن المروزي عن مجاهد وعكرمة وعنه أبو حمزة السكري ونوح بن مريم، وثقه ابن معين قتله أبو مسلم سنة إحدى و ثلاثين و مائة كذا في الخلاصة) عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ آیتِ کریمہ:

﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [النور: ٣١]

''اور آپ مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، مگر جو (از خود) اس میں سے ظاہر ہو اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں اور اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ کریں، مگر اپنے خاوندوں پر یا اپنے باپ دادا پر یا اپنے خاوندوں کے باپ دادا پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں (سوتیلے بیٹوں) پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی (مسلمان) عورتوں پر یا اپنے دائیں ہاتھ کی ملکیت (کنیزوں) پر یا عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے نوکر چاکر مردوں پر یا ان لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں (کی چیزوں) سے واقف نہ ہوں اور وہ (عورتیں) اپنے پاؤں (زور زور سے) زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے، وہ (لوگوں کو) معلوم ہو جائے، اور اے مومنو! تم مجموعی طور پر اللہ سے توبہ کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ'' سے آیت ﴿ اَلْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ ﴾ کا استثناء کیا گیا ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿ ثِيَابَهُنَّ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ جلباب یا رداء ہے۔ (جلباب بالکسر چادر۔ رداء بالکسر پوشش۔ (كذا في الصراح) مجمع البحار میں ہے کہ ''جلباب'' بکسر جیم وسکونِ لام قمیص یا خمار واسع[3]

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣٩) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١١١) [3] مجمع بحار الأنوار (١/ ٣٧١)

(بڑی اوڑھنی) اور رِداء بکسرِ را ''مَا يَسْتُرُ أَعَالِيَ الْبَدَنِ''،[1] یعنی جو بدن کا اوپر والا حصہ ڈھانپے فقط۔ اور قاموس میں ہے ''رداء ملحفۃ'' معروف ہے)[2] اور اسی طرح عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، مجاہد، سعید بن جبیر، ابو الشعثاء، ابراہیم نخعی، حسن، قتادہ، زہری اور اوزاعی رحمہم اللہ وغیرہم سے مروی ہے۔ ابو صالح نے کہا کہ اپنا جلباب اتار رکھے اور مرد کے روبرو کھڑی ہو، درع وخمار میں (دِرع: عورت کا لباس، خمار: سر پر ڈالنے والی اوڑھنی)۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ وغیرہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ''أَنْ يَّضَعْنَ مِنْ ثِيَابِهِنَّ'' میں کہا ہے کہ وہ جلباب ہے اُوڑھنی کے اوپر۔ کچھ خوف نہیں کہ اس کو اُتار رکھیں مسافر کے یا غیر مسافر کے نزدیک، اس صورت میں کہ اس پر گاڑھی اوڑھنی ہو۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے ﴿غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: ''لَا يَتَبَرَّجْنَ بِوَضْعِ الْجِلْبَابِ لِيُرِيَ مَا عَلَيْهِنَّ مِنَ الزِّيْنَةِ'' یعنی چادر اتار کر اظہارِ زینت نہ کریں، تاکہ جو زینت ان پر ہے وہ دکھائی دے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ام ضیاء سے روایت کیا ہے، کہا میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر داخل ہوئی تو میں نے کہا: اے ام المومنین! آپ جلباب و نفاض و صباغ اور بالیوں اور پائل اور سونے کی انگوٹھی اور باریک کپڑوں کے بارے میں کیا فرماتی ہیں؟ (جلباب چادر ہے۔ نفاض شاید وہ کپڑا ہے جس کا گہرا رنگ دور کر دیا گیا اور رنگ کا کچھ اثر باقی رہ گیا اور صباغ رنگین کپڑا۔ والله أعلم بالصواب) تو فرمایا: اے عورتوں کے گروہ! تم سب کا ایک ہی قصہ ہے۔ اللہ نے تمھارے لیے زینت حلال کی اس طور پر کہ زینت کا اظہار کرنے والی نہ ہو، یعنی تمھارے لیے حلال نہیں ہے کہ تمھاری زینت کو کوئی غیر محرم مرد دیکھے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرا ایک شریک تھا، اس کو مسلم کہتے تھے اور وہ سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی بیوی کا غلام تھا۔ ایک دن وہ بازار کی طرف آیا اور اس کے ہاتھ میں منہدی کا اثر تھا تو میں نے اس سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے یہ خبر دی کہ اس نے اپنی مالکہ کے سر میں خضاب لگایا تھا، یہ عورت حذیفہ کی بیوی تھی، چنانچہ میں نے اس بات کا انکار کیا تو مسلم بولا: تو چاہے تو میں تجھے اس کے پاس لے چلوں؟ میں نے کہا: ہاں، پھر وہ مجھے اس کے پاس لے گیا تو وہ ایک جلیل بی بی تھیں، میں نے اُن سے کہا کہ مسلم نے مجھ سے یہ بیان کیا ہے کہ اس نے تمھارے سر میں خضاب لگایا، وہ بولیں: ہاں، اے میرے بیٹے! میں تو اُن بیٹھ رہنے والی عورتوں میں سے ہوں جو نکاح کی توقع نہیں رکھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو اس بارے میں فرمایا ہے وہ تو سن چکا ہے۔[3] قولہ تعالیٰ: ﴿وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ کپڑے اُتار رکھنا ان کو جائز ہے، لیکن ان کا اپنے کپڑوں کو نہ اتارنا بہتر و افضل ہے۔[4]

---

(1) مجمع بحار الأنوار (٢/ ٣١٩) (2) القاموس المحيط (١/ ١٦٦١)
(3) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣٩_ ٢٦٤٢) (4) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٠٢_ ٤٠٣)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ''قواعد'' سے مراد بوڑھی عورتیں ہیں، جو حیض سے بیٹھ رہی ہیں یا بڑھاپے کی وجہ سے نہ ان سے تمتع کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ بچہ جننے کے قابل ہیں، نہ ان کو حیض آتا ہے۔ قواعد کا واحد قاعد ہے بغیر تائے تانیث کے، تاکہ تا کا حذف اس پر دال ہو کہ وہ قعود بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔ جس طرح کے ''امرأة حامل'' بولتے ہیں، تاکہ حذفِ تا اس پر دلالت کرے کہ وہ حمل حبل ہے۔ محاورے میں جو عورت اپنے گھر میں بیٹھی ہوتی ہے تو اس کو ''قَاعِدَةٌ فِيْ بَيْتِهَا'' تائے تانیث کے ساتھ بولتے ہیں اور جو عورت اپنی پشت پر بوجھ لادے ہوتی ہے تو اس کو ''حَامِلَةٌ عَلَى ظَهْرِهَا'' کہتے ہیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عورتیں ہیں کہ تزویج سے بیٹھ رہی ہیں،[1] یعنی ان کا نکاح نہیں ہوا، یہی معنی ہیں اس قول کے: ﴿ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا ﴾ یعنی اپنے بڑھاپے کی وجہ سے نکاح میں طمع نہیں رکھتی ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ عورتیں ہیں کہ بچے سے بیٹھ رہی ہیں، یہ قول ٹھیک نہیں ہے، اس لیے کہ عورت بچے سے نا اُمید ہو کر بیٹھ رہتی ہے اور مرد اس سے اپنا کام نکال سکتا ہے۔[2] کسی نے کہا: وہ بڑھیا عورتیں ہیں کہ مرد جب ان کو دیکھتے ہیں تو گھن کرتے ہیں۔ رہی وہ عورت جس میں کچھ حسن و جمال باقی رہ گیا ہے اور وہ شہوت کا محل ہے تو وہ اس آیت کے حکم میں داخل نہ ہو گی۔

پھر اللہ پاک نے قواعد کے حکم کا ذکر کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ ﴾ ثیاب سے مراد وہ کپڑے ہیں جو ظاہر بدن پر ہوتے ہیں، جیسے جلباب و رِداء جو کپڑوں کے اوپر ہوتی ہیں اور قناع جو اوڑھنی کے اوپر ہوتا ہے اور اس جیسی دوسری چیزیں۔ اس سے مراد وہ کپڑے نہیں، جو عورتِ خاصہ پر ہوتے ہیں، یعنی تن ڈھانکتے ہیں اور خمار یعنی اوڑھنی۔ یہ ان کے لیے اس لیے جائز ہوا کہ دل ان سے پھرے ہوئے ہیں، کیوں کہ ان میں مردوں کو کسی طرح رغبت نہیں رہی ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان کو وہ شے مباح کر دی جو اُن کے غیر کے لیے مباح نہیں کی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس عورت پر کچھ گناہ نہیں جو اپنے گھر میں درع اور خمار کے ساتھ بیٹھے اور جلباب اپنے اوپر سے اتار رکھے، جب تک کہ اس چیز کے ساتھ تبرج نہ کرے، جس کو اللہ نے مکروہ رکھا ہے۔[3] دوسرے الفاظ ان سے یہ مروی ہیں کہ وہ اس طرح پڑھا کرتے تھے: ''أَنْ يَّضَعْنَ مِنْ ثِيَابِهِنَّ'' (اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بھی پڑھا ہے) اور فرماتے ہیں کہ وہ جلباب ہے۔[4]

---

[1] معاني القرآن (٤/ ٥٣) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٠٩) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٤١)

[4] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٩٣) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٤١) تفسير الطبري (١٩/ ٢١٧)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جلباب کو اتار رکھے۔[1] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اور رِداء کو زیادہ کیا ہے۔[2] پھر اللہ پاک نے ان کی حالتوں سے ایک حالت کا استثناء فرمایا: ﴿ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ﴾ یعنی وہ اس زینت کو ظاہر کرنے والی نہ ہو جس کے چھپانے کا ﴿ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ ﴾ [النور:٣١] ''اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں۔'' میں ان کو حکم دیا ہے، تاکہ مردان کو دیکھیں۔ یا مراد زینتِ خفی ہے، (جیسے قلادہ، سوار اور خلخال، یعنی زیور گلو بند، کنگن اور پازیب۔) تبرج کھلنے اور ظاہر ہونے کو کہتے ہیں آنکھوں کے لیے اور اس شے کو جو چھپی ہوئی ہے ظاہر کرنے کا تکلف کرنے کو کہتے ہیں اور عورت کے اپنی زینت اور خوبیوں کو مردوں کے لیے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی معنی سے ''بُرُوْجٌ مُّشَيَّدَةٌ'' و ''بُرُوْجُ سَمَاءٍ'' ہیں، اور اس بارے میں عرب کا قول ہے: ''سَفِيْنَةٌ بَارِجَةٌ''، یعنی وہ کشتی جس پر کوئی پردہ نہیں ہوتا ہے۔ ﴿ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ﴾ یعنی اگر وہ کپڑے اتارنے کو ترک کر دیں اور پاک دامنی چاہیں تو یہ ان کے لیے کپڑوں کو اتار کر رکھ دینے سے بہتر ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ''وَاَنْ يَتَعَفَّفْنَ'' پڑھا ہے بغیر سین کے۔[3] ﴿ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک کثیر السماع والعلم اور بلیغ السماع والعلم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔[4]

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا
عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ
اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ
اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ
اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ
مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ
اَشْتَاتًا ۭ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٦١﴾

اندھے پر کوئی حرج نہیں اور نہ لنگڑے ہی پر حرج ہے اور نہ مریض پر ہی کوئی حرج ہے اور نہ خود تمہی پر (کوئی حرج ہے) کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں یا اپنی ماؤں

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٢٢) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٢١٧)
[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٣١٠) [4] فتح البيان (٩/ ٢٦٣_ ٢٦٤)

کے گھروں یا اپنے بھائیوں کے گھروں یا اپنی بہنوں کے گھروں یا اپنے چچاؤں کے گھروں یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں یا اپنے ماموؤں کے گھروں یا اپنی خالاؤں کے گھروں یا (ان گھروں سے) جن کی چابیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں (کے گھروں) سے، (اس میں بھی) تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم مل کر کھاؤ یا الگ الگ، پھر جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں پر سلام کہو، (یہ) اللہ کی طرف سے بابرکت (اور) پاکیزہ تحفہ ہے، اسی طرح اللہ تمھارے لیے آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھو (61)

اعزہ واقرباء کے گھروں سے بلا اجازت کھانے پینے کی رخصت:

یعنی اپنائیت کے علاقوں میں کھانے کی چیز کے لیے ہر وقت پوچھنا ضروری نہیں ہے، نہ کھانے والا حجاب کرے نہ گھر والا دریغ کرے، مگر عورت کا گھر، اگر اس کا خاوند ہو تو اس کی مرضی چاہیے، اور اکٹھے ہو کر کھاؤ یا الگ الگ، اس کا دل میں خیال نہ رکھیے کہ کس نے کم کھایا اور کس نے زیادہ۔ سب نے مل کر پکایا سب نے مل کر کھایا، اور اگر ایک شخص کی کھلانے کی مرضی نہ ہو تو کسی کی چیز کھانا ہرگز درست نہیں، اور آپس کی ملاقات میں سلام کی پابندی لگا دی۔ آپس کی ملاقات میں اس سے بہتر کوئی دعا نہیں، جو لوگ اس کو چھوڑ کر اور الفاظ مقرر کرتے ہیں تو اللہ کی تجویز سے ان کی تجویز بہتر نہیں ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس معنی کے سبب سے اس جگہ اندھے، لنگڑے اور مریض سے حرج کو دور کیا گیا ہے، اس میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے:

1 امام عطاء خراسانی اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ نے کہا ہے: کہتے ہیں کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں نازل ہوئی ہے[1] اور اس جگہ اس آیت کو اس آیت کی طرح ٹھہرایا ہے جو سورۃ الفتح میں ہے اور وہ لامحالہ جہاد کے بارے میں ہے، یعنی ان لوگوں پر ضعف اور عاجزی کی وجہ سے جہاد کو ترک کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورت براءت میں فرمایا ہے: ﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿91﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴾ [التوبة: 91- 92] ''ضعیفوں اور بیماروں پر اور جو لوگ کوئی چیز نہیں پاتے کہ وہ خرچ کریں، ان پر (پیچھے رہنے میں) کوئی گناہ نہیں، جبکہ اللہ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (8/ 85)

اور اس کے رسول کے لیے خیر خواہی کرتے ہیں۔ نیکی کرنے والوں پر (گرفت کی) کوئی راہ نہیں۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور (اے نبی!) نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) جو آپ کے پاس آئے کہ آپ انھیں (سفرِ جہاد کے لیے) سواری دیں (اور) آپ نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں تو وہ اس حال میں لوٹ گئے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی تھیں کہ ان کے پاس کچھ نہیں جسے وہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کریں۔‘‘

2 کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اندھے کے ہمراہ کھانے میں حرج سمجھتے تھے، اس لیے کہ وہ کھانے کو اور ان عمدہ چیزوں کو، جو اس کھانے میں ہیں، دیکھتا نہیں ہے تو بسا اوقات جو اندھا نہیں ہے، وہ ان چیزوں کو جلدی سے لے لیتا ہے اور اسی طرح لنگڑے کے ساتھ کھانے میں حرج سمجھتے تھے، اس لیے کہ وہ جم کر بیٹھ نہیں سکتا تو اس کا ہم نشین اس سے سبقت لے جاتا ہے اور مریض کھانے میں سے اپنے غیر کی طرح نہیں کھاتا، پس ان وجوہ کے سبب ان لوگوں کے ہمراہ کھانے کو مکروہ سمجھا ہے، تاکہ وہ ان پر ظلم نہ کریں، اس پر اللہ پاک نے اس بارے میں رخصت دینے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ قول سعید بن جبیر و مقسم کا ہے۔

3 امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ مبعث سے پہلے ان لوگوں کے ساتھ کھانے میں حرج سمجھتے تھے، اس لیے کہ ان سے گھن کھاتے تھے اور اپنی جانوں کو عزیز سمجھتے تھے، اس لیے کہ ان پر تفضّل نہ کریں، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔

4 امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ آدمی اندھے کو یا لنگڑے کو یا مریض کو اپنے باپ کے گھر کی طرف لے جاتا، یا اپنے بھائی کے یا اپنی بہن کے یا اپنی پھوپھی کے یا اپنی خالہ کے گھر کی طرف، سو یہ اپاہج لوگ اس میں حرج سمجھتے تھے اور کہتے کہ ہم کو تو اپنے غیر کے گھروں کی طرف لے جاتے ہیں، اس پر یہ آیت ان کو رخصت دینے کے لیے نازل ہوئی۔

5 امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدمی اپنے باپ کے گھر میں داخل ہوتا یا اپنے بھائی یا اپنی بیٹی کے گھر میں، پھر عورت کھانے میں سے کسی شے کا اسے تحفہ دیتی تو وہ نہ کھاتا، اس وجہ سے کہ صاحبِ خانہ اس جگہ نہیں ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ﴾[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿وَلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ﴾ اس کو دو واسطے سے ذکر کیا: ایک یہ کہ اس کا غیر اس پر معطوف ہو لفظ میں۔ دوسرا یہ کہ مابعد اس کا اس کے برابر ہو جائے حکم میں اور یہ بیوتِ ابناء کو بھی شامل ہے، کیوں کہ ابناء پر نص نہیں کی گئی ہے اور اسی لیے اس سے استدلال کیا ہے اس شخص نے جو اس طرف گیا ہے کہ بیٹے کا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٤٣۔ ٢٦٤٦)

مال اس کے باپ کے مال کی طرح ہے۔ مسند وسنن میں چند وجوہ سے رسول اللہ ﷺ سے وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ»[1] یعنی تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ ﴾ یہ قول ظاہر ہے۔ کبھی اس سے وہ شخص استدلال کرتا ہے جو بعض اقارب کے نفقہ کو بعض پر واجب کہتا ہے، چنانچہ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب ہے، اس قول میں جو اُن سے مشہور ہے۔ رہا یہ قول: ﴿ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ ﴾ تو سعید بن جبیر اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ شخص آدمی کا خادم ہے غلام و قہرمان، یعنی داروغہ۔ پھر مالک نے جو طعام اس کی سپردگی میں رکھوایا ہے، اس میں سے اگر وہ دستور کے مطابق کھالے تو کچھ برائی نہیں ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے عن عروۃ عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے کہ مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جانے والے نفیر میں شامل ہونے کی رغبت رکھتے، (نفیر اس جماعت کو کہتے ہیں جو کسی کام کے لیے جاتی ہے۔ یہاں مراد غزوہ ہے) تو اپنی کنجیاں اپنے اپاہج لوگوں کو دے جاتے اور کہتے کہ ہم نے تمھارے لیے حلال کر دیا ہے کہ جس شے کی تمھیں حاجت ہو اس کو کھاؤ، پھر اپاہج لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو کھانا حلال نہیں ہے، اس لیے کہ انھوں نے اپنے دل کی خوشی سے ہم کو اجازت نہیں دی، ہم تو امانت دار ہیں۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ ﴾[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ﴾ یعنی اپنے صدیقوں اور اصحاب، یعنی دوستوں کے گھروں سے کھانے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، جب تم جان لو کہ یہ بات ان کو بری اور مشکل نہیں لگتی اور وہ اس کو مکروہ نہیں سمجھتے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جب تو اپنے دوست کے گھر میں داخل ہو تو کچھ خوف نہیں ہے کہ تو اس کے اذن کے بغیر کھالے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ﴾ علی بن ابی طلحہ نے اس کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ﴾ [النساء: ٢٩] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ'' تو مسلمانوں نے کہا کہ اللہ نے ہم کو منع کیا ہے کہ ہم اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے کھائیں اور طعام افضل اموال میں سے ہے۔ چنانچہ ہم میں سے کسی کو حلال نہیں کہ کسی کے پاس کھائے، اس لیے لوگ اس سے رک گئے۔ اس پر اللہ پاک نے ﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٠٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٩٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٣/ ٣٢٣)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٤٦۔ ٢٦٤٧)

عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ﴾ نازل فرمایا۔

نیز وہ اس میں عار کرتے تھے اور حرج سمجھتے تھے کہ آدمی اکیلا کھائے، یہاں تک کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی کھائے۔ اس پر اللہ پاک نے اس بارے میں ان کو رخصت دی۔ فرما دیا کہ تم پر کوئی گناہ نہیں، خواہ مل کر کھاؤ یا جدا ہو کر۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن کے ایک قبیلہ بنی کنانہ میں سے کوئی خیال کرتا تھا کہ اگر وہ تنہا کھائے تو یہ اس کی بے عزتی ہے۔ یہ جاہلیت کے دور میں تھا، یہاں تک کہ آدمی ذو وحفل، یعنی دودھ روکے ہوئے اونٹیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا، حالاں کہ وہ بھوکا ہوتا تھا، تاکہ وہ کوئی ایسا شخص پائے جو اس کے ساتھ کھائے پیے۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔[1]

چنانچہ یہ اللہ پاک کی طرف سے ایک رخصت ہے، اس بات کی کہ چاہے آدمی اکیلا کھائے چاہے جماعت کے ساتھ، اگرچہ جماعت کے ساتھ کھانا بہتر اور باعثِ برکت ہے، چنانچہ امام احمد نے "عن وحشي بن حرب عن أبيه عن جده" روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں اور سیر نہیں ہوتے۔ فرمایا: شاید تم متفرق ہو کر کھاتے ہو۔ تم اپنے کھانے پر اکٹھے ہو جاؤ اور اللہ کے نام کا ذکر کرو، تمھارے لیے اس میں برکت دی جائے گی۔[2] (ورواه أبو داود وابن ماجه من حديث الوليد بن مسلم به) ابن ماجہ نے بروایتِ عمر رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کھاؤ مل کر اور جدا مت ہو، بے شک برکت جماعت کے ساتھ ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ﴾ سعید بن جبیر، حسن بصری، قتادہ اور زہری رحمہم اللہ نے کہا: یعنی پس چاہیے کہ سلام کرے بعض تمھارا بعض پر۔[4] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: مجھے ابو الزبیر نے خبر دی کہ میں نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کو سنا، وہ کہتے تھے کہ جب تو اپنے گھر والوں پر داخل ہو تو ان پر سلام کر "تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً" (فتح القدیر اور فتح البیان میں یہ قول یہاں تک ہے: أخرجه البخاري وغيره) کہا میں نے اس کو نہیں دیکھا مگر برکت۔[5]

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا اور مجھے خبر دی زیاد نے ابن طاؤس سے کہ وہ کہتے تھے کہ تم میں سے کوئی اپنے گھر

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٤٨_ ٢٦٤٩)

[2] مسند أحمد (٣/ ٥٠١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٦٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٨٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٦٤)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٩١) اس کی سند میں "عمرو بن دینار قہرمان" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢/ ٢٨) البتہ حدیث کا پہلا جملہ صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٤٩_ ٢٦٥٠) [5] الأدب المفرد (١/ ٣٧٥) فتح البيان (٩/ ٢٧١)

میں داخل ہوتو چاہیے کہ سلام کرے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے عطاء سے کہا کہ کیا واجب ہے کہ جب میں نکلوں، پھر داخل ہوں تو اُن پر سلام کروں؟ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: نہیں، میں اس کے واجب ہونے کو کسی سے نقل نہیں کرتا ہوں، لیکن وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور میں اسے چھوڑتا نہیں ہوں مگر بھول کر۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت تو مسجد میں داخل ہوتو کہہ "اَلسَّلَامُ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ" اور جب تو اپنے گھر والوں پر داخل ہوتو اُن پر سلام کر اور جب تو ایسے گھر میں داخل ہو جس میں کوئی نہ ہو اس طرح کہہ: "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ".

امام ثوری رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ جب تو ایسے گھر میں داخل ہو کہ اس میں کوئی نہ ہو تو کہہ "بِسْمِ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا مِنْ رَّبِّنَا، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ" امام قتادہ رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب تو اپنے گھر والوں پر داخل ہوتو ان پر سلام کر اور جب ایسے گھر میں داخل ہو کہ اس میں کوئی نہ ہو تو کہہ: "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ" پس یقیناً اس کا حکم کیا جاتا تھا اور ہم سے حدیث بیان کی گئی ہے کہ فرشتے اس کو لوٹاتے ہیں، یعنی اس کا جواب دیتے ہیں۔[2]

حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مجھ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ باتوں کی وصیت کی، فرمایا: انس! تو اسباغ وضو کر، یعنی پورا کامل وضو کر، تیری عمر میں زیادتی کی جائے گی اور میری اُمت سے جو بھی تجھ سے ملے اسے سلام کر تیری نیکیاں بہ کثرت ہوں گی، اور جب تو اپنے گھر میں داخل ہوتو اپنے گھر والوں پر سلام کر تیرے گھر کی خیر بہ کثرت ہوگی، اور ضحیٰ کی نماز پڑھ، وہ یقیناً اوابین کی نماز ہے تجھ سے پہلے۔ اے انس! رحم کر چھوٹوں پر اور عزت کر بڑوں کی تو قیامت کے دن میرے ساتھیوں میں سے ہوگا۔[3] سبحان اللہ! کیسی عظیم الشان رفاقت کا وعدہ ہے۔ الٰہی سیدی! تو ہم کو ان اعمالِ صالح کی توفیق دے کہ ہم جیسے گناہگاروں کو بھی یہ دولت نصیب ہو، آمین۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ﴾ امام محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کہا کرتے تھے کہ میں نے تشہد کو نہیں لیا مگر کتاب اللہ سے۔ میں نے اللہ کو سنا کہ وہ یوں فرماتا ہے: ﴿ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ﴾ سو نماز میں تشہد یہ ہے: "اَلتَّحِيَّاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰهِ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ" پھر اپنے واسطے دعا کرے اور سلام پھیرے۔ اسی طرح امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حدیث ابن اسحاق سے روایت کیا ہے۔[4] صحیح مسلم میں جو عن ابن عباس عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، وہ اس کے مخالف ہے۔[5] واللّٰه أعلم.

---

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٢٢٥) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٥٠۔ ٢٦٥١)

[3] مسند البزار (١٤/ ١٢) اس کی سند میں "عوید بن ابی عمران جونی" سخت ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٥١۔ ٢٦٥٢) [5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٠٣)

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے اس سورتِ کریمہ میں احکامِ محکمہ وشرائعِ متقنہ مبرمہ (محکم اور مضبوط) ذکر کیے تو اپنے بندوں کو اس بات پر آگاہی بخشی کہ وہ اپنے بندوں کے لیے شافی کافی وافی بیان سے باتیں بیان کرتا ہے، تاکہ وہ ان کو سوچیں سمجھیں اور بوجھیں: ﴿ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ [1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اہلِ علم نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے کہ آیا محکم ہے یا منسوخ۔ اہلِ علم کی ایک جماعت تو اول کی قائل ہے اور ایک جماعت دوسرے کی۔ کہتے ہیں کہ مسلمان جس وقت غزوے کو جاتے تھے تو اپنے اپاہج لوگوں کو پیچھے چھوڑ جاتے اور اپنے دروازوں کی کنجیاں ان کو دے دیتے اور ان سے کہتے کہ ہم نے تمھارے لیے حلال کر دیا ہے کہ تم کھاؤ جو کچھ ہمارے گھروں میں ہے اور وہ اس سے حرج سمجھتے اور کہتے کہ ہم ان میں داخل نہ ہوں گے اور وہ لوگ غائب ہیں۔ اس پر ان کو رخصت دینے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ پس آیت کے معنی اپاہج لوگوں سے حرج کو دور کرنا ہے، جو انھیں اپنے اقارب کے گھروں سے کھانے میں تھا، یا اس شخص کے گھر سے کھانے میں تھا جو جہاد پر جاتے ہوئے ان کو کنجی دے دیتا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس شے کا جلیل تر قول ہے جو اس آیت میں روایت کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے توقیف ہے۔ [2]

کسی نے کہا ہے کہ یہ لوگ جن کا ذکر ہوا حرج یا گناہ سمجھتے تھے صحیح اور تندرست لوگوں کے ساتھ کھانے کو اس بات سے پرہیز کرنے کے لیے کہ وہ ان سے گھن کریں گے اور اس ڈر سے کہ وہ ان افعال سے ایذا پائیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کسی نے کہا: اندھے سے اس شے میں حرج دور کیا گیا، جو کہ اس تکلیف سے متعلق ہے۔ جس میں بصر (دیکھنا) شرط ہے اور لنگڑے سے اس شے میں جس کی تکلیف میں چلنے پر پوری قدرت شرط ہے، اس طرح سے کہ لنگڑے پن سے اس کا ادا کرنا مشکل ہے اور مریض سے اس شے میں کہ جس کے ساقط کرنے میں مرض موثر ہوتا ہے۔ ان کے سوا اور اقوال لکھے ہیں، لیکن چوں کہ بعض قول تو بعینہٖ اور بعض اقوال مذکورہ بالا کے لگ بھگ تھے اس لیے ان کے ذکر کی حاجت نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم پر حرج نہیں ہے اور نہ اس شخص پر جو مومنین میں سے تمھاری طرح ہے۔ یہ ابتدائے کلام مستانف ہے، یعنی اے لوگو! اور تم پر کچھ حرج نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اندھے، لنگڑے اور مریض سے حرج کو دور کرنا، اگر اس اعتبار سے ہے کہ وہ تندرست لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھائیں، یا اُن کے گھروں میں داخل ہوں تو اس صورت میں ﴿ وَلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ﴾ ماقبل سے متصل ہوگا اور اگر مذکورہ لوگوں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۰۳۔ ۴۰۶)
[2] تفسیر القرطبي (۱۲/ ۳۱۳)

سے حرج کو دور کرنا ان تکالیف کے اعتبار سے ہے جن میں آنکھ کا درست ہونا اور لنگڑا پن کا نہ ہونا اور بیماری کا نہ ہونا شرط ہوتا ہے تو ﴿ وَلَا عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ ﴾ ابتدائے کلام ٹھہرے گا۔ ماقبل سے متصل نہ ہوگا۔

﴿ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم کھاؤ اور جو کوئی تمھارے ساتھ ہے اپنے گھروں سے، جن میں تمھارا سامان و اسباب ہے اور تمھارے گھر والے ہیں۔ چنانچہ ﴿ بُيُوْتِكُمْ ﴾ میں بیوتِ اولاد بھی شامل ہیں۔ مفسرین نے اسی طرح کہا ہے، کیوں کہ اولاد کے گھر ان کے گھروں میں داخل ہیں، اس سبب سے کہ آدمی کے بیٹے کا گھر اس آدمی کا گھر ہے، اسی لیے اللہ پاک نے بیوتِ اولاد کا ذکر نہیں کیا اور بیوتِ آباء و بیوتِ امہات اور ان کے بعد دیگر کا ذکر فرمایا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض نے اس کا معارضہ کیا ہے۔ یوں کہا ہے کہ یہ اللہ پاک کی کتاب پر تحکم ہے (زبردستی ٹھونسنا ہے) بلکہ ظاہر میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ ابن یعنی اولاد اُن لوگوں کے مخالف ہوں۔[1] اس معارضے کا یہ جواب دیا ہے کہ اولاد کا رتبہ آباء کی نسبت کم نہیں ہے اس رتبے سے جو آباء کا اولاد کی نسبت سے ہے، بلکہ آباء کے لیے تو ایک خصوصیت ہے اولاد کے مالوں میں اس حدیث شریف کی وجہ سے: «أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ»[2] اور اس حدیث مبارک کے سبب سے کہ «وَلَدُ الرَّجُلِ مِنْ كَسَبِهِ»[3] ''یعنی مرد کا لڑکا اس کی کمائی سے ہے۔''

پھر یہ بات ہے کہ اللہ پاک نے بھائی بہنوں کے گھروں کا ذکر کیا، بلکہ چچا پھوپھی اور ماموں خالہ کے گھر کا ذکر کیا، تو بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ سبحانہ ان لوگوں کے گھر کے کھانے سے تو حرج کی نفی کرے اور اولاد کے گھر سے حرج کی نفی نہ فرمائے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اپنی بیویوں کے گھروں سے، کیونکہ بیوی کا گھر خاوند کے گھر کی طرح ہے اور اس لیے کہ میاں بیوی ایک نفس کی طرح ہو گئے ہیں۔ یک جان و دو قالب کی مثال یہاں خوب صادق آتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ ﴾ سے مراد ''مِنْ أَمْوَالِ عَيَالِكُمْ'' ہے، یعنی اپنے عیال کے مالوں سے، لیکن عمومیت زیادہ مناسب ہے تا کہ کُل کو شامل ہو جائے۔ بعض لوگوں نے کھانے کے جواز کو اجازت کے ساتھ مشروط کیا ہے، یعنی اگر ان مردوں نے جن کا ذکر کیا گیا اجازت دے رکھی ہے تو کھانا جائز ہے ورنہ خیر، کیوں کہ اذن دلالتاً ثابت ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ اذن شرط نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بغیر اجازت کھانے کا جواز اس وقت ہے جب طعام مبذول ہو، (یعنی کھلا رکھا ہوا ہے، کسی محفوظ جگہ میں بند نہیں رکھا ہوا۔) پھر اگر وہ محرز ہے، یعنی کسی محفوظ جگہ پر ہے جو ان سے پرے ہے تو اُن کو اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان میں ادنیٰ قرینہ کافی ہے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ ان میں یہ شرط کی جائے

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٣١٤) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٢٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٤٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧١١٩)

کہ ان کی عدمِ رضا کو نہ جانے بخلاف ان کے سوا اور اجنبی لوگ کہ ان میں صریح اذن یا قرینۂ قویہ کا ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ بات ہے جو مجھے ظاہر ہوئی۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس سے تعرض کیا ہو۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ ﴾ یعنی وہ گھر جن میں تصرف کرنے کے تم مالک ہوئے ہو گھر والوں کے اذن سے، یہ لوگ جیسے وکیل اور غلام اور خازن، کیوں کہ جس شخص نے ان کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دی ہے اور اس کی کنجی ان کو عطا کی ہے، اس کے گھروں میں تصرف کرنے کے وہ مالک ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد غلاموں کے گھر ہیں۔ جمہور کی قراءت "مَلَكْتُمْ" بہ فتحِ میم وتخفیفِ لام ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بضمِ میم وکسر وتشدیدِ لام پڑھا ہے۔ اور نیز "مَفَاتِيْحَهُ" حرفِ یائے تحتیہ کو داخل کیا ہے، تا وحا کے درمیان اور قتادہ رحمہ اللہ نے "مفتاحه" بصیغۂ مفرد پڑھا ہے۔ "مَفَاتِحُ" جمع ہے "مِفْتَحٌ" کی اور "مَفَاتِيْحُ" جمع "مِفْتَاحٌ" کی ہے۔

﴿ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے دوست کے گھروں سے کھاؤ، اگرچہ تمھارے اور اس کے درمیان کوئی قرابت نہ ہو، کیوں کہ غالب یہی ہے کہ دوست اپنے دوست کے لیے سخاوت کرتا ہے اور اس کا جی اس سے خوش ہوتا ہے۔ صدیق کا اطلاق واحد وجمع دونوں پر ہوتا ہے، اسی کے مثل عدو (دشمن) و خلیط (شریک) وقطین (مقیم) وعشیر (ساتھی مددگار) ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تو اپنے دوست کے گھر اس کے مشورے کے بغیر داخل ہو، پھر تو اس کے کھانے سے اس کی اجازت کے بغیر کھا لے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔[1] ابن زید رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ ایک شے ہے جو منقطع ہو چکی۔ یہ جو تھا تو اسلام کے شروع میں تھا۔ ان لوگوں کے دروازے نہ تھے اور پردے پڑے رہتے تھے، سو بسا اوقات آدمی گھر میں داخل ہوتا اور اس میں کوئی نہ ہوتا تو بسا اوقات کھانا پاتا اور وہ بھوکا ہوتا، تو اللہ پاک نے اس کو جائز کر دیا کہ اسے کھا لے اور کہا کہ وہ بات آج کے دن جاتی رہی۔ گھروں میں ان کے گھر والے ہیں، پس جس وقت وہ نکلتے ہیں تو بند کر جاتے ہیں۔[2] امام نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اب تو لوگوں پر انتہا درجے کا بخل غالب ہو گیا ہے، لہٰذا اب کھایا جائے تو صرف اذن سے کھایا جائے۔[3] انتھی.

امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن لوگوں کا ذکر ہوا، ان کے گھروں سے کھانا جائز ہے، گو وہ حاضر نہ ہوں، یعنی گیارہ قسم کے لوگ، جبکہ ان کی رضا کو صریحی طور پر جان لے[4] یا کسی قرینے سے ان کی رضا مندی کا علم ہو جائے، خواہ وہ قرینہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔ خاص طور پر ان لوگوں کا ذکر اس لیے کیا کہ ان کی آپس میں فراخ دلی ایک معمول کی بات ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اسلام کے شروع میں جائز تھا، پھر منسوخ ہو گیا۔ یہ بعینہٖ وہی ابن زید کا قول ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٤٨) الدر المنثور (٦/ ٢٢٥)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٤٦)
[3] تفسير النسفي (٣/ ١٥٨)
[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٦٨)

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ﴾ "أَشْتَاتٌ" "شت" کی جمع ہے۔ "شت" مصدر ہے الگ کے معنی میں۔ محاورے میں جس وقت لوگ متفرق ہوتے ہیں تو بولتے ہیں: "شَتَّ الْقَوْمُ" یعنی قوم متفرق ہوگئی، یہ جملہ کلام مستانف ہے جو ایک اور حکم کے بیان پر مشتمل ہے، پہلے احکام کی قسم سے ﴿ جَمِيْعًا ﴾ اور ﴿ اَشْتَاتًا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے۔ معنی یہ ہیں: "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوْا مُجْتَمِعِيْنَ أَوْ مُفْتَرِقِيْنَ" یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم مل جل کر کھاؤ یا جدا جدا ہو کر۔ بعض عرب تنہا کھانے کو گناہ سمجھتے تھے، یہاں تک کہ کسی ساتھ کھانے والے کو پائیں تو اس کے ساتھ کھائیں اور بعض نہیں کھاتے تھے مگر مہمان کے ساتھ، اسی بارے میں حاتم کا قول ہے ؂

إِذَا مَا صَنَعْتِ الزَّادَ فَالْتَمِسِيْ لَهُ   أَكِيْلًا فَإِنِّيْ لَسْتُ آكِلَهُ وَحْدِيْ

"یعنی جب تو نے توشۂ راہ پکایا تو اس کے لیے کوئی ساتھ کھانے والا تلاش کر، کیوں کہ میں تنہا اس کو نہ کھاؤں گا۔"

امام عکرمہ اور ابو صالح رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انصار کے ہاں جس وقت مہمان اترتا تو وہ کھاتے نہ تھے جب تک کہ مہمان ان کے ساتھ نہ کھائے۔ چنانچہ یہ آیت ان کی رخصت کے لیے نازل ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حارث رضی اللہ عنہ غازی ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلا اور اپنے گھر والوں پر خالد بن یزید کو خلیفہ کر گیا، اس نے اس بات میں حرج سمجھا کہ اس کے کھانے میں سے کھائے اور وہ مجہود تھا، یعنی مفلس تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ترجمۃ الباب یوں لکھا ہے: "بَابُ قَوْلِهٖ تَعَالٰی: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ ... الخ ﴾"[2]

اہلِ علم نے جو کہا ہے اس میں یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا اس باب میں یہ مقصد ہے کہ تمام کو اباحت ہے کھانے کی گو کھانے میں ان کے حالات مختلف ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جائز فرمایا، سو یہ سنت ہو گیا ان جماعتوں میں جو کھانے کی طرف بلائی جاتی ہیں نہد و ولائم میں اور اس افلاس میں جو سفر میں واقع ہوتا ہے اور اس گھر میں جس کی کنجیوں کا بوجہ امانت یا قرابت و رشتے داری یا صداقت و دوستی کے تو مالک ہوا ہے، چنانچہ تجھے جائز ہے کہ تو کھائے قریبی رشتے دار کے ساتھ یا دوست کے ساتھ یا تنہا ہو کر۔ نہد وہ مال یا کھانا ہے جس کو رفیق لوگ اپنے نفقے کے مطابق جمع کرتے ہیں اور اس کو باہم خرچ کرتے ہیں۔ امام ابن دُرَید نے کہا ہے کہ اسی بارے میں یوں کہا جاتا ہے: "تَنَاهَدَ الْقَوْمُ الشَّيْءَ بَيْنَهُمْ"

امام ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدیث حسن میں ہے: «أَخْرِجُوْا نَهْدَكُمْ فَإِنَّهٗ أَعْظَمُ لِلْبَرَكَةِ وَأَحْسَنُ لِأَخْلَاقِكُمْ» نہد وہ ہے جس کو رفیق لوگ مناہدہ کے وقت نکالتے ہیں، وہ یہی سفر وغیرہ میں نفقہ کا برابر تقسیم کرنا ہے۔[3] اسی نہد سے گوٹ ہے، جس کو اہلِ ہند کیا کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ دس بیس آدمی اتفاق کرتے ہیں، پیسے یا روپیہ

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٢٥) [2] صحيح البخاري (٥/ ٢٠٥٨) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ٣١٧)

یا آٹا وغیرہ سب سے برابر وصول کرتے ہیں، پھر سب کو جمع کر کے کھانا پکاتے ہیں، پھر سب مل جل کر اس کو کھا لیتے ہیں۔ ہر شخص اپنی بھوک اور جثّہ کے مطابق کھاتا ہے کوئی زیادہ کوئی کم، مگر کسی کو اصلاً اس کی شکایت نہیں ہوتی۔

غرضیکہ پھر اللہ پاک نے ایک اور ادب کا بیان شروع کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ ﴾ اللہ سبحانہ اپنے بندوں کو ادب سکھاتا ہے کہ جس وقت تم گھروں میں داخل ہو، سوائے ان گھروں کے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے تو اُن کے گھر والوں کو سلام کرو، جو بہ منزلہ تمھارے اپنے نفوس کے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان بیوت سے مراد وہی بیوت ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا، چنانچہ پہلے قول کی بنا پر امام حسن اور نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ گھر مسجدیں ہیں اور ''سَلِّمُوْا'' سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ تمھاری طرح کے ان میں موجود ہیں ان پر سلام کرو۔ پھر اگر مسجدوں میں کوئی نہ ہو تو بعض نے کہا کہ ''اَلسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ'' کہے اور کسی نے کہا ہے کہ ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کہے اور فرشتوں کی نیت کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ'' کہے۔[1] یہ اقوال تفصیل کے ساتھ پہلے ہی گزر چکے ہیں۔

دوسرے قول کی قائل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت ہے، وہ قول یہ ہے کہ بیوت سے مراد وہی بیوت ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ بیوت سے مراد تمام بیوت ہیں، بستے ہوئے گھر ہوں یا وہ جن میں سکونت نہیں ہے۔ جو گھر بستے ہوئے ہوں تو اُن کے لوگوں پر سلام کرے اور جو بستے نہیں ہیں اور خالی ہیں تو اپنے آپ پر سلام کرے اور اس طرح کہے: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ'' امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ بیوت میں عموم کا قائل ہو، تخصیص پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ قول کا اطلاق اس لیے کیا ہے کہ اس میں ہر گھر خواہ اپنا ہو یا پرایا سب کے سب داخل ہو جائیں۔ پھر جب پرائے گھر میں داخل ہو تو اجازت طلب کرے۔[2]

﴿ تَحِيَّةً ﴾ منصوب ہے مصدریت کی بنا پر، کیوں کہ ﴿ فَسَلِّمُوا ﴾ کے معنی ہیں: ''فَحَيُّوْا''، ''أَيْ: فَحَيُّوْا تَحِيَّةً ثَابِتَةً صَادِرَةً مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ'' یعنی نیک دعا دو، ایسی نیک دعا جو اللہ پاک کی طرف سے ثابت اور صادر ہے اور اس کے پاس سے ہے، یعنی اللہ نے تم کو نیک دعا دی ہے اس کے ساتھ۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے کہ تم اس کو اللہ کی فرماں برداری کے واسطے کرو۔

پھر اللہ پاک نے اس تحیت کی یہ تعریف فرمائی کہ ﴿ مُبٰرَكَةً ﴾، یعنی یہ نیک دعا ''كَثِيْرَةُ الْبَرَكَةِ وَالْخَيْرِ، دَائِمَةُ الْبَرَكَةِ وَالْخَيْرِ'' ہے۔ اس کی خیر و برکت بہت ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس پر ثواب دیا جائے گا۔ ﴿ طَيِّبَةً ﴾ یعنی سننے والے کا جی اس سے خوش ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ طَيِّبَةً ﴾ کے معنی ''حَسَنَةً جَمِيْلَةً'' ہیں۔

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٢٦) تفسير القرطبي (١٢/ ٣١٨) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٣١٨)

مطلب یہ ہے کہ اس میں لفظ اور معنی دونوں کی خوبی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے یہ بات بتائی کہ سلام مبارک اور طیب ہے، اس لیے کہ اس میں اجر وثواب ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ سلام ہے، کیوں کہ سلام اللہ کا نام ہے اور وہ اہلِ جنت کا تحفہ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ وہ مسجد ہے جب تو اس میں داخل ہو تو کہہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ"[2] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس وقت تو غیر آباد گھر میں یا مسجد میں داخل ہو تو کہہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ"[3]

پھر اللہ پاک نے ﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ﴾ کو دوبارہ ذکر فرمایا، ما سبق کی تاکید کے لیے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ "ذلك" کا اشارہ فعل کے مصدر کی طرف ہے۔ جملہ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ تبیین کی وجہ ہے، یعنی اللہ پاک کھول کھول کر بیان فرماتا ہے اور مفصل ومشرح فرماتا ہے تمھارے لیے تمھارے معالمِ دین کو اس اُمید سے کہ تم اللہ پاک کی باتوں کو بوجھو اور اُن کے معانی کو سمجھو۔[4]

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾

بس مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، اور جب وہ رسول کے ساتھ کسی اجتماعی کام پر ہوتے ہیں تو آپ سے اجازت لیے بغیر (وہاں سے) چلے نہیں جاتے، (اے نبی!) بلاشبہ جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں، وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، چناں چہ جب وہ اپنے کسی کام کے لیے آپ سے اجازت مانگیں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دیں، اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت مانگیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے (62)

اجتماعی کام سے جانے کے لیے رخصت لینا:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک ادب ہے جس کا اللہ پاک نے اپنے بندوں کو ارشاد فرمایا ہے۔

---

(1) فتح القدير (٤/ ٧٣٠)
(2) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٥١۔ ٢٦٥٠)
(3) الأدب المفرد (١/ ٣٦٣) الدر المنثور (٦/ ٢٢٨)
(4) فتح البيان (٩/ ٢٦٥۔ ٢٧١)

جس طرح داخل ہونے کے وقت ان کو اجازت لینے کا حکم دیا، اسی طرح واپس جانے کے وقت اذن طلب کرنے کا حکم دیا ہے، خصوصاً جبکہ وہ کسی جمع ہونے کے کام میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ہوں۔ مثلاً جمعہ کی نماز میں یا جماعت میں یا عیدین میں یا کسی مشورے کے لیے کوئی اجتماع ہو اور اس جیسا کوئی اور کام ہو۔ اللہ پاک نے ان کو حکم فرمایا ہے کہ ایسی حالت میں اجازت لینے اور مشورہ لینے کے بعد علاحدہ ہوں۔ جس کسی نے ایسا کام کیا تو بے شک وہ کامل مومنوں کے زمرے میں ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسولِ کریم رؤف رحیم کو یہ حکم دیا کہ ان مومنین میں سے جب کوئی جانے کی اجازت مانگے تو اگر چاہیں تو اس کو اجازت دے دیں۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَأْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ ﴾ امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مجلس میں پہنچے تو چاہیے کہ سلام کرے، پھر جب اٹھنے کا ارادہ کرے تو چاہیے کہ سلام کرے، چنانچہ پہلا سلام دوسرے سلام سے زیادہ ضروری نہیں ہے۔[1] (وهكذا رواه الترمذي والنسائي من حديث محمد بن عجلان به وقال الترمذي: حديث حسن) اس حدیث میں ابو داود کے استاد احمد بن حنبل و مسدد ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جملہ ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ ﴾ مستأنفہ ہے۔ ماقبل میں جو احکام بیان ہو چکے ہیں اس کی تقریر و تثبیت کے لیے لایا گیا ہے۔ کلمہ ﴿ إِنَّمَا ﴾ کا حصر کے صیغوں سے ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ایمان کامل پورا نہیں ہوتا، یہاں تک کہ اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسول پر۔ جملہ ﴿ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ معطوف ہے ﴿ اٰمَنُوْا ﴾ پر، اس کے ساتھ صلہ کے حیز میں داخل ہے، یہ گویا دوسرا صلہ ہے اور محط کمال ہے۔ ﴿ أَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ سے مراد امرِ طاعت ہے، یعنی جس وقت وہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ہوں، کسی امرِ طاعت پر جمع ہوں، جیسے: جمعہ، جماعت، عیدین اور جہاد یا کسی کام میں مشورہ کی خاطر یا اس جیسا کوئی اور کام ہو۔ امر کا نام ﴿ جَامِعٍ ﴾ مبالغے کے لیے رکھا ہے۔ اس میں اس لیے اسناد مجازی ہے کہ امر چونکہ ان کو جمع کرنے کا سبب تھا، اس لیے جمع کی نسبت امر کی طرف کر دی گئی بطور مجاز کے۔ کسی نے "عَلَى أَمْرٍ جَمِيعٍ" بھی پڑھا ہے۔ یہ شخص یمانی ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ امرِ جامع و جمیع وہ ہے جس کا نفع یا نقصان عام ہوتا ہے، یہ وہ اہم اور جلیل القدر امر ہے کہ جس کے لیے اہلِ رائے اور تجربہ کار لوگوں کا جمع ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ﴿ لَمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ﴾ یعنی جب ایسا کام ہو تو نبی اکرم ﷺ کے پاس سے متفرق نہ ہوں اور جس کام کے لیے جمع ہوئے ہیں اس سے چلے نہ جائیں، کسی عذر کی وجہ سے جو انھیں پیش آ گیا ہو، یہاں تک کہ ان سے اجازت لے لیں۔ اجازت مانگنے کا اعتبار ان

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٠٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٠٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٠٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٠٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٠٠)

کے کمال ایمان میں ہے، کیوں کہ وہ ایمان کے صحیح ہونے کی نشانی ہے اور اس سے اس شخص کی تمیز ہوتی ہے جو ایمان میں مخلص ہے منافق سے، اس لیے کہ منافق کی عادت تو کھسک جانا اور فرار ہو جانا ہے۔ اجازت لینے کا حکم اس لیے بھی ہے کہ اس سے مجلس میں سے رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر چلے جانے کے جرم کی سنگینی ظاہر ہو۔ مفسرین نے کہا ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ جمعے کے دن منبر پر چڑھتے اور آدمی چاہتا کہ مسجد سے نکلے کسی حاجت یا کسی عذر کی وجہ سے تو وہ نہ نکلتا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسی جگہ پر کھڑا ہوتا کہ آپ ﷺ اس کو دیکھ لیتے تو آپ ﷺ پہچان لیتے کہ وہ جو کھڑا ہے تو اس لیے کہ اذن مانگتا ہے۔ پھر آپ ﷺ ان میں سے جس کو چاہتے اذن دے دیتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمعے کے دن امام کا اذن یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے اشارہ کر دیتا ہے۔[1]

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے یہ بات بتائی کہ مومنین جب اپنے نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ کسی ایسے کام کے لیے جمع ہوں جس کے لیے جماعت کی حاجت ہوتی ہے تو اُن سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ اسی طرح چاہیے کہ اگر امام کے ساتھ ہوں تو اس کی مخالفت نہ کریں اور اپنے مجمعوں میں سے کسی مجمع میں سے اس کی اجازت کے بغیر واپس نہ جائیں اور امام کے لیے یہ بات ہے کہ وہ چاہے تو اجازت دے دے چاہے نہ دے جیسی اس کی رائے ہو، کیوں کہ اللہ پاک نے اس طرح فرمایا ہے: ﴿ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ ﴾[2]۔ علماء نے کہا ہے کہ ہر کام جس پر مسلمان اپنے امام کے ہمراہ جمع ہوں تو اس کی مخالفت نہ کریں اور نہ اس کے پاس سے لوٹ کر جائیں، مگر اس کی اجازت سے۔

پھر اللہ پاک نے اس امر کی بہت مؤثر انداز میں تاکید و تعظیم فرمائی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ پس اللہ سبحانہ بیان فرماتا ہے کہ جو لوگ اجازت مانگنے والے ہیں، وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں، جیسے پہلے یہ حکم دیا کہ کامل ایمان والے مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور اذن مانگنے کو جمع کرنے والے ہیں اور جو شخص بغیر اجازت کے جانے والا ہے وہ ایسا نہیں ہے۔ ﴿ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ ﴾ یعنی جس وقت مومنین رسول اللہ ﷺ سے اپنے بعض امور کے لیے جو اُن کو پیش آتے ہیں اور ان کو فکر اور اندیشہ میں ڈالتے ہیں، اجازت مانگیں تو ﴿ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ ﴾ تو رسول اللہ ﷺ ان میں سے جس کو چاہیں اجازت دے دیں اور جس کو مصلحت کے تقاضے کے تحت چاہیں اذن نہ دیں۔ اس میں آپ ﷺ کی شان مبارک کا بلند کرنا ہے۔ جس طرح کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو واقع ہوا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ غزوۂ تبوک کے لیے نکلے تو انھوں نے آپ ﷺ سے اپنے گھر کی طرف لوٹ جانے کا کسی کام کے لیے اذن مانگا تو آپ ﷺ نے ان کو اذن دے دیا اور ان سے فرمایا تو لوٹ جا « فَلَسْتَ بِمُنَافِقٍ » یعنی اس لیے کہ تو منافق نہیں

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٥٢۔ ٢٦٥٣) [2] معاني القرآن (٤/ ٥٥)

ہے۔ اس سے کسی نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ بعض احکام آپ کی رائے کے سپرد ہیں اور جو شخص اس کا انکاری ہے تو اس نے مشیت کو اس بات کے ساتھ مقید کیا ہے کہ مشیت آپ کے اس شخص کی سچائی کے بارے میں علم کی تابع ہے، یعنی تو اذن دے دے اس شخص کو جس کا تجھے علم ہے کہ اس کو کوئی عذر ہے۔

پھر اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ ان کے لیے مغفرت مانگیں: ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۚ ﴾ یعنی اذن دینے کے بعد تو اُن کے لیے بخشش مانگ۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اذن مانگنا گو کسی جائز عذر کے لیے ہو، پھر بھی اس شائبے سے خالی نہیں ہے کہ دنیا کے معاملے کو آخرت کے معاملے پر اختیار کیا ہو، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کی مجالس کو اذن مانگنے سے بہتر سمجھنا چاہیے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک بندوں کے قصوروں اور فتوروں کے لیے کثیر المغفرت ہے اور ان پر آسانی کرنے اور مغفرت کرنے میں کثیر الرحمت ہے اور اس میں وہ وہاں تک پہنچنے والا ہے، جس کے آگے کوئی اور انتہا نہیں ہے۔[1]

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿63﴾

تم رسول کے بلانے کو باہم ایک دوسرے کو بلانے کے مانند نہ ٹھہراؤ، یقیناً اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں، لہٰذا چاہیے کہ جو لوگ اس (اللہ اور اس کے رسول) کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اس (بات) سے ڈریں کہ انھیں کوئی آزمائش آ پڑے یا انھیں دردناک عذاب آ لے (63)

رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہونے کے ادب کا بیان:

نبی اکرم ﷺ کے بلانے سے حاضر ہونا فرض ہوتا تھا جس کام کے لیے بلائیں، پھر یہ بھی تھا کہ وہاں سے بلا اجازت چلے نہ جائیں، اب بھی اپنے سرداروں کے ساتھ سب کو اسی طرح کرنا چاہیے۔ انتہیٰ. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ لوگ کہا کرتے تھے: "یا محمد، یا أبا القاسم" اللہ عزوجل نے اس سے ان کو منع فرما دیا، اپنے نبی کی عظمت کی خاطر کہا کہ تم اس طرح کہا کرو: "یا نبي الله، یا رسول الله"۔ اسی طرح امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ

[1] فتح البیان (۹/ ۲۷۲۔۲۷۴)

نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے حکم فرمایا: "أَنْ يُهَابَ نَبِيُّهُ ﷺ وَأَنْ يُبَجَّلَ وَأَنْ يُعَظَّمَ وَأَنْ يُسَوَّدَ"، مطلب یہ ہے کہ اس کے نبی کی ہیبت کی جائے اور تجیل و بزرگی کی جائے اور تعظیم وعظمت کی جائے اور سیادت وسرداری کی جائے۔ مقاتل رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم ان کا نام مت لو جب ان کو پکارو، یعنی "یا محمد" نہ کہو اور نہ ہی یا "ابن عبداللہ" کہو، لیکن ان کی بزرگی کرو، اس طرح کہا کرو: "يا نبي الله، يا رسول الله"۔ امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ اللہ نے ان کو حکم دیا ہے کہ ان کی بزرگی کریں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ کی روایت کے ایک الفاظ یہ ہیں کہ "أَمَرَهُمْ أَنْ يُشَرِّفُوْهُ وَيُفَخِّمُوْهُ"[1] (كذا في الفتحين)

یہ ایک قول ہے اور سیاق سے یہی ظاہر ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [البقرة: ١٠٤] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم (نبی سے یہ) نہ کہو: [رَاعِنَا] بلکہ یہ کہو: [اُنْظُرْنَا] اور تم غور سے سنو اور کافروں کے لیے بہت دردناک عذاب ہے۔" نیز فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۞ وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الحجرات: ٢۔ ٥] "اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور آپ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو، جیسے تم ایک دوسرے سے اونچی آواز میں (بات) کرتے ہو، کہیں تمھارے عمل برباد نہ ہو جائیں اور تمھیں خبر تک نہ ہو۔ بلاشبہہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے بخشش اور بہت بڑا اجر ہے۔ بلاشبہہ جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اور اگر بے شک وہ صبر کرتے، حتی کہ آپ (خود ہی) ان کی طرف نکلتے، تو ان کے لیے بہت بہتر ہوتا، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

یہ سب نبی اکرم ﷺ کو خطاب کرنے اور آپ ﷺ سے بات کرنے کے بارے میں ادب کی تعلیم ہے اور آپ ﷺ کے پاس بیٹھنے کے آداب سکھائے گئے ہیں، جس طرح کہ ان کو حکم ہوا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ پیش کریں۔ اس بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ تم اس بات کا اعتقاد نہ کرو کہ نبی اکرم ﷺ کی اپنے غیر کے لیے دعا اسی طرح ہے جس طرح کسی دوسرے کی غیر کے لیے دعا ہے، کیوں کہ ان کی دعا تو مستجاب (قبول ہونے والی) ہے، لہٰذا تم اس بات سے بچو کہ نبی اکرم ﷺ تم پر

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٥٤۔ ٢٦٥٥) تفسير الطبري (١٩/ ٢٣٠)

بددعا کریں اور تم ہلاک ہو جاؤ۔ اس قول کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری اور عطیہ عوفی رحمہما اللہ سے نقل کیا ہے۔[1] واللہ سبحانہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ﴾ مقاتل بن حیان نے کہا ہے کہ یہ لوگ منافق ہیں جمعہ کے روز حدیث ان پر بھاری ہوتی تھی، یعنی خطبہ تو یہ لوگ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پناہ پکڑتے تھے کہ مسجد سے نکل جائیں اور کسی کو یہ بات لائق نہ تھی کہ جب جمعے کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ شروع فرمائیں تو وہ بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے مسجد سے نکل جائے اور جب کوئی شخص نکلنے کا ارادہ کرتا تو اپنی انگلی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اجازت دے دیتے تھے، اس کے بغیر کہ وہ شخص کلام کرے، اس لیے کہ اُن میں سے کوئی اگر خطبے کے دوران کلام کرتا تو اس کا جمعہ باطل ہو جاتا تھا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ جس وقت آپ کے ساتھ اجتماع میں ہوتے تو اُن کا بعض کسی دوسرے سے پناہ پکڑتا، تاکہ آپ سے غائب ہو جائیں تو آپ اُن کو نہ دیکھیں۔ قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: "لِوَاذًا عَنْ نَبِيِّ اللّٰهِ وَعَنْ كِتَابِهِ"۔ سفیان نے کہا: "لِوَاذًا مِنَ الصَّفِّ"، مطلب یہ ہے کہ آنکھ بچا کر کھسک جاتے، اللہ کے نبی سے اور اس کی کتاب سے یا صف سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "خِلَافًا"، یعنی خلاف کر کے کھسک جاتے ہیں۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ ﴾ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے۔ امر یہی آپ کی سبیل اور راہ ہے اور آپ کا منہاج، طریقہ، سنت اور شریعت ہے، پس اُن کے اقوال و اعمال آپ کے اقوال و اعمال سے تولے جائیں تو جو قول و عمل اس کے موافق ہے، وہ مقبول ہے اور جو اس کے مخالف ہے، وہ مردود ہے اس کے قائل اور فاعل پر وہ کوئی ہو، جیسا کہ صحیحین وغیرہما میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کسی نے کوئی ایسا عمل کیا کہ اس پر ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ رد ہے۔[3] یعنی پس چاہیے کہ وہ لوگ ڈریں، جو باطناً و ظاہراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے خلاف کرتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو کوئی فتنہ پہنچے، یعنی ان کے دلوں میں کفر یا نفاق یا بدعت آجائے یا ان کو عذابِ الیم پہنچے، دنیا میں قتل ہو کر یا حد کی تعزیر پا کر یا قید ہو کر یا اس طرح کی اور تکلیف آئے، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اور تمھاری مثل اس شخص کی مثال کی طرح ہے کہ اس نے آگ جلائی، پھر جب اس نے اپنے اردگرد کی اشیا کو روشن کر دیا تو پتنگے اس میں گرنے لگے اور آگ جلانے والا ان کو روکنے لگا اور وہ اس پر غلبہ کر رہے ہیں اور بے دھڑک اس میں گر رہے ہیں، فرمایا: یہ ہے میری مثال اور تمھاری مثال، میں تو تمھاری حُجز کو پکڑتا ہوں، یعنی تمھاری کمروں کو، تاکہ تمھیں آگ میں گرنے سے بچاؤں اور تم مجھ پر غالب آجاتے ہو اور اس آگ میں بے دھڑک گرتے ہو۔[4] (أخرجاه من حديث عبد الرزاق)

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲٦٥٥) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲٦٥٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۵۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۱۸)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦١١٨) صحیح مسلم (۲۲۸٤) مسند أحمد (۲/ ۳۱۲) تفسیر ابن کثیر (۳/ ٤٠٦۔ ٤٠٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جملہ ﴿ لَا تَجْعَلُوْا ... الخ﴾ مستانفہ ہے ماقبل کی تقریر کرتا ہے، یعنی رسول جو تم کو بلاتا ہے تو اس کے بلانے کو تم کسی اور کے بلانے کی طرح نہ سمجھو تساہل اور سستی کرنے میں کہ بعض حالات میں تم جواب دینے سے سستی کرتے ہو اور بغیر اجازت مانگے لوٹ جاتے ہو۔ یا اپنی آواز بلند کرتے ہو، بلکہ تم تو رسول کو فوراً جواب دو، گو تم نماز ہی میں کیوں نہ ہو۔ امام سعید بن جبیر اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ تم نہایت رفق اور نرمی سے ''یا رسول اللہ'' کہا کرو اور ترش روئی کے ساتھ ''یا محمد'' نہ کہا کرو۔[1] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم رسول کو خفا کر کے اس کی بد دعا کے درپے نہ ہونا، کیوں کہ ان کی دعا واجب کرنے والی ہے، مطلب یہ ہے کہ تم ان کی بد دعا کا سامنا مت کرو، کیوں کہ رسول کی دعا مقبول ہے، وہ تم پر عذاب کو واجب کر دے گی۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم پر رسول کے حکم کو فوراً مان لینا واجب ہے۔ امام ابو العباس رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ ... الخ ﴾ اس قول کا مؤید ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم رسول کی اپنے رب سے دعا کو اس طرح کی دعا نہ سمجھو جیسی تمھارے چھوٹے اور بڑے اور فقیر اور غنی کرتے ہیں، اللہ سے کوئی حاجت مانگتے ہیں، کبھی تو ان کی دعا قبول ہوئی اور کبھی نہیں، کیوں کہ رسول کی دعائیں سنی جاتی ہیں اور قبول ہوتی ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں مروی ہے، یعنی اس طرح کی پکار نہ سمجھو، جیسے تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو اس کا نام لے کر پکارتا ہے، لیکن تم تو رسول کی عزت و توقیر کرو، اس سے کہو: ''یا رسول اللہ، یا نبی اللہ''۔ اس پر دور سے ایسے مت چیخو ''یا ابا القاسم'' لیکن جس طرح اللہ پاک نے سورۃ الحجرات میں فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﴾[2] [الحجرات: ۳] ''بلاشبہہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں۔'' پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جانتا ہے جو سرک جاتے ہیں مسجد سے خطبے میں ایک ایک کر کے بغیر اجازت مانگے ہوئے خفیہ طور پر کسی شے سے چھپے ہوئے۔ کلمۂ ﴿ قَدْ ﴾ تحقیق کے لیے ہے۔ ''تسلل'' چھپ کر درمیان میں سے نکل جانے کو کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنے ساتھیوں کے درمیان سے نکل جاتا ہے تو اس وقت عرب کے محاورے میں اس طرح بولتے ہیں: ''تَسَلَّلَ فُلَانٌ مِنْ بَيْنِ أَصْحَابِهٖ''

﴿ لِوَاذًا ﴾ ''ملاوذة'' سے ماخوذ ہے۔ ''ملاوذة'' یہ ہے کہ تو کسی چیز کی آڑ میں اس خوف سے چھپ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲٦٥٥) [2] فتح القدير (٤/ ۸۰)

جائے کہ کہیں وہ شخص تجھے دیکھ لے۔ اصل اس کی یہ ہے کہ یہ اس کی پناہ لے اور وہ اس کی۔ ”وَاللَّوْذُ مَا يُطِيفُ بِالْجَبَلِ“ یعنی جو شے پہاڑ کو گھیرے ہوتی ہے، اس کو لوذ بولتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ لواذ روغان ہے (روغ و روغان لومڑی کے بھاگ نکلنے کو کہتے ہیں)، ایک شے سے دوسری شے کی طرف چھپنا۔ ﴿ لِوَاذًا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے: ”أَيْ: مُتَلَاوِذِيْنِ، أَيْ: يَلُوْذُ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ“ یعنی اس حال میں سرک جاتے ہیں کہ بعض بعض کی پناہ لیتا ہے، ایک سے ملتا ہے دوسرے سے چپکتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا نصب بنا بر مصدریت ہے۔ فعل محذوف کے لیے کہ حقیقت میں حال وہی ہے، یعنی ”يَلُوْذُوْنَ لِوَذًا“ مطلب یہ ہے کہ اس حال میں سرک جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کی پناہ لیتے ہیں۔

یزید بن قطیب نے ”لَوَاذًا“ بفتحِ لام پڑھا ہے۔[1] غرضیکہ آیتِ کریمہ میں اس حالت کا بیان ہے جو منافقوں سے واقع ہوتی تھی کہ وہ جمعہ کی نماز سے سرک جاتے تھے ایک دوسرے کی پناہ لیتے ہوئے اور ایک دوسرے سے چپک کر رسول اللہ ﷺ سے چھپتے ہوئے۔ جمعہ کا دن منافقوں پر سب دنوں سے زیادہ سخت ہوتا تھا، کیوں کہ وہ لوگوں کا نماز و خطبہ کے لیے جمع ہونا دیکھتے تھے، وہ حاضر ہونے سے جان چھڑاتے تھے اور چھپ کر سرک جاتے تھے اور اُن میں سے ایک دوسرے کے ساتھ چپک کر اور چھپ کر نکل جاتا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لِوَاذًا ﴾ جہاد سے بھاگنا ہے۔[2] (وَبِهِ قَالَ الْحَسَنُ)

امام مقاتل رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ کوئی نکسیر یا حدث کرنے کے سبب سے نکلتا نہ تھا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ سے اجازت مانگتا۔ آپ ﷺ کی طرف اپنے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتا تو نبی اکرم ﷺ اس کو اپنے دست مبارک سے اجازت دیتے، اس کی طرف اشارہ فرما دیتے، اور منافقوں میں سے وہ شخص تھا جس کو مسجد میں بیٹھنا اور خطبہ سننا گراں گزرتا تھا تو جب مسلمانوں میں سے کوئی شخص اجازت طلب کرتا تو منافق اس کے پہلو کی طرف کھڑا ہوتا، اس کی آڑ میں چھپتا، یہاں تک کہ نکل جائے۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی۔[3]

(أخرجه أبو داود في مراسيله)

﴿ فَلْيَحْذَرِ ﴾ میں حرفِ فا ماقبل پر مابعد کی ترتیب کے واسطے ہے، فعل مخالفت (﴿ يُخَالِفُوْنَ ﴾) کلمۂ ﴿ عَنْ ﴾ کے ساتھ متعدی کیا گیا، باوجود اس کے کہ وہ خود متعدی ہوتا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو معنی اعراض یا صَدّ کا متضمن کیا ہے اور یہ دونوں عن کے ساتھ متعدی ہوتے ہیں۔ امام ابو عبیدہ اور اخفش رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ ﴿ عَنْ ﴾ یہاں زائد ہے۔ امام خلیل و سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زائد نہیں ہے، بلکہ بعد کے معنی میں ہے، جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ ﴾[4] [الكهف: ٥٠] ”چناں چہ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔“ یعنی ”بَعْدَ أَمْرِ رَبِّهِ“،

[1] روح المعاني (١٨/ ٢٢٦) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٢٢) [3] الدر المنثور (٦/ ٢٣١) [4] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٢٣)

اولیٰ وہی ہے جو ہم ذکر کر آئے ہیں کہ تضمین مذکور ہے۔ ﴿عَنْ اَمْرِهٖٓ﴾ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر اللہ سبحانہ کی ہے، کیوں کہ حقیقت میں آمر وہی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ چاہیے ڈریں وہ لوگ جو مخالفت کرتے ہیں اور نبی ﷺ کے حکم سے یا اللہ پاک کے حکم سے یا دونوں کے حکم سے منہ موڑتے ہیں۔ اس کے مقتضا پر عمل ترک کر کے اور اللہ اور رسول کی روش کے خلاف جاتے ہیں، وہ اس بات سے ڈریں کہ ان کو کوئی فتنہ پہنچے۔

﴿اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ﴾ ''يَحْذَرُ'' کا مفعول ہے اور فاعل موصول ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''إِصَابَةَ فِتْنَةٍ لَّهُمْ'' چناں چہ اسی کے موافق معنی مذکور ہوئے۔ فتنہ اس جگہ مقید نہیں ہے کسی خاص قسم کے فتنے کے ساتھ۔ کسی قسم کا فتنہ ہو سب کو یہ لفظ شامل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد قتل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ زلازل۔ کسی نے کہا ہے کہ ظالم بادشاہ کا مسلط ہونا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دینا۔ کسی نے کہا ہے کہ استدراج کے طریق سے پورے طور پر نعمتیں دینا، یا دنیا میں کوئی تکلیف و ایذا دینا۔ ﴿اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ یا ان کو آخرت میں درد دہندہ عذاب پہنچے، جس طرح کہ جس فتنے کے پہنچنے سے ان کو ڈرایا تھا، وہ دنیا میں تھا۔ ﴿اَوْ﴾ کا کلمہ واسطے منع خلو کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے حکم کی مخالفت دو حال سے خالی نہیں ہے: یا تو دنیا میں کوئی فتنہ پہنچے، یا آخرت میں عذابِ الیم ہو۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فقہا نے اس آیتِ کریمہ سے اس بات پر حجت پکڑی ہے کہ امر وجوب کے لیے ہے۔ حجت لینے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کو اپنے امر کی مخالفت کرنے سے ڈرایا اور اس پر عذاب کی وعید فرمائی اس قول سے کہ ﴿اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ چنانچہ اللہ پاک کے امر کا امتثال (اتباع) واجب ہے اور اس کی مخالفت حرام ہے۔[1] آیتِ کریمہ ہر اس شخص کو شامل ہے جو اللہ پاک کے امر کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے رسول (ﷺ) کے امر کی۔[2] الٰہی سیدی! تو ہم کو احکامات کے اتباع کی اور نواہی سے بچنے کی توفیق عطا فرما اور ہمارے قصور اور فتور سے درگزر کر۔ ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفرلنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين. ربنا اغفرلنا و تب علينا يا أرحم الراحمين و يا أكرم الأكرمين و يا مجيب الداعين و يا معطي السائلين، ربّ صل وسلم و بارك على محمد وعلى آله وذريته و أزواجه وصحبه وأولياءه وأحبائه و أشياعه وأتباعه أجمعين آمين آمين آمين عدد ما علمت وزنة ما علمت وملء ما علمت إلى يوم الدين.

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٢٢_ ٣٢٣) [2] فتح البيان (٩/ ٢٧٤_ ٢٧٦)

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قَدْ یَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِ ؕ وَ یَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْهِ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۶۴﴾

خبردار! بلاشبہ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، یقیناً وہ اس (روش) کو جانتا ہے جس پر تم ہو، اور جس دن وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ انھیں خبر دے گا جو انھوں نے عمل کیے اور اللہ ہر شے کو خوب جانتا ہے (64)

اللہ تعالیٰ کے علمِ کلی کا بیان:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ وہ آسمانوں کا اور زمین کا مالک ہے، وہ عالم ہے غیب اور شہادت کا اور وہ عالم ہے اس چیز کا جو بندے چھپ کر اور علانیہ کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قَدْ یَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِ ﴾۔ حرفِ ﴿ قَدْ ﴾ تحقیق کے لیے ہے، جس طرح کہ اس سے پہلے فرمایا ہے: ﴿ قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ﴾ [النور: ٦٣] ''یقیناً اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں۔'' نیز فرمایا ﴿ قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِیْنَ مِنْكُمْ وَ الْقَآىِٕلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا ۚ وَ لَا یَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ [الأحزاب: ١٨] ''بے شک اللہ انھیں جانتا ہے جو تم میں سے (جہاد میں) رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں اور انھیں بھی جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں: ہمارے پاس آجاؤ اور وہ جنگ میں کم ہی آتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴾ [المجادلة: ١] ''(اے نبی!) یقیناً اللہ نے اس عورت (خولہ بنت ثعلبہ) کی بات سن لی جو اپنے خاوند (اوس بن صامت) کے متعلق آپ سے جھگڑ رہی تھی اور وہ اللہ کی طرف شکایت کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٣٣] ''(اے نبی!) تحقیق ہم جانتے ہیں کہ بے شک آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہیں جو وہ کہتے ہیں، پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے، بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٤٤] ''ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھ رہے ہیں، تو ہم ضرور

آپ کو اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، پھر آپ اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیں، اور جہاں کہیں بھی تم ہو اپنے منہ اس کی طرف پھیر لو اور بے شک وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی، وہ ضرور جانتے ہیں کہ بے شک یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو وہ عمل کرتے ہیں۔'' ان سب آیتوں میں تحقیق فعل کی لفظ ''قَدْ'' سے ہوئی ہے جس طرح کہ مؤذن کا قول تحقیق وثبوت کے لیے ہے: « قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ »

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک اس حال کا عالم ہے جس پر تم ہو، اس کا مشاہدہ کرنے والا ہے، اس سے ذرہ برابر غائب نہیں ہوتا۔ جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ [الشعراء: ۲۱۷۔ ۲۲۰] ''اور آپ (اللہ) غالب (اور) مہربان پر توکل رکھیں۔ جو آپ کو دیکھتا ہے جب آپ (اکیلے نماز میں) قیام کرتے ہیں۔ اور آپ کی نقل وحرکت کو سجدہ کرنے والوں میں بھی (دیکھتا ہے)۔ بلاشبہ وہی خوب سننے والا، بڑا جاننے والا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [یونس: ٦١] ''اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں، جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی، مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ ﴾ [الرعد: ۳۳] ''کیا پھر وہ (اللہ) جو ہر نفس (کے اعمال) پر نگران ہے جو اس نے کمائے۔'' یعنی وہ اپنے بندوں پر حاضر ہے، اس چیز کے ساتھ جو وہ خیر وشر سے کرنے والے ہیں۔ نیز فرمایا: ﴿ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ [ھود: ٥] ''آگاہ رہو! جب وہ اپنے کپڑے اوڑھتے ہیں (تب بھی) وہ (اللہ) جانتا ہے جو وہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں، بے شک اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴾ [الرعد: ١٠] ''(اللہ کے نزدیک) مساوی ہے تم میں سے جو کوئی آہستہ بات کہے یا بلند آواز سے کہے، اور جو رات (کی تاریکی) میں چھپنے والا ہو یا دن (کی روشنی) میں چلنے والا ہو۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ

كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [هود: ٦] ''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے، اور وہ جانتا ہے اس کی قرار گاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔ ہر چیز واضح کتاب میں (تحریر) ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (چھوٹا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو؟'' آیات واحادیث اس بارے میں بہت سی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس دن خلائق اللہ کی طرف پھیری جائے گی اور وہ قیامت کا دن ہے تو وہ ان کو خبر دے گا، اس کی جو انھوں نے دنیا میں کیا وہ خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴾ [القيامة: ١٣] ''اس دن انسان کو بتا دیا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ٤٩] ''اور (ہر ایک کا) اعمال نامہ (سامنے) رکھ دیا جائے گا، پھر آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ وہ اس کے مندرجات (تحریر) سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے: ہائے ہماری کم بختی! کیسا ہے یہ اعمال نامہ جو نہیں چھوڑ رہا کسی چھوٹے اور نہ بڑے (عمل) کو مگر اس نے اسے شمار کر رکھا ہے۔ اور انھوں نے جو عمل کیے تھے حاضر پائیں گے۔ اور آپ کا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔'' اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ والحمد لله رب العالمين، ونسأله التمام، هذا آخر سورة النور و لله الحمد و المنة.[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ ﴾ اس بات پر تنبیہ ہے کہ وہ اس ذات پاک کے حکم کی مخالفت نہ کریں جس کے واسطے وہ ساری مخلوق جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں۔ چنانچہ یہ سب اس کی ملک ہے اور اس کی خلق ہے اور اس کے غلام۔ تحقیق وہ جانتا ہے اے بندو! ان احوال کو جن پر تم ہو۔ اس کے مطابق وہ تم کو جزا دے گا۔ ﴿ يَعْلَمُ ﴾ اس جگہ بمعنی ''علم'' ہے اور ﴿ قَدْ ﴾ اس لیے داخل کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے علم کی تاکید کرے، یعنی اس بات کی کہ اللہ

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٠٧۔ ٤٠٨)

اس شے کو جانتا ہے جس پر دینِ حق کی مخالفت میں وہ ہیں اور علم کی تاکید رجوع کرتی ہے تاکیدِ وعید کی طرف۔

﴿ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ ﴾ معطوف ہے ﴿ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ﴾ پر، یعنی وہ جانتا ہے اس شے کو جس پر تم ہو اور جانتا ہے اس دن کو جس میں وہ اس کی طرف پھیرے جائیں گے تو اس میں ان کے کیے کی ان کو جزا دے گا۔ اس میں صیغۂ حاضر سے غائب کی طرف تبدیلی ہے۔ اللہ پاک کے علم کو جو یومِ رجوع کے ساتھ معلق کیا ہے بجائے نفسِ رجوع کے تو یہ تحقیقِ علمِ الٰہی میں زیادت کے لیے ہے، کیوں کہ علم کسی چیز کے واقع ہونے کے وقت مستلزم ہوتا ہے علم بوقوعِ شے کو برطریق ابلغ وجہ کے، پھر جو اعمال انھوں نے کیے جن میں سے امر کی مخالفت ہے ان اعمال کی ان کو خبر دے گا۔ ظاہر سیاق سے یہ ہے کہ یہ وعید منافقوں کے لیے ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی ان کے اعمال وغیرہ سے کوئی شے اللہ پاک سے مخفی نہیں ہے۔ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ خاتمۂ سورۃ النور میں سے اس آیت کو پڑھ رہے تھے اور آپ نے اپنی دو انگلیوں کو اپنی دونوں آنکھوں کے نیچے کیا ہوا تھا اور فرما رہے تھے: ﴿ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيْرٌ ﴾ [1]

(أخرجه أبو عبيد في فضائله والطبراني، وقال السيوطي: بسند حسن)

"وَلِكُلِّ حَرْفٍ حَدٌّ" یعنی قرآن پاک کے ہر حرف کے واسطے ایک حد ہے، یعنی ایک انتہا ہے۔ "وَلِكُلِّ حَدٍّ مَطْلَعٌ" یعنی ہر حد کے واسطے ایک چڑھنے کی جگہ ہے کہ اس کا علم حاصل کر کے اس نہایت پر چڑھتے ہیں اور وہاں تک پہنچتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر و باطن کے ہر طرف اور سمت کے لیے ایک اوپر جانے کی جگہ ہے۔ پس ظہر کا مطلع تو عربیت کا سیکھنا ہے اور اسبابِ نزول اور ناسخ و منسوخ کا معلوم کرنا ہے اور مطلع بطن کا تصفیہ اور تزکیۂ نفس و ریاضت ہے۔ شرح سنت میں کہا ہے کہ تلاوت میں ہر حرف کے لیے ایک حد ہے، جیسے مصحف امام کہ اس سے آگے نہ بڑھا جائے اور ایک حد تفسیر میں ہے، جیسے مسموع کو جو سنا گیا ہے اس پر قناعت کریں اس سے آگے نہ بڑھیں۔ یا حد سے مراد فرائض و احکام ہیں اور اس کا مطلع ثواب اور عذاب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مطلع فہم ہے کہ غور و فکر کرنے والے پر یہ تاویل اور معانی کو کھولتا ہے، یہ بیان "مجمع البحار" کے متفرق مقامات سے لیا گیا ہے۔ غرضیکہ

حضرت فرقانِ من برد دل و جانِ من   برد دل و جانِ من حضرت فرقانِ من

"میری حق و باطن کی تمیز (روشنی) نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میری حق و باطل میں فرق والی روشنی (قرآن) مجید نے اپنا قیدی بنا لیا۔"

---

[1] المعجم الكبير (١٧/ ٢٨٢) الدر المنثور (٦/ ٢٣٣) فتح البيان (٩/ ٢٧٦) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أبي يعلى (٩/ ٨٠) صحيح ابن حبان (١/ ٢٧٦) اس کی سند ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢٩٨٩)

اس کا عجب عالم ہے، لفظ کی خوبصورتی الگ ہے، معنی کا کمال علاحدہ اور ترکیب کی خوبی الگ۔ ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے موافق اس سے بہرہ یاب ہے اور اس کی لذت میں غرقاب۔ ؎

بہارِ عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد   برنگ اصحابِ صورت را بو اربابِ معنی را

”اس کے حسن کی کیفیت کی بہار دل و جان کو ہمیشہ تازہ رکھتی ہے۔ ظاہر پرستوں کو رنگ سے اور اہلِ باطن کو خوشبو سے۔“

انتہٰی ما في علم الكتاب و إلى الله المرجع والمآب في كل إياب و ذهاب و بيده الكريمة الحق و الصواب في كل باب. الحمد و المنة کہ یکم ربیع الثانی ۱۳۱۱ ہجری روز پنج شنبہ وقت دہ ساعت شبِ جمعہ کو محلہ امیر گنج میں یہ سورت تمام ہوئی۔ اللہ پاک اپنے فضل و کرم سے باقی سورتوں کو بھی تمام کرا دے اور اس کو خاص اپنی ذات پاک کے واسطے ٹھہرائے اور شائبۂ ریا و سمعہ سے بچائے اور مجھ کو اور میری اولاد و احفاد اور سارے مومنین اور مومنات کو اس سے نفع دے اور ہم سب کو اپنی مرضیات کی توفیق دے اور عافیتِ دارین نصیب کرے اور حسنِ خاتمہ نصیب فرمائے اور جس کے حکم سے یہ سب ہو رہا ہے اس کی عمر و دولت میں برکت دے اور اسے مظفر و منصور رکھے۔ آمين. يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِيْنَ. آمِيْن.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ

اس سورت کی ستتر (۷۷) آیتیں ہیں۔ جمہور کے قول کے مطابق یہ ساری سورت مکی ہے۔ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح امام ابن الضریس، نحاس اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے چند طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اسی قول کو امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مگر اس میں سے تین آیتیں مدینہ منورہ میں اتری ہیں، وہ یہ ہیں: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾، ﴿ يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ ﴾، ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صٰلِحًا ... غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾[2] [الفرقان: ٦٨۔ ٦٩۔ ٧٠]

امام مالک، شافعی، بخاری، مسلم، ابن حبان اور بیہقی رحمہم اللہ نے اپنی سنن میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے سنا ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہما کو کہ وہ سورۃ الفرقان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں پڑھتا ہے، سو میں نے اس کی قراءت پر کان رکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ کئی حروف پر اسے پڑھ رہا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائے تھے، چنانچہ قریب تھا کہ میں اس سے جلدی میں جا کر نماز میں لڑ پڑوں، پھر میں نے زبردستی صبر کیا، یہاں تک کہ اس نے سلام پھیرا تو میں نے اس کو اس کی چادر سے لپیٹ کر اپنی طرف کھینچا، پھر میں نے کہا: یہ سورت تجھے کس نے پڑھائی جس کو میں نے تجھے پڑھتے ہوئے سنا ہے؟ وہ بولا کہ مجھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی ہے۔ میں نے کہا: تو نے جھوٹ کہا، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تمھاری قراءت سے مختلف طریقے پر پڑھایا ہے، پھر میں اسے کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے چلا۔ پھر میں نے عرض کی کہ میں نے اس کو سنا ہے، یہ سورۃ الفرقان کو کئی حروف پر پڑھتا ہے جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اسے چھوڑ دے اور فرمایا: اے ہشام! تو پڑھ تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ قراءت پڑھی جس کو میں نے اسے پڑھتے ہوئے سنا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح اتاری گئی ہے۔

پھر فرمایا: اب اے عمر! تو پڑھ تو میں نے وہ قراءت پڑھی جو مجھے پڑھائی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوں ہی اتاری گئی ہے۔ بے شک یہ قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے، لہٰذا تم پڑھو جو تمھیں اس میں سے آسان معلوم

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٣٤) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ١)

ہو۔[1] (حرف سے مراد لغت ہے، یعنی قرآن کی سات الگ الگ لغات ہیں، بعض تو لغتِ قریش میں اور بعض لغتِ ہذیل میں اور ہوازن اور یمن میں۔ ولا یرید کون السبعة في الحرف الواحد علی أنه قد جاء فیه ما قرئ بسبعة و عشرة کمالك یوم الدین و عبد الطاغوت و هذا أحسن ما قیل فیها و الحرف لغة الطرف أي علی سبعة لغات هي أفصح اللغات وقیل: الحرف الإعراب وقیل: لیس بحصر بل توسعة، والسبعة المشهورة لیست سبعة الحدیث بل یحتمل کون هذه السبعة واحدا من تلك و قیل هي القراءات السبع و علی حال لا صلة أنزل کذا في مجمع البحار.)[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔

وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا، تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا بنے① وہی ذات ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس نے اپنے لیے کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا②

بابرکت ذاتِ باری تعالیٰ کا تعارف:

اللہ پاک نے جو قرآنِ عظیم اپنے رسول کریم ﷺ پر نازل فرمایا تو اس پر اپنے نفسِ کریم کی حمد فرماتا ہے، جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۞ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا﴾ [الکهف:۱۔۲] ''ساری حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی

[1] الموطأ (۱/ ۲۰۱) مسند الشافعي (۱/ ۲۳۷) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٧٠٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۱۸) صحیح ابن حبان (۳/ ۱٦) سنن البیهقي الکبریٰ (۲/ ۳۸۳)

[2] مجمع بحار الأنوار (۱/ ٤٩٠)

نہیں رکھی۔ نہایت سیدھی (بغیر افراط وتفریط کے اتاری) تا کہ وہ اس (اللہ) کی طرف سے سخت عذاب سے ڈرائے اور مومنوں کو بشارت دے جو نیک عمل کرتے ہیں کہ بے شک ان کے لیے اچھا اجر ہے۔" اور اس جگہ ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ فرمایا، یہ برکت سے تفاعل کا وزن ہے، جو مستقل وثابت ودائم ہے۔

﴿ نَزَّلَ ﴾ "فَعَّلَ" کا وزن ہے تکرر وتکثر سے، یعنی لفظ کی زیادتی معنی کی زیادتی کی دلیل ہوتی ہے، چونکہ شد کے ساتھ ﴿ نَزَّلَ ﴾ میں تخفیف کے ساتھ "نَزَلَ" کی نسبت زیادتی ہے، اس لیے اس کے معنی میں بھی تکرار اور کثرت ہے نزول کی، جس طرح کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴾ [النساء: ١٣٦] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ، اس کے رسول اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو اس نے پہلے نازل کی۔ اور جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کرے تو وہ یقیناً بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔"

غرضیکہ اگلی کتابوں کے بارے میں "أنزل" کہا اور قرآن شریف کی شان میں "نَزَّلَ" فرمایا، اس لیے کہ اگلی کتابیں کامل ایک ہی دفعہ میں اتاری جاتی تھیں اور قرآن شریف منجم مفرق مفصل نازل کیا گیا ہے، آیتیں بعد آیتوں کے اور احکام بعد احکام کے اور سورتیں بعد سورتوں کے اُتاری گئی ہیں، اس قسم کے نازل کرنے میں انتہائی تاکید وتشدید ومبالغہ ہوتا ہے اور جس شخص پر اس طرح اتارا جاتا ہے تو اس کے حال پر انتہا درجے کی عنایت ہوتی ہے اور اس کا بڑا ہی اہتمام اور خیال ہوتا ہے۔ چناں چہ خود اللہ پاک نے اس سورت کے دوران اس بات کا ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٣٢۔ ٣٣] "اور کافروں نے کہا: اس پر یہ قرآن ایک ہی بار اکٹھا کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے نازل کیا) ہے، تا کہ ہم اس سے آپ کا دل مضبوط کریں اور ہم نے اسے خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سنایا ہے۔ اور وہ (کافر) جب آپ کے پاس کوئی مثال (اعتراض) لے کر آئیں تو ہم (جواب میں) آپ کو حق اور (اس کی) بہت اچھی توجیہ وتفسیر بتا دیتے ہیں۔"

اور اسی لیے اس جگہ قرآن شریف کا نام فرقان رکھا ہے، کیوں کہ وہ حق و باطل کے درمیان فرق کرتا ہے اور سچ اور جھوٹ کے درمیان اور ہدایت اور گمراہی کے درمیان اور سرکشی اور رُشد کے درمیان اور حلال وحرام کے درمیان فرق کرتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ عَلٰي عَبْدِهٖ ﴾ صفتِ مدح ہے اور تعریف اور صفت ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو اپنی عبودیت کی طرف منسوب فرمایا، چناں چہ آپ ﷺ کی سب سے اشرف حالت میں، یعنی شبِ معراج میں

آپ کو اسی صفت کے ساتھ موصوف فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾ [بني إسرائيل: ١] ''پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔'' اور مقامِ دعوت الی اللہ میں بھی آپ کا یہی وصف ذکر کیا ہے: ﴿ وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴾ [الجن: ١٩] ''اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ (محمد ﷺ) اللہ کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو قریب تھا کہ لوگ (کفار) اس پر ٹوٹ پڑیں۔'' اور آپ پر قرآن کے اتارنے اور فرشتے کے اترنے کے وقت بھی اسی طرح آپ کا وصف بیان فرمایا ہے اور یوں کہا ہے: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ [الفرقان: ١] ''وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا، تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا بنے۔''

یعنی اللہ پاک نے جو آپ کو اس کتاب کے ساتھ مخصوص فرمایا، جو عظیم، مفصل، مبین، محکم اور مضبوط ہے کہ جس کے نہ آگے سے باطل آتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکیم وحمید کی طرف سے اتارا گیا ہے کہ جس نے اس کو فرقانِ عظیم ٹھہرایا ہے، وہ اس لیے کہ آپ کو رسالت کے ساتھ اس شخص کی طرف مخصوص کرے، جو آسمان کے سائے تلے اور زمین کے اوپر قرار پکڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سارے عالم کی طرف آپ کو مبعوث کیا ہے، چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں بھیجا گیا ہوں احمر و اسود کی طرف (احمر و اسود سے مراد عجم و عرب ہیں، کیوں کہ عجم پر سرخی اور سفیدی غالب ہے اور عرب پر اُدمت وسُمرہ۔ کسی نے کہا: جن و انس مراد ہیں۔ کسی نے کہا: احمر سے مراد صرف ابیض (سفید) ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''اِمْرَأَةٌ حَمْرَاءُ'' یعنی سفید رنگ کی عورت۔[1] كذا في مجمع البحار)۔

اور فرمایا کہ بے شک میں ایسی پانچ خصلتیں دیا گیا ہوں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئی تھیں۔ پھر ان میں سے یہ ذکر فرمایا کہ بے شک نبی بھیجا جاتا تھا خاص کر اپنی قوم کی طرف اور میں عام طور پر سب لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔[2] جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ''کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول اُمی نبی پر ایمان لاؤ، جو (خود بھی) اللہ اور اس کے (تمام) کلمات پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔'' یعنی جس نے مجھ کو بھیجا ہے، وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے،

---

[1] مجمع بحار الأنوار (١/ ٥٧٧) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

جو کسی شے سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے اور وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی طرح اس جگہ فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ ﴾ اور اپنی ذات مقدس کو ولد و شریک سے منزہ و مبرا کیا ہے۔ پھر یہ خبر دی: ﴿ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ﴾ یعنی ہر شے اس کے ماسوا مخلوق ہے اور اس کا کوئی پروردگار ہے اور وہ ہر شے کا خالق و رب و ملیک و الٰہ ہے اور ہر شے اس کے قہر و تدبیر و تسخیر و تقدیر کے تحت میں ہے۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا یہ بیان ہے کہ اللہ پاک نے اس سورت مبارکہ میں توحید پر کلام کیا، اس لیے کہ توحید سب سے مقدم ہے اور سب سے بڑھ کر مقصود اور مہتم بالشان ہے۔ پھر نبوت میں کلام فرمایا، اس لیے کہ نبوت واسطہ ہے۔ پھر معاد یعنی قیامت کے بارے میں گفتگو فرمائی، اس لیے کہ معاد خاتمہ ہے۔ ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ کی اصل برکت سے ماخوذ ہے۔ برکت کہتے ہیں نمو و زیادت کو، خواہ حسی ہو یا عقلی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "تبارَكَ" برکت سے "تفاعل" ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام زجاج نے کہا کہ برکت کے معنی ہر خیر والی چیز کی کثرت ہے۔ امام فراء نے کہا کہ "تبارَكَ وَتَقَدَّسَ" عربیت میں دونوں ایک ہیں، معنی ان کے عظمت و بزرگی کے ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "تبارَكَ عَطَاءُهُ"، یعنی اللہ پاک کی عطا زائد و کثیر ہوئی۔ کسی نے کہا: دائم و ثابت ہوئی۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول سب قولوں سے لغت و اشتقاق میں بہتر ہے "بَرَكَ الشَّيْءُ" سے۔ جب کوئی شے ثابت ہو جاتی ہے تو بولتے ہیں: "بَرَكَ الشَّيْءُ" یعنی وہ ثابت ہو گئی۔ اسی معنی سے "بَرَكَ الْجَمَلُ" ہے، یعنی اونٹ بیٹھ گیا اور ثابت ہو گیا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے جو کہا تھا کہ تبارک و تقدس ایک ہیں۔[2]

تو اس پر کسی نے یوں اعتراض کیا کہ تقدیس تو طہارت سے ماخوذ ہے، حالاں کہ تبارک کسی طریقے سے بھی طہارت میں سے نہیں ہے، یعنی پھر دونوں کا ایک ہونا کیسا؟! علماء رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ لفظ خاص اللہ پاک ہی کے واسطے استعمال ہوتا ہے اور ماضی کے لفظ سے ہی استعمال میں آتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک اپنے ماسوا سے برتر ہے، اپنی ذات، صفات اور افعال میں۔ ان افعال میں سے قرآنِ کریم کا نازل کرنا ہے، جو ایک اعجاز ہے اور اللہ پاک کے علوِ شان اور اس کے سُموِ صفات کی شہادت دیتا ہے اور اس بات کی کہ اس کے افعال حکمتوں اور مصلحتوں ہی پر مبنی ہیں اور اُن میں کسی قسم کے خلل کا شائبہ تک نہیں ہے۔ فرقان سے مراد قرآن شریف ہے۔ اس کا نام فرقان اس لیے رکھا ہے کہ وہ اپنے احکام سے حق اور باطل کے درمیان اور محق و مبطل کے درمیان فرق کرتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٠٨۔ ٤٠٩)
[2] تفسير القرطبي (١٣/ ١)

نے کہا ہے کہ فرقان قرآن ہے۔ اس میں اللہ پاک کا حلال وحرام اور شریعت و دین ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ قرآن کو فرقان اس لیے کہا ہے کہ قرآن اوقاتِ کثیرہ میں ٹکڑے ٹکڑے اترا ہے۔ اسی واسطے ﴿ نَزَّلَ ﴾ شد کے ساتھ فرمایا ہے تکثیر تفریق کی وجہ سے۔

﴿ عَبْدِهٖ ﴾ سے مراد ہمارے نبی محمد ﷺ ہیں۔ پھر تنزیل کی یہ وجہ بیان فرمائی: ﴿ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ کیوں کہ انزال سے غرض اور مقصود یہی نذارت (ڈرانا) ہے۔ اس جگہ عالمین سے مراد انس و جن ہیں، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ انہی کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملائکہ کی طرف نہیں بھیجے گئے ہیں۔[2] آپ کے علاوہ انبیاء میں سے کوئی نبی۔ علی نبینا وعلیھم الصلاۃ والسلام۔ جن وانس یعنی ان دونوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے۔ نذیر کے معنی منذر ہیں، یعنی تاکہ نبی اکرم ﷺ ڈرانے والے اور خوشی سنانے والے ہوں۔ یا یہ معنی ہیں، تاکہ قرآن کا اتارنا ڈرانے والا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس جگہ نذیر مبالغے کے لیے مصدر کے معنی میں ہو، تاکہ قرآن کا اتارنا ڈرانا ہو، یا تاکہ نبی اکرم ﷺ ڈرانا ہوں۔ ضمیر کو نبی اکرم ﷺ کے واسطے ٹھہرانا زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ آپ سے اِنذار کا صادر ہونا حقیقت ہے اور قرآن شریف سے مجاز ہے اور حقیقت پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے، یا اس وجہ سے کہ آپ ﷺ اقرب مذکور ہیں۔ (یعنی ﴿ لِيَكُوْنَ ﴾ سے ﴿ عَبْدِهٖ ﴾ زیادہ قریب ہے بہ نسبت فرقان کے۔)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، تاکہ لوگوں کو اللہ کے بأس وعذاب سے ڈرائیں اور تم سے پہلے لوگوں پر جو واقعات اللہ کی طرف سے گزرے ہیں، ان سے لوگوں کو خوف دلائیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ فرقان کی طرف راجع ہونا زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے قرآن کی شان میں یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ﴾ [بني إسرائيل: ٩] ''بے شک یہ قرآن وہ راہ بتاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے۔'' ضمیر کا رجوع اتارنے والے کی طرف بھی صحیح ہے۔ یعنی اللہ پاک۔

﴿ لِلْعٰلَمِيْنَ ﴾ ﴿ نَذِيْرًا ﴾ سے متعلق ہے جو فاصلے کی رعایت کی وجہ سے اس سے پہلے رکھا گیا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنی ذات کریم کو چار صفتوں کے ساتھ موصوف کیا: پہلی صفت یہ ہے: ﴿ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی آسمان و زمین کی ملکیت اسی کی ہے نہ کہ اس کے غیر کی، نہ مستقل طور پر اور نہ تبع کے طور پر۔ چنانچہ ان میں تصرف کرنے والا وہی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آخری موصول پہلے کا بدل یا بیان ہو، لیکن وصف ہونا زیادہ بہتر ہے۔ اس میں اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے کہ وجود میں اور وجود کے توابع کی بقاء وغیرہ میں سب کے سب اسی کے محتاج ہیں۔

دوسری صفت یہ ہے: ﴿ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ﴾ اس میں یہود و نصاریٰ کی تردید ہے۔ تیسری صفت یہ ہے:

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٠) الدر المنثور (٦/ ٢٣٥) [2] تفسیر الجلالین (١/ ٤٧٠) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٠)

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ﴾ اس میں فرقہ ثنویہ و وثنیہ اور بتوں کو پوجنے والوں اور شرکِ خفی کرنے والے یعنی تمام قسم کے مشرکین کی تردید ہے۔ اللہ پاک نے تمام وجوہ سے ملکیت کو صرف اپنی ذاتِ مقدس کے لیے ثابت کیا، پھر ملکیت میں جو کوئی اس کے قائم مقام ہوا اس کی نفی فرمائی۔ پھر جو بات اس کی دلیل ہے، اس سے آگاہی بخشی اور یہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ یعنی ہر موجود شے کو اسی نے پیدا کیا، ہر وہ شے جس پر مخلوق کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ چوتھی صفت ہوئی۔

﴿ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو اشیا اس نے پیدا کی ہیں، ان میں سے ہر شے کا اپنی حکمت سے اندازہ کیا اسی بنا پر، جس کا اس نے ارادہ کیا ہے اور جس کام کے وہ لائق ہے، اسی کے لیے اس کو مہیا فرمایا ہے اور اس کو ایسا ٹھیک کر دیا ہے کہ اس میں کسی طرح کی کجی نہیں ہے۔ اور نہ مقتضائے حکمت و مصلحت پر کسی قسم کی زیادتی ہوئی ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی کوئی کمی ہوئی ہے دنیا اور دین دونوں کے بارے میں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر شے کو ایسے بنایا ہے کہ اپنے ارادے کے مطابق اس میں تقدیر و اندازے کی رعایت فرمائی ہے، مثلاً: انسان کی پیدائش مخصوص مواد اور متعین صورت اور شکل سے کی ہے۔

پھر اس کے لیے جن خصوصیتوں اور افعال کا ارادہ کیا ہے، ان کے واسطے اس کو مقدر و مہیا کر دیا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ پھر ایک مدت تک اس کو باقی رکھنے کا اندازہ کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی مخلوق میں سے ہر شے کے لیے اس کی صلاحیت بیان کر دی اور اس کو ایک معلوم اندازے کے ساتھ ٹھہرایا۔[1] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے: مقدر کیا ہر شے کے لیے اس کا رزق اور اجل۔ چنانچہ تقدیریں اس شے پر جاری کر دیں کہ جس کو پیدا کیا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ خلق سے مراد صرف پیدا کرنا اور ایجاد کرنا ہے، مجازاً معنائے تقدیر کے ملاحظے کے بغیر، اگرچہ حقیقت میں وہ تقدیر سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ معنی یہ ہوں گے کہ ہر شے کو ایجاد کیا، پھر اس کو مقدر کیا، تاکہ تکرار لازم نہ آئے۔ یہ معتزلہ پر واضح ترین دلیل ہے بندوں کے افعال کی تخلیق پر۔ پھر اللہ پاک نے اس بات کی تصریح کی کہ بت پوجنے والوں کے مذہب کھوٹے ہیں، ان کے طریقے ردی اور بے کار ہیں۔[3] چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝۳

اور لوگوں نے اس کے سوا (اَور) معبود بنا لیے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ تو (خود)

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٢) [2] فتح القدير (٤/ ٨٢) [3] فتح البيان (٩/ ٢٧٩_ ٢٨١)

پیدا کیے گئے ہیں اور وہ خود اپنے کسی نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں اور نہ موت و حیات کے مالک ہیں، اور نہ دوبارہ (جی) اُٹھنے ہی کے (مالک ہیں) ③

شرک کی نامعقولیت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک دنیا کے مشرکوں کو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ انھوں نے اللہ کے سوا اَور معبود پکڑے ہیں، کون سا اللہ جو ہر شے کا خالق ہے اور مالک ہے ازمّۂ امور کا جس کی شان یہ ہے کہ جو اس نے چاہا وہ ہوگیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ (ازمّہ زمام کی جمع ہے۔ زمام مہار کو کہتے ہیں، یعنی اس کے ہاتھ میں سب کاموں کی مہاریں ہیں۔ اس کے چاہے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سُبْحَانَكَ مَا أَعْظَمَ شَأْنَكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا يَا سَيِّدَنَا وَ يَا مَوْلَانَا). ؎

چاہا اس نے وے نہ چاہا تو نے　　　　تیرا چاہا ہوا اس کا نہ ہوا

اللہ پاک کی ایسی بلند عظیم البرہان اور قوی السلطان شان کے باوجود مشرکوں نے اس کے ساتھ بتوں کو پوجا، کون سے بت، جو مچھر کے ایک پَر کے پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں، بلکہ وہ خود ہی بنائے گئے ہیں، یعنی وہ خود مخلوق ہیں۔ نہ اپنے بُرے کے مالک ہیں نہ بھلے کے پھر وہ اپنے پوجنے والے کے مالک کیسے ہو گئے!! اور نہ وہ مرنے کے مالک ہیں نہ جینے کے اور نہ جی اٹھنے کے۔ یعنی ان کو اس میں سے کسی شے کی قدرت نہیں ہے، بلکہ ان سب کاموں کا رجوع اللہ عزوجل کی طرف ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور قیامت کے دن وہی ساری پہلی اور بعد والی مخلوق کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ [لقمان: ۲۸] ''تمھیں پیدا کرنا اور تمھیں (دوبارہ) اُٹھانا (اللہ کے نزدیک) ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴾ [القمر: ۵۰] ''اور ہمارا حکم تو آنکھ جھپکنے کی طرح ایک (کلمہ) ہی ہوتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴾ [النازعات: ۱۳۔ ۱۴] ''چنانچہ وہ (قیامت) تو صرف ایک (خوفناک) ڈانٹ ہوگی۔ تب لوگ ایک دم کھلے میدان میں (جمع) ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴾ [الصافات: ۱۹] ''سو بس وہ (اُٹھانا) تو ایک جھڑکی ہی ہوگی، تو وہ یکا یک (زندہ ہو کر) دیکھتے ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۵۳] ''وہ بس ایک (ہولناک) چیخ ہوگی، پھر یکا یک وہ سب ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔''

اللہ پاک ہی معبودِ برحق ہے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں، نہ اس کے سوا کوئی اور رب ہے نہ اس کے سوا کسی

کی عبادت لائق ہے، کیونکہ اس کی شان تو یہ ہے کہ جو اس نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ وہ تو ایسا ہے کہ اس کا کوئی لڑکا ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے، نہ اُس کا کوئی ہمسر ہے نہ کوئی بدیل ونظیر و وزیر، بلکہ هُوَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ، الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اِتَّخَذُوْا ﴾ کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہے یا "مُنْذَرِيْن" کی طرف یا مشرکین کی طرف اگرچہ پہلے ان کا ذکر نہیں گزرا ہے، لیکن ان پر تین چیزیں دال ہیں: ایک تو "عَالَمِيْن"، دوسرے شریک کی نفی، تیسرے کلمہ "نَذِيْر"، یعنی مشرکوں نے اپنے واسطے ٹھہرائے ہیں اور معبود، حالانکہ وہ اللہ پاک سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اٰلِهَةً ﴾ سے مراد اوثان ہیں، یعنی بت جو اللہ کے سوا پوجے جاتے ہیں۔[2]

﴿ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا ﴾ محلِ نصب میں ہے اور ﴿ اٰلِهَةً ﴾ کی صفت ہے، یعنی ایسے معبود ٹھہرائے ہیں کہ کسی بھی شے کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ عقلاء کو غیر عقلاء پر اس لیے تغلیب دی ہے کہ کفار کے معبودوں میں فرشتے ہیں اور عزیر اور مسیح علیہم السلام۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اٰلِهَةً ﴾ کی تعبیر ضمیر عقلا کے ساتھ اس لیے کی ہے کہ ان کے بارے میں کفار کا اعتقاد تھا کہ وہ ضرر اور نفع پہنچاتے ہیں۔ ﴿ وَهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک ان کو پیدا کرتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک ہی خالق و رازق ہے اور یہ بت پیدا کیے جاتے ہیں اور وہ کسی شے کو پیدا نہیں کرتے، نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔[3] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کے پوجنے والے ان کی صورتیں بناتے ہیں اور اُن کو گھڑتے ہیں۔

پھر جب اللہ پاک نے اپنے نفسِ کریم کا قوتِ باہرہ کے ساتھ وصف کیا تو مشرکوں کے معبودوں کو انتہائی عاجزی کے ساتھ موصوف کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴾ یعنی وہ اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ اپنے لیے کسی نفع کو کھینچ کر لے آئیں اور اپنے سے کسی ضرر کو دور کر دیں۔ ضرر کا ذکر پہلے اس لیے کیا ہے کہ ضرر کو دور کرنا نفع حاصل کرنے سے زیادہ مقصود ہوتا ہے۔ غرضیکہ جب ان کی یہ گت ٹھہری کہ وہ خاص اُس بات میں بھی جو اُن کی ذات سے متعلق ہے ضرر کو دور کرنے اور نفع حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تو پھر اپنے پوجنے والوں کے لیے ان چیزوں کی قدرت کے کیسے حامل ہو سکتے ہیں۔ یہ بات ان کے انتہائی طور پر عاجز اور کمزور ہونے پر دال ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کی عاجزی کو اور بڑھ کر بیان فرمایا تو ان اُمور کی تصریح کی: ﴿ وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴾ یعنی وہ زندوں کو مارنے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ ہی مرے ہوؤں کو زندہ کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کو قبروں سے اُٹھانے کی قدرت رکھتے ہیں، کیوں کہ نشور موت کے بعد زندہ کرنے کو کہتے

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٠٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٢) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٢)

ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''أَنْشَرَ اللّٰهُ الْمَوْتٰى فَنُشِرُوْا'' موت کو اس لیے پہلے ذکر کیا کہ اس کو ضرر متقدم سے مناسبت ہے۔ جب اللہ پاک توحید کے بیان سے اور مشرکوں کے مذاہب کو باطل کرنے سے فارغ ہو چکا تو منکرینِ نبوت کے شبہوں کے بارے میں شروع کیا۔ چنانچہ پہلا شبہہ جو اُن سے نقل فرمایا، وہ یہ ہے:[1]

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ࣙ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۶

اور کافر لوگوں نے کہا: یہ (قرآن) تو نرا جھوٹ ہے، جسے وہ (نبی) خود گھڑ لایا ہے، اور اس (کے گھڑنے) میں اَور لوگوں نے اس کی مدد کی ہے۔ چنانچہ (اے نبی!) وہ تو بلاشبہہ ظلم و زیادتی اور جھوٹ پر اُتر آئے ہیں ④ اور انھوں نے کہا: یہ اگلوں کے افسانے ہیں (جو) اس نے اپنے لیے لکھوائے ہیں، اور وہ صبح و شام اس پر پڑھے جاتے ہیں ⑤ کہہ دیجیے: اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے، بلاشبہہ وہ غفور (اور) رحیم ہے ⑥

قرآنِ مجید کے بارے میں کفار کے بے ہودہ الزامات اور ان کے جواب:

پہلے پہلے نماز کا وقت صبح و شام مقرر تھا۔ مسلمان نبی ﷺ کے پاس جمع ہوتے تھے، جو نیا قرآن اترا ہوتا، اسے یاد کرنے کے لیے لکھ لیتے تو کافر یوں کہنے لگے۔ یہ ذکر اللہ نے اپنی بخشش اور مہربانی سے اتارا ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک کفار کے جاہل لوگوں کی کم عقلی اس بات میں بیان کرتا ہے کہ قرآن شریف کے بارے میں وہ اس طرح کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں ہے، مگر افک یعنی جھوٹ ہے، جس کو نبی ﷺ نے باندھ لیا۔ ﴿ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس کے جمع کرنے کے لیے اور لوگوں سے مدد لی ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ﴾ یعنی کفار تو قرآنِ مجید کے بارے میں یوں کہتے ہیں کہ جھوٹ باندھ لیا ہے، حالاں کہ خود انھوں نے یہ بات کہنے میں ایک جھوٹ قول بنا لیا ہے، خود جانتے ہیں کہ وہ باطل ہے اور جس بات کا زعم کرتے ہیں، اس میں خود اپنا جھوٹ جانتے پہچانتے ہیں۔

[1] فتح البیان (۹/ ۲۸۱۔ ۲۸۲)

﴿وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا﴾ پھر یہ دوسری بات قرآن شریف کے بارے میں کہی کہ قرآن کیا ہے، اگلے لوگوں کی کتابیں ہیں کہ ان کو لکھ لیا ہے۔ ﴿فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ وہی اس پر پڑھی جاتی ہیں، دن کے پہلے حصے اور آخری حصے میں۔ یہ بات جو اُن سے صادر ہوئی تو یہ اُن کی کم عقلی اور جھوٹ اور بہتان کی وجہ ہے، ہر ایک اس کے باطل ہونے کو خوب جانتا ہے، کیوں کہ یہ بات تواتر کے ساتھ اور لازمی اور ظاہری طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ محمد ﷺ نے لکھنے کی مشق نہیں کی، نہ شروع عمر میں نہ آخر عمر میں۔ نیز آپ ﷺ نے اپنی پیدائش سے لے کر انہیں کے درمیان نشوونما پائی، یہاں تک کہ اللہ پاک نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ تقریباً چالیس برس ان میں رہے بسے اور وہ لوگ آپ ﷺ کے رہنے سہنے، داخل ہونے کی جگہ اور نکلنے کی جگہ، سچائی و راستی اور نیکی اور پاکیزگی اور پاکی، پاک دامنی، اور پارسائی کو جانتے تھے اور جھوٹ، فجور اور دوسری بداخلاق اور بری عادات سے دور رہنے کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے، یہاں تک کہ آپ کے لڑکپن میں اور آپ کے مبعوث ہونے تک آپ ﷺ کا نام امین رکھتے تھے، اس وجہ سے کہ آپ کی سچائی اور راست بازی اور نیکی کو خوب جانتے تھے۔

پھر جب اللہ پاک نے آپ ﷺ کی عزت وتکریم کی، جس شے کے ساتھ عزت وتکریم کی، یعنی آپ ﷺ کو منصب نبوت و رسالت پر سرفراز فرمایا تو اُن لوگوں نے آپ ﷺ کے لیے عداوت قائم کی اور آپ ﷺ کو ان باتوں کے ساتھ عیب لگایا جن سے آپ ﷺ کی پاکیزگی اور پاکی کو ہر عقل مند خوب جانتا ہے اور جس بات کے ساتھ آپ ﷺ کو تہمت لگاتے ہیں، اس میں حیران ہوئے، چنانچہ کبھی تو اپنے افک اور بہتان کے مارے آپ کو ساحر جادوگر کہتے، کبھی شاعر کہتے، کبھی مجنون اور کبھی کذاب بتاتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا﴾ [بني إسرائيل: ٤٨] ''دیکھیے! انھوں نے آپ کے لیے کس طرح مثالیں بیان کیں، وہ گمراہ ہوگئے، لہٰذا وہ راستہ نہیں پا سکتے۔'' اور اس جگہ جو انھوں نے عناد و افتراء کیا تو اس کے جواب میں اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ یعنی اس نے قرآن کو اتارا ہے، جو سچے پکے اخبار پر مشتمل ہے اور وہ اخبار جو پہلے زمانے اور آخر زمانے میں واقعات ہوئے ہیں، ان کے مطابق ہیں۔

﴿اَلَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے اور پوشیدہ باتوں کو بھی اس طرح جانتا ہے جس طرح ظاہر باتوں کو۔ ﴿اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک ان کو توبہ اور رجوع الی اللہ کی طرف بلاتا ہے اور ان کو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ اس کی رحمت بہت وسیع ہے اور اس کا علم عظیم ہے اور جو کوئی اس کی طرف رجوع ہو تو وہ اس پر رجوع فرماتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ باوجود ان کے جھوٹ اور افترا، فجور، بہتان، کفر، عناد کے اور ان کے قرآن شریف اور رسول کریم ﷺ کے حق میں ایسی باتیں کہنے کے جو

انھوں نے کہی ہیں، اللہ پاک ان کو بلاتا ہے کہ ان باتوں سے توبہ کریں اور جس حال میں وہ ہیں، اس کو چھوڑ دیں اور اسلام اور ہدایت کی طرف آئیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [المائدۃ: ۷۳۔ ۷۴] ''یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنھوں نے کہا: بے شک اللہ تین میں سے تیسرا ہے اور کوئی معبود نہیں سوائے ایک معبود کے۔ اور وہ جو کچھ کہتے ہیں اگر اس سے باز نہ آئے تو ان میں جن لوگوں نے کفر کیا، انھیں ضرور دردناک عذاب ملے گا۔ پھر کیا وہ اللہ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ﴾ [البروج: ۱۰] ''بے شک جنھوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی، تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلانے والا عذاب ہے۔'' امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے: "أُنْظُرُوْا إِلٰی هٰذَا الْكَرَمِ وَالْجُوْدِ قَتَلُوْا أَوْلِيَاءَهُ وَهُوَ يَدْعُوْهُمْ إِلَی التَّوْبَةِ وَالرَّحْمَةِ"[1] یعنی اس کرم اور بخشش کو تو دیکھو کہ انھوں نے تو اللہ پاک کے دوستوں کو قتل کر ڈالا اور وہ ان کو توبہ و رحمت کی طرف بلا رہا ہے کہ جو کچھ تم سے ہوا سو ہوا، اب توبہ کرلو میری طرف آؤ، وسیع رحمت تیار ہے، تمھارے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ کر دی باز آ　　　صدبار اگر توبہ شکستی باز آ

''توبہ کرلے، توبہ کرلے، جو کچھ بھی تو نے کیا ہے توبہ کرلے، اگر تو نے سو بار توبہ توڑی ہے، پھر توبہ کرلے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ﴾ سے مراد عرب کے مشرک ہیں۔ ﴿ اِنْ هٰذَآ ﴾ کا اشارہ قرآن شریف کی طرف ہے۔ ﴿ اِلَّآ اِفْكُ ﴾ سے مراد کذب ہے۔ ﴿ اِفْتَرٰىهُ ﴾ کے معنی ہیں: "اِخْتَلَقَهُ" یعنی مکے کے مشرکوں نے کہا کہ اس قرآن شریف کو نبی اکرم ﷺ نے اپنی طرف سے جھوٹ بنا لیا ہے۔ ﴿ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ﴾ اور اس کے بنانے پر ایک اور قوم نے اس کی مدد کی ہے۔ اس قوم سے مراد یہود ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ یہ لوگ ہیں: ابوفکیہہ یسار مولی الحضرمی، عداس مولی حویطب بن عبد العزی، جبر مولی ابن عامر یہ تینوں آدمی یہود کے تھے۔ ایسی تقریر پر سورۃ النحل میں کلام گزر چکا ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کی اس طرح سے تردید فرمائی: ﴿ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ﴾ یعنی انھوں نے یقینی طور

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۰۹۔ ۴۱۰)

پر ایک ہولناک ظلم عظیم کی بات کہی اور کھلا ہوا جھوٹ بولا۔ حرفِ فا ترتیب مابعد کے لیے ہے ما قبل پر، لیکن نہ اس بنا پر کہ دونوں واقعی مختلف امر ہیں، بلکہ اس بنا پر کہ دوسرا حقیقتاً عینِ اول ہے، رہی ترتیب تو یہ تغایر اعتباری کے مطابق ہے۔ کلمۂ ﴿ قَدْ ﴾ ظلم اور جھوٹ کی تحقیق کے لیے ہے جس کو وہ لائے۔ ﴿ ظُلْمًا ﴾ کا نصب ﴿ جَآءُوْ ﴾ سے ہے، اس لیے کہ "جَاءَ"، کبھی "أَتیٰ" کے استعمال کی طرح ہوتا ہے اور اسی کے مثل متعدی ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ نزعِ خافض منصوب ہے، اصل یہ ہے: "جَآءُوْا بِظُلْمٍ" یعنی وہ ایک بڑا ظلم لائے۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر حال منصوب ہے اور اُن کا یہ بات کہنا اس لیے ظلم ہوا کہ انھوں نے ایک قبیح چیز کو ایسے شخص کی طرف منسوب کیا کہ وہ اس سے مبرا اور پاک ہے۔ تو انھوں نے شے کو اس کی جگہ کے علاوہ جگہ پر رکھا اور یہی ظلم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ظلم یہ ہے کہ انھوں نے ایک اعجاز والے کلام کو یہود کے ساتھ مختلق و متلفق ٹھہرایا، یعنی اللہ پاک کے کلامِ اعجاز نظام کی یہ قدر کی کہ اسے جھوٹ باندھا ہوا، خود بنایا ہوا اور یہود سے لیا ہوا قرار دیا۔ رہا ان کی بات کا زُور (جھوٹ) ہونا، تو وہ ظاہر ہے، کیوں کہ وہ اس بات میں جھوٹ بولے۔

پھر اللہ پاک نے دوسرے شبہے کا ذکر فرمایا اور کہا: ﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی قرآن شریف کی شان میں کہا ہے کہ وہ اگلوں کے قصے کہانیاں اور خبریں ہیں جن کو انھوں نے لکھ رکھا ہے، جیسے: قصہ رستم واسفند یار کا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ کا واحد "أُسْطُوْرَةٌ" ہے جس طرح کہ "أَحَادِيْثُ" کا واحد "أُحْدُوْثَةٌ" ہے۔[1] غیر زجاج نے کہا کہ ﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ "أسطار" کی جمع ہے، جیسے "أَقَاوِيْلُ" "أَقْوَالٌ" کی جمع ہے، یعنی "قَوْلٌ" کی جمع "أَقْوَالٌ" اور "أَقْوَالٌ" کی جمع "أَقَاوِيْلُ" ہے۔

﴿ اِكْتَتَبَهَا ﴾ کے معنی "اِسْتَكْتَبَهَا" یا "كَتَبَهَا لِنَفْسِهٖ" یعنی آپ نے اگلوں کے قصوں کو دوسرے سے لکھوا رکھا ہے یا خود نے اپنے واسطے لکھ رکھا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ ان کو جمع کر لیا ہے اور کتب سے ماخوذ ہے۔ کتب کہتے ہیں جمع کرنے کو، کتابت بالقلم سے نہیں ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ ﴿ اِكْتَتَبَهَا ﴾ کا محل نصب ہے، بنا بر حال یا رفع ہے اس بنا پر کہ خبرِ ثانی ہے، اس لیے کہ ﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ مرفوع ہے مبتدائے محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر، یعنی "هٰذَا أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا"۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ مبتدا ہو اور ﴿ اِكْتَتَبَهَا ﴾ اس کی خبر۔

طلحہ نے "أُكْتُتِبَهَا" پڑھا ہے بصیغۂ مجہول۔ معنی یہ ہیں کہ "اِكْتَتَبَهَا لَهٗ كَاتِبٌ"، یعنی ان کو کسی کاتب نے ان کے لیے لکھا، کیوں کہ وہ اُمی تھے اور لکھنا جانتے نہیں تھے اور نہ پڑھتے تھے۔ پھر "له" کا لام حذف کیا گیا تو فعل ضمیر کی طرف پہنچا تو "اِكْتَتَبَهَا إِيَّاهُ" ہوا۔ پھر فعل ضمیر کے لیے بنا کیا گیا، جو "إياه" ہے تو وہ ضمیر مرفوع مستتر ہوگئی، اس کے بعد کہ منصوب بارز تھی۔ کشاف میں اسی طرح کہا ہے اور ابو حیان نے اس پر اعتراض کیا ہے۔[2]

---

[1] معاني القرآن (٤/ ٥٨) [2] فتح القدير (٤/ ٨٣) الكشاف (٣/ ٢٦٩) البحر المحيط (٦/ ٤٤٢)

﴿ فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ اس پر القا کیے جاتے ہیں، یعنی ڈالے جاتے ہیں، اس کے بعد کہ ان کو لکھا ہے، تا کہ ان کو اس شخص کے منہ سے سن کر یاد کر لے، جو اس پر ان کو املا کرتا ہے اس لکھے ہوئے سے، کیوں کہ وہ اُمی ہے، یہ قدرت نہیں رکھتا کہ اس لکھے ہوئے سے ان کو خود پڑھ لے۔ یا ﴿ اِكْتَتَبَهَا ﴾ کے معنی ''أَرَادَ اكْتِتَابَهَا'' ہیں۔

﴿ فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ ﴾ اس لیے کہ محاورے میں بولتے ہیں: ''أَمْلَيْتُ عَلَيْهِ فَهُوَ يَكْتُبُ'' ﴿ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ کے معنی ہیں: ''غُدْوَةً وَّعَشِيًّا'' یعنی صبح و شام، گویا انھوں نے یہ کہا کہ یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کو دن کے دو طرفوں میں تعلیم کرتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ﴿ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ سارے وقتوں میں، یعنی جب دن کے دو کناروں کا ذکر کیا تو ان کے درمیان کا وقت بطریقِ اولیٰ آ گیا۔ چنانچہ سارا وقت مراد ہوا۔

پھر اللہ پاک نے اس شبہے کا یہ جواب دیا: ﴿ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی اے پیغمبر! تم ان سے کہہ دو کہ یہ قرآن اس قسم سے نہیں ہے کہ جھوٹ باندھا گیا ہو اور کسی قوم کی مدد سے بنا لیا گیا ہو اور دوسرے لوگوں نے جوڑی ہوئی کہانیوں اور اگلے لوگوں کے قصوں میں سے لکھ لیا ہو، بلکہ یہ تو ایک آسمانی امر ہے، اس کو تو اس ذات پاک نے اتارا ہے جو ہر شے کو جانتا ہے اور اس سے کوئی شے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اسی لیے تم اس کے مقابلے سے عاجز رہ گئے اور اس جیسی ایک سورت بھی نہ لا سکے۔ خاص کر سِرّ کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ پاک نے جو شے نازل فرمائی ہے وہ ایسے اسرارِ بدیعی پر مشتمل ہے کہ انسانی عقلیں ان تک نہیں پہنچ سکتیں، ان سے پہلے ہی تھک کر رہ جاتی ہیں۔ ''سِرّ'' غیب کو کہتے ہیں، یعنی جو غیب آسمان اور زمین کے اندر موجود ہے، اس کو اللہ پاک ہی جانتا ہے۔

جملہ ﴿ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ عذاب میں تاخیر ہونے کی علت ہے، یعنی تم جو رسول اللہ ﷺ پر افترا اور ظلم کرتے ہو اور جھوٹ باندھتے ہو تو اس وجہ سے اگرچہ تم اس کے مستحق ہو کہ تم پر جلدی سے عذاب آ جائے، لیکن اللہ پاک اس کی وجہ سے تم پر سزا کی جلدی نہیں کرتا، کیوں کہ وہ کثیر المغفرت والرحمۃ ہے، بڑی رحمت و بخشش والا ہے۔ رباعی: ؎

دل را اے درد صاف خواہی کردن بر جرم گر اعتراف خواہی کردن
دانم آخر معاف خواہی کردن یا رب تو کریم و من گنہ گارِ تو ام

''اے درد! اگر تو جرم کا اعتراف کر کے دل کو صاف کرنا چاہتا ہے (تو اللہ تعالیٰ سے یہ گزارش کر) اے میرے رب! تو کریم اور میں گناہ گار ہوں تو مجھے معاف کرنا جانتا ہے۔''

پھر جب اللہ پاک اس طعن کے ذکر سے فارغ ہو چکا جو کفار نے قرآن شریف پر کیا تھا اور اس کی تردید فرما چکا تو اس طعن کا ذکر کیا جو رسول اللہ ﷺ پر کیا ہے۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

[1] فتح البیان (۹/ ۲۸۲۔ ۲۸۴)

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي
الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾ اَوْ
يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَ
قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾ اُنْظُرْ
كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹﴾
تَبٰرَكَ الَّذِيْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾ بَلْ كَذَّبُوْا
بِالسَّاعَةِ ۫ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۚ﴿۱۱﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ
مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ وَ اِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا
مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ
ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾

اور انھوں نے کہا: اس رسول کو کیا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے؟ اس کی طرف فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا جو اس کے ہمراہ (لوگوں کو) ڈرانے والا ہوتا؟ ⑦ یا اس کی طرف کوئی خزانہ ڈالا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ (پھل) کھاتا اور ظالموں نے (مومنوں سے) کہا: تم تو بس ایک جادو زدہ شخص ہی کی اتباع کرتے ہو ⑧ دیکھیے! انھوں نے آپ کے لیے کیسی مثالیں بیان کی ہیں، وہ بہک گئے ہیں، لہٰذا وہ راہ نہیں پاسکتے ⑨ وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جو اگر چاہے تو آپ کے لیے اس سے بہتر (چیزیں) بنا دے، (یعنی) ایسے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں اور آپ کے لیے محلات بنا دے ⑩ لیکن انھوں نے قیامت کو جھٹلایا اور ہم نے اس شخص کے لیے جو قیامت کو جھٹلائے، بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے ⑪ جب وہ ان (مجرموں) کو دور دراز جگہ سے دیکھے گی تو وہ اس کا غضب ناک ہونا اور چیخنا چلانا سنیں گے ⑫ اور جب وہ زنجیروں میں جکڑے اس کی کسی تنگ جگہ میں جھونکے جائیں گے تو وہ وہاں ہلاکت کو پکاریں گے ⑬ (کہا جائے گا:) تم آج ایک ہلاکت کو مت پکارو، بلکہ بہت سی ہلاکتوں کو پکارو ⑭

رسول اللہ ﷺ پر کفار کے اعتراض:

یعنی ایک دفعہ مر جائیں تو چھوٹ جائیں، دن میں ہزار دفعہ مرنے سے تو حال بدتر ہوتا ہے۔ انتہیٰ[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک کافروں کی سرکشی وعناد اور حق کو بغیر کسی دلیل کے جھٹلانے کی خبر دیتا ہے اور یہ بات جو انھوں نے کہی کہ ﴿ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ تو یہ محض ان کا تعلل اور کھیل کرنا ہے، یہ کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ جس طرح ہم کھانا کھاتے ہیں اسی طرح وہ بھی کھاتا ہے، جیسے ہمیں اس کی حاجت ہوتی ہے اسی طرح وہ بھی اس کا محتاج ہوتا ہے اور کمائی اور تجارت کے لیے بازاروں میں آتا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ وہ بھی ہماری طرح کا بشر ہے، بھلا بشر بھی کہیں رسول ہوتا ہے؟! ﴿ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف اللہ کے پاس سے کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترا، جو اس کے دعوے کے سچا ہونے کا شاہد اور گواہ ہوتا؟ یہ ایسا ہے، جیسا کہ فرعون نے کہا تھا: ﴿ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٥٣] ''پھر اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں اُتارے گئے، یا اس کے ساتھ فرشتے صفیں باندھے آتے؟''

اسی طرح ان لوگوں نے برابر کہا۔ ان سب کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور اسی لیے انھوں نے یہ کہا: ﴿ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ ﴾ یعنی یا اس کی طرف خزانے کا علم ڈالا جاتا کہ اس سے خرچ کیا کرتا۔ ﴿ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ﴾ یعنی یا اس کے لیے کوئی باغ ہوتا، جو اس کے ساتھ چلتا، جہاں وہ جاتا۔ یہ سب اللہ پاک کے لیے سہل اور آسان ہے، لیکن اس کے ترک کرنے میں اس کی حکمت ہے۔ وَلَهُ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا ﴾ یعنی وہ بات لائے جس سے تجھے تہمت لگاتے ہیں اور تجھ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یوں کہتے ہیں کہ جادوگر ہے، جادو کا مارا ہے، مجنون ہے، جھوٹا ہے، شاعر ہے۔ یہ سب باطل قول ہیں، جن لوگوں کو ذرا سی بھی فہم اور عقل ہے، ان میں سے ہر شخص ان کے جھوٹ اور افترا کو اس بارے میں خوب جانتا ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ﴿ فَضَلُّوْا ﴾ یعنی راہِ ہدایت سے بہک گئے، اب راہ نہیں پا سکتے۔ یہ اس واسطے ہے کہ جو کوئی حق سے اور راہِ ہدایت سے نکل گیا تو وہ گمراہ ہوتا ہے، جدھر توجہ کرے، کیوں کہ حق ایک ہے اور اس کی راہ متحد ہے، بعض بعض کی تصدیق کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ پر کیے گئے اعتراضات کے جوابات:

پھر اللہ پاک نے اپنے نبی کو یہ خبر دی کہ اگر وہ چاہے تو جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس سے بھی بہتر اور زیادہ اور خوب تر اس کو دنیا میں دے دے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

﴿ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَیَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی دنیا میں۔ یہ بھی کہا ہے کہ قریش ہر پتھر کے گھر کا نام قصر رکھتے ہیں، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن حبیب بن ابی ثابت عن خثیمہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو زمین کے ایسے خزانے اور کنجیاں دے دیں، جو آپ سے پہلے ہم نے کسی نبی کو نہیں دیے اور نہ ہی آپ کے بعد کسی کو دیں گے اور یہ اس چیز کو کم نہیں کرے گا، جو آپ کے لیے اللہ کے پاس ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! تو اس کو میرے لیے آخرت میں جمع رکھ، اس پر اللہ عزوجل نے اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْٓ ... الآیة ﴾[1] (تفسیر ابن کثیر میں اسی طرح ہے، مگر یہاں سے ضرور عبارت ساقط ہوئی ہے، چنانچہ فتح البیان و فتح القدیر میں یہ روایت بہ تخریج فریابی و ابن ابی شیبہ و ابن جریر وغیرہ لکھی ہے، اس میں اس کے بعد یہ الفاظ ہیں: "شَیْئًا وَإِنْ شِئْتَ جَمَعْتُهَا لَكَ فِي الْآخِرَةِ" یعنی اگر تو چاہے تو میں اس کو تیرے لیے آخرت میں جمع کر رکھوں)۔[2]

کفار کے اعتراضات کی اصل وجہ کا ذکر اور جہنم کی ہولناکیوں کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ﴾ یعنی یہ لوگ جو اس طرح کہتے ہیں تو وہ تکذیب اور عناد کے لیے کہتے ہیں، نہ یہ کہ بصیرت حاصل کرنے اور ہدایت چاہنے کے لیے اس کی طلب کرتے ہیں۔ بلکہ روزِ قیامت کو جھٹلانا ہی اس کے لیے اس بات کا سبب ہوا ہے کہ اس قسم کی واہیات باتیں کہیں، جن کو وہ بک رہے ہیں۔ ﴿ وَاَعْتَدْنَا ﴾ کے معنی ہیں: "أَرْصَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا" یعنی اس شخص کے لیے کہ جس نے تکذیب کی روزِ قیامت کی ہم نے درد دینے والا گرم عذاب جہنم میں تیار کر رکھا ہے، جس کو برداشت کرنے کی طاقت کسی میں نہ ہو گی۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے عن سلمہ بن کہیل عن سعید بن جبیر روایت کیا ہے: "اَلسَّعِیْرُ وَادٍ مِنْ قَیْحِ جَهَنَّمَ"[3] یعنی سعیر جہنم کے پیپ کی ایک وادی ہے۔ (قیح بقاف وتحتیہ بمعنی پیپ ہے اور فیح بفاء وتحتیہ شیوع حر کو کہتے ہیں، یعنی کثرتِ حرارت۔ اس لفظ میں دونوں احتمال ہیں، مگر احتمالِ اخیر بمناسبتِ مقام قوی تر ہے۔ واللّٰہ أعلم.)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِذَا رَاَتْهُمْ ﴾ یعنی جس وقت ان کو جہنم دیکھے گی۔ ﴿ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ ﴾ یعنی مقام محشر میں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سو برس کی راہ سے۔[4] ﴿ سَمِعُوْا لَهَا تَغَیُّظًا وَّزَفِیْرًا ﴾ "أَيْ: حَنَقًا عَلَیْهِمْ" یعنی وہ اس کا جھنجھلانا اور غصے کے مارے ان پر چلانا سنیں گے، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِذَآ اُلْقُوْا فِیْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا وَّهِیَ تَفُوْرُ ۝ تَكَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ ﴾ [الملك: ٧۔ ٨] ''جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس کی دھاڑ سنیں گے اور وہ جوش مارے گی۔ قریب ہے کہ وہ غیظ و غضب سے پھٹ پڑے۔'' یعنی لگتا ہے کہ اس کے

---

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٢٤٣) تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٦)
[2] فتح البیان (٩/ ٢٨٧) فتح القدیر (٤/ ٨٨)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٧)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٧)

شدتِ غیظ سے اس پر جس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا، اس کا بعض حصہ بعض سے جدا ہو پڑے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اصحابِ نبی ﷺ میں سے ایک شخص سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «مَنْ يَّقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ أَوِ ادَّعٰى إِلٰى غَيْرِ وَالِدَيْهِ أَوِ انْتَمٰى إِلٰى غَيْرِ مَوَالِيْهِ فَلْيَتَبَوَّأْ بَيْنَ عَيْنَيْ جَهَنَّمَ مَقْعَدًا» یعنی جو کوئی مجھ پر وہ بات کہے جو میں نے نہیں کہی، یا جس نے اپنے ماں باپ کے علاوہ کسی اَور کی طرف اپنی نسبت کی، یا اپنے غیر موالی کی طرف منسوب ہو تو چاہیے کہ اپنا ٹھکانا جہنم کی دو آنکھوں کے درمیان بنا لے۔ کسی نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا جہنم کے لیے دو آنکھیں ہیں؟ فرمایا: کیا تو نے نہیں سنا اللہ کو کہ فرماتا ہے: ﴿ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴾۔[1] (ورواه ابن جرير عن محمد بن خداش عن محمد بن يزيد الواسطي به)

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ربیع بن خثیم رحمہ اللہ کسی لوہار پر سے گزرے تو عبداللہ رضی اللہ عنہ آگ میں لوہے کی کسی شے کی طرف نظر کرنے لگے۔ اور ربیع نے اس کی طرف نظر کی تو ربیع جھولنے لگے کہ گر پڑیں۔ (ربیع بن خثیم ثوری ابو یزید کوفی مخضرم ہیں، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان کو روایت ہے، انھوں نے ربیع کے حق میں کہا تھا کہ اگر تجھے نبی اکرم ﷺ دیکھتے تو دوست رکھتے۔ ۶۴ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ رضي الله عنهما و نفعنا بحبهما۔ قول میسور)۔ پھر عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ایک رات فرات کے کنارے پر ایک آہنی آتشدان پر گزر کیا (فرات بالضم اصل میں اچھے پانی کو کہتے ہیں، جس سے پیاس بجھ جائے، اسی مناسبت سے کوفے کی نہر کا نام رکھا ہے، یہاں یہی مراد ہے) پس جب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا اور آگ اس کے جوف میں شعلہ مار رہی تھی تو یہ آیت پڑھی: ﴿ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴾ ربیع بے ہوش ہو گئے، ان کو ان کے گھر کی طرف اٹھا لے گئے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ظہر تک اُن کی حفاظت کی، سو ان کو افاقہ نہ ہوا۔ رضي الله عنه.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بے شک بندہ البتہ کھینچا جائے گا آگ کی طرف تو وہ اس کی طرف چیخے گی، خچر کے جَو کی طرف چیخنے کی طرح۔[2] پھر ایک ایسی چیخ مارے گی، جس کو سن کر سب کے سب ڈر جائیں گے۔[3] (هكذا رواه ابن أبي حاتم باسناده مختصرا) امام ابوجعفر بن جریر نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ بے شک آدمی البتہ آگ کی طرف کھینچا جائے گا تو اس کا بعض بعض کی طرف منقبض ہو جائے گا۔ اس سے رحمان فرمائے گا: تجھے کیا ہوا؟ تو وہ کہے گی کہ وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے، اللہ فرمائے گا کہ میرے بندے کو چھوڑ دو، اور بے شک آدمی آگ کی طرف کھینچا جائے گا تو عرض کرے گا: یا رب! تیرے ساتھ یہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٧) تفسیر الطبري (١٩/ ٢٤٤)

[2] اصل کا لفظ "فتشهق إليه شهقة كالبغلة إلى الشعير ثم تزفر زفرة"

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٧ـ ٢٦٦٨)

گمان نہیں تھا، فرمائے گا: پھر تیرا کیا گمان تھا؟ تو وہ عرض کرے گا: یہ کہ سمالے مجھ کو تیری رحمت، فرمائے گا: چھوڑ دو میرے بندے کو۔ اور بے شک آدمی آگ کی طرف کھینچا جائے گا تو وہ اس طرح چیخے گی، جیسے خچر جَو کی طرف چیختا ہے اور ایک ایسی چیخ مارے گی کہ کوئی باقی نہ رہے گا، مگر ڈر جائے گا۔ یہ اسناد صحیح ہے۔ عبد الرزاق نے عن مجاہد عن عبید بن عمیر اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ بے شک جہنم ایک ایسی چیخ مارے گی کہ کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی نبیِ مرسل ایسا نہ ہوگا جو گر نہ پڑے، اس حال میں کہ اس کے فرائص (شانے کا گوشت) کانپتے ہوں گے۔ ابراہیم علیہ السلام البتہ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جائیں گے اور کہیں گے: اے میرے رب! میں تجھ سے آج صرف اپنے نفس کا سوال کرتا ہوں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے عن ایوب عن عبد اللہ بن عمرو روایت کیا ہے کہ مثل زُجّ کے رمح میں، یعنی اس کی تنگی سے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح نیزے کی بھال نیزے میں ٹھسی ہوتی ہے، اسی طرح جہنم بھی ان پر تنگ کی جائے گی۔ یحییٰ بن ابی اسید اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں کہ آپ سے کسی نے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بے شک وہ البتہ آگ میں زبردستی گھسائے جائیں گے، جس طرح میخ دیوار میں گھسائی جاتی ہے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُقَرَّنِيْنَ ﴾ سے مراد ''مکتفین'' ہے،[2] یعنی ان کی مشکیں بندھی ہوں گی۔

جہنمیوں کی چیخ و پکار:

﴿ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴾ یعنی وہ اس جگہ ویل کو پکاریں گے اور حسرت اور خیبت کو (ویل کے معنی ہلاکت، حسرت، افسوس اور خیبت و زیاں کاری)۔ امام احمد رحمہ اللہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے جو شخص آگ کا حلہ (لباس) پہنایا جائے گا، وہ ابلیس ہے تو وہ اسے اپنے دونوں بھنوؤں پر رکھے گا اور اسے اپنے پیچھے سے کھینچے گا اور اس کی ذریت اس کے بعد ہوگی اور وہ پکارے گا: ''یَا ثُبُوْرَاہُ'' اور وہ پکاریں گے: ''یَا ثُبُوْرَهُمْ'' یہاں تک کہ آگ پر کھڑے ہوں گے۔ پھر کہے گا: ''یَا ثُبُوْرَاہُ'' اور وہ کہیں گے: ''یَا ثُبُوْرَهُمْ'' تو ان سے کہا جائے گا کہ آج کے دن تم ایک ثبور کو مت پکارو اور بہت سے ثبور کو پکارو۔[3] (لم یخرجه احد من أصحاب الكتب الستة. ورواه ابن أبي حاتم عن أحمد بن سنان عن عفان به رواه ابن جرير من حديث ابن سلمة به)

امام عوفی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، یعنی مت پکارو تم آج کے دن ایک ویل کو اور پکارو ویل کثیر کو۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثبور ہلاکت ہے۔[4] اور ظاہر تر یہ بات ہے کہ ثبور میں ہلاکت، ویل و خسارہ و دمار

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٤٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٨ـ ٢٦٦٩)

[3] مسند أحمد (٣/ ١٥٢) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٦٩) تفسير الطبري (١٩/ ٢٤٥ـ ٢٤٦) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١٤٣)

[4] تفسير الطبري (١٩/ ٢٤٥)

کے سب معنی شامل ہیں، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا: ﴿ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴾[1] [بني إسرائيل: ١٠٢]
''اے فرعون! میں تو تجھے ہلاک کیا ہوا سمجھتا ہوں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اس جگہ ﴿ هٰذَا الرَّسُوْلِ ﴾ کے اشارے میں مشار الیہ کی شان کو کم کیا گیا ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کفار نے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام رسول رکھا تو یہ استہزاء اور تمسخر کے لیے ہے۔ یہاں جو ذکر کیا ہے تو اس کا حاصل چھے قباحتیں ہیں اخیر ﴿ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴾ ہے۔ اللہ پاک نے ان قبائح کا رد کیا ہے۔ بعض کا رد تو اجمالی طور پر ہے، بعض کا تفصیلی طور پر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کون سی چیز اور کون سا سبب اس شخص کو حاصل ہوا ہے، جو رسالت کا دعویٰ کرتا ہے، حالاں کہ وہ کھانا کھاتا ہے، جس طرح ہم کھاتے ہیں اور طلبِ معاش کے لیے بازاروں میں آمد و رفت رکھتا ہے، جیسے ہم آمد و رفت رکھتے ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ رسول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ فرشتہ ہو اور کھانے پینے اور کمائی کرنے سے بے نیاز ہو۔ کلمۂ ''ما'' استفہامیہ محلِ رفع میں ہے بنا بر ابتدا اور استفہام انکار کے لیے ہے اور مبتدا کی خبر ہے ﴿ لِ هٰذَا الرَّسُوْلِ ﴾ اور جملہ ﴿ یَاْكُلُ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ اسی جملے سے اخبار کا فائدہ مکمل ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِیْنَ ﴾ [المدثر: ٤٩] ''پھر انھیں کیا ہوا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں؟'' اور انکار سبب کی طرف متوجہ ہے مع تحققِ مسبب کے۔ مسبب أکل وشی ہے، لیکن تحقق اس مسبب کا مستبعد ہوا بسبب منتفی ہونے اس کے سبب کے نزدیک ان کے واسطے تحکم و استہزاء کے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اگر وہ صحیح ہے تو اس کا کیا حال ہے کہ اس کی حالت ہماری حالت سے مختلف نہیں ہے۔ ﴿ لَوْلَآ ﴾ تحضیض کا ہے بمعنی ''هلّا''، یعنی برانگیختہ و آمادہ کرنے کے لیے۔ امام ابن ہشام رحمہ اللہ نے ہروی سے نقل کیا ہے کہ ﴿ لَوْلَآ ﴾ استفہام کا ہے۔[2] اس قول کے نقل کرنے کے بعد تحضیض کو قوت دی ہے۔

﴿ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا ﴾ کفار نے یہ بات طلب کی کہ نبی کے ساتھ کوئی فرشتہ ہو کہ اس کا ساتھ دے، اس کی مساعدت و مدد کرے۔ پہلے یہ فرمایش کی تھی کہ نبی فرشتہ ہو، کھانے اور کمائی کرنے سے مستغنی ہو، پھر اس فرمایش سے اترے تو کہا کہ فرشتہ نہ سہی، اس کے ساتھ ہی کوئی فرشتہ ہو کہ اس کی تصدیق کرے اور اس کی رسالت کی گواہی دے۔ جمہور نے ﴿ فَیَكُوْنَ ﴾ بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ تحضیض کا جواب ہے۔ کسی نے بہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ اُنْزِلَ ﴾ پر معطوف۔ ماضی پر اس لیے عطف جائز ہوا کہ اس سے مراد مستقبل ہے۔ ﴿ اَوْ یُلْقٰٓی اِلَیْهِ كَنْزٌ ﴾ معطوف ہے ﴿ اُنْزِلَ ﴾ پر اور ﴿ فَیَكُوْنَ ﴾ پر اس کا عطف صحیح نہیں ہے۔ معنی یہ

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤١٠۔ ٤١٢) [2] روح المعاني (١٨/ ٢٣٨)

ہیں: یا کیوں نہیں ڈالا جاتا اس کی طرف کوئی خزانہ؟ اب فرشتے کے اترنے کی فرمایش سے نیچے اترے تو یہ فرمایش کی کہ اس کے ساتھ کوئی خزانہ ہو کہ آسمان سے اس کی طرف ڈالا جائے تا کہ روزی کمانے سے بے نیاز ہو جائے۔

﴿ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ﴾ جمہور کی قراءت تکون بتائے فوقیہ ہے۔ امام اعمش اور قتادہ رحمہما اللہ نے "یَکُوْنُ" بیائے تحتیہ پڑھا ہے، اس لیے کہ جنت کی تانیث حقیقی نہیں ہے۔ حمزہ، علی اور خلف نے "نَأْكُلُ" بہ نون پڑھا ہے، باقی قراء کی قراءت ﴿ يَاْكُلُ ﴾ بیائے تحتیہ ہے، یعنی یا ہو اس کے لیے کوئی باغ کہ ہم اس کے پھلوں سے کھائیں یا وہ خود اس سے کھائے، تا کہ اس سبب سے اس کو ہم پر ایک قسم کی عزت اور شرف ہو، اس طرح سے کہ اس کا کھانا اس کے اپنے باغ سے ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: دونوں قراءتیں حسن ہیں، اگرچہ قراءت یائے تحتیہ زیادہ ظاہر ہے، اس لیے کہ تنہا نبی اکرم ﷺ کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، پس ضمیر کا رجوع آپ کی طرف زیادہ ظاہر ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عتبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، نضر بن حارث، ابو البختری، اسود بن عبد المطلب، زمعہ بن اسود، ولید بن مغیرہ، ابوجہل بن ہشام، عبد اللہ بن ابی امیہ، اُمیہ بن خلف، عاص بن وائل اور منبہ بن حجاج جمع ہوئے تو بعض نے بعض سے کہا کہ محمد ﷺ کی طرف آدمی بھیجو، پھر اس سے گفتگو کرو اور جھگڑو، یہاں تک کہ اس سے عذر قطع کر لو۔ چنانچہ آپ ﷺ کی طرف یہ کہلا کر بھیجا کہ تیری قوم کے شریف لوگ تیرے لیے جمع ہوئے ہیں تا کہ تجھ سے گفتگو کریں، کہا: پھر رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو وہ لوگ بولے: اے محمد! ہم نے تیری طرف آدمی بھیجا، تا کہ ہم تجھ سے عذر قطع کر لیں۔ لہٰذا اگر تو یہ قصہ صرف اس لیے لے کر آیا ہے کہ اس سے تو مال طلب کرے تو ہم اپنے مالوں میں سے تیرے لیے جمع کر دیں اور اگر تو اس سے کسی شرف اور بزرگی کا طالب ہے تو ہم تجھے سردار بنا دیں اور اگر تو اس سے حکومت کا ارادہ کرتا ہے تو ہم تجھے بادشاہ کر دیں۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا بِيْ مِمَّا تَقُوْلُوْنَ » یعنی جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اس میں سے مجھے کوئی شے مطلوب نہیں ہے۔ میں جو کچھ تمھارے پاس لایا ہوں، وہ اس لیے نہیں لایا کہ اس سے میں تمھارے مال طلب کروں، یا اس سے تم پر شرف حاصل کروں، یا تم پر ملک یعنی بادشاہت کروں، لیکن مجھے اللہ نے تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر کتاب اُتاری ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا ہو جاؤں، پس میں نے تم کو اپنے رب کی رسالت پہنچا دی اور تمھارے لیے خیر خواہی کر دی۔ پس اگر تم مجھ سے اس شے کو قبول کرو، جو میں تمھارے پاس لایا تو وہ تمھارا دنیا اور آخرت میں حصہ ہے، یعنی تمھارا فائدہ ہے اور اگر تم اسے رد کر دو گے تو میں اس پر صبر کروں گا اللہ کے حکم کے لیے، یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کر دے۔ وہ بولے: اے محمد! اگر تو ان چیزوں میں سے کسی چیز کو قبول نہیں کرتا جو ہم نے تجھے پیش کی ہیں، یا یوں کہا ہے کہ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو

---

[1] فتح القدیر (٤/ ٨٥)

اپنے لیے اپنے رب سے سوال کر کہ وہ تیرے ساتھ کسی فرشتے کو بھیجے، جو اس بات میں تیری تصدیق کرے، جو تو ہم سے کہتا ہے اور تیری طرف سے ہمارے ساتھ گفتگو کرے اور تو اپنے رب سے سوال کر کہ وہ تیرے لیے باغ اور سونے اور چاندی کے محل کر دے اور تجھے ان چیزوں سے غنی اور بے نیاز کر دے، جن کی تو تلاش کرتا ہے، کیوں کہ تو بازاروں میں معاش کا ذریعہ تلاش کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے، جیسے ہم اسے تلاش کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہم تیرے رب کی طرف سے عطا کردہ تیرے فضل اور منزلت کو پہچان لیں۔ یہ کام کر اگر تو رسول ہے، جیسا کہ تو خیال کرتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا أَنَا بِفَاعِلٍ، مَا أَنَا بِالَّذِي يَسْأَلُ رَبَّهُ هٰذَا» یعنی میں تو ایسا کرنے والا نہیں ہوں، میں وہ شخص نہیں ہوں جو اپنے رب سے اس قسم کا سوال کروں۔ میں تمھاری طرف اس بات کے ساتھ نہیں بھیجا گیا، اللہ نے تو مجھ کو بشیر اور نذیر بنا کر، یعنی خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔[1] (وأخرجه ابن إسحاق و ابن جرير و ابن المنذر)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴾ اس جگہ ظالمین سے مراد وہی لوگ ہیں جنھوں نے اگلی باتیں کہی ہیں۔ یہاں صرف "قَالُوْا" کہہ دینا کافی تھا، لیکن اسم ظاہر کو مضمر کے بجائے رکھا اور اس کے ساتھ ظلم کی صفت جو بیان کی تو اس لیے کہ ظلم کا حکم ان پر لگانا منظور تھا۔ مسحور وہ شخص ہے جو کہ مخدوع ہو، یعنی اس پر مکر کیا گیا ہو اور جادو سے اس کی عقل پر غلبہ کیا گیا ہو۔ اس جگہ سحر سے مراد لازم سحر ہے، یعنی عقل کا خلل پذیر ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شخص ایسا ہے کہ اس کی عقل میں خلل آ گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "مسحور" بمعنی ذو سحر ہے۔ "وَهِيَ الرِّئَةُ أَيْ: بَشَرًا لَهُ رِئَةٌ لَا مُلْكًا"، یعنی مسحور مشتق ہے سُحر سے۔ سُحر کہتے ہیں پھیپھڑے کو، یعنی یہ شخص پھیپھڑے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری طرح بشر ہے، اور بشر کہیں رسول ہوا ہے؟! اس قسم کا بیان سورۃ الاسراء میں گزر چکا ہے۔[2]

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ ﴾ جو جو بیکار اور واہیات باتیں جن کے منہ سے نکالنے پر انھوں نے جرأت کی اور بے دھڑک ان کو بک دیا ہے، اللہ پاک ان کی عظمت بیان کرتا ہے اور ان سے تعجب دلاتا ہے کہ دیکھ تو انھوں نے تیرے لیے کیسی مثالیں بیان کی ہیں اور تیرے حق میں کیسی عجیب باتیں کہی ہیں جو عقل سے خارج ہیں اور امثال کے قائم مقام ہیں اور تیرے لیے ایسی صفتیں گھڑی ہیں اور ایسی حالتیں ایجاد کی ہیں جو ناممکنات میں سے ہیں۔ اس قسم کی واہیات اور خرافات باتوں سے ان کا مقصد تیری تکذیب کرنا اور تجھے جھٹلانا ہے۔ امثال وہی نادر قسم کے اقوال اور عجیب و غریب فرمایشیں ہیں، جن کا اس جگہ ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو مفتری ٹھہرایا اور کہا کہ انھیں املا کرائی جاتی ہے اور وہ مسحور ہیں۔ نعوذ باللہ من جميع ما كره الله تعالىٰ.

﴿ فَضَلُّوْا ﴾ یعنی وہ سیدھے راستے سے بہک گئے، چنانچہ ان کو اس کی طرف کوئی راہ نہیں ملتی اور وہ صواب میں

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٣٦۔ ٢٣٧) [2] رقم الآية (٤٧)

سے کسی شے کی طرف نہیں پہنچے، بلکہ ایسی کھوٹی باتیں لائے جو ایک ادنیٰ عقل رکھنے والے اور کم تمیز والے سے بھی صادر نہیں ہو سکتیں۔

اسی لیے اللہ پاک نے یہ فرمایا: ﴿ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴾ یعنی اس نبی کی نبوت میں عیب تلاش کرنے کی کوئی راہ نہیں پاتے۔ چوں کہ کافر لوگ پست خیال ہیں، ان کا مبلغِ علم یہی مال و دولت اور دنیائے فانی کی ظاہری تازگی اور رونق ہے اور وہ لوگ آخرت کی خوبیوں سے بالکل ناواقف واقع ہوئے ہیں، اس لیے انھوں نے نبوت کی سچائی کا دار و مدار خزانہ اور باغات اور محلات پر رکھا، حالاں کہ آخرت کے مقابلے میں اس کی کوئی ہستی اور وقعت نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس کی تردید اس طرح فرمائی: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ ﴾ یعنی وہ ذات پاک بڑی خوبیوں والی اور بابرکت ہے کہ اگر وہ چاہے تو تیرے لیے اس دنیا میں اس خزانے اور باغ اور محل سے بھی بہتر مہیا کر دے، جس کی کفار نے فرمایش کی ہے۔

پھر اللہ پاک نے خیر کی یہ تفسیر فرمائی: ﴿ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ یعنی تجھے دنیا ہی میں ایسے باغ دے دے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، لیکن اللہ پاک نے یہ چاہا کہ یہ چیزیں آپ کو آخرت میں عطا فرمائے۔ ﴿ جَنّٰتٍ ﴾ ﴿ خَيْرًا ﴾ کا بدل ہے اور ﴿ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴾ معطوف ہے موضع ﴿ جَعَلَ ﴾ پر۔ ﴿ جَعَلَ ﴾ کا محل جزم ہے۔ جمہور کی قراءت جزم کے ساتھ ہے۔ امام ابن کثیر، ابن عامر اور ابوبکر نے بہ رفع "يَجْعَلُ" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ کلام مستانف ہے۔ علمِ اعراب میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جب شرط ماضی ہو تو اس کے جواب میں جزم اور رفع دونوں جائز ہیں۔

پس ﴿ جَعَلَ ﴾ اس جگہ محلِ جزم و رفع میں ہے تو جائز ہے کہ جو اس پر معطوف ہے وہ مجزوم ہو، جیسا کہ جمہور نے پڑھا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ مرفوع ہو جس طرح کہ ابن کثیر وغیرہ نے پڑھا ہے۔[1] کسی نے بہ نصب بھی پڑھا ہے اور کسی کی یہ قراءت بھی ہے کہ ﴿ يَجْعَلْ ﴾ کے لام کو ﴿ لَكَ ﴾ کے لام میں ادغام کیا ہے اجتماعِ مثلین کے سبب سے، اور ادغام کو چھوڑ کر بھی پڑھا گیا ہے، اس لیے کہ دونوں کلمے منفصل ہیں۔ قصر پتھروں کے گھر کو کہتے ہیں، اس لیے کہ اس کا رہنے والا مقصور ہوتا ہے، یعنی روکا ہوا اور محفوظ، تاکہ اس کی طرف کوئی نہ پہنچ سکے۔ کسی نے کہا ہے کہ قصر مٹی کا یا اُون اور بالوں کا گھر ہے۔ غرضیکہ جو بات کسی کم عقل والے سے صادر نہیں ہوتی، اللہ پاک نے وہ بات کفار سے نقل کر کے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔

پھر اس ڈانٹ سے پھر کر یہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ﴾ یعنی وہ بات جو انھوں نے کہی سو کہی، بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب یہ بات کی کہ قیامت کی تکذیب کی، یہ اس وجہ سے کہ وہ دلیلوں میں غور و فکر کر کے کچھ فائدہ نہیں

[1] فتح القدير (٤/ ٨٦)

حاصل کرتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس ساز و سامان کا ذکر کیا جو اس شخص کے لیے تیار کیا گیا ہے جو قیامت کو جھٹلاتا ہے۔

فرمایا: ﴿ وَاَعۡتَدۡنَا لِمَنۡ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيۡرًا ﴾ یہ جملہ محلِ نصب میں ہے حال کی بنا پر۔ بلکہ انھوں نے تو قیامت کو جھٹلایا اور حقیقت حال یہ ہے کہ ہم نے قیامت کی تکذیب کرنے والے کے لیے شعلے مارتی اور دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ امام ابو مسلم نے کہا کہ ﴿ اَعۡتَدۡنَا ﴾ کے معنی ہیں: "جَعَلْنَاهُ عَتِيْدًا وَّمُعَدًّا لَّهُمْ"[1] یعنی ہم نے ان کے لیے سعیر کو تیار کر رکھا ہے۔ سعیر دہکتی ہوئی اور شعلہ مارتی آگ کا نام ہے۔ یہ آیتِ کریمہ اس بات پر دال ہے کہ جہنم آج موجود ہے، جس طرح کہ جنت کا آج موجود ہونا اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: ﴿ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] "جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔" چونکہ "ساعة" کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس لیے "كَذَّبَ بِهَا" کہنا کافی تھا، لیکن طعن و تشنیع میں مبالغہ کرنے کے لیے "ساعة" کے لفظ کو ضمیر کی جگہ رکھا گیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ان کے لیے سعیر کا تیار کر رکھنا، اگرچہ صرف اس لیے نہیں ہے کہ انھوں نے قیامت کی تکذیب کی، بلکہ شریعت میں سے کسی شے کی تکذیب کریں تو بھی وہی سعیر تیار ہے، لیکن چوں کہ قیامت کی تکذیب ایک قریبی وجہ ان کے سعیر میں داخل ہونے کے لیے تھی، اسی لیے اسی کی تکذیب پر سعیر کے تیار کرنے کو مرتب کیا اور اسی ترتیب پر اکتفا فرمایا، ورنہ شریعت کے اَور اُمور کی تکذیب پر بھی سعیر تیار ہے۔ جملہ ﴿ اِذَا رَاَتۡهُمۡ ﴾ محلِ نصب میں ہے اور ﴿ سَعِيۡرًا ﴾ کی صفت ہے، اس لیے کہ سعیر آگ کے معنی میں مؤنث ہے اور نار مؤنث سماعی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت ان کے لیے آگ ظاہر ہو گی تو وہ دیکھنے والے کے سامنے ہو گی، یعنی وہ دور ہو گی، مگر ایسی جگہ پر ہو گی کہ دیکھنے والا اس کو خوب دیکھ لے۔

کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ جس وقت ان کو آگ کے داروغہ دیکھیں گے۔ غرض اس سے یہ ہے کہ دیکھنے کی نسبت آگ کی طرف نہیں ہے، بلکہ اس کے خازنوں کی طرف ہے۔ اس سے کوئی مانع نہیں ہے کہ اللہ پاک آگ کو ادراکِ بصر دے دے، یعنی اسے دیکھنے کی قوت دے دے۔ یہی قول راجح ہے اور کیوں راجح نہ ہو، خود حدیث شریف میں آ چکا ہے کہ جہنم کی دو آنکھیں ہیں۔ چنانچہ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔[2] (أخرجه عبد بن حميد و ابن جرير من طريق خالد بن دريك و نحوه عند رزين في كتابه و صححه ابن العربي في قبسه وله لفظ بمعناه)

دوسری حدیث یہ ہے کہ بروایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن آگ سے ایک گردن نکلے گی، اس کی دو آنکھیں ہوں گی جو دیکھیں گی اور کان ہوں گے جو سنیں گے اور ایک زبان ہو گی جو بولے گی کہ میں تین آدمیوں کے لیے مقرر کی گئی ہوں۔ (حدیث کے الفاظ یہ ہیں: «يَخْرُجُ عُنُقٌ مِّنَ النَّارِ» هُوَ بِضَمِّ عَيْنٍ، شَخْصٌ أَوْ طَائِفَةٌ، وَمِنْ بَيَانِيَةٌ، «وُكِّلْتُ، أَيْ: وَكَّلَنِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِأَنْ أُدْخِلَ هٰؤُلَاءِ

---

[1] فتح القدير (٤/ ٨٦)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

الثَّلَاثَةَ النَّارَ وَأُعَذِّبُهُمْ» كذا في مجمع البحار)۔[1] یعنی ہر جبار عنید کے لیے اور ہر اس شخص کے لیے جو اللہ کے ساتھ اور معبود کو پکارے اور مصوروں کے لیے۔[2] (جَبَّارٌ عَنِيدٌ: هُوَ الْجَائِرُ عَنِ الْقَصْدِ، اَلْبَاغِيُ الَّذِيْ يَرُدُّ الْحَقَّ مَعَ الْعِلْمِ بِهِ، كذا في المجمع)۔[3] (أخرجه الترمذي، وفي الباب عن أبي سعيد قال أبو عيسى: هذا حديث غريب صحيح)

﴿ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ آگ ان کو دیکھے گی اور وہ اُن سے دور ہوگی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے اور اُن کے درمیان سال بھر کی راہ ہوگی۔ کسی نے کہا ہے کہ سو برس کی راہ۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ پانچ سو برس کی راہ۔ ﴿ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا ﴾ یعنی اس کا اس طرح جوش مارنا سنیں گے جس طرح کسی غضبناک کا سینہ غصے کے مارے جوش مارتا ہے۔ یعنی اس کی ایک آواز ہوگی جو اس کے کافروں پر غضبناک ہونے پر دلالت کرے گی۔ اس کے جوش مارنے کی بھی ایک آواز ہوگی جو غضبناک کی آواز کی طرح ہوگی۔ ﴿ وَزَفِيْرًا ﴾ زفیر اس آواز کو کہتے ہیں جو پیٹ سے سنائی دیتی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اس آواز کا سننا ہے جو اس کے غصے کی دلیل ہے۔ یعنی اس کی ایک آواز مشابہ آواز غضبناک کے سنیں گے۔ قطرب نے کہا: مراد یہ ہے کہ اس کے تغیظ کو جان لیں گے، یعنی غضبناک ہونے کو اور اس کی زفیر کو سنیں گے، جس طرح کہ اس مصرعہ میں ہے: "مُتَقَلِّدًا سَيْفًا وَّرُمْحًا"[5] یعنی تلوار لٹکانے والا اور نیزے کو اٹھانے والا ہے۔

کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ اس میں عذاب کیے ہوئے لوگوں کی چیخ و پکار سنیں گے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴾ [هود: ١٠٦] "ان کے لیے اس (آگ) میں بس چیخنا چلانا اور دھاڑنا ہوگا۔" حرفِ "في" اور لام ایک دوسرے کے قریب ہیں، مثلاً یوں بولتے ہیں: "هٰذَا لِلّٰهِ وَفِي اللّٰهِ" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ جب ان کو سو برس کی راہ سے دیکھے گی۔ یہ اس وقت ہوگا کہ جہنم لائی جائے گی اور کھینچی جائے گی، ستر ہزار باگوں سے، ہر باگ سے ستر ہزار فرشتے باندھے جائیں گے، اگر وہ چھوڑ دی جائے تو ہر نیک اور فاجر پر آ جائے۔ ﴿ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴾ ایک چیخ مارے گی تو کوئی قطرہ آنسو کا نہ رہے گا، مگر وہ ظاہر ہو جائے گا، پھر دوسری چیخ مارے گی تو دل اپنی جگہوں سے قطع کیے جائیں گے اور وہ حلق میں پہنچ جائیں گے۔[6]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا ﴾ مکان کا وصف ضیق کے ساتھ اس لیے کیا کہ اس سے زیادہ شدت اور سختی ظاہر ہو اور یہ بات سمجھی جائے کہ ان پر عذاب کی انتہا ہو چکی ہے۔ ﴿ مُقَرَّنِيْنَ ﴾ منصوب ہے حال

[1] مجمع بحار الأنوار (٣/ ٦٨٩) [2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٧٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٠٥١)
[3] مجمع بحار الأنوار (٣/ ٦٨٧) [4] الدر المنثور (٦/ ٢٣٩) [5] فتح القدير (٤/ ٨٦) [6] الدر المنثور (٦/ ٢٣٩)

ہونے کی بنا پر، یعنی جب وہ جہنم کی تنگ جگہ میں ڈالے جائیں گے، اس حالت میں کہ ان کے ہاتھ ان کی گردنوں کے طوقوں کے ساتھ ملائے گئے ہوں گے اور لوہے کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ مشکیں بندھی ہوئی ہوں گی۔ یہ معنی پہلے گزر چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ شیاطین کے ساتھی بنا دیے جائیں گے، یعنی ان میں سے ہر ایک اپنے شیطان کی طرف قرین کیا جائے گا، یعنی وہ اور اس کا شیطان ایک ہی زنجیر میں باندھا جائے گا۔ سورت ابراہیم میں اس قسم کے مضمون پر کلام گزر چکا ہے۔[1]

﴿ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴾ یعنی وہ اس تنگ جگہ میں ہلاکت کو پکاریں گے، جس طرح کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ﴿ ثُبُوْرًا ﴾ کا نصب مصدریت کی بنا پر ہے۔ "أَيْ: ثَبَرْنَا ثُبُوْرًا" (فتح القدیر میں مجہول لکھا گیا ہے،[2] لیکن بہتر معروف ہے، کیوں کہ ثبور کے معنی ہلاکت ونقصان کے ہیں، یہ معنی لازم ہیں۔ واللہ أعلم)۔ یعنی ہلاک ہوئے ہم ہلاک ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ خوب ہلاک ہوئے کہ اس کے بعد ہلاکت کا کوئی درجہ باقی نہ رہا۔ کسی نے کہا ہے کہ مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ اس جگہ ہلاکت کی تمنا کریں گے اور اس بلا کی وجہ سے جو اُن پر نازل ہوئی ہلاکت کو پکاریں گے اور کہیں گے "یَا ثُبُوْرَاہُ"، یعنی اے ہلاکت! تو حاضر ہو کہ یہ تیرا وقت ہے، لیکن وہ ہلاک نہیں ہوں گے، ان کو اس کا جواب یہ ملے گا: ﴿ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴾ یہ بات ان سے جہنم کے داروغے کہیں گے، یعنی تم ایک ثبور کا پکارنا چھوڑ دو اور بہت سے ثبور کو پکارو، کیوں کہ جس ہلاکت اور نقصان میں تم مبتلا ہو، وہ اس سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3] ثبور مصدر ہے، جو قلیل اور کثیر پر واقع ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی جمع نہیں کی جاتی۔ اسی کے مثل یہ قول ہے: "ضَرَبْتُهُ ضَرْبًا كَثِيْرًا، وَقَعَدَ قُعُوْدًا طَوِيْلًا"

یہاں جو ﴿ كَثِيْرًا ﴾ فرمایا، وہ کثرتِ دعا کی مطابقت سے ہے، جو اس سے متعلق ہے نہ کہ فی نفسہٖ اس کی کثرت کے مطابق ہے، کیوں کہ وہ تو ایک چیز ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تم اپنی جانوں پر ثبور کو نہ پکارو ایک پکارنا اور پکارو اس کو بہت سا پکارنا، کیوں کہ جس عذاب میں تم ہو، وہ اس سے زیادہ سخت ہے، اس کی طویل مدت اور اس کے لا متناہی ہونے کے سبب سے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ان کے حال کی تمثیل اور تصویر ہے اس شخص کے حال کے ساتھ جس سے یہ کہا جائے اس کے بغیر کہ اس جگہ کوئی قول ہو۔ یہ بات قرآن شریف کے ظاہر کے خلاف ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم اس شے میں واقع ہوئے ہو کہ اس میں تمھاری ثبور ایک نہیں ہے، بلکہ وہ ثبور بہت ہیں، کیوں کہ عذاب کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قسم ایک ثبور ہے، اس کی شدت اور سختی کی وجہ سے، یا اس لیے کہ وہ متجدد ہوتا رہتا ہے، ہر دفعہ ایک نئی قسم کا عذاب موجود ہوتا ہے۔

---

[1] رقم الآیة (٤٩) [2] معاني القرآن (٤/ ٥٩) فتح القدیر (٤/ ٨٧) [3] معاني القرآن (٤/ ٥٩)

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَٰهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴾ [النساء: ٥٦] ''جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کی جگہ دوسری کھالیں چڑھا دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں، بلاشبہ اللہ بہت زبردست، بڑی حکمت والا ہے۔'' یا اس لیے کہ وہ منقطع نہیں ہوتا ہے تو ہر وقت میں ایک ثبور ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس جواب سے مراد ان کو ان کے عذاب کے ہمیشہ رہنے کے بارے میں آگاہ کرنا ہے اور انھیں اس بات سے نا امید کرنا ہے کہ اس ہلاکت والے عذاب سے ان کو کبھی نجات نصیب ہو گی، جس کی وہ تمنا کرتے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول کریم رؤف رحیم کی زبان مبارک پر کافروں کو خوب زجر و توبیخ کی۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

قُلْ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۚ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَمَصِيرًا ﴿١٥﴾ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَسْئُولًا ﴿١٦﴾

کہہ دیجیے: کیا یہ (عذاب) زیادہ بہتر ہے یا ابدی جنت، جس کا متقین کو وعدہ دیا گیا ہے؟ وہ ان کے لیے جزا اور واپسی کی جگہ ہے ⑮ اس میں ان کے لیے ہو گا جو وہ چاہیں گے، ہمیشہ (وہاں) رہنے والے، یہ آپ کے رب کے ذمے وعدہ ہے جو پوچھا جا سکتا ہے ⑯

جہنم بہتر ہے یا ابدی جنت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک فرماتا ہے: اے پیغمبر! کہ یہ بدبختوں کا حال ہے، جن کا وصف ہم نے تجھ سے بیان کیا ہے کہ اپنے منہ کے بل جہنم کی طرف حشر کیے جائیں گے تو جہنم ترش روئی و خفگی اور چیخنے چلانے کے ساتھ ان سے ملے گی اور وہ اس کے تنگ مکانوں میں زنجیروں میں بندھے ہوئے اور کسے ہوئے ڈال دیے جائیں گے، نہ کسی طرح حرکت کر سکیں گے نہ استبصار (دیکھنے) کی طاقت رکھیں گے، نہ ہی وہ اس عذاب اور بلا سے خلاصی پا سکیں گے جس میں وہ گرفتار ہیں۔ کیا یہ بہتر ہے یا وہ باغ جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ہے اور جس کا اللہ نے اپنے پرہیزگار بندوں سے وعدہ کیا ہے اور اس کو ان کے لیے تیار کر رکھا ہے اور اس کو ان کا بدلہ اور لوٹ کر جانے کا مقام ٹھہرایا ہے، اس بات کے عوض کہ انھوں نے دنیا میں اللہ پاک کی اطاعت کی، اور اس کی طرف ان کا مآل اور مرجع قرار دیا ہے۔

﴿ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ﴾ یعنی ان کے لیے وہاں وہ چیزیں ہیں جن کی وہ خواہش کریں گے۔ لذیذ اور مزے دار کھانے پینے کی چیزیں، پہننے رہنے بسنے، سوار ہونے اور نظر کرنے اور دیکھنے وغیرہ کی ایسی چیزیں کہ نہ کسی

[1] فتح البیان (۹/ ۲۸٤۔ ۲۹۰)

آنکھ نے اُن کو دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی دل پر ان کا خیال گزرا اور وہ اس عیش و آرام اور راحت و تازگی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ابدًا دائمًا سرمدًا بغیر انقطاع و زوال و انقضا کے اس میں عیش و آرام سے بسر کریں گے، اس سے کسی اور طرف منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔

یہ من جملہ وعدہ الٰہی ہے، جس نے ان پر اس کا تفضّل کیا ہے اور اس کا ان پر احسان فرمایا ہے، اسی لیے یوں ارشاد کیا ہے: ﴿ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴾ یعنی لابُد ضرور یہ واقع ہوگا اور یقینی طور پر وجود میں آئے گا، جس طرح کہ ابوجعفر ابن جریر نے بعض عربی کے علماء سے اس کو حکایت کیا ہے کہ ﴿ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴾ کے معنی وعدہ واجب کے ہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے عن عطاء عن ابن عباس سے روایت کیا ہے: «يَقُوْلُ: سَلُوْا الَّذِيْ وَاعَدْتُّكُمْ أَوْ قَالَ: وَاعَدْنَاكُمْ تُنْجَزُوْهُ» یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اس شے کو مانگو جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا ہے، یا کہا کہ ہم نے تم سے وعدہ کیا ہے، تم اس کو پورا کیے جاؤ گے۔

محمد بن کعب قرظی نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ فرشتے ان کے واسطے اس کا سوال کریں گے، اے ہمارے رب! تو ان کو جناتِ عدن میں داخل کر جن کا تو نے اُن سے وعدہ فرمایا ہے۔ امام ابو حازم رحمہ اللہ (ابو حازم دو ہیں: ایک تو ابو حازم سلمان کوفی اشجعی ہیں، جنھوں نے پانچ برس سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مجالست کی، عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی خلافت میں وفات پائی۔ امام احمد اور ابن معین رحمہما اللہ نے ان کی توثیق کی۔ دوسرے ابو حازم سلمہ بن دینار اعرج تمار مدنی قاص زاہد احد الاعلام ثقہ ہیں، اپنے وقت میں بے مثل تھے، ۱۳۵ یا ۱۴۰ھ میں وفات پائی۔ قول میسور) نے کہا ہے، جب قیامت کا دن ہوگا تو مومن کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے تیرے لیے اس شے پر عمل کیا جس کا تو نے ہم کو امر فرمایا، لہٰذا تو ہمارے لیے اس شے کو پورا کر جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔[1] چنانچہ وہ یہ قول ہے اللہ تعالیٰ کا: ﴿ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴾۔

اس سورت میں یہ مقام کہ نار کا ذکر کیا، پھر اہلِ جنت کے حال سے آگاہ فرمایا، ایسا ہے جیسا کہ اللہ پاک نے سورۃ الصافات میں اہلِ جنت کا حال ذکر کیا ہے، پھر اور جو اس میں تر و تازگی، حبور (خوشی) اور سرور ہے، اس کا بیان کیا ہے۔ پھر یوں فرمایا ہے: ﴿ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ۝ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۝ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ۝ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ۝ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ۝ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴾[2] [الصافات: ٦٢۔ ٧٠] ''کیا یہ مہمانی بہتر ہے یا (دوزخ میں) تھوہر کا درخت؟ بلاشبہہ ہم نے اسے ظالموں کے لیے آزمایش بنایا ہے۔ بے شک وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی تہ میں اُگتا ہے۔ اس کا پھل گویا کہ وہ شیطانوں کے سر ہیں۔ تو بلاشبہہ وہ (دوزخی) اس میں سے کھائیں گے، پھر اس سے (اپنے)

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٤٦۔ ٢٤٧) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧١) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤١٣)

پیٹ بھریں گے۔ پھر اس پر بے شک ان کے لیے (پینے کو) گرم کھولتے پانی کا آمیزہ ہوگا۔ پھر یقیناً ان کی واپسی بھڑکتی آگ کی طرف ہوگی۔ بلاشبہ انھوں نے اپنے باپ دادوں کو گمراہ پایا۔تو وہ انہی کے نقشِ قدم پر دوڑے جاتے ہیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ سعیر کی طرف ہے جو صفاتِ عظیمہ کے ساتھ متصف ہے۔ جنت کو جو خلد کی طرف مضاف کیا ہے تو اس اضافت میں اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ جنت کا عیش و آرام قائم دائم رہے گا، کبھی منقطع نہ ہوگا۔ یہاں پر جو کلمہ ﴿ خَيْرٌ ﴾ لایا گیا ہے، باوجود اس کے کہ نار میں کسی طرح کی خیر نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب لوگ کبھی اس کو بولتے ہیں۔ اسی باب سے وہ قول ہے جس کو سیبویہ نے عرب سے نقل کیا ہے کہ وہ یوں بولتے ہیں: ''اَلسَّعَادَةُ أَحَبُّ إِلَيْكَ أَمِ الشَّقَاوَةُ'' یعنی سعادت تجھے زیادہ محبوب ہے یا بدبختی، حالاں کہ یہ بات معلوم ہے کہ سعادت اس کو زیادہ محبوب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ خیر تفضیل کے باب سے نہیں ہے یہ تو ایسی ہے جیسے تو کہتا ہے: ''عِنْدَهٗ خَيْرٌ'' یعنی اس کے پاس خیر ہے، مطلق خوبی و بھلائی کے معنی ہیں تفضیل مراد نہیں ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول اچھا ہے، جیسا کہ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ نے کہا:

أَتَهْجُوْهُ وَلَسْتَ لَهٗ بِكُفْوٍ فَشَرُّكُمَا لِخَيْرِكُمَا الْفِدَاءُ [1]

مطلب یہ ہے کہ اس شعر میں بھی خیر و شر سے مراد تفضیلی معنی نہیں ہیں، بلکہ بھلائی برائی مراد ہے۔ ﴿ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ یعنی وہ جنتِ خلد جس کا وعدہ پرہیز گاروں کو ملا ہے۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴾ یعنی وہ جنت پرہیز گاروں کے لیے ان کے اعمال کا بدلہ اور جائے بازگشت تھی کہ پھر کر اس کی طرف جائیں گے۔ یہ اللہ پاک کے علم میں تھا یا ان کی پیدائش سے بھی ایک زمانہ دراز پہلے سے لوحِ محفوظ میں تھا۔ یا یہ اس لیے فرمایا کہ اللہ پاک نے جس شے کا وعدہ کیا ہے تو وہ شے اپنی حقیقت اور وجود میں ایسی ہے گویا ہو چکی۔

﴿ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ نعمتیں اور انواع و اقسام کی لذیذ اور مزیدار چیزیں جو وہ چاہیں گے، وہ سب اُن کے لیے جنت میں مہیا اور تیار ہیں، چنانچہ اَور آیتِ کریمہ میں اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ ﴾ [حم السجدة: ٣١] ''اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تمھارے جی چاہیں گے۔'' شاید ہر گروہ کی ہمتوں کو وہی مل جائے گا جو اس کے رُتبے کے مطابق ہے، کیوں کہ ظاہر یہ بات ہے جو اشیاء کسی کامل کے لیے ہیں، ان میں سے کوئی چیز کوئی ناقص خواہش کر کے پا نہ سکے گا۔ اس میں اس بات سے آگاہ فرمایا ہے کہ ساری مرادیں صرف جنت ہی میں حاصل ہوں گی، چنانچہ دنیا میں اس بات کے پیچھے پڑنا کہ ہماری

---

[1] فتح القدير (٤/ ٨٧)

ساری مرادیں بر آئیں اور ان کی طلب میں محنت و مشقت اٹھانا، دردِ سری اختیار کرنا اور ذلیل و خوار ہونا عبث و بے سود ہے، اگر کوئی خواہش پوری ہو جائے تو شکر کرے اور پوری نہ ہو تو صبر کرے، اعمالِ صالح کے بجالانے میں کشش و کوشش فرمائے، تاکہ ہر خواہش جنت میں پائے۔ آدمی یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں آخرت ہو جائے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟! ہر گھر کی خصوصیات الگ الگ ہیں، وہ اسی میں ہوتی ہیں، ایک کی کیفیت دوسرے میں کس طرح ہو سکتی ہے۔ شہاب نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت والوں کے دِلوں میں یہ بات القا نہ کرے گا کہ جو شخص رُتبے میں ان سے زیادہ بزرگ ہے اس کے رتبے کو پائیں، وہ اپنے سے علاوہ دوسرے کے حال کی طرف توجہ ہی نہ کریں گے، یعنی ہر شخص اپنی عیش اور مزے میں مست ہو گا، دوسرے سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہو گا۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد — کسے را با کسے کارے نباشد

''بہشت وہ جگہ ہوتی ہے، جہاں کسی قسم کا دُکھ نہیں ہو گا اور کسی فرد کا کسی دوسرے سے کوئی بھی معاملہ متعلق نہیں ہو گا، ہر ایک آزاد و بے نیاز ہو گا۔''

﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ منصوب ہے بنا بر حال، یعنی جنت میں جو چاہیں گے وہ پائیں گے، اس حال میں کہ جنت کی نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ عیش و نعمت کی تکمیل یہ ہے کہ وہ دائمی ہو، کیوں کہ اگر وہ منقطع ہو جائے تو ایک طرح کے غم و رنج کے ساتھ ملی ہو گی۔ اور جنت تو خوشی اور سرور کا گھر ہے نہ کہ تکالیف اور سختیوں کا۔ اللهم ارزقنا بجودك الواسع وكرمك العميم و فضلك العظيم يا رحيم، وصل وسلم و بارك عليه وعلى آله وصحبه آمين. خلود کے معنی کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ ﴿ كَانَ ﴾ میں ضمیر ''مَا يَشَآءُوْنَهٗ'' کی طرف راجع ہے، یا خلود کی طرف، یا وعدے کی طرف جس پر ﴿ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ دال ہے۔ ﴿ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴾ یعنی وہ شے جس کو وہ چاہیں گے، یا خلود یا تیرے رب پر وعدۂ مسئول، یعنی ایسا وعدہ کہ لائق ہے اس کے کہ مانگا جائے اور طلب کیا جائے۔

کما فی قولہ تعالیٰ: ﴿ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ ﴾ [آل عمران: ١٩٤] ''(اے) ہمارے رب! اور ہمیں وہ چیز دے جس کا تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا تھا۔'' کسی نے کہا ہے کہ فرشتے ان کے لیے جنت کا سوال کریں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ اِۨلَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ ﴾ [المؤمن: ٨] ''اور انھیں ان ابدی باغوں میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔'' یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وعدۂ واجب ہے، گو اس کا سوال نہ کیا جائے۔[1]

---

[1] فتح البیان (٩/ ٢٩١)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ
اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوْا
سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ
مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ
وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ فَمَا
تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ
عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾

اور جس دن اللہ انھیں اور ان کو جنھیں وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں، جمع کرے گا، پھر (ان سے) پوچھے گا: کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود ہی راہ سے بھٹک گئے تھے؟ (17) وہ کہیں گے: تو پاک ہے! ہمارے لائق نہیں تھا کہ ہم تیرے سوا کارساز بنائیں، لیکن تو نے انھیں سامانِ زندگی دیا، اور ان کے باپ دادا کو بھی، حتی کہ وہ (تیرا) ذکر بھول گئے اور وہ لوگ ہلاک ہونے والے تھے (18) (اللہ فرمائے گا: اے کافرو!) یقیناً انھوں نے تو تمھیں جو تم کہتے تھے جھٹلا دیا، لہٰذا (اب) نہ تم (اپنے آپ سے عذاب) ٹالنے کی طاقت رکھتے ہو اور نہ (کسی سے) مدد (لے سکتے ہو) اور تم میں سے جو شخص ظلم (شرک) کرے گا تو اسے ہم بہت بڑا عذاب چکھائیں گے (19)

روزِ قیامت مشرکین کے معبودوں کا اعلانِ براءت:

کفار نے جو اللہ تعالیٰ کے سوا ملائکہ وغیرہم کو پوجا ہے تو اُن کو قیامت کے دن اس بارے میں ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کی جائے گی۔ اس پر ان کو ڈانٹیں گے اور دھمکائیں گے۔ چنانچہ اللہ پاک اس کی خبر دیتا ہے اور یوں فرماتا ہے کہ جس دن وہ ان کو جمع کر کے بلائے گا اور اُن کو جن کو وہ پوجتے ہیں، اللہ کے سوا انھیں بھی بلائے گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام اور ملائکہ ہیں۔[1]

پھر پروردگار تبارک وتعالیٰ معبودوں سے فرمائے گا، کیا تم نے ان لوگوں کو اللہ کے سوا اپنی عبادت کی طرف بلایا تھا یا خود انھوں نے تم کو پوج لیا، اپنی طرف سے تمھارے بلائے بغیر؟ جیسے اللہ سبحانہٗ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٤٧)

يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ [المائدة: ۱۱۶۔ ۱۱۷] ’’اور جب اللہ کہے گا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟ تو وہ کہیں گے: تو پاک ہے، میرے لیے (جائز) نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہو تو یقیناً تو اُسے جانتا ہے۔ تو اسے بھی جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں اسے نہیں جانتا، جو کچھ تیرے نفس میں ہے۔ بے شک تو ہی سب سے بڑھ کر غیب کو جاننے والا ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا سوائے اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمھارا رب ہے، اور میں ان پر نگران تھا، جب تک میں ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اُٹھا لیا، تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر نگہبان ہے۔‘‘

اسی لیے اللہ پاک نے اس جواب کی خبر دی جو معبود لوگ قیامت کے دن کہیں گے۔ ﴿ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ ﴾ اکثر نے ﴿ نَتَّخِذَ ﴾ کو بہ فتحِ نون پڑھا ہے، یعنی ساری مخلوق کو یہ بات بن نہیں آتی ہے کہ تیرے سوا کسی کو پوجیں، نہ ہم کو نہ ان کو۔ چنانچہ ہم نے تو اُن کو اس کی طرف نہیں بلایا، بلکہ خود انھوں نے اس کو اپنی طرف سے اور ہماری مرضی اور امر کے بغیر کیا ہے اور ہم اُن سے اور اُن کی عبادت سے بری اور بے زار ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [سبا: ۴۰۔ ۴۱] ’’اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر وہ فرشتوں سے کہے گا: کیا یہی لوگ تمھاری عبادت کیا کرتے تھے؟ وہ کہیں گے: تو پاک ہے، تو ہی ان کے ما سوا ہمارا کارساز ہے، بلکہ وہ تو جنوں کی عبادت کرتے تھے، ان کے اکثر انہی پر ایمان رکھتے تھے۔‘‘ دوسروں نے بہ ضمِ نون پڑھا ہے، یعنی کسی کو یہ بات لائق نہیں ہے کہ ہم کو پوجے، کیوں کہ ہم تو تیرے بندے ہیں تیرے محتاج ہیں۔ یہ قراءت قریب المعنی ہے پہلے سے۔

﴿ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ﴾ یعنی ان پر عمریں دراز ہوئیں، یہاں تک کہ اس شے کو بھول گئے جو تو نے اپنے رسولوں کی زبان پر نازل کی، یعنی تیری عبادت کی طرف بلانا کہ صرف تجھی کو پوجیں اور کسی کو تیرا شریک نہ کریں۔ ﴿ وَكَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ بُوْرًا ﴾ بہ معنی ہلاکت ہے، یعنی ہلاک ہونے والے ہیں۔ امام حسن بصری اور امام مالک رحمہ اللہ نے زہری سے روایت کیا ہے: ”أَيْ: لَا خَيْرَ فِيهِمْ“ [1]

---

[1] تفسير الطبري (۱۹/ ۲۴۸)

یعنی یہ ایسے لوگ تھے کہ ان میں کوئی بھلائی نہ تھی۔ ابن زبعری نے کہا ہے، جبکہ وہ اسلام لے آیا۔ (یہ شخص شاعر تھا کفر کی حالت میں نبی اکرم ﷺ کی ہجو کیا کرتا تھا، جب مسلمان ہوا تو ہجو کے عوض میں آپ کی مدح کی، اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ حالتِ کفر میں میں نے اپنی زبان کو ہجو میں کھولا تھا، اب میری زبان اس کھولی ہوئی کو مدح کر کے بند کرے گی)۔

يَا رَسُوْلَ الْمَلِيْكِ إِنَّ لِسَانِيْ رَاتِقٌ مَّا فَتَقْتُ إِذْ أَنَا بُوْرٌ
إِذْ أُجَارِيْ الشَّيْطَانَ فِيْ سَنَنِ الْغَيِّ وَمَنْ مَالَ مَيْلَهُ مَثْبُوْرٌ

یعنی اے رسولِ بادشاہ! بے شک میری زبان اس شے کو بند کرنے والی ہے، جسے میں نے کھولا جب کہ میں ایک بے خبر مرد تھا، جبکہ میں شیطان کے ہمراہ چلتا رہا، گمراہی کے راستے میں اور جو کوئی شیطان کے جھکنے کی طرف جھکا یا شیطان کے مائل ہونے کی طرح مائل ہوا تو وہ ہلاک کیا گیا۔ اس شعر سے غرض یہ ہے کہ یہاں "بور" بمعنی مردِ ہالک، فاسد بے خیر کے ہے، اس کا اطلاق مفرد، مذکر، مؤنث اور جمع پر ایک ہی لفظ سے ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ کے سوا تم نے پوجا اور یہ خیال کیا کہ یقیناً وہ تمھارے ساتھی اور مددگار ہیں اور تمھیں اللہ کے قریب کر دیں گے تو وہ تمھارے اس خیال میں تم کو جھٹلا چکے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ٥۔ ٦] ''اور اس سے زیادہ گمراہ کون شخص ہے، جو اللہ کے سوا اس کو پکارتا ہے جو اُسے قیامت تک جواب نہیں دے سکتا؟ جبکہ وہ ان کی پکار ہی سے غافل ہیں۔ اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے، اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ اپنے آپ سے عذاب کو پھیر دینے پر قادر نہیں ہوں گے اور نہ ہی اپنی جانوں کا بدلہ لینے کی قدرت رکھیں گے۔ ﴿ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ تم میں سے جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا۔ ﴿ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴾ تو ہم اس کو بڑا عذاب چکھائیں گے۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا واضح بیان یہ ہے کہ ﴿ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ ﴾ کا ظرف منصوب بہ فعل مضمر ہے۔ "أي: اُذْكُر" یعنی یاد کر اُس دن کو جس میں ان کو جمع کرے گا۔ یاد کرنے کو دن سے متعلق کیا، باوجود اس کے کہ مقصود وہ شے یاد کرنا ہے

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤١٣۔ ٤١٤)

جو اس دن میں واقع ہو گی۔ پس یہ مبالغہ اور تاکید کے لیے ہے، چنانچہ بارہا یہ بات گزر چکی ہے۔ ابن محیصن، حمید، ابن کثیر، حفص، یعقوب اور ابو عمرو ﷭ نے دوری کی روایت میں ﴿ يَحْشُرُهُمْ ﴾ یائے تحتیہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم ﷭ نے اس کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ کلام کے شروع میں ﴿ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ ﴾ فرمایا ہے۔

باقی قراء کی قراءت سوائے اعرج کے بہ نونِ تعظیم ہے۔ اعرج نے سارے قرآن شریف میں "یُحشِرُھُم" بہ کسرِ شینِ معجمہ پڑھا ہے۔ امام ابن عطیہ ﷫ نے کہا کہ یہ استعمال میں قلیل ہے اور قیاس میں قوی ہے، کیوں کہ "یفعل" بہ کسرِ عین متعدی میں زیادہ تر قیاسی ہے، "یفعُل" بضمِ عین سے۔ امام ابو حیان ﷫ نے اس کی تردید یوں کی ہے کہ مضموم و مکسور دونوں برابر ہیں۔ مگر یہ کہ ان میں سے ایک مشتہر ہو گا تو اس کا اتباع کیا جائے گا۔

﴿ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ ﴿ يَحْشُرُ ﴾ کے مفعول یعنی ﴿ هُمْ ﴾ پر معطوف ہے۔ یہاں ما کا کلمہ فرمایا، جو غیر عقلاء کے لیے رکھا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصنام و اوثان اور اسی طرح کے غیر عقلاء کو ملائکہ و جن اور مسیح علیہ السلام وغیرہ عقلاء پر تغلیب دی ہے۔ غرض اس سے اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ عقلاء اور غیر عقلاء سب کے سب اس بات میں مشترک ہیں کہ معبود ہونے کے لائق نہیں ہیں۔ یا اس لیے کہ غیر عاقل کو پوجنے والے عاقل کو پوجنے والوں سے زیادہ ہیں۔ سو عابدین کی کثرت کا اعتبار کر کے غیر عاقل کو عاقل پر غلبہ دیا ہے۔ امام مجاہد اور ابن جریج ﷭ نے کہا ہے کہ مراد ملائکہ و انس و جن اور مسیح اور عزیر علیہما السلام ہیں، اس دلیل سے کہ اس کے بعد ان کو ہی خطاب ہے اور اُن کا جواب ہے۔ امام ضحاک، عکرمہ اور کلبی ﷭ نے کہا ہے کہ خاص طور پر اصنام ہیں، گو وہ نہ سنتے ہیں، نہ بولتے ہیں۔ اللہ پاک قیامت کے دن ان کو سننے والا اور بولنے والا کر دے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ عام ہے اور کلمہ "ما" عقلاء اور غیر عقلاء کو شامل ہے، اس لیے کہ اس سے مراد وصف ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ ان کو اور اُن کے معبودوں کو جمع کرے گا۔ ﴿ فَيَقُوْلُ ﴾ امام ابن عامر، ابو حیوہ، ابن کثیر اور حفص ﷭ نے بہ نون پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت بہ یائے تحتیہ ہے۔ ابو عبید نے اسی کو پسند کیا ہے، جس طرح کہ اس کو ﴿ يَحْشُرُهُمْ ﴾ میں اختیار کیا تھا۔ ابو حاتم نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[1]

﴿ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ ﴾ میں سوالیہ انداز ڈانٹ ڈپٹ اور توبیخ کے لیے ہے، معنی یہ ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ عابدوں پر حجت قائم کرنے اور پوجنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور عاجز کرنے کے لیے فرمائے گا کہ کیا ان کا بہکنا تمھاری وجہ سے تھا اور ان کو اپنی عبادت کی طرف بلانے کی وجہ سے تھا؟ ﴿ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴾ یعنی یا وہ خود راہِ حق سے بہک گئے، اس طرح سے کہ جس بات سے حق پر استدلال کیا جاتا ہے اس میں غور و فکر نہ کیا اور جس شے سے صحیح راستے کی طرف پہنچتے ہیں، اس میں غور و فکر نہ کیا۔ ﴿ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ ﴾ مستانفہ ہے اور سوالِ مقدر کا

[1] فتح القدير (٤/ ٩٠)

جواب ہے۔ ﴿ سُبْحٰنَكَ ﴾ کے معنی اس بات پر تعجب ہے جو اُن کو کہی گئی، کیوں کہ وہ تو فرشتے ہیں یا انبیائے معصومین یا جمادات غیر عاقل۔ یعنی تو پاک ہے۔

﴿ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ ﴾ کسی نے ﴿ يَنْۢبَغِيْ ﴾ کو بصیغۂ مجہول پڑھا ہے (یہ قراءت ابو عیسیٰ اسود قاری کی ہے)۔ ابن خالویہ نے کہا ہے کہ سیبویہ کا زعم ہے کہ یہ ایک لغت ہے: "أَيْ: مَا صَحَّ وَمَا اسْتَقَامَ لَنَا" ﴿ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ ﴾ ولی کا اطلاق تابع پر کیا جاتا ہے، جس طرح کہ متبوع پر اطلاق ہوتا ہے، یعنی ہمارے لیے درست اور راست اور ٹھیک یہ بات نہیں ہے کہ ہم تجھ سے تجاوز کر کے کوئی رفیق پکڑیں کہ ہم اس کو پوجنا شروع کر دیں۔ پھر بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم تیرے بندوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائیں، باجود اس کے کہ ہم خود تیرے سوا کسی کو نہیں پوجتے۔ یہ معنی جمہور کی قراءت پر ہیں کہ ﴿ نَتَّخِذَ ﴾ کو معروف پڑھیں۔ اور مجہول کی بنا پر معنی یہ ہیں: ہم کو لائق نہیں ہے کہ ہم کو مشرک تیرے سوا رفیق پکڑیں۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ قراءت جائز نہیں ہے۔ امام ابو عمرو بن علا و عیسیٰ بن عمر رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ دو بار ذکر کیا۔ اگر یہ قراءت صحیح ہوتی تو یوں فرماتا: "أَنْ نُتَّخَذَ مِنْ دُوْنِكَ أَوْلِيَآءَ"، یعنی دوسرا ﴿ مِنْ ﴾ حذف کر دیا جاتا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے۔

پھر اللہ پاک نے معبودوں سے یہ بات نقل کی کہ انھوں نے جواب مذکور کے بعد مشرکوں کے ایمان ترک کرنے کا سبب ذکر کیا، چنانچہ کہا: ﴿ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ﴾ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خود وہی راہ سے بہک گئے، کسی اور نے ان کو نہیں بہکایا۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو نہیں بہکایا، لیکن اے ہمارے پروردگار اور پالنہار! تو نے ان کے باپ دادا کو برتنے کے لیے نعمتیں دیں اور اُن پر رزق کی فراخی کی اور اُن کو لمبی عمریں دیں، یہاں تک کہ وہ تیری یاد سے غافل ہو گئے اور تیری نصیحت کو بھول گئے اور تیری کتاب کے سوچنے سمجھنے کو چھوڑ دیا، اور تیری عجیب کاری گری میں غور وفکر کرنے کو ترک کر دیا اور تیری طرح طرح کی مخلوقات میں بھی غور وفکر کرنا چھوڑ دیا، اور عکس القضیہ کر کے اس کو اپنے گمراہ ہونے کا ذریعہ بنا لیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ نسیانِ ذکر سے مراد شکر گزاری کو ترک کر دینا ہے۔

﴿ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ یہ لوگ جنھوں نے تیرے ساتھ شرک کیا اور تیرے غیر کو پوجا۔ یہ تیری قضائے ازلی میں ہلاک ہونے والے تھے۔ بور ماخوذ ہے بوار سے، بُوار ہلاکت کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "رَجُلٌ بَائِرٌ، وَقَوْمٌ بُوْرٌ" اس میں واحد وجمع برابر ہے۔ اس لیے کہ مصدر ہے اور مصدر کا اطلاق تھوڑے اور زیادہ دونوں پر ہوتا ہے۔ یا "بُوْرٌ"، "بَائِرٌ" کی جمع ہے۔ کسی نے کہا: "بَوَارٌ"، بمعنی فساد ہے۔ محاورے میں بولتے

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۱۰۔ ۱۱)

ہیں: ''بَارَتْ بُضَاعَتُهُ'' یعنی اس کا مایہ، یعنی پونجی فاسد ہوگئی اور ''أَمْرٌ بَايِرٌ'' یعنی فاسد کام۔ یہ لغت ازد کی ہے۔ کسی نے کہا: قوم بور کے یہ معنی ہیں کہ ان میں کوئی خیر نہیں ہے۔ ''بوار الأرض'' سے ماخوذ ہے، یعنی زمین کا کھیتی سے بیکار کرنا۔ پس اس میں کوئی خیر نہیں ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بوار بمعنی کساد ہے، اسی باب سے یہ قول ہے: ''بَارَتِ السِّلْعَةُ'' یعنی سامان کاسد ہوا، یہ سب معنی ہلاکت اور فساد کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ غرضیکہ پھر غیبت سے عدول کر کے خطاب کے طور پر کفار سے یہ کہا جائے گا: ﴿ فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ بِمَا تَقُولُونَ ﴾ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''فَقَالَ اللّٰهُ عِنْدَ تَبرى الْمَعْبُودِيْنَ مُخَاطِبًا لِلْمُشْرِكِيْنَ الْعَابِدِيْنَ لِغَيْرِ اللّٰهِ: فَقَدْ كَذَّبَكُمُ الْمَعْبُوْدُوْنَ فِيْ قَوْلِكُمْ أَنَّهُمْ آلِهَةٌ'' یعنی معبودوں کے مشرکین عابدین غیر اللہ سے بے زار ہونے کے وقت اللہ نے ان سے خطاب کر کے کہا کہ اب تم کو تمھارے معبود اس بات میں جھٹلا چکے کہ وہ معبود ہیں۔

﴿ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ﴾ حفص نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے۔[1] باقی قاریوں کی قراءت بیائے تحتیہ ہے، اور جمہور نے ﴿ تَقُولُونَ ﴾ بتائے خطاب پڑھا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جب ﴿ كَذَّبُوْ ﴾ کی ضمیر معبودوں کی طرف راجع ہو اور ﴿ كُمْ ﴾ کا خطاب کفار کو ہو اور اسی طرح ﴿ تَقُولُونَ ﴾ اور ﴿ تَسْتَطِيعُونَ ﴾ کا تو معنی یہ ہوں گے کہ اے کفار! معبود تو تم کو تمھاری بات میں جھٹلا چکے تو اب تم اس عذاب کو پھیرنے کی طاقت نہیں رکھتے جو اللہ نے تم کو عذاب کیا ہے اور نہ اللہ کی طرف سے کوئی مدد حاصل کر سکتے ہو۔ ''صرف'' کے معنی ہیں دور کرنا۔ کسی نے کہا ہے کہ حیلہ کرنا، یعنی تم اس کو کسی طرح بھی اپنی جان سے ہٹا نہیں سکتے اور نہ کوئی حیلہ اور تدبیر کر سکتے ہو۔ اور جب ''يَسْتَطِيْعُوْنَ'' بیائے تحتیہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ جب معبود تمھاری تکذیب کر چکے تو اب وہ طاقت نہیں رکھتے کہ تم سے عذاب کو پھیر دیں اور تمھاری مدد کریں۔ اور جس صورت میں ﴿ كَذَّبُوْ ﴾ کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہو اور ﴿ كُمْ ﴾ کا خطاب مومنوں کو ہو اور اسی طرح ﴿ تَقُولُونَ ﴾ کی اور ''يَسْتَطِيْعُوْنَ'' بہ یائے تحتیہ میں ضمیر کفار کی طرف پھرے تو معنی یہ ہوں گے کہ اے مومنو! تم کو یہ کافر اس بات میں جھٹلا چکے جس کو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اور اس حق میں جو تم پیش کرتے ہو تو اب وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے کہ جس حق کی طرف اللہ نے تم کو ہدایت کی ہے، اس سے تم کو پھیر دیں اور نہ اپنے آپ کی مدد کر سکتے ہیں، اس عذاب کے خلاف جو اُن کے ہم کو جھٹلانے کی وجہ سے اُن پر نازل ہوا۔ یہ معنی ابن زید و ابو عبید کے کلام سے سمجھے جاتے ہیں۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: جائز ہے کہ اس طرح پڑھا جائے: ''فَقَدْ كَذَبُوْكُمْ'' بہ تخفیف ذال اور ''بِمَا يَقُوْلُوْنَ'' بیائے تحتیہ۔ امام مجاہد اور بزی رحمہما اللہ نے اسی طرح پڑھا ہے: ''أَيْ: كَذَبُوْكُمْ فِيْ قَوْلِهِمْ''[2] یعنی معبودوں نے جو یہ کہا ہے کہ ﴿ سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ... الخ ﴾ تو انھوں نے اپنے اس قول میں تم کو جھوٹا کر دیا۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٩١)
[2] تفسير القرطبي (١٣/ ١٢)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مفاجات باحتجاج و الزام حسن ورائع ہے اور خاص کر جبکہ اس سے التفات مل جائے اور قول محذوف ہو تو اور بھی حسن و جمال بڑھ جاتا ہے، اس کی مثال یہ آیت ہے: ﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [المائدة: ١٩] ''اے اہلِ کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے، جو رسولوں کے وقفے کے بعد تمھارے لیے باتیں کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس تو کوئی خوش خبری دینے والا اور کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ پس یقیناً تمھارے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا ہے، اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔'' اور شاعر کا یہ قول بھی اس کی مثال ہے:

قَالُوْا خُرَاسَانُ أَقْصَى مَا يُرَادُ بِنَا ثُمَّ الْقُفُوْلُ فَقَدْ جِئْنَا خُرَاسَانَا [1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴾ یہ وعید ہے ہر ظالم کو اور جن لوگوں میں سیاقِ کلام ہے وہ تو اس کے تحت میں بدخولِ اولیٰ داخل ہیں۔ عذابِ کبیر سے مراد عذابِ نار ہے اور اس کی تفسیر آگ میں خلود کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ تفسیر مشرک کے لائق ہے، فاسق کے لائق نہیں، مگر معتزلہ اور خوارج کے قول کے مطابق فاسق کے بھی لائق ہے۔ حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ظلم سے مراد شرک ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ يَظْلِمْ ﴾ بمعنی ''يُشْرِكْ'' ہے۔[2] کسی نے ''يُذِقْهُ'' بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ یہ آیت اور اس جیسی اور آیتیں مقید بہ توبہ ہیں۔ غرضیکہ کفار نے جو پہلے کہا تھا کہ رسول کو کیا ہوا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے۔ تو اللہ پاک نے اس قول کا بطلان واضح کرنے کے لیے اپنے رسول کی طرف دوبارہ خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿٢٠﴾

اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، بلاشبہ وہ کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے اور ہم نے تمھیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا، کیا تم صبر کرتے ہو؟ اور آپ کا رب (سب کچھ) خوب دیکھ رہا ہے (20)

سابقہ رسول علیہم السلام بھی بشر ہی تھے:

پیغمبر کافروں کا ایمان جانچنے کے لیے ہیں اور کافر پیغمبروں کا صبر جانچنے کے لیے۔ انتہیٰ۔

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٦٤) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٢٥٢)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ پہلے پیغمبر جن کو اس نے بھیجا ہے وہ سب کھانا کھاتے تھے، اس سے غذا لینے کے لیے حاجتمند ہوتے تھے، کمائی کرنے اور تجارت کرنے کے لیے بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ یہ بات کچھ ان کے حال اور منصب کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ اچھی راہ و روش اور مرغوب صفات اور بہترین اقوال اور کامل اعمال، ظاہری طور پر خارقِ عادات اور دلائلِ قاہرہ سے ایسی چیزیں ان کو عطا کیں، جن سے ہر عقلِ سلیم اور بصیرتِ مستقیم رکھنے والا شخص اس شے کے صدق پر استدلال کرسکتا ہے جس کو وہ اللہ پاک کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔ اس کی نظیر یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾ [یوسف: ١٠٩] ”اور ہم نے آپ سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں سے مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔“ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ﴾ [الأنبياء: ٨] ”اور ہم نے ان (نبیوں) کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں، اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً اَتَصْبِرُوْنَ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے تمھارے بعض کو بعض سے جانچا اور آزمایا، تاکہ ہم جان لیں کہ اطاعت کرنے والا کون ہے اور نافرمان کون ہے، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿اَتَصْبِرُوْنَ﴾ کیوں جی تم صبر کرو گے؟ ﴿وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک اس شخص کو خوب دیکھتا ہے جو اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی طرف وحی کی جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الأنعام: ١٢٤] ”اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس کو سونپے۔“ اور اس شخص کو دیکھتا ہے جو اس بات کے لائق ہے کہ اللہ پاک اسے اس شے کی طرف ہدایت کرے، جسے دے کر رسولوں کو بھیجا ہے اور اسے بھی دیکھتا ہے جو اس کے لائق نہیں ہے۔

محمد بن اسحاق نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر میں چاہتا کہ اپنے رسولوں کے ساتھ دنیا کر دوں کہ کوئی ان کی مخالفت نہ کرے تو البتہ میں کر دیتا، لیکن میں نے ارادہ کیا کہ ان سے بندوں کی جانچ کروں۔[1] صحیح مسلم میں عیاض بن حماد (ابن کثیر میں اسی طرح ہے، مگر حمار یاد آتا ہے۔ واللہ أعلم) سے مروی ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بے شک میں جانچنے والا ہوں تجھ کو، اور جانچنے والا ہوں ساتھ تیرے۔[2] مسند میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، اگر میں چاہتا تو البتہ اللہ میرے ساتھ سونے چاندی کے پہاڑوں کو چلا دیتا۔[3] صحیح میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ نبی ملک، یعنی بادشاہ نبی ہوں یا عبد رسول، آپ ﷺ نے اس کو اختیار کیا کہ عبد رسول ہوں۔[4]

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧٦) ② صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥)

③ مسند أبي يعلىٰ (٨/ ٣١٨) شعب الإيمان (٢/ ١٧٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٨٤)

④ مسند أحمد (٢/ ٢٣١) تفسير ابن كثير (٣/ ٤١٤۔ ٤١٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٠٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ زجاج نے کہا ہے کہ جو جملہ ﴿ اِلَّآ ﴾ کے بعد واقع ہوتا ہے، وہ موصوف محذوف کی صفت ہوتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے تجھ سے پہلے رسولوں میں سے کسی کو نہیں بھیجا، مگر وہ کھانا کھانے والے اور چلنے پھرنے والے تھے، پس تو بھی انہی کی مثل ہے اور اُن سے بھی ویسا کہا گیا، جیسا تجھ سے کہا گیا۔ موصوف اسی لیے حذف کیا گیا ہے کہ ﴿ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ میں اس پر دلیل ہے۔ اس کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ [الصافات: ١٦٤] ''(فرشتے کہتے ہیں:) ہم میں سے تو ہر ایک کا مقام مقرر ہے۔'' یعنی ''وَمَا مِنَّا أَحَدٌ''۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جملے کا اعراب سے کوئی محل نہیں ہے۔ یہ تو موصول محذوف کا صلہ ہے کہ وہ مفعول ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''إِلَّا مَنْ إِنَّهُمْ''۔ ﴿ اِنَّهُمْ ﴾ میں اور اس کے ما بعد میں ضمیر ''من'' مقدر کی طرف راجع ہے۔ اس کی مثل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ﴾ [مریم: ٧١] ''اور تم میں سے جو بھی ہے، وہ اس (جہنم) پر وارد ہونے والا ہے۔'' ''أَيْ: إِلَّا مَنْ يَرِدُهَا'' کسائی بھی اسی کے قائل ہیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول خطا ہے، اس لیے کہ ''من'' موصولہ کا حذف جائز نہیں ہے۔ ابن انباری نے کہا: محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، تقدیر یہ ہے: ''إِلَّا وَإِنَّهُمْ'' چنانچہ ان کے نزدیک واؤ محذوف ہے۔ جمہور نے بہ کسر ''إِنَّ'' پڑھا ہے، اس لیے کہ اس کی خبر میں لام ہے، چنانچہ علمِ نحو میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور یہ ان کے نزدیک مجمع علیہ ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے، مگر علی بن سلیمان اخفش نے ہم سے حکایت کیا ہے کہ محمد بن یزید مبرد نے کہا ہے کہ اس ''إِنَّ'' میں فتح جائز ہے، اگرچہ اس کے بعد لام ہے۔ میں اس قول کو وہم گمان کرتا ہوں۔ جمہور کی قراءت ''يَمْشُوْنَ'' بہ فتحِ یائے تحتیہ وسکونِ میم وتخفیفِ شین معجمہ ہے۔ سیدنا علی، ابن عوف اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے بہ ضمِ یائے تحتیہ وفتحِ میم وضمِ شین مشدد پڑھا ہے۔ یہ قراءت پہلے کے معنی میں ہے، اس کی سند یہ شعر ہے:

أَمْشِيْ بِأَعْطَانِ الْمِيَاهِ وَأَتَّقِيْ قَلَائِصَ مِنْهَا صَعْبَةٌ وَّرَكُوْبٌ

کعب بن زہیر کا قول ہے:

مِنْهُ تَظَلُّ سِبَاعُ الْحَيِّ ضَامِرَةً وَلَا تَمْشِيْ بِوَادِيْهِ الْأَرَاجِيْلُ[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمد ﷺ سے پہلے رسول اسی منزلت میں تھے، کھاتے پیتے اور چلتے تھے۔[2] ﴿ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ﴾ یہ خطابِ عام ہے لوگوں کو اور نیز اس میں نبی ﷺ کو تسلی ہے، کیوں کہ آپ اشرف الاشراف ہیں اور اخس الاخساء کے ساتھ مبتلا کیے گئے تھے۔ اللہ پاک نے

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٣۔ ١٤) فتح القدير (٤/ ٩٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧٥)

اپنے بعض بندوں کو بعض کے لیے فتنہ ٹھہرایا ہے، چنانچہ صحیح اور تندرست بیمار کے لیے فتنہ ہے اور غنی و مال دار فقیر اور محتاج کے لیے فتنہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ پہلے ذکر کیے گئے بعض سے مراد اُمتوں کے کفار ہیں اور دوسرے بعض سے مراد رسول ہیں۔ فتنے کے معنی آزمایش اور محنت ہے، یعنی آزمانا اور جانچنا۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ لوگوں میں سے بعض جانچے گئے ہیں بعض کے ساتھ۔ ایک دوسرے سے آزمائے گئے ہیں۔

چنانچہ مریض کہتا ہے کہ میں صحیح کی طرح کیوں نہ کیا گیا اور اسی طرح ہر آفت والا کہتا ہے۔ تندرست آزمایا گیا ہے، بیمار سے اس طرح کہ تندرست بیمار سے ملول نہ ہو اور نہ اس کو حقیر جانے، اور غنی کی آزمایش کی گئی ہے فقیر سے، یعنی غنی فقیر کی مواسات کرے، اس کی جان و مال سے مدد کرے۔ فقیر کی آزمایش غنی سے ہوئی ہے، اس طرح کہ فقیر غنی پر حسد کرتا ہے اور اسی طرح بعض بعض سے آزمایا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آیتِ کریمہ سے مراد یہ ہے کہ جب شریف اسلام لانے کا ارادہ کرتا اور دیکھتا کہ کمین اس سے پہلے مسلمان ہو چکا ہے تو عار و ننگ کرتا اور کہتا کہ میں اس کے بعد مسلمان نہ ہوں گا کہ اس کو مجھ پر سبقت اور فضیلت ہو، چنانچہ وہ اپنے کفر پر جما رہتا تھا، تو یہ ہے ایک دوسرے سے آزمایا جانا۔ اس قول کو امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے، حالاں کہ آیت کو اس پر قصر کرنا بے وجہ ہے، کیوں کہ اگرچہ یہ سب باتیں آیت کے نزول کا سبب ہیں، لیکن اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: فقیر کہتا ہے کہ اللہ چاہتا تو مجھ کو فلاں شخص کی طرح غنی کر دیتا۔ بیمار کہتا ہے: اگر اللہ چاہتا تو مجھ کو فلاں کی طرح تندرست کر دیتا۔ نابینا کہتا ہے: اگر اللہ چاہتا تو مجھے فلاں کی طرح بینا کر دیتا۔[2]

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: عالم کے واسطے جاہل سے خرابی ہے اور ویل ہے جاہل کی عالم سے اور خرابی ہے مالک کی مملوک سے اور ویل ہے مملوک کی مالک سے اور ویل ہے شدید یعنی قوی کی ضعیف یعنی کمزور سے اور خرابی ہے ضعیف کی شدید سے۔[3] اور ویل ہے بادشاہ کی رعیت سے اور خرابی ہے رعیت کی بادشاہ سے۔ بعض تمھارا بعض کے لیے فتنہ ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ﴾ پھر اللہ پاک نے یہ خبر دینے کے بعد فرمایا: ﴿ أَتَصْبِرُونَ ﴾ یہ سوالیہ انداز مقرر کرنے کے لیے ہے۔ تقدیر یہ ہے: کیا تم صبر کرو گے، اس سخت حالت اور بڑی آزمایش پر جس کو تم دیکھ رہے ہو تو اجر دیے جاؤ یا صبر نہ کرو گے تو تمھارا غم زیادہ ہوگا؟ اس قول پر اکثر لوگ چلے ہیں۔ کسی نے کہا: ﴿ أَتَصْبِرُونَ ﴾ کے معنی ہیں ''اِصْبِرُوْا''، جس طرح کہ ﴿ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴾ [المائدة: ۹۱] ''پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟'' کے معنی ہیں: ''اِنْتَهُوْا'' باز آ جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ استفہام امر کے معنی میں ہے، اس میں بہ نسبت صریح حکم کے مبالغہ زیادہ ہوتا ہے۔ کسی

---

[1] فتح القدير (٤/ ٩٢) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٢٥٣)

[3] مسند أبي يعلىٰ (٧/ ٨٠) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٧٥٦۔ ٤٧٥٧)

نے کہا ہے کہ اس جگہ اس جملہ استفہامیہ کا موقع ایسا ہے، جیسا کہ ﴿ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك: ٢] ''تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔'' کا موقع ہے ﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك: ٢] ''تا کہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔'' میں۔ امام بخاری نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم اس شخص کی طرف نظر کرو جو تم سے اسفل ہے، یعنی نیچے ہے اور مت نظر کرو اس شخص کی طرف جو تم سے فوق، یعنی اوپر ہے۔ چنانچہ یہ اس کے زیادہ لائق ہے کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ جانو جو تم پر ہے۔[1]

اللہ پاک نے صبر کرنے والوں سے یہ وعدہ فرمایا ہے: ﴿ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴾ یعنی اللہ پاک اس شخص کو خوب دیکھتا ہے جو صبر کرتا ہے اور اس شخص کو بھی جو صبر نہیں کرتا۔ ان میں سے ہر ایک کو وہ جزا دے گا جس کا وہ مستحق ہو گا۔ پھر اللہ پاک نے کفار کے شبہوں میں سے ایک اور شبہہ نقل کیا، جس سے انھوں نے نبوت میں قدح یعنی عیب جوئی کی ہے۔[2] چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٢٢﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿٢٣﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿٢٤﴾

اور ان لوگوں نے کہا جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے: ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کیے گئے یا ہم اپنے رب کو دیکھتے؟ بلاشبہہ انھوں نے اپنے نفسوں میں تکبر کیا اور بہت بڑی سرکشی کی (21) جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لیے کوئی بشارت نہیں ہو گی، اور وہ (فرشتے) کہیں گے: (تم پر جنت) ممنوع و حرام کر دی گئی ہے (22) اور انھوں نے جو (بظاہر نیک) عمل کیے ہوں گے، ہم ان کی طرف متوجہ ہو کر ان کو اڑتا ہوا پراگندہ گرد و غبار بنا دیں گے (23) جنتی لوگ اس دن بہترین ٹھکانے اور بہت اچھی آرام گاہ میں ہوں گے (24)

کفار کی ہٹ دھرمی وعناد کا بیان:

اللہ پاک کفار کی تعنت اور سرکشی کی خبر دیتا ہے کہ وہ بڑے سرکش ہیں اپنے کفر اور عناد میں۔ یوں کہا کہ

(1) صحیح البخاري، رقم الحديث (٦١٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٣) (2) فتح البيان (٩/ ٢٩٥۔ ٢٩٦)

﴿ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ یعنی ہم پر رسالت لے کر فرشتے کیوں نہ اترے جس طرح کہ انبیاء پر اترتے ہیں؟ چنانچہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں ان کی اس بات کی خبر دی ہے: ﴿ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ﴾ [الأنعام: ١٢٤] ''(جب ان کے پاس نشانی آتی ہے تو) وہ کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ ایسی ہی چیز خود ہمیں دی جائے جیسی رسولوں کو دی گئی۔'' احتمال ہے کہ اس جگہ ان کی مراد یہ ہو کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ اترے، تاکہ ہم انھیں ظاہری طور پر دیکھ لیتے، پھر وہ ہم کو یہ بتاتے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، جس طرح کہ انھوں نے یہ کہا ہے: ﴿ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٢] ''یا اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے لے آ۔'' اس کی تفسیر سورت سبحان میں گزر چکی ہے اور اسی لیے یہاں یوں کہا: ﴿ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ﴾

نیز اسی لیے اللہ پاک نے یہ فرمایا: ﴿ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴾ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١١] ''اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے، اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے، تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اور بات تھی) لیکن ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ فرشتوں کو اپنے خیر کے دن میں نہ دیکھیں گے، بلکہ جس دن ان کو دیکھیں گے تو اس دن ان کو کوئی خوش خبری نہ ہوگی۔ یہ بات احتضار کے وقت، یعنی مرنے کے وقت پر صادق آتی ہے یعنی جان کنی کے وقت، جس وقت فرشتے ان کو نار کی اور اللہ جبار وقہار کے غیظ وغضب کی خوش خبری دیں گے۔ چنانچہ فرشتے کافر سے اس کی روح نکلنے کے وقت کہتے ہیں کہ اے خبیث نفس! تو نکل جو کہ خبیث جسم میں تھی تو گرم ہوا کی طرف نکل اور سخت گرم پانی کی طرف اور سایۂ دخان کی طرف نکل۔ مگر روح نکلنے سے انکار کرتی ہے اور بدن میں پھیل جاتی ہے، پھر فرشتے اس کو مارتے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ [الأنفال: ٥٠] ''اور کاش! آپ دیکھیں، جب کہ فرشتے کافروں کو فوت کرتے ہیں، وہ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہیں اور (کہتے ہیں کہ) تم جلا دینے والا عذاب چکھو۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٩٣] ''کاش! آپ ظالموں کو اس حال میں دیکھیں جب وہ موت کی سختیوں میں گرفتار ہوتے ہیں، اور فرشتے (یہ کہتے

ہوئے) اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں، آج تمھیں بدلے میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا، کیوں کہ تم اللہ پر ناحق باتیں گھڑتے تھے اور اس کی آیتیں سن کر تکبر کرتے تھے۔'' اور اسی لیے اس آیت کریمہ میں یوں فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴾

یہ حال مومنوں کی موت کے وقت ان کی حالت سے مختلف ہے، کیوں کہ ان کو خیر اور خوشیوں کے حصول کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝30 نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝31 نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴾ [حم السجدة: ۳۰۔ ۳۲] ''بلاشبہ جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اُترتے ہیں: نہ تم ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور جنت سے خوش ہو جاؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیاوی زندگی میں بھی تمھارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (رفیق ہیں) اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تمھارے جی چاہیں گے اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تم مانگو گے۔ (یہ) بڑے بخشن ہار، نہایت رحم کرنے والے کی طرف سے مہمان نوازی ہوگی۔''

صحیح حدیث میں سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرشتے مومن کی روح سے کہتے ہیں کہ اے پاک روح! تو نکل کہ تو پاک جسم میں تھی، اسے آباد رکھتی تھی تو اب روح و ریحان اور ربِ غیر غضبان (نہ ناراض ہونے والے رب) کی طرف نکل۔[1] یہ حدیث سورت ابراہیم میں گزر چکی ہے، اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت: ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۚ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴾ [إبرهيم: ۲۷] ''اللہ ایمان والوں کو قولِ ثابت (کلمۂ توحید) سے دنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے اور اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' طی الفراسخ میں یہ حدیث شریف اور اس کے سوا اور احادیث اس بارے میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ سچا طلب گار اس کی طرف رجوع فرمائے۔ دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ ﴿ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے۔ امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ وغیرہما اسی کے قائل ہیں۔[2] اس کے درمیان اور پہلے دیے گئے قول کے درمیان کوئی منافات (تضاد) نہیں ہے، اس لیے کہ فرشتے ان دونوں دنوں میں یعنی روزِ موت اور روزِ معاد میں مومنوں اور کافروں کے لیے ظاہر ہوں گے تو مومنوں کو تو رحمت و رضوان

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٦٨) ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملی ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٩/ ٢٥٦)

کی خوش خبری دیں گے اور کافروں کو خبث وخسران وزیان کی خبر سنائیں گے۔ چنانچہ اس دن مجرموں کے لیے کوئی خوش خبری نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ فرشتے کافروں سے کہیں گے کہ آج کے دن فلاح تم پر قطعی طور پر حرام ہے۔ مراد یہ ہے کہ چھٹکارا یا تمھاری خواہش کا ملنا تمھارے لیے نہیں ہے۔ حجر کی اصل منع ہے، اسی معنی سے یہ محاورہ ہے کہ "حَجَرَ الْقَاضِيُ عَلَى فُلَانٍ" یہ اس وقت بولتے ہیں جب قاضی کسی شخص کو تصرف کرنے سے روک دے، یا مفلسی کی رو سے، یا بے وقوفی کی وجہ سے، یا کم سنی، یا اس جیسی کسی اور وجہ سے۔ اسی باب سے حطیم بیت اللہ شریف کو حجر کہتے ہیں، کیوں کہ طواف کو منع کرتی ہے کہ اس میں طواف کیا جائے۔ طواف جو کیا جاتا ہے تو وہ اس کے پرے سے کیا جاتا ہے۔ اسی معنی سے عقل کو حجر بولتے ہیں، اس لیے کہ عقل اپنے صاحب کو نالائق بات میں غور وخوض کرنے سے باز رکھتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ ﴿ يَقُولُونَ ﴾ میں ضمیر ملائکہ کی طرف راجع ہے۔ یہ قول امام مجاہد، عکرمہ، حسن، ضحاک، قتادہ، عطیہ عوفی، عطاء خراسانی اور خصیف رحمہم اللہ غیر واحد کا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ﴿ وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ یہ قطعی حرام ہے کہ ان کو اس شے کی خوش خبری دی جائے، جس شے کی خوش خبری متقی لوگ دیے جائیں۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے امام ابن جریج رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ قول مشرکین کے کلام میں سے ہے، جس دن کہ وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو وہ فرشتوں سے پناہ مانگیں گے[3]، اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کی عادت ہے کہ ان میں سے کسی پر جب کوئی حادثہ یا کچھ شدت وسختی نازل ہوتی ہے تو کہتے ہیں: ﴿ حِجْرًا مَّحْجُورًا ﴾۔

اس قول کے لیے اگرچہ ایک ماخذ اور وجہ ہے، لیکن سیاق کے بہ نسبت بعید ہے۔ خاص کر اب کہ جمہور نے اس کے خلاف تصریح کی ہے۔ لیکن ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ حِجْرًا مَّحْجُورًا ﴾ کی تفسیر میں "عوذًا معاذًا" کہا ہے، لہٰذا احتمال ہے کہ امام مجاہد کی مراد وہی ہو جو ابن جریج نے ذکر کیا ہے، لیکن ابن ابی حاتم کی روایت میں "عن ابن أبي نجيح عن مجاهد" یہ ہے کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "حِجْرًا مَحْجُورًا عوذًا معاذًا" یہ فرشتے کہیں گے۔[4] والله أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَدِمْنَآ إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ ﴾ یہ قیامت کے دن ہوگا، جب اللہ پاک بندوں سے اس بھلائی اور برائی پر محاسبہ کرے گا جو انھوں نے کی ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے یہ خبر دی ہے کہ ان مشرکوں نے جن اعمال

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٥٦) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧٧)
[3] تفسير الطبري (١٩/ ٢٥٦) [4] تفسير الطبري (١٩/ ٢٥٦) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧٨)

کے بارے میں خیال کیا تھا کہ وہ ان کو نجات دینے والے ہیں تو ان کو ان میں سے کچھ حاصل نہ ہوگا، یہ اس لیے کہ اس میں شرعی شرط موجود نہیں ہے اور وہ شرعی شرط یہ ہے کہ یا تو اعمال میں اخلاص ہے یا شرعِ الٰہی کے مطابق ہے۔ چنانچہ ہر عمل جس میں اخلاص نہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ شریعت کے مطابق نہ ہو تو وہ باطل اور بے کار ہے۔ کفار کے اعمال ان دونوں باتوں میں سے ایک سے خالی نہیں ہوتے ہیں، یا ان میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں تو اب تو وہ قبولیت سے اور بھی زیادہ دور ہوئے۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ ﴾ امام مجاہد اور ثوری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَقَدِمْنَآ ﴾ کے معنی ”وَعَمِدْنَا“ ہیں، یعنی ہم نے قصد کیا۔ اسی طرح امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ بعض نے کہا: ”وَآتَيْنَا عَلَيْهِ“ یعنی ہم اس پر آئے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود علی ـ کرم الله وجهه ـ سے روایت کیا ہے (سفيان عن أبي إسحاق عن الحارث عن علي رضی اللہ عنہ) کہ ﴿ هَبَآءً ﴾ سورج کی شعاع ہے جبکہ روزن میں داخل ہو اور اسی طرح بوجہ دیگر ان سے مروی ہے اور اس کے مثل ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، سدی اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی مروی ہے۔ اور ایسا ہی امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ کسی شخص کے روزن میں شعاع ہے اور اگر وہ چلے کہ اس پر قبضہ کرے تو نہ کر سکے۔ مطلب یہ ہے کہ آنکھ سے تو اس کے اجزا نظر آتے ہیں، لیکن جب مٹھی میں پکڑتا ہے تو کچھ بھی نہیں۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ ماءِ مہراق ہے، یعنی آبِ ریختہ۔

امام ابو الاحوص رحمہ اللہ نے ”عن أبي إسحاق عن الحارث عن علي رضی اللہ عنہ“ روایت کیا ہے کہ ”اَلْهَبَاءُ وَهَجُ الدَّوَابِّ“ (اصل مطبوع مصر ابن کثیر میں اسی طرح ”وھج“ ہے واو کے ساتھ، مگر ”وھج“ سوزانیِ آتش کو کہتے ہیں۔ یہ معنی مقام کے لحاظ سے مناسب معلوم نہیں ہوتے۔ اسی طرح ”دھج“ دال کے ساتھ کے معنی بھی درست نہیں ہوتے۔ ہاں ”رھج“ رائے مہملہ کے ساتھ کے معنی گرد و غبار کے ہیں۔ یہ معنی البتہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ ”مجمع البحار“ میں لکھا ہے کہ ”هَبَاءٌ أَصْلُهُ مَا ارْتَفَعَ مِنْ تَحْتِ سَنَابِكِ الْخَيْلِ“[1] یعنی گھوڑوں کے سموں کے نیچے سے جو شے اڑتی ہے اصل میں ﴿ هَبَآءً ﴾ اس کو کہتے ہیں۔ اب یہ شے جو سم کے نیچے سے مرتفع ہوتی ہے وہ یا گرد و غبار ہے یا آگ نکلتی ہے، جبکہ سُم پتھر پر پڑے، والله أعلم)۔ اسی کے مثل ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ هَبَآءً ﴾ وہ شے ہے کہ دیکھے تو درختوں کے سوکھے پتے کہ جس وقت ہوا ان کو

[1] مجمع بحار الأنوار (١٣١/٥)

اڑائے، پس وہ یہ پتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبد اللہ بن وہب نے بہ سندِ خود عبید بن یعلیٰ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ ﴿ هَبَآءً ﴾ راکھ ہے، جبکہ ہوا اس کو اڑائے۔[1] ان قولوں کا حاصل جو اس آیتِ کریمہ کے مضمون سے آگاہ کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے اعمال کیے اور اعتقاد کیا کہ وہ کسی شے پر ہیں، پھر جب وہ ایک عادل حاکم پر پیش کیے گئے، جو کسی پر ظلم وستم نہیں کرتا تو پھر وہ بالکل کوئی شے نہ نکلی۔ اس باب میں ان کو ایسی شے سے تشبیہ دی گئی جو حقیر اور بے حقیقت اور متفرق ہے کہ جس کا مالک اس میں سے کسی شے پر بالکل قادر نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴾ [إبراهيم: ١٨] ''جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کے (نیک) اعمال کی مثال راکھ کی سی ہے، جس پر آندھی کے دن زور کی ہوا چلی۔ جو کچھ انھوں نے کمایا، وہ اس پر کوئی قدرت نہیں رکھیں گے۔ یہی پرلے درجے کی گمراہی ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ﴾ [البقرة: ٢٦٤] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی مثال چکنے پتھر کی سی ہے جس پر مٹی پڑی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہو تو (ساری مٹی بہہ جائے اور) صاف چٹان رہ جائے۔ وہ (ریاکار) جو نیکی کرتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ [النور: ٣٩] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال چٹیل میدان میں ریت کی طرح ہیں، پیاسا اس (ریت) کو پانی سمجھتا رہا، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے وہاں کچھ بھی نہ پایا اور اللہ کو اپنے پاس پایا، پھر اللہ نے اس کا حساب پورا پورا دیا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔'' اس کی تفسیر پر پہلے کلام گزر چکا ہے۔ ولله الحمد والمنة.

اہلِ جنت کا مقام ومرتبہ:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾ یعنی قیامت کے دن دوزخ والے اور جنت والے برابر نہ ہوں گے۔ بہشت والے وہی ہیں جو مراد پانے والے ہیں یہ اس لیے ہے کہ اہلِ جنت تو بلند

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧٨-٢٦٨٠)

درجات اور غرفات آمنات (پُر امن بالا خانے) کی طرف جائیں گے سو وہ لوگ تو امن والے مقام میں ہوں گے جو بہت حسین منظر والا ہوگا اور طیب المقام ہوگا، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ اچھی قرار گاہ اور بہترین قیام گاہ ہے اور دوزخ والے درکات سافلات (نچلے طبقے) میں اور ایک کے بعد دوسری حسرتوں اور نا امیدیوں میں اور طرح طرح کے عذابوں اور سزاؤں میں ہوں گے اور وہ بری جائے قرار اور بدترین جائے قیام ہے، یعنی برا ٹھکانا ہے دیکھنے میں اور دوپہر کے آرام کے لیے بھی بری جائے قیام ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾ یعنی انھوں نے جو اعمالِ مقبول کیے، اسی کے سبب سے پایا جو کچھ کہ پایا اور گئے جدھر گئے، بہ خلاف اہلِ نار کے کہ ان کا ایک عمل بھی ایسا نہ تھا کہ ان کے لیے جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ اور نار سے نجات کا موجب ہو۔

اللہ پاک نے نیک بخت لوگوں کے حال سے آگاہی بخشی بدبختوں کے حال پر اور اس بات کی خبر دی کہ ان کے پاس بالکل کوئی خیر نہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ جو ہے سو ایک گھڑی ہے کہ اس میں اللہ کے دوست تختوں پر حورِعین کے ساتھ قیلولہ کریں گے اور اللہ کے دشمن شیاطین کے ساتھ بندھے ہوئے قیلولہ کریں گے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک حساب کتاب سے فارغ ہوگا، دوپہر کو تو اہلِ جنت، جنت میں اور اہلِ نار، نار میں قیلولہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں اس گھڑی کو پہچانتا ہوں، جس میں جنت والے جنت میں داخل ہوں گے اور جہنم والے جہنم میں داخل ہوں گے اور وہ گھڑی وہ ہے جو دنیا میں ارتفاع ضحیٰ اکبر (دوپہر سورج کے بلند ہونے کے وقت) ہوتی ہے، جس وقت لوگ قیلولہ کرنے کے لیے اپنے گھروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پس اہلِ نار، نار کی طرف رجوع کریں گے۔ رہے اہلِ جنت تو ان کو جنت کی طرف لے جائیں گے، چنانچہ ان کا قیلولہ جنت میں ہوگا اور وہ مچھلی کی کلیجی کھلائے جائیں گے، جو اُن سب کو سیر کر دے گی۔ وہ اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾

امام سفیان رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: دوپہر نہ ہوگی، یہاں تک کہ یہ لوگ قیلولہ کریں گے اور یہ لوگ بھی قیلولہ کریں گے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾ اور یہ آیت پڑھی: ﴿ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴾ [الصافات: ٦٨] ”پھر یقیناً ان کی واپسی بھڑکتی آگ کی طرف ہوگی۔“ امام عوفی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ جنت کے بالا خانوں میں قیلولہ کریں گے اور جب اپنے رب پر پیش کیے جائیں گے تو ان کا حساب ہوگا۔ ایک پیشی یہ ہے حسابِ یسیر اور یہ اس آیت کی مثل ہے: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ

مَسْرُوْرًا﴾ [الانشقاق: ٧۔ ٩] ''پھر جس شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا۔ تو جلد ہی اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ اور وہ اپنے اہل کی طرف ہنسی خوشی لوٹے گا۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّأَحْسَنُ مَقِيْلًا، مَأْوًى وَمَنْزِلًا'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صفوان بن محرز نے حدیث بیان کی کہ قیامت کے دن دو آدمی لائے جائیں گے، ان میں سے ایک تو دنیا میں بادشاہ تھا، سرخ و سفید رنگ کی طرف مائل، پھر اس کا محاسبہ ہوگا تو وہ ایسا بندہ ظاہر ہوگا، جس نے کبھی کوئی خیر نہیں کی، پھر اس کو آگ کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا۔ دوسرا شخص دنیا میں کملی والا تھا، پھر اس کا محاسبہ ہوگا تو وہ کہے گا: یا رب! تو نے مجھے کوئی شے عطا نہیں کی کہ تو مجھ سے اس کا حساب لے تو اللہ فرمائے گا: میرے بندے نے سچ کہا، لہٰذا تم اسے چھوڑ دو، پھر اس کو حکم ہوگا جنت کا۔ پھر وہ چھوڑ دیے جائیں گے، جس قدر کہ اللہ چاہے گا، پھر آگ والا بلایا جائے گا تو وہ سیاہ کوئلے کی طرح ہوگا، پھر اس سے کہا جائے گا کہ تو نے کیسا مقیل (قیلولہ کرنے کی جگہ) پایا؟ وہ عرض کرے گا کہ ''شَرُّ مَقِيْلٍ'' پھر اس سے کہا جائے گا کہ ''عُدْ'' یعنی پھر وہیں لوٹ جا۔ پھر جنت والا بلایا جائے گا تو وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوگا۔ پھر اس سے کہا جائے گا تم نے کیسا مقیل پایا؟ وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! ''خَيْرُ مَقِيْلٍ'' پس اس سے کہا جائے گا: پھر وہیں چلا جا۔ ان سب روایتوں کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عمرو بن حارث سے روایت کیا ہے کہ سعید بن صواف نے عمرو کو حدیث بیان کی کہ سعید کو یہ بات پہنچی ہے کہ قیامت کا دن مومن پر کوتاہ کیا جائے گا، یہاں تک کہ ایسا ہو جائے گا، جیسا کہ عصر سے لے کر غروب تک ہوتا ہے اور مومنین جنت کے باغات میں اِدھر اُدھر جائیں گے، یہاں تک کہ لوگوں سے فراغت کی جائے گی۔ یہ اللہ پاک کا وہی قول ہے: ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا﴾[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا لبِ لباب مع توضیح بیان یہ ہے کہ جملہ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ...الخ﴾ معطوف ہے: ﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ﴾ پر۔ ﴿لَا يَرْجُوْنَ﴾ بمعنی ''لَا يَبَالُوْنَ'' ہے، جس طرح کہ اس شعر میں ہے:

لَعَمْرُكَ مَا أَرْجُوْ إِذَا كُنْتُ مُسْلِمًا　　　عَلَى أَيِّ جَنْبٍ كَانَ فِيْ اللّٰهِ مَصْرَعِيْ

یعنی تیری عمر کی قسم جبکہ میں مسلمان ہوں تو میں پروا نہیں کرتا کہ میرا پچھڑنا اللہ کی راہ میں کسی پہلو پر بھی ہو۔ کسی نے کہا کہ بمعنی ''لَا يَخَافُوْنَ'' ہے، یہ تہامہ کی لغت ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''رجا'' کو موضع خوف میں

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٨٠۔ ٢٦٨١) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٢٥٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٤١٥۔ ٤١٨)

رکھا ہے۔[1] کسی نے کہا کہ "لَا يَأْمَلُوْنَ" کے معنی میں ہے۔ امل آرزو و اُمید کو کہتے ہیں۔ اسی معنی میں یہ شعر ہے:

أَتَرْجُوْ أُمَّةٌ قَتَلَتْ حُسَيْنًا شَفَاعَةَ جَدِّهِ يَوْمَ الْحِسَابِ

یعنی کیا امید رکھتی ہے وہ امت جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا کہ روزِ حساب ان کے نانا ان کی شفاعت کریں گے۔ غرضیکہ ﴿ يَرْجُوْنَ ﴾ کے تین معنی ہوئے: اول معنی یہ ہیں کہ کہا مشرکوں نے جو اللہ پاک کے ملنے کی پروانہیں کرتے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ کیا وہ برائی لے کر اپنے رب سے ملنے سے ڈرتے نہیں۔ "لقاء" کی اصل شے کی طرف پہنچنا ہے۔ اسی سے متعلق رویت ہے، کیوں کہ رویت مرئی کی طرف پہنچنا ہے۔ لقائے رب سے مراد جزائے رب کی طرف پہنچنا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لقاء سے مراد رویت ہو قولِ اول کی بنا پر۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو خیر لے کر ہمارے ملنے کی امید نہیں رکھتے، اس لیے کہ وہ بعث کے منکر ہیں۔ رجا کے حقیقی معنی امید و آرزو ہیں، اسی پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہے کہ جو اس ثواب کے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے، جس کا ہم نے اطاعت کرنے پر وعدہ کیا ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ جو کوئی ثواب کی اُمید نہیں رکھتا، وہ عتاب سے نہیں ڈرتا۔ ان کا مقولہ یہ ہے: ﴿ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ یعنی ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے کہ وہ ہم کو خبر دیتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں، یا وہ ہم پر رسول بنا کر کیوں نہ اتارے گئے کہ اللہ ان کو بھیجتا۔

﴿ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ﴾ یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیتے تو وہ ہم کو خبر دیتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہیں۔ پھر اللہ پاک نے ان کے اس شبہے کا یہ جواب دیا: ﴿ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴾ یعنی انھوں نے حق کے ساتھ تکبر کرنے اور عناد اور دشمنی کو اپنے دلوں میں پوشیدہ رکھا، جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ﴾ [المؤمن: ٥٦] "ان کے سینوں میں صرف برائی (کا خبط) ہے، وہ اس تک کبھی پہنچ نہیں سکیں گے۔" "عتو" کہتے ہیں طغیان و سرکشی میں حد سے بڑھنے کو اور اس کے پرلے سرے میں پہنچنے کو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ "عتو" سے مراد شدتِ کفر ہے۔[2]

"عتو" کو کبر کے ساتھ اس لیے موصوف کیا کہ یہ سخت بات جو انھوں نے کہی، اس کا منہ سے نکالنا ایک بہت بڑی بات اور مطالبہ ہے، اس سے بڑھ کر اور کون سی بات ہو گی، کیوں کہ انھوں نے ایک بشر کو بحیثیتِ رسول بھیجے جانے کو کافی نہ سمجھا، یہاں تک کہ فرشتوں کو اپنی طرف بھیجے جانے کا مطالبہ کیا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھے اور تخیر کی طرف چلے، یعنی اپنی پسند کی طرف کہ فرشتے آتے۔ یا اللہ پاک ان سے خطاب کرتا اور اس کو دنیا میں اس طرح دیکھتے کہ اس کے اور اُن کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوتا۔ آمنے سامنے اس سے بات چیت کرتے۔ ان رذیلوں کمینوں کو تو ذرا دیکھو کہ اپنے آپ کو کہاں تک پہنچایا ہے، حالانکہ وہ حقیر ترین اور قلیل ترین اور ذلیل ترین ہیں

[1] فتح القدير (٤/ ٩٣) [2] الدر المنثور (٦/ ٢٤٤)

اس سے کہ وہ اس بات کے اہل ہوں، یا ایسے لوگوں میں شمار کیے جائیں جن میں ایسی قابلیت ہو۔ جو کوئی اپنے نفس کی حیثیت سے لاعلم ہوتا ہے اور اپنی حد کے پاس کھڑا نہیں ہوتا تو اس کی یہی گت ہوتی ہے۔ جس کسی کا نفس اپنی قدر و مرتبے سے جاہل ہوتا ہے تو اس کا غیر اس سے وہ شے دیکھتا ہے جس کو وہ خود نہیں دیکھتا۔

﴿ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ ﴾ فعل محذوف سے منصوب ہے۔ "أَيْ: اُذْكُرْ" یعنی یاد کر تو اس دن کو جس دن میں وہ عذاب کے فرشتوں کو دیکھیں گے، جو ایسا دیکھنا نہیں ہوگا، جیسا انھوں نے طلب کیا ہے اور نہ اس صورت پر جس کی انھوں نے فرمایش کی ہے، بلکہ ایک اور ہی شکل پر۔ یہ وہ دن ہے کہ فرشتے ان کی موت کے وقت ظاہر ہوں گے یا ان کے حشر کے وقت۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روزِ قیامت میں۔ امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ يَوْمَ ﴾ اس فعل سے منصوب ہو جس پر ﴿ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴾ دال ہے۔ "أَيْ: يَمْنَعُوْنَ الْبُشْرَى يَوْمَ يَرَوْنَ" یعنی وہ خوش خبری سے منع کیے جائیں گے، روکے جائیں گے، جس دن کہ فرشتوں کو دیکھیں گے، یا اس دن میں ان کے واسطے خوش خبری پائی نہ جائے گی۔

چنانچہ اللہ پاک نے اس بات کی خبر دے دی کہ جس وقت وہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ موت کا وقت ہے یا قیامت کا دن ہے۔ اللہ پاک نے مومنوں کے برعکس خوش خبری سے ان کو محروم کر دیا ہے کہ مومنوں کو تو جنت کی خوش خبری ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ مجرمین وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کے ساتھ کفر کرنے کا جرم کیا ہے۔[2] مجرمین اسم ظاہر ہے۔ مضمر کی جگہ میں اس کو رکھا گیا ہے، یا کلمہ مجرمین عام ہے تمام کافروں کو شامل ہے۔ مجرم وہ لوگ ہیں جنھوں نے گناہ کیے ہیں اور مراد کفار ہیں، کیوں کہ مطلق اسماء میں اکمل مسمیات شامل ہوتے ہیں۔

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ ﴾ میں ضمیر کفار کی طرف راجع ہے، یعنی جس وقت کفار فرشتوں کو دیکھیں گے تو ﴿ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾ کہیں گے۔ یہ ایک کلمہ ہے جسے دشمن کا آمنا سامنا ہونے کے وقت یا کسی مصیبت یا حادثہ پیش آنے کے وقت بولا کرتے تھے۔ بجائے استعاذہ (أَعُوْذُ بِاللّٰهِ) کے اس کلمے کو ادا کرتے تھے۔ عرب بول چال میں اگر کوئی کسی سے کہتا: "أَتَفْعَلُ كَذَا؟" کیا تو یہ کام کرے گا؟ تو وہ کہتا: "حِجْرًا مَّحْجُوْرًا" یعنی تجھ پر حرام ہے کہ تو مجھ سے تعرض کرے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ کفار اللہ پاک سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ مکروہ چیز اور بلا کو روک دے کہ انھیں لاحق نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے سوال کرتے ہیں کہ اس عذاب کو اچھی طرح سے روک دے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ فرشتوں کے اقوال میں سے ہے، یعنی فرشتے کفار سے کہیں گے کہ یہ بات بالکل حرام ہے کہ تم میں سے کوئی جنت میں داخل ہو اور کہیں گے کہ آج کے دن خوش خبری صرف مومنوں کے لیے ہے۔

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بالکل حرام ہے یہ بات کہ ہم تم کو اس شے کی خوش خبری دیں، جس کی

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٩٨)
[2] فتح القدير (٤/ ٩٣)

خوش خبری ہم متقیوں کو دیں۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک کلمہ ہے، جس کو عرب لوگ سختی کے وقت کہا کرتے تھے۔[1] حجر مصدر ہے بہ معنی استعاذہ، یعنی پناہ چاہنا۔ کسرہ وفتحہ دو لغت ہیں، ان دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، کسی نے بہ ضم حائے مہملہ پڑھا ہے۔ یہ بھی اس میں ایک لغت ہے۔ (صراح میں ہے: "حجر بالكسر حرام وبالضم وبالفتح مثله والكسر أفصح وقرئ بالثلث في قوله تعالىٰ: ﴿وَحَرْثٌ حِجْرٌ﴾ [الأنعام: ١٣٨] و منه قوله تعالىٰ ﴿حِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ "أَيْ: حَرَامًا مُّحَرَّمًا") "حجر" ماخوذ ہے "حَجَرَهُ إِذَا مَنَعَهُ" سے، جو مصادر کہ منصوب ہوتے ہیں ایسے فعلوں سے جن کا ظاہر کرنا متروک ہے۔ سیبویہ نے اس کلمہ کو ان میں ذکر کیا ہے اور انہیں میں اس کو بھی ٹھہرایا ہے۔ امام سمین اور بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے۔[2] محجور صفتِ موکدہ ہے معنی کے لیے جس طرح کہ عرب کا یہ قول ہے: "ذَيْلٌ ذَائِلٌ وَمَوْتٌ مَائِتٌ" (یہ تاکید مبالغہ کے لیے آتی ہے: "ذَيْلٌ ذَائِلٌ" یعنی دامن دراز، اور "مَوْتٌ مَائِتٌ" یعنی سخت موت۔)

﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ﴾ یہ کفار کو ایک اور وعید ہے، اس لیے کہ وہ ایسے اعمال کیا کرتے تھے، ان کی صورتیں خیر کی ہوتی تھیں، جیسے صلہ رحم، اغاثۂ ملہوف، کھانا کھلانا اور اس جیسے اور اعمال۔ ان پر ثواب دینے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں، مگر ان کا کفر جس پر وہ قائم دائم رہے۔ (صلہ رحم قرابت والوں کے ساتھ حسبِ مراتب حسنِ سلوک کرنے کو کہتے ہیں اور اغاثۂ ملہوف سے مراد مظلوم شخص کی دادرسی کرنا ہے۔) چنانچہ ان کے حال اور اعمال کی تشبیہ اس قوم کے حال سے دی گئی کہ جنھوں نے اپنے بادشاہ کی مخالفت کی اور اس کی نافرمانی اختیار کی تو وہ اُن کے مال ومتاع اور سامان واسباب کی طرف آیا جو ان کے پاس تھا تو اس نے اس سب کو فاسد کر ڈالا، اس میں سے کچھ نہ چھوڑا، ورنہ اس جگہ کسی طرح کا قدوم نہیں ہے۔ یا قدوم اس (اللہ تعالیٰ) کی صفات میں سے ہے مجئ ونزول کی طرح۔ چنانچہ اس پر بغیر تاویل وتعطیل وتکییف وتشبیہ وتمثیل کے ایمان لانا واجب ہے، جس طرح کہ سلف صالحین کا مذہب ہے اور حق یہی ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿قَدِمْنَآ﴾ کے معنی "عَمِدْنَا وَقَصَدْنَا" ہیں۔ جب کوئی شخص کسی امر کی طرف قصد وعمد کرتا ہے تو محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "قَدِمَ فُلَانٌ إِلَى أَمْرِ كَذَا"[3] کسی نے کہا ہے کہ قدوم سے مراد قدومِ ملائکہ ہے۔ اللہ پاک نے اس کی خبر اپنے نفسِ مقدس کی طرف سے دی ہے۔ گویا فرشتوں کے آنے کو اپنا آنا فرمایا ہے۔ قصد اللہ پاک کے حق میں طرف معنی ارادہ کے راجع ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے ان کے عمل کو باطل کر دیا کہ اس کے لیے کسی طرح کا ثواب نہیں ہے، کیوں کہ اس کو اللہ عزوجل کے واسطے نہیں کیا تھا۔ اسی بارے میں یہ حدیث شریف ہے:

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧٧_ ٢٦٧٨) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٢١٣) [3] فتح القدير (٤/ ٩٤)

«كُلُّ عَمَلٍ لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»[1] یعنی جس عمل پر ہمارا امر نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔ ﴿هَبَآءً﴾ کا واحد ''هَبَاءَةٌ'' ہے اور جمع ''أَهْبَاءُ'' ہے۔ نضر بن شمیل نے کہا: ''هباء'' تراب، یعنی خاک ہے جس کو ہوا اڑاتی ہے، گویا وہ دھواں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شے جو سوراخ سے سورج کی روشنی کے ساتھ غبار کے مشابہ داخل ہوتی ہے۔ اسی طرح امام خلیل اور ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] ابن عرفہ نے کہا ہے کہ ''هَبَاءٌ وَّهَبْوَةٌ'' باریک خاک ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ وہ شے ہے جو گھوڑوں کی دُموں یا جانوروں کے کھروں سے اُن کے چلنے کے وقت بلند ہوتی ہے، یعنی غبار۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ﴿هَبَآءً﴾ سورج کی شعاع ہے جو سوراخ سے نکلتی ہے۔[4] ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ''اَلْهَبَاءُ وَهَجُ الْغُبَارِ يَسْطَعُ ثُمَّ يَذْهَبُ فَلَا يَبْقَى مِنْهُ شَيْءٌ'' (''وهج'' سوزانیِ آتش کو کہتے ہیں۔ والله أعلم۔ یہاں یہ مراد ہے کہ ﴿هَبَآءً﴾ غبار کی چمک ہے جو بلند ہوتی ہے، پھر جاتی رہتی ہے، اس میں سے کوئی شے باقی نہیں رہتی)۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ ﴿هَبَآءً﴾ وہ شے ہے جو آگ سے اڑتی ہے، جبکہ وہ دہکتی اور شعلہ مارتی ہے، اس سے پتنگے اڑتے ہیں، پھر جب وہ گر پڑتے ہیں تو کچھ شے نہیں ہوتے۔[5] ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ﴿هَبَآءً﴾ وہ شے ہے جس کو ہوا اڑاتی ہے اور متفرق کرتی ہے، یعنی خاک اور حطامِ شجر، یعنی درختوں کے ریزے ریزے غبار کی طرح۔[6] ان میں سے بعض اقوال پہلے گزر چکے ہیں، لیکن چونکہ الفاظ اور بیان کا فرق تھا، اس لیے وضاحت کے لیے دوبارہ لکھ دیے گئے ہیں، جو بات کہ لغت میں ثابت ہے اور عارفینِ لغت نے اس کو نقل کیا ہے، وہ پہلے معنی ہیں۔ منثور کہتے ہیں پھیلے ہوئے پریشان کو۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا، یہاں تک کہ ''هباء منثور'' کی طرح ہو گئے۔ اللہ پاک نے اس پر اکتفا کیا ہے کہ اعمال کو ﴿هَبَآءً﴾ سے تشبیہ دی، یہاں تک کہ ﴿هَبَآءً﴾ کا یہ وصف کیا کہ منتشر اور متبدد ہے، یعنی پریشان۔ بالجملہ یہ استعارہ ہے، اس بات سے کہ ان کے عمل کو ایسا کر دیا ہے کہ وہ اکٹھے ہونے کو قبول نہیں کرتا اور نہ اس سے کوئی فائدہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں کسی طرح کا ثواب نہیں ہے، کیوں کہ اس میں ثواب کی شرط نہیں ہے، وہ شرط ایمان باللہ وبالرسول اور اخلاص ہے اور ریا کاری اور سمعہ سے پاک صاف ہونا۔ ان کے عملِ خیر کی جزا ان کو دنیا ہی میں دے دی جاتی ہے اور آخرت میں ان کے لیے کچھ نہیں۔

پھر اللہ پاک نے نیک لوگوں کے حال کو فاجر لوگوں کے حال سے علاحدہ کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا﴾ ﴿مُسْتَقَرًّا﴾ کا نصب تمیز کی بنا پر ہے۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨) [2] فتح القدير (٤/ ٩٤)
[3] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٢) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧٩) [5] الدر المنثور (٦/ ٢٤٦) [6] تفسير البغوي (٦/ ٧٩)

ہے کہ قیلولہ عرب کے نزدیک دوپہر کو آرام لینا ہے جب سخت گرمی ہو، اگرچہ اس کے ساتھ نیند نہ ہو، اس لیے کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾ حالاں کہ جنت میں نیند نہیں ہے۔[1] یعنی قیامت کے دن جنت والے مقام کے لحاظ سے کافروں کے دنیا میں مقام سے افضل ہوں گے اور دوپہر کے وقت جنت میں جائے آرام کے لحاظ سے بہت اچھے ہوں گے۔ یا یہ معنی ہیں کہ مومن ان سے بہتر ہوں گے آخرت میں اگر فرض کیا جائے کہ یہ ان کے واسطے ہو، یا تفضیل کا صیغہ صرف وصف کے لیے ہو بغیر مفاضلہ کے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوفی لوگ ''اَلْعَسَلُ أَحْلٰی مِنَ الْخَلِّ'' کو جائز رکھتے ہیں۔[2] (یعنی شہد سرکہ سے شیریں ہے، یہاں تفضیل مراد نہیں ہے، کیوں کہ سرکہ میں شیرینی بالکل نہیں اور سرکہ تلخ اور ترش ہے۔) غرضیکہ آیتِ کریمہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ نار میں سے ہر ایک نے قیلولہ کیا، یعنی قیلولہ کے وقت قرار پذیر ہوئے، اگرچہ مومنین کا قرار پکڑنا راحت میں ہے اور کافروں کا عذاب میں۔ چنانچہ اس وقت تمام مخلوق کا حساب مکمل ہو چکا ہوگا۔[3] چوں کہ اس جگہ قیامت کا ذکر آ گیا، اس لیے اللہ پاک نے روزِ قیامت کے کچھ احوال کے اوصاف بیان کیے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿٢٥﴾
اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ
عَسِيْرًا ﴿٢٦﴾ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ
يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ
فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ۭ وَكَانَ
الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾

اور جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے لگاتار اُتارے جائیں گے ﴿25﴾ اس دن حقیقی بادشاہی رحمان ہی کی ہوگی، اور وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا ﴿26﴾ اور جس دن (ہر) ظالم اپنے دونوں ہاتھ دانتوں سے کاٹ کھائے گا (اور) کہے گا: اے کاش! میں رسول کے ساتھ راہ اختیار کرتا ﴿27﴾ ہائے میری کم بختی! کاش! میں فلاں (شخص) کو دوست نہ بناتا ﴿28﴾ بلاشبہہ اس نے میرے پاس ذکر (قرآن) آجانے کے بعد مجھے (اس سے) بہکا دیا اور شیطان انسان کو (مصیبت میں) بے یار و مددگار چھوڑ دینے والا ہے ﴿29﴾

---

[1] تفسیر الرازي (١٤/ ١٩) [2] تفسیر القرطبي (١٣/ ٢٢) [3] فتح البیان (٩/ ٢٩٦۔ ٣٠٠)

قیامت کی ہولناکیوں کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک روزِ قیامت کی ہولناکیوں اور دہشت کی اور ان عظیم اُمور کی خبر دیتا ہے جو اس میں ہوں گے۔ چنانچہ اُن میں سے آسمان کا شق ہونا اور پھٹ جانا ہے اور غمام کے ساتھ کھل جانا ہے۔ غمام نور کے سائے ہیں، کون سا نور جو ایسا عظیم ہے کہ آنکھوں پر غالب ہو جائے گا اور آسمانوں کے فرشتوں کا نازل ہونا ہے اس دن، چنانچہ وہ محشر میں تمام خلائق کو گھیر لیں گے، پھر اللہ تعالیٰ فیصلے کرنے کے لیے آئے گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایسا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾[1] [البقرۃ: ۲۱۰] ''کیا اب وہ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ بادلوں کے سائے میں ان کے سامنے چلا آئے اور فرشتے بھی اور (ان کے) معاملے کا فیصلہ ہی کر ڈالا جائے؟ آخر سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔''

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی، فرمایا کہ اللہ قیامت کے دن ایک جگہ پر تمام مخلوق یعنی جنوں، انسانوں، چوپایوں، درندوں، پرندوں وغیرہ کو جمع کرے گا، پھر آسمانِ دنیا پھٹے گا تو اس کے لوگ اُتریں گے اور وہ جنوں، انسانوں اور ساری مخلوق سے زیادہ ہوں گے، پھر وہ جنوں، انسانوں اور ساری مخلوق کو گھیر لیں گے۔ پھر دوسرا آسمان پھٹے گا تو اس کے لوگ اتریں گے، چنانچہ یہ گھیر لیں گے ان فرشتوں کو جو ان سے پہلے اترے اور جن وانس اور ساری مخلوق کو، یہ آسمانِ دنیا کے لوگوں اور ساری مخلوق سے زیادہ ہوں گے۔ پھر تیسرا آسمان شق ہوگا تو اس کے لوگ اُتریں گے اور یہ دوسرے آسمان کے اور پہلے آسمان کے لوگوں سے اور ساری مخلوق سے زیادہ ہوں گے۔ پھر وہ ان فرشتوں کو جو اُن سے پہلے اترے ہیں اور جنوں اور انسانوں اور ساری مخلوق کو گھیر لیں گے، پھر اسی طرح ہر آسمان اسی تضعیف پر ہوگا، یعنی اس کے لوگ پہلے والے لوگوں اور ساری مخلوق کو گھیر لیں گے، یہاں تک کہ ساتواں آسمان شق ہوگا اور یہ لوگ ان آسمان والوں سے جو اُن سے پہلے نازل ہوئے تھے زیادہ ہوں گے اور جنوں اور انسانوں اور ساری مخلوق سے، پھر وہ ان سب کو گھیر لیں گے اور ہمارا رب عزوجل نازل ہوگا ابر کے سائبانوں میں اور اس کے اردگرد کرّوبین ہوں گے۔ یہ ساتوں آسمانوں کے لوگوں سے اور جنوں، انسانوں اور ساری مخلوق سے زیادہ ہوں گے، ان کے سینگ نیزوں کی گرہوں کی طرح ہوں گے اور وہ عرش کے نیچے ہیں۔ ان کی تسبیح وتہلیل وتقدیس کا شور ہوگا، ان میں سے ہر ایک کے پاؤں کے تلے سے ٹخنے تک کا فاصلہ پانچ سو برس کی راہ ہوگی اور ٹخنے سے گھٹنے تک کی مسافت پانچ سو برس کی ہوگی اور گھٹنے سے نیفۂ ازار کی جگہ تک کی مسافت

[1] تفسیر الطبري (۱۹/ ۲۶۰)

پانچ سو برس کی راہ ہو گی اور جائے نیفہ/ازار سے ہانس تک کی جگہ پانچ سو برس کی راہ ہو گی اور ہانس اور بالی کی جگہ کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہو گی اور اس کے اوپر پانچ سو برس کی راہ ہو گی۔ وجهنم مجنبته.[1] هكذا رواه ابن أبي حاتم بهذا السياق (ابن کثیر کے حاشیہ پر جو مطبوعہ مصر ہے، مصحح نے لکھا ہے: "هكذا في أصل الذي بأيدينا من غير نقط وليحرر لفظ الرواية انتهى" اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ روایت کے الفاظ کیا ہیں، اس شکل میں دو احتمال ہیں: ایک تو "محسته" کی صورت ہو سکتی ہے۔ محسہ پشت خارستور کو کہتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ "مجبنة" ہو۔ "مجبنة" اس لشکر کو کہتے ہیں، جو لشکر کے میمنہ ومیسرہ میں ہوتا ہے۔ شاید یہ معنی ہوں کہ اس میدان کے دائیں بائیں جانب میں جہنم ہو، یہ اس وقت درست ہو کہ جب لفظِ روایت کی خوب تحقیق ہو جائے، ورنہ احتمال سے کیا کام نکلتا ہے، اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ کیا لفظ ہے)۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ یہ آسمان جس وقت پھٹے گا تو اس وقت جنوں اور انسانوں سے زیادہ مقدار میں فرشتے اتریں گے اور وہ یوم التلاق ہے، وہ وہ دن ہے جس میں آسمان والے اور زمین والے ملیں گے۔ زمین والے کہیں گے کہ آیا ہمارا رب، اور آسمان والے کہیں گے کہ نہیں آیا، وہ آنے والا ہے۔ پھر دوسرا آسمان پھٹے گا، پھر تیسرا آسمان، پھر چوتھا آسمان۔ اسی طرح تضعیف کی ساتویں آسمان تک، پھر اس سے فرشتے اتریں گے جو زیادہ ہوں گے ان لوگوں سے جو آسمانوں سے اترے ہیں اور جنوں اور انسانوں سے، پھر کروبین اتریں گے، پھر آٹھ حاملینِ عرش کے درمیان ہمارا رب تشریف لائے گا، ہر فرشتے کے ٹخنے اور گھٹنے کے درمیان ستر برس کی راہ ہے اور اس کی ران اور مونڈھے کے درمیان ستر برس کی مسافت ہے اور اُن میں سے ہر فرشتہ اپنے ساتھی دوسرے فرشتے کے منہ پر تامل نہ کرے گا، (یعنی ہر فرشتہ خوف و ہیبت اور تعظیم اور اجلال کی وجہ سے دوسرے فرشتے کے چہرے کو نہ دیکھے گا، ہر ایک سر جھکائے ہوئے تسبیح کرتا ہو گا) اور اُن میں سے ہر فرشتہ اپنے سر کو دونوں چھاتیوں کے درمیان رکھنے والا ہو گا اور کہے گا: "سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ" اور اُن کے سروں پر ایک شے مبسوط ہو گی، گویا وہ نیزے ہیں اور عرش اس کی فوق (چھت) ہے۔ (حاملینِ عرش کی شکل پہاڑی بکروں کی طرح ہو گی، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے، یہ شے جو اُن کے سروں پر بچھی ہوئی ہو گی وہ سینگ ہوں گے، نیزوں کی طرح ان کے سروں پر بچھے ہوئے ہوں گے۔ واللہ اعلم) "ثم وقف.[2] فمداره على علي بن زيد بن جدعان وفيه ضعف في سياقاته غالباً وفيها نكارة شديدة" حدیث مشہور صور میں اسی کے قریب وارد ہو چکا ہے۔ والله أعلم.

نیز اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَيَوْمَىِٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَىِٕذٍ وَّاهِيَةٌ ۝ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ١٥ - ١٧] "تو اس دن واقع

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٨٢ - ٢٦٨٣)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ٢٦١)

ہونے والی (قیامت) واقع ہو گی۔ اور آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس دن بودا ہو گا۔ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور اس دن آٹھ (فرشتے) آپ کے رب کا عرش اپنے اوپر اُٹھائے ہوں گے۔'' شہر بن حوشب نے کہا ہے کہ عرش کے اٹھانے والے آٹھ ہیں، ان میں سے چار کہتے ہیں: ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَكَ الْحَمْدُ عَلَى حِلْمِكَ بَعْدَ عِلْمِكَ'' اور چار کہتے ہیں: ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَكَ الْحَمْدُ عَلَى عَفْوِكَ بَعْدَ قُدْرَتِكَ'' (رواه ابن جرير)

امام ابوبکر بن عبداللہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت زمین والے عرش کی طرف نظر کریں گے کہ وہ اوپر سے ان پر گر رہا ہے تو اُن کی آنکھیں اس کی طرف اوپر چڑھ جائیں گی اور ان کے پیٹ میں ان کے گردے کانپنے لگیں گے اور اُن کے سینوں میں سے دل اپنی جگہ سے اڑ کر ان کے حلق میں پہنچ جائیں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس وقت اللہ عزوجل نیچے اترے گا تو اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان ستر ہزار پردے ہوں گے، ان میں سے نور اور ظلمت (اندھیرا) ہے، پھر اس ظلمت میں ایک ایسی آواز کی جائے گی کہ اس کے سبب سے دل اُکھڑ جائیں گے۔[1] یہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے: ''وَلَعَلَّهُ مِنَ الزَّامِلَتَيْنِ'' والله أعلم (زاملہ اس اونٹ کو کہتے ہیں جس پر کھانا، دانا، سامان و اسباب لادتے ہیں۔ شاید عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے یہ کہا ہو گا کہ میرے پاس دو اونٹ بھر علم ہے، اس لیے یہ کہا ہے کہ شاید یہ حدیث بھی اسی علم سے ہو۔ والله أعلم۔ ناظر کو اگر زاملتین کے معنی پر یقینی اطلاع ہو جائے تو اس کو لکھ دے۔ والسلام)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [المؤمن: ١٦] ''آج کس کی بادشاہی ہے؟ (پھر خود ہی فرمائے گا:) صرف اللہ واحد وقہار کی۔'' صحیح میں ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ آسمانوں کو اپنے سیدھے ہاتھوں میں لپیٹے گا اور زمینوں کو اپنے دوسرے ہاتھوں میں لے گا، پھر فرمائے گا: میں ہوں بادشاہ! میں ہوں دیّان (یعنی قہار یا حاکم و قاضی۔ فعال کا وزن ہے ''دَانَ النَّاس'' سے، یعنی ''قَهَرَهُمْ عَلَى الطَّاعَةِ''[2] كذا في مجمع البحار)۔ کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں جبار؟ کہاں ہیں متکبر؟[3] (یعنی لوگوں پر جبر و قہر و ظلم و زبردستی کرنے والے۔ اور متکبر کے یہ معنی ہیں کہ اپنے آپ کو لوگوں سے بڑے سمجھنے والے)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴾ عسیر کے معنی ہیں شدید صعب، یعنی نہایت سخت۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١٠٣] ''بڑی گھبراہٹ انھیں غم ناک نہیں کرے گی، اور فرشتے ان سے (یہ کہہ کر) ملیں گے: یہ ہے تمھارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔'' امام احمد نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ کسی نے عرض کی:

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٦١۔ ٢٦٠) [2] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٢٢٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٨) اس میں ''أَنَا الدَّيَّانُ'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

یا رسول اللہ! وہ دن جس کا مقدار پچاس ہزار برس کا ہے کیا ہی بڑا ہے یہ دن، تو آپ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بے شک البتہ وہ مومن پر خفیف کیا جائے گا یہاں تک کہ اس پر وہ فرض نماز سے بھی زیادہ خفیف (ہلکا) ہوگا جس کو وہ دنیا میں پڑھتا ہے۔[1]

روزِ قیامت ظالم کی ندامت و پشیمانی:

﴿ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ ... الخ﴾ اللہ تعالیٰ ظالم کی ندامت اور پشیمانی کی خبر دیتا ہے، وہ ظالم جس نے رسول اللہ ﷺ کی راہ سے علاحدگی اختیار کی اور جو اس حقِ مبین سے علاحدہ ہوا جو ظاہر کھلا ہوا حق ہے، جس کو آپ ﷺ اللہ کے پاس سے لے کر آئے ہیں اور اس میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں۔ اور آپ ﷺ کی راہ کو چھوڑ کر اَور رستے پر چلا۔ چنانچہ جب قیامت کا دن ہوگا تو نادم و پشیمان ہوگا، جبکہ ندامت اس کو کچھ نفع نہ دے گی اور حسرت و افسوس کے مارے اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے گا۔

آگے کے دن پاچھے گئے اور پی سے کیو نہ ہیت
اب پچتائے کیا ہوت ہے چڑیا چگ گئیں کھیت

غرض کہ برابر ہے کہ آیتِ کریمہ کا نزول عقبہ بن ابی معیط کے حق میں ہو یا اس کے سوا اور بدبختوں کے بارے میں، لیکن آیت ہر ظالم کے حق میں عام ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ۝ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ﴾ [الأحزاب: ٦٦۔ ٦٧] ''جس دن آگ میں ان کے چہرے الٹ پلٹ کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: اے کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ اور وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی تو انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔'' چنانچہ ہر ظالم قیامت کے دن نادم ہوگا اور انتہا درجے کی پشیمانی اٹھائے گا۔

﴿ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ۝ يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴾ کہتا ہوا اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھائے گا۔ خلیل سے مراد وہ شخص ہے، جس نے اس کو ہدایت سے پھیرا اور گمراہی کی راہ پر لے گیا اور اس باب میں اُمیہ بن خلف یا اس کا بھائی اُبی بن خلف برابر ہیں، یا ان دونوں کے سوا کوئی اَور۔ ﴿ لَّقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ﴾ ذکر سے مراد قرآن شریف ہے، یعنی قرآن سے اس نے مجھ کو گمراہ کیا، اس کے بعد کہ وہ مجھ تک پہنچ چکا تھا اور اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولًا ﴾ یعنی شیطان انسان کو حق سے باز رکھتا ہے، اس سے پھیرتا ہے اور باطل میں اس سے کام لیتا ہے اور باطل کی طرف اسے بلاتا ہے۔[2]

[1] مسند أحمد (٣/ ٧٥) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الترغیب والترهیب: ٢/ ٢٢٠)

[2] تفسیر ابن أبي كثير (٣/ ٤١٨۔ ٤٢٠)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مبانی اور معانی کی وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ تَشَقَّقُ ﴾ بہ معنی "تفتح" ہے۔ فتح کھولنے کو کہتے ہیں اور "تفتح" کھلنے کو بولتے ہیں۔ امام عاصم، اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ، کسائی اور ابوعمرو نے "تشقق" بہ تخفیفِ شین پڑھا ہے۔ اس کی اصل "تتشقق" ہے۔ باقی قراء کی قراءت بہ تشدیدِ شین بادغام ہے۔ پہلی قراءت کو ابوعبید رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور ثانی کو امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے۔ غمام بالفتح کے معنی ابر ہے۔ ﴿ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ ﴾ کے یہ معنی ہیں "تَتَشَقَّقُ عَنِ الْغَمَامِ" اس لیے کہ حرفِ با اور حرفِ عن یکے بجائے دیگرے آیا کرتے ہیں، جس طرح کہ "رَمَيْتُ بِالْقَوْسِ وَعَنِ الْقَوْسِ" دونوں طرح بولتے ہیں، یعنی آسمان ابر سے پھٹ جائے گا۔ ابوعلی فارسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا اور اس پر ابر ہوگا، جس طرح محاورے میں بولتے ہیں: "رَكِبَ الْأَمِيرُ بِسِلَاحِهِ" یعنی امیر اس حال میں سوار ہوا کہ اس کے ہتھیار اس پر تھے۔ "وَخَرَجَ بِثِيَابِهِ" اور اس حال میں نکلا کہ اس کا لباس اس پر تھا۔[1]

مروی ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا ایک باریک سفید بدلی سے، جو مثل ضبابہ کے ہوگی۔ ضبابہ وہ بدلی ہے جو زمین کو ڈھانک دیتی ہے دھوئیں کی طرح۔ اور یہ نہیں ہوا مگر بنی اسرائیل کے لیے ان کی وادیِ تیہ میں۔ کسی نے کہا ہے آسمان اس بدلی کے ساتھ پھٹ جائے گا جو آسمان اور لوگوں کے درمیان ہے۔ معنی یہ ہیں کہ آسمان پھٹنے کے ساتھ بدلی پھٹ جائے گی۔ کسی نے کہا ہے کہ آسمان فرشتوں کے اترنے کے لیے پھٹ جائے گا، جس طرح کہ اللہ پاک نے اس کے بعد فرمایا ہے: ﴿ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيلًا ﴾۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بِالْغَمَامِ ﴾ میں حرف با سببیہ ہے، یعنی "بِسَبَبِ الْغَمَامِ" یعنی بدلی کے طلوع ہونے کے سبب سے آسمان پھٹ جائے گا۔ گویا وہی بدلی ہے جس سے آسمان پھٹتا ہے۔ کسی نے کہا کہ حرفِ با محذوف سے متعلق ہے: "أَيْ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ مُتَلَبِّسَةً بِالْغَمَامِ"

ابن کثیر رحمہ اللہ نے "نُنْزِلُ الْمَلَائِكَةَ" پڑھا ہے تخفیف کے ساتھ باب انزال سے مضارع اور "اَلْمَلَائِكَةَ" منصوب ہے مفعولیت کی بنا پر۔ قرائے سبعہ سے باقی نے "نُزِّلَ" بہ ضمِ نون وکسرِ زائے مشددہ بصیغۂ ماضی مجہول پڑھا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابورجاء نے "نَزَّلَ" بصیغۂ ماضی معروف اور فاعل اس کا اللہ پاک ہے اور ملائکہ منصوب بنا بر مفعولیت۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے "أَنْزَلَ الْمَلَائِكَةَ" پڑھا ہے۔ یہ بھی ان سے مروی ہے کہ "تَنَزَّلَتِ الْمَلَائِكَةُ" پڑھا ہے۔ قراءاتِ شاذہ میں اس کے سوا اور بھی ہیں۔[2] ﴿ نُزِّلَ ﴾ کی جو ﴿ تَنْزِيلًا ﴾ سے تاکید کی تو اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ فرشتوں کا اتارنا ایک عجیب وغریب طریقے اور قسم سے ہوگا۔ اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ اتارنا رضا ورحمت کے طور پر ہوگا۔ غصے اور عذاب کے طور پر نہ ہوگا۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٣) فتح القدير (٤/ ٩٦) [2] فتح القدير (٤/ ٩٦)

﴿ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ ﴿ اَلْمُلْكُ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ اَلْحَقُّ ﴾ اس کی صفت ہے اور ﴿ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ خبر اور ﴿ يَوْمَىِٕذٍ ﴾ ﴿ اَلْمُلْكُ ﴾ سے متعلق ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے، یعنی وہ ملک ثابت جو زائل نہ ہوگا اور نہ ہی اس دن اس میں رحمان کا کوئی شریک ہوگا۔ جو ملک زائل ہو اور منقطع ہو جائے وہ حقیقت میں ملک ہی نہیں اور اس لیے کہ سلطان یعنی غلبہ و تسلط ظاہر اور مکمل طور پر عام اور ثابت صورتاً و معناً اور ظاہری و باطنی طور پر اس طریقے پر کہ اس کو اصلاً کسی طرح کا زوال نہ ہو، وہ صرف اللہ پاک کے لیے ہی ہے۔

﴿ اَلْمُلْكُ ﴾ کو جو ﴿ يَوْمَىِٕذٍ ﴾ کے ساتھ مقید کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہتِ مذکور کا صرف اللہ پاک کے لیے ثبوت صرف اسی خاص دن میں ہے۔ رہے اس کے سوا اور دن دنیا کے تو ان میں غیر اللہ کے لیے بھی بادشاہت ہے، اگرچہ وہ حقیقی بادشاہت نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ مبتدا کی خبر ظرف ہے یعنی ﴿ يَوْمَىِٕذٍ ﴾ اور ﴿ اَلْحَقُّ ﴾ ﴿ اَلْمُلْكُ ﴾ کی صفت ہے، یعنی ملک خاص اس دن میں رحمان کے لیے ثابت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْمُلْكُ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ اَلْحَقُّ ﴾ اس کی خبر اور ﴿ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ حق سے متعلق ہے۔

﴿ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ دن باوجود اس کے کہ اس میں ملک صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کے لیے ہوگا، کفار پر مشکل ہوگا، اس لیے کہ اس میں ان کو عذاب اور سزا پہنچے گی حساب ہو جانے کے بعد۔ رہے مومنین تو ان پر آسان ہوگا اور مشکل نہیں ہوگا، کیوں کہ ان کو اس دن عزت اور عظیم خوشیاں نصیب ہوں گی۔ ﴿ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ ﴾ میں ظرف منصوب بہ محذوف ہے، "أَيْ: أُذْكُرْ" جس طرح کہ ظرف اول یعنی ﴿ يَوْمَ تَشَقَّقُ ﴾ اسی محذوف سے منصوب ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ "عَضّ" حقیقت ہے اور اس سے کوئی مانع بھی نہیں ہے، نہ کوئی اس کی تاویل کا موجب ہے۔

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظالم اپنے ہاتھوں کو کھائے گا، یہاں تک کہ اپنی کہنیوں کو کھائے گا، پھر وہ اُگ آئیں گی، پھر ان کو کھا جائے گا، اسی طرح ہر بار اس کے ہاتھ اُگ آئیں گے اور وہ ان کو اس کام پر حسرت کے مارے جو کر چکا ہے کھا جائے گا۔[1] (ذکرہ الخازن) کسی نے کہا ہے کہ ہاتھ کاٹ کھانا غیظ و حسرت سے کنایہ ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ظالم سے مراد ہر ظالم ہے، جو اس جگہ میں وارد ہوگا اور اس منزل میں نازل ہوگا۔ آیت کا ورود جو خاص سبب پر ہوا ہے، وہ اس سے مانع نہیں، کیوں کہ عمومیتِ لفظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ ظالم اُبی بن خلف وعقبہ بن ابی معیط ہیں۔ یہ دونوں جہنم میں خلیل ہیں۔[2]

﴿ يَقُوْلُ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ اور جو بات کہی جائے گی وہ یہ ہے: ﴿ يٰلَيْتَنِيْ ﴾ اور منادیٰ محذوف ہے: "أَيْ: يَا قَوْمِي لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا" یعنی وہ ظالم اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے گا

---

[1] تفسير الخازن (٥/ ٩٩) [2] الدر المنثور (٦/ ٢٥٣)

حسرت کے مارے اس حال میں کہ یہ کہتا ہوگا: اے میری قوم! کاش میں رسول کے ساتھ حق کی راہ پکڑتا اور اس پر چلتا، یہاں تک کہ ان گمراہ کرنے والی باتوں سے نجات پاتا۔ مراد نبی اکرم ﷺ کی اس بات میں پیروی کرتا جس کو آپ لے کر آئے ہیں، یعنی کاش میں محمد ﷺ کی پیروی کرتا اور دنیا میں ان کے ہمراہ ہدایت کی راہ کو اختیار کرتا۔

﴿ يَٰوَيْلَتَىٰ ﴾ امام حسن رحمہ اللہ نے بہ یائے صریح پڑھا ہے اور دوری رحمہ اللہ نے بہ امالہ۔ امام ابو علی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ترک امالہ احسن ہے، اس لیے کہ اس لفظ کی اصل یائے تحتیہ ہے، پھر کسرہ فتحہ سے بدلا گیا ہے اور حرفِ یا تا سے بدلا گیا ہے، یا سے بھاگنے کے لیے، پس جس شخص نے امالہ کیا تو اس نے اسی طرف رجوع کیا کہ جس سے بھاگا ہے۔

﴿ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴾ اس ظالم نے اپنے نفس پر ویل، ثبور اور ہلاکت کی بد دعا کی، کافر کی دوستی کی وجہ سے، جس نے اس کو دنیا میں بہکایا۔ کلمۂ ﴿ فُلَانًا ﴾ کنایہ ہے اعلام سے۔ نیساپوری نے کہا ہے کہ بعض ائمۂ لغت نے زعم کیا ہے کہ ''فلان'' کا استعمال کلامِ فصیح میں صرف بطورِ حکایت کے ہی ثابت ہوا ہے۔ یہ نہیں بولتے کہ ''جَاءَنِي فُلَانٌ''، لیکن یوں کہتے ہیں کہ ''قَالَ زَيْدٌ: جَاءَنِي فُلَانٌ'' کیوں کہ فلاں اسم ہے اس لفظ کا کہ جو علم ہے اسم کا، اور اسی طرح اللہ پاک کے کلام میں آیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''فلان'' کنایہ ہے علمِ ذکور ''من یعقل'' سے اور ''فلانۃ''، علم ہے ان کے اناث سے اور یہ منصرف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ نکرہ ''من یعقل'' سے کنایہ ہے جو من جملہ ذکور ہیں اور ''فلانۃ'' کنایہ ہے اناث ''من یعقل'' سے۔ رہا ''الفلان و الفلانۃ'' الف اور لام کے ساتھ تو یہ غیر عقلاء سے کنایہ ہوتا ہے اور ''فُلُ'' ندا کے ساتھ مختص ہے، مگر ضرورتِ شعر میں، اور یہ مرخم نہیں ہے فلاں سے۔ فراء کا اس میں اختلاف ہے۔

امام ابو حیان رحمہ اللہ کا زعم یہ ہے کہ ابن عصفور اور ابن مالک نے اس بات میں وہم کیا ہے کہ فلاں کو علم ''من یعقل'' سے کنایہ ٹھہرایا ہے۔[1] اس کے لام میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ''واؤ'' ہے۔ دوسری یہ ہے کہ ''یا'' ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدمی اپنے خلیل و دوست کے دین پر حشر کیا جائے گا، لہٰذا چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک نظر کرے کہ کس سے دوستی کرتا ہے۔[2] (أخرجه أبو داود والترمذي) ان دونوں کے الفاظ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تو صرف مومن کا مصاحب بن اور نہ کھائے تیرا کھانا مگر متقی، یعنی پرہیز گار۔[3] شیخین نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جلیس

---

[1] فتح القدير (٤/ ٩٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٣٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٧٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٥٤٥) اس میں ''حشر کیے جانے کا ذکر'' نہیں ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٩٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٤١)

صالح اور جلیس سوء کی مثال مشک اُٹھانے والے اور بھٹی کو پھونکنے والے کی طرح ہے۔ مشک کا اُٹھانے والا ایسا ہے کہ یا وہ تجھے دے گا یا تو اس سے خریدے گا یا تو اس سے خوشبو پائے گا اور بھٹی کو پھونکنے والا یا تو تیرے کپڑے جلائے گا یا تو اس سے بدبو پائے گا۔[1]

﴿ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ﴾ یہ تعلیل ہے اس کی تمنیِ مذکور کی اور اس کی تعلل کی وضاحت ہے، (یعنی یہ آرزو کر کے اپنے نفس کو مشغول رکھتا ہے اور بہلاتا ہے، ورنہ اس تمنا کا کچھ حاصل نہیں ہے۔) اس کے شروع میں لام قسمیہ (یعنی لامِ توطۂ قسم کا، اس لیے کہ یہ جواب ہے قسم محذوف کا "أَيْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ"۔) اپنی خطا کے بیان کرنے میں مبالغہ کے لیے ہے اور حسرت و ندامت کو ظاہر کرنے میں مبالغہ کرنے کو قسم کا لام لایا ہے، یعنی کاش! میں فلاں کو دوست نہ پکڑتا، اس لیے کہ قسم ہے اللہ کی! البتہ مقرر اس نے، یعنی جس کو میں نے دوست پکڑا تھا، مجھ کو قرآن شریف سے یا اللہ کی کتاب سے یا اللہ کے ذکر سے یا نصیحت سے یا کلمۂ شہادت سے یا ان سب باتوں سے مجھ کو بہکا دیا، اس کے بعد کہ وہ میرے پاس آ گیا اور مجھ کو اس پر قدرت ہو گئی، اس طرح سے کہ اس نے مجھ کو اس پر ایمان لانے سے روک دیا۔

﴿ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴾ یعنی اور ہے شیطان انسان کے لیے خذول کہ اس کو چھوڑ دیتا ہے اور اس سے بے زار اور بری ہو جاتا ہے سختی اور آزمایش کے وقت۔ "خذل" فریاد رسی کے ترک کرنے کو کہتے ہیں، اسی باب سے ابلیس کا مشرکوں کو خذلان کرنا ہے، اس انداز سے کہ وہ تو اس سے دوستی کرتے ہیں اور اس کو اپنا رفیق، یار اور مددگار خیال کرتے ہیں، پھر جب وہ اس سے فریاد رسی چاہیں گے تو اُن کو چھوڑ دے گا۔ یہ جملہ جملۂ ماقبل کا مقرر ہے، یعنی تائید کرتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ پاک کے کلام سے ہو، یا کلامِ ظالم کا تتمہ ہو۔ اس نے اپنے دوست کا نام شیطان رکھا، اس کے بعد کہ اس کو گمراہ کرنے والا ٹھہرایا تھا۔ یا شیطان سے ابلیس مراد لیا، کیوں کہ وہی اس کے لیے گمراہ کرنے والوں کی دوستی کا باعث بنا۔[2]

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝۳۱

اور رسول کہیں گے: اے میرے رب! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو متروک بنا دیا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٩٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٢٨)
[2] فتح البيان (٩/ ٣٠٠۔ ٣٠٤)

(پسِ پشت ڈال دیا) تھا⑳ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن مجرموں میں سے بنائے، اور
آپ کا رب ہادی اور مددگار کافی ہے㉛

روزِ قیامت رسول اللہ ﷺ کا تارکینِ قرآن کے حوالے سے شکوہ:

یعنی کافر بہکایا کریں، جس کو اللہ چاہے گا راہِ مستقیم پر لائے گا۔ انتہیٰ۔[1]

اللہ پاک اپنے رسول و نبی کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ انھوں نے یہ کہا: ﴿ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرک لوگ قرآن شریف کا اصغاء و استماع نہیں کرتے تھے، یعنی اس کی طرف کان نہیں دھرتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾ [حم السجدة: ٢٦] ''اور کافروں نے (ایک دوسرے سے) کہا: تم اس قرآن کو مت سنو، اور (جب پڑھا جائے تو) شور وغل کرو، تاکہ تم غالب آ جاؤ۔'' چنانچہ جس وقت قرآن شریف ان پر تلاوت کیا جاتا تو شور وغل بہت کرتے اور اس کے علاوہ اَور بات چیت کرتے، یہاں تک کہ اس کو نہیں سنتے تھے۔ چنانچہ یہ من جملہ ہجرانِ قرآن ہے، اور اس پر ایمان نہ لانا، اس کی تصدیق نہ کرنا بھی اس کے ہجران سے ہے اور اس کے سوچنے سمجھنے کو ترک کرنا بھی اس کے ہجران سے ہے، اور اس پر عمل نہ کرنا، اس کے اوامر کا بجا نہ لانا اور اس کے زواجر سے پرہیز نہ کرنا ہجرانِ قرآن ہی سے ہے، اور قرآن سے کنارہ کر کے غیر قرآن کی طرف جانا، جیسے: شعر یا قول یا غنا یا لہو یا کلام، یا غیر قرآن سے کوئی طریقہ اخذ کرنا، یہ بھی ہجرانِ قرآن سے ہے۔ لہٰذا ہم اللہ سے سوال کرتے ہیں، جو کریم اور منان ہے اور جس شے کو چاہتا ہے اس پر قادر ہے کہ ہم کو اس شے سے خلاصی دے، جو اس کو ناخوش کرے اور ہم سے اس شے میں کام لے جو اس کو راضی رکھے کہ ہم اس کی کتاب پاک کو حفظ کریں اور اسے سمجھیں بوجھیں اور رات دن کے اطراف میں اس کے مقتضا پر قائم ہوں، اس طرح سے کہ جس کو وہ دوست رکھتا ہے اور پسند فرمایا ہے: ''إِنَّهُ كَرِيْمٌ وَهَّابٌ''

قولہ: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! جس طرح تم کو تمھاری قوم میں جو بات حاصل ہوئی ہے ان لوگوں سے، جنھوں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے، اسی طرح اگلی اُمتوں میں بھی ہوا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کے لیے دشمن ٹھہرائے ہیں مجرموں سے۔ وہ لوگوں کو اپنی گمراہی اور کفر کی طرف بلاتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۚ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١١٢﴾ وَلِتَصْغٰى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١٢۔ ١١٣] ''اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین، ہر نبی کے دشمن بنائے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے کان میں

چکنی چپڑی باتیں ڈالتا رہتا ہے، تاکہ اسے دھوکے میں رکھے۔ اور (اے نبی!) اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے۔ چناں چہ آپ ان لوگوں کو، اور جو کچھ یہ جھوٹ گھڑ رہے ہیں، اس کو رہنے دیجیے۔ اور تاکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل اس جھوٹ کی طرف مائل ہو جائیں، اور وہ اس (جھوٹ) کو پسند کرتے رہیں اور وہ جو (برے کام) کر رہے ہیں وہ کرتے رہیں۔''

اور اسی لیے اس جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴾ یعنی جو کوئی اس کے رسول کا اتباع کرے اور اس کی کتاب پر ایمان لائے اور اس کی تصدیق کرے اور اس کا متبع اور پیرو ہو تو اللہ پاک اس کا دنیا اور آخرت میں ناصر اور ہادی ہے۔ ﴿ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴾ جو فرمایا ہے تو اس لیے کہ مشرک لوگ لوگوں کو اتباعِ قرآن سے روکا کرتے تھے، تاکہ اس سے کوئی ہدایت نہ پا جائے اور اس لیے کہ ان کا طریقہ قران کے طریقے پر غالب ہو جائے۔ چنانچہ اس لیے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَقَالَ الرَّسُوْلُ ﴾ ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ ﴾ پر معطوف ہے، معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن کہیں گے اللہ کو اپنا حزن و ملال ظاہر کرنے کے لیے، یا شکایت کرنے کے لیے اس چیز کے بارے میں جو اُن کی قوم نے کی، یا یہ نبی ﷺ کے اس دنیا میں قول کا بیان ہے: ﴿ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴾ یعنی اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو مہجور اور متروک کیا نہ اس کو قبول کیا اور نہ اس پر ایمان لائے جس کو میں لے کر اُن کے پاس آیا اور جس کے پہنچانے کا تو نے مجھے حکم دیا اور اس کو دے کر مجھے بھیجا۔ کسی نے کہا ہے کہ "مهجور" ماخوذ ہے۔ "هَجَرَ إِذَا هُذِيَ" سے۔ معنی یہ ہیں کہ انھوں نے قرآن کو ہجر و ہذیان سمجھا، یعنی بے ہودہ بکنا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَهْجُوْرًا ﴾ کے معنی "مهجوراً فِيْهِ" ہیں۔ پھر جار و مجرور کو حذف کر دیا، یعنی قرآن کو ایک ایسی شے ٹھہرایا کہ اس کے حق میں بے ہودہ باتیں بکتے ہیں۔ اس میں ان کا بے ہودہ بکنا یہ ہے کہ اس کو شعر و سحر اور اگلوں کی کہانیاں کہتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے انبیاء میں سے ہر نبی کے لیے، جو اللہ کی طرف دعوت کرتے ہیں، دشمن ٹھہرائے ہیں کہ نبی سے دشمنی کرتے ہیں، یہ دشمن اس کی قوم کے مجرم اور گناہ گار لوگ ہیں، لہٰذا اے پیغمبر! تم مت گھبراؤ، کیونکہ یہ تو انبیاء کا دأب (طریقہ) ہے، جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور صبر کرو، جیسا انھوں نے صبر کیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٢٠)

کہ نبی اکرم ﷺ کا دشمن ابو جہل تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا دشمن قارون تھا اور وہ ان کا چچا زاد بھائی تھا۔[1] ﴿ وَكَفٰى بِرَبِّكَ ﴾ میں حرفِ "با" زائد ہے، یعنی "کَفٰی رَبُّکَ" اور ﴿ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے، یا بنا بر تمیز۔ یعنی اللہ اپنے بندوں کو مصالحِ دین و دنیا کی ہدایت کرتا ہے اور ان کو ان کے دشمنوں پر فتح دیتا ہے۔[2]

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿٣٣﴾ؕ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٣٤﴾ ﴾

اور کافروں نے کہا: اس پر یہ قرآن ایک ہی بار اکٹھا کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے نازل کیا) ہے، تاکہ ہم اس سے آپ کا دل مضبوط کریں، اور ہم نے اسے خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سنایا ہے (32) اور وہ (کافر) جب آپ کے پاس کوئی مثال (اعتراض) لے کر آئیں تو ہم (جواب میں) آپ کو حق اور (اس کی) بہت اچھی توجیہ و تفسیر بتا دیتے ہیں (33) جو لوگ اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، وہی لوگ بدترین مکان والے اور گمراہ ترین راہ والے ہیں (34)

قرآنِ مجید کے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے کی حکمت کا بیان:

تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا، یعنی ہر بات کے وقت اس کا جواب آتا رہے تو پیغمبر کا دل ثابت رہے۔ انتہیٰ.

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ کافر اکثر اعتراض کیا کرتے ہیں اور عیب جوئی اور سرکشی سے پیش آتے ہیں اور فضول باتوں میں گفتگو کرتے ہیں، چنانچہ ایک یہ اعتراض کیا: ﴿ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ﴾ یعنی یہ کتاب جو اس کی طرف وحی کی گئی، یہ ساری کی ساری ایک ہی جگہ کیوں نہ اتاری گئی، جیسے اس سے پہلے کی کتابیں ایک ہی دفعہ میں نازل کی گئی تھیں، جیسے تورات، انجیل اور زبور وغیرہ کتبِ الٰہیہ؟ تو اللہ پاک نے اس کا یہ جواب دیا کہ قرآن شریف جو تیئس برس میں واقعات اور حادثات کے مطابق اور جن احکام کی ضرورت ہوتی تھی، ان کے مطابق منجم نازل کیا گیا، یہ اس لیے کہ اللہ اس سے مومنوں کے دلوں کو ثابت رکھے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٠٦] "اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے (نازل) کیا، تاکہ آپ اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سنائیں، اور ہم نے اسے بتدریج ہی نازل کیا ہے۔" اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ ﴾۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴾ کے معنی ہیں: "بَيَّنَّاهُ تَبْيِيْنًا"،

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٥٤) [2] فتح البیان (٩/ ٣٠٤۔ ٣٠٥)

یعنی ہم نے اس کو بیان کیا اچھی طرح بیان کرنے کی طرح۔ مطلب یہ ہے کہ خوب کھول کر بیان کیا ہے۔ ابن زید نے کہا: ”فَسَّرْنَاهُ تَفْسِيرًا“[1] اس کے معنی بھی پہلے معنوں کی طرح ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴾ یعنی وہ تیرے پاس جب بھی کوئی حجت اور شبہہ لائیں گے، یا کوئی ایسی بات کریں گے جس سے حق کا مقابلہ کریں گے تو ہم ان کو ایسی بات سے جواب دیں گے جو حق ہوگی اور اُن کی بات سے زیادہ واضح اور فصیح ہوگی۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ﴿ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ ﴾ یعنی نہیں لائیں گے وہ کوئی ایسی شے جس سے قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عیب تلاش کریں گے، لیکن ﴿ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴾ یعنی مگر جرائیل علیہ السلام اللہ کی طرف سے ان کا جواب لے کر اتریں گے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بڑا اعتناء (ہمدردی۔ غمخواری) اور شرف و بزرگی ہے، اس لحاظ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ عزوجل کی طرف سے صبح وشام اور شب و روز اور حضر وسفر میں قرآن کی وحی آتی تھی۔ اور ہر بار جب فرشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن لے کر آتا تھا تو یہ کتاب اتارنے کے مثل ہے، جیسے اس سے پہلے اگلی کتابیں اترا کرتی تھیں۔ پس یہ مرتبے کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے برادران انبیاء علیہم السلام سے برتر، بزرگ تر اور عظیم تر ہے۔ قرآن شریف بھی شریف تر کتاب ہے، جس کو اللہ پاک نے نازل کیا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بزرگ نبی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کے لیے دونوں صفتیں ایک ساتھ جمع فرمائی ہیں۔ ملائے اعلیٰ میں تو ﴿ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ﴾ سارا کا سارا لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کے بیت العزت کی طرف نازل کیا، پھر اس کے بعد زمین کی طرف واقعات اور حادثات کے مطابق منجم نازل فرمایا۔ نسائی نے بہ سندِ خود ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قرآن ﴿ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ﴾ آسمانِ دنیا کی طرف لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا۔ پھر اس کے بعد بیس برس میں اترا۔

قال الله تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴾ اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا: ﴿ وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ﴾[2] [بني إسرائيل: ۱۰۶] ”اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے (نازل) کیا، تاکہ آپ اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سنائیں، اور ہم نے اسے بتدریج ہی نازل کیا ہے۔“

پھر اللہ پاک نے کفار کی بدحالی کی خبر دی کہ قیامت کے دن معاد میں ان کا برا حال ہوگا اور بدترین حالات اور قبیح صفات میں ان کا حشر ہوگا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ الَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴾۔ صحیح میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! کافر روزِ قیامت میں اپنے منہ کے بل کیسے حشر کیا جائے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک جس نے اس کو دونوں پاؤں پر چلایا،

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲٦۹۱)
[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢١)

وہ اس بات پر قادر ہے کہ اس کو قیامت کے دن اس کے منہ پر چلائے۔[1] اور اسی طرح امام مجاہد، حسن، قتادہ رحمہ اللہ اور بہت سے مفسروں نے کہا ہے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ یہ قول ان کی فرمایشوں اور سرکشیوں میں سے ہے، یعنی اللہ پاک نے کتاب کو اس پر ایک ہی دفعہ غیر منجم نازل کیوں نہیں کیا جس طرح تورات موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر اور زبور داود علیہ السلام پر؟ اس قول کے کہنے والے کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون ہے؟ کسی نے تو کہا ہے کہ کفارِ قریش ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہود ہیں۔ انھوں نے کہا: تو کیوں نہیں لایا، ہمارے پاس قرآن کو ایک ہی دفعہ میں، جس طرح کہ تورات، انجیل اور زبور نازل کی گئیں؟ یہ ایک باطل خیال ہے اور ایسا دعویٰ ہے جو حق سے ہٹا ہوا ہے، کیوں کہ یہ کتابیں بھی تفریق کے ساتھ نازل کی گئی ہیں، جس طرح کہ قرآن شریف نازل ہوا ہے، لیکن وہ لوگ سرکش یا جاہل ہیں، کتبِ الٰہی کے نازل ہونے کی کیفیت کو نہیں جانتے کہ ان کا نزول انبیا علیہم السلام پر کس طرح ہوا ہے۔ یہ ان کا ایک اعتراض ہے، جس کا کوئی فائدہ نہیں، کیوں کہ معجزہ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا نزول ایک دفعہ ہو یا متفرق طور پر ہو، باوجود اس کے کہ متفرق ہونے کے کئی فائدے ہیں: ایک یہ ہے کہ اس کا نزول موقع کے مطابق ہونا مزید بصیرت اور اس سے زیادہ غور وفکر کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

دوسرا یہ ہے کہ وہ منجم نازل ہوگا اور رسول ہر نجم پر تحدی (چیلنج) کرے گا، پھر کفار اس کے مقابلے سے عاجز ہو جائیں گے تو یہ بات اس کی قوتِ قلب میں اضافہ کرے گی۔ تیسرا حالیہ قرائن کے مطابق الفاظ کا چسپاں ہونا ہے، یہ زیادہ مؤثر ہوگا۔ پھر اللہ پاک نے ان کے شبہے کا رد کیا اور منجم نازل کرنے کا فائدہ دل کو ثابت اور مضبوط رکھنا بیان فرمایا۔ ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ حرفِ کاف محلِ نصب میں ہے، اس بنا پر کہ مصدر محذوف کی صفت ہے اور "ذلك" "تنزيل" کی طرف اشارہ ہے، جو اُن کے کلام سے سمجھی جاتی ہے۔ یعنی اس تنزیل مفرق کی طرح کہ جس میں انھوں نے قدح کی ہے، یعنی عیب نکالا ہے اور اس کے علاوہ کی فرمایش کی ہے، یعنی پورا قرآن ایک ہی دفعہ اترنے کی۔

ہم نے اس کو اتارا ﴿ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ ﴾ تاکہ ہم اس اتارنے کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کریں، کیوں کہ قرآن کو موقع کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنے کا یہ فائدہ ہے کہ تو اس کو یاد کر لے اور اس کے معانی کو خوب سمجھ لے۔ یہ بات دل کو مضبوط کرنے کے بڑے اسباب میں سے ہے۔ حرفِ لام "نَزَّلْنَاهُ" محذوف سے متعلق ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لام جواب ہے قسم محذوف کا۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٦)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٢٠۔ ٤٢١)

نے کہا ہے کہ یہ قول مرجوح ہے۔ عبداللہ نے "لِيُثْبِّتَ" بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے، اس کا فاعل اللہ سبحانہٗ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ تتمۂ کلام مشرکین سے ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تورات، انجیل اور زبور کی طرح۔ اس صورت میں ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ پر وقف ہوگا۔ پھر ﴿ لِنُثَبِّتَ ﴾ سے کلام کی ابتدا ہوگی۔ معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے تجھ پر قرآن کو اس غرض کے لیے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا۔ ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول نہایت احسن ہے۔ نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ قرآن کا منجم اتارنا نبوت کی نشانیوں میں سے تھا، کیونکہ جب بھی کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شے کا سوال کرتے تھے تو ان کو اس کا جواب ملتا تھا۔ اور یہ بات نبی سے ہی ہوتی ہے۔ اس قسم کا نازل کرنا نبی کے اور اس کے ساتھیوں کے دلوں کو مضبوط کرنے کے لیے ہوتا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: "لِنُشَدِّدَ بِهِ فُؤَادَكَ وَنَرْبِطَ عَلَى قَلْبِكَ"[2] یعنی تا کہ اس سے ہم تیرے دل کو مضبوط کریں۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا، تا کہ تو اس کو یاد رکھ سکے اور اس کو حفظ کر لے، کیونکہ پہلی کتابیں جو نبیوں پر نازل ہوئیں تو وہ لکھتے پڑھتے تھے اور قرآن شریف نبی اُمی پر نازل ہوا ہے کہ وہ نہ لکھتے ہیں نہ پڑھتے ہیں، اور اس لیے کہ قرآن میں سے ناسخ و منسوخ ہے اور بعض اس میں سے ان امور کے متعلق سوالوں کا جواب ہے، جو مختلف اوقات میں ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے اور منجم نازل کیا، تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو خوب یاد کریں اور جو کوئی اس پر عمل کرے، اس کے لیے زیادہ سہل اور آسان ہو۔

﴿ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴾ معطوف ہے مفعول مقدر پر "أَيْ: كَذٰلِكَ نَزَّلْنَاهُ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا" یعنی اسی طرح قرآن کو ہم نے اتارا اور اس کو ترتیل کیا، ایسی ترتیلِ بدیع کہ اس کی خوبی کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ "تَرْتِيل" کے معنی یہ ہیں کہ ایک آیت بعد ایک آیت کے ہو۔ یہ قول امام نخعی، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "بَيَّنَّاهُ تَبْيِينًا" یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے: "وَرَسَّلْنَاهُ تَرْسِيلًا يَقُولُ شَيْئًا بَعْدَ شَيْءٍ"۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بَعْضَهُ فِي أَثَرِ بَعْضٍ"۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيلًا"۔ امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا ہوں ترتیل کو مگر تحقیق اور تبیین۔[3] کسی نے کہا: ہم نے اس کو تجھ پر جبرائیل علیہ السلام کی زبان پر پڑھا ایک شے کے بعد ایک شے، بیس یا تیئیس برس میں آہستگی سے تا کہ اس کا سمجھنا اور حفظ کرنا آسان ہو۔

پھر اللہ پاک نے یہ بات ذکر کی کہ وہ ہر وقت میں محجوج ہیں، یعنی ان پر حجت قائم کی گئی ہے۔ ان کا قول ہر حالت پر اور ہر وجہ سے دفعہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴾

---

[1] فتح القدير (٤/ ٩٨۔ ٩٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٩٠)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٩٠۔ ٢٦٩١) فتح القدير (٤/ ٩٩)

یعنی اے نبی! نہیں لائیں گے مشرک لوگ تیرے پاس اپنی مثلوں سے کوئی مثل جو تیرے کام کے باطل کرنے میں سرکشی اور عناد کا درجہ رکھتی ہیں مگر ہم لائیں گے، تیرے پاس ان کی مثلوں کے جواب میں ایسی بات جو حق اور ثابت ہے اور وہ ان کی لائی ہوئی مثلوں کو باطل کر دے گا اور اس کا سر توڑ ڈالے گا اور اس کو دفع کر دے گا۔ مگر مثل سے اس جگہ مراد سوال اور فرمایش ہے اور حق سے مراد اس کا جواب ہے، کون سا جواب جو اس کے ذریعے کو کاٹ دے گا اور اس کے شبہے کو باطل کر ڈالے گا اور اس کے مادے کو کاٹ دے گا۔ استثناء مفرغ ہے عام حالات سے اور جملہ محلِ حال میں ہے: "أَيْ لَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ فِيْ حَالٍ مِنَ الْأَحْوَالِ إِلَّا فِيْ حَالِ إِيْتَائِنَا إِيَّاكَ ذٰلِكَ"

﴿ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے پاس خوب تر تفسیر و بیان و تفصیل اور وہ شے جو معنی و مقصود میں ان کی مثل سے بہت اچھی ہوگی۔ یعنی ان کے سوال سے۔ "من مثلهم" کو جو حذف کیا تو اس لیے کہ کلام میں اس پر دلیل موجود ہے۔ چنانچہ ﴿ اَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴾ کا عطف حق پر ہے۔ پھر اللہ پاک نے ان جاہلوں کو وعید سنائی اور ان کی مذمت کی، لہٰذا فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ﴾ یعنی وہ دوزخ کی طرف حشر کیے جائیں گے، اس حالت میں کہ اپنے منہ پر ہوں گے۔ موصول مبتدا ہے اور اس کی خبر ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ ہے، یا خبر ہے مبتدائے محذوف کی: "أَيْ: هُمُ الَّذِيْنَ"۔ نصب اس کا ذم کی بنا پر بھی جائز ہے۔ منہ پر حشر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ کھینچے جائیں گے منہ کے بل اور زمین کو روندیں گے اپنے سروں پر، باوجود ان کے قدموں کے بلند ہونے کے، اللہ پاک کی قدرت سے اور کھینچے جائیں گے سروں پر۔

﴿ شَرٌّ مَّكَانًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کا مسکن و منزل و مصیر بہت برا ہے، یعنی جہنم۔ ﴿ وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ دوسروں کی نسبت راہ سے زیادہ بھٹکنے والے ہیں، یعنی ان کی راہ بڑی گمراہی کی ہے، وہ راہ یہی ان کا کفر ہے، کیوں کہ وہ اسی کفر کے سبب سے نار میں پہنچے ہیں۔ یہ قول اسنادِ مجازی کے باب سے ہے، اس قسم کی آیت کی تفسیر سورت سبحان میں گزر چکی ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾ متصل ہے: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾ سے۔ غرضیکہ جب اللہ پاک مشرکین کے شبہے کے جواب سے فارغ ہو چکا تو کچھ قصے پہلے لوگوں کے ذکر کیے، تاکہ نبی اکرم ﷺ کی تسلی و تشفی ہو کہ یہ مشرکین کی عادت ہے کہ اپنے انبیاء کی تکذیب کیا کرتے ہیں۔ یہ کچھ خاص نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ایک پرانی بات ہے۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

[1] فتح البیان (۹/ ۳۰۵۔ ۳۰۸)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ
وَزِيْرًا ۚ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ
فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ
وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا
وَّثَمُوْدَا۠ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَكُلًّا
ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ
الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا
لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو مددگار بنایا(35) پھر ہم نے کہا: تم دونوں اس قوم کی طرف جاؤ جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ پھر ہم نے انھیں بالکل ہی ہلاک کر کے رکھ دیا(36) اور قومِ نوح کو بھی، جب اس نے رسولوں کی تکذیب کی، ہم نے انھیں غرق کر دیا۔ اور ہم نے انھیں لوگوں کے لیے نشانِ (عبرت) بنا دیا، اور ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے(37) اور قومِ عاد اور ثمود اور کنویں والے اور ان کے درمیان (دیگر) بہت سی قوموں کو بھی (ہم نے ہلاک کر دیا)(38) اور ہر ایک کے لیے ہم نے مثالیں بیان کیں، اور سب کو بالکل تباہ و برباد کر دیا(39) اور بلاشبہ یہ لوگ اس (قوم کی) بستی پر سے تو گزرتے ہیں جس پر بدترین بارش برسائی گئی، کیا پھر وہ اسے دیکھتے نہیں رہے؟ بلکہ وہ دوبارہ (جی) اُٹھنے کی اُمید ہی نہیں رکھتے تھے(40)

مشرکوں کے لیے وعید اور دردناک عذاب سے ڈرانے کا بیان:

کنویں والے ایک امت کو کہتے ہیں، جنھوں نے اپنے رسول کو کنویں میں پھینکا، پھر ان پر عذاب آیا، تب وہ رسول خلاص ہوا۔ انتھی[1]۔

آپ کی قوم کے مشرکوں میں سے جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی اور آپ کی مخالفت کی تو اللہ پاک ان کو وعید سناتا ہے اور ان کو اپنے سخت اور دردناک عذاب سے ڈراتا ہے، وہ عذاب جو اس نے ان پہلی اُمتوں پر نازل کیا، جنھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے شروع کیا۔ اللہ پاک نے ان کو مبعوث

فرمایا اور اُن کے ساتھ ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو وزیر بنا دیا، یعنی آپ کا تائید کرنے والا، ناصر اور مددگار بنایا۔ فرعون اور اس کے لشکروں نے ان دونوں کی تکذیب کی تو اللہ پاک نے ان کو ہلاک کیا۔ ﴿ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴾ ''اور کافروں کے لیے اسی طرح کی سزائیں ہیں۔'' [محمد: ۱۰]

اسی طرح نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ کیا، جب انھوں نے اللہ کے رسول نوح علیہ السلام کو جھٹلایا اور جس نے ایک رسول کی تکذیب کی، اس نے سارے رسولوں کی تکذیب کی، کیوں کہ ایک رسول اور دوسرے رسول کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف ہر رسول کو بھیجتا تو بے شک وہ ان سب کی تکذیب کرتے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ ﴾ حالاں کہ ان کی طرف تو صرف نوح علیہ السلام ہی مبعوث ہوئے تھے اور وہ اُن میں ساڑھے نوسو برس رہے، ان کو اللہ عزوجل کی طرف بلاتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور سزا سے ڈراتے رہے۔ پھر ان پر ایمان نہ لائے مگر تھوڑے۔

اسی لیے اللہ پاک نے ان سب کو ڈبو دیا اور روئے زمین پر بنی آدم میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا سوائے کشتی والوں کے فقط۔ ﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ﴾ یعنی ہم نے ان کو لوگوں کے لیے عبرت بنایا۔ جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ۱۱۔ ۱۲] ''بے شک جب پانی میں طغیانی آئی تو ہم نے تمھیں بہتی ناؤ میں سوار کیا۔ تاکہ ہم تمھارے لیے اس (فعل) کو نصیحت بنا دیں اور (تاکہ) یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔'' یعنی ہم نے تمھارے واسطے کشتیوں سے وہ شے باقی رکھی کہ تم اس پر بڑے گہرے پانی میں سوار ہوتے ہو، تاکہ تم یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر کی، یعنی تمھیں غرق ہونے سے نجات دینا اور تمھاری اولاد میں سے ایسے لوگ پیدا کرنا جو نوح علیہ السلام پر ایمان لائے اور ان کی رسالت کی تصدیق کی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴾ ان کے قصوں پر کئی سورتوں میں کلام گزر چکا ہے، جیسے سورت اعراف۔ اب ان کے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رہے اصحابِ رس تو ابن جریج رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ لوگ دیہاتِ ثمود میں سے ایک گاؤں والے ہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصحاب رس فلج میں تھے، یہ لوگ اصحابِ یٰسین ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فلج دیہات یمامہ سے ہے۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اصحابِ رس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ آذربائیجان میں ایک کنواں ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے عن ابی بکر عن عکرمہ روایت کیا ہے کہ رس ایک کنواں ہے، جس میں انھوں نے اپنے نبی کو ٹھونس دیا تھا، یعنی اس میں دفن کر دیا تھا۔[2] امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے

[1] تفسیر الطبري (۱۹/ ۲۶۹۔ ۲۷۰)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۶۹۵)

روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ لوگوں میں سے جنت میں جو سب سے پہلے قیامت کے دن داخل ہوگا، وہ سیاہ فام غلام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک گاؤں والوں کی طرف ایک نبی بھیجا۔ اس گاؤں کے لوگوں میں سے صرف وہی غلام اس پر ایمان لایا۔ پھر گاؤں والوں نے اس نبی پر ظلم کیا، اس کے لیے ایک کنواں کھودا، پھر اس کو اس میں ڈال دیا، پھر ایک سخت پتھر اس پر رکھ کر اس کا منہ ڈھانک دیا۔ فرمایا: وہ غلام جاتا تو اپنی پیٹھ پر لکڑیاں رکھتا، پھر ان کو لا کر بیچتا اور اس سے کھانے پینے کا سامان خریدتا، پھر اس کو اس کنویں کی طرف لاتا، پھر اس پتھر کو اُٹھاتا، اللہ تعالیٰ اس کے اٹھانے پر اس کی اعانت فرماتا، پھر کھانا پینا اس نبی کی طرف لٹکا دیتا، پھر اس پتھر کو ویسے ہی رکھ دیتا جیسا تھا۔

فرمایا: یہ حال اتنی مدت تک رہا، جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ہو۔ پھر وہ غلام چلا کہ لکڑیاں لائے، جیسا کہ وہ کیا کرتا تھا تو اس نے اپنی لکڑیاں جمع کیں اور اُن کو باندھا اور اس سے فارغ ہوا، پھر جب اس نے ان کو اٹھانے کا ارادہ کیا تو اس کو اونگھ آ گئی، چنانچہ وہ لیٹ رہا تو سو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو کان پر تھپک دیا، وہ سات برس تک اسی طرح سویا رہا، پھر وہ جاگا تو اس نے انگڑائی لی، پھر اس نے دوسری کروٹ بدلی، پھر اور سات برس کے لیے اللہ نے اس کے کان پر تھپک دیا، پھر وہ جاگا اور اس نے اپنا بوجھ اٹھایا اور اس نے سوچا کہ وہ دن کی ایک گھڑی بھر سویا ہے، پھر وہ گاؤں کی طرف آیا تو اس نے وہ لکڑیوں کا بھار بیچا، پھر اس نے کھانے پینے کا سامان خریدا، جیسا کہ اس کا معمول تھا، پھر وہ اس گڑھے کی جگہ پر گیا، جس میں وہ تھا، پھر اس کو ڈھونڈا تو نہ پایا۔

"وَكَانَ قَدْ بَدَأَ لِقَوْمِهِ فِيهِ بَدَاءً" ("بداء" بہ معنی استصوابِ شے ہے، یعنی کسی شے کو نہ جاننے کے بعد اس کو درست جاننا، مطلب یہ ہے کہ پہلے تو قوم نے نبی کو نہ مانا، پھر اس کے حق میں ان کو یہ بات ظاہر ہوئی کہ مان لیں، پس اس پر ایمان لے آئے)۔ انھوں نے اس نبی کو نکال لیا اور اس پر ایمان لے آئے اور اس کی تصدیق کی۔ کہا: ان کے نبی ان سے اس کالے آدمی کے بارے میں پوچھا کرتے تھے، وہ کہتے کہ ہم نہیں جانتے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس نبی کو قبض کیا، یعنی وفات دی اور وہ کالا آدمی اپنی نیند سے بیدار ہوا اس کے بعد۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک وہ کالا آدمی جنت میں داخل ہونے والوں میں سے سب سے پہلا شخص ہے۔[1] (هكذا رواه ابن جرير عن ابن حميد عن سلمة عن محمد بن إسحاق عن محمد بن كعب مرسلا وفيه غرابة و نكارة ولعل فيه إدراجاً۔ والله أعلم)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگ اس پر محمول کیے جائیں کہ وہ اصحابِ رس ہیں، جن کا قرآن میں ذکر ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے تو ان کے متعلق خبر دی ہے کہ اس نے ان کو ہلاک کر دیا اور اس روایت کے مطابق یہ لوگ اپنے نبی ﷺ پر ایمان لائے۔ ہاں اگر یہ ہو کہ نئے لوگ پیدا ہوئے ہوں، جو اپنے آباء کے ہلاک ہونے کے بعد اس نبی پر ایمان لائے ہوں تو پھر اور بات ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ قول ہے کہ اصحابِ رس

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٧٠۔ ٢٧١) یہ روایت مرسل ہے۔

سے مراد اصحاب الاخدود ہیں، جن کا ذکر سورۃ البروج میں ہے۔[1] فاللہ أعلم.

﴿ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴾ ''أَيْ: وَأُمَمًا بَيْنَ أَضْعَافِ ذَلِكَ أَهْلَكْنَاهُمْ كَثِيْرًا'' یعنی اس کے درمیان میں ہم نے بہت سی اُمتوں کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ اسی لیے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ﴾ یعنی ہم نے ان کے لیے حجتیں بیان کیں اور دلیلیں ظاہر و واضح کیں جیسا کہ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اور دور کر دیے ہم نے ان سے عذر۔ ﴿ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴾ یعنی ہر ایک کو ہم نے ہلاک کر دیا، بالکل ہلاک کرنا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ﴾ [بني إسرائيل: ١٧] ''اور ہم نے نوح کے بعد کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں۔'' ''اَلْقَرْنُ هُوَ الْأُمَّةُ مِنَ النَّاسِ'' یعنی لوگوں کے گروہ کو قرن کہتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴾ [المومنون: ٤٢] ''پھر ہم نے ان کے بعد دوسری اُمتیں پیدا کیں۔'' بعض نے قرن کی حد ایک سو بیس برس کہی ہے۔ کسی نے سو برس۔ کسی نے اسی (٨٠) برس۔ کسی نے چالیس برس۔ اس کے سوا اور بھی قول ہیں۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ قرن وہ گروہ ہے جو ہم عصر، یعنی ایک ہی زمانے میں ہو اور جب وہ چل دیے اور اُن کے بعد اَور گروہ آیا تو وہ دوسرا قرن ہے، جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہوا ہے۔ ((خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ))[2] الحديث.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ﴾ یعنی قومِ لوط علیہ السلام کا گاؤں وہ سدوم ہے، جس کو اللہ پاک نے دو طرح سے ہلاک کیا: ایک تو اس کو اُلٹا کر دیا، دوسرے سجیل کے پتھروں کا اس پر برساؤ کیا۔ (سِجِّيْلٌ مُشَدَّدُ الْجِيْمِ. سنگ گل وَقَالُوْا هِيَ حِجَارَةٌ مِنْ طِيْنٍ طُبِخَتْ بِنَارِ جَهَنَّمَ مَكْتُوْبٌ فِيْهَا أَسْمَاءُ الْقَوْمِ لِقَوْلِهِ تَعَالىٰ: ﴿ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴾ [الذاريات: ٣٣] كذا في الصراح)۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴾ [النمل: ٥٨] ''اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) سخت بارش برسائی، تو ڈرائے گئے لوگوں پر (پتھروں کی) بدترین بارش برسائی گئی تھی۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَبِالَّيْلِ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ [الصافات: ١٣٧۔ ١٣٨] ''اور بلاشبہ تم صبح کو ان (کی تباہ شدہ بستیوں) پر سے گزرتے ہو۔ اور رات کو بھی، کیا پھر تم عقل نہیں رکھتے؟'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴾ [الحجر: ٧٦] ''اور بے شک وہ بستی سیدھی راہ پر موجود ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الحجر: ٧٩] ''اور بے شک وہ دونوں (تباہ شدہ بستیاں) کھلی شاہراہ پر ہیں۔'' اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ﴾ یعنی کیا پھر نہیں دیکھا، اس عذاب کو جو ان لوگوں پر نازل ہوا

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٧١) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٢٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٥)

اس سبب سے کہ رسول کی تکذیب کی اور اوامرِ الٰہی کی مخالفت کی کہ اس سے عبرت حاصل کریں۔ ﴿ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴾ یعنی بلکہ اس پر سے گزرنے والے یہ کفار عبرت نہیں لیتے ہیں، اس لیے کہ روزِ قیامت میں معاد کی اُمید نہیں رکھتے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ وَلَقَدْ ﴾ میں حرفِ لام قسم کا جواب ہے: ”أَيْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ آتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ“ مراد تورات ہے، یعنی اللہ کی قسم! ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی، جس طرح کہ تجھ کو قرآن دیا۔ ﴿ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴾ ہارون عطفِ بیان ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ قطع کی بنا پر منصوب ہو اور ﴿ وَزِيْرًا ﴾ مفعول ثانی ہے۔ کسی نے کہا: حال ہے اور مفعول ثانی ﴿ مَعَهٗ ﴾ ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس کے بھائی ہارون علیہ السلام کو وزیر یعنی مددگار و ساتھی کیا دعوت میں اور اللہ کا بول بالا کرنے میں۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔[2] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغت میں ”وزیر“ وہ شخص ہے جس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور اس کی رائے پر عمل کیا جاتا ہے۔ وزر وہ شے ہے جس کے ساتھ چنگل مارا جاتا ہے، اسی باب سے ﴿ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴾[3] ”ہرگز نہیں! (وہاں) کوئی پناہ گاہ نہیں۔“ [القيامة: ١١]

”وزیر“ کی تفسیر سورت طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔[4] وزارت نبوت کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ ایک زمانے میں کئی نبی مبعوث ہوا کرتے تھے اور ان کو حکم ہوتا تھا کہ بعض بعض کی مدد کریں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دو آدمی کسی کام میں شریک ہوں تو وہ دونوں اس کام پر ایک دوسرے کے متوازی و مددگار ہیں۔ چنانچہ یہ ایک دوسرے کی مدد کرنا، اس کام میں شریک ہونے کے مخالف نہیں ہے۔ یا یہ کہ ہارون علیہ السلام شروع میں موسیٰ علیہ السلام کے وزیر تھے، پھر نبی ہوئے۔ چنانچہ دونوں کے نبوت میں مشترک ہونے کے سبب سے اس طرح کہا گیا: ﴿ اِذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ﴾ اس قوم سے مراد فرعون اور اس کی قوم قبط ہے۔ آیات سے مراد وہی نو نشانیاں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ انھوں نے یہ آیتوں کی تکذیب اس وقت نہیں کی کہ جس وقت اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو جانے کا حکم دیا، بلکہ تکذیب اس کے بعد واقع ہوئی۔ چنانچہ یہ ماضی بہ معنی مستقبل ہے، جس طرح کہ خبر دینے میں اللہ سبحانہٗ کی عادتِ کریمہ ہے، معنی یہ ہیں کہ تم اس قوم کی طرف جاؤ، جو عن قریب ہماری آیتوں کی تکذیب کریں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی جو صفت تکذیب بتائی گئی ہے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی حکایت بیان کرنے اور ان کے عذاب کا مستحق ہونے کی وجہ بیان کرنے کی غرض سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بھی مراد ہو سکتی

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٢١۔ ٤٢٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٩٣) [3] معاني القرآن (٤/ ٦٧) [4] رقم الآية (٢٩)

ہے کہ تم اس قوم کی طرف جاؤ کہ جس کا حال یہ ہے کہ وہ تکذیب کرنے کی طرف رجوع ہوئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بھیجتے وقت اس قوم کا وصف تکذیب کے ساتھ کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کرنے والے تھے، آیاتِ رسالت کی نہیں۔

قشیری نے کہا ہے کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴾ [النازعات: ١٧] ''(کہ) فرعون کی طرف جاؤ، بے شک اس نے سرکشی کی ہے۔'' یہ قول اس کے منافی نہیں ہے، یعنی اس میں ایک کو خطاب کیا ہے اور یہاں دو کو اس لیے کہ جب وہ دونوں مامور ہیں تو ہر ایک مامور ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہیں کہ بعض جگہ پر خاص طور پر موسیٰ علیہ السلام کو خطاب اس لیے ہے کہ رسالت میں وہ اصل ہیں اور خطاب میں دونوں کو اکٹھے اس لیے رکھا کہ وہ دونوں ساتھ بھیجے گئے ہیں۔

﴿ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴾ میں عبارت محذوف ہے، یعنی پھر دونوں ان کی طرف گئے تو انھوں نے ان کی تکذیب کی۔ چنانچہ اس تکذیب کے بعد ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، بڑا ہلاک کرنا۔ لہٰذا قصے کے دو جانب پر اقتصار کیا، کیوں کہ یہاں اسی پر کفایت کرنا منظور ہے جو قصے سے مقصود ہے وہ یہی رسول بھیج کر حجت قائم کرنا اور اُن کی تکذیب کرنے کی وجہ سے ان کو ہلاک کرنے کا استحقاق ثابت کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ ''تدمیر'' سے مراد اس کا حکم کرنا ہے، کیوں کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے بھیجنے کے فوراً بعد میں وہ ہلاک نہیں ہوئے، بلکہ ایک مدت کے بعد ہلاک ہوئے ہیں۔

﴿ وَقَوْمَ نُوْحٍ ﴾ کے نصب میں کئی قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ﴿ دَمَّرْنٰهُمْ ﴾ کی ''ہا'' و ''میم'' پر معطوف ہے۔ یا منصوب بہ فعلِ محذوف ہے، یعنی ''اُذْكُرْ''۔ یا بہ فعلِ مضمر جس کی تفسیر ﴿ اَغْرَقْنٰهُمْ ﴾ کر رہا ہے، یعنی ''أَغْرَقْنَا قَوْمَ نُوحٍ أَغْرَقْنَاهُمْ''۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منصوب ہے ﴿ اَغْرَقْنٰهُمْ ﴾ مذکور سے بغیر تقدیر مضمر کے جس کی تفسیر ما بعد کرتا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس قول کو یوں رد کیا ہے کہ ''أَغْرَقْنَا'' دو مفعول کی طرف متعدی نہیں ہوتا ہے، تا آنکہ اپنی ضمیر متصل میں عمل کرے اور قومِ نوح میں عامل ہو۔[1]

﴿ لَمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ ﴾ میں ''رسل'' سے مراد خود نوح علیہ السلام ہیں، ان کو جمع کے پیرایہ میں اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان کا ٹھہرنا ان میں طول طویل ہوا ہے تو فی المعنی گویا وہ خود کئی رسول ہیں۔ یا یہ معنی کہ نوح علیہ السلام کی تکذیب کی اور اُن سے پہلے جو اللہ کے رسول ہوئے ان کی تکذیب کی، اس لیے کہ توحید کے لانے میں وہ سب شریک ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے ایک نبی کی تکذیب کی تو گویا اس نے سارے نبیوں کی تکذیب کی۔[2] اس قول کے معنی پہلے گزر چکے ہیں۔ طوفان سے ان کے ڈبونے کا قصہ سورت ھود میں گزر چکا ہے۔[3]

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے غرق کرنے کو یا ان کے قصے کو ان کے بعد

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣١) [2] معاني القرآن (٤/ ٦٧۔ ٦٨) [3] رقم الآية (٢٥)

والے لوگوں کے لیے عبرت ٹھہرایا ہے کہ ہر مشاہدہ کرنے والا اس کا اور اس کی خبر کا ہر سننے والا اس سے نصیحت پذیر ہو۔ ﴿ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ ظالمین سے مراد کافرین ہیں، یعنی خاص قوم نوح علیہ السلام کے۔ اس بنا پر اسم ظاہری موضع ضمیر میں رکھنا اس لیے ہوگا کہ منظور ان پر وصفِ ظلم کا حکم لگانا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر وہ شخص مراد ہو جو تکذیب میں ان کی راہ چلے۔ عذابِ الیم سے مراد عذابِ آخرت ہے، سوائے اس عذابِ عاجل کے جو دنیا میں ان پر نازل ہوا۔ ﴿ وَّعَادًا ﴾ کا عطف قومِ نوح پر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "الظالمین" کے محل پر۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ جَعَلْنٰهُمْ ﴾ کے مفعول پر۔ ﴿ وَّثَمُوْدَ ﴾ معطوف ہے ﴿ عَادًا ﴾ پر۔ "ثمود" حی کے معنی کی بنا پر منصرف ہے اور غیر منصرف ہے "قبیلة" کی تاویل کی بنیاد پر، یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ عاد وثمود کا قصہ پہلے گزر چکا ہے۔

﴿ وَّاَصْحٰبَ الرَّسِّ ﴾ کلامِ عرب میں رس وہ کنواں ہے جو غیر مطوی ہو، یعنی پتھروں سے نہ بنایا گیا ہو، اس کی جمع رساس ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے مثلاً صاحبِ قاموس نے یہ قید لگائی ہے کہ مطوی ہو، یعنی پتھروں سے بنایا گیا ہو۔ ان دونوں نقلوں کو جمع کرنے سے یہ بات ماخوذ ہوتی ہے کہ رس کا اطلاق مطلق کنویں پر ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے: "اَلرَّسُّ: إِبْتِدَاءُ الشَّيْءِ، وَمِنْهُ رَسُّ الْحُمَّى وَرَسِيْسُهَا، وَالْبِئْرُ الْمَطْوِيَّةُ بِالْحِجَارَةِ، انتهى"[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رس انطاکیہ میں کنواں ہے، ان لوگوں نے حبیب نجار کو اس میں قتل کیا تو وہ اس کی طرف منسوب ہوئے۔ حبیب نجار یٰسین والے ہیں، جنھوں نے یہ کہا تھا: ﴿ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [يٰسٓ: ٢٠] "اے میری قوم! تم رسولوں کی پیروی کرو۔" اسی طرح امام مقاتل اور عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہما نے کہا ہے۔[2]

کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک قوم تھی آذربائیجان میں۔ انھوں نے اپنے انبیاء کو قتل کیا تھا تو اُن کے درخت اور کھیتیاں سوکھ گئی تھیں، پھر وہ بھوک اور پیاس کے مارے مر گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ لوگ درختوں کی پوجا کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ بتوں کی پوجا کرتے تھے تو اللہ پاک نے شعیب علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا، ان کی تکذیب کی اور ان کو ایذا دی۔ کسی نے کہا ہے کہ رس ایک کنواں ہے۔ یمامہ میں۔ فلج بہ فتحِ فاء و لام و جیم یمن کے قریب ایک بڑا گاؤں ہے اور یمن میں عاد کے مساکن میں سے ایک جگہ ہے اور سکونِ لام کے ساتھ فلج بصرہ کے قریب ایک وادی ہے۔ (قاله ابن الأثير)[3] کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک قوم ہے کہ اللہ پاک نے ان کی طرف ایک نبی بھیجا تو وہ اس کو کھا گئی۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ لوگ اصحابِ اُخدود ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ رس وہی "بِئْرٍ مُعَطَّلَةٍ" ہے، جس کا ذکر گزر چکا ہے اور اصحابِ رس اس کے لوگ ہیں۔

صحاح میں ہے کہ رس ایک کنویں کا نام ہے جو بقیہ ثمود کا تھا۔[4] کسی نے کہا ہے کہ رس بنی اسد کا ماء ونخل،

[1] القاموس المحيط (١/ ٧٠٧)
[2] فتح القدير (٤/ ١٠٢)
[3] النهاية في غريب الأثر (٣/ ٩١٢)
[4] الصحاح للجوهري (٤/ ٧٢)

یعنی پانی اور کھجوروں کے درخت ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ رس برف ہے، جو پہاڑوں میں جمع ہو جاتا ہے اور رس ایک وادی کا نام ہے۔ نیز رس لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے کو اور اُن کے درمیان فساد ڈالنے کو کہتے ہیں۔ یہ ان الفاظ میں سے ہے، جن کے متضاد معنی ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مشرق میں ایک نہر کا نام رس ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک قوم ہے جو بتوں کی پوجا کرتی تھی، اللہ تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا تو انھوں نے ان کی تکذیب کی، وہ اس وقت رس کے گرد تھے۔ رس ایک غیر مطوی (کھلا ہوا) کنواں ہے۔ وہ ڈھے پڑا تو وہ اور ان کے گھر سب دھنسا دیے گئے۔[1] انتھیٰ۔

کسی نے کہا ہے کہ یہ لوگ اصحابِ حنظلہ بن صفوان ہیں، انھیں کو اللہ تعالیٰ نے اس پرندے سے آزمایا تھا جو عنقائے مغرب کے نام سے مشہور ہے (اس پرندے میں ہر قسم کا رنگ تھا۔ اس کی لمبی گردن ہونے کی وجہ سے اس کا نام عنقا رکھا ہے، وہ ان کے پہاڑ میں رہا بسا کرتا تھا، پہاڑ کا نام فتخ یا دمخ تھا، ان کے بچوں پر ٹوٹ پڑتا تھا، پھر ان کو جھپٹ لے جاتا، جبکہ اس کو شکار کی حاجت ہوتی، اسی لیے اس کا نام مغرب ہوا، وہ یہی امرِ غریب بچوں کا لے جانا ہے۔ کہا ہے کہ ایک دلہن کو اُچک لے گیا تھا۔ یا اس کے غروب وغیبت کی وجہ سے مغرب کہتے ہیں، مغرب بہ ضمِ میم و فتحِ میم دونوں طرح ہے۔ غرض حنظلہ نے اس پر بد دعا کی تو اس پر بجلی پڑی، پھر انھوں نے حنظلہ کو قتل کیا تو ہلاک کر دیے گئے)۔ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے ایک طویل مرفوع خبر اس کے بارے میں وارد ہوئی ہے، چنانچہ وہ پہلے گزر چکی ہے۔[2] فتح القدیر و فتح البیان میں کہا ہے کہ وہ حدیث مرسل یہی ہے۔[3]

﴿ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴾ معطوف ہے ما قبل پر۔ قرون جمع ہے قرن کی۔ مراد اہلِ قرون ہیں۔ قرن میں بہت سے اقوال ہیں، چناں چہ پہلے ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کی طرف دو قول منسوب ہیں: ایک سو برس کا، دوسرا ستر برس کا۔ زرارہ بن اوفیٰ کا قول ایک سو بیس برس کا ہے۔[4] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی قول مرفوعاً مروی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ قرن سو برس کا ہے۔[5] دوسرا پچاس برس کا۔ تیسرا چالیس برس کا۔[6] فتح القدیر و فتح البیان میں کہا ہے، میں نہیں گمان کرتا کہ ان میں سے کوئی شے صحیح ہو۔ لوگوں کی جماعت کا نام قرن رکھا گیا ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے: «خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ»[7] حاکم نے کنی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت معد بن عدنان تک پہنچتے تو رک جاتے، پھر فرماتے: "كَذَبَ النَّسَّابُوْنَ" اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴾[8]

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٢١٨)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] فتح القدير (٤/ ١٠٤۔ ١٠٥) فتح البيان (٩/ ٣٠١)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٩٦)
[5] مستدرك الحاكم (٢/ ٥٩٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٦٠)
[6] الدر المنثور (٦/ ٢٥٩)
[7] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[8] الدر المنثور (٦/ ٢٥٩) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١١)

﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ان اُمتوں کی طرف ہے جن کا ذکر گزر چکا ہے، یعنی عاد اور اصحاب رس کے درمیان یہ لوگ جماعتیں ہیں، اسی لیے اس پر کلمۂ ﴿ بَيْنَ ﴾ کا استعمال بہت اچھا ہوا ہے۔ کبھی ذکر کرنے والا مختلف اشیاء کا ذکر کرتا ہے۔ پھر ان کی طرف ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ کرتا ہے اور حساب کرنے والا بہت سے عددوں کا شمار کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے: "فَذٰلِكَ كَيْتَ وَكَيْتَ" یعنی وہ محسوب و معدود اتنے ہیں۔

﴿ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں اور ڈرایا ہم نے ہر ایک کو، ان کے واسطے ہم نے امثال کو بیان کیا۔[1] اور ہم نے ان کے واسطے حجت بیان کی اور نہیں بیان کیں ہم نے ان کے لیے باطل مثالیں جس طرح کہ یہ کافر لوگ بیان کرتے ہیں۔ اس معنی کی بنا اس پر ہے کہ ﴿ كُلًّا ﴾ کو فعل مضمر سے منصوب ٹھہرایا ہے، جس کی تفسیر اس کا ما بعد کر رہا ہے، اس لیے کہ "حَذَّرْنَا وَذَكَّرْنَا وَأَنْذَرْنَا"، "ضَرَبْنَا" کے معنی میں ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما قبل پر معطوف ہو۔ تنوین عوض ہے مضاف الیہ محذوف سے، یعنی "الْأُمَمَ"۔ معنی یہ ہیں کہ کل اُمتیں جن کے لیے ہم نے پہلے لوگوں کے عجیب قصے بیان کیے، جو عجیب و غریب مثالوں کے مشابہ ہیں اور ان کے لیے ہم نے حجت بیان کی۔ پس ہم نے ان کو ہلاک نہیں کیا، مگر انذار یعنی ڈرانے کے بعد، یعنی پہلے ان کو ڈرایا دھمکایا، جب باز نہ آئے تب ہلاک کر ڈالا۔

﴿ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴾ ﴿ كُلًّا ﴾ منصوب ہے اس فعل سے جو اس کے بعد ہے۔ "تتبیر" عذاب سے ہلاک کرنے کو کہتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے جس کو تو توڑے اور اس کے ریزے ریزے کرے تو بے شک تو نے اس کی "تتبیر" کی۔[2] مورج اور اخفش رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی "دَمَّرْنَا تَدْمِيْرًا" ہیں "تا" اور "با" کو "دال" اور "م" سے بدل لیا ہے۔[3] ﴿ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ ﴾ جملۂ مستأنفہ ہے۔ اس بات کو بیان کرتا ہے کہ انھوں نے بعض اُمتوں کی ہلاکت کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہاں ﴿ اَتَوْا ﴾ میں "مَرُّوْا" کے معنی شامل ہیں، اس لیے کہ اس کے صلہ میں "عَلٰى" آیا ہے، ورنہ "أتیٰ" خود متعدی استعمال ہوتا ہے یا "إلیٰ" کے ساتھ۔ معنی یہ ہیں کہ مشرکینِ مکہ نے جو شام کی طرف سفر کیے ہیں، ان میں قومِ لوط کی بستی پر گزر کیا ہے، یہ بستی سدوم تھی، یہ گاؤں ان کی قوم کے دیہات میں زیادہ بڑا تھا۔ تمام دیہات پانچ تھے، اللہ پاک نے چار گاؤں کو ان کے لوگوں کے ساتھ ہلاک کر ڈالا۔ ایک باقی بچ گیا، یہ ان میں چھوٹا گاؤں تھا، یہاں کے لوگ خبائث نہیں کرتے تھے۔

پھر اس بستی کی یہ صفت بیان کی: ﴿ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ﴾ امطار کے معنی ہیں رمی۔ مطر سے مراد پتھر ہیں۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[4] مطر کا نصب مصدریت کی بنا پر ہے، یا مفعول ثانی کی بنا پر، کیوں کہ معنی یہ ہیں: "أَعْطَيْتُهَا وَأَوْلَيْتُهَا مَطَرَ السَّوْءِ"۔ یا اس بنا پر کہ مصدر محذوف کی صفت ہے: "أَيْ: إِمْطَارًا مِثْلَ مَطَرِ السَّوْءِ"،

---

[1] معاني القرآن (٤/ ٦٨) [2] معاني القرآن (٤/ ٦٨) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٤) [4] الدر المنثور (٦/ ٢٦٠)

امام ابو السمال رحمہ اللہ نے ''اَلسُّوْءِ'' ﴿ضم سین پڑھا ہے۔ ''سوء'' کی تفسیر سورت براءت میں گزر چکی ہے،[1] معنی یہ ہیں: ایسا قریہ کہ پتھروں سے ہلاک ہوا، جن کے ساتھ وہ مارا گیا اور رمی کیا گیا۔

﴿ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ﴾ میں استفہام ڈرانے اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے ہے۔ یعنی قریہ مذکور کو دیکھتے ہیں، جب وہ شام کی طرف تجارت کی غرض سے سفر کرتے ہیں تو اس پر سے گزرتے ہیں۔ حرفِ فا عطف کے لیے ہے مقدر پر۔ ''أَيْ: أَلَمْ يَكُوْنُوْا يَنْظُرُوْنَ إِلَيْهَا فَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا'' غرض یہ ہے کہ اس پر بار باران کا گزر ہوتا ہے تو اس کے آثار دیکھتے ہیں اور جو اس کے لوگوں پر عذاب نازل ہوا ہے، اس کے آثار پاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ سوالیہ انداز تقریر کا ہے۔ تقریر اس کو کہتے ہیں کہ مخاطب کو مستعد و آمادہ کریں، اس شے کے اقرار پر جس کو وہ جانتا ہے۔ یہاں وہ شے نفی کے بعد ہے۔ منظور یہ ہے کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ انھوں نے اس کو دیکھا ہے، تاکہ اس سے عبرت پکڑیں۔ تفسیر ابی السعود میں ہے کہ حرفِ ''فا'' واسطے عطف مدخول ہمزۂ استفہام تقریر کے ہے مقدر پر، جس کا مقام مقتضی ہے۔

''أَيْ: أَلَمْ يَكُوْنُوْا يَنْظُرُوْنَ إِلَيْهَا فَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا، أَوْ كَانُوْا يَنْظُرُوْنَ إِلَيْهَا فَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا فِيْ مِرَارِ مُرُوْرِهِمْ لِيَتَّعِظُوْا بِمَا كَانُوْا يُشَاهِدُوْنَهُ مِنْ آثَارِ الْعَذَابِ فَالْمُنْكَرُ فِي الْأَوَّلِ تَرْكُ النَّظَرِ وَعَدَمُ الرُّؤْيَةِ مَعًا وَالْمُنْكَرُ فِي الثَّانِيْ عَدَمُ الرُّؤْيَةِ مَعَ تَحَقُّقِ النَّظَرِ الْمُوْجِبِ لَهَا''[2] انتھیٰ۔

یعنی کیا نظر نہیں کی اس کی طرف، سو نہ دیکھا اس کو، یا یہ معنی ہیں: کیا نظر کی اس کی طرف، پھر اس کو نہ دیکھا، اپنے بار بار گزرنے پر بھی، تاکہ ان آثارِ عذاب سے، جن کا مشاہدہ کرتے تھے، نصیحت حاصل کرتے۔ پس پہلے معنی میں جس شے کا انکار کیا گیا ہے، وہ ترکِ نظر و عدمِ رؤیت معاً ہے، اور دوسرے معنی میں عدمِ رویت تحققِ نظر کے ساتھ ہے جو رؤیت کی موجب ہے۔ حاصل یہ ہے کہ انھوں نے ان آثار کو عبرت کا دیکھنا نہ دیکھا۔ پھر اللہ پاک نے ان کے نہ دیکھنے سے اضراب و اعراض کر کے فرمایا: ﴿ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴾ یعنی بلکہ یہ لوگ بعث کی اُمید نہیں رکھتے، جس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ جزا کی اُمید نہیں رکھتے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ يَرْجُوْنَ ﴾ کے معنی ﴿ يَخَافُوْنَ ﴾ ہوں۔[3] یعنی وہ بعث سے نہیں ڈرتے، غرضیکہ جب یہ لوگ نہ بعث کی اُمید رکھتے ہیں نہ اس کا خوف تو آثارِ گذشتہ سے کیا خاک عبرت حاصل کریں گے؟! عبرت تو وہ شخص لیتا ہے جو بعث کو مانتا ہے اس کا خوف و امید رکھتا ہے۔

[1] فتح القدير (٤/ ١٠٣) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٢١٩) [3] فتح البيان (٩/ ٣٠٨_ ٣١٢)

وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ
اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝٤١ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا
عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ
اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝٤٢ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ
عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝٤٣ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ
اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝٤٤

اور (اے نبی!) جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کو ہنسی مذاق کا نشانہ بناتے ہیں (اور کہتے ہیں:) کیا یہی ہے وہ جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ ﴿41﴾ بے شک وہ تو ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکانے ہی لگا تھا، اگر ہم ان (معبودوں کی عبادت) پر جمے نہ رہتے اور جلد وہ جان لیں گے جب عذاب دیکھیں گے کہ سب سے زیادہ بے راہ کون ہے ﴿42﴾ کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا لیا ہے؟ کیا پھر آپ اس کے ذمے دار بنتے ہیں ﴿43﴾ یا آپ سمجھتے ہیں کہ بے شک ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں۔ وہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گم راہ ہیں ﴿44﴾

مشرکوں کا رسول اللہ ﷺ کو ہنسی مذاق کا نشانہ بنانا:

اللہ پاک مشرکوں کے رسول اللہ ﷺ سے ٹھٹھا کرنے کی خبر دیتا ہے، جس وقت وہ آپ کو دیکھتے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ﴾ [الأنبياء: ٣٦] ”اور جب کافر آپ کو دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو مذاق ہی کا نشانہ بناتے ہیں۔“ ان کی مراد آپ کو عیب لگانا اور گھٹانا ہے۔ اور یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴾ یہ بات گھٹانے اور عیب لگانے اور حقیر کرنے کے طور پر کہتے تھے۔ فقبحهم الله! جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤١] ”اور (اے نبی!) بلاشبہ آپ سے پہلے بھی رسولوں سے استہزا کیا گیا، پھر جن لوگوں نے ان (رسولوں) سے تمسخر کیا، انھیں اس (عذاب) نے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ﴾ ان کی مراد یہ ہے کہ قریب تھا کہ وہ ان کو بتوں کی عبادت

سے بہکا دے، اگر وہ صبر نہ کرتے اور قوی نہ رہتے اور جمے نہ رہتے۔ اس پر پھر اللہ پاک نے ان کو وعید سنائی اور سرزنش کی اور تنبیہ کی: ﴿ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾ یعنی یہ لوگ بتوں کی پوجا چھوڑنے کو اور اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کو گمراہی خیال کرتے ہیں۔ وہ ایسا خیال کرتے رہیں، آیندہ جب وہ عذاب دیکھیں گے تو جان لیں گے کہ کون راہ سے بہت بہکا ہوا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو اس بات پر آگاہی بخشی کہ جس شخص پر بدبختی لکھی جا چکی ہے تو اس کو سوائے اللہ عزوجل کے کوئی اور ہدایت نہیں کرتا۔

﴿ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ یعنی جب کبھی کوئی چیز اچھی سمجھی اور اس کو خوبصورت خیال کیا تو اس کو پوجنے لگا۔ ﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [الفاطر: ٨] ''چناں چہ بے شک اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔'' اس لیے اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴾ یعنی کہیں تو اس کا ذمہ لے سکتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ آدمی جاہلیت میں ایک زمانے تک سفید پتھر کو پوجتا، پھر جب کوئی اور پتھر اس سے زیادہ خوبصورت دیکھتا تو اس کو پوجنے لگتا اور پہلے کو چھوڑ دیتا۔[1]

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾ یعنی ان لوگوں کا حال چرنے والے چوپایوں سے بھی بدتر ہے، کیوں کہ وہ تو جس کام کے لیے بنائے گئے ہیں اس کو کرتے ہیں اور یہ لوگ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، مگر انھوں نے اس کام کو نہ کیا اور غیر اللہ کو پوجتے ہیں اور اس کو اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ ان پر حجت قائم ہو چکی اور رسول اُن کی طرف بھیج دیے گئے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مبانی و معانی کی وضاحت کے ساتھ یہ ہے: ﴿ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ﴾ کلمہ ﴿ اِنْ ﴾ نافیہ بمعنی ''مَا'' ہے۔ ﴿ هُزُوًا ﴾ بہ معنی مفعول ہے، یعنی ''مَهْزُوًّا''۔ کفار کا معاملہ جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، اس کا اکتفا اس پر کیا کہ انھوں نے رسول کو پکڑا، ٹھٹھا کیا۔ مطلب یہ کہ مشرکوں کو رسول سے اور کوئی تعلق اور واسطہ اور کام نہیں، مگر یہی کہ جب ان کو دیکھا ان سے مسخرا پن کرنے لگے۔ ﴿ اِذَا ﴾ کا جواب ﴿ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ ﴾ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جواب محذوف ہے، یعنی ''قَالُوْا: اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا''، معنی یہ ہیں کہ جہاں تجھ کو دیکھا بولے: کیا یہی ہے جس کو اللہ نے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ اس معنی کی بنا پر جملہ ﴿ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ﴾ شرط و جزا کے درمیان معترضہ ہوگا، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٩٩)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٢٣۔ ٤٢٤)

اس کی بنا پر ﴿ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴾ محلِ نصب میں ہو گا بنا بر حال۔ بہ تقدیرِ قول: "أَيْ: قَائِلِيْنَ: أَهٰذَا" معنی یہ ہیں کہ جہاں تجھ کو دیکھا تو تجھ سے صرف ٹھٹھا کیا گیا، اس طرح سے کہ یہ کہتے ہیں: کیا یہی ہے جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اس اشارے میں اس بات پر دلالت ہے کہ رسول کو حقیر سمجھتے اور اس سے ٹھٹھا کرتے تھے۔ ﴿ بَعَثَ ﴾ کا مفعول موصول کی طرف راجع ضمیر محذوف ہے، یعنی "بَعَثَهُ" اور ﴿ رَسُوْلًا ﴾ کا نصب بنا برحال ہے بہ معنی "مُرْسَلًا"۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی ہے، وہ جس وقت اپنے یاروں کے ساتھ مل کر گزرتا تو ٹھٹھا کرتا ہوا یہ کہتا: کیا یہ وہ شخص ہے کہ اللہ نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے، اس حال میں کہ وہ خود ہی دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ بھیجا ہوا ہے۔ اسم اشارہ مبتدا ہے اور اس کی خبر موصول ہے مع اپنے صلہ کے۔ ﴿ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ﴾ کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے، ضمیر شان اس کا اسم محذوف ہے: "أَيْ: انه" معنی یہ ہیں کہ مشرکوں نے کہا ہے کہ تحقیق حال یہ ہے کہ قریب تھا کہ یہ رسول ہمیں ہمارے معبودوں سے پھیر دے اور ہم اُن کی عبادت کو چھوڑ دیں، اس لیے کہ اس نے انتہائی کوشش کی اور توحید کی طرف دعوت دی اور بہت سی ایسی باتیں پیش کیں جو ذہن پر اثر کرتی ہیں کہ وہ حجتیں اور معجزے ہیں۔

﴿ لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا ﴾ یعنی مذکورہ وجوہ کی بنا پر قریب تھا کہ وہ ہم کو ان معبودوں سے بہکا دے، اگر ہم اپنی جانوں کو ان کی عبادت پر نہ روکتے۔ پھر اللہ پاک نے اس کا یہ جواب ارشاد کیا: ﴿ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾ یعنی وہ عن قریب جان لیں گے، جبکہ روزِ قیامت میں عذاب کو ظاہر ظہور طریقے سے دیکھیں گے جس کے وہ اپنے کفر کے سبب سے لائق ہیں کہ کون حق و ہدایت کی راہ سے بہت دور جا پڑا ہے، وہ یا مومن لوگ۔ پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ جس راہ پر وہ چلے ہیں، اس کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل و حجت نہیں ہے۔ سوائے اپنے گمراہ آباء کی تقلید کے اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کے۔

چنانچہ اپنے رسول کریم ﷺ کو تعجب دلا کر یہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ یعنی اے پیغمبر! بھلا دیکھو تو اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا اور اس سے تعجب کر۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: "ذٰلِكَ الْكَافِرُ لَا يَهْوَى شَيْئًا إِلَّا اتَّبَعَهُ" یعنی یہ کافر ہے کہ نہیں خواہش کرتا کسی شے کی، مگر اس کی پیروی کر لیتا ہے۔ حسن رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[1] اصل میں "مَنِ اتَّخَذَ هَوَاهُ إِلٰهَهُ" ہے، لیکن عنایت اور اہتمام کی وجہ سے مفعولِ ثانی کو مقدم کر دیا، جس طرح یہ قول ہے: "عَلِمْتُ مُنْطَلِقًا زَيْدًا" یہ قول زمخشری کا ہے،[2] یعنی وہ اپنی خواہش کا مطیع ہوا، بالکل مثل مطیع ہونے معبود کے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نہ کچھ تقدیم ہے نہ تاخیر ہے، کیوں کہ دونوں مفعول تعریف میں برابر ہیں۔ (قاله السمين)

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٠٠) [2] الكشاف (٣/ ٢٨٧)

قلب یعنی الٹ پلٹ کرنے کا دعویٰ کوئی عمدہ بات نہیں ہے، کیونکہ قلب تو شعر کی ضرورت سے ہوتا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ پہلی وجہ کے قائل ہیں۔ پھر کہا ہے کہ جس نے یہ وہم کیا کہ دونوں مفعول علی الترتیب ہیں اس بنا پر کہ تعریف میں دونوں برابر ہیں تو اس سے یہ بات غائب ہوگئی کہ مفعولِ ثانی اس باب میں وہی ہے جو متلبس بحالتِ حادثہ ہوتا ہے، یعنی کیا دیکھا تو نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو اپنے نفس کے لیے معبود بنا لیا، اس کے بغیر کہ اس کا ملاحظہ کرے اور اپنے دین کی بنیاد بھی اسی پر کی ہے اس حال میں کہ حجتِ باہرہ اور روشن دلیل کی طرف بالکل توجہ کرنے والا نہیں ہے۔[1]

﴿ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴾ میں سوالیہ انداز انکار اور استبعاد کے لیے ہے، معنیٰ یہ ہیں کہ کیا تو اس پر نگہبان اور کفیل ہوسکتا ہے کہ تو اسے ایمان کی طرف پھیر لائے اور کفر سے اس کو نکال دے اور خواہش کی پیروی کرنے سے اس کو محفوظ رکھے اور اللہ پاک کے سوا جس کی وہ خواہش کرتا ہے اس کی پرستش سے اسے بچائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات نہیں ہوسکتی اور انتہائی بعید ہے۔ تو اس بات پر قادر نہیں ہے نہ تو اس کی طاقت رکھتا ہے، کیوں کہ ہدایت اور گمراہی تیری مرضی کے مطابق نہیں مل سکتی۔ تجھ پر جو فرض ہے وہ اللہ کا دین پہنچا دینا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت قتال کی آیت سے منسوخ ہے۔ یہ کلبی کا قول ہے۔

پھر اللہ پاک نے پہلے انکار سے دوسرے انکار کی طرف رخ پھیرا۔ فرمایا: ﴿ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی کیا تو خیال کرتا ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ آیاتِ قرآنی اور مواعظ کو جن کو تو اُن پر پڑھتا رہتا ہے، سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں، یا اس کے معنیٰ کو سمجھتے بوجھتے ہیں، یہاں تک کہ تو اُن کے حال کا اعتناء کرتا ہے (خیال یا پروا کرتا ہے) اور اہتمام کرتا ہے اور اُن کے ایمان لانے کا طمع رکھتا ہے، حالاں کہ وہ ایسے نہیں ہیں، بلکہ وہ تو اس شخص کی طرح ہیں جو نہ سنتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ خاص طور پر اکثر کا ذکر اس لیے کیا کہ ان میں سے بعض ایمان لائے اور بعض نے حق کو سمجھا، لیکن ریاست کے خوف سے اور از راہِ تکبر اپنے آپ کو بڑا جانا اور حق کو جان لینے کے بعد بھی مسلمان نہ ہوئے۔

پھر اللہ پاک نے ان کا حال بیان کیا اور اُن کے بارے میں طمع کرنے کا مادہ قطع کر دیا اور یہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ ﴾ یعنی جو کچھ وہ سنتے ہیں، ان سے نفع لینے میں وہ بالکل چوپایوں کی طرح ہیں کہ جن سے عقل اور فہم بالکل لے لیا گیا ہے، لہٰذا تو ان میں طمع مت کر، کیوں کہ سننے سمجھنے کا فائدہ مفقود ہے، گو جو بات ان سے کہی جاتی ہے اسے سنتے ہیں اور جو کچھ ان پر پڑھا جاتا ہے اسے سمجھتے ہیں، لیکن اس سے نفع نہ لیا تو وہ اس کی طرح ہوئے جو نہ سنتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ غرضیکہ اللہ پاک نے اُن پر یہ حکم لگایا کہ وہ چوپایوں کی طرح ہیں، پھر اس سے اعراض کیا اور دوسری طرف توجہ فرمائی اور جو بات اس سے بڑھ کر تھی، اس کا ان پر حکم لگایا۔

[1] تفسیر أبي السعود (٦/ ٢٢١)

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾ یعنی بلکہ یہ تو چوپایوں سے بھی بڑھ کر راہ بھولے ہوئے ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ بہائم تو اپنے پرورش کرنے والے کو پہچانتے ہیں اور اپنی چراگاہوں اور پانی پینے کے گھاٹوں کی طرف راہ پاتے ہیں اور اپنے مالکوں کے مطیع اور فرمانبردار ہوتے ہیں۔ رہے یہ لوگ تو نہ یہ مطیع ہوتے ہیں اور نہ اپنے رب کو پہچانتے ہیں جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان کو روزی و رزق دیا ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ چوپایوں کی جو شخص خبر گیری کرتا ہے تو وہ اس کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور جو اُن سے احسان کرتا ہے اس کی تمیز کرتے ہیں، اس سے جو اُن سے برائی کرتا ہے۔ اور جو شے ان کو فائدہ دینے والی ہوتی ہے، اس کو طلب کرتے ہیں اور جو اُن کو نقصان پہنچاتی ہے اس سے بچتے ہیں اور یہ لوگ نہ اپنے پروردگار کے مطیع اور فرمانبردار ہوتے ہیں، نہ اس کے احسان کو شیطان کی برائی سے پہچانتے ہیں اور نہ اس ثواب کو طلب کرتے ہیں، جو سارے منافع سے بڑھ کر ہے اور نہ اس عذاب سے بچتے ہیں جو تمام تکالیف سے زیادہ سخت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ چوپایوں کی جہالت کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی اور اُن لوگوں کی جہالت فتنوں کی طرف برانگیختہ کرنے اور لوگوں کو حق سے روکنے کا باعث بنتی ہے۔ تیسرے یہ ہے کہ ان کو قدرت ہی نہیں ہے کہ وہ کمال کو طلب کریں تو اس طلبِ کمال نہ کر سکنے پر ان کا کوئی قصور نہیں ہے، نہ ان کی کسی طرح سے مذمت کی جا سکتی ہے اور یہ لوگ اگر ایسا کریں تو قصور وار ہیں اور اپنے قصور پر بڑے عذاب کے مستحق ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ لوگ چوپایوں سے زیادہ گمراہ اس لیے ہوئے کہ چوپایوں پر نہ کسی طرح کا حساب ہے نہ کسی طرح کا عذاب۔ کسی نے یہ وجہ کہی ہے کہ جب چوپائے توحید و نبوت کی صحت کو نہیں سمجھتے تو وہ اس کے باطل ہونے کا عقیدہ بھی نہیں رکھتے، بخلاف ان لوگوں کے کہ انھوں نے عناد و مکابرہ و تعصب و غمطِ حق کی وجہ سے باطل عقیدہ اپنایا۔ (عناد: دشمنی، مکابرہ: جان بوجھ کر نہ ماننا۔ تعصب: ہٹ دھرمی اختیار کرنا، غمط: حقیر جاننا)

کسی نے کہا ہے کہ چوپائے سجدہ اور تسبیح کرتے ہیں اور کفار نہیں کرتے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرشتے روح اور عقل ہیں اور چوپائے نفس اور ہویٰ ہیں اور آدمی ساری چیزوں کا مجموعہ ہے آزمایش کے طور پر۔ چنانچہ اگر اس پر نفس اور خواہشات غالب ہوئیں تو چوپائے اس سے بہتر ہیں اور اگر روح اور عقل اس پر غالب ہوئے تو وہ ملائکہ کرام پر افضل ہو جاتا ہے۔ جبکہ اللہ پاک جاہلوں کی جہالت اور گمراہی کے ذکر سے فارغ ہوا تو اس کے بعد کچھ توحید کے دلائل ذکر کیے اور ان میں جو عظیم انعام ہیں، ان کا ذکر فرمایا۔ ان میں سے جو یہاں ذکر کی ہیں، ان کا حاصل پانچ دلیلیں ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ سایہ کے احوال سے استدلال کیا ہے۔[2] چنانچہ ارشاد فرمایا:

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٦) [2] فتح البيان (٩/ ٣١٢۔ ٣١٤)

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ
ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿٤٥﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا
يَّسِيْرًا ﴿٤٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا
وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿٤٧﴾

کیا آپ نے اپنے رب (کی قدرت) کی طرف نہیں دیکھا کہ اس نے سایہ کیسے پھیلایا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو اسے ٹھہرا دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس (سائے) پر راہنما بنایا 45 پھر ہم نے اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیا 46 اور وہی (اللہ) ہے جس نے تمھارے لیے رات کو لباس اور نیند کو (ذریعۂ) آرام بنایا، اور اس نے دن کو اُٹھ کھڑے ہونے کا وقت بنایا 47

وجودِ باری تعالیٰ اور اس کی قدرت کے دلائل کا بیان:

شروع میں ہر چیز کا سایہ لمبا پڑتا ہے، پھر جس طرف سورج چلتا ہے، اس کے مقابل سایہ ہٹتا ہے، جب تک کہ جڑ میں آ لگے۔ اپنی طرف کھینچ لیا یہ کہ اپنی اصل کو جا لگتا ہے، سب کی اصل اللہ ہے۔ انتہی۔

یہاں سے اللہ پاک نے ان دلیلوں کا ذکر شروع کیا جو اس کے وجود باوجود پر دال ہیں اور اس کی قدرت پر بھی کہ مختلف اور متضاد اشیاء کے پیدا کرنے پر اس کو پوری پوری قدرت حاصل ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ﴾ ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ عنہم، امام ابو العالیہ، ابو مالک، مسروق، مجاہد، سعید بن جبیر، نخعی، ضحاک، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "ظل" سے مراد وہ ہے جو طلوعِ فجر اور سورج طلوع ہونے کے درمیان ہے۔[1] ﴿ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ "دَائِمًا لَا يَزُوْلُ"، یعنی وہ ہمیشہ رہتا زائل نہ ہوتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [القصص: ۷۱۔ ۷۲] "(اے نبی!) کہہ دیجیے: دیکھو تو! اگر اللہ تم پر قیامت تک ہمیشہ کے لیے رات ہی (طاری) کر دے تو اللہ کے سوا کون الٰہ ہے جو تمھیں روشنی (دن) لا دے؟ کیا پھر تم سنتے نہیں؟ کہہ دیجیے: بتلاؤ! اگر اللہ تم پر قیامت تک ہمیشہ کے لیے دن ہی (طاری) کر دے تو اللہ کے سوا کون الٰہ ہے جو تمھیں رات لا دے کہ تم اس میں آرام کر سکو؟ کیا پھر تم دیکھتے نہیں؟"

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٧٥) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٠١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ﴾ یعنی اگر آفتاب اس پر طلوع نہ کرتا تو البتہ وہ پہچانا نہ جاتا، کیوں کہ ضد پہچانی نہیں جاتی مگر اپنی ضد سے۔ امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا: "دَلِيلًا تَتْلُوهُ وَتَتْبَعُهُ"، یعنی سورج اس کے پیچھے لگا آتا ہے، یہاں تک کہ اس کے کل پر آ جاتا ہے۔ ﴿ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا ﴾ یعنی ظل کو، کسی نے کہا ہے کہ سورج کو ﴿ يَسِيْرًا ﴾ کے معنی ہیں: "سَهْلًا"۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "سَرِيْعًا"۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "خَفِيًّا"، امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قَبْضاً خَفِيًّا" یہاں تک کہ زمین میں کوئی سایہ باقی نہیں رہتا، مگر چھت کے نیچے یا درخت کے نیچے، حالانکہ سورج اس کے اوپر سایہ کیے ہوئے ہے۔ امام ایوب بن موسیٰ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ قَبْضًا يَسِيْرًا ﴾ کے معنی ہیں: "قَلِيلًا قَلِيلًا"[1] یعنی ذرا ذرا۔

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا ﴾ یعنی وہ اللہ پاک ہی ہے جو رات کو وجود پر لباس کی طرح اُوڑھا دیتا ہے اور اس کو ڈھانک دیتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ﴾ [الليل: ١] "رات کی قسم جب وہ چھا جائے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالنَّوْمَ سُبَاتًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے نیند کو بدنوں کی راحت کے لیے قاطعِ حرکت قرار دیا ہے، کیوں کہ اعضاء و جوارح دن میں معاش کی تلاش میں چلنے پھرنے اور بہت زیادہ حرکت کرتے رہنے سے تھک جاتے ہیں، پھر جب رات آئی اور ساکن ہوئی تو حرکتیں سکون پذیر ہو جاتی ہیں اور اعضاء راحت لیتے ہیں، پھر نیند آ جاتی ہے، جس میں بدن اور روح دونوں کی راحت ہے۔ ﴿ وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ لوگ اپنی معاش اور کمانے کے لیے اور مختلف اسباب اکٹھا کرنے کے لیے اس میں اُٹھ نکلتے ہیں اور چلتے پھرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ [القصص: ٧٣] "اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم اس (رات) میں آرام کرو اور تاکہ تم (دن میں) اس کا فضل تلاش کرو، اور شاید کہ تم شکر کرو۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ یہ رؤیت یا تو بصری ہے، یعنی سر کی آنکھ سے دیکھنا۔ مراد یہ ہے کہ کیا تو نے اپنے رب کی کاریگری کی طرف نہیں دیکھا، یا تو نے سائے کی طرف نہیں دیکھا کہ اس کو تیرے رب نے کس حالت میں اور کیسے دراز کیا ہے۔ یا مراد رؤیتِ قلبی ہے، یعنی دل کی آنکھ سے دیکھنا۔ یہ رؤیت علم کے معنی سے ہے، اس لیے کہ سایہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ہر تبدیل ہونے والی شے حادث ہے اور ہر حادث کے لیے ایک بنانے والا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ بہ معنی "أَلَمْ تَعْلَمْ" ہے۔[2]

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٠٢۔ ٢٧٠٣) [2] معاني القرآن (٤/ ٧٠)

یہ رؤیت رؤیتِ قلب کے باب سے ہے، کہا: یہ کلام قلب کی بنا پر ہے، تقدیر یہ ہے: ''أَلَمْ تَرَ إِلَى الظِّلِّ كَيْفَ مَدَّهُ رَبُّكَ'' یعنی کیا تو نے سائے کی طرف نہیں دیکھا کہ اس کو تیرے رب نے کیسا دراز کیا۔ مراد وہ سایہ ہے، جو اِسفار (روشنی) کے وقت سے سورج نکلنے تک ہوتا ہے۔ یہ ایسا سایہ ہے کہ اس کے ساتھ سورج نہیں ہوتا۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ ظل ہے، جو سورج غروب ہونے سے لے کر اس کے طلوع ہونے تک ہوتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ کوئی گھڑی اس گھڑی سے اچھی نہیں ہے، اس لیے کہ بیمار اس میں راحت پاتا ہے، اسی طرح مسافر اور ہر تکلیف والا، اس میں آرام پاتا ہے اور اسی گھڑی میں مردوں کے نفوس اور روحیں جسموں کی طرف پھیری جاتی ہیں اور اس میں زندوں کے جی خوش ہوتے ہیں اور یہ صفت مغرب کے بعد مفقود ہوتی ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت کا دن اسی طرح کا ہے اور اس گھڑی کی طرف اشارہ کیا، جس میں نماز پڑھنے والے صبح کی نماز پڑھتے ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سایہ غداۃ (چاشت کے وقت) میں ہوتا ہے۔ ''فَيْءُ عَشِيٍ'' میں، یعنی قبل زوال ظل کہلاتا ہے اور بعد زوال ''فیء'' کہلاتا ہے، کیوں کہ زوال کے بعد وہ رجوع کرتا ہے، اس کا نام ''فئ'' اس لیے رکھا ہے کہ وہ مشرق سے مغرب کی جانب رجوع ہوا ہے۔ حمید بن ثور ایک بڑے بلند درخت کا وصف کرتا ہے اور اس سے کسی عورت کا کنایہ کیا ہے ؎

فَلَا الظِّلُّ مِنْ بَرْدِ الضُّحَى تَسْتَطِيعُهُ وَلَا الْفَيْءُ مِنْ بَرْدِ الْعَشِيِّ تَذُوقُ

(یعنی وہ ایسا بڑا گنجان درخت ہے کہ نہ تو سردیِ ضحیٰ کے سائے کی طاقت رکھتا ہے، نہ وہ بعد زوال کے سائے کی سردی کو چکھتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ وہ ایسی نازنین عورت عیش و آرام میں ہے کہ گھر کے باہر نہیں نکلتی ہے کہ قبل و بعد زوال کا سایہ اسے لگے اور ان دونوں کی برودت اسے ایذا پہنچائے)

ابن سکّیت نے کہا: ظل وہ ہے کہ سورج اس کا نسخ کرتا ہے اور ''فیء'' وہ ہے جو سورج کو نسخ کرتا ہے۔ رؤبہ نے کہا ہے کہ ہر وہ شے جس پر سورج ہو، پھر اس سے ڈھل جائے تو وہ فئ و ظل ہے اور جس پر سورج نہ تھا تو وہ ظل ہے۔[1] انتہیٰ. ظل کی حقیقت ایک امرِ متوسط ہے خالص روشنی اور خالص تاریکی کے درمیان۔ یہ توسط زیادہ تر دونوں اطراف سے برابر ہے اور بہت بہترین حالت ہے، کیوں کہ خالص تاریکی کو طبیعت مکروہ رکھتی ہے اور حِس اس سے نفرت کرتی ہے اور کامل روشنی اپنی قوت اور زور کی وجہ سے حِس بصری پر غالب ہو جاتی ہے اور گرمی سے تکلیف پہنچتی ہے، اسی لیے بہشت کو ظل کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔ ﴿وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ﴾ [الواقعة: ٣٠] ''اور لمبے لمبے سایوں میں۔''

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ جو کہا گیا کہ ''ظل'' سے مراد وہ ہے جو طلوعِ فجر اور طلوعِ شمس کے درمیان ہوتا ہے، صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مراد لوگوں کو اللہ عز و جل کی عظیم قدرت اور اس بات میں

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٣٧)

اس کی حکمتِ بالغہ پر آگاہ کرنا ہے، جس کا وہ مشاہدہ کر رہے ہیں تو ضروری ہے کہ "ظل" سے مراد وہ مخصوص حالت ہو جس کو وہ جانتے پہچانتے ہیں، ایک جگہ میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ اُن کے اور سورج کے درمیان ایک جسمِ کثیف حائل ہو جاتا ہے، وہ حالت اس کے مخالف ہوتی ہے جو اس جگہ کی اطراف میں سورج کی روشنی پڑ رہی ہے اور خاص اس جگہ میں سایہ ہوتا ہے اور وہ بات جو ذکر کی ہے، اگرچہ وہ حقیقت میں سایہ ہے افق شرقی کے لیے، لیکن لوگ اس کو "ظل" شمار نہیں کرتے، نہ اس کا وصف کرتے ہیں "ظل" کے مشہور اوصاف کے ساتھ۔[1] انتھی.

کاتب الحروف ۔عفا اللہ عنہ۔ عرض کرتا ہے کہ مفتی ابو السعود مرحوم نے جو فرمایا، اس کا حاصل یہی ہے کہ "ظل" کی ایک فرد نکال کر اس کو ترجیح دے دی اور سلف صالحین سے جو "ظل" کی تفسیر منقول ہے، اس کو مرجوح ٹھہرایا۔ واللہ أعلم۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ صاحب! جو بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ وغیرہم سے صحیح طور پر ثابت ہوئی، وہی ٹھیک ہے، گو جو بات مفتی صاحب نے فرمائی وہ بھی "ظل" کی ایک فرد ہو، اس پر ترجیح دینے کے کیا معنی ہیں۔ دیکھو ابن عباس رضی اللہ عنہما حبرِ اُمت ترجمان القرآن سے مروی ہے کہ ﴿كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی فجر کے بعد یہاں تک کہ سورج طلوع ہو۔[2]

ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جس وقت تو فجر کی نماز پڑھتا ہے تو آفتاب کے طلوع ہونے کی جگہ اور اس کے غروب ہونے کی جگہ کے درمیان تک ظل ہوتا ہے۔ پھر اللہ اس پر سورج کو دلیل بنا کر بھیجتا ہے تو ظل کو سمیٹ لیتا ہے۔[3] تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ طلوعِ فجر اور طلوعِ شمس کے درمیان ہے۔[4] جمہور اسی کے قائل ہیں۔ اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کا نام "ظل" نہیں رکھا جاتا، کیوں کہ یہ تو رات کی بقایا سے ہے اور غیر نہار میں واقع ہے۔ یہ بعینہٖ وہی مفتی ابو السعود مرحوم کا اعتراض ہے۔ حقیقت میں یہ کچھ اعتراض نہیں ہے، اگر بالفرض لغت میں اس کا نام "ظل" نہ ہو، جب سلف صالح سے اس کی یہ تفسیر وارد ہوئی تو یہی معتبر ہے، حقیقت لغوی نہ سہی حقیقت شرعی تو بالضرور ٹھہرے گی۔

مفتی ابو السعود نے آیت کے یہ معنی لکھے ہیں: کیا تو نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کہ اس نے کس طرح کسی سایہ کرنے والی چیز کا سایہ پیدا کیا اور ایجاد کیا، خواہ وہ پہاڑ کا سایہ ہو یا کسی عمارت کا یا درخت کا۔ یہ سایہ طلوعِ شمس کی ابتدا کے وقت پھیلا ہوا اور لمبا ہو۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ پاک نے اس کو دراز کیا اس کے بعد کہ وہ اس طرح کا نہ تھا، جیسا کہ نصف نہار کے بعد ہے غروبِ آفتاب تک، کیوں کہ یہ بات باوجود اس تصریح سے خالی ہونے کے کہ یہ سایہ اللہ پاک ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، سیاق نظم کریم اس کا انکار کرتی ہے۔[5]

---

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٢٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٠١) [3] تفسير الطبري (١٧/ ٢١٧)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٠١) [5] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٢٢)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ﴾ جملہ معترضہ ہے معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان، یعنی اگر اللہ پاک اس کا سکون چاہتا تو اس کو ساکن اور ثابت اور دائم کر دیتا۔ کہ زائل نہ ہوتا اور قرار پذیر کر دیتا کہ سورج اسے نہ مٹاتا اور نہ وہ روئے زمین سے جاتا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر چاہتا تو سورج کو طلوع ہونے سے روک دیتا تو وہ زائل نہ ہوتا، یا سورج سے اس کی روشنی سلب کر لی جاتی۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اقامت و استقرار کی تعبیر سکون کے ساتھ مشہور ہے، جس طرح محاورے میں بولتے ہیں کہ "سَكَنَ فُلَانٌ بَلَدَ كَذَا" جبکہ وہ شخص اس شہر میں مقیم اور قرار پذیر ہو۔

قولہ: ﴿ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴾ معطوف ہے، جملہ ﴿ مَدَّ الظِّلَّ ﴾ پر اس کے حکم میں داخل ہے، یعنی کیا ہم نے سورج کو سایہ پر سورج کے ایک وقت آنے پر زائل کرنے کے ساتھ، ایک حجت اور برہان اور علامت اور نشانی کہ جس کے احوال سے سایہ کے احوال پر دلیل پکڑی جاتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ سایہ سورج کا پیرو ہوتا ہے، جس طرح کہ راستہ بتانے والے کی پیروی کی جاتی ہے راستے میں۔ اس لحاظ سے کہ سایہ بڑھتا گھٹتا ہے سورج کی وجہ سے اور کبھی لمبا ہوتا ہے اور کبھی سمٹتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اگر سورج نہ ہوتا تو سایہ پہچانا نہ جاتا اور اگر نور نہ ہوتا تو ظلمت (اندھیرا) پہچانی نہ جاتی۔ اشیاء اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ "دلیل" بصیغہ مؤنث نہ لائی گئی، حالاں کہ شمس کی صفت ہے، اس لیے کہ دلیل معنی اسم میں ہے، جس طرح یوں بولتے ہیں: "اَلشَّمْسُ بُرْهَانٌ وَالشَّمْسُ حَقٌّ"

﴿ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ ﴾ بھی معطوف ہے ﴿ مَدَّ الظِّلَّ ﴾ پر، اس کے حکم میں داخل ہے۔ معنی یہ ہیں کہ پھر سمیٹا ہم نے اس دراز سائے کو اور ہم نے اس کو مٹایا آفتاب کی شعاع کو اس کی جگہ میں بتدریج ڈالنے کے وقت، یہاں تک کہ وہ سائے غائب اور مدہم ہو جاتے ہیں۔ ﴿ اِلَيْنَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس کا مرجع اللہ پاک کی طرف ہے، جس طرح کہ اس کا پیدا ہونا بھی اسی سے ہے۔

﴿ قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے سائے کو بتدریج اپنی طرف سمیٹا، ذرا ذرا سورج کے بلند ہونے کے مطابق، تاکہ اس دنیا کے معاملات منظّم ہو جائیں اور اس سے مخلوق کے بے شمار فائدے حاصل ہوں۔ کسی نے یہ معنی کیے ہیں کہ ہم پر آسان ہے مشکل نہیں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "خَفِيْفًا" جبکہ اس سے ایک جزء سمیٹا تو اس کی جگہ ایک جزء اندھیرے کا رکھ دیا، ایک ہی دفعہ میں زائل نہیں ہو جاتا۔ یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔[1] کسی نے کہا کہ آیت میں سائے کا قبض کرنا مراد ہے قیامت کے قائم ہونے کے وقت اس کے اسباب کو قبض کر لینے کی وجہ سے۔ اسباب یہی روشنی والے اجرام ہیں، یعنی روشن ستارے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ یہ ظل فضا میں قائم رہتا ہے طلوعِ فجر سے طلوعِ آفتاب تک، پھر جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ظل

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٨)

آیک ایک جزء کر کے مقبوض ہو جاتا ہے اور اس کا خلیفہ فضا میں سورج کی شعاع ہو جاتی ہے، پھر وہ زمین پر چمکتا ہے اور ساری چیزوں پر غروب کے وقت تک، پھر جب وہ غروب ہو جاتا ہے تو وہاں کچھ سایہ نہیں رہتا۔ وہ جو ہے تو وہ دن کے نور کا بقیہ ہے۔

ایک قوم نے کہا ہے کہ سایہ کا قبض کرنا سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہے، کیوں کہ جس وقت تک وہ غروب نہیں ہوتا تو سایہ میں کچھ بقیہ ہوتا ہے۔ رات ہی کے آنے سے اور اس پر تاریکی چھا جانے سے ہی سایہ کا زوال مکمل ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ قبض سورج کے ساتھ واقع ہوا ہے، کیوں کہ جس وقت سورج ہوتا ہے تو سایہ ذرا ذرا کر کے جانا شروع کرتا ہے۔ یہ قول مالک و ابراہیم تیمی کا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: پھر ہم نے ضیائے شمس کو فئے کے ساتھ سمیٹا قبضِ یسیر کر کے۔

پھر اللہ پاک نے اپنی دوسری قدرتِ تامہ کا ذکر فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا ﴾ یعنی اللہ سبحانہ ایسی قدرت والا ہے کہ اس نے تمھارے فائدے کے لیے رات کو لباس بنایا۔ رات کی تاریکی جو کہ ستر کرتی ہے اور ڈھانک لیتی ہے، اس کو ستر چھپانے والے لباس سے تشبیہ دی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رات کا وصف لباس کے ساتھ کیا تشبیہ کے طور پر اس لحاظ سے کہ رات اشیاء کو چھپا لیتی ہے، ڈھانک لیتی ہے۔[2] ﴿ لَكُمُ ﴾ کا حرفِ لام ﴿ جَعَلَ ﴾ سے متعلق ہے۔ غرضیکہ رات کا ایک وصف تو یہ ہے کہ وہ ساری اشیاء کو چھپا لیتی ہے، دوسرا وصف اس کا یہ ہے کہ مخلوق اس میں سوتی ہے اور آرام پاتی ہے۔ خود نیند ایک علاحدہ نعمت ہے اور اس کا پیدا کرنا ایک مستقل اور مکمل قدرت ہے۔

اس لیے اللہ پاک نے اس کا احسان رکھ کر ارشاد فرمایا: ﴿ وَالنَّوْمَ سُبَاتًا ﴾ یعنی اللہ وہ ہے جس نے نیند کو تمہارے واسطے راحت بنایا، کیوں کہ جب تم سوتے ہو تو کاموں میں مشغول ہونے سے منقطع ہو جاتے ہو۔ "سبات" کی اصل تمدد ہے، یعنی دراز ہونا، لیٹنا۔ عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: "سَبَتَتِ الْمَرْأَةُ شَعْرَهَا" یعنی عورت نے اپنے بالوں کو کھولا اور چھوڑ دیا۔ "رَجُلٌ مَسْبُوْتٌ" ممدود الخلقت کو کہتے ہیں، یعنی وہ شخص جس کے اعضاء دراز ہوں اور سنتے ہوئے ہوں۔ نیند کو سبات اس لیے کہتے ہیں کہ وہ تمدد سے ہوتی ہے اور تمدد میں راحت کے معنی ہیں۔ کسی نے کہا "سبت" قطع کرنے کو کہتے ہیں۔ پس نیند اشتغال یعنی مشغولیت سے منقطع ہوتی ہے۔ اسی معنی سے سبتِ یہود ہے، کیوں کہ وہ ہفتے کے دن مشغولیت سے منقطع ہوتے ہیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سبات" ہلکی نیند ہے، وہ یہ ہے کہ حرکت سے منقطع ہو جائے اور روح اس کے بدن میں ہو یا سر میں خواب کی ابتدا، یعنی غنودگی ہے، یہاں تک کہ دل کو پہنچے، یعنی کیا ہم نے تمھاری نیند کو

---

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٣٨) [2] تفسیر الطبري (١٩/ ٣١٨)

تمھارے لیے راحت۔ خلیل نے کہا ہے کہ "سبات" خوابِ گراں ہے، یعنی ہم نے تمھاری نیند کو ثقیل اور گراں کیا، تاکہ آسایش و راحت کامل ہو جائے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "سبات" موت ہے اور "مسبوت" مردہ کو کہتے ہیں، کیوں کہ وہ حیات سے کٹ جاتا ہے۔ یہ اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ ﴾ [الأنعام: ٦٠] "اور وہی ہے (اللہ) جو رات کو تمھیں فوت کرتا ہے۔"

پھر اللہ پاک نے تیسری قدرت اور نعمت کا ذکر فرمایا: ﴿ وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴾ یعنی اللہ وہ ہے جس نے دن کو صاحبِ نشور و انتشار کر دیا کہ اس میں لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں معاش کے لیے۔ یعنی دن کو زمانہ بعث کا کر دیا "سبات" سے۔ بیداری کو حیات سے تشبیہ دی، جس طرح کہ نیند کو "سبات" سے تشبیہ دی جو موت کے مشابہ ہے۔ یہ آیتِ کریمہ اس بات کے ساتھ کہ خالق کی قدرت پر دال ہے، اس میں مخلوق پر اس کی نعمت کا اظہار بھی ہے، اس لیے کہ پردۂ شب کے محتجب (پردے میں) ہونے میں دینی اور دنیوی فائدے ہیں اور خواب و بیداری میں جن کی تشبیہ موت اور حیات سے دی گئی ہے، اس شخص کے لیے عبرت ہے جو عبرت لے۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے فرزند سے فرمایا تھا: "كَمَا تَنَامُ فَتُوقَظُ كَذٰلِكَ تَمُوتُ فَتُنْشَرُ" یعنی جیسا تو سوتا ہے، پھر بیدار کیا جاتا ہے، اسی طرح تو مرے گا، پھر اُٹھا کر کھڑا کیا جائے گا۔[2] پھر اللہ تعالیٰ نے چوتھی قدرت و نعمت کا ذکر فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً طَهُوْرًا ﴿48﴾ لِّنُحْيِۦ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿49﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ڮ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿50﴾

اور وہی (اللہ) ہے جس نے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے بشارت دینے والی ہوائیں چلائیں، اور ہم نے آسمان سے پاکیزہ پانی اُتارا ﴿48﴾ تاکہ ہم اس سے مردہ شہر کو زندہ کریں اور ہم اپنی مخلوق میں سے بہت سے مویشیوں اور انسانوں کو وہ (پانی) پلائیں ﴿49﴾ اور بلاشبہ ہم نے اس کو ان کے سامنے بار بار بیان کیا، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں، پھر بھی اکثر لوگ ناشکری کیے بغیر نہیں رہتے ﴿50﴾

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ہی نے ہواؤں کو بادلوں اور بارش کی خوش خبری بنایا ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ اور سلطانِ عظیم میں سے ہے کہ اللہ سبحانہ ہواؤں کو خوش خبری دینے کے لیے بھیجتا ہے کہ اس کے بعد بادل آئے گا۔ ہوا کی بہت قسمیں ہیں۔ مطلب یہ ہے

[1] فتح القدير (٤/ ١٠٧)
[2] فتح البيان (٩/ ٣١٥۔ ٣١٩)

کہ اللہ پاک نے جو ہوا کو مسخر کیا ہے تو اس تسخیر میں اس کی بہت سی قسمیں ہیں، چنانچہ کوئی ہوا تو بادل کو برانگیختہ کرتی ہے، کوئی اس کو لادتی ہے، کوئی اسے ہانکتی ہے، کوئی بادل کے آگے آگے خوش خبری دیتی ہوئی چلتی ہے، کوئی اسے پہلے زمین کو جھاڑتی ہے، کوئی بادل کو باردار کرتی ہے تاکہ پانی برسائے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴾ یعنی پانی کو ایک آلہ بنایا ہے کہ اس سے صفائی ستھرائی کی جاتی ہے، جیسے سحور و وجور اور جوان دونوں کے جاری مجریٰ ہیں۔ یہ قول سب قولوں سے زیادہ صحیح ہے، جو اس بارے میں کہے گئے ہیں۔

رہا وہ شخص جس نے یہ کہا کہ "طَهُوْر" بروزن فعول بمعنی فاعل ہے، یا مبالغہ و تعدی کے لیے بنایا گیا ہے تو ان دونوں میں سے ہر قول پر لغت و حکم کے لحاظ سے اشکالات ہیں۔ یہ مقام ان کی تشریح کا نہیں ہے۔ واللہ أعلم۔

علی بن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ثابت بنانی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ میں امام ابو العالیہ کے ہمراہ بارش کے روز داخل ہوا اور حالت یہ تھی کہ بصرہ کے راستے گندے تھے، پھر امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے نماز پڑھی تو میں نے ان سے کہا۔ (یعنی اس بارے میں ان سے گفتگو کی کہ آپ نے پاؤں نہیں دھوئے یا اور کچھ کہا ہو۔[1] واللہ أعلم۔ لیکن قرینہ قول مذکور پر دال ہے۔) انھوں نے کہا: ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴾ کہا کہ پاک کر دیا اس کو آسمان کے پانی نے۔

نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ اللہ نے اس کو طہور اتارا ہے، اسے کوئی شے نجس نہیں کرتی ہے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: کسی نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم بئرِ بضاعہ سے وضو کریں؟ یہ ایک کنواں تھا، جس میں گندگی اور کتے کے گوشت ڈالے جاتے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانی طہور ہے، اس کو کوئی چیز نجس نہیں کرتی۔[2] (رواه الشافعي و أحمد و صححه أبو داود و الترمذي و حسنه والنسائي)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ اسنادِ خود خالد بن یزید سے روایت کیا ہے، کہا: ہم عبد الملک بن مروان کے پاس تھے، لوگوں نے پانی کا ذکر کیا تو خالد بن یزید نے کہا کہ من جملہ آب ایک پانی ہے آسمان کا اور من جملہ اس کے ایک پانی ہے کہ اس سے بادل پیتا ہے دریا سے، پھر اس کو رعد اور برق شیریں کر دیتا ہے، اب رہا وہ پانی جو دریا سے ہے، تو اس سے نبات (سبزی) نہیں ہوتی، نبات تو اسی پانی سے ہوتی ہے جو آسمان سے ہوتا ہے۔[3] (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: "رَوَى ابْنُ أَبِي حَاتِمٍ بِإِسْنَادِهِ حَدَّثَنَا أَبُو الْأَشْعَثِ حَدَّثَنَا مُعْتَمِرٌ سَمِعْتُ أَبِي يُحَدِّثُ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۷۰۵)

[2] مسند أحمد (۳/ ۱۵) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦) سنن النسائي، رقم الحديث (۳۲٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (۱۹۲۵)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۷۰٦)

عَنْ سَيَّارٍ عَنْ خَالِدِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ: كُنَّا عِنْدَ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ مَرْوَانَ فَذَكَرُوْا الْمَاءَ... الخ“) کاتبِ حروف کہتا ہے کہ خالد کے قول سے معلوم ہوا کہ اس شاعر کے قول کی اصل ہے:

دشنام خلق را ندہم جز دعا جواب — ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں ثمر دہم

”میں لوگوں کی گالیوں کا سوائے دعا کے کوئی جواب نہیں دیتا‘ میں تو ایک بادل ہوں کہ کڑوا (پانی) اٹھاتا ہوں اور میٹھا پھل (بارش) دیتا ہوں۔“

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں اتارا اللہ نے آسمان سے کوئی قطرہ، مگر اُگائی اس سے زمین میں گھاس یا دریا میں موتی۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا ہے کہ ”فِي الْبَرِّ بُرٌّ وَفِي الْبَحْرِ دُرٌّ“ یعنی خشکی میں گیہوں اور دریا میں موتی۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ لِنُحْيِۦَ بِهِۦ بَلْدَةً مَّيْتًا ﴾ سے مراد وہ زمین ہے جس پر کافی دیر تک پانی نہ برسا اور وہ اس کا انتظار کرتی رہی اور دبی پڑی تھی، اس میں نہ کوئی نبات تھی نہ کوئی شے، پھر جب اس پر پانی آیا تو اس نے گھاس اُگائی اور اس کے ٹیلوں نے قسم قسم کے پھول اور طرح طرح کی روئیدگی حاصل کی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا ٱلْمَآءَ ٱهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ﴾ [الحج: ٥] ”پھر جب ہم نے اس پر پانی نازل کیا تو وہ لہلہا اُٹھی، اور پھولی، اور اس نے ہر طرح کی خوش نما نباتات نکالیں۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنُسْقِيَهُۥ مِمَّا خَلَقْنَآ أَنْعَٰمًا وَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا ﴾ تا کہ اس سے حیوان چوپائے اور آدمی پییں، جو اس کے ضرورت مند ہیں، خود اپنے پینے کے لیے اور اپنی کھیتیوں اور پھلوں کو سیراب کرنے کے لیے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ ٱلَّذِى يُنَزِّلُ ٱلْغَيْثَ مِنۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوا۟ وَيَنشُرُ رَحْمَتَهُۥ ۚ وَهُوَ ٱلْوَلِىُّ ٱلْحَمِيدُ ﴾ [الشوریٰ: ٢٨] ”اور وہی ہے جو لوگوں کے نا اُمید ہو جانے کے بعد بارش نازل کرتا ہے اور وہ اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی کارساز، تعریف کیا ہوا ہے۔“ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَٱنظُرْ إِلَىٰٓ ءَاثَٰرِ رَحْمَتِ ٱللَّهِ كَيْفَ يُحْىِ ٱلْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَآ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴾ [الروم: ٥٠] ”چناں چہ آپ اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھیں، وہ زمین کو اس کی موت (ویرانی) کے بعد کیسے زندہ (آباد) کرتا ہے، بے شک وہ ضرور مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ صَرَّفْنَٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوا۟ ﴾ یعنی برسایا ہم نے اس زمین کو نہ اس کو اور ہانکا ہم نے بادل کو کہ اس زمین پر گزرتا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر دوسری زمین کو پانی دیتا ہے اور جو زمین اس سے پہلے ہے، اس میں ایک قطرہ بھی نازل نہ ہوا۔ اس میں اللہ پاک کی حجتِ بالغہ اور حکمتِ قاطعہ ہے۔ ابن عباس و ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ بارش کی رو سے کوئی سال کسی سال سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اللہ پاک اس کو طرح طرح سے بانٹتا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٠٦)

ہے، جس طرح چاہتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر میں اسی طرح ہے، لیکن تحسین میں یہ الفاظ ہیں: "مَا مِنْ عَامٍ بِأَكْثَرَ مَطَرًا مِنْ عَامٍ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ" حاصل ایک ہی ہے، مگر روایت کا اختلاف ہے)۔

پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ﴾ [1] ﴿ لِيَذَّكَّرُوْا ﴾ کے معنی یہ ہیں: تاکہ اللہ کے مردہ زمین کو زندہ کرنے سے وہ یہ بات یاد کریں کہ وہ مردوں کو اور اُن کی ہڈیوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد ان کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ جس شخص سے بارش روکی گئی، وہ یہ نصیحت حاصل کر لے کہ اس کو جو یہ بلا پہنچی ہے، یہ اس کے کسی گناہ کے سبب سے ہے، تاکہ وہ جس حال میں ہے، اس سے باز رہے۔ عمر مولیٰ غفرہ نے کہا ہے کہ جبرائیل جنائز کے مقام میں تھے تو نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: اے جبرائیل! میں بادل کا حال جاننا چاہتا ہوں، جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے کہا: یا نبی اللہ! یہ بادل کا فرشتہ ہے، آپ اس سے پوچھ لیں تو اس فرشتے نے کہا کہ ہمارے پاس مہر کی ہوئی چٹھیاں آتی ہیں کہ فلاں فلاں بلاد کو اتنے اتنے قطرے پانی پلا دو۔ [2] (رواه ابن أبي حاتم و هو حديث مرسل)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴾ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو اس طرح کہتے ہیں: "مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا" [3] یعنی ہم فلاں فلاں نچھتر کی وجہ سے پانی برسائے گئے۔ یہ بات جو امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہی ویسی ہے جو صحیح مسلم کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے صحیح ہوئی ہے کہ ایک رات کو بارش ہوئی تو دوسرے دن آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا تھا: کیا تم جانتے ہو کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں، فرمایا کہ اللہ نے فرمایا کہ میرے بندوں نے صبح کی ان میں سے کچھ تو مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور کچھ کفر کرنے والے ہیں۔ چنانچہ جس نے کہا ہے کہ ہم پر بارش اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے برسائی گئی تو یہ مجھ پر ایمان لانے والا اور ستارے کے ساتھ کفر کرنے والا ہے اور جس نے کہا ہے کہ ہم پر بارش برسائی گئی: "بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا" یعنی فلاں فلاں تارے کے سبب سے تو یہ شخص میرے ساتھ کفر کرنے والا ہے اور تارے پر ایمان لانے والا ہے۔ [4]

ایک قراءتِ سبعیہ میں "الرِّيْحَ" بصیغۂ مفرد ہے، اس کی بنا پر الف و لام جنسی ہو گا۔ "نشرا" میں چار قراءتیں ہیں: ایک تو بضمِ نون وشین۔ دوسرے بضمِ نون وسکونِ شین بنا بر تخفیف۔ تیسرے "نَشْرا" بفتحِ نون و سکونِ شین اور چوتھے "بُشْرا" بضمِ بائے موحدہ وسکونِ شین۔ پہلے دو کا مفرد "نشور" بروزن رسول ہے اور تیسرے مصدر ہے اور چوتھے کا مفرد "بشور" بروزن رسول ہے اور چاروں سبعیہ ہیں۔ قراءتِ نون کے یہ معنی ہیں کہ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٩/ ٢٨٠)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٠٦) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٠٧)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٢٤۔ ٤٢٦)

وہی اللہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا، اس حال میں کہ بارش کے آگے آگے متفرق ہیں اور بائے موحدہ کی قراءت کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ اس حال میں کہ وہ خوش خبری دینے والی ہیں۔

مبشرات تین ہوائیں ہیں: صبا و جنوب و شمال بخلاف "دَبُوْر" کے کہ وہ عذاب والی ہوا ہے، جس سے قومِ عاد کو ہلاک کیا گیا۔ مصباح میں ہے کہ ہوائیں چار ہیں: ایک تو شمال ہے، یہ ناحیۂ شام (شام کے کنارے) سے آتی ہے۔ دوسری جنوب، یہ اس کے مقابل ہے، یہ ریحِ یمانی ہے۔ تیسری صبا یہ مطلع شمس سے آتی ہے، اس کو قبول بھی کہتے ہیں۔ چوتھی دبور ہے یہ ناحیۂ مغرب (مغرب کے کنارے) سے آتی ہے۔ ریح مؤنث ہے۔ اکثر اسے "الریح" بولتے ہیں، کبھی مذکر آتی ہے، ہواء کے معنی کی بنا پر۔ پس "هُوَ الرِّيْحُ، وَهَبَّ الرِّيْحُ" کہتے ہیں۔ اس قول کو ابو زید نے نقل کیا ہے۔

امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ریح مؤنث ہے، اس میں کوئی علامت نہیں ہے، اسی طرح ہوا کے سارے نام مؤنث ہیں، مگر اعصار، کیوں کہ یہ مذکر ہے۔[1] (اعصار کے معنی بگولا۔ قرآن شریف میں ہے: ﴿ إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ ﴾ [البقرة: ٢٦٦] اس کا مفصل بیان "المبتكر في بيان المؤنث والمذكر" میں ہے)۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ﴿ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ "قُدَّامَ الْمَطَرِ لِأَنَّهُ رِيْحٌ ثُمَّ سَحَابٌ ثُمَّ مَطَرٌ وَهَذِهِ اسْتِعَارَةٌ مَلِيْحَةٌ"[2] انتھیٰ. اس آیتِ کریمہ کی تفسیر سورۃ الاعراف میں پورے طور پر گزر چکی ہے۔[3]

﴿ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا ﴾ یعنی ہم نے ایسا پانی اتارا جس سے طہارت کی جاتی ہے، جس طرح وضو اس پانی کو کہتے ہیں، جس سے وضو کیا جاتا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طہور لغت میں طاہر مطہر کو کہتے ہیں، یعنی وہ چیز جو کہ خود پاک ہو اور دوسری شے کو پاک کر دے۔ کہا ہے کہ فعول کا وزن کلامِ عرب میں کئی معنوں میں آتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ فعول اس شے کے لیے آتا ہے جس سے فعل کیا جاتا ہے، جس طرح کہ طہور وہ شے ہے جس سے طہارت کی جاتی ہے اور وضو وہ پانی ہے جس سے وضو کیا جاتا ہے۔

امام ابن انباری نے کہا: "طَهُوْر" بہ فتحِ طاء اسم ہے، اسی طرح "وَضُوْءٌ وَوَقُوْد" ہے اور بہ ضمِ طاء مصدر ہے۔ لغت میں جو بات مشہور ہے، وہ یہی ہے۔ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ طہور: طاہر و مطہر کو بولتے ہیں، اس کی تائید یہ بات کرتی ہے کہ "طہور" بنائے مبالغہ ہے،[4] اس کی دلیل یہ حدیث ہے جو نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا دریا کے بارے میں کہ « هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ »[5] (أخرجه أبو داود و الترمذي والنسائي) یعنی

---

[1] المصباح المنير (١/ ١٢٨) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٧١) [3] رقم الآية (٥٧) [4] فتح القدير (٤/ ١٠٧)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠٤٨)

دریا کا پانی طاہر مطہر ہے، اس کا مردہ حلال ہے، یعنی مچھلی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ طہور، طاہر کو کہتے ہیں، اس کے لیے اس آیت سے استدلال فرمایا ہے: ﴿ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴾ [الدهر: ٢١] ''اور اُن کا رب انھیں شرابِ طہور پلائے گا۔'' یہاں طہور کے معنی طاہر کے ہیں، اسی کے بارے میں شاعر کا یہ قول ہے:

خَلِيْلِيْ هَلْ فِيْ نَظْرَةٍ بَعْدَ تَوْبَةٍ أُدَاوِيْ بِهَا قَلْبِيْ عَلَى فُجُوْرٍ
إِلَى رُجَحِ الْأَكْفَالِ غِيْدٌ مِنَ الظِّبَا عِذَابُ الثَّنَايَا رِيْقُهُنَّ طَهُوْرٌ

اس شعر میں معشوق کے تھوک کا وصف طہور کے ساتھ کیا ہے، حالاں کہ وہ طاہر ہے مطہر نہیں ہے۔ ثعلب نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور وہی راجح ہے، اس لیے کہ ازہری نے اس کو اہلِ لغت سے حکایت کیا ہے۔ چنانچہ یہ بطور مبالغہ ہے۔ بہرحال شریعت اس بات پر وارد ہوئی ہے کہ پانی فی نفسہٖ پاک ہے اور دوسروں کو پاک کرنے والا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ ﴾ [الأنفال: ١١] ''اور آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا، تاکہ تمھیں اس کے ذریعے سے پاک کر دے۔'' اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ پیدا کیا گیا ہے پانی طہور، پھر بئرِ بضاعہ کی حدیث شریف ذکر کی ہے،[1] اس کے بعد کہا ہے کہ اس کی اسناد میں طویل کلام ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص میں اس کو پورے طور پر ذکر کیا ہے۔[2] علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے شرح منتقیٰ میں ان کی پیروی کی ہے۔[3]

نکتہ:

اللہ پاک نے جو پانی کا وصف طہور کے ساتھ فرمایا ہے تو اس میں دو فائدے ہیں: ایک یہ ہے کہ نعمت پر آگاہ کرنا ہے، یعنی پانی کا خود پاک ہونا ایک نعمت ہے اور دوسری شے کو پاک کر دینا، ایک دوسری نعمت ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس شے کے ساتھ جو بعد میں مذکور ہے، اپنا احسان پورا کرنا ہے، کیوں کہ پاک اور پاک کرنے والا پانی زیادہ تر رچتا پچتا اور نفع بخش ہوتا ہے، اس پانی کی نسبت جس میں کوئی ایسی شے ملی جلی ہو، جو اس کی طہوریت کو زائل کر دے۔ اس میں اللہ پاک اس بات سے آگاہ فرماتا ہے کہ لوگوں کے ظاہر جب کہ ایسے ہیں کہ ان کو پاک کرنا چاہیے تو ان کے باطن پاک صاف اور ستھرا کرنے کے زیادہ لائق ہیں۔

غرضیکہ اللہ پاک نے پانی نازل کرنے کی وجہ بیان فرمائی: ﴿ لِنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ﴾ یعنی ہم نے آسمان سے پاک پانی اس لیے نازل کیا کہ اس پانی سے جو آسمان سے اتارا گیا، مردہ بستی کو زندہ کریں۔ ﴿ بَلْدَةً ﴾ کا وصف میت سے کیا، حالاں کہ میت مذکر کی صفت ہے اور ﴿ بَلْدَةً ﴾ مونث ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ بَلْدَةً ﴾ بہ معنی بلد ہے جو مذکر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''بلد'' سے مراد مکان ہے۔ یا یہ وجہ ہے کہ میت میں مذکر اور مؤنث برابر ہیں۔ اس جگہ زندہ کرنے سے مراد ایسی جگہ سے روئیدگی نکالنا، جس میں نبات نہیں ہے۔

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تلخيص الحبير (١/ ١٢۔ ١٦) [3] نيل الأوطار (١/ ٣٤۔ ٣٦)

﴿ وَنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴾ ضمیر منصوب راجع ہے "ماء" کی طرف، یعنی ہم وہ پانی اپنی مخلوق میں سے بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو پلا دیں۔ امام ابوعمرو و عاصم رحمہ اللہ نے ایک روایت میں اور ابو حیان اور ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے "نَسْقِيه" بفتحِ نون پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت بضمِ نون ہے۔[1] ﴿ مِمَّا ﴾ میں کلمۂ "من" ابتدائیہ ہے اور ﴿ نُسْقِيَهٗ ﴾ سے متعلق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ محذوف سے متعلق ہو، اس بنا پر کہ حال ٹھہرے۔ انعام سے مراد "بهائم" ہیں یعنی اونٹ، گائیں، بکریاں۔ اس پر پہلے کلام گزر چکا ہے۔

انعام کا ذکر خاص کر اس لیے کیا ہے کہ وہ ہمارے ذخیرے ہیں اور اکثر بلاد کی معاش کا ان پر دار و مدار ہے اور اسی لیے ان کے پانی پلانے کو آدمیوں کے پلانے سے پہلے ذکر کیا، جس طرح کہ زمین کے زندہ کرنے کا ذکر اُن سے پہلے کیا ہے، اس لیے کہ زمین انعام کی زندگی اور تعیش کا سبب ہے۔ لہٰذا جو شے آدمیوں کی حیات و معاش کا سبب ہے، اس کو مقدم (پہلے ذکر) کیا۔

﴿ اَنَاسِيَّ ﴾ انسان کی جمع ہے۔ سیبویہ اسی طرف گئے ہیں اور یہی قول راجح ہے۔ امام فراء، مبرد اور زجاج رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ جمع ہے "انسي" کی، یعنی بیائے نسبت کے ساتھ۔ اس میں یہ بات ہے کہ جس اسم میں یائے نسبت ہوتی ہے، اس کی جمع "فعالی" کے وزن پر نہیں آتی۔ امام فراء رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ انسان کی جمع ہے۔ پہلے قول کی بنا پر اصل اناسین ہے، جیسے: سرحان و سراحین وبستان و بساتین، چنانچہ حرفِ یا کو نون سے عوض ٹھہرایا۔[2]

﴿ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ﴾ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ ﴿ صَرَّفْنٰهُ ﴾ کی ضمیر دلائلِ مذکورہ کی طرف راجع ہے، یعنی ہم نے قرآن میں اظلال کے احوال اور بارش کے نازل کرنے کو کھول کر بیان کیا اور باقی کتبِ آسمانی میں بیان کیا، تاکہ وہ غور و فکر کریں اور عبرت پکڑیں۔ کسی نے کہا ہے کہ سب اشیاء مذکورہ میں جو شے سب سے قریب ہے، اس کی طرف ضمیر راجع ہے اور وہ "مَطَر" ہے۔ یعنی ہم نے مطر کو پھیلا دیا مختلف شہروں کے درمیان اور مختلف اوقات میں اور مختلف صفتوں پر، مثلاً: بعض شہروں میں زیادہ برستا ہے، بعض میں کم، اور کسی شہر میں کسی وقت برستا ہے اَور کسی شہر میں اور وقت بارش ہوتی ہے اور کبھی وابل (موٹی بوند کا) ہوتا ہے، کبھی طش (ہلکی بارش)، کبھی طل (شبنم)، کبھی جود (بہت بارش)، کبھی رذاذ اور کبھی دیمہ۔ "رذاذ" نرم ریزہ بارش کو کہتے ہیں، یعنی پھوار۔ دیمہ وہ بارش ہے، جو پیوستہ بغیر بجلی اور کڑک کے ہو، یعنی جھڑی جو کئی دن برابر برستی رہتی ہے۔ غرضیکہ جس جگہ جس وقت جس قسم کی بارش مناسب ہوتی ہے، اسی کے مطابق اس کی حکمت اور فضل و رحمت اور کرم سے پانی برستا ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ ضمیر قرآن شریف کی طرف پھرتی ہے۔ اس سے پہلے تین جگہ قرآن کا ذکر گزر چکا ہے، ایک تو سورت کے شروع میں ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ ﴾ [الفرقان: ١] دوسری: ﴿ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٠٨) [2] فتح القدير (٤/ ١٠٨)

﴿ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ ﴾ [الفرقان: ٢٩] تیسری: ﴿ اِتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٣٠] معنی یہ ہیں کہ البتہ ہم نے واقعی اس قرآن کو بار بار ذکر کیا، اس کی آیتوں کو لوگوں کے درمیان اتارنے کے ساتھ، تاکہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں اور اس میں جو کچھ مذکور ہے، اس سے عبرت لیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ریح کی طرف راجع ہے اس بنا پر کہ ریح بہ معنی ہوا ہے۔ اس بنا پر کہ ضمیر مطر کی طرف راجع ہو، اس کے معنی میں اختلاف کیا ہے، لہٰذا ایک معنی تو وہ ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ تصریفِ مطر سے مراد اس سے طرح طرح کا فائدہ لینا ہے، یعنی پینے میں، پلانے میں، کھیتوں کو سیراب کرنے میں، طہارتوں میں۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے "صَرَفْنٰهُ" بہ تخفیف پڑھا ہے، باقی قراء نے بہ تشدید پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے "لِیَذْكُرُوْا" بہ تخفیفِ ذال پڑھا ہے "ذکر" سے، اور باقی قراء نے بہ تشدیدِ ذال پڑھا ہے "تذکر" سے۔ ﴿ فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴾ اس جگہ کفر سے مراد کفرانِ نعمت ہے اور نعمت کا انکار ہے، یعنی اس کی ناشکری کرنا اور اس کی کم پروا کرنا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفر سے مراد ان کا انواء (ستاروں) کے حق میں یہ قول ہے کہ "مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا"، امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم اہلِ تفسیر میں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں پاتے کہ اس جگہ کفران کا یہ قول ہے: "مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا"[1]

مختار میں کہا ہے کہ ستارے کے مغرب میں منازل سے گرنے کو اور اس کے رقیب کے اسی گھڑی میں مشرق سے طلوع ہونے کو نوء کہتے ہیں، یہ ہر تیرہ دن میں سوائے جبہ کے ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے چودہ دن ہیں۔ عرب لوگ امطار اور ریاح اور گرمی اور سردی کی ساقط ہونے والے تارے کی طرف نسبت کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ طلوع ہونے والے ستارے کی طرف نسبت کرتے تھے، کیوں کہ وہ اس کے سلطان میں ہے۔ "نوء" کی جمع "أنواء" ہے۔[2] (كذا في فتح البيان مع التوضيح الكافي)

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا ۟ۖ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ﴿٥٢﴾ وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٥٣﴾ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ﴿٥٤﴾

اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیجتے (51) چناں چہ آپ کافروں کی اطاعت نہ کریں

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٥٧) [2] مختار الصحاح (١/ ٦٨٨) فتح البيان (٩/ ٣١٩ـ ٣٢٢)

اور ان سے بذریعہ قرآن بڑے زور کا جہاد کریں (52) اور وہی (اللہ) ہے جس نے دو سمندر ملائے، یہ بہت لذیذ و شیریں ہے (پیاس بجھانے والا)، اور یہ بہت کڑوا کھاری ہے، اور اس نے ان دونوں کے درمیان ایک پردہ اور مضبوط آڑ رکھی (53) اور وہی (اللہ) ہے جس نے پانی (منی) سے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کے نسبی اور سسرالی رشتے ٹھہرائے، اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے (54)

رسول اللہ ﷺ کی عالمگیر رسالت کا بیان:

یعنی نبی کا آنا تعجب نہیں۔ اللہ چاہے تو نبیوں کی بہتات کر دے، ہر بستی میں ایک نبی، سو تو کافروں کے انکار سے شبہہ نہ کھا۔ اپنی اولاد کا جد ہے اور جہاں ان کا نکاح ہوا وہ ان کا سسرال ہے، اور رب سب کچھ کر سکتا ہے، یعنی مارے پھر زندہ کر دے۔ انتھیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے، تا کہ وہ ان کو اللہ عزوجل کی طرف بلاتا، لیکن اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو ساری زمین والوں کی طرف بعثت کے ساتھ خاص کیا ہے اور ہم نے تجھ کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ تو ان کو یہ قرآن پہنچا دے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ١٩] ''تا کہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ١٧] ''اور تمام فرقوں میں سے جو بھی اس کا منکر ہو، اس کے آخری وعدے کی جگہ جہنم ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ [الشورىٰ: ٧] ''تا کہ آپ اہلِ مکہ اور اس کے گرد و پیش والوں کو ڈرائیں۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ''کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

صحیحین میں ہے کہ میں اسود و احمر کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ یہ بھی مروی ہے کہ نبی ایک خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔[1] اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ ﴾ یعنی قرآن کے ساتھ، یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[2] ﴿ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾

[التوبة: ٧٣] ''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے اور ان کا (اصل) ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ لوٹ کر جانے کی بدترین جگہ ہے۔''

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١) (2) تفسير الطبري (١٩/ ٢٨١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ ﴾ یعنی اللہ پاک نے دو پانی پیدا کیے: میٹھا اور کھاری۔ میٹھا جیسے نہریں، ندیاں، چشمے اور کنویں۔ یہ وہی دریائے حلو، عذب، فرات، زلال، یعنی آبِ شیریں صاف پیاس بجھانے والا ہے۔ یہ قول ابن جریج کا ہے، اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اس معنی میں کسی طرح کا شک نہیں ہے، کیوں کہ وجود میں کوئی بحر ساکن نہیں ہے اور وہ عذبِ فرات ہو، اور اللہ پاک نے جو خبر دی ہے تو وہ واقع کی خبر دی ہے، تاکہ جو نعمتیں اللہ نے اپنے بندوں کو عطا کی ہیں، ان سے ان کو آگاہ کرے، تاکہ وہ اس کا شکر ادا کریں۔ پس دریائے شیریں وہ یہی دریا ہیں جو لوگوں کے درمیان جاری ہیں۔ اللہ پاک نے اس کو اپنی مخلوق کے درمیان پھیلا دیا ہے، ان کو نہریں، ندیاں اور چشمے بنا کر ہر زمین میں ان کی اپنی ضرورت کے مطابق اور ان کی زمینوں کو سیراب کرنے کے مطابق، کیوں کہ وہ اس کے حاجت مند ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ﴾ یعنی یہ دریا کھاری کڑوا کہ کوئی اس کو پی نہیں سکتا۔ یہ دریا ایسے ہیں کہ مشرق و مغرب میں مشہور و معروف ہیں بحرِ محیط، اور جو کھاڑیاں اس سے متصل ہیں اور بحرِ قلزم، بحرِ یمن، بحرِ فارس، بحرِ بصرہ، بحرِ چین، بحرِ ہند، بحرِ روم، بحرِ جرر اور وہ دریائے ساکن جو جاری نہیں، ان سے ملتے جلتے اور مشابہ ہیں، لیکن یہ دریا موج مارتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں۔ سردی کے اور ہواؤں کی تیزی کے زمانے میں ان میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ ان میں سے وہ دریا ہے جس میں مد و جزر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر مہینے کے شروع میں اس سے مد و فیض حاصل ہوتا ہے، پھر جب مہینا گھٹنا شروع کرتا ہے تو وہ دریا جزر کرتے ہیں، یعنی سمٹ جاتے ہیں، یہاں تک کہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ پھر جب دوسرے ماہ کا چاند نکلتا ہے تو مَد میں شروع کرتے ہیں چودھویں رات تک، پھر سمٹنا شروع کرتے ہیں۔

اللہ پاک نے اس کی عادت جاری کر رکھی ہے اور وہ پوری قدرت والا ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اللہ پاک نے ان سارے ساکن دریاؤں کو کھارا پیدا کیا ہے، تاکہ ان کے سبب سے ہوا بدبودار نہ ہو جائے کہ اس سے عالمِ وجود میں خرابی ہو اور تاکہ زمین میں جو حیوان مرتے ہیں، ان کی وجہ سے گندا نہ ہو جائے اور جب کہ ان کا پانی کھاری ہوا تو ان کی ہوا صحیح ہوئی اور ان کا مردار پاک ہوا اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب آپ ﷺ سے کسی نے آبِ دریا کا پوچھا تھا کہ کیا ہم دریا کے پانی سے وضو کریں تو آپ ﷺ نے فرمایا: «هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ» یعنی اس کا پانی پاک ہے اور اس کا میتہ (مردار) حلال ہے۔[1] (رواه الأئمة مالك والشافعي وأحمد وأهل السنن بإسناد جيد)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾ یعنی شیریں اور کھاری کے درمیان ایک حاجز (رکاوٹ) کر دیا۔ اس سے مراد زمین کا یبس ہے اور ﴿ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾ یعنی ایک رکاوٹ ہے کہ ایک دوسرے تک

[1] الموطأ (١/ ٢٢) مسند الشافعي (١/ ٧) مسند أحمد (٢/ ٣٦١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠٤٨)

نہیں پہنچتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝١٩ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝٢٠ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ [الرحمٰن: ١٩۔ ٢١] ''رحمان نے دو سمندر جاری کیے جو باہم ملتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے، وہ دونوں (اس سے) تجاوز نہیں کرتے۔ پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [النمل: ٦١] ''(کیا یہ بت بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جس نے زمین ٹھہرنے کے لائق بنائی، اور اس کے درمیان نہریں بنائیں اور اس کے لیے اس نے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان آڑ رکھی؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) الٰہ ہے؟ (نہیں!) بلکہ ان کے اکثر علم نہیں رکھتے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَاۗءِ بَشَرًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک نطفۂ ضعیف سے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کو ٹھیک کیا اور برابر کیا اور اس کو کامل الخلقت بنایا۔ نر یا مادہ جیسے چاہتا ہے، پھر اس کا نسب اور صہر (سسرال) کیا۔ چنانچہ وہ اپنے ابتدائے حال میں ایک نسب والا بچہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی پہلے پہلے تو ایک بوند پانی تھا، پھر اپنی ماں کے پیٹ میں اس کے اعضاء بنے، شکل وصورت بنی، پھر پیدا ہوتے ہی ناتے والا ہوا کہ ماں باپ سے اس کا ناتا لگا کہ کسی کا بیٹا اور پوتا کہلانے لگا، پھر شادی کرتا ہے تو دامادی کی قرابت والا ہو جاتا ہے۔ بیاہ کے تعلق سے اس کے ساتھ کئی رشتے لگ جاتے ہیں، کسی کا یہ داماد ہوتا ہے، کوئی اس کا سسر ہوتا ہے کوئی سالا، پھر اس کے لیے اصہار و اختان وقرابات ہو جاتی ہے۔ (اصہار، صہر خسر اصہار عورت کے گھر والے۔ اختان ختن داماد۔ عرب کے نزدیک ہر وہ شخص جو عورت کی طرف سے ہو، جیسے: جورو کا باپ، بھائی، یہ لوگ اختان ہیں اور عام کے نزدیک ختن آدمی کا اس کی بیٹی کا خاوند ہے۔ كذا في الصرح)۔ ان سب رشتوں کا ظہور ایک ذلیل وحقیر پانی سے ہوا ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴾ یعنی تیرا رب بڑی قدرت والا ہے کہ اس نے اپنی قدرتِ تامہ و حکمتِ بالغہ سے پانی کی ایک بے حقیقت بوند کا کیا کچھ کارخانہ کر دیا اور اس سے کس قدر تعلق لگا دیے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو البتہ تیرے وقت میں ہر بستی میں ایک رسول بھیجتے، تاکہ ان کو ڈرائے اور یہ رسل مبعوثین تیرے معاون اور مددگار ہو جاتے تو تجھ پر نبوت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا، جس طرح بارش کو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیا ہے، لیکن ہم نے یہ نہ کیا، بلکہ صرف ایک ہی ڈرانے والا مقرر کیا ہے اور وہ تو ہے اے پیغمبر! اور نبوت کے کام کو صرف تجھ ہی پر ڈالا، یہ اس لیے کیا کہ تیرا اجلال ہو اور تعظیمِ شان ہو اور تاکہ تجھے سارے رسولوں پر فضیلت حاصل ہو اور اس لیے کہ تیرے لیے بڑا اجر ہو۔ لہٰذا تو اس کا مقابلہ اس طرح سے کر کہ

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٢٦۔ ٤٢٧)

نعمت کا شکر ادا کر اور دعوت الی اللہ اور حق کو ظاہر کرنے کے لیے سعی اور کوشش کرتا رہ اور اس کام میں ثابت قدم رہ۔ کافر لوگ جو تجھے اپنے معبودوں کی اتباع کی طرف بلاتے ہیں تو اس میں ان کا مطیع نہ ہو، بلکہ دعوت میں کوشش کر اور اس میں ثابت قدم رہ اور گھبرا مت۔

﴿ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾ میں ضمیر قرآن شریف کی طرف راجع ہے، یعنی ان سے قرآن کے ساتھ مقابلہ کر اور جو اس میں قوارع (کھٹکے) وزواجر (دھمکیاں) اور اوامر ونواہی ہیں، وہ ان پر پڑھ۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر اللہ پاک کی طرف راجع ہے یا اسلام کی طرف یا تلوار کی طرف، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ یہ سورت مکی ہے اور قتال کا حکم ہجرت کے بعد ہوا ہے۔ کسی نے کہا کہ ضمیر ترکِ اطاعت کی طرف راجع ہے، جو ﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ سے سمجھا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس شے پر ﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴾ دال ہے اس کی طرف ضمیر پھرتی ہے، کیوں کہ اللہ پاک اگر ہر بستی میں ایک نذیر بھیجتا تو ہر نذیر پر اس بستی کا مجاہدہ فرض ہوتا، جس کی طرف وہ بھیجا گیا اور جبکہ ساری بستیوں کے لیے ایک ہی نذیر پر اکتفا کیا گیا اور وہ نبی اکرم ﷺ ہیں تو ضروری ہے کہ آپ ﷺ پر تمام مجاہدات جمع ہوں۔ لہٰذا آپ کا جہاد کبیر اور عظیم ہوا اور اس میں تمام مجاہدے جمع ہو گئے۔

گویا آپ ﷺ سے یوں فرمایا کہ کیوں کہ تو ساری بستیوں کے لیے نذیر ہے، اس لیے تو ان سے جہاد کر ایسا جہاد جو ہر مجاہدے کا جامع ہو۔ ان دونوں وجھوں میں جو بعد ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔ جہادِ کبیر سے مراد جہادِ شدید ہے، جس کا وقوع اللہ پاک کے نزدیک عظیم موقع میں ہو، اس لیے کہ اس میں مشقتیں اٹھائی جاتی ہیں، کیوں کہ احمقوں اور بے وقوفوں سے دلائل اور براہین کے ساتھ لڑنا دشمنوں کے ساتھ تلواروں سے لڑنے سے زیادہ مشکل ہے، اس سے مراد آپ کا دوسرے مسلمانوں کو آمادہ اور برانگیختہ کرنا ہے اور ان کو متحرک کرنا ہے۔

پھر اللہ پاک نے توحید کی چوتھی دلیل ذکر فرمائی اور ارشاد فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ ﴾ "أَيْ: أَرْسَلَهُمَا مُتَجَاوِرَيْنِ أَوْ خَلَاهُمَا مُتَلَاصِقَيْنِ بِحَيْثُ لَا يَتَمَازَجَانِ" یعنی وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو چھوڑ رکھا ہے، اس حال میں کہ ان میں سے ایک دوسرے سے مجاور ہے۔ یا ان کو رہا کیا اس حال میں کہ ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے، اس طریقے سے کہ ایک دوسرے سے ملتا نہیں ہے۔ ﴿ مَرَجَ ﴾ بہ معنی "غلی و خلط و أرسل" سے ماخوذ ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "مَرَجْتُ الدَّابَّةَ وَأَمْرَجْتُهَا" جبکہ تو جانور کو چراگاہ میں چھوڑے اور اس کو تو رہا کر دے کہ جہاں چاہے چلا جائے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ ﴾ کے معنی ہیں: "أَرْسَلَهُمَا وَأَفَاضَ أَحَدَهُمَا إِلَى الْآخَرِ" یعنی ان کو چھوڑ دیا اور ایک کو دوسرے کی طرف پہنچا دیا۔ ابن عرفہ نے کہا ہے کہ خلط کر دیا ان کو تو وہ دونوں ملتے ہیں۔

محاورۂ عرب میں جبکہ تو کسی شے کو کسی شے میں خلط کر دے تو بولے گا کہ "مَرَجْتُهُ أَيْ: خَلَطْتُهُ" دین اور

امر جب مختلط و مضطرب ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں: ”مُرِجَ الدِّيْنُ وَالْأَمْرُ“ اس معنی سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ﴾ [ق: ٥] ”وہ ایک الجھاؤ میں پڑ گئے ہیں۔“ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا: ”مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ: خَلَّى بَيْنَهُمَا لَا يَلْتَبِسُ أَحَدُهُمَا بِالْآخَرِ“ یعنی دو دریاؤں کے درمیان تخلیہ کر دیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ ملتبس نہیں ہوتا (خلط ملط نہیں ہوتا)۔ ”يُقَالُ: مَرَجْتُ الدَّابَّةَ إِذَا خَلَّيْتَهَا تَرْعَى“ امام ثعلب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مَرَجَ﴾ اجراء ہے، معنی یہ ہیں کہ جاری کر دیا ان کو۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک قوم کہتی ہے کہ ”أَمْرَجَ الْبَحْرَيْنِ“ مثل ”مرج“ کے ہے، ”فَعَلَ وَأَفْعَلَ“ کے ایک معنی ہیں۔[1]

﴿عَذْبٌ فُرَاتٌ﴾ وہ پانی ہے کہ بلیغ العذوبت ہو، یعنی حلاوت (میٹھا پن) کی طرف مائل ہو اور جملہ مستأنفہ ہے، سوال مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ ان کو کیسا ملایا تو یہ اس کے جواب میں کہا گیا: ﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ﴾ یا محلِ نصب میں ہے، بنا بر حال بتقدیرِ قول، یعنی اس حال میں کہ ان کے حق میں یہ کہا گیا ہے کہ ﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ﴾ کسی نے کہا ہے کہ آبِ شیریں کو فرات اس لیے کہتے ہیں کہ ”إِنَّهُ يُفْرِتُ الْعَطَشَ“ فرت قطع وشق وکسر کو کہتے ہیں، چوں کہ وہ پیاس کو بجھا دیتا ہے، قطع کرتا ہے اس لیے اس کو فرات بولتے ہیں۔ ﴿فُرَاتٌ﴾ کی جمع نہیں کی جاتی، مگر شاذ و نادر، ”فرتان“ بروزن ”غربان“ پر۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾ اس کے معنی ہیں: بلیغ الملوحۃ یعنی انتہائی کھاری۔ کسی نے کہا ہے کہ ”اَلْبَلِيْغُ فِي الْحَرَارَةِ“ یعنی حرارت میں انتہائی درجے کا۔ کسی نے کہا ہے کہ تلخی میں انتہائی درجے کا۔ طلحہ نے ”مَلِحٌ“ بفتحِ میم وکسرِ لام پڑھا ہے۔[2] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: ”خَلَعَ أَحَدَهُمَا عَلَى الْآخَرِ“[3] یعنی ایک کو دوسرے پر اڑھا دیا ہے۔ اس لیے نہ شیریں کھاری میں کوئی خرابی کرتا ہے اور نہ کھاری شیریں میں۔ یہ جملہ خوب ترین مقابلوں میں سے ہے، اس لحاظ سے کہ یوں فرمایا ہے: ”عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّمِلْحٌ أُجَاجٌ“۔ برزخ وہ حائل اور رکاوٹ ہے، جس کو اللہ پاک نے اپنی قدرت سے ان کے درمیان کر دیا ہے، وہ ان کے درمیان فصل اور جدائی رکھتا ہے اور ان کو باہم ملنے سے روکتا ہے اور وہ محسوس نہیں ہوتا۔

﴿حِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ کے معنی ہیں ”سِتْرًا مَّسْتُوْرًا“ یعنی ایک ایسا پوشیدہ پردہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ ملنے سے روکتا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتا۔ نہ کھاری شیریں کو فاسد کرتا ہے اور نہ شیریں کھاری کو۔ لہٰذا برزخ حاجز ہوا اور حجر مانع (روکنے والا)۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے وہی معنی ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں کہ ایک کلمہ ہے کہ جس کو پناہ مانگنے والا کہا کرتا ہے۔

گویا ہر دریا دوسرے سے پناہ مانگتا ہے اور اس سے یہ بات کہتا ہے کہ ﴿حِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ یہ استعارہ تمثیلیہ

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٥٨) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٥٩) [3] تفسير الطبري (١٩/ ٢٨٣)

ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ”حَدًّا مَّحْدُوْدًا“، مثلاً دجلہ کھاری دریا میں داخل ہوتا ہے، پھر اسے پھاڑتا ہے، پھر میلوں تک اس کے درمیان میں بہتا ہے، حالاں کہ اس کا مزہ نہیں بدلتا۔ کسی نے کہا ہے کہ حرام محرم ہے کہ یہ کھاری میٹھے سے میٹھا یا میٹھا کھاری سے کھارا ہو جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے امر و قضا سے ایک کو دوسرے سے روک دیا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ بحرِ عذب سے مراد بڑی بڑی نہریں ہیں، جیسے نیل و فرات و جیحون اور بحرِ اجاج سے مراد مشہور بحر (سمندر) ہیں اور اُن کے درمیان زمین سے برزخ حائل ہے۔

غرضیکہ اللہ پاک نے انسان کو پانی سے پیدا کیا، پھر اس کے احوال میں سے ایک یہ حالت بیان فرمائی: ﴿وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا﴾ اس جگہ ”ماء“ سے مراد آبِ نطفہ ہے، یعنی وہی ہے جس نے آبِ نطفہ سے انسان کو پیدا کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ صرف پانی مراد ہے، جو اس آیتِ کریمہ سے مراد ہے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ﴾ [الأنبياء: ٣٠] ”اور ہم نے پانی سے ہر زندہ شے بنائی۔“ کسی نے کہا ہے کہ وہ پانی ہے، جس سے آدم علیہ السلام کی طینت خمیر کی گئی اور اس کو مادۂ بشر کا ایک جز ٹھہرایا، تا کہ وہ مجتمع ہو اور اس کا سلسلہ چلے اور شکلوں اور صورتوں کی قبولیت کے لیے بہ سہولت مستعد ہو۔[2] (قاله أبو السعود)

﴿فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا﴾ یعنی پھر اس کو صاحبِ نسب و صہر کر دیا۔ نسب سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ نکاح حلال نہیں اور صہر وہ ہے جس سے نکاح حلال ہے۔ یہ قول امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ کا ہے۔ ”صہر“ اس محاورے سے مشتق ہے کہ جب تو کسی شے کو خلط ملط کرے تو یوں کہے گا: ”أَصْهَرْتُ الشَّيْءَ“ مناکح (جن سے نکاح کیا جائے) کا نام صہر اس لیے رکھا ہے کہ لوگ اس سے مختلط ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ صہر نکاح کی قرابت ہے۔ لہٰذا زوجہ کی قرابت تو اختان ہیں اور زوج (شوہر) کی قرابت احماء ہیں اور اصہار دونوں کے لیے عام ہے۔[3] (قاله الأصمعي)

قاموس میں ہے: ”اَلصِّهْرُ بِالْكَسْرِ: اَلْقَرَابَةُ وَالْخَتَنُ وَجَمْعُهُ أَصْهَارٌ“[4] مصباح میں ہے، خلیل نے کہا ہے کہ صہر عورت کے گھر والے ہیں۔ کہا: اور بعض عرب احماء و اختان دونوں کو اصہار ٹھہراتے ہیں۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صہر عورتوں کے محرم قریبی رشتہ داروں کو کہتے ہیں، جیسے: ماں باپ اور بھائی اور بھائیوں کی اولاد اور چچا اور ماموں اور خالائیں، پس یہ لوگ عورت کے شوہر کے اصہار ہیں اور جو لوگ مرد کی طرف سے اس کے قریبی محرم رشتہ دار ہیں، وہ اس کی بیوی کے اصہار ہیں۔ ابن سکیت رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر وہ شخص کہ زوج کی طرف سے ہے، اس کا باپ یا بھائی یا چچا، پس یہ لوگ احماء ہیں اور جو عورت کی طرف سے ہیں تو وہ اختان ہیں اور اصہار میں دونوں قسمیں شامل ہیں۔[5] ”صَاهَرْتُ لَهُمْ وَإِلَيْهِمْ وَفِيْهِمْ صَرَفَ لَهُمْ صِهْرًا“ انتہیٰ.

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٠٩) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٢٦) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٦٠)
[4] القاموس المحيط (١/ ٥٤٩) [5] المصباح المنير (١/ ١٨٢)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ نسب وصہر دو معنی میں عام ہیں ہر قرابت کو جو دو آدمیوں کے درمیان ہوتی ہے۔[1] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ نسبت سات قسم کی قرابت ہے، اس کو اس آیتِ کریمہ میں جمع کیا گیا ہے: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ ﴾ اور یہاں سے ﴿ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ ﴾ تک "صہر" کی وجہ سے حرمت ہے۔ صہر، وہ خلطت ہے جو مشابہ قرابت ہے اور وہ نسبِ محرم ہے نکاح کے لیے۔ اللہ پاک نے سات قسمیں تو نسب سے حرام کی ہیں اور سات صہر کی طرف سے، یعنی سبب سے ان میں سے آیتِ مذکورہ میں چھے کا ذکر ہے اور ساتویں قسم یہ ہے، جو اس آیتِ کریمہ میں مذکور ہے: ﴿ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾ [النساء: ٢٢] "اور جن عورتوں سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہو، ان سے تم نکاح نہ کرو۔"

امام ابن عطیہ اور زجاج رحمہما اللہ وغیرہما نے رضاع کو من جملہ نسب ٹھہرایا ہے۔ اس کی تائید نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے: «يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»[2] اللہ پاک نے دو قسم پر بشر کی تقسیم فرمائی ہے: ایک تو ذوی نسب، یعنی مرد لوگ جن کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے۔ چنانچہ یوں بولتے ہیں: "فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ" اور "فُلَانَةُ بِنْتُ فُلَانٍ"۔ دوسری قسم ذواتِ صہر ہیں، یعنی وہ عورتیں جن سے مصاہرت کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴾ [القیامة: ٣٩] "پھر اس سے مذکر اور مؤنث کا جوڑا بنایا" امام عبد بن حمید رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن مغیرہ سے روایت کیا ہے، کہا: کسی نے عمر رضی اللہ عنہ سے نسب وصہر کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ میں گمان کرتا ہوں کہ تم نسب کو پہچان گئے۔ رہا صہر سو اختان وصحابہ ہیں۔[3] (فتح القدیر و فتح البیان میں اسی طرح ہے، مگر یہ لفظ اصہار معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم)

﴿ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک بلیغ القدرت وعظیم القدرت ہے، اس کی قدرتِ باہرہ میں سے یہ ہے کہ اس نے پانی کی ایک بوند سے انسان بنایا اور پھر اسے دو مذکورہ قسموں میں تقسیم کر دیا۔ پھر جب اللہ پاک توحید کے دلائل کا ذکر کر چکا تو کفار کی قباحتوں اور اُن کی سیرت کی فضیحتوں کی طرف عود کیا۔[4] چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ
الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ۝۵۵ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۵۶
قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ
اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۵۷ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٥٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٧)
[3] الدر المنثور (٦/ ٢٦٦) [4] فتح البيان (٩/ ٣٢٢_ ٣٢٥)

وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۚۛ ﴿۵۸﴾ الَّذِيْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى
الْعَرْشِ ۚۛ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا
لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ
نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾

اور وہ اللہ کے علاوہ ان کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، اور کافر تو اپنے رب کے مقابل (شیطان کا) مددگار ہے 55 اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے 56 کہہ دیجیے: میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا، مگر جو یہ چاہے کہ اپنے رب کی طرف راہ پکڑے (وہ اسے مان لے) 57 اور آپ اس زندہ (اللہ) پر توکل کیجیے جو مرے گا نہیں اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے کو کافی ہے 58 وہ ذات جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھے دنوں میں، پھر وہ عرش پر مستوی ہوا، (وہی) رحمان ہے، لہٰذا کسی باخبر سے اس کی شان پوچھ لیں 59 اور جب ان سے کہا جائے رحمان کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں: کیا ہے رحمان؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دیتا ہے؟ اور اس (تبلیغ) نے ان کو نفرت میں زیادہ کر دیا 60

مشرکوں کی جہالت کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس بات میں مشرکوں کی جہالت کی خبر دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں کو پوجتے ہیں جو نہ کسی نقصان کے مالک ہیں نہ کسی نفع کے۔ وہ یہ شرک کسی دلیل کے ساتھ نہیں کرتے کہ جو اُن کو اس طرف کھینچ کر لے جائے، نہ ہی ان کے پاس کوئی حجت ہے جو ان کو اس طرف پہنچائے، بلکہ وہ یہ صرف آرا اور خواہشات اور دل کی خواہش سے کرتے ہیں، لہٰذا وہ بتوں کو دوست رکھتے ہیں اور ان کی راہ میں لڑتے ہیں اور ان کے بارے میں اللہ اور رسول اور مومنین سے دشمنی کرتے ہیں، اسی لیے اللہ پاک نے یہ فرمایا: ﴿ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴾ یعنی کافر شیطان کی راہ میں اللہ کے جتھے کے خلاف مدد کرنے والا ہے، حالانکہ غالب ہونے والا اللہ ہی کا جتھا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴾ [يٰسٓ: ٧٤۔ ٧٥] ''اور انھوں نے اللہ کے سوا کئی معبود بنا لیے، تاکہ ان کی مدد کی جائے۔ وہ (معبود) ان کی مدد کی طاقت نہیں رکھتے، جب کہ وہ (مشرکین) تو خود ان (بتوں) کے حاضر باش لشکری (حمایتی) ہیں۔''

یعنی ان کے معبود جن کو انھوں نے اللہ کے سوا پکڑا ہے، وہ ان کے لیے کسی مدد کے مالک نہیں ہیں اور یہ جاہل نادان بتوں کے لیے ایک لشکر حاضر ہیں کہ ان کی طرف سے لڑتے ہیں اور اُن کے حوزی (قوم کی جگہ، شہر) سے دور کرتے ہیں، لیکن اچھا انجام اور نصرت تو اللہ پاک کے لیے ہے اور دنیا اور آخرت میں اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مظاہرت کا مطلب ہے کہ اللہ کی معصیت پر شیطان کی مدد کرتا ہے اور اس کی اعانت کرتا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کافر شیطان کے لیے عون، یعنی مددگار ہے، اپنے رب کے خلاف عداوت اور شرک کے ساتھ۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ظَهِيْرًا ﴾ بمعنی "مَوَالِيًا" ہے، یعنی موالات اور دوستی کرنے والا۔[1] پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ یعنی نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو مگر خوش خبری سنانے والا مومنوں کو اور ڈرانے والا کافروں کو۔ اس شخص کو جنت کی خوش خبری دینے والا جس نے اللہ کی اطاعت کی اور اس کو سخت عذاب کے آنے سے پہلے ڈرانے والا جس نے اللہ کے حکم کی مخالفت کی۔

﴿ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ﴾ تو کہہ دے کہ میں تم سے اللہ کا پیغام پہنچانے پر اور اس ڈرانے پر تم سے کوئی اُجرت اور مزدوری نہیں مانگتا کہ تمھارے مالوں سے طلب کروں، میں تو اس کام کو اللہ کی ذات کے طلب کرنے کے لیے اور اس شخص کے لیے کرتا ہوں جسے تم میں سے اللہ صراطِ مستقیم پر لانا چاہتا ہے۔ ﴿ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ یعنی مگر وہ شخص جو اپنے رب کی طرف راہ اختیار کرنا چاہے۔ ﴿ سَبِيْلًا ﴾ سے مراد وہ طریق ومسلک ومنہج ہے کہ اس میں اس شے کی پیروی کرے جس کو نبی ﷺ لے کر آئے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ﴾ یعنی تو اپنے سارے کاموں میں اس اللہ پر بھروسا کرنے والا ہو جو زندہ ہے کبھی نہ مرے گا اور وہی اول و آخر و ظاہر و باطن ہے اور اس کو ہر چیز کی خوب خبر ہے اور وہ دائم و باقی اور سرمدی و ابدی اور حی و قیوم ہے اور رب اور بادشاہ ہے ہر شے، کا تو اس کو اپنا ذخیرہ اور ملجا بنا کہ اسی پر بھروسا کیا جاتا ہے اور اسی کی طرف گھبرا کر دوڑتے ہیں۔ بے شک وہی کافی و ناصر و موید و مظفر و مددگار ہے۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [المائدة: ٦٧] ''اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧١١)

ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا، اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا۔"

امام ابن ابی حاتم نے شہر بن حوشب سے روایت کیا ہے کہ سلمان رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کی کسی گلی میں ملے، (اصل روایت کے الفاظ: "بَعْضَ فِجَاجِ الْمَدِيْنَةِ" ہیں۔ "فِجَاج" بالکسر جمع "فج" کی ہے۔ "فج" دو کوہ کے درمیان کشادہ راہ کو کہتے ہیں)۔ تو سلمان رضی اللہ عنہ نے آپ کو سجدہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلمان! مجھے سجدہ مت کر تو اس زندہ کو سجدہ کر جو نہ مرے گا۔[1] (وهذا مرسل حسن)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ﴾ اللہ پاک نے اس آیتِ کریمہ میں اپنی حمد کو تسبیح کے ساتھ رکھا ہے، یعنی اس کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ، اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرمایا کرتے تھے: « سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ »[2] یعنی تو اللہ کے لیے عبادت کو خالص کر اور توکل کو بھی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴾ [المزمل: ۹] "(وہ) مشرق ومغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کو کارساز بنا لیجیے۔" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ۱۲۳] "چناں چہ آپ اسی کی عبادت کریں اور اسی پر توکل کریں۔" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ﴾ [الملك: ۲۹] "کہہ دیجیے: وہ رحمان ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر ہم نے توکل کیا۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے بندوں کے گناہوں سے خوب خبردار ہے، اس کا علم تام کافی ہے۔ اس پر کوئی پوشیدہ شے بھی پوشیدہ نہیں ہے، نہ ہی اس پر کوئی ذرہ برابر چیز غائب ہوتی ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ﴾ یعنی اللہ پاک وہ زندہ ہستی ہے کہ نہ مرے گا اور وہ ہر شے کا مالک، خالق، رب اور بادشاہ ہے جس نے اپنی قدرت اور سلطان سے ساتوں آسمانوں کو ان کی بلندی و وسعت اور فراخی کے ساتھ پیدا کیا اور ساتوں زمینوں کو ان کی پستی اور کثافت، یعنی دبیز اور موٹا ہونے کے ساتھ چھے دن میں پیدا فرمایا۔ ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ "أَيْ: يُدَبِّرُ الْأَمْرَ وَيَقْضِي بِالْحَقِّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ" یعنی اللہ پاک کام کی تدبیر کرتا ہے اور صحیح فیصلہ کرتا ہے اور وہ تمام فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔

﴿ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴾ "أَيْ: اِسْتَعْلِمْ عَنْهُ مَنْ هُوَ خَبِيْرٌ بِهِ عَالِمٌ بِهِ فَاتَّبِعْهُ وَاقْتَدِ بِهِ" یعنی اس کے بارے میں اس شخص سے پوچھ جو اس کی خبر رکھنے والا واقف کار اور جاننے والا ہے، چنانچہ اس کی اتباع اور اقتدا کر۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ اللہ کے بندے اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اللہ کا جاننے والا اور خبر رکھنے والا کوئی نہیں

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲۷۱۳) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷٦۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٤)

ہے، اور کیسے ہو، آپ تو اولادِ آدم علیہ السلام کے سردار ہیں دنیا اور آخرت میں۔ آپ کی شان تو یہ ہے: ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ [النجم: ۳۔ ٤] ''اور وہ (اپنی) خواہش سے نہیں بولتا۔ وحی ہی تو ہے جو (اس کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔''

چنانچہ جو بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہی حق ہے اور جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی، وہی صدق و راست ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی امامِ محکم اور پیشوائے مطلق ہیں۔ جس وقت لوگ کسی شے میں جھگڑیں تو ضروری ہے کہ اپنے جھگڑے کو ان کے پاس لے جائیں۔ پھر جو بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کے مطابق ہے حق وہی ہے، اور جو ان کے مخالف ہے وہ مردود ہے اس کے کہنے والے پر، وہ خواہ کوئی ہو۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [النساء: ٥٩] ''پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [الشوریٰ: ١٠] ''اور (دین کی) جس چیز میں بھی تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ [الأنعام: ١١٥] ''اور آپ کے رب کی بات صدق اور عدل میں مکمل ہے۔'' یعنی سچا ہے خبر دینے میں اور عدیل ہے اوامر و نواہی میں، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس چیز کی میں نے تجھے خبر دی تو وہ ویسی ہی ہے، جیسی میں نے تجھے خبر دی۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ شمر بن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: "هٰذَا الْقُرْآنُ خَبِيْرٌ بِهٖ" یعنی یہ قرآن اس کا بڑا باخبر ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے مشرکوں پر انکار کیا جو بتوں اور اللہ کے سوا انداد کو سجدہ کرتے ہیں۔ ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ﴾ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہے؟ یعنی ہم رحمان کو نہیں پہچانتے۔ مشرک لوگ اس بات کا انکار کرتے تھے کہ اللہ کا نام رحمان رکھیں، چنانچہ حدیبیہ کے دن انھوں نے اس کا انکار کیا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب سے فرمایا کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" لکھ تو بولے کہ ہم رحمان اور رحیم کو نہیں پہچانتے، لیکن وہی لکھو جیسے تم پہلے لکھا کرتے تھے، یعنی "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ"[2] اسی لیے اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ﴾ [بني إسرائيل: ١١٠] ''کہہ دیجیے: (اللہ کو) ''اللہ'' کہہ کر پکارو یا ''رحمان'' کہہ کر، تم جس نام سے بھی پکارو تو اسی کے لیے

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٨٧) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧١٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨٤)

اچھے سے اچھے نام ہیں۔'' یعنی وہ اللہ ہے اور وہ رحمان ہے۔ اور اس آیت میں یوں فرمایا: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ﴾ یعنی اس کو نہیں پہچانتے، نہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔

﴿ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا ﴾ یعنی کیا ہم صرف تیرے کہنے سے سجدہ کر لیں۔ ﴿ وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴾ رہے مومنین تو وہ اللہ کو پوجتے ہیں جو رحمان و رحیم ہے اور صرف اسی کو معبود جانتے ہیں اور اس کو سجدہ کرتے ہیں۔ علما نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ یہ سجدہ جو سورۃ الفرقان میں ہے، اس کے پڑھنے والے کو اور سننے والے کو وہاں سجدہ کرنا مشروع ہے، چناں چہ یہ بات اپنی جگہ میں ثابت ہو چکی ہے۔[1] واللّٰہ سبحانہٗ وتعالیٰ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا واضح بیان یہ ہے کہ پوجتے ہیں اللہ کے سوا اس چیز کو جو انھیں نفع نہ دے، اگر وہ اسے پوجیں۔ اور نقصان نہ پہنچائے ان کو، اگر وہ اسے چھوڑ دیں۔ ''ظهير'' بہ معنی مظاہر ہے، یعنی معاون ہے اپنے رب پر شرک و عداوت کے ساتھ۔ رب پر مظاہرت لعینہ اس کے رسول پر مظاہرت ہے، یا اس کے دین پر۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کافر شیطان کی متابعت کرتا ہے اور اللہ کی معصیت میں اس کی معاونت کرتا ہے، کیوں کہ کافروں کا بتوں کو پوجنا شیطان کی معاونت ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: معنی یہ ہیں کہ کافر اپنے رب پر ھین ہیں،[2] یعنی اس کے نزدیک ذلیل ہیں اور ان کی کچھ قدر نہیں، وہ بالکل بے حقیقت ہیں۔ یہ معنی عرب کے اس قول سے ماخوذ ہیں: ''ظَهَرْتُ بِهِ'' یعنی میں نے فلاں کو اپنے پسِ پشت کر دیا اور اس کی طرف التفات نہ کیا۔ اسی معنی سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ﴾ [هود: ۹۲] ''اور تم نے اس (اللہ) کو اپنی پیٹھ پیچھے ڈال رکھا ہے۔''

کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کافر اپنے رب پر جس کو وہ پوجتا ہے، یعنی بت، قوی اور غالب ہے، اس کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے، کیوں کہ وہ جماد ہے، اس کو کوئی چیز دور کرنے پر یا نفع پہنچانے پر کسی طرح کی قدرت نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ ظَهِيْرٌ ﴾ جمع ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴾ [التحریم: ٤] ''اور ان کے علاوہ (تمام) فرشتے (بھی) مددگار ہیں۔'' اور معنی یہ ہوں گے کہ بعض کافر رسول اللہ ﷺ کے خلاف یا اللہ تعالیٰ کے دین کے خلاف مظاہر اور مددگار ہیں دوسرے کافروں کے، اور یہاں کافر سے مراد جنس ہو۔ یہ بات کہ اس آیت کا سببِ نزول ایک معین کافر ہے، چنانچہ کہا ہے کہ وہ ابو جہل ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ مراد ابو الحکم ہے، جس کا نام رسول اللہ ﷺ نے ابو جہل بن ہشام رکھا ہے،[3] تو یہ مذکور معنی کے خلاف نہیں ہے۔ چنانچہ سب سے زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ آیت ہر کافر کے لیے عام ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۲۷۔ ۴۲۹) [2] فتح القدیر (٤/ ١١١) [3] تفسیر الطبري (۱۹/ ۲۸۵)

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ یعنی نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو کسی اور حال میں مگر صرف اس حال میں کہ تو مومنوں کو جنت کی خوشی سنانے والا ہے اور کافروں کو آگ کے عذاب سے ڈرانے والا ہے، لہٰذا تو ان کے ایمان نہ لانے پر غمگین نہ ہو۔ ''انذار'' میں صیغۂ مبالغہ پر قصر کیا۔ اس کا نکتہ یہ ہے کہ انذار کی تخصیص کافروں کے ساتھ ہے، کیوں کہ گفتگو انہیں کے بارے میں ہے اور انذار کامل انہیں کے لیے ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ مبالغہ ''کُم'' کے اعتبار سے ہے، تاکہ اس انذار میں گناہ گاروں کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ﴾ یعنی اے نبی! تم کہہ دو کہ میں قرآن پاک یا رسالت کے پہنچانے پر، یا اس شے پر جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، یہ بات ﴿ اَرْسَلْنٰكَ ﴾ سے معلوم ہوتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ مِنْ اَجْرٍ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے۔ ''عَرَضٌ مِنْ عَرَضِ الدُّنْيَا''[1] یعنی دنیا کے سامان سے کوئی سامان یا اسباب نہیں مانگتا۔ ﴿ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ میں استثناء منقطع ہے، یعنی لیکن جو شخص چاہے کہ اپنے رب کی طرف راہ پکڑ لے تو چاہیے کہ ایسا کر لے۔

کسی نے کہا کہ استثناء متصل ہے۔ معنی یہ ہیں کہ مگر جو شخص چاہے کہ اللہ پاک کی طرف طاعت کے ساتھ تقرب کرے اور اس کو اس لحاظ سے اجر کی صورت میں متصور کیا کہ یہ مقصود الحصول ہے، جبکہ اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ کفار رسول اللہ ﷺ کے خلاف اور آپ ﷺ کے کام کے خلاف تظاہر اور مدد کرنے والے ہیں اور آپ ﷺ ان سے بالکل اُجرت نہیں مانگتے۔ (مطلب یہ ہے کہ میں تم سے رسالت پر کوئی اجر و مزدوری نہیں چاہتا، مگر یہ مزدوری چاہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے رب کی طرف طاعت کے ساتھ تقرب کرے۔ تقرب کو مزدوری کی صورت میں ادا کیا، اس لیے کہ جس طرح مزدوری کا حصول مقصود ہوتا ہے، اسی طرح تقربِ رب کا حصول بھی مقصود ہے)۔

اب آپ کو اس بات کا امر کیا کہ تکلیف کے دور کرنے میں اور فائدہ حاصل کرنے میں اللہ پر توکل کریں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ﴾ یعنی تو اُن کے شر سے کفایت طلب کرنے میں اور ان کی مزدوری سے غنیٰ مانگنے میں اس زندہ پر بھروسا کر جو نہ مرے گا، کیوں کہ وہ اس قابل ہے کہ اس پر بھروسا کیا جائے۔ صفتِ حیات کا جو خاص کر ذکر کیا تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اسی پر مصالح و منافع حاصل کرنے اور نقصانات کو دور کرنے میں بھروسا اور اعتماد کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ کی زندگی سوائے اللہ پاک کے اور کسی کے لیے نہیں ہے اور جن لوگوں کی زندگی منقطع ہونے والی ہے، جب وہ مر جاتے ہیں تو جو شخص ان پر توکل و اعتماد کرتا تھا، وہ ضائع اور برباد ہو جاتا ہے۔ توکل بندے کے اللہ تعالیٰ پر تمام امور میں اعتماد کرنے کو کہتے ہیں اور اسباب و وسائط ہیں، ان کا حکم فرمایا ہے، اس کے بغیر کہ ان پر اعتماد کرے۔ اعتماد خاص اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ہوتا ہے۔

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧١٢)

حکایت:

بعض صالحین نے اس آیتِ کریمہ کو پڑھا، پھر فرمایا: کسی عقل والے کے لیے صحیح نہیں ہے کہ اس آیت کے بعد کسی مخلوق پر وثوق و اعتماد کرے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ﴾ یعنی اللہ پاک کی تنزیہ کر اور نقصان کی صفتوں سے اس کی پاکی بیان کر، اس حال میں کہ اس کی حمد بھی ساتھ ساتھ کرتا رہ۔ کسی نے کہا کہ ﴿ سَبِّحْ ﴾ کے معنی "صَلِّ" ہیں، یعنی نماز پڑھ۔ نماز کا نام تسبیح رکھا جاتا ہے۔ ﴿ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴾۔ ﴿ كَفٰى بِهٖ ﴾ کے معنی ہیں "حَسْبُكَ" یعنی اللہ پاک تجھے بس ہے، اس کلمے سے مراد مبالغہ ہوتا ہے، جیسے یہ قول ہے: "كَفٰى بِاللّٰهِ رَبًّا"۔ خبیر وہ ہے جو تمام معاملات پر مطلع ہو کہ ان میں سے کچھ بھی اس پر مخفی نہ رہے۔ چنانچہ اللہ پاک کا اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہونا تجھے کافی ہے، تیرے اوپر کسی طرح کی ملامت نہیں ہے، وہ مومن ہوں یا کافر۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک کے ساتھ کسی غیر کی طرف حاجت نہیں ہے، کیوں کہ وہ خبیر ہے اور جاننے والا ہے، ان کو پوری پوری جزا اور سزا دینے پر قادر ہے۔

اس میں سخت وعید ہے، گویا یوں فرمایا کہ جب تم نے اس کے حکم کی مخالفت پر اقدام کیا تو اس کا علم تمھیں بدلہ اور وہ عذاب دینے کے لیے کافی ہے جس کے تم مستحق ہو۔ غرضیکہ اللہ پاک نے اپنی صفت "خبیر" کا ذکر کیا، پھر اپنی صفت میں اور مبالغہ کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ﴾ یعنی وہ تو ایسی قدرت والا ہے جس نے یہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہیں، ان کو چھے دن میں پیدا کیا۔ یا شاید اس کا ذکر زیادتِ تقریر کے لیے کیا، کیونکہ وہ اس لائق ہے کہ اس پر توکل کیا جائے، اس لحاظ سے کہ وہ توکل کا خالق ہے اور ہر چیز پر اس کا تصرف اور اختیار ہے۔

﴿ اَلَّذِيْ ﴾ محلِ جر میں ہے ﴿ اَلْحَيِّ ﴾ کی صفت ہے۔ ﴿ بَيْنَهُمَا ﴾ فرمایا "بینهن" نہ کہا، اس لیے کہ مراد دو قسمیں ہیں، پس معنی یہ ہیں کہ پیدا کیا نوعِ آسمان کو اور نوعِ زمین کو چھے دن میں۔ زمین کو دو دن میں بنایا اتوار اور پیر کو اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو دو دن میں پیدا کیا منگل اور بدھ کو اور آسمانوں کو دو دن میں بنایا جمعرات اور جمعہ کو، جمعے کی آخری ساعت میں فارغ ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس مدت کی مقدار میں پیدا کیا، کیوں کہ اس وقت نہ رات تھی نہ دن تھا۔

رہی یہ بات کہ اللہ پاک نے ان سب کو چھے دن میں پیدا کیا، حالاں کہ وہ تو اس پر قادر ہے کہ ایک لحظہ میں پیدا کر دے، تو اس کا مقصد اپنی مخلوق کو نرمی اور ثابت قدمی کی تعلیم دینا ہے۔ خلق کو چاہیے کہ اپنے کاموں میں نرمی اور آہستگی کا برتاؤ کریں۔ پھر اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے یہ بات لازم آتی ہے کہ آسمانوں و زمین کی پیدائش کے بعد عرش کی پیدائش ہوئی ہے جس طرح کہ ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے تو کہیں گے کہ

کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ عرش کی پیدائش پر داخل نہیں ہوا، بلکہ اللہ پاک کے علو پر داخل ہوا ہے، یعنی اللہ سبحانہٗ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد ان پر عالی ہوا۔

لغت میں عرش بادشاہ کے تخت کو کہتے ہیں اور اس جگہ مراد وہ عظیم جسم ہے جس نے عالم کو گھیر رکھا ہے اور ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے۔ استواء اللہ پاک کی ایک صفت ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خلق سے مباین ہے، یعنی جدا ہے اور وہ علی الذات ہے اور عالم کے اوپر ہے۔ مسئلہ استواء کی تقریر سورۃ الاعراف وغیرہ میں گزر چکی ہے،[1] اس کے بارے میں زمانۂ قدیم سے گفتگو ہوتی آئی ہے، اس بارے میں بہت سے رسالے تالیف ہوئے، چنانچہ ہمارے زمانے میں بھی اس بارے میں گفتگو ہوئی اور رسالے لکھے گئے۔ سیدنا ابوالوفا الصدیق رحمہ اللہ نے اس بارے میں رسالہ احتوا اُردو زبان میں لکھا اور فتح البیان میں بھی ہر جگہ خوب کلام کیا۔ اس جگہ فتح البیان میں عالم ربانی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ کا ایک رسالہ چار ورق کے مطابق نقل فرمایا ہے۔ طوالت کے خوف سے اس کو چھوڑ دیا۔ طالبِ صادق اگر چاہے تو فتح البیان وغیرہ سیدنا مرحوم کی تصنیفات کی طرف رجوع فرمائے، اس سے تسلی وتشفی حاصل کر لے۔ اللھم اغفرلنا وتب علینا، ووفقنا لما تحب وترضاہ، وجنبنا عما لا یعنینا في الدنیا والدین آمین.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ﴾ مرفوع ہے، اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یعنی "هُوَ الرَّحْمٰنُ" یہ ﴿ اَلْحَيِّ ﴾ کی دوسری صفت ہوئی۔ جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے۔ یا بدل ہے ﴿ اِسْتَوٰى ﴾ کی ضمیر سے، یا مبتدا ہے اور اس کی خبر جملہ ﴿ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴾ ہے۔ یہ امام اخفش رحمہ اللہ کی رائے کی بنا پر ہے۔ امام زید بن علی رحمہ اللہ نے جر پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اَلْحَيِّ ﴾ کی صفت ہے، یا موصول کی۔ ﴿ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴾ میں ضمیر مجرور "خلق سمٰوٰت و أرض و استوی علی العرش" کی طرف راجع ہے، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ان امور کا ذکر جو اجمالاً ہوا ہے تو ان کی تفاصیل کو علیم سے پوچھ۔ امام زجاج اور اخفش رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ حرفِ 'با' بہ معنی "عن" ہے، یعنی "فَاسْأَلْ عَنْهُ"، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ سَاَلَ سَآىِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴾ [المعارج: ۱] "ایک سائل نے عذاب مانگا جو واقع ہونے والا ہے۔" أَيْ: عَنْ عَذَابٍ وَّاقِعٍ.[2]

"خبیر" سے مراد اللہ پاک ہے، کیوں کہ اس مخلوقات کی تفصیل کو صرف وہی جانتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اور یہ بات جو کسی نے کہی ہے کہ تقدیر یہ ہے کہ اگر تو اس میں شک کرے تو اس کے بارے میں کسی "خبیر" سے پوچھ، اس بنا پر کہ خطاب تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہے، تو یہ بات درستی اور راستی سے الگ ہے۔ کسی نے کہا: تو اس کے بارے میں اس شخص سے پوچھ جس نے اس کو اگلی کتابوں میں پایا ہے، تاکہ اس کے متعلق وہ تیری تصدیق کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر رحمان کی طرف راجع

[1] رقم الآیة (٥٤) [2] فتح القدیر (٤/ ١١٢۔ ١١٣)

ہے، یعنی اگر وہ رحمان کے اللہ پاک پر اطلاق کا انکار کریں تو تو اس کے بارے میں اس شخص سے پوچھ جو اہلِ کتاب میں سے تجھ کو اس کی خبر دے، تاکہ ان کی کتابوں میں اس کے ہم معنی جو بات آئی ہے، اس کو پہچان لیں۔

﴿ خَبِيْرًا ﴾ منصوب ہے بنا بر مفعولیت، یا بنا بر حالِ مؤکدہ۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے حالیت کو ضعیف کہا ہے۔ وجہ یہ بیان کی ہے کہ ﴿ خَبِيْرًا ﴾ کا فاعل ''اِسْأَلْ'' سے حال ہونا اس لیے ضعیف ہے کہ ''خبیر'' سے صرف بطورِ تاکید سوال کیا جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا ﴾ [البقرة:٩١] ''حالاں کہ وہ (قرآن) حق ہے اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہے۔'' کہا یہ جائز ہے کہ ''رحمن'' سے حال ہو، جبکہ ''رحمن'' کو مرفوع کہا جائے ''استویٰ'' سے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا جائز ہے کہ ﴿ بِهٖ ﴾ میں حرفِ ''با'' زائد ہو۔ معنی یہ ہیں: ''فَاسْأَلْ حَالَ كَوْنِهِ خَبِيْرًا''۔[2] کسی نے کہا ہے کہ یہ جاری مجرائے قسم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ﴾ [النساء: ١] ''اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم آپس میں سوال کرتے ہو، اور رشتے توڑنے سے ڈرو۔'' پہلی وجہ ان سب وجوہ سے حق کے زیادہ قریب ہے۔ پھر اللہ پاک نے خبر دی کہ وہ لوگ رحمان کے معنی سے جاہل ہیں۔

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ﴾ مفسروں نے کہا ہے کہ ان لوگوں نے کہا ہے کہ ہم رحمان کو نہیں پہچانتے، مگر رحمانِ یمامہ کو، اس سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رحمٰن اسمائے الٰہی میں سے ایک نام ہے۔ جب انھوں نے رحمٰن کا نام سنا تو اس کا انکار کیا اور بولے رحمٰن کیا ہے؟[3] ﴿ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴾ استفہامِ انکاری ہے، یعنی ہم اس رحمٰن کو سجدہ نہیں کرتے، جس کا سجدہ کرنے کا تو ہم کو حکم دیتا ہے اور جس شخص نے ''يَأْمُرُنَا'' بیائے تحتیہ پڑھا ہے تو معنی یہ ہوں گے، کیا ہم سجدہ کریں اس کو جس کو سجدہ کرنے کے لیے محمد ﷺ ہم کو حکم کرتے ہیں۔ مدنیوں اور بصریوں کی قراءت بتائے فوقیہ ہے۔ اسی کو امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے۔

امام اعمش، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے بیائے تحتیہ قراءت کی ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کی تاویل میں کہا ہے کہ ضمیر رحمٰن کی طرف راجع ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوفیوں کی قراءت کی بنا پر یہ بعید تاویل کی جائے، یہ کچھ واجب نہیں ہے۔ لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ ضمیر نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہو۔ تو اس بنا پر قراءت صحیح ہو جائے گی، اگرچہ پہلی قراءت زیادہ تر واضح ہے۔[4] ﴿ وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ سجدہ کا حکم کرنا ان کی

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٨٩)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ٢٨٧) فتح القدير (٤/ ١١٣)
[3] فتح القدير (٤/ ١١٣)
[4] تفسير القرطبي (١٣/ ٦٤)

نفرت اور دین سے دوری کو اور زیادہ کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ رحمٰن کا ذکر ان کی ایمان سے دوری کو زیادہ کرتا ہے۔ اسی طرح امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ پھر اللہ پاک نے وہ بات بیان کی کہ اگر اس میں غور و فکر کریں تو سمجھ جائیں کہ رحمٰن کو سجدہ کرنا واجب ہے۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾

وہ ذات بڑی بابرکت ہے جس نے آسمان میں ستارے بنائے اور اس میں چراغ (سورج) اور روشن چاند بنایا (61) اور وہی (اللہ) ہے جس نے ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے رات اور دن بنائے، اس شخص (کی نصیحت) کے لیے جو نصیحت پکڑنا چاہے یا شکر کرنا چاہے (62)

اللہ تعالیٰ کی بزرگی وعظمت کا بیان:

آسمان کے بارہ حصے ہیں، ان کا نام برج ہے۔ ہر ایک پر ستاروں کا پتا ہے۔ یہ حدیں رکھی ہیں۔ بدلتے رہنا یا بڑھنا گھٹنا یا آنا جانا یا یہ کہ ایک دوسرے کا بدلنا۔ دن کا کام رہ گیا رات کو کیا رات کا کام دن کو کیا۔ انتہیٰ

اللہ پاک اپنی ذاتِ مقدس کی بزرگی اور عظمت بیان کرتا ہے، اس حسین وجمیل کام پر کہ اس نے آسمان میں بروج بنائے۔ بروج سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں۔ یہ قول امام مجاہد، سعید بن جبیر، ابو صالح، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ آسمان میں قصور (محلات) ہیں، جو محافظوں کے لیے ہیں۔ یہ قول سیدنا علی، ابن عباس رضی اللہ عنہم، محمد بن کعب، ابراہیم نخعی، سلیمان بن مہران، اعمش اور ایک روایت کے مطابق امام ابو صالح رحمہ اللہ سے مروی ہے۔[2] پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ مگر یہ بات ہو کہ کواکبِ عظام محافظوں کے قصور (محلات) ٹھہرائے جائیں تو دونوں قول جمع ہو جائیں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ﴾ [الملك: ٥] ''بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کیا اور انھیں شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنا دیا اور شیطانوں کے لیے ہم نے (دوزخ کا جلانے والا) عذاب تیار کر دیا۔''

سراج سے مراد آفتابِ روشن ہے جو عالمِ وجود میں چراغ کی طرح ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴾ [النبا: ١٣] ''اور ہم نے ایک روشن چراغ (سورج) بنایا۔'' ﴿ وَقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴾ کے معنی ہیں ماہتاب مشرق مضی، یعنی چاند جو روشن ہے، دوسرے نور سے بغیر نورِ آفتاب کے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ

---

[1] فتح البيان (٩/ ٣٢٥۔ ٣٤١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧١٦)

﴿الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾ [یونس: ٥] ''وہی ہے (اللہ) جس نے سورج کو نہایت روشن بنایا اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں مقرر کیں۔'' اور نوح علیہ السلام سے یہ خبر دی کہ انھوں نے اپنی قوم سے یوں کہا: ﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ [نوح: ١٥۔ ١٦] ''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے سات آسمان تہ بہ تہ کیسے تخلیق کیے؟ اور اس نے ان میں چاند کو روشن اور سورج کو چراغ بنایا؟''

پھر اللہ پاک نے اپنی دوسری صفت کا ذکر فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾ یعنی اللہ وہ ہے جس نے رات اور دن کو خِلفہ بنایا، یعنی ان میں سے ہر ایک دوسرے کا خلیفہ ہوتا ہے، یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں، سست نہیں ہوتے۔ جب رات جاتی ہے تو دن آتا ہے اور جب دن جاتا ہے تو رات آتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ [إبراهيم: ٣٣] ''اور تمھارے لیے سورج اور چاند مسخر کیے، جو مسلسل چل رہے ہیں، اور تمھارے لیے رات اور دن کو مسخر کیا۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا﴾ [الأعراف: ٥٤] ''وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آ لیتی ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ [یٰسٓ: ٤٠] ''نہ سورج کے یہ لائق ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیرتا پھرتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا﴾ یعنی اللہ پاک نے جو رات اور دن کو متعاقب کیا ہے کہ ایک کے پیچھے دوسرا لگا آتا ہے تو اس سے غرض اپنے بندوں کی عبادت کے لیے وقت مقرر کرنا ہے، لہٰذا جس کسی کا کوئی عمل رات میں فوت ہو جائے تو اس کا تدارک دن میں کر لے، اور جس کسی کا کوئی عمل دن میں فوت ہو جائے تو اس کا تدارک رات میں کر لے۔ صحیح کی حدیث میں مروی ہے کہ اللہ عزوجل اپنا ہاتھ رات میں پھیلاتا ہے، تاکہ دن کا گناہ گار توبہ کر لے اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے، تاکہ رات کا گناہ گار توبہ کر لے۔[1]

امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو ابو حمزہ رحمہ اللہ نے حسن سے حدیث بیان کی کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ضحیٰ کی نماز لمبی پڑھی تو اُن سے کسی نے کہا کہ آج آپ نے ایسی شے کی کہ اس کو نہیں کرتے تھے، فرمایا کہ مجھ پر میرے ورد میں سے کچھ باقی رہ گیا تھا تو میں نے چاہا کہ اس کو پورا کرلوں یا فرمایا کہ اس کی قضا کرلوں اور یہ آیتِ کریمہ پڑھی: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا﴾

امام ابن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس شخص سے رات سے کوئی شے فوت ہوگئی تو وہ اس کو دن میں پالے اور جس سے دن میں کوئی شے فوت ہوگئی تو وہ اس کو رات میں پالے۔ اسی طرح امام عکرمہ،

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٩)

سعید بن جبیر اور حسن نے بھی کہا ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ خِلْفَةً ﴾ سے مراد مختلفین ہے،[1] یعنی اللہ پاک نے رات اور دن کو مختلف کیا ہے۔ رات کو اپنی سیاہی کے ساتھ اور دن کو اپنی روشنی کے ساتھ۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ بروج سے مراد نجومِ سبعہ سیارہ کے بروج ہیں، یعنی ان کی بارہ منزل اور مقام ہیں، جن میں وہ چلتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بروج بڑے بڑے ستارے ہیں۔ یہ قول امام حسن، امام قتادہ اور مجاہد رحمہم اللہ کا ہے۔[3] فتح البیان و فتح القدیر میں پہلے قول کو زیادہ صحیح کہا ہے۔ "بروج" قصورِ عالیہ کو کہتے ہیں، یعنی بلند محل۔ سبعہ سیارہ کے منازل کا نام بروج اس لیے رکھا ہے کہ وہ ستاروں کے لیے ایسے ہیں، جیسے اس شخص کے لیے بلند مقامات جو ان میں رہتا بستا ہے۔ "بروج" "تبرج" سے مشتق ہے، "تبرج" ظہور کو کہتے ہیں۔ دوسرے قول میں بڑے ستاروں کا نام ان کے ظہور کے سبب سے بروج رکھا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ برج ہر اونچی اور بلند جگہ کو کہتے ہیں۔[4] لہٰذا اب تشبیہ یا نقل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ وہ یہی بارہ برج ہیں، ان کا پہلا حمل ہے اور اس کا نام کبش بھی رکھتے ہیں۔ پھر ثور ہے۔ پھر جوزا، پھر سرطان، پھر اسد۔ اس کو لیث بھی کہتے ہیں۔ پھر سنبلہ، پھر میزان، پھر عقرب، پھر قوس، پھر جدی اور پھر دلو۔ اس کا نام دالی بھی رکھتے ہیں، پھر حوت۔[5] ان برجوں کو کسی نے یوں نظم کیا ہے:

حَمَلَ الثَّوْرُ جَوْزَةَ السَّرْطَانِ وَرَعَى اللَّيْثُ سُنْبَلَ الْمِيْزَانِ
وَرَمَى عَقْرَبٌ بِقَوْسٍ لِجَدْيٍ نَزَحَ الدَّلْوُ بِرْكَةَ الْحِيْتَانِ

یہ کواکب سبعہ سیارہ کی منزلیں ہیں۔ مریخ کے لیے تو حمل و عقرب ہے، زہرہ کے لیے ثور و میزان، عطارد کے لیے جوزا و سنبلہ، قمر کے لیے سرطان، آفتاب کے لیے اسد، مشتری کے لیے قوس و حوت، زحل کے لیے جدی و دلو۔[6] (قاله المحلي)

بعض نے سبعہ سیارہ کو یوں نظم کیا ہے:

زُحَلٌ شَرَى مَرِّيْخَهُ مِنْ شَمْسِهِ فَتَزَاهَرَتْ لِعُطَارِدَ الْأَقْمَارُ

پس زحل ساتویں آسمان میں ایک ستارا ہے اور مشتری چھٹے آسمان میں، مریخ پانچویں میں، سورج چوتھے میں، زہرہ تیسرے میں، عطارد دوسرے میں، چاند پہلے میں۔ حاصل یہ ہے کہ سات سیاروں میں سے پانچ نے تو دس برج لیے، ہر ایک نے دو دو برج، اور سورج اور چاند نے ایک ایک برج لیا۔

جمہور نے ﴿ سِرٰجًا ﴾ بصیغۂ افراد پڑھا ہے اور اس سے مراد سورج ہے۔ حمزہ و کسائی نے "سُرُجًا" پڑھا ہے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧١٨۔ ٢٧١٩) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٢٩) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧١٦)
[4] معاني القرآن (٤/ ٧٣) [5] الدر المنثور (٦/ ٢٦٩) [6] تفسير الجلالين (١/ ٤٧٧)

بصیغۂ جمع، مراد نجوم عظام و قادہ ہیں، یعنی بڑے بڑے انتہائی چمکدار تارے ہیں۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے پہلی قراءت کو ترجیح دی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے دوسرے کی تاویل میں کہا ہے کہ مراد سورج اور تارے ہیں۔ ﴿وَقَمَرًا مُّنِيْرًا﴾ کے یہ معنی ہیں کہ چاند جب طلوع ہوتا ہے تو زمین کو روشن کر دیتا ہے۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے "قُمْرًا" پڑھا ہے بضم قاف وسکونِ میم۔ یہ قراءت ضعیف اور شاذ ہے۔ قمر کا ذکر خاص کر اس لیے کیا ہے کہ عرب کے نزدیک اس کو ایک طرح کی فضیلت ہے، کیوں کہ وہ سال کی بنا قمری مہینوں پر کرتے ہیں۔

امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا: ﴿خِلْفَةً﴾ "كُلُّ شَيْءٍ بَعْدَ شَيْءٍ" یعنی ہر شے جو ایک شے کے بعد آئے وہ ﴿خِلْفَةً﴾ کہلاتی ہے۔ رات دن کی خلفہ ہے اور دن رات کا خلفہ ہے، کیونکہ ایک دوسرے کا خلفہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر "خلفة النبات" ہے، یعنی موسمِ صیف میں جو پتے پہلے پتوں کے بعد نکلتے ہیں، ان کو خلفہ کہتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ یہ جاتا ہے اور یہ آتا ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿خِلْفَةً﴾ خلاف سے ہے، یہ سفید ہے، یہ کالا ہے۔[2] پہلا قول زیادہ قوی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ متعاقب (ایک دوسرے کے تعاقب میں) آتے ہیں، روشنی اور تاریکی میں اور زیادتی اور کمی میں۔ کسی نے کہا کہ حذفِ مضاف کے باب سے ہے، یعنی رات اور دن کو صاحبِ خلفہ کیا، یعنی اختلاف والا۔ جمہور نے ﴿اَنْ يَّذَّكَّرَ﴾ بہ تشدید پڑھا ہے، حمزہ کی قراءت بہ تخفیف ہے، پس ماخوذ ہے "تَذَكَّرَ لِلّٰهِ" سے اور دوسری ماخوذ ہے "ذَكَرَ لِلّٰهِ" سے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے "يَتَذَكَّرُ" پڑھا ہے۔[3]

آیت کے معنی یہ ہیں کہ نصیحت قبول کرنے والا، عبرت لینے والا جس وقت رات اور دن کے اختلاف میں نظر کرتا ہے تو جان لیتا ہے کہ ان کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل کرنے والا ضرور کوئی ہے جو ان کو بدلتا رہتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تذکر کرے، نصیحت پذیر ہو تو اس بات کو جان لے کہ اللہ پاک نے ان کو ایسے ہی بے فائدہ نہیں بنایا۔ لہٰذا اللہ سبحانہٗ کی بنائی ہوئی چیزوں میں عبرت حاصل کرے اور اس کا شکر ادا کرے، ان نعمتوں پر جن کا اس نے اس پر انعام کیا ہے۔ کون سی نعمتیں؟ اس کی عقل، فکر اور فہم یا وہ عظیم نعمتیں اور بہت زیادہ لطف و کرم جو اس نے رات اور دن میں رکھے ہیں۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يَذْكُرُ" اور "يَتَذَكَّرُ" دونوں ایک معنی میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ﴾ [الأعراف: ۱۷۱] "اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو" عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: "وَتَذَكَّرُوْا مَا فِيْهِ" کلمۂ ﴿اَوْ﴾ تقسیم کے لیے ہے اور تنویع کے لیے اور وہ "مانعة الخلو" ہے، لہٰذا جمع بھی جائز ہے۔[4] پھر اللہ پاک نے اپنے صالح بندوں کے اوصاف اور دنیوی اور اُخروی حالات بیان کیے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

---

[1] فتح القدير (٤/ ١١٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٧١٨) [3] فتح القدير (٤/ ١١٤) [4] فتح البيان (٩/ ٣٤١۔ ٣٤٤)

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿٦٣﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿٦٤﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٦٦﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی (وقار اور عاجزی) سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے بات کریں تو وہ کہتے ہیں: سلام ہے (63) اور وہ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں رات گزارتے ہیں (64) اور وہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کا عذاب پھیر دے، بلاشبہ اس کا عذاب دائمی چمٹنے والا ہے (65) بے شک وہ (جہنم) ٹھہرنے اور قیام کرنے کی بری جگہ ہے (66) اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی (بخیلی) ہی، اور ان کا خرچ اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے (67)

اللہ تعالیٰ کے مومن بندوں کی صفات کا بیان:

یعنی ایسے لوگوں یعنی جاہل لوگوں کے منہ نہیں لگتے، نہ ان میں شامل ہوتے ہیں، نہ ان سے لڑتے ہیں۔ سجدے اور قیام کا ذکر کیا رکوع کا نہیں کیا، کیوں کہ رکوع بہت لمبا نہیں ہوتا۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے مومن بندوں کی صفتیں ہیں، جو زمین پر سکینت اور وقار کے ساتھ آہستہ سے چلتے ہیں اور ان میں تکبر اور شیخی نہیں ہوتی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ﴾ [الإسراء: ٣٧] ''اور زمین پر اکڑ کر مت چل۔'' اللہ پاک کے جو بندے ہیں، وہ جب چلتے ہیں تو اُن میں تکبر نہیں ہوتا، نہ ہی اکڑ ہوتی ہے، اور نہ مال کی مستی اور بڑائی ہوتی ہے۔ یعنی تکبر کی چال نہیں چلتے، چلنے میں ناز نخرہ نہیں کرتے، اتراتے نہیں، یہ مراد نہیں کہ ریا و بناوٹ کے بیماروں کی طرح چلتے ہیں۔ سردار اولادِ آدم سرورِ کائنات نبی اکرم ﷺ چلتے تو گویا ''يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ'' یعنی اتار میں اتر رہے ہیں اور گویا زمین آپ کے لیے لپٹی جاتی ہے۔ بعض سلف نے کمزور بن کر اور بناوٹ کر کے چلنے کو مکروہ کہا ہے، یہاں تک کہ عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک جوان آدمی کو دیکھا کہ آہستہ آہستہ چل رہا ہے تو فرمایا: تیرا کیا حال ہے کیا تو بیمار ہے؟ کہا: نہیں، اے امیر المومنین! وہ درہ

لے کر اس پر چڑھے اور اس کو حکم دیا کہ قوت کے ساتھ چلے۔

﴿ هَوْنًا ﴾ سے اس جگہ مراد سکینہ اور وقار ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس وقت تم نماز کو آؤ تو اس حال میں مت آؤ کہ دوڑتے ہوئے ہو اور تم اس حال میں آؤ کہ تم پر سکینہ ہو، لہٰذا جو نماز تم پاؤ اس کو پڑھ لو اور جو تم سے فوت ہو جائے اس کو پورا کر لو۔[1] عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود حسن بصری رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ مومنین ایک ایسی قوم ہے کہ واللہ! ان کے کان اور آنکھیں اور اعضاء ذلیل اور پست ہوئے، یہاں تک کہ جاہل ان کو بیمار خیال کرتا ہے اور واللہ! بے شک وہ البتہ صحیح اور تندرست ہیں، لیکن ان کے اندر خوف میں سے وہ شے داخل ہوئی جو دوسروں میں داخل نہیں ہوئی اور اُن کو اُن کے آخرت کے علم نے دنیا سے روک رکھا۔

چنانچہ کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ"۔ یعنی تعریف ہے اللہ کے لیے جس نے غم کو ہم سے دور کیا، خبردار واللہ! جس شے نے لوگوں کو غمگین کیا، اس نے ان کو غمگین نہ کیا اور اُن کے لیے جنت کو طلب کرنے والی کوئی چیز بھاری نہیں ہوئی، یعنی جنت کو حاصل کرنے والے تمام کام بہ آسانی کیے، لیکن ان کو آگ کے خوف نے رلایا۔ "إِنَّهُ مَنْ لَمْ يَتَعَزَّ بِعَزَاءِ اللّٰهِ تَقَطَّعُ نَفْسُهُ عَلَى الدُّنْيَا حَسَرَاتٍ" یعنی جو کوئی مصیبت اور تکلیف کے وقت "إنا لله و إنا إليه راجعون" نہ کہے تو دنیا کی حسرتوں کے مارے اس کا جی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور جو کوئی نہ دیکھے واسطے اللہ کے کوئی نعمت مگر کھانے میں یا پینے میں تو یقیناً اس کا علم قلیل ہوا اور اس کا عذاب حاضر ہوا۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ یہ مومن بندوں کی دوسری صفت ہے کہ جس وقت جاہل اور نادان لوگ بری بات کہہ کر اُن سے بے وقوفی اور سبکی کرتے ہیں تو وہ ان سے اسی طرح پیش نہیں آتے، بلکہ عفو و درگزر کرتے ہیں اور اُن سے صرف خیر اور بھلائی کی بات کہتے ہیں۔ جس طرح کہ نبی اکرم ﷺ کا حال تھا کہ جاہل کی شدت اور سختی سے آپ کا حلم اور بردباری اور زیادہ ہو جاتی اور جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴾ [القصص: ۵۵] "اور جب وہ بے ہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں، تمھیں سلام ہو، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔"

امام احمد نے نعمان بن مقرن مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک شخص کو گالی دی اور رسول اللہ ﷺ نزدیک تھے، پھر جس کو گالی دی تھی، اس نے کہنا شروع کیا: "عَلَيْكَ السَّلَامُ"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خبردار! ایک فرشتہ تمھارے درمیان تیری طرف سے جواب دیتا تھا، جب اس نے تجھ کو گالی دی تو اس نے کہا کہ تو اور تو زیادہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٢١)

حق دار ہے اس کا، اور جب تو نے اس سے ”وعليك السلام“ کہا تو اس (فرشتے) نے کہا: نہیں، بلکہ تجھ پر سلام ہے اور تو اس کا زیادہ حق دار ہے۔[1] (إسناده حسن ولم يخرجوه)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ سے مراد ”قَالُوْا سِدَادًا“ ہے۔ سداد گفتار اور رفتار میں درستی اور راستی کو کہتے ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”رَدُّوْا مَعْرُوْفًا مِنَ الْقَوْلِ“ یعنی اس کے جواب میں دستور کی بات کہتے ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر اُن پر جہالت کی جاتی ہے تو بردباری کرتے ہیں اور ”سَلَامٌ عَلَيْكُمْ“ کہتے ہیں۔ ”يُصَاحِبُوْنَ عِبَادَ اللّٰهِ نَهَارَهُمْ بِمَا يَسْمَعُوْنَ“[2] (یعنی باوجود اس کے کہ دن بھر لوگوں سے برا بھلا سنتے ہیں، اور ان کی باتوں کا کچھ خیال نہیں کرتے اور حلم و بردباری کر کے اس کو برداشت کرتے ہیں اور اُن کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔)

پھر اللہ پاک نے یہ بات ذکر کی ہے کہ ان کی رات بہتر رات ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴾ یعنی اپنے رب کی طاعت و عبادت میں رات بسر کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ [الذاريات: ١٧۔ ١٨] ”وہ رات کو بہت ہی تھوڑا سوتے تھے اور وہ سحری کے وقت مغفرت مانگا کرتے تھے۔“ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ [السجدة: ١٦] ”اُن کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور اُمید سے پکارتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے، اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ [الزمر: ٩] ”کیا (یہ مشرک بہتر ہے یا وہ) جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے اور قیام کرتے ہوئے عبادت و فرماں برداری کرتا ہے، جبکہ وہ آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی اُمید بھی رکھتا ہے؟ کہہ دیجیے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔“ اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۤ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴾ غرام سے مراد ملازم دائم ہے، جیسا کہ اعشیٰ شاعر کا یہ قول ہے:

إِنْ يُّعَذِّبْ يَكُنْ غَرَامًا وَإِنْ يُّعْطِ جَزِيْلًا فَإِنَّهُ لَا يُبَالِي

[1] مسند أحمد (٥/ ٤٤٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو خالد والبی کا سماع سیدنا نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٩٢٣)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٢١۔ ٢٧٢٢)

کسی ممدوح کی مدح کرتا ہے کہ اگر وہ عذاب کرے تو اس کا عذاب ہمیشہ لازم رہنے والا ہوتا ہے اور اگر عطا کرے تو بہت کچھ مال عطا کرتا ہے، اس لیے کہ وہ کچھ پروا نہیں کرتا۔ اسی لیے حسن رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ہر شے جو ابن آدم کو پہنچے اور اس سے زائل ہو جائے تو وہ غرام نہیں ہے۔ غرام تو وہ شے ہے کہ لازم ہو، جب تک کہ زمین و آسمان ہیں۔ اسی طرح سلیمان تیمی و محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴾۔ یعنی "مَا نَعِمُوا فِي الدُّنْيَا، إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ سَأَلَ الْكُفَّارَ عَنِ النِّعْمَةِ فَلَمْ يَرُدُّوهَا إِلَيْهِ فَأَغْرَمَهُمْ فَأَدْخَلَهُمُ النَّارَ"[1] ﴿ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ یعنی جہنم از روئے منظر بری منزل ہے اور از روئے مقام قیلولہ کی بری جگہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صورت شکل میں بری جگہ اور رہنے بسنے کے لیے بھی بدتر قیام گاہ ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مالک بن حارث سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ جس وقت آدمی آگ میں ڈالا جائے گا تو اس میں گرے گا، یہاں تک کہ جب دوزخ کے ایک دروازے پر پہنچے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ یہاں ٹھہر جا، یہاں تک کہ تجھے تحفہ دیا جائے۔ کہا: پھر وہ سانپوں اور بچھوؤں کے زہر کا ایک پیالہ پلایا جائے گا تو اس کا چمڑہ اور بال علاحدہ ہو جائیں گے اور پٹھے اور رگیں علاحدہ ہو جائیں گی۔ نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے "عن مجاهد عن عبيد بن عمير" روایت کیا ہے کہ بے شک نار میں البتہ کنویں ہیں، جن میں بُختی اونٹوں جتنے بڑے سانپ ہیں اور سیاہ خچروں کی طرح بچھو ہیں، جس وقت وہ آگ میں پھینکے جائیں گے تو وہ سانپ اور بچھو اپنی جگہوں سے ان کی طرف نکلیں گے اور ان کے ہونٹوں کو ان کے چہروں کو اور ان کے بالوں کو پکڑ لیں گے، پھر ان کے قدموں تک ان کا گوشت اتاریں گے، پھر جب وہ آگ کی گرمی پائیں گے تو واپس لوٹ جائیں گے۔[2]

امام احمد نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک ایک بندہ جہنم میں ہزار برس تک یا حنان یا منان پکارے گا۔ پھر اللہ عزوجل جبرائیل علیہ السلام سے فرمائے گا کہ تو جا اور میرے اس بندے کو میرے پاس لے آ۔ جبرائیل علیہ السلام چلیں گے تو نار والوں کو اُوندھے پڑے ہوئے اور روتے ہوئے پائیں گے، پھر اپنے رب عزوجل کی طرف لوٹ کر آئیں گے تو اس کو خبر دیں گے، پھر اللہ عزوجل فرمائے گا: تو اس کو میرے پاس لے آ۔ بے شک وہ فلاں فلاں جگہ میں ہے، پھر وہ اسے لے آئیں گے تو اس کو اپنے رب عزوجل کے سامنے کھڑا کریں گے۔ چنانچہ وہ اس سے فرمائے گا: اے میرے بندے! تو نے اپنا مکان اور قیلولہ کی جگہ کو کیسا پایا؟ تو وہ عرض کرے گا: اے رب! وہ بدتر جگہ اور قیلولہ کی بدتر جگہ ہے، پھر اللہ عزوجل فرمائے گا: پھر لے جاؤ میرے بندے کو تو وہ کہے گا: اے میرے رب! میں یہ اُمید نہیں رکھتا تھا کہ جبکہ تو نے مجھے اس سے نکالا کہ تو پھر مجھے اس میں

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٩٧) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٢٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٢٤)

لے جائے گا۔ چنانچہ اللہ عزوجل فرمائے گا: میرے بندے کو چھوڑ دو۔[1] اللهم أجرنا من النار ومن موجبات النار يا رحمن يا رحيم. اللهم فصل وسلم و بارك على رسولك الكريم و على آله وصحبه ما دام أهل النار في العذاب الأليم و أهل الجنة في النعيم المقيم آمين آمين.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا ﴾ یعنی اللہ کے صالح بندے اپنے خرچ میں مبذر (فضول خرچ) نہیں ہیں کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کریں اور نہ اپنے گھر والوں سے بخل کرنے والے ہیں کہ اُن کے حق میں کمی کریں، ان کی کفایت کے مطابق ان کو نہ دیں، بلکہ عدل خیار ہیں، یعنی بیچ کی چال چلنے والے ہیں۔ "وَخَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا" نہ اسراف ہے نہ بخل ہے۔ ﴿ وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ ﴾ [بني إسرائيل: ٢٩] "اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا نہ رکھ اور نہ اسے پوری طرح کھول دے۔" سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مرد کی سمجھ داری یہ ہے کہ وہ اپنی گزران میں میانہ روی اختیار کرے۔[2] (أخرجه الإمام أحمد ولم يخرجوه)

نیز امام احمد نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ مفلس نہیں ہوا، جس نے میانہ روی اختیار کی۔[3] "لم يخرجوه" حافظ ابو بکر بزار رحمہ اللہ نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «مَا أَحْسَنَ الْقَصْدَ فِي الْغِنَى، وَمَا أَحْسَنَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ، وَمَا أَحْسَنَ الْقَصْدَ فِي الْعِبَادَةِ»، ثُمَّ قَالَ: لَا نَعْرِفُهُ يُرْوَى إِلَّا مِنْ حَدِيْثِ حُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ.[4] یعنی کیا اچھی ہے میانہ روی تونگری میں اور کیا اچھی ہے بیچ کی چال محتاجی میں اور کیا اچھا ہے بیچ کا راستہ عبادت میں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: "لَيْسَ فِي النَّفَقَةِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ سَرَفٌ" یعنی اللہ پاک کی راہ میں خرچ کرنا اسراف نہیں ہے۔ ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شے میں تو نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کیا تو وہ اسراف ہے۔[5] ایاس رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا ہے کہ اسراف اللہ عزوجل کی معصیت میں خرچ کرنا ہے۔[6]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ ﴾ مستأنفہ ہے جو صالحین عباد اللہ کے

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٢٣٠) اس کی سند میں "ابو ظلال ہلال بن میمون" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٢٤٩)

[2] مسند أحمد (٥/ ١٩٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٥٥٦)

[3] مسند أحمد (١/ ٤٤٧) اس کی سند میں "ابراہیم ہجری" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٤٥٩)

[4] مسند البزار (٧/ ٣٤٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢١٦٤)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٢٦) [6] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٢٩۔ ٤٣٢)

اوصاف بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے، اس میں خالص اللہ کے بندوں کی صفتوں کا بیان ہے، منافقوں کا حال بیان کرنے کے بعد۔ (تفسیر ابوالسعود میں بھی اسی طرح ہے۔ حالاں کہ اس سے پہلے مشرکوں کا حال ذکر کیا گیا ہے، منافقوں کا ذکر نہیں ہے۔ واللہ أعلم)۔ کہا ہے کہ رحمان کی طرف عباد کی اضافت خصوصیت اور عزت کے لیے ہے، ورنہ ساری مخلوق اللہ کے بندے ہیں۔ ﴿ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ ﴾ مبتدا ہے، اس کی خبر موصول مع صلہ ہے۔ ﴿ هَوْنًا ﴾ مصدر ہے، اس کے معنی سکینہ و وقار اور تواضع ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ ﴿ هَوْنًا ﴾ ﴿ يَمْشُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی زمین میں وہ سکینہ اور وقار کی چال چلتے ہیں۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشابہ یہ ہے کہ اس کی تاویل اس بات پر کی جائے کہ اس چلنے والے کے اخلاق اور عادات "ھون" ہوں، یعنی اس کی چال میں سکینہ، وقار اور تواضع ہو۔[1]

رہی یہ بات کہ اس سے مراد صرف "مشي" کی صفت ہو، یہ باطل ہے، کیوں کہ بہت سے آہستہ آہستہ چلنے والے ایسے ہیں جو ذئبِ اطلس ہیں۔ یعنی وہ بھیڑیا جس کا رنگ تیرہ سیاہی مائل ہوتا ہے اور اس کے بال گرے ہوئے ہوتے ہیں، چور کو اس سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مشی مبارک میں تکفی فرماتے تھے، گویا آپ اترائی میں چل رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قدم مبارک کو زمین سے اٹھاتے، پھر اس کو رکھتے اور اپنے قدم مبارک کو زمین پر مسح نہیں فرماتے تھے، یعنی گھسیٹتے نہیں تھے، جس طرح کہ تبختر کرنے والے کی چال ہوتی ہے اور اپنے قدم مبارک کو قوت و جلاوت (پھرتی) سے اٹھاتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ تکفی سے یہ مراد ہے کہ چلنے میں دائیں اور بائیں جانب مائل ہوتے تھے کشتی کی طرح۔ کسی نے کہا کہ یہ معنی غلط ہیں، کیوں کہ یہ چال تو ناز سے چلنے والے کی ہے، بلکہ معنی یہ ہیں کہ آگے کی جانب مائل ہوتے تھے۔

پھر کسی نے اس کو رد کیا ہے کہ لفظ اس معنی کا تقاضا نہیں کرتے۔ یہ چال اسی وقت قابلِ مذمت ہے کہ اس کو جان بوجھ کر کرے اور اگر بغیر ارادے کے ہو یا پیدائشی طور پر ہو تو قابلِ مذمت نہیں ہے۔ بعض محدثین سے مروی ہے کہ حدیث شریف کے طالب کو چاہیے کہ "سریع المشي والقراءت والکتابة" ہو، یعنی جلد چلے، جلد پڑھے اور جلد لکھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہ وہ مومنین ہیں جو زمین پر "ھونا" چلتے ہیں، یعنی اطاعت و پاک دامنی و پارسائی اور انکساری کے ساتھ۔

ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: "ھونا" یعنی "عِلْمًا وَّحِلْمًا"[2] معنی یہ ہیں کہ سکینہ اور وقار سے چلتے ہیں تواضع اور انکساری کرتے ہوئے۔ اکڑتے ہوئے تکبر کرتے نازنخرے سے اور خوشی کے مارے پھولے ہوئے نہیں چلتے، بلکہ عالم و حکیم و دانش مند اور وقار، پاک دامنی اور پارسائی والے ہو کر چلتے ہیں۔ اِدھر اُدھر نظر نہیں کرتے، غیر محرم کو تاکتے گھورتے نہیں ہیں، برابر سیدھے اپنی راہ چلے جاتے ہیں، اس لیے بعض علما نے بازاروں میں سوار ہو کر

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۶۸) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۷۲۰)

چلنے کو مکروہ کہا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے ﴿ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ﴾ [الفرقان: ۷] ''اور بازاروں میں چلتا ہے۔'' فرمایا ہے:

شیر سرافگندہ خرامد براہ   کارِ سگان ست بہر سو نگاہ

''شیر سر یعنی نگاہ نیچی کیے راستہ طے کرتا ہے اور کتوں کا کام ہر طرف نگاہ رکھنا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ یعنی جاہلوں، بیوقوفوں اور احمقوں سے جو ایذا و تکلیف ان کو پہنچتی ہے، اس کا تحمل کرتے ہیں۔ جاہل کے ساتھ جہالت اور بے وقوفوں کے ساتھ بے وقوفی اور سبکی نہیں کرتے، بلکہ اپنے تحمل و برداشت سے اس کی سبکی کو دور کرتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سلام تسلیم سے نہیں ہے، یہ تو تسلم سے ہے۔ عرب لوگ کہتے ہیں: ''سَلَامٌ أَيْ: تَسَلُّمًا مِنْكَ'' یعنی تجھ سے براءت (بیزاری) ہے۔ ﴿ سَلٰمًا ﴾ کا نصب دو امر سے ایک کی بنا پر ہے: یا تو فعل محذوف کا مصدر ہے: ''أَيْ: قَالُوْا: سَلَّمْنَا سَلَامًا'' یعنی ہم سلامت رہے سلامت رہنا، یہ معنی سیبویہ کے قول کی بنا پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تحمل کر کے تیری سبکی و حماقت کے شر سے بچے۔ یا منصوب ہے اس بنا پر کہ مفعول بہ ہے: ''أَيْ: قَالُوْا هٰذَا اللَّفْظ'' یعنی جب کوئی ان سے جہالت کرتا ہے تو یہ لفظ یعنی ﴿ سَلٰمًا ﴾ کہہ دیتے ہیں۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ حاصل یہی ہے کہ سلام کہہ کر اس کی جہالت سے بچے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَلٰمًا ﴾ کے معنی ہیں ''سِدَادًا'' یعنی جاہل و بیوقوف سے ایسی بات کہتے ہیں کہ رفق و نرمی کے ساتھ اس سے اس کو دور کر دیتے ہیں۔

نتواں عربدہ با چشم تو کردن آری   بتواضع گزرانند خود مستان را

''ہاں! آپ کے ساتھ بدخوئی کا رویہ نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ متوالوں کو تو بڑی خاطر داری کے ساتھ گزارتے ہیں۔''

غرضیکہ سیبویہ نے کہا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو اس بات کا حکم نہیں ہوا تھا کہ مشرکوں کو سلام کریں، لیکن یہ ﴿ سَلٰمًا ﴾ اس قول کے معنی کی بنا پر ہے کہ ''تَسْلِيمًا مِنْكُمْ وَمُتَارَكَةً وَلَا خَيْرَ وَلَا شَرَّ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ'' مطلب یہ ہے کہ محاورۂ عرب میں جب کہ باہم کسی طرح کی بھلائی برائی نہ ہو اور اس کا اظہار منظور ہو تو بولتے ہیں: ﴿ سَلٰمًا ﴾ یعنی ہماری تمھاری کوئی بھلائی برائی نہیں ہے، ہم تم سے الگ تھلگ ہیں، چنانچہ اسی طرح اس جگہ ﴿ سَلٰمًا ﴾ انھی معنوں میں ہے۔ تحیۂ سلام مراد نہیں ہے۔ محمد بن یزید مبرد رحمہ اللہ نے سیبویہ کی عبارت پر اعتراض کیا ہے کہ اس نے اس میں خطا کی، چوک گیا اور مضمون کو بری عبارت میں ادا کیا۔ لائق یہ تھا کہ یوں کہا جاتا کہ مسلمانوں کو اس وقت ان سے لڑنے کا حکم نہیں ہوا تھا، پھر ان کو ان سے لڑنے کا حکم ہوا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ

ناسخ و منسوخ کے معنی میں امام سیبویہ رحمہ اللہ کا کوئی کلام ہو، سوائے اس آیت کے، کیوں کہ اس نے اپنے کلام کے آخر میں کہا ہے کہ اس آیت کو آیتِ سیف نے منسوخ کر دیا ہے۔[1]

فتح القدیر و فتح البیان میں فرمایا ہے کہ آدمی جب اپنے غیر علم میں بات کرتا ہے اور اپنی راہ چھوڑ کر غیر کی راہ میں چلتا ہے تو اس کی بات اسی طرح کی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو مشرکوں پر سلام کرنے کا نہ حکم ہوا نہ اس سے منع کیا گیا، بلکہ ان کو صفح و ہجرِ جمیل کا حکم ہوا، یعنی ان سے درگزر کریں اور خوش اسلوبی سے ان سے جدا رہیں، لہٰذا نسخ کا دعویٰ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔[2] خطیب نے امام ابو العالیہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کو آیتِ قتال نے منسوخ کر دیا ہے، حالاں کہ منسوخی کا دعویٰ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ آیتِ قتال سے منسوخ ہو یا کسی اور آیت سے، کیوں کہ بیوقوفوں سے درگزر و چشم پوشی کرنا اور مقابلہ نہ کرنا، ادب و مروت و شریعت میں مستحسن ہے اور آبرو و ورع کو بالکل صحیح و سالم رکھنے والا ہے۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس وقت میں مسلمانوں کو نہ اس بات کا حکم کیا گیا ہے کہ مشرکوں کو سلام کریں نہ ہی اس سے منع کیا گیا، بلکہ ان کو صفح، درگزر اور ہجرِ جمیل یعنی احسن انداز سے علاحدگی اختیار کرنے کا حکم ہوا اور خود نبیٔ اکرم ﷺ مشرکوں کی مجلسوں پر کھڑے رہتے اور اُن کو تحیت کرتے اور اُن سے قریب ہوتے اور اُن سے مداہنت نہیں فرماتے تھے، یعنی حق کی طرف ان کو بلاتے، دعوت میں کسی طرح کی کمی نہیں کرتے تھے۔

حکایت:

نضر بن شمیل نے کہا: مجھے خلیل نے حدیث بیان کی کہ میں ابو ربیعہ اعرابی کے پاس آیا، جو لوگ میں نے دیکھے ہیں یہ شخص اُن سب سے بڑھ کر عالم تھا، اچانک دیکھا کہ وہ بام پر تھا، ہم نے اس کو سلام کیا تو اس نے سلام کا جواب دیا اور ہم سے کہا: ''استووا'' ہم حیران رہ گئے، ہم نے نہ سمجھا کہ اس نے کیا کہا۔ ایک اعرابی جو اس کے پہلو کی طرف تھا، اس نے ہم سے کہا کہ اس نے تم کو امر کیا ہے کہ تم بام پر چڑھ آؤ۔ خلیل رحمہ اللہ نے کہا: یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ کے باب سے ہے۔ کہا: پھر ہم اس کی طرف چڑھ گئے تو کہا: ''هَلْ لَكُمْ فِيْ خُبْزٍ فَطِيْرٍ وَلَبَنٍ هَجِيْرٍ؟'' یعنی کیا تم کو نانِ فطیر اور عمدہ فاضل دودھ کی حاجت ہے؟ (فطیر، خمیر کی ضد ہے۔ گُندھے ہوئے بغیر خمیر کے آٹے کی روٹی کو خبز فطیر کہتے ہیں)۔ ہم نے کہا کہ ہم ابھی اس سے مفارقت کر کے آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی روٹی کھا کر دودھ پی کر آئے ہیں۔ تو امام ابو ربیعہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ سَلٰمًا ﴾۔ ہم نے نہ سمجھا کہ اس نے کیا کہا۔ پس اسی اعرابی نے کہا: ''إِنَّهُ سَأَلَكُمْ مُتَارَكَةً لَا خَيْرَ فِيْهَا وَلَا شَرَّ'' یعنی اس نے تم سے علاحدہ ہونے کے لیے سوال کیا کہ جس میں نہ کوئی خیر ہے نہ شر۔ خلیل نے کہا ہے کہ یہ لفظ اللہ کے قول ﴿ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ کے باب سے ہے۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٦٨۔ ٦٩) [2] فتح القدير (٤/ ١١٥) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٦٩۔ ٧٠)

غرض کہ پھر اللہ پاک نے عباد الرحمٰن کا تیسرا وصف بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيٰمًا ﴾ یعنی وہ ایسے لوگ ہیں کہ رات بسر کرتے ہیں، اپنے پروردگار کے لیے اپنے منہ پر سجدہ کرتے ہوئے اور اپنے قدموں پر کھڑے ہوئے۔ پہلے ان کی خلق کے سارے معاملے کا حال بیان کیا تھا، اب ان کا خالق کے ساتھ معاملہ بیان کیا ہے کہ اس کے ساتھ ان کا یہ برتاؤ ہے کہ رات رب کی اطاعت اور عبادت میں گزارتے ہیں۔ "بیتوتت" یہ ہے کہ رات تجھے پالے، خواہ تو سوئے یا نہ سوئے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کو رات نے پا لیا تو مقرر اس نے "بیتوتت" کی، وہ سویا یا نہ سویا۔[1] جس طرح محاورے میں بولتے ہیں: "بَاتَ فُلَانٌ قَلْقًا" یعنی فلاں نے بے قرار و بے چینی میں رات بسر کی۔ ظاہر ہے کہ بے چینی میں آدمی سوتا نہیں ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، ظاہر یہ ہے کہ اللہ پاک نے ساری رات کے زندہ رکھنے کے ساتھ ان کی صفت کی ہے، یا رات کے اکثر حصے کے ساتھ۔[2] خاص کر "بیتوتت" کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ عبادت رات میں زیادہ تر مشکل ہوتی ہے، کیونکہ یہ راحت اور آرام کا وقت ہے اور ریا سے بعید تر ہوتی ہے۔

رہی یہ بات کہ قیام سجدے سے پہلے ہوتا ہے اور یہاں ﴿ سُجَّدًا ﴾ کو ﴿ قِيٰمًا ﴾ سے پہلے ذکر فرمایا ہے؟ چنانچہ قیام کو بعد میں جو ذکر کیا تو یہ فاصلۂ آیات کے لیے ہے۔ پھر اللہ پاک نے ان کی چوتھی صفت یہ بیان کی کہ باوجود اطاعت اور عبادت کے جہنم کے عذاب سے ترساں و لرزاں رہتے ہیں اور اپنے رب سے یہ دعا مانگتے ہیں: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴾ یعنی عباد الرحمٰن وہ لوگ ہیں، جو یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے عذابِ جہنم کو پھیر دے، بے شک اس کا عذاب غرام ہے، یعنی کافروں کے لیے تو ہمیشہ کے لیے کلی طور پر لازم و ملزوم ہے اور گناہ گار مومنوں کے لیے ایسا لازم ہے کہ اس کے بعد وہ جہنم سے چھوٹ کر جنت میں جائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ باوجود اس کے کہ اپنے رب کے مطیع و فرمانبردار ہیں، رات دن اس کی اطاعت و عبادت میں لگے رہتے ہیں اور خالق اور مخلوق سے اپنا معاملہ اچھا رکھتے ہیں، پھر بھی اللہ تعالیٰ کے استدراج اور ڈھیل سے امن میں نہیں رہتے، بلکہ اس کے عذاب سے ڈرتے، لرزتے اور کانپتے رہتے ہیں۔ کاتب الحروف عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ اس وقت مقام کی مناسبت سے یاد آیا کہ سید السادات سیدنا مخدوم جہانیاں رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ شیخ رکن الدین بجیرہ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمہ اللہ قطب عالم ہونے کے بعد جمعہ وغیرہ کی شب کو مکہ معظمہ میں تشریف لے جاتے تو وہاں کے شیوخ سے ملاقات ہوتی تو وہ ان کی مدح کرتے، یہ اس کے جواب میں یہ شعر پڑھتے اور روتے۔

از ہیبت آں دوراہے خون شد دل من   تا خود بکدام رہ بود منزل من

"اس دوراہے کے خوف سے میرا دل دہل گیا، کیوں کہ معلوم نہیں کہ کون سے راستے میں میری منزل ہے۔"

---

[1] معاني القرآن (٤/ ٧٥) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٧٦)

﴿ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴾ [الشوریٰ: ۷] ”ایک گروہ جنت میں ہوگا اور دوسرا بھڑکنے والی آگ میں۔“ یہ حکایت خاکسار نے درمنظوم ترجمہ ملفوظ مخدوم میں لکھی ہے۔ انتھی. غرضیکہ غرام شرِ لازم دائم کو کہتے ہیں۔ یہ قول امام ابن زید رحمہ اللہ کا ہے،[1] چنانچہ یہی معنی نبی اکرم ﷺ سے مرفوعاً وارد ہوئے ہیں۔ اسی لحاظ سے قرض خواہ کا نام غریم رکھا گیا ہے، کیوں کہ وہ قرض دار سے ملازمت کرتا ہے اور اس سے چمٹتا ہے۔ غریم قرض خواہ اور قرض دار دونوں کو بولتے ہیں۔ عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: ”فُلَانٌ مُغْرَمٌ بِكَذَا“ یعنی فلاں شخص فلاں شے کا ملازم ہے، اس پر شیفتہ وفریفتہ ہے۔ یہ معنی تو غرام کے کلامِ عرب میں ہیں، چنانچہ ابن اعرابی وابن عرفہ وغیرہما نے اس کا ذکر کیا ہے۔

امام زجاج نے کہا ہے کہ غرام اشد عذاب کو کہتے ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: دائم ہلاکت کو۔[2] جملہ ﴿ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ ماقبل کی تعلیل ہے اور اسی طرح ﴿ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴾ بھی تعلیل ہے، حرفِ عطف حذف کر دیا گیا ہے، پس دونوں جملے عباد الرحمٰن کے قول سے ہیں اور دونوں محلِ نصب میں واقع ہیں۔ جائز ہے کہ ﴿ سَاءَتْ ﴾ بمعنی ”أَحْزَنَتْ“ ہو، اس صورت میں مفعول کا متصرف اور ناصب ہوگا اور وہ مفعول یہاں محذوف ہوگا: ”أَيْ: جَهَنَّمَ أَحْزَنَتْ أَصْحَابَهَا وَدَاخِلِيْهَا“ اور جائز ہے کہ ﴿ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ تمیز ہو یا حال۔ معنی یہ ہیں کہ بے شک جہنم نے قرار گاہ اور اقامت گاہ ہونے کے لحاظ سے اپنے لوگوں کو اور اپنے داخل ہونے والوں کو غمگین کیا ہے۔ یا اس حال میں کہ وہ ان کی جائے قرار اور جائے اقامت ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ”سَاءَتْ“ بمعنی ”بئست“ ہو۔ اس صورت میں جو اس کا حکم ہے وہ اسے دیا جائے گا اور مخصوص بالذم محذوف ہوگا اور ﴿ سَاءَتْ ﴾ میں ضمیر مبہم ہوگی اور ﴿ مُسْتَقَرًّا ﴾ صرف تمیز ہی قرار پائے گا۔ ”أَيْ: سَاءَتْ هِيَ هِيَ“. دوسرا ”هِيَ“ مخصوص بالذم ہوگا اور یہی رابط ٹھہرے گا اس جملے کے اور اس جملے کے درمیان جس سے خبر واقع ہوا ہے اور وہ ”إِنَّ“ ہے۔ (كذا قال السمين)

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ مُسْتَقَرًّا ﴾ تمیز ہے اور ﴿ سَاءَتْ ﴾ بہ معنی ”بئس“ ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اس سے ایک اشکال لازم آئے گا، وہ یہ ہے کہ فاعل مذکر کے فعل کا مونث ہونا لازم آئے گا اور وہ بھی بلا جواز، کیوں کہ اس بنا پر ”سَاءَتْ“ میں فاعل ضمیر ہوگی اور وہ مابعد کی طرف راجع ہوگی اور وہ ﴿ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ ہے، حالاں کہ یہ مذکر ہیں، پھر تانیث کہاں سے آئی، اس کا جواب یہ ہے کہ ”مستقر“ عبارت ہے جہنم سے، اسی لیے اس کے فعل کی تانیث جائز ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ مستقر و مقام دونوں ہم معنی ہیں، رہی یہ بات کہ جب ہم معنی ہوئے تو ایک کا عطف دوسرے پر کیوں ہوا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے الفاظ چونکہ مختلف تھے، اس لیے عطف کر دیا گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ دونوں معنی میں مختلف ہیں۔ چنانچہ مستقر تو گناہ گاروں کے لیے ہے، کیوں کہ وہ وہاں سے نکلیں گے اور مقام کفار کے لیے ہے، اس لیے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ جملہ ﴿ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٢٩٧) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٧١) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٩١)

میں دونوں امر جائز ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ پاک کے کلام سے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ مومنین کے کلام کا بیان ٹھہرے، چنانچہ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔

پھر اللہ پاک نے مومنین کی پانچویں صفت یہ بیان کی کہ وہ خرچ کرنے میں بیچ کی چال چلتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا ﴾ امام حمزہ، کسائی، اعمش، عاصم اور یحییٰ بن وثاب نے بفتح تحتیہ وضم فوقیہ پڑھا ہے۔ "قَتَرَ يَقْتُرُ" بروزن "قَعَدَ يَقْعُدُ" سے۔ امام ابو عمرو اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے بفتح تحتیہ و کسر تائے فوقیہ پڑھا ہے۔ یہ لغت معروف وحسن ہے۔ اہلِ مدینہ وابن عامر وابوبکر کی قراءت عاصم سے بضم تحتیہ و کسر فوقیہ ہے۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: محاورے میں بولتے ہیں: "قَتَرَ الرَّجُلُ عَلَى عَيَالِهِ يَقْتُرُ وَيَقْتِرُ قَتْرًا وَأَقْتَرَ يُقْتِرُ إِقْتَارًا" سب کے معنی خرچ میں تنگی کرنے کے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیتِ کریمہ کے جو معنی کیے گئے ہیں، ان سب سے بہتر معنی یہ ہیں کہ جس کسی نے غیر طاعتِ الٰہی میں خرچ کیا تو وہ اسراف ہے اور جس نے طاعتِ الٰہی سے امساک کیا (یعنی ہاتھ روکا) وہ اقتار ہے اور جس نے اللہ پاک کی طاعت میں صرف کیا، وہ قوام ہے۔

امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا: قوام یہ ہے کہ بھوکا نہ مارے، ننگا نہ رکھے اور ایسا خرچ نہ کرے کہ لوگ کہیں کہ یقیناً اس نے اسراف کیا۔ یزید بن حبیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں کہ وہ کوئی کھانا تنعم اور لذت کے لیے نہ کھاتے تھے اور کوئی کپڑا جمال اور خوبصورتی کے لیے نہیں پہنتے تھے، لیکن وہ صرف اسی قدر کھاتے تھے جو اُن سے بھوک کو ختم کر دے اور اللہ پاک کی عبادت کے لیے ان کو قوت دے، اور لباس وہ پہنتے تھے جو ان کے ستر کو چھپا دے اور ان کو گرمی اور سردی سے بچائے۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے اس دستور اور معیار سے زیادہ نہ کیا اور نہ بخل کیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٩] "اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا نہ رکھ اور نہ اسے پوری طرح کھول دے کہ پھر ملامت زدہ، تھکا ہارا ہو کر بیٹھ رہے۔"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ وہ مومنین ہیں، اسراف نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کریں اور نہ اقتار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو منع کریں۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: "كَفَى سَرَفًا أَنْ لَّا يَشْتَهِيَ شَيْئًا إِلَّا اشْتَرَاهُ وَأَكَلَهُ" فضول خرچی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جب بھی کسی شے کی خواہش کرے، اس کو خرید لے اور کھا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسراف خرچ کرنے میں حد سے بڑھنا ہے، یہاں تک کہ تبذیر کی حد میں داخل ہو جائے اور "إِقْتَار" اس شے میں کمی کرنا ہے جو لازمی اور ضروری ہو۔ حسان بن عبدالرحمن رحمہ اللہ نے "وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قِوَامًا" بکسر قاف پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت بفتح قاف ہے۔ کہا ہے کہ دونوں کے ایک معنی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "قِوَام" بالکسر وہ ہے جس پر شے دائم وقرار پذیر ہوتی ہے اور بالفتح بہ معنی عدل واستقامت ہے (قاله ثعلب)

کسی نے کہا ہے کہ بالفتح دو شے کے درمیان عدل ہے اور بالکسر وہ ہے جس کے ساتھ کوئی شے قائم کی جاتی ہے، نہ اس سے زیادہ ہو کہ بچ جائے اور نہ کم ہو کہ بالکل پوری ہو۔ کسی نے کہا کہ بالکسر سداد و مبلغ ہے۔ ("سداد" بالكسر و الفتح ما يسد به الخلة والكسر أفصح و "مبلغ" حد رسیدن۔ غرض یہ ہے کہ قوام بالکسر وہ شے ہے، جس سے حاجت بند ہو جائے اور حاجت کی حد کو پہنچ جائے، مثلاً سداد عیش اس قدر کھانا کہ اس سے بھوک بند ہو جائے)۔

﴿ كَانَ ﴾ کا اسم اس میں مقدر ہے اور ﴿ قَوَامًا ﴾ اس کی خبر۔ یہ قول امام فراء رحمہ اللہ کا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ان کا خرچ کرنا قصد اور وسط، یعنی درمیانہ ہے اسراف اور اقتار کے درمیان، اور دو سیئہ کے درمیان حسنہ ہے۔ مثلاً اسراف کرنا گناہ ہے اور تنگی کرنا گناہ ہے اور خرچ میں میانہ روی کرنا نیکی ہے تو میانہ روی دو بدیوں کے درمیان ایک نیکی ہوئی۔ امام فراء رحمہ اللہ سے ایک اور قول مروی ہے، وہ یہ ہے کہ ﴿ كَانَ ﴾ کا اسم ﴿ بَيْنَ ذٰلِكَ ﴾ اور ﴿ بَيْنَ ﴾ مبنی بر فتح ہے، اس لیے کہ من جملہ ظروفِ مفتوحہ ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اس قول کی کیا وجہ ہے، کیوں کہ ﴿ بَيْنَ ﴾ جب موضعِ رفع میں ہوتا ہے تو مرفوع ہو جاتا ہے،[1] غرضیکہ اللہ پاک نے سچے پکے خالص مومنوں کی پانچ صفتیں بیان کیں اور یہ پانچوں طاعتیں تھیں، جن کو وہ بجا لاتے تھے اور اُن کے عامل تھے۔ جب ان کے ذکر سے فارغ ہوا تو چند معاصی کا ذکر کیا کہ وہ ان سے بچتے ہیں، ان کے گرد نہیں پھٹکتے۔[2] چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۖ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾

اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اور وہ کسی نفس کو بھی جسے (مارنا) اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، ناحق قتل نہیں کرتے اور وہ زنا نہیں کرتے، اور جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ گناہ کی سزا پائے گا (68) یومِ قیامت اس کا عذاب دُگنا کر دیا جائے گا، اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل و خوار

[1] تفسير القرطبي (٣/ ٧٢ـ ٧٣) فتح القدير (٤/ ١١٦) [2] فتح البيان (٩/ ٣٤٤ـ ٣٤٩)

رہے گا (69) مگر جس نے توبہ کی اور وہ ایمان لایا اور نیک عمل کیے، تو انھی لوگوں کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دے گا، اور اللہ غفور (اور) رحیم ہے (70) اور جو توبہ کرے، اور نیک کام کرے تو بلاشبہہ وہ اللہ سے توبہ کرتا ہے، جیسے توبہ کرنے کا حق ہے (71)

عباد الرحمٰن شرک، قتلِ ناحق اور زنا سے اجتناب کرتے ہیں:

بجز حق کے، یعنی جہاں چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کی جان نہ ماریں سوائے تین گناہ کے: خون کے بدلے میں، یا بدکاری میں سنگسار کرنا، یا راستہ میں لوٹنے پر مارنا، یعنی دوسرے گناہوں کی نسبت یہ گناہ بڑے ہیں۔ گناہوں کو نیکیوں سے بدل دینا یہ ہے کہ گناہوں کی جگہ نیکیوں کی توفیق دے گا اور کفر کی حالت میں کیے گئے گناہ معاف کرے گا۔ پہلے ذکر تھا کفر کے گناہوں کا جن کے بعد ایمان لایا۔ یہ ذکر ہے اسلام لانے کے بعد گناہ کرنے کا۔ وہ بھی جب توبہ کرلے، یعنی اپنے کام سے پھرے تو اللہ کے ہاں جگہ پائے۔ انتہٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

1 امام احمد رحمہ اللہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا: یہ کہ تو اللہ کے لیے ند یعنی ہمسر ٹھہرائے، حالاں کہ اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ عرض کی: پھر کون سا گناہ؟ فرمایا: تو اپنے لڑکے کو اس خوف سے مار ڈالے کہ یہ تیرے ساتھ کھائے گا۔ عرض کی: پھر کون سا؟ فرمایا: یہ کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق نازل کی: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ﴾ [1]۔ (وهكذا رواه النسائي عن هناد بن السري عن أبي معاوية به، وقد أخرجه البخاري ومسلم من حديث الأعمش ومنصور، زاد البخاري: وواصل ثلاثتهم عن أبي وائل شقيق بن سلمة عن أبي ميسرة عمرو بن شرحبيل عن ابن مسعود رضي الله عنه فالله أعلم .ولفظهما عن ابن مسعود رضي الله عنه قال: قلت يا رسول الله! أي الذنب أعظم الحديث طريق غريب).

2 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے مسروق سے روایت کیا ہے، کہا عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نکلے تو میں آپ کے ساتھ ہولیا، آپ ﷺ زمین کی ایک بلندی پر بیٹھے اور میں آپ ﷺ سے نیچے بیٹھا اور میرا منہ آپ ﷺ کے دونوں گھٹنوں کے برابر تھا، میں نے آپ کی خلوت کو غنیمت سمجھا اور میں نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر سے قربان ہوں یا رسول اللہ! کون سا گناہ سب سے زیادہ بڑا ہے؟ فرمایا: یہ کہ تو اللہ کے "نِدّ" کو پکارے، حالاں کہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔ میں نے عرض کی: پھر کون سا گناہ؟ فرمایا: یہ کہ تو اپنے لڑکے کو اس بات کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠١٣) مسند أحمد (١/ ٣٨٠)

کراہت سے مار ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے، یعنی تیرے کھانے میں شریک ہو۔ میں نے عرض کی: پھر کون سا گناہ؟ فرمایا: یہ کہ تو اپنے پڑوسی کی عورت سے زنا کرے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾[1]

3 امام نسائی رحمہ اللہ نے سلمہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے حجۃ الوداع میں: خبردار! وہ چار باتیں ہیں، میں اُن کے بیان کرنے میں بخل کرنے والا نہیں ہوں، یعنی میں ان کو بیان کر دیتا ہوں، جب سے میں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، وہ یہ ہیں: تم اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کرو اور مت مارو اس جان کو جس کو اللہ نے حرام کیا ہے، مگر حق کے ساتھ اور مت زنا کرو اور چوری نہ کرو۔[2]

4 امام احمد نے مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: تم زنا کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام کیا ہے، لہٰذا وہ قیامت کے دن تک حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرد کا دس عورتوں سے زنا کرنا زیادہ آسان ہے، اس سے کہ اپنے پڑوسی کی عورت سے زنا کرے۔ فرمایا: پھر چوری کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ عرض کی کہ اس کو اللہ اور رسول نے حرام کیا ہے تو وہ حرام ہے۔ فرمایا: البتہ اگر کوئی مرد دس گھروں سے چوری کرے تو یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے، یعنی اس کا گناہ کم درجے کا ہے، اس کے اپنے پڑوسی کے گھر میں چوری کرنے سے۔[3]

5 ابو بکر بن ابی الدنیا نے ہیثم بن مالک طائی سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک شرک کے بعد کوئی اور گناہ اس سے بڑا نہیں ہے کہ آدمی اپنے نطفے کو اس رحم میں رکھے جو اس کے لیے حلال نہیں ہے، یعنی زنا کرے۔[4]

6 ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اہلِ شرک کے کچھ لوگوں نے قتل کیا تو بہت کچھ کیا اور زنا کیا تو بہت کچھ کیا، پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو عرض کی کہ بے شک جو بات تو کہتا ہے اور جس کی طرف بلاتا ہے، البتہ اچھی ہے، اگر تو ہم کو اس بات کی خبر دے دے کہ جو کچھ ہم کر چکے ہیں اس کے لیے کفارہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الزمر: ٥٣] ''آپ کہہ دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی ہے! تم اللہ

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٠٥) اس کی سند میں ''سری بن اسماعیل'' ضعیف راوی ہے۔

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٦٤٠)

[3] مسند أحمد (٦/ ٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٠٤٣)

[4] الورع لابن أبي الدنيا (١/ ٩٤) یہ روایت مرسل ہے۔

کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔"[1] (قال ابن جريج: أخبرني يعلى عن سعيد بن جبير أنه سمع ابن عباس رضی اللہ عنہما يحدث الخ)

7 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو فاختہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا، بے شک اللہ تجھے منع کرتا ہے کہ تو مخلوق کو پوجے اور خالق کو چھوڑ دے اور تجھے منع کرتا ہے کہ اپنے لڑکے کو مار ڈالے اور اپنے کتے کو غذا دے اور تجھے منع کرتا ہے کہ تو اپنے پڑوسی کی عورت سے زنا کرے۔ سفیان نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ فرمان ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴾ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اثام جہنم میں ایک وادی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اثام جہنم میں وادیاں ہیں، ان میں زانی لوگ عذاب کیے جائیں گے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اثام نکال ہے، یعنی عقوبت یا سزا ہے۔ ہم اس کی حدیث بیان کیے جاتے تھے کہ وہ جہنم میں ایک وادی ہے۔ ہم سے ذکر کیا گیا کہ حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے سے کہا کرتے تھے: بیٹا! زنا سے بچنا، بے شک اس کا اول مخافت ہے اور اس کا آخر ندامت ہے۔[3] جس حدیث کو امام ابن جریر وغیرہ نے ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً و مرفوعاً روایت کیا ہے، اس میں یہ بات وارد ہوئی ہے کہ غی و اثام جہنم کی تہہ میں دو کنوئیں ہیں۔[4] "أَجَارَنَا اللّٰهُ تَعَالىٰ مِنْهَا بِمَنِّهٖ وَكَرَمِهٖ"۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اثام بہ معنی جزا ہے،[5] یہ قول آیت کے ظاہر کے زیادہ مشابہ ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ یعنی اس پر عذاب مکرر کیا جائے گا اور سخت کیا جائے گا، ﴿ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴾ یعنی ہمیشہ ہمیشہ اس میں حقیر و ذلیل ہو کر رہے گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صٰلِحًا ﴾ یعنی یہ صفاتِ قبیحہ جو اس نے کیے ہیں، اس پر اس کی جزا وہ ہے جو مذکور ہوئی، مگر وہ شخص جو دنیا میں اللہ عزوجل کی طرف رجوع ہو، ان سب برائیوں سے منہ موڑ کر تو بے شک اللہ تعالیٰ اس پر رجوع ہوگا۔ اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ قاتل کی توبہ صحیح ہے اور اس آیت اور سورۃ النساء کی آیت کے درمیان کسی طرح کا تعارض نہیں ہے: ﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٩٣] "اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے اس کی سزا جہنم ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اللہ نے اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٢٨) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٣٠) [4] تفسير الطبري (١٩/ ٣٠٨۔ ٣٠٩) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٣٠)

اس لیے کہ یہ آیت اگرچہ مدنی ہے، مگر مطلق ہے اور اس شخص پر محمول ہوگی جس نے توبہ نہیں کی ہے، اس لیے کہ یہ مقید بہ توبہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٤٨] ''بے شک اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، اس نے جھوٹ گھڑا اور بڑے گناہ کا کام کیا۔'' اور رسول اللہ ﷺ کی صحیح سنت سے قاتل کی توبہ کا صحیح ہونا ثابت ہو چکا ہے جس طرح کہ اس شخص کے قصے میں آیا ہے جس نے سو آدمیوں کو قتل کر ڈالا تھا، پھر اس نے توبہ کی تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی اور نبی اکرم ﷺ نے اس کی تقریر فرمائی،[1] یعنی اس بات کو برقرار رکھا۔ اس کے علاوہ اور احادیث ہیں۔ یہ شعر اس قصے کے فی الجملہ مناسب ہے:

ایں درگہِ ما درگہِ نو میدی نیست   صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

''یہ بارگاہ جو ہماری بارگاہ ہے، یہاں کسی کو مایوسی نہیں ہوتی، اگر تو نے سو بار بھی توبہ توڑی ہے، پھر توبہ کر لے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ ایک قول یہ ہے کہ ان کے سیئات کے عمل حسنات سے بدل دیے جائیں گے، مثلاً: پہلے گناہ کرتے تھے اب نیک اعمال کریں گے۔ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ وہ مومنین ہیں کہ اپنے ایمان لانے سے پہلے سیئات پر تھے، پھر اللہ پاک نے ان کو سیئات سے بے رغبت کر دیا اور اُن کو حسنات کی طرف پھیر دیا، پھر سیئات کی جگہ ان کو حسنات بدل دیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس آیت کی تفسیر کے وقت یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

وَبُدِّلْنَ بَعْدَ حَرِّهٖ خَرِيْفًا   وَبَعْدَ طُوْلِ النَّفْسِ الْوَجِيْفَا

یعنی وہ احوال اپنے غیر کی طرف متغیر ہو گئے۔ امام عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی قبیح صفت پر ہوتا ہے، پھر اللہ اس کے عوض اس کو خیر بدل دیتا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کو بتوں کی عبادت کے عوض رحمٰن کی عبادت سے بدل دیا، مسلمانوں کے قتل سے مشرکین کے قتال کو بدل دیا اور مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کے عوض مومن عورتوں کے ساتھ نکاح کو بدل دیا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کے بدعمل کے عوض نیک عمل کو بدل دیا اور شرک کے بدلے اخلاص دے دیا اور ان فجور کے عوض پاک دامنی بدل دی، یعنی بدکاری کے بدلے ان کو پارسائی دی اور کفر کے بدلے اسلام دیا۔

یہ قول امام ابو العالیہ، قتادہ اور ایک اور جماعت کا بھی ہے۔[2] دوسرا قول یہ ہے کہ یہ گذشتہ سیئات نفسِ توبہ نصوح

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٦) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٣٣_ ٢٧٣٤)

سے بدل کر حسنات ہو جائیں گے، اور یہ نہیں ہے، بلکہ اس طرح ہے کہ جب کبھی اس نے اپنے گذشتہ گناہ کو یاد کیا تو نادم اور پشیمان ہوا اور "إنا للّٰه وإنا إليه راجعون" کہا اور استغفار کی، پس اس اعتبار سے وہ گناہ بدل کر طاعت ہو جائے گا، پھر قیامت کے دن اگرچہ اس کو اپنے اعمال نامے میں لکھا ہوا پائے گا، لیکن وہ اس کے لیے ضرر رساں نہ ہو گا اور اس کے نامۂ اعمال میں تبدیل ہو کر حسنہ ہو جائے گا، جس طرح کہ اس بارے میں سنت ثابت ہوئی ہے اور سلف صالحین رحمہم اللہ سے اس کے بارے میں آثارِ نبویہ صحیح ہوئے ہیں:

1. ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ بے شک میں اس کو جانتا ہوں جو سب سے آخر میں دوزخ سے نکالا جائے گا اور وہ شخص جو سب سے آخر میں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ (بعض نسخوں میں اس روایت کی سند میں ان الفاظ کے ساتھ زیادت کی گئی ہے: (قال الإمام أحمد: حدثنا أبو معاوية، حدثنا الأعمش عن المعرور بن سويد عن أبي ذر رضی اللہ عنہ الخ انتهى من حاشية ابن كثير المطبوع بمصر)۔ ایک شخص لایا جائے گا، پس فرمائے گا (اصل کے الفاظ یہ ہیں: "فيقول نحوا عنه الخ" گو "يقول" کا فاعل مذکور نہیں ہے، مگر وہ اللہ پاک ہی ہے) کہ اس سے اس کے بڑے گناہ علاحدہ رکھو اور چھوٹے گناہوں کے متعلق اس سے پوچھو۔ کہا: پھر اس سے کہا جائے گا کہ تو نے فلاں دن ایسا اور ایسا کیا؟ اور فلاں دن ایسا ایسا کیا تو وہ کہے گا: ہاں، اس کو کسی شے کا انکار کرنے کی طاقت نہ ہو گی، پھر کہا جائے گا کہ تیرے لیے ہر گناہ کے عوض ایک نیکی ہے تو وہ کہے گا: یا رب میں نے تو بہت چیزیں کی ہیں کہ اس جگہ میں ان کو نہیں دیکھتا۔ راوی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچلیاں کھل گئیں۔[1] (انفرد بإخراجه مسلم)

2. ابو القاسم طبرانی نے ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس وقت ابن آدم سو جاتا ہے تو فرشتہ شیطان سے کہتا ہے تو مجھے اپنا نامۂ اعمال دے دے تو وہ اسے دے دیتا ہے تو فرشتہ اپنے نامۂ اعمال میں جو کوئی نیکی پاتا ہے تو اس کے بدلے میں شیطان کے نامۂ اعمال سے دس بدیاں مٹا دیتا ہے اور ان کو نیکیاں لکھتا ہے۔ پس جس وقت تم میں کوئی سونے کا ارادہ کرے تو چاہیے کہ تکبیر کہے تینتیس بار اور حمد کرے چونتیس بار اور تسبیح کہے تینتیس بار، پس یہ سو ہوئیں۔[2]

3. امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کو اس کا نامۂ اعمال دیا جائے گا، وہ اس کے اوپر والے حصے کو پڑھے گا تو وہ اس کی بدیاں ہوں گی، پھر جب وہ بدگمانی کرنے کے قریب ہو گا تو اس کے نیچے والے حصے میں نظر کرے گا تو وہاں اس کی نیکیاں ہوں گی، پھر اس کے اوپر والے حصے پر نظر

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠) مسند أحمد (٥/ ١٧٠)

[2] المعجم الكبير (٣/ ٢٩٦) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٥٦١٠)

کرے گا تو ناگاہ وہ بدل کر نیکیاں کر دی گئی ہوں گی۔

④ نیز ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیامت کے دن کچھ لوگ آئیں گے کہ انھوں نے بہت کچھ گناہ کیے ہوں گے، کہا گیا: اے ابو ہریرہ! وہ لوگ کون ہیں؟ کہا: وہ ہیں کہ اللہ جن کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔[1]

⑤ نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو الصیف سے روایت کیا ہے، یہ شخص معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے ہے، کہا ہے کہ جنت والے جنت میں چار قسموں میں داخل ہوں گے: متقین، پھر شاکرین، پھر خائفین، پھر اصحابِ یمین، کہا: اس لیے کہ انھوں نے بدیاں کی ہیں اور نیکیاں بھی، وہ اپنے نامۂ اعمال اپنے داہنے ہاتھوں میں دیے جائیں گے تو وہ اپنی بدیوں کو ایک ایک حرف کر کے پڑھیں گے اور کہیں گے: اے ہمارے رب! یہ تو ہماری بدیاں ہیں، پھر ہماری نیکیاں کہاں ہیں؟ اس وقت اللہ تعالیٰ بدیاں مٹا دے گا اور ان کو نیکیاں کر دے گا، اس وقت وہ کہیں گے: ﴿ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴾ [الحاقة: ١٩] ''لو! میرا اعمال نامہ پڑھو'' یہ لوگ اکثر اہلِ جنت ہیں۔

⑥ علی بن الحسین امام زین العابدین رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ﴾ فرمایا کہ آخرت میں۔

⑦ مکحول رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بخش دے گا ان کو، پھر ان کو نیکیاں کر دے گا۔[2] (رواهما ابن أبي حاتم)

⑧ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کے مثل سعید بن مسیّب سے روایت کیا ہے۔[3]

⑨ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو جابر سے روایت کیا ہے، ابو جابر نے امام مکحول رحمہ اللہ کو حدیث کرتے ہوئے سنا، کہا کہ ایک بڑا بوڑھا آیا۔ یہ شخص ''ھرم'' کو پہنچ گیا تھا، یعنی بڑھاپے کی انتہا کو، اس کی دونوں بھنویں آنکھوں پر گر پڑی تھیں، یعنی مارے بڑھاپے کے، سو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ایک شخص ہے کہ اس نے غدر کیا اور فجور کیا (غدر بہ معنی بے وفائی ہے، یعنی گناہ کو چھوڑنے کا جو عہد ہے، اس کو پورا نہ کیا، بلکہ گناہ کیے یہ غدر ہوا اور فجور بہ معنی بدکاری ہے) اور کسی حاجہ کو چھوڑا نہ واجہ کو، مگر اس کو اپنے سیدھے ہاتھ سے توڑا (یعنی میرے جی نے جس گناہ کی طرف مجھے بلایا میں نے اس کو بلا تکلف کر لیا یہ حاجہ ہے، اور واجہ من جملہ توابع ہے جیسے بولتے ہیں روٹی ووٹی، موٹا جھوٹا، اسی طرح عربی میں حاجہ واجہ ہے، یہاں بطورِ تشبیہ گناہ کرنے کا ذکر کیا ہے، مثلاً: درخت میں بہت سا پھل لگا ہوا ہے، جس کو جی چاہا اس کو توڑ کر کھا لیا اور اسی طرح گناہ کا حال ہے کہ جس گناہ کو جی چاہا اس کو بلا تکلف کر لیا)۔ اگر اس کے گناہ اہلِ زمین کے درمیان بانٹے جائیں تو ان کو ہلاک کر دیں، پھر کیا اس کے لیے کوئی توبہ ہے؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کیا تو اسلام لایا ہے؟ تو اس نے کہا: میں جو ہوں تو اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ وحدہ لا شریک لہ اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے

① تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٣٤ـ ٢٧٣٣) ② تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٣٥) ③ تفسير الطبري (١٩/ ٣١٢)

بندے اور رسول ہیں تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تیرے لیے تیرے غدرات اور فجرات بخشنے والا ہے (''غدرات'' بفتحتین ''غدرہ'' کی جمع ہے ''غدرہ'' بہ معنی غدر ہے۔ غدر وہی ترکِ معاصی کے عہد کو وفا نہ کرنا۔ غدرات و فجرات سے مراد گناہ و معاصی ہیں) اور جب تک تو اس طرح ہے تیری برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ پھر اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! اور غدرات میرے اور فجرات میرے؟ تو فرمایا کہ غدرات تیرے اور فجرات تیرے، پھر وہ شخص منہ پھیر کر ''الله أكبر لا إله إلا الله'' کہتا ہوا چلا گیا۔[1]

10 طبرانی نے ابو فروہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی ﷺ کے پاس آیا، پھر عرض کی: آپ مجھے اس آدمی کے بارے میں خبر دیں جس نے کل گناہ کیے اور اس نے اپنے لیے نہ کوئی حاجہ چھوڑا نہ کوئی واجہ تو کیا اس کے لیے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا: کیا تو اسلام لایا ہے؟ تو اس نے کہا: ہاں، فرمایا: اب تو نیکیاں کر اور برائیاں چھوڑ، تو اللہ ان سب کو تیرے لیے نیکیاں کر دے گا۔ وہ بولا: اور میرے غدرات اور میرے فجرات؟ فرمایا: ہاں۔ (من حديث أبي المغيرة عن صفوان بن عمر عن عبد الرحمن بن جبير عن أبي فروة أنه أتى رسول اللهﷺ الخ)۔ راوی نے کہا: پھر وہ تکبیر کہتا رہا، یہاں تک کہ چھپ گیا۔[2] (و رواه الطبراني من طريق أبي فروة الرهاوي عن ياسين الزيات عن أبي سلمة الحمصي عن يحيىٰ بن جابر عن سلمة بن نفيل مرفوعا)

11 سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت میرے پاس آئی تو اس نے کہا: آیا میرے لیے کوئی توبہ ہے میں نے زنا کیا اور بچہ جنا اور اس کو مار ڈالا؟ تو میں نے کہا: نہیں، چنانچہ وہ کھڑی ہوئی اور حسرت کو پکارتی تھی۔ پھر میں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ پھر اس عورت نے جو کہا تھا اور میں نے اس سے جو کہا تھا، اس کا قصہ آپ ﷺ سے بیان کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ بِئْسَمَا قُلْتَ ﴾ یعنی تو نے برا کہا، تو یہ آیت کیوں نہیں پڑھتا تھا: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿68﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿69﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ ﴾ پھر میں نے اس آیت کو اس پر پڑھا تو وہ سجدہ کرتی ہوئی گری اور کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ لِيْ مَخْرَجًا'' یعنی حمد ہے اس اللہ کو جس نے میرے لیے گناہ سے نکلنے کی راہ ٹھہرا دی۔ (هذا حديث غريب من هذا الوجه وفي رجاله من لايعرف، والله أعلم، وقد رواه ابن جرير من حديث إبراهيم بن المنذر الحرامي بسنده بنحوه وعنده: فخرجت تدعو بالحسرة وتقول: يا حسرتا أخلق هذا الحسن للنار؟ وعنده: لما رجع من

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٣٥-٢٧٣٦) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] المعجم الكبير (٧/ ٥٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٩١)

عند رسول اللهﷺ تطلبها في جميع دور المدينة فلم يجدها فلما كان من الليلة المقبلة جاءته فأخبرها بما قال له رسول اللهﷺ فخرت ساجدة وقالت: الحمد لله الذي جعل لي مخرجا وتوبة مما عملت وأعتقت جارية كانت معها وابنتها وتابت إلى الله عزوجل[1]

پھر اللہ پاک نے اپنی عمومِ رحیمیت کی خبر دی کہ اس کی رحمت اپنے بندوں پر عام ہے اور اُن میں سے جو کوئی اس کی طرف رجوع ہو تو وہ اس پر رجوع ہوتا ہے، کسی بھی گناہ سے ہو، وہ جلیل ہو یا حقیر، بڑا ہو یا چھوٹا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ۱۱۰] ”اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا پائے گا۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ [التوبة: ۱۰۴] ”کیا انھیں معلوم نہیں کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے، اور وہی صدقات لیتا ہے اور یہ کہ بلاشبہہ اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الزمر: ۵۳] ”آپ کہہ دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“ یعنی اس کے لیے جو اس کی طرف رجوع ہو۔ (آخر میں ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ﴾ مطلب یہ ہے کہ جو کوئی اللہ پاک کی طرف رجوع ہوگا اور گناہوں سے توبہ کرے گا تو وہ اس کے سارے گناہ بخش دے گا۔)[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ رحمٰن کے بندے اللہ پاک کے ساتھ کسی رب کو نہیں پکارتے، نہ اس کے ساتھ کسی شے کو شریک کرتے ہیں، بلکہ اس کی توحید کرتے ہیں، اس کو ایک جانتے ہیں، اس کے لیے عبادت کا اخلاص کرتے ہیں، اسی کی عبادت کرتے اور اسی سے دعا مانگتے ہیں۔

یکے دانم یکے گویم یکے خوانم

اور جس جان کے قتل کو اللہ پاک نے حرام کیا ہے، اسے کسی وجہ سے قتل نہیں کرتے، سوائے اس وجہ کے جو اس

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۷۳۵) تفسیر الطبري (۱۹/ ۳۰۶۔ ۳۰۷) اس کی سند میں ”عبید بن ابی عبید اور عیسی بن شعیب“ متکلم فیہ راوی ہیں۔

[2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۳۲۔ ۴۳۵)

کی حرمت وعصمت کو زائل کرنے والی ہو، یعنی کسی وجہ سے جانوں کو قتل نہیں کرتے، مگر ان وجوہ کی بنا پر جن سے ان کا مار ڈالنا ضروری ہے، وہ یہی ہیں کہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو جانا اور شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کرنا اور کسی جان کو بغیر کسی نفس کے بدلے کے مار ڈالنا۔ اور وہ زنا نہیں کرتے، یعنی جو شرم گاہیں بغیر نکاح اور ملکِ یمین (غلامی) کے حرام کی گئی ہیں، ان کو حلال نہیں کرتے، ان کو حرام جانتے ہیں اور جو شخص اشیائے مذکورہ میں سے کوئی شے کرے تو وہ آثام سے ملے گا۔ آثام کلامِ عرب میں عذاب کے معنی میں ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: "آثَمَهُ اللّٰهُ يُؤْثِمُهُ أَثَامًا وَآثَامًا أَيْ: جَازَاهُ جَزَاءَ الْإِثْمِ فَهُوَ مَأْثُومٌ أَيْ: يُجْزَى جَزَاءَ الْإِثْمِ" یعنی آثام اور اَثام گناہ کے بدلہ دینے کو کہتے ہیں۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، عکرمہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آثام ایک وادی ہے جہنم میں، اللہ نے اس کو کافروں کے لیے عتاب ٹھہرایا ہے۔ (ابن کثیر میں اس جگہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ہے، والله أعلم از مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں ایک پہاڑ ہے۔ امام ابو مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آثام اور اثم کے ایک معنی ہیں۔ اس جگہ مراد جزائے آثام ہے۔ اسمِ شے کا اطلاق اس کی جزا پر کیا گیا ہے۔ کسی نے "يُلَقَّ" بضمِ تحتیہ و تشدید قاف پڑھا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے "يَلْقَ أَيَامًا" پڑھا ہے جمع یوم۔ ایام سے مراد شداید اور سختیاں ہیں۔ عرب لوگ شداید کی تعبیر ایام کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

فتح القدیر و فتح البیان میں ہے: میں گمان نہیں کرتا ہوں کہ یہ قراءت حسن رحمہ اللہ سے صحیح ہو۔ امام نافع، ابن عامر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے "يُضَاعَفْ" اور "يَخْلُدْ" کو بجزم پڑھا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "يُضَعَّفْ" بہ تشدیدِ عین و بدونِ الف و بجزم پڑھا ہے۔ طلحہ بن سلیمان رحمہ اللہ نے "نُضَعِّفْ" بضمِ نون و کسرِ عین مشددہ و بجزم پڑھا ہے۔ امام ابو جعفر اور شیبہ رحمہ اللہ کی بھی یہی قراءت ہے۔ امام عاصم رحمہ اللہ نے ابو بکر رحمہ اللہ کی روایت میں ہر دو فعل کو برفع پڑھا ہے بنا بر استیناف۔ امام طلحہ بن سلیمان رحمہ اللہ نے "تَخْلُدُ" بتائے فوقیہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ کافر کو خطاب ہے۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے "يُخْلَدْ" بضمِ یائے تحتیہ و فتحِ لام پڑھا ہے۔ امام ابو علی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روایت کے لحاظ سے یہ غلط ہے۔[1]

غرضیکہ "یضاعف" میں چار قراءتیں ہیں، سوائے نون کے اور وہ سب سبعیہ ہیں۔ "یضاعف" میں جزم کی وجہ یہ ہے کہ ﴿يَلْقَ﴾ سے بدل ہے، اس لیے کہ معنی میں دونوں متحد ہیں۔ ﴿فِيْهٖ﴾ کی ضمیر عذابِ مضاعف کی طرف راجع ہے۔ کسی نے "فهي" باشباع پڑھا ہے، وعید میں مبالغے کے لیے۔ عرب لوگ مبالغے کے لیے مد کیا کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ ہائے کنایہ میں اشباع اصل ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس کے لیے قیامت کے دن عذاب دُگنا

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٧٥۔ ٧٦) فتح القدير (٤/ ١١٧۔ ١١٨)

کر دیا جائے گا اور ہمیشہ اس عذاب میں ذلیل وحقیر اور خوار ہو کر رہے گا۔ عذاب جسمانی اور روحانی دونوں طرح کا ہو گا۔ عذاب کے دوگنا ہونے کا یہ سبب ہے کہ جب مشرک نے شرک کے ساتھ ساتھ معاصی کا ارتکاب کیا تو اس کے لیے عذاب دُگنا کیا جائے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ ...الآیة﴾ کو کئی سال تک پڑھا، پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صٰلِحًا ... الآیة﴾. میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا جتنا اس آیت کے نازل ہونے پر ہوئے اور اس آیتِ کریمہ کے نازل ہونے پر: ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ [الفتح: ۱] ''(اے نبی!) بلاشبہ ہم نے آپ کو فتح مبین دی۔''[1]

بالجملہ ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ ﴾ کے استثناء میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ يَلْقَ ﴾ کی ضمیر مستتر سے استثنائے متصل ہے، یعنی مگر جس شخص نے توبہ کر لی تو وہ اثام سے نہ ملے گا، بلکہ اس کے لیے عزت واکرام میں اس طریقے سے زیادتی کی جائے گی کہ اس کی بدیاں نیکیوں سے بدل دی جائیں گی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ منقطع ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اتصال ظاہر نہیں ہے، اس لیے کہ مستثنیٰ منہ پر اس بات کا حکم کیا گیا ہے کہ اس کے لیے دوگنا عذاب کیا جائے گا تو اس بنا پر عبارت کی تقدیر یہ ہو گی: "إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا يُضَاعَفُ لَهُ الْعَذَابُ"، یعنی مگر جس شخص نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیا تو اس کو دُگنا عذاب نہ کیا جائے گا۔ دُگنے کی نفی سے غیر دُگنے عذاب کی نفی لازم نہیں آتی۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک اولیٰ یہ ہے کہ منقطع ہو، بہ معنی ﴿ لٰكِنْ ﴾ یعنی "لٰكِنْ مَنْ تَابَ...الخ"[2]۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علماء کے درمیان اس بات میں کچھ اختلاف نہیں ہے کہ استثنا کافر اور زانی کے حق میں عام ہے۔ مسلمانوں میں سے جو قاتل ہے، اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔

﴿ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ﴾ میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس تبدیلی کے معنی یہ ہیں کہ پہلے معاصی کو ان کی توبہ کے سبب سے ان سے مٹا دے گا اور اُن کے بجائے اُن کے لیے طاعاتِ لاحقہ ثابت کرے گا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے اس بارے میں جو کچھ کہا گیا، اس سب سے بہتر یہ بات ہے کہ کافر کی جگہ مومن لکھا جائے گا اور عاصی کی جگہ مطیع۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ایک قوم کہتی ہے کہ تبدیلی آخرت میں ہو گی، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ تبدیلی تو دنیا ہی میں ہے، اللہ تعالیٰ شرک کے بجائے ایمان کر دے گا اور شک کے بجائے اخلاص اور فجور اور بدکاری کے بجائے احسان اور پاک دامنی (فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں: قَالَ الْحَسَنُ: قَوْمٌ يَقُوْلُوْنَ: هَذَا التَّبْدِيْلُ فِي الْآخِرَةِ وَلَيْسَ كَذٰلِكَ، إِنَّمَا التَّبْدِيْلُ فِي الدُّنْيَا، يُبَدِّلُ اللّٰهُ لَهُمْ إِيْمَانًا مَكَانَ الشِّرْكِ وَإِحْصَانًا مَكَانَ الْفُجُوْرِ وَقَتْلَ الْمُشْرِكِ مَكَانَ الْمُؤْمِنِ انتهى.[3] فتح القدیر

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٧٩) [2] البحر المحيط (٦/ ٤٧٢) [3] فتح البيان (٩/ ٣٥١)

کے الفاظ یہ ہیں: "إِيمَانًا مَكَانَ الشِّرْكِ وَإِخْلَاصًا مِنَ الشَّكِّ وَإِحْصَانًا مِنَ الْفُجُوْرِ. انتهى"[1]) اور قتلِ مشرک کو بجائے مومن کے (یہ جملہ امام حسن رحمہ اللہ کے قول میں نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے یہ قول علاحدہ ہے اور یوں ہو: "وَقِيلَ: اَلْمُؤْمِنُ مَكَانَ الْمُشْرِكِ" لیکن امام خازن رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے۔ اس میں یوں ہے: "فَيُبَدِّلُهُمْ بِالشِّرْكِ إِيمَانًا وَّبِقَتْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ قَتْلَ الْمُشْرِكِيْنَ وَبِالزِّنَا عِفَّةً وَّإِحْصَانًا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ"[2]

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سیئہ" کی جگہ حسنہ نہیں رکھا جائے گا، لیکن "سیئہ" کی جگہ توبہ رکھی جائے گی اور حسنہ مع توبہ کے۔[3] ایک قول یہ ہے کہ بدیاں نیکیوں سے بدلی جائیں گی۔ اس قول کی قائل صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کی ایک جماعت ہے۔ چنانچہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معصیت کا ملکہ اور معصیت کے داعی اور باعث جو نفس میں ہیں وہ بدل دیے جائیں گے، ملکۂ طاعت سے اس طور پر کہ پہلے ملکہ کو دور کر دے گا اور اس کی جگہ دوسرا ملکہ لے آئے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ تبدیلی غفران سے عبارت ہے، یعنی اللہ پاک ان کے لیے وہ بدیاں بخش دے گا نہ یہ کہ ان کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ اللہ پاک کے فضل و کرم اور تفضّل و رحمتِ عامہ و خاصہ سے کچھ بعید نہیں ہے کہ جب بندے کی توبہ صحیح ہو جائے تو ہر سیئہ کی جگہ حسنہ رکھ دے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ»[4] یعنی سیئہ کے بعد ہی نیکی کر لے تو وہ اس کو مٹا دے گی اور لوگوں سے اچھے خلق سے پیش آ۔ سیئات کے دور ہونے اور سیئات کے حسنات سے بدل دیے جانے کے بارے میں بہت حدیثیں وارد ہوئی ہیں، چنانچہ بعض پہلے گزر چکی ہیں۔ غرضیکہ تبدیل و تکفیرِ سیئات کا ذکر جو ابھی ہوا ہے۔

پس جملہ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ اس کی تقریر و تثبیت کرتا ہے۔ یعنی اللہ پاک میں ہمیشہ غفران اور رحمت کے اوصاف موجود رہتے ہیں۔ ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهٗ يَتُوْبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَابًا﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو شخص گناہوں سے توبہ کرے، ان کو چھوڑ دے، ان پر نادم اور پشیمان ہو اور نیک کام بجا لائے اور اُن کے ساتھ گزشتہ گناہوں کی تلافی کرے تو بے شک یہ شخص اس سبب سے اللہ کی طرف ایسا رجوع ہوگا، جو اللہ پاک کے نزدیک صحیح اور پسندیدہ اور قوی ہوگا، سزا کو مٹانے والا اور ثواب کو حاصل کرنے والا ہوگا۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ اللہ کی طرف رجوع ہوگا، صحیح رجوع، جو توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور ان پر احسان کرتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ رجوع کرے گا اللہ کی طرف اور اس کے ثواب کی طرف اچھا رجوع ہونا۔ یہ تعمیم ہے تخصیص کے بعد۔ قفال نے کہا ہے کہ پہلی آیت ان لوگوں کے حق میں ہو، جو مشرکوں سے تائب ہوئے ہیں اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ﴾[5] پھر اس پر عطف کیا ہے ان لوگوں کا جو مسلمانوں میں سے تائب ہوئے ہیں اور ان کی توبہ کے بعد عملِ صالح

[1] فتح القدير (٤/ ١١٨) [2] تفسير الخازن (٥/ ١٠٩) [3] تفسير القرطبي (٣/ ٧٦۔ ٧٧)
[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٩٧) [5] فتح القدير (٤/ ١١٩)

کا ذکر کیا ہے، پس ان کے لیے بھی تائبین کا حکم ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے زبان سے توبہ کی اور فعل سے اس کو سچا نہ کر دکھایا تو یہ توبہ کوئی نفع دینے والی نہیں ہے، بلکہ جس نے توبہ کی اور عمل صالح کیا، پھر اعمالِ صالحہ سے اپنی توبہ کو سچا کر دکھایا تو وہی ہے جس نے توبہ کی۔ توبہ کا سچا ہونا یہ ہے کہ توبہ توبۂ نصوح ہے اور اسی لیے مصدر کے ساتھ اس کی تاکید کی ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس نے توبہ کا ارادہ کیا اور اس پر عزم کیا تو چاہیے کہ اللہ کی طرف توبہ کرے، چنانچہ خبر امر کے معنی میں ہے۔ یہ تاویل اس لیے کی ہے کہ شرط اور جزا اکٹھے نہ ہو جائیں، کیوں کہ اس طرح نہیں کہتے کہ "مَنْ تَابَ فَإِنَّهُ يَتُوْبُ"

کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے شرک سے توبہ کی اور فرائض ادا کیے ان لوگوں میں سے کہ جنھوں نے نہ قتل کیا اور نہ زنا کیا تو بے شک وہ موت کے بعد اللہ کی طرف رجوع کرے گا، اچھا رجوع ہونا، کیوں کہ وہ اپنے سے علاوہ ان لوگوں پر فضیلت والا اور کامیاب اور بلند ہوگا، جنھوں نے قتل اور زنا کیا ہے۔ لہٰذا پہلی توبہ تو شرک سے رجوع ہے اور دوسری اللہ پاک کی طرف جزا اور مکافات کے لیے رجوع ہے۔ پہلا قول اولیٰ ہے۔[1] رباعی ؎

بر جرم گر اعتراف خواہی کردن — دل را اے درد صاف خواہی کردن
یا رب تو کریم و من گنہگار توام — دانم آخر معاف خواہی کردن

"اپنے جرم کو اگر تو تسلیم کرنا چاہتا ہے تو اے درد! دل کو صاف کرنا پڑے گا۔ اے رب! تو کرم کرنے والا ہے اور میں تیرا گناہ گار ہوں، میں جانتا ہوں کہ آخر تو معاف کر دے گا۔"

جرم و گناہ کا اعتراف کرنا اپنے قصور کا اقرار کرنا ہے اور اپنے قصور کا معترف ہونا ہی ندامت اور پشیمانی پر مبنی ہے اور منشائے قبول و معذرت بخشش کا وسیلہ ہے، کیوں کہ "اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ، وَالتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ" پس جرم وعصیان پر اعتراف کرنا آدمی کا کام ہے اور صفائی کا موجب ہے اور استکبار اور انکار ابلیس کا شعار ہے اور عقوبت کا سبب ہے اور عین خطا ہے۔ یا رب! ہم بنی آدم تجھ جیسے کریم پروردگار کے گناہ گار ہیں، آخر ہم اس لطفِ عمیم کی ظلِ حمایت میں، یعنی سائے میں ہیں، بالخصوص ہم خالص محمدی لوگ تیری رحمتِ رحیمیہ کے امیدوار ہیں اور زیادہ تر توقع رکھتے ہیں۔ "وَنَجِيْئُ بِمُحَمَّدٍ حَبِيْبِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيْعًا وَلَا نَقْنُطُ مِنْ رَّحْمَتِكَ إِنَّكَ تَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا" غرضیکہ پھر اللہ پاک نے ان توبہ کرنے والوں، عملِ صالح کرنے والوں کی صفت بیان کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

---

[1] فتح البیان (۹/ ۳۴۹۔ ۳۵۳)

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا
كِرَامًا ﴿٧٢﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا
صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا
وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿٧٤﴾

اور وہ جو جھوٹی شہادت نہیں دیتے، اور جب کسی لغو اور بیہودہ کام سے ان کا گزر ہو تو وہ عزت و وقار سے گزر جاتے ہیں (72) اور وہ کہ جب انھیں ان کے رب کی آیات کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے (73) اور وہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر اور ہمیں متقیوں کا امام بنا (74)

رحمان کے بندوں کی کچھ مزید صفات کا ذکر:

لغو چیزوں پر شرافت سے گزرنا یہ ہے کہ گناہ کی باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور کھیل کی باتوں کی طرف دھیان نہیں کرتے، نہ ان میں شامل ہوتے ہیں، نہ ان سے لڑتے ہیں۔ اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے، یعنی دھیان سے سنتے ہیں۔ آنکھ کی ٹھنڈک یہ کہ وہ بھی اپنی راہ پر ہوں، ہم پرہیز گاروں کے آگے ہوں اور وہ ہمارے پیچھے۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ بھی من جملہ ﴿عِبَادُ الرَّحْمٰنِ﴾ کی صفات سے ہے کہ وہ جھوٹی گواہی میں حاضر نہیں ہوتے۔ کسی نے کہا ہے کہ "زور" شرک ہے اور بتوں کی پوجا۔ کسی نے کہا ہے کہ جھوٹ، فسق، کفر، لغو اور باطل ہے۔ امام محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "زور" لغو و غنا ہے، یعنی راگ اور گانا۔ امام ابو العالیہ، طاؤس، ابن سیرین، ضحاک اور ربیع بن انس رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ وہ مشرکوں کی عیدیں ہیں، یعنی تہوار اور میلے ٹھیلے، جن کو وہ دین سمجھتے ہیں۔ امام عمرو بن قیس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجالس سوء وخنا ہیں،[1] یعنی بری اور بے ہودہ مجلسیں۔

امام مالک رحمہ اللہ نے زہری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ شراب پینا۔ وہ اس میں حاضر نہیں ہوتے، نہ اس میں رغبت کرتے ہیں، جس طرح کہ حدیث شریف میں مروی ہے کہ جو کوئی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو وہ اس دسترخوان پر نہ بیٹھے، جس پر شراب کا دور چل رہا ہو۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ﴾ سے مراد جھوٹی گواہی ہے۔ وہ قصد کر کے جان بوجھ کر دوسرے پر جھوٹی گواہی دینا ہے۔ چناں چہ صحیحین میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کیا میں تم کو کبیرہ گناہوں میں سے سب سے کبیرہ گناہ کی خبر نہ دوں؟ اس

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٣٧۔ ٢٧٣٨)

(2) سنن الترمذي (٢٨٠١) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ١٧١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٠٦)

کلمے کو تین بار فرمایا، تو ہم نے عرض کی: "بلٰی" یعنی ہاں ہم کو خبر دیجیے یا رسول اللہ! فرمایا: «أَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ أَلَا وَ شَهَادَةُ الزُّوْرِ» یعنی سنتے ہو! اور جھوٹ بولنا، سنتے ہو! اور جھوٹی گواہی دینا، پھر اس کلمے کو بار بار فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا: کاش! آپ سکوت فرماتے۔[1]

ظاہر تر سیاق سے یہ بات ہے کہ ﴿ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جھوٹے کام میں حاضر نہیں ہوتے اور اسی لیے اللہ پاک نے اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ یعنی وہ "زور" میں حاضر نہیں ہوتے اور جس وقت "زور" پر ان کے گزرنے کا اتفاق پڑ جاتا ہے تو گزر جاتے ہیں اور اس کے میل کچیل سے ذرا بھی آلودہ نہیں ہوتے۔ اسی لیے فرمایا ہے کہ ﴿ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ یعنی اس سے باخبر نہیں ہوتے، بزرگی رکھ کر اس سے جلد گزر جاتے ہیں۔ امام محمد بن مسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے ابراہیم بن میسرہ رحمہ اللہ نے خبر دی کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ "مَرَّ بِلَهْوٍ مُعْرِضًا فَلَمْ يَقِفْ" یعنی انھوں نے راہ کے درمیان لہو پر گزر کیا تو وہ نہ ٹھہرے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَقَدْ أَصْبَحَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَّأَمْسَى كَرِيْمًا» یعنی ابن مسعود نے کریم ہو کر صبح و شام کی (شاید لہو سے مراد راگ ہے۔ لہو میں جھوٹے قصے کہانیاں، بے اصل باتیں اور راگ گانا موسیقی کا سیکھنا داخل ہیں) پھر ابن میسرہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾[2] (أخرجه ابن أبي حاتم قال: حدثنا أبو سعيد الأشجّ، حدثنا أبو الحسن العجلي عن محمد بن مسلم) الخ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴾ یہ بھی مومنین کی صفات میں سے ہے کہ جس وقت اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو اُن کے ایمان میں اضافہ کرتی ہیں اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس کافر جب اللہ کا کلام سنتا ہے تو وہ اس پر کچھ اثر نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اس حالت سے بدلتا ہے، جس پر وہ قائم ہے، بلکہ اپنے کفر، طغیان، سرکشی، جہالت اور گمراہی پر ڈٹا رہتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ١٢٤۔ ١٢٥] "اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان (منافقین) میں سے بعض ایسے ہیں جو (طنزاً) کہتے ہیں: تم میں سے کس کو اس (سورت) نے ایمان میں زیادہ کیا ہے؟ چناں چہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اس (سورت) نے ان کو ایمان میں زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے، تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) پلیدی پر مزید پلیدی کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کافر ہی رہے۔"

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٣٨۔ ٢٧٣٩)

پس قولہ تعالیٰ: ﴿ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴾ یعنی بخلاف کافر کے کہ جب وہ اللہ کی آیتوں کو سنتا ہے تو اس پر اثر نہیں کرتیں اور وہ اپنے حال پر مستمر رہتا ہے، گویا ان کو سنا ہی نہیں، بہرا ہے اندھا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ نہ سنا نہ دیکھا نہ کسی شے کو سمجھا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بہت سے آدمی ہیں، جو اُن کو پڑھتے ہیں اور اندھے اور بہرے ہو کر گر پڑتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ حق سے بہرے نہیں ہوئے اور نہ ہی اس میں اندھے ہوئے ہیں، پس وہ واللہ! ایک قوم ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے سمجھا اور جو اُس کی کتاب میں ہے اور اس سے جو کچھ سنا اس سے نفع پایا۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن عون رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے شعبی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آدمی قوم کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس نے اس آیت کو نہیں سنا جس کا انھوں نے سجدہ کیا ہے، آیا وہ ان کے ساتھ سجدہ کرے؟ کہا: پس شعبی رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھ دی،[1] یعنی وہ ان کے ساتھ سجدہ نہ کرے، کیوں کہ اس نے آیتِ سجدہ پر تدبر نہیں کیا۔ مومن کو لائق نہیں کہ "إِمَّعَةٌ" ہو (إِمَّعَة بکسرِ ہمزہ وتشدیدِ میم وہ شخص ہے، جس کے لیے کوئی رائے نہ ہو، پس وہ ہر ایک کی اس کی رائے میں متابعت کرتا ہے، عورت کو بھی "إمعة" کہتے ہیں۔ کبھی اس کا حرفِ ہا محذوف ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ہے جو ہر ایک سے کہتا ہے کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔[2] كذا في مجمع البحار۔ اس کے سوا اور بھی قول ہیں)۔ مگر مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے کام میں بصیرت اور بینائی پر ہو اور واضح بین اور ظاہر یقین پر ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ... الآية ﴾ یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ پاک سے اس بات کا سوال کرتے ہیں کہ ان کی پشتوں سے ہونے والی اولاد میں سے ایسے لوگ نکالے کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں اور اسی وحدہ لا شریک لہ کو پوجیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کی مراد وہ شخص ہے کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ عمل کرے تو اس سے اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں دنیا اور آخرت میں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے اس سے خوبی اور جمال کا ارادہ نہیں کیا، لیکن یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ مطیع ہوں۔ کسی نے حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ تو فرمایا یہ کہ اللہ مسلم بندہ کو دکھا دے کہ اس کی بیوی اور بھائی اور خویش اللہ کی اطاعت کو اختیار کیے ہوئے ہیں، لا واللہ! یعنی اللہ کی قسم! مسلمان کے لیے کوئی چیز اس سے زیادہ آنکھ کو ٹھنڈک پہنچانے والی نہیں ہے کہ وہ اپنے لڑکے یا پوتے یا بھائی کو یا خویش کو اللہ عزوجل کا مطیع و فرمانبردار دیکھے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ تیری عبادت اچھی طرح کریں اور ہم پر گناہ نہ کھینچ لائیں۔

عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی ازواج اور اولاد کے لیے اس بات کا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٤٠_ ٢٧٤١)
[2] مجمع بحار الأنوار (١/ ٩٠)

سوال کرتے ہیں کہ ان کو اسلام کی ہدایت دے۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے جبیر بن نفیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم ایک دن مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے، ایک شخص ان کے پاس سے گزرا تو اس نے کہا کہ خوشی ہو ان دونوں آنکھوں کو جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، البتہ ہم دوست رکھتے ہیں کہ ہم دیکھتے جو تو نے دیکھا اور ہم حاضر ہوتے، جہاں تم حاضر ہوئے، اس پر مقداد رضی اللہ عنہ غضبناک ہوئے تو میں تعجب کرنے لگا، کیوں کہ اس نے تو اچھی بات ہی کہی تھی۔

سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ کون سی چیز آدمی کے لیے اس بات کا باعث ہوتی ہے کہ وہ کسی جگہ میں حاضر ہونے کی تمنا کرے، جس سے اللہ نے اس کو غائب رکھا ہے، وہ نہیں جانتا کہ اگر وہ اس جگہ حاضر ہوتا تو وہاں کس کیفیت میں ہوتا۔ واللہ! البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قومیں حاضر ہوئیں، جن کو اللہ نے ان کے نتھنوں کے بل جہنم میں اُوندھا ڈال دیا، نہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا مانا، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، کیا تم اللہ کی حمد نہیں کرتے ہو، اس سبب سے کہ اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے شکموں سے نکالا کہ تم اپنے رب کو پہچانتے ہو، اس شے کی تصدیق کرنے والے ہو جس کو تمھارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، جو بلا تمھارے غیر کے لیے تھی اس سے تم کو بچا لیا گیا، البتہ مقرر بھیجا اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بدترین حال پر جس پر کہ پہلے نبیوں میں سے کسی نبی کو بھیجا ہو فترتِ جاہلیت میں، یعنی دو پیغمبروں کے درمیانی عرصے میں، وہ لوگ خیال کرتے تھے کہ بتوں کو پوجنا ہی سب دینوں سے بہتر ہے۔ چنانچہ وہ ایسا فرقان لے کر آئے کہ جس سے حق اور باطل کے درمیان فرق کر دیا اور باپ اور اس کے بیٹے کے درمیان جدائی ڈال دی۔ بیشک آدمی البتہ اپنے باپ کو اور اپنے بیٹے کو اور اپنے بھائی کو کافر دیکھتا تھا، حالانکہ اللہ پاک نے اس کے دل کا قفل ایمان کے واسطے کھول دیا، وہ جانتا ہے کہ اگر وہ ہلاک ہوگا تو آگ میں داخل ہوگا، تو اس کی آنکھ ٹھنڈی نہیں ہوتی تھی حالانکہ وہ جان رہا ہے کہ اس کا دوست آگ میں ہے اور بے شک وہ یہی بات ہے، جو اللہ پاک نے فرمائی ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا ... الآية ﴾[2] (وهذا إسناد صحيح ولم يخرجوه)

﴿ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن، سدی، قتادہ اور ربیع بن انس رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو پیشوا کر دے کہ خیر میں ہماری پیروی کی جائے۔[3] ان کے سوا اَور لوگوں نے کہا ہے کہ ہم کو کر دے راہ بتانے والے، راہ پانے والے اور خیر کی طرف بلانے والے۔ چنانچہ انھوں نے اس بات کو دوست رکھا کہ ان کی عبادت ان کی اولاد کی عبادت کے ساتھ متصل ہو جائے اور اُن کی ہدایت اُن کے غیر یعنی دوسروں کی طرف متعدی ہو جائے، کیونکہ اس کا فائدہ بہت زیادہ ہے اور اس کا انجام کار بہت بہتر ہے، اسی لیے صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب ابن آدم مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، مگر تین

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣١٨۔ ٣١٩) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٤٢)

[2] مسند أحمد (٦/ ٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٢٣)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٤٢۔ ٢٧٤٣)

چیزوں کا فائدہ اسے پہنچتا رہتا ہے: نیک لڑکا جو اس کے لیے دعا کرتا ہے، یا علم جس سے وہ شخص نفع یاب ہوتا ہے جو اُس کے بعد ہے، یا صدقۂ جاریہ۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ وہ جھوٹی گواہی کو قائم نہیں کرتے، یا "زور" میں حاضر نہیں ہوتے۔ "زور" کہتے ہیں کذب اور باطل کو اور نہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ دوسرے معنی کی طرف جمہور مفسرین گئے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغت میں "زور" کذب کو کہتے ہیں اور کوئی کذب شرک باللہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر مفسر اس پر ہیں کہ اس جگہ "زور" کے معنی شرک ہیں۔[2] حاصل یہ ہے کہ ﴿ يَشْهَدُوْنَ ﴾ اگر شہادت سے ہے تو کلام میں مضاف محذوف ہوگا: "أَيْ: لَا يَشْهَدُوْنَ شَهَادَةَ الزُّوْرِ" یعنی وہ جھوٹ کی گواہی نہیں دیتے۔ اور اگر شہود و حضور سے ہے، جس طرح کہ جمہور اس طرف گئے ہیں، تو اس کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ باطل کی ان کے باطل پر مساعدت نہیں کرتے۔[3] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کذب کی۔ اسی طرح امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔[4]

کسی نے کہا کہ "کذابین" کی جگہوں پر حاضر ہونے سے نفرت کرتے ہیں اور خطا کاروں کی مجلسوں میں جانے سے نفرت کرتے ہیں، اس لیے اہلِ شر کے میل ملاپ سے بچنے کے لیے ان کے قریب نہیں جاتے۔ کسی نے کہا ہے کہ نوح کی مجلس میں حاضر نہیں ہوتے اور نوح ماتم میں نوحہ کرنے کو کہتے ہیں۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ "زور" کی قسموں میں سے کسی قسم کو خاص نہ کیا جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس میں حاضر نہیں ہوتے جس پر زور کا نام صادق آتا ہے، کوئی زور کیوں نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "زور" مدینہ منورہ میں ایک بت تھا، ہر سات دن میں اس کے گرد کھیل کود کرتے تھے۔[5]

﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ یعنی وہ جس وقت اتفاقی طور پر بغیر قصد و ارادے کے لغو پر گزرتے ہیں تو اس طرح سے گزر جاتے ہیں کہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں، اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اس پر ٹھہرنے سے، یا اس پر غور کرنے سے اپنی جانوں کو بچا کر رکھتے ہیں، اسی باب سے فواحش یعنی بے حیائی اور بے شرمی کی باتوں سے چشم پوشی کرنا ہے اور گناہوں سے درگزر کرنا ہے اور اس چیز کا ذکر کنایہ اور اشارہ سے کرنا جس کی تصریح کرنا اور کھلم کھلا کہنا مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ امام باقر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب فروج کا ذکر کرتے ہیں تو ان سے کنایہ کرتے ہیں۔[6]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٣١) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٣٥۔ ٤٣٧) [2] فتح القدیر (٤/ ١١٩)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٣٦) [4] تفسیر الطبري (١٩/ ٣١٤) تفسیر القرطبي (١٣/ ٧٩)

[5] الدر المنثور (٦/ ٢٨٢) [6] تفسیر النسفي (٣/ ١٧٨)

لغو: قول یا فعل میں سے ہر ساقط اور ردی چیز کو کہتے ہیں۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ لغو کل معاصی ہیں۔[1]
کسی نے کہا ہے کہ شتم و اذی ہے، یعنی گالی دینا، ایذا پہنچانا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بِاللَّغْوِ ﴾ سے مراد ''بِذَوِي اللَّغْوِ'' ہے، یعنی جب لغو والوں پر گزرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم جس وقت اس بت پر سے گزرتے تو ﴿ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ اس کی طرف نظر نہ کرتے،[2] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [القصص: ٥٥] ''اور جب وہ بے ہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں۔'' محاورے میں بولتے ہیں: ''فُلَانٌ يُكْرِمُ عَمَّا يَشِيْنُهُ'' یعنی وہ اس شے سے بچتا ہے جو اسے عیب ناک کرتی ہے اور لغو میں داخل ہونے سے اپنے نفس کی بزرگی رکھتا ہے اور لغو باتوں والے لوگوں سے میل جول کرنے سے اپنے آپ کو بزرگ تر رکھتا ہے۔

آیات سے مراد قرآن شریف ہے یا جو نصیحت، موعظت اور عبرت اس میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کو قرآن شریف سمجھایا جاتا ہے، یا جو اس میں وعظ و نصیحت ہے، وہ ان کو سمجھایا جاتا ہے تو وہ اس پر اس طرح نہیں گرتے، جیسے بہرے اور اندھے ہوں، بلکہ وہ اس پر اوندھے اس حال میں گرتے ہیں کہ یاد رکھنے والے کانوں سے سننے والے ہیں اور نگاہ رکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے والے ہیں اور اس سے نفع لیتے ہیں۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس سے غفلت نہیں برتتے کہ گویا بہرے ہوں کہ اس کو سنا نہ ہو اور اندھے ہوں کہ اس کو دیکھا نہ ہو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں کسی طرح کا گر پڑنا نہیں ہے، بلکہ یہ محاورہ ایسا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ ''فُلَانٌ قَعَدَ يَبْكِيْ'' یعنی فلاں شخص بیٹھا ہوا روتا ہے، اگرچہ وہ بیٹھنے والا نہ ہو۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: گویا وعظ سننے والا کھڑا ہونے والا ہے، پھر جب اس نے وعظ سے اعراض کیا اور منہ موڑا تو یہ خرور ہوا۔ خرور کہتے ہیں غیر نظام پر گر پڑنے کو، یعنی بے طور گر پڑنے کا نام خرور ہے۔

کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ جس وقت ان پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، چنانچہ وہ سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں اور بہرے اور اندھے ہو کر ان پر نہیں گرتے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا گرنا بے سمجھے بوجھے نہیں ہے، بلکہ ان کا سمجھنا بوجھنا ان کے گرنے کا باعث ہوا ہے، وعظ و نصیحت نے ان کے دل کے اندر ایسا اثر کیا کہ اس کے مارے گر پڑے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اپنے پہلے حال پر نہیں بیٹھے رہتے کہ گویا نہ سنا۔ کشاف میں کہا ہے کہ یہ خرور کی نفی نہیں ہے یہ تو اس کا اثبات ہے اور بہرے پن اور اندھے پن کی نفی ہے۔ مراد یہ ہے کہ نفی قید کی طرف متوجہ ہے مقید کی طرف نہیں ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٧٩) [2] الدر المنثور (٦/ ٢٨٢)

﴿ مِنْ اَزْوَاجِنَا ﴾ میں کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائیہ ہے یا بیانیہ۔[1] (قاله الزمخشري) ﴿ وَذُرِّيّٰتِنَا ﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام نافع، ابن کثیر اور حسن رحمہ اللہ نے بہ جمع پڑھا ہے۔ امام ابو عمرو، حمزہ، کسائی، طلحہ اور عیسیٰ رحمہ اللہ نے بہ افراد پڑھا ہے کہ "ذرية" جمع اور مفرد دونوں پر وارد ہوتی ہے۔ پہلے کی مثال ﴿ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا ﴾ [النساء: ٩] ہے اور دوسرے کی مثال ﴿ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ﴾ [آل عمران: ٣٨] ہے۔

﴿ قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ منصوب ہے اس بنا پر کہ ﴿ هَبْ ﴾ کا مفعول ہے۔ "قرة العين" چشم کی ٹھنڈک کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "قَرَّتْ عَيْنُهُ قُرَّةً" یعنی اس کی آنکھ ٹھنڈی ہوئی اچھی طرح سے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو آنکھ کی ٹھنڈک اچھی طرح نصیب ہوئی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: محاورے میں بولتے ہیں: "أَقَرَّ اللّٰهُ عَيْنَكَ" یعنی اللہ تیری آنکھ کو ٹھنڈا کرے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے دل میں وہ شے پہنچے، جس کو تو پسند کرتا ہے۔ مفضل نے کہا ہے کہ "قرة العين" میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ٹھنڈک اس کے آنسو کی ہے، اس لیے کہ یہ دلیل ہے سرور وضحک کی، یعنی خوشی اور ہنسی کی، جس طرح کہ آنسو کی گرمی حزن وغم کی دلیل ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ "قرة العين" سے مراد خوابِ چشم ہے، نیند جب آتی ہے کہ دل فارغ ہو اور رنج جاتا رہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مراد رضا کا حصول ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ یہ بات عطا کرے کہ وہ طاعت کے ساتھ عمل کریں تو ہماری آنکھیں اس سے ٹھنڈی ہوں دنیا اور آخرت میں۔[3] کیوں کہ مومن کی آنکھ کو ٹھنڈا کرنے والی اس سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں کہ وہ اپنی بیوی اور اولاد کو اللہ عزوجل کا مطیع و فرمانبردار دیکھے تو اس بات کا طمع رکھے کہ وہ اس کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے تو اس سے اس کی خوشی پوری ہوگی اور اس کی آنکھ ٹھنڈی ہوگی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴾ اور ہم کو پرہیزگاروں کے لیے قدوہ، یعنی پیشوا بنا دے کہ خیر میں ہماری پیروی کی جائے۔ "امام" کہا، ائمہ نہ فرمایا، اس لیے کہ امام سے جنس مراد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ﴾ [المؤمن: ٦٧] "پھر وہ تمھیں بچے کی صورت میں نکالتا ہے۔" یہاں طفل سے مراد جنس ہے اور جنس کا اطلاق ایک اور ایک سے زیادہ پر برابر ہوتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ پاک نے دو کے واسطے: ﴿ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٦] "بلاشبہہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔" کہا ہے۔ یعنی یہ اس واحد کے باب سے ہے جس سے جمع مراد ہوتی ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إِمَام" جمع ہے "أم" کی۔ "أَمَّ يَؤُمُّ" سے۔ "أم" کی جمع "فعال" کے وزن پر کی گئی ہے، جس طرح کہ "صاحب" کی جمع "صحاب" اور "قائم" کی جمع "قيام" ہے۔ کسی نے کہا کہ امام مصدر ہے۔

---

[1] الكشاف (٣/ ٣٠١_ ٣٠٢) [2] فتح القدير (٤/ ١١٩_ ١٢٠)

[3] تفسير الطبري (١٩/ ٣١٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٤٢)

محاورے میں بولتے ہیں: "أَمَّ فُلَانٌ فُلَانًا إِمَامًا" یعنی فلاں نے فلاں کی امامت کی۔ جس طرح کہ صیام و قیام دونوں مصدر ہیں اور مصدر کا اطلاق مفرد اور جمع پر ہوتا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ امام کو مفرد مان کر یہ تاویل کی جاتی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو امام کر۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ ہم کو ہمارے کلمے کے متحد ہونے اور ہمارے طریقے کے متفق ہونے کی وجہ سے ہم کو ایک امام بنا۔ کسی نے کہا ہے کہ کلام مقلوب کے باب سے ہے، معنی یہ ہیں کہ متقین کو ہمارے لیے امام کر۔ (یہ ایک مستقل معنی ہیں، ورنہ افراد و جمع سے اس کو کچھ بحث نہیں ہے، واللہ أعلم از مصحح، سلمہ اللہ تعالیٰ)۔

امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دعا ان سے بطریقِ انفراد صادر ہوئی اور اُن میں سے دعا کے وقت ہر ایک کی عبارت یہ ہے: "وَاجْعَلْنِيْ لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا" لیکن قوم کی عبارتیں قصدِ ایجاز کے واسطے صیغۂ متکلم مع الغیر بیان کی گئیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صٰلِحًا﴾ [المومنون: ٥١] ''(فرمایا:) اے رسولو! تم پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔'' ان تاویلوں میں امام کو اپنے حال پر باقی رکھا ہے۔ امام قفال رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت امام کو اسم کی راہ لے جائیں گے، یعنی اس کو اسم فرض کریں گے تو اس کو واحد لائیں گے، گویا یوں کہا ہے کہ کر ہم کو حجت متقین کے لیے۔ اسی کے مثل بینہ کا کلمہ ہے بہ معنی گواہ کہ ایک پر اور ایک سے زیادہ پر بولتے ہیں۔ محاورے میں کہتے ہیں: "هٰؤُلَاءِ بَيِّنَةُ فُلَانٍ" یعنی یہ لوگ فلاں کے بینہ ہیں۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظ امام میں جمع وغیرہ برابر ہے، پس مطابقت حاصل ہے، یعنی اب کچھ تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ امام نیسابوری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں اس بات پر دلالت ہے کہ دینی ریاست ان چیزوں میں سے ہے کہ جن کا طلب کرنا اور اُن میں رغبت کرنا واجب ہے۔ قریب تر بات یہ ہے کہ انھوں نے اللہ پاک سے یہ سوال کیا کہ طاعت میں ان کو اس درجے تک پہنچا دے کہ وہ مشار الیہ ہو جائیں۔ ان کی طرف اشارہ کیا جائے اور اُن کی پیروی کی جائے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تو ہم کو ہدایت کا امام اور پیشوا بنا دے کہ ہم سے ہدایت حاصل کی جائے اور ہم کو گمراہی کا پیشوا مت کر، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ سعادت کے لیے یوں فرمایا ہے: ﴿وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ [الأنبياء: ٧٣] ''اور ہم نے انھیں امام بنایا، وہ ہمارے حکم سے (لوگوں کو) راہِ ہدایت بتاتے تھے۔'' اور اہلِ شقاوت کے لیے یہ ارشاد کیا: ﴿وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ [القصص: ٤١] ''اور ہم نے انھیں (لوگوں کو) آگ کی طرف بلانے والے سرغنے بنا دیا۔''[3]

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٢٠) [2] فتح القدير (٤/ ١٢٠)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٤٢) فتح البيان (٩/ ٣٥٣_ ٣٥٦)

أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴿٧٥﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿٧٦﴾ قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۖ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾

انھی لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے میں (جنت کے) بالاخانے جزا میں دیے جائیں گے، اور وہاں دعا اور سلام کے ساتھ ان کا استقبال ہوگا (75) وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے، وہ (بہشت) بہت اچھا مستقر اور مقام ہوگا (76) کہہ دیجیے: اگر تمھاری دعا و التجا نہ ہوتی تو میرا رب تمھاری پروا نہ کرتا، تم (حق کو) جھٹلا چکے ہو، لہٰذا وہ (عذاب تمھیں) عن قریب لازم ہو کر رہے گا (77)

عباد الرحمٰن کی جزا کا بیان:

یعنی ایسی جگہ پر تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرنا بھی غنیمت ہے، ان کا تو وہ گھر ہے، یعنی بندہ مغرور نہ ہو اللہ کو اس کی کیا پروا، مگر اس کی التجا پر رحم کرتا ہے، اب آگے تو لڑائی اور جہاد ہے۔ انتھیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے اوصاف میں سے صفاتِ جمیلہ اور اقوال و افعالِ جلیلہ کا ذکر کیا، جو اوپر بیان ہو چکے ہیں تو اس کے بعد یوں فرمایا: ﴿ أُولَٰئِكَ ﴾ یعنی یہ لوگ جن میں یہ صفتیں پائی جاتی ہیں، قیامت کے دن غرفہ کی جزا دیے جائیں گے۔ "غُرْفَة" سے مراد جنت ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمالِ صالح کی جزا میں ان کو بہشت عنبر سرشت ملے گی۔ امام جعفر باقر، سعید بن جبیر، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "غرفة" سے مراد جنت ہے۔[1] اس کا یہ نام اس کے بلند ہونے کی وجہ سے رکھا ہے۔ ﴿ بِمَا صَبَرُوا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جنت ان کو اس وجہ سے ملی کہ انھوں نے مذکورہ صفات کے ساتھ قائم رہنے پر صبر کیا۔

﴿ وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴾ یعنی جنت میں تحیہ و اکرام (سلام اور عزت افزائی) کے ساتھ مبادرت کیے جائیں گے، یعنی جلدی سے دیے جائیں گے اور اُن سے عزت اور احترام کے ساتھ ملیں گے، پس ان کے لیے سلام ہے اور ان پر سلام ہے، کیوں کہ فرشتے ان پر ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے داخل ہوں گے: ﴿ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ ۚ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ [الرعد: ٢٤] "(اور کہیں گے:) تم پر سلام ہو، اس لیے کہ تم نے صبر کیا، لہٰذا آخرت کا گھر بہت خوب ہے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ خَالِدِينَ فِيهَا ﴾ یعنی وہ اس میں اقامت گزیں ہوں گے، رہ پڑیں گے، وہاں سے نہ کوچ کریں گے، نہ نقل کریں گے، نہ مریں گے، نہ اس سے ٹلیں گے اور نہ اس سے کہیں اور منتقل ہونا چاہیں گے۔ جیسے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٤٣)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ [ھود: ۱۰۸] ''اور لیکن جو نیک بخت بنائے گئے ہوں گے تو (وہ) جنت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان اور زمین (باقی) رہیں گے، مگر یہ کہ آپ کا رب (کچھ اور) چاہے، (یہ اللہ کا) نہ ختم ہونے والا انعام ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ یعنی خوب جگہ ہے قرار پکڑنے کی اور خوب جگہ ہے دوپہر کے آرام کرنے کی اور خوب جگہ ہے اترنے کی (اصل کے الفاظ "حَسُنَتْ مَنْظَرًا وَّطَابَتْ مَقِيْلًا وَّمَنْزِلًا" ہیں، گویا یہ حاصل معنی ہیں، ورنہ مستقر و مقام کے معنی قرار گاہ و قیام گاہ ہیں)

کفار کی وعید:

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ ﴾ یعنی تو کہہ دے کہ میرا رب تمھاری پروانہیں کرتا، جبکہ تم نے اس کو نہ پوجا، کیوں کہ اس نے تو خلق کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس کو پوجیں اور اس کی توحید کریں اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کریں۔ امام مجاہد اور عمرو بن شعیب نے کہا ہے کہ ﴿ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ ﴾ کے معنی ہیں: "مَا يَفْعَلُ بِكُمْ رَبِّيْ" یعنی کیا کرے گا تم کو میرا رب۔

امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو اس بات کی خبر دی ہے کہ اگر تمھارا ایمان نہ ہو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو اس کو ان کی کچھ حاجت نہیں ہے، جب کہ ان کو مومن پیدا نہیں کیا اور اگر اس کو ان کی کوئی حاجت ہوتی تو البتہ اُن کو ایمان محبوب کر دیتا، جس طرح کہ اس نے مومنوں کے لیے محبوب کر دیا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ﴾ یعنی اے کافرو! پس مقرر تم تو جھٹلا چکے۔ ﴿ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴾ پس قریب ہے کہ تمھاری تکذیب تمھارے لیے لزام ہو جائے گی، یعنی دنیا و آخرت میں تمھارے عذاب اور ہلاکت اور بربادی کی مقتضی ہو گی۔ بدر کا دن اس میں داخل ہے، جس طرح کہ عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب رضی اللہ عنہم، امام محمد بن کعب قرظی، مجاہد، ضحاک، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے اس کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴾ یعنی قیامت کے دن۔[2] ان دونوں قولوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔[3] آخر تفسیر سورۃ الفرقان۔ وللّٰه الحمد والمنة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع توضیح یہ ہے کہ ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو مذکورہ صفات کے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۷۴۵) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۷۴۶) [3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۳۷۔ ۴۳۸)

حامل ہیں، جن کی تفصیل آٹھ موصولات کے تحت میں کی گئی ہے، اس حیثیت سے کہ وہ ان صفتوں کے ساتھ متصف ہیں۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ وہ لوگ ان صفتوں کے سبب سے پوری طرح متمیز ہیں اور مشاہد امور کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ ﴿أُولَٰٓئِكَ﴾ مبتدا ہے اور اس کا مابعد خبر اور جملہ مستأنفہ ہے۔ کسی نے کہا کہ ﴿أُولَٰٓئِكَ﴾ اور اس کا مابعد ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ﴾ کی خبر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ "غرفة" سے مراد بلند درجہ اور وہ جنت کے مقامات میں سب سے بلند اور افضل ہے، جس طرح کہ دنیا کے مسکن میں سے سب سے بلند جگہ غرفہ ہوتی ہے۔ اصل میں "غرفة" ہر بلند اور اونچی عمارت کو کہتے ہیں، اس کی جمع "غُرَفٌ" ہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "غرفة" سے مراد جنت ہے،[1] یعنی جزا میں ان کو جنت ملے گی۔ چوں کہ "غرفة" جنس پر دال ہے، اس لیے اس کو بصیغۂ واحد ذکر کیا ہے، اس کی دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿وَهُمْ فِي الْغُرُفَٰتِ ءَامِنُونَ﴾ [سبا: ٣٧] "اور وہ بالا خانوں میں امن سے رہیں گے۔" سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غرفہ سرخ یاقوت اور سبز زبرجد اور سفید موتی سے بنا ہوا ہے، اس میں نہ فصم ہے اور نہ وصم۔[2] (أخرجه الحكيم الترمذي) (فصم: شکستن بے جدائی ووصم: شگافِ چوب بے جدائی وعیب)

یہ حاصل ہے کہ اس غرفہ میں کسی طرح کی دراڑ نہ ہوگی نہ کسی قسم کی شکستگی، صاف عمدہ ڈھلا ڈھلایا ہوگا۔ ﴿بِمَا صَبَرُوا﴾ میں حرفِ "با" سببیہ ہے اور کلمۂ "ما" مصدریہ ہے۔ یعنی تکالیف اور طاعات کی مشقتوں پر صبر کرنے اور خواہشات اور شہوات کو چھوڑنے اور مجاہدات کے تحمل اور برداشت کرنے کی وجہ سے غرفہ ان کو جزا ملے گی۔ ﴿يُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَٰمًا﴾۔ امام ابو بکر، مفضل، اعمش، یحیٰ بن وثاب، حمزہ، کسائی اور خلف رحمہم اللہ نے "يَلْقُوْنَ" بفتحِ تحتیہ وسکونِ لام وتخفیفِ قاف پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اس قراءت کو اختیار کیا ہے۔ کہا: اس لیے کہ عرب لوگ یوں بولتے ہیں: "فُلَانٌ يَلْقَى بِالسَّلَامِ وَالتَّحِيَّةِ وَالْخَيْرِ" اور "يُلَقَّى" بہت کم بولتے ہیں۔ باقی قراء کی قراءت بضمِ تحتیہ وفتحِ لام وتشدیدِ قاف ہے۔ اسے امام ابو عبیدہ اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے پسند کیا ہے بسبب اس آیتِ کریمہ کے: ﴿وَلَقَّىٰهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا﴾[3] [الدهر: ١١] "اور انھیں تازگی اور سرور سے نوازا۔"

اول کے معنی یہ ہیں کہ وہ جنت میں دعا وسلام پائیں گے اور دوسرے کے معنی یہ ہیں کہ بعض بعض کو دعا دے گا اور پاک پروردگار ان کی طرف سلام بھیجے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ تحیہ بہ معنی بقائے دائم وملکِ عظیم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرشتے ان کو تحیہ کریں گے، دعا دیں گے اور ان کو سلام کریں گے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ تحیت وسلام اللہ پاک کی طرف سے ان کے لیے ہوگا، اسی باب سے اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُۥ سَلَٰمٌ﴾ [الأحزاب: ٤٤]

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٢٠) [2] فتح القدير (٤/ ١٢٣) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٣٩٢٥)
[3] تفسير القرطبي (١٣/ ٨٢-٨٣)

''جس دن وہ اس (اللہ) سے ملیں گے تو ان کی دعا ہوگی ''سلام''۔'' کسی نے کہا: تحیت کے معنی ان کو دعا دینا ہے درازیٔ زندگی کی اور سلام کے معنی ان کو آفتوں سے سلامتی کی دعا دینا ہے۔ کسی نے کہا: تحیت سے مراد اللہ کا ان کو ہدایا اور تحائف کے ساتھ عزت بخشا ہے اور سلام سے مراد اللہ پاک کا قول کے ساتھ ان پر سلام ہے۔

﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے، یعنی دارں حالیکہ وہ اس میں بغیر موت کے اقامت کرنے والے ہوں گے، نہ وہ مریں گے، نہ وہاں سے نکلیں گے۔ ﴿ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ یعنی غرفہ اچھی جائے قرار ہے جس میں وہ قرار پذیر ہوں گے اور اچھی جائے قیام ہے جس میں وہ قیام کریں گے۔ یہ ﴿ سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ کے مقابلے میں فرمایا ہے۔ ﴿ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ ﴾ اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے کہ وہ کل کی طاعت سے غنی اور بے نیاز ہے اور بندوں کو جو پابند کیا ہے تو اس لیے کہ وہ اس پابندی سے فائدہ حاصل کریں۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''مَا عَبَأْتُ بِفُلَانٍ'' یعنی میں نے فلاں کی پروا نہ کی اور نہ اس کی میرے نزدیک کچھ قدر ہے۔ ''یعبأ'' کی اصل ''عبء'' سے ہے، جس کے معنی ثقل اور بوجھ ہیں۔ خلیل نے کہا: ''مَا أَعْبَأُ بِفُلَانٍ'' ''أَيْ: مَا أَصْنَعُ بِهِ'' یعنی میں فلاں کو کیا کروں گا، گویا اس کو قلیل وحقیر و بے حقیقت سمجھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اسی طرح امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔

امام زجاج نے کہا: ﴿ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ اس کے نزدیک تمھارے لیے کون سا وزن ہو گا۔ یا ''مَا يَصْنَعُ بِكُمْ أَوْ بِعَذَابِكُمْ'' یعنی وہ تم کو یا تمھارے عذاب کو کیا کرے گا اور ''عبء'' بہ معنی ثقل ہے۔ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے یا نافیہ۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ استفہامیہ ہے۔ ابنِ شجری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک حقیقتِ قول یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ کا محل نصب ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''أَيُّ عَبْءٍ يَعْبَأُ بِكُمْ، أَيْ أَيُّ: مُبَالَاةٍ يُبَالِيْ بِكُمْ، وَأَيُّ اعْتِدَادٍ يَّعْتَدُّ بِكُمْ'' یعنی میرا رب تمھاری کیا پروا کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو تمھاری کچھ پروا نہیں ہے اور تم اس کے نزدیک کسی قطار وشمار میں نہیں ہو۔

﴿ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اگر اس کا تم کو بلانا نہ ہوتا کہ تم اس کو پوجو۔ اس معنی کی بنا پر مصدر یعنی ﴿ دُعَآؤُكُمْ ﴾ دعا اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ یہ قول امام فراء رحمہ اللہ کا مختار ہے اور مصدر کا فاعل محذوف ہے اور ﴿ لَوْلَا ﴾ کا جواب بھی محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''لَوْ لَا دُعَاءُ كُمْ لَمْ يَعْبَأْ بِكُمْ'' یعنی اگر اس کا تم کو بلانا نہ ہوتا کہ تم اس کو پوجو تو وہ تمھاری پروا نہ کرتا۔ اس معنی کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاریات: ٥٦] ''اور میں نے جن اور انسان اسی لیے تو پیدا کیے ہیں کہ وہ میری ہی عبادت کریں۔'' اور خطاب سارے لوگوں کو ہے، پھر کفار کو ان میں سے خاص کیا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ﴾ ابن الزبیر رضی اللہ عنہما نے "فَقَدْ كَذَّبَ الْكَافِرُوْنَ" پڑھا ہے اور ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے بھی اسی طرح پڑھا ہے، جس طرح کہ ابن جنی نے بیان کیا ہے۔ (ابن جنی رحمہ اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت بیان کرتے ہیں اور امام زہراوی اور نحاس رحمہما اللہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت بیان کرتے ہیں)۔ اس قراءت میں اس بات پر روشن دلیل ہے کہ خطاب سارے لوگوں کو ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "دعاء" مصدر مضاف ہے فاعل کی طرف، یعنی اگر تمھارا سختیوں میں اس سے فریاد رسی کرنا نہ ہوتا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر تمھارا دعا کرنا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ تمھاری یعنی تمھارے گناہوں کو بخشنے کی پروا نہ کرتا۔ جو اس کے قائل ہیں کہ دعا فاعل کی طرف مضاف ہے، ان میں سے قتیبی اور فارسی ہیں۔ انھوں نے کہا ہے: اصل یہ ہے کہ اگر تمھارا اس کے سوا معبودوں کو پکارنا نہ ہوتا۔

﴿ لَوْلَا ﴾ کا جواب محذوف ہے، اس کی تقدیر اس وجہ پر ہے: "لَوْلَا دُعَاءُكُمْ لَمْ يُعَذِّبْكُمْ" یعنی تو وہ تم کو عذاب نہ کرتا۔ ﴿ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ﴾ کے معنی پہلی وجہ کی بنا پر، یعنی جب مصدر مفعول کی طرف مضاف ہو، یہ ہیں: تو مقرر تم نے تکذیب کی اس شے کی، جس کی طرف تم بلائے گئے، اور دوسری وجہ کی بنا پر یعنی جب مصدر فاعل کی طرف مضاف ہو، یہ ہیں: تو مقرر تم نے توحید کی تکذیب کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴾ یعنی عن قریب تکذیب کی جزا تم کو ملے گی۔ جمہور مفسرین اس بات پر ہیں کہ اس جگہ لزام سے مراد وہ عذاب ہے جو مشرکوں کو بدر کے دن لازم ہوا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اسی کے قائل ہیں۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ عذابِ آخرت ہے۔ امام ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ لزام سے مراد فیصلہ ہے، یعنی وہ حکم کہ حق و باطل کو علاحدہ علاحدہ کر دے، معنی یہ ہیں کہ عن قریب تمھارے اور مومنوں کے درمیان فیصلہ ہوگا۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمھاری تکذیب لزام ہوگی، کہ لازم ہوگی تم کو تو تم توبہ نہ دیے جاؤ گے۔ جمہور قراء "لزام" کے لام کی کسرہ کے قائل ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ لزام دائمی عذاب ہے اور ہلاک و فنا کرنے والا ہے کہ تمھارے بعض کو بعض کے ساتھ ملانے والا ہوگا۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے امام ابو زید رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے کہ میں نے امام ابوالسماک کو سنا، وہ لزام کو لام کی فتح کے ساتھ پڑھتے تھے۔ امام ابوجعفر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لَزِمَ" کا مصدر ہوگا اور کسرہ زیادہ صحیح ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ لزام موت ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ وبال۔ صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پانچ نشانیاں جو قیامت پر دال ہیں، گزر چکی ہیں: دخان، قمر، روم، بطشہ ولزام۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٨٣۔ ٨٥) فتح القدير (٤/ ١٢١۔ ١٢٢)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ٣٢٥)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩٨)

دخان اس آیت میں مذکور ہے: ﴿ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ﴾ [الدخان: ١٠] ''تو آپ اس دن کا انتظار کیجیے جب آسمان صاف دھواں لائے گا۔'' دخان سے یہ مراد ہے کہ جب کفارِ مکہ پر قحط کا عذاب نازل ہوا تو آدمی بھوک کے مارے دیکھتا تھا کہ گویا اس کے اور آسمان کے درمیان دھواں ہے۔ قمر یہ ہے: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ [القمر: ١] ''قیامت بہت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔'' روم یہ ہے: ﴿ الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴾ [الروم: ١۔ ٢] ''الٓمٓ۔ رومی مغلوب ہوگئے۔'' بطشہ یہ ہے: ﴿ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ﴾ [الدخان: ١٦] ''جس دن ہم بہت بڑی پکڑ پکڑیں گے۔'' اس سے مراد جنگِ بدر میں قتل ہے۔ لزام یہ ہے: ﴿ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴾ لیکن اس میں اتنی بات ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ لزام روزِ بدر ہے تو اس صورت میں لزام بطشہ کے ساتھ مکرر ہوگا اور معدود صرف چار چیزیں ہوں گی، اس کا جواب یہ دیا ہے کہ لزام سے مراد یومِ بدر کی قید ہے اور بطشہ سے مراد روزِ بدر کا قتل ہے۔ واللہ أعلم.

کشاف میں ہے کہ جب اللہ پاک نے بندوں کی عبادت کا وصف کیا اور صالحات اور حسنات کا شمار فرمایا اور اعمالِ صالحہ کی وجہ سے ان کی تعریف کی اور ان کو درجات کی بلندی کا وعدہ دیا تو اس کے بعد یہ بیان کیا کہ اللہ پاک نے جو ان لوگوں کی پروا کی، ان کا لحاظ اور پاس کیا، ان کا ذکر بلند فرمایا، تو یہ سب کچھ صرف ان کی عبادت کے سبب سے کیا ہے۔ چنانچہ اپنے رسولِ کریم رؤف و رحیم کو امر فرمایا کہ اُن سے کہہ دیں کہ اللہ اُن کی پروا صرف ان کی عبادت کی وجہ سے کرتا ہے، کسی اور وجہ سے نہیں۔ اگر اُن کی عبادت نہ ہوتی تو وہ اُن کی بالکل پروا نہ کرتا، نہ ان کو شمار میں لاتا اور نہ وہ اس کے نزدیک کوئی ایسی چیز ہوتے کہ اس کی پروا کی جاتی۔ اس تقریر سے معلوم ہوا کہ خطاب مومنوں کو ہے اور دعا عبادت کے معنی میں ہے۔[1]

پھر کفار کو خطاب کیا: ﴿ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ﴾ یعنی مومنوں کی پروا اور قدر تو ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے ہوئی نہ اور کسی وجہ سے۔ اب تم کہو کہ اللہ پاک تمھاری پروا اور قدر کیوں کرے، حالاں کہ تم تو رسول اور قرآن کی تکذیب کر چکے، لہٰذا اس تکذیب کی پروا اور قدر یہی ہے کہ عن قریب تم کو عذاب لازم ہوگا آخرت میں اس کے بعد کہ دنیا میں بھی تم پر عذاب نازل ہوگا، چنانچہ بدر کے دن ان میں سے ستر آدمی مارے گئے اور دنیا کے ساتھ آخرت کا عذاب متصل لازم ہوگیا اور ستر آدمی قید ہوئے۔

مفتی ابو السعود مرحوم کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا امر فرمایا کہ لوگوں سے یہ بات بیان کر دیں کہ جو لوگ اُن بڑی بڑی نعمتوں کو حاصل کرنے والے ہیں، جن میں رغبت کرنے والے رغبت کرتے ہیں اور ڈھکنے والے ڈھکتے ہیں، وہ صرف اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے ان کو ملی ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ نے شمار

[1] الکشاف (٣/ ٣٠٣)

کیا ہے اور اگر وہ اعمالِ صالح نہ ہوتے تو اللہ پاک بالکل اُن کی کچھ پروا اور قدر نہ کرتا۔ یعنی جو بھلائی و برائی ان کی جنس سے صادر ہوئی، اس کو ان سب سے بالمشافہہ ہو کر کہہ دو: ﴿ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ﴾ أَيُّ عَبْءٍ يَعْبَأُ بِكُمْ، وَأَيُّ اعْتِدَادٍ يَعْتَدُّ بِكُمْ لَوْلَا عِبَادَتُكُمْ لَهُ تَعَالىٰ حَسْبَمَا مَرَّ تَفْصِيلُهُ" یعنی کیا پروا رکھے تمھاری میرا رب اور تم کو کس گنتی اور شمار میں لائے، اگر اس کے لیے تمھاری عبادت نہ ہو، جیسے کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے، کیوں کہ جس شے کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے، وہ اللہ پاک کی معرفت و طاعت ہے، ورنہ انسان اور سارے چوپائے برابر ہیں۔[1] اس تقریر سے معلوم ہوا کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے اور دعا بہ معنی عبادت اور خطاب عام ہے۔[2] والله سبحانه أعلم بمعاني كتابه وحسن أداءه.

الحمد للہ و المنۃ کہ تفسیر سورت فرقان بست وہشتم (۲۸) ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۱ھ بعد نمازِ عشا شب پنج شنبہ محلّہ امیر گنج میں تمام ہوئی، اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور مجھے اور سب مومنین و مومنات کو اس سے نفع پہنچائے اور باقی سورتوں کے لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ خاص اس سورت کی تفسیر کا نام مواہب الرحمٰن فی تفسیر سورۃ الفرقان رکھا گیا۔

ومؤلفه ومترجمه العبد المذنب الراجي رحمة ربه القوي ذوالفقار أحمد النقوي غفر الله له ولوالديه وأحسن إليهما وإليه بفضله وكرمه وصلى الله علىٰ خاتمة النبيين ﷺ وصحبه وبارك وسلم آمين، والحمد لله أولا وآخرا وظاهراً، وباطناً، رزقنا الله الحسنى وزيادة وأعطانا الإفادة والإجادة آمين آمين آمين.

---

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٣٢)
[2] فتح البيان (٩/ ٣٥٦ ـ ٣٥٨)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ

اس سورت مبارک کی دو سو ستائیس آیتیں ہیں۔ یہ جمہور کے نزدیک مکی سورت ہے اور اسی طرح امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے ابن عباس و ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ کا لفظ ان سے یہ ہے کہ سورۃ الشعراء مکے میں اتاری گئی ہے، سوائے پانچ آیتوں کے جو اس کے آخر میں ہیں کہ وہ مدینے میں اتری ہیں۔ وہ آیتیں یہ ہیں: ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ... إلیٰ آخرھا﴾۔[1] (جمل میں کہا ہے کہ کل چار آیتیں ہیں۔ واللّٰہ أعلم)۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ نے مجھے تورات کے بجائے سبع طول عطا کی ہیں۔ ("سبع طول"، فتح القدیر میں اسی طرح ہے۔ فتح البیان وغیرہ میں سبع طوال ہے، معنی ایک ہیں، یعنی سات لمبی سورتیں) اور مجھے بجائے انجیل کے مئین عطا فرمائیں، (یعنی وہ سورتیں جن میں سو یا سو سے زیادہ آیتیں ہیں) اور بجائے زبور کے مجھے طواسین عطا کی ہیں اور مجھ کو حوامیم اور مفصل کے ساتھ فضیلت دی۔ مجھ سے پہلے کسی نبی نے ان کو نہیں پڑھا۔

نیز امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں مفصل کو نافلہ کے طور پر دیا گیا، یعنی زیادہ۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں اسی طرح ہے۔[2] سلیمان جمل نے جو امام قرطبی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے وہ سورت دی گئی جس میں بقرہ کا ذکر ہے شروع سے، اور مجھے طٰہٰ اور طواسین الواحِ موسیٰ میں سے دی گئیں اور مجھے فواتحِ قرآن اور خواتیمِ سورۃ البقرہ عرش کے نیچے سے دی گئیں اور میں مفصل بطورِ نافلہ دیا گیا۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اللہ نے مجھ کو توریت کے بجائے سبع طوال عطا کیں اور مجھے انجیل کے بجائے المٓصٓ عطا کی۔ انتہٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کی تفسیر میں جو اُن سے مروی ہے، اس کا نام سورۃ الجامعہ واقع ہوا ہے۔[3] نسخہ مطبوعہ مصر میں اسی طرح ہے۔ فتح القدیر، فتح البیان میں سورۃ الجمعہ ہے۔[4] واللّٰہ أعلم.

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٨٨) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٨٦) فتح القدير (٤/ ١٢٤) فتح البيان (٩/ ٣٥٩)

[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٣٨) [4] فتح القدير (٤/ ١٢٤) فتح البيان (٩/ ٣٥٩)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ اَلَّا یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳﴾ اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَۃً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُہُمۡ لَہَا خٰضِعِیۡنَ ﴿۴﴾ وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا کَانُوۡا عَنۡہُ مُعۡرِضِیۡنَ ﴿۵﴾ فَقَدۡ کَذَّبُوۡا فَسَیَاۡتِیۡہِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۶﴾ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اِلَی الۡاَرۡضِ کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ ﴿۷﴾ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۹﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

طٰسٓمّٓ ① یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ② (اے نبی!) شاید اس (غم) سے کہ وہ لوگ ایمان نہیں لاتے، آپ خود کو ہلاک ہی کر لیں گے ③ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی اُتار دیں، پھر اس کے آگے ان کی گردنیں جھکی ہی رہ جائیں ④ اور رحمٰن کے پاس سے جو بھی کوئی نئی نصیحت آتی ہے تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں ⑤ چناں چہ، یقیناً وہ جھٹلا چکے، لہٰذا جلد ان کے پاس اس کی خبریں آئیں گی جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے ⑥ کیا انھوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں ہر قسم کی کتنی ہی عمدہ چیزیں اُگائی ہیں ⑦ بلاشبہ اس میں عظیم نشانی ہے، اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ⑧ اور بے شک آپ کا رب، وہی ہے غالب، بہت رحم کرنے والا ⑨

کفار کے قرآن سے اعراض پر رسول اللہ ﷺ کو تسلی:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں جو حروفِ مقطعہ ہیں، ان پر ہم سورۃ البقرہ کی تفسیر میں کلام کر آئے ہیں۔ ﴿ تِلۡکَ ﴾ دور کے لیے اشارہ کرنے کے لیے آتا ہے، یہاں مشار الیہ قریب کی تعظیم وعظمت کے لیے لایا گیا ہے، یعنی یہ آیتیں قرآن کی ہیں، جو ظاہر، واضح اور جلی کتاب ہے، جو حق و باطل اور ہدایت و گمراہی کے درمیان فرق کرتا ہے۔ ﴿ بٰخِعٌ ﴾ کے معنی "مُهْلِكٌ" ہیں، یعنی شاید تم اپنی جان کو اس وجہ سے ہلاک کرنے

والے ہو کہ تم ان کے ایمان کی حرص کرتے ہو اور اس بات پر غمگین ہوتے ہو کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ یہ اللہ پاک کی طرف سے کفار کے ایمان نہ لانے پر اپنے رسول ﷺ کو تسلی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ﴾ [الفاطر: ۸] ''لہٰذا آپ کی جان ان پر افسوس کرتے ہوئے نہ جاتی رہے۔'' اور جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴾ [الکہف: ٦] ''پھر شاید آپ تو خود کو ان کے پیچھے غم سے ہلاک کرنے والے ہیں، اگر یہ (کافر) اس بات (قرآن) پر ایمان نہ لائیں۔''

امام مجاہد، عکرمہ، قتادہ، عطیہ، ضحاک اور حسن رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ ﴿ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ ﴾ کے معنی ہیں: ''قَاتِلٌ نَفْسَكَ''[1] یعنی تو تو اپنی جان کو مار ڈالنے والا ہے۔ اسی معنی سے شاعر کا یہ قول ہے:

أَلَا أَيُّهَذَا الْبَاخِعُ الْحُزْنُ نَفْسَهُ بِشَيْءٍ نَحَتْهُ عَنْ يَدَيْهِ الْمَقَادِرُ

یعنی ''خبردار اے وہ شخص! کہ رنج وغم اس کی جان کو مار ڈالنے والا ہے، اس سبب سے کہ تقدیر نے اس کو اس کے ہاتھوں سے علاحدہ کر دیا ہے۔''

پھر اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ﴿ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴾ یعنی اگر ہم چاہتے تو البتہ ہم ایک ایسی نشانی اتار دیتے کہ وہ ان کو زبردستی ایمان کی طرف لے آتی، لیکن ہم ایسا نہیں کرتے، کیوں کہ ہم ہر کسی سے صرف ایمانِ اختیاری چاہتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ [یونس: ۹۹] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو لوگ زمین میں ہیں، سب کے سب، سارے ہی ایمان لے آتے، پھر کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے، حتی کہ وہ مومن ہو جائیں؟'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ [ھود: ۱۱۸] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو یقیناً تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔'' چنانچہ اللہ پاک کی تقدیر اور اس کی حکمت و حجتِ بالغہ نافذ و جاری ہے اپنی خلق پر، اس طرح سے کہ ان کی طرف رسول بھیجے اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴾ یعنی جب کبھی کوئی کتاب آسمان سے آئی تو اکثر لوگوں نے اس سے منہ موڑا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۳] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [یٰس: ۳۰] ''ہائے افسوس بندوں پر! ان کے پاس جو بھی رسول آیا وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے (رہے)۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّ مَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٤٨)

﴿أَحَادِيثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ﴾ [المؤمنون: ٤٤] ''پھر ہم لگاتار اپنے رسول بھیجتے رہے، جب بھی کسی امت کے پاس ان کا رسول آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی، پھر ہم ایک کے پیچھے دوسری قوم کو (ہلاک) کرتے رہے، اور ہم نے انھیں افسانے بنا دیا، چناں چہ ان لوگوں کے لیے دوری ہے جو ایمان نہیں لاتے۔''

اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ﴾ یعنی پس یہ اس حق کو جھٹلا چکے جو ان کے پاس آیا، پس عنقریب جان لیں گے اس جھٹلانے کی خبر ایک مدت کے بعد۔ ﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ﴾ [الشعراء: ٢٢٧] ''اور ظالم لوگ جلد جان لیں گے کون سی پلٹنے کی (خوفناک) جگہ وہ پلٹیں گے۔'' پھر اللہ پاک نے اپنی عظمتِ سلطان اور جلالتِ قدر و شان سے آگاہ فرمایا کہ انھوں نے اس کے رسول کی مخالفت پر اور اس کی کتاب کی تکذیب پر جرأت کی، حالاں کہ وہ تو ایسا قاہر، زبردست، عظیم و بزرگ اور قادر وقوی ہے کہ اس نے زمین کو پیدا کیا اور اس میں ہر ایک قسم کی خاصی چیزیں اُگائیں، کھیتیاں اور پھل اور طرح طرح کے اور قسم قسم کے حیوان پیدا کیے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے ایک شخص کے واسطے سے شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ لوگ زمین کی پیداوار سے ہیں، پس جو کوئی جنت میں داخل ہوا تو وہ کریم ہے اور جو نار میں داخل ہوا تو وہ لئیم ہے۔[1]

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خالق کی قدرت پر دلالت ہے، جو اشیاء کا پیدا کرنے والا ہے، جس نے زمین کو بچھایا ہے اور آسمان کی بنا کو بلند کیا ہے اور باوجود اس کے کہ اکثر لوگ ایمان نہیں لائے، بلکہ اس کی تکذیب کی اور اس کے رسولوں کو اور اس کی کتابوں کو جھٹلایا اور اس امر کی مخالفت کی اور اس کی نہی کے مرتکب ہوئے۔ ﴿وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ بے شک تیرا پروردگار البتہ وہی ہے کہ ہر شے پر غالب ہوا ہے اور اس کو مقہور کیا ہے، اپنی خلق پر بڑا مہربان ہے، پس جو کوئی اس کی نافرمانی کرتا ہے، اس پر جلدی نہیں فرماتا، بلکہ اس کو مہلت دیتا ہے، پھر اس کو پکڑ لیتا ہے، غالب قدرت والے کا پکڑنا۔ امام ابو العالیہ، قتادہ، ربیع بن انس اور ابن اسحاق رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس سے انتقام اور بدلہ لینے میں غالب ہے، جس نے اس کے امر کی مخالفت کی اور اس کے غیر کو پوجا۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس شخص پر رحیم ہے، جو اس کی طرف رجوع ہوا اور اس کی طرف انابت کی۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ امام اعمش، یحییٰ بن وثاب، ابو بکر، مفضل، حمزہ، کسائی اور خلف رحمہم اللہ نے ''طسم'' کو بہ امالۂ حرفِ طا پڑھا ہے۔ امام نافع، ابو جعفر، شیبہ اور زہری رحمہم اللہ نے بین اللفظین پڑھا ہے۔ امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٥٠)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٥١) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٣٨۔ ٤٣٩)

نے اس قراءت کو اختیار کیا ہے، باقی کی قراءت اشباع کے ساتھ بفتح ہے۔ مدنیوں نے اور امام ابو عمرو، عاصم اور کسائی رحمہم اللہ نے بادغامِ نون پڑھا ہے طس کی میم میں، اور امام اعمش اور حمزہ رحمہما اللہ نے باظہارِ نون پڑھا ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ادغام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ کا اختیار کردہ ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابو اسحاق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "فيما يجري وما لا يجري" میں حکایت کیا ہے، جائز ہے کہ اس طرح کہا جائے: طاسین میم بفتحِ نون وضمِ میم، جس طرح کہ "هذا معدي كرب" کہتے ہیں۔ عیسیٰ نے بکسرِ میم پڑھا ہے، اور یہ نافع سے بھی مروی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں طا۔ س۔ م ہے حرفِ مقطعہ کے طور پر۔ چنانچہ ہر حرف پر ایسا وقفہ کیا جائے گا کہ جس سے ہر حرف اپنے غیر سے متمیز ہو جائے گا اور اسی طرح امام ابو جعفر رحمہ اللہ نے پڑھا ہے۔ طسم کا محلِ اعراب رفع ہے، بنا بر ابتدا، جبکہ سورت کا نام ٹھہرے گا، چناں چہ اکثر لوگ اس طرف گئے ہیں۔ یا اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہوگی۔ یہ بھی جائز ہے کہ محلِ نصب میں ہو بہ تقدیر "اُذْكُرْ" یا "اِقْرَأْ" کے۔[1] رہی یہ بات کہ جب شمار کرنے کے طور پر مسرود ہو تو اس صورت میں اس کے لیے اعراب کا کوئی محل نہیں ہے۔ چناں چہ کئی جگہ یہ بات گزر چکی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ طٰسٓمٓ ﴾ اللہ پاک کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن شریف کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سورت کا نام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے طول وسناء وملک کی قسم کھائی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ علماء ﴿ طٰسٓمٓ ﴾ کی تفسیر کرنے سے عاجز ہوئے،[2] اس مقام میں یہی بات حق ہے۔ اسی لیے محلی رحمہ اللہ نے یوں فرمایا ہے: "اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ"[3] ﴿ تِلْكَ ﴾ کا اشارہ اس سورت کی طرف ہے یا اس سورت کی آیتوں کی طرف۔ اس کا محل رفع ہے، اس بنا پر کہ یہ اور اس کا مابعد مبتدا کی خبر ہے اگر ہم ﴿ طٰسٓمٓ ﴾ کو مبتدا ٹھہرائیں، اور اگر اس کو مبتدائے محذوف کی خبر قرار دیں تو اس کا محل رفع ہوگا، اس بنا پر کہ ﴿ تِلْكَ ﴾ مبتدا ہوگا اور ﴿ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴾ اس کی خبر ہوگی۔ یا ﴿ تِلْكَ ﴾ خبر ہوگی مبتدائے محذوف کی، یا ﴿ طٰسٓمٓ ﴾ سے بدل ہوگا۔ اس جگہ کتاب سے مراد قرآن شریف ہے اور "مُبِيْنٌ" بہ معنی "مُبَيِّنٌ" ہے، یعنی یہ سورت یا اس سورت کی آیتیں قرآن شریف کی آیتیں ہیں، جو حق کو باطل سے ظاہر اور واضح کرنے والا ہے۔ یا "مُبِيْنٌ" بہ معنی "بَيِّنٌ" ہے، جبکہ "أَبَانَ" بمعنی "بَانَ" سے لازم ہو۔ یعنی وہ قرآن کہ اس کا اعجاز ظاہر اور واضح ہے۔ یہ معنی اس مقام کے زیادہ لائق ہیں اور مقصود کے زیادہ موافق ہیں۔ اس لیے صاحبِ کشاف نے اس پر اکتفا کیا ہے۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾. ﴿ بَاخِعٌ ﴾ کے معنی قاتل ومہلک ہیں۔ "بخع"

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٨٧) فتح القدير (٤/ ١٢٥) [2] تفسير البغوي (٦/ ١٠٢)
[3] تفسير الجلالين (١/ ٤٧٩) [4] الكشاف (٣/ ٣٠٥)

اصل میں یہ ہے کہ ذبح کرنے میں "بخاع" کو پہنچے۔ "بخاع" ایک رگ ہے جو قفا میں ہوتی ہے، جو سر کے پیچھے کی جانب گدی میں ہوتی ہے۔ اس سے غرض ذبح کرنے میں مبالغہ کرنا ہے، ایسا ذبح کرے کہ گدی تک پہنچ جائے۔ صراح میں کہا ہے کہ "بخع" خود کے مار ڈالنے کو کہتے ہیں خشم واندوہ سے۔ "إیضاح شرح مقامات" میں ہے کہ "بَخَعَ الشَّاةَ" کے یہ معنی ہیں کہ بکری کے ذبح کرنے میں مبالغہ کیا۔ اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس کی گردن کی ہڈی کو قطع کر دے اور ذبح کرنے میں "بخاع" کو پہنچ جائے۔ "بخاع" وہ رگ جو پشت کی ہڈی میں ہوتی ہے اور "نخع" بنون اس سے کم ہے، وہ یہ ہے کہ ذبح کرنے میں "نخاع" کو پہنچ جائے۔ "نخاع" وہ رشتۂ سفید ہے جو گردن میں جاری ہوتا ہے۔ انتہٰی۔ "بخع" کی تحقیق سورۃ الکہف میں گزر چکی ہے۔[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے "بَاخِعُ نَفْسِكَ" اضافت کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قاریوں کی قراءت بہ قطع ہے۔ ﴿ اَلَّا يَكُوْنُوْا ﴾ محلِ نصب میں ہے، اس بنا پر کہ مفعول لہ ہے ﴿ بَاخِعٌ ﴾ کا۔ یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ کا ہے۔ معنی یہ ہیں شاید تو اپنی جان کو اس لیے قتل کرنے والا اور ہلاک کرنے والا ہے کہ مکہ والے اس شے پر جس کو تو لے کر آیا ہے ایمان نہیں لاتے۔[2] اس جگہ کلمۂ "لعل" اشفاق یعنی "ترجی" کے لیے ہے، یہاں بہ معنی امر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو اپنی جان پر شفقت و رحم کر اس غم کے خفیف کرنے کے ساتھ اور ان کے ایمان نہ لانے پر حسرت اور افسوس مت کر۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے، کیوں کہ آپ کو اپنی قوم کے ایمان لانے کی حرص تھی اور ان کے منہ موڑنے کو دیکھ کر سخت افسوس فرماتے تھے۔

جملہ ﴿ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً ﴾ مستانفہ ہے تسلیِ سابق کی تعلیل کے لیے لایا گیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تو اُن کے ایمان نہ لانے پر حسرت اور افسوس مت کر، اس لیے کہ اگر ہم چاہتے تو اُن پر آسمان سے کوئی ایسی ڈرانے والی نشانی اتارتے جو اُن کو ایمان کی طرف لے آتی، لیکن اس بات کا پہلے سے فیصلہ ہو چکا ہے کہ ہم اس کو نازل نہ کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اُن کے ایمان کے ساتھ متعلق نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ اس میں طمع کرنا اور اس کے حاصل نہ ہونے سے دردمند ہونا بے وجہ ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کلمۂ ﴿ اٰيَةً ﴾ صریح مفعول ہے اور ﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ اور ﴿ مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ دونوں ظرف ہیں۔ ان کو صریح مفعول پر کیوں مقدم کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہتمامِ مقدم اور تشویقِ موخر کے لیے ایسا کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴾ معطوف ہے جزا پر، یعنی ﴿ نُنَزِّلْ ﴾ پر تو اب محلِ جزم میں ہوگا یا کلامِ مستانف ہے اور ماضی بہ معنی مضارع ہے، یعنی "فَتَظَلُّ أَعْنَاقُهُمْ"، معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ اس نشانی کے لیے مطیع اور فرماں بردار ہو جاتے۔ ﴿ خٰضِعِيْنَ ﴾ میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ اَعْنَاقُهُمْ ﴾ کی خبر ہے۔

---

[1] رقم الآیة (٦)

[2] فتح القدیر (٤/ ١٢٥)

اس میں یہ اشکال ہے کہ جمع سالم عقلاء کے ساتھ خاص ہے اور "أَعْنَاق" غیر عاقل، لہٰذا یہ اس کی خبر کیسے ہو گی؟ اس کے کئی جواب دیے ہیں، ایک یہ ہے کہ اس کی اصل "فَظَلُّوا لَهَا خَاضِعِينَ" ہے۔ "أَعناق" کو تقریر اور تصویر کے لیے زائد لائے ہیں، اس لیے کہ "أَعناق" جائے خضوع ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ جب "أَعناق" کو عقلا کی صفات کے ساتھ موصوف کیا تو وہ اُن کے قائم مقام ٹھہرایا گیا اور جس شے کے ساتھ عقلا کا وصف کیا جاتا ہے، اسی کے ساتھ "أَعناق" کا وصف کیا۔

تیسرا یہ ہے کہ عیسیٰ بن عمر نے کہا ہے کہ "خَاضِعِينَ وَخَاضِعَةٌ" اس جگہ برابر ہیں، امام مبرد رحمہ اللہ نے اس کو پسند کیا ہے، معنی یہ ہیں کہ جب ان کی گردنیں ذلیل ہوئیں تو وہ خود ذلیل ہوئے۔ پس گردنوں سے خبر دینا بعینہٖ گردن والوں سے خبر دینا ہے۔ کلامِ عرب میں یہ بات جائز ہے کہ اول سے خبر ترک کی جائے اور ثانی سے خبر دی جائے۔ چوتھا یہ ہے: امام ابو عبید اور کسائی رحمہما اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "خَاضِعِيهَاهُمْ" امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ پانچواں یہ ہے کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَعْنٰقُهُمْ ﴾ سے مراد "كُبَرَاؤُهُمْ" ہے، یعنی ان کے سردار اور بڑے لوگ۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی لغت میں مشہور و معروف ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "جَاءَ عُنُقٌ مِنَ النَّاسِ" یعنی ان میں سے سردار لوگ آئے، جس طرح کہ "أَعناق" بہ معنی "رؤسا" آتا ہے، اسی طرح وجوہ و صدور بھی بہ معنی "رؤسا" ہے۔ چھٹا یہ ہے کہ امام ابو زید اور اخفش رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَعْنٰقُهُمْ ﴾ بہ معنی "جَمَاعَاتُهُمْ" ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "جَاءَنِي عُنُقٌ مِنْهُمْ"[1] یعنی ان میں سے ایک جماعت میرے پاس آئی۔ ساتواں یہ ہے کہ مضاف محذوف ہے، یعنی "فَظَلَّتْ أَصْحَابُ الْأَعْنَاقِ" پھر مضاف کو حذف کر دیا اور خبر اسی حالت پر باقی رہی، جس پر حذف سے پہلے تھی محذوف کی رعایت کے لیے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ خٰضِعِيْنَ ﴾ منصوب ہے بنا بر حال ﴿ اَعْنٰقُهُمْ ﴾ کی ضمیر سے۔ یہ قول امام کسائی رحمہ اللہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ خٰضِعِيْنَ ﴾ کی تفسیر "ذَلِيلِينَ" فرمائی ہے۔[2]

﴿ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴾ اللہ پاک نے یہ بات بیان فرمائی کہ باوجود اس کے کہ اللہ سبحانہٗ اس بات پر قادر ہے کہ ان کو ایمان کی طرف زبردستی لے آئے، ان کے پاس قرآن شریف کو حالاً بعد حال لاتا ہے، مثلاً: ایک آیت نازل کی، پھر حسبِ ضرورت و حاجت دوسری آیت اُتاری، ایک سورت اتاری، پھر دوسری سورت اُتاری۔ جب کوئی موعظت اور نصیحت تازہ بتازہ نو بنو اُن کے لیے نازل کرتا ہے تو وہ بھی جو نقیض مقصود ہے، اسی کی تجدید کرتے ہیں، وہ یہی منہ موڑنا، جھٹلانا اور ٹھٹھا کرنا ہے۔ جب کبھی کوئی نئی آیت آئی جھٹ پٹ اس سے منہ پھیر لیا، جھٹلا دیا اور مسخرا پن کرنے لگے۔

[1] فتح القدير (٤/ ١٢٦) [2] الدر المنثور (٦/ ٢٨٩)

﴿ مِنْ ذِكْرٍ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے عموم کی تاکید کے لیے اور ﴿ مِنَ الرَّحْمٰنِ ﴾ میں من ابتدائے غایت کا ہے اور استثناء مفرغ ہے اعم العام سے۔ اس کا محل نصب ہے بنا بر حالیت ﴿ يَأْتِيْهِمْ ﴾ کے مفعول سے۔ اس قسم کی آیت کی تفسیر سورۃ الانبیاء میں گزر چکی ہے۔ [1] معنی یہ ہیں کہ ان کے پاس جب بھی رحمان کے پاس سے کسی بھی حال میں کوئی نصیحت آتی ہے تو وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ ﴿ فَقَدْ كَذَّبُوْا ﴾ یعنی سو یہ جھٹلا چکے اس ذکر و نصیحت کو، جو ان کے پاس آتا ہے صریح طور پر اور کھلم کھلا جھٹلانا۔ صرف اعراض پر اکتفا نہ کیا۔ کسی نے کہا: اعراض کے معنی تکذیب ہیں، کیوں کہ جس شخص نے کسی شے سے اعراض کیا اور اس کو قبول نہ کیا تو یقیناً اس کو جھٹلایا۔ اس بنیاد پر تکذیب کا ذکر اس لیے ہوگا کہ اس بات پر دال ہو کہ ان سے تکذیب صریح طور پر صادر ہوئی، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ چنانچہ کسی شے سے اعراض کرنا، اس کی طرف توجہ نہ کرنا ہے۔

پھر اس شے کے ذکر کی طرف منتقل ہوئے جو اعراض سے زیادہ سخت ہے، یعنی صراحتاً تکذیب کی، پھر اس سے اس شے کی طرف منتقل ہوئے جو اس سے بھی زیادہ سخت ہے، یعنی استہزاء ٹھٹھا کرنا، چنانچہ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَسَيَأْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ اس پر دال ہے۔ "أنباء" سے مراد وہ سزا ہے، جس کے وہ عاجلاً و آجلاً مستحق ہیں، اس کا نام انباء اس لیے رکھا ہے کہ وہ ان چیزوں میں سے ہے جس کی قرآن شریف نے خبر دی ہے۔ رہی یہ بات کہ ﴿ مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ فرمایا اور "مَا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ" یا "مَا كَانُوْا بِهٖ يُكَذِّبُوْنَ" نہ کہا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ استہزاء اعراض اور تکذیب دونوں سے زیادہ سخت ہے اور ان کو مستلزم ہے اور اس میں ایک سخت وعید ہے۔ اس قسم کی تفسیر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔ [2]

پھر اللہ پاک نے وہ شے ذکر کی جو اس کی کمال قدرت پر دلالت کرتی ہے، جو اسے تمام امورِ حسیہ میں حاصل ہے کہ جو کوئی اُن میں غور و فکر کرے اور اُن کی طرف دیکھے اور اُن سے دلیل پکڑے تو اس کو ان سے زیادہ بڑی دلیل اور واضح برہان حاصل نہ ہو اور یہ بات بیان فرمائی کہ اس نے ان کے لیے ایسی دلیلیں ظاہر کر دی ہیں کہ زمین میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہتی ہیں اور اُس کی توحید اور یکتائی اور اس کے منفرد ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس کے باوجود اُن میں سے اکثر لوگ کفر پر جمے ہوئے ہیں۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ ﴾ ہمزہ استفہامِ توبیخی کے لیے ہے اور حرفِ واؤ عطف کے لیے ہے مقدر پر، جس طرح کہ اس کے نظائر میں ہوا کرتا ہے، یعنی کیا نہیں دیکھا انھوں نے زمین کے عجائب وغرائب کی طرف۔ بعض عجائب کا بیان اس قول سے فرمایا: ﴿ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴾ یعنی ہم نے ہر عمدہ قسم

---

[1] رقم الآیة (۲) [2] رقم الآیة (۵)

کی پیداوار سے بہت کچھ اُگایا۔ اللہ پاک نے اپنی عظمت وقدرت سے آگاہ فرمایا کہ اس نے اپنی قدرتِ تامہ سے زمین میں کثرت سے روئیدگی اُگائی۔ یہ جھٹلانے والے اور ٹھٹھا کرنے والے اگر غور کریں، جس طرح کہ غور کرنے کا حق ہے تو وہ بے شک اس بات کو جان لیں کہ اللہ پاک ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

﴿ زَوْجٍ ﴾ سے اس جگہ صنف اور قسم مراد ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: "لَون" یعنی رنگ۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زوج نوع ہے اور کریم بہ معنی محمود ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہر نفع دینے والی قسم کی سبزی اُگائی کہ جس کو اُگانے پر رب العالمین کے سوا اور کوئی قادر نہیں ہوتا، کیوں کہ جو بھی روئیدگی ہوتی ہے اس کا نفع یعنی فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ کریم اصل میں حسن شریف کو کہتے ہیں۔ محاورے میں نخلہ کریمہ کھجور کے اس درخت کو بولتے ہیں جس پر کھجوریں کثرت سے لگتی ہیں۔ رجل کریم شریف فاضل مرد کو کہتے ہیں۔ کتاب کریم وہ خط کتابت ہے جس کے معانی پسندیدہ ہوتے ہیں۔ نبات کریم وہ ہے جو اپنے فائدہ میں پسندیدہ ہے۔[1]

کلمۂ کثرت اور کلمۂ احاطہ دونوں کو جمع فرمایا؛ چنانچہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ﴿ كُلِّ ﴾ کا کلمہ تو دلالت کرتا ہے، روئیدگی کی تمام اقسام کا تفصیلی طور پر احاطہ کرنے پر اور کلمۂ ﴿ كَمْ ﴾ اس بات پر دال ہے کہ یہ محیط متکاثر ومفرط الکثرۃ ہے۔ ان دونوں کلموں کو اکٹھا لاکر اپنی کمالِ قدرت سے آگاہ کیا ہے۔[2] (قاله الزمخشري و إليه أشار في التقرير)

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ﴾ یعنی یہ بات جو ذکر کی گئی ہے کہ اللہ پاک نے ہر قسم کی بکثرت روئیدگی اُگائی، اس میں یا ان ازواج و اصناف میں سے ہر ایک میں یقیناً ایک دلالتِ بینہ اور علامتِ واضحہ ہے، اللہ پاک کی کمال قدرت اور اس کی بدیعِ صنعت پر۔

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفترے ست معرفت کردگار

"عقل مند کی نظر میں درخت کی سبز پتیوں کا ہر ورق اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دفتر ہے۔"

حرفِ لام ﴿ اِنَّ ﴾ کے اسم موخر میں زاید ہے۔ یہ آیت اس سورت میں آٹھ بار مذکور ہوئی ہے۔ پھر اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ ان میں سے اکثر لوگ اپنی گمراہی پر جمے ہوئے ہیں اور اپنے جحود، انکار، تکذیب اور استہزاء پر پکے جمے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی میرا علم اُن کے بارے میں سابق ہو چکا ہے کہ وہ اسی طرح رہیں گے، اسی لیے ایسی ایسی بڑی بڑی نشانیاں ان کو فائدہ نہیں دیتیں۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس جگہ ﴿ كَانَ ﴾ زاید ہے۔

﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾ یعنی اللہ پاک ان لوگوں پر غالب اور قاہر ہے، اس طرح سے کہ ان سے انتقام لے گا، اس کے باوجود کہ وہ بڑی رحمت والا ہے، اسی لیے ان کو مہلت دے رکھی ہے اور جلدی سے ان

[1] فتح القدير (٤/ ١٢٦۔ ١٢٧) [2] الكشاف (٣/ ٣٠٧)

کو سزا نہیں دے دی۔ یا یہ معنی ہیں کہ اپنے دشمنوں سے تو انتقام لینے والا ہے اور اپنے دوستوں پر بڑا مہربان ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسولِ کریم رؤف رحیم ﷺ کی تسلی و تشفی کے لیے سات انبیائے سابقین کے قصے ذکر فرمائے، تاکہ آپ ﷺ کے دل کی تشفی ہو جائے کہ قوم کی تکذیب کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ ایک رسمِ قدیم ہے، ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے۔ پہلے موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا، دوسرا ابراہیم علیہ السلام کا، تیسرا نوح علیہ السلام کا، چوتھا ہود علیہ السلام کا، پانچواں صالح علیہ السلام کا، چھٹا لوط علیہ السلام کا اور ساتواں شعیب علیہ السلام کا۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿١١﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿١٢﴾ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿١٣﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿١٤﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿١٥﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿١٨﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿٢٠﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢١﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿٢٢﴾

اور (یاد کریں) جب آپ کے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ تو ظالم قوم کے پاس جا⑩ (یعنی) قومِ فرعون کے پاس، کیا وہ ڈرتے نہیں؟⑪ اس نے کہا: اے میرے رب! بے شک میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے⑫ اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی، لہٰذا تو ہارون کی طرف بھی (وحی) بھیج⑬ اور ان کا میرے ذمے ایک گناہ (جرم) ہے، لہٰذا مجھے خوف آتا ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے⑭ فرمایا: ہرگز نہیں! چناں چہ تم دونوں ہماری نشانیوں کے

[1] فتح البیان (۹/ ۳۶۱۔ ۳۶۵)

ساتھ جاؤ، یقیناً ہم تمھارے ساتھ خوب سننے والے ہیں⑮ چناں چہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو: بلاشبہہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں⑯ یہ کہ بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) ہمارے ساتھ بھیج دے⑰ فرعون نے کہا: کیا ہم نے اپنے پاس بچپن میں تیری پرورش نہیں کی اور تو ہمارے درمیان اپنی عمر کے کئی برس نہیں رہا؟⑱ اور تو اپنا وہ کام کر گیا جو کر گیا اور تو ناشکروں میں سے ہے⑲ اس نے کہا: میں نے وہ کام اس وقت کیا تھا جب کہ میں بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے تھا⑳ پھر جب میں تم سے ڈرا تو میں تم سے بھاگ گیا، پھر میرے رب نے مجھے حکم بخشا اور اس نے مجھے رسولوں میں سے بنایا㉑ اور (کیا یہی ہے) وہ احسان جو تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے㉒

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ:

ملکِ شام ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے بنی اسرائیل کا وطن تھا۔ یوسف علیہ السلام کی وجہ سے مصر میں آ رہے، کتنی ہی مدت گزری، اب حق تعالیٰ نے ان کو ملکِ شام دینا چاہا، فرعون ان کو چھوڑتا نہیں تھا، کیوں کہ ان سے بیگار میں کام لیتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام سے ایک قبطی کا خون ہو گیا تھا۔ سورۃ القصص میں اس کا بیان آئے گا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کی خبر دیتا ہے جس کا اس نے اپنے بندے اور رسول اور کلیم موسیٰ بن عمران علیہ السلام کو حکم کیا، جبکہ ان کو طور کی دائیں طرف سے پکارا اور اُن سے کلام کیا اور سرگوشی کی اور ان کو رسالت عطا کی اور ان کو برگزیدہ کیا اور فرعون اور اس کی قوم کی طرف جانے کا حکم دیا، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴾ یہ سب عذر ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک سے سوال کیا کہ ان عذروں کو ان سے دور فرما دے، جس طرح کہ سورت طٰہٰ میں کہا ہے: ﴿ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْۤ اَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْۤ اَمْرِيْ ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴾ [طٰہٰ: ۲۵۔ ۳۶] ”اس (موسیٰ) نے کہا: میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔ اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ (تاکہ) وہ میری بات سمجھ سکیں۔ اور میرے لیے

میرے کنبے میں سے ایک وزیر بنا دے۔ (یعنی) میرے بھائی ہارون کو۔ اس کے ساتھ میری کمر مضبوط کر دے۔ اور اسے میرے کام (نبوت) میں شریک کر دے۔ تا کہ ہم تیری بکثرت تسبیح کریں۔ اور ہم تجھے بکثرت یاد کریں۔ بے شک تو ہمیں خوب دیکھنے والا ہے۔ اس (اللہ) نے فرمایا: اے موسیٰ! جو کچھ تو نے مانگا تجھے دیا جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مجھ پر ایک گناہ کا دعویٰ ہے قبطی کو مار ڈالنے کے سبب سے اور بلادِ مصر سے ان کے نکلنے کا یہی سبب ہوا۔ اللہ پاک نے اس کے جواب میں فرمایا: ﴿ كَلَّا ﴾ یعنی تو اس سے کچھ مت ڈر، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [القصص: ۳۵] ''اللہ نے فرمایا: ہم تیرے بھائی کے ذریعے سے تیرا بازو مضبوط کر دیں گے اور تم دونوں کو غلبہ عطا کریں گے، پھر وہ تم دونوں تک نہیں پہنچ سکیں گے، ہماری نشانیوں کے ساتھ (جاؤ)، تم دونوں اور جنھوں نے تمھاری پیروی کی، غالب رہیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴾ اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴾ [طٰه: ٤٦] ''بلاشبہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں۔'' یعنی میں اپنے حفظ ونگہبانی اور نصر و تائید سے تمھارے ساتھ ہوں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ جس طرح کہ دوسری آیت میں کہا ہے: ﴿ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ﴾ [طٰه: ٤٧] ''بے شک ہم تیرے رب کے رسول ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تو ان کو اپنی قید و قبضہ و عذاب سے رہا کر دے، اس لیے کہ وہ اللہ پاک کے مومن بندے ہیں اور ان کے گروہ مخلص ہیں اور وہ تیرے پاس ذلت والے عذاب میں گرفتار ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ بات کہی تو اس نے بالکل اعراض کیا اور حقارت سے ان کی طرف دیکھا اور یوں بولا: ﴿ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴾ یعنی کیا تو وہ شخص نہیں ہے جس کو ہم نے اپنے درمیان اور اپنے گھر میں پرورش کیا اور کئی سال تک ہم نے اس پر انعام کیا، پھر اس کے بعد تو نے اس احسان کا بدلہ اس طرح سے دیا کہ تو نے ہم میں سے ایک شخص کو مار ڈالا اور تم پر ہمارا جو احسان تھا اس کا انکار کیا اور اس کی ناشکری کی۔ اسی لیے یوں کہا: ﴿ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ أَيْ: اَلْجَاحِدِيْنَ'' یعنی تو ناشکرا ہے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ کا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1]

﴿ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے کہ وہ کام میں نے اس وقت کیا کہ وہ میری طرف وحی کیے جانے اور نبوت و رسالت عطا کیے جانے سے پہلے کا وقت تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ وغیرہم نے کہا ہے: ﴿ وَاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ ''أَيْ: اَلْجَاهِلِيْنَ'' امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٤٠)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں اسی طرح ہے۔ [1] مطلب یہ ہے کہ وہ کام مجھ سے نادانستہ ہو گیا، میں نے اس کو جان بوجھ کر نہیں کیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ یعنی پہلی حالت چلی گئی اور دوسری حالت یا دوسری ذمے داری آ گئی۔ یقیناً مجھے اللہ تعالیٰ نے تیری طرف بھیجا ہے، لہٰذا اگر تو اس کی اطاعت کرے گا تو سالم رہے گا اور اگر اس کی مخالفت کرے گا تو ہلاک ہو گا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ ﴾ یعنی جو تو نے مجھ پر احسان کیا ہے اور مجھے پالا پوسا ہے، یہ اس برائی کے مقابلے میں ہو سکتا ہے جو تو نے بنی اسرائیل کے ساتھ کی ہے کہ ان کو غلام اور خدمت گار بنا رکھا ہے۔ ان کو اپنے اور اپنی رعیت کے کاموں اور مشقتوں میں لگا رکھا ہے، محنت اور مشقت کے کام اُن سے لیتا ہے۔ تو نے جو ان میں سے ایک آدمی پر احسان کیا ہے، کیا یہ احسان اس برائی کی برابری کر سکتا ہے جو تو نے اُن کے ساتھ بحیثیتِ مجموعی کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے جو بات ذکر کی ہے، یہ اس برائی کی نسبت جو تو نے اُن کے ساتھ کی ہے، کچھ بھی نہیں ہے۔ [2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى ﴾ مستانفہ ہے، جو ما قبل کی تقریر کے لیے لایا گیا ہے۔ پہلی آیات میں اعراض و تکذیب اور استہزاء کا ذکر تھا، اس میں بھی انہیں چیزوں کا ذکر ہے۔ فرعون اور اس کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی سب کام کیے۔ اس قصے سے غرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی و تشفی کرنا اور مکہ والوں کو دھمکی دینا اور زجر و توبیخ کرنا ہے کہ اللہ کے رسول کی تکذیب کا انجام وہی ہوتا ہے جو فرعون اور اس کی قوم کا ہوا تھا۔ بالجملہ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ میں عامل محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَاتْلُ أَوِ اذْكُرْ إِذْ نَادَى"۔ ندا بہ معنی دعا ہے، یعنی اے پیغمبر! تم پڑھو یا یاد کرو اس وقت کو جب تمھارے رب نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا، جس وقت کہ انھوں نے درخت کو اور آگ کو دیکھا۔ یہ پکارنا ایسے کلام سے ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بغیر واسطے کے تمام سمتوں سے سنا۔

﴿ اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ اَنِ ﴾ تفسیریہ ہے، کیوں کہ ندا میں قول کے معنی ہیں۔ یہ جملہ ندا کا بیان ہے یا مصدریہ ہے: "أَيْ: بِأَنْ"، یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اس بات کے ساتھ پکارا کہ تو اس گناہ گار قوم کی طرف جا۔ ندا کے تحت میں جو باتیں وارد ہوئی ہیں تو یہ جملہ ان کی ابتدا یا شروع نہیں ہے، بلکہ ان میں سے ایک بات یہ ہے۔ ندا کا مطلع (شروع) وہی ہے، جس کی تفصیل سورت طٰہٰ میں واقع ہوئی ہے کہ ﴿ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝ ﴾

---

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٣٤١) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٣٩۔ ٤٤٠)

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿16﴾ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿17﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ
اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿18﴾ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿19﴾ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ
تَسْعٰى ﴿20﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿21﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ
غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿22﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴾ [طٰه: ١٢۔ ٢٣] ’’بے شک میں تیرا رب ہوں، لہٰذا تو اپنے جوتے اتار دے، بلاشبہ تو مقدس وادیِ طویٰ میں ہے۔ اور میں نے تجھے چن لیا ہے، لہٰذا جو وحی کی جاتی ہے اسے غور سے سن۔ بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، چناں چہ تو میری ہی عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔ بے شک قیامت آنے والی ہے، میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں، تا کہ ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا اس (فکرِ آخرت) سے تجھے وہ شخص روکنے نہ پائے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا، اور اس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی، ورنہ تو (بھی) ہلاک ہو جائے گا۔ اور اے موسیٰ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں، اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں، اور اس میں میرے لیے اور بھی مقاصد ہیں۔ اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ! اسے پھینک دے۔ پھر جب اس نے اسے پھینکا تب وہ دوڑتا ہوا سانپ (بن گیا) تھا۔ فرمایا: اسے پکڑ لے اور مت ڈر، ہم اسے اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔ اور تو اپنا ہاتھ اپنی بغل سے ملا، وہ بغیر کسی مرض کے چمکتا ہوا سفید نکلے گا، (یہ) دوسری نشانی ہے۔ تا کہ ہم تجھے اپنی کچھ بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔‘‘

رہی یہ بات کہ قومِ فرعون کو ظلم کے ساتھ موصوف کیا، یہ اس لیے کہ انھوں نے کفر کو، جس سے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور معاصی اور گناہوں کو، جن سے دوسروں پر ظلم کیا، اکٹھا کر لیا تھا۔ مثلاً بنی اسرائیل کو غلام بنا لینا، ان کے بیٹوں کا مار ڈالنا۔ بنی اسرائیل اس وقت میں چھے لاکھ تیس ہزار آدمی تھے۔ ﴿ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ﴾ کا نصب بنا بر بدل ہے، یا ﴿ اَلْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ کا عطفِ بیان ہے، گویا قوم ظالمین کے معنی اور اس کا ترجمہ فرعون کی قوم ہے۔ گویا دو عبارتیں ہیں جو نوبت بہ نوبت ایک مضمون اور معنی پر واقع ہوتی ہیں۔ اس قوم سے مراد قبطی لوگ ہیں۔

﴿ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں: کیا وہ اللہ پاک کے عذاب سے ڈرتے نہیں ہیں کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کر کے اس کے عذاب کو اپنی جانوں سے پھیر دیں؟ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو ان سے کہہ دے: کیا وہ نہیں ڈرتے ہیں۔ غائب کا صیغہ اس لیے کہا کہ خطاب کے وقت وہ غائب تھے۔ عبید بن عمیر اور ابو حازم رحمہما اللہ نے ’’أَلَا تَتَّقُوْنَ‘‘ بتائے خطاب پڑھا ہے، یعنی تو ان سے کہہ کہ کیوں جی تم ڈرتے نہیں ہو۔ اسی کے مثل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ ﴾[1] [آل عمران: ١٢] ’’(اے نبی!) جن لوگوں نے کفر کیا، ان سے کہہ دیجیے:

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٩١)

عن قریب تم مغلوب ہو جاؤ گے۔'' بیائے تحتیہ وتائے فوقیہ۔ یا یہ معنی ہیں کہ تو ان کے پاس جا اس حال میں کہ تو ڈانٹنے والا ہو، کیوں کہ اب ان کے لیے اس بات کا وقت آ گیا ہے کہ وہ ڈریں۔

کلمہ ﴿ اَلَا ﴾ حث واغرا کا ہے، یعنی کسی کو کسی شے پر برانگیختہ کرنا، آمادہ کرنا، ابھارنا، تاکہ وہ اس شے کو کرلے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ ظلم کرتے ہیں، اس حال میں کہ اللہ سے اور اس کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ اس بنا پر یہ حال ہوگا "ظالمین" کی ضمیر سے۔ غرضیکہ جب اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو انھوں نے تین عذر پیش کیے، ان میں سے ہر عذر اپنے سے پہلے عذر پر مرتب ہے۔ اس سے ان کی مراد رسالت سے باز رہنا نہیں ہے، بلکہ اس بھاری ذمے داری پر اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرنا ہے۔ پہلا عذر یہ کیا: ﴿ رَبِّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴾ یعنی اے میرے پروردگار! میں اس سے ڈرتا ہوں کہ وہ رسالت میں میری تکذیب کریں گے۔ خوف وہ غم ہے جو انسان کو کسی ایسے امر کے سبب سے لاحق ہوتا ہے جو آیندہ واقع ہونے والا ہو۔

دوسرا اور تیسرا عذر یہ ہے: ﴿ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ ﴾ یہ دونوں جملے ﴿ اَخَافُ ﴾ پر معطوف ہیں، یعنی ان کے مجھ کو جھٹلانے کی وجہ سے میرا سینہ تنگ ہوگا اور رسالت کو ادا کرنے میں میری زبان نہ چلے گی۔ یہ اس لیے کہا ہے کہ ان کی زبان مبارک میں ایک گرہ تھی۔ جمہور نے ﴿ يَضِيْقُ ﴾ اور ﴿ يَنْطَلِقُ ﴾ کو برفع پڑھا ہے، بنا پر عطف بر ﴿ اَخَافُ ﴾، چنانچہ اس کا ذکر ہوا، یا بنا بر استیناف۔ یعقوب، عیسیٰ بن عمرو اور ابوحیوہ رحمہم اللہ نے بہ نصب ہر دو فعل پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ يُكَذِّبُوْنِ ﴾ پر عطف ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں قراءتوں کے واسطے ایک وجہ ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلْوَجْهُ الرَّفْعُ"، یعنی رفع بہتر ہے نصب سے، کیوں کہ نصب کی صورت میں عطف ﴿ يُكَذِّبُوْنِ ﴾ پر ہوگا اور یہ بعید ہے۔[1]

﴿ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴾ یعنی تو جبرائیل علیہ السلام کو وحی دے کر ہارون کی طرف بھیج، تاکہ وہ میرے ساتھ رسول، وزیر، مظاہر اور معاون ہو جائے، مجھے اس سے قوت اور توانائی حاصل ہو۔ وزیر بننے کا اس آیت میں اس لیے ذکر نہیں کیا کہ وہ دوسری جگہ سے معلوم ہوتا ہے، چناں چہ سورت طٰہٰ میں فرمایا ہے: ﴿ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴾ [طٰہٰ: ٢٩] ''اور میرے لیے میرے کنبے میں سے ایک وزیر بنا دے۔'' نیز سورۃ القصص میں ہے: ﴿ فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْۤ ﴾ [القصص: ٣٤] ''لہٰذا تو اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج دے کہ وہ میری تصدیق کرے۔''

جس وقت موسیٰ علیہ السلام شام میں نبی ہوئے، اس وقت ہارون علیہ السلام مصر میں تھے، یہ بات جو موسیٰ علیہ السلام نے کہی یہ معاونت طلب کرنے کے باب سے ہے کہ ان کے بھائی کو ان کی مدد کے لیے ہمراہ کر دے، یہ نہیں ہے کہ انھوں نے رسالت قبول کرنے سے معافی چاہی، نہ یہ کہ حکم کی تعمیل کرنے میں جلدی کرنے سے توقف کیا، بلکہ رسالت کو پہنچانے

[1] فتح القدير (٤/ ١٢٧)

کے لیے اعانت اور مدد کی درخواست کی کہ ایسے عظیم القدر کام کے لیے ان کے بھائی ان کے معاون و مددگار ہو جائیں۔ ”وَكَفٰى بِطَلَبِ الْعَوْنِ دَلِيْلًا عَلَى التَّقَبُّلِ لَا عَلَى التَّعَلُّلِ“ یعنی رسالت کے قبول کرنے پر یہی دلیل کافی ہے کہ انھوں نے اعانت طلب کی۔ اس میں بہانہ جوئی اور پہلو تہی کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

﴿ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴾ اس ذنب سے مراد وہی قبطی کا مار ڈالنا ہے۔[1] (قاله قتادة) اس کا نام گناہ رکھا قبطیوں کے زعم کے مطابق۔ یا جس طرح کہ ”جزاء سيئة“ کا نام سیئہ رکھا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اس بات سے ڈرے کہ کہیں قصاص کے طور پر اس کے عوض ان کو نہ مار ڈالیں تو رسالت سے جو مقصود ہے، وہ فوت ہو جائے۔ لہٰذا جس بات کا ان کو خوف تھا، وہ یہی تھا۔ یہ بھی تعلل و بہانہ جوئی نہیں ہے، بلکہ متوقع آزمایش کے دور کرنے کی طلب ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ کبھی انبیاء کو بھی خوف حاصل ہوتا ہے، پھر فضلا کا کیا ذکر۔ پھر اللہ پاک نے ان کو اس کا جواب ایسی عبارت سے دیا جو ایک قسم کے ڈر اور دھمکی پر مشتمل ہے۔

ارشاد فرمایا: ﴿ كَلَّا ﴾ یعنی ہرگز نہیں، وہ تجھے قتل نہ کریں گے، گویا یوں کہا گیا کہ تو جس بات کا گمان اور خیال کرتا ہے، اس سے باز رہ۔ ﴿ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ ﴾ یعنی تو اور تیرا بھائی دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ۔ اس جواب کے ضمن میں اس بات کی قبولیت ہو گئی جس کی موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی کہ ان کے بھائی ان کے ساتھ ہوں، چناں چہ دونوں کو خطاب کرنا اس پر دال ہے اور اس میں حاضر کی غائب پر تغلیب ہے، کیوں کہ ہارون علیہ السلام اس وقت مصر میں تھے اور موسیٰ علیہ السلام کو عطائے رسالت اور خطاب طور میں ہوا تھا۔ گویا یوں فرمایا کہ اے موسیٰ! تو اس خیال سے باز رہ اور جا تو اور جس کی تو نے درخواست کی ہے اور قبطیوں سے مت ڈر۔

﴿ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴾ یعنی اس لیے کہ ہم اس بات کو سننے والے ہیں جو تم کہو گے اور جو بات تم سے کہی جائے گی۔ اس جگہ کے علاوہ استماع کے معنی یہ ہیں کہ سننے کے لیے کان جھکانا۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”اِسْتَمَعَ فُلَانٌ حَدِيْثَهٗ“ یعنی فلاں نے فلاں کی بات کی طرف کان جھکایا، چوں کہ اس جگہ استماع کو اس معنی پر محمول کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے اس کو سماع پر محمول کیا گیا، یعنی یہاں استماع کے معنی سننے کے ہیں۔[2] (كذا قال النسفي)۔ غرضیکہ اللہ پاک نے جو موسیٰ علیہ السلام کو خوف سے زجر کیا تو ﴿ اِنَّا مَعَكُمْ ﴾ میں اس کی وجہ ہے۔ یعنی تو مت ڈر، اس لیے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں اور سننے والے ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴾ [طٰہٰ: ٤٦] ”بلاشبہہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں۔“

اس سے اللہ پاک کی مراد ان کے دلوں کو تقویت دینا ہے اور وہ ان کی حفاظت اور نگہبانی کا متولی ہے۔ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو جمع کا قائم مقام ٹھہرا کر ﴿ مَعَكُمْ ﴾ فرمایا ہے، کیوں کہ سب سے قلیل جمع دو کی تعداد ہے، چنانچہ بعض

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٣٨) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٨١)

ائمہ اس طرف گئے ہیں۔ یا ﴿ مَعَكُمْ ﴾ کہنے کی یہ وجہ ہے کہ مراد موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور وہ شخص ہے جس کی طرف یہ دونوں بھیجے گئے، اب تین ہو گئے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد یہ دونوں مع بنی اسرائیل کے ہوں۔ یا ان دونوں کی تعظیم کے لیے جمع کا صیغہ کہہ دیا۔ ﴿ مَعَكُمْ ﴾ اور ﴿ مُسْتَمِعُوْنَ ﴾ دونوں کلمۂ "إِنَّ" کی خبریں ہیں۔ یا ﴿ مُسْتَمِعُوْنَ ﴾ خبر ہے اور ﴿ مَعَكُمْ ﴾ اس سے متعلق ہے۔ معیت میں جو مجاز ہے وہ مخفی نہیں ہے، اس لیے کہ مصاحبت اجسام کی صفات سے ہے۔ لہٰذا اس معیت سے مراد نصرت و معونت و مدد کی معیت ہے۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں، یعنی ہم تمھارے معاون و مددگار ہیں۔

﴿ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ حرفِ فا ما بعد کی ترتیب کے لیے ہے ما قبل پر۔ رسول کو واحد ذکر کیا، تثنیہ نہ کہا، حالاں کہ رسول دو تھے، جس طرح کہ ﴿ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ﴾ [طٰهٰ: ٤٧] "بے شک ہم تیرے رب کے رسول ہیں۔" میں بلفظِ تثنیہ فرمایا ہے تو اس کی کئی وجہیں ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ رسول مصدر ہے بہ معنی رسالت اور مصدر واحد لایا جاتا ہے اور جب رسول بہ معنی مرسل ہوتا ہے تو تثنیہ کے ساتھ تثنیہ اور جمع کے ساتھ جمع آتا ہے۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول بہ معنی رسالت ہے، معنی یہ ہیں "إِنَّا ذَوُوْ رِسَالَةِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" یعنی ہم ربّ العالمین کی رسالت والے ہیں۔ نیز امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اثنین اور جمع کے معنی میں جائز ہے۔ عرب لوگ بولتے ہیں: "هٰذَا رَسُوْلِيْ وَوَكِيْلِيْ وَهٰذَانَ رَسُوْلِيْ وَوَكِيْلِيْ وَهٰؤُلَاءِ رَسُوْلِيْ وَوَكِيْلِيْ"

غرض یہ ہے کہ محاورۂ عرب میں رسول اور وکیل کا اطلاق مفرد و تثنیہ و جمع پر برابر آتا ہے۔ اسی باب سے کلمۂ ﴿ عَدُوٌّ ﴾ ہے جو اس آیت میں ہے: ﴿ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٧٧] "تو بلاشبہ وہ میرے دشمن ہیں، سوائے رب العالمین کے۔" دوسری وجہ یہ ہے کہ معنی ہیں: "كُلُّ وَاحِدٍ مِّنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" یعنی ہم میں سے ہر ایک رب العالمین کا رسول ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ دونوں رسالت میں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار تھے، اس لیے بہ منزلہ ایک رسول کے ہوئے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: پھر موسیٰ و ہارون علیہما السلام فرعون کی طرف چلے تو اس نے ایک سال تک ان کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دی۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ تفسیر کا ہے، اس لیے کہ ارسال جو رسول سے سمجھا جاتا ہے، اس میں اس قول کے معنی شامل ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو چھوڑ دے، رہا کر دے، تا کہ وہ ہمارے ساتھ زمینِ فلسطین میں چلے جائیں اور اُن کو غلام مت بنا۔ فرعون نے چار سو برس سے ان کو غلام بنا رکھا تھا، ان سے محنت و مشقت کے کام لیا کرتا تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس آئے اور جس بات کا اللہ پاک نے ان کو حکم دیا تھا، وہ اس سے کہہ دی، اس کے بعد اس نے ان سے یہ کہا: ﴿ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا ﴾ یعنی کیا ہم

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٩٢۔ ٩٣)

نے اپنی گود میں اپنے گھروں میں تیری پرورش نہیں کی، اس سے ان پر احسان رکھنا اور انھیں حقیر کرنا مقصود تھا، یعنی ہم نے تجھے قریب الولادت سے تیرے دودھ چھڑانے کے بعد اپنے پاس رکھا، پالا پوسا اور جن بچوں کو ہم نے قتل کر ڈالا، ان میں تجھ کو نہیں مار ڈالا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴾ یعنی تو اپنی عمر میں سے کئی سال ہمارے درمیان رہا، پھر یہ بات کب ہوئی جس کا تو دعویٰ کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان میں اٹھارہ برس رہے۔ کسی نے کہا: تیس برس۔ کسی نے کہا: چالیس برس۔ پھر ان سے قبطی کے قتل کا اقرار کرایا اور زجر و توبیخ کی، یوں کہا: ﴿ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ ﴾ "فَعْلَةٌ"، بفتح "فا" ایک بار فعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے:

اَلْفَعْلَةُ لِلْمَرَّةِ وَالْفِعْلَةُ لِلْحَالَةِ

یعنی "فَعْلَةٌ"، بفتح "فا" ایک بار فعل کرنے کے لیے اور بکسر "فا" حالت کے لیے آتا ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے بکسرِ فا پڑھا ہے، اور فتح زیادہ صحیح ہے،[1] اس لیے کہ بفتح ایک بار کے لیے ہے، نوع کے لیے نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نعمتیں گنوائیں تو اُن سے ان کے گناہ ذکر کیے اور "فَعْلَةٌ" سے قبطی کا قتل مراد لیا۔

پھر بولا: ﴿ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی تو اُن لوگوں میں سے ہے جو نعمت کی ناشکری کرتے ہیں، کیوں کہ تو نے میرے مصاحبوں میں سے ایک شخص کو مار ڈالا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو اُن میں سے ہے جو اس بات کا انکار کرنے والے ہیں کہ فرعون معبود ہے۔ کسی نے کہا: تو اُن میں سے ہے جو اس کے زعم میں اللہ کا انکار کرنے والے ہیں۔ "لِأَنَّهُ كَانَ مَعَهُمْ عَلَى دِيْنِهِمْ" (اس قول میں غور کرنا چاہیے)۔ اور جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو یہ جواب دیا: ﴿ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ یعنی کیا تو ہے میں نے وہ فعل جس کا تو نے ذکر کیا، یعنی قبطی کا قتل اور میں اس وقت ضالین، یعنی جاہلین میں سے تھا۔ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔[2]

موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نفس سے کفر کی نفی کی اور اس بات کی خبر دی کہ انھوں نے وہ کام جہالت کی بنا پر کیا تھا اور وہ اس سے پہلے تھا کہ ان کے پاس وہ علم آئے جو اللہ پاک نے ان کو سکھایا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ میں اس بات سے جاہل تھا کہ وہ مُکّا قتل کو پہنچ جائے گا۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: "جاهلین" بہ معنی "ناسین" ہے،[3] یعنی میں نے اس کو بھول کر کیا۔ کسی نے بہ معنی "مخطئین" کہا ہے۔ یعنی میں نے اس کو چوک کر کیا تھا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ ضلال کے بجائے جہل رکھتے ہیں اور جہل کو بجائے ضلال۔[4]

﴿ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ ﴾ یعنی میں تمھارے درمیان سے مدین کی طرف نکل گیا، جس طرح کہ

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٩٣)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ٣٤١)
[3] تفسير القرطبي (١٣/ ٩٤)
[4] تفسير الطبري (١٩/ ٣٤٠۔ ٣٤١)

سورۃ القصص میں ہے، جب میں تم سے ڈرا کہ تم مجھے مار ڈالو گے۔ یہ خوف ان کو اس وقت ہوا، جب آلِ فرعون کے مومن نے ان سے کہا: ﴿ اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴾ [القصص: ۲۰] ''بلاشبہہ سردار تیرے خلاف مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر ڈالیں، لہٰذا تو نکل جا، بے شک میں تیرے خیر خواہوں میں سے ہوں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُكْمًا ﴾ پھر میرے رب نے مجھے حکم بخشا، یعنی نبوت یا علم و فہم۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حکم سے مراد ان کو تورات کی تعلیم دینا ہے، جس میں اللہ کا حکم ہے۔[1] ﴿ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴾ یعنی اس نے مجھے اپنے رسولوں کے زمرے میں سے کیا ہے۔ فرعون نے جس بات کے ساتھ ان کو توبیخ کی تھی، ان کی نبوت میں عیب لگانے کے لیے وہ بات یہی قبطی کا ناحق قتل تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کا رد کیا۔ رد کی وجہ یہ ہے کہ حکم اور نبوت کا عطا کرنا اس حادثے کے بعد ہوا ہے۔

﴿ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴾ کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ بات فرمائی وہ اقرار کے طور پر ہے کہ انھوں نے نعمت کا اقرار کیا، گویا فرمایا کہ ہاں وہ پرورش کرنا ایک نعمت ہے، جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے، لیکن وہ میری رسالت کو رد نہیں کرتا۔ امام فراء اور ابن جریر رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بات انھوں نے بطورِ انکار کہی، یعنی کیا تو مجھ پر اس بات کا احسان رکھتا ہے کہ تو نے مجھے بچپن سے پرورش کیا اور تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا ہے اور ان کو قتل کیا ہے اور وہ میری قوم ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسروں نے اس کو انکار کے طور پر خارج کیا ہے، اس کا انکار ہے کہ فرعون نے جو بات کہی وہ موسیٰ علیہ السلام پر نعمت ہو۔

لفظ اس کا لفظ خبر ہے اور اس میں مخاطب کو تبکیت ہے، یعنی ڈانٹ ڈپٹ ہے، یعنی اس کو عاجز کرنا اور ڈانٹنا ہے، اس معنی کی بنا پر کہ تو اگر بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل نہ کرتا تو میری ماں مجھے دریا میں ڈالنے سے بے نیاز ہوتی، لہٰذا تو گویا مجھ پر اس بات کا احسان رکھتا ہے کہ جو تیری بلا کی وجہ سے ہوئی۔ غرض یہ ہے کہ تیرا مجھ پر کوئی احسان نہیں ہے، کیوں کہ اگر تیرا ظلم اور قتل نہ ہوتا تو میری ماں مجھے کیوں دریا میں ڈالتی اور تجھے میری پرورش کرنے کی نوبت آتی، وہ خود مجھے پال لیتی۔

امام ازہری رحمہ اللہ نے اس کے مثل اس سے زیادہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ تربیت غلام بنانے کے سبب سے تھی، جس کا میں نے ذکر کیا ہے، یعنی تیرا مجھ کو پرورش کرنا اس لیے تھا کہ میری قوم کو غلام بنائے تو اُن کا مالک ہو، ان پر قہر و جبر کرے، ان کو دبائے۔ کسی نے کہا ہے کہ عبارت میں استفہام مقدر ہے۔ ''أَيْ: أَوَ تِلْكَ نِعْمَةٌ'' یعنی کیا یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے؟ یہ امام اخفش رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ جس شخص نے یہ کہا کہ کلام انکاری ہے تو اس کے

[1] تفسير القرطبي (۱۳/ ۹۴)

نزدیک معنی یہ ہے: "أَوَ تِلْكَ نِعْمَةٌ" یعنی یہ نعمت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ تو مجھ پر اس کا احسان رکھے۔

﴿ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ "اِتَّخَذْتَهُمْ عَبِيْدًا" یعنی تو نے ان کو غلام بنایا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "عَبَّدْتُهُ وَأَعْبَدْتُهُ" ایک ہی معنی میں، یعنی میں نے اس کو غلام بنایا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اس کا محل رفع ہے، اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ یا بدل ہے ﴿ نِعۡمَةٌ ﴾ سے اور جر باضمار حرفِ با ہے اور نصب بحذف حرفِ با۔[1] اس میں سات وجہیں ہیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کیا ہے۔[2]

قَالَ فِرۡعَوۡنُ وَمَا رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ؕ‏ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِيۡنَ ‏﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنۡ حَوۡلَهٗۤ
اَلَا تَسۡتَمِعُوۡنَ‏ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمۡ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ‏ ﴿۲۶﴾ قَالَ
اِنَّ رَسُوۡلَـكُمُ الَّذِىۡۤ اُرۡسِلَ اِلَيۡكُمۡ لَمَجۡنُوۡنٌ‏ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ
الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ‏ ﴿۲۸﴾

فرعون نے کہا: اور رب العالمین کیا ہے؟ (23) اس نے کہا: وہ آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، ان کا رب ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو (24) اس نے اپنے اردگرد والوں (درباریوں) سے کہا: کیا تم سنتے نہیں ہو؟ (25) اس نے کہا: (وہ) تمھارا اور تمھارے اگلے آباؤ اجداد کا رب ہے (26) اس نے کہا: بلاشبہ تمھارا یہ رسول، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، یقیناً دیوانہ ہے (27) اس نے کہا: (وہ) مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کا رب ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو (28)

رب العالمین کے بارے میں فرعون کا تمرد و سرکشی:

موسیٰ علیہ السلام ایک بات کہے جاتے تھے، اللہ کی قدرت کی نشانیاں بتاتے جاتے تھے اور فرعون بیچ میں اپنے سرداروں کو اُبھارتا تھا کہ کہیں اُن کو یقین نہ آ جائے۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرعون کے کفر، سرکشی، طغیان، تمرد اور انکار کی خبر دیتا ہے، جو اس کے اس قول سے ظاہر ہے: ﴿ وَمَا رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴾۔ بات اس طرح ہے کہ وہ اپنی قوم سے کہا کرتا تھا: ﴿ مَا عَلِمۡتُ لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرِىۡ ۚ ﴾ [القصص: ۳۸] "میں تو اپنے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں جانتا" یعنی نہیں جانا میں نے تمھارے

[1] فتح القدیر (٤/ ١٢٩)
[2] فتح البیان (٩/ ٣٦٥۔ ٣٧٠)

واسطے کوئی معبود سوا میرے۔'' ﴿ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ﴾ [الزخرف: ٥٤] ''تب اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا (اور اس کی عقل مار دی) تو انھوں نے اس کی اطاعت کی۔'' یہ لوگ قادر مطلق اور صانع جل وعلا کا انکار کیا کرتے تھے اور اس بات کے معتقد تھے کہ ان کا کوئی رب نہیں ہے سوائے فرعون کے۔

پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ ﴿ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٦] یعنی بے شک میں سب جہانوں کے مالک کا بھیجا ہوا ہوں تو فرعون نے اُن سے کہا کہ وہ کون ہے جس کے بارے میں تو زعم کرتا ہے کہ وہ میرے سوا رب العالمین ہے؟ علمائے سلف وائمۂ خلف نے اس کی تفسیر اسی طرح کی ہے، یہاں تک کہ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۞ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴾[1] [طٰهٰ: ٤٩۔٥٠] ''اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ اس (موسیٰ) نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی شکل وصورت دی، پھر ہدایت دی۔'' اہلِ منطق میں سے جو یہ زعم کرتا ہے کہ یہ سوال ماہیت کے متعلق ہے تو بے شک اس نے غلطی کی، کیوں کہ فرعون تو اللہ کی ذات کا اقراری ہی نہ تھا کہ ماہیت کا سوال کرے، بلکہ اس میں جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ بالکل اس کا جاحد اور منکر تھا، اگرچہ اس پر حجتیں اور دلیلیں قائم ہو چکی ہیں۔

غرضیکہ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے رب العالمین کا سوال کیا تو اس وقت انھوں نے یہ کہا ہے کہ ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ یعنی وہ اس سب کا خالق و مالک ہے، اس کا مختارِ کل ہے اور معبود ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی ہے جس نے ساری اشیاء کو پیدا کیا، یعنی عالمِ علوی اور جو کچھ اس میں ثوابت و سیارے اور روشن ستارے ہیں اور عالمِ سفلی اور جو کچھ اس میں ہیں، مثلاً: دریا، جنگل، پہاڑ، درخت، حیوانات، نباتات پھل وغیرہ اور جو کچھ آسمان اور زمین کے درمیان ہے، یعنی ہوا اور پرندے اور جس پر فضا مشتمل ہے۔ یہ سب اللہ پاک کے غلام و بندے اور اس کے سامنے ذلیل اور فرماں بردار ہیں۔

﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴾ یعنی اگر تمھارے پاس یقین کرنے والے دل اور نفوذ کرنے والی آنکھیں ہیں۔ اس وقت فرعون نے توجہ کی اُن لوگوں کی طرف جو اس کے گرد اشرافِ قوم اور سردار اور ارکانِ دولت بیٹھے ہوئے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے قول پر تکبرانہ، تمسخرانہ اور تکذیب کے انداز سے ان سے مخاطب ہو کر کہا: ﴿ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴾ یعنی کیا تم اس بات پر تعجب نہیں کرتے ہو جو یہ اپنے زعم میں کہتا ہے کہ میرے سوا تمھارا کوئی اور معبود ہے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی وہ تو تمھارا اور تمھارے اگلے باپ دادا کا خالق ہے، جو فرعون سے اور اس کے زمانے سے پہلے گزر چکے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٥٦)

اب تو فرعون نے اپنی قوم سے یوں کہا: ﴿ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ یعنی بے شک تمھارا رسول جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے البتہ دیوانہ ہے، اس کو اپنے اس دعویٰ میں کچھ عقل نہیں ہے کہ وہاں میرے سوا کوئی رب ہے۔ یہ لوگ جن کو فرعون نے شبہے میں ڈال کر غصے سے گرم کیا تھا اور ان کو جوش میں لایا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے ان کو مخاطب کر کے یہ جواب دیا کہ ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی اللہ وہ ہے جس نے مشرق کو مشرق ٹھہرایا ہے جس سے تارے طلوع ہوتے ہیں اور مغرب کو مغرب قرار دیا ہے کہ اس میں ستارے، ثوابت اور سیارے غروب ہوتے ہیں، اس نظام اور بندوبست کے تحت جس میں ان کو مسخر کیا ہے اور ان کا اندازہ مقرر فرمایا ہے۔

اگر یہ شخص جو زعم کرتا ہے کہ وہ تمھارا رب و معبود ہے، سچا ہے تو چاہیے کہ اس کے مخالف نظام قائم کر دے، مشرق کو مغرب ٹھہرا دے اور مغرب کو مشرق، جس طرح کہ اللہ پاک نے اس شخص کے متعلق بیان کیا ہے، جس نے ابراہیم علیہ السلام سے ان کے رب کے بارے میں حجت کی: ﴿ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۸] ''جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس (نمرود) نے کہا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا: بے شک اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال کر دکھا، چناں چہ وہ ہکا بکا رہ گیا جس نے کفر کیا تھا اور اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو ظالم ہیں۔'' اور اسی لیے جبکہ فرعون دلائل کے سامنے مغلوب ہو گیا اور اس کی حجت منقطع ہوئی تو وہ اپنی جاہ، قوت اور سلطنت کے استعمال کی طرف رجوع ہوا اور اس نے یہ اعتقاد کیا کہ ایسا کرنا اس کے لیے فائدہ مند ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے حق میں ایسا کرنا ضروری ہے، چنانچہ وہ بات کہی جس کی خبر اللہ پاک نے اس کی طرف سے دی ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جب فرعون نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا یہ قول سنا کہ ﴿ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ تو جو انھوں نے کہا تھا، اس پر اعتراض کے طور پر ان سے استفسار کیا کہ وہ کون شے ہے؟ استفہام میں کلمۂ ''ما'' لایا، جس سے مجہول کے بارے میں پوچھا جاتا ہے اور جس سے جنس کا تعین طلب کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کی کیا صفت ہے؟ تم محاورے میں بولتے ہو: ''مَا زَيْدٌ'' یعنی زید کیا ہے، دراز قد ہے یا کوتاہ قد، فقیہ ہے یا طبیب؟ امام کشاف رحمہ اللہ وغیرہ نے اس پر تصریح کی ہے۔

غرضیکہ فرعون نے جب یہ بات کہی تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور اس شے کا جو

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۴۰۔ ۴۴۱)

آسمانوں اور زمین کے درمیان ہے۔ چنانچہ اس کے لیے وہ شے معین کر دی جو عالمین سے مراد رکھی تھی اور جس بات کا اس نے سوال کیا تھا اس کے جواب کو ترک کر دیا، کیوں کہ اس نے رب العالمین کی جنس کا سوال کیا تھا، حالاں کہ اس کی کوئی جنس نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے اس کو ایسی شے کے ساتھ جواب دیا جو عظیم قدرتِ الٰہیہ پر دلالت کرتی ہے، جس سے ہر سننے والے کے لیے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ پاک رب ہے اور اس کے سوا اور کوئی رب نہیں ہے اور اس میں اس کے اس دعوے کو باطل کرنا ہے کہ وہ معبود ہے۔ اگر تم کسی شے پر یقین کرنے والے ہو تو یہ شے یقین کرنے والوں کے لیے اس کے ظہور کی وجہ سے اور اس کی دلیل کے روشن ہونے کی وجہ سے زیادہ مؤثر ہے۔ یہ وہ علم ہے جو استدلال سے حاصل ہوتا ہے اور اسی لیے یوں نہیں کہتے کہ اللہ موقن ہے۔ فرعون نے ان لوگوں سے، جو اس کے اردگرد بیٹھے تھے، کہا، اور یہ لوگ اشرافِ قوم کے پانچ سو افراد تھے، یہ کنگن پہنے ہوئے تھے اور کنگن صرف سلاطین ہی پہنتے ہیں، یہ چیز صرف بادشاہوں کے لیے ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے جلیل القدر ذی رتبہ و بلند مرتبہ تھے۔

ان سے یہ کہا: ﴿ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴾ ان کو تعجب دلایا، ایک ضعیف بات سے۔ گویا یوں کہا کہ جو بات موسیٰ علیہ السلام نے کہی تم اس کو سنتے ہو، اس سے تعجب نہیں کرتے ہو کہ میں نے تو اس سے رب العالمین کی حقیقت کا سوال کیا اور وہ اس کے افعال ذکر کرتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ زعم کرتا ہے کہ وہ رب السمٰوٰت ہے حالانکہ آسمان واجب بالذات ہیں اور خود حرکت کرتے ہیں جس طرح کہ دھریہ کا مذہب ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ آسمانوں کا کسی مؤثر کا محتاج ہونا کسی کے علم میں نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون لعین پر حجت وارد کی اور اس کو اس کا جواب نہ آیا تو اپنی قوم کو مغالطہ دیا، کہنے لگا کہ دیکھو تم تعجب نہیں کرتے ہو کہ میں تو حقیقت کے متعلق پوچھتا ہوں اور وہ افعال کا ذکر کرتا ہے۔ جواب سوال کے مطابق نہیں ہے۔ یہ بات لعین نے صرف مغالطے میں ڈالنے کے لیے کہی، کیوں کہ یہاں جواب کو سوال سے ہٹ کر دینا متعین ہے (ضروری ہے) اس لیے کہ وہ سوال ہی کم عقلی اور حماقت پر مبنی ہے اور بے فائدہ ہے۔

پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی بات سنی تو اس پر اور حجت وارد کی۔ یہ حجت پہلی حجت میں شامل ہے، لیکن چوں کہ فہمِ سامعین کی طرف زیادہ تر قریب ہے، اس لیے اس کا ذکر بالخصوص علاحدہ سے کیا۔ چنانچہ فرمایا کہ وہ رب تمھارا رب ہے اور تمھارے پہلے باپ دادا کا رب ہے، یعنی اگلے جملے میں عام ذکر کر کے خود ان کو اور ان کے آبا کو خاص کیا، اس لیے کہ عقل مند جس شے میں نظر کرتا ہے، اس سے زیادہ تر قریب اس کی جان ہے اور وہ شخص جس سے وہ پیدا ہوا ہے۔ یہ حجت قادر مطلق پر بہت واضح دلیل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے خوب واضح کر کے یہ بات بتا دی کہ فرعون مربوب ہے رب نہیں ہے، جیسا کہ وہ دعویٰ کرتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ یہ رب جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں وہی ہے، جس نے تمھارے اگلے باپ دادا کو پیدا کیا ہے اور تم کو پیدا کیا ہے، پھر تم اس شخص کو کیوں پوجتے ہو جو تم میں سے

ایک ہے، وہ بھی تمھاری طرح پیدا ہوا ہے اور اس کے باپ دادا ہیں۔ وہ تمھارے باپ دادا کی طرح دفن ہو چکے۔ اس وقت فرعون نے ان کو کچھ خاطر خواہ جواب نہ دیا، بلکہ ایسی بات کہی کہ اس کی قوم کو شک میں ڈالے اور ان کے خیال میں یہ بات پیدا کرے کہ یہ بات جو موسیٰ علیہ السلام نے کہی، ایسی ہے کہ اس کو عقل مند لوگ نہیں کہتے۔

پھر بولا کہ بے شک تمھارا رسول جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، البتہ دیوانہ ہے۔ اس بات سے اس کا مقصد قوم کو مغالطہ دینا اور یہ بات ظاہر کر کے حیرت میں ڈالنا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو بات کہی ہے، اس کو خفیف و ہلکا سمجھتا ہے اور اس سے ٹھٹھا کرتا ہے۔ مجنون اس لیے کہا ہے کہ وہ سوال کسی شے کا کرتا ہے اور وہ اس کو جواب دوسری شے کا دیتے ہیں۔ رسول کی اضافت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطبین کی طرف کی، اس لیے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ذات کی طرف مرسل ہونے سے تکبر کیا۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ایسی بات کے ساتھ جواب دیا جو اُن کے پہلے جواب کی تکمیل ہے۔

فرمایا کہ وہ مشرق اور مغرب کا اور جو شے اُن کے درمیان ہے، ان سب کا رب ہے۔ مشرق و مغرب کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا کہ ان کی دلیل دینا بہت زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ مشرق سے مراد سورج کا اور دن کا طلوع ہونا ہے اور مغرب سے مراد غروبِ آفتاب اور دن کا ڈھلنا ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ سورج کا ایک جانب سے طلوع ہونا اور دوسری جانب میں اس کا غروب ہونا ایک ہی انداز پر نہیں ہوتا، مگر وہ قادرِ حکیم کے مقرر کردہ اندازے کے مطابق ہوتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس کا ملک تیرے ملک کی طرح نہیں ہے، کیوں کہ تو تو ایک شہر کا مالک ہے تیرا حکم اس شہر کے علاوہ شہر میں نہیں چلتا۔ اس شہر میں وہ شخص مر جاتا ہے جس کا مرنا تجھے پسند نہیں۔ اور جس نے مجھے بھیجا ہے وہ مشرق و مغرب، اور جو اس کے درمیان ہے، کا مالک ہے، یعنی تم ہر دن مشاہدہ کرتے ہو کہ وہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے اور اس کو ایک مدار پر حرکت دیتا ہے کہ وہ گزشتہ دن کے مدار سے مختلف ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کو مغرب کی طرف پہنچاتا ہے ایسے طور سے، جو نافع (نفع بخش) ہے، جس سے کائنات کے تمام معاملات کا انتظام چلتا ہے۔

فرعون نے جو موسیٰ علیہ السلام کو جنون کے ساتھ منسوب کیا تھا تو وہ اس کو رد کرنے میں مشغول نہ ہوئے، بلکہ اس سے یہ بات بیان کر دی کہ اللہ پاک کی ربوبیت مشرق و مغرب، اور جو اس کے درمیان ہے، کو شامل ہے۔ اگر چہ یہ بات اللہ پاک کی ربوبیت کے تحت "سمٰوٰت و أرض وما بينهما" کے لیے بھی شامل تھی۔ اس کی ایک وجہ تو پہلے گزر چکی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں تصریح ہے اسناد حرکاتِ سمٰوت وما فیہا کی اور احوال و اوضاع آسمانوں کا تغیر کبھی تو نور سے اور کبھی ظلمت سے اللہ پاک کی طرف سے۔ کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات جان لی تھی کہ اس سوال سے فرعون کا ارادہ اس شخص کے بارے میں معرفت حاصل کرنے کا راستہ تھی جس کا اس نے سوال کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا اس شے کے ساتھ جو رب تعالیٰ کی معرفت کی راہ تھی۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اشیاء میں سے کسی شے کو سمجھتے ہو یا اگر تم عقل رکھنے والوں سے ہو، یعنی اے فرعون! اگر تو اور تیرے ساتھ جو لوگ ہیں، عقل والوں میں سے ہو تو تو اور وہ اس بات کو پہچان جاؤ گے کہ تیرے سوال کا کوئی جواب نہیں، مگر وہی جو میں نے تجھ سے ذکر کر دیا ہے۔ پہلے موسیٰ علیہ السلام نے ان سے نرمی کی اور نرمی کا معاملہ کیا، اس لیے یوں کہا: ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ﴾۔ پھر جب ان کی طبیعت کی شدت اور سختی کو دیکھا تو ان سے سختی کی اور جواب دینے میں ان پر درشتی کی اور جیسی انھوں نے گفتگو کی ویسی ہی بات چیت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔

یوں کہا: ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ کیوں کہ اس میں زیادہ تر مبالغہ ہے اور پہلے جو کہا تھا اس کے بھی زیادہ موافق ہے، کیوں کہ انھوں نے ان کو جنون کے ساتھ منسوب کیا تھا تو انھوں نے کہا کہ تم تو مجھے مجنون کہتے ہو اور میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم کو عقل ہے تو میری بات کو سمجھ جاؤ گے۔ ورنہ تم بے عقل و جاہل ہو۔ پھر جب کہ لعین کے پاس حجت نہ رہی اور کچھ جواب نہ بنا تو اپنی برتری و تغلب اور ڈانٹ ڈپٹ کی طرف رجوع کیا، ڈرانے دھمکانے لگا۔ دشمن اور مغلوب کا یہی حال ہوتا ہے کہ جب حجت میں عاجز ہو جاتا ہے تو بلاوجہ دبانے لگتا ہے۔[1] چنانچہ یہ کہنے لگا:

قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝۲۹ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۰ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۳۱ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝۳۲ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝۳۳ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝۳۴ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝۳۵ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ۝۳۶ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ۝۳۷

اس نے کہا: البتہ اگر تو نے میرے سوا کوئی اور معبود پکڑا تو میں ضرور تجھے قیدیوں میں سے کر دوں گا (29) موسیٰ نے کہا: اگرچہ میں تیرے پاس کوئی واضح شے (دلیل) لاؤں (تب بھی؟) (30) اس نے کہا: اگر تو سچوں میں سے ہے تو وہ تو لے ہی آ (31) چناں چہ موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو آناً فاناً وہ واضح اژدہا بن گیا (32) اور اس نے اپنا ہاتھ (بغل میں سے) کھینچ نکالا تو اس وقت وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید (چمکتا) تھا (33) فرعون نے اپنے اردگرد موجود سرداروں سے کہا:

[1] فتح البیان (۹/ ۳۷۰۔ ۳۷۳)

بلاشبہ یہ ضرور ماہر جادوگر ہے 34 وہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو سے تمھیں تمھاری زمین سے نکال دے، لہٰذا تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ 35 انھوں نے کہا: اسے اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے اور شہروں میں (جادوگروں کو) اکٹھا کرنے والے بھیج دے 36 (کہ) وہ ہر ماہر جادوگر کو تیرے پاس لے آئیں 37

وہ معجزے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے پیش کیے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب فرعون پر بیان اور عقل سے حجت قائم ہو چکی تو اس طرف رجوع ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ہاتھ اور بادشاہت سے دبائے، اس لیے کہ اس نے یہ خیال کیا کہ اب اس مقام سے ورے کوئی بات نہیں ہے تو یہ بولا کہ اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود ٹھہرایا تو میں لازمی طور پر تجھے قید میں ڈال دوں گا۔ پس اس وقت موسیٰ علیہ السلام بولے اور میں جو تیرے پاس ایک قطعی اور واضح دلیل لایا ہوں۔ فرعون بولا: اگر تو سچ کہتا ہے تو وہ پیش کر۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو اسی وقت وہ ایک ناگ بن گئی، بالکل ظاہر اور واضح تھی، ظاہر اور واضح ہونے میں اور عظمت اور بزرگی میں۔ پاؤں والی، بڑے منہ والی، ہولناک شکل جو بے چین کرنے والی تھی۔ اور اپنی جیب میں ڈال کر اپنا ہاتھ نکالا تو اسی وقت وہ بالکل سفید ہو کر نکلا، دیکھنے والوں کے سامنے، اس طرح چمکنے والا جیسے چاند کا ٹکڑا۔

معجزے دیکھ کر فرعون کی مغالطہ آمیزی:

پس فرعون اپنی شقاوت اور بدبختی کے سبب سے جھٹلانے اور دشمنی کی طرف جلدی سے رجوع ہوا اور اپنے گرد کے سرداروں سے کہا کہ یہ کوئی جادوگر ہے، جو فاضل اور فائق اور قابل ہے جادو میں۔ پھر فرعون نے ان پر یہ بات چلائی کہ یہ جادو کے قبیل سے ہے، معجزے کے قبیل سے نہیں ہے۔ پھر ان کو موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت پر ابھارا اور آمادہ کیا تو یوں کہا کہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمھارے دیس سے نکال دے۔ یعنی اس نے ارادہ کیا ہے کہ اس کے سبب سے لوگوں کے دل اپنے ساتھ لے جائے اور اس کی اعانت کرنے والے، اتباع کرنے والے، نصرت کرنے والے اور مددگار بڑھ جائیں اور تمھاری حکومت پر غالب ہو جائے تو تمھارے شہر لے لے۔

لہٰذا تم اس کے بارے میں مجھے مشورہ دو کہ میں اس کے ساتھ کیا کروں؟ وہ بولے کہ اس کو اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے اور شہروں میں اپنے ہرکارے بھیج کہ وہ تیرے پاس ہر بڑے ماہر اور عالم جادوگر کو لے آئیں۔ یعنی تو ان کو تاخیر دے تاکہ تو اپنی مملکت کے شہروں اور حکومت کے اقلیموں سے ہر ایک بڑے جادوگر کو جمع کر لے، تاکہ وہ اس سے مقابلہ کریں اور جو جادو وہ لایا ہے، وہ اس جیسا جادو لائیں، پھر تو غالب ہو جائے گا اور تیرے لیے نصرت اور تائید ہوگی۔ چنانچہ فرعون نے ان کی یہ بات مان لی۔

یہ معاملہ اللہ پاک کی اس باب میں تسخیر سے ہوا، تا کہ لوگ ایک جگہ پر جمع ہو جائیں اور اللہ پاک کی نشانیاں اور اس کی حجتیں، براہین اور دلیلیں دن کی روشنی کی طرح بالکل ظاہر ہو جائیں اور لوگوں پر کھل جائیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴾ کے معنی ہیں: "مِنْ أَهْلِ السِّجْنِ" الف اور لام عہد کے واسطے ہے، یعنی میں تجھ کو ان قیدیوں میں سے کروں گا، جن کا حال تو جان چکا ہے میرے قید خانوں میں۔ فرعون کا قید خانہ قتل سے بھی زیادہ سخت تھا، کیوں کہ جب وہ کسی کو قید کرتا تو اسے نکالتا نہ تھا، یہاں تک کہ مر جائے۔ زمین کے نیچے ایک مکان تھا، اس کے اندر ایک گہرا گڑھا تھا، اس میں اس کو تنہا ڈال دیتا تھا۔

اس لیے ﴿ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴾ زیادہ بلیغ ٹھہرایا گیا ہے "لَأَسْجُنَنَّكَ" سے، کیوں کہ مذکورہ وجہ سے پہلی عبارت میں زیادہ تر مبالغہ ہے اور دوسری عبارت سے صرف قید سمجھی جاتی ہے۔ غرضیکہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قید خانے کی وعید سنائی اور یوں نہ کہا کہ تیری دلیل کیا ہے کہ اس معبود نے تجھ کو بھیجا ہے، اس لیے کہ اس میں اس بات کا اقرار تھا کہ وہاں کوئی معبود ہے سوا اس کے اور یہ جو قید خانے کی وعید سنائی تو اس میں اس کا ضعف ہے، کیوں کہ یہ بات مروی ہے کہ فرعون موسیٰ علیہ السلام سے بہت خوف کھاتا تھا، ان سے ڈرتا اور گھبراتا تھا، یہاں تک کہ ملعون اپنا پیشاب نہیں روک سکتا تھا۔

پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات سنی تو دو وجہ سے اس سے ملاطفت فرمائی: ایک یہ ہے کہ اس کی بات کو مان لینے میں طمع کی۔ دوسرے یہ کہ مناظرے کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی، اس ارادے سے کہ جو حجت نبوت کے باب میں معتبر ہے، اس سے اس کو دبائیں گے۔ وہ حجت یہی معجزے کا ظاہر کرنا ہے۔ پس اس سے ایسے طریقے سے پیش کیا کہ اس کے لیے معجزہ طلب کیے بغیر چارہ نہ ہو۔

یوں فرمایا: ﴿ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی کیا تو مجھے مسجونین سے کرے گا اور اگر میں تیرے پاس کوئی ایسی چیز لے آؤں، جس سے میرا صدق ظاہر ہو جائے اور اس وقت میرے دعوے کی سچائی کھل جائے۔ ﴿ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴾ سے مراد معجزہ ہے، اس لیے کہ اس میں دو دلالتیں جمع ہوتی ہیں: ایک تو وہ صانع اور قادر مطلق کے وجود و حکمت پر دال ہوتا ہے۔ دوسرے جس شخص کے ہاتھ پر اس کا ظہور ہوتا ہے، اس کے دعوے کی سچائی پر دلالت کرتا ہے۔ اس جگہ ہمزہ استفہام کے لیے ہے اور واؤ کا حرف مقدر پر عطف کے لیے ہے، چناں چہ اسی کے مطابق ترجمہ گزر چکا ہے۔

غرضیکہ جب فرعون نے یہ بات سنی تو جو شے موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پیش کی تھی، اس کی طلب کی۔ چنانچہ بولا:

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۴۱۔ ۴۴۲)

﴿ فَأْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اس کو لے آ۔ فرعون نے جو اُن کو اس کے لانے کے لیے کہا تو یہ خیال کر کے کہ وہ اس کے مقابلے پر قادر ہوگا۔ یہ شرط ہے، جواب اس کا محذوف ہے، کیوں کہ جو شے جواب پر دال ہے وہ پہلے گزر چکی۔

چنانچہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے معجزہ ظاہر کیا، اپنی لاٹھی ڈال دی تو اسی وقت وہ ﴿ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴾ ہوگئی۔ مطلب یہ ہے کہ لاٹھی کا اژدھا اور ناگ بن جانا ظاہر اور کھلا ہوا تھا، کوئی ملمع کاری یا خیالی چیز نہ تھی، جس طرح کہ جادوگر کیا کرتے ہیں کہ حقیقت میں کچھ شے ہوتی ہے اور دیکھنے والوں کو جادو کے زور سے کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ لاٹھی کا سانپ بن جانا ایسا نہ تھا، بلکہ حقیقت اور نفس الامر میں وہ سانپ ہوگئی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ سانپ بن گئی تو آسمان کی طرف تقریباً ایک میل بلند ہوئی، پھر فرعون کی طرف منہ کیے ہوئے نیچے اتری تو بولا: قسم ہے اس کی جس نے تجھے بھیجا ہے تو اس کو پکڑ لے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑ لیا تو وہ لاٹھی ہوگئی، جیسے وہ تھی۔ ﴿ ثُعْبَانٌ ﴾ کا لفظ "ثَعَبْتُ الْمَاءَ فِي الْأَرْضِ فَانْثَعَبَ" سے مشتق ہے، یعنی رواں کیا میں نے پانی کو زمین میں تو وہ رواں ہوگیا۔

اللہ پاک نے دوسری جگہ ﴿ ثُعْبَانٌ ﴾ کے بجائے ﴿ حَيَّةٌ ﴾ کہا ہے: ﴿ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴾ [طٰہٰ: ۲۰] "پھر جب اس نے اسے پھینکا تب وہ دوڑتا ہوا سانپ (بن گیا) تھا۔" ایک جگہ ﴿ جَآنٌّ ﴾ فرمایا ہے: ﴿ كَاَنَّهَا جَآنٌّ ﴾ [القصص: ۳۱] "وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہا ہے۔" ﴿ جَآنٌّ ﴾ وہ سانپ ہے جو صِغر کی طرف مائل ہوتا ہے، یعنی چھوٹا ہوتا ہے اور ثعبان کِبر کی طرف مائل ہوتا ہے اور ﴿ حَيَّةٌ ﴾ جنس ہے بڑے اور چھوٹے دونوں کو شامل ہے۔ اس آیت کی اور اس سے بعد والی آیت کی تفسیر سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔[1]

﴿ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس گندم گونی حالت پر وہ تھا، اب اس کے برخلاف ہوگیا۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ اس کی سفیدی ایک ایسی شے ہوگئی کہ دیکھنے والے اس کو دیکھنے کے لیے جمع ہوتے تھے، کیوں کہ وہ سپیدی عام حالت سے مختلف تھی اور وہ نوری تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنا ہاتھ جیب سے باہر نکالا تو وہ ایک دم سفید چمکتا ہوا تھا ناظرین کے لیے اور اس شخص کے لیے جو اس کی طرف نظر کرے اور اسے دیکھے۔[2] اس میں برص نہیں تھا، اس کی شعاع سورج کی شعاع کی طرح تھی، اتنی تیز شعاع تھی کہ آنکھیں چندھیا جائیں اور پھر انھیں اُفق بھی نظر نہ آئے۔

غرضیکہ سردار لوگ جو اُس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، ان سے کہا کہ بے شک یہ البتہ بہت بڑا جادوگر ہے۔ وہ جادو کا زمانہ تھا، اسی لیے فرعون نے اس بات کو رواج دیا اور معجزے کی حقیقت کو تسلیم نہ کیا۔ لوگوں کو نفرت دلانے کے

[1] رقم الآیة (۱۰۷)
[2] تفسیر الطبري (۱۹/ ۳٤٥)

لیے یہ کہا کہ یہ چاہتا ہے کہ تم کو اپنے جادو کے زور سے تمھاری سرزمین سے نکال دے۔ یہ بات اس خوف سے کہی کہ کہیں وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی بات کو نہ مان لیں۔

﴿ فَمَاذَا تَأْمُرُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تمھاری رائے کیا ہے اور ایسی بات میں تمھارا مشورہ کیا ہے؟ ان سے یہ اظہار کیا کہ جو بات وہ کہیں گے، اس طرف وہ مائل ہو گا۔ اس سے غرض ان کو مالوف کرنا اور اُن کی مودت اور دوستی حاصل کرنا ہے، کیوں کہ اس نے جو ربوبیت کا دعویٰ کر رکھا تھا، وہ اب زوال پذیر تھا اور جس بات سے اپنے آپ کو ان پر زیادہ عزت والا ٹھہراتا ہے، وہ نیست و نابود ہونے لگی تھی۔ ورنہ وہ تو فخر و کبریائی، تکبر اور جبر کے مارے اس سے کہیں بڑھ کر تھا کہ ان کو ایسا خطاب کرے اور ان سے ایسی بات پوچھے، جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ بھی ان کی طرح کا ایک فرد اور ایک شخص ہے، اس کے باوجود کہ اس وقت سے پہلے یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہاں کا معبود ہے اور وہ اس کی اس بات کو تسلیم کرتے تھے اور اس کے دعویٰ میں اس کی تصدیق کرتے تھے۔

ظاہر معجزے کے سلطان اور غلبے نے اسے بوکھلا دیا اور حیران و پریشان کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ رب ہونے کے دعویٰ کی بلندی سے عاجزی کے گڑھے کی طرف اُتار دیا کہ جن لوگوں کو اپنے زعم میں اپنے غلام اور بندے سمجھتا تھا، اب ان سے عاجزی و فروتنی کرنی پڑی کہ وہ، جو وہ کہیں گے یا رائے دیں گے، اس کی تعمیل ضرور ہو گی، یا جن لوگوں کی ربوبیت کا دعویٰ کرتا تھا اور خود کو اُن کا رب سمجھتا تھا، اس بلندی سے اتار کر مشاورت کی پستی میں لا ڈالا کہ اب ان سے مشورہ لینا پڑا، اس کے بعد کہ رائے اور تدبیر میں وہ خود مستقل تھا اور یہ بات کہی کہ اس کے ملک پر موسیٰ علیہ السلام کے قابض ہونے کا خوف ہے اور زمین کی اور اس سے نکالنے کی نسبت سرداروں کی طرف کی۔ اس کی غرض یہ تھی کہ ان کو موسیٰ علیہ السلام سے متنفر کرے۔ (كذا في أبي السعود)[1]

﴿ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ ﴾ یعنی سرداروں نے یہ مشورہ دیا کہ تو اُن کے معاملے میں تاخیر کر۔ یہ ماخوذ ہے: "أَرْجَيْتُهُ إِذَا أَخَّرْتَهُ" سے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کو روک کر رکھ، یعنی حبس کر اور شہروں میں جمع کرنے والوں کو بھیج کہ وہ جادوگروں کو اکٹھا کر لائیں، یہ لوگ "شُرَط" (سپاہی) ہیں جو لوگوں کو جمع کیا کرتے ہیں۔

﴿ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴾ کلمۂ احاطہ اور صیغۂ مبالغہ اس لیے ذکر کیا کہ اس کی بے چینی اور بے قراری میں اس کی کچھ تسکین ہو جائے۔ ﴿ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴾ سے مراد وہ ہے جو سحر کے علم اور اس کے عمل میں بہت آگے ہے۔ غرض یہ کہ وہ موسیٰ علیہ السلام پر فاضل اور فائق ہو گا اور جادو کے علم میں اس سے بڑھ جائے گا۔[2]

---

1. تفسير أبي السعود (٦/ ٢٤١)
2. فتح البيان (٩/ ٣٧٣۔ ٣٧٥)

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٣٨﴾ وَّقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم
مُّجْتَمِعُونَ ﴿٣٩﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ﴿٤٠﴾
فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا
نَحْنُ الْغَالِبِينَ ﴿٤١﴾ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٢﴾
قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٤٣﴾ فَأَلْقَوْا
حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ ﴿٤٤﴾
فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿٤٥﴾ فَأُلْقِيَ
السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ
مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿٤٨﴾

چناں چہ جادوگر ایک مقرر دن کو (خاص) وقت پر جمع کر لیے گئے (38) اور لوگوں سے کہا گیا: کیا تم بھی جمع ہوگے؟ (39) اگر وہ (جادوگر) غالب آئیں تو شاید ہم ان جادوگروں کی اتباع کریں (40) پھر جب جادوگر آئے تو وہ فرعون سے کہنے لگے: اگر ہم ہی غالب آئے تو کیا ہمارے لیے کوئی صلہ ہوگا؟ (41) فرعون نے کہا: ہاں! اور بے شک تب تم (میرے) مقربین میں سے ہوگے (42) موسیٰ نے ان سے کہا: جو کچھ تم ڈالنے والے ہو، ڈال دو (43) تب انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہنے لگے: عزتِ فرعون کی قسم! بلاشبہ ہم ہی غالب ہیں (44) پھر موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو وہ فوراً ہی اسے نگلنے لگا جو وہ جھوٹ موٹ گھڑ رہے تھے (45) چناں چہ جادوگر (بے اختیار) سجدے میں گر پڑے (46) وہ کہنے لگے: ہم رب العالمین پر ایمان لائے (47) موسیٰ اور ہارون کے رب پر (48)

موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کا فعلی مناظرہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ فعلی مناظرہ، جو موسیٰ علیہ السلام اور قبطیوں کے درمیان واقع ہوا، اللہ پاک نے سورۃ الاعراف، سورت طٰہٰ اور اس سورت میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ قبطیوں نے ارادہ کیا کہ اللہ پاک کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں، مگر اللہ پاک نے نہ مانا اور اپنے نور کو پورا کرنے کا ارادہ کر لیا، گو کافر لوگ برا مانیں۔

کفر اور ایمان کی یہی حالت ہے کہ جہاں کہیں یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہوتے ہیں تو ایمان ہی کفر پر غالب ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا

هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١٨] ''بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتا ہے، پھر یکایک وہ (باطل) ملیامیٹ ہو جاتا ہے اور تمھارے لیے ان باتوں کی وجہ سے ہلاکت ہے جو تم (اللہ کے بارے میں) بیان کرتے ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبٰطِلُ ۚ اِنَّ الْبٰطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨١] ''اور کہیے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔'' اور اسی لیے جادوگر آئے، ان کو اقالیم بلادِ مصر (دور دراز) سے جمع کیا تھا۔

یہ لوگ اس زمانے میں جادو، صنعت و کاریگری اور تخییل میں سب سے بڑھ کر تھے۔ اس فن میں بڑے ماہر اور کامل تھے اور یہ جادوگر ایک جمِ غفیر اور بہت بڑی تعداد میں تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ بارہ ہزار تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ پندرہ ہزار۔ کسی نے کہا ہے کہ سترہ ہزار۔ کسی نے کہا ہے کہ انیس ہزار۔ کسی نے کہا ہے کہ تیس ہزار سے کچھ زیادہ۔ کسی نے کہا ہے کہ اسّی ہزار تھے۔ اس کے سوا اور قول بھی ہیں، ان کی گنتی کو اللہ پاک ہی خوب جانتا ہے۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان جادوگروں کا کام ان میں سے چار آدمی چلاتے تھے، یہ چار شخص ان کے رئیس اور سردار تھے، چاروں کے نام یہ ہیں: سابور، عاذور، حطحط، مصفی۔ لوگوں نے اس دن جمع ہونے میں بڑی جدوجہد کی تھی۔ ان کے کہنے والے نے یوں کہا: ﴿ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴾ اور ''نَتَّبِعُ الْحَقَّ'' نہ کہا۔ یعنی شاید ہم جادوگروں کی پیروی کریں، اگر وہی غالب ہو جائیں اور یہ نہ کہا: شاید ہم حق کی پیروی کریں۔ برابر ہے کہ غلبہ کا صدور جادوگروں سے ہو یا موسیٰ علیہ السلام سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رعیت اپنے بادشاہ کے دین پر ہوتی ہے۔

﴿ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ ﴾ یعنی پھر جب جادوگر فرعون کی مجلس کی طرف آئے اور حال یہ تھا کہ اس کے لیے ایک وطاق (یعنی خیمہ وغیرہ) نصب کیا گیا تھا اور اس نے اپنے خادموں، نوکروں، وزیروں، ملک کے سرداروں اور مملکت کے لشکروں کو جمع کیا تھا۔ جادوگر اس کے روبرو کھڑے ہوئے، اس سے اس کا احسان اور تقرب طلب کرتے تھے، اس صورت میں کہ وہ اس شخص پر غالب ہوں، جس کے مقابلے کے لیے ان کو جمع کیا ہے۔

لہٰذا وہ بولے: ﴿ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴾ یعنی بھلا ہمارا کچھ اجر بھی ہے، اگر ہم غالب آ جائیں؟ فرعون بولا: ﴿ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴾ یعنی ہاں اور خاص تر اس چیز سے جو تم طلب کرتے ہو، میں تم کو اپنے پاس مقرب اور ہم نشیں لوگوں میں سے کروں گا۔ مطلب یہ ہے کہ ہاں، تمھارے سحر کی اُجرت اور مزدوری دوں گا اور مزدوری کے علاوہ تم کو ایک خاص شے زیادہ دوں گا جبکہ تم غالب ہو جاؤ گے، وہ خاص شے یہی ہے کہ تم کو اپنے مقرب مصاحبوں کے زمرے میں شامل کر لوں گا۔ وہ جادوگر اس گفتگو کے بعد مناظرے کے مقام کی طرف لوٹ گئے۔

بولے: اے موسیٰ! یا تو تو ڈال لے یا ہم پہلے ڈالنے والے ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بلکہ تم ہی ڈالو۔ اس جگہ اختصار کیا ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ڈالو جو تم ڈالنے والے ہو۔ انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور

بولے: ﴿ بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ یعنی فرعون کے اقبال سے ہم ہی البتہ غالب رہیں گے۔

یہ قول ایسا ہے جیسا کہ عوام کے جاہل لوگ جس وقت کچھ کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ''هٰذَا بِثَوَابِ فُلَانٍ'' یعنی یہ کام فلاں کے ثواب و برکت و جزا سے ہوا۔ جس طرح اہلِ ہند کے امراء میں رسم ہے کہ جب نوکر کوئی کام کرتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ حضور کے اقبال سے یہ کام ہوا یا ہوگا۔ غرضیکہ اللہ پاک نے سورۃ الاعراف میں یوں ذکر فرمایا: ﴿ سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴾ [الأعراف: ١١٦] ''تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں (لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپوں سے) ڈرایا، اور وہ بہت بڑا جادو لائے تھے۔'' اور سورت طٰہٰ میں اس طرح فرمایا ہے: ﴿ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۗ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۗ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ [طٰہٰ: ٦٦۔ ٦٩] ''پھر ناگہاں ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کو یہ خیال گزرنے لگا کہ ان کی رسیاں اور اُن کی لاٹھیاں بلاشبہہ دوڑ رہی ہیں۔ پھر موسیٰ نے اپنے نفس میں خوف محسوس کیا۔ ہم نے کہا: خوف نہ کھا، بے شک تو ہی غالب رہے گا۔ اور جو (لاٹھی) تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اسے ڈال دے، وہ اس کو نگل جائے گی، جو کچھ انھوں نے بنایا ہے، بس انھوں نے تو جادوگر کا فریب بنایا ہے، اور جادوگر جہاں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا۔''

اور اس جگہ یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴾ یعنی پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ اسی وقت لقف کرنے لگا اس سانگ کو جو انھوں نے بنایا تھا، یعنی اس کو جھپٹنے اور جمع کرنے لگا ہر طرف سے اور اس کو نگلنے لگا، پھر اس نے ان کے سانگ میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٨﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿١٢٠﴾ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢١﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١١٨۔ ١٢٢] ''بالآخر حق ثابت ہوگیا اور جو کچھ وہ لوگ کر رہے تھے، باطل ٹھہرا۔ تب وہ جادوگر وہیں مغلوب ہوگئے اور ذلیل و خوار ہو کر پیچھے ہٹ آئے۔ اور جادوگر (بے اختیار) سجدے میں گر پڑے۔ انھوں نے کہا: ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے۔ موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔''

چنانچہ یہ قصہ ایک نہایت ہی امرِ عظیم ہوا اور ایک ایسی برہان اور حجت ہوئی جو ہر قسم کے عذر کو کاٹنے والی اور سر توڑنے والی تھی۔ یہ اس لیے کہ جن لوگوں سے فرعون نے نصرت اور مدد چاہی اور ان سے اس بات کا طالب ہوا کہ وہ غالب ہوں، پس وہی مغلوب، عاجز اور ذلیل ہوئے اور اسی موجودہ حالت اور اسی گھڑی میں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور اس اللہ رب العالمین کے لیے سجدہ ریز ہو گئے جس نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو حقِ صریح اور واضح معجزہ دے کر بھیجا تھا۔ چنانچہ فرعون ایسا مغلوب ہوا کہ ویسا مغلوب ہونا چشمِ عالم کہن نے کبھی مشاہدہ نہیں کیا۔ فرعون۔ علیه لعنة الله والملائكة و الناس أجمعين۔ بڑا ہی بے حیا، بے شرم اور جری تھا، چنانچہ اب بھی روشن دلیل اور

واضح برہان کو دیکھ لینے کے بعد اس نے دشمنی اور تکبر اور باطل دعویٰ کی طرف رجوع کیا اور جادوگروں کو، جو سچے پکے مومن ہو گئے تھے، دھمکیاں اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا شروع کیا اور ڈرانے دھمکانے لگا اور یہ کہنے لگا: ﴿ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴾ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرعون نے کہا: ﴿ إِنَّ هَٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴾ [الأعراف: ١٢٣] ''بے شک یہ مکر ہے، تم نے اس شہر میں (مل کر) یہ مکر کیا ہے، تاکہ یہاں رہنے والوں کو اس (شہر) سے نکال دو، پھر جلد ہی (اس کا نتیجہ) تم جان لو گے۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا حاصل یہ ہے کہ ﴿ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴾ سے مراد یوم زینت ہے، جس طرح کہ اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَن يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴾ [طٰہٰ: ٥٩] ''اس (موسیٰ) نے کہا: تمھارا وعدہ زینت (جشن) کا دن ہے اور یہ کہ لوگ دن چڑھے اکٹھے کیے جائیں۔'' یہ یومِ زینت ان کا روزِ عید تھا یا روزِ بازار اور ﴿ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴾ سے مراد وقتِ چاشت ہے، کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام نے روزِ زینت سے جو وقت اُن کے لیے مقرر کیا تھا، وہ بھی چاشت کا وقت ہے، جس طرح کہ اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَأَن يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴾ [طٰہٰ: ٥٩] ''اور یہ کہ لوگ دن چڑھے اکٹھے کیے جائیں۔'' میقات وہ ہے جو وقت اور جگہ میں سے مقرر و متعین کیا جاتا ہے۔ اسی معنی میں مواقیتِ احرام اور نماز ہیں۔

﴿ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ﴾ یعنی لوگوں سے کہہ دیا گیا: کیوں جی کیا تم جمع ہونے والے ہو؟! یہ بات جمع ہونے پر برانگیختہ کرنے کے لیے کہی، تاکہ جو بات موسیٰ علیہ السلام سے اور جادوگروں سے صادر ہو، لوگ اس کا مشاہدہ کریں اور دیکھ لیں کہ غلبہ کس کو ہوتا ہے۔ فرعون نے یہ بات اس واسطے کہی کہ اس کو اپنے غلبے کا بھروسا تھا اور چاہا کہ یہ کام لوگوں کے مجمع میں ہو، تاکہ ان میں سے کوئی بھی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے۔ یہ بات موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک اچھے موقعے میں واقع ہوئی، جس کو وہ چاہتے تھے، کیوں کہ وہ خوب جانتے تھے کہ غالب اللہ پاک ہی کی حجت ہوگی اور کافروں کی حجت باطل ٹھہرے گی اور لوگوں کے مجمع کے اندر اللہ پاک کی حجت کے ظاہر اور غالب ہونے میں دو فائدے ہیں: ایک یہ ہے کہ جو لوگ حق پر ہیں ان کے قوی ہونے میں زیادتی ہوگی اور جو لوگ باطل پر ہیں ان کے مقہور ہونے میں بڑھوتی ہوگی۔

﴿ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ شاید ہم ساحروں کی، ان کے دین

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٤٢۔ ٤٤٣)

میں، پیروی کریں، اگر وہی غالب ہوئے نہ موسیٰ علیہ السلام۔ اتباعِ سحرہ سے مراد ان کے دین میں باقی رہنا ہے، اس دین پر جس پر وہ تھے، کیوں کہ اس وقت سحرہ کا دین وہی تھا، جو اُن کا دین تھا اور مقصود اس دین کی مخالفت ہے، جس کی طرف موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بلایا۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ حقیقتاً ساحروں کے دین کا اتباع کریں، مراد تو صرف اسی قدر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا اتباع نہ کریں، لیکن وہ اپنی بات کو پیرایۂ کنایہ میں لائے، اس سے غرض ساحروں کو اپنے سحر میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرنے کے لیے آمادہ کرنا ہے،[1] تاکہ ساحروں کو یہ طمع ہو کہ اگر ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب ہو جائیں گے تو فرعون اور اس کی قوم ہمارے دین کا اتباع کریں گے، اس طمع سے سحر کرنے میں خوب سعی و کوشش کریں کہ کسی طرح سے موسیٰ علیہ السلام پر غالب ہو جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''سَحَرَة'' سے مراد موسیٰ و ہارون علیہما السلام ہیں۔ یہ بات استہزا اور تمسخر کے طور پر کہی۔

غرضیکہ جب ساحر لوگ آئے تو اس وقت انھوں نے فرعون سے اس کام پر جزا طلب کی، جس کو وہ عن قریب کریں گے اور فرعون سے کہا کہ کیا ہمارے لیے تو کوئی جزا عطا کرے گا مال یا جاہ سے؟ کسی نے کہا ہے کہ مراد اُن کی یہ ہے کہ کیا بے شک ہمارے لیے ثوابِ عظیم ہے۔

پھر انھوں نے اس جزا کو ان کے موسیٰ علیہ السلام پر غلبہ کے ظاہر ہونے کے ساتھ مشروط کیا تو اس طرح سے کہا: ﴿ اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴾ یعنی اگر ہم غالب ہوں۔ فرعون نے ان کی اس بات سے اتفاق کیا اور کہا: ﴿ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴾ یعنی ہاں میرے نزدیک تمھارے جادو کے ذریعے غالب آ جانے پر تمھارے لیے یہ اُجرت اور مزدوری ہے کہ تم میرے نزدیک مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم جو سحر ڈالنے والے ہو، اسے ڈالو، پس عن قریب تم اس کا انجام دیکھ لو گے کہ کیا ہوتا ہے۔ دوسری آیت میں یوں فرمایا ہے: ﴿ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١١٥] ''جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو تو ڈال یا (پہلے) ہم ہی (اپنا جادو) ڈالیں۔'' پس دونوں آیتوں میں اس طرح موافقت کی جائے گی کہ اس جگہ اس کو اس پر محمول کریں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان ساحروں کے ﴿ اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ ... الخ ﴾ کہنے کے بعد اُن سے یہ کہا کہ ﴿ اَلْقُوْا ﴾۔

موسیٰ علیہ السلام نے جو اُن کو ﴿ اَلْقُوْا ﴾ کہا تو یہ کچھ اُن کی طرف سے سحر اور جادو کرنے کا حکم نہیں ہے، بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ ان کو حجت سے مغلوب کریں اور اُن کے لیے یہ بات ظاہر کریں کہ جس شے کو وہ لے کر آئے ہیں، وہ اس جنس سے نہیں ہے، جس کے ساتھ ساحروں نے ان کا مقابلہ کرنا چاہا ہے۔ غرض یہ کہ پھر انھوں نے اپنی رسیاں اور

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٤٢)

لاٹھیاں ڈال دیں۔ وہ ستر (۷۰) ہزار رسیاں تھیں اور ستر ہزار لاٹھیاں تھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ رسیاں بہتر (۷۲) ہزار تھیں اور اتنی ہی لاٹھیاں تھیں۔ وہ لوگوں کے خیال میں ایسے ڈالتے تھے کہ وہ سانپ ہیں جو دوڑ رہے ہیں اور ڈالتے وقت یہ کہا: ﴿ بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ ﴾ یعنی فرعون کی عزت اور قوت کی قسم کھائی۔ یہ جاہلیت کی قسموں میں سے ہے۔

اس قول میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ قسم ہے، اس کا جواب ﴿ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ محذوف سے متعلق ہے اور حرفِ ''با'' سببیت کا ہے اور عزت سے مراد عظمت ہے، یعنی فرعون کی عظمت کے سبب سے ہم ہی غالب ہوں گے، اس لیے کہ انھوں نے اپنے دل میں غلبے کا پکا اعتقاد کر لیا تھا اور یہ ارادہ کیا تھا کہ ان سے پرلے درجے کا سحر جو ممکن ہو گا وہ لائیں گے۔ غرضیکہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو اسی وقت وہ اس سانگ (باطل کام) کو جو اُن سے صادر ہوا تھا، اس کو ذلیل کر کے لینے لگا، اس طریقے سے کہ وہ ان سب نقلی سانپوں کو نگلنے لگا۔ کہتے ہیں کہ عصا سانپ بن گیا اور جو لاٹھیاں اور رسیاں انھوں نے پھینکی تھیں، ان سب کو نگل گیا۔ پھر انھوں نے اس کو پکڑ لیا تو وہ اسی وقت ویسا ہو گیا، جیسے پہلے تھا۔ جب ساحروں نے اس قصے کا مشاہدہ کیا کہ یہ کام صانع حکیم کا ہے، یہ کسی بشر کا کام نہیں اور نہ ہی ساحروں کے سحر اور تخیل سے ہے تو وہ سب اللہ پاک پر ایمان لے آئے اور اس کو سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے اور موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کی اور ان کی نبوت کو تسلیم کر لیا۔

﴿ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ''خَرُّوا وَسَقَطُوْا سَاجِدِیْنَ''۔ خرور کو القاء کے پیرایہ میں مشابہت کے طور پر ادا کیا ہے، اس لیے کہ اس کا ذکر القاآت کے ساتھ ہوا ہے اور اس لیے کہ انھوں نے جلدی سے سجدہ کیا تو گویا وہ ایسے ہو گئے کہ ڈال دیے گئے۔ کسی نے ان کو سجدے میں ڈال دیا اور وہ پکڑے گئے، پھر اپنے منہ کے بل گرا دیے گئے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ خرور کے بدلے میں جو القاء لایا گیا تو اس لیے کہ ماقبل سے مشابہ ہو جائے اور اس بات پر دلالت کرے کہ ساحروں نے جب دیکھا، جو کچھ کہ دیکھا تو وہ اپنی جان کے مالک نہ ہوئے، یعنی اس کو تھام نہ سکے اور گویا وہ پکڑ لیے گئے، پھر اپنے منہ کے بل ڈالے گئے اور اللہ پاک نے ان کو اس توفیق کے سبب سے جو اُن کو عطا فرمائی، حق کا اعتراف کرنے کا حوصلہ دیا۔[1]

امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس معنی کی بنا پر ''اُلْقِيَ'' میں استعارۂ تبعیہ ہے، مشابہت نے اس کو حسین کر دیا ہے، مجاز مرسل نہیں ہے، اگرچہ نظمِ قرآنی اس کی محتمل ہے اور شبہ کی وجہ بیان القا کے معنی کا عدمِ تمالک ہے۔[2] اور اس بات کا کہ اس کا فاعل کون ہے، اگر اس کی تصریح واقع ہو، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ بدلِ اشتمال ہے ''اُلْقِيَ'' سے، یا حال ہے باضمارِ ''قد''۔ ﴿ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴾ عطفِ بیان ہے ﴿ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کا۔ یا بدل ہے اس کی توضیح واشعار کے لیے کہ ان کے ایمان لانے کا سبب وہ شے ہوئی جو

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٣٨) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٢)

اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے ہاتھ پر جاری کی۔ ﴿ رَبِّ ﴾ کی اضافت ان کی طرف اس لیے کی کہ اس حالت میں اس دعوت پر قائم صرف وہی دونوں تھے۔ اس میں فرعون کو سرزنش اور تعجیز ہے، اس بات کے ساتھ کہ وہ رب نہیں ہے، جو حقیقی رب ہے تو وہ یہ ہے۔ غرض یہ کہ ساحروں نے سجدہ کرتے وقت یہ کہا کہ ہم تو رب العالمین پر ایمان لائے، جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا رب ہے۔ یہ اس لیے کہا ہے کہ وہ جان چکے تھے کہ جس شے کا انھوں نے عصا سے مشاہدہ کیا، یعنی رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل جانا، وہ سحر سے حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے: "أَصْبَحُوا سَحَرَةً وَأَمْسَوْا شُهَدَاءَ" [1] یعنی صبح کو تو ساحر تھے اور شام کو شہدا ہو گئے۔ بالجملہ جب فرعون نے ساحروں سے یہ بات سنی اور اللہ پاک کے لیے ان کا سجدہ کرنا دیکھا تو اس سے اور کچھ نہ بنا، مگر یہ بات جو اللہ پاک نے اس سے نقل فرمائی ہے: [2]

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ
عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ
وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا
لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا
رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾

فرعون نے کہا: میرے اجازت دینے سے پہلے تم نے اسے مان لیا، بے شک وہ تمھارا بڑا ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے، لہٰذا جلد تم جان لو گے، میں ضرور تمھارے ہاتھ اور پاؤں مخالف طرف سے کاٹ دوں گا اور تم سب کو ضرور سولی چڑھاؤں گا ﴿49﴾ وہ کہنے لگے: کوئی حرج نہیں، بے شک ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿50﴾ بے شک ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری خطائیں بخش دے گا، اس لیے کہ ہم پہلے ایمان لانے والے ہیں ﴿51﴾

فرعون کی دھمکی اور جادوگروں کی استقامت:

تمھارا بڑا رب کو کہا، یعنی موسیٰ علیہ السلام اور تم ایک استاد کے شاگرد ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فرعون نے ساحروں کو تہدید کی، ان کو ڈرایا دھمکایا، مگر اس نے ان میں کچھ فائدہ حاصل نہ کیا اور اُن کو وعید سنائی، مگر اس وعید نے بھی ان کے ایمان اور تسلیم اور فرماں برداری کو اور زیادہ بڑھایا۔ یہ اس لیے ہوا کہ ان کے دلوں سے کفر کا پردہ دور کر

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲٤۲۸)
[2] فتح البیان (۹/ ۳۷۵۔ ۳۷۸)

دیا گیا اور حق اُن پر اس طرح سے ظاہر ہو گیا کہ جس امر کو موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے ہیں، یہ کسی بشر سے صادر نہیں ہو سکتا، مگر اس صورت میں کہ اللہ پاک اس میں اس کی تائید کرے اور اس کو اس سچائی کے لیے حجت اور دلیل ٹھہرا دے، جس کو وہ اپنے رب کی طرف سے لے کر آیا ہے۔

ساحروں کی قوم تو اس بات سے جاہل رہی اور اُن کو یہ امر معلوم ہو گیا۔ اسی لیے فرعون نے ان سے یوں کہا کہ تم نے اس کو میرے اجازت دینے سے پہلے ہی مان لیا، یعنی چاہیے تو یوں تھا کہ تم نے جو کام کیا، اس کے لیے مجھ سے اذن مانگ لیتے اور میرے مشورے کے بغیر اس میں مجھ پر سبقت نہ کرتے، پھر اگر میں تم کو اجازت دے دیتا تو تم کرتے اور اگر منع کرتا تو باز رہتے، کیوں کہ وہ حاکم میں ہی ہوں جس کی اطاعت کی جاتی ہے، تم کو میری ہی اطاعت کرنا تھا۔

﴿ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ﴾ یعنی بے شک البتہ وہی تمھارا بڑا ہے، جس نے تم کو جادو سکھایا ہے، حالاں کہ یہ ایک ایسا مقابلہ و مکابرہ ہے، جس کو ہر شخص خوب جانتا ہے کہ باطل ہے، کیونکہ اس دن سے پہلے تو ساحر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جمع نہیں ہوئے تھے، ان سے پہلے سے ملاقات نہ تھی، پھر بھلا وہ کیوں کر ان کے بڑے ہونے لگے کہ انھوں نے ان کو سحر کرنا تعلیم دیا۔ یہ بات کوئی عقل مند نہیں کہہ سکتا۔ پھر فرعون نے ان کو ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سولی چڑھانے کی وعید سنائی تو وہ بولے: ﴿ لَا ضَیْرَ ﴾ یعنی کچھ حرج نہیں ہے، یہ بات ہم کو ضرر نہ پہنچائے گی اور نہ ہم اس کی کچھ پروا کرتے ہیں۔

﴿ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴾ یعنی ہمارا مرجع تو اللہ ہی کی طرف ہے اور وہ ضائع نہیں کرتا اس شخص کا اجر جس نے کوئی اچھا کام کیا، اور جو کچھ تو ہمارے ساتھ کر رہا ہے اس پر مخفی نہیں ہے اور وہ عن قریب ہم کو اس پر پوری پوری جزا دے گا۔ اسی لیے انھوں نے کہا: ﴿ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَآ ﴾ یعنی ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب بخش دے گا ہمارے گناہ جو ہم نے کیے ہیں اور وہ جادو جو تو نے ہم سے زبردستی کروایا ہے۔ ﴿ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ یعنی اس کے سبب سے کہ ہم نے اپنی قوم قبط سے ایمان لانے میں سبقت اور تیزی کی ہے۔ پھر ان سب کو قتل کر ڈالا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ تم نے اس کو میرے اذن کے بغیر مان لیا۔ یہ اس وقت کہا کہ اسے اپنی قوم پر اس بات کا ڈر ہوا کہ وہ ساحروں کی پیروی کر لیں گے، پھر جو ساحر ایمان لے آئے تھے، ان کو مغالطہ دیا اور لوگوں کو اس وہم میں ڈالا کہ موسیٰ علیہ السلام کا فعل اسی قسم کا سحر ہے۔ چنانچہ یوں کہا کہ وہ البتہ تمھارا بڑا ہے، جس نے تم کو سحر سکھایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے لیے جو اس نے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ جادوگروں کے بڑے ہیں، باوجود اس کے کہ اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کی اس شے کے ساتھ صفت کرے اور اس کا اقرار کرے، جس سے ان کی شان بلند ہو۔ اس

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٤٣)

کی وجہ یہ ہے کہ اس مناظرے کے وقت حاضر لوگوں میں سے ہر شخص یہ جان چکا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کام کیا، وہ اس سحر سے زیادہ غالب اور واضح تھا، جو ساحروں نے کیا۔

لہٰذا فرعون نے چاہا کہ لوگوں پر شک ڈالے، اس طرح سے کہ یہ جو تم نے مشاہدہ کیا ہے، اگرچہ یقینی طور پر ان ساحروں کے سحر سے بڑا کام ہے، مگر یہ بات کچھ تعجب کی نہیں ہے، کیوں کہ یہ ان کے بڑے کا فعل ہے اور اس شخص کا جو اُن کا استاد ہے، جس سے انھوں نے یہ جادو سیکھا ہے، لہٰذا تم مت خیال کرو کہ وہ ایسا فعل ہے جس پر بشر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اس رب کے فعل سے ہے جس کی طرف موسیٰ (علیہ السلام) بلا رہا ہے اور یہ نہ سمجھو کہ ساحر لوگ بصیرت اور ظہورِ حق کی بنا پر ایمان لائے ہیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام کا تم پر غلبہ کچھ اللہ کے معجزے کے سبب سے نہیں ہوا، بلکہ اس سحر کی وجہ سے ہوا ہے جو اس نے تم کو نہیں سکھایا اور تم اپنی ناقص عقل کے سبب سے یہ خیال کر بیٹھے کہ وہ تم پر سحر کے بغیر غالب ہو گیا، چنانچہ تم نے مان لیا۔

پھر فرعون نے ان ساحروں کو وعید سنائی کہ جو اللہ پاک پر ایمان لے آئے تھے، جب اللہ تعالیٰ کی حجت نے ان کو مغلوب کر دیا، کہا: ﴿ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾ پہلے صرف ان کو ہول میں ڈالنے کی دھمکی دی، یعنی تم نے اس کو مان تو لیا ہے، مگر اب تم معلوم کرو گے کہ میں کیا کچھ تم کو سزا دیتا ہوں اور جو کچھ تم نے کیا ہے اس کا وبال تم کو معلوم ہو جائے گا، اور میری طرف سے جو کچھ عذاب اور سزا تمھیں پہنچے گی، عن قریب تم اسے جان لو گے۔

پھر اس دھمکی کی تفصیل یہ بیان کی: ﴿ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ﴾ یعنی اس مخالفت کے سبب سے جو تم سے ظاہر ہوئی، میں البتہ تمھارے ہاتھ اور پاؤں کاٹوں گا۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہر ایک کا سیدھا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ گویا اس دھمکی سے عام لوگوں کو خوف دلانا چاہا، تا کہ ایمان میں اُن کی پیروی نہ کر بیٹھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو ہاتھ پاؤں کاٹنے کی اور سولی پر چڑھانے کی جو دھمکی دی تھی ان کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کچھ نہیں کیا۔ قرآن شریف میں یہ بات وارد نہیں ہوئی، جو اس پر دال ہو کہ یہ معاملہ ان کے ساتھ کیا، لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ ان سب کو قتل کر ڈالا۔[1] واللہ أعلم بما فعل بهم.

غرضیکہ ساحروں نے جب فرعون کی دھمکی سنی تو بولے: ﴿ لَا ضَيْرَ ﴾ یعنی ہم پر کچھ ضرر نہیں ہے، دنیا کے اس عذاب میں جو ہمیں لاحق ہو گا۔ امام ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لَا ضَيْرَ وَلَا ضَرَرَ وَلَا ضُرَّ" ایک ہی معنی میں ہیں۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے: "ضَارَهُ يَضُوْرُهُ وَيَضِيْرُهُ ضَيْرًا وَضَوْرًا أَيْ: ضَرَّهُ"۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے بعض کو یوں کہتے سنا ہے: "لَا يَنْفَعُنِيْ ذٰلِكَ وَلَا يَضُوْرُنِيْ"[2] امام ابوزید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لَا يَضِيْرُنَا الَّذِيْ تَقُوْلُ وَإِنْ صَنَعْتَ بِنَا وَصَلَبْتَنَا"، یعنی ہم کو وہ شے ضرر نہ دے گی جس کا تو کہتا ہے، اگرچہ تو وہ ہمارے ساتھ کر گزرے اور ہم کو سولی پر چڑھا دے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٤٣) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٩٨)

﴿ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴾ یعنی ہم اپنے رب کی طرف البتہ رجوع کرنے والے ہیں اور وہ ہمارا جزا دینے والا ہے، ہمارے صبر کرنے کے سبب سے تیری اس تکلیف پر جو تو ہمیں دے گا اور ہمارے اس کی توحید پر ثابت قدم رہنے کے سبب سے اور کفر سے بری ہونے کے سبب سے۔[1] (قاله أبو زيد) حاصل یہ ہے کہ دنیا کا عذاب ہمیں کچھ تکلیف پہنچانے والا نہیں، اس لیے کہ وہ زائل ہو جائے گا اور اس کے بعد ہمارے رب کی طرف رجوع ہونے سے کوئی چارہ نہیں ہے تو وہ ہمیشہ رہنے والی نعمتوں میں سے ہم کو وہ شے عطا کرے گا جس کی نہ کوئی حد ہو سکتی ہے نہ ہی اس کی صفت بیان ہو سکتی ہے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تکلیف نہ ہونے کی وجہ سے، یعنی ہمارا اس میں کوئی ضرر نہیں ہے، بلکہ ہمارے لیے اس میں عظیم فائدہ ہے، کیوں کہ ان تکالیف پر خالص اللہ پاک کی خاطر صبر کرنے میں ہم کو اپنی خطاؤں کی معافی اور عظیم ثواب حاصل ہوگا، اس کی وجہ سے ہمارے گناہ مٹا دیے جائیں گے اور ہم کو بڑا ثواب ملے گا۔ یا یہ معنی ہیں کہ جس قتل کی تو ہم کو وعید سناتا ہے، اس میں ہم پر کوئی ضرر نہیں ہے، کیوں کہ ہم کو اپنے رب کی طرف رجوع ہونا ہے، موت کے کسی بھی سبب کے ذریعے سے، اور قتل ہونا ان سب سے زیادہ آسان وارجیٰ (جس کا طمع کیا جائے) ہے۔[2]

﴿ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ ﴾ یعنی ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہم کو ہمارا رب ہماری خطائیں بخش دے، یعنی کفر اور جادو۔ پھر اس طمع کی وجہ یہ بیان کی: ﴿ اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾۔ کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ بفتح ہے اس بنا پر کہ اس کے شروع میں لام مقدر ہے، یعنی "لِأَنْ" یا حرفِ با، یعنی "بِأَنْ"۔ امام فراء اور کسائی رحمہما اللہ نے کسرہ اس بنا پر جائز رکھا ہے کہ مجازاۃ ہو۔ معنی یہ ہیں کہ ہم خطاؤں کی بخشش کی اس بنا پر اُمید رکھتے ہیں کہ ہم ان لوگوں میں سے پہلے ہیں جو معجزے ظاہر ہونے کے بعد قومِ فرعون میں سے ایمان لائے، یا ان لوگوں میں سے پہلے ہیں جو اہلِ مشہد میں سے ایمان لائے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومنین سے مراد ان کے زمانے کے مومنین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے زمانے کے ایمان لانے والوں میں سے پہلے یہی لوگ ہیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ مروی ہے کہ ان کے ساتھ چھے لاکھ اور ستر ہزار ایمان لائے، یہ وہی لوگ ہیں جن سے فرعون نے اپنے اس قول میں مراد رکھی ہے: ﴿ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴾[3] [الشعراء: ٥٤] "یقیناً یہ گروہ بہت ہی کم تعداد میں ہے۔" غرض یہ ہے کہ جب اس قدر اُن کے ساتھ ایمان لائے اور وہ اُن کے اہلِ زمان تھے تو پھر یہ کیسے اہلِ زمان کے اول مومنین ٹھہرے؟! سلیمان جمل نے کہا کہ بنی اسرائیل ان سے قبل ایمان لائے ہیں، حالاں کہ وہ ان کے زمانے میں ہیں۔ اسی لیے امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے: "أَيْ: مِنْ أَتْبَاعِ فِرْعَوْنَ أَوْ مِنْ أَهْلِ الْمَشْهَدِ"[4] (یعنی مجمع عام جس میں سب لوگ حاضر ہوئے تھے)۔ امام ابو زید رحمہ اللہ کا قول یہ

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٤٩)
[2] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٤٣)
[3] تفسير القرطبي (١٣/ ٩٨) فتح القدير (٤/ ١٣٣)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٣٩)

ہے: "كَانُوا كَذَالِكَ يَوْمَئِذٍ أَوَّلَ مَنْ آمَنَ بِآيَاتِهِ حِينَ رَأَوْهَا"[1] حاصل یہ ہے کہ بے کھٹکے بات یہی ہے کہ اتباعِ فرعون میں سے یا اس مجمعِ عام میں سے پہلے یہی لوگ ایمان لائے ہیں۔[2] واللّٰہ أعلم.

وَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡۤ اِنَّكُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۵۲﴾
فَاَرۡسَلَ فِرۡعَوۡنُ فِى الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِيۡنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ لَشِرۡذِمَةٌ
قَلِيۡلُوۡنَ ﴿۵۴﴾ وَ اِنَّهُمۡ لَنَا لَغَآئِظُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَ اِنَّا لَجَمِيۡعٌ حٰذِرُوۡنَ ﴿۵۶﴾
فَاَخۡرَجۡنٰهُمۡ مِّنۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوۡزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيۡمٍ ﴿۵۸﴾
كَذٰلِكَ ؕ وَاَوۡرَثۡنٰهَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۵۹﴾

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ تو میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل چل، بلاشبہ تمھارا تعاقب کیا جائے گا(52) پھر فرعون نے شہروں میں اکٹھا کرنے والے بھیجے(53) (یہ پیغام دے کر کہ) بے شک یہ (بنی اسرائیل) تھوڑی سی جماعت ہے(54) اور بلاشبہ وہ ہمیں غصہ دلانے والے ہیں(55) اور بلاشبہ ہم ہر وقت چوکنّے رہنے والے ہیں(56) چناں چہ ہم نے ان (فرعونیوں) کو باغوں اور چشموں سے نکالا(57) اور خزانوں اور بہترین قیام گاہوں سے(58) اسی طرح ہوا، اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث بنایا(59)

موسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے ہجرت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام کا قیام بلادِ مصر میں دراز ہوا اور وہاں اللہ پاک کی حجتیں اور براہنیں فرعون پر اور اس کے سرداروں پر قائم کیں اور حجت قائم ہونے کے باوجود وہ لوگ دشمنی اور تکبر و مقابلہ کرتے رہے تو اب اُن کے لیے سوائے عذاب اور سزا اور وبال کے کچھ باقی نہ رہا۔ چنانچہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ رات کے وقت بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جائیں اور ان کو وہاں لے چلیں، جہاں ان کو حکم ہو۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے وہی کام کیا، جس کا اللہ عزوجل نے ان کو حکم کیا تھا۔ وہ ان کو نکال کر لے گئے، اس کے بعد کہ انھوں نے فرعون کی قوم کے لوگوں سے بہت سا زیور عاریتاً لے لیا تھا۔ بہت سے مفسروں نے جو ذکر کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ ان کا بنی اسرائیل کو نکال کر لے جانا طلوعِ قمر کے وقت تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اس رات چاند گہن ہو گیا تھا۔ واللّٰہ أعلم.

موسیٰ علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی قبر کا پوچھا تو بنی اسرائیل کی ایک بڑھیا نے ان کو وہ قبر بتا دی۔ چنانچہ انھوں نے

[1] تفسیر الطبري (۱۹/ ۳۴۹) [2] فتح البیان (۹/ ۳۷۸۔ ۳۸۰)

ان کا تابوت اپنے ساتھ اُٹھا لیا۔ کہتے ہیں کہ خود انھوں نے اس کو اٹھا لیا۔ یوسف علیہ السلام نے اس کی وصیت کی تھی کہ جس وقت بنی اسرائیل نکلیں تو اس کو اپنے ساتھ لے جائیں۔[1]

یہ بات ایک حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کو سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک اعرابی کے گھر پر تشریف لے گئے تو اس نے آپ کا اکرام کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: « تَعَاهَدْنَا » یعنی تو ہم سے اس بات کا عہد کر کہ ہم سے ملاقات کرے، پھر وہ اعرابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ تیری کیا حاجت ہے؟ تو وہ بولا کہ ایک اونٹنی پالان کے ساتھ اور ایک بکری کہ میرے گھر والے اس کا دودھ دوہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تو اس سے عاجز ہوا کہ بنی اسرائیل کی بڑھیا کی طرح ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے عرض کی: یا رسول اللہ! بنی اسرائیل کی بڑھیا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب ارادہ کیا کہ بنی اسرائیل کو لے چلیں تو راستہ بھول گئے۔

چنانچہ بنی اسرائیل سے کہا: یہ کیا ہے؟ تو بنی اسرائیل کے علماء نے کہا ہم آپ سے بیان کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو جس وقت وفات حاضر ہوئی تو انھوں نے ہم سے اللہ کا پکا عہد لیا تھا کہ ہم جب بھی مصر کو چھوڑ کر نکلیں تو اپنے ساتھ ان کے تابوت کو اُٹھا لے جائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: پھر تم میں سے کون جانتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟ تو وہ بولے کہ اسے صرف بنی اسرائیل کی ایک بڑھیا ہی جانتی ہے۔ پھر اس کی طرف آدمی بھیجا اور کہلا بھیجا کہ تو مجھے یوسف علیہ السلام کی قبر بتا دے تو وہ بولی کہ میں نہ بتاؤں گی، یہاں تک کہ تو مجھے میرا حکم عطا کرے، اس سے کہا کہ تیرا حکم کیا ہے؟ اس نے کہا: میرا حکم یہ ہے کہ میں تمھارے ساتھ جنت میں ہوں۔ یہ بات گویا ان پر گراں گزری تو ان سے کہا گیا کہ آپ اسے اس کا حکم عطا کریں۔ کہا: پھر وہ ان کے ساتھ ایک بحیرہ کی جگہ کی طرف چلی، یعنی پانی جمع ہونے کی جگہ۔ پھر ان سے کہا کہ اس پانی کو خشک کرو، پھر جب اس کو خشک کر دیا تو کہا کھودو! پھر جب کھودا تو یوسف علیہ السلام کی قبر کو نکال لیا، پھر جب اس کو نکال لیا تو اسی وقت راستہ روشن دن کی طرح ہو گیا۔[2] یہ حدیث شریف انتہائی غریب ہے۔ قریب تر بات یہ ہے کہ موقوف ہے۔ واللّٰه أعلم.

پھر جب فرعون والے صبح کو اُٹھے تو حال یہ تھا کہ ان کی مجلس میں نہ کوئی پکارنے والا تھا نہ کوئی جواب دینے والا، یعنی بنی اسرائیل کے چلے جانے کے بعد علاقہ سنسان ہو گیا تھا۔ اس حالت نے فرعون کو غضب ناک کیا اور اسے بنی اسرائیل پر سخت غصہ آیا، اس لیے کہ اللہ پاک اس کو ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پھر اس نے اپنے شہروں میں جلدی سے اپنے ہرکارے بھیجے، یعنی وہ لوگ جو لشکر کو جمع کریں، مثلاً: نقیب اور حاجب کی طرح لوگوں کو اکٹھا کریں اور ان میں یہ اعلان کیا کہ یہ لوگ یعنی بنی اسرائیل، البتہ ایک قلیل سی جماعت ہے۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٦٨_ ٢٧٦٩) [2] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٣٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣١٣)

﴿ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴾ یعنی ہم کو ہر وقت ان سے وہ شے پہنچے گی، جو ہم کو غصہ دلائے گی۔ ﴿ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴾ یعنی ہم ہر وقت ان کی غائلہ سے حذر کرتے ہیں، یعنی ان کی بلا اور سختی سے ڈرتے ہیں۔ سلف میں سے ایک گروہ نے ''حذِرُوْنَ'' پڑھا ہے، یعنی مستعد بسلاح ہیں، یعنی ہر وقت ان کے ڈر سے ہتھیار باندھے تیار رہتے ہیں۔ ''وَإِنِّي أُرِيدُ أَنْ أَسْتَأْصِلَ شَأْفَتَهُمْ وَأُبِيدَ خَضْرَاءَهُمْ'' فرعون نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کا بالکل استیصال کر دوں، ان کو جڑ سے اُکھاڑ دوں۔ (شافہ ایک سوزش ناک پھوڑا ہے جو قدم کے نیچے ہوتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''اِسْتَأْصَلَ اللّٰهُ شَأْفَتَهُ'' یعنی اللہ اس کا استیصال کرے، جیسے: شافہ کا داغ دینے سے استیصال کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو اور اُن کی کھیتی وغیرہ سب کو ستیاناس کر دوں کہ ان کا نام ونشان باقی نہ رہے)۔ فرعون جس بات کا بنی اسرائیل کے ساتھ ارادہ کرتا تھا، اس کے ساتھ خود اس کو اور اس کے لشکر کو جزا دی گئی۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿57﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴾۔ یعنی پھر وہ اس نعیم سے جحیم کی طرف نکلے اور یہ بلند بلند منزلیں اور پھلوں کے باغات اور جاری نہریں اور ملک اور جاہ وجلال اور اموال اور طرح طرح کے وافر رزق دنیا میں چھوڑ گئے۔

﴿ كَذٰلِكَ ۚ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۚ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ۚ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٣٧] ''اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کے مشرق اور مغرب کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔ اور (اے نبی! اس طرح) بنی اسرائیل کے حق میں آپ کے رب کا اچھا وعدہ پورا ہوا، اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا تھا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ تباہ کر دیا جو (کارخانے) وہ بناتے اور جو (محلات کی عمارتیں) وہ اٹھاتے تھے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿5﴾ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴾ [القصص: ٥۔ ٦] ''اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں زمین میں ضعیف جان (کر دبا) لیا گیا تھا اور انھیں پیشوا بنائیں اور انھیں (ملک مصر کے) وارث بنائیں۔ اور (یہ کہ) ہم انھیں زمین (شام و فلسطین) میں اقتدار بخشیں اور ہم فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکروں کو ان (کمزور لوگوں کے ہاتھوں) سے وہ چیز دکھائیں، جس سے وہ ڈرتے تھے۔''[1]

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٤٣۔ ٤٤٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو رات کے وقت دریا کی طرف لے چلیں نہ کہ شام کی طرف جانے والے خشکی کے راستے کی طرف۔ یہ قصہ ساحروں کے ایمان لانے کے کئی سال بعد ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا نام "عِبَادِيْ" رکھا، اس لیے کہ وہ ایمان لائے تھے موسیٰ علیہ السلام پر اور اس شے پر جس کو وہ لے کر آئے تھے۔ اس قسم کی تفسیر سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔[1]

جملہ ﴿ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴾ اگلے امر کی وجہ ہے، یعنی تو بنی اسرائیل کو لے نکل اس لیے کہ فرعون اور اس کی قوم تمھارے پیچھے آئے گی تاکہ تم کو واپس لے جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ تو ان کو لے چل یہاں تک کہ جب وہ صبح کے وقت تمھارے پیچھے آئیں گے تو تم کو ان پر تقدم حاصل ہو گا اس طرح سے کہ وہ تمھیں دریا پر پہنچنے سے پہلے نہ پائیں گے، بلکہ وہ تمھارے پیچھے ہوں گے، اس طرح سے کہ تم دریا میں داخل ہو گے تو وہ بھی تمھارے داخل ہونے کی جگہوں میں داخل ہوں گے۔ پھر میں دریا کو ان پر ملا دوں گا اور ان کو ڈبو دوں گا۔ غرضیکہ جس وقت فرعون کو بنی اسرائیل کے نکل جانے کی خبر پہنچی تو اس نے شہروں میں جمع کرنے والے لوگ بھیجے کہ جن جگہوں مین اس کے اتباع و فرماں بردار لوگ ہیں، ان سب لشکروں کو جمع کر کے لے آئیں۔ پھر جب یہ لوگ فرعون کے پاس جمع ہو گئے تو اُن سے کہا کہ ﴿ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴾ یعنی یہ بنی اسرائیل ایک تھوڑی سی جماعت ہے۔ "شرذمة" ایک حقیر اور قلیل جماعت کو کہتے ہیں، اس کی جمع "شراذم" ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "شرذمة" آدمیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے اور کسی شے کے ٹکڑے کو بھی "شرذمة" کہتے ہیں۔

"ثَوْبٌ شَرَاذِمُ أَيْ: مُتَقَطِّعٌ" امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "شرذمة" کو "عُصْبَةٌ قَلِيْلَةٌ وَقَلِيْلُوْنَ وَكَثِيْرَةٌ وَكَثِيْرُوْنَ" بولتے ہیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "شرذمة" لوگوں کا ایک قطعہ ہے، جو کثیر نہیں ہے۔ اس کی جمع "شراذم" ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسروں نے کہا: فرعون نے جس شرذمہ کو قلیل کہا، وہ لوگ چھے لاکھ آدمی تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں[2] اور فرعون کے ساتھیوں کا شمار نہیں کیا جاتا۔[3]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ شرذمۃ قلیل چھے لاکھ ستر ہزار تھے۔[4] امام محلی رحمہ اللہ نے یہی قول ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ فرعون کا مقدمۃ الجیش سات لاکھ آدمی تھے۔ اس نے اپنے لشکر کی کثرت کے لحاظ سے بنی اسرائیل کو قلیل کہا۔[5] اس کا پورا لشکر لاکھوں تھا۔ امام عبد بن حمید اور ابن منذر رحمہما اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] رقم الآية (١١٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٧١) [3] فتح القدير (٤/ ١٣٤)

[4] تفسير الطبري (١٩/ ٣٥١) [5] تفسير الجلالين (١/ ٤٨٤)

سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اصحابِ موسیٰ علیہ السلام جو دریا سے پار ہوئے بارہ سبط تھے، ہر راہ میں بارہ ہزار تھے، سب کے سب یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھے۔

نیز امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ کا دشمن جس جگہ اللہ پاک نے اس کو غرق کیا، وہ اور اس کے ساتھی ستر سردار اور ہر سردار کے ساتھ ستر ہزار اور تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جس جگہ سے دریا عبور کیا، وہاں ان کے ساتھ ستر ہزار تھے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قصہ بہ سندِ واہی (کمزور ترین) مروی ہے۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قومِ فرعون کے طلائع (جاسوس) جن کو بنی اسرائیل کے پیچھے بھیجا تھا چھے لاکھ تھے۔ وہ سب کے سب ایک ہی رنگ کے گھوڑوں پر سوار تھے۔[2] فتح القدیر و فتح البیان میں فرمایا ہے کہ یہ اقوال اور روایات مضطرب ہیں۔ سلف کے بہت سے لوگوں سے ان سے ملتی جلتی مضطرب اور مختلف روایات مروی ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی نبی ﷺ سے صحیح ثابت نہیں ہے۔[3]

﴿ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴾ محاورے میں بولتے ہیں: "غَاظَنِيْ كَذَا وَأَغَاظَنِيْ وَالْغَيْظُ: الْغَضَبُ" یعنی فلاں شخص نے مجھے غضبناک کیا۔ اسی معنی سے "تغیظ" اور "اغتیاظ" ہے، یعنی انھوں نے میرے اذن کے بغیر نکل کر ہمیں خشمناک کیا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اس شے کو کرنے والے ہیں جو ہم کو غیظ و غضب میں لائے۔[4] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اس سبب سے کہ انھوں نے ہمارے دین کی مخالفت کی، ہمارے مال لے گئے جو عاریتاً لیے تھے، ہماری کنواریوں کو قتل کیا اور ہمارے اذن کے بغیر ہماری زمین سے نکل گئے۔[5]

﴿ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴾ اس کو "حَذِرُون" اور "حَذُرُون" بھی پڑھا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حاذر" وہ شخص ہے جو تجھ سے ابھی ڈرتا ہے اور "حذر" وہ ہے جو اسی طرح سے پیدا ہوا ہے کہ تو جب بھی اس سے ملے تو وہ ڈرنے والا ہے، یعنی پیدائشی ڈرپوک۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حاذر" مستعد کو کہتے ہیں اور "حذر" متیقظ کو، یعنی بیدار ہوشیار چوکنا۔ یہی قول امام کسائی اور محمد بن یزید مبرد رحمہم اللہ کا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حذرون" مدنیوں کی قراءت ہے اور ابو عمرو کی اور "حاذرون" اہلِ کوفہ کی قراءت ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ "حَذِرُون" اور "حَذُرُون" کے ایک معنی ہیں۔ یہی قول سیبویہ کا بھی ہے۔[6]

کلمۂ "جمیع" الفاظِ تاکید میں سے نہیں ہے کہ یہ بات لازم آئے کہ تاکید کے الفاظ مستعمل نہیں ہوتے مگر بطور تبعیت کے، بلکہ جمیع بہ معنی جماعت ہے۔ معنی یہ ہیں کہ بے شک البتہ ہم ایک جماعت ہیں کہ حذر اور بچاؤ کرنا اور

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٩٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٦٩) [3] فتح القدير (٤/ ١٣٧)
[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٨٤) [5] تفسير الخازن (٥/ ١١٨) [6] فتح القدير (٤/ ١٣٤۔ ١٣٥)

معاملات میں احتیاط کا استعمال کرنا، ہماری عادت ہے۔ یعنی ہم کاموں میں دور اندیشی کا برتاؤ کیا کرتے ہیں۔ فرعون نے یہاں تین فقرے ذکر کیے ہیں۔ پہلے یہ کہا کہ ﴿ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴾ اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ لوگ تو تھوڑے سے ہیں، ان کی کچھ شان وشوکت اور دبدبہ نہیں ہے کہ وہ ان کا پیچھا کرنے کی رکاوٹ ہو۔

غرض یہ ہے کہ اپنے لوگوں کو ان کا پیچھا کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور ان کی حقارت بیان کرتا ہے کہ وہ تو ایک ذرا سی جماعت ہے، تاکہ یہ لوگ ان کی شوکت دیکھ کر بزدل نہ ہو جائیں۔ دوسرا فقرہ یہ ہے: ﴿ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴾ اس میں ان لوگوں کی سخت عداوت کی طرف اشارہ کیا، جس کی طرف اپنے لوگوں کو بلا رہا ہے۔ غرض یہ ہے کہ وہ ہمارے بڑے دشمن ہیں، ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے ہم کو غصہ آتا ہے تو تم ان کو خوب اچھی طرح تلاش کرو اور ان کا پیچھا کرو۔ تیسرا فقرہ یہ ہے: ﴿ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴾ اس میں اشارہ کیا ہے کہ ان کی شان میں بیداری و ہوشیاری کرنا واجب ہے، اس سے غرض ان کو ہوشیاری پر آمادہ کرنا ہے، یا یہ کہہ کر اہلِ مداین سے، یعنی جن لوگوں کو شہروں سے بلا کر اکٹھا کیا تھا، عذر کیا ہے کہ میں جو اس قدر اہتمام کر رہا ہوں تو یہ کسی خوف کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ احتیاط اور دور اندیشی ہم لوگوں کی عادت ہے۔ غرض یہ کہ کہیں اس سے ان لوگوں کو یہ خیال اور گمان نہ ہو جائے کہ اس کی سلطنت کمزور ہوگئی ہے۔ یہ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے مضمون کا حاصل ہے۔[1]

﴿ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝57 وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴾ یعنی پھر ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو نکالا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے نکلنے کا داعیہ اور سبب پیدا کر دیا تو وہ مذکورہ اشیاء کو چھوڑ کر زمینِ مصر سے نکلے، تاکہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم سے جا ملیں۔ ﴿ جَنّٰتٍ ﴾ جمع "جنت" ہے بہ معنی باغ۔ ﴿ عُيُوْنٍ ﴾ جمع "عین" ہے، جس کے معنی چشمہ ہے۔ ﴿ كُنُوْزٍ ﴾ جمع "کنز" ہے بہ معنی خزانہ۔ باغ تو دریائے نیل کے دونوں جانب تھے اسوان سے رشید تک۔ جمہور مفسرین کے نزدیک ﴿ عُيُوْنٍ ﴾ سے مراد پانی کے چشمے ہیں تو نہریں اس کے تحت میں داخل ہو گئیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ عُيُوْنٍ ﴾ سے مراد وہ نہریں ہیں جو گھروں میں بہتی تھیں۔ نیل سے کاٹ کر ان کو لائے تھے۔[2] ﴿ كُنُوْزٍ ﴾ سے مراد خزانے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دفینے۔ کسی نے کہا ہے کہ نہریں۔

اس قول میں نظر ہے، کیوں کہ جب ﴿ عُيُوْنٍ ﴾ سے مراد جمہور کے نزدیک پانی کے چشمے ٹھہرے تو نہریں خود اس کے تحت میں آ گئیں، جس طرح کہ پہلے مذکور ہوا۔ پھر کیا ضرورت کہ ﴿ كُنُوْزٍ ﴾ سے مراد نہریں لی جائیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كُنُوْزٍ ﴾ سے مراد ظاہری مال ہیں، یعنی سونا چاندی، کیوں کہ ان میں سے اللہ پاک کا حق ادا نہیں کیا گیا، اس لیے ان کا نام کنوز رکھ دیا۔[3] امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كُنُوْزٍ ﴾ سے مراد یا تو وہ مال ہیں جو زمین کے نیچے ہیں۔ ان کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ جو مال زمین کے اوپر ہے، وہ تو منطمس ہوگیا (مٹ گیا)۔

[1] تفسیر البيضاوي (٤/ ٢٣٩_ ٢٤٠) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٨٤) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٨٤)

یا مراد مطلق مال ہے، جس سے اللہ کا حق ادا نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کو کنز کہتے ہیں۔ پہلا قول لغت کے زیادہ تر موافق ہے اور دوسرا قول سلف سے مروی ہے تو اب اس جگہ زبردستی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[1]

﴿ مَقَامٍ كَرِيمٍ ﴾ میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد منازل حسان ہیں، یعنی خوبصورت بارونق پر تکلف مکانات۔ کسی نے کہا ہے کہ منابر ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ (یہی قول سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ ہزار جباروں کے ہزار منبر تھے، ان پر فرعون کی اور اس کے ملک کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ كذا في القرطبي) کسی نے کہا ہے کہ رؤسا و امراء واور وزراء کی مجلسیں ہیں۔ اس قول کو ابن عیسیٰ نے بیان کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مرابطِ خیل، یعنی جائے بستن اسپان۔ مراد گھوڑوں کے تھان ہوئے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: میں نے سنا ہے کہ ﴿ مَقَامٍ كَرِيمٍ ﴾ فیوم ہے[2] (فیوم بہ فتحِ فا و تشدیدِ تحتانی مصر کی ایک جگہ ہے۔ شاید مصباح لغت کے مصنف اسی جگہ کے ہوں)۔ ﴿ كَذَٰلِكَ ﴾ احتمال ہے کہ محلِ نصب میں ہو: "أَيْ: أَخْرَجْنَاهُمْ مِثْلَ ذٰلِكَ الْإِخْرَاجِ الَّذِيْ وَصَفْنَا"، یعنی ہم نے ان کو نکالا، اس نکالنے کی طرح جس کا وصف ہم نے بیان کیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ محلِ جر میں ہو، بنا بر وصفیت مقامِ کریم سے، یعنی "مَقَامٌ كَرِيْمٌ مِثْلُ ذٰلِكَ الْمَقَامِ الَّذِيْ كَانَ لَهُمْ"، یعنی ہم نے ان کو مقامِ کریم سے نکالا، جو اس مقام کی طرح تھا جو اُن کے لیے تھا۔ محلِ رفع میں بھی ہو سکتا ہے، اس بنا پر کہ خبر ہو مبتدائے محذوف کی: "أَيْ: إِخْرَاجُنَا كَمَا وَصَفْنَا أَوِ الْأَمْرُ كَذٰلِكَ"، یعنی نکالنا ہمارا ویسا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا، یا حال ایسا ہے جیسا ہم نے بیان کیا۔

﴿ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴾ معطوف ہے ﴿ فَأَخْرَجْنَاهُمْ ﴾ پر، یعنی ہم نے ان سب چیزوں کا مالک بنی اسرائیل کو کر دیا، فرعون اور اس کی قوم کو غرق کرنے کے بعد۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب بنی اسرائیل نہر کے پار ہو گئے تو واپس لوٹے اور اُن کے گھر، مال، باغ اور چشمے سب لے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ وراثت سے اس جگہ وہ زیور مراد ہے جو فرعون والوں سے عاریتاً لیا تھا۔ اللہ پاک کے حکم سے بنی اسرائیل اس کے وارث ہو گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے خوبصورت گھر اور خزانے کے وارث ہو گئے۔ الحمد للہ کہ یہ دونوں امر ان کے لیے کر دیے گئے۔[3]

فَأَتْبَعُوهُمْ مُشْرِقِينَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا تَرَاءَى الْجَمْعَانِ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ
إِنَّا لَمُدْرَكُونَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا ۖ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾
فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانْفَلَقَ
فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾ وَأَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِينَ ﴿٦٤﴾

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٤) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ١٠٤) [3] فتح البيان (٩/ ٣٨٠۔ ٣٨٣)

وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿٦٥﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٦﴾
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٦٧﴾ وَاِنَّ
رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٦٨﴾

چناں چہ سورج نکلتے ہی انھوں (فرعونیوں) نے ان کا پیچھا کیا 60 پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو اصحابِ موسیٰ کہنے لگے: یقیناً ہم تو پکڑے گئے 61 موسیٰ نے کہا: ہرگز نہیں! بلاشبہہ میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ضرور میری راہنمائی کرے گا 62 تب ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا سمندر پر مار، تو وہ پھٹ گیا، پھر (سمندر کا) ہر ٹکڑا بہت بڑے پہاڑ کی طرح ہوگیا 63 اور ہم وہاں دوسروں (فرعونیوں) کو قریب لے آئے 64 اور ہم نے موسیٰ اور جو اس کے ہمراہ تھے، سب کو بچالیا 65 پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا 66 بلاشبہہ اس میں عظیم نشانی ہے، اور ان کے اکثر مومن نہیں ہیں 67 اور بے شک آپ کا رب، وہی ہے غالب، بہت رحم کرنے والا 68

فرعون کے موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا کرنے اور غرق ہونے کا بیان:

ایک رات اللہ کے حکم سے شہرِ مصر میں وبا پڑی، ہر گھر میں بڑا بیٹا مر گیا اور بنی اسرائیل کو آگے سے حکم تھا کہ تیار رہیں، اس رات میں نکل کھڑے ہوئے۔ پھر ان کو ماتم میں کئی دن لگے، آخر فرعون کی تاکید سے سب نکل کر پیچھے لگے دریائے قلزم پر جا ملے۔ دریا پھٹ گیا، پانی بہت گہرا تھا، بارہ جگہ سے پھٹ کر گلیاں بن گئیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے اس میں سے گزرے، پانی کے پہاڑ کھڑے رہ گئے۔ آپ کا رب بڑا غالب ہے۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا دیا کہ مکہ کے فرعون بھی مسلمانوں کے پیچھے نکلیں گے لڑنے کے لیے، پھر بدر کے دن وطن سے باہر تباہ ہوں گے، جیسے فرعون تباہ ہوا۔ انتہٰی

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسروں میں سے غیر واحد نے ذکر کیا ہے کہ فرعون ایک محفلِ عظیم اور بڑے اجتماع کے ساتھ نکلا۔ یہ مجمع دیارِ مصر کے اس وقت کے اہلِ حل و عقد، سرکاری اہلکار، امراء، وزراء، کبراء، روساء اور جنود سے مل کر بنا تھا۔ غرض یہ ہے کہ فرعون جس مجمع کو لے کر نکلا، وہ لوگ سلطنتِ مصر کے حکام و وزیر و امیر اور بندوبست کرنے والے تھے۔ رہی یہ بات کہ غیر واحد نے اسرائیلیات سے جو ذکر کیا ہے کہ وہ لاکھوں سواروں (سولہ لاکھ سواروں) میں نکلا، ان میں سے ایک لاکھ سیاہ گھوڑوں پر تھے، مگر اس قول میں نظر ہے۔

کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان میں آٹھ لاکھ سیاہ گھوڑے تھے، اس میں بھی نظر ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ بات بنی اسرائیل کے مجازفات سے ہے، (یعنی بطور تخمینے کے ہے، تحقیقی نہیں ہے۔ واللہ سبحانهٗ و تعالی أعلم)۔

قرآن شریف نے جس بات کی خبر دی ہے، وہی نافع ہے۔ اس نے ان کی گنتی اور تعداد کو متعین نہیں کیا، اس لیے کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو سب کے سب جمع ہو کر نکلے۔

﴿ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴾ یعنی فرعون والے بنی اسرائیل کی طرف طلوعِ آفتاب کے وقت پہنچے۔ ﴿ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ ﴾ یعنی پھر جب دونوں فریق نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہنے لگے: ﴿ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴾ یعنی ہم تو پکڑے گئے۔ یہ اس لیے کہا کہ بنی اسرائیل دریائے قلزم کے کنارے پر آ کر ٹھہر گئے تھے، کیوں کہ آگے جا نہیں سکتے تھے۔ دریا ان کے آگے تھا اور فرعون اپنے لشکر کے ساتھ ان کے پیچھے سے آ پہنچا تھا۔

﴿ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴾ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم جس بات کا خوف کرتے ہو، اس میں سے تم کو کچھ بھی نہ پہنچے گا، کیوں کہ اللہ پاک ہی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اس جگہ لے چلوں اور اللہ پاک وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ ہارون علیہ السلام مقدمۃ الجیش میں تھے اور ان کے ساتھ یوشع بن نون یا مومن آلِ فرعون تھا اور موسیٰ علیہ السلام ساقۂ لشکر میں تھے، یعنی آخری حصے میں۔ مفسرین میں سے غیر واحد نے ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل ٹھہر گئے، وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کریں۔ یوشع بن نون یا آلِ فرعون کا مومن موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: اے اللہ کے نبی! تمھارے رب نے تم کو حکم دیا ہے کہ اس جگہ چلو؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ اب تو فرعون اور اس کے لشکر اور بھی قریب آ گئے اور بالکل تھوڑا سا فاصلہ باقی رہ گیا۔

اس وقت اللہ پاک نے اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کو حکم کیا کہ اپنے عصا سے دریا کو ماریں تو اس کو مارا اور کہا: پھٹ جا اللہ کے اذن سے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب کہ دریا کی طرف پہنچے تو یہ دعا کی: "يَا مَنْ كَانَ قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ، وَالْمُكَوِّنُ لِكُلِّ شَيْءٍ، وَالْكَائِنُ بَعْدَ كُلِّ شَيْءٍ، اِجْعَلْ لَنَا مَخْرَجًا" یعنی اے وہ ذات! جو تھا قبل ہر شے کے، ہست کرنے والا ہر شے کا اور باقی رہنے والا ہر شے کے بعد! تو کر دے، ہمارے واسطے نکلنے کی جگہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے عصا سے دریا کو مار۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس رات اللہ نے دریا کی طرف یہ وحی کی کہ جس وقت تجھے موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا سے مارے تو تو اس کی بات سننا اور اطاعت کرنا، اس لیے دریا نے وہ رات اس حال میں بسر کی کہ اس کو اضطراب تھا، وہ جانتا نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کس طرف سے اسے ماریں گے، پھر جب وہ دریا کی طرف پہنچے تو اُن سے ان کے جوان یوشع بن نون نے عرض کی: یا نبی اللہ! آپ کے رب عزوجل نے آپ کو کیا حکم دیا ہے؟ کہا: مجھے تو یہ حکم دیا ہے کہ میں دریا کو ماروں۔ یوشع نے عرض کی کہ پھر تم اس کو مارو۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو بات مجھ سے ذکر کی گئی ہے، اس میں یہ ہے کہ اللہ نے دریا کی طرف وحی کی کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا سے تمھیں ماریں تو تو اُن کے لیے پھٹ جانا۔ کہا: دریا نے رات اس حال

میں کاٹی کہ مضطرب ہو رہا تھا اور بعض اس کا بعض کو، اللہ پاک کے خوف سے اور اس حکم کے انتظار میں جو اللہ نے اس کو دیا تھا، مارتا تھا۔ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اپنا عصا دریا کو مار، انھوں نے اس سے دریا کو مارا۔ عصا میں اللہ پاک کا سلطان تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا، چنانچہ دریا پھٹ گیا۔[1] غیر واحد نے یہ ذکر کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام دریا کے پاس آئے۔ پھر کہا: پھٹ جا عصا کے مارنے پر اللہ کے اذن سے۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴾ یعنی بڑے پہاڑ کی طرح۔ یہ سیدنا عبداللہ بن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم، امام محمد بن کعب، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے: "هُوَ الْفَجُّ بَيْنَ الْجَبَلَيْنِ" یعنی طَود سے مراد دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ راہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ دریا میں بارہ راستے بن گئے، ہر سبط کے لیے ایک راہ۔[2] امام سدی رحمہ اللہ نے اس قدر زیادہ کہا ہے: اور اس میں طاق ہو گئے کہ بعض ان کا بعض کی طرف دیکھتا تھا اور پانی اپنے طور پر دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا اور اللہ پاک نے ہوا کو دریا کی تہہ کی طرف بھیجا تو اس نے اس کو خشک کر دیا تو وہ روئے زمین کی طرح خشک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴾ [طٰهٰ: ٧٧] "پھر ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنا، جبکہ تجھے نہ تو پکڑے جانے کا خوف ہوگا اور نہ (ڈوبنے کا) ڈر۔"

اور اس قصے میں فرمایا ہے: ﴿ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴾۔ ﴿ ثَمَّ ﴾ کے معنی "هُنَالِكَ" ہیں، یعنی اس جگہ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عطاء خراسانی، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے: "أَزْلَفْنَاهُمْ" کے یہ معنی ہیں کہ قریب کیا ہم نے دریا سے فرعون کو اور اس کے لشکروں کو۔[3] اور نزدیک کیا ہم نے ان کو اس کی طرف اور نجات دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اور اُن کو جو اُن کے ساتھ تھے، سب کے سب۔ ﴿ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴾ یعنی نجات دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اور ان کو جنھوں نے اُن کے دین پر ان کی پیروی کی۔ ان میں سے کوئی ہلاک نہ ہوا اور فرعون کو اور اس کے لشکروں کو ڈبو دیا، ان میں سے کوئی بھی باقی نہ بچا، سب ہلاک ہو گئے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو فرعون کو اس کی خبر پہنچی، اس نے ایک بکری کا حکم دیا تو وہ ذبح کی گئی اور کہا: "لَا وَاللّٰهِ!" (اصل روایت میں اسی طرح ہے، مگر وہ تو اللہ کا منکر تھا خود کو اللہ کہتا تھا، اس نے اللہ کی قسم کس طرح کھائی؟ ہاں یوں ہو سکتا ہے کہ گویا خود اس نے اپنی قسم کھائی۔ واللہ أعلم)۔ اس کا چمڑہ اتارنے سے پہلے پہلے میرے پاس چھے لاکھ قبطی جمع ہو جائیں۔

پھر موسیٰ علیہ السلام چلے، یہاں تک کہ دریا کے پاس پہنچے اور اس سے کہا پھٹ جا تو دریا نے ان سے کہا: اے موسیٰ!

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٧١_ ٢٧٧٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٧٣_ ٢٧٧٤)

[3] تفسير الطبري (١٩/ ٣٥٩) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٧٤)

البتہ مقرر تو نے تکبر کیا، آیا میں کسی ابن آدم کے لیے پھٹا ہوں کہ میں تیرے لیے پھٹ جاؤں؟! کہا: اور موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ ایک شخص اپنے گھوڑے پر سوار تھا، اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! تم کہاں حکم کیے گئے ہو؟ کہا: میں نہیں حکم کیا گیا، مگر بایں طور یعنی، دریا۔[1] (مطلب یہ ہے کہ مجھے دریا کے مارنے کا حکم ہے، یہاں وہاں کا ذکر نہیں ہے کہ فلاں جگہ مار)

چنانچہ اس نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور تیرنے لگا۔ اس نے باہر نکل کر موسیٰ علیہ السلام سے وہی پہلے والا سوال کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے بھی وہی جواب دیا۔ اس نے پھر گھوڑے کو دریا میں داخل کیا اور نکل کر وہی سوال کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے وہی جواب پایا۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم! نہ اس (اللہ) نے غلط کہا اور نہ آپ ہی نے جھوٹ بولا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعے سے یہ پیغام دیا کہ اپنا عصا دریا میں مار۔ موسیٰ علیہ السلام نے دریا میں عصا مارا تو وہ پھٹ کر بارہ راستوں میں تبدیل ہوگیا۔ ہر جماعت کو اپنا راستہ نظر آنے لگا۔ جب سارے اصحابِ موسیٰ اس سے نکل گئے اور سارے فرعونی اس میں داخل ہوگئے تو دریا پھر سے جاری ہوگیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ پھر جب موسیٰ علیہ السلام کے لوگوں کا آخری آدمی نکل چکا اور فرعون والے پورے کے پورے دریا میں داخل ہو چکے تو دریا ان پر مل گیا، چنانچہ اس دن سے زیادہ تر سواد (مجمع) کبھی نہیں دیکھی گئی اور فرعون ۔لعنه اللّٰه۔ ڈوب گیا۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً﴾ یعنی بے شک اس قصے میں اور اس میں جو عجیب وغریب باتیں ہیں اور اللہ کے مومن بندوں کی نصرت و تائید کا جو ذکر ہے، وہ واضح دلیل اور قطعی حکمت و حجت ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جمہور نے ﴿فَاَتْبَعُوْهُمْ﴾ کو بقطعِ ہمزہ پڑھا ہے۔ حسن و حارث دیناری نے بوصلِ ہمزہ وتشدیدِ فوقانی پڑھا ہے۔ ﴿مُّشْرِقِيْنَ﴾ حال ہے، یعنی لاحق ہوئے اور آ ملے فرعون والے بنی اسرائیل سے اس حال میں کہ وقتِ شروق شروع ہونے والا تھا۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: ”شَرَقَتِ الشَّمْسُ شُرُوْقًا“ یعنی سورج نکلا جس طرح کہ کوئی شخص صبح اور شام کے وقت میں داخل ہوتا ہے تو کہتے ہیں: ”أَصْبَحَ وَأَمْسَی“ یعنی وہ ان دونوں وقتوں میں داخل ہوا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ مشرق کی طرف داخل ہونے والے تھے، جس طرح کہ جانبِ نجد اور جانبِ تہامہ جانے کے لیے بولتے ہیں: ”أَنْجَدَ، وَأَتْهَمَ“. کسی نے کہا ہے کہ ﴿مُّشْرِقِيْنَ﴾ بہ معنی ”مضيئين“ ہے، یعنی روشنی میں داخل ہونے والے تھے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے تو کہتے ہیں: ”شَرَقَتِ الشَّمْسُ“ اور جب روشن ہو جاتا ہے تو بولتے ہیں: ”أَشْرَقَتْ“

﴿فَلَمَّا تَرَاۗءَ الْجَمْعٰنِ﴾ جمہور نے ”تَرَآءَ“ بہ تحقیقِ ہمزہ پڑھا ہے اور ابن وثاب و اعمش رحمہما اللہ نے بغیر ہمزہ۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٧٤۔ ٢٧٧٥) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٤٤۔ ٤٤٦)

کسی نے "تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ" پڑھا ہے۔ "تَرَآءَ" تفاعل کے وزن پر ہے رؤیت سے۔ "جَمْعَانِ" سے مراد بنی اسرائیل وقبط ہیں، یعنی جب مقابل ہوئے دونوں گروہ اس طرح سے کہ ہر گروہ دوسرے کو دیکھتا تھا تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا: ﴿ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴾ یعنی قریب ہے کہ پالے گی ہم کو فرعون کی جماعت، حالاں کہ ہمیں ان کے مقابلے کی کسی طرح طاقت نہیں ہے۔ جمہور نے بصیغۂ اسم مفعول پڑھا ہے "أَدْرَكَ" سے۔ اسی باب سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ﴾ [یونس: ۹۰] "حتی کہ جب اسے غرق ہونے نے پالیا۔"

امام اعرج اور عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے بفتحِ دال مشددہ وکسرِ راء پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں ایک معنی میں ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ماہر نحوی کہتے ہیں کہ "مُدْرَكُوْنَ" بہ تخفیف جو بولتے ہیں تو اس کے معنی ہیں: "مُلْحَقُوْنَ" اور بہ تشدید کے یہ معنی ہیں کہ اجتہاد، سعی اور کوشش کرنے والے ہیں اپنے لحاق اور ملنے میں۔ کہا کہ امام سیبویہ رحمہ اللہ کے قول کے یہ معنی ہیں۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قراءت کے یہ معنی ہیں کہ ہم اُن کے ہاتھوں پر پے در پے ہلاک ہونے والے ہیں، یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی باقی نہ رہے گا۔[1] موسیٰ علیہ السلام نے ان کو زجر کر کے اور جھڑک کر کہا: ﴿ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴾ یعنی وہ تم کو ہرگز نہ پائیں گے۔ اللہ پاک نے جو ہدایت، خلاصی اور کامیابی کا وعدہ کیا تھا، وہ ان کو اپنے اس قول سے یاد دلایا کہ میرے ساتھ میرا رب اپنی نصرت اور مدد کے ساتھ ہے اور وہ ابھی مجھے نجات کی راہ بتائے گا۔

غرضیکہ پھر جب بنی اسرائیل پر بڑی آزمایش نازل ہوئی اور ایسے لشکر دیکھے، جن کے مقابلے کی ان کو کسی طرح طاقت نہ تھی تو اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ دریا کو اپنے عصا سے ماریں، وہ یہ قول ہے: ﴿ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ﴾۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ﴿ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴾ کہا تو اللہ پاک نے ان کے لیے ہدایت کا طریقہ بیان کیا، ان کو دریا کے مارنے کا حکم دیا۔ اللہ عزوجل کا ارادہ ہوا کہ نشانی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ متصل ہو اور انہیں کے فعل سے متعلق ہو جس کو وہ کریں، ورنہ عصا کا مارنا بذاتہٖ دریا کو پھاڑ نہیں سکتا، نہ اس پر معین ہے، مگر اسی قدرت اور اختراعِ الٰہی سے جو اس کے ساتھ مل گیا اور اسی سے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے نجات پائی اور اُن کے دشمن ہلاک ہوئے۔

﴿ فَانْفَلَقَ ﴾ میں فا فصیحہ ہے، یعنی جملۂ محذوف پر آگاہ کرتی ہے، وہ جملہ یہ ہے: "فَضَرَبَ فَانْفَلَقَ وَانْشَقَّ فَصَارَ اثْنَيْ عَشَرَ فِلْقًا" یعنی پس موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو مارا تو وہ پھٹ گیا، پھر بارہ ٹکڑے ہو گیا، اسباط کی تعداد کے برابر، اور راہ کے دائیں بائیں پانی بڑے پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا، یہی اس قول کے معنی ہیں: ﴿ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴾۔ ﴿ فِرْقٍ ﴾ سے مراد دریا کا ٹکڑا ہے۔ کسی نے "فِلْقٍ" پڑھا ہے راء کے بدلے لام کے

[1] الکشاف ۳/ ۳۲۱) فتح القدیر (٤/ ١٣٥)

ساتھ۔ ”طَوْد“ بہ معنی کوہ ہے، یا بہ معنی کوہِ عظیم۔ اس کی جمع ”أَطْوَاد“ ہے، یہ ماخوذ ہے: ”طَادَ يَطُوْدُ إِذَا ثَبَتَ“ سے۔ ”عظیم“ بہ معنی ضخیم، یعنی ہو گیا ہر ٹکڑا بڑے پہاڑ کی طرح، ان میں رستے تھے، جن پر وہ چلتے تھے، ان سے نہ سوار کا زین تر ہوا نہ اس کا لبد۔[1] (قاله ابن عباس ﷺ و ابن مسعود ﷺ) (لبد بالکسر بہ معنی نمد ہے، یعنی نمدہ جو گھوڑے پر ڈالتے ہیں اور ”سَرْج“ بہ معنی زین ہے۔)

﴿ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ اَزْلَفْنَا ﴾ بہ معنی ”قَرَّبْنَا“ ہے،[2] یعنی ہم نے فرعون کو اور اس کی قوم کو دریا کی طرف قریب کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ ہم نے نجات کے قریب کیا اور ”آخَرِيْنَ“ سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”جَمَعْنَا“ کے معنی میں ہے، اسی معنی سے شبِ مزدلفہ کو ”لَيْلَةُ الْجَمْعِ“ بولتے ہیں۔ (اصل روایت میں اس طرح ہے: ”ومنه قيل لليلة المزدلفة ليلة جمع“ یہ عبارت غیر ظاہر ہے، کیوں کہ لیلہ سے کچھ بحث نہیں ہے، بحث تو مزدلفہ سے ہے۔ مزدلفہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شب کو یہ لوگ وہاں جمع ہوتے ہیں، اس لیے اس کا نام ”جمع“ رکھ دیا ہے۔ یعنی لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ، کیوں کہ ازدلاف جمع کے معنی میں آتا ہے۔ مزدلفہ کی وجہ تسمیہ اور بھی ہے)۔

﴿ ثَمَّ ﴾ ظرفِ مکان ہے واسطے بعید کے، مراد وہ جگہ ہے، جہاں دریا پھٹ گیا۔ امام حسن اور ابو حیوہ رحمہما اللہ نے ”زَلَفْنَا“ پڑھا ہے ثلاثی مجرد سے۔ سیدنا ابی، ابن عباس، عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہم نے ”أَزْلَقْنَا“ قاف کے ساتھ پڑھا ہے ”أَيْ: أَزْلَلْنَا وَأَهْلَكْنَا“۔ یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جس وقت گھوڑی اپنے بچے کو ڈال دیتی ہے تو اس وقت بولتے ہیں کہ ”أَزْلَقَتِ الْفَرَسُ“[3] یعنی گھوڑی نے بچے کو ڈال دیا، ہلاک کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام بنی اسرائیل اور قومِ فرعون کے درمیان تھے۔ بنی اسرائیل سے کہتے کہ تمھارا آخری حصہ اپنے پہلے حصے کے ساتھ مل جائے اور قبطیوں سے کہتے کہ آہستہ چلو، تاکہ تمھارا آخری حصہ پہلے سے مل جائے۔ بنی اسرائیل کہتے تھے کہ ہم نے اس شخص سے زیادہ بہتر سیاست میں کوئی اور نہیں دیکھا اور قبطی کہتے تھے کہ ہم نے زیادہ تر خوب بلانے والا اس شخص سے نہیں دیکھا۔

﴿ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اور جو لوگ اُن کے ساتھ تھے، ان سب کو اس طرح پر نجات دی کہ انھوں نے اس کے بعد کہ اللہ پاک نے دریا میں راہیں بنا دیں، دریا کو پار کر لیا۔ ﴿ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴾ یعنی پھر ہم نے فرعون کو اور اس کی قوم کو ڈبو دیا۔ اللہ پاک نے ان کو اس طرح ڈبو دیا کہ دریا کو ان پر بند کر دیا، اس کے بعد کہ وہ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کا اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے اس میں داخل ہو گئے اور بنی اسرائیل اس میں سے نکل چکے تھے۔ جو لوگ اموات اور حوادث وغیرہ میں تاروں کی تاثیر کے قائل ہیں، اس

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٥٧) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٣٥٩) [3] فتح القدير (٤/ ١٣٦)

واقعے میں ان کے قول کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ وہ سب ہلاک ہونے میں جمع ہو گئے، اس کے باوجود کہ ان کے طالع مختلف تھے۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ ﴾ میں اس قصے کی طرف اشارہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون لعین کے درمیان گزرا، یہاں تک کہ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ﴿ لَاٰيَةً ﴾ یعنی اس قصۂ مذکور میں البتہ بڑی عبرت ہے اور ظاہر باہر قدرت ہے۔ اللہ پاک کی قدرت اور عظیم سلطان اور اختیار پر مدلل علامات ہیں، ان لوگوں کے لیے جو اُن کے بعد ہوں گے۔

﴿ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی فرعون کے ہمراہیوں میں سے اکثر اللہ پاک پر ایمان لانے والے نہیں تھے، کیوں کہ بعد میں اُن میں سے نہیں ایمان لائے، مگر تھوڑے، جیسے: حزقیل اور ان کی دختر اور آسیہ زوجۂ فرعون اور وہ بڑھیا جس نے یوسف علیہ السلام کی قبر بتائی۔ ''أَكْثَرُ'' سے مراد اُن لوگوں کی اکثریت نہیں ہے جو فرعون کے ساتھ اس وقت تھے، جب وہ موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کر کے ان سے آ کر ملا ہے، کیوں کہ وہ تو سب کے سب دریا میں ہلاک ہو گئے، بلکہ مراد وہ لوگ ہیں جو شروع میں اس کے ساتھ تھے اور جو لوگ اس کے تابع اور اس کی طرف منسوب تھے۔ یہ انتہا ہے اس بات کی جو ممکن ہے کہ اس مقام میں کہی جائے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے: کلمۂ ﴿ كَانَ ﴾ زائد ہے اور مراد مشرکوں کے متعلق بتانا ہے، اس کے بعد کہ انھوں نے وعظ و نصیحت کو سنا۔

﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾ یعنی بے شک تیرا رب اپنے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہے، اس طرح سے کہ ان کو ڈبو دیا اور بڑا مہربان ہے اپنے دوستوں پر کہ ان کو نجات دی۔[1] پھر اللہ پاک نے دوسرا قصہ ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾
قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلْ
يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾
قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ
مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۷﴾

اور ان (کفار) کو ابراہیم کی خبر سنائیے ﴿69﴾ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: تم کیا پوجتے ہو؟ ﴿70﴾ وہ کہنے لگے: ہم بت پوجتے ہیں، اور ہم (ہمیشہ) انھی کے مجاور رہیں گے ﴿71﴾

[1] فتح البیان (۹/ ۳۸۳۔۳۸۶)

ابراہیم نے کہا: کیا وہ تمھیں سنتے ہیں جب تم انھیں پکارتے ہو؟ (72) یا وہ تمھیں نفع دیتے ہیں یا ضرر پہنچاتے ہیں؟ (73) انھوں نے کہا: (نہیں) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، وہ اسی طرح کرتے تھے (74) ابراہیم نے کہا: کیا بھلا دیکھا تم نے جن کو تم پوجتے آرہے ہو؟ (75) تم اور تمھارے اگلے باپ دادا؟ (76) تو بلاشبہہ وہ میرے دشمن ہیں، سوائے رب العالمین کے (77)

ابراہیم خلیل علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ مکالمہ:

اللہ پاک اپنے بندے اور رسول خلیل جلیل علیہ السلام امام الحنفاء (یعنی یک رنگ لوگوں کے پیشوا، امامِ موحدین ومخلصین) کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے رسولِ کریم رؤف رحیم سید المرسلین خاتم النبیین شفیع المذنبین نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کی خبر کو اپنی امت پر پڑھیں اور ان کو سنائیں، تاکہ وہ اخلاص وتوکل میں اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت میں اور شرک اور اہلِ شرک سے بے زار ہونے میں ان کی اقتدا کریں اور ان کے پیرو ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام کو ان کا رشد وصلاح پہلے سے عطا کیا تھا، یعنی ان کے لڑکپن سے لے کر بڑھاپے تک، اس لیے کہ جس وقت انھوں نے ہوش سنبھالا اور جوان ہوئے اسی وقت سے اپنی قوم کو بتوں کے پوجنے سے منع کیا کہ اللہ عزوجل کے ساتھ بتوں کو نہ پوجیں، چنانچہ اپنے باپ سے اور قوم سے کہا: ﴿ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴾ یعنی یہ کیا مورتیں ہیں، جن کے لیے تم لگے بیٹھے رہتے ہو؟ بولے کہ ہم مورتیوں کو پوجتے ہیں۔ ﴿ فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيۡنَ ﴾ یعنی ہم اُن کی عبادت اور دعا پر اقامت گزیں ہیں اور اُن کو پوجتے رہتے ہیں اور اُن کو پکارا کرتے ہیں۔

فرمایا: ﴿ هَلۡ يَسۡمَعُوۡنَكُمۡ اِذۡ تَدۡعُوۡنَ ﴾ یعنی انھوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ ان امور میں سے وہ خود نہیں کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے تو اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے، لہٰذا وہ اُن کے قدموں پر دوڑ رہے ہیں۔ اس وقت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا كُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ﴾ یعنی اگر یہ بت کچھ چیز ہیں اور اُن کی کوئی تاثیر ہے اور یہ کچھ قدرت رکھتے ہیں تو چاہیے کہ مجھے نقصان پہنچائیں، کیوں کہ میں تو اُن کا دشمن ہوں، میں اُن کی کچھ پروا نہیں کرتا ہوں، نہ ان میں کوئی غور وفکر کرتا ہوں، مجھے ان کا ذرا بھی کچھ خیال نہیں ہے۔

یہ آیت ویسی ہے، جیسی اللہ پاک نے نوح علیہ السلام سے خبر دی ہے: ﴿ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَكُمۡ وَشُرَكَآءَكُمۡ ثُمَّ لَا يَكُنۡ اَمۡرُكُمۡ عَلَيۡكُمۡ غُمَّةً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَىَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴾ [یونس: ۷۱] ''چناں چہ تم اور تمھارے شریک مل کر (میرے خلاف) فیصلہ کرلو، پھر تمھارا فیصلہ تم میں (کسی سے) پوشیدہ نہ رہے، پھر مجھ پر تم وہ نافذ کردو اور مجھے مہلت نہ دو۔''

نیز ہود علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ اِنِّىۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَاشۡهَدُوۡۤا اَنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ۞ مِنۡ دُوۡنِهٖ فَكِيۡدُوۡنِىۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ۞ اِنِّىۡ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّىۡ وَرَبِّكُمۡ‌ؕ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا‌ؕ اِنَّ رَبِّىۡ عَلٰى صِرَاطٍ

﴿ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [ھود: ٥٤۔ ٥٦] ''بے شک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ بے شک میں بَری ہوں ان سے جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔ سوائے اللہ کے، چناں چہ تم سب مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی تدبیر کرلو، پھر تم مجھے مہلت نہ دو۔ بے شک میں نے اللہ پر بھروسا کیا ہے جو میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے، (زمین پر) چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں، جسے اس نے اس کی پیشانی سے نہ پکڑ رکھا ہو، بے شک میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔''

نیز اسی طرح ابراہیم علیہ السلام ان کے معبودوں سے بے زار ہوئے تو فرمایا: ﴿ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٨١] ''اور میں ان سے کیوں ڈروں جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو، جب کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم ان کو اللہ کے شریک ٹھہراتے ہو، جن کی اس نے تم پر کوئی دلیل نازل نہیں کی؟ پس دونوں فریقوں میں سے کون امن کا زیادہ حق دار ہے؟ (بتاؤ) اگر تم جانتے ہو۔'' نیز اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ ﴾ [الممتحنة: ٤] ''یقیناً تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: بے شک ہم تم سے اور ان سے بَری ہیں، جن کی تم عبادت کرتے ہو سوائے اللہ کے، ہم تم سے منکر ہوئے، ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہوگیا ہے، حتی کہ تم اللہ اکیلے پر ایمان لے آؤ۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ۝ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٢٦۔ ٢٨] ''اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: بلاشبہہ میں ان (بتوں) سے بَری الذمہ ہوں، جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ سوائے اس (اللہ) کے جس نے مجھے پیدا کیا، تو بے شک وہی جلد میری راہنمائی فرمائے گا۔ اور ابراہیم اسی (کلمۂ توحید) کو (اپنی اولاد میں) اپنے پیچھے ایک پائندہ و تابندہ بات بنا گئے، تاکہ وہ (اللہ کی طرف) رجوع کریں۔''[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ ﴾ معطوف ہے ﴿ وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى ﴾ کے عامل پر، یعنی "وَاذْكُرْ إِذْ نَادَىٰ... الخ"۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ ﴾. "أُتْلُ" بہ معنی "أَقْصُصْ" ہے۔ ﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ کی ضمیر کفارِ مکہ کی طرف راجع ہے۔ ﴿ نَبَاَ ﴾ سے مراد خبر و حدیث و قصہ ہے۔ ﴿ اِذْ قَالَ ﴾

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٤٦۔ ٤٤٧)

منصوب ہے ﴿ نَبَاَ ﴾ سے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ نَبَاَ ﴾ سے بدلِ اشتمال ہے تو اس صورت میں ﴿ اِذْ ﴾ میں عامل ﴿ اُتْلُ ﴾ ہوگا، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اے پیغمبر! تم مکہ والوں پر ابراہیم علیہ السلام کی خبر کا قصہ بیان کرو، جبکہ اس نے اپنے والد اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کیا چیز پوجتے ہو، حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ وہ بت پوجتے ہیں، لیکن یہ سوال اس لیے کیا کہ ان پر حجت قائم کریں اور اُن کو یہ بات دکھا دیں کہ جو شے وہ پوجتے ہیں، وہ اس کی مستحق نہیں کہ پوجی جائے، بلکہ پوجنے سے بالکل علاحدہ ہے۔ انھوں نے بت پوجنے کے ساتھ فخر اور مباہاۃ کر کے یہ کہا: ﴿ نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴾ یعنی ہم بتوں کے پوجنے پر قائم و دائم رہتے ہیں، دن بھر اس پر مستمر رہتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ کسی وقتِ معین میں ان کو پوجتے ہوں۔ محاورۂ عرب میں جب کوئی کسی کام کو دن بھر کرتا رہے تو کہتے ہیں: "ظَلَّ يَفْعَلُ كَذَا" اور رات بھر کرتا رہے تو بولتے ہیں: "بَاتَ يَفْعَلُ كَذَا" پس ظاہر عبارت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ لوگ دن بھر بتوں کی عبادت پر استمرار پذیر رہتے تھے، رات کو نہیں۔

﴿ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کے پوجنے پر اقامت پذیر رہتے تھے۔ ﴿ لَهَا ﴾ کا فائدہ یہ ہے کہ عکوف انھیں کے لیے تھا۔ پھر جب انھوں نے یہ بات کہی تو ابراہیم علیہ السلام نے ان کے مذہب کی خرابی پر آگاہ کر کے یوں فرمایا: ﴿ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴾۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں حذف ہے، یعنی کیا وہ سنتے ہیں، تم سے تمھاری بات، یا کیا وہ تمھارا پکارنا سنتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے "هَلْ يُسْمِعُوْنَكُمْ" پڑھا ہے بضمِ یائے تحتانی، یعنی کیا وہ تم کو اپنی آوازیں سناتے ہیں تمھارے ان کو پکارنے کے وقت۔[1] امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول حکایتِ حالِ ماضی کی بنا پر ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ تم حاضر کرو ان حالوں کو جن میں تم ان کو پکارتے ہو، آیا انھوں نے تمھارا پکارنا سنا، جب تم نے ان کو پکارا۔ یہ معنی سرزنش کرنے میں زیادہ موثر ہیں۔[2] یا وہ تم کو کسی بھی طرح کا نفع پہنچاتے ہیں، اگر تم ان کو پوجو، یا اگر تم ان کو نہ پوجو تو تمھیں کسی طرح کا نقصان پہنچاتے ہیں۔

یہ استفہام تقریر کے لیے ہے، کیوں کہ جب وہ نہ سنتے ہیں نہ نفع اور ضرر پہنچاتے ہیں تو پھر اُن کو پوجنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جب انھوں نے کہا کہ ہاں وہ ایسے ہیں تو گویا انھوں نے اس بات کا اقرار کر لیا کہ ان کا بتوں کو پوجنا کھیل کود، بے فائدہ کام اور کم عقلی اور حماقت سے ہے اور اس وقت ان پر حجت قائم ہو جائے گی۔ غرضیکہ جب خلیل جلیل علیہ السلام نے ان پر یہ ظاہری حجت وارد کی تو اُن کو کچھ جواب نہ بن پڑا، مگر تقلید کی طرف رجوع ہونا۔

لہٰذا وہ یوں بولے: ﴿ بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کہ وہ اسی طرح ان بتوں کو پوجا کرتے تھے تو ہم نے بھی اُن کی تقلید کی، باوجود اس کے کہ وہ بت نہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ

[1] فتح القدير (٤/ ١٣٨) [2] الكشاف (٣/ ٣٢٣)

سکتے ہیں نہ ہی کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ تفسیر ابی السعود میں ہے کہ یہ جواب اُن کی طرف سے اس بات کا اقرار ہے کہ وہ سننے اور نفع پہنچانے یا نقصان پہنچانے سے جس کا ذکر ہوا، بالکل دور کنارے پڑے ہوئے ہیں اور وہ اس بات کے اظہار پر مجبور ہو گئے کہ ان کے پاس اپنے فعل کی تقلید کے سوا کوئی سند نہیں ہے۔ یعنی اُمورِ مذکور کا نہ ہم نے اُن سے مشاہدہ کیا ہے اور نہ جانا ہے، بلکہ ہم نے اپنے آبا کو پایا ہے کہ وہ اس طرح کرتے تھے تو ہم نے ان کا اقتداء کیا ہے۔[1] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں دین میں تقلید کے باطل ہونے کی اور اس کی مذمت کرنے کی دلیل ہے اور دلیل کو پکڑ لینے اور اس پر چلنے کی تعریف ہے۔[2]

غرضیکہ جب گمراہ آباء و اجداد کے مقلدین نے یہ بات کہی تو خلیل علیہ السلام نے یہ فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝75 اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴾ رویت میں دو احتمال ہیں: یا تو بصری ہے تو اس کی بنا پر یہ معنی ہیں: "أَنَظَرْتُمْ فَأَبْصَرْتُمْ"۔ یا علمی ہے تو یہ معنی ہوں گے: "أَتَفَكَّرْتُمْ وَتَأَمَّلْتُمْ فَعَلِمْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ" یعنی کیا تم نے نظر کی ہے تو دیکھ لیا ہے، یا کیا تم نے تفکر و تامل کیا ہے تو جان لیا ہے، اس شے کو جسے تم ان بتوں سے پوجتے ہو جو نہ سنتے ہیں نہ نفع اور ضرر پہنچاتے ہیں، یہاں تک کہ تم اس بات کو جان لو کہ تم ضلالت اور جہالت پر قائم ہو۔

سلیمان جمل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو السعود رحمہ اللہ اسی طرف مائل ہیں اور گازرونی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ بات مقتضی اس کی ہے کہ "رأی" اس جگہ اپنے اصل معنی میں مستعمل ہے بہ معنی علم کے اور اس بنیاد پر بہ معنی "عَرَفَ" ہو گا، کیوں کہ یہاں صرف ایک مفعول ہے، یعنی موصول، غرض یہ ہے کہ علم کے دو مفعول ہوتے ہیں، چوں کہ یہاں ایک ہے، اس لیے علم بہ معنی "عَرَفَ" ٹھہرا۔ عبارت ابو السعود کی یہ ہے: "أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ، أَيْ: أَنَظَرْتُمْ فَأَبْصَرْتُمْ، أَوْ أَتَأَمَّلْتُمْ فَعَلِمْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَهُ انتهٰی"[3] اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے "رأی" کے دونوں احتمال بصری و علمی کے برابر رکھے ہیں اور دونوں کے موافق معنی بیان کیے ہیں۔ بلکہ بصری کے اول ذکر کیے ہیں۔

پھر جمل کا یہ فرمانا کہ صنیع ابو السعود اس کا مقتضی ہے کہ اس جگہ "رَأَى" اپنے اصل معنی میں مستعمل ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ہاں یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ جب اپنے اصلی معنی میں ہو گا تو یہاں بہ معنی "عَرَفَ" ٹھہرے گا، اس لیے کہ یہاں ایک مفعول ہے، چوں کہ اس میں اس قدر جھگڑا تھا، اس لیے اس سے تعرض کیا اور بصری میں کچھ جھگڑا نہ تھا، اس لیے اس کا کچھ ذکر نہ کیا، غرضیکہ اس کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ گازرونی کی صنیع اس کی مقتضی ہے کہ ﴿ اَفَرَءَيْتُمْ ﴾ بہ معنی "أَخْبِرُوْنِيْ" ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ جب اس معنی میں ہوتا ہے تو اس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلا مفرد ہوتا ہے اور وہ اس جگہ موصول ہے اور دوسرا جملہ استفہامیہ، وہ یہاں موجود نہیں ہے تو اس کی عبارت میں مقدر

[1] تفسیر أبي السعود (٦/ ٢٤٨) [2] تفسیر الخازن (٥/ ١١٩) [3] تفسیر أبي السعود (٦/ ٢٤٨)

مانیں گے۔ گازرونی کی عبارت یہ ہے کہ تم مجھے اس شے کے حال کی خبر دو جس کو تم پوجتے ہو، یا مجھے اس شے کی خبر دو جسے تم پوجتے ہو، آیا وہ عبادت کے لائق ہے یا نہیں؟ یہ بت پوجنے والوں کے ساتھ استہزاء ہے۔

حرفِ ''فا'' سببیہ ہے، اس بات کو مفید ہے کہ اس کا ما بعد یعنی عداوت ان کے حال کو طلب کرنے کا سبب ہے، پس یہ حرفِ ''فا'' بہ معنی لام ہے۔ یعنی تم مجھے ان کے حال کی خبر دو، اس لیے کہ وہ تو میرے دشمن ہیں، جس طرح کہ رضی نے اس کی تصریح کی ہے اس آیتِ کریمہ کی دلیل سے: ﴿ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴾ [الحجر: ٣٤] غرضیکہ پھر خلیل علیہ السلام نے ان کو خبر دی کہ جن بتوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بری و بے زار ہوں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْ ﴾

رہی یہ بات کہ اصنام کو دشمنی کے ساتھ موصوف کیا، حالاں کہ وہ جماد ہیں اور عقل نہیں رکھتے؟! تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر میں ان کو دنیا میں پوجوں تو قیامت کے دن وہ میرے دشمن ہیں۔ یا یہ وجہ ہے کہ کفار نے جب کہ ان کو پوجا اور ان کو عاقل زندہ لوگوں کے قائم مقام ٹھہرایا، اس لیے ان پر عداوت کے لفظ کا اطلاق کیا۔ یا بابِ مقلوب سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں ان کا دشمن ہوں، کیوں کہ جس سے تو نے عداوت کی تو مقرر اس نے تجھ سے عداوت کی، یہ امام فراء رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: یہ اس شے کے حال کا بیان ہے جس کو وہ یہ بات بتائے جانے کے بعد کہ ان کو اس کا علم نہیں ہے، پوجتے ہیں۔ عداوت کی نسبت اپنی طرف کی، ان پر تعریض کرنے کے لیے (اشارتاً ان کو چھیڑنے کے لیے)۔ نصیحت کرنے کے لیے اس قسم کی بات کا زیادہ فائدہ ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ اس کی تصریح اس طرح سے کرے کہ وہ تو تمھارے دشمن ہیں، حالاں کہ مقصد یہی ہے، مگر تعریضاً نہ کہ تصریحاً۔ کسی نے کہا کہ ﴿ فَإِنَّهُمْ ﴾ کی ضمیر ان کے اگلے باپ دادا کی طرف راجع ہے، یعنی وہ لوگ میرے دشمن ہیں، اس لیے کہ انھوں نے بتوں کو پوجا ہے۔ اس قول کو یوں رد کیا ہے کہ سیاقِ کلام معبودوں میں ہے، عابدوں میں نہیں ہے۔

کلمۂ ﴿ عَدُوٌّ ﴾ کلمۂ صدیق کی طرح واحد و مثنیٰ اور جمع اور مذکر و مؤنث سب پر بولا جاتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ علی بن سلیمان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کسی نے ''عدوۃ اللّٰہ'' کہا ہے، حرفِ ہا کو ثابت رکھا ہے تو اس نے کہا ہے کہ ''عدوہ'' بہ معنی معادیہ کے ہے اور جس نے ''عدو'' بغیر ہا مؤنث و جمع کے واسطے کہا ہے تو اس کو بہ معنی نسب ٹھہرایا ہے۔

﴿ إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی لیکن رب العالمین ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ تو میرا ولی اور دوست ہے دنیا اور آخرت میں، وہ دونوں جہان میں مجھ پر فضل و کرم اور مہربانی کرتا رہتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: نحویوں نے کہا ہے کہ یہ استثناء اول سے نہیں ہے، یعنی استثناء منقطع ہے بمعنی ''لکن''۔ نیز امام زجاج رحمہ اللہ نے یہ بھی جائز رکھا ہے کہ استثناء اول سے ہو، یعنی استثناء متصل اس بنیاد پر کہ وہ لوگ اللہ عزوجل کو پوجتے تھے اور اس کے ساتھ بتوں کو

پوجتے تھے۔ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام نے ان کو آگاہ کر دیا کہ وہ اس شے سے بے زار ہیں، جس کو وہ پوجتے ہیں، مگر اللہ جو رب ہے جہاں کا۔ امام جرجانی رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "أَفَرَأَيْتُمْ مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ، أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ، إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ، فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي"

چنانچہ اس کو تقدیم اور تاخیر کے باب سے ٹھہرایا ہے اور ﴿ إِلَّا ﴾ کو بہ معنی "دون" اور "سویٰ" قرار دیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ﴾ [الدخان: ٥٦] "وہاں وہ موت (کا مزہ) نہ چکھیں گے، سوائے پہلی موت کے۔" یعنی "دُونَ الْمَوْتَةِ الْأُولَىٰ"۔ معنی یہ ہیں کہ تم مجھے اس شے کی خبر دو جس کو تم پوجتے رہے ہو اور تمھارے اگلے باپ دادا سوائے ﴿ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کے، بے شک وہ میرے دشمن ہیں۔ حسن بن فضل رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں "إِلَّا مَنْ عَبَدَ رَبَّ الْعَالَمِينَ"[1] حاصل یہ ہے کہ انھوں نے عداوت کو عابدوں سے متعلق کیا ہے اور استثناء کو متصل ٹھہرایا ہے، یعنی غیر اللہ کو پوجنے والے میرے دشمن ہیں اور اللہ پاک کو پوجنے والے میرے دوست ہیں۔ پھر خلیل جلیل علیہ السلام نے رب العالمین کا وصف بیان کیا:[2]

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿٧٩﴾
وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿٨١﴾
وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾

جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری راہنمائی کرتا ہے (78) اور وہی مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے (79) اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے (80) اور وہی مجھے موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا (81) اور وہی جس سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ روزِ قیامت میری خطائیں بخش دے گا (82)

اللہ عزوجل کے لطف و کرم کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی میں نہیں پوجتا ہوں، مگر اس کو جو یہ کام کرتا ہے، جس نے مجھے بنایا ہے، پھر وہی راہ بتاتا ہے، یعنی وہ ایسا خالق ہے کہ اس نے مقدر کیا قدر کو اور راہ بتائی خلائق کو طرف اس کے، چنانچہ ہر ایک اسی شے پر چلتا ہے جو اس کے لیے مقدر کی ہے اور وہی ہے جو راہ بتاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور بھٹکاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہی ہے جو مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے، یعنی وہ میرا خالق ہے اور مجھے روزی رزق دینے والا ہے، ان آسمانی اور زمینی اسباب سے جن کو اس نے مسخر و میسر فرمایا ہے۔ لہٰذا بادل کو چلایا اور پانی اتارا اور اس سے زمین کو زندہ کیا اور اس سے ہر قسم کے میوے بندوں کے رزق کے طور پر نکالے اور میٹھا خوش گوار پانی نازل فرمایا اور اسے

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٠٩) فتح القدير (٤/ ١٣٩) [2] فتح البيان (٩/ ٣٨٦۔ ٣٨٩)

اپنے پیدا کیے ہوئے چوپایوں اور بہت سے آدمیوں کو پلاتا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

''بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان کام میں لگے ہوئے ہیں، تاکہ تو روزی حاصل کر لے اور غفلت میں نہ کھائے۔''

﴿ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴾ بیماری کو اپنی طرف منسوب کیا، گو وہ اللہ پاک کی قدرت و قضا وخلق سے ظہور میں آئی ہے، لیکن ادب کے لحاظ سے اس کو اپنے نفس کی طرف منسوب کیا، جس طرح کہ اللہ پاک نے نماز پڑھنے والے کو حکم دیا ہے کہ یوں کہے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ [الفاتحة: ٦۔ ٧] ''ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دکھا۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا، ان کی نہیں جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی۔'' پس انعام و ہدایت کی نسبت اللہ پاک کی طرف کی ہے اور غضب کا فاعل ادب کے لیے محذوف کر دیا اور ضلال (گمراہی) کی نسبت بندوں کی طرف فرمائی ہے، جس طرح کے جنوں نے کہا ہے: ﴿ وَاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴾ [الجن: ١٠] ''اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ کیا زمین والوں کے لیے برا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے لیے بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔'' اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے یہاں فرمایا کہ جب میں کسی مرض میں پڑتا ہوں تو سوا اس کے کوئی میری شفا پر قادر نہیں ہوتا ہے، بہ سبب ان اسباب کے جن کو وہ مقدر کرتا ہے اور وہ اس کی طرف موصل ہوتے ہیں اور وہ جو مجھے مارے گا، پھر زندہ کرے گا، یعنی وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اس پر قدرت نہیں رکھتا، کیوں کہ وہی ہے جو ابتدا کرتا ہے اور دوہراتا ہے۔ ﴿ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴾ یعنی دنیا اور آخرت میں گناہوں کو بخشنے پر اللہ کے سوا کون قادر ہے اور وہی بڑا کرنے والا ہے جو چاہتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ موصول یعنی ﴿ اَلَّذِيْ خَلَقَنِيْ ﴾، ﴿ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کی صفت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ موصول مبتدا ہے اور اس کا ما بعد خبر ہے۔ قولِ اول زیادہ صحیح ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ موصول بدل ہو لفظِ رب سے، یا اس کا عطفِ بیان ہو، یا منصوب ہو بنا بر مدح بہ تقدیر ''أَعْنِيْ'' یا ''أَمْدَحُ''، غرض یہ کہ خلیل جلیل علیہ السلام نے اپنے رب کو ایسی صفتوں کے ساتھ موصوف کیا کہ جن کے سبب سے وہ عبادت کا مستحق ہے، کیوں کہ پیدا کرنا، ہدایت دینا، رزق عطا کرنا، تکلیف اور بیماری کو دور کرنا، نفع اور شفا عطا فرمانا اور مارنا اور زندہ کرنا

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٤٧)

اور گناہوں کا بخشنا، یہ سب نعمتیں ہیں، جس کسی پر ان میں سے بعض کا انعام کیا گیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنے منعم کا شکر ادا کرے، شکر کے تمام طریقوں کے ذریعے جن میں سب سے اعلیٰ اور اولیٰ اور افضل عبادت ہے۔ پھر جس پر ان ساری نعمتوں کا انعام کیا گیا ہو، اس پر شکر ادا کرنے کے واجب ہونے کا کیا کہنا کہ کس شد و مد سے اس کو شکر ادا کرنا چاہیے۔ لیکن

از دست و زبان کہ برآید کز عہدۂ شکرش بدر آید

''وہ کون ہے جو اپنے ہاتھوں اور زبان سے اس (اللہ) کے شکر سے عہدہ برآ ہو سکے۔''

سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر اتنی گونا گوں نعمتیں اور رات دن اتنے زیادہ احسانات ہیں کہ ان کا شمار کرنا غیر ممکن ہے: ﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴾ [إبراهيم: ٣٤] ''اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انھیں شمار نہ کر سکو گے۔ بے شک انسان بڑا ظالم، نہایت ناشکرا ہے۔'' اگر ساری عمر ادنیٰ نعمت کا شکر ادا کرتے کرتے بسر ہو جائے، تب بھی حق ادا نہ ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

وَلَوْ أَنَّ نَفْسِيْ مُذْ بَرَأَهَا مَلِيْكُهَا مَضَى عُمْرُهَا فِيْ سَجْدَةٍ قَلِيْلُ
أُحِبُّ مُنَاجَاةَ الْحَبِيْبِ بِأَوْجُهٍ وَلٰكِنَّ لِسَانَ الْمُذْنِبِيْنَ كَلِيْلُ

''یعنی اگر میری جان جیسے کہ اسے اس کے مالک نے پیدا کیا ہے، اس کی عمر ایک سجدے میں گزر جائے تو بھی نہایت کم ہے، میں تو دوست رکھتا ہوں کہ اپنے دوست کی انواع و اقسام کے بیان سے مناجات کروں، اس کو بیان کروں، مگر عاجز ہوں کیا کروں۔ گناہ گاروں کی زبان کند ہے۔''

گناہوں نے زبان کی تیزی، فصاحت اور بیان کی چستی و چالاکی، حسن و خوبصورتی اور فصاحت کھو دی ہے۔ زبان کی تلوار کو غیبت، جھوٹ اور بہتان کی کثرت نے کھا لیا ہے۔ برے خیالات اور نفسِ امارہ کی شہوات نے دلوں کو محصور کر رکھا ہے۔ اے دل! بتاؤ تمھارا یہ حال اور تمھاری ترجمان یعنی زبان کی یہ حالت کیسے بن گئی؟ ﴿ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴾ [الشعراء: ٨٩] ''الا یہ کہ کوئی اللہ کے پاس (شرک و بدعت سے پاک) صحیح سالم دل کے ساتھ حاضر ہو۔''

شاید آپ کو یاد ہو، وہ سلامتی کس طرح نصیب ہو، ہاں لو چلو، آؤ ارحم الراحمین مجیب السائلین رب العالمین تعالیٰ شانہ وعظم سلطانہ سے بصد عجز و نیاز یہ دعا مانگیں: ''اَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ، وَارْحَمْنَا وَاغْفِرْلَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، آمین''، غرض یہ کہ ''ھو ھو'' کی ضمیریں جو ان جملوں کے شروع میں آئی ہیں تو یہ بات بتانے کے لیے ہیں کہ ان کاموں کا کرنے والا رب العالمین ہی ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور۔

مرض کی نسبت اپنے نفس کی طرف کی اس لیے کہ ادب کا لحاظ کرنا منظور ہے، جس طرح کہ خضر علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا ﴾ [الكهف: ٧٩] ''لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ اس میں عیب ڈال دوں۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ یَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا ﴾ [الكهف: ٨٢] ''چنانچہ تیرے رب نے چاہا کہ وہ دونوں (یتیم) اپنی جوانی کو پہنچیں۔'' ورنہ مرض اور شفا وغیرہ سب اللہ پاک کی طرف سے ہے۔

﴿ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴾ میں زندہ کرنے سے مراد اٹھانا ہے، اسی لیے اس جگہ کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ کے ساتھ عطف کیا ہے ماقبل کے برعکس کہ وہاں عطف بحرفِ ''فا'' ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مارنے اور زندہ کرنے کے درمیان ایک لمبا عرصہ ہے، کیونکہ اس سے مراد آخرت میں زندہ کرنا ہے۔ ان فعلوں سے حرفِ ''یا'' اس لیے حذف کیا کہ وہ رؤسِ آیات ہیں۔ امام ابن ابی اسحاق رحمہ اللہ نے ان سب فعلوں کو حرفِ ''یا'' کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے جو یہ کہا ہے: ﴿ وَالَّذِیْۤ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾ تو یہ دو سبب سے ہے: ایک تو اپنی کسرِ نفسی۔ دوسرے امت کو اس بات کی تعلیم کرنا ہے کہ معاصی سے اجتناب کریں اور ڈرتے رہیں اور جو گناہ ان سے ہو جاتے ہیں، اپنے لیے اُن کی بخشش طلب کریں۔

تینوں معطوف جگہوں پر موصول کو بار بار لانے کی یہ وجہ ہے کہ مقصود اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ ان صلوں میں سے ہر ایک مستقل نعمتِ جلیل ہے، یعنی ایک اچھی تعریف ہے حکم کے قبول کرنے اور مان لینے میں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ طمع ابراہیم علیہ السلام کے حق میں تو یقین کے معنی میں ہے اور ان کے علاوہ دوسروں کے لیے اُمید کے معنی میں ہے۔ حسن رحمہ اللہ اور امام ابو اسحاق رحمہ اللہ نے ''خطایا'' بصیغۂ جمع پڑھا ہے، فرمایا کہ ''خطیئة'' ایک نہیں ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں ''خطیئة'' بہ معنی ''خطایا'' آتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''خطیئة'' سے ان کی مراد اُن کا یہ قول ہے: ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ ﴾ [الأنبیاء: ٦٣] ''بلکہ یہ (کام) ان کے اس بڑے نے کیا ہے۔'' اور یہ قول: ﴿ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴾ [الصافات: ٨٩] ''بے شک میں تو بیمار ہوں۔'' اور یہ قول کہ بی بی سارہ رضی اللہ عنہا ان کی بہن ہیں۔

امام حسن رحمہ اللہ نے یہ زیادہ کہا کہ انھوں نے اس تارے کو کہا تھا: ﴿ هٰذَا رَبِّیْ ﴾ [الأنعام: ٧٦] ''یہ میرا رب ہے۔'' امام واحدی رحمہ اللہ نے مفسرین سے حکایت کیا ہے کہ انھوں نے ''خطایا'' کی وہی تفسیر کی ہے جو امام مجاہد رحمہ اللہ نے کی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انبیا علیہم السلام بشر ہیں، جائز ہے کہ ان پر ''خطیئة'' واقع ہو جائے مگر ان سے کبیرہ گناہ نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ معصوم ہیں۔[1] ﴿ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾ سے مراد روزِ جزا ہے جس میں بندوں کو ان کے اعمال کی جزا دی جائے گی۔ یہ بات مخفی نہ رہے کہ مجاہد نے اور ان کے ساتھ والوں نے خطایا کی جو تفسیر کی وہ ضعیف ہے، اس لیے کہ وہ باتیں معاریض (توریے کے طور پر ہیں)۔

---

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ١١٠۔ ١١١) فتح القدیر (٤/ ١٤٠)

دوسری بات یہ ہے کہ وہ باتیں جو انھوں نے کہیں، وہ اس گفتگو کے بعد کیں، جو اُن کے اور اُن کی قوم کے درمیان ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تقریر قوم کے سامنے پہلے ہوئی اور وہ باتیں اس کے بعد ہوئیں، پھر وہ اس کی تفسیر کس طرح ہوسکتی ہیں۔ واللہ أعلم۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ابن جدعان جاہلیت میں صلہ رحمی کیا کرتا تھا اور مسکین کو کھانا کھلاتا تھا۔ کیا وہ اس کو فائدہ دے گا؟ فرمایا: اس کو نفع نہ دے گا، کیوں کہ اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا: «رَبِّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ»[1]

غرض یہ کہ ابراہیم علیہ السلام یہ سب اس بات پر حجت لائے کہ الٰہیت کی صلاحیت نہیں رکھتا، یعنی الٰہیت کے قابل نہیں، مگر وہ جو یہ افعال کرتا ہے۔ پھر جب خلیل جلیل علیہ السلام اپنے رب کی تعریف اور صفت سے فارغ ہو چکے اور حق تعالیٰ سبحانہ کی بارگاہِ عالی جاہ سے جو طرح طرح اور قسم قسم کے لطف و کرم اور عطائیں پیدائش سے لے کر روزِ بعث تک ان پر برستی رہیں، ان کا اقرار اور اعتراف کر چکے تو اس نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے رب سے مناجات کریں، تاکہ اس بارے میں اَور لوگ بھی ان کی پیروی کریں، چنانچہ اس کے بعد یہ دعا فرمائی:[2]

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَاجْعَلْنِي مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿٨٥﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٨٦﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٨٧﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾

اے میرے رب! مجھے حکمت عطا فرما، اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا (83) اور بعد والوں میں میرا ذکرِ خیر جاری رکھ (84) اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے کر دے (85) اور میرے باپ کو بخش دے، بے شک وہ گمراہوں میں سے تھا (86) اور جس دن وہ (لوگ دوبارہ) اُٹھائے جائیں گے، مجھے رسوا نہ کرنا (87) جس دن نہ مال کوئی نفع دے گا اور نہ اولاد (88) الا یہ کہ کوئی اللہ کے پاس (شرک و بدعت سے پاک) صحیح سالم دل کے ساتھ حاضر ہو (89)

خلیل الرحمٰن ابراہیم علیہ السلام کی اپنے لیے اور اپنے باپ کے لیے کچھ دعائیں کرنے کا بیان:

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دعا سے مراد یہ ہو کہ آخر زمانے میں میرے گھرانے سے نبی ہو اور اُمت ہو، جو میرا دین تازہ کریں۔ انتہیٰ۔

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۱۴) [2] فتح البیان (۹/ ۳۸۹۔۳۹۱)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے درخواست ہے کہ ان کا رب ان کو حکم عطا کرے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ حکم علم ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لُب ہے، یعنی عقل۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن شریف ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبوت ہے۔[1] ﴿ وَاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تو مجھ کو دنیا اور آخرت میں نیکوں کے ساتھ کرنا۔ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احتضار (وفات) کے وقت فرمایا: «اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْأَعْلٰى»۔ اس کلمے کو تین بار فرمایا۔[2] حدیث شریف میں دعا آئی ہے: «اَللّٰهُمَّ أَحْيِنَا مُسْلِمِيْنَ، وَأَمِتْنَا مُسْلِمِيْنَ، وَأَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مُبَدِّلِيْنَ»[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ یعنی میرے لیے میرے بعد ذکرِ جمیل کر کہ میں اس کے ساتھ یاد کیا جاؤں اور خیر میں میری پیروی کی جائے، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [الصافات: ۱۰۸۔ ۱۱۰] ''اور ہم نے اس (کے ذکرِ خیر) کو پیچھے آنے والوں میں باقی رکھا۔ ابراہیم پر سلام ہو۔ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔'' امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: یعنی ثنائے حسن۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [النحل: ۱۲۲] ''اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا۔''

نیز جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ۲۷] ''اور ہم نے اسے اس کا اجر دنیا میں بھی دیا اور بلاشبہ وہ آخرت میں صالح لوگوں میں سے ہوگا۔'' لیث بن ابی سلیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر ملت ان کو محبوب رکھتی ہے اور اُن سے دوستی رکھتی ہے۔[4] اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[5] ﴿ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴾ یعنی تو دنیا میں مجھ پر یہ انعام کر کہ میرا ذکرِ جمیل باقی رکھ اور آخرت میں یہ کہ تو مجھے جنتِ نعیم کے وارثوں میں سے کر۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴾ [إبراهيم: ٤١] ''اے ہمارے رب! جس دن حساب قائم ہوگا اس دن مجھے، میرے والدین کو اور تمام مومنوں کو معاف فرمانا۔'' یہ دعا اس قبیل سے ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس سے رجوع کیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲۷۸۰۔ ۲۷۸۱)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤٤) البتہ اس میں تین بار کے بجائے دو مرتبہ کا ذکر ہے۔

[3] مسند أحمد (۳/ ٤٢٤) مگر اس میں "وَلَا مُبَدِّلِيْنَ" کے بجائے "وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ" ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲۷۸۱) [5] تفسير الطبري (۱۹/ ٣٦٤۔ ٣٦٥)

لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١١٤] ''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا بس ایک وعدے کے باعث تھا، جو وعدہ انھوں نے اس سے کیا تھا، پھر جب ابراہیم پر واضح ہوگیا کہ یقیناً وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے زار ہوگئے۔ بے شک ابراہیم بڑے نرم دل، بہت تحمل والے تھے۔''

اللہ پاک نے ان کے باپ کے لیے استغفار کرنے کے الحاق کو قطع کر دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؗ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَ مَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الممتحنة: ٤] ''یقیناً تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: بے شک ہم تم سے اور ان سے بَری ہیں، جن کی تم عبادت کرتے ہو سوائے اللہ کے، ہم تم سے منکر ہوئے، ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہوگیا ہے، حتیٰ کہ تم اللہ اکیلے پر ایمان لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں ضرور تیرے لیے بخشش مانگوں گا اور میں تیرے لیے اللہ (کی طرف) سے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ یعنی تو مجھے پناہ دے روزِ قیامت میں رسوائی سے، حالاں کہ اس دن اول و آخر ساری مخلوق مبعوث ہوگی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ روزِ قیامت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے اس حالت میں ملیں گے کہ اس پر گرد و غبار اور سیاہی ہوگی۔ دوسری روایت میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے ملیں گے تو کہیں گے کہ اے رب! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو مجھے اس دن رسوا نہ کرے گا، جس دن لوگ مبعوث ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے جنت کو کافروں پر حرام کر دیا ہے۔[1] (هكذا رواه عند هذه الآية قال: في أحاديث الأنبياء بهذا الإسناد بعينه منفردا به)

اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر سے قیامت کے دن ملیں گے، حالاں کہ آزر کے چہرے پر سیاہی اور غبار ہوگا تو ابراہیم علیہ السلام اس سے کہیں گے کہ کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو میری نافرمانی نہ کر، تو اُن کا باپ کہے گا: آج میں تیری نافرمانی نہ کروں گا۔ ابراہیم علیہ السلام کہیں گے: اے رب! تو نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا ہے کہ تو مجھے رسوا نہ کرے گا، جس دن لوگ مبعوث ہوں گے، پھر کون سی رسوائی میرے باپ اَبْعَد کی رسوائی سے بڑھ کر ہوگی۔ (''اَبْعَد'' کے معنی ہیں کہ خیر و بھلائی سے نہایت دور پڑا ہوا)۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے جنت کو کافروں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٠-٤٤٩١)

پر حرام کر دیا ہے۔ پھر فرمائے گا: اے ابراہیم! اپنے پاؤں کے نیچے نظر کر، وہ نظر کریں گے تو ان کا باپ ایک نر کفتار (بجو) نجاست میں لوٹ پوٹ ہو گا، اس کے پاؤں پکڑ کر اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے قیامت کے دن اپنے باپ کو دیکھا کہ اس پر غبار اور سیاہی ہے اور اس سے کہا کہ میں نے تجھے اس سے منع کر دیا تھا، مگر تو نے میری نافرمانی کی۔ اس نے کہا: لیکن آج میں ایک دفعہ بھی تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔ (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: «لَكِنِّي الْيَوْمَ لَا أَعْصِيكَ وَاحِدَةً») ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے رب! تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مجھے اس دن رسوا نہ کرے گا جس دن لوگ مبعوث ہوں گے، اگر تو نے میرے باپ کو رسوا کیا تو مقرر تو نے اَبْعَد کو رسوا کیا۔ فرمایا: اے ابراہیم! میں نے تو اس (جنت) کو کافروں پر حرام کر دیا ہے۔ پھر اس کو ابراہیم علیہ السلام سے لے لیا۔ فرمایا: اے ابراہیم! تیرا باپ کہاں ہے؟ عرض کی کہ تو نے اس کو مجھ سے لے لیا۔ فرمایا: تو اپنی نظر نیچی کر، وہ نظر کریں گے تو اسی وقت وہ ایک ذیخ ہے کہ اپنی گندگی میں لوٹ رہا ہے، پھر اس کے پاؤں پکڑے جائیں گے، پھر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔[2] (ورواه أبو عبد الرحمن النسائي في التفسير من سننه الكبير) یہ اسناد غریب ہے اور اس میں نکارت ہے۔

ذیخ "ضباع" کے نر کو کہا جاتا ہے۔ "ضباع" "ضبع" کی جمع ہے۔ ضبع کو فارسی میں کفتار، اردو میں بجو، ہماری زبان میں زخ بولتے ہیں۔ گویا آزر کی صورت ایک بجو کی کر دی گئی کہ اپنی نجاست میں لت پت ہو رہا ہے، پھر وہ ویسا ہی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (وقد رواه البزار بإسناد من حديث حماد بن سلمة عن أيوب عن محمد بن سيرين عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم وفيه غرابة و رواه أيضا من حديث قتادة عن جعفر بن عبد الغافر عن أبي سعيد عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم بنحوه)

قولہ تعالیٰ: ﴿يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک کے عذاب سے آدمی کو اس کا مال نہ بچا سکے گا، اگرچہ وہ زمین بھر کر سونا فدیہ میں دے اور نہ ہی اس کے بیٹے بچا سکیں گے، اگرچہ روئے زمین کے سارے لوگ فدیہ میں دے دے۔ اس دن صرف یہ چیزیں نفع دیں گی: اللہ پر ایمان اور اس کے لیے اپنے دین کو خالص کرنا اور شرک اور اہلِ شرک سے بے زار ہو جانا۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾ یعنی مگر وہ شخص جو ایسا دل لے کر آئے گا، جو میل کچیل اور شرک سے پاک صاف اور صحیح سالم ہو۔

امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قلبِ سلیم وہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ اللہ پاک حق ہے اور قیامت آنے والی ہے، اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے اور یہ کہ اللہ ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قلبِ سلیم وہ ہے، جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ۔ امام مجاہد اور حسن رحمہما اللہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧٢) [2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢٢)

وغیرہما نے کہا ہے کہ قلبِ سلیم وہ ہے جو شرک سے سالم ہے۔[1] امام سعید بن میسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قلبِ سلیم قلبِ صحیح تندرست ہے، یہ مومن کا دل ہے، کیوں کہ کافر اور منافق کا دل مریض اور بیمار ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ [البقرۃ: ١٠] ''ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے۔'' ابوعثمان نیساپوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قلبِ سلیم وہ دل ہے جو بدعت سے صحیح سالم ہے، سنت کی طرف مطمئن وساکن ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ پاک سے حکم عطا کرنے کا سوال کیا۔ حکم سے مراد علم وفہم وعمل میں کمال ہے کہ جس سے خلافتِ حق اور خلق کی ریاست کو چلانے کے لیے مستعد و لائق ہو جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد نبوت ورسالت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک کے حدود واحکام کی معرفت ہے۔

﴿ وَاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو انبیا علیہم السلام مجھ سے پہلے گزرے ہیں عملِ صالح میں تو مجھے ان کے ساتھ ملا دے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صالحین سے مراد اہلِ جنت ہیں[3] یعنی تو مجھے ان کے درجوں میں کر دے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے (قولِ ثانی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ پھر قولِ اول کے اولیٰ ہونے کی کیا وجہ ہے، حالاں کہ دونوں اقوال کا حاصل ایک ہی ہے)۔ اللہ پاک نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ چناں چہ فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ٢٧] ''اور بلاشبہہ وہ آخرت میں صالح لوگوں میں سے ہوگا۔''

آخرین میں لسانِ صدق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ تو میرے لیے آخری لوگوں میں ثنائے حسن کر اور آخری اُمتوں میں جو میرے بعد دنیا میں آئیں گی اور اُن کا اثر قیامت تک باقی رہے گا، ان میں میرا ذکرِ جمیل، عزت، نیک نامی، قبولیت اور وصیت عام کر دے۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لسان کو بجائے قول رکھا ہے استعارے کے طور پر، اس لیے کہ قول زبان سے ہوتا ہے، کبھی عرب کے لوگ زبان بولتے ہیں اور کلمہ مراد لیتے ہیں، اللہ پاک نے ان کو یہ بات عطا فرما دی۔

چنانچہ فرمایا ہے: ﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ [الصافات: ٧٨] کیوں کہ ہر اُمت ان کی دلیل پکڑتی ہے اور اُن کی تعظیم کرتی ہے اور سارے دین والے اُن سے دوستی رکھتے ہیں اور اُن کی تعریف اور صفت کرتے ہیں، خاص کر یہ امت اور خاص کر نماز کی تشہدوں میں سے ہر تشہد میں ان کا ذکرِ خیر کرتی ہے۔ امام مکی رحمہ اللہ نے کہا: کسی نے کہا ہے کہ ان کی دعا کے معنی یہ ہیں کہ آخر زمانے میں ان کی اولاد سے وہ شخص ہو، جو قائم بہ حق ہو۔ چنانچہ ان کی دعا قبول ہوئی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں، حالاں کہ اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[4] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: یا یہ معنی ہیں کہ میرے واسطے میری ذریت میں سے کسی کو مقرر کر، جو میرے اصل دین کی تجدید کرے اور لوگوں کو اس شے کی طرف بلائے، جس کی طرف میں اُن کو بلایا کرتا تھا اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔[5] انتھی.

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٨٣) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٤٧ـ ٤٤٩) [3] الدر المنثور (٦/ ٣٠٦)

[4] تفسير القرطبي (١٣/ ١١١ـ ١١٢) فتح القدير (٤/ ١٤٠ـ ١٤١) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٤٣)

اس صورت میں یہ آیت برتقدیرِ مضاف ہے، یعنی کہ تم مجھ کو صاحبِ لسانِ صدق کر۔ یا یہ مجاز ہے، جز کے کل پر اطلاق کے باب سے کہ دعوت زبان سے ہوتی ہے۔ اصل دین سے مراد عقاید اور غیر منسوخ احکام ہیں۔[1] (كذا قال الشهاب) امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد دعائے حسن ہے قیامِ قیامت تک۔[2] اس کی بھی کوئی وجہ نہیں، اس لیے کہ لسانِ صدق اس سے عام تر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اہلِ ملل کا ابراہیم علیہ السلام پر جمع ہونا۔[3] چنانچہ کوئی امت نہیں ہے مگر وہ ان کو دوست رکھتی ہے اور ان پر ثنا کرتی ہے۔

﴿ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴾ یعنی تو مجھ کو جنت کے وارثوں میں شامل کر دے اور ان کے جملے سے ٹھہرا دے، یعنی جن لوگوں کو جنت بغیر کسی محنت و مشقت کے عطا کی گئی ہے، جس طرح کہ آدمی کو وراثت بغیر تکلیف و مشقت کے حاصل ہوتی ہے۔ ﴿ مِنْ وَّرَثَةِ ﴾ میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ اِجْعَلْنِيْ ﴾ کا دوسرا مفعول ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ مفعولِ ثانی کی صفت ہے: "أَيْ: وَارِثًا كَائِنًا مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ"۔ اضافت جنت کی نعیم کی طرف محل کی اضافت ہے طرف حال کے۔ جنت کو من جملہ ان چیزوں کے ٹھہرایا جو میراث میں ملتی ہیں۔ چنانچہ اس سے مقصود غنیمتِ آخرت کی تشبیہ ہے دنیا کی غنیمت کے ساتھ۔ غرضیکہ خلیل جلیل علیہ السلام نے جبکہ پہلے دعا سے دنیا کی سعادت طلب کی تو اس دعا سے آخرت کی سعادت طلب فرمائی اور وہ سعادت جنتِ نعیم ہے۔ یعنی ناز و نعمت اور راحت و آرام کا باغ جس میں ہمیشہ عیش کریں گے، طرح طرح اور قسم قسم کی لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ تمام نعمتوں کا سردار بھی وہیں پر نصیب ہوگا، یعنی ذوالجلال والاکرام رب العالمین اور ارحم الراحمین کا دیدارِ پُر انوار۔ یہ ایسی نعمت ہے کہ گویا جنت اپنے سارے ساز و سامان، حوروں اور قصور و غلمان کے ساتھ اس کا مقدمہ اور تمہید ہے اور اصل مقصود یہی ہے، اور کیوں کر نہ ہو، گھر سے مقصود گھر والا ہوتا ہے نہ کہ صرف گھر۔ وراثت کے معنی اور تفسیر سورت مریم میں گزر چکی ہے۔

﴿ وَاغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ ان کے باپ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ان پر ایمان لے آئے گا، لہٰذا انھوں نے اس کے لیے مغفرت مانگی۔ پھر جب ان پر یہ بات کھل گئی کہ وہ تو اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بے زار ہو گئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: معنی یہ ہیں کہ تو اس پر احسان کر توبہ کا جس سے وہ تیری مغفرت کا مستحق ہو جائے۔[4] ﴿ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ کے معنی یہ ہے کہ وہ ان مشرکوں میں سے ہے جو ہدایت کی راہ بھولے ہوئے ہیں۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ کے مذہب پر ﴿ كَانَ ﴾ زائد ہے۔ چناں چہ کئی جگہ گزر چکا ہے۔

سورۃ التوبہ اور سورت مریم میں اس کی تفسیر پوری طرح بیان ہو چکی ہے۔ ﴿ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ یعنی تو مجھے علی رؤس الاشہاد فضیحت مت کر کہ تو مجھ پر عتاب کرے یا مجھے اس بات پر عقاب کرے، جو میں پہلے کر گزرا

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٨)
[2] تفسير القرطبي (١٣/ ١١٢)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٨١)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٨٢)

ہوں۔ یا تو مجھے روزِ قیامت میں عذاب مت کر۔ یہ بات عاقبت کے خوف کے سبب سے کہی اور اس لیے کہ عقلی طور پر عذاب کیے جانے کا جواز ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ تو میرے باپ کو عذاب کر کے مجھے رسوا مت کر، یا اس کو ضالین کے گروہ میں مبعوث کر کے، یا میرا رتبہ بعض وارثین کے رتبے سے کم کر کے مجھے رسوا مت کر۔ ''إِخزا'' کا اطلاق ''خِزْيٌ'' پر ہوتا ہے۔ ''خزي'' ''هوان'' کو کہتے ہیں، ''هوان'' کے معنی ذلت اور خواری کے ہیں اور ''خزاية'' پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ ''خزاية'' بہ معنی حیا ہے، یعنی شرمانا۔

﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴾ بدل ہے ﴿ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ سے، یعنی جس دن کہ نفع نہ دے گا، اس میں مال اور بیٹے لوگوں میں سے کسی کو، حالاں کہ بیٹا خاص ترین قرابت ہے اور حمایت اور تکلیف کو دور کرنے اور فائدہ دینے کے لحاظ سے اولیٰ والیق ہے۔ پھر جب اسی نے فائدہ نہ دیا تو اس کے علاوہ اور رشتے دار اور معاون و مددگار کیا فائدہ دیں گے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اور اس کے بعد والی آیت کلامِ الٰہی سے ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے۔[1] ظاہر یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ہی کے کلام کا حصہ ہے۔

﴿ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴾ میں استثناء منقطع ہے بہ معنی ''لٰكِن''۔ کشاف میں کہا ہے: ''إِلَّا حَالَ مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ''[2] مضاف محذوف کی تقدیر کی ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ اس کی طرف داعی ہو۔[3] کسی نے کہا ہے کہ یہ استثناء بدل ہے مفعول محذوف سے، یا مستثنیٰ منہ سے، کیوں کہ تقدیر یہ ہے: ''لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ أَحَدًا مِّنَ النَّاسِ إِلَّا مَنْ كَانَتْ هٰذِهِ صِفَتُهٗ''، یعنی لوگوں میں سے کسی کو نہ مال فائدہ دے گا اور نہ بیٹے، مگر اس کو جس کی یہ صفت ہے کہ وہ اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ﴿ يَنْفَعُ ﴾ کے فاعل سے بدل ہو تو اس صورت میں مرفوع ہوگا۔

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: ''إِلَّا مَالُ مَنْ، أَوْ بَنُو مَنْ، فَإِنَّهُ يَنْفَعُ''[4] یعنی مال اس شخص کا، یا بیٹے اس شخص کے جو اللہ کے پاس سلیم دل لے کر آیا، کیوں کہ یہ چیزیں اس کو نفع دیں گی۔ یہ ماضی یعنی کلمۂ ﴿ اَتَى ﴾ بہ معنی مضارع ہے، اسی طرح ''أُزْلِفَتْ، وَبُرِّزَتْ، وَقِيلَ، وَكُبْكِبُوْا، وَقَالُوْا'' بھی مضارع کے معنی میں ہیں۔

﴿ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴾ کے معنی میں اختلاف ہے۔ کسی نے تو کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ شرک سے سالم ہے۔ رہے گناہ تو اُن سے کوئی سالم نہیں رہ سکتا۔ اکثر مفسرین کا بھی یہی قول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ دل ہے جو بدعت سے خالی اور سنت کی طرف مطمئن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مال و بنین کی آزمایش سے سالم ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ سَلِيْمٍ ﴾ بہ معنی خالص ہے۔[5] امام جنید رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ﴿ سَلِيْمٍ ﴾ لغت میں ''لديغ'' یعنی مارگزیدہ، یعنی

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٤١) [2] الكشاف (٣/ ٣٢٥) [3] البحر المحيط (٧/ ٢٢)
[4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٩٨) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٨٣).

سانپ کے ڈسے ہوئے کو کہتے ہیں، چنانچہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے خوف سے وہ دل مارگزیدہ کی طرح ہے۔

فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ یہ معنی قرآن کے معنی کی تعکیس و تحریف ہے۔[1] کاتب الحروف عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ جناب استاد ابوالقاسم جنید رحمہ اللہ کی غرض معنی مذکور سے یہ نہیں ہے کہ قلبِ سلیم کے صرف یہی معنی ہیں اور معنی نہیں ہیں، بلکہ بطور لطیفے کے ایک معنی یہ بھی ہیں اور لغتِ عرب بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ غور سے دیکھو تو سلیم کا پہلا درجہ شرک سے سلامتی ہے اور ظاہری اور خفیہ گناہوں سے سلامت ہونا ہے، جب ان سب سے صاف ہو جائے گا تو پھر نورِ معرفت آئے گا۔ جب نورِ معرفت سے منور ہو گا اور اپنے مالک کو خوب پہچان لے گا، تب کہیں اسے خوف پیدا ہو گا، کیوں کہ جب تک اسے نہ پہچانے گا تو اس سے کیوں کر ڈرے گا، جب اسے مقامِ خوف نصیب ہو گا تو اس وقت بے شک اس کی یہی کیفیت ہو گی کہ مارگزیدہ کی طرح تلملاتا رہے گا۔ یہ معنی گویا قلبِ سلیم کے آخری درجے کے معنی ہیں۔ واللہ أعلم. امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ صحیح یہ قول ہے کہ اس سے مراد جہالت و اخلاقِ رذیلہ سے نفس کی سلامتی ہے۔[2] انتہیٰ

ربِ جلیل نے استثنائے خلیل علیہ السلام کو ان کے اکرام اور اعظام کے لیے صواب کہا۔ پھر اس کو اپنے اس قول میں ان کی صفت ٹھہرایا: ﴿ وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ﴿83﴾ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴾ [الصّافات: ۸۳۔ ۸۴] ”اور بے شک ابراہیم بھی اسی (نوح) کے گروہ سے ہے۔ جب وہ اپنے رب کے پاس پاک صاف دل کے ساتھ آیا۔“

امام نسفی رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے مشرکوں کے ساتھ اپنے کلام کو کیسا ترتیب کے ساتھ ذکر فرمایا کہ پہلے ان سے اس کے بارے میں سوال کیا، جس کو وہ پوجتے ہیں اور سوال بھی ایسا کہ دل میں قرار پکڑے نہ کہ صرف پوچھنے کی حد تک ہو۔ پھر ان کے معبودوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن کے کاروبار کو اس طرح سے باطل ثابت کیا کہ وہ نہ نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ نفع اور نہ ہی سنتے ہیں۔ پھر ان کی تقلید پر متوجہ ہوئے جو وہ اپنے باپ دادا کی کیا کرتے تھے تو اس کو شبہہ ہونے سے نکال دیا۔

پھر اس کے حجت اور دلیل ہونے کا ذکر کیا۔ پھر مسئلے کی تصویر اپنی ذات سے پیش کی، یہاں تک کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا خالص ذکر کیا تو اس کی شان کی عظمت بیان کی اور اس کی نعمتوں کا شمار کیا، اپنی پیدایش کے وقت سے لے کر وفات کے وقت تک اس کی رحمت کے ساتھ کہ آخرت میں جس کی اُمید کی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد اخلاص کے ساتھ دعائیں کیں اور اللہ پاک کے ساتھ نہایت ادب کے ساتھ عاجزی اور زاری کی۔ پھر اس سے قیامت کے دن کا ذکر ملا دیا اور اللہ تعالیٰ کا ثواب اور عقاب ذکر کیا اور اس دن جن اُمور کی طرف مشرک لوگ دفع کیے جائیں گے

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٤١) [2] تفسير الرازي (٢٤/ ١٣٠)

ان کا ذکر کیا، وہ یہ ہیں کہ جس ضلال اور گمراہی میں وہ تھے، اس پر ندامت اور حسرت کریں گے اور دنیا کی طرف دوبارہ آنے کی تمنا کریں گے، تاکہ ایمان لائیں اور اطاعت کریں۔[1] یہ پوری آیت کی تفسیر کا حاصل ہے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ۝
وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ
يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ۝
وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ۝ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۝
تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۝
وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۝ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

اور جنت متقین کے قریب کی جائے گی (90) اور دوزخ کو گمراہوں کے لیے ظاہر ونمایاں کر دیا جائے گا (91) اور ان سے کہا جائے گا: کہاں ہیں وہ جنھیں تم پوجتے تھے (92) اللہ کے سوا؟ کیا وہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں یا وہ بدلہ لے سکتے ہیں؟ (93) پھر وہ اور (سب) گمراہ اس جہنم میں اوندھے منہ ڈالے جائیں گے (94) اور ابلیس کے سارے لشکر بھی (95) وہ کہیں گے جب کہ وہ وہاں جھگڑ رہے ہوں گے: (96) اللہ کی قسم! یقیناً ہم ہی کھلی گمراہی میں تھے (97) جبکہ ہم تمھیں رب العالمین کے برابر ٹھہراتے تھے (98) اور ہمیں تو (انھی بڑے) مجرموں ہی نے بہکایا تھا (99) تو (اب) ہمارے لیے کوئی سفارشی نہیں ہے (100) اور نہ کوئی مخلص دوست (101) کاش! پھر ہم ایک بار (دنیا میں) لوٹیں تو ہم مومنوں میں سے ہو جائیں (102) بے شک اس میں عظیم نشانی ہے۔ اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں (103) اور بے شک آپ کا رب وہی ہے غالب، بہت رحم کرنے والا (104)

پرہیزگاروں اور گمراہوں کی جزا وسزا کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ اُزْلِفَتِ ﴾ بہ معنی "قُرِّبَتْ وَأُدْنِيَتْ" ہے، یعنی بہشت عنبر سرشت اہلِ موقف

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٩٠) فتح البيان (٩/ ٣٩١۔ ٣٩٤)

کے پاس لائی جائے گی، اس حال میں کہ مزخرف اور مزین ہوگی، یعنی آراستہ کی ہوئی سنوری سنورائی، اپنے دیکھنے والوں کے لیے ساز وسامان درست کی ہوئی۔ وہ لوگ یہی متقی اللہ سے ڈرنے والے ہیں، جنھوں نے اس میں رغبت کی اور دنیا میں جو کچھ آرام وعیش ہے، اس پر جنت کو اختیار کیا اور دنیا میں اس کے لیے عمل کیا، اور دوزخ ظاہر کی جائے گی، اور گمراہوں کے لیے اس کو کھولا جائے گا اور اس سے ایک گردن ظاہر ہوگی، پھر وہ ایک ایسی چیخ مارے گی جس سے دل حلق تک پہنچ جائیں گے اور اس کے لوگوں سے ڈانٹنے اور دھمکانے کے لیے کہا جائے گا، کہاں ہیں جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے تھے، کیا وہ تمھاری مدد کرتے ہیں یا تمھارا بدلہ لے سکتے ہیں، یعنی جن معبودوں کو تم نے پوجا ہے اللہ کے سوا، ان بتوں میں سے اور اللہ کے دشمنوں سے وہ اس قابل نہیں ہیں کہ آج کے دن تم سے کچھ دفع کر سکیں اور نہ ہی اپنی جان سے کچھ دور کر سکتے ہیں، کیوں کہ تم اور وہ آج کے دن دوزخ کا ایندھن ہو، تم اس پر وارد ہوگے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ﴾۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اس میں گرا دیے جائیں گے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ کے علاوہ لوگوں نے کہا ہے کہ "کبکبوا فیھا" "کاف" مکرر ہے، جس طرح کہ صرصر بولتے ہیں۔ صراح میں ہے: "کب برروی درافگندن وَكَبَّ اللّٰهُ عَدُوَّهُ وَكَبْكَبَهُ بِمَعْنًى" انتھی"، یعنی "کب" کے معنی منہ کے بل ڈال دینے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بعض بعض پر ڈال دیے جائیں گے کفار اور اُن کے سردار جنھوں نے ان کو شرک کی طرف بلایا۔

﴿ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴾ یعنی ابلیس کے سارے لشکر بھی اس میں ڈال دیے جائیں گے۔ ﴿ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿96﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿97﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی ضعیف لوگ ان سے کہیں گے جنھوں نے تکبر کیا کہ ہم تو تمھارے تابع تھے تو کیا تم ہم سے آگ کا کوئی حصہ دور کر سکتے ہو؟ اور یہ اس حال میں کہیں گے کہ اپنی جان پر ملامت کو دہراتے ہوں گے کہ اللہ کی قسم! ہم تو صریح گمراہی میں تھے، جب تم کو تمام جہانوں کے مالک کے برابر ٹھہراتے تھے، یعنی ہم تمھارے حکم کی اس طرح اطاعت کرتے تھے، جس طرح کہ رب العالمین کے حکم کی اطاعت کی جاتی ہے اور ہم نے تم کو رب العالمین کے ساتھ پوجا۔

﴿ وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ یعنی ہم کو اس کی طرف صرف مجرموں نے بلایا۔ ﴿ فَمَا لَنَا مِنْ شٰفِعِيْنَ ﴾ یعنی پھر کوئی نہیں ہماری سفارش کرنے والے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ شٰفِعِيْنَ ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ یہ آیت ایسی ہے جیسی یہ ہے: ﴿ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَاۤ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٣] "تو کیا ہمارے لیے کوئی سفارشی ہیں کہ وہ ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم ان اعمال سے ہٹ کر عمل کریں جو ہم (پہلے) کیا کرتے تھے؟ بے شک انھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا اور وہ ساری باتیں ہوا ہوگئیں جو وہ گھڑتے رہتے تھے۔"

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٦٧)

اسی طرح یہاں کہا ہے: ﴿ فَمَا لَنَا مِنْ شٰفِعِيْنَ ۝ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴾۔ حمیم سے مراد قریبی اور رشتہ دار ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! وہ جانتے ہیں کہ دوست جب صالح ہوگا تو نفع دے گا اور رشتے دار جب صالح ہوگا تو شفاعت کرے گا۔[1] ﴿ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی وہ اس بات کی تمنا کریں گے کہ دارِ دنیا کی طرف پھیر دیے جائیں، تاکہ اپنے رب کی اطاعت کے ساتھ عمل کریں اپنے زعم میں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اگر وہ دارِ دنیا کی طرف پھیر دیے جائیں تو پھر وہی کریں گے جس سے منع کیے گئے ہیں اور بے شک وہ البتہ جھوٹے ہیں۔ یہ تمنا ان کی بے معنی ہے۔

اللہ پاک سورت صٓ میں اہلِ نار کے جھگڑنے کی خبر دے چکا ہے، پھر فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴾ [صٓ: ٦٤] ''بلاشبہہ یہ اہلِ دوزخ کا باہم جھگڑنا حق ہے۔'' پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ﴾ یعنی بے شک ابراہیم کے اپنی قوم سے حجت کرنے میں اور ان پر حجتیں قائم کرنے میں توحید کے بارے میں البتہ بڑی واضح دلیل ہے، اس بات پر کہ لا الہ الا اللہ، یعنی نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جنت متقین کے لیے قریب کی جائے گی، تاکہ اس میں داخل ہوں، یا ایسی جگہ میں لائیں گے کہ متقی لوگ موقف (کھڑے ہونے کی جگہ) سے اس کا مشاہدہ کریں گے اور طرح طرح اور قسم قسم کی خوبیاں جو اس میں ہیں، ان پر واقف ہوں گے تو خوش ہوں گے، اس بات سے کہ اس کی طرف حشر کیے جائیں گے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا اس میں داخل ہونا قریب کر دیا جائے گا اور اُن کا اس کی طرف نظر کرنا۔[3] اور دوزخ غاوین، یعنی کافروں کے لیے ظاہر کر دی جائے گی، یعنی ان لوگوں کے لیے جو راہِ حق سے گمراہ ہیں۔

حق سے مراد ایمان اور تقویٰ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ اس طور پر ظاہر کی جائے گی کہ اس کو طرح طرح کی ہولناکیوں کے ساتھ دیکھیں گے جو اس میں ہیں اور اس بات کا یقین کر لیں گے کہ وہ اس میں واقع ہونے والے ہیں اور اس سے پھر جانے کا کوئی راستہ نہ پائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں داخل ہونے سے پہلے اس لیے ظاہر کی جائے گی کہ اس کو دیکھ کر کافروں کا حزن و ملال سخت ہو اور مومنوں کا سرور زیادہ ہو۔

ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر اُن سے کہا جائے گا: ﴿ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ کلمۂ ''ما'' موصولہ ہے، اس سے مراد بت اور شریک ہیں۔ ﴿ اَيْنَ مَا ﴾ کے طرزِ تحریر میں مصاحف کا اختلاف ہے کہ کلمۂ ''ما'' ''أَیْنَ'' کے ساتھ ملا ہوا لکھا جائے یا اس سے جدا لکھنا چاہیے۔ علاحدہ لکھنا زیادہ ظاہر ہے، اس لیے کہ یہ ''أَیْنَ'' وہ

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٣٦٩) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٤٩۔ ٤٥٠) [3] معاني القرآن (٤/ ٩٤)

نہیں ہے جو اس آیت میں ہے: ﴿ اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ ﴾ [النساء: ۷۸] ''تم جہاں کہیں بھی ہو گے، موت تمھیں پا لے گی۔'' کیوں کہ یہ ما زائد ہے اور بالاتفاق ملا ہوا لکھا جاتا ہے۔ کلمۂ ''أَيْنَ'' خبر مقدم ہے اور ''ما'' مبتدائے مؤخر ''أَيْ: آلِهَتُكُمْ أَيْنَ'' یعنی تمھارے معبود کس مکان میں ہیں، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے تھے۔ یہ سوال تبکیت وتوبیخ (سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ) کا ہے، اس کے جواب کی توقع نہیں کی جاتی ہے۔ کیا وہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں کہ تم سے عذاب کو دور کریں، یا اپنی جان سے عذاب کو دور کر سکتے ہیں، یہ سب ان کو ڈانٹ ڈپٹ اور زجر وتوبیخ ہے۔ مالک بن دینار رحمہ اللہ نے ''بَرَّزَتْ'' بفتحِ ''با ورا'' بصیغۂ معروف پڑھا ہے۔

﴿ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا ﴾ یعنی پھر وہ دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے سروں پر الٹ دیے جائیں گے، کسی نے کہا ہے کہ بعض پر بعض ڈال دیے جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ جمع کیے جائیں گے۔ ماخوذ ہے ''کبکبہ'' سے۔ ''کبکبہ'' جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ قول امام ہروی رحمہ اللہ کا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ''كوكب الشيء'' سے مشتق ہے۔ کوکب شے معظم شے کو کہتے ہیں اور گھوڑوں کی جماعت کو ''کوکب'' اور ''كبكبة'' بولتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''دُهْدِهُوْا'' ہے۔ ''دهدهه'' پتھر کے لڑھکانے کو کہتے ہیں۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے لگ بھگ ہیں، اصل اس کی ''كُبِّبُوْا'' ہے دو بائے موحدہ کے ساتھ۔ پہلا حرفِ با مشدد ہے دو حرف سے۔ پھر درمیان کے حرفِ ''با'' سے ''کاف'' بدلا گیا۔[1] ''کبکب'' تکریر ہے ''کب'' کی۔ ''کب'' کے معنی ''منہ کے بل ڈالنا'' ہیں۔

لفظ کی تکرار معنی کی تکرار پر دلیل ٹھہرائی گئی ہے، گویا کافر جس وقت آگ میں ڈالا جائے گا تو منہ کے بل گرے گا، ایک بار کے بعد پھر ایک بار اسی طرح گرتا رہے گا، یہاں تک کہ دوزخ کی تہہ میں جا کر قرار پکڑے گا۔ ''نعوذ بالله الرحيم الرحمن من النيران وأصحاب النيران'' امام زجاج رحمہ اللہ نے اس معنی کو ترجیح دی ہے کہ بعض ان کا بعض پر ڈالا جائے گا۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے اس معنی کو راجح کہا ہے کہ وہ اپنے سروں کے بل ڈالے جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی ''أُنْكِسُوْا'' ہیں۔ ''نكس وإنكاس'' بہ معنی نگوں سر کرنے کے ہیں۔

﴿ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ ﴾ کی ضمیر معبودوں کی طرف راجع ہے اور ﴿ الْغَاوٗنَ ﴾ سے عابد لوگ مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر قریش کی طرف پھرتی ہے اور ''غاوون'' سے مراد آلہہ واصنام ہیں۔ کسی نے کہا کہ جن اور کفار ہیں۔ امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا ﴾ بہ معنی ''جُمِعُوْا فِيْهَا'' اور ﴿ هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴾ مشرکینِ عرب اور آلہہ ہیں۔[2] انتہی

[1] فتح القدير (٤/ ١٤٢)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ٣٦٧) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٨٥) الدر المنثور (٦/ ٣٠٨)

﴿ جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ ﴾ سے مراد شیاطین ہیں، جو بندوں کو اغوا کرتے ہیں، بہکاتے ہیں اور وہ جنوں اور انسانوں سے ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد شیطان کی اولاد اور اس کے پیروکار ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر وہ شخص ہے جو بتوں کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ ﴿ اَجْمَعُوْنَ ﴾ اس ضمیر کی تاکید ہے جو "کُبْکِبُوْا" میں ہے اور جو اُن پر عطف کیا گیا ہے۔ ﴿ قَالُوْا ﴾ میں "غاوون" کی ضمیر ہے۔

جملہ ﴿ وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور مقولہ قول کا ﴿ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ ہے۔ کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ مخففہ ہے ثقیلہ سے، حرفِ لام فارق ہے اس کے اور ﴿ اِنْ ﴾ نافیہ کے درمیان، اور جملہ ﴿ قَالُوْا ﴾ اس کے ساتھ جو اس کے تحت ہے مستأنفہ ہے۔ سوال مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے پوچھا کہ جب ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا گیا جس کا ذکر ہو چکا ہے تو انھوں نے کیا کہا؟ سو یہ جملہ اس کا جواب ہے کہ "غاوون" کہیں گے، اس حال میں کہ وہ اپنے معبودوں سے جہنم میں جھگڑ رہے ہوں گے: قسم ہے اللہ کی! بے شک ہم البتہ کھلی گمراہی میں تھے، یعنی بے شک ہماری شان اور حال ہمارا ہونا تھا ظاہر گمراہی میں۔ ﴿ ضَلٰلٍ ﴾ سے اس جگہ مراد خسارہ و نقصان و بربادی اور ہلاکت اور حیرت ہے حق سے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ پاک بتوں کو بولنے کی طاقت عطا فرمائے، یہاں تک کہ باہم بات چیت کرنا اور جھگڑنا درست ہو جائے۔ یا یہ گفتگو گناہ گاروں اور شیطانوں کے درمیان واقع ہو گی۔

﴿ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ کے عامل میں کئی قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس میں عامل "كَوْنُهُمْ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ" ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ﴿ ضَلٰلٍ ﴾ ہے۔ اس قول میں ضعف ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ ﴿ مُبِيْنٍ ﴾ ہے۔ چوتھا یہ ہے کہ اس میں عامل وہ ہے جس پر کلام دال ہے۔ "كَأَنَّهُ قِيْلَ: ضَلَلْنَا وَقْتَ تَسْوِيَتِنَا لَكُمْ فِي الْعِبَادَةِ بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ" معنی یہ ہیں کہ ہمارا ظاہر گمراہی میں ہونا، اس وقت تھا کہ ہم تم کو رب العالمین کے ساتھ برابر ٹھہراتے تھے۔ یا ہم اس وقت گمراہی میں تھے یا کھلی گمراہی اس وقت تھی یا ہم گمراہ ہوئے جس وقت ہم نے رب العالمین کو تم جیسی کم تر اور ذلیل تر اور عاجز تر مخلوقات کے برابر ٹھہرایا۔

کوفیوں کا قول یہ ہے کہ ﴿ اِنْ كُنَّا ﴾ میں کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ نافیہ ہے اور لام بہ معنی "إلا" ہے، یعنی نہیں تھے ہم مگر کھلی گمراہی میں، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور وہ بصریوں کا مذہب ہے۔ مضارع کا صیغہ قصۂ ماضیہ کی صورت حاضر کرنے کو لایا گیا ہے۔ ﴿ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ یعنی ہم کو ہدایت سے صرف ان لوگوں نے گمراہ کیا جنھوں نے ہم کو بتوں کو پوجنے کی طرف بلایا۔ ان لوگوں میں جن، انسان اور شیاطین مراد ہیں۔ کسی نے کہا کہ ﴿ اَلْمُجْرِمُوْنَ ﴾ سے مراد ان کے رؤسا اور سردار ہیں، جنھوں نے ان کو گمراہ کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ابلیس اور اس کے لشکر ہیں اور آدم علیہ السلام کا پہلا بیٹا قابیل ہے، کیوں کہ اسی نے پہلے پہل قتل کو اور انواعِ معاصی کو نکالا ہے۔ کسی نے

کہا ہے کہ وہ شخص ہے جس نے شرک کا طریقہ نکالا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے پہلے لوگ ہیں، جن کی انھوں نے پیروی اختیار کی اور اُن کے قدم بقدم چلے۔

﴿ فَمَا لَنَا مِنْ شٰفِعِيْنَ ﴾ یعنی پھر ہماری سفارش کرنے والے کوئی نہیں کہ ہمارے لیے عذاب سے نکالنے کی سفارش کریں جس طرح کہ مومنوں کی سفارش کرنے والے فرشتوں، انبیاء اور مومنین میں سے ہیں۔ ﴿ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴾ اور نہ کوئی دوست قرابت والا ہے۔ ﴿ حَمِيْمٍ ﴾ وہ قریبی ہے کہ جس کو تو دوست رکھے اور وہ تجھ کو دوست رکھے۔ "شفعاء" کو بصیغۂ جمع ذکر کیا اور ﴿ صَدِيْقٍ ﴾ کو مفرد۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بارہا گزر چکا ہے کہ لفظ صدیق واحد، دو، جمع اور مذکر ومؤنث پر برابر بولا جاتا ہے، یا یہ وجہ ہے کہ عادت میں "شفعاء" کی کثرت ہوتی ہے اور "صدیق" کی قلت، اس لیے کہ صدیق وہ ہے جو تیری دوستی میں سچا پکا ہے، وہ اس شے سے غمگین ہو جاتا ہے جس نے تجھے غم میں ڈالا ہے، ایسا دوست بہت کم ہوتا ہے۔

کسی عقل مند سے صدیق کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ صدیق ایک اسم ہے کہ اس کے کوئی معنی نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک اسم ہے بلا مسمی۔ یا یہ وجہ ہے کہ ایک صدیق اس سے بڑھ کر سعی کرتا ہے جو شافع کرتے ہیں۔ ﴿ حَمِيْمٍ ﴾ "حَامَّةُ الرَّجُلِ" سے ماخوذ ہے۔ "حامة" آدمی کے خاص لوگوں کو اور اس کے اقربا کو کہتے ہیں۔ جب کوئی شے قریب ہو جاتی ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "حَمَّ الشَّيْءُ وَأَحَمَّ" اسی معنی سے "حُمّٰی" بہ معنی تپ (بخار) ہے، اس لیے کہ اجل سے قریب کر دیتی ہے۔ علی بن عیسیٰ رحمہ اللہ نے کہا کہ قریبی کا نام جو حمیم رکھا گیا تو اس لیے کہ وہ اپنے صاحب کے غصے کے سبب سے حمیت کرتا ہے۔ پس علی بن عیسیٰ رحمہ اللہ نے "حمیت" سے "حمیم" کو ماخوذ ٹھہرایا ہے۔[1]

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حمیم احتمام سے ماخوذ ہے بمعنی اہتمام۔ حاصل یہی ہے کہ حمیم سچا خالص دوست ہے کہ جو شے تجھے مہموم (غمگین) کرتی ہے وہی اس کو مہموم کرتی ہے۔[2] نفی میں اس جگہ دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے بالکل صدیق ہی کی نفی ہے، یا صرف اس کی صفت کی نفی ہے (یعنی یا تو وہاں کوئی خالص دوست نہ ہوگا، یا کوئی دوست ہوگا، مگر اس میں خلوص کی صفت نہ ہوگی۔)

﴿ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً ﴾ یہ بات انھوں نے بطور تمنا کے کہی جو کمال حسرت کا پتا دیتی ہے۔ گویا یوں کہا کہ کاش ہم کو دنیا کی طرف پھر جانا نصیب ہو۔ "تمنیٰ" کا جواب یہ ہے: ﴿ فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی تو ہم مومنین کے زمرے میں ہو جائیں، یہاں تک کہ شفاعت ہمارے لیے حلال ہو جائے جیسے ان کے لیے حلال ہوگئی۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١١٦) [2] الكشاف (٣/ ٣٢٧)

﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ﴾ یعنی یہ خبر ابراہیم علیہ السلام کی، اور ان کی قوم کا قصہ جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے، اس میں بے شک البتہ عبرت اور نشانی اور حجت اور نصیحت ہے اس شخص کے لیے جو اس سے بصیرت حاصل کرنا چاہے اور عبرت لینا چاہے، اس لیے کہ اس کا بیان نہایت عمدہ ترتیب اور بہترین تقریر پر واقع ہوا ہے، جو شخص اس میں غور وفکر کرے گا، اسے سمجھے بوجھے گا، اسے ان کے علم کی کثرت معلوم ہو جائے گی، کیوں کہ اس میں اتنے امور ہیں: ایک تو علوم دینی کی طرف اشارہ ہے، یعنی شرک کی نفی اور اللہ پاک قادرِ مطلق کی توحید کی طرف اور ان کے دلائل سے آگاہ کرنا ہے اور دوسرے قوم کو اچھے انداز میں دعوت پیش کرنا اور ان سے اچھے اخلاق سے معاملہ کرنا ہے اور ان پر کمال مہربانی کرنا ہے۔

تیسرے اپنے نفس میں امر کا تصور کرنا ہے کہ ﴿ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ ﴾ [الشعراء: ۷۷] کہا اور مقصود یہ ہے کہ وہ معبود تمھارے دشمن ہیں۔ چوتھے وعد و وعید کا اطلاق حکایت کے طور پر کیا ﴿ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ ﴾ اور ﴿ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ ﴾ میں، تاکہ اشاروں اشاروں سے ان کو بیدار اور ہوشیار کیا جا سکے اور ان کو بات پر غور کرنے اور قبول کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ کلمۂ "آیۃ" میں تنوین تعظیم اور تفخیم (بڑائی) کے لیے ہے، یعنی اس قصے میں بہت بڑی نشانی اور انتہائی عظیم الشان حجت اور نصیحت ہے۔

﴿ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴾ یعنی نہیں ہیں اکثر یہ لوگ جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم علیہ السلام کی خبر پڑھتے ہیں، یعنی قریش اور جو لوگ ان کے دین پر ایمان لانے والے۔ کسی نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ یہ لوگ سارے غیر مومن تھے۔

﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴾ اور بے شک تیرا رب البتہ اپنے دشمنوں پر قہر کرنے والا اور اپنے دوستوں پر بڑا مہربان ہے۔ یا دشمنوں پر بڑا مہربان ہے کہ ان کی سزا میں تاخیر کرتا ہے اور ان کو جلد عذاب نہیں کرتا۔[1] پھر اللہ پاک نے تیسرا قصہ نوح علیہ السلام کا ذکر فرمایا:

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾

قومِ نوح نے رسولوں کو جھٹلایا (105) جب ان سے ان کے بھائی نوح نے کہا: کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں؟ (106) بے شک میں تمھارے لیے امانت دار رسول ہوں (107) لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور

[1] فتح البیان (۹/ ۳۹۴۔ ۳۹۷)

میری اطاعت کرو (108) اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے (109) لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (110)

نوح علیہ السلام کے اپنی قوم کو تبلیغ کرنے کا بیان:

اللہ تعالیٰ اپنے بندے اور رسول نوح علیہ السلام کی خبر دیتا ہے۔ یہ پہلے رسول ہیں جن کو اللہ پاک نے زمین والوں کی طرف بھیجا، اس کے بعد کہ بتوں اور شریکوں کی پوجا کی گئی۔ اللہ پاک نے ان کو اس سے منع کرنے والا اور اس کے سخت اور ناگوار عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ ان کی قوم نے ان کو جھٹلایا اور جن برے اور گندے اعمال میں وہ مبتلا تھے، یعنی بتوں کو اللہ پاک کے ساتھ پوجا کرتے تھے، انھی برے افعال پر قائم رہے۔ انھوں نے جو نوح علیہ السلام کی تکذیب کی تو اللہ پاک نے اسے اس کے قائم مقام ٹھہرایا کہ انھوں نے سارے رسولوں کی تکذیب کی۔ اس لیے یوں فرمایا: ﴿ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ (105) اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ یعنی کیا تم اس بات سے نہیں ڈرتے ہو کہ تم بتوں کو پوجتے ہو۔

﴿ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴾ یعنی بے شک میں اللہ کی طرف سے تمھاری طرف رسول ہوں اور اس شے میں امین ہوں جس کو دے کر مجھے بھیجا ہے۔ میں اپنے رب کی رسالتیں تم کو پہنچاتا ہوں نہ ان میں بڑھاتا ہوں نہ ان میں سے کچھ گھٹاتا ہوں اور میں جو تمھاری خیر خواہی کرتا ہوں اس پر تم سے کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا، بلکہ اس کا ثواب اللہ پاک کے پاس ذخیرہ کرتا ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو، کیوں کہ اس بات میں جس کو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے، میری سچائی اور خیر خواہی اور امانت ظاہر اور واضح ہو چکی ہے۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ كَذَّبَتْ ﴾ بصیغۂ مؤنث کہا، اس لیے کہ اس کی نسبت قوم کی طرف ہے اور قوم جماعت کے معنی میں ہے، یا اُمت یا قبیلہ کے معنی میں۔ مصباح میں ہے کہ قوم مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے، اسی طرح ہر اسمِ جمع جس کا واحد اس کے لفظ سے نہیں ہے، جیسے: "رھط" اور "نفر" وہ بھی مذکر و مؤنث استعمال ہوتا ہے۔[2] تکذیب کو مرسلین پر واقع کیا، حالاں کہ انھوں نے تکذیب نہیں کی تھی، مگر اسی رسول کی جو اُن کی طرف بھیجا گیا تھا، یعنی نوح علیہ السلام۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے ایک رسول کی تکذیب کی تو اس نے مقرر تمام رسولوں کی تکذیب کی، اس لیے کہ ہر رسول اپنے سوا اور رسولوں کی تصدیق کرنے اور انھیں ماننے کا حکم کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ انھوں نے نوح علیہ السلام کی تکذیب ان کی رسالت میں کی اور اپنے بعد رسولوں کے آنے کی جو اُن کو خبر دی تو اس خبر

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٥٠) [2] المصباح المنير (١/ ٢٦٩)

میں بھی ان کی تکذیب کی۔ یا اس لیے کہ ان میں ایک زمانۂ دراز تک رہے اور بسے اس لیے وہ خود گویا رسل ہوئے۔

ان کو ﴿ اَخُوْهُمْ ﴾ کہا، یعنی ان کو قوم کا بھائی ٹھہرایا، تو یہ بھائی پن ان کے باپ کی طرف کا ہے۔ دین میں ان کے بھائی نہ تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بھائی پن ہم مجلس ہونے اور ہم نشین ہونے کا ہے، چوں کہ وہ ان میں اٹھتے بیٹھتے تھے، اس لیے ان کا بھائی کہہ دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ قولِ عرب میں ماخوذ ہے کہ "يَا أَخَا بَنِي تَمِيمٍ"، یعنی اے بنی تمیم کے بھائی!۔ مراد یہ ہے کہ ان میں سے ایک۔

﴿ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ یعنی کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے ہو کہ بتوں کو پوجنا چھوڑ دو اور اس کے رسول کا کہنا مانو، جس رسول کو اس نے تمھاری طرف بھیجا ہے۔ ﴿ اَمِيْنٌ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو بات میں تم کو اللہ کی طرف سے پہنچاتا ہوں، اس میں امین ہوں، یا جو کچھ تمھارے درمیان ہے، اس میں امین ہوں، کیوں کہ وہ لوگ ان کی امانت اور راستی کو پہچان چکے تھے۔

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک کی اطاعت کو اپنے لیے بچاؤ ٹھہراؤ اس کے عذاب سے، اور اس بات میں میرا کہنا مانو جس کا میں تم کو اللہ پاک کی طرف سے حکم کرتا ہوں، یعنی اس پر ایمان لاؤ اور شرک چھوڑ دو اور دین کے فرائض پر قائم رہو۔

﴿ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ﴾ یعنی میں تم کو رسالت پہنچانے پر تم سے کچھ مزدوری طلب نہیں کرتا اور نہ ہی اس میں تم سے کوئی طمع رکھتا ہوں۔ حرفِ "من" زائد ہے، مفعول میں استغراق کے لیے ہے، یعنی میں تم سے کسی قسم کی اُجرت کا طالب نہیں ہوں۔ ﴿ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی میرا اجر جس کو میں طلب کرتا ہوں اور چاہتا ہوں وہ صرف رب العالمین پر ہے نہ کہ اس کے غیر پر۔

نکتہ:

پانچ قصوں کے شروع میں جو تقویٰ کی رغبت دلائی اور اس پر آمادہ اور برانگیختہ کیا تو یہ اس پر دال ہے کہ انبیا علیہم السلام کی بعثت کا مقصد صرف لوگوں کو معرفتِ حق کی طرف دعوت دینا ہے اور اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا ہے، اس بات میں جو مدعوین کو ثوابِ الٰہی کے قریب کرتی ہے اور ان کو اللہ کے عذاب سے دور کرتی ہے۔ تمام انبیا علیہم السلام اس دعوت پر متفق تھے، اگرچہ بعض فروعی معاملات میں ان کی شریعتیں مختلف تھیں اور انبیا علیہم السلام مطامع دنی (کمینے طمع) اور دنیوی اغراض سے مبرا اور پاک صاف تھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴾ کی تکرار نفوس میں تاکید اور تقریر کے لیے ہے، یعنی اس کو بار بار لانے سے غرض یہ ہے کہ تقویٰ اور اطاعت دلوں میں جم جائے اور پختہ ہو جائے، باوجود اس کے کہ اس میں سے ہر

ایک سبب کے ساتھ معلق کیا گیا ہے۔ وہ سببِ اول میں تو امانت ہے اور دوسرے درجے پر طمع کو قطع کرنا ہے۔ اس کی نظیر یہ قول ہے: ''أَلَا تَتَّقِي اللّٰهَ فِي عُقُوقِي وَقَدْ رَبَّيْتُكَ صَغِيرًا، أَلَا تَتَّقِي اللّٰهَ فِي عُقُوقِي وَقَدْ عَلَّمْتُكَ كَبِيرًا'' یعنی کیا تو نہیں ڈرتا ہے اللہ سے میری نافرمانی میں، حالاں کہ میں نے تجھ کو حالتِ صغر میں پالا ہے۔ کیا تو نہیں ڈرتا ہے اللہ سے میری نافرمانی میں، حالاں کہ حالتِ کبر میں میں نے تجھ کو تعلیم دی ہے۔ اللہ پاک کے تقوے کا امر پہلے ذکر کیا، اس کے بعد اطاعتِ الٰہی کا امر کیا، اس لیے کہ اللہ پاک کا تقویٰ وجہ ہے اس کی اطاعت کی۔[1]

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿١١١﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٢﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٤﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٥﴾

انھوں نے کہا: کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں، حالاں کہ تیری پیروی تو رذیل لوگوں نے کی ہے (111) نوح نے کہا: اور مجھے کیا معلوم جو وہ عمل کرتے رہے ہیں (112) ان کا حساب تو میرے رب کے ذمے ہے، اگر تم کچھ شعور رکھتے ہو (113) اور میں مومنوں کو دور کرنے والا نہیں (114) میں تو کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں (115)

قوم کا نوح علیہ السلام کو جواب:

محنتی لوگوں کو رذیل کہا۔ پیغمبر کے ساتھ شروع میں غریب لوگ ہوئے ہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ مجھے ان کی سچائی قبول ہے، ان کے کام سے کیا غرض کہ ان کا پیشہ کیا ہے۔ انتہیٰ

وہ لوگ کہتے ہیں، ہم تجھ کو نہ مانیں گے اور نہ تیری پیروی کریں گے اور ہم اس بارے میں کمینے لوگوں کے پیچھے لگ جائیں، جنھوں نے تیری پیروی کی ہے اور تجھے مانا ہے۔ حالاں کہ وہ ہم میں سے رذیل لوگ ہیں اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴾ نوح علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی ان لوگوں نے جو میری پیروی کی ہے تو مجھے کون سی شے لازم آتی ہے، یعنی وہ اگر کسی خاص پیشے سے تعلق رکھتے ہوں تو میرے لیے یہ ضروری نہیں کہ میں ان کی حالت پر بحث اور غور کروں۔ میرے لیے تو یہ لازمی ہے کہ میں ان کا مجھ پر ایمان لانا قبول کرلوں اور اُن کے دل کے بھیدوں کو اللہ پاک کی طرف سونپ دوں، ان کا حساب میرے رب کے ذمے ہی ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو اور میں ایمان والوں کو ہانکنے والا نہیں ہوں۔

---

[1] فتح البیان (۹/ ۳۹۸۔ ۳۹۹)

گویا قوم نے نوح علیہ السلام سے یہ مطالبہ کیا کہ مومنین کو اپنے پاس سے دور کر دیں تو پھر قوم ان کی پیروی کرے گی۔ انھوں نے ان کی یہ بات نہ مانی اور کہہ دیا: ﴿ وَمَآ اَنَاْ بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ اَنَاْ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی میں تو صرف ڈرانے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں، لہٰذا جو کوئی میری اطاعت کرے اور میری پیروی اور تصدیق کرے تو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے۔ یعنی وہ میرا اور میں اس کا، شریف ہو یا کمینہ، جلیل ہو یا حقیر۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ استفہام انکار کے لیے ہے، یعنی ہم کیسے تیری پیروی اور تصدیق کریں اور تجھ پر ایمان لائیں، حالاں کہ تیری پیروی تو ارذل لوگ کر چکے ہیں۔ ''أَرْذَلُوْنَ'' ''أَرْذَل'' کی جمع ہے اور جمع مکسر ''أَرْذَالٌ'' ہے اور مؤنث ''رذلیٰ'' ہے۔ ''أَرْذَلُوْنَ'' وہ لوگ ہیں جو عزت اور مال میں کمتر ہیں۔ ''رذالة'' بہ معنی کمینہ پن اور ذلت ہے۔ ان کے مالوں اور عزت کی قلت کے سبب سے یا ان کے نسب کے پست ہونے کی وجہ سے ان کو رذیل شمار کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''أَرْذَلُوْنَ'' سے مراد جولاہے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ''سَفَلَةُ النَّاسِ وَأَرَاذِلُهُمْ''[2] یعنی رذیل کمینے لوگ۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ قافہ ہے۔[3] (قافہ جمع ہے قائف کی۔ قائف پے شناس کو کہتے ہیں جو قدم کے نقش کو پہچانتا ہے۔ عرب میں اس فن کے لوگ بڑے ماہر ہوتے تھے۔) کسی نے کہا: جولاہے اور کفش دوز (موچی)۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ لوگ خسیس پیشے والوں میں سے تھے۔ ''وَالصِّنَاعَةُ لَا تُزْرِيْ بِالدِّيَانَةِ'' یعنی حال یہ ہے کہ پیشہ دینداری کو عیب ناک نہیں کرتا، پس غنا دین کی غنا ہے اور نسب تقویٰ کا نسب ہے۔

جائز نہیں ہے کہ مومن کا نام ارذل رکھا جائے، اگرچہ وہ سب سے زیادہ محتاج آدمی ہو اور نسب میں سب سے زیادہ نچلے درجے کا آدمی ہو۔ انبیاء علیہم السلام کے پیرو ہمیشہ سے اسی طرح کے ہوتے آئے ہیں۔ ان لوگوں نے غنی اور مال دار لوگوں سے پہلے جلدی سے انبیا کی پیروی کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اغنیاء پر ریاست کا استیلاء (غلبہ) ہوتا ہے اور اس سے جدا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ کسی اور کا مطیع اور فرماں بردار ہونے سے شرم آتی ہے اور فقیر آدمی کو ایسے موانع کوئی نہیں ہوتے، اس لیے وہ جلد مان لیتا ہے اور فرماں برداری اختیار کر لیتا ہے۔ اہلِ دنیا میں زیادہ تر لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے، حالاں کہ یہ بات ان کی کم عقلی کی علامت ہے اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنی رائے کو حطامِ دنیا پر مقصور کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کے پاس دنیا کم ہے ان کی پیروی کر لینے کو اپنی پیروی کی رکاوٹ ٹھہرایا ہے اور جو شے ایمان کی طرف بلاتی ہے اس کے سبب سے جو وہ ایمان لائے تو ان کے ایمان لانے کو اس بات کی دلیل قرار دیا کہ

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٥٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٨٨) [3] تفسير الخازن (٥/ ١٢٢)

ایمان لانا باطل عمل ہے۔ "فَمَا أَسْفَهَهُمْ وَمَا أَجْهَلَهُمْ وَمَا أَرَكَّ عُقُولَهُمْ وَمَا أَسْخَفَ آرَاءَهُمْ" سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام ضحاک اور یعقوب حضرمی رحمہ اللہ نے "فَأَتْبَاعُكَ الْأَرْذَلُونَ" پڑھا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت حسن ہے۔ اس لیے کہ اس واؤ کے بعد اسماء بہت آیا کرتے ہیں۔ "اتباع" جمع "تابع" کی ہے۔[1]

غرض یہ کہ نوح علیہ السلام نے ان کی بات کا یہ جواب دیا: ﴿ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾. "کان" زائد ہے: "أَيْ وَمَا عِلْمِي بِعَمَلِهِمْ" یعنی مجھے اس کا مکلف نہیں کیا گیا کہ میں ان کے اعمال کا علم حاصل کروں، مجھے جو تکلیف دی گئی ہے تو اس بات کی کہ میں ان کو ایمان کی طرف بلاؤں اور ایمان کا اعتبار کرنے کے لیے مجھے ان کے پیشوں اور فقیری و امیری معلوم کرنے کا مکلف نہیں کیا گیا۔

انھوں نے جو ﴿ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴾ کہا تو گویا اس سے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ان کا ایمان لانا صحیح نظر اور مکمل سوچ بچار سے نہیں ہے۔ صرف مال اور بلندی کی توقع سے وہ ایمان لائے ہیں۔ نوح علیہ السلام نے اس کا یہ جواب دیا، یعنی میں ان کے باطنی حال سے واقف نہیں ہوں، میں تو اُن کی ظاہری حالت سے واقف ہوا ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ میں نے یہ بات جانی نہیں ہے کہ آیندہ زمانے میں اللہ پاک ان کو تو ہدایت کرے گا اور تم کو گمراہ کرے گا اور ان کو توفیق دے گا اور تم کو خوار کرے گا اور ان کو ہدایت دے گا اور تم کو بہکا دے گا۔

﴿ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴾ یعنی ان کا حساب اور ان کے دل کی باتوں کو تلاش کرنا اور ان کے اعمال کا حساب صرف اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اگر تم میں شعور اور فہم ہوتا تو اُن کو اُن کے پیشوں کی عار نہ دلاتے۔ جمہور نے ﴿ تَشْعُرُوْنَ ﴾ پڑھا ہے بتائے فوقیہ۔ امام ابن ابی عبلہ، ابن السمیفع، اعرج اور ابو زرعہ رحمہم اللہ نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ گویا کفار سے خطاب کرنا چھوڑا اور التفات کر کے ان کے حال کی خبر دینے لگے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "اَلصِّنَاعَاتُ لَا تَضُرُّ فِي بَابِ الدِّيَانَاتِ" یعنی پیشے دین کے بارے میں نقصان دہ نہیں ہوتے۔ حقیقت میں کیا خوب بات کہی ہے۔[2]

کفار کے کلام سے جو اس بات کا مطالبہ ظاہر ہوا تھا کہ مومنین کو اپنے پاس سے ہانک دیں تو نوح علیہ السلام نے اس کا یہ جواب دیا: ﴿ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾۔ یعنی تمھاری طلب بے سود ہے، میں مومنوں کو ہانکنے والا نہیں ہوں، کیوں کہ ﴿ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں، اس شے کو واضح کرنے والا ہوں جس شے کو پہنچانے کا اللہ پاک نے مجھ کو حکم فرمایا ہے کہ میں اس کو تمھاری طرف پہنچا دوں۔ یہ جملہ گویا ماقبل کی علت (وجہ) ہے۔[3]

---

[1] فتح القدیر (٤/ ١٤٤) [2] فتح القدیر (٤/ ١٤٥) [3] فتح البیان (٩/ ٣٩٩۔ ٤٠٠)

قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾

وہ بولے: اے نوح! اگر تو باز نہ آیا تو تُو سنگسار کیے گئے لوگوں میں سے ہوگا (116) نوح نے کہا: اے میرے رب! بے شک میری قوم نے مجھے جھٹلایا ہے (117) لہٰذا تو میرے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما اور مجھے اور جو میرے ہمراہ مومن ہیں ان کو نجات دے (118) چناں چہ ہم نے اسے اور جو (لوگ) بھری کشتی میں اس کے ساتھ تھے ان کو نجات دی (119) پھر اس کے بعد ہم نے باقی سب غرق کر دیے (120) بے شک اس میں عظیم نشانی ہے، اور ان کے اکثر مومن نہیں (121) اور بلاشبہ آپ کا رب، وہی ہے غالب، بہت رحم کرنے والا (122)

نوح علیہ السلام کو قوم کی دھمکی، ان کی بددعا اور قوم کی ہلاکت:

جب نوح علیہ السلام کا قوم میں ٹھہرنا دراز ہوا اور وہ رات دن، پوشیدہ اور ظاہر اور آہستہ اور پکار کر ان کو اللہ پاک کی طرف بلاتے رہے۔ جوں جوں وہ ان پر دعوت کو پیش کرتے، اتنے ہی وہ غلیظ کفر اور امتناعِ شدید پر پختہ ہوتے جاتے اور تکبر اور دشمنی پر جمتے جاتے تھے۔ دعوت نے اُن پر کچھ اثر نہ کیا، یہاں تک کہ آخر میں یہ بولے کہ اے نوح! اگر تو اپنے دین کی ہمیں دعوت دینے سے باز نہ آیا تو سنگسار ہوگا، یعنی ہم تجھے رجم کر ڈالیں گے۔ پس اس وقت انھوں نے اللہ پاک سے بددعا کی جو اس نے قبول کر لی۔

دعا یہ تھی: ﴿ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ جس طرح کہ دوسری آیت میں کہا ہے: ﴿ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ [القمر: ۱۰] ''تب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک میں بے بس ہوں، اب تو ہی انتقام لے۔'' اور اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴾ فلک مشحون سے مراد بھری ہوئی کشتی ہے۔ سامان و اسباب سے اور ہر شے کے جوڑوں سے جو ہر زوجین سے دو دو اس میں لاد لیے تھے، یعنی ہم نے نوح علیہ السلام کو نجات دی اور ان سب کو جو اُس کے تابع ہوئے تھے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ قوم نے کہا: اے نوح (علیہ السلام)! اگر تو ہمارے دین میں عیب کرنا اور ہمارے معبودوں کو گالی دینا نہ چھوڑے گا تو البتہ تو سنگسار کیے ہوؤں میں سے ہو جائے گا، یعنی ہم تجھے سنگسار کر ڈالیں گے۔ کسی نے کہا کہ ''مرجومین'' بہ معنی ''مشتومین'' (گالی دیے گئے) ہے۔ رجم کے معنی دشنام دادن بھی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تجھے گالیاں دیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی ''مقتولین'' ہے، یعنی ہم تجھے مار ڈالیں گے۔

غرض یہ کہ ایک مدت دراز تک ان کے اور قوم کے درمیان تکرار اور گفتگو ہوتی رہی، اس کے بعد زبانی بحث اور تکرار کو چھوڑ کر سختی اور توعد کی طرف رجوع ہوئے۔ ڈانٹنے، دھمکانے اور دباؤ ڈالنے لگے، یعنی سختی کرنے لگے۔ جب نوح علیہ السلام نے ان کی یہ بات سنی تو بولے: اے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلایا، یعنی میری تکذیب کی اور اس پر پکے ہو گئے، اس کے بعد کہ میں نے اتنی مدتِ دراز تک ان کو توحید کی طرف بلایا، مگر انھوں نے میری بات نہ سنی اور نہ ہی میری دعوت قبول کی۔ اس قول سے صرف ان کی غرض یہ تھی کہ وہ اس بات کو ظاہر کریں جس کے سبب سے ان پر بددعا کرنے پر وہ مجبور ہوئے ہیں، وہ یہی حق کا جھٹلانا ہے۔ انھوں نے جو ان کو ڈرایا دھمکایا یا ان کی بے عزتی کی، یہ بددعا کا سبب نہیں ہے۔

﴿ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا ﴾ ''فتح'' بہ معنی حکم ہے، یعنی تو ہمارے درمیان وہ حکم کر جس کا ہم میں سے ہر ایک مستحق ہے۔ غرض یہ ہے کہ عذاب اور ہلاکت نازل کر۔ سورت نوح میں جو انھوں نے مفصل دعا کی ہے، یہ اس دعا کی اجمالی حکایت ہے۔ ﴿ وَنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی اور نجات دے مجھ کو اور ان مومنین کو جو میرے ساتھ ہیں۔ یہ اسی افراد تھے چالیس مرد اور چالیس عورتیں۔ جب انھوں نے یہ دعا کی تو اللہ پاک نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴾ یعنی پس ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے بھری ہوئی کشتی میں نجات دی۔ وہ کشتی آدمیوں اور حیوانوں اور پرندوں سے بھری ہوئی تھی۔ ''شحن'' کشتی کے بھرنے کو کہتے ہیں، جس کشتی میں انسان اور جانور اور سامان و اسباب ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ''مشحون'' بہ معنی ''ممتلئ'' ہے۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: کیا تم جانتے ہو کہ مشحون کیا ہے؟ ہم نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: موقر۔ ان کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ فرمایا: مثقل۔[1] یعنی پھر ہم نے کشتی والوں کو نجات دینے کے بعد ان کی قوم سے باقی لوگوں کو ڈبو دیا۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ﴾ یعنی بے شک اس قصے میں البتہ ایک نشانی اور عظیم عبرت ہے۔ ﴿ وَمَا كَانَ

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٥٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٩١)

﴿ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ اس سے یہ بات سمجھائی کہ اگر ان کے آدھے بھی مومن ہوتے تو وہ پکڑے نہ جاتے۔ ﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾ یعنی بے شک تیرا رب البتہ قہر کرنے والا ہے، اپنے دشمنوں کو اور اس طریقے سے انتقام لینے والا ہے کہ جو کوئی جحد اور انکار کرتا ہے اور کفر پر جما رہتا ہے تو اس کی اہانت (توہین) کرتا ہے اور اس کو ذلیل وخوار فرماتا ہے اور اپنے دوستوں پر بڑا مہربان ہے اور ان پر انعام واکرام کرنے والا ہے، اس طور سے کہ جو کوئی توحید کا اقرار کرتا ہے، اس کی اعانت اور مدد فرماتا ہے۔[1] پھر اللہ پاک نے چوتھا قصہ ہود علیہ السلام کا ذکر فرمایا:

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۝١٢٣ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝١٢٤ۚ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝١٢٥ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝١٢٦ۚ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١٢٧ؕ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝١٢٨ۙ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝١٢٩ۚ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۝١٣٠ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝١٣١ۚ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝١٣٢ۚ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝١٣٣ۚۙ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝١٣٤ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝١٣٥ؕ

(قومِ) عاد نے رسولوں کو جھٹلایا ﴿123﴾ جب ان کے بھائی ہود نے کہا: کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿124﴾ بے شک میں تمھارے لیے امانت دار رسول ہوں ﴿125﴾ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ﴿126﴾ اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے ﴿127﴾ کیا تم ہر اونچی جگہ پر بطورِ کھیل تماشا یادگاریں بناتے ہو؟ ﴿128﴾ اور تم مضبوط محل بناتے ہو، شاید تم ہمیشہ (یہیں) رہو گے ﴿129﴾ اور جب تم (کسی پر) ہاتھ ڈالتے ہو تو سرکش بن کر ہی ہاتھ ڈالتے ہو ﴿130﴾ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ﴿131﴾ اور تم اس ذات سے ڈرو جس نے تمھیں ان چیزوں میں بڑھایا (امداد دی) ہے جو تم جانتے ہو ﴿132﴾ اس نے تمھیں بڑھایا ہے مویشیوں اور بیٹوں میں ﴿133﴾ اور باغوں اور چشموں میں ﴿134﴾ بلاشبہ میں تم پر یومِ عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿135﴾

---

[1] فتح البیان (۹/ ۴۰۰۔ ۴۰۲)

ہود علیہ السلام کا اپنی قوم کو وعظ و نصیحت:

ان لوگوں کو اونچے اور مضبوط منارے بنانے کا شوق تھا، جس سے کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی، سوائے نمود و نمایش کے اور رہایش کی عمارتیں بھی بڑے تکلف سے مال خراب کرنے کے لیے بناتے تھے۔ باغِ ارم بھی انہیں کا مشہور ہے۔ اللہ پاک اپنے بندے ہود علیہ السلام کی بابت اس بات کی خبر دیتا ہے کہ انھوں نے اپنی قومِ عاد کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔ ان کی قوم احقاف میں رہا کرتی تھی، یہ احقاف ریت کے پہاڑ تھے، جو بلادِ یمن کی طرف سے حضر موت کے قریب تھے، ان کا زمانہ نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد کا تھا، جیسا کہ سورت اعراف میں فرمایا ہے: ﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ﴾ [الأعراف: ٦٩] ”اور یاد کرو، جب اس نے قومِ نوح کے بعد تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تمھیں قد و قامت میں بڑھوتری دی۔“

یہ لوگ انتہا درجے کی قوت ترکیب و طاقت اور زور میں تھے۔ بڑے حملہ آور، سخت گیر اور دراز قد تھے۔ ان کے پاس کھانے پینے کی اشیاء اور مال اور اولاد بہت کثرت سے تھے۔ باغ، نہریں، کھیتیاں اور میوے بہت کچھ تھے۔ غرض یہ کہ دنیا کی طرح طرح اور قسم قسم کی خوبیاں ان کو حاصل تھیں اس سب کچھ کے باجود اللہ پاک کے ساتھ غیر اللہ کو پوجتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے ایک آدمی ہود علیہ السلام کو رسول و بشیر و نذیر بنا کر اُن کی طرف بھیجا اور انھوں نے ان کو اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی طرف دعوت دی اور اس کی مخالفت کی صورت میں اس کے انتقام، عذاب اور پکڑ سے ان کو ڈرایا۔ ان سے ویسا کہا جیسا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا۔

ہود علیہ السلام نے یہ فرمایا: ﴿ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴾ ﴿ رِيْعٍ ﴾ میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ ﴿ رِيْعٍ ﴾ مشہور شاہراؤں کے نزدیک بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ وہاں وہ بڑی بڑی، مضبوط اور ظاہری لحاظ سے بڑی شان و شوکت والی عمارتیں بناتے تھے۔ اسی لیے یوں کہا ہے: ﴿ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً ﴾ یعنی کیا تم ہر مشہور شاہراہ پر ایک عالی شان اور مشہور عمارت نشانی کے طور پر بناتے ہو۔

﴿ تَعْبَثُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ کام کرتے ہو یہ عبث ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں، یہ تم صرف لہو ولعب کے لیے اور اپنی قوت کا اظہار کرنے کے لیے بناتے ہو۔ اسی لیے ان کے نبی ہود علیہ السلام نے ان پر اس کا انکار کیا، کیوں کہ اس کام میں وقت کا ضائع کرنا ہے اور جسموں کو بے فائدہ کاموں میں لگا کر تھکانا ہے اور ایسی شے میں مشغول ہونا ہے جو نہ دنیا میں کوئی فائدہ دیتی ہے اور نہ آخرت میں اور اسی لیے یہ کہا: ﴿ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴾

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَصَانِعَ ﴾ ”بروج مشیده“ اور ”بنیان مخلد“ ہے، یعنی پختہ مکانات جو

ہمیشہ کو رہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے ایک روایت میں "بروج" کے معنی حمام ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ماخذ الماء" (یعنی وہ شے جس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے۔ "مآخذ" "ماخذ" کی جمع ہے۔ "ماخذ" بہ معنی حوض ہے۔) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض نے "كَأَنَّكُمْ خَالِدُوْنَ" پڑھا ہے[1] اور قراءتِ مشہورہ میں ﴿ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴾ ہے، یعنی تاکہ تم ان میں ہمیشہ اقامت کرو، حالاں کہ یہ بات تم کو حاصل ہونے والی نہیں ہے، بلکہ وہ تم سے زائل ہونے والی ہے، جیسے ان سے زائل ہوئی جو تم سے پہلے تھے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عون بن عبد اللہ بن عتبہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے جب کہ غوطہ میں وہ مکانات دیکھے جو مسلمانوں نے نئے بنائے اور درخت لگائے (غوطہ بالضم دمشق میں ایک مشہور جگہ ہے، نہایت اچھی آب و ہوا، جیسے: ہند میں کشمیر، دنیا کی جنتوں میں سے ایک یہ بھی ہے) تو اُن کی مسجد میں کھڑے ہوئے، پھر ندا کی: اے اہلِ دمشق! تو وہ اُن کے پاس جمع ہو گئے۔ پھر اللہ پاک کی حمد وثنا کی۔ پھر فرمایا: "أَلَا تَسْتَحْيُوْنَ؟ أَلَا تَسْتَحْيُوْنَ؟ تَجْمَعُوْنَ مَا لَا تَأْكُلُوْنَ، وَتَبْنُوْنَ مَا لَا تَسْكُنُوْنَ، وَتَأْمُلُوْنَ مَا لَا تُدْرِكُوْنَ، إِنَّهُ قَدْ كَانَتْ قَبْلَكُمْ قُرُوْنٌ يَّجْمَعُوْنَ فَيُوْعُوْنَ وَيَبْنُوْنَ فَيُوْثِقُوْنَ وَيَأْمُلُوْنَ فَيُطِيْلُوْنَ فَأَصْبَحَ أَمَلُهُمْ غُرُوْرًا وَّأَصْبَحَ جَمْعُهُمْ بُوْرًا وَّأَصْبَحَتْ مَسَاكِنُهُمْ قُبُوْرًا، إِلَّا إِنَّ عَادًا مَلَكَتْ مَا بَيْنَ عَدَنَ وَعُمَانَ خَيْلًا وَّرِكَابًا، فَمَنْ يَّشْتَرِيْ مِنِّيْ مِيْرَاثَ عَادٍ بِدِرْهَمَيْنِ؟"[2] یعنی کیا تم شرماتے نہیں ہو، کیا تم شرماتے نہیں ہو؟ جمع کرتے ہو وہ شے جس کو کھاتے نہیں ہو، بناتے ہو وہ مکان جس میں رہتے بستے نہیں ہو، آرزو کرتے ہو اس شے کی جس کو پاتے نہیں ہو، بے شک تم سے پہلے بہت سے قرن گزر چکے ہیں کہ وہ جمع کرتے تھے، پھر اس کو سینتتے تھے اور مکان بناتے، پھر اس کو پختہ اور مضبوط کرتے اور آرزو کرتے تو لمبی تڑنگی کرتے، پھر ان کی آرزو تو دھوکا ہو گئی اور اُن کا جمع کیا ہوا ہلاک ہو گیا اکارت گیا اور اُن کی رہایش گاہیں اور مکان قبریں ہو گئے، سنتے ہو! قومِ عاد جس قدر گھوڑے اور اُونٹ عدن اور عمان کے درمیان تھے، ان سب کے وہ مالک ہوئے، پھر کون شخص ہے جو مجھ سے میراثِ عاد دو درہم کے بدلے خرید لے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴾ اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو پنجہ مارتے ہو ظلم سے۔ ہود علیہ السلام ان کی قوت اور زور اور درشتی و سختی و جبروت و تکبر کا بیان فرماتے ہیں۔ ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴾ یعنی اپنے رب کو پوجو اور اپنے رسول کے مطیع ہو۔ پھر ان کو اللہ پاک نے جو نعمتیں دی تھیں، ان کا یاد دلانا شروع کیا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝١٣٢ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝١٣٣ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ اور ڈرو تم اس سے جس نے مدد دی تم کو اس چیز کے ساتھ کہ تم جانتے ہو۔ مدد دی تم کو چوپایوں کے ساتھ اور بیٹوں کے

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٧٥۔ ٣٧٦) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٧٩٤۔ ٢٧٩٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٧٩٩)

ساتھ اور باغوں اور چشموں کے ساتھ۔ ﴿ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴾ یعنی بے شک میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں اگر تم نے جھٹلایا اور مخالفت کی۔ پس انھوں نے رغبت دے کر اور ڈرا کر ہر طرح سے ان کو دعوت دی، مگر اس نے ان کو کچھ نفع نہ دیا۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ كَذَّبَتْ عَادُ ِۨ الْمُرْسَلِیْنَ ﴾ کی تانیث اس کی قبیلے کی طرف اسناد کے اعتبار سے ہے، کیوں کہ عاد ان کے پدرِ اعلیٰ کا نام ہے۔ یہ شخص سام بن نوح کی نسل سے تھا۔ مرسلین کے جھٹلانے کی وجہ، باوجود اس کے کہ انھوں نے صرف ایک ہی رسول کی تکذیب کی تھی، عن قریب نوح علیہ السلام کے قصے میں گزر چکی ہے۔

ہود علیہ السلام نسب کے لحاظ سے قومِ عاد کے بھائی ہوتے تھے اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ ﴾۔ یہ ایک خوبصورت تاجر تھے، جو آدم علیہ السلام سے مشابہ تھے، چار سو چونسٹھ برس زندہ رہے۔ ﴿ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ کی تفسیر ویسی ہے، جیسی کہ نوح علیہ السلام کے قول میں ابھی گزر چکی ہے۔ اسی طرح تفسیر ﴿ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝۱۲۵ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝۱۲۶ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ کی بھی ہو چکی ہے۔

زمین سے جو مکان بلند ہوتا ہے اس کو ﴿ رِیْعٍ ﴾ کہتے ہیں۔ ﴿ رِیْعٍ ﴾ "رِیْعَة" کی جمع ہے۔ محاورۂ عرب میں کہتے ہیں کہ "كَمْ رِیْعِ أَرْضُكَ؟" یعنی تیری زمین کی بلندی کتنی ہے؟ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ رِیْعٍ ﴾ بہ معنی ارتفاع ہے جمع "ریعة" کی۔ امام قتادہ، ضحاک اور کلبی رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ رِیْعٍ ﴾ بہ معنی طریق ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مقاتل اور سدی رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اہلِ لغت کے نزدیک ﴿ رِیْعٍ ﴾ کا اطلاق اس مکان پر جو زمین سے بلند ہے، مشہور و معروف ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ رِیْعٍ ﴾ بہ معنی کوہ ہے۔ اس کا واحد "ریعة" ہے اور جمع "أریاع" آتی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رِیْعٍ ﴾ دو پہاڑوں کے درمیان فراخ راہ ہے۔ ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ منظرہ ہے (جائے نگریستن وثنیہ پشتہ)۔ ان سے تیسری روایت یہ ہے کہ ثنیہ صغیرہ ہے، یعنی چھوٹا ٹیلہ۔[2] کسی نے کہا کہ بروجِ حمام (یعنی کبوتروں کے گھر جن میں وہ رہتے ہیں، معنی یہ ہیں کہ انھوں نے کبوتروں کے گھر بنائے تھے۔ پس ہود علیہ السلام نے ان کے بنانے سے ان کو منع کیا۔ ﴿ تَعْبَثُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ تم کبوتروں سے کھیلتے ہو۔ واللہ أعلم) امام ابن اعرابی نے کہا کہ ﴿ رِیْعٍ ﴾ بہ معنی صومعہ ہے (صومعۂ نصاریٰ معروف ہے اس کا سر باریک ہوتا ہے) اور ریع وہ برج ہے جو صحرا میں ہوتا ہے اور ریع تل عالی کو کہتے ہیں یعنی پشتۂ بلند۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۵۱۔ ۴۵۲)
[2] تفسیر الطبري (۱۹/ ۳۷۴)

﴿ رِيْعٍ ﴾ میں دو لغت ہیں: کسرہ و فتحِ رائے۔ سوالیہ انداز ملامت کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے اپنایا گیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کیا تم ہر بلند جگہ میں ایک علم اور نشانی اور عمارت بناتے ہو، جس کے بنانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کے ساتھ تم گزرنے والوں سے کھیل تماشا اور مسخرا پن کرتے ہو۔ اس لیے کہ تم اس بلند مکان سے راستے پر جھانکتے ہو، پھر جو کوئی تم پر گزرتا ہے، اس کو ایذا دیتے ہو اور اس سے ہنستے ہو۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا اس سے مراد عشارین کا عبث ہے (عشارین وہ لوگ ہیں جو راستوں پر بیٹھتے ہیں اور مسافروں سے ظلماً محصول لیتے ہیں)۔ جو لوگ اُن پر سے گزرتے ہیں، ان کے مالوں سے وہ لوگ عبث کرتے ہیں۔ اس قول کو امام ماوردی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

﴿ مَصَانِعَ ﴾ سے مراد وہ مکانات ہیں، جن کو لوگ منازل ٹھہراتے ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر بنا "مَصْنَعَةٌ" ہے، یعنی مضبوط قلعہ ہے۔ یہی قول امام کلبی رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حصونِ مشیدہ ہیں، یعنی محکم مضبوط قلعے۔ (قاله مجاهد وغيره) امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد مصانعِ ماء ہیں، یعنی پانی کے حوض جو زمین کے نیچے بنائے جاتے ہیں۔ اس کا واحد "مَصْنَعَةٌ" اور "مَصْنَعٌ" ہے، یعنی وہ حوض اور برکے جن میں وہ پانی جمع کیا کرتے تھے۔ پس "مَصَانِعُ" "صهريجون" کے قبیل سے ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مصنعه" حوض ہے، جس میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا ہے اور "مصانع" حصون ہیں۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مصانع" ہمارے نزدیک یمن کی لغت میں قصورِ عالیہ ہیں، یعنی بڑے بڑے اونچے محل۔[1]

﴿ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم ایسے ایسے اونچے مکان بناتے ہو، درآنحالیکہ تم اس بات کی امید رکھتے ہو کہ ہمیشہ دنیا میں رہو۔ اس لیے کہ تم بعث (دوبارہ جی اٹھنے کا) انکار کرتے ہو۔ اس وقت توبیخ یعنی ڈانٹ ظاہر ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ تم اس شخص کے عمل کی طرح عمل کرنے والے ہو جو خلود کی اُمید رکھتا ہے، اسی لیے تم ان کی عمارت کو محکم اور مضبوط کرتے ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ "لعل" استفہامِ توبیخی کے لیے ہے۔ یہ قول ابن زید کا ہے[2] اور اسی کے قائل کوفی لوگ ہیں۔ یعنی کیا تم ہمیشہ ہمیشہ رہو گے، جس طرح کہ عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: "لَعَلَّكَ تَشْتِمُنِي"، یعنی کیا تو مجھے گالی دیتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كَيْ تَخْلُدُوْا"، یعنی "لَعَلَّ"، بہ معنی "كَيْ" ہے۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اسی طرح پڑھا ہے، یعنی تاکہ تم ہمیشہ رہو، موت میں غور و فکر نہ کرو۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں: "كَأَنَّكُمْ بَاقُوْنَ مُخَلَّدُوْنَ"، یعنی گویا تم باقی اور ہمیشہ رہنے والے ہو۔ "لَعَلَّ" کے معنی تشبیہ ہوئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی "كَأَنَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ" کہا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ بعض قراءت میں "كَأَنَّكُمْ مُخَلَّدُوْنَ" ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: میں نے اس شخص کو نہیں دیکھا، جس نے اس پر تصریح کی ہو کہ

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٢٢۔ ١٢٣) فتح القدير (٤/ ١٤٥۔ ١٤٦)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ٣٧٦)

"لَعَلَّ" تشبیہ کے لیے ہوتا ہے۔ جمہور نے "تَخْلُدُوْنَ" بہ تخفیف پڑھا ہے اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے بہ تشدید پڑھا ہے۔[1]

(﴿ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝۱۲۸ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴾ ﴿ رِيْعٍ ﴾ بہ معنی جائے بلند ﴿ اٰيَةً ﴾ آیت بہ معنی علم و نشانی، وہ لوگ رستے کی بلند جگہوں میں اعلامِ طوال، یعنی اونچے اونچے مینار بناتے تھے، تاکہ مسافر اور راہ گیر لوگ ان سے اپنے سفر میں راہ پائیں۔ ہود علیہ السلام نے ان کو اس کام سے روکا اور اس کو عبث اور بے فائدہ ٹھہرایا، اس لیے کہ مسافر لوگ اپنے سفر میں ستاروں سے راہ پا لیتے ہیں، ان کی نشانیوں کے محتاج نہیں ہوتے تو اُن کا بنانا محض مال کو ضائع کرنا ہوا۔ فضول اور بے فائدہ مال ضائع کرنے پر ان کو ڈانٹا، یہ ایک معنی ہوئے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ مراد کبوتروں کے گھر ہیں، کبوتر بازی پر انھیں ڈانٹا کہ تم ہر بلند جگہ پر کبوتر خانے بناتے ہو اور کبوتروں سے کھیلتے ہو۔ تیسرے یہ معنی ہیں کہ تم ہر بلند جگہ پر مکان بناتے ہو اور جو کوئی تم پر سے گزرتا ہے، اس سے عبث کرتے ہو، اس کو چھیڑتے ہو، اس سے مسخرا پن کرتے ہو۔ یہ کام بھی ڈانٹنے کے قابل ہے کہ بے فائدہ مکان میں جمع ہونا اور لوگوں کو چھیڑنا اور ایذا پہنچانا اور ایسے مکان بنانے میں پیسہ برباد کرنا ہے۔ چوتھے یہ معنی ہیں کہ تم محل بناتے ہو اور اُن پر فخر کرتے ہو۔ فخر و مباہات کے لیے مکان بنانا قابلِ توبیخ ہے۔

﴿ مَصَانِعَ ﴾ سے مراد یا تو پانی کے حوض ہیں یا قصور ہیں، یعنی محل چونے گچ کے مضبوط۔ یا مراد مضبوط قلعے ہیں، یہ تین معنی ہوئے۔ یہ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا حاصل ہے۔[2] لیکن پہلے معنی کی بنا پر ڈانٹنے کی وجہ معلوم نہیں ہوتی، کیوں کہ پانی کے حوض بنانا ایک امرِ مباح ہے، بلکہ ایک فائدہ کا کام ہے، مگر جب امرِ مباح اپنی حد سے بڑھ جائے اور فخر و نمود اس کا مقصد ہو تو ایسا امرِ مباح بھی قابلِ توبیخ ہو سکتا ہے، ورنہ نفسِ محل، قلعہ، مکان بھی لائقِ توبیخ نہیں ہو سکتے۔ واللہ أعلم.

ہاں آخر کے دو معنوں کی بنا پر توبیخ کی وجہ یہ ہے کہ مکانوں کو اس طور پر محکم اور مضبوط کرنا کہ وہ اپنی خواہشات کی طوالت اور غفلت پر دال ہو تو ایسا کام بلا شک قابلِ توبیخ ہے۔ چنانچہ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴾ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ﴿ اٰيَةً ﴾ کے معنی قصور کے لیے جائیں اور ﴿ مَصَانِعَ ﴾ کے معنی بھی قصور ہوں تو یہ تکرار ہوگی، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہاں قصور پر مفاخرت کی وجہ سے توبیخ ہے اور دوسری جگہ پر باعتبار احکام اور قصور کی مضبوطی کے توبیخ ہے۔ اس حیثیت سے تکرار نہ ہوگی۔ واللہ أعلم.

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رِيْعٍ ﴾ سے مراد بلند مکان اور ﴿ اٰيَةً ﴾ سے مراد برج حمام یا مکان جو اپنی بلندی کی وجہ سے علامت کے مثل ہوتا ہے، جو شخص ان پر سے گزرتا ہے، اس سے مسخرا پن کرتے۔ ﴿ مَصَانِعَ ﴾ کے تین معنی ہیں، جو مذکور ہیں۔ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴾ "تَرْجُوْنَ الْخُلُوْدَ فِي الدُّنْيَا"[3] انتھی. امام محلی رحمہ اللہ کے

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٤٦) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٤٧۔ ٢٤٨) [3] تفسير النسفي (٣/ ١٩٣)

الفاظ یہ ہیں: ﴿ بِكُلِّ رِيۡعٍ ﴾ "مَكَانٌ مُرْتَفِعٌ"، ﴿ اٰيَةً ﴾ "بِنَاءً عَلَمًا لِلْمَارَّةِ"، ﴿ تَعۡبَثُوۡنَ ﴾ "بِمَنْ يَمُرُّ بِكُمْ وَتَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ وَالْجُمْلَةُ حَالٌ مِنْ ضَمِيْرِ تَبْنُوْنَ"، ﴿ تَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ ﴾ "لِلْمَاءِ تَحْتَ الْأَرْضِ"، ﴿ لَعَلَّكُمۡ ﴾ "كَأَنَّكُمْ"، ﴿ تَخۡلُدُوۡنَ ﴾ "فِيْهَا لَا تَمُوْتُوْنَ"[1] انتہیٰ. از مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ)

﴿ وَاِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِيۡنَ ﴾ یعنی جس وقت تم مارنے اور قتل کی نیت سے حملہ کرتے ہو تو جبار ہو کر، یعنی بغیر رافت اور نرمی اور مہربانی کے۔ "بطش" سطوۃ واخذ بعنف کو کہتے ہیں، یعنی دباؤ ڈالنا اور سخت گیری کرنا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جس وقت تم ارادہ کرتے ہو بطش کا، یہ اس لیے کہ شرط اور جزا متحد نہ ہو جائیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بطش کا جو اُن پر انکار کیا ہے تو اس لیے کہ بطش ظلم ہے۔ رہا حق میں تو کوڑے اور تلوار کے ساتھ بطش جائز ہے۔[2] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اونچے اونچے مکانوں کا بنانا حبِ دنیا پر دلالت کرتا ہے۔ یہ صفتیں الٰہیت کی ہیں بندے کو ان کا حاصل ہونا ممتنع ہے۔ غرضیکہ جب ہود علیہ السلام نے ان اوصافِ قبیحہ کے ساتھ ان کا وصف کیا، جو دال ہیں ظلم، عتو، تمرد، تجبر اور سرکشی پر تو ان کو تقویٰ کا حکم دیا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ﴾ یعنی تم اسباب میں اللہ سے ڈرو اور جس بات کا میں نے تم کو امر کیا ہے، اس میں میری اطاعت کرو۔ اول تقویٰ کا اجمال کیا، پھر اس کی یہ تفصیل کی: ﴿ وَاتَّقُوا الَّذِيۡۤ اَمَدَّكُمۡ بِمَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ یعنی تم اس اللہ سے ڈرو، جس نے تم کو طرح طرح کی نعمتوں اور قسم قسم کی بھلائیوں کے ساتھ مدد دی، جو تم کو حاصل ہیں اور تم ان کو جانتے ہو۔ (اس کو تقویٰ کی تفصیل کہنا غیر ظاہر ہے، بلکہ پہلے صرف اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ذات کا بیان کیا، پھر اس کے اوصاف اور انعامات کی تفصیل کے ساتھ ان کا اعادہ کیا۔ از مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ)۔

پھر اس اجمال کی یہ تفصیل کی: ﴿ اَمَدَّكُمۡ بِاَنۡعَامٍ وَّبَنِيۡنَ ۝١٣٣ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ﴾ یعنی اس نے تم کو چوپایوں اور بیٹوں کے ساتھ مدد دی اور باغوں اور نہروں اور کنوؤں کے ساتھ۔ فعل ﴿ اَمَدَّكُمۡ ﴾ کو دوبارہ اس لیے استعمال کیا تاکہ تاکید اور تقریر ہو، اس لیے کہ اس باب میں اجمال کے بعد تفصیل اور ابہام کے بعد تفسیر کرنے کو زیادہ تر دخل ہے۔ پھر انھیں وعظ و نصیحت کی اور ڈرایا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنِّيۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴾ یعنی اگر تم نے کفر کیا اور اسی بات پر مصر رہے جس پر تم ہو اور ان نعمتوں کا شکر نہ کیا تو مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔ مراد دنیا اور آخرت کا عذاب ہے، کیوں کہ نعمت کی ناشکری کرنا اپنے پیچھے عذاب کو لاتا ہے، جس طرح کہ نعمت کا شکر ادا کرنا اپنے بعد اور زیادہ نعمت کو لاتا ہے۔[3] غرض یہ کہ ہود علیہ السلام کے وعظ و نصیحت نے ان کو کچھ فائدہ نہ دیا، انھوں نے ان کی بات کا یہ جواب دیا:

---

[1] تفسیر الجلالین (١/ ٤٨٨) [2] فتح القدير (٤/ ١٤٦) [3] فتح البيان (٩/ ٤٠٢۔ ٤٠٤)

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿١٣٦﴾
اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿١٣٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٤٠﴾

انھوں نے کہا: ہمارے لیے برابر ہے، خواہ تو وعظ ونصیحت کرے یا نصیحت کرنے والوں میں
سے نہ ہو (136) یہ تو پہلوں ہی کی عادت ہے (137) اور ہم عذاب دیے جانے والے نہیں (138) پھر
انھوں نے اسے جھٹلایا تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، بلاشبہ اس میں عظیم نشانی ہے، اور ان کے
اکثر ایمان لانے والے نہ تھے (139) اور بے شک آپ کا رب وہی ہے غالب، بہت رحم کرنے والا (140)

قوم ہود علیہ السلام کا جواب اور ان کی ہلاکت کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک قوم ہود علیہ السلام کے جواب کی خبر دیتا ہے، جو اس نے ہود علیہ السلام کو دیا، اس کے بعد کہ انھوں نے قوم کو ڈرایا، انذار کیا، ان کو ترغیب وترہیب کی اور ان کے لیے حق کو ظاہر کر دیا۔ وہ بولے: ﴿ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴾ یعنی ہم جس بات پر ہیں اس سے نہ پھریں گے۔ ﴿ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [هود: ٥٣] ''اور ہم (صرف) تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم تجھ پر ایمان لانے والے (بھی) نہیں۔''

بات اسی طرح ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [البقرة: ٦] ''بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لیے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [يونس: ٩٦] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ بعض نے بفتح خا وسکونِ لام "خَلْقُ الْاَوَّلِيْنَ" پڑھا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور عوفی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور علقمہ اور مجاہد رحمہما اللہ سے روایت کیا ہے کہ اس قول سے ان کی مراد یہ ہے کہ نہیں ہے یہ شے جس کو تو لے کر ہمارے پاس آیا ہے، مگر اخلاقِ اولین ہے[1]، جس طرح کہ قریش کے مشرکوں نے کہا: ﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ [الفرقان: ٥] ''اور انھوں نے کہا: یہ اگلوں کے افسانے ہیں (جو) اس نے اپنے لیے لکھوائے ہیں اور وہ صبح وشام اس پر پڑھے جاتے ہیں۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ

عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٤] ''اور کافر لوگوں نے کہا: یہ (قرآن) تو نرا جھوٹ ہے، جسے وہ (نبی) خود گھڑ لایا ہے اور اس (کے گھڑنے) میں اور لوگوں نے اس کی مدد کی ہے۔ چنانچہ (اے نبی!) وہ ظلم و زیادتی اور جھوٹ پر اُتر آئے ہیں۔'' دوسرے لوگوں نے ﴿ خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ بضمِ خاء و لام پڑھا ہے۔

مراد یہ ہے کہ ان کا دین اور جس امر پر وہ قائم ہیں، وہ دین ہے اگلے باپ دادا کا، اور وہ ان کے تابع ہیں، ان کے پیچھے چلنے والے ہیں، زندہ رہیں گے جیسے وہ زندہ رہے اور مریں گے جس طرح وہ مرے، نہ بعث ہے نہ معاد۔ اسی لیے انھوں نے یوں کہا: ﴿ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ سے مراد دینِ اولین ہے۔ یہی امام عکرمہ، عطا خراسانی، قتادہ اور عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ کا بھی قول ہے۔ اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ اللہ کے نبی ہود علیہ السلام کی تکذیب، مخالفت اور دشمنی پر قائم رہے۔ اللہ پاک نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ ان کو ہلاک کرنے کا سبب قرآن شریف میں نو (۹) مرتبہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ پاک نے ریح صرصر عاتیہ کو ان پر بھیجا، یعنی نہایت سخت چلنے والی اور انتہائی سرد ہوا۔ چنانچہ ان کے ہلاک کرنے کا سبب انہیں کی جنس سے ہوا، کیوں کہ وہ حد درجہ کے زیادتی کرنے والے، سرکش اور جابر و ظالم تھے۔ پس اللہ پاک نے ان پر وہ شے مسلط کی جو ان سے بھی زیادہ ترعاتی اور سرکش اور قوی اور زوردار تھی جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ [الفجر: ٦۔ ٧] ''کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا؟ (عادِ) ارم جو اونچے ستونوں والے تھے۔''

یہ لوگ عادِ اولیٰ ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰى ﴾ [النجم: ٥٠] ''اور بلاشبہ اسی نے پہلے عادیوں کو ہلاک کیا۔'' یہ لوگ ارم بن سام بن نوح کی اولاد سے تھے۔ ﴿ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ یعنی وہ لوگ کہ عمد میں بستے تھے، جس کسی نے یہ زعم کیا ہے کہ ارم ایک شہر ہے اس نے اس قول کو اسرائیلیات سے لیا ہے۔

امام کعب اور وہب رحمہ اللہ کے کلام سے اس کی کوئی اصل اصیل نہیں ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴾ [الفجر: ٨] ''جن کے مانند کوئی قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی۔'' اگر اس سے مراد کوئی شہر ہوتا تو اللہ پاک یوں فرماتا: "اَلَّتِي لَمْ يُبْنَ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ" اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴾ [حم السجدة: ١٥] ''پھر جو عاد تھے تو انھوں نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور بولے: قوت میں ہم سے زیادہ سخت کون ہے۔ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ جس نے انھیں پیدا کیا وہ

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٧٨۔ ٣٧٩) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٧٩٧)

قوت میں ان سے زیادہ سخت ہے۔ اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔''

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اللہ پاک نے ان پر بیل کی ناک کے برابر ہوا بھیجی، وہ ہوا اپنے خازنوں، موکلوں اور داروغوں پر سرکش ہوئی، یعنی مارے زور کے ان کے حکم سے نکلی جاتی تھی۔ پھر اللہ پاک نے اس کو اس باب میں اذن دیا تو وہ چلی اور اس نے ان کے بلاد کو کنکروں سے مارا، پھر ان کی ہر شے کو کنکروں سے ہلاک کر ڈالا، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا ﴾ [الأحقاف: ٢٥] ''وہ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر دے گی۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُومًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَىٰ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴾ [الحاقة: ٦۔ ٧] ''اور جو عاد تھے تو یخ تند و تیز بے قابو آندھی سے ہلاک ہوئے۔ اللہ نے اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن جڑ کاٹنے (فنا کرنے) کے لیے مسلط رکھا، پھر آپ اس قوم کو پچھاڑے (ہلاک کیے) ہوئے دیکھتے ہو، گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔'' یعنی وہ بدن باقی رہ گئے بغیر سروں کے۔ یہ یوں ہوا کہ ان میں کے آدمی کے پاس ہوا آتی، پھر اسے اُکھاڑتی اور ہوا میں اوپر اُٹھا لے جاتی، پھر اسے اس کے دماغ کے بل اوندھا مارتی، پھر اس کے دماغ کو کچلتی اور اس کے سر کو توڑتی اور اس کو ڈال دیتی، گویا وہ کھجور کی جڑیں ہیں جو اُکھڑی پڑی ہیں۔ انھوں نے پہاڑوں، کنوؤں اور غاروں میں اپنا بچاؤ کیا تھا، ان میں محفوظ ہو کر بیٹھے تھے، اپنے لیے زمین میں آدھے بدن تک گڑھے کھودے تھے، غرض یہ کہ ان میں بیٹھ کر بچ رہیں گے، مگر اس کام نے اللہ کے حکم سے کچھ بھی ان سے دور نہ کیا۔ یہ کاریگری ان کے کچھ کام نہ آئی، کیوں کہ اللہ کی اجل جس وقت آ جاتی ہے تو پھر تاخیر نہیں کی جاتی، اسی لیے اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَاهُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴾.[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ تیرا وعظ کرنا اور نہ کرنا ہمارے نزدیک دونوں برابر ہیں، ہم اس میں سے کسی شے کی پروا نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی طرف توجہ کرتے ہیں جو تو کہتا ہے اور نہ اس کے سبب سے اس حال سے باز رہتے ہیں جس میں ہم ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ انھوں نے یہ بات ظاہر کی کہ ہم کو تیری باتوں کی کچھ پروا نہیں ہے اور جو نصیحتیں تو نے کی ہیں وہ ہلکی، خفیف اور بے حقیقت ہیں۔ وعظ ایک کلام ہے جو دل کو نرم کرتا ہے وعد اور وعید کے ذکر کے ساتھ۔ ﴿ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ ﴾ کہا۔ ''أَمْ لَمْ تَعِظْ'' نہ کہا واسطے رؤس آیات کے اور قافیوں کی رعایت کے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس کی ایک وجہ بیان کی ہے، کہا ہے کہ یہ عبارت ان کے ہود علیہ السلام کے وعظ کو کم اہمیت دینے میں ''أَمْ لَمْ تَعِظْ'' سے زیادہ بلیغ ہے۔[2]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٥٢۔ ٤٥٣) [2] الکشاف (٣/ ٣٣١)

مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو یہ کہا: ﴿ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴾ تو ان کی غرض اس سے یہی ہے کہ ہم تمھارے وعظ کو کسی گنتی اور شمار میں نہیں لاتے۔ ہمارے نزدیک اس کی کچھ قدر نہیں ہے، محض بے حقیقت ہے۔ یہ مضمون دو عبارتوں میں ادا ہوسکتا ہے۔ ایک یہ ہے: ﴿ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴾۔ دوسری یہ ہے: "أَ وَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَعِظْ" لیکن ان دونوں میں فرق ہے، پہلی میں دوسری کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، کیوں کہ پہلی کے معنی ہیں: ہم پر برابر ہے کہ تو اس فعل کو کرے جو وعظ ہے یا تو اصلاً اہلِ وعظ میں سے نہ ہو۔ یعنی تیرے وعظ سے ہماری بے پروائی میں تیرا وعظ اور تیرا اصلاً اہلِ وعظ سے نہ ہونا، دونوں برابر ہیں، گویا یوں کہا کہ تو وعظ کرے یا تو چکنا پتھر ہو، ہمارے نزدیک دونوں باتیں برابر ہیں۔ بلاشک اس میں "أَ وَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَعِظْ" سے زیادہ مبالغہ ہے۔

اسی لیے اس کے باوجود کہ مقابلہ اسی عبارت کا مقتضی تھا اور یہ مختصر بھی تھی، لیکن اوپر ذکر کیے گئے مبالغے کی وجہ سے پہلی عبارت کو اس کے طول کے باوجود اختیار کیا۔ عباس رحمہ اللہ نے ابوعمرو رحمہ اللہ سے اور بشر رحمہ اللہ نے کسائی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: "أَوَعَظتَّ" بادغامِ ظا کے تائے فوقیہ میں۔ یہ قول بعید ہے اس لیے کہ حرفِ ظاء حرفِ اطباق ہے، وہ اسی حرف میں مدغم ہوتا ہے جو مخرج کے لحاظ سے اس سے انتہائی قریب ہو۔ امام عاصم، اعمش اور ابن محیصن رحمہم اللہ سے بھی یہ قول مروی ہے۔ باقی قراء کی قراءت بہ اظہارِ طائے معجمہ کے ساتھ ہے۔

﴿ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ ماقبل کی تعلیل ہے، یعنی یہ دین جس کو تو لے کر ہمارے پاس آیا ہے یہ نہیں ہے، مگر اگلوں کی عادت جس پر وہ تھے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ نہیں ہے یہ جس پر ہم ہیں مگر عادت اولین کی۔ یہ معنی اس بنا پر ہیں جو امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ کے معنی "عَادَةُ الْأَوَّلِيْنَ" ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام فراء رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿ خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ بہ معنی "عَادَةُ الْأَوَّلِيْنَ" ہے اور محمد بن ولید نے ہم سے حکایت کیا ہے، وہ محمد بن یزید سے راوی ہیں، کہا کہ ﴿ خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ سے مراد اگلوں کا مذہب ہے اور وہ شے جس پر ان کا امر جاری ہوا، یہ دونوں قول ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ کہا اور محمد بن یزید سے ہم کو یہ حکایت کی کہ ﴿ خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ کے معنی "تَكْذِيْبُ الْأَوَّلِيْنَ" ہیں۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ان لوگوں نے یہ کہا ہے کہ نہیں ہے یہ جس کی طرف تو ہم کو بلاتا ہے، مگر کذب ہے اگلوں کا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا اور یہ قول ہے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام مجاہد رحمہ اللہ کا کہ خلق و اختلاق بہ معنی کذب ہے۔ اس معنی سے یہ آیت ہے: ﴿ وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ﴾ [العنکبوت: ۱۷] ''اور تم جھوٹ گھڑتے ہو۔'' ابن کثیر، ابوعمرو، کسائی اور یعقوب رحمہم اللہ نے "خَلْقُ" بہ فتح خاء وسکونِ لام پڑھا ہے، باقی کی قراءت بضمِ ہر دو ہے۔ امام ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلی قراءت کی بنا پر اس کے معنی اختلاق اور کذبِ اولین ہیں اور دوسری قراءت کی بنا پر

"عَادَةُ الْاَوَّلِيْنَ" ہیں۔ یہ تفصیل ضروری ہے۔ امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "خلق" بہ معنی دین وطبع ومروۃ ہے۔ امام ابو قلابہ رحمہ اللہ نے بضم خاء وبسکونِ لام پڑھا ہے، یہ قراءتِ ضم ہر دو کی تخفیف ہے۔[1]

ظاہر یہ ہے کہ آیت سے مراد اسی شخص کا قول ہے جس نے کہا کہ معنی یہ ہیں: نہیں ہے یہ جس پر ہم ہیں، مگر عادت اولین کی اور اُن کا فعل۔ اس کی تائید اُن کا یہ قول کرتا ہے: ﴿ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾ یعنی ہم عذاب نہ کیے جائیں گے، بطش وغیرہ پر جو ہم کرتے ہیں، من جملہ ان اعمال کے جن پر ہم قائم ہیں دنیا میں اور نہ بعث ہے نہ حساب۔

﴿ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ﴾ یعنی پھر انھوں نے ہود علیہ السلام کی تکذیب کی، مطلب یہ ہے کہ اس کی تکذیب پر اصرار کیا تو ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا، دنیا میں ہوا کے عذاب سے، جس طرح کہ قرآن شریف نے کئی جگہ اس کی تصریح فرمائی ہے۔ یہ ہوا سرد تھی اور نہایت سخت آواز والی تھی۔ یہ سات رات اور آٹھ دن تک ان پر مسلط کی گئی تھی۔ اس کا شروع چہار شنبہ کی صبح سے ہوا تھا، شوال کی آٹھ راتیں باقی رہی تھیں اور موسمِ سرما کے آخر میں وہ ہوا چلی تھی۔ پھر جب اللہ پاک ہود علیہ السلام اور اُن کی قوم کے قصے سے فارغ ہوا تو صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کا قصہ ذکر کیا۔[2] چنانچہ ارشاد فرمایا:

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

(قومِ) ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا ﴿141﴾ جب ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا: کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں؟ ﴿142﴾ بلاشبہہ میں تمھارے لیے امانت دار رسول ہوں ﴿143﴾ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ﴿144﴾ اور میں اس (تبلیغ) پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے ﴿145﴾

صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کا تذکرہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے بندے اور رسول صالح علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ اس نے ان کو ان کی قومِ ثمود کی طرف بھیجا۔ یہ لوگ عرب تھے اور مدینۂ حجر میں بستے تھے، جو وادی القریٰ اور بلادِ شام کے درمیان تھا۔ ان کی رہایش گاہیں اور مکانات مشہور ہیں۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے شام کو عبور کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ تبوک کی طرف پہنچے، پھر مدینے کی طرف مراجعت فرمائی، تاکہ اس کے لیے تیاری کریں، اس وقت آپ ﷺ کا

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٢٤۔ ١٢٥) فتح القدير (٤/ ١٤٧۔ ١٤٨) [2] فتح البيان (٩/ ٤٠٤۔ ٤٠٦)

گزر دیارِ ثمود پر ہوا، اس بارے میں جو حدیثیں مروی ہیں، ان کو ہم سورت اعراف میں ذکر کر آئے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ قومِ عاد کے بعد اور خلیل جلیل علیہ السلام سے قبل تھی۔ ان کے نبی صالح علیہ السلام نے ان کو اللہ عزوجل کی طرف بلایا کہ اسی وحدہ لا شریک لہٗ کو پوجیں اور جو رسالت ان کو پہنچائی ہے، اس میں ان کی اطاعت کریں۔ مگر انھوں نے ان کو نہ مانا اور ان کو جھٹلایا اور اُن کی مخالفت کی۔ ان کو اس بات کی خبر دی کہ ان کو دعوت دینے کے عوض میں ان سے کچھ مزدوری نہیں چاہتے، وہ تو اس کا ثواب اللہ عزوجل سے طلب کرتے ہیں۔ پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں اور احسانات تھے، وہ ان کو یاد دلائے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مرسلین سے مراد صالح علیہ السلام ہیں۔ رسولوں کو جمع لانے کی وجہ پہلے گزر چکی ہے۔ ثمود صالح علیہ السلام کے قبیلہ کا نام ہے۔ آپ کے دادا کا نام ثمود تھا، انہیں کا نام قبیلے کا نام رکھ دیا، اسی لیے ان کو قوم کا بھائی کہا۔ نسب کے اعتبار سے وہ ان کے بھائی تھے، کیوں کہ پدرِ اعلیٰ میں قوم کے ساتھ جمع ہوتے تھے۔ دو سو اسی برس زندہ رہے۔ ان کے اور ہود علیہ السلام کے درمیان ایک سو برس کا فاصلہ تھا۔ باقی آیات کی تفسیر ہود علیہ السلام کے قصے میں ابھی گزر چکی ہے۔[2] غرض یہ کہ صالح علیہ السلام نے قوم کو اللہ پاک کی نعمتیں یاد دلائیں۔ چنانچہ فرمایا:

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هٰهُنَا اٰمِنِيْنَ ﴿١٤٦﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٤٧﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿١٤٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٥٠﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٥١﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿١٥٢﴾

کیا تمھیں یہاں کی چیزوں میں پر امن چھوڑ دیا جائے گا (146) (یعنی) باغوں اور چشموں میں (147) اور کھیتوں اور کھجوروں میں جن کے خوشے نرم و نازک ہیں (148) اور تم اِتراتے ہوئے پہاڑوں سے گھر تراشتے ہو (149) چناں چہ تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (150) اور تم حد سے بڑھنے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو (151) جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے (152)

صالح علیہ السلام کی اپنی قوم کو نعمتوں کی یاددہانی:

صالح علیہ السلام اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں اور اُن کو اس بات سے ڈراتے ہیں کہ ان پر اللہ پاک کے عذاب نازل ہوں۔ ان پر جو طرح طرح کی اور قسم قسم کی نعمتیں ہیں، وہ ان کو یاد دلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو طرح طرح

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٥٣) [2] فتح البیان (٩/ ٤٠٦)

کا رزق اس کثرت سے عطا کیا تھا، گویا ان پر مینہ کی طرح برس رہا تھا، ان کو خوفناک چیزوں سے بے خوف رکھا تھا، ان کو ہر قسم کا امن دیا ہوا تھا، ان کے لیے باغات لگا دیے تھے، ان کے لیے چشمے نکال دیے تھے اور ہر قسم کی کھیتیاں اور میوے پیدا کیے تھے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴾ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے تم کو ہر قسم کی نعمتیں عطا کیں، چشمے، کھیتی اور کھجور کے باغ تم کو دیے۔ تم رات دن ایسی ایسی نعمتوں میں لوٹ پوٹ ہو رہے ہو اور خوب عیش و آرام میں رہتے ہو، بے روک ٹوک اور بے خوف اچھی طرح سے بسر کرتے ہو۔ تم کو چاہیے کہ جس مالک الملک نے تم کو یہ سب کچھ محض اپنے فضل و کرم سے دیا ہے، ان نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرو اور ایسے کام مت کرو کہ تم پر اس کا عذاب اور سزا نازل ہو۔

امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ "أَيْنَعَ وَبَلَغَ فَهُوَ هَضِيمٌ"[1] مطلب یہ ہے کہ جب کھجور کے درخت کا شگوفہ پختہ ہو جاتا ہے تو اس کو "ھضیم" کہتے ہیں۔ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ کے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ ﴿ هَضِيمٌ ﴾ یعنی "معشبة" (تفسیر ابن کثیر میں اسی طرح ہے۔[2] فتح القدیر و فتح البیان میں "معشب" ہے۔[3] ظاہراً ٹھیک یہی معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ "طلع" مذکر ہے، ہاں باعتبارِ جنس مؤنث ہونا درست ہوسکتا ہے۔ واللہ أعلم)۔

مطلب یہ ہے کہ عشب گیاہِ تر کو کہتے ہیں، معنی یہ ہوئے کہ ان کا شگوفہ تر و تازہ ہے۔ اسماعیل بن ابی خالد رحمہ اللہ نے عمرو بن ابی عمرو سے روایت کیا ہے اور عمرو نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پایا ہے، یہ سیدنا عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے راوی ہیں، فرمایا کہ "إِذْ أَرْطَبَ وَاسْتَرْخَى"۔ حاصل یہ ہے کہ درختِ خرما کے شگوفے کی کھجوریں پک جاتی ہیں اور وہ لٹک پڑتا ہے تو اس شگوفے کو ہضیم کہتے ہیں۔ گویا معنی یہ ہوئے کہ ان کے شگوفے کی کھجوریں پکی ہوئی ہیں اور مارے کھجوروں کی کثرت کے جھک گیا ہے، ٹوٹا پڑتا ہے۔ آخری قول کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ امام ابو صالح رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔[4]

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے یہی تین قول فتح البیان اور فتح القدیر میں مذکور ہیں۔[5] حاصل سب کا یہی ہے کہ ان کے شگوفے تر و تازہ اور پختہ ہیں، ان میں کھجوریں بہ کثرت ہیں، مارے کثرت کے ٹوٹے پڑتے ہیں، چنانچہ یہ مقامِ امتنان ہے، یعنی اللہ کے احسان کا مقام ہے۔ کھجور کے درختوں کو وصفِ مذکور کے ساتھ اس لیے موصوف کیا ہے، کیوں کہ کھجور کے باغ کی یہ حالت انتہائی پسندیدہ اور مطلوب ہوتی ہے۔ امام ابو اسحاق رحمہ اللہ نے امام ابو العلاء رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ "هُوَ الْمُذَنَّبُ مِنَ الرُّطَبِ". امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "هُوَ الَّذِي إِذَا يَبِسَ تَهَشَّمَ وَتَفَتَّتَ وَتَنَاثَرَ"[6]

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٣٨٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٠١) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٥٣)
[3] فتح القدير (٤/ ١٤٩) فتح البيان (٩/ ٤٠٧) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٠١)
[5] فتح القدير (٤/ ١٤٩) فتح البيان (٩/ ٤٠٧) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٠١_ ٢٨٠٢)

قولِ اول کی بنا پر ''طَلْعٌ هَضِيْمٌ'' کے یہ معنی ہیں کہ اس شگوفے کی پکی کھجوریں خشک کی گئی ہیں۔ کھجور والوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ کوئی تو پکی تر و تازہ کھجور کھاتا ہے، کوئی اس کے شگوفے کو توڑ کر سکھا کر کھاتا ہے۔ ہر ایک میں علاحدہ لذت ہوتی ہے، کسی کو یہ پسند ہے، کسی کو وہ مرغوب ہے۔ احسان یہ ہوا کہ اللہ نے تمھارے لیے ایسے ایسے عمدہ میوے پیدا کیے ہیں کہ ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق اس سے فائدہ اور مزہ اٹھاتا ہے۔

دوسرے قول کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ جس وقت شگوفہ خشک ہو جاتا ہے تو ٹوٹ جاتا ہے اور بکھر پڑتا ہے۔ یہ حالت اس کے خوب پک جانے کی ہے۔ احسان یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس کو اپنی قدرت سے پیدا کیا اور محفوظ رکھا، پھر اس کی انتہائی پسندیدہ اور مطلوب حالت کو پہنچایا، پھر وہ خشک ہو کر بکھر گیا، یہ سب تم پر انعام ہے کہ مزے سے اس کو کھاؤ اور مالک کا شکر ادا کرو۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے عبدالکریم رحمہ اللہ سے سنا، کہا: مجھے امیہ نے خبر دی، کہا: میں نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے سنا وہ کہتے تھے: ﴿ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴾ کہا: ''حِيْنَ يَطْلُعُ تَقْبِضُ عَلَيْهِ فَتَهْضِمُهُ فَهُوَ مِنَ الرَّطْبِ الْهَضِيْمِ وَمِنَ الْيَابِسِ الْهَشِيْمِ تَقْبِضُ عَلَيْهِ فَتَهَشِّمُهُ'' امام عکرمہ اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: ''اَلْهَضِيْمُ: اَلرَّطْبُ اللَّيِّنُ'' یعنی شگوفہ تر و تازہ و نرم و نازک۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: جس وقت پھل کا بوجھ بہت ہو جاتا ہے اور بعض بعض پر سوار ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ ہضیم ہے۔ کبھی یوں کہا کہ شگوفہ جب متفرق ہو جاتا ہے اور سبز ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ ہضیم ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿ هَضِيْمٌ ﴾ وہ ہے جس کی گٹھلی نہ ہو۔ امام ابوصخر رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ هَضِيْمٌ ﴾ وہ ہے جو تو نے دیکھا ہے شگوفہ کو جب کہ پھٹ جاتا ہے اس سے غلاف، پھر تو دیکھتا ہے شگوفے کو کہ بعض بعض سے چپکا ہوا ہے تو وہ ﴿ هَضِيْمٌ ﴾ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور غیر واحد رحمہم اللہ نے کہا ہے، یعنی ''حاذقین''۔ معنی یہ ہیں کہ تم پہاڑوں سے گھر تراشتے ہو، اس حال میں کہ تم اس کام میں ماہر ہو اور خوب کاری گری سے بلا تکلف بناتے ہو۔ ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ ''شَرِهِيْنَ أَشِرِيْنَ'' اس معنی کو مجاہد رحمہ اللہ اور ایک جماعت نے اختیار کیا ہے،[1] یعنی اس حال میں کہ تم حرص کرنے والے ہو اور تبختر (مٹک مٹک کر چلنا، ناز سے چلنا) اور مال مستی کرنے والے ہو اور خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے ہو۔ ان دونوں قولوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے، کیوں کہ یہ گھر جو وہ پہاڑوں میں تراش کر بناتے تھے تو یہ تکبر اور مال مستی اور اِترانے کے لیے اور عبث اور بے فائدہ بناتے تھے، ان کے بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور وہ اُن کے بنانے میں اور تراشنے اور نقش و نگار کرنے میں ماہر کاریگر تھے، چناں چہ جس کسی نے ان کے مکانات کو دیکھا ہے، اس نے ان کی حالت سے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اسی لیے صالح علیہ السلام نے ان سے یوں فرمایا: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴾ یعنی تم اس کام پر توجہ کرو، جس کا تم کو

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٠١_ ٢٨٠٣)

دنیا اور آخرت میں فائدہ ہو، وہ کام یہی اپنے رب کی عبادت کرنا ہے، جس نے تم کو پیدا کیا اور تم کو رزق روزی دی، تاکہ تم اسی کو پوجو اور توحید پر قائم ہو جاؤ، اس کو زبان سے ایک کہو اور دل سے ایک جانو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔
﴿ وَلَا تُطِيعُوٓا۟ أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾ ٱلَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴾ "مسرفین" سے مراد اُن کے رئیس وسردار اور بڑے لوگ ہیں، جو شرک وکفر وحق کی مخالفت کی طرف ان کو بلاتے تھے۔[1] (كذا في ابن كثير مع التوضيح)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ہمزہ استفہامِ انکاری وتوبیخی کے لیے ہے، یعنی تم مت گمان کرو اور نہ تم کو لائق ہے کہ اس بات کا اعتقاد کرو کہ تم ان نعمتوں میں جو تم کو اللہ پاک نے عطا کی ہیں، ہمیشہ لوٹتے پوٹتے رہو گے موت یا عذاب سے بے خوف ہو کر، گویا تم دنیا میں ہمیشہ رہنے والے ہو۔ چوں کہ اس آیت میں نعمتوں کا ابہام کیا تھا، اس لیے اس کی تفسیر اس قول میں کی: ﴿ فِى جَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٤٧﴾ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴾ نخل کا ذکر علاحدہ کیا باوجود اس کے کہ وہ ﴿ جَنَّٰتٍ ﴾ میں داخل تھے۔ یہ اس لیے کہ اس کو باقی درختوں پر فضیلت ہے۔ اس فضیلت کی وجہ سے اس کو علاحدہ ذکر کیا۔ یا اس لیے کہ ﴿ جَنَّٰتٍ ﴾ سے مراد نخل کے علاوہ اور درخت ہیں۔ بہت دفع شے واحد کو ایسے لفظ سے ذکر کرتے ہیں کہ وہ عام ہوتا ہے اس شے اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کے لیے بھی۔ جس طرح کہ نعم کا ذکر کرتے ہیں اور اس سے صرف اونٹوں کا قصد کرتے ہیں اوز اسی طرح جنت کا ذکر کرتے ہیں اور اس سے کھجور کے سوا دوسرے درخت مراد لیتے ہیں، لیکن پہلی وجہ زیادہ صحیح ہے۔

﴿ نَخْلٍ ﴾ اسمِ جمع ہے، اس کا واحد "نخلہ" ہے اور ہر اسمِ جمع جو اس طرح کا ہے، اس کا استعمال مؤنث و مذکر دونوں طرح ہوتا ہے اور نخیل بیائے تحتانی کے مؤنث ہونے پر اتفاق ہے۔ ﴿ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴾ "أَوَّلُ مَا يَطْلُعُ مِنَ الثَّمَرِ" ہے، یعنی ثمرِ نخل جو پہلے نکلتا ہے، اس کو "طَلْعٌ" کہتے ہیں۔ صراح میں کہا ہے: "شگوفۂ نخستین بر درختِ خرما۔" بعد اس کے اس کا نام خلال ہے، پھر بلح، پھر بسر، پھر رطب، پھر تمر۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هُوَ مَا يَطْلُعُ مِنْهَا كَنَصْلِ السَّيْفِ فِي جَوْفِهِ شَمَارِيخُ الْقِنْوِ"[2] انتہی (قنو بہ معنی خوشۂ خرما ہے اور شمارخ باریک باریک ٹہنیوں کو کہتے ہیں، جن کے سروں پر کھجوریں لگتی ہیں۔) یعنی "طلع" وہ شے ہے جو کھجور کے درخت سے تلوار کے بھال کی طرح نکلتی ہے۔ اس کے پیٹ میں خوشۂ خرما کی شاخیں ہوتی ہیں۔ اس کی تشبیہ تلوار کی بھال کے ساتھ شکل اور ہیئت میں ہے۔ پہلے اس کی شکل اسی طرح کی ہوتی ہے۔

﴿ هَضِيمٌ ﴾ کے معنی ہیں نضیج، رخص، لین، لطیف، یعنی پختہ ونرم و نازک۔ کھجور کا خوشہ کبھی تو لطیف ونرم ہوتا ہے، ثمر کی لطافت کی وجہ سے اور کبھی کھجور مادہ ہوتی ہے تو اس کا طلع لطیف و نازک ہوتا ہے بخلاف نر کے کہ اس کا

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٥٣۔ ٤٥٤) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٤٩)

خوشہ ہضیم ولطیف نہیں ہوتا، بلکہ غلیظ و سخت ہوتا ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ خرمائے برنی کا طلع زیادہ تر لطیف ہوتا ہے بہ نسبت خرمائے ''لون'' کے ''طلع'' کے۔ برنی بہترین خرما ہے اور لون ردی ترین۔ مدینے والے برنی اور عجوہ کے سوا اور کھجوروں کو ''ألوان'' بولتے ہیں۔ غرض یہ ٹھہری کہ ''طلع هضيم'' بہ معنی پختہ و نرم و نازک ہے، اس معنی کی بنا پر ''هَضِيْمٌ'' ''هَضَمٌ'' بفتحتین سے ماخوذ ہوگا۔ ''هضم'' کے معنی رقت و ہزال کے معنی ہیں، یعنی باریکی و لاغری۔ یا طلع ہضیم کے یہ معنی ہیں کہ ثمر کی کثرت کے مارے لٹکا پڑتا ہے اور ٹوٹا پڑتا ہے۔

اس معنی کی بنا پر ﴿ هَضِيْمٌ ﴾ بہ معنی کسر سے ماخوذ ہوگا۔ مختار میں کہا ہے کہ ''طلع'' کو ''هضيم'' جب تک کہتے ہیں کہ وہ اپنے غلاف سے نہ نکلا ہو۔ اس لیے کہ اس وقت اس کا بعض بعض میں داخل ہوتا ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے ﴿ هَضِيْمٌ ﴾ کے معنی میں بارہ قول نقل کیے ہیں، اس میں سے بہترین اور زیادہ موافق و موثر وہی قول ہے، جو پہلے مذکور ہوا۔

﴿ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴾ ''نحت'' بہ معنی نجر و بری ہے، ''نَحَتَهُ يَنْحِتُهُ'' بالکسر براہ اور ''نحاته برايه'' ہے، یعنی تراشہ۔ ''منحت'' اس آلے کو کہتے ہیں، جس سے یہ تراشتے ہیں۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور ابن ذکوان رحمہم اللہ نے ''فرهين'' بغیر الف کے پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت ﴿ فٰرِهِيْنَ ﴾ ہے الف کے ساتھ۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ دونوں کے ایک معنی ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ کے معنی نشاط و شدتِ فرح کے ہیں، یعنی انتہا درجے کی خوشی، کہ خوشی کے مارے پھولا نہ سمائے۔ امام ابوعبید رحمہ اللہ وغیرہ نے دونوں میں فرق کیا ہے۔[1] کہا کہ ﴿ فٰرِهِيْنَ ﴾ بہ معنی ''حاذقين'' ہے۔

یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے، یعنی مکانوں کو تراشنے میں ماہر۔ کسی نے کہا ہے کہ ''متجبرين'' اور ''فرهين'' کے معنی ''بطرين أشرين'' ہیں، اس کے قائل امام مجاہد رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ ہیں۔ کسی نے کہا: ''شرهين''۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''كيسين''۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''معجبين ناعمين آمنين''۔ یہی قول امام حسن رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ کسی نے کہا: ''فرحين''۔ امام اخفش رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام ابوزید رحمہ اللہ نے کہا: ''أقوياء.''[2] ''فرهين'' میں نو قول ہوئے۔

﴿ فٰرِهِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم پہاڑوں سے گھر تراشتے ہو، درآنحالیکہ ان کے بنانے میں ماہر ہو یا تجبر و تکبر کرنے والے ہو اور ﴿ فٰرِهِيْنَ ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ تم نازنخرہ اور مستی کرنے والے ہو، یا بہت زیادہ حرص کرنے والے ہو، یا زیرک و دانش مند و ہوشیار ہو، یا عجب اور ناز کرنے والے بے خوف ہونے والے ہو، یا خوش ہونے والے، یا قوی زور آور زبردست ہو۔ یہ لوگ اپنے گھر پہاڑوں سے تراش کر بنایا کرتے تھے، جبکہ ان کی عمریں دراز

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٢٨) فتح القدير (٤/ ١٤٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٠٢۔ ٢٨٠٣) تفسير القرطبي (١٣/ ١٢٨)

ہوئیں اور مٹی ڈھیلوں کے مکانات گر گئے، اس لیے کہ ان کی چھتیں اور دیواریں ان کی عمر میں فنا ہونے سے پہلے بوسیدہ ہو جاتی تھیں۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان میں سے آدمی تین سو برس سے لے کر ہزار برس تک زندہ رہتا تھا۔ اسی طرح قوم ہود علیہ السلام کا حال تھا۔ غرضیکہ صالح علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم اللہ سے ڈرو اور جس بات کا میں نے تم کو امر کیا ہے، اس میں میرا کہنا مانو اور ''مسرفین'' کی اطاعت مت کرو۔

''مسرفین'' سے مراد مشرکین ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ نو آدمی ہیں جنھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں تھیں۔ امر کو مجاز کے طور پر حکمِ ایقاعی (لڑائی کرانا) میں قابلِ اطاعت ٹھہرایا۔ امر سے مراد آمر ہے، یعنی حکم کرنے والوں کا کہا مت مانو، پھر ان مسرفوں کا اللہ پاک نے یہ وصف بیان کیا کہ وہ زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے، یعنی ان کی عادت یہی ہے کہ وہ زمین میں بگاڑ کرتے ہیں، اللہ پاک کی اطاعت کے ساتھ اچھا کام ان سے ہرگز کبھی صادر نہیں ہوتا۔[1] پس انھوں نے اپنے نبی کی بات کا یہ جواب دیا:

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿١٥٣﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٥٤﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿١٥٥﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥٦﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿١٥٧﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٨﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٥٩﴾

انھوں نے کہا: بس تو سحر زدہ لوگوں میں سے ہے (153) تو ہماری طرح ایک بشر ہی تو ہے، لہٰذا اگر تو سچوں میں سے ہے تو کوئی نشانی (معجزہ) لے آ (154) صالح نے کہا: یہ اونٹنی (معجزہ) ہے، (ایک دن) اس کے پینے کی باری ہے اور ایک مقرر دن تمھارے پینے کی باری ہے (155) اور اسے بری نیت سے نہ چھونا، ورنہ تمھیں بہت بڑے دن کا عذاب آ پکڑے گا (156) چناں چہ انھوں نے اس کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں، پھر وہ نادم ہوئے (157) تو انھیں عذاب نے آ پکڑا، بے شک اس میں عظیم نشانی ہے، اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہ تھے (158) اور بے شک آپ کا رب وہی ہے غالب، بہت رحم کرنے والا (159)

قوم ثمود کا صالح علیہ السلام کو جواب، معجزے کا مطالبہ اور عذاب کا بیان:

اونٹنی اللہ کی قدرت سے پتھر میں سے پیدا ہوئی۔ صالح علیہ السلام کی دعا سے وہ چھوٹی پھرتی تھی، جس جنگل میں وہ

[1] فتح البیان (۹/ ۴۰۶۔ ۴۰۷)

چرنے جاتی، وہاں سے سب مویشی بھاگ کر ایک طرف ہو جاتے، جس تالاب پر پانی پینے کے لیے جاتی، سب مویشی وہاں سے بھاگ جاتے۔ پھر یہ بات طے پائی کہ ایک دن وہ پانی پر جائے اور ایک دن دوسروں کے مویشی جائیں۔ ایک بدکار عورت کے گھر مویشی بہت تھے، چارے اور پانی کی تکلیف سے اپنے ایک یار کو سکھایا، اس نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ کر ڈال دیے اس کے تین دن کے بعد عذاب آیا۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک ثمود کے حالات کی اور جو انھوں نے اپنے نبی صالح علیہ السلام کو جواب دیا، اس کی خبر دیتا ہے، جب کہ انھوں نے اپنے رب عزوجل کی عبادت کی طرف ان کو بلایا تو وہ بولے: ﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴾۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ان کی مراد "مِنَ الْمَسْحُوْرِيْنَ" ہے کہ تو تو اُن لوگوں میں سے ہے جن پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴾ یعنی "مِنَ الْمَخْلُوْقِيْنَ"[1] مطلب یہ ہے کہ تو تو ایک خلق ہے مخلوقات میں سے۔ بعض نے اسی معنی پر شاعر کے قول سے استشہاد کیا ہے:

فَإِنْ تَسْأَلِيْنَا فِيْمَ نَحْنُ فَإِنَّنَا عَصَافِيْرُ مِنْ هٰذَا الْأَنَامِ الْمُسَحَّرِ

یعنی ان لوگوں سے کہ جن کے واسطے سحر ہے۔ سحر پھیپھڑے کو کہتے ہیں، یعنی تو آدمیوں کی جنس سے ہے، ظاہر تر اسباب میں۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کا قول ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ تو تو اپنی اس بات میں مسحور ہے، تجھ کو کچھ عقل نہیں ہے۔

پھر بولے: ﴿ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ یعنی پھر ہمیں چھوڑ کر تیری طرف کیسے وحی کی گئی، جس طرح کہ دوسری آیت میں کہا ہے: ﴿ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿25﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴾ [القمر: ٢٥۔ ٢٦] "کیا ہمارے درمیان سے اسی پر وحی نازل کی گئی ہے؟ (نہیں) بلکہ وہ سخت جھوٹا اور شیخی باز ہے۔ کل ہی وہ جان لیں گے کہ کون کذاب اور شیخی باز ہے؟"

پھر انھوں نے صالح علیہ السلام سے ایک نشانی کی فرمایش کی کہ ان کے پاس لے آئیں، تاکہ وہ اپنے رب کے پاس سے جو شے ان کے پاس لائیں تو وہ اس سے ان کی سچائی اور راستی کو جان لیں۔ غرض یہ کہ ان کے اشراف لوگ جمع ہوئے اور ان سے یہ بات طلب کی کہ ابھی ان کے لیے اس پتھر سے ایک دس ماہ کی حاملہ اونٹنی نکال دیں۔ ایک پتھر ان کے پاس تھا، اس کی صفت ایسی ایسی تھی، اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت اللہ کے نبی صالح علیہ السلام نے ان سے عہد و پیمان لیے کہ اگر وہ ان کے سوال کو پورا کر دیں تو وہ اُن پر ایمان لے آئیں گے اور ان کی پیروی کریں گے۔ انھوں نے وہ عہد و پیمان قبول کیے تو صالح علیہ السلام کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی۔

پھر اللہ عزوجل سے یہ دعا کی کہ ان کا سوال پورا کر دے۔ وہ پتھر جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا تھا،

---

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٣٨٤۔ ٣٨٥)

پھٹ گیا اور دس مہینے کی حاملہ اونٹنی جس طرح کی انھوں نے بیان کی تھی، نکل آئی تو بعض تو ایمان لے آئے اور اکثر نے کفر کیا، فرمایا: ﴿ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ یعنی تمھارے پانی پر ایک دن وہ وارد ہوگی اور ایک دن تم اس پر وارد ہو گے۔

﴿ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ اللہ پاک کے انتقام اور عذاب سے ان کو ڈرایا، اگر وہ اس کو کچھ برائی پہنچائیں۔ چنانچہ وہ اونٹنی ان کے درمیان ایک زمانہ تک رہی۔ پانی پر وارد ہوتی اور پیتی اور چارہ کھاتی اور وہ لوگ اس کے دودھ سے خوب پیتے اور سیراب ہوتے۔ جتنا ان کو کافی ہوتا اتنا دودھ اس سے دھو لیتے۔ پھر جب ان پر زمانہ دراز ہوا تو اُن سب سے بڑا بدبخت حاضر ہوا تو وہ اس کو قتل کرنے کے لیے آ گئے اور جھک پڑے، اس شخص نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔

﴿ فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿١٥٧﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ﴾ وہ عذاب یہ ہوا کہ ان کی زمین پر سخت زلزلہ آیا اور ان پر ایک بڑی سخت چنگھاڑ آئی کہ ان کے دلوں کو اُن کی جگہ سے اُکھیڑ دیا اور اللہ کے حکم سے ان کو وہ شے آئی، جس کا انھیں خیال تک نہ تھا۔ ﴿ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٧٨] ''چناں چہ وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل (مردہ) گرے پڑے تھے۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ امام کلبی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ "اَلْمُسَحَّرُ هُوَ الْمُعَلَّلُ بِالطَّعَامِ وَالشَّرَابِ" یعنی مسحر وہ ہے جس کو کھانے پینے کی علت ہے۔ تو مسحر وہ ہوا جس کے پھیپھڑا ہے، مطلب یہ ہے کہ تو تو ہماری طرح بشر ہے، کھاتا ہے اور پیتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بے شک تو کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے اور اس کی علت میں گرفتار ہے۔ مورج نے کہا ہے کہ لغتِ ربیعہ میں مسحر مخلوق کو کہتے ہیں۔[2]

﴿ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ ﴾ صالح علیہ السلام نے یہ اشارہ اس کے بعد کیا کہ اللہ پاک نے ان کی دعا کے سبب سے پتھر سے اس کو نکالا، جیسے کہ انھوں نے فرمایش کی تھی۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا کہ میں نے اس اونٹنی کے بیٹھنے کی جگہ دیکھی ہے تو ناگاہ وہ ساٹھ گز تھی ساٹھ گز میں۔ غرض یہ کہ اس کے بعد صالح علیہ السلام نے ان کو دو باتوں کی وصیت کی: ایک یہ کہ اس کے لیے پانی کا حصہ ہے اور تمھارے لیے بھی اس کا حصہ مقرر ہے۔ تم کو لائق نہیں ہے کہ اس دن میں پیو جو اس کا حصہ ہے اور نہ وہ اس دن میں پیے جس دن تمھارا حصہ ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے یہ جوازِ مہایاۃ پر دلیل ہے۔ ("اَلْمَهَايَاةُ قِسْمَةُ الْمَنَافِعِ عَلَى التَّعَاقُبِ وَالتَّنَاوُبِ"[3] كذا في تعريفات الجرجاني. یعنی منافع کا باری باری بانٹنا)۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٥٤۔ ٤٥٥) [2] فتح القدیر (٤/ ١٤٩) [3] التعریفات (١/ ٣٠٣)

کیوں کہ ﴿ لَهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ ''مھایاۃ'' سے ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ شِرْبٌ ﴾ پانی کے حصے کو کہتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رہا مصدر تو اس میں کہتے ہیں: ''شَرِبَ شُرْبًا و شِرْباً'' اور اکثر مضموم ہے اور ''شَرْبٌ'' بفتحِ شین جمع ہے ''شَارِبٌ'' کی۔ اس جگہ مراد ''شِرْبٌ'' بالکسر ہے۔ جمہور کی قراءت دونوں میں یہی ہے۔ امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے دونوں میں بضمِ شین پڑھا ہے۔[1]

دوسری وصیت یہ کی: ﴿ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ ﴾ یعنی اس کو بری طرح سے مت چھیڑنا، یعنی کونچیں کاٹنے یا مارنے یا کوئی اور ایسی چیز نہ کرنا جو اس کو برائی پہنچائے۔ نہی کا جواب ﴿ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ ہے۔ دن کو اس لیے عظیم کہا کہ اس میں عذاب نازل ہوگا۔ دن کو عظیم کے ساتھ موصوف کرنے میں مبالغہ زیادہ ہے بہ نسبت عذاب کے موصوف کرنے سے، اس لیے کہ جب عذاب کے سبب سے وقت عظیم ہوگیا تو عذاب کا واقع ہونا تو انتہائی عظیم درجہ ہوگا۔

﴿ فَعَقَرُوْهَا ﴾ یعنی سہ شنبہ کے روز قُدار نے تلوار سے اس کی کونچیں کاٹیں، اس کی پنڈلیوں میں ضرب لگائی۔ یہ شخص والد الزنا، کوتاہ قد اور بدصورت تھا، لیکن چوں کہ وہ سب اس کام سے راضی تھے، اس لیے عقر کی نسبت ان کی طرف کی گئی۔ ﴿ فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴾ یعنی پھر کل کو پچھتاتے رہ گئے اس کی کونچیں کاٹنے کی وجہ سے، جبکہ یہ بات پہچان لی کہ عذاب نازل ہونے والا ہے۔ یہ یوں ہوا کہ صالح علیہ السلام نے ان کو تین دن کی مہلت دی تھی، ہر دن ان پر عذاب کی علامت ظاہر ہوتی تھی اور وہ نادم ہوئے ایسے وقت میں کہ اس ندامت کا کوئی فائدہ نہ تھا، کیوں کہ عذاب کو دیکھ لینے کے بعد اور عذاب کے آثار ظاہر ہونے کے بعد ندامت فائدہ نہیں دیتی اور اس لیے کہ خالی ندامت توبہ نہیں ہے۔

﴿ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ﴾ یعنی جس عذاب کا صالح علیہ السلام نے ان سے وعدہ کیا تھا، اس عذاب نے ہفتے کے دن ان کو پکڑ لیا۔ عذاب کے آثار کا ظہور اس طرح ہوا کہ پہلے دن یعنی چہار شنبہ کے دن ان کے چہرے زرد پڑ گئے، پھر پنج شنبہ کو سرخ ہو گئے، پھر جمعہ کے دن سیاہ ہو گئے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کے قول میں یہ ہے کہ ان کے بدنوں میں پھوڑے نکل آئے مثل دانہ نخود کے، پہلے دن میں تو سرخ ہوئے، پھر دوسرے دن زرد ہو گئے، پھر تیسرے دن سیاہ پڑ گئے اور ناقہ کا عقر چہار شنبہ کو ہوا اور اُن کی ہلاکت یک شنبہ کو۔ اس میں وہ پھوڑے پھوٹ گئے اور جبرائیل علیہ السلام نے ان پر ایک چیخ ماری تو دونوں وجہ سے مر کر رہ گئے اور یہ ضحیٰ کا وقت تھا۔[2]

﴿ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ان میں سے اکثر یا نصف لوگ ایمان لے آتے تو عذاب میں نہ پکڑے جاتے اور قریش جو اس بات سے محفوظ رہے تو ان لوگوں کی برکت سے جو ان میں سے ایمان لائے، یہ قصہ اس کے سوا اور جگہ پر تفصیل سے گزر چکا ہے۔ پھر اللہ پاک نے چھٹا قصہ لوط علیہ السلام کا بیان فرمایا:[3]

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٤٩) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢١٨) [3] فتح البيان (٩/ ٤٠٨۔ ٤٠١)

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٦٠﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٦١﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٦٢﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٦٣﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٤﴾

قومِ لوط نے رسولوں کو جھٹلایا (160) جب ان سے ان کے بھائی لوط نے کہا: کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں؟ (161) بلاشبہہ میں تمھارے لیے امانت دار رسول ہوں (162) لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (163) اور میں اس (تبلیغ) پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے (164)

لوط علیہ السلام کی دعوت کا بیان:

اللہ پاک اپنے بندے اور رسول لوط علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے۔ ان کا نسب یہ ہے: لوط بن ہاران بن آزر۔ یہ خلیل جلیل ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ اللہ پاک نے ان کو ایک بڑی اُمت کی طرف بھیجا۔ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں یہ لوگ سدوم میں اور اس کے اعمال (قرب و جوار کی بستیوں) میں رہتے بستے تھے، جن کو اللہ پاک نے ان بستیوں کے ساتھ ہلاک کر ڈالا اور اس کی جگہ ایک چھوٹا بدبودار دریا کر دیا جو ناپاک تھا۔ یہ بستیاں بلادِ غور میں مشہور ہیں جو بیت المقدس کے مقابل ایک طرف ہیں، اس کے اور بلادِ کرک وشوبک کے درمیان۔ لوط علیہ السلام نے ان کو اللہ عزوجل کی طرف بلایا کہ اسی وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کریں اور اس کے رسول کا کہا مانیں، جس کو اس نے ان کی طرف بھیجا ہے اور ان کو اللہ پاک کی نافرمانی سے منع کیا اور اس کام کا ارتکاب کرنے سے ان کو منع کیا، جس کو انھوں نے دنیا میں نیا نکالا تھا اور اُن سے پہلے مخلوق میں سے کسی نے وہ کام نہیں کیا تھا۔ وہ فعل یہی تھا کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اغلام کیا کرتے تھے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ لوط علیہ السلام کو جو ﴿ اَخُوْهُمْ ﴾ فرمایا تو اس لیے کہ وہ اس بستی میں رہتے تھے، اس شہر میں ان کے قرب و جوار میں تھے۔ دین اور نسب میں ان کے بھائی نہ تھے، کیوں کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں اور یہ دونوں بابل کی سرزمین سے بلادِ مشرق کے ہیں۔[2] غرض یہ کہ وہ لوگ عورتوں سے بے نیاز اور مردوں کے نیاز مند تھے۔ اسی لیے ان سے یوں فرمایا:

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٥٥) [2] فتح البيان (٩/ ٤٠١)

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ
لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوْا
لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾
قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ؕ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي
الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ
مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾

کیا تم (جنسی تسکین کی خاطر) جہان کے مردوں کے پاس آتے ہو؟ (165) اور تم اپنی بیویاں چھوڑ دیتے ہو، جنھیں تمھارے رب نے تمھارے لیے پیدا کیا ہے، بلکہ تم لوگ حد سے گزرنے والے ہو (166) انھوں نے کہا: اے لوط! اگر تو باز نہ آیا تو یقیناً تو نکالے جانے والوں میں سے ہو گا (167) لوط نے کہا: بے شک میں تمھارے (خلافِ فطرت) عمل سے دشمنی رکھنے والوں میں سے ہوں (168) اے میرے رب! تو مجھے اور میرے اہل کو اس عمل (کے وبال) سے نجات دے جو وہ کرتے ہیں (169) چناں چہ ہم نے اسے اور اس کے سب اہل کو نجات دی (170) سوائے ایک بڑھیا کے (جو) پیچھے رہنے والوں میں سے تھی (171) پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا (172) اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) سخت بارش برسائی، چناں چہ ڈرائے گئے لوگوں پر (برسائی گئی) بدترین بارش تھی (173) بے شک اس میں عظیم نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہ تھے (174) اور بے شک آپ کا رب وہی ہے غالب، بہت رحم کرنے والا (175)

قوم کی بے حیائی کا رد، قوم کا جواب اور اس پر پتھروں کی بارش کا عذاب:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب لوط علیہ السلام اللہ کے نبی نے ان کو فواحش کا ارتکاب کرنے اور اغلام (مردوں سے جنسی خواہش پوری) کرنے سے منع کیا اور ارشاد کیا کہ اپنی عورتوں سے صحبت کریں، جن کو اللہ پاک نے ان کے لیے پیدا کیا تو ان کی قوم نے ان کو یہی جواب دیا کہ جس چیز کو تو ہمارے پاس لے کر آیا ہے، اگر تو اس سے باز نہ رہے گا تو ہم تجھے اپنے درمیان سے نکال دیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ

﴿ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٨٢] ''اور اس کی قوم کا جواب بس یہی تھا کہ انھوں نے کہا: انھیں اپنی بستی سے نکال دو، بے شک یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔''

پھر جب انھوں نے دیکھا کہ جس حال میں وہ ہیں، اس سے باز نہ آئیں گے اور اپنی ضلالت اور گمراہی پر جمے ہوئے ہیں تو اُن سے بے زار ہو گئے اور کہا کہ البتہ میں تمھارے کام سے بغض رکھنے والا ہوں، میں اس کو دوست نہیں رکھتا ہوں نہ اس سے راضی ہوں اور تم سے بے زار ہوں۔ پھر ان پر بد دعا کی، یوں کہا کہ اے رب! مجھے اور میرے گھر والوں کو اس سے نجات دے جو وہ کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو سب کو نجات دی۔

﴿ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴾ یہ عورت ان کی بیوی تھی اور بد بڑھیا تھی اور پیچھے باقی رہ گئی، وہ ان لوگوں کے ہمراہ ہلاک ہوئی، جو ان کی قوم سے باقی رہے، جس طرح کہ اللہ پاک نے ان کے بارے میں سورۃ الاعراف اور ہود میں اور اسی طرح سورۃ الحجر میں خبر دی ہے، جبکہ اللہ پاک نے لوط علیہ السلام کو اس بات کا حکم دیا کہ رات کے وقت اپنے گھر والوں کو لے چلیں، مگر اپنی عورت کو اور جس وقت چنگھاڑ کو سنیں تو مڑ کر نہ دیکھیں، جب کہ وہ عذاب ان کی قوم پر نازل ہو۔ انھوں نے امرِ الٰہی کے لیے صبر کیا اور چلتے رہے۔ اللہ پاک نے ان کی قوم پر عذاب نازل کیا، جو ان سب کو پہنچا، یعنی کوئی نہ بچا۔ جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿٨٢﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۚ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴾ [هود: ٨٢۔ ٨٣] ''اور ان پر کھنگر کے پتھر تہ بہ تہ برسائے۔ جو تمھارے رب کے ہاں سے نشان زدہ تھے۔ اور وہ (پتھر یا سزا یا بستی) ان ظالموں (قریش مکہ) سے دور نہیں۔'' اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿١٧٣﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٤﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾ [1] ''پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔ اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) سخت بارش برسائی، چناں چہ ڈرائے گئے لوگوں پر (برسائی گئی) بدترین بارش تھی۔ بے شک اس میں عظیم نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہ تھے اور بے شک آپ کا رب وہی ہے غالب، بہت رحم کرنے والا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اَتَاْتُوْنَ ﴾ کے معنی ''أَتَنکِحُونَ'' ہیں، یعنی کیا تم وطی کرتے ہو۔ ''ذُکْرَان'' ''ذَکَر'' کی جمع ہے اور ''أُنثٰی'' کی ضد۔ ''ذکر'' نر ہے اور ''أُنثٰی'' مادہ ہے۔ ''ذُکْرَان'' سے مراد بنی آدم ہیں، یا ہر حیوان۔ وہ لوگ یہ کام مسافروں سے کیا کرتے تھے، چناں چہ اس کا ذکر سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٥٥)

﴿ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم چھوڑتے ہو اس شے کو جسے تمھارے نفع لینے کے لیے اللہ نے صحیح و لائق و حلال و مباح کیا ہے، تمھاری ازواج سے۔ ''أزواج'' سے مراد مؤنث جنس ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم نے عورتوں کے قبلوں (اگلی طرف) کو چھوڑ دیا اور مردوں کی دُبروں (پچھلی طرف) اور عورتوں کی دُبروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ بیوی اور لونڈی کی دُبر حرام ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جس کسی نے اس کو جائز رکھا ہے تو یقیناً اس نے بڑی خطا کی ہے۔[3]

﴿ عَادُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم حد سے بڑھنے والے ہو سارے گناہوں میں اور من جملہ ان کے یہ گناہ ہے، جس کا تم مردوں کے ساتھ ارتکاب کرتے ہو۔ وہ بولے: اے لوط! اگر تو باز نہ آئے گا ہمیں منع کرنے سے اور ہمارے کام کو برا کہنے سے تو تُو اُن لوگوں میں سے ہو گا جو ہمارے شہر سے نکالے جاتے ہیں۔ شاید وہ جس کسی کو اپنے شہر سے بدر کرتے تھے تو بدترین حال پر نکالا کرتے تھے، جب ہی تو انھوں نے نکالنے کی دھمکی دی۔ ''قَالِيْنَ'' کے معنی ہیں ''مُبْغِضِيْنَ''، یعنی مردوں سے وطی کرنا جس میں تم مبتلا ہو، میں تمھارے اس کام سے بغض رکھنے والا ہوں۔ ''قلي'' شدید بغض کو کہتے ہیں، گویا وہ ایسا بغض ہے کہ دل کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''قَلَيْتُهُ أَقْلِيْهِ قَلْيٌ وَقَلَاءٌ'' اس میں اس خبیث گناہ کی عظمت یعنی بڑے ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ ان کا اس کام کو مبغوض رکھنا دین کے لحاظ سے تھا۔

معلوم ہوا کہ یہ معصیت بڑی ہی سخت ہے، جبھی تو ان کو اس سے ایسا سخت بغض ہوا۔ پھر لوط علیہ السلام نے ان کی محاورت سے اعراض کیا، یعنی ان کے ساتھ گفتگو کرنے سے منہ پھیرا اور اللہ عزوجل سے یہ بات طلب کی کہ اُن کو نجات دے۔ پھر کہا کہ اے میرے رب! تو مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کے خبیث عمل سے نجات دے، یا اس کی سزا سے ہمیں نجات دے، جو عن قریب ان کو پہنچنے والی ہے۔ اللہ پاک نے ان کی دعا قبول کی اور فرمایا: پھر ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو اور اُن لوگوں کو جو ان کی دعوت قبول کر کے ان کے دین کے پیرو ہو گئے تھے، ان سب کو نجات دی۔

﴿ اَجْمَعِيْنَ ﴿170﴾ اِلَّا عَجُوْزًا ﴾ یعنی ہم نے سب کو نجات دی، مگر ایک بڑھیا۔ یہ بڑھیا لوط علیہ السلام کی بیوی تھی اور قوم کے فعل سے راضی تھی اور جو شخص معصیت سے راضی ہوتا ہے وہ عاصی کے حکم میں ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ عجوز کا استثناء ﴿ اَهْلَهٗ ﴾ سے کیا ہے، حالاں کہ وہ عجوز کافر تھی اور ان کے اہل مومن تھے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عجوز اہل کے اسم میں شریک تھی، گو اُن کے ایمان میں شریک نہ تھی۔ ﴿ فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴾ کے معنی ہیں: ''مِنَ الْبَاقِيْنَ فِيْ الْعَذَابِ'' امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: ''مِنَ الْبَاقِيْنَ فِيْ الْهَرَمِ'' یعنی وہ عورت باقی رہی، یہاں تک کہ بڑھیا ہو گئی۔

[1] تفسیر الطبري (19/ 388) [2] الدر المنثور (6/ 317) [3] تفسیر النسفي (3/ 195)

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذاہب و باقی دونوں کو غابر کہتے ہیں۔ عرب لوگ بولتے ہیں: "مَا مَضٰی وَمَا غَبَرَ" یعنی جو گزر گیا اور جو باقی رہا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوط علیہ السلام کی بیوی ہے، عذابِ الٰہی میں چلی گئی۔[1]

﴿ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اس طرح ہلاک کیا کہ ان کو دھنسا دیا اور ان پر پتھر برسائے اور اُن کی بستیوں کو ان پر اُلٹا دیا اور ان کی اوپر کی جانب کو نیچے کر دیا۔

﴿ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے جو لوگ بستیوں کے باہر تھے سفر کی وجہ سے، یا اور کسی وجہ سے تو ان پر پتھروں کا برساؤ کیا۔ یا مطر سے مراد گندھک اور آگ ہے۔ ﴿ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴾ مخصوص بالذم محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "مَطَرُهُمْ"۔ "مُنْذَرِيْنَ" سے مراد کوئی معین قوم نہیں، بلکہ مراد "کافرین" کی جنس ہے۔[2] پھر اللہ پاک نے ساتواں قصہ شعیب علیہ السلام کا ذکر فرمایا:

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿176﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿177﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿178﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿179﴾ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿180﴾

اصحابِ اُیکہ نے رسولوں کو جھٹلایا (176) جب ان سے شعیب نے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ (177) بے شک میں تمھارے لیے امانت دار رسول ہوں (178) لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (179) اور میں اس (تبلیغ) پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے (180)

شعیب علیہ السلام کی اپنی قوم کو وعظ و نصیحت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحیح قول کی بنا پر ﴿ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ ﴾ مدین والے ہیں۔ شعیب علیہ السلام اللہ کے نبی انھی میں سے تھے۔ اس جگہ شعیب علیہ السلام کو جو "أَخُوهُمْ" نہ کہا تو اس لیے کہ یہ لوگ اُیکہ کی عبادت کی طرف منسوب ہیں۔ ایکہ ایک درخت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایکہ گنجان درختوں کو کہتے ہیں، جیسے جھاڑی۔ یہ لوگ ان کو پوجا کرتے تھے۔

اسی لیے جب فرمایا: ﴿ كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ تو "إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ شُعَيْبٌ" نہ کہا اور کہا تو اس طرح کہا: ﴿ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ ﴾ تو جو اُن کے درمیان اخوت کا نسب تھا، اس کو اس بات کے سبب سے قطع کر دیا جس کی طرف وہ منسوب ہوئے، اگرچہ شعیب علیہ السلام نسب میں ان کے بھائی تھے۔ لوگوں میں سے جس شخص نے اس نکتے کو نہیں سمجھا تو وہ یہ گمان کر بیٹھا کہ اصحابِ اُیکہ اہلِ مدین کے علاوہ ہیں، چنانچہ یہ زعم کیا کہ اللہ پاک

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٣٢) [2] فتح البيان (٩/ ٤١٠۔ ٤١٢)

نے شعیب علیہ السلام کو دو اُمتوں کی طرف بھیجا۔ ان میں سے بعض نے یوں کہا کہ تین اُمتوں کی طرف مبعوث کیا۔ اسحاق بن بشر کاہلی نے روایت کیا ہے اور یہ شخص ضعیف ہے، کہا: مجھ سے حدیث بیان کی امام ابن سدی رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے اور زکریا بن عمرو نے "عن خصيف عن عكرمة" سے، دونوں نے کہا: نہیں بھیجا اللہ نے کسی نبی کو دو بار، مگر شعیب علیہ السلام کو ایک بار تو مدین کی طرف، اللہ نے ان کو صیحہ (سخت چیخ) سے پکڑا اور ایک بار اصحابِ اَیکہ کی طرف تو ان کو "يَوْمُ الظُّلَّةِ" کے عذاب نے پکڑا۔

امام ابو القاسم بغوی رحمہ اللہ نے "عن هدبة عن همام عن قتادة" ﴿ وَاَصْحٰبُ الرَّسِّ ﴾ [ق: ۱۲] کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ قومِ شعیب ہیں اور ﴿ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ قومِ شعیب ہیں۔ یہی قول اسحاق بن بشر کا بھی ہے۔ جویبر کے علاوہ نے کہا ہے کہ اصحابِ اَیکہ و مدین ایک ہیں۔ واللّٰه أعلم.

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ترجمہ شعیب میں بہ سندِ خود عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قومِ مدین اور اصحابِ اَیکہ دو اُمتیں ہیں کہ ان کی طرف اللہ نے شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔[1] یہ حدیث غریب ہے اور اس کے رفع میں نظر ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ موقوف ہو اور صحیح یہ بات ہے کہ وہ ایک ہیں، ہر مقام میں ایک شے کے ساتھ موصوف ہوئے ہیں اور اسی لیے ان لوگوں کو ناپ اور تول کے پورا کرنے کا وعظ و حکم کیا ہے، جس طرح کہ قصہ مدین میں ہے: "سواء بسواء" یعنی برابر، چنانچہ یہ اس پر دال ہے کہ دونوں ایک امت ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ نافع، ابن کثیر اور ابن عامر رحمہم اللہ نے "لَيْكَةَ" پڑھا ہے، بلامِ واحد و فتح تائے فوقیہ، اس کو اسمِ غیر معرف بالف و لام ٹھہرایا ہے، جس کی طرف ﴿ اَصْحٰبُ ﴾ کی اضافت کی گئی ہے۔ باقی قراء کی قراءت ﴿ اَلْئَيْكَةِ ﴾ معرف بالف و لام ہے۔ اَیکہ گنجان درختوں کو کہتے ہیں اور یہی غیضہ ہے اور لیکہ قریہ کا نام ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے،[3] لیکن یہ انکار جید نہیں ہے۔ کسی نے کہا: دونوں ایک معنی میں ہیں اور غیضہ کا نام ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو عبید رحمہ اللہ نے جو یہ بیان کیا ہے کہ لیکہ اس قریہ کا نام ہے جس میں وہ تھے اور اَیکہ سارے شہر کا نام ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ ثابت نہیں ہوئی اور نہ اس کے قائل معروف ہیں اور اگر وہ معروف بھی ہوں تو اس میں نظر ہے، کیوں کہ سارے اہلِ علم اس کے خلاف ہیں۔[4]

امام ابو علی فارسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "الأيكة" "أيكة" پر الف لام لگا کر معرفہ بنایا گیا ہے۔ پھر جب ہمزہ تخفیف کے لیے حذف کیا گیا تو اس کی حرکت لام پر ڈال دی گئی۔ خلیل نے کہا ہے کہ اَیکہ غیضہ ہے، یعنی وہ گنجان

---

[1] الدر المنثور (۵/ ۹۱) [2] تفسير ابن كثير (۳/ ۴۵۶)
[3] الكشاف (۳/ ۳۳۷) [4] تفسير القرطبي (۱۳/ ۱۳۳)

درخت جو بیر کے اور پیلو اور ان جیسے نرم و نازک پھل پیدا کرتے ہیں۔[1] غرض یہ ہوئی کہ بیر اور پیلو وغیرہ کی جھاڑی کو اَیکہ بولتے ہیں۔ امام عبد بن حمید رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے "لیکة" کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ "أیکة" ہے۔

امام اسحاق بن بشر اور ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔیْكَةِ الْمُرْسَلِیْنَ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ یہ لوگ اصحابِ غیضہ تھے ساحلِ بحر سے مدین تک۔[2] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظ ﴿ الْاَیْكَةِ ﴾ قرآن شریف میں چار بار وارد ہوا ہے: سورۃ الحجر میں اور سورت قٓ میں اور اس جگہ اور سورت صٓ میں۔ پہلے کے دو تو الف و لام کے ساتھ اور مجرور ہیں جبکہ آخر کے دو پڑھے جاتے ہیں الف و لام و جر سے اور بحذفِ ہمزہ و القائے حرکتِ ہمزہ بر لام و فتح ہا، یعنی تا، باجود اس کے کہ کل مجرور ہیں، بہ سبب اضافت اصحاب کے اس کی طرف۔

﴿ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ یہاں "أَخُوهُمْ" نہیں فرمایا، جس طرح کہ ان سے پہلے اور انبیاء کے حق میں کہا ہے، اس لیے کہ شعیب علیہ السلام نسب میں ﴿ الْاَیْكَةِ ﴾ میں سے نہ تھے۔ پھر جب مدین کا ذکر کیا ہے تو یوں کہا ہے: ﴿ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ﴾ [العنکبوت: ٣٦] "ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔" اس لیے کہ وہ مدین والوں میں سے تھے۔ ان کے نسب کی تحقیق سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔ اللہ پاک نے شعیب علیہ السلام کو دو اُمتوں کی طرف بھیجا۔ اصحابِ ایکہ اور اصحابِ مدین۔ چنانچہ اللہ پاک نے اصحاب الایکہ کو تو "ظُلَّه" سے ہلاک کیا اور اہلِ مدین پر جبرائیل علیہ السلام نے ایک چیخ ماری تو وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

﴿ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿١٧٨﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿١٧٩﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ پاک نے جو انبیائے مذکورین کی دعوت ایک طور پر نقل فرمائی ہے تو اس لیے کہ وہ سب ان امور پر متفق تھے: ایک تو اللہ کا تقویٰ۔ دوسرے اللہ اور رسول کی اطاعت۔ تیسرے عبادت میں اخلاص۔ چوتھے رسالت کی تبلیغ پر اجرت نہ لینا۔ چوں کہ وہ سب ان باتوں میں متفق تھے،[3] اسی لیے اللہ پاک نے ان سب سے یہی امور بے کم و کاست برابر نقل فرمائے۔ پھر جن امور کا شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو امر کیا، اللہ پاک نے ان کا ذکر فرمایا:

اَوْفُوا الْكَیْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ ﴿١٨١﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِیْمِ ﴿١٨٢﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا
فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿١٨٣﴾ وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ
وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿١٨٤﴾

[1] فتح القدير (٤/ ١٥١) [2] الدر المنثور (٦/ ٣١٨) [3] فتح البيان (٩/ ٤١٢۔ ٤١٣)

تم ماپ پورا کرو اور خسارہ دینے والوں سے نہ بنو (181) اور تم بالکل سیدھی ترازو سے تولو (182) اور تم لوگوں کو ان کی اشیاء کم نہ دو، اور نہ تم زمین میں فساد کرتے ہوئے دوڑو (183) اور اس (اللہ) سے ڈرو جس نے تمھیں اور پہلی مخلوق کو پیدا کیا (184)

شعیب علیہ السلام کا اپنی قوم کو ماپ تول پورا دینے کا حکم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شعیب علیہ السلام ان کو ماپ تول پورا کرنے کا حکم دیتے ہیں اور دونوں میں کمی کرنے سے ان کو منع فرماتے ہیں، یعنی جس وقت تم لوگوں کو دو تو اُن کے لیے ماپ کو پورا کرو اور ماپ کم مت کرو کہ ان کو ناقص دو اور جب تمھارے واسطے ہو تو تم اس کو پورا بھرپور لو، لیکن لو جیسا کہ دیتے ہو اور دو جس طرح کہ لیتے ہو۔

''قسطاس'' بہ معنی میزان ہے، یعنی ترازو۔ کسی نے کہا ہے کہ قبان (قبان: کپان کا معرب ہے، وہ ترازو جس کا ایک پلڑا ہو اور دوسرے پلڑے کے بجائے ترازو کی ڈنڈی سے پتھر باندھ دیتے، صراح) ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ رومی زبان سے معرب ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''قسطاس مستقیم'' رومی زبان میں بہ معنی عدل ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''قسطاس'' بہ معنی عدل ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ ﴾ یعنی ''لَا تَنْقُصُوْهُمْ أَمْوَالَهُمْ'' مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے مال کم مت دو۔ ﴿ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾ مراد راہ زنی ہے، جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ ﴾ [الأعراف: ٨٦] ''اور تم ہر ایک راستے پر مت بیٹھو، تم اس شخص کو ڈراتے اور اللہ کے راستے سے روکتے ہو جو اس پر ایمان لے آئے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ اللہ پاک کے عذاب سے ان کو ڈراتے ہیں، جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے اگلے باپ دادا کو، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے: ﴿ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢٦] ''(وہ) تمھارا اور تمھارے اگلے آباؤ اجداد کا رب ہے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سدی، سفیان بن عیینہ اور عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ نے کہا ہے: ﴿ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی ''خَلْقُ الْأَوَّلِيْنَ'' اور ابن زید نے پڑھا: ﴿ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ﴾ [یٰس: ٦٢] ''اور بلاشبہ اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا۔''[2]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨١٢)

[2] تفسیر الطبري (١٩/ ٣٩٢) تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨١٣) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٥٦۔ ٤٥٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا حاصل یہ ہے کہ ایفائے کیل سے مراد اتمامِ کیل ہے، یعنی جو کوئی ماپ کا ارادہ کرے اور اس کا معاملہ کرے تو اس کو پورا کرے۔ ﴿ مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ماپ اور تول کے کم کرنے والوں میں سے مت ہو جاؤ۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَخْسَرْتُ الْكَيْلَ وَالْوَزْنَ" یعنی میں نے ماپ اور تول کو کم کیا۔ اسی بارے میں یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴾ [المطففين: ٣] "اور جب وہ انھیں ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیتے ہیں۔" علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ کیل ایک تو وافی ہوتا ہے، یعنی پورا تو اس کا حکم کیا گیا ہے اور ایک طفیف ہوتا ہے، یعنی ناقص، اس سے منع کیا گیا ہے، اور ایک زاید ہوتا ہے، اس سے سکوت فرمایا ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر نہ کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے اس کو کیا تو یقیناً اس نے احسان کیا اور اگر اس نے نہ کیا تو اس پر کچھ نہیں ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے بیان میں اضافہ فرمایا: ﴿ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴾ یعنی تم حق دو برابر ترازو سے۔ اس کی تفسیر کا بیان سورت سبحان میں گزر چکا ہے۔[2] "قسطاس" کو مضموم و مکسور دونوں طرح پڑھا ہے۔ "قسطاس" میزان ہے یا قبان۔ اگر یہ قسط بہ معنی عدل سے ہے اور اس کا عین مکرر ٹھہرایا گیا ہے تو اس کا وزن فعلان ہے، ورنہ پھر رباعی ہے۔ "بخس" بہ معنی نقص ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "بَخَسَهُ حَقَّهُ إِذَا نَقَصَهُ" یعنی جب کوئی کسی کے حق کو کم کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس نے اس کے حق کو کم کیا۔

مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے جو حقوق ہیں تم اُن کو کم مت کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ اشیاء سے مراد درہم اور دینار ہیں، یعنی تم لوگوں کے روپے، اشرفیوں کے کنارے کاٹ کر کم مت کرو۔ یہ تعمیم ہے بعد تخصیص کے، یعنی پہلے تو ماپ تول کے پورا کرنے کا حکم کیا اور کمی کرنے سے منع کیا، پھر عام طور پر منع فرما دیا کہ کسی کی کوئی چیز کم مت کرو۔ اس کی تفسیر سورت ہود میں گزر چکی ہے۔

اسی طرح ﴿ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾ کا بیان سورت ہود وغیرہ میں ہو چکا ہے، یعنی زمین میں فساد کے ساتھ مبالغہ نہ کرو، جیسے راہ زنی کرنا، لوٹنا، کھیتی کا برباد کر ڈالنا ہے۔ وہ لوگ یہ کام کیا کرتے تھے، چنانچہ ان سے منع کیے گئے۔ جب کوئی شخص زمین میں فساد کرتا ہے تو محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "عَثَا فِيْ الْأَرْضِ" باب اس کا "سما" ہے اور "عَثِيَ" بالکسر اور "عَثَى" بفتحتین بروزن "فَتَى"۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے قاری فتحِ ثا پر متفق ہیں۔ اس بات سے یقینی طور پر یہ دلیل ہے کہ قرآن شریف ثانی لغت پر نازل ہوا ہے۔ قاموس میں اس طرح کہا ہے کہ "عَثَى كَسَعَى وَرَمَى وَرَضِيَ"[3]

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٩٦) [2] رقم الآية (٣٥) [3] القاموس المحيط (١/ ١٦٨٨)

﴿ وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ﴾ یعنی تم اس اللہ سے ڈرو جس نے تم کو ایک نطفے سے پیدا کیا اور اس پر تمھارا معدوم کرنا بہت ہی آسان ہے اور قولہ: ﴿ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ﴾ سے ان کے ضعف کی طرف اشارہ کیا اور اُن کی قوت کی طرف جو اُن سے پہلے تھے، یعنی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان کو جو تم سے پہلے تھے اور گناہوں کے سبب سے ہلاک کر دیے گئے، جیسے: قومِ لوط کہ ایک خلقت اور طبیعتِ عظیم پر تھے۔ جمہور نے بکسرِ جیم و با و تشدیدِ لام پڑھا ہے۔ اور ابو حصین، اعمش، حسن، اعرج اور شیبہ رحمہم اللہ نے بضمِ ہر دو اور تشدیدِ لام اور سلمی نے بفتحِ جیم مع سکونِ با پڑھا ہے۔ ”جبلة“ بمعنی ”خلیقة“ ہے۔ یہ مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے مراد اگلی امتیں ہیں۔ محاورے میں کہتے ہیں: ”جُبِلَ فُلَانٌ عَلَی کَذَا“ یعنی فلاں پیدا کیا گیا ہے فلاں بات پر۔ نحاس نے کہا کہ خلق کو ”جبلة“ کہتے ہیں بکسرِ جیم و بائے موحدہ اور بضمِ ہر دو مع تشدیدِ لام در ہر دو و بضمِ جیم و سکونِ با و ضم و فتحِ با۔ ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”جِبِلَّة وَجُبُلَّة وَجِبِلّ وَجُبُلّ“ یہ سب لغات ہیں۔ معنی اس کے جمع و عددِ کثیر ہیں آدمیوں سے۔ اسی باب سے قولہ تعالیٰ: ﴿ جِبِلًّا كَثِیْرًا ﴾ [یٰسٓ: ٦٢] ہے، یعنی ”خَلْقًا کَثِیْرًا“[1] اور اسی معنی سے یہ قولِ شاعر ہے:

وَالْمَوْتُ أَعْظَمُ حَادِثٍ فِیْمَا یَمُرُّ عَلَی الْجِبلَّةِ

یعنی جو امور خلق پر گزرتے جاتے ہیں ان میں موت سب سے بڑھ کر حادثہ ہے۔ غرض یہ کہ جب شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو مذکورہ باتوں کا حکم دیا تو انھوں نے ان کو یہ جواب دیا:

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴿١٨٥﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿١٨٦﴾ فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿١٨٧﴾ قَالَ رَبِّیْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٨٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿١٨٩﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿١٩٠﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿١٩١﴾

انھوں نے کہا: بس تو سحر زدہ (لوگوں) میں سے ہے (185) اور تو ہماری طرح بشر ہی تو ہے، اور ہم تجھے بلاشبہہ جھوٹوں میں خیال کرتے ہیں (186) لہٰذا اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا گرا دے (187) شعیب نے کہا: میرا رب خوب جانتا ہے جو تم عمل کرتے ہو (188) چناں چہ انھوں نے اسے (شعیب کو) جھٹلایا، تو انھیں سائے والے دن کے عذاب نے آن پکڑا، بے شک

[1] فتح القدیر (٤/ ١٥٢) فتح البیان (٩/ ١٣۔ ٤١٤)

وہ بہت بڑے دن کا عذاب تھا (189) بلاشبہہ اس میں عظیم نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے
والے نہ تھے (190) اور بے شک آپ کا رب، وہی ہے غالب، بہت رحم کرنے والا (191)

قومِ شعیب کا جواب اور عذاب کے ذریعے ان کی ہلاکت:

سائبان کی طرح ابر آیا، اس میں سے آگ برسی، سب قوم جل گئی۔ انتھٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک شعیب علیہ السلام کی قوم کے جواب کی خبر دیتا ہے کہ اس نے ان کو ویسا ہی جواب دیا، جیسا کہ ثمود نے اپنے رسول کو دیا تھا، ان کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے ہیں، جبھی تو یوں کہا کہ ﴿ إِنَّمَآ أَنتَ مِنَ ٱلْمُسَحَّرِينَ ﴾ یعنی تُو تو مسحورین میں سے ہے، تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے اور تُو تو ایک آدمی ہے، جیسے ہم ہیں۔

﴿ وَإِن نَّظُنُّكَ لَمِنَ ٱلْكَٰذِبِينَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو تجھے خیال کرتے ہیں کہ جو بات تو کہتا ہے اس میں تو جھوٹ کا قصد کرتا ہے نہ یہ کہ اللہ نے تجھ کو ہماری طرف بھیجا ہے۔

﴿ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ ﴾۔ امام ضحاک نے کہا ہے کہ "جَانِبًا مِّنَ السَّمَآءِ" یعنی تو ہم پر آسمان کا کوئی کنارہ دے مار۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قِطَعًا مِّنَ السَّمَآءِ" یعنی آسمان کے ٹکڑے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذاب آسمان سے۔[1] یہ قول اس قول سے مشابہ ہے جو قریش نے کہا تھا، جس کی خبر اللہ پاک نے اس آیت کریمہ میں دی ہے: ﴿ وَقَالُوا۟ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ ٱلْأَرْضِ يَنۢبُوعًا ۝٩٠ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ ٱلْأَنْهَٰرَ خِلَٰلَهَا تَفْجِيرًا ۝٩١ أَوْ تُسْقِطَ ٱلسَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِىَ بِٱللَّهِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةِ قَبِيلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٠۔ ٩٢] "اور وہ بولے: ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگور کا ایک باغ ہو، پھر تو اس (باغ) کے درمیان (جگہ جگہ) نہریں جاری کر دے۔ یا تو آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے جیسے تو کہا کرتا ہے، یا اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے لے آ۔"

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَإِذْ قَالُوا۟ ٱللَّهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ ٱلْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ ٱلسَّمَآءِ أَوِ ٱئْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ [الأنفال: ٣٢] "اور جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔"

اسی طرح ان جاہل کافروں نے کہا: ﴿ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴾ شعیب علیہ السلام نے اس کا یہ جواب دیا: ﴿ رَبِّىٓ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴾ یعنی اللہ تم کو خوب جانتا ہے، اگر تم اس کے مستحق ہو

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨١٤)

گے تو تم کو اس کے ساتھ جزا دے گا اور وہ تم پر ظالم نہ ہو گا۔ اسی طرح ان پر جزا واقع ہوئی، جیسی انھوں نے مانگی تھی، بھرپور ان کو جزا ملی۔

اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ یہ عذاب اس جنس سے ہوا جس کا انھوں نے سوال کیا تھا کہ آسمان کا ٹکڑا ان پر گرا دے۔ اس لیے کہ اللہ پاک نے ان کی سزا یہ ٹھہرائی کہ سات دن تک ان کو سخت گرمی پہنچی، اس سے کوئی شے ان کو نہیں بچاتی تھی۔ پھر ایک بادل اُن کی طرف آیا، اس نے ان پر سایہ کیا تو وہ اس کی طرف چلنے لگے کہ اس کے سائے میں جا کر گرمی سے بچیں۔ پھر جب وہ سب اس کے نیچے جمع ہو گئے تو اللہ پاک نے ان پر اس میں سے آگ کے شرارے، شعلے اور وہج عظیم (آگ کی لپٹیں) بھیجے، یعنی آگ کے ٹکڑے اور شعلے بہت زیادہ ان پر گرنے لگے اور زمین ان کو لے کر ہلی اور ان پر ایک سخت چنگھاڑ آئی، جس نے ان کی روحوں کو نکالا۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾

اللہ پاک نے ان کے ہلاک کرنے کی صفت تین جگہ ذکر فرمائی، ہر جگہ اس کے سیاق کے مطابق بیان فرمایا۔

سورۃ الاعراف میں یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٩١] ''پھر انھیں زلزلے نے آ پکڑا، چناں چہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔'' یہ اس لیے فرمایا کہ انھوں نے یہ کہا تھا: ﴿ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ﴾ [الأعراف: ٨٨] ''اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے ضرور نکال دیں گے یا تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ گے۔''

چونکہ انھوں نے اللہ کے نبی کو اور ان کے متبعین کو زمین سے ہلایا تھا تو خود ان کو لرزۂ زمین نے پکڑ لیا۔ سورت ہود میں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ [هود: ٩٤] ''اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں زبردست چیخ نے آ پکڑا تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔'' اس کی یہ وجہ ہے کہ انھوں نے اللہ پاک کے نبی سے استہزا کیا تھا اور اس طرح کہا تھا: ﴿ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴾ [هود: ٨٧] ''کیا تیری نماز تجھے یہ حکم کرتی (سکھاتی) ہے کہ ہم ان (معبودوں) کو چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے یا اپنے مالوں میں وہ نہ کریں جو کرنا چاہیں؟ بلاشبہہ تو تو بڑا نرم مزاج، بڑا سمجھ دار ہے۔''

یہ بات استہزا کے طور پر اور انھیں حقیر کرنے کے طور پر کہی تھی، چنانچہ اس کے لیے مناسب یہ ہوا کہ ان کو چنگھاڑ آئے اور ان کو ساکت کر دے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ [هود: ٩٤] ''اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں زبردست چیخ نے آ پکڑا تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔'' اور اس جگہ یہ کہا: ﴿ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾

یہ بات سرکشی اور عناد کے طور پر کہی تھی تو اس کے لیے مناسب یہ تھا کہ جس بات کو انھوں نے بعید سمجھا تھا، وہی ان پر سچی کر دی جائے۔ لہٰذا یہ فرمایا: ﴿ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ پاک نے ان پر سات دن تک گرمی مسلط کر دی، یہاں تک کہ کوئی شے ان کو اس گرمی سے سایہ کر کے نہیں بچاتی تھی۔ پھر اللہ نے ان کے لیے ایک بادل اُٹھایا تو اُن میں سے ایک شخص اس بادل کی طرف گیا اور اس کا سایہ لیا، اس نے اس کے نیچے ٹھنڈک اور راحت پائی۔ پھر اس نے اپنی قوم کو اس کی خبر کی تو وہ سب اس کے پاس آئے اور اس کے سائے میں ہو گئے تو اس نے ان پر آگ دھکائی۔

اسی طرح امام عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہم سے بھی مروی ہے۔ عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بادل کو ان سے کھول دیا اور سورج کو ان پر گرما دیا تو وہ جل بھن گئے، جس طرح کہ ٹڈیاں توے میں جلتی ہیں۔ (اصل روایت میں لفظ "مقلی" ہے۔ "مقلی" بالکسر بہ معنی تابہ ہے، یعنی توا یا کڑاہی، جس میں کوئی شے بھونتے ہیں یا تلتے ہیں)۔ امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدین والے تین قسم کے عذاب سے عذاب کیے گئے۔ ان کو اُن کے گھروں میں زلزلے نے پکڑا تو وہ گھروں سے باہر نکل گئے۔ ان کو سخت گھبراہٹ پہنچی اور ڈرے کہ اگر اپنے گھروں میں داخل ہوں تو کہیں وہ ان کے اوپر نہ گر پڑیں۔

پھر اللہ پاک نے ان پر ظلہ بھیجا، ایک شخص اس کے نیچے داخل ہوا۔ اس نے کہا کہ میں نے آج کے دن کی طرح کا اچھا اور ٹھنڈا سایہ نہیں دیکھا۔ اے لوگو! آؤ۔ چنانچہ وہ سب لوگ ظلہ کے نیچے داخل ہو گئے تو اُن پر ایک چیخ ماری تو وہ سب کے سب مر گئے۔ پھر محمد بن کعب رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴾[1]

امام محمد بن جریر رحمہ اللہ نے یزید باہلی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کے بارے میں پوچھا: ﴿ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴾ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رعدہ وحر شدید بھیجی، یعنی زلزلہ اور سخت گرمی تو اس نے ان کی سانسوں کو پکڑ لیا تو وہ گھروں سے بھاگتے ہوئے نکلے اور جنگل کی طرف گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر بادل بھیجا تو اس نے ان پر سایہ کیا۔ انھوں نے اس سے ٹھنڈک اور لذت محسوس کی۔ پھر بعض نے بعض کو پکارا، یہاں تک کہ جب وہ سب کے سب اس سائے میں جمع ہو گئے تو اللہ نے ان پر آگ بھیجی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ ہے: ﴿ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ ﴾[2]۔

﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ بیشک تیرا رب کافروں سے انتقام لینے میں بڑا غالب ہے اور اپنے مومن بندوں پر بڑا مہربان ہے۔[3]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨١٥۔ ٢٨١٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٣٩٤) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٥٧۔ ٤٥٨)

فتح البیان کا بیان:

ہود علیہ السلام کے قصے میں ﴿ مَآ اَنْتَ ﴾ واؤ کے بغیر ہے اور یہاں "وَمَا أَنْتَ" واؤ کے ساتھ ہے۔ اس کا نکتہ یہ ہے کہ یہاں دو معنوں کا ارادہ کیا گیا ہے، یعنی تسحیر اور بشریت کا، ان کے نزدیک یہ دونوں وصف رسالت کے مخالف ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ رسول مسحور ہو اور بشر ہو۔ ان کی تکذیب میں مبالغہ کرنے کو یہ واؤ زیادہ کیا ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ دو وصف کو جمع کرتا ہے جو رسالت کے منافی ہیں۔ ان میں سے اگر ایک وصف ہو تو بھی رسالت کے منافی ہے۔ پھر جب دونوں وصف جمع ہو گئے تُو تو کسی طرح رسول نہیں ہوسکتا اور قصۂ ہود میں واؤ کو ترک کیا، کیوں کہ وہاں پر ایک ہی معنی کا قصد ہے۔ یعنی ان کا مسحور ہونا، پھر اس کی تاکید بشر ہونے سے کی ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ وغیرہ کے بیان کا حاصل یہی ہے،[1] لیکن اتنی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ "مسحرین" کے دو معنی مذکور ہو چکے ہیں: ایک "مسحورین" دوسرے "مخلوقین"۔ اول معنی کی بنا پر نکتۂ مذکور ٹھیک ہوگا اور دوسرے معنی کی بنا پر جملہ ﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴾ اور جملہ ﴿ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ معنی میں دونوں ایک ہوں گے۔

ثانی جملۂ اول کی تاکید ہوگا۔ ترکِ واؤ کی صورت میں اول معنی کی بنا پر ثانی جملہ مستانفہ تعلیل ٹھہرے گا پہلے جملہ کے لیے۔ معنی یہ ہوں گے کہ تجھ پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے، اس لیے کہ تُو تو ہماری طرح ایک بشر ہے اور دوسرے معنی کی بنا پر جملۂ ثانی تاکید ہوگا جملۂ اول کی۔ واللہ أعلم.

﴿ وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ مخففہ ہے ثقیلہ سے، اسم اس کا ضمیرِ شان مقدر ہے اور حرفِ لام فارق ہے، اس کے اور ﴿ اِنْ ﴾ نافیہ کے درمیان۔ تقدیر یہ ہے: "إِنَّهُ نَظُنُّكَ"۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی طرح تقدیر کی ہے،[2] معنی یہ ہیں: بے شک شان یہ ہے کہ جس رسالت کا تو ہم پر دعویٰ کرتا ہے، ہم اس میں تجھ کو خیال کرتے ہیں جھوٹوں سے۔ امام محلی رحمہ اللہ کے علاوہ نے یہ تقدیر کی ہے: "إِنَّا نَظُنُّكَ" یہ انسب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ نافیہ ہے اور حرفِ لام بہ معنی "إِلَّا" ہے، یعنی نہیں گمان کرتے، ہم تجھ کو مگر جھوٹوں سے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تو تجھے جھوٹا ہی خیال کرتے ہیں۔

شعیب علیہ السلام ان کو عذاب کی وعید سنایا کرتے تھے، اگر وہ ایمان نہ لائیں۔ مگر انھوں نے عیب جوئی، سرکشی، استبعاد اور عاجز کرنے کے طور پر ان کو یہ کہا: ﴿ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی تو جو ہم کو عذاب کی وعید سنایا کرتا ہے، سو لے اب ہم پر آسمان سے کوئی ٹکڑا دے مار، اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ "كِسَفٌ"، "كِسْفَةٌ" کی جمع ہے، جیسے: "سِدَرٌ"، "سِدْرَةٌ" کی جمع ہے۔

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "کسف" کسی شے کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں:

---

[1] الکشاف (۳/ ۳۳۸) [2] تفسیر الجلالین (۱/ ۴۹۱)

"أَعْطِنِي كِسْفَةً مِنْ ثَوْبِكَ" یعنی تو مجھے اپنے کپڑے سے ایک ٹکڑا دے دے۔ اس کی جمع "کِسْف" اور "کِسَف" ہے۔ "سَمَا" سے مراد بادل ہے یا "ظلہ"۔[1] (قاله النسفي) سلمی وحفص نے "کِسَفًا" پڑھا ہے، جمع "کِسْفَةٌ" کی۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے "کِسْفًا" پڑھا ہے تو اس نے اس کو واحد ٹھہرایا ہے اور جس نے "کِسَفًا" پڑھا ہے اس نے جمع قرار دیا ہے۔ اس کی تحقیق سورت سبحان میں گزر چکی ہے۔[2] ﴿قَالَ رَبِّيٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم جو شرک اور معاصی کرتے ہو، اللہ پاک اس کو خوب جانتا ہے، لہٰذا وہ تم کو اس پر جزا دینے والا ہے، اگر وہ چاہے گا۔ اس میں سخت دھمکی ہے۔

﴿فَكَذَّبُوْهُ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی اور اس پر جمے رہے۔ ﴿فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ ظلہ سے مراد بادل ہے۔ اللہ پاک نے اس کو ان کے سروں کے اوپر کھڑا کیا تو اس نے ان پر آگ برسائی اور وہ ہلاک ہو گئے۔ جس شے کی انھوں نے فرمایش کی تھی، وہی اللہ نے ان کو پہنچائی، کیوں کہ اگر "کسف" سے ان کی مراد بادل کا ٹکڑا ہے تو تو ظاہر ہی ہے اور اگر اس سے ان کی مراد آسمان کا ٹکڑا ہے تو ان پر عذاب کا نزول اسی سمت سے ہوا، یعنی اوپر سے آسمان کی طرف سے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ پاک نے جہنم سے ایک گرم ہوا اُن کی طرف بھیجی، وہ سات دن تک ان کو گھیرے رہی، یہاں تک کہ گرمی نے ان کو پکا ڈالا، ان کے گھر گرم ہو گئے اور ان کے کنوؤں اور چشموں میں پانی کھولنے لگا تو وہ اپنے گھروں اور محلوں سے بھاگتے ہوئے نکل گئے، اس حال میں کہ وہ گرم ہوا اُن کے ساتھ تھی۔

پھر اللہ پاک نے ان کے سروں کے اوپر سے سورج کو ان پر مسلط فرما دیا، پس اس نے ان کو ڈھانک لیا، یہاں تک کہ ان کی کھوپڑیاں ان میں جنبش کرنے لگیں اور اُن کے پاؤں کے نیچے گرم کنکر ان پر مسلط کر دیے، یہاں تک کہ ان کے پاؤں کے گوشت گر پڑے، پھر ان کے لیے ایک سائبان کالی بدلی کی طرح اٹھا۔ پھر جب انھوں نے اس کو دیکھا تو اس کی طرف لپکے، اس کے سائے میں آرام حاصل کرنا چاہتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ سب کے سب جمع ہو گئے تو وہ ان پر ڈھانک دیا گیا تو وہ ہلاک ہو گئے اور اللہ پاک نے شعیب علیہ السلام کو اور ان کے ہمراہی مومنوں کو نجات دی۔[3] ان کی روایت کے دوسرے الفاظ گزر چکے ہیں۔

تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ فرمایا: جو شخص تجھ سے علماء میں سے ﴿عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ کا بیان کرے تو تُو اس کی تکذیب کر۔ فتح القدیر وفتح البیان میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یوں فرماتے ہیں۔[4] پھر ہم ان سے اس کے قصے کے بارے میں کیا عرض کریں جو انھوں نے ہم سے بیان کیا ہے اور جس کو ہم ابھی ان سے اس

---

[1] تفسیر النسفي (۳/ ۱۹۷) [2] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۱۳۵)

[3] الدر المنثور (٦/ ۳۱۸۔ ۳۱۹) [4] تفسیر الطبري (۱۹/ ۳۹۴) فتح القدیر (٤/ ۱۵٤) فتح البیان (۹/ ٤۱٦)

جگہ نقل کر آئے ہیں، حالاں کہ اس قصے کو امام عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ وغیرہم نے ان سے باسانیدِ خود نقل کیا ہے، ممکن ہے یوں کہیں، جبکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما دریائے علم تھے، اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے برکتِ اثر سے ان کو کتاب اللہ کی تاویل تعلیم فرمائی تھی تو وہ اس حدیث کی معرفت کے ساتھ مختص تھے، ان کے سوا اور اہلِ علم اس کو نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا جو شخص ﴿عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ کی حدیث اور وجہ کے متعلق ایسا بیان کرے، جو اس وجہ سے مختلف ہو، جو انھوں نے ہم سے بیان کی تو ہم کو ان کی وصیت ہے کہ ہم اس شخص کی تکذیب کریں، اس لیے کہ اس کا علم سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ہے، ان کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ واللہ أعلم.

نکتہ:

عذاب کی اضافت ﴿يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ کی طرف کی "ظلة" کی طرف نہ کی، یعنی ﴿عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ کہا "عَذَابُ الظُّلَّةِ" نہ کہا؟ تو اس سے غرض یہ بات بتانا ہے کہ ان کے لیے اس دن میں عذاب تھا سوائے ﴿عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ کے۔ (كذا قيل كذا في فتح البيان) مصححِ مصر نے طرۂ کتاب پر یہ حاشیہ لکھا ہے: "قوله غير عذاب يوم الظلة كذا بالأصل الذي بأيدينا و انظره" کاتبِ حروف عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ مصحح صاحب درست فرماتے ہیں۔

عبارت میں خلل ہے، کاتب کی سہو سے لفظ "یوم" زیادہ ہو گیا ہے، صحیح "غير عذاب الظلة" ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن کئی قسم کے عذاب جمع ہو گئے تھے، ان میں سے عذابِ ظلہ بھی تھا، چناں چہ اس کی تفسیر مفسرین کے اقوال میں گزر چکی ہے۔ اگر "عذاب الظلة" کہا جاتا تو معلوم ہوتا کہ صرف ظلہ کا عذاب ہوا، حالانکہ اس دن کئی عذاب تھے۔ اس لیے اللہ پاک نے ﴿عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ فرمایا، تاکہ وہ سب عذاب اس میں آجائیں، کیوں کہ وہ دن ان کا جامع تھا۔

رہی یہ بات کہ "یوم" کی اضافت "ظلة" کی طرف کیوں کی تو، واللہ اعلم، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آخر عذاب ظلہ کا ہوا اور یہ ان سب سے بڑا تھا، اس میں وہ سب ہلاک ہی ہو گئے۔ غرض کہ جو عذاب ان لوگوں کو پہنچا تھا۔ پھر اللہ پاک نے اس کا یہ وصف بیان فرمایا کہ ﴿إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ یعنی بے شک وہ بڑے دن کا عذاب تھا، اس لیے کہ اس میں ان پر ایسی شدت اور سختی ہوئی کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ﴾ کی تفسیر پورے طور پر پہلے گزر چکی ہے، اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سورت اعراف اور ہود میں ان قصوں پر کلام گزر چکا ہے۔ اس جگہ ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جو شخص کلام کے موقعوں اور اسلوبوں کو جانتا پہچانتا ہے اور سمجھتا بوجھتا ہے، اس پر یہ بات مخفی نہیں ہے

کہ ان سات قصوں کے آخر میں جو ان کلمات کی تکرار کی گئی ہے، اس میں کیا کچھ دھمکی و ڈانٹ اور تقریر اور تاکید ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس سورت میں ہر قصے کے شروع اور آخر میں جو عبارت بار بار لائی گئی ہے وہ تین طرح کے فائدوں کے لیے ہے: ایک تو یہ کہ ان کے معانی کے صادر ہونے میں تقریر ہو، یعنی ان کے معنی مقرر ہو جائیں۔ دوسرے اس لیے کہ وعظ میں اور ڈانٹ ڈپٹ میں ابلغ (مؤثر) ہو۔ تیسرے اس لیے کہ ان میں سے ہر قصہ ایک مستقل تنزیل کی طرح ہے اور اس میں ویسا اعتبار ہے جیسا اس کے علاوہ قصوں میں ہے۔ لہٰذا ہر قصہ اس لائق ہے کہ وہ اس شے کے ساتھ شروع کیا جائے جس کے ساتھ اس کے ساتھ والا قصہ شروع کیا گیا ہے اور ختم بھی اسی شے پر کیا جائے جس پر اس کے ساتھ والا قصہ ختم کیا گیا۔[1] یہ ان کی عبارت کا حاصل ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿١٩٥﴾

اور بلاشبہ یہ (قرآن) رب العالمین کا نازل کردہ ہے (192) روح الامین (جبریل) اسے لے کر نازل ہوا (193) آپ کے دل پر، تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں (194) فصیح عربی زبان میں (195)

قرآنِ مجید کو محمد ﷺ پر اللہ تعالیٰ ہی نے نازل کیا ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس کتاب کی خبر دیتا ہے جس کو اس نے اپنے بندے اور رسولِ محمد ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔ ﴿ وَاِنَّهٗ ﴾ یعنی وہ قرآن جس کا ذکر سورت کے شروع میں اس قول میں گزر چکا ہے: ﴿ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٥] ''اور رحمٰن کے پاس سے جو بھی کوئی نئی نصیحت آتی ہے تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں۔''

﴿ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی اللہ نے اس کو تجھ پر اتارا ہے۔ تیری طرف اس کی وحی کی ہے۔ ﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴾ یعنی جبرائیل علیہ السلام۔ سلف میں سے کئی لوگوں کا یہ قول ہے، جیسے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام محمد بن کعب، قتادہ، عطیہ عوفی، سدی، ضحاک، زہری اور ابن جریج رحمہم اللہ۔ اس قول میں کچھ اختلاف نہیں۔[2] امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [البقرة: ٩٧] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: جو کوئی جبریل کا دشمن ہے، تو اُسی نے اِس قرآن کو اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر نازل کیا ہے، یہ اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی اور مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص سے

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٩٧) فتح البيان (٩/ ٤١٥۔ ٤١٧) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٣٩٦) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨١٧)

روح الامین نے باتیں کیں اس کو زمین نہیں کھاتی۔[1] یعنی لے اترا ہے اس کو معزز فرشتہ، جو اللہ کے نزدیک معزز اور ملائے اعلیٰ میں اس کی بات مانی جاتی ہے۔

﴿ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ یعنی اے محمد! تیرے دل پر اتارا ہے، وہ میل کچیل سے پاک اور کمی بیشی سے محفوظ ہے۔

﴿ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴾ تاکہ تو اس کے ساتھ اللہ کی سزا اور عذاب سے ڈرائے اس شخص کو جو اس کی مخالفت اور تکذیب کرے اور خوش خبری سنا دے اس پر ایمان لانے والوں اور اس کی پیروی کرنے والوں کو۔

﴿ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی یہ قرآن جس کو ہم نے تیری طرف اتارا ہے، ہم نے اس کو عربی زبان میں اتارا ہے، جو کہ بہت وضاحت و بلاغت والی اور کامل و شامل زبان ہے، اس لیے کہ یہ قرآن شریف بین، واضح اور ظاہر ہو اور ہر قسم کے عذر کو دور کرنے والا، حجت قائم کرنے والا اور اسلام کی شاہراہ کی طرف دلیل ہو۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے موسیٰ بن محمد بن ابراہیم تیمی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، وہ اپنے باپ سے راوی ہیں کہ اس دوران میں کہ ایک بادل والے دن رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ تھے (اصل روایت میں "فِيْ يَوْمٍ دَجِنٍ" ہے۔ "دَجنٌ" فرو پوشیدن ابر آسمان را کو کہتے ہیں اور "دُجُنَّةٌ" بہ معنی ابر برہم نشستہ و ابر تاریک بے باران۔ "يَوْمُ دَجْنٍ" "وَيَوْمٌ دَجْنٌ" بہ اضافت و بہ صفت دونوں طرح بولتے ہیں۔ کذا في الصراح)۔

آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: « كَيْفَ تَرَوْنَ بَوَاسِقَهَا؟ » قَالُوْا: مَا أَحْسَنَهَا وَأَشَدَّ تَرَاكُمَهَا، قَالَ: « فَكَيْفَ تَرَوْنَ قَوَاعِدَهَا؟ » قَالُوْا: مَا أَحْسَنَهَا وَأَشَدَّ تَمَكُّنَهَا. قَالَ: « فَكَيْفَ تَرَوْنَ جَرْيَهَا؟ » قَالُوْا: مَا أَحْسَنَهُ وَأَشَدَّ سَوَادَهُ، قَالَ: « فَكَيْفَ تَرَوْنَ رَحَاهَا اسْتِدَارَةً؟ » قَالُوْا: مَا أَحْسَنَهَا وَأَشَدَّ اسْتِدَارَتَهَا، قَالَ: « فَكَيْفَ تَرَوْنَ بَرْقَهَا (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن "مجمع البحار" سے یوں معلوم ہوتا ہے: "اخفوًا أم وميضاً أم يشق شقا" تقدیر یہ ہے: "أيخفوا خفوا أم يومض وميضاً"[2] صراح میں ہے: "وميض" بجلی کا چمکنا ہے بغیر اس کے کہ ابر میں پراگندہ ہو جائے اور جو برق نواحِ ابر میں پراگندہ ہو جاتی ہے، اس کو خفو کہتے ہیں اور جو لمبی چمکتی ہے اور ابر کو چیر دیتی ہے اس کو عقیقہ بولتے ہیں) أَ وَمِيْضٌ أَمْ خَفْقٌ أَمْ يُشَقُّ شَقًّا » قَالُوْا: بَلْ يُشَقُّ شَقًّا، قَالَ: « اَلْحَيَا اَلْحَيَا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ » قَالَ: فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! بِأَبِيْ وَأُمِّيْ مَا أَفْصَحَكَ، مَا رَأَيْتُ الَّذِيْ هُوَ أَعْرَبُ مِنْكَ، قَالَ: فَقَالَ: « حُقَّ لِيْ وَإِنَّمَا نَزَلَ الْقُرْآنُ بِلِسَانِيْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ: ﴿ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴾ »۔[3]

بواسق سے مراد فروعِ سحاب ہیں، جو مستطیل ہو گئے ہیں۔ قواعد سے مراد وہ بادل ہے جو معترض ہو گیا ہے اور نیچے ہو گیا ہے، اس کی تشبیہ قواعد النساء سے دی ہے۔ "وميض" وہ بجلی ہے جو خفی چمکنا چمکتی ہے۔ خفو بجلی کے ضعیف

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨١٨) [2] مجمع بحار الأنوار (٣/ ٢٤١)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨١٨۔ ٢٨١٩) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز سند میں "موسیٰ بن محمد بن ابراہیم تیمی" ضعیف راوی ہے۔

چمکنے کو کہتے ہیں۔ جس وقت بجلی مستطیل چمکتی ہے آسمان کے وسط کی طرف اور اس کو اعتراض نہیں ہوتا ہے تو اس وقت بولتے ہیں: ”یشق شقا“۔ ”حیا“ بالقصر مطر کو کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ زمین کو زندہ کرتا ہے۔

حدیث شریف کے معنی یہ ہیں کہ ایک دن آسمان پر ابر چھا رہا تھا، آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: تم ابر کے بواسق کو کس طرح دیکھتے ہو؟ یعنی اس کی شاخیں جو مستطیل ہو رہی ہیں، ان کو کیا خیال کرتے ہو؟ گویا ابر کی لمبی لمبی شاخوں کو کھجور کے بلند درختوں سے تشبیہ دی۔ صحابہ نے عرض کی: کیا خوبصورت ہیں اور کیا ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ہو رہے ہیں! فرمایا: پھر کیسا دیکھتے ہو اس کے قواعد کو؟ یعنی بادل کی بدلیوں سے جو بدلیاں عریض اور نیچی ہو گئی ہیں ان کو کیسا خیال کرتے ہو؟ گویا ان بدلیوں کو بیٹھی ہوئی عورتوں سے تشبیہ دی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: کیا خوب ہیں اور کیا شدت سے ان کا جماؤ ہے۔

فرمایا: پھر کس طرح دیکھتے ہو، اس کے جری کو؟ (اصل روایت ”فکیف ترون جریها“ ہے۔ واللہ أعلم اس سے کیا مراد ہے)۔ عرض کی: کیا حسین ہے اور کیا سخت ہے اور اس کی سیاہی! فرمایا: پھر کس طرح دیکھتے ہو اس کی چکی کو؟ یعنی جو بدلی اس میں سے گول ہو گئی ہے۔ عرض کی: کیا خوبصورت ہے اور کیا خوبصورت اس کی گولائی ہے! فرمایا: پھر کس طرح دیکھتے ہو اس کی بجلی کو، کیا وہ ایسا چمکنا چمکتی ہے کہ ابر میں پراگندہ نہیں ہو جاتی یا وہ ایسی چمکتی ہے کہ اطرافِ ابر میں پراگندہ ہو جاتی ہے یا ایسی چمکتی ہے کہ وسطِ آسمان کی طرف مستطیل ہو جاتی ہے اور آڑی نہیں ہوتی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ وسطِ آسمان کی طرف مستطیل ہو جاتی ہے اور آڑی نہیں ہوتی۔

فرمایا: بارش ہو گی۔ إن شاء اللہ۔ راوی نے کہا: پھر ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ تو کیا ہی فصیح ہیں۔ میں نے آپ سے بڑھ کر کوئی فصیح شخص نہیں دیکھا۔ راوی نے کہا: اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: میں اس کا مستحق ہوں، کیوں کہ قرآن جو نازل کیا گیا ہے۔ تو میری زبان میں۔ نیز اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴾

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ نہیں اتری وحی مگر عربی زبان میں۔ پھر ہر نبی نے اپنی قوم کے لیے ترجمہ کیا اور قیامت کے دن زبان سریانی ہو گی۔ (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: ”وَاللِّسَانُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِالسُّرْيَانِيَّةِ“ یعنی قیامت کے دن سب کی زبان سریانی لغت میں ہو گی) پھر جو شخص جنت میں داخل ہو گا تو وہ عربی زبان میں باتیں کرے گا۔ اس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ إِنَّهُ ﴾ کی ضمیر ان خبروں اور قصوں کی طرف راجع ہے جن

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨١٩) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٥٨۔ ٤٥٩)

کو اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کی طرف نازل فرمایا ہے۔ یا قرآن شریف کی طرف راجع ہے، اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں گزرا ہے۔ لیکن چوں کہ وہ معلوم ہے، اس لیے پہلے ذکر نہ ہونے سے بھی اس کی طرف ضمیر پھیرنا ٹھیک ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔

﴿ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کسی نے کہا ہے کہ یہاں مضاف مقدر ہے، یعنی ''ذو تنزیل'' اور جبکہ ''تنزیل'' بہ معنی منزل ہو تو مضاف مقدر کرنے کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ بے شک یہ خبریں اور قصے، یا یہ قرآن البتہ اتارا ہوا ہے، جہان کے پروردگار کا۔ یہ شعر و سحر نہیں ہے، نہ اگلوں کی کہاوتیں ہیں، نہ وہ ہے جو اور کچھ اس کے سوا کافروں نے بکا ہے۔

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴾ امام نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے ﴿ نَزَلَ ﴾ کو بہ تخفیف پڑھا ہے، باقی قراء کی قراءت تشدید کے ساتھ ہے۔ اس کی بنیاد پر ''اَلرُّوْحَ الْاَمِیْنَ''، منصوب ہو گا بنا بر مفعول بہ۔ امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اس قراءت کو اختیار کیا ہے۔[1] روح الامین سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ روح الامین جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ میں نے ان کے چھے سو پر دیکھے جو موتی کے تھے جن کو انھوں نے مور کے پَروں کی طرح پھیلا رکھا تھا۔ اس کو ابو الشیخ نے روایت کیا ہے۔[3] جبرائیل علیہ السلام کا نام روح اس لیے رکھا ہے کہ وہ روح سے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان کا نام امین اس لیے ہوا کہ وہ امین بنائے گئے ہیں، اللہ پاک کے نبیوں کی طرف اللہ کی وحی امانت کے ساتھ پہنچانے والے ہیں۔ پہلی قراءت کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ اس کو معتبر فرشتہ لے کر اترا ہے۔ دوسرے کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ رب العالمین نے اسے روح الامین کو دے کر اتارا ہے۔

﴿ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ روح الامین نے اس کو تیرے دل پر پڑھا ہے، تاکہ تو اس کو یاد رکھے اور سمجھے اور نہ بھولے۔ قلب کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا ہے کہ حواسِ باطنہ میں سے قلب پہلا سمجھنے والا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خاص کر قلب کا ذکر کیا ہے، حالاں کہ وہ تو نبی اکرم ﷺ پر اتارا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قلب کو ذکر کرنا اس بات کی تاکید ہے کہ یہ قرآن منزل محفوظ ہے اور رسول اس کے قلب سے متمکن ہے، اس میں تبدیلی جائز نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حقیقت میں مخاطب قلب ہی ہے، اس لیے کہ تمیز و عقل و اختیار کی جگہ وہی ہے۔ باقی اعضاء اس کے مسخر ہیں۔ اس بات پر قرآنِ مجید و حدیث شریف و معقول دال ہے۔ قرآن شریف کی تو یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ ﴾ [ق: ۳۷] ''بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے نصیحت ہے جو (آگاہ) دل رکھتا ہے۔'' اور حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''خبردار اور بے شک جسم میں گوشت

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۱۳۷) [2] تفسیر الطبري (۱۹/ ۳۹٦) [3] العظمة لأبي الشیخ (۲/ ۸۰۱)

کا ایک ٹکڑا ہے، جس وقت وہ درست ہو گیا تو سارا جسم درست ہو گیا اور جس وقت وہ فاسد ہو گیا تو سارا جسم فاسد ہو گیا خبردار اور وہ قلب ہے۔" اس کو امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

معقول کی دلیل یہ ہے کہ جس وقت قلب پر غشی طاری ہو جائے اور باقی اعضاء کاٹے جائیں تو دل کو شعور حاصل نہیں ہوتا اور جس وقت دل ہوشیار ہو جاتا ہے تو اعضاء پر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں، دل کو ان سب کا شعور ہوتا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ دلیل معقول میں سے یہ ہے کہ فرحت و سرور اور غم و حزن کی جگہ قلب ہی ہے۔ لہٰذا جس وقت دل خوش ہوتا ہے یا رنجیدہ تو باقی اعضاء کا حال بدل جاتا ہے، چنانچہ دل دوسرے اعضاء کے لیے ایک سردار کے طور پر ہے۔ اسی بارے میں یہ بات ہے کہ عقل کی جگہ قلب ہی ہے اوپر دیے گئے صحیح اقوال کی بنا پر۔ پھر جب یہ بات ثابت ہو گئی تو دل ہی امیر مطلق ہوا اور وہی مکلف ہے، کیوں کہ تکلیف عقل اور فہم کے ساتھ مشروط ہے۔[2]

امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ اور ﴿ لِتَكُوْنَ ﴾ دونوں ﴿ نَزَلَ ﴾ سے متعلق ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے: جائز ہے کہ "تَنْزِيْل" سے متعلق ہوں، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے ﴿ نَزَّلَ ﴾ کو بہ تشدید بصیغۂ مجہول پڑھا ہے اور فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور ﴿ اَلرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴾ اس صورت میں مرفوع ہو گا بنا بر نائب فاعل۔ ﴿ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴾ "إنزال" کی وجہ ہے، یعنی قرآن کو تجھ پر اس لیے اتارا ہے کہ اس میں جو تحذیرات اور انذارات اور عقوبات (ڈرانے اور بچانے کے احکامات اور سزائیں) ہیں ان سے ان کو ڈرائے۔

﴿ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴾ "مُنْذِرِيْنَ" سے متعلق ہے، یعنی تاکہ تو ان ڈرانے والوں سے ہو، جنھوں نے اس عربی زبان کے ساتھ ڈرایا ہے۔ یہ لوگ ہود، شعیب، صالح اور اسماعیل علیہم السلام ہیں۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ ﴿ بِهٖ ﴾ سے بدل ہو۔[4] کسی نے کہا ہے کہ "نزول" سے متعلق ہو، یعنی اس کو عربی زبان میں اتارا ہے، تاکہ تو اس کے ساتھ ڈرائے۔ "إنذار" کے ذکر کے اہتمام کی وجہ سے اس کو بعد میں ذکر کیا۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ ﴾ سے مراد رسالت یا عربی لغت ہے۔[5] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے بھی "بلغت عربي" کہا ہے۔[6]

اللہ پاک نے جو قرآن شریف کو رسولِ عربی کی زبانِ عربی میں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکینِ عرب یہ بات نہ کہہ سکیں کہ جو تو ہماری غیر زبان میں کہتا ہے، ہم اسے نہیں سمجھتے۔ اگر قرآن شریف عجمی زبان میں نازل ہوتا تو وہ بالیقین یہ کہتے۔ اس لیے اللہ پاک نے اس کو عربی زبان میں نازل کر کے ان کی حجت قطع کر دی اور ان کی علت اور عذر کو دور فرما دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے: "بِلِسَانٍ قُرَيْشٍ"

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩) [2] تفسير الخازن (٥/ ١٢٥)
[3] البحر المحيط (٧/ ٣٨) [4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٠١)
[5] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٠١) [6] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٦٤)

یعنی قریش کی زبان میں اس کو نازل کیا اور اگر غیر عربی ہوتا تو وہ اس کو نہ سمجھتے۔ امام بریدہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ "بِلِسَانِ جُرْهُمٍ"۔[1] ("جرہم" یمن کا ایک قبیلہ ہے۔)

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٩٦﴾ أَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ آيَةً أَن يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٩٧﴾ وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ﴿١٩٨﴾ فَقَرَأَهُ عَلَيْهِم مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿١٩٩﴾

اور بلاشبہ وہ (قرآن کا ذکر) پہلی کتابوں میں بھی ہے ﴿196﴾ کیا ان کے لیے یہ ایک نشانی (کافی) نہیں کہ بنی اسرائیل کے علماء بھی اس (قرآن یا صاحب قرآن) کو جانتے ہیں ﴿197﴾ اگر ہم اس (قرآن) کو کسی عجمی پر نازل کرتے ﴿198﴾ پھر وہ اسے ان پر پڑھتا، (تو بھی) وہ اس پر ایمان نہ لاتے ﴿199﴾

پہلی کتابوں میں بھی قرآنِ مجید کا ذکر موجود ہے:

یعنی اس قرآن کی خبر اگلی کتابوں میں لکھی ہے اور اس کا مدعا بھی زیادہ تر یہی ہے۔ کافر کہتے تھے کہ قرآن عربی زبان میں آیا ہے، اس نبی کی زبان بھی عربی ہے، شاید یہ خود ہی اپنی طرف سے کہتا ہو۔ اگر غیر زبان والے پر عربی میں آتا تو یقین کرتے، فرمایا کہ دھوکے والے کا دل کبھی نہیں ٹھہرتا، پھر کوئی اور شبہہ نکال لیتے کہ کوئی سکھا جاتا ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس قرآن کا ذکر اور اس کے نام کا بلند کرنا، البتہ اگلی کتابوں میں موجود ہے جو ان کے نبیوں سے نقل ہوتے آئے ہیں، جنھوں نے زمانۂ قدیم اور جدید میں اس کی بشارت دی ہے، جس طرح کہ اللہ پاک نے انبیا علیہم السلام سے اس کا عہد و پیمان لیا تھا، یہاں تک کہ ان انبیا میں سے آخری نبی اپنی جماعت میں کھڑے ہوئے اور ان کو احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا خطبہ دیا، چناں چہ اللہ پاک نے قرآن شریف میں اس کی خبر دی ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ [الصف: ٦] "اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا۔" "زُبُر" اس جگہ کتب کے معنی میں ہے، جو زبور کی جمع ہے۔ اسی طرح زبور داود علیہ السلام کی کتاب ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ﴾ [القمر: ٥٢] "اور جو کچھ انھوں نے کیا ہے، وہ صحیفوں میں (درج) ہے۔" یعنی ہر شے جو انھوں نے کی ہے، وہ فرشتوں کے صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے۔

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٣٢٢) فتح القدير (٤/ ١٦١) فتح البيان (٩/ ٤١٧۔ ٤١٨)

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَوَ لَمۡ یَکُنۡ لَّهُمۡ اٰیَةً اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴾ یعنی ان کو شاہدِ صادق کی یہ بات کافی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء اس قرآن کا ذکر اپنی کتابوں میں پاتے ہیں، جن کا وہ درس دیا کرتے ہیں۔ علماء سے مراد اُن کے عادل اور سچے علماء ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی صفت اور آپ ﷺ کے مبعوث ہونے کی جگہ اور آپ ﷺ کی اُمت کا اقرار کرتے ہیں، وہ اُمت جو ان کے پاس موجود ہے۔ چناں چہ جو لوگ ان میں سے مسلمان ہوئے انھوں نے اس کی خبر دی ہے، جیسے: عبداللہ بن سلام اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہما نے ان لوگوں سے نقل کیا ہے، جن کو انھوں نے پایا ہے اور جو اَور لوگ ان کی طرح کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ ۫ یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَ عَزَّرُوۡهُ وَ نَصَرُوۡهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٧] ''(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے۔ اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، چناں چہ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

پھر اللہ پاک نے قریش کے کفر اور عناد کی شدت کی اطلاع دی، جو اُن کو اس قرآن سے ہے کہ اگر یہ قرآن عجمیوں کے کسی آدمی پر نازل ہوتا، ان لوگوں میں سے جو عربی زبان کا ایک کلمہ بھی نہیں جانتے ہیں اور اس پر یہ کتاب اپنے بیان اور فصاحت کے ساتھ نازل کی جاتی تو بھی اس پر ایمان نہ لاتے۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَ لَوۡ نَزَّلۡنٰهُ عَلٰی بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِیۡنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَیۡهِمۡ مَّا کَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِیۡنَ ﴾

چنانچہ دوسری آیت میں ان کی طرف سے یہ خبر دی ہے: ﴿ وَ لَوۡ فَتَحۡنَا عَلَیۡهِمۡ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوۡا فِیۡهِ یَعۡرُجُوۡنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوۡۤا اِنَّمَا سُکِّرَتۡ اَبۡصَارُنَا بَلۡ نَحۡنُ قَوۡمٌ مَّسۡحُوۡرُوۡنَ ﴾ [الحجر: ١٤۔ ١٥] ''اور اگر ہم ان پر آسمان سے ایک دروازہ کھول دیں، پھر وہ اس پر چڑھنے لگیں۔ تب بھی وہ یہی کہیں گے کہ ہماری تو نظریں ہی بند کر دی گئی ہیں، بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ لَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَیۡهِمُ الۡمَلٰٓئِکَةَ وَ کَلَّمَهُمُ الۡمَوۡتٰی وَ حَشَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ کُلَّ شَیۡءٍ قُبُلًا مَّا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَهُمۡ یَجۡهَلُوۡنَ ﴾ [الأنعام: ١١١] ''اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے، اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے، تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اَور بات تھی) لیکن

ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴾ [یونس: ۹٦] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ اِنَّهٗ ﴾ کی ضمیر قرآن شریف کی طرف راجع ہے، یعنی قرآن اپنے ان احکام کے اعتبار سے جن پر شریعوں کا اجماع ہے، البتہ اگلے نبیوں کی کتابوں میں ہے جیسے تورات اور انجیل۔ ''زُبُر'' بہ معنی کتب ہے، اس کا واحد زبور ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ قرآن کا ذکر ان میں موجود ہے۔ یا ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے، یعنی آپ کی بشارت اگلی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن کا زُبرِ اولین میں ہونا یہ ہے کہ نفسِ قرآن اُن میں مذکور ہے، یہ مراد نہیں کہ جن احکام پر قرآن مشتمل ہے، وہ ان میں ہیں۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جب قرآن کا ترجمہ غیر عربی زبان میں کیا جائے جیسے فارسی وغیرہ ہے تو وہ قرآن، قرآن ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا کہ صحیح قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب سے یہ ہے کہ قرآن شریف نظم و معنی دونوں ہیں۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے۔[2]

﴿ اَوَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً ﴾ میں ہمزہ انکار کے لیے ہے اور حرفِ واؤ عطف کے لیے ہے مقدر پر، چناں چہ اس کا بیان بارہا گزر چکا ہے، آیت کے معنی ہیں علامت و دلالت، یعنی کیا کفارِ مکہ کے لیے ایسی نشانی نہیں ہے، جو اس بات پر دلالت کرے کہ قرآن حق ہے اور رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگلے انبیاء علیہم السلام کی کتابوں میں ہے۔

﴿ اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴾ یعنی یہ بات کہ بنی اسرائیل کے علماء بالعموم اس کو جانتے پہچانتے ہیں، یا ان کے وہ علماء جو ایمان لے آئے ہیں، جیسے: عبداللہ بن سلام، اسد، اسید، ثعلبہ اور ابن یامین رضی اللہ عنہم۔ یہ پانچ آدمی علمائے یہود میں سے ہیں اور ان کا اسلام اچھا ہوا۔ یہ لوگ قرآن شریف کی حقیت کی اور اس کے منزل من اللہ ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ اہلِ کتاب کی شہادت جو مشرکوں پر حجت ہوئی، وہ اس لیے کہ مشرکین اہلِ کتاب کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور ان کی تصدیق کرتے تھے۔ ابن عامر نے ''تَکُنْ'' بتائے فوقیہ پڑھا ہے اور ''اٰیَةٌ'' کو برفع، اس بنا پر کہ ''کان'' کا اسم ہے اور خبر اس کی ﴿ اَنْ یَّعْلَمَهٗ ﴾ ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ ''کان'' تامہ ہو۔ باقی قراء کی قراءت بیائے تحتیہ اور بہ نصب ﴿ اٰیَةً ﴾ ہے، اس بنا پر کہ ''کان'' کی خبر ہے اور ﴿ اَنْ یَّعْلَمَهٗ ﴾ اس کا اسم ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَنْ یَّعْلَمَهٗ ﴾ اسم ہے ''کان'' کا اور ﴿ اٰیَةً ﴾ اس کی خبر ہے۔ معنی یہ ہیں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ٤٥٩)
[2] حاشیة الشهاب علی تفسیر البیضاوي (۷/ ۲۹)

کہ کیا بنی اسرائیل کا یہ جاننا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نبیِ حق ہیں، کفارِ مکہ کے لیے ان کی نبوت کی علامت اور دلیل نہیں ہے، کیوں کہ بنی اسرائیل کے جو علماء ایمان لے آئے تھے، وہ اس بات کی خبر دیتے تھے کہ آپ ﷺ کا ذکرِ خیر اُن کی کتابوں میں موجود ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور دونوں نے رفع کے ساتھ قراءت کی وہی وجہ بیان کی ہے جو ہم ذکر کر آئے ہیں۔[1] امام ابن عامر رحمہ اللہ کی قراءت میں نظر ہے، کیوں کہ نکرہ کا اسم ٹھہرانا اور معرفہ کا خبر ٹھہرانا جائز نہیں ہے، گو بطور شاذ بعض اشعار میں وارد ہوا ہے، اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لَهُمْ ﴾ سے نکرہ کی تخصیص ہوگئی ہے تو یہ بے وجہ ہے، اس واسطے کہ وہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور حال معنی میں صفت ہے، لہٰذا اس کی توجیہ میں جو کچھ کہا گیا، اس سب سے بہتر وہی بات ہے جو ہم کہہ آئے ہیں کہ "کان" تامہ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ علمائے بنی اسرائیل میں سے تھے اور ان کے بہترین لوگوں میں سے تھے، وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی کتاب پر ایمان لے آئے۔ اللہ نے اُن سے یوں فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾[2] (یعنی کفارِ مکہ سے کہا۔ غرض یہ ہے کہ اللہ پاک نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی تعریف فرمائی۔)

﴿ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۝١٩٨ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی اگر ہم اس قرآن کو اس صفت پر جس پر وہ ہے عجمیوں میں سے کسی شخص پر اتارتے کہ جن کو عربی بولنے پر قدرت نہیں ہے، پھر وہ اس کو صحیح قراءت کے ساتھ ان پر پڑھتا تو بھی وہ اس کی پیروی کرنے میں شرم وعار کے مارے اس پر ایمان نہ لاتے، باوجود اس کے کہ اس میں دو معجزے جمع ہو جاتے: ایک معجزہ عجمی شخص کا عربی کلام، یعنی قرآن شریف کی قراءت کرنا، دوسرے قرآن کا معجزہ اور باوجود اس کے کہ عجمی اصلاً عربی کا علم حاصل کرنے پر متّہم نہیں ہوتا ہے، نہ ہی اختراعِ عربی کے ساتھ اس پر کوئی اعتراض ہوسکتا ہے، اس لیے کہ اس کے کلام میں فصاحت نہیں ہوسکتی اور عربی اس کی زبان نہیں ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہم اس کو بعض عجمیوں پر کسی عجمی زبان میں اتارتے، پھر وہ اس کو ان پر اپنی زبان میں پڑھتا تو بھی وہ اس پر ایمان نہ لاتے اور کہتے ہم اس کو نہیں سمجھتے بوجھتے۔

اس آیت کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ﴾ [حم السجدة: ٤٤] "اگر ہم اسے عجمی (زبان کا) قرآن بنا کر بھیجتے تو وہ ضرور کہتے: اس کی آیتیں (عربی میں) کھول کر بیان کیوں نہیں کی گئیں؟" یہ جملہ شرطیہ وقوع کو مستلزم نہیں ہے۔ "أعجمین" جمع ہے "أعجمي" کی۔ صاحبِ تحریر نے یہی کہا ہے: یا "أعجم" کی جمع ہے۔ یہ قول امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کا ہے۔ جب کوئی فصیح اللسان نہیں ہوتا ہے، اگر چہ وہ عربی ہو تو محاورۂ عرب میں اس کو "رَجُلٌ أَعْجَمٌ أَوْ عَجَمِيٌّ" کہتے ہیں اور جب کہ اس کی اصل عجم سے ہو تو

[1] فتح القدير (٤/ ١٥٥)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٢٠)

"رَجُلٌ عَجَمِيٌّ" بولتے ہیں، گو وہ فصیح ہی کیوں نہ ہو۔ مگر امام فراء رحمہ اللہ نے "رَجُلٌ عَجَمِيٌّ" کہنا جائز رکھا ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أعجم" وہ شخص ہے جو فصیح نہیں بولتا اور اس کی زبان میں عجمہ ہے یا استعجام ہے اور "أعجمي" بھی اس کے مثل ہے، مگر اتنی بات ہے کہ اس میں یائے نسبت کی زیادتی ہے جو تاکید کے لیے ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے "عَلَى بَعْضِ الْأَعْجَمِيِّينَ" پڑھا ہے اور اسی طرح جحدری نے۔ امام ابوالفتح ابن جنی نے کہا ہے کہ "أعجمين" کی اصل "أعجميين" ہے، پھر یائے نسبت کو حذف کر دیا اور یاء ونون کے ساتھ اس کی جمع اس پر دلیل ٹھہرائی گئی۔[1]

كَذَٰلِكَ سَلَكْنَٰهُ فِى قُلُوبِ ٱلْمُجْرِمِينَ ﴿٢٠٠﴾ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِۦ حَتَّىٰ يَرَوُا۟ ٱلْعَذَابَ ٱلْأَلِيمَ ﴿٢٠١﴾ فَيَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٠٢﴾ فَيَقُولُوا۟ هَلْ نَحْنُ مُنظَرُونَ ﴿٢٠٣﴾ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿٢٠٤﴾ أَفَرَءَيْتَ إِن مَّتَّعْنَٰهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَآءَهُم مَّا كَانُوا۟ يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَآ أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾ وَمَآ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنذِرُونَ ﴿٢٠٨﴾ ذِكْرَىٰ وَمَا كُنَّا ظَٰلِمِينَ ﴿٢٠٩﴾

اسی طرح ہم نے اس (تکذیب) کو مجرموں کے دلوں میں داخل کر دیا ہے (200) وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں (201) چناں چہ وہ ان پر اچانک آ پڑے گا، جبکہ انھیں خبر تک نہ ہوگی (202) پھر وہ کہیں گے: کیا ہمیں (کچھ) مہلت مل سکتی ہے؟ (203) کیا وہ لوگ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ (204) بھلا آپ دیکھیں تو! اگر ہم انھیں کئی برس (دنیا کا) فائدہ دیں (205) پھر وہ (عذاب) ان پر آ جائے جس سے انھیں ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے (206) تو جس (سامانِ عیش) سے وہ مزے اُڑا رہے تھے ان کے کچھ کام نہ آئے گا (207) اور ہم نے جس بستی کو بھی ہلاک کیا، تو (پہلے) اس کے لیے ڈرانے والے (بھیجے) تھے (208) یاددہانی کے لیے، اور ہم ظالم نہیں ہیں (209)

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ ہم نے اسی طرح تکذیب اور کفر اور انکار کو مجرموں کے دلوں میں داخل کر دیا ہے، وہ اس وقت تک حق کو نہیں مانیں گے، جب تک کہ عذابِ الیم کو نہ دیکھ لیں، یعنی جس

[1] فتح القدير (٤/ ١٥٦) فتح البيان (٩/ ٤١٩۔ ٤٢٠)

وقت ظالموں کو ان کی معذرت کوئی فائدہ نہ دے گی۔ ان کے لیے پھٹکار ہے اور برا گھر ہے۔ پھر ان کو اللہ کا عذاب اچانک آئے گا اور ان کو خبر نہ ہوگی۔ پھر کہنے لگیں گے کہ کچھ بھی ہم کو مہلت ملے، یعنی جس وقت عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش! ان کو ذرا سی مہلت ملے، تاکہ وہ اپنے زعم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت والے عمل کریں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴾ [إبراهيم: ٤٤] ”اور (اے نبی!) لوگوں کو اس دن سے ڈرائیں جب انھیں عذاب آ لے گا تو ظالم کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی مدت تک مہلت دے (تاکہ) ہم تیری دعوت قبول کریں اور رسولوں کی اتباع کریں۔ (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمھارے لیے کوئی زوال نہیں؟“

ہر ظالم و فاجر و کافر جس وقت اپنی عقوبت کا مشاہدہ کرے گا تو سخت نادم ہوگا۔ یہ فرعون ہے کہ جس وقت کلیم علیہ السلام نے اس پر یہ بد دعا کی کہ ﴿ رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٨٨﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا ﴾ [يونس: ٨٨۔ ٨٩] ”اے ہمارے رب! بے شک تو نے فرعون اور اس (کی قوم) کے سرداروں کو دنیاوی زندگی میں شان و شوکت اور مال و زر دے رکھا ہے، اے ہمارے رب! تاکہ وہ (لوگوں کو) تیری راہ سے بھٹکا دیں۔ اے ہمارے رب! ان کے مال و زر غارت کر دے اور ان کے دل سخت کر دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب (نہ) دیکھ لیں۔ اللہ نے کہا: یقیناً تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے۔“

تو فرعون کے حق میں یہ بد دعا اثر کر گئی، پھر وہ ایمان نہ لایا، یہاں تک کہ عذابِ الیم کو دیکھا: ﴿ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ [يونس: ٩٠۔ ٩١] ”حتی کہ جب اسے غرق ہونے نے پا لیا، تو پکار اُٹھا: میں ایمان لاتا ہوں کہ بے شک اس ذات کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ (اللہ نے فرمایا:) کیا اب (ایمان لاتا ہے؟) جب کہ تو پہلے نافرمان تھا اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٨٤۔ ٨٥] ”چناں چہ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا: ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ہم ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا

تو انھیں ان کے ایمان (لانے) نے کوئی نفع نہ دیا، یہی اللہ کا طریقہ ہے، جو اس کے بندوں میں گزرا اور اس (عذاب کے) موقع پر کافروں نے خسارہ اُٹھایا۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴾ اللہ پاک نے یہ بات ان پر انکار کرنے کے لیے اور ان کو ڈرانے اور دھمکانے کے لیے کہی، کیوں کہ وہ تکذیب اور استبعاد (ناممکن سمجھتے ہوئے) کے لیے رسول کو یوں کہا کرتے تھے کہ تو ہم پر اللہ کا عذاب لے آ، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ [الحج: ٤٧۔ ٤٨] ”اور وہ آپ سے جلد عذاب مانگتے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا اور بلاشبہہ آپ کے رب کے ہاں ایک دن تمھاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس کی طرح ہے۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے انھیں ڈھیل دی جب کہ وہ ظالم تھیں، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا اور میری ہی طرف (سب کی) واپسی ہے۔“

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴾ یعنی اگر ہم ان کو ایک مدت تک، گو وہ دراز ہی کیوں نہ ہو، ان کو تاخیر اور مہلت دے بھی دیں، پھر ان پر امرِ الٰہی آ پہنچے تو جس عیش و آرام میں وہ رہے، وہ ان کے کس کام آئے گا ان کا حال تو یہ ہوگا، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴾ [النازعات: ٤٦] ”جس روز وہ قیامت کو دیکھیں گے (تو سمجھیں گے) کہ گویا وہ دنیا میں بس ایک شام یا صبح ہی ٹھہرے ہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ﴾ [البقرة: ٩٦] ”ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کاش! اسے ایک ہزار سال کی عمر مل جائے، حالاں کہ اس قدر عمر کا ملنا بھی اسے عذاب سے بچانے والا نہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ﴾ [اللیل: ١١] ”اور جب وہ (دوزخ میں) گرے گا تو اسے اس کا مال کوئی فائدہ نہ دے گا۔“ اسی لیے یہاں فرمایا ہے: ﴿ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴾

صحیح حدیث میں مروی ہے کہ کافر کو لایا جائے گا، پھر آگ میں ایک دفعہ ڈبو دیا جائے گا۔ پھر اس سے کہا جائے گا: کیا تو نے کبھی کوئی خیر دیکھی، کیا تو نے کبھی کوئی عیش و آرام دیکھا؟ تو وہ کہے گا: ”لَا، وَاللّٰهِ يَا رَبِّ“ یعنی نہیں، اے میرے رب! اور لوگوں میں سے جو حاجت اور فقیری میں سب سے زیادہ رہا تھا اسے لایا جائے گا اور اسے جنت میں ایک دفعہ پھرایا جائے گا، پھر اس سے کہا جائے گا: کیا تو نے کبھی کوئی حاجت اور فقیری دیکھی؟ تو وہ کہے گا: ”لَا، وَاللّٰهِ يَا رَبِّ! أَيْ: مَا كَأَنَّ شَيْئًا كَانَ“[1] یعنی کبھی کچھ حاجت اور مفلسی نہ تھی۔ اسی لیے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یہ بہت پڑھا کرتے تھے:

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٠٧)

كَأَنَّكَ لَمْ تُؤْثِرْ مِنَ الدَّهْرِ لَيْلَةً إِذَا أَنْتَ أَدْرَكْتَ الَّذِي أَنْتَ تَطْلُبُ

''جب تو اپنی مراد کو پہنچ گیا تو گویا تو نے کبھی کسی تکلیف کا نام بھی نہیں سنا۔''

پھر اللہ پاک نے مخلوق میں اپنے عدل کی خبر دی کہ اس نے اُمتوں میں سے کسی اُمت کو اس وقت تک ہلاک نہیں کیا، جب تک ان سے تمام عذر دور نہیں کر دیے اور ان کو برے انجام سے ڈرایا نہیں اور اُن کی طرف رسول نہیں بھیجے۔ اسی لیے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ﴾۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ حَتّٰى نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥] ''اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهۡلِكَ الۡقُرٰى حَتّٰى يَبۡعَثَ فِىۡۤ اُمِّهَا رَسُوۡلًا يَّتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهۡلِكِى الۡقُرٰٓى اِلَّا وَاَهۡلُهَا ظٰلِمُوۡنَ ﴾ [القصص: ٥٩] ''اور آپ کا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں، حتی کہ وہ ان کی کسی بڑی بستی میں کوئی رسول بھیجتا ہے، وہ ان پر ہماری آیات تلاوت کرتا ہے، اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں، مگر (اسی وقت) جب کہ ان کے باشندے ظالم ہوں۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: ﴿ كَذٰلِكَ سَلَكۡنٰهُ فِىۡ قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴾ یعنی اس داخل کرنے کی طرح ہم نے قرآن کو نبی اکرم ﷺ کی قراءت کے ساتھ کفارِ مکہ کے دلوں میں داخل کیا، یہاں تک کہ انھوں نے اس کے معانی کو سمجھ لیا اور اس کی فصاحت کو پہچانا اور یہ جان لیا کہ وہ معجزہ ہے۔ حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ہم نے شرک اور تکذیب کو مجرموں کے دلوں میں داخل کیا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''سَلَكْنَا الْقَسْوَةَ''، یعنی ہم نے ان کے دلوں میں سختی داخل کی۔[2] لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ سیاقِ کلام قرآن شریف کے حق میں ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں معتزلہ پر اس مسئلے میں حجت ہے کہ بندوں کے خیر اور شر اعمال اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، بندے اپنے افعال کے خالق نہیں ہیں، اس کی روشن دلیل ﴿ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ [الصافات: ٩٦] ''تمھیں اور تمھارے اعمال کو پیدا کیا ہے۔'' ہے، یعنی تم کو پیدا کیا اور اس کو پیدا کیا جو تم خیر و شر کرتے ہو۔

جملہ ﴿ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ﴾ یا مستانفہ ہے جو اپنے سے ماقبل کی وضاحت اور بیان کے لیے لایا گیا ہے۔ یا محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ سَلَكۡنٰهُ ﴾ کی ضمیر سے۔ یا حال ہے ﴿ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴾ سے۔ ﴿ حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَ لِيۡمَ ﴾ یعنی وہ قرآن پر ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ عذابِ الیم کا مشاہدہ کر لیں۔ اس عذاب سے مراد موت کے وقت موت کا معائنہ ہے، اس وقت یہ ایمان یاس کا ہوگا اور ان کو کچھ فائدہ نہ دے گا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے ﴿ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴾ میں جزم کو جائز رکھا ہے، اس لیے کہ اس میں شرط اور مجازاۃ کے معنی ہیں، اور زعم کیا ہے کہ من جملہ

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٥٩۔ ٤٦٠)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٢١۔ ٢٨٢٢)

شانِ عرب یہ بات ہے کہ جس وقت وہ "لا" کو "کي لا" کی جگہ پر رکھتے ہیں، جس طرح یہاں ہے تو کبھی اس کے ما بعد کو مجزوم کرتے ہیں اور کبھی مرفوع، پس "رَبَطتُ الْفَرَسَ لَا يَنفَلِت" (یعنی میں نے گھوڑے کو باندھا تاکہ چھٹ نہ جائے۔) کو بہ رفع و جزم دونوں طرح بولتے ہیں، کیوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر میں گھوڑے کو نہ باندھوں تو چھٹ جائے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بصریوں کے نزدیک یہ سب ﴿ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ میں خطا ہے، جازم کے بغیر جزم جائز نہیں ہے۔ ﴿ فَيَاْتِيَهُمْ ﴾ (أَيِ: الْعَذَابُ) ﴿ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ یعنی پھر آئے گا ان کو عذاب اچانک اور حال یہ ہے کہ اس کے آنے کی ان کو خبر نہ ہوگی۔ حسن رحمہ اللہ نے "فَتَأْتِيَهُمْ" بتائے فوقیہ پڑھا ہے۔[1] یعنی پھر آئے گی ان کو قیامت۔ اگرچہ قیامت کا ذکر پہلے نہیں گزرا کہ ضمیر اس کی طرف راجع ہو، لیکن عذاب کا ذکر اس پر دال ہے۔ حرفِ فا رتبے کی ترتیب کے لیے ہے نہ کہ زمانے کے لیے۔ معنی یہ ہیں کہ یہاں تک کہ دیکھیں گے عذاب کو، پھر اس شے کو جو اس کے دیکھنے سے بھی زیادہ سخت ہے اور وہ ان کو اچانک عذاب کا لاحق ہونا ہے۔

پھر وہ شے جو اس سے بھی بڑھ کر سخت ہے اور وہ یہ ہے کہ مہلت کا سوال کریں گے اس کے باوجود کہ مہلت کا نہ ملنا قطعی یقینی ہے، جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴾ یعنی جس وقت عذاب دیکھ لیں گے تو کہیں گے: کیا ہم تاخیر یا مہلت دیے گئے عذاب اور ہلاکت سے؟ اگرچہ مہلت پلک جھپکنے تک ہی کی ہو، تاکہ ہم ایمان لے آئیں۔ یہ جو انھوں نے کہا تو مارے حسرت اور افسوس کے کہا، اس ایمان پر جو اُن سے فوت ہو گیا اور محال چیز کا طمع کرنے کے لیے۔ محال یہی ہے کہ عذاب کے آنے کے بعد اُن کو مہلت ملے اور دنیا کی طرف لوٹ جانے کی آرزو کرنے کے لیے کہ پھر دنیا میں جائیں اور ان سے جو کوتاہیاں اور کمیاں رہ گئیں، ان کا ازالہ کریں۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ اب نہ کچھ تاخیر ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی طرح کی مہلت مل سکتی ہے۔

کسی نے کہا کہ ﴿ هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴾ سے مراد بطور استہزاء کے عذاب کے جلدی آنے کی طلب ہے، اس لیے کہ اس کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴾ اس قول میں ظاہر معنی سے جو بُعد اور مخالفت ہے، وہ مخفی نہیں ہے، کیوں کہ ﴿ هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں مہلت طلب کرنا۔ رہا: ﴿ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴾ تو اس سے مراد ان کی اس بات کا رد اور انکار ہے جو اُن سے واقع ہوئی۔ وہ یوں کہا کرتے تھے: ﴿ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال: ۳۲] "تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔" نیز فرمایا: ﴿ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ ﴾ [الأعراف: ۷۰] "تو ہم پر وہ (عذاب) لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے۔" کیوں کہ انھوں نے ایسی شے کا استعجال کیا، یعنی جلدی طلب کی، جس میں ان کا ضرر ہے اور ان کی موت ہے۔

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۱۳۸۔ ۱۳۹)

پس استفہام ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور ان پر افسوس کرنے کے لیے ہے۔ حرفِ فا عطف کے لیے ہے مقدر پر جو مقام کا تقاضا ہے: "أَيْ: أَيَكُوْنُ حَالُهُمْ كَمَا ذُكِرَ عِنْدَ نُزُوْلِ الْعَذَابِ فَيَسْتَعْجِلُوْنَ بِعَذَابِنَا" یعنی کیا ان کا حال ہوگا، جیسا کہ مذکور ہوا ہے کہ وہ عذابِ الیم اترنے کے وقت مہلت طلب کریں گے۔ پھر وہ ہمارے عذاب کو جلد مانگتے ہیں، حالاں کہ ان دونوں باتوں میں جو تضاد ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ یا وہ مقدر یہ ہے: "أَيَغْفَلُوْنَ عَنْ ذٰلِكَ مَعَ تَحَقُّقِهِ وَتَقَرُّرِهِ فَيَسْتَعْجِلُوْنَ... الخ" یعنی کیا وہ اس بات سے غافل ہوتے ہیں، باوجود اس کے ثابت اور یقینی ہونے کے پھر جلدی چاہتے ہیں۔

نکتہ:

"بِعَذَابِنَا" کو ﴿ يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴾ سے پہلے رکھا باوجود اس کے کہ وہ اس سے متعلق ہے، اس کے بعد ہونا چاہیے تھا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ انکار اور توبیخ جس شے پر گرتا ہے اور جس پر اس کا توڑ ہے، وہ یہ ہے کہ جس بات کی جلدی کی جاتی ہے، وہ عذابِ الٰہی ہے۔ یعنی کیا وہ ہمارے عذاب کی جلدی چاہتے ہیں، یہ نکتہ تو معنوی ہے، لفظی نکتہ یہ ہے کہ رعایتِ فواصل کو مقدم کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَرَءَيْتَ ﴾ میں استفہامِ انکاری ہے اور حرفِ "فا" مقدر پر عطف کے لیے ہے، جو مناسبِ مقام ہے اور معنی اس کے "أخبرني" ہیں اور خطاب ہر اس شخص کو ہے جو خطاب کے لائق ہے، یعنی اے مخاطب! تو مجھے خبر دے کہ اگر ہم نے ان کو دنیا میں سالہائے دراز تک برتنے دیا اور ان کی عمریں لمبی کر دیں، پھر ان کو وہ عذاب اور ہلاکت آگئی جس کا ان سے وعدہ تھا تو وہ درازِ مدت تک ان کا برتتے رہنا ان کے کیا کام آئے گا؟!

﴿ مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ ﴾ کا ﴿ مَاۤ ﴾ استفہامیہ ہے۔ "أَيْ: أَيُّ شَيْءٍ أَغْنَى عَنْهُمْ، كَوْنَهُمْ مُمَتَّعِيْنَ ذٰلِكَ التَّمَتُّعَ الطَّوِيْلَ" ﴿ مَا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴾ کا ﴿ مَاۤ ﴾ یا مصدریہ ہے یا موصولہ اور استفہام انکار تقریری کے لیے ہے۔ کسی نے کہا کہ پہلا ﴿ مَاۤ ﴾ نافیہ ہے اور دوسرا مصدریہ، یعنی کام نہ آئے گا ان کو زمانۂ دراز تک دنیا میں رہنا اس طرح سے کہ ان کا عذاب دور ہو یا اس میں تخفیف ہو۔ کسی نے "يَمْتَعُوْنَ" پڑھا ہے، بہ سکونِ میم و تخفیفِ تائے فوقیہ، اس محاورے سے "أَمْتَعَ اللّٰهُ زَيْدًا بكذا" یعنی فائدہ دیا اللہ نے زید کو فلاں شے کے ساتھ۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ حسن رحمہ اللہ سے طواف میں ملے اور وہ ان سے ملاقات کی تمنا رکھتے تھے تو ان سے کہا کہ تم مجھے وعظ کرو، حسن رحمہ اللہ نے اس آیت کی تلاوت کرنے سے زیادہ ان کو وعظ نہ کیا، یعنی صرف یہ آیت پڑھ دی۔ حقیقت میں اس سے بڑھ کر اور کیا وعظ ہوگا!

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ اس آیت کو پڑھا کرتے تھے، جب فیصلہ کرنے کے لیے آپ جلوس

فرماتے۔[1] ﴿ وَمَآ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ ﴾ میں حرف ﴿ مِنۡ ﴾ زاید ہے۔ یہ جملہ ﴿ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ﴾ کی تاکید کے لیے ہے، یا قریہ کی صفت ہے، یا اس سے حال ہے، نفی کے پہلے آجانے نے اس کو جائز کر دیا ہے۔ یعنی ہلاک نہیں کیا ہم نے بستیوں میں سے کسی بستی کو، مگر رسولوں کو بھیج کر انھیں ڈرانے اور اُن کے عذر دور کرنے کے بعد اور کتابیں نازل کرنے کے بعد۔ ﴿ ذِكۡرٰى ﴾ بہ معنی تذکرہ ہے۔ محلِ نصب میں بنا بر علت، یا بنا بر مصدریت۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنا بر حال۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنا بر مصدریت، یعنی "يَذْكُرُوْنَ ذِكْرَى"۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول صحیح ہے، اس لیے کہ ﴿ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ﴾ کے معنی ہیں: "إِلَّا لَهَا مُذَكِّرُوْنَ"۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ موضعِ رفع میں ہو، اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو، یعنی "إِنْذَارُنَا ذِكْرَى" یا "ذٰلِكَ ذِكْرَى"۔

ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے: "ذِكْرٰى" یا "نُذَكِّرُهُمْ ذِكْرٰى"۔ کسی نے کہا: حال ہے ﴿ مُنۡذِرُوۡنَ ﴾ کی ضمیر سے، یعنی "يُنْذِرُوْنَهُمْ ذَوِيْ تَذْكِرَةٍ"۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے مفعول لہ ہونے کی تصریح کی ہے، یعنی ﴿ مُنۡذِرُوۡنَ ﴾ کی علت ہے۔ تقدیر یہ ہے: "رُسُلٌ تُنْذِرُهُمْ لِأَجْلِ تَذْكِيْرِهِمُ الْعَوَاقِبَ" اور یہ بھی جائز کہا ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو۔ "أَيْ: هٰذَا ذِكْرٰى"[2] اور جملہ معترضہ ہو اور امام اخفش رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ ﴿ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم ان کے عذاب کرنے میں ظالم نہیں ہیں اور نہ ہماری شان ہے کہ ہم ظلم کریں۔ ہم تو ان پر حجت پیش کر چکے اور ان کو ڈر سنا دیا اور ان کا عذر دور کر دیا۔[3]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَفَرَءَيۡتَ ﴾ معطوف ہے ﴿ فَيَقُوۡلُوۡا ﴾ پر اور ان کے مابین کا جملہ معترضہ ہے۔ ﴿ مَا كَانُوۡا يُوۡعَدُوۡنَ ﴾ میں تنازع ہے۔ "رَأَيْتَ" چاہتا ہے کہ اس کا مفعولِ اول ہو اور ﴿ جَآءَهُمۡ ﴾ چاہتا ہے کہ اس کا فاعل ٹھہرے۔ اس تنازع کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کو "رَأَيْتَ" کا مفعول ٹھہرایا اور ﴿ جَآءَهُمۡ ﴾ کا فاعل ضمیر مستتر کو قرار دیا جو اس کے اندر ہے ﴿ مَا كَانُوۡا ﴾ کی طرف راجع ہے: "أَيْ: جَاءَهُمْ هُوَ يَعْنِي الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَهُ" اور ﴿ مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ ... إلخ ﴾ محلِ نصب میں ہے "رأیت" کے مفعولِ ثانی کا قائم مقام۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اس کی خوب تفصیل کی ہے یہاں اس قدر کافی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ﴾ اگر کوئی کہے کہ ﴿ اِلَّا ﴾ کے بعد جو جملہ ہے اس سے واؤ ترک کیا گیا ہے اور قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴾ [الحجر: ٤] "اور ہم نے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے، اس (کی تباہی) کے لیے لکھی ہوئی (میعاد) مقرر تھی۔" میں واؤ ترک نہیں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل ترک واؤ ہے، اس لیے کہ جملہ قریہ کی صفت ہے اور جس وقت واؤ زیادہ کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ صفت

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٩٩) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٠٢) [3] فتح القدير (٤/ ١٥٧) فتح البيان (٩/ ٤٢٠۔ ٤٢٣)

کو موصوف کے ساتھ ملانے کی تاکید کرے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ سَبۡعَةٌ وَّثَامِنُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ ﴾ [الكهف: ٢٢] ''وہ سات ہیں، ان کا آٹھواں ان کا کتا ہے۔'' امام سمین رحمہ اللہ نے زمخشری رحمہ اللہ سے اس کو نقل کیا ہے۔

شیخ زادہ کا بیان آیتِ باب کی تفسیر میں یہ ہے کہ ﴿ فَيَأۡتِيَهُمۡ ﴾ معطوف ہے ﴿ يَرَوُا ﴾ پر اور ﴿ فَيَقُولُوا ﴾ معطوف ہے ''يَأْتِيَهُمْ'' پر۔ ظاہر نظمِ قرآنی اس پر دال ہے کہ عذاب کا ناگہاں آنا رویتِ عذاب کے بعد ہو اور مہلت کا سوال عذاب کے ناگہاں آنے کے بعد ہو، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ جو شے پہلے واقع ہوگی، وہ عذاب کا ناگہاں آنا ہے، پھر عذاب کو دیکھنا ہے، پھر مہلت کا سوال کرنا ہے، اس لیے یہ بات واجب ہوئی کہ کلمۂ ''فا'' زمانے میں تراخی کے لیے نہ ہو، بلکہ رتبے میں تراخی کے لیے ہو، اس طرح سے کہ معنی یہ ہوں کہ وہ قرآن شریف پر ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ اس عذاب کو نہ دیکھ لیں کہ جو ایمان کی طرف مضطر کرنے والا ہے۔

پھر اس شے کو نہ دیکھ لیں، جو اس سے بھی زیادہ سخت ہے، یعنی ان کا مہلت مانگنا، یہ بات جانتے ہوئے کہ مہلت کا نہ ملنا یقینی ہے، کیوں کہ وہ عذاب کو موت کے فرشتوں کے آجانے کے وقت دیکھیں گے، یا آخرت میں دیکھیں گے، حالاں کہ وہ اس وقت اس بات کو خوب جانتے ہوں گے کہ ان کو نہ تو خلاصی ملے گی نہ مہلت۔ مہلت کا جو وہ سوال کریں گے تو وہ محض دیر کرنے اور اپنے جی کو خوش کرنے کے لیے کریں گے۔

پھر جب اللہ پاک نے مجرموں کے عذاب کا یہ وصف بیان کیا کہ عذاب کا دیکھنا ان کو ایمان کی طرف مضطر کر دے گا اور وہ ان کو اچانک آئے گا، پھر وہ بے چین ہو کر اور مجبور ہو کر پلک جھپکنے تک کی مہلت کا سوال کریں گے۔ پھر ان کا یہ سوال قبول نہ ہوگا تو جو لوگ دنیا میں عذاب کا جلد آنا مانگا کرتے تھے اور یوں کہتے تھے: ﴿ فَأَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [الأنفال: ٣٢] ''تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا'' اور یوں کہتے تھے: ''لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى تُسۡقِطَ عَلَيۡنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ'' ''ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرا دے'' اور اسی طرح کی اور باتیں کہتے تھے۔

ان سے ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کے طور پر یوں ارشاد فرمایا: ﴿ أَفَبِعَذَابِنَا يَسۡتَعۡجِلُونَ ﴾ یعنی یہ لوگ پھر کس طرح جلد مانگتے ہیں اس شے کو جو اُن کے پاس اچانک آ جائے گی اور اس کو دیکھنے کے وقت مہلت کا سوال کریں گے تو ان کو ایک لمحے کی بھی مہلت نہ ملے گی، حالاں کہ عاقل اس شے کو جلدی نہیں مانگتا ہے جس میں اس کی ہلاکت ہوتی ہے۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ أَفَرَءَيۡتَ ﴾ ''أَيْ: أَفَعَلِمۡتَ يَا مُحَمَّدُ، وَمَعۡنَاهُ: اِعۡلَمۡ'' یعنی کیا پس جانا تو نے اے محمد! یعنی تو جان لے: ﴿ إِنۡ مَّتَّعۡنٰهُمۡ سِنِينَ ﴿205﴾ ثُمَّ جَآءَهُمۡ مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿206﴾ مَآ أَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴾. ﴿ مَآ أَغۡنٰى ﴾ کا ﴿ مَآ ﴾ یا تو استفہامیہ ہے، محلِ نصب میں مفعول مقدم ہے ﴿ أَغۡنٰى ﴾ کا اور ﴿ مَا كَانُوا ﴾ ﴿ أَغۡنٰى ﴾ کا فاعل ہے اور یہ کلمۂ ﴿ مَآ ﴾ مصدریہ ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر ہم نے ان کو کئی برس تک فائدہ

اٹھانے دیا، پھراُن کے پاس وہ عذاب آیا، جس کا ان کو وعدہ دیا جاتا تھا تو اُن کو ان کا مزید فائدہ اٹھانا یا برتتے رہنا، ان سے کون سی چیز کو دور کرے گا۔ چوں کہ استفہامِ انکاری ہے، اس لیے یہ معنی ہیں کہ ان کا سالہائے دراز کا برتتے رہنا، ان سے کسی شے کو دفع نہ کرے گا۔

﴿ مَآ اَغْنٰى ﴾ کا ﴿ مَآ ﴾ نافیہ ہے تو اس صورت میں ﴿ اَغْنٰى ﴾ کا مفعول محذوف ہوگا۔ معنی یہ ہیں کہ ان سے ان کا زمانۂ دراز تک برتتے رہنا، عذاب کا کچھ حصہ بھی دور نہ کرے گا۔ غرض یہ کہ پھر جب اللہ پاک نے قرآن شریف کا یہ وصف بیان کیا کہ وہ رب العالمین کا اتارا ہوا ہے اور اس سے اپنے معجزے اور اپنے نبی اکرم ﷺ کی نبوت سے آگاہ فرمایا تو اس کے بعد ان لوگوں کے زعم کا رد فرمایا جن کا یہ زعم تھا کہ قرآن جن اور شیاطین کے القا سے ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢١٠﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿٢١١﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿٢١٢﴾

اور شیاطین اس (قرآن) کو لے کر نازل نہیں ہوئے ﴿٢١٠﴾ اور نہ یہ ان کے لائق ہے اور نہ وہ اس کی استطاعت ہی رکھتے ہیں ﴿٢١١﴾ بلاشبہہ وہ تو اس کے سننے سے بھی دور رکھے گئے ہیں ﴿٢١٢﴾

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل علیہ السلام قرآنِ مجید لے کر اترتے ہیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنی کتابِ عزیز کی خبر دیتا ہے کہ اس کے نہ آگے سے باطل آتا ہے نہ پیچھے سے، یہ حکیم وحمید کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اس کو روح الامین لے کر اترا ہے، جس کی اللہ پاک کی طرف سے تایید کی گئی ہے اور نہیں لے کر اترے اس کو شیطان۔

پھر یہ بات ذکر فرمائی کہ یہ ان پر ممتنع ہے، یعنی تین وجہ سے ردّ کیا گیا ہے: ایک یہ ہے کہ ﴿ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ ﴾ یعنی یہ ان کے مطلوب ومقصود سے نہیں ہے، کیوں کہ ان کی طبیعتوں میں تو فساد کرنا اور بندوں کو گمراہ کرنا ہے اور قرآن جو ہے تو اس میں امر بالمعروف ہے اور نہی عن المنکر ہے اور نور، ہدی اور برہانِ عظیم ہے، لہٰذا قرآن شریف اور شیاطین کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔

اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ ﴾۔ اور ﴿ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ ان کے لائق بھی ہوتو بھی اس کو کر نہ سکیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ [الحشر: ٢١] ''(اے نبی!) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا (اور) پھٹ جاتا۔'' پھر بیان فرمایا کہ اگر وہ ان کے لائق ہو اور اس کو اٹھانے کی

اور ادا کرنے کی طاقت رکھیں تو اس تک نہ پہنچیں، کیوں کہ وہ تو قرآن شریف کے نزول کے وقت اس کے سننے سے ایک طرف کنارے میں ہیں، اس لیے کہ قرآن شریف کے نازل کرنے کی مدت میں آسمان کو رسول اللہ ﷺ کی سخت حراست کرنے والوں سے اور شعلوں سے بھر دیا گیا تھا۔

چنانچہ قرآن شریف کا ایک حرف تک سننے کے لیے بھی شیطانوں میں سے کوئی نہ پہنچا، تاکہ امر مشتبہ نہ ہو جائے۔ یہ بات اللہ پاک کی اپنے بندوں پر رحمت سے ہے اور اپنی شریعت کی حفاظت اور حمایت کے لیے اور اپنی کتاب اور رسول کی تائید کے لیے ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴾ جس طرح کہ اللہ پاک نے جنوں کی طرف سے خبر دی ہے: ﴿ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴾ [الجن: ۸۔ ۱۰] ”اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسے سخت پہرے داروں اور شہابوں (شعلوں) سے بھرا پایا۔ اور یہ کہ ہم آسمان کے ٹھکانوں میں سن گن لینے کو بیٹھا کرتے تھے، چنانچہ اب جو سننے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شہاب اپنی گھات میں پاتا ہے۔ اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ کیا زمین والوں کے لیے برا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے لیے بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔“[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ کفار نے جو قرآن شریف کے بارے میں زعم کیا تھا کہ وہ اس قبیل سے ہے جس کو شیاطین کاہنوں پر القا کرتے ہیں تو یہ اس کی تردید ہے کہ اس کو شیطان نہیں لے اترے۔ پہلے تو حق کو یہ بات بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ اس کو تو روح الامین لے کر اترے ہیں، پھر کافروں کے قول کو رد فرما دیا۔ قرآن شریف نہ سحر ہے نہ کہانت ہے، نہ شعر اور نہ پریشان خواب جس طرح کہ کفار بکا کرتے تھے۔ بھلا شیاطین اس کو کیسے لے کر اتریں گے، ان کو تو یہ لائق ہی نہیں ہے، نہ ان سے اس کا اتارنا صحیح اور درست ہو سکتا ہے۔ کفار نے جو بات ان کی طرف منسوب کی ہے، وہ اصلاً اس کو نہیں کر سکتے، نہ ان سے بن آتی ہے۔ وہ تو قرآن کے سننے سے یا فرشتوں کی بات سننے سے بالکل یکسو اور علاحدہ پڑے ہوئے ہیں، اس سے چھپائے گئے ہیں اور شعلوں سے مارے جاتے ہیں۔ حسن رحمہ اللہ، امام ابن سمیفع اور اعمش رحمہ اللہ نے ”الشیاطون“ بواو ونون پڑھا ہے، جمع سالم کے قائم مقام ٹھہرایا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سارے نحویوں کے نزدیک غلط ہے۔

حکایت:

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے علی بن سلیمان اخفش کو سنا، وہ کہتے تھے: میں نے محمد بن یزید مبرد کو سنا،

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ٤٦٠۔ ٤٦١)

وہ کہتے تھے کہ یہ علماء کی غلطی میں سے ہے، یہ جو ہے تو کسی شبہے کے سبب سے ہوتا ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے جب اس کے آخر میں یا اور نون دیکھا اور وہ موضع رفع میں تھا تو جمع سالم کے ساتھ ان پر مشتبہ ہو گیا، چنانچہ انھوں نے غلطی کی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیخ نے غلطی کی، یعنی حسن رحمہ اللہ نے۔ پھر کسی نے یہ بات نضر بن شمیل سے کہی تو انھوں نے کہا کہ اگر یہ جائز ہے کہ رؤبہ و عجاج اور اُن کے اصحاب کے قول سے حجت پکڑی جائے تو یہ بھی جائز ہے کہ حسن رحمہ اللہ اور ان کے صاحب محمد بن سمیفع کے قول سے بھی حجت پکڑی جائے، باوجود اس کے کہ ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے اس کو نہیں پڑھا، مگر مقرر انھوں نے اس میں کچھ سنا ہے۔ مؤرج نے کہا ہے کہ اگر شیطان "شَاطَ يَشِيطُ" سے ہو تو اُن کی قراءت کے لیے ایک وجہ ہے۔

یونس بن حبیب نے کہا ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو سنا، وہ یوں کہتا تھا: "دَخَلْنَا بَسَاتِيْنَ مِنْ وَرَائِهَا بَسَاتُوْنَ"[1] اس محاورے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی جمع حالتِ نصب و جر میں یا اور نون کے ساتھ اور حالتِ رفع میں واؤ اور نون کے ساتھ آتی ہے۔ پھر جب اللہ پاک قرآن شریف کی حقیقت کو ثابت کر چکا اور اس بات کو کہ وہ اس کے پاس سے اتارا ہوا ہے تو اپنے نبی (ﷺ) کو اس بات کا امر کیا کہ اسی وحدہ لاشریک لہٗ کو پکاریں۔[2] لہٰذا ارشاد فرمایا:

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿٢١٣﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢١٥﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢١٦﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٢١٧﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٢١٨﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿٢١٩﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٢٢٠﴾

چناں چہ (اے نبی!) آپ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکاریں ورنہ آپ عذاب پانے والوں میں سے ہوں گے ﴿213﴾ اور آپ اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرائیں ﴿214﴾ اور جو مومنوں میں سے آپ کی اتباع کریں، ان کے لیے اپنے (مشفقانہ) بازو جھکائے رکھیں ﴿215﴾ پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو کہہ دیجیے: بلاشبہ تم جو کچھ کر رہے ہو، میں اِس سے بَری ہوں ﴿216﴾ اور آپ (اللہ) غالب (اور) مہربان پر توکل رکھیں ﴿217﴾ جو آپ کو دیکھتا ہے جب آپ (اکیلے نماز میں) قیام کرتے ہیں ﴿218﴾ اور آپ کی نقل و حرکت کو سجدہ کرنے والوں میں بھی (دیکھتا ہے) ﴿219﴾ بلاشبہ وہی خوب سننے والا، بڑا جاننے والا ہے ﴿220﴾

---

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ١٤١) فتح القدیر (٤/ ١٥٧_ ١٥٨) [2] فتح البیان (٩/ ٤٢٣)

تبلیغِ عام کا حکم:

اپنے رشتے داروں کو ڈرا دے جو فرمایا تو یہ کہا رسول کو اور سنایا دوسروں کو۔ جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ ﷺ نے سارے قریش کو پکار کر سنا دیا اور اپنی پھوپھی اور اپنی بیٹی اور اپنے چچا تک کو یہ کہہ دیا کہ اللہ کے ہاں اپنی اپنی فکر کرو اور اللہ کے ہاں میں تمھارا کچھ نہیں کر سکتا۔ ایمان والوں سے فروتنی سے پیش آ، یعنی ان پر شفقت رکھ، وہ اپنے ہوں یا پرائے، اور اللہ کے حکم کے خلاف جو کوئی کرے، اس سے تو بے زار ہو جا، وہ اپنا ہو یا پرایا۔ یعنی جب تو تہجد کے لیے اٹھتا ہے اور اپنے یاروں کی خبر لیتا ہے کہ یاد میں ہیں یا غافل تو اس وقت اللہ تجھے دیکھتا رہتا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس بات کا حکم کرتا ہے کہ اکیلے اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کی جائے اور خبر دیتا ہے کہ جو کوئی اس کے ساتھ شریک کرے گا تو اس کو عذاب کرے گا۔ پھر اپنے رسول ﷺ کو اس بات کا حکم دیا کہ اپنے قریبی ناتے والوں کو ڈرائیں اور یہ کہہ دیں کہ ان میں سے کسی کو خلاصی نہ دے گا، مگر اپنے رب عزوجل پر ایمان لانا اور ان کو حکم دیا کہ اللہ کے مومن بندوں میں سے جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ہیں، ان کے لیے اپنا پہلو نرم کریں، یعنی ان سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ فرما، اور اللہ کی مخلوق میں سے جو کوئی ان کی نافرمانی کرے، اس سے بے زار ہوں، وہ کوئی بھی ہو، اپنا ہو یا پرایا۔ اسی لیے اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ یہ خاص ڈرانا عام ڈرانے کے منافی نہیں ہے، بلکہ یہ خاص بھی عام لوگوں سے ایک فرد ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ [الأنعام: ۹۲] ''تاکہ آپ ام القریٰ (مکہ) اور اس کے آس پاس والوں کو ڈرائیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ [یٰس: ٦] ''تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس کے باپ دادا نہیں ڈرائے گئے، لہٰذا وہ (دین سے) غافل ہیں۔'' پھر فرمایا: ﴿ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ﴾ [الأنعام: ٥١] ''اور (اے نبی!) آپ اس (قرآن) کے ذریعے سے ان لوگوں کو ڈرائیں جنھیں ڈر رہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس اکٹھے کیے جائیں گے۔''

نیز فرمایا: ﴿ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴾ [مریم: ۹۷] ''تاکہ آپ اس سے متقین کو بشارت دیں اور اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو ڈرائیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ۱۹] ''تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ۱۷] ''اور ان گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔'' صحیح مسلم میں ہے: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کہ نہ سنے کا مجھ کو اس امت سے کوئی یہودی نہ نصرانی، پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لائے گا، مگر داخل ہوگا آگ میں۔[1]

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۳)

اس آیتِ کریمہ کے نزول میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، اب ہم ان کا ذکر کرتے ہیں:

پہلی حدیث: امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ جس وقت اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل کی: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ تو نبی اکرم ﷺ کوہِ صفا پر آئے، پھر اس پر چڑھے اور پکارا: « يَا صَبَاحَاه » (اس کلمے کو مستغیث کہا کرتا ہے، اس کی اصل یہ ہے کہ جس وقت لوٹنے کے لیے چلاتے تو کہتے تھے، کیوں کہ وہ لوگ صبح کے وقت لوٹا کرتے تھے۔ لوٹنے کے دن کا نام یوم الصباح رکھتے تھے، گویا اس کلمے کا کہنے والا کہتا ہے کہ دشمن نے ہم کو ڈھانک لیا ہے۔ ایک قول اس میں اَور ہے)۔ پس لوگ آپ کی طرف جمع ہو گئے، کوئی شخص خود آپ ﷺ کی طرف آیا، کسی نے اپنا قاصد بھیج دیا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے بنی عبدالمطلب! اے بنی فہر! تم مجھے بتاؤ کہ اگر میں تم کو اس بات کی خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کا اور تمھیں لوٹنے کا ارادہ کرتا ہے تو تم مجھے سچا جانو گے؟ وہ بولے: ہاں! فرمایا: بے شک میں ڈرانے والا ہوں تم کو آگے آنے والے ایک سخت عذاب سے۔ ابولہب نے کہا: "تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ، أَمَا دَعَوْتَنَا إِلَّا لِهٰذَا؟!" ("تَبَّ" بہ معنی ہلاکت ہے، ناصب اس کا **فعل محذوف** ہے۔ "سَائِر" بہ معنی باقی ہے اور بہ معنی "جمیع" صحیح نہیں ہے، لیکن اس جگہ "مجمع البحار" میں کہا ہے کہ بہ معنی "جمیع" ہے اور بہ معنی باقی کہنے والا صحیح نہیں ہے، لیکن اس قول میں نظر ہے۔[1] واللّٰه أعلم)۔

(دوسری حدیث میں بجائے اس کے "أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟" ہے، یعنی کیا اسی کے لیے تو نے ہم کو جمع کیا تھا؟) یعنی ہلاکی ہو تجھ کو سارے دنوں میں، کیا تو نے ہم کو صرف اسی لیے بلایا تھا؟! اللہ تعالیٰ نے ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴾ [اللهب: ١] "ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔" نازل فرمائی۔[2] (ورواه البخاري و مسلم و الترمذي والنسائي من طرق عن الأعمش به)

دوسری حدیث: امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب کہ آیتِ مذکورہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے۔ پھر فرمایا: اے فاطمہ محمد ﷺ کی بیٹی! اے صفیہ عبدالمطلب کی بیٹی! اے بنی عبدالمطلب! میں تمھارے لیے اللہ سے کسی شے کا مالک نہیں ہوں، مجھ سے میرے مال میں سے جو تم چاہو مانگ لو۔[3] (انفرد بإخراجه مسلم)

تیسری حدیث: امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے قریش کو بلایا، عام اور خاص لوگوں کو اکٹھا کیا۔ پھر فرمایا: اے گروہِ قریش! تم اپنی جانوں کو آگ

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٣/ ١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨) مسند أحمد (١/ ٣٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٦٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٥٢٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٥) مسند أحمد (٦/ ١٨٧)

سے چھڑاؤ۔ اے گروہِ بنی کعب! چھڑاؤ اپنی جانوں کو آگ سے۔ اے گروہِ بنی ہاشم! چھڑاؤ اپنی جانوں کو آگ سے۔ اے گروہِ بنی عبدالمطلب! چھڑاؤ اپنی جانوں کو آگ سے۔ اے فاطمہ بیٹی محمد کی! تو چھڑا اپنی جان کو آگ سے۔ بے شک واللہ! میں تمھارے لیے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ خبردار بے شک تمھارے واسطے رحم ہے (رشتے داری ہے) «سَأَبُلُّهَا بِبَلَالِهَا» یعنی میرے اور تمھارے درمیان جو رشتہ ہے، میں اس کو دنیا میں تر رکھوں گا، صلہ رحمی کروں گا۔[1] (ورواه مسلم والترمذي من حديث عبد الملك بن عمير به، وقال الترمذي: غريب من هذا الوجه، ورواه النسائي من حديث موسى بن طلحة مرسلاً ولم يذكر فيه أبا هريرة، والموصول هو الصحيح، وأخرجاه في الصحيحين من حديث الزهري عن سعيد بن المسيب وأبي سلمة بن عبد الرحمن عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ)۔ ("بلال" جمع ہے "بلل" کی۔ "بلل" وہ شے ہے جو حلق کو تر کرتی ہے، پانی ہو یا دودھ یا اور کوئی شے، "بِلال" بکسر با بھی کہا ہے اور بالفتح مصدر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صلہ رحمی کی تشبیہ تری سے دی ہے اور قطع رحمی کی خشکی کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں صلہ رحمی کروں گا)۔

امام احمد نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بنی عبد المطلب! خرید و تم اپنی جانوں کو اللہ سے۔ اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی! اور اے فاطمہ بیٹی رسول اللہ کی! خرید لو تم اپنی جانوں کو اللہ سے، «فَإِنِّي لَا أُغْنِي عَنْكُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا» یعنی بے شک میں تم دونوں کے کام نہ آؤں گا اللہ سے۔ تم میرے مال سے جو چاہو مانگ لو۔[2] (تفرد به من هذا الوجه، وتفرد به أيضا عن معاوية عن زائدة عن أبي الزناد عن الأعرج عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم بنحوه و رواه أيضاً عن حسن بن لهيعة عن الأعرج عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ مرفوعاً)۔

امام ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں: اے بنی قصی! اے بنی ہاشم! اے بنی عبد مناف! «أَنَا النَّذِيرُ، وَالْمَوْتُ الْمُغِيرُ، وَالسَّاعَةُ الْمَوْعِدُ»[3] یعنی میں تو ڈرانے والا ہوں، اور موت لُوٹنے والی ہے، اور قیامت جائے وعدہ ہے، یا وقتِ وعدہ ہے، اس دن معلوم ہو جائے گا کہ حق پر کون ہے۔

چوتھی حدیث: امام احمد رحمہ اللہ نے قبیصہ بن مخارق اور زہیر بن عمرو سے روایت کیا ہے، دونوں نے کہا: جب کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ صَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم رَضْمَةً مِنْ جَبَلٍ عَلٰى أَعْلَاهَا حَجَرٌ، فَجَعَلَ يُنَادِي: «يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ! إِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُكُمْ كَرَجُلٍ رَأَى الْعَدُوَّ فَذَهَبَ يَرْبَأُ أَهْلَهُ رَجَاءَ أَنْ يَّسْبِقُوْهُ فَجَعَلَ يُنَادِي وَيَهْتِفُ: يَا صَبَاحَاهُ»[4] (ورواه مسلم والنسائي من حديث سليمان بن طرخان التيمي

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٨٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٤٤) مسند أحمد (٢/ ٣٦٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦) مسند أحمد (٢/ ٤٤٨)

[3] مسند أبي يعلىٰ (١١/ ١٠) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢٣) مسند أحمد (٥/ ٦٠)

عن أبي عثمان عبد الرحمن بن سهل النهدي، عن قبيصة و زهير بن عمرو الهلالي به) ("رضمة" واحد ہے "رضم و رضام" کا۔ "وهي دون الهضاب وقيل هي صخور بعضها على بعض"۔ "هضاب" جمع ہے "هضبة" کی "هضبة" بہ معنی "رابية" ہے یعنی ٹیلا۔ كذا في مجمع البحار)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ ایک پہاڑ کے رضمہ پر چڑھے، اس کی چوٹی پر ایک پتھر تھا، اس پر کھڑے ہو کر پکارنے لگے: اے بنی عبد مناف! میں جو ہوں تو ڈرانے والا ہوں، میری مثال اور تمھاری مثال ایک آدمی کی طرح ہے کہ اس نے دشمن کو دیکھ لیا۔ وہ چلا کہ اپنے گھر والوں کی حفاظت کرے اور اُن کو محفوظ رکھے اس اُمید سے کہ وہ دشمن سے سبقت کر جائیں تو وہ پکارنے لگا اور آواز دینے لگا: "يَا صَبَاحَاهُ"۔ مطلب یہ ہے کہ گھر والوں سے چلا کر کہہ دیا کہ جلدی چلے جاؤ، ورنہ دشمن آ کر ہلاک کر ڈالے گا۔

پانچویں حدیث: امام احمد نے "عن عباد بن عبد الله الأسدي عن علي رضی اللہ عنہ" سے روایت کیا ہے: جبکہ یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے اپنے اہلِ بیت کو جمع کیا، تیس آدمی جمع ہوئے، انھوں نے کھایا اور پیا، پھر اُن سے فرمایا کہ کون شخص ہے جو میری طرف سے میرے دین کا ضامن ہو اور میرے مواعید کا ضامن ہو اور میرے ساتھ جنت میں ہو اور میرے اہل میں میرا خلیفہ ہو؟ ایک شخص نے کہا، شریک راوی نے اس شخص کا نام لیا ہے: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنْتَ كُنْتَ بَحْرًا، مَنْ يَّقُوْمُ بِهٰذَا" یعنی آپ تو ایک دریا ہیں، کون سا شخص اس بات کے ساتھ قیام کر سکتا ہے! راوی نے کہا: پھر دوسرے آدمی نے یہی بات تین بار کہی۔

راوی نے کہا: پھر یہ بات اپنے اہلِ بیت پر پیش کی تو علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ان باتوں کا ضامن ہوتا ہوں۔[1]

طریقِ دیگر جو اس سیاق سے مبسوط تر ہے، اس کے مطابق امام احمد نے ربیعہ بن ناجد عن علی رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی عبد المطلب کو جمع کیا یا بلایا "وَهُمْ رَهْطٌ وَكُلُّهُمْ يَأْكُلُ الْجَذْعَةَ وَيَشْرَبُ الْفَرَقَ" یعنی یہ لوگ ایک جماعت تھے اور وہ سب اتنے تھے کہ ایک جذعہ کو کھا لیں اور فرق بھر پانی پی لیں۔ ("رهط" اصل میں آدمی کے عشیرہ، یعنی کنبے کو کہتے ہیں اور اس کے گھر والوں کو۔ اس کا اطلاق دس سے کم مردوں پر ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: چالیس تک اور ان میں عورت داخل نہیں ہے، اس کا واحد اس کے لفظ سے نہیں ہے، جمع اس کی "أرهط وأرهاط" اور جمع الجمع "أراهط" آتی ہے۔[2] (كذا في مجمع البحار) صراح میں کہا ہے کہ "رہط گروہ کم از دہ از مرداں وقوم قبیلہ"۔ جذع بالتحریک بکریوں میں سے وہ ہے جو ایک برس کا ہو اور دوسرے برس میں آیا ہو اور گائے اور گھوڑے کا جذعہ وہ ہے جو تیسرے سال میں آیا ہو اور اُونٹ کا وہ ہے جو پانچویں برس میں آیا ہو۔ "فَرَق" بہ سکون وتحریکِ راء اہلِ مدینہ کا ایک پیمانہ ہے جو سولہ رطل کا ہوتا ہے۔ (كذا في الصراح) "مجمع البحار" میں کہا ہے کہ ایک پیمانہ ہے کہ اس میں سولہ رطل سماتے ہیں۔ بارہ مُد اور تین صاع کا ہوتا ہے حجاز میں۔ کسی نے کہا کہ فرق پانچ اقساط کا ہے اور قسط نصف صاع ہے اور وہ بہ سکون ایک سو بیس رطل کا ہوتا ہے۔[3] اور مُد بالضم ربع صاع ہے لغتاً اور وہ ایک

---

[1] مسند أحمد (١/ ١١١) [2] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٤٠٢) [3] مجمع بحار الأنوار (٤/ ١٢٨)

رطل اور ثلث رطل کا پیمانہ ہے اہلِ حجاز کے نزدیک۔ اور دو رطل کا ہے اہل عراق کے نزدیک۔ اور رطل نیم مَن کا ہوتا ہے)۔[1]

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ان کے لیے مُد بھر کھانا تیار کیا، پھر انھوں نے کھایا، یہاں تک کہ سیر ہو گئے اور کھانا ویسا ہی باقی رہا جیسا تھا، گویا چھوا نہیں گیا۔ پھر آپ نے غمر منگایا، یعنی چھوٹا پیالہ تو انھوں نے پیا، یہاں تک کہ سیراب ہو گئے اور پانی باقی رہا، گویا چھوا نہیں گیا، یا پیا نہیں گیا اور فرمایا: اے بنی عبد المطلب! بے شک میں تمھاری طرف خاصتاً بھیجا گیا ہوں اور لوگوں کی طرف عامتاً اور یقیناً تم نے اس آیت کو دیکھ لیا اور سمجھ لیا، پھر تم میں سے کون مجھ سے اس بات پر بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی ہو اور میرا ساتھی ہو؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر آپ ﷺ کی طرف کوئی کھڑا نہ ہوا۔ پھر مَیں آپ ﷺ کی طرف کھڑا ہوا اور میں قوم میں سب سے چھوٹا تھا۔ کہا: آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جا! پھر آپ نے تین بار وہی کلمہ کہا، ہر بار مَیں آپ ﷺ کی طرف کھڑا ہوتا تو آپ مجھ سے فرماتے: بیٹھ جا، یہاں تک کہ تیسری بار میں آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا۔[2]

اس سیاق سے زیادہ مبسوط اور زیادہ غریب طریق اور اضافے کے ساتھ حافظ ابوبکر بیہقی نے "دلائل النبوۃ" میں محمد بن اسحاق سے روایت کیا ہے۔ محمد نے کہا: مجھے حدیث بیان کی اس شخص نے جس نے عبداللہ بن حارث بن نوفل کو سنا، یونس بن بکیر نے کہا کہ محمد نے مجھ سے اس شخص کا نام چھپایا۔ عبداللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی، انھوں نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی، فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے یہ بات پہچان لی کہ اگر میں یہ بات جلدی سے اپنی قوم کو پیش کروں تو میں اُن سے وہ شے دیکھوں گا، جس کو میں مکروہ سمجھتا ہوں، اس لیے میں چپ رہا۔ پھر میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمد! اگر تو وہ بات نہیں کرے گا جس کا تجھے اللہ نے امر کیا ہے تو تجھے اللہ عذاب کرے گا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر آپ ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا: اے علی! بے شک اللہ نے مجھے امر کیا ہے اس بات کا کہ میں اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈراؤں تو میں نے یہ بات سوچی کہ اگر میں جلدی ہی ان کو یہ بات کہوں تو میں ان سے وہ شے دیکھوں گا جس کو میں ناپسند کرتا ہوں، پس میں اس بات پر چپ ہو رہا، پھر میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمد! اگر تو وہ شے نہ کرے گا جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے تو تجھ کو تیرا رب عذاب کرے گا۔

چنانچہ اے علی! ہمارے لیے ایک بکری اور صاع بھر کھانا پکا اور ہمارے لیے ایک بڑا پیالہ دودھ کا تیار کر، پھر میرے لیے بنی عبد المطلب کو جمع کر۔ میں نے حکم کی بجا آوری کی۔ پھر وہ لوگ آپ کی طرف جمع ہوئے اور وہ اس دن چالیس مرد تھے۔ "يَزِيْدُوْنَ رَجُلًا اَوْ يَنْقُصُوْنَ رَجُلًا"، یعنی اُن میں ایک شخص زیادہ یا ایک کم ہو گا، یعنی تخمیناً

[1] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٥٥٢)

[2] مسند أحمد (١/ ١٥٩) اس کی سند میں "ربیعہ بن ناجد" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٧٩٣)

چالیس مرد تھے۔ ان میں آپ کے چچا ابو طالب، حمزہ اور عباس تھے اور ابولہب کافر خبیث بھی تھا۔ پھر میں نے وہ جفنہ، یعنی بڑا کاسہ ان کی طرف پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس میں سے ایک ٹکڑا لیا، پھر اسے اپنے دندان مبارک سے چیرا، پھر اس کو اس پیالے کے چاروں طرف پھیلا دیا اور فرمایا: کھاؤ بسم اللہ، قوم نے کھایا یہاں تک کہ اس سے سیر ہو گئے، پیالے میں صرف ان کی انگلیوں کے نشان دکھائی دیتے تھے۔ واللہ! (واللہ اعلم، شاید مطلب یہ ہے کہ وہ کھانا اس قدر تھا کہ ایک آدمی اس کو کھالے، لیکن نبی اکرم ﷺ کی برکت سے اس میں اتنی برکت ہوئی کہ سب نے خوب سیر ہو کر اس کو کھایا اور وہ ویسا ہی رہا جیسا تھا، صرف انگلیوں کے نشان معلوم ہوتے تھے)۔ بے شک حالت یہ ہے کہ مرد اُن میں سے البتہ کھاتا ہے مثل اس کے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! تو اُن کو پلا، میں وہی قعب (لکڑی کا پیالہ) لایا تو انھوں نے اس میں سے پیا، یہاں تک کہ سب کے سب سیراب ہو گئے اور قسم ہے اللہ کی! بے شک حالت یہ ہے کہ ان میں ایک مرد اتنا پی جاتا ہے جتنا اس پیالے میں تھا۔

پھر جس وقت رسول اللہ ﷺ نے ان سے بات کرنے کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے آپ کی طرف کلام کرنے سے پہل کی اور کہا کہ تمھارے صاحب نے تم پر جادو کیا ہے، لہٰذا وہ لوگ متفرق ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ ان سے بات نہ کر سکے۔ پھر جب دوسرا دن ہوا، یعنی اگلا دن تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! تو ہمارے لیے ویسا ہی کھانا اور پینا تیار کر جیسا تو نے کل تیار کیا تھا۔ بے شک اس شخص نے مجھ سے بات کرنے میں جلدی کی اس بات کی جو تو نے سنی، اس سے پہلے کہ میں قوم سے بات کروں۔ میں نے حکم کی بجا آوری کی۔ پھر میں نے ان کو جمع کیا آپ کے لیے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ویسا ہی کیا جیسا کل کیا تھا۔ پھر ان لوگوں نے کھانا کھایا، یہاں تک کہ اس سے سیر ہو گئے اور قسم ہے اللہ پاک کی! کہ حالت یہ ہے کہ ان میں سے ایک مرد اتنا کھانا کھا جاتا ہے جتنا کہ برتن میں تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! ان کو پلا۔ میں وہی قعنب لایا تو انھوں نے پیا، یہاں تک کہ سب سیراب ہو گئے اور قسم ہے اللہ کی! بے شک حالت یہ ہے کہ ان میں سے ایک مرد اس کے مثل پی جاتا ہے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے بات کرنے کا ارادہ کیا تو ابولہب نے جلدی سے کہنا شروع کیا اور کہا کہ تمھارے صاحب نے تم پر سحر کیا، پھر وہ لوگ متفرق ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان سے بات نہ کی۔ پھر جب کل کا دن ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! ہمارے لیے ایسا ہی کھانا پینا تیار کر، جیسا تو نے کل تیار کیا تھا۔ بے شک اس شخص نے مجھ سے وہی بات کی جو تو نے سنی، اس سے پہلے کہ قوم سے کلام کروں۔ میں نے حکم کی بجا آوری کی، پھر ان کو جمع کیا آپ ﷺ کے لیے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ویسا ہی کیا جیسا کہ کل کیا تھا۔ پھر لوگوں نے کھانا کھایا، یہاں تک کہ سیر ہو گئے۔ پھر میں نے ان کو اس قعنب سے پلایا، یہاں تک کہ وہ سب سیراب ہو گئے اور قسم ہے اللہ کی بے شک حالت

یہ ہے کہ ان میں سے ایک مرد اتنا کھانا کھا جاتا ہے اور اتنا پی لیتا ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے بنی عبد المطلب! اللہ کی قسم! بے شک میں نہیں جانتا کہ عرب کا کوئی جوان اپنی قوم کے پاس اس سے افضل کوئی شے لایا ہو، جس کو میں تمھارے پاس لایا ہوں، بے شک میں تمھارے پاس یقینی خبر دنیا اور آخرت کے بارے میں لایا ہوں۔[1]

اس حدیث کی پوری سند یہ ہے: بیہقی نے کہا: "أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْحَافِظُ، أَخْبَرَنَا أَبُو الْعَبَّاسِ مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ، حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ الْجَبَّارِ، حَدَّثَنَا يُونُسُ بْنُ بُكَيْرٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ قَالَ: حَدَّثَنِي مَنْ سَمِعَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ الْحَارِثِ بْنِ نَوْفَلٍ وَاسْتَكْتَمَنِي اسْمَهُ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضی اللہ عنہ... إِلٰى آخر الحديث. قَالَ أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ الْجَبَّارِ: بَلَغَنِي أَنَّ ابْنَ إِسْحَاقَ إِنَّمَا سَمِعَهُ مِنْ عَبْدِ الْغَفَّارِ بْنِ الْقَاسِمِ بْنِ أَبِي مَرْيَمَ عَنِ الْمِنْهَالِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ وَقَدْ رَوَاهُ أَبُو جَعْفَرِ بْنُ جَرِيرٍ عَنِ ابْنِ حُمَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ عَنِ ابْنِ إِسْحَاقَ، عَنْ عَبْدِ الْغَفَّارِ بْنِ الْقَاسِمِ بْنِ أَبِي مَرْيَمَ عَنِ الْمِنْهَالِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضی اللہ عنہ فَذَكَرَ مِثْلَهُ، وَزَادَ بَعْدَ قَوْلِهِ: « إِنِّي جِئْتُكُمْ بِخَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (پہلی حدیث میں یوں تھا: بِخَيْرٍ بِأَمْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللّٰهُ أَعْلَم) وَقَدْ أَمَرَنِيَ اللّٰهُ أَنْ أَدْعُوَكُمْ إِلَيْهِ، فَأَيُّكُمْ يُوَازِرُنِي عَلَى هَذَا الْأَمْرِ عَلَى أَنْ يَكُونَ أَخِي، وَكَذَا وَكَذَا ». قَالَ: فَأَحْجَمَ الْقَوْمُ عَنْهَا جَمِيعًا وَقُلْتُ - وَإِنِّي لَأَحْدَثُهُمْ سِنًّا، وَأَرْمَصُهُمْ عَيْنًا، وَأَعْظَمُهُمْ بَطْنًا، وَأَحْمَشُهُمْ سَاقًا: أَنَا يَا نَبِيَّ اللّٰهِ أَكُونُ وَزِيرَكَ عَلَيْهِ، فَأَخَذَ بِرَقَبَتِي، ثُمَّ قَالَ: « إِنَّ هَذَا أَخِي، وَكَذَا وَكَذَا، فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوا » ثُمَّ قَامَ الْقَوْمُ يَضْحَكُونَ وَيَقُولُونَ لِأَبِي طَالِبٍ: قَدْ أَمَرَكَ أَنْ تَسْمَعَ لِابْنِكَ وَتُطِيعَ. تَفَرَّدَ بِهَذَا السِّيَاقِ عَبْدُ الْغَفَّارِ بْنُ الْقَاسِمِ بْنِ أَبِي مَرْيَمَ، وَهُوَ مَتْرُوكٌ كَذَّابٌ شِيعِيٌّ، اِتَّهَمَهُ عَلِيُّ بْنُ الْمَدِينِيِّ وَغَيْرُهُ بِوَضْعِ الْحَدِيثِ، وَضَعَّفَهُ الْأَئِمَّةُ رحمہم اللہ.

امام ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت میں جو زیادہ الفاظ ہیں، ان کے معنی یہ ہیں کہ بے شک میں تمھارے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لایا ہوں اور یقیناً مجھے اللہ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ میں تم کو اس کی طرف بلاؤں، لہٰذا تم میں سے کون میری مدد کرتا ہے اس بات پر کہ وہ میرا بھائی ہو اور ایسا ایسا کہا (جیسا کہ حدیث میں گزر چکا)۔ ساری قوم اس سے رک گئی اور میں نے کہا: حالاں کہ بے شک میں البتہ ان سب سے کم عمر تھا اور میری آنکھوں میں ان سب سے زیادہ گیج تھی اور ان سب سے زیادہ بڑا میرا پیٹ تھا اور زیادہ باریک میری پنڈلیاں تھیں۔ غرض سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا

[1] دلائل النبوة للبيهقي (۲/ ۱۷۸۔ ۱۸۰) اس کی سند میں ''عبدالغفار بن القاسم'' سخت ضعیف راوی ہے۔

اس بیان سے اپنی کم عمری ثابت کرنا ہے، کیوں کہ یہ سب امور کم سنی میں ہوا کرتے ہیں، یعنی باوجود میری کم عمری کے میں نے عرض کی کہ یا نبی اللہ! میں اس کام پر آپ کا وزیر اور معاون ہوتا ہوں۔ آپ ﷺ نے میری گدی پکڑی، پھر فرمایا: بے شک یہ میرا بھائی ہے اور ایسا ہے اور ایسا ہے، تم اس کی بات سنو اور اس کا کہا مانو، پھر وہ لوگ کھڑے ہوئے ہنستے ہوئے اور ابو طالب سے یہ کہتے ہوئے کہ مقرر تجھ کو امر کیا ہے کہ تو اپنے بیٹے کی بات سنے اور اس کا کہا مانے۔ [1]

طریقِ دیگر سے امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن حارث سے روایت کیا ہے، کہا کہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: میرے لیے بکری کی ایک ران (حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں: «اِصْنَعْ لِيْ رِجْلَ شَاةٍ بِصَاعٍ مِنْ طَعَامٍ» ''رجل شاۃ'' کے معنی آدھی بکری ہے۔ کسی نے کہا کہ ''رجل'' بہ معنی ''فخذ'' ہے، یعنی ران۔ اور صاع چار مد کا ہوتا ہے۔) اور ایک صاع طعام کا تیار کر اور دودھ کا ایک برتن۔ کہا: پس میں نے حکم کی بجا آوری کی۔ پھر فرمایا کہ میرے لیے بنی ہاشم کو بلا لا۔ کہا: پھر میں ان کو بلا لایا اور وہ اس وقت چالیس مرد تھے سوائے ایک مرد کے، یا چالیس اور ایک۔ کہا: اور اُن میں سے دس مرد ایک جزعہ کھا لیتے تھے اس کے سالن کے ساتھ۔ پھر جب وہ قصعہ یعنی بڑا پیالہ لائے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے اوپر اوپر سے لیا۔ پھر فرمایا: کھاؤ، پس کھایا، یہاں تک کہ سیر ہو گئے اور وہ کھانا اسی طرح تھا، یعنی انھوں نے اس سے کم نہ کیا، مگر ذرا سا۔ کہا: پھر میں آپ کے پاس وہ برتن لایا تو انھوں نے پیا، یہاں تک کہ سیراب ہو گئے اور بچ رہا۔

پھر جب کھانے پینے سے فارغ ہو چکے تو رسول اللہ ﷺ نے ارادہ کیا کہ بات کریں تو اُن لوگوں نے جلدی سے اپنی بات شروع کر دی اور بولے کہ ہم نے آج جیسا جادو پہلے نہیں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے سکوت فرمایا۔ پھر مجھ سے (دوسرے دن) فرمایا کہ بکری کی ایک ران ایک صاع طعام کے ساتھ تیار کر۔ میں نے تیار کیا، پھر میں نے ان کو جمع کیا، پھر جب کھا پی چکے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پہلے بات کرنا شروع کی، فرمایا: تم میں سے کون میری طرف سے میرا دین ادا کرتا ہے اور میرے اہل میں میرا خلیفہ ہوتا ہے؟ کہا: وہ لوگ خاموش رہے اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے سکوت کیا اس خوف سے کہ وہ ان کے مال کا احاطہ کر لے، کہا: اور میں نے عباس رضی اللہ عنہ کی عمر کی وجہ سے سکوت کیا، یعنی میں ان کی عمر کا لحاظ کر کے چپ رہا۔

پھر آپ ﷺ نے اس کلمے کو دوبارہ کہا تو بھی عباس رضی اللہ عنہ خاموش رہے، پھر جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں۔ کہا: میں اس وقت ان سب سے زیادہ بدشکل تھا اور میں اعمش العینین تھا، یعنی بیماری کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے اور میرا پیٹ بڑا تھا اور پنڈلیاں پتلی تھیں۔ [2] یہ اس حدیث کے متعدد طریق ہیں۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٤٠٩۔ ٤١٠) اس کی سند میں ''عبدالغفار بن القاسم'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٢٦۔ ٢٨٢٩) اس کی سند میں ''عبداللہ بن عبدالقدوس'' ضعیف راوی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے چچاؤں اور ان کی اولاد سے جو اس بات کا سوال کیا کہ ان کا دین اُن کی طرف سے ادا کریں اور اُن کے گھر میں ان کا خلیفہ ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں، گویا آپ نے اس بات کا خوف کیا کہ جس وقت وہ لوگوں کو ڈرانے کی بھاری ذمے داریوں کو ادا کرنے کے درپے ہوں تو وہ قتل کیے جائیں۔

پھر جب اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يَآأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [المائدة: ٦٧] ”اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا، اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا اور بلاشبہ اللہ کافروں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔“ تو اس وقت آپ امن میں ہو گئے۔ پہلے آپ کی حراست کی جاتی تھی، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [المائدة: ٦٧] ”اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا۔“

اس وقت بنی ہاشم میں ایمان اور یقین اور تصدیق کی رو سے رسول اللہ ﷺ کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی نہ تھا، اسی لیے جس بات کے لیے رسول اللہ ﷺ نے بنی ہاشم سے کہا تھا تو اُن سب سے پہلے علی رضی اللہ عنہ نے جلدی سے اس کو تسلیم کیا تھا۔ پھر۔ والله أعلم۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کھلم کھلا کوہِ صفا پر لوگوں کو بلایا اور عام دعوتِ اسلام دی۔ آپ ﷺ نے قریش کو ڈرانا شروع کیا عام لوگوں کو بھی اور خاص لوگوں کو بھی، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اپنے چچاؤں اور پھوپھیوں اور بیٹیوں سے جن جن کا چاہا نام لیا اور انھیں ڈرایا، تاکہ ادنیٰ کی تنبیہ کر کے اعلیٰ کو بھی سنائیں اور فرمایا کہ میں ڈرانے والا ہوں اور اللہ ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف۔

امام عبدالواحد دمشقی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو حدیث بیان کر رہے ہیں اور ان کو فتویٰ دے رہے ہیں اور ان کا لڑکا ان کے پہلو کی طرف ہے اور اُن کے گھر والے مسجد کے کونے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں۔ کسی نے کہا: کیا حال ہے لوگوں کا کہ وہ تو اس علم میں جو تمھارے پاس ہے رغبت کر رہے ہیں اور تمھارے گھر والے بیٹھے ہوئے لہو کر رہے ہیں؟ تو وہ بولے: اس لیے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ سب لوگوں سے زیادہ دنیا میں بے رغبت انبیاء ہیں اور ان پر لوگوں میں سے سب سے زیادہ سخت نزدیک کے ناتے دار ہیں اور یہ بات اس آیت میں ہے جو اللہ عزوجل نے نازل فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿214﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿215﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾[1]. (رواه الحافظ ابن عساكر في ترجمة عبد الواحد الدمشقي من طريق عمرو بن سمرة عن محمد بن سوقة عن عبد الواحد الدمشقي)

---

[1] تاريخ دمشق (٣٧/ ٢٩١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تو اپنے سارے کاموں میں عزیز رحیم پر بھروسا کر، کیوں کہ تیرا مؤید، ناصر، حافظ، مظفر اور تیرا بول بالا کرنے والا وہی ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ الَّذِي يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴾ یعنی وہ تیرے حال پر عنایت کرنے والا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے ﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ﴾ [الطور: ٤٨] ''اور (اے نبی!) اپنے رب کے حکم (آنے) تک صبر کیجیے، بلاشبہہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ تجھے دیکھتا ہے جبکہ تو نماز کی طرف کھڑا ہوتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ''يَرَى قِيَامَهُ وَرُكُوعَهُ وَسُجُودَهُ'' یعنی وہ تیرے قیام و رکوع اور سجدوں کو دیکھتا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ جو دیکھتا ہے تجھ کو جبکہ تو بالکل تنہا نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تو اپنے بچھونے سے یا اپنی مجلس سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ تو تجھے دیکھتا ہے کھڑا ہوا اور بیٹھا ہوا اور تیری تمام حالتوں پر۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ تجھے دیکھتا ہے جبکہ تو کھڑا ہوتا ہے اور ساجدین میں تیرے تقلب کو، یعنی وہ تجھے نماز میں دیکھتا ہے اس حال میں کہ تو تنہا ہے اور وہ دیکھتا ہے تجھ کو مجمع میں۔ یہی قول امام عکرمہ، عطا خراسانی اور حسن بصری رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے سے بھی اسی طرح دیکھ سکتے تھے، جس طرح کہ اپنے آگے سے دیکھتے تھے۔[1] اس کی شاہد یہ صحیح حدیث ہے: ''برابر کرو تم اپنی صفوں کو، بے شک میں تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔''[2] امام بزار اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے دو طریق سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے، یعنی ''تَقَلُّبُهُ مِنْ صُلْبِ نَبِيٍّ إِلَى صُلْبِ نَبِيٍّ حَتَّى أَخْرَجَهُ نَبِيًّا''[3] مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک دیکھتا ہے تیرے تقلب کو ایک نبی کی پشت سے دوسرے نبی کی پشت کی طرف، یہاں تک کہ تجھے نبی کر کے نکالا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے بندوں کی باتوں کا بڑا سننے والا ہے اور ان کی حرکات و سکنات کو بڑا جاننے والا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾[4] [یونس: ٦١] ''اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں، جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٢٧_ ٢٨٢٩) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٨٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٣٤)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٢٨) [4] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٦١_ ٤٦٥)

آپ کے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی، مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ عشیرہ اقربین کو اس واسطے خاص کیا کہ ان کی شان اور حال کا اہتمام کرنا زیادہ اہم ہے اور اُن کو حق کی طرف ہدایت کرنا مقدم ہے۔ پھر بخاری و مسلم وغیرہما کی حدیث جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کو ذکر کیا ہے۔[1] پھر فرمایا کہ اس بارے میں صحابہ کی ایک جماعت کی وساطت سے کئی حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف عشیرہ اقربین کا بیان ہے اور اُن کو کھلم کھلا ڈرانا ہے۔ جناح بہ معنی جانب ہے۔ جب کوئی کسی سے نرمی و ملاطفت وشفقت کا برتاؤ کرتا ہے تو محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: ''خَفَضَ جَنَاحَهُ'' یعنی اس نے اپنا بازو اور اپنی جانب پست کر دی۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے نرمی کی۔

اس میں اچھا استعارہ ہے، معنی یہ ہیں کہ تو اپنے بازو کو نرم کر اور تواضع کر اس شخص کے لیے جو مومنین موحدین میں سے ہو، وہ تیرے ناتے دار ہوں یا غیر ناتے دار، اور ان سے محبت کر اور ان سے درگزر کر، پھر اگر وہ تیرے حکم کی مخالفت کریں اور تیری تابعداری نہ کریں تو تُو اُن سے کہہ دے کہ میں تمھارے عمل سے، یا اس شے سے جس کو تم کرتے ہو بے زار ہوں، یعنی غیر اللہ کو پوجنا۔ یہ آیت اس بات پر دال ہے کہ مومنین سے وہ لوگ مراد ہیں، جو ایمان کے قریب آ لگے ہیں، زبان سے تصدیق کرتے ہیں، اس لیے کہ جو خالص مومن ہیں، وہ آپ ﷺ کی نافرمانی نہیں کرتے نہ آپ ﷺ کے مخالف ہوتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کے لیے وہ شے بیان کی جس پر وہ اعتماد کریں، جب لوگ آپ ﷺ کے نافرمان ہوں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ تو اپنے سارے کام عزیز رحیم کے سپرد کر دے، کیوں کہ وہ دشمنوں پر غلبہ پانے پر قادر ہے اور اپنے دوستوں پر بڑا مہربان ہے۔ امام نافع اور ابن عامر رحمہ اللہ نے ''فَتَوَكَّلْ'' بہ حرفِ ''فا'' پڑھا ہے۔[2] باقی قراء کی قراءت واؤ کے ساتھ ہے اور دونوں سبعیہ ہیں، پس پہلے کی بنا پر اس کا مابعد مثل جزا کے ہوگا ماقبل سے اور اس پر مترتب ہو گا، اور دوسرے کی بنیاد پر مابعد واؤ کا معطوف ہوگا ماقبل پر، ایک جملے کا عطف ہوگا دوسرے جملے پر بغیر ترتیب کے۔

﴿ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جبکہ تو نماز کے لیے اس حال میں کھڑا ہوتا ہے کہ تو اکیلا ہے۔ یہ قول اکثر مفسرین کا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ جب تو کھڑا ہوتا ہے جس جگہ کہ تو ہے۔[3] ﴿ السّٰجِدِيْنَ ﴾ کے معنی مُصَلِّین ہیں، یعنی وہ تجھے دیکھتا ہے اگر تو جماعت کے ساتھ نماز پڑھے اور تو اس وقت رکوع کرنے اور سجدہ کرنے والا اور قیام کرنے والا ہے۔ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۱۴۳) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۲۸)

حکایت:

امام مقاتل رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آیا تم نمازِ باجماعت کا ذکر قرآنِ مجید میں پاتے ہو؟ تو امام صاحب نے فرمایا: "لَا یَحْضُرُنِيْ" یعنی مجھے وہ مقام اس وقت حاضر نہیں ہوتا ہے، پس مقاتل رحمہ اللہ نے ان کے لیے یہ آیت پڑھ دی۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ وہ دیکھتا ہے تجھ کو موحد مردوں کی پشتوں میں ایک نبی سے دوسرے نبی کی طرف۔ آدم وحوا علیہما السلام سے لے کر عبداللہ وآمنہ تک، یہاں تک کہ تجھ کو اس اُمت میں نکالا۔ آپ ﷺ کے سارے اصول مرد اور عورتیں مومن ہیں۔ (یہ معنی ﴿ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴾ سے زیادہ مناسب ہیں)۔ اس قول پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کا باپ کافر تھا آیاتِ کریمہ کے مطابق۔ بعض نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا، باپ نہ تھا، لیکن اس میں ظاہری ضعف ہے۔ بعض نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اصول میں شرک داخل نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جب تک نورِ محمدی "ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى" میں رہا، پھر جب ان کے بعد کے لوگوں میں منتقل ہوا تو ممکن ہے کہ جن سے منتقل ہو کر آیا ہے، وہ غیر اللہ کو پوجیں۔

آزر نے بتوں کو نہیں پوجا، مگر اس کے بعد کہ نورِ محمدی اس سے منتقل ہو کر ابراہیم علیہ السلام میں آ گیا۔ اس نے اس نور کے منتقل ہو جانے سے پہلے غیر اللہ کو نہیں پوجا۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ تَقُوْمُ ﴾ سے مراد آپ کا تہجد کے لیے کھڑا ہونا ہے اور "تقلب" سے مراد آپ کی ان لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لے آمد ورفت ہے، جو عبادت میں مصروف ہیں اور اس کے لیے سعی کرنے والے ہیں اور آپ کی نگاہ کا ان میں پھیرنا ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کی خبر گیری فرماتے تھے کہ اللہ کی یاد میں مصروف ہیں یا غافل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تین قول مروی ہیں: ایک یہ ہے کہ "تقلب" سے مراد آپ کا قیام ورکوع وسجود ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ وہ دیکھتا ہے تجھ کو اس وقت کہ تو ساجدین کے ساتھ ہے، ان کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور بیٹھتا ہے۔[1] تیسرا قول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جس وقت نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو آپ ﷺ اس شخص کو دیکھتے جو آپ کے پیچھے ہوتا، اسی طرح جس طرح اس شخص کو دیکھتے جو آپ کے آگے ہے۔[2]

اسی بارے میں وہ حدیث ہے جس کو صحیحین وغیرہما میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم خیال کرتے ہو میرے قبلے کو اس جگہ، قسم ہے اللہ کی! مجھ پر تمھارا خشوع اور رکوع مخفی نہیں ہے اور بے شک میں البتہ تم کو اپنی پشت کے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔[3] ﴿ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تو کہتا ہے اللہ پاک

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٤١١۔ ٤١٢) [2] الدر المنثور (٦/ ٣٣٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٢٤)

اس کو خوب سنتا ہے اور خوب جانتا ہے۔ پھر اللہ پاک نے ﴿ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴾ [الشعراء: ۲۱۰] ''اور شیاطین اس (قرآن) کو لے کر نازل نہیں ہوئے۔'' کے معنی کی تاکید فرمائی اور اس کا بیان کیا۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

کیا میں تمھیں بتاؤں کس پر شیاطین نازل ہوتے ہیں؟ (221) وہ ہر جھوٹ گھڑنے والے، گناہ گار پر نازل ہوتے ہیں (222) جو (شیطانوں کی طرف) کان لگاتے ہیں اور ان کے اکثر جھوٹے ہیں (223) اور شاعروں کی پیروی گمراہ (لوگ) ہی کرتے ہیں (224) کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ بلاشبہ وہ (خیال کی) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں (225) اور بلاشبہ وہ (ایسی باتیں) کہتے ہیں، جو کرتے نہیں (226) سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اور اللہ کا بکثرت ذکر کیا، اور جب ان پر ظلم ہوا تو اس کے بعد انھوں نے بدلہ لیا اور ظالم لوگ جلد جان لیں گے کہ کون سی پلٹنے کی (خوفناک) جگہ وہ پلٹیں گے (227)

مشرکین کی افترا پردازی اور اس کی تردید کا بیان:

جن پر شیطان اترتے ہیں ان میں سے وہ لوگ ہیں جو کاہن کہلاتے ہیں، کسی شیطان سے دوستی کر رکھتے ہیں، نذر نیاز دے کر، وہ سب شیطانوں کے ساتھ مل کر فرشتوں کی باتیں سننے کے لیے جاتے ہیں، وہاں انگارے مارے جاتے ہیں جو چھوٹے تاروں کی شکل میں نظر آتے ہیں، جو ایک دو باتیں کان میں پڑ گئیں، اپنے اس دوست کو آ سنائی، اس نے لوگوں کو بتا دی، لوگ اس کے قائل ہوئے۔ صحیح معنوں میں کاہن یہ ہے اور بہت سے لوگ مکر بناتے ہیں، بعضی چیز انسان سے چھپی ہے، شیطان کو معلوم ہے، جیسے سو پچاس کوس کے حالات یا کسی کی جیب میں کیا ہے، اس کے دل میں خیال کیا ہے اور آیندہ کی خبر شیطان کو بھی معلوم نہیں، مگر ایک دو بات جو فرشتوں سے سن لی اور دس بیس اپنی طرف سے ملا لیں اٹکل سے، اٹکل جھوٹ نکلے یا سچ ہو۔

[1] فتح البیان (۹/ ۴۲۳۔ ۴۲۶)

شیطان نیک جنوں سے بے زار ہے کہ یہ اس کو برا جانتے ہیں۔ جھوٹے دغا بازوں سے خوش ہے، جو اس کی مرضی کے موافق ہیں۔ کافر پیغمبر کو بھی کاہن بتاتے اور کبھی شاعر کہتے، فرمایا کہ شاعر کی بات سے کسی کو ہدایت نہیں ہوتی، اس کی صحبت میں ہزاروں خلق نیکی پر آتی ہیں۔ ایک ایک بیابان میں سر ٹکراتے پھرتے ہیں، یعنی جو مضمون پکڑ لیا، اسی کو بڑھائے چلے گئے۔ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں، یعنی جھوٹ موٹ کرتے ہیں، مگر جو کوئی شعر میں اللہ کی حمد کہے یا کفر کی مذمت اور گناہ کی برائی بیان کرے یا اگر کافر لوگ اسلام کی ہجو کریں تو یہ اس کا جواب دے تو ایسے شعر کہنا عیب نہیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مشرکوں میں سے جن لوگوں کا یہ زعم تھا کہ جس شے کو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، وہ حق نہیں ہے اور خود انھوں نے اپنی طرف سے بنا لی ہے، یا جنوں میں سے کوئی تابع اس کو ان کے پاس لایا ہے۔ اللہ پاک ان کو مخاطب کر کے فرماتا ہے اور اپنے رسول ﷺ کی بارگاہِ عالی جاہ کو ان کے جھوٹے قول اور افترا پردازی سے پاک اور مبرا کرتا ہے اور اس بات سے آگاہ فرماتا ہے کہ جس شے کو رسول لے کر آیا ہے، وہ اللہ ہی کے پاس ہے اور اسی کی تنزیل اور وحی ہے۔ اس کو ایک باعزت اور بہت ہی امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے اور وہ شیاطین کی طرف سے نہیں ہے، کیوں کہ ان کو ایسے قرآنِ عظیم میں کسی طرح کی رغبت نہیں ہے، وہ تو اسی شخص پر اترتے ہیں جو کاہنوں اور جھوٹوں میں سے، یعنی ان کے مشابہ اور ان کا ہم جنس ہو۔

اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ﴿٢٢١﴾ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ﴾ یعنی کیا میں تم کو خبر دوں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر افاک اثیم پر اترتے ہیں۔ ﴿أَفَّاكٍ﴾ وہ ہے جو اپنی بات میں بڑا جھوٹا ہے۔ ﴿أَثِيمٍ﴾ وہ ہے جو اپنے افعال میں فسق و فجور کرنے والا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس پر شیطان اترتے ہیں، ایسا شخص کاہنوں میں سے ہے اور جھوٹے اور نافرمان لوگوں میں سے جو اُن کے قائم مقام ہیں، کیوں کہ شیاطین بھی کاذب اور فاسق ہوتے ہیں۔

﴿يُلْقُونَ السَّمْعَ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ آسمان سے چوری چھپے باتیں سنتے ہیں، چنانچہ علمِ غیب میں سے کوئی بات سن لیتے ہیں، پھر اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا دیتے ہیں، پھر انسانوں میں سے جو اُن کے دوست ہیں، ان کی طرف اس بات کو لا ڈالتے ہیں۔ پھر وہ اس کو لوگوں سے بیان کرتے ہیں تو جو کچھ انھوں نے کہا اس میں سے اس بات کے سچا ہونے کی وجہ سے، جو آسمان سے سنی گئی ہے، سب لوگ ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ بات صحیح حدیث میں وارد ہوئی ہے، جس طرح کے امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے نبی اکرم ﷺ سے کاہنوں کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ کچھ چیز نہیں ہیں، انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ تو کچھ چیز بیان کرتے ہیں تو وہ حق ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ کلمۂ حق سے ہے، جن اس کو جھپٹ لیتے ہیں، پھر اس کو اپنے دوست کے کان میں مرغی کے کرکرانے کی طرح کرکراتے ہیں۔ پھر وہ یعنی

کاہن لوگ اس کے ساتھ سو جھوٹ باتیں ملا دیتے ہیں۔[1]

نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس وقت اللہ امر کو آسمان میں جاری کرتا ہے تو اس کے قول کے لیے عاجزی کے طور پر فرشتے اپنے پر مارتے ہیں، گویا وہ چکنے پتھر پر زنجیر گرتی ہے۔ پھر جب اُن کے دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ مقرب فرشتے پوچھنے والے فرشتوں کو جواب دیتے ہیں، مثلاً جبرائیل علیہ السلام ہیں، وہ جواب دیتے ہیں کہ اللہ پاک نے جو فرمایا ہے، وہ حق ہے۔ مجمل جواب دیتے ہیں، تفصیلی جواب نہیں دیتے، کیوں کہ ان کی غرض صرف ان کا خوف دور کرنا ہے، یعنی تم گھبراؤ نہیں۔ اللہ پاک نے جو حکم دیا ہے، وہ معمولی ہے تم اس کو جانتے ہو، ہر روز جو حکم ہوا کرتا ہے وہی ہے۔ قیامت کے قائم ہونے کا حکم نہیں ہے، جیسا تم خیال کرتے ہو۔[2] (تفرد به البخاري)

یعنی اللہ تعالیٰ نے حق کہا ہے اور وہ برتر ہے بڑا ہے، اس کلمے کو سننے کے چور سن لیتے ہیں اور سننے کے چور اس طرح ہوتے ہیں، بعض بعض پر، ایک پر ایک، سفیان نے اس کو اپنے ہاتھ سے بیان کیا، اس کو محرف کیا اور اپنی انگلیوں کے درمیان تفریق کی۔ پس سن لیتا ہے اس کلمے کو، پھر اس کو اس شیطان کی طرف ڈالتا ہے جو اس کے نیچے ہے، پھر دوسرا شیطان اس کو اپنے نیچے والے کی طرف ڈالتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کو ساحر یا کاہن کی زبان پر ڈالتا ہے، پھر کبھی تو اس کو انگارا لگتا ہے، اس سے پہلے کہ وہ اس کلمے کو نیچے والے کی طرف ڈال دے اور کبھی وہ اس کو انگارا لگنے سے پہلے ڈال دیتا ہے، پھر وہ اس کلمے کے ساتھ سو جھوٹ باتیں ملاتا ہے۔ کہا جاتا ہے، یعنی جو شخص کاہن کو سچا جانتا ہے، وہ اس سے کہتا ہے جو اس کو ملامت کرتا تھا، کیا ہم سے فلاں کاہن نے پکی طرح نہیں کہا تھا، فلاں فلاں دن فلاں فلاں بات؟ چنانچہ اس کی تصدیق کی جاتی ہے اس کلمے کے سبب سے جو آسمان سے سنا گیا ہے۔ (تفرد به البخاري)[3] جبکہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اس سے ملتی جلتی روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے روایت کی ہے، وہ انصار کے بعض افراد سے بیان کرتے ہیں جس کا ذکر سورت سبا کی درج ذیل آیت کی تفسیر میں آئے گا، ان شاء اللہ: ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾ [سبأ: ۲۳] ''حتی کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے تو (باہم) کہتے ہیں: تمھارے رب نے کیا کہا ہے؟ وہ کہتے ہیں: حق (سچ کہا) اور وہ بہت بلند، بہت بڑا ہے۔''

نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک فرشتے عنان میں باتیں کرتے ہیں اور عنان بادل ہے۔ «بِالْأَمْرِ فِي الْأَرْضِ» یعنی اس امر کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷۱۲۲)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢٢)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢٢)

بارے میں جو زمین میں جاری ہوگا۔ شیطان اس کلمے کو سن لیتے ہیں، پھر اس کو کاہن کے کان میں قر قراتے ہیں، جس طرح شیشہ قر قراتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا دیتے ہیں۔[1] (وروى البخاري في موضع آخر من كتاب بدء الخلق بسنده عن عائشة رضي الله عنها بنحوه)

شعراء کے عمومی مزاج کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴾ سیدنا علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مراد کفار ہیں، جن کی پیروی جنوں اور انسانوں میں سے گمراہ کرتے ہیں۔ اسی طرح مجاہد اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ وغیرہما نے کہا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو شاعر باہم ایک دوسرے کی ہجو کیا کرتے تھے تو لوگوں کے کئی گروہ اس کا بدلہ لیتے اور کئی گروہ اس کا ساتھ دیتے، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔[2] امام احمد نے ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ عرج میں جا رہے تھے، جو مدینے سے کئی دنوں کی راہ پر ایک قریہ ہے، اس دوران ایک شاعر شعر پڑھتا ہوا سامنے آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « خُذُوا الشَّيْطَانَ أَوْ أَمْسِكُوا الشَّيْطَانَ » یعنی پکڑو شیطان کو، یا روکو شیطان کو، البتہ تم میں سے کسی کے لیے یہ بہتر ہے کہ اس کا پیٹ پیپ سے بھر جائے، بہ نسبت اس کے کہ شعر سے بھر جائے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴾ سیدنا علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "فِيْ كُلِّ لَغْوٍ يَخُوْضُوْنَ"، یعنی ہر لغو اور بے فائدہ بات میں خوض کرتے ہیں، گھستے ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ "فِيْ كُلِّ فَنٍّ مِنَ الْكَلَامِ"، یعنی کلام کی ہر قسم میں خوض کرتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: واللہ! یقیناً ہم نے ان کی وادیوں کو دیکھا ہے، جن میں وہ گھستے ہیں، کبھی فلاں کی گالی میں، کبھی فلاں کی تعریف میں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شاعر باطل کے ساتھ ایک قوم کی تعریف کرتا ہے اور ایک قوم کی باطل کے ساتھ مذمت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تعریف اور مذمت دونوں جھوٹی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ امام عوفی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک زمانے میں دو شخص تھے، ایک تو انصار میں سے تھا اور دوسرا کسی اور قوم کا تھا۔ ان دونوں نے باہم ایک دوسرے کی ہجو کی۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کی قوم کے غواۃ، یعنی بے وقوف لوگ ہو گئے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿224﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿225﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴾

علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "أَكْثَرُ قَوْلِهِمْ يَكْذِبُوْنَ فِيْهِ"،[4] یعنی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١١٤)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٣١_ ٢٨٣٢)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٥٩) مسند أحمد (٣/ ٨)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٣٣)

شاعر لوگ اپنے اکثر قول میں جھوٹ بولتے ہیں، یہ بات جو انھوں نے فرمائی حقیقت میں اسی طرح ہے۔ "فَإِنَّ الشُّعَرَاءَ يَتَبَجَّحُونَ بِأَقْوَالٍ وَّأَفْعَالٍ لَمْ تَصْدُرْ مِنْهُمْ وَلَا عَنْهُمْ فَيَتَكَثَّرُونَ بِمَا لَيْسَ" (اس کے بعد اصل میں بیاض ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد "عِنْدَهُمْ" کا لفظ رہ گیا ہے۔) واللّٰه أعلم۔ ("صَدَرَ مِنْهُ" کے معنی ہیں، اس سے فلاں شے کا ظہور ہوا اور صدر عنه کے معنی ہیں کہ فلاں شے نے اس سے بازگشت کی) یعنی اس لیے کہ شاعر لوگ ان اقوال و افعال سے خوش ہوتے ہیں جن کا صدور نہ اُن کی طرف سے ہوا ہے نہ خود اُن سے ہوا ہے۔ بس تکلف کے ساتھ اس شے کی کثرت ظاہر کرتے ہیں جو اُن کے پاس نہیں ہے۔ اسی لیے علماء رحمہم اللہ نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ جب شاعر اپنے شعر میں ایسی شے کا اقرار کرے جو موجبِ حد ہو تو آیا اس اقرار سے وہ حد اس پر قائم کی جائے یا نہیں، اس لیے کہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ اس میں دو قول ہیں۔

حکایت:

محمد بن اسحاق و محمد بن سعد نے طبقات میں اور زبیر بن بکار نے "كتاب الفكاهة" میں ذکر کیا ہے کہ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لقمان بن عدی بن نصلہ کو سرزمینِ بصرہ کے علاقے میسان پر عامل مقرر کیا اور وہ شعر کہا کرتے تھے۔ پس انھوں نے یہ شعر کہے:

أَلَا هَلْ أَتَى الْحَسْنَاءَ أَنَّ خَلِيْلَهَا ... بِمَيْسَانَ يُسْقَى فِيْ زُجَاجٍ وَّحَنْتَمِ
إِذَا شِئْتُ غَنَّتْنِيْ دَهَاقِيْنُ قَرْيَةٍ ... وَرَقَّاصَةٌ تَحْثُوْ عَلٰى كُلِّ مَبْسِمِ
فَإِنْ كُنْتَ نَدْمَانِيْ فَبِالْأَكْبَرِ اسْقِنِيْ ... وَلَا تَسْقِنِيْ بِالْأَصْغَرِ الْمُتَثَلِّمِ
لَعَلَّ أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ يَسُوْءُهٗ ... تَنَادُمُنَا بِالْجَوْسَقِ الْمُتَهَدِّمِ

یعنی سنتا ہے! کیا معشوقۂ حسین کو یہ خبر پہنچی کہ اس کا یار میسان میں ہے، اس کا یہ حال ہے کہ شیشے کی پیالیوں میں اور سبز کوزے میں اس کو شراب پلائی جاتی ہے، جس وقت میں چاہتا ہوں تو گاؤں کی زمیندارنیاں مجھے گانا سناتی ہیں اور ایسی ناچنے والی ہے کہ ہر ایک کے دانتوں پر اور منہ پر خاک مارتی ہے، پھر اگر تو میرا حریف اور شراب کا ہم نشیں ہو تو مجھے بڑے پیالے سے پلا اور رخنہ دار پیالے سے مت پلا، یہ ہماری ہم نشینی جو گری پڑی بوسیدہ محل میں ہو رہی ہے، شاید امیر المومنین کو بری لگے۔ غرضیکہ پھر جب یہ شعر امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو پہنچے تو فرمایا: "إِيْ وَاللّٰهِ إِنَّهٗ لَيَسُوْءُنِيْ ذٰلِكَ وَمَنْ لَقِيَهٗ فَلْيُخْبِرْهُ أَنِّيْ قَدْ عَزَلْتُهٗ" یعنی ہاں واللہ! بے شک یہ بات مجھے بری لگتی ہے اور جو شخص اس سے ملے تو چاہیے کہ اسے بتا دے کہ میں نے اسے یقیناً معزول کر دیا اور اس کو یہ فرمان تحریر فرمایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ حٰمٓ ① تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ② غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ فَقَدْ بَلَغَنِي قَوْلُكَ ہ

لَعَلَّ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ يَسُوْءُهُ تَنَادُمُنَا بِالْجَوْسَقِ الْمُتَهَدِّمِ

وَأَيْمُ اللّٰهِ إِنَّهُ لَيَسُوْءُنِي وَقَدْ عَزَلْتُكَ“ یعنی اس کتاب کا نازل فرمانا اس اللہ کی طرف سے ہے، جو غالب اور دانا ہے۔ گناہ کا بخشنے والا اور توبہ کا قبول فرمانے والا، سخت عذاب والا، انعام وقدرت والا، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی طرف واپس لوٹنا ہے۔ اما بعد!

یقیناً مجھے تیرا یہ قول پہنچا: ”لَعَلَّ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ... إِلٰى آخره“ اور قسم ہے اللہ کی! بے شک وہ البتہ مجھے برا لگا ہے، مقرر میں نے تجھ کو برطرف کر دیا۔ پھر جب نعمان امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اسی شعر کے ساتھ ان کو سرزنش فرمائی۔ نعمان نے عرض کی: واللہ اے امیر المومنین! میں نے اس کو کبھی نہیں پیا۔ ”وَمَا ذَاكَ الشِّعْرُ إِلَّا شَيْءٌ طَفَحَ عَلَى لِسَانِي“ یعنی نہیں ہے یہ شعر مگر ایک شے ہے کہ میری زبان پر جاری ہوگئی۔

پس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”أَظُنُّ ذٰلِكَ وَلٰكِنْ وَاللّٰهِ لَا تَعْمَلُ لِي أَبَدًا وَقَدْ قُلْتَ مَا قُلْتَ“[1] یعنی میں گمان کرتا ہوں اس کا، لیکن واللہ! تو کبھی میرے کسی عمل کا عامل نہ ہوگا، حالاں کہ تو کہہ چکا جو کچھ کہہ چکا۔ مطلب یہ ہے کہ میں کبھی تجھ کو کسی جگہ کا حاکم نہ کروں گا۔ پھر یہ بات ذکر نہیں کی گئی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نعمان کو شراب پر حد لگائی ہو، حالاں کہ ان کا شعر اس بات کا اقرار کرتا ہے، کیوں کہ شاعر لوگ جو کہتے ہیں، وہ کرتے نہیں ہیں۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نعمان کو اس پر ملامت فرمائی اور اُن کی مذمت کی اور اس کی وجہ سے ان کو معزول فرما دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاعر نہیں تھے:

اسی لیے حدیث شریف میں یہ بات وارد ہوئی ہے کہ تم میں سے کسی کے لیے یہ بہتر ہے کہ اس کا پیٹ پیپ سے پُر ہو جائے کہ وہ اس کو گلا ڈالے بہ نسبت اس کے کہ شعر سے پُر ہو۔[2] اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن پر یہ قرآن شریف اُتارا گیا، کاہن نہیں ہیں اور نہ شاعر ہیں، اس لیے کہ آپ کا حال مبارک ظاہری طور پر شعراء کے حال کے منافی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [یٰسٓ: ٦٩] ”اور ہم نے اس (رسول) کو شعر کہنا نہیں سکھایا اور نہ (یہ) اس کے لائق ہی تھے، یہ (کلامِ الٰہی) تو سراسر نصیحت اور واضح قرآن ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۞ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا

---

[1] الطبقات لابن سعد (٤/ ١٤٠) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٦٧)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٢٥٧)

مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿41﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿42﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الحاقة: ٤٠۔ ٤٣]
''بلاشبہ یہ (قرآن) رسول کریم (جبریل) کا قول ہے۔ اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم کم ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ (یہ) کسی کاہن کا قول ہے، تم کم ہی نصیحت پکڑتے ہو۔ (یہ تو) رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے۔'' اور اسی طرح یہاں فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - إلى قوله - وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴾۔

شعرائے اسلام البتہ اس سے مستثنیٰ ہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے عن یزید بن عبد اللہ بن قسیط عن ابی الحسن سالم براد بن عبد اللہ مولا تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ جب ﴿ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴾ نازل ہوئی تو سیدنا حسان بن ثابت، عبد اللہ بن رواحہ اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم روتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی کہ اللہ نے جب یہ آیت نازل کی تو اللہ یہ بات جان چکا ہے کہ ہم شاعر ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر سنائی: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ فرمایا: تم ہو۔ ﴿ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ فرمایا: تم ہو۔ ﴿ وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ﴾ فرمایا: تم ہو۔[1] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير من رواية ابن إسحاق)

نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو الحسن مولیٰ بنی نوفل سے روایت کیا ہے کہ حسان بن ثابت اور عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روتے ہوئے آئے، جبکہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴾ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یہ آیت پڑھی یہاں تک کہ ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ تک پہنچے تو فرمایا کہ تم ہو۔ پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ہشام بن عروہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ تک تو عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! یقیناً اللہ نے جان لیا ہے کہ میں ان میں سے ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾۔

اسی طرح سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، مجاہد، قتادہ، زید بن اسلم اور غیر واحد رحمہم اللہ نے کہا ہے[2] کہ یہ استثناء ہے ما تقدم سے، اور بے شک یہ استثناء ہے، لیکن یہ سورت مکی ہے تو انصار کے شعراء ان آیتوں کا سببِ نزول کس طرح ہو سکیں گے اور اس میں نظر ہے اور پہلے جو حدیثیں گزر چکی ہیں، وہ مرسل ہیں، ان پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ واللہ أعلم۔ لیکن اس استثناء میں شعرائے انصار وغیرہم داخل ہیں، یہاں تک کہ جاہلیت کے شعراء میں سے جو لوگ اسلام اور اہلِ اسلام کی مذمت کرنے میں ملوث رہے تھے، پھر توبہ و انابت کی اور رجوع ہوئے اور باز رہے اور عملِ صالح کیے اور اللہ کی یاد بہت کی اس کلامِ بد کے مقابلے میں جو پہلے اُن سے صادر ہو چکا، وہ بھی اس استثناء میں داخل ہیں،

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٣٤) تفسیر الطبري (١٩/ ٤١٨) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٣٤۔ ٢٨٣٦)

کیوں کہ نیکیاں بدیوں کو لے جاتی ہیں اور اہلِ اسلام اور اسلام کی تعریف کے مقابلے میں اس مذمت سے توبہ کی جو وہ کیا کرتے تھے جس طرح کہ عبداللہ بن زبعریٰ نے کہا، جبکہ اسلام لے آیا: ؎

يَا رَسُوْلَ الْمَلِيْكِ إِنَّ لِسَانِيْ رَاتِقٌ مَّا فَتَقْتُ إِذْ أَنَا بُوْرٌ
إِذ أُجَارِيْ الشَّيْطَانَ فِيْ سُنَنِ الْغَيِّ وَمَنْ مَالَ مَيْلَهُ مَثْبُوْرٌ

یہ شعر ترجمہ کے ساتھ پہلے گزر چکے ہیں۔[1] اسی طرح ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عداوت رکھنے والا تھا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ، اور آپ کا چچا زاد بھائی تھا، اور سب سے بڑھ کر آپ ﷺ کی ہجو کیا کرتا تھا۔ پھر جب مسلمان ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر اس کو کوئی محبوب نہ تھا اور آپ ﷺ کی مدح کرتا تھا اس کے بعد کہ آپ کی ہجو کرتا تھا، اور آپ سے دوستی رکھتا تھا اس کے بعد کہ آپ سے عداوت کرتا تھا۔ اسی طرح مسلم نے اپنی صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابوسفیان صخر بن حرب رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو عرض کی: یا رسول اللہ! تین چیزیں آپ مجھے عطا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، عرض کی کہ آپ معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنا کاتب ٹھہرائیں، (یعنی اپنی روبکاری کا اس کو میر منشی مقرر کریں۔) فرمایا: ہاں۔ عرض کی: آپ مجھ کو امیر کریں، یہاں تک کہ میں کفار سے لڑوں، جس طرح کہ مسلمانوں سے لڑا کرتا تھا۔ فرمایا: ہاں، اور تیسری بات کو ذکر کیا۔[2] اور اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ ذکر کیا انھوں نے اللہ کا بہت اپنے کلام میں۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے شعر میں۔ یہ دونوں قول صحیح ہیں، مٹانے والے ہیں اس شے کو جو پہلے ہو چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رد کرتے ہیں کفار پر اس شے کو جس کے ساتھ انھوں نے مومنین کی ہجو کی تھی۔ اسی طرح امام مجاہد، قتادہ اور غیر واحد رحمہم اللہ نے کہا ہے۔[3] یہ ویسی بات ہے، جو صحیح میں ثابت ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسان رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أُهْجُهُمْ» أَوْ قَالَ: «هَاجِهِمْ» یعنی تو ان کی ہجو کر اور جبرائیل علیہ السلام تیرے ساتھ ہیں۔[4] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی کہ بے شک اللہ عزوجل نے شعراء کے حق میں نازل کیا ہے، جو نازل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن جہاد کرتا ہے اپنی جان سے اور اپنی زبان سے: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! لَكَأَنَّ مَا تَرْمُوْنَهُمْ بِهِ نَضْحُ النَّبْلِ»[5] یعنی قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ وہ شے جس کے ساتھ تم ان

[1] سورۃ الفرقان (آیت: ۱۷۔۱۹) کی تفسیر کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٠١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٣٥۔ ٢٨٣٦) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٨٦)
[5] مسند أحمد (٦/ ٣٨٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٣١)

کو عیب لگاتے ہو، ہجو کرتے ہو، مارنا ہے تیروں کا۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا ان کی ہجو کرنا ان کو تیروں کی طرح اثر کرتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴾ [الروم: ٥٧] ''چناں چہ جن لوگوں نے ظلم و زیادتی کی اس دن ان کی معذرت (انھیں) کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے (اپنے رب کو) راضی کرنے کے لیے کہا جائے گا۔'' صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « إِيَّاكُمْ وَالظُّلْمَ، فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَّوْمَ الْقِيَامَةِ »[1] یعنی تم ظلم سے بچو، پس بے شک ظلم قیامت کے دن تاریکیاں ہیں۔ امام قتادہ بن دعامہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں ظالم سے شعراء اور غیر شعراء سب ہی مراد ہیں۔

امام ابو داود طیالسی نے کہا: ہم کو حدیث بیان کی ایاس بن ابی تمیمہ رحمہ اللہ نے، کہا: میں حسن رحمہ اللہ کے پاس حاضر ہوا اور لوگ ایک نصرانی کا جنازہ لے کر ان کے پاس سے گزرے تو انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴾ امام عبد اللہ بن ابی رباح اور صفوان بن محرز رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت وہ اس آیت کو پڑھتے تو روتے، یہاں تک کہ میں کہتا: اس آیت کی تلاوت سے تو گویا ان کی رگِ جان ہی کٹ جائے گی۔

امام ابن وہب نے کہا: ہم کو شریح اسکندرانی نے بعض مشیخہ سے خبر دی کہ وہ روم کی سرزمین میں تھے، اس دوران کہ ایک رات وہ آگ پر بیٹھے ہوئے تھے اور اس پر گوشت بھون رہے تھے، یا تاپ رہے تھے کہ اچانک کئی سوار آ گئے، پھر اُن کی طرف کھڑے ہوئے تو ناگہاں فضالہ بن عبید اُن میں تھے، مشیخہ نے ان کو اُتارا، پھر اُن کے ساتھ بیٹھے، کہا: ہمارا ایک دوست کھڑا ہوا، نماز پڑھ رہا تھا، یہاں تک کہ اس آیت پر گزرا: ﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ﴾ تو فضالہ بن عبید رحمہ اللہ بولے: یہ وہ لوگ ہیں کہ بیت اللہ کو خراب کریں گے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اُن سے اہلِ مکہ مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مشرکوں میں سے ظلم کیا ہے۔ صحیح یہ بات ہے کہ یہ آیت ہر ظالم کے حق میں عام ہے، جیسا کہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ میرے باپ نے وصیت میں دو سطریں لکھیں:

وصیتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، هَذَا مَا أَوْصَى بِهِ أَبُوْ بَكْرِ بْنِ أَبِيْ قُحَافَةَ عِنْدَ خُرُوْجِهِ مِنَ الدُّنْيَا، حِيْنَ يُؤْمِنُ الْكَافِرُ وَيَنْتَهِيْ الْفَاجِرُ وَيَصْدُقُ الْكَاذِبُ، إِنِّيْ اسْتَخْلَفْتُ عَلَيْكُمْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ، فَإِنْ يَّعْدِلْ فَذَلِكَ ظَنِّيْ بِهِ وَرَجَائِيْ فِيْهِ، وَإِنْ يَّجُرْ وَيُبَدِّلْ فَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ ﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴾[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٨) مسند أحمد (٢/ ١٠٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٣٦۔ ٢٨٣٧)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٣٦۔ ٢٨٣٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٦٥۔ ٤٦٩)

یعنی یہ وہ شے ہے جس کے ساتھ ابوبکر بن ابو قحافہ نے وصیت کی دنیا سے نکلتے وقت جس وقت کہ کافر ایمان لاتا ہے اور فاجر باز رہتا ہے اور جھوٹا سچ بولتا ہے کہ میں نے تم پر عمر بن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا، اگر وہ عدل کرے تو یہ میرا اس کے ساتھ گمان ہے اور اس میں میری امید ہے اور اگر وہ جور (ظلم) کرے اور تبدیلی کرے تو میں غیب کو نہیں جانتا ہوں اور عن قریب ظلم کرنے والے جان لیں گے کہ کس کروٹ پر اُلٹتے ہیں۔

آخر تفسیر سورة الشعراء والحمد لله رب العالمین۔ ۴/ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۱ ہجری روز پنج شنبہ ظہر کے وقت کے قریب مکمل ہوئی۔ والحمد لله أولا وآخرا وظاهراً و باطناً، والصلاة والسلام علىٰ سيدنا ومولانا محمد وآله وصحبه وبارك وسلم. آمين

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ تَنَزَّلُ ﴾ کی اصل "تتنزل" ہے، ایک حرفِ تا کو حذف کر دیا ہے۔ معنی یہ ہیں: کیا خبر دوں میں تم کو اے کفارِ مکہ! کہ شیطان کس پر اترتے ہیں؟ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ شیاطین کا رسول اللہ ﷺ پر اُترنا محال ہے، شیاطین تو ہر افاکِ اثیم پر اترتے ہیں۔ ﴿ اَفَّاكٍ ﴾ "كَثِيْرُ الْإِفْكِ" کو اور ﴿ اَثِيْمٍ ﴾ "كَثِيْرُ الْإِثْمِ" کو کہتے ہیں، اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جو کاہن ہے، کیوں کہ شیاطین استراقِ سمع (چوری چھپے سننا) کیا کرتے تھے، پھر کاہنوں کی طرف آتے، پھر جو بات چوری سے سن لی، اس کو کاہنوں کی طرف لا ڈالتے تھے، جس طرح کہ مسیلمہ کذاب نبوت کا دعویٰ کرنے والوں میں سے ہے اور سطیح کاہنوں میں سے۔

﴿ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ ﴾ کے یہی معنی ہیں۔ "سمع" سے مراد وہ شے ہے جس کو وہ سنتے ہیں ان باتوں میں سے جن کو وہ چوری سے سنتے ہیں، اس صورت میں جملہ ﴿ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ ﴾ شیاطین کی طرف راجع ہوگا، محلِ نصب میں ہوگا بنا بر حال، یعنی درآنحالیکہ شیطان اس شے کو جس کو ملائے اعلیٰ سے سن لیا ہے، کاہنوں کی طرف ڈالنے والے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہوں کہ شیاطین سمع کو ڈالتے ہیں، یعنی ملائے اعلیٰ کی طرف کان لگاتے ہیں، تاکہ ان سے کچھ چرا لیں۔ پہلے معنی کی بنا پر سمع سے مراد مسموع ہوگا اور دوسرے معنی کی بنیاد پر قوتِ سامعہ مراد ہوگا، جس کا محل کان ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جملہ ﴿ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ ﴾ ﴿ كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ کی طرف راجع ہو، اس بنا پر کہ صفت ہو یا جملہ مستانفہ۔

معنی "إلقاء" کے یہ ہوں گے کہ یہ لوگ سنتے ہیں اس چیز کو جس کو شیاطین اُن کی طرف القا کرتے ہیں۔ من جملہ ان باتوں کے جن میں سے ایک بات تو سچ ہوتی ہے اور سو جھوٹ ہوتی ہیں اور وہ ان کو عوام خلق کی طرف القا کرتے ہیں جس طرح کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔[1]

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

جملہ ﴿ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴾ ﴿ كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ کی طرف راجع ہے، یعنی اکثر یہ کاہن لوگ جھوٹے ہیں، اس بات میں جو یہ شیاطین سے لیتے ہیں، کیوں کہ جس بات کو انھوں نے سنا ہے، اس میں اپنی جھوٹی بنائی باتوں سے بہت کچھ ملا دیتے ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان میں سے اکثر اس بات میں جھوٹے ہیں جس کا وہ لوگوں کی طرف شیاطین کی سنی ہوئی باتوں کا القا کرتے ہیں۔ یا یہ جملہ ﴿ اَلشَّيٰطِيْنُ ﴾ کی طرف راجع ہے، یعنی اکثر شیاطین اس بات میں جھوٹے ہیں جس کا القا وہ کاہنوں کی طرف کرتے ہیں، ان باتوں میں سے جن کو انھوں نے سنا ہے، کیوں کہ وہ اپنی طرف سے اس میں بہت جھوٹ ملا لیتے ہیں۔ یہ بات اس سے پہلے تھی کہ شیاطین آسمان سے روکے جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وجہِ اول کی بنا پر افاکین کا وصف اس بات کے ساتھ کیسے درست ہو گا کہ اکثر ان کے کاذب ہیں، بعد اس کے کہ ان سب کا وصف افک کے ساتھ ہو چکا ہے؟ اس کا یہ جواب ہے کہ ﴿ اَفَّاكٍ ﴾ سے مراد وہ شخص ہے جو بہت جھوٹ بولتا ہے، وہ مراد نہیں جو جھوٹ ہی بولتا ہے۔

﴿ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس بات کی شیاطین سے حکایت کرتے ہیں، اس میں ان میں سے سچے کم ہیں۔ جس مقصد کے لیے یہ کلام لایا گیا ہے، وہ مشرکوں کے اس زعم کا رد کرنا ہے کہ نبی اکرم ﷺ انہیں لوگوں میں سے ہیں، جن کی طرف شیطان القا کیا کرتا ہے۔ یعنی کاہن لوگ۔ رد یہ بات بیان کر کے کیا کہ کاہنوں پر کذب کا بہت زیادہ غلبہ ہے اور نبی اکرم ﷺ کے احوال سے سوائے سچائی کے اور کچھ ظاہر نہیں ہوا۔ پھر وہ البتہ کیوں کر ہوں گے، جیسا انھوں نے زعم کیا ہے!!

دوسرے یہ کہ کاہن لوگ شیاطین کی تعظیم کرتے ہیں اور یہ نبی جو اللہ پاک کی طرف سے اس کی رسالت دے کر بھیجے گئے ہیں، ان کی مذمت کرتے ہیں، ان پر لعنت بھیجتے ہیں اور اُن سے پناہ مانگنے کا حکم دیتے ہیں۔ پھر جبکہ مشرکوں میں سے کسی نے یہ کہا تھا کہ نبی اکرم ﷺ شاعر ہیں تو اللہ پاک نے شاعروں کا حال بیان کیا اور یہ بات ذکر کی کہ جس بات پر شعراء ہیں، وہ اس حال کے منافی ہے جس پر نبی کریم ﷺ ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴾ یعنی شعراء کا ساتھ دینے والے اور اُن کی راہ چلنے والے اور اُن کے جملے سے متاثر ''غاؤن'' ہی ہوتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو حق سے گمراہ ہیں۔

''شعراء'' ''شاعر'' کی جمع ہے اور ''غاؤن'' ''غاوي'' کی۔ یہ لوگ جنوں اور انسانوں کے گمراہ لوگ ہیں۔ کسی نے کہا: ''زَائِلِیْنَ عَنِ الْحَقِّ'' ہیں، یعنی وہ لوگ جو حق سے علاحدہ ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا: مشرکین۔ کسی نے کہا: شیاطین۔ کسی نے کہا: وہ لوگ ہیں جو ہجو کے شعر کی یا اس شعر کی روایت کرتے ہیں جو جائز نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خاص طور پر کافروں کے شاعر ہیں۔

من جملہ اُن کے یہ لوگ ہیں عبد اللہ بن زبعری سہمی، ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی، مسافع بن عبد مناف، ابو عزہ جمحی، امیہ بن ابی الصلت ثقفی۔ ان لوگوں نے کذب اور باطل بکا اور کہا کہ ہم کہتے ہیں جیسا محمد ﷺ کہتے ہیں اور شعر کہے۔ ان کی قوم کے گمراہ لوگ ان کے پاس جمع ہوئے اور ان کے شعر سننے لگے جب کہ وہ نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی ہجو کرتے تھے اور اُن شاعروں سے ان کے قول کی روایت کرتے تھے، یعنی وہ قول دوسروں کو بتاتے تھے۔ چنانچہ یہ وہ قول ہے اللہ پاک کا۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کوئی شاعر مدح یا ہجو کرے، کسی ایسی شے کے ساتھ جو حقیقت نہیں ہے اور ایک قوم اس کو محبوب رکھے، یعنی پسند کرے اور اس میں اس کی متابعت کرے تو یہ لوگ ''غاوون'' ہیں۔[1] معنی یہ ہیں کہ ان امور پر شاعروں کی پیروی صرف غاوون ہی کرتے ہیں وہ امور یہ ہیں: کذب و باطل اور بے آبروئی کرنا، نسبوں میں عیب لگانا، حسب ونسب میں طعن کرنا، کسی ایسے شخص کی مدح کرنا، جو اس کا مستحق نہیں ہے، کسی ایسے شخص کی مذمت کرنا جو مذمت کا مستحق نہیں، ان سب امور کا شاعروں سے ادا ہونا غاوون ہی کو اچھا لگتا ہے۔ جمہور نے ''وَالشُّعَرَاءُ'' برفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتدا ہے اور ما بعد اس کا خبر ہے، عیسیٰ بن عمر نے بہ نصب پڑھا ہے بنا بر اشتغال۔ امام نافع، شیبہ، حسن اور سلمی نے ''یَتْبَعُهُمْ'' بہ تخفیف پڑھا ہے، باقی قراء کی قراءت بہ تشدید ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے شعرائے باطل کی قباحتیں بیان فرمائی ہیں: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴾ یہ جملہ اپنے ماقبل کی تقریر کرتا ہے اور ہر اس شخص کو خطاب ہے، جس سے رویت ہوسکتی ہے۔ جس وقت کوئی شخص اپنے منہ پر چلے، جس طرح خبطی دیوانے لوگ منہ اٹھائے چلتے ہیں تو محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: ''هَامَ يَهِيْمُ هَيْمًا وَهَيْمَانًا۔ ''هیام'' یہ ہے کہ اپنے منہ پر چلا جائے مارے عشق وغیرہ کے، اور یہ تمثیل ہے جس طرح کہ کشاف میں کہا ہے۔[3] معنی یہ ہیں: اے مخاطب! کیا نہیں دیکھا تو نے شعراء کو کہ وہ جھوٹ کی قسموں میں سے ہر قسم میں گھستے ہیں، جھوٹ کی گھاٹیوں میں سے ہر گھاٹی میں گفتگو کرتے ہیں، کبھی تو ہجو کر کے آبروؤں کو چیرتے پھاڑتے ہیں، کبھی فحش اور بے ہودہ باتوں میں سے ہر بے ہودہ اور فحش بات ایسی ذکر کرتے ہیں جس کو نہ کان قبول کرتا ہے نہ عقل اچھا جانتی ہے۔ کبھی کم عقلی اور حماقت اور بے حیائی کے دریا میں غوطہ لگاتے ہیں اور حق کی مذمت اور باطل کی تعریف کرتے ہیں۔ محرمات کے کرنے میں رغبت دلاتے ہیں، منکرات کے کرنے کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں، جس طرح کہ ان کے اشعار میں تو سنتا ہے کہ شراب و زنا ولواطت اور اسی طرح کی دوسری ملعون خصلتوں کی تعریف ہوتی ہے اور کیوں نہ ہوں، ان کی اکثر پیش کردہ چیزیں تو محض خیالات ہوتی ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی اور اُن کے کلمات زیادہ تر ان امور میں ہوتے ہیں: حرام کے ساتھ تشبیب، یعنی عورتوں کی صفاتِ حسن کا ذکر کرنا، تغزل و مغازلت، یعنی عورتوں

---

[1] معاني القرآن (٤/ ١٠٤)
[2] فتح القدير (٤/ ١٥٩۔ ١٦٠)
[3] الكشاف (٣/ ٣٤٨)

سے بات چیت کرنا اور جھوٹا دعویٰ کرنا اور آبرو ریزی کرنا اور حسب ونسب میں عیب لگانا اور طعن کرنا اور وعدۂ باطل کرنا اور باطل فخر کرنا اور غیر مستحق کی مدح کرنا اور مدح میں مبالغہ کرنا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔[1]

غرضیکہ ﴿ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴾ استعارۂ بلیغ اور تمثیلِ رائع کے باب سے ہے۔ شاعر لوگ جو طرح طرح اور قسم قسم کے قول میں مدح و مذمت وتشبیب اور شعر کی مختلف قسموں کی جو بھرمار کرتے ہیں تو اس کی تشبیہ اس شخص کی سرگردانی سے دی ہے جو ہر راستے میں سرگرداں و حیران پھرتا ہے۔ ''هَائِمٌ'' وہ شخص ہے جو اپنی راہ میں خبط کرتا ہے اور کسی جائے معین کا قصد نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح شاعروں کا حال ہے کہ ہر قسم کے مضمون میں سر مارتے پھرتے ہیں۔ ''هَائِمٌ'' عاشق کو بھی کہتے ہیں اور ''هَيْمَانٌ'' پیاسے کو بولتے ہیں۔

''هیام'' ایک بیماری ہے جو پیاس سے اونٹوں کو لاحق ہوتی ہے، جس اونٹ یا اونٹنی کو یہ بیماری ہوتی ہے، اس کو ''جَمَلٌ أَهْيَمُ وَنَاقَةٌ هَيْمَاءُ'' بولتے ہیں اور جمع دونوں کی ''هِيْمٌ'' آتی ہے۔ چناں چہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴾ [الواقعة: ٥٥] ''پھر پینے والے ہو پیاسے اونٹوں کی طرح۔'' کسی نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شے کی تعریف کرتے ہیں، پھر اسی کی مذمت کرتے ہیں اور حق اور صداقت کے طالب نہیں ہوتے ہیں۔ وادی مثال ہے فنون، اقسام، انواع اور طرقِ کلام کے لیے اور معانی ومضامین اور قافیوں میں غوطہ مارنے کے لیے۔

پھر اللہ پاک نے ان کی دوسری صفت بیان فرمائی: ﴿ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ کیا، وہ کیا، حالاں کہ اس بات میں وہ جھوٹے ہیں۔ فنِ شعر کی وجہ سے انھوں نے یہ طریقہ اپنایا ہے، جس پر وہ چل رہے ہیں، لہٰذا کبھی تو اپنے کلام سے ایسے بھلائی کے کاموں کی ترغیب دیتے ہیں جو وہ خود نہیں کرتے اور کبھی برائی کے ایسے ایسے کاموں کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں، جن کے کرنے پر قادر نہیں ہیں جس طرح کہ تم اُن کے بہت سے شعروں میں پاتے ہو کہ جھوٹے جھوٹے دعوے کرتے ہیں اور خالص جھوٹ بولتے ہیں، جو ''قذفِ محصنات (پاک دامن عورتوں کو تہمت لگانا) کے زمرے میں آتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے ان کے ساتھ ایسا ایسا کیا، حالاں کہ وہ محض جھوٹ اور بہتان ہوتا ہے۔

پھر اللہ پاک نے مومن شعرائے صالحین کا استثناء کیا، جن کا زیادہ تر حال حق اور صداقت کا قصد ہے اور وہ کافر شاعروں کو جواب دیا کرتے تھے اور اُن کی ہجو کرتے اور نبی اکرم اور آپ ﷺ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے دفاع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ یعنی مگر وہ لوگ جو مومنین کے جتھے میں داخل ہوئے اور نیک اعمال کیے۔ ﴿ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ یعنی اپنے اشعار میں اللہ پاک کا بہت سا ذکر کیا اور اللہ کے ذکر سے شعر نے ان کو باز نہ رکھا، جیسے: ابن رواحہ، حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور کعب بن زہیر رضی اللہ عنہم۔

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٥٦)

﴿ وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ﴾ جیسے ان میں سے وہ شخص ہے، جو اس شخص کی ہجو کرے جس نے اس کی ہجو کی، یا کسی عالم یا فاضل کے لیے بدلہ لے، جس طرح کہ نبی اکرم ﷺ کے شعراء سے واقع ہوا کرتا تھا، کیوں کہ یہ لوگ اس شخص کی ہجو کرتے تھے، جو آپ ﷺ کی ہجو کرتا تھا اور آپ ﷺ کی طرف سے حمایت کرتے تھے اور آپ ﷺ کی آبرو کا دفاع کرتے تھے اور شعرائے مشرکین کا مقابلہ کرتے تھے۔ اس میں وہ شخص بھی داخل ہے جو اپنے شعر سے اہلِ سنت کے لیے بدلہ لیتا ہے اور اہلِ بدعت سے مقابلہ کرتا ہے اور اہلِ بدعت کے شاعر جو اپنی بدعت کی تعریف اور سنتِ مطہرہ کی ہجو کرتے ہیں، اس کو رد کرتا ہے جس طرح کہ شعرائے رافضہ اور اس طرح کے شعراء سے بہت کچھ واقع ہوتا ہے، اس لیے کہ حق کے لیے بدلہ لینا اور باطل کو رد کرنا اور اسے کھوٹا کہنا بڑا جہاد ہے اور اس کام کا کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ میں سے ہے جو اللہ دین کا بدلہ لینے والے ہیں اور جس شے کے ساتھ قائم ہونے کا اللہ پاک نے حکم دیا ہے، اس کے ساتھ قیام کرنے والے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ شعر کئی قسم کا ہوتا ہے، جس شعر میں کسی طرح کی خیر نہیں ہے تو وہ کبھی حرام کی قسم میں سے ہو جاتا ہے اور جس میں خیر ہے تو وہ کبھی واجب کی قسم میں سے ہو جاتا ہے۔ شعر کی مذمت اور اس کی کثرت کرنے کے بارے میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں، اسی طرح اس کے مباح اور جائز ہونے میں بھی حدیثیں آئی ہیں، اس کی تحقیق میں لمبا چوڑا کلام ہے، اس بارے میں کئی حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں، بعض یہ ہیں: دیلمی نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: وہ شعراء جو اسلام میں مرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو حکم کرے گا کہ وہ شعر کہیں، جن کو حورِ عین گائیں جنت میں اپنے خاوندوں کے لیے اور جو شعراء شرک میں مر گئے ہیں تو وہ آگ میں ویل اور ہلاکت کو پکارتے ہیں۔

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک شعر میں سے البتہ حکمت ہے۔ کہا: اور آپ ﷺ کے پاس قریظہ بن کعب، عبداللہ بن رواحہ اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم آئے۔ پھر عرض کی کہ ہم شعر کہتے ہیں اور یہ آیت نازل ہوئی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پڑھو۔ انھوں نے پڑھا: ﴿ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿224﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿225﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿226﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ تو فرمایا: تم وہی ہو ﴿ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ تو فرمایا: تم وہی ہو ﴿ وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ﴾ تو فرمایا: تم وہی ہو۔[1]

امام احمد اور ابن سعد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حسان رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے اور وہ مسجد میں شعر پڑھ رہے تھے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے گوشۂ چشم سے ان کی طرف دیکھا تو سیدنا حسان رضی اللہ عنہ نے اُن کی طرف نظر کی۔ پھر کہا کہ میں یقیناً اس میں پڑھا کرتا تھا اور اس میں وہ ہوتے تھے جو تجھ سے بہتر تھے، یعنی

[1] الدر المنثور (٦/ ٣٣٥)

رسول اللہ ﷺ، لہٰذا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ چپ ہو رہے۔ پھر سیدنا حسان رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف التفات کیا اور کہا: میں تجھے اللہ کی قسم دلاتا ہوں، کیا تو نے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: جواب دے میری طرف سے، الٰہی تائید کر اس کی روح القدس کے ساتھ؟ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں۔[1] ابن ابی شیبہ نے بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: شعر میں سے حکمت کی باتیں ہیں۔ امام ابن ابی شیبہ کے الفاظ بروایتِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ یہ ہیں: «إِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكَمًا وَمِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا»[2] یعنی بے شک شعر میں سے حکمت کی باتیں ہیں اور بیان سے سحر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض شعر حکمت ہوتا ہے اور بعض بیان مثل سحر کے اثر کرتا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « حُسْنُ الشِّعْرِ كَحُسْنِ الْكَلَامِ وَقَبِيحُ الشِّعْرِ كَقَبِيحِ الْكَلَامِ»[3] یعنی اچھا شعر اچھے کلام کی طرح ہے اور برا شعر برے کلام کی طرح ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: "رَوَاهُ إِسْمَاعِيلُ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَوْفٍ الشَّامِيِّ وَحَدِيثُهُ عَنْ أَهْلِ الشَّامِ صَحِيحٌ، فِيمَا قَالَ يَحْيٰى بْنُ مَعِينٍ وَغَيْرُهُ"[4] امام مسلم نے حدیث عمرو بن شرید عن ابیہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں رسول اللہ ﷺ کا ردیف (سواری پر آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا) ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: « هَلْ مَعَكَ مِنْ شِعْرِ أُمَيَّةَ بْنِ أَبِي الصَّلْتِ؟ » یعنی کیا تجھے امیہ بن ابی الصلت کے کچھ شعر یاد ہیں؟ میں نے عرض کی: ہاں! فرمایا: « هِيهِ » یعنی پڑھ۔ پھر میں نے آپ ﷺ کو ایک بیت پڑھ کر سنایا، پھر فرمایا: اَور۔ میں نے ایک اور بیت پڑھ کر سنایا۔ پھر فرمایا: اَور۔ یہاں تک کہ میں نے آپ کو سو بیت پڑھ کر سنائے۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ خود مسجد میں شعر پڑھتے اور دوسرے سے پڑھواتے۔ چنانچہ مروی ہے کہ انھوں نے عمرو بن ابی ربیعہ مخزومی کو بلایا۔ پھر اس سے ایک قصیدہ پڑھنے کو کہا تو اس نے وہ اُن کو پڑھ کر سنایا اور وہ تقریباً ستر بیت تھے۔ اس پر پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سارے قصیدے کو دہرایا، ایک ہی بار سننے سے انھوں نے اس کو یاد کر لیا تھا۔[6] امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً »[7] اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے کہ شعر ایک کلام ہے۔ چنانچہ اس میں سے بعض حسن ہے، یعنی اچھا ہے اور بعض اس میں سے قبیح ہے، یعنی برا ہے۔ پس حسن کو لے اور قبیح کو چھوڑ دے۔[8]

سید آزاد بلگرامی رحمہ اللہ کی ایک تقریرِ لطیف ان کی کتاب "تسلية الفوائد في قصائد آزاد" نام میں ہے۔ اگر تم اس سے مطلع ہونا چاہتے ہو تو اس کتاب کی طرف رجوع فرماؤ، عجیب منور اور دلچسپ کتاب ہے۔ کاتب الحروف ـ عفا الله عنه ـ نے مارے شوق کے خود اپنے قلم سے اس کو لکھا، اصلی قلمی نسخہ سیدنا ابو الوفا الصدیق رحمہ اللہ کے پاس تھا،

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٨٥) مسند أحمد (٥/ ٢٢٢)
[2] مصنف ابن أبي شيبة (٥/ ٢٧٢)
[3] سنن الدار قطني (٤/ ١٥٦)
[4] تفسير القرطبي (١٣/ ١٤٩)
[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٥٥)
[6] تفسير البغوي (٦/ ١٣٩)
[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٩٣)
[8] تفسير البغوي (٦/ ١٣٨)

ان سے عاریتاً لے کر نقل کیا، اب ان کے اخلاف باسعادت سلمھم اللہ تعالیٰ کے پاس موجود ہے۔ مدینہ طیبہ ۔علی صاحبھا الصلاۃ والتحیۃ۔ میں وارد ہونے کے وقت ”تسلیۃ الفوائد“ کا ایک نسخہ وہاں کے کتب خانہ میں دیکھا، معلوم ہوتا ہے کہ خود سید صاحب مرحوم نے تبرکاً وہاں رکھا ہو گا، کیونکہ اس میں مدحِ نبوی ﷺ کے قصیدے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے اس سورت مبارک کو ایک آیت پر ختم کیا جو ساری وعید کی جامع ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَسَيَعْلَمُ ﴾ اس میں تہدیدِ شدید اور عظیم دھمکی ہے۔ اسی طرح ﴿ الَّذِينَ ظَلَمُوا ﴾ کے اطلاق میں اور ﴿ أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ﴾ کے ابہام میں۔ بعض نے اس آیت کو شعراء کے ساتھ مخصوص کیا ہے، حالاں کہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیوں کہ اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہوتا ہے خصوصیتِ سبب کا نہیں۔

دیکھو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ آیت پڑھی، جبکہ ان کو اپنا ولیِ عہد کیا،[1] چناں چہ اس کا قصہ پہلے گزر چکا ہے اور سلفِ صالح باہم ایک دوسرے کو اس کے ساتھ وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ امام ابن عطاء رحمہ اللہ نے کہا: قریب ہے کہ جان لے گا ہم سے اعراض کرنے والا اس شے کو جو اس سے فوت ہوئی ہے۔[2] معنی یہ ہیں: ”يَنْقَلِبُونَ مُنْقَلَبًا أَيَّ مُنْقَلَبٍ“ مراد جہنم ہے، یعنی ”أَيَّ مُنْقَلَبٍ“ صفت ہے مصدر محذوف کی، اس کو پہلے اس لیے رکھا ہے کہ اس میں استفہام کے معنی شامل ہیں۔

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَيَعْلَمُ ﴾ اس میں عمل نہ کرے گا، اس لیے کہ استفہام میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا،[3] بلکہ وہ اس میں عمل کرنے سے معلق ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ کا یہ قول مردود ہے، اس لیے کہ جو ﴿ أَيَّ ﴾ صفت واقع ہوتا ہے، وہ استفہامیہ نہیں ہوتا، اسی طرح استفہامیہ صفت نہیں ہوتا۔ یہ دونوں دو قسمیں ہیں، ان میں سے ہر ایک علاحدہ قسم ہے۔

﴿ أَيَّ ﴾ کی بہت سی قسمیں ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس باب میں قول کی حقیقت یہ ہے کہ استفہام ایک معنی ہیں اور اس کا ماقبل ایک اور معنی ہیں۔ اگر ماقبل اس کا اس میں عمل کرے تو بعض معانی بعض میں داخل ہو جائیں۔ واللہ أعلم۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں: ”أَيَّ مَصِيرٍ يَصِيرُونَ وَأَيَّ مَرْجِعٍ يَرْجِعُونَ“ یعنی بری جائے بازگشت میں بازگشت کریں گے اور بری جائے رجوع میں رجوع کریں گے، کیوں کہ ان کی جائے بازگشت نار کی طرف ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے اور مرجع ان کا عذاب کی طرف ہے اور وہ بہت برا مرجع ہے۔

”منقلب“ اور ”مرجع“ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ”منقلب“ تو اس شے کی ضد کی طرف منتقل ہونا ہے جس میں وہ ہے اور مرجع اس حال سے لوٹنا ہے جس میں وہ ہے، اس حال کی طرف جس پر وہ تھا۔ چنانچہ ہر مرجع منقلب ہو گیا

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسير النسفي (٣/ ٢٠٢) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٠٢)

اور ہر منقلب مرجع نہیں ہے۔[1] (ذكره الماوردي)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن رحمہ اللہ نے "أَيَّ مُنْفَلَتٍ يَّنْفَلِتُوْنَ" پڑھا ہے یہ حرفِ فا بجائے قاف اور حرفِ تا بجائے بائے موحدہ، ماخوذ "انفلات" سے بنون وفا وفوقیہ۔ باقی قراء کی قراءت بقاف و بائے موحدہ ہے انقلاب سے بنون و قاف و موحدہ۔ پہلے کے معنی یہ ہیں کہ ظالم لوگ اللہ کے عذاب سے خلاصی پانے کا طمع کریں گے اور اس بات کا طمع کریں گے کہ اس سے جدا ہوں، حالاں کہ وہ اس پر قادر نہ ہوں گے۔[2]

الحمد للہ والمنۃ کہ تفسیر سورۃ الشعراء ۴/ جمادی الآخرۃ ۱۳۱۱ ہجری روز پنجشنبہ وقت نو ساعت شب جمعہ کو محلہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور اسی طرح اپنے فضل و کرم سے باقی سورتوں کی تفسیر لکھنے کی توفیق عطا کرے۔ ومولفه العبد الراجي رحمة ربه الباري ذوالفقار أحمد النقوي السهارنفوري غفر الله له ولوالديه وأحسن إليهما وإليه، وكذلك لسيدنا أبي الوفا الصديق صاحب ترجمان القرآن مغفرة ظاهرة وباطنة لا تغادر ذنبا آمين۔ رزقنا الله الحسنى وأذاقنا حلاوة رضوانه الأسنى آمين۔ والحمد لله أولا وآخراً وظاهراً وباطناً، والصلاة والسلام على خير الخلق وسيد المرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين، آمين. اللّٰهم أعنا على ذكرك و شكرك وحسن عبادتك. اللهم إنك عفو تحب العفو فاعف عنا، وأحسن عاقبتنا في الأمور كلها، وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة، واجعلنا من المقربين لديك والواصلين إليك وأغننا بفضلك عمن سواك، وانصرنا على أعدائنا من الخلق أجمعين. يا حي يا قيوم برحمتك أستغيث، أغثني يا مولائي وسيدي وأعذني من شر كلاب الدنيا وكلاب كلابها وأكلبها، وأكاليبها آمين آمين آمين فقط.

---

[1] تفسير القرطبي (۱۳/ ۱۵۲۔ ۱۵۳) [2] فتح القدير (٤/ ١٦٠۔ ١٦١) فتح البيان (۹/ ٤٢٦۔ ٤٣٣)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ النَّمْلِ

اس سورت کی ترانوے یا چورانوے یا پچانوے آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: یہ ساری سورت مکی ہے سب کے قول میں۔[1] ابن ضریس، نحاس، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ نے دلائل میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ سورۃ النمل مکے میں اتاری گئی۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اسی کے مثل ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا ہے۔[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾ هُدًى
وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ؕ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ
الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۵﴾ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

طٰسٓ ۚ یہ قرآن اور واضح کتاب کی آیات ہیں① (یہ) ہدایت اور بشارت ہے (ان) مومنوں کے لیے② جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں③ بلاشبہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال پرکشش بنا دیے ہیں، لہٰذا وہ بھٹکتے پھرتے ہیں④ وہی لوگ ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور آخرت میں بھی وہی زیادہ خسارے میں ہوں گے⑤ اور (اے نبی!) بلاشبہ آپ کو تو ایک کمال حکمت والے، خوب جاننے والے کی طرف سے یہ قرآن سکھایا جاتا ہے⑥

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٥٤) [2] الدر المنثور (٦/ ٣٤٠)

قرآنِ مجید سے ہدایت و بشارت صرف ایمان والوں ہی کو حاصل ہوتی ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سورت کے شروع میں جو حروفِ مقطعہ ہیں، ان پر کلام سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ ﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی یہ قرآن اور ظاہر واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ ﴿ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف سے ہدایت و بشارت اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جس نے یہ امور کیے، یعنی اس پر ایمان لایا، اس کی پیروی اور تصدیق کی، جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کیا، فرض نماز کو قائم کیا، فرض زکات ادا کی، دارِ آخرت اور بعثِ بعد موت اور اعمال کی جزا و سزا کا یقین کیا کہ بھلے اور برے عمل کی جزا ضرور ملے گی اور جنت اور دوزخ کا یقین کیا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴾ [حم السجدة: ٤٤] ''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔''

نیز فرمایا: ﴿ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴾ [مريم: ٩٧] ''تاکہ آپ اس سے متقین کو بشارت دیں اور اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو ڈرائیں۔'' اور اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی بے شک جو لوگ آخرت کو جھٹلاتے ہیں اور اس کے واقع ہونے کو بعید جانتے ہیں۔ ﴿ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ یعنی خوبصورت کر کے دکھائی ہم نے ان کو وہ شے جس میں وہ ہیں اور ہم نے ان کو ان کی گمراہی میں مدد کی، پس وہ اپنی گمراہی میں بہکے پھرتے ہیں۔ یہ دارِ آخرت کی تکذیب کا بدلہ ہے، جس کو انھوں نے جھٹلایا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١٠] ''اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔''

﴿ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْعَذَابِ ﴾ یعنی وہی لوگ ہیں جن کو دنیا اور آخرت میں بری طرح کی مار ہے۔ ﴿ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴾ یعنی اہلِ محشر میں سے کوئی ان کے سوا اپنی جانوں کا نقصان نہ کرے گا۔ ﴿ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴾ یعنی بے شک اے محمد! تو قرآن کو اس ذات کے پاس سے لیتا ہے، جو اپنے امر و نہی میں حکمت والا اور تمھارے چھوٹے بڑے اُمور کا علم رکھنے والا ہے۔ اس کی خبر بالکل سچی ہے اور اس کا حکم مکمل طور پر عدل ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ [الأنعام: ١١٥] ''اور آپ کے رب کی بات صدق اور عدل میں مکمل ہے۔''[1]

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٧٠)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: ﴿ طٰسٓ ﴾ سورت کے ابتدائی حروفِ مقطعات کے بارے میں مفصل کلام گزر چکا ہے۔ یہ حروف اگر سورت کا نام ہیں تو محل ان کا رفع ہے ابتدا کی بنا پر اور ان کا ما بعد خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہوں: "أَيْ: اِسْمُ هٰذِهِ السُّوْرَةِ طٰسٓ" یا "هٰذَا اسْمُ هٰذِهِ السُّوْرَةِ" یعنی یہ اس سورت کا نام ہے۔ اور اگر یہ حروف سورت کا نام نہیں ہیں، بلکہ تعدید کے طرز پر مسرود ہیں، یعنی ان کو شمار کرنے کے طور پر ان کو ذکر کیا ہے تو اس صورت میں اعراب سے ان کا کوئی محل نہیں ہے۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِهِ بِذٰلِكَ.

اللہ پاک ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی مراد کیا ہے۔

﴿ تِلْكَ ﴾ اس سورت کی ذات کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ اس کے نام کے ذکر کرنے کے ساتھ اس کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ اسمِ اشارہ مبتدا ہے، اس کی خبر ﴿ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ ﴾ ہے اور یہ جملہ مبتدائے اول کی خبر ہے۔ اس تقدیر پر کہ وہ ابتدا کے ساتھ مرفوع ہو۔ ﴿ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴾ جمہور نے اس کو زیر سے پڑھا ہے، اس بنا پر کہ قرآن پر عطف ہے، یعنی یہ سورت قرآن کی آیتیں ہیں اور ﴿ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴾ کی آیتیں ہیں۔ احتمال ہے کہ کتاب سے مراد قرآنِ مجید ہو، لہٰذا اس صورت میں ایک صفت کا دوسری صفت پر عطف ہوگا مع اتحاد مدلول کے۔

پھر اگر کوئی کہے کہ جب کتاب و قرآن کے ایک معنی ہوئے تو عطف کا کیا فائدہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ معطوف میں ایک صفت زائد تھی، معطوف علیہ کے مفہوم پر اس لیے اس اعتبار سے مفید ہو گیا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہو۔ تیسرا یہ ہے کہ خود یہی سورت مراد ہو۔ امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے "كِتَابٌ مُبِيْنٌ" پڑھا ہے، دونوں پر رفع کے ساتھ اس بنا پر کہ آیات پر معطوف ہے،[1] یعنی یہ سورت آیتیں ہیں قرآن کی اور کتابِ مبین ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس قراءت کی بنا پر مضاف محذوف کو مقدر مانا ہے اور مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام کیا ہے، یعنی وہ آیات کتابِ مبین۔

مطلب یہ ہے کہ جو اعراب مضاف کا تھا، وہی اعراب مضاف الیہ کو دیا، غرضیکہ آیات کے دو وصف بیان کیے: ایک تو قرآنیت ہے، یہ وصف اس بات پر دال ہے کہ وہ آیتیں پڑھی جاتی ہیں، مع اس اشارے کے کہ وہ قرآن عربی معجز ہیں۔ دوسرا وصف کتابیت ہے۔ یہ وصف اس پر دال ہے کہ وہ لکھی جاتی ہیں، مع اس اشارے کے کہ پہلی منزلہ کتب کی صفت کے ساتھ متصف ہیں۔ اس تقدیر پر صفت کا صفت پر عطف مع اتحاد مدلول کے باب سے نہ ہوگا۔ پھر ان دو وصفوں کے ساتھ ایک تیسرا وصف ملا دیا، وہ ان کے معانی کی وضاحت ہے، یعنی جو کوئی ان کو پڑھتا ہے اس

[1] فتح القدير (٤/ ١٦٦)

کے لیے اس کے معانی ظاہر و واضح ہیں۔ ﴿ مُبِيْنٍ ﴾ یا تو "أَبَانَ" بہ معنی "بَانَ" سے ہے، یعنی جس بلاغت پر یہ کتاب مشتمل ہے، اس کے سبب سے اس کا اعجاز ظاہر و واضح ہے۔ یا "أَبَانَ" متعدی سے ماخوذ ہے، یعنی یہ کتاب ان حکمتوں اور حکموں کو ظاہر کرنے والی ہے جو اس کی پیچیدگیوں میں ہیں اور آخرت کے احوال کو ظاہر کرنے والی ہے، جن میں سے ثواب و عقاب ہے، یا ہدایت و گمراہی کی راہ کو ظاہر کرنے والی ہے، یا حق و باطل اور حلال و حرام کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔

نکتہ:

اس جگہ قرآنیت کے وصف کو پہلے رکھا ہے اس لیے کہ قرآنیت (قراءت کرنا) لکھنے کی حالت سے پہلے ہے اور سورۃ الحجر میں اس کو بعد میں رکھا ہے، یوں فرمایا ہے: ﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الحجر: ١] "الٓرٰ، یہ آیات ہیں کتاب اور قرآنِ مبین کی۔" یہاں اس کی اس حالت کی طرف نظر کی ہے، جس پر وہ ہوگیا ہے، اس لیے کہ وہ مکتوب ہے اور کتابت قراءت کا سبب ہے۔ واللّٰہ أعلم.

رہی یہ بات کہ قرآن کو معرفہ ذکر کیا ہے اور کتاب کو نکرہ اس سورت میں، اور سورۃ الحجر میں کتاب کو معرفہ ذکر کیا اور قرآن شریف کو نکرہ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اندر معرفہ اور نکرہ ہونے کی صلاحیت ہے۔ اس لیے کہ قرآن و کتاب دونوں علم ہیں اس شے کے جس کو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے اور اس علم کا وصف ہیں، کیوں کہ وہ پڑھا جاتا ہے اور لکھا جاتا ہے۔ لہٰذا جس جگہ معرفہ کے لفظ سے آیا ہے تو وہ علم ہے اور جہاں نکرہ کے لفظ سے آیا ہے تو وہ وصف ہے۔ ﴿ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ موضعِ نصب میں ہے بنا برحال آیات سے یا کتاب سے، یعنی وہ آیتیں ہیں قرآن کی کہ ہدایت کرنے والی ہیں اور خوش خبری دینے والی ہیں، یا اس حالت میں کہ کتاب مومنوں کے لیے ہادی اور مبشر ہے۔

یا محلِ رفع میں ہے اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: هُوَ هُدًى وَّبُشْرَى"، یعنی وہ کتاب ہدایت دینے والی اور خوش خبری دینے والی ہے۔ یا ہدایت اور خوش خبری ہے اور دونوں ﴿ تِلْكَ ﴾ کی خبریں ہیں۔ یا دونوں فعل محذوف کے مفعول مطلق ہیں: "أَيْ: يَهْدِيْ هُدًى وَيُبَشِّرُ بُشْرَى" یعنی وہ کتاب ہدایت کرتی ہے صحیح ہدایت اور خوش خبری دیتی ہے اچھی طرح۔

پھر اللہ پاک نے ان مومنوں کا وصف بیان کیا، جن کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ﴾ یعنی وہ ایسے مومن ہیں کہ پانچوں نمازوں کو قائم رکھتے ہیں اور ان کی شرائط کو جو فرض اور سنت ہیں، ہمیشہ پورا کرتے ہیں اور ان کو ان کے طریقے پر ادا کرتے ہیں اور جب ان کے مالوں پر

زکات واجب ہوتی ہے تو اسے خوشی سے ادا کرتے ہیں۔ اسم (﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾) موصول محلِ جر میں ہے، اس بنا پر کہ "اَلْمُؤْمِنِيْنَ" مومنین کی صفت ہے۔ یا مدح کی بنا پر محلِ نصب میں ہے، یا بدل ہے، یا بیان ہے، یا اس بنا پر محلِ رفع میں ہے کہ مبتدائے مقدر کی خبر ہے، یعنی "هُمُ الَّذِيْنَ"۔ چوں کہ نماز کا قائم کرنا اور زکات کا دینا اس قسم سے ہے کہ اپنے اوقات میں متکرر و متجدد (بار بار) ہوتا رہتا ہے، اس لیے ان دونوں کو جملۂ فعلیہ پر ادا کیا جو تجدد پر دال ہوتا ہے۔ اور آخرت کا یقین کرنا چونکہ ایک امرِ ثابت تھا اور اس کا دوام مطلوب تھا اس لیے اس کو جملۂ اسمیہ کے پیرایہ میں ادا کیا جو دوام اور استمرار پر دال ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾۔ یہ جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی وہ نماز کو قائم رکھتے ہیں اور زکات دیتے ہیں، درآں حالیکہ وہ آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ استدلال سے اس کو جانتے ہیں۔ چوں کہ اس بات کا بتانا منظور ہے کہ اُن کو ہر وقت میں یقین مستقل رہتا ہے اور منقطع نہیں ہوتا، اس لیے خبر کو فعل مضارع میں ذکر کیا ہے۔ ﴿ هُمْ ﴾ کی ضمیر کو دو بار اس لیے ذکر کیا کہ اس کے اور خبر کے درمیان ﴿ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ سے فصل ہو گیا ہے، لہٰذا اس کو دوبارہ ذکر کر کے خبر سے متصل کر دیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مقصود حصر پر آگاہ کرنا ہے، یعنی آخرت کا کما حقہ یقین یہی لوگ کرتے ہیں جو ایمان اور عملِ صالح کے حامل ہیں، کیوں کہ عاقبت کا خوف ہی ان کو ان مشقتوں کو اٹھانے کا باعث ہوتا ہے اور اس بات کا بتانا منظور ہے کہ یہی لوگ یقین کی قوت اور ثبات میں یکتائے روزگار ہیں۔

پھر جب اللہ پاک نے اہلِ سعادت کا ذکر کیا تو ان کے بعد اہلِ شقاوت کا (بدبخت لوگوں کا) ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ ﴾ یعنی بے شک وہ لوگ جو آخرت کی تصدیق نہیں کرتے اور وہ کافر ہیں ہم نے ان کو اُن کے اعمال خوبصورت کر کے دکھائے ہیں۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کے برے اور قبیح اعمال کو ان کے لیے شہوات کو شامل کر کے مزین کر دیا، یہاں تک کہ وہ ان اعمال کو اچھا سمجھنے لگے۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کے اعمالِ حسنہ کو مزین کیا اور دنیا و آخرت کی جو بھلائیاں ہیں وہ ان کے لیے ذکر کر دیں، مگر انھوں نے اس کو قبول نہ کیا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اُن کے کفر پر یہ جزا کر دی کہ ہم نے ان کے لیے وہی شے مزین کر دی جس پر وہ ہیں،[1] اس طرح پر کہ اسے ہم نے ان کی طبیعت اور نفس کے لیے بہت پسندیدہ بنا دیا۔

﴿ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ پس وہ ان اعمال میں ہمیشہ متردد اور متحیر (حیران) رہتے ہیں، نہ ان کا صحیح طریقہ انھیں معلوم ہوتا ہے اور نہ اُن کی حقیقت واضح ہوتی ہے، اس لیے کہ حقیقت میں ان کی جو قباحت ہے، اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ يَعْمَهُوْنَ ﴾ کے معنی "يَتَمَادُّوْنَ" ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "يَلْعَبُوْنَ"

[1] معاني القرآن (٤/ ١٠٨)

امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے: "یَتَحَیَّرُوْنَ"[1] کسی نے کہا: ان پر دوام کرتے ہیں اور اُن میں منہمک ہوتے ہیں اور ڈٹے رہتے ہیں، یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ یہ مبتدا ہے، اس کی خبر ﴿ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴾ ہے، یعنی ان کے لیے سخت تر عذاب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دنیا میں عذاب ہے، جیسے: قتل وقید۔

دنیا کے عذاب کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ اس کے بعد کا یہ قول ہے: ﴿ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴾ یعنی یہی لوگ آخرت میں سخت خسارے اور نقصان میں ہوں گے اور اُن کی وجہ سے انھیں سخت قسم کی بدنصیبی اور نقصان ہو گا، چنانچہ مفضل علیہ خود انہیں کے نفوس ہیں، زمان اور مکان کے اختلاف کے اعتبار سے۔ پھر اس کے بعد جو اللہ پاک عجیب خبر کا ذکر فرمائے گا تو اس سے پہلے تمہید کے طور پر نفع بخش مقدمہ کا بیان کیا۔

لہٰذا نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے یہ ارشاد کیا: ﴿ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴾ یعنی بے شک آپ کو اللہ علیم وحکیم کی طرف سے قرآن سکھایا جاتا ہے شدت کے ساتھ، کیوں کہ اس میں سخت تکالیف ہیں۔ حکیم وعلیم دونوں کو جمع کیا، اس کے باوجود کہ علم حکمت میں شامل ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو علم حکمت میں داخل ہے وہ عملی علم ہے اور یہی علم عمل کی کیفیت سے متعلق ہے اور علم اس علم سے عام تر ہے۔

پس گویا یوں کہا گیا کہ وہ اپنے افعال میں مصیب ہے، یعنی صحیح ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے علم کے مطابق کرتا ہے اور ہر شئے کو خوب جانتا ہے، خواہ وہ علم عمل کی طرف لے جانے والا ہو یا نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن شریف نبی اکرم ﷺ پر بڑی پختگی اور اہتمام سے القا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ لیتے ہیں اور سیکھتے ہیں۔ اور وہ ایسی ذات پاک سے القا کیا جاتا ہے جو بڑا دانا اور حکمت والا ہے اور اس کا ہر کام علم وحکمت سے ہے۔ اس کی ساری خبریں ٹھیک ہیں، ان کو شک وشبہے کی ہوا تک نہیں لگی۔

کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ "لَدُنْ"، "عِنْدَ" کے معنی میں ہے۔ ("عند" اور "لَدَی" میں فرق یہ ہے کہ "عِنْدَ" ظرف اعیان ومعانی کا ہوتا ہے جب کہ "لَدَی" میں یہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ "عِنْدِيْ مَالٌ" کہہ سکتے ہیں، اگرچہ مال غائب ہو اور "لَدَيَّ مَالٌ" اسی وقت کہیں گے جب مال حاضر ہو۔) "لَدُنْ" میں کئی لغت ہیں۔ سورۃ الکہف میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ غرضیکہ یہ آیت ان قصوں کی تمہید ہے، جو بعد میں بیان ہوں گے اور اُن میں اللہ تعالیٰ کے لطائفِ حکمت اور دقائقِ علم کا بیان ہو گا۔ اس سورت مبارکہ میں پانچ قصے مذکور ہیں: پہلا قصہ موسیٰ علیہ السلام کا، دوسرا قصہ نملہ (چیونٹی) کا، تیسرا قصہ بلقیس کا، چوتھا صالح علیہ السلام کا اور پانچواں لوط علیہ السلام کا۔[2]

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٥٥) [2] فتح البيان (١٠/ ٩۔ ١١)

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝۷ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۸ یٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۹ وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۰ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۱ وَ اَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝۱۲ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۱۳ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۱۴

(وہ وقت یاد کریں) جب موسیٰ نے اپنی اہلیہ سے کہا: بے شک میں نے آگ دیکھی ہے، میں ابھی تمھارے پاس وہاں سے کوئی خبر یا سلگتا انگارا لاؤں گا، تاکہ تم تاپو ⑦ چناں چہ جب موسیٰ اس (آگ) کے پاس پہنچا تو اسے آواز دی گئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ (نور) میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے، اور اللہ رب العالمین پاک ہے ⑧ اے موسیٰ! بلاشبہ وہ میں ہی اللہ ہوں، نہایت غالب، خوب حکمت والا ⑨ اور اپنا عصا ڈال دے، چناں چہ جب (موسیٰ نے عصا ڈالا اور) اسے دیکھا کہ وہ حرکت کر رہا ہے، گویا کہ وہ سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر پلٹا اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، (اللہ نے فرمایا:) اے موسیٰ! مت ڈر، بلاشبہ میرے حضور میں رسول ڈرا نہیں کرتے ⑩ مگر جس نے ظلم کیا، پھر اس نے برائی کے بعد (برے اعمال کو) بدل کر نیکی کی، تو بلاشبہ میں بڑا بخشن ہار، نہایت مہربان ہوں ⑪ اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کر، وہ سفید (چمکتا ہوا) بے عیب نکلے گا، یہ ان نو نشانیوں (معجزات) میں سے ہے (جن کے ساتھ تمھیں) فرعون اور اس کی قوم کی طرف (بھیجا گیا ہے۔) بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں ⑫

پھر جب ان کے پاس ہمارے واضح روشن معجزات پہنچے تو انھوں نے کہا: یہ تو کھلا جادو ہے (13) اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، جب کہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔ پھر دیکھیے فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟ (14)

قصہ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون لعین کا انجام بد:

آگ کے اندر اور آس پاس فرشتے مقرب تھے آگ نہ تھی۔ ان کا نور تھا اور آواز اللہ تعالیٰ نے غیب سے دی۔ لاٹھی پہلے پہلے تو پتلی سی جاندار بن گئی تھی، جب فرعون کے آگے ڈالی تو بڑی ہو کر ناگ بن گئی۔ معاف کرنے کا جو ذکر کیا تو وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے چوک کر ایک کافر کا خون ہو گیا تھا، ان کے دل میں اس کا ڈر تھا، ان کو وہ معاف کر دیا۔ سورت اعراف میں سات نشانیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت یاد دلاتا ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کو برگزیدہ کیا اور ان سے کلام کیا اور سرگوشی کی اور ان کو ظاہر باہر اور عظیم نشانیاں دیں اور اُن کو زبردست اور غالب دلیلیں عطا فرمائیں اور فرعون اور اس کی قوم کی طرف ان کو رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے ان نشانیوں کا انکار کیا اور کفر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی اتباع اور فرماں برداری سے تکبر کیا۔

ارشاد فرمایا: ﴿ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ ﴾ یعنی اے محمد! تو یاد کر جب موسیٰ علیہ السلام اپنے گھر والوں کو لے کر چلا تو راستہ بھول گیا۔ یہ چلنا رات کے وقت اندھیرے میں تھا، چنانچہ طور کی طرف ایک روشن آگ دیکھی کہ دہک رہی ہے اور روشن ہو رہی ہے تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے ایک آگ دیکھی ہے، میں ابھی تمھارے پاس اس سے کچھ خبر راستے کی لاتا ہوں، یا اس میں سے کوئی انگارا لے کر آتا ہوں۔

﴿ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴾ "أَيْ تَتَدَفَّعُوْنَ بِهٖ" یعنی شاید تم اس سے گرمی حاصل کرو، اسے تاپو۔ انھوں نے جیسا کہا تھا، ویسا ہی ہوا، کیوں کہ وہ اس سے ایک بڑی خبر لے کر پھرے، وہ خبر ایک بڑے نور کی تھی، جس سے وہ نور حاصل کر کے آئے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ یعنی پھر جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے تو ایک عظیم اور عجیب منظر دیکھا۔ جب اس آگ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ آگ ایک سبز درخت میں روشن ہو رہی ہے۔ ادھر تو آگ کی روشنی پر روشنی بڑھتی جاتی ہے، ادھر درخت کی سبزی اور تازگی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ پھر اپنا سر اٹھایا تو دیکھا کہ اس کا نور آسمان کے بادل کے ساتھ متصل ہے۔

(اصل روایت میں الفاظ "متصل بعنان السماء" ہے، "عَنَانٌ" بفتح عین بادل کے معنی میں ہے۔ "عَنَانَةٌ" کی جمع ہے۔ کسی نے کہا: "عَنَانٌ" وہ شے ہے جو تجھے ظاہر ہوتی ہے، جب تو آسمان کی طرف سر اٹھاتا ہے۔ حدیث

کی بعض روایات میں "أَعْنَانٌ" ہے، یعنی آسمان کے اطراف اور کنارے۔) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ آگ نہ تھی، وہ تو ایک نور روشن ہو رہا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ وہ نور رب العالمین کا تھا، موسیٰ علیہ السلام اس حال کو دیکھ کر تعجب کرتے ہوئے ٹھہر گئے، پھر ان کو آواز دی گئی: ﴿ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ وہ بہت مقدس ہے۔ ﴿ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ "اور وہ جو آگ کے اردگرد ہے۔" یعنی فرشتوں میں سے جو وہاں موجود ہے۔[1] (قاله ابن عباس و عكرمة و سعيد بن جبير و الحسن و قتادة)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ سوتا نہیں ہے اور نہ اس کو لائق ہے کہ سوئے۔ اللہ پاک میزان کو نیچے کرتا ہے اور اونچا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے اعمال جو اس کی طرف چڑھتے ہیں اور اُن کے رزق جو اس کے پاس سے اترتے ہیں، ان کی ترازو کو نیچے کرتا ہے اور اونچی کرتا ہے، جس طرح کوئی تولنے والا تولتے وقت اپنے ہاتھ کو نیچا اور اونچا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس شے کو مقدر فرماتا ہے اور نازل کرتا ہے، یہ اس کی مثال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "قسط" سے مراد رزق کا حصہ ہے، جو ہر مخلوق کا نصیب ہے اور "خفض" سے مراد اس کی قلت ہے، یعنی اس کو کم کرنا اور رفع سے مراد اس کو زیادہ کرنا ہے۔ واللہ أعلم.

اس کی طرف رات کا عمل دن سے پہلے چڑھایا جاتا ہے اور دن کا عمل رات سے پہلے۔ مسعودی رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کہا ہے کہ اس کا پردہ نور ہے یا نار ہے، اگر وہ اس کو اٹھا لے تو اس کے چہرے کی سبحات ہر اس شے کو جلا ڈالیں، جہاں تک اس کی آنکھ پہنچے۔ "سُبُحَات"، بضمِ سینِ مہملہ و بائے موحدہ بہ معنی انوار ہے اور "وجہ" سے مراد ذات پاک ہے۔ "مَا انْتَهَى إِلَيْهِ بَصَرُهُ" سے مراد ساری مخلوق ہے، کیوں کہ اس کی آنکھ نے سب کو گھیرا ہوا ہے۔ اس حدیث کے معنی میں کئی قول ہیں۔

سب سے قریب معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ پاک نور یا نار کے پردے کو، جو بندوں کے اور اس کے درمیان ہے، اٹھا دے تو اس کی ذات پاک کے انوار اس کا جلال اور عظمت ساری مخلوق کو جلا ڈالے، کیوں کہ اس عالم میں، یعنی دنیا میں مخلوق کی ترکیب یا پیدایش اس طرح کی گئی ہے کہ وہ اس کے دیدار کو برداشت نہیں کر سکتا۔ واللہ أعلم۔ پھر امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے، جو سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، یہ آیت پڑھی: ﴿ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾[2] (وأصل الحديث مخرج في صحيح مسلم من حديث عمرو بن مرة)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی پاک ہے ذات اللہ کی جو سارے جہان کا پروردگار ہے، جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے، اس کی مخلوق میں سے کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی شے اس کی مصنوعات میں سے اس کا احاطہ کر سکتی ہے اور وہ ساری مخلوقات سے برتر اور عظیم ہے، مباین ہے، نہ اس کو زمین گھیر سکتی ہے نہ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٩/ ٢٨٤٥ـ ٢٨٤٧) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٩) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٤٤ـ ٢٨٤٥)

آسمان، بلکہ وہ تو اللہ احد وصمد ہے، یعنی اکیلا ہے۔ کسی فانی چیز کے مثل اور مشابہ ہونے سے منزہ ومبرا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ ان کو یہ بات بتائی کہ جو کوئی اس سے خطاب کر رہا ہے اور مناجات کر رہا ہے، وہ اس کا رب اللہ ہے، جو عزیز ہے، ہر شے پر قاہر اور غالب ہے۔ ہر شے اس کی مقہور ومغلوب ہے۔ وہ اپنے اقوال اور افعال میں حکمت والا ہے۔

پھر اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے عصا کو ڈال دیں، تاکہ ان کے لیے ایک واضح دلیل ظاہر کر دے اس بات پر کہ ہر کام کو کرنے والا، اس کا اختیار رکھنے والا اور اس کی قدرت رکھنے والا وہی ہے۔ پھر جب وہ عصا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے ڈال دیا تو اسی وقت ایک بڑا ہولناک سانپ بن گیا اور باوجود اتنا بڑا ہونے کے بہت ہی تیز حرکت کرنے والا بن گیا۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ ﴾ سانپوں کی قسموں میں سے "جانٌّ" ایک قسم کا سانپ ہے، جو سب سے زیادہ تیز حرکت والا اور انتہائی مضطرب اور بے قرار ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں گھروں میں رہنے والے سانپوں کو مارنے کی ممانعت آئی ہے۔[1] (کسی حدیث میں ہے کہ زمزم میں جنان بہت زیادہ ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کو پاک کرنے کے لیے ان کے قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ پھر آخر میں قتل کی ممانعت فرمائی، اس لیے کہ اس میں زہر نہیں ہے۔[2] كذا في مجمع البحار)

"جِنَانٌ" بکسرِ جیم وتشدیدِ نون ﴿ جَآنٌّ ﴾ کی جمع ہے۔ ﴿ جَآنٌّ ﴾ باریک اور ہلکے سانپ کو کہتے ہیں، یہ سفید رنگ کا لمبا سانپ ہوتا ہے، اس میں زہر نہیں ہوتا اور نہ ضرر پہنچاتا ہے، اس قسم کے سانپ گھروں میں رہا کرتے ہیں۔ ہندی میں اس کو سیتا کی لِٹ کہتے ہیں۔ غرضیکہ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے اس کو دیکھا تو ﴿ وَلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ﴾ یعنی پھر گیا پیٹھ پھیر کر اور التفات نہ کیا، یعنی مارے خوف کی شدت کے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ یعنی اے موسیٰ! تو اس شے سے مت ڈر جس کو تو دیکھتا ہے، بے شک میں ارادہ کرتا ہوں کہ تجھے برگزیدہ کروں رسول بنا کر اور تجھے جلیل القدر نبی بناؤں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یہ استثنائے منقطع ہے۔ اس میں بشر کے لیے ایک عظیم بشارت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص برے عمل پر ہو، پھر اس سے باز آ جائے اور رجوع کرے اور توبہ وانابت کرے تو بے شک اللہ پاک اس پر رجوع ہوتا ہے، یعنی اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ [طٰهٰ: ٨٢] "اور بے شک میں بہت بخشنے والا ہوں اس کے لیے جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر ہدایت پر رہے۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ١١٠] "اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٣٥) [2] مجمع بحار الأنوار (١/ ٤٠٢)

جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا پائے گا۔'' اس بارے میں بہت سی آیتیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾ یہ دوسری نشانی ہے اور اللہ پاک کی قدرتِ تامہ پر ایک ظاہر اور کھلی ہوئی دلیل ہے، جو ہر کام کرنے کا مکمل اختیار رکھتا ہے اور یہ اس شخص کے صدق اور راستی پر بھی دلیل ہے جس کے واسطے اسے معجزہ ٹھہرایا گیا۔ اللہ پاک نے ان کو حکم دیا کہ اپنا ہاتھ اپنے کرتے کی جیب میں داخل کریں۔ پھر جب انھوں نے اس کو داخل کیا اور نکالا تو وہ سفید چمکتا ہوا نکلا، گویا وہ چاند کا ایک ٹکڑا ہے اس میں چمک تھی اور وہ بجلی کی طرح چمکتا تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ یعنی نو نشانیوں میں سے یہ دو نشانیاں ہیں، جن کے ساتھ تیری تائید کروں گا اور ان کو تیرے لیے برہان ٹھہراؤں گا۔ یہ وہی نو نشانیاں ہیں جن کے بارے میں اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ﴾[بني إسرائيل: ١٠١] ''اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دیں۔'' چنانچہ اس کی تقریر اسی آیت کے تحت گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی پھر جب ان کے پاس ہماری نشانیاں آئیں درآنحالیکہ وہ واضح اور ظاہر اور بین تھیں تو بولے کہ یہ تو کھلا جادو ہے اور اپنے جادو سے ان کے مقابلے کا ارادہ کیا تو وہ مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر لوٹے۔ ﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا ﴾ یعنی ظاہری طور پر ان کا انکار کیا۔ ﴿ وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ﴾ اور اپنے جی میں جان لیا کہ وہ اللہ کے پاس سے حق ہیں، لیکن جان بوجھ کر ان کا انکار کیا اور اُن سے عناد برتا اور مقابلہ کیا۔ ﴿ ظُلْمًا ﴾ "أَيْ: مِنْ أَنْفُسِهِمْ سَجِيَّةً مَّلْعُوْنَةً وَعُلُوًّا" یعنی حق کی پیروی کرنے سے تکبر کر کے ان کا انکار کیا، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ یعنی اے نبی! تو دیکھ کہ اس بات میں ان کا انجام کار کیا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر ڈالا اور ایک صبح ان سب کے سب کو ڈبو دیا۔

آیت میں خطاب کا مضمون یہ کہہ رہا ہے کہ اے محمد رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والو اور اس شے کا انکار کرنے والو جس کو وہ اپنے رب کی طرف سے لے کر آئے ہیں! تم اس بات سے ڈرو کہ کہیں وہ عذاب تمھیں بھی بطریقِ اولیٰ واحریٰ نہ پہنچے، جو عذاب فرعون والوں کو پہنچا، کیوں کہ محمد ﷺ موسیٰ علیہ السلام سے اشرف واعظم ہیں اور اُن کی برہان زیادہ مدلل اور مضبوط ہے ان کے برہان سے، مع ان دلائل کے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائے ہیں اور وہ ان کی ذات اور شمائل میں موجود ہیں، اور پہلے انبیاء نے ان کے بارے میں جو بشارتیں دی تھیں وہ ان کے حق میں سابق ہو چکی ہیں، اور ان کے لیے عہد و پیمان اور پکے وعدے لیے گئے ہیں۔ عليه من ربه أفضل الصلاة و التسليم.[1]

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٧١۔ ٤٧٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان واضح یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ ظرف ہے، فعلِ مضمر سے منصوب ہے، وہ فعلِ مضمر "اُذْکُرْ" ہے۔
امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: محلِ ﴿ اِذْ ﴾ نصب ہے، معنی یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذکر کر جس وقت اس نے اپنے اہل سے کہا۔[1] اہل سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی بی بی ہیں۔ یہ قصہ اس وقت کا ہے جب وہ اپنی بی بی کو لے کر مدین سے مصر کی طرف چلے، اس سفر میں اُن کے ہمراہ صرف ان کی بی بی تھی جو شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھی۔ ان کے لیے اہل کا لفظ، جو کثرت پر دال ہے، تعظیم کے لیے کہا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے ہمراہ ان کا لڑکا اور خادم بھی تھا، اسی لیے لفظِ اہل کہا، اسی کے مثل ﴿ اُمْكُثُوْٓا ﴾ [القصص: ۲۹] ہے۔ اس سفر کا باعث یہ تھا کہ مصر میں اپنی ماں اور بھائی سے ملاقات کریں۔

جس رات کا یہ قصہ ہے وہ رات تاریک اور سرد تھی، برف پڑ رہی تھی اور راستہ بھول گئے تھے اور ان کی بی بی کو دردِ زہ تھا۔ غرضیکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اہل سے کہا: ﴿ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ﴾ یعنی بے شک میں نے آگ دیکھی ہے دور سے۔ چوں کہ راہ بھول گئے تھے، اس لیے یوں کہا: تم تو یہاں ٹھہرو: ﴿ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ ﴾ میں اب تمھارے پاس اس سے راستے کی کوئی خبر لاتا ہوں، یعنی راستہ معلوم کر کے آتا ہوں۔ ﴿ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ ﴾ یا تمھارے پاس کوئی انگارا سلگا کر لاتا ہوں۔ اگر کوئی کہے کہ سین تسویف کے لیے ہے اور تسویف تاخیر میں ڈالنے کو کہتے ہیں، حالاں کہ مقام کے لحاظ سے تاخیر مناسب نہیں ہے، کیوں کہ سرد رات میں باوجود تنہائی کے اہل سے جدا ہونا قابلِ تاخیر نہیں ہے؟ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو آنے کی تاخیر کا کہا تو اس سے ان کی غرض لمبے فاصلے سے آگاہ کرنا ہے، اگر اس مسافت کی دوری سے آگاہ نہ کرتے تو اُن کی بی بی کو شبہے سے خلجان ہوتا، اگر ان کے واپس آنے میں دیر ہوتی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ سین یہاں تسویف کے لیے نہیں ہے، بلکہ آنے کے وعدے کی تاکید کے لیے ہے قطع نظر دیر اور جلدی کے۔ اگر یہ بات صحیح ہو جائے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ صرف ان کی بی بی تھیں تو ان کو جمع کا خطاب اس لیے کیا ہے کہ اول اس سے کنایہ کیا ہے اہل کے لفظ کے ساتھ، جو کثرت پر دال ہے، یا تعظیم کے لیے ہے تسلی دینے میں مبالغے کی خاطر۔ عاصم، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے بہ تنوینِ "شِهَابٍ" پڑھا ہے۔[2] باقی قراء کی قراءت باضافتِ شہاب ہے ﴿ قَبَسٍ ﴾ کی طرف۔ پہلے کی بنا پر ﴿ قَبَسٍ ﴾ "شِهَابٍ" سے بدل ہوگا، یا اس کی صفت ہوگا، اس لیے کہ ﴿ قَبَسٍ ﴾ بہ معنی "مَقْبُوْسٌ" ہے۔ دوسرے کی بنا پر اضافت بیانی ہو گی اور معنی دونوں کی بنیاد پر یہ ہیں: "آتِيْكُمْ بِشُعْلَةِ نَارٍ مَقْبُوْسَةٍ، أَيْ: مَأْخُوْذَةٍ مِنْ أَصْلِهَا" یعنی میں تمھارے پاس آگ کا شعلہ لے آؤں، ایسا

---

[1] معاني القرآن (٤/ ١٠٨) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ١٥٦)

شعلہ جو اس کی اصل سے لیا گیا ہوگا اور فتیلے کے سر میں ہوگا یا لکڑی میں۔ اضافت بیانی کا فائدہ یہ ہے کہ مراد مقصود کو معین کرنا ہے۔ مقصود ﴿ قَبَسٍ ﴾ ہے، جو دو فائدے رکھتا ہے: ایک تو روشنی اور دوسرا تاپنا، کیوں کہ آگ کی ایک قسم وہ ہے جو قبس نہیں ہوتی جیسے انگارا۔

موسیٰ علیہ السلام نے جو دو وعدے کیے، وہ ظن کے طریق سے ہیں، چناں چہ سورت طٰہٰ میں جو بہ صیغۂ ترجی فرمایا ہے، اس سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ کلمۂ ﴿ أَوْ ﴾ جو تردید کے لیے ہے، اس سے غرض اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ اگر دونوں مقصد حاصل نہ ہوئے تو ایک تو ضرور ہی حاصل ہوگا، کیوں کہ ظاہری معاملے میں ایسا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عادت بھی یہی ہے کہ وہ اپنے بندوں پر دو حرمان (نا اُمیدی) جمع نہیں کرتا۔ یہ امام ابو السعود رحمہ اللہ کے قول کا حاصل ہے۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے شہاب کو بہ تنوین پڑھا ہے تو اس نے ﴿ قَبَسٍ ﴾ کو "شِهَابٍ" کی صفت ٹھہرایا ہے۔[2] چنانچہ پہلے گزر چکا ہے اور اضافت کی قراءت میں فراء نے کہا ہے کہ یہ اضافت مثل "مَسْجِدُ الْجَامِعِ" اور "صَلَاةُ الْأُولٰى" کے ہے، شے کو اپنی ذات کی طرف مضاف کیا ہے اختلافِ اسماء کے سبب سے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اضافت نوع کی جنس کی طرف ہے، جیسے: "ثَوْبُ خَزٍّ" اور "خَاتَمُ حَدِيْدٍ" ہے اور یہ اضافت بہ معنی "مِنْ" کے ہے، یعنی "شِهَابٌ مِّنْ قَبَسٍ"۔ کہا: اور غیر قرآن شریف میں "بِشِهَابٍ قَبَسًا" بولنا جائز ہے۔ اس بنا پر کہ مصدر ہو یا بیان ہو یا حال ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر سفید نور والی شے "شِهَابٌ" ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: شہاب آگ ہے۔ ثعلب نے کہا: شہاب کی اصل ایک لکڑی ہے کہ اس کے ایک طرف انگارا ہے اور دوسری طرف آگ نہیں ہے، اور شہاب روشن شعاع کو کہتے ہیں اور ستارے کو بھی شہاب بولتے ہیں۔[3]

صراح میں کہا ہے کہ "شہاب": بالکسر درخشِ آتش، و "قبس": بالتحریک پارۂ آتش، و اقتباس: آتش گرفتن۔

﴿ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴾ "لعل" واسطے ترجی (اُمید رکھنا) کے ہے، یا "كَيْ" کے معنی میں ہے، یعنی اس بات کی اُمید کے لیے کہ تم گرمی حاصل کرو سردی سے، یا تاکہ تم اس سے تاپو۔ جب کوئی شخص آگ سے گرمی حاصل کرتا ہے، تاپتا ہے تو عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: "صَلَى بِالنَّارِ وَاصْطَلٰى بِهَا" اور "صِلَا" بڑی آگ کو کہتے ہیں۔

نکتہ:

یہاں تو ﴿ سَاٰتِيْكُمْ ﴾ فرمایا اور سورۃ القصص میں ﴿ لَعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ ﴾ [طٰہٰ: ۱۰] "شاید میں اس میں سے تمھارے لیے کوئی انگارا لے آؤں۔" اس کے باوجود کہ پہلا یقین ہے اور دوسرا اُمید ہے؟ تو ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، اس لیے کہ جس وقت اُمید رکھنے والے کی اُمید قوی ہو جاتی ہے تو وہ یوں کہہ دیتا ہے: "سَأَفْعَلُ كَذَا"، "وَسَيَكُوْنُ كَذَا"، یعنی میں اب ایسا کرتا ہوں اور اب ایسا ہوتا ہے، اس کے باوجود نا اُمیدی کو بھی جائز رکھتا ہے۔

---

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٧٣) [2] معاني القرآن (٤/ ١٠٨) [3] فتح القدير (٤/ ١٦٧)

مسئلہ:

اس سورت میں اور سورۃ القصص میں الفاظ مختلف ہیں اور قصہ ایک ہے تو اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث کا بالمعنیٰ نقل کرنا جائز ہے، اور اسی طرح نکاح بغیر "تزوج" کا لفظ کہے ہوئے بھی جائز ہے۔[1] كذا قال الإمام النسفي.

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوۡدِیَ اَنۡۢ بُوۡرِكَ مَنۡ فِی النَّارِ وَمَنۡ حَوۡلَهَا ﴾ یعنی پھر جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے جس کو دور سے دیکھا تھا تو ان کو طور کی جانب سے آواز دی گئی کہ برکت دیا گیا وہ شخص جو آگ میں ہے اور وہ شخص جو اس کے آس پاس ہے۔ کلمۂ ﴿ اَنۡ ﴾ مفسرہ ہے، اس لیے کہ ندا میں قول کے معنی ہیں۔ یا مصدریہ ہے: "أَيْ: بِأَنْ بُورِكَ"۔ اول کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ ان سے یہ کہا گیا کہ "بُورِكَ"۔ ثانی کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ ندا کی گئی اس شخص کی برکت کے ساتھ جو آگ میں ہے، یعنی اللہ برکت دے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کو اس بات کے ساتھ ندا کی کہ ہم نے تجھ کو مقدس اور پاک کیا، یعنی اللہ کے سوا جو شے تیرے دل کو مشغول کرتی تھی اس سے ہم نے تیرے دل کو پاک صاف کر دیا اور تجھے نبوت اور رسالت کے لیے پسند کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَنۡ ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے۔ تقدیر یہ ہے کہ "بِأَنَّهُ بُورِكَ" اس کا اسم ضمیرِ شان ہے اور "بُورِكَ" اس کی خبر ہے۔ یہ بغیر عوض کے جائز ہوا۔ اگرچہ زمخشری رحمہ اللہ نے اس کو منع کیا ہے، اس لیے کہ "بورك" دعا ہے اور دعا اپنے غیر کی مخالف ہوتی ہے بہت سے احکام میں۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں فاصل کی حاجت نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَنۡ ﴾ موضعِ نصب میں ہے: "أَيْ: بِأَنْ" یعنی بہ نزعِ خافض۔ کہا: اور یہ بھی جائز ہے کہ موضعِ رفع میں ہو، اس بنا پر کہ ﴿ نُوۡدِیَ ﴾ کا نائب فاعل ٹھہرے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ﴿ نُوۡدِیَ ﴾ کا نائب فاعل ضمیر ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔

سیدنا ابی بن کعب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے "بُورِكَتِ النَّارُ" پڑھا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ امام کسائی رحمہ اللہ نے عرب سے نقل کیا ہے: "بَارَكَكَ اللّٰهُ وَبَارَكَ فِيكَ وَعَلَيْكَ وَلَكَ"۔ اسی طرح امام فراء رحمہ اللہ نے بھی حکایت کیا ہے۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بُوۡرِكَ مَنۡ فِی النَّارِ ﴾ فرمایا اور "بُورِكَ عَلَى مَنْ فِي النَّارِ" نہ کہا؟ تو یہ اس شخص کی لغت پر ہے جو "بَارَكَكَ" کہتا ہے۔[3] معنی یہ ہیں کہ وہ شخص برکت دیا گیا اور مقدس و مطہر کیا گیا جو نار میں ہے، وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یا اس شخص پر برکت دی گئی جو نار کے قرب میں ہے نہ یہ کہ وہ اس کے وسط میں ہے، کیوں کہ وہ حقیقتاً اس کے اندر نہ تھے، بلکہ اس کے قریب کی جگہ میں تھے۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے اللہ پاک کی طرف سے تحفۂ تعظیم و تکریم ہے، یعنی خوش آمدید ہے، جس طرح کہ ابراہیم کے پاس

[1] تفسير النسفي (٣/ ٢٠٤) [2] فتح القدير (٤/ ١٦٧۔ ١٦٨) [3] تفسير الطبري (١٩/ ٤٢٩)

جب فرشتے داخل ہوئے تو انھیں تحیت پیش کی گئی اور فرشتوں نے اس طرح کہا: ﴿ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾[1] (قاله القرطبي)

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نار میں فرشتے تھے[2] اور اس جگہ نار مجرد نور ہے، لیکن موسیٰ علیہ السلام نے گمان کیا کہ وہ نار ہے۔ پھر جب اس کے پاس پہنچے تو اسے نور پایا۔ حسن اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ سے مروی ہے کہ ﴿ مَنْ فِي النَّارِ ﴾ سے مراد اللہ پاک ہے، یعنی اللہ کا نور، یا اس کی قدرت اور سلطنت۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک کے حکم سے وہ شے جو آگ میں ہے، اس کو برکت دی گئی۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کا مذہب یہ ہے کہ اس جگہ نار سے مراد نور ہے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: یعنی درخت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا نور تھا اور ﴿ مَنْ حَوْلَهَا ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نور میں تھا، نور سے ندا کی گئی۔ ﴿ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ ان کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ ان کو اللہ نے پکارا اور وہ نور میں تھا۔[4] امام فریابی، عبد بن حمید اور ابن منذر رحمہم اللہ نے ان سے روایت کیا ہے، فرمایا: ”بُوْرِكَتِ النَّارُ“۔ امام عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اس طرح ہے: ”بُوْرِكَتِ النَّارُ وَمَنْ حَوْلَهَا، أَمَّا النَّارُ فَيَزْعُمُوْنَ أَنَّهَا نُوْرُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ“ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ بُوْرِكَ ﴾ کی تفسیر ”قُدِّسَ“ سے روایت کی ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَنْ ﴾ سے مراد غیر عقلاء ہے اور وہ نور ہے اور وہ جگہ جو اس کے آس پاس تھی۔

امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ”بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ“ کی تفسیر میں مروی ہے، یعنی ”قُدِّسَ مَنْ فِي النَّارِ وَهُوَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ، عَنَى بِهِ نَفْسَهُ“ یعنی مراد خود اللہ پاک ہے، اس معنی کی بنا پر کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا اور اس کی جانب سے ان کو سنایا۔ چنانچہ مروی ہے کہ تورات شریف میں یوں لکھا ہوا ہے: ”جَاءَ اللّٰهُ مِنْ سَيْنَاءَ وَأَشْرَفَ مِنْ سَاعِيْنَ وَاسْتَعْلَى مِنْ جِبَالِ فَارَانَ“ سینا سے اللہ پاک کے آنے کے یہ معنی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اس سے کی۔ ”ساعين“ سے مراد مسیح علیہ السلام کی بعثت ہے۔ ”جبال فاران“ سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہے۔ فاران مکہ کا نام ہے۔[6]

پھر اللہ پاک نے ہر برائی اور عیب سے اپنی ذات مقدس کی تنزیہ فرمائی: ﴿ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٥٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٤٦) [3] فتح القدير (٤/ ١٦٨)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٤٥_ ٢٨٤٧) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٤٦_ ٢٨٤٥) الدر المنثور (٦/ ٣٤١)

[6] تفسير الخازن (٥/ ١٣٣_ ١٣٤)

موسیٰ علیہ السلام نے آگ سے جو ندا سنی تو اللہ پاک ان کو اس سے تعجب دلاتا ہے، یہ کلام بھی من جملہ ندا کے ہے۔ اس جگہ تنزیہ کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ مقصود وہم کا دور کرنا ہے۔ شاید موسیٰ علیہ السلام کو بشری تقاضے کے تحت جو عادتِ خلقی پر جاری ہے یہ وہم ہوا ہو کہ جس کلام کو وہ اس جگہ اس کی آواز اور حرف میں سن رہے ہیں، وہ مخلوق کے کلام کی طرح ہو، یا اس کا کلام کرنے والا کسی جگہ یا سمت میں ہے۔ چنانچہ اس وہم کو سبحان اللہ کہہ کر دور کر دیا، یعنی اللہ تعالیٰ مخلوق کی مشابہت سے پاک صاف ہے، یہ حفناوی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

﴿ يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ ضمیر شان کی ہے، یعنی اے موسیٰ! بے شک شان یہ ہے کہ میں غالب، قاہر اور حکمت والا ہوں اپنے امر اور فعل میں۔ کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: اے رب! وہ کون ہے جس نے مجھے پکارا؟ تو اس پر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ اللہ پاک نے ارادہ فرمایا کہ ان کے ہاتھ پر معجزے ظاہر کرے۔ چنانچہ یہ قول اس کی تمہید ہے۔ پھر ان کو حکم دیا کہ اپنے عصا کو ڈال دیں، تاکہ جو خارقِ عادات معجزات ان کے ہاتھ پر جاری کیے ہیں، ان کو پہچان لیں تو ان سے مانوس ہو جائیں۔

لہٰذا فرمایا: ﴿ وَاَلْقِ عَصَاكَ ﴾۔ یہ جملہ ﴿ بُوْرِكَ ﴾ پر معطوف ہے اور اس کے ساتھ ندا کی تفسیر ایک ہی لڑی میں ہے۔ "أَيْ: نُوْدِيَ أَنْ بُوْرِكَ وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ" یہاں کلام میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ پھر انھوں نے عصا کو اپنے ہاتھ سے ڈال دیا تو وہ سانپ بن گیا۔ ﴿ فَلَمَّا رَاٰهَا ﴾ کی ضمیر "ھا" سے ﴿ تَهْتَزُّ ﴾ حال ہے، اس لیے کہ رؤیت بصری ہے۔ ﴿ كَاَنَّهَا جَآنٌّ ﴾ یا تو حالِ ثانی ہے یا ﴿ تَهْتَزُّ ﴾ کی ضمیر سے حال ہے تو اس صورت میں حالِ متداخل ہو گا۔ (قاله السمين)

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ عصا حرکت کرنے لگا، جس طرح کہ "جَانٌّ" (سانپ) حرکت کرتا ہے۔ ﴿ جَآنٌّ ﴾ سفید سانپ کو کہتے ہیں، اس کو ﴿ جَآنٌّ ﴾ کے ساتھ تشبیہ اس کی خفتِ حرکت میں دی ہے، ورنہ اس کا جسم تو نہایت ہی بڑا تھا۔[1] دوسری جگہ اس کی عظمت کی وجہ سے اسے ﴿ ثُعْبَانٌ ﴾ فرمایا ہے۔ ﴿ جَآنٌّ ﴾ کی جمع جِنَّانٌ" ہے۔ ﴿ جَآنٌّ ﴾ ہلکے چھوٹے جسم والے سانپ کو کہتے ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ چھوٹا اور نہ بڑا۔[2] حرفِ فافصیحہ ہے، جملۂ محذوف کی خبر دے رہا ہے۔ اس کو دو وجہ سے حذف کر دیا: ایک تو اس کے ظہور پر بھروسا کیا۔ دوسرے یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ بہت تیزی کے ساتھ واقع ہوا۔

گویا یوں کہا گیا: پھر اس کو ڈال دیا تو وہ سانپ بن گیا، دوڑنے لگا، پس اس کو دیکھا، پھر جب اسے تیزی اور اضطراب کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے دیکھا: ﴿ وَلّٰى مُدْبِرًا ﴾ یعنی مارے خوف کے پیٹھ پھیر کر مڑ گیا۔ ﴿ وَلَمْ يُعَقِّبْ ﴾ یعنی واپس نہ مڑا۔ اس محاورے سے ماخوذ ہے: "عَقَّبَ الْمُقَاتِلُ إِذَا كَرَّ بَعْدَ الْفَرِّ" جس وقت لڑنے والا بھاگنے کے

[1] معاني القرآن (٤/ ١٠٩) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ١٦٠)

بعد حملہ کرتا ہے تو اس وقت یوں بولتے ہیں اور جس وقت کوئی رجوع کرتا ہے تو کہتے ہیں: "عَقَّبَ فُلَانٌ" ہر رجوع کرنے والے کو "مُعَقِّبٌ" بولتے ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ نہ ٹھہرا، نہ التفات کیا، نہ مڑا اور نہ نظر کی، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ "تعقیب" "کر بعد الفر" کو کہتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کو جو رعب طاری ہوا تو اس سبب سے کہ انھوں نے گمان کیا کہ یہ اُن کے ساتھ کسی ارادے کے تحت کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ پاک کا یہ فرمان اس بات سے آگاہ کرتا ہے: ﴿ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ﴾ یعنی اے موسیٰ! تو میرے غیر سے مت ڈر۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ پر بھروسا کر کے سانپ اور اس کے ضرر سے خوف مت کر، یا مطلقاً مت ڈر۔ پھر نہ ڈرنے کی یہ وجہ بیان فرمائی: ﴿ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ یعنی جس کسی کو میں اپنی رسالت دے کر بھیجتا ہوں، وہ میرے پاس سانپ وغیرہ سے نہیں ڈرتا تو تو بھی میرے پاس مت ڈر۔ کسی نے کہا ہے کہ مرسلین سے خوف کی نفی سارے وقتوں میں نہیں ہے، بلکہ ان سے خوف کی نفی خطاب اور وحی اور ارسال (رسالت عطا کرتے) کے وقت ہوتی ہے، کیوں کہ وہ لوگ اس وقت اللہ عزوجل کے شؤن (قدر و منزلت) کے مطالعے میں مستغرق ہوتے ہیں، ان کے دل مین کسی شے کا خوف اور خطرہ نہیں ہوتا۔ رہیں اور حالتیں تو وہ سب لوگوں سے بڑھ کر اللہ پاک سے ڈرتے ہیں، یا یہ معنی ہیں کہ رسولوں کے لیے میرے نزدیک برا انجام نہیں ہے کہ وہ اس سے ڈریں۔

پھر اللہ پاک نے استثنائے منقطع فرمایا: ﴿ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ لیکن جس شخص نے اپنی جان پر ظلم کیا معصیت کے ساتھ، پھر برا کرنے کے بعد پشیمان ہوا اور توبہ کی تو بے شک میں بڑا بخشنے والا مہربان ہوں، توبہ قبول کرتا ہوں اور اس کو بخشتا ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ استثناء مقدر سے ہے "أَيْ: لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ"، یعنی میرے نزدیک مرسلین نہیں ڈرتے اور جو ڈرتے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں اور اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ظلم کیا: ﴿ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا... الخ﴾ جس نے ظلم کیا، پھر بدل کر نیکی کی۔

امام فراء رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ محذوف سے استثناء محال ہے، کیوں کہ وہ ایسی شے سے استثناء ہے جس کا ذکر نہیں ہوا۔ امام فراء رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ﴿ اِلَّا ﴾ بہ معنی واو ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ استثناء مذکور سے متصل ہے، محذوف سے نہیں۔ معنی یہ ہیں مگر وہ شخص رسولوں میں سے جس نے صغیرہ گناہ ہو جانے سے ظلم کیا، جن سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس قول کو پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ اس نے اس شخص کو جان لیا ہے جس نے ان میں سے اس کی نافرمانی کی ہے، چنانچہ اس کا استثناء کیا۔[1]

پھر یوں فرمایا: ﴿ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ﴾ اگرچہ میں نے اس کی مغفرت کی، جیسے: آدم، داود علیہما السلام اور برادرانِ یوسف، اور موسیٰ علیہ السلام کے قبطی کو قتل کرنے کی وجہ سے جو گناہ ہوا تھا، اس کی مغفرت کی اور مغفرت کرنے کے بعد خوف

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٦٨)

کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے، کیوں کہ ہمارے نبی سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ جن کے اگلے پچھلے سب گناہ اللہ پاک نے بخش دیے، اس کے باوجود آپ ﷺ یوں فرمایا کرتے تھے: «وَدِدْتُ أَنِّي شَجَرَةٌ تُعْضَدُ»[1] یعنی میں دوست رکھتا ہوں کہ کاش مَیں کوئی درخت ہوتا کہ اس کو کاٹ ڈالا جاتا۔ آپ ﷺ کا یہ فرمانا انتہا درجے کے خوف پر دال ہے اور کیوں نہ ہو۔ ع

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

غرضیکہ کہ پھر دوسرے معجزے کے اظہار کا حکم دیا: ﴿ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾ "جیب" سے قمیص کا گریبان مراد ہے۔ "جَیب" اس کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ قطع کی جاتی ہے، تاکہ سر اس میں داخل ہو۔ سورۃ القصص میں ﴿ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ ﴾[القصص: ٣٢] "اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال۔" فرمایا ہے۔ ﴿ اَدْخِلْ ﴾ میں جو مبالغہ ہے ﴿ اُسْلُكْ ﴾ میں نہیں ہے۔ (﴿ اَدْخِلْ ﴾ اور ﴿ اُسْلُكْ ﴾ دونوں کے معنی قریب قریب ہیں، لیکن ادخال میں سلک کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، کیوں کہ سلک تو پرونا ہے، جیسے: موتی کو تاگے میں پروتے ہیں اور ادخال میں ذرا شدت اور زور ہے۔ گویا کسی شَے کو کسی شے میں زور سے گھسانا۔ واللہ أعلم.)

رہی یہ بات کہ آستین میں ہاتھ کے داخل کرنے کا امر نہ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صوف کا چھوٹا جبہ پہنے ہوئے تھے، اس کی آستین نہ تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ تنگ آستین تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر صوف کا جبہ تھا، وہ ان کی دونوں کہنیوں تک نہیں پہنچتا تھا، اس لیے ان سے فرمایا کہ تو اپنا ہاتھ اپنی جیب میں داخل کر، چنانچہ انھوں نے داخل کیا۔[2]

﴿ تَخْرُجْ ﴾ ﴿ اَدْخِلْ ﴾ کا جواب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عبارت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أَدْخِلْ يَدَكَ تَدْخُلْ، وَأَخْرِجْهَا تَخْرُجْ" حالاں کہ اس حذف کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں داخل کر تو وہ اپنے گندمی رنگ کے خلاف بغیر برص کے، یا کسی آفت کے بغیر بالکل سفید ہو کر نکلے گا۔ یہ صنعتِ احتراس ہے، چوں کہ ﴿ بَيْضَآءَ ﴾ میں برص وغیرہ کا شبہہ ہوتا تھا، اس لیے ﴿ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾ فرما کر اس شبہے کو رفع کر دیا۔

مفسرین نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر صوف کا جبہ تھا، اس کی نہ آستینیں تھیں نہ گھنڈیاں۔ چنانچہ انھوں نے اپنا ہاتھ گریبان میں گھسا لیا اور اس کو نکالا تو اسی وقت وہ بجلی کی طرح چمکنے لگا اور اس سے ایسی شعاعیں نکلتی تھیں جو بینائی کو ڈھانکتی تھیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بَيْضَآءَ ﴾ حال ہے ﴿ تَخْرُجْ ﴾ کے فاعل سے اور ﴿ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٩٠) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ١٧٤)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٥٠)

یا تو دوسرا حال ہے، یا ﴿ بَيْضَآءَ ﴾ کی ضمیر سے حال ہے، یا ﴿ بَيْضَآءَ ﴾ کی صفت ہے۔ اللہ پاک اس بات پر قادر تھا کہ ان کے ہاتھ کو اس کے جیب میں داخل کیے بغیر چمکتا دمکتا کر دے اور اس پر بھی قادر تھا کہ ان کے عصا کو ان کے ہاتھ ہی میں اژدھا بنا دے، لیکن اس نے ان کا امتحان لیا، یہ حکم کر کے کہ ہاتھ کو جیب میں داخل کریں اور عصا کو ڈالیں۔ اللہ پاک کو یہ اختیار ہے کہ وہ مختلف قسم کی تکالیف میں سے جس محنت اور امتحان سے چاہے اپنے بندوں کا امتحان کرے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ ﴾ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ تَخْرُجْ ﴾ کے فاعل۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں ہے کہ اس میں بُعد ہے۔[1] بُعد کی وجہ معلوم نہیں ہوتی، حالاں کہ جس محذوف سے یہ متعلق ہے، یعنی آیت کا لفظ، اس کی تصریح سورت طٰہٰ میں موجود ہے، وہاں یوں فرمایا: ﴿ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴾ [طٰه: ٢٢] ''وہ بغیر کسی مرض کے چمکتا ہوا سفید نکلے گا، (یہ) دوسری نشانی ہے۔'' یہ دوسرا معجزہ ہے۔ من جملہ نو نشانیوں کے۔ (كذا أفاده الحفناوي)

کسی نے کہا ہے کہ محذوف سے متعلق ہے: "أَيْ: اِذْهَبْ فِيْ تِسْعِ آيَاتٍ" یعنی جا تو نو نشانیوں کو لے کر۔ کسی نے کہا: اس قول سے متعلق ہے: "أَلْقِ عَصَاكَ وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جُمْلَةِ تِسْعِ آيَاتٍ" کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان دونوں میں نو نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، یعنی عصا اور یدِ بیضاء۔ چنانچہ اس صورت میں گیارہ نشانیاں ہوں گی۔ دو تو یہ ہوئیں۔ تیسری "فلق" یعنی دریا کا پھٹنا۔ چوتھی طوفان۔ پانچویں "جراد" (مکڑی یا ٹڈی)۔ چھٹی "قمل" یعنی چیچڑیاں۔ ساتویں "ضفادع" یعنی مینڈک۔ آٹھویں "دم" یعنی خون۔ نویں "طمس" (﴿ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ ﴾ [يونس: ٨٨] ''اے ہمارے رب! ان کے مال و زر غارت کر دے۔'' چنانچہ ان کے اموال پتھر ہو گئے۔ "طموس" دروس و انمحاء کو کہتے ہیں)۔ دسویں "جدب" یعنی خشک سالی، ان کے بوادی (جنگلوں) میں۔ گیارھویں ان کے کھیتوں میں نقصان۔

ہاں یوں ہو سکتا ہے کہ "جدب" اہلِ بوادی (جنگل وصحرا) کے لیے تھا اور زرع کا نقصان مزارع کی نسبت سے تھا تو اس اعتبار سے ایک نشانی ساقط ہو گئی۔ اسی طرح بحر کا فلق بھی ساقط ہے، کیوں کہ یہ ان نشانیوں میں سے نہیں ہے جو فرعون کی دعوت (اللہ کی طرف بلانے) کے لیے تھیں، بلکہ یہ تو اُن کو ہلاک کرنے کے لیے ہوا، جبکہ انھوں نے عناد کیا اور کفر و سرکشی پر جمے رہے۔ لہٰذا مراد وہ نو نشانیاں ہیں جن کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف بھیجے گئے تھے اور وہ صرف نو ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہتر سے بہتر قول جو اس بارے میں کہا گیا ہے یہ ہے کہ ید بیضا نو نشانیوں میں داخل ہیں۔ اسی طرح امام مہدوی اور قشیری رحمہما اللہ نے کہا ہے۔

امام زجاج اور قشیری رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ تو یوں بولتا ہے کہ "خَرَجْتُ فِيْ عَشْرَةِ نَفَرٍ" حالاں کہ تو اُن میں

[1] فتح القدير (٤/ ١٦٩) فتح البيان (١٠/ ١٧)

سے ایک ہے، یعنی میں دس میں دسواں تھا جو نکلا، پس ﴿ فِيْ ﴾ بہ معنی "مِنْ" ہے۔ "فِيْ" کے "مِنْ" سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے جس طرح کہ تو یوں کہتا ہے: "خُذْ لِيْ عَشْرًا مِنَ الْإِبِلِ فِيْهَا فَحْلَانِ أَيْ: مِنْهَا" یعنی تو میرے لیے دس اونٹ لے کہ اُن میں سے دو نر ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فِيْ ﴾ "مِنْ" کے معنی میں ہے۔ ید بیضا اور عصا نو سے خارج ہیں۔ اسی طرح امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ﴾ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبارت میں اضمار ہے۔ "أَيْ: إِنَّكَ مَبْعُوْثٌ أَوْ مُرْسَلٌ إِلَى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ" اسی طرح امام زجاج رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے،[1] یعنی تو بھیجا گیا فرعون کی طرف اور اس کی قوم کی طرف، اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو کفر، عدوان اور سرکشی میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں، یعنی بڑے سخت کافر و سرکش ہیں۔

﴿ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ پھر جب ان کے پاس ہماری نشانیاں آئیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر تھیں، اس حال میں کہ وہ روشن اور ظاہر تھیں تو بولے: یہ چیزیں جو معجزے اور کرامات ہیں اور جن کو ہم دیکھ رہے ہیں اور جنھیں موسیٰ علیہ السلام لے کر آیا ہے، یہ واضح اور ظاہر جادو ہے۔ ﴿ مُبْصِرَةً ﴾ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اس کا اطلاق مفعول پر کیا ہے، جیسے: "مَاءٌ دَافِقٌ" بہ معنی "مَدْفُوْقٌ" ہے۔ اس سے غرض اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ وہ نشانیاں اتنی واضح اور روشن ہیں کہ وہ خود اپنی ذات کو دیکھیں، اگر وہ ان چیزوں میں سے ہوں جو دیکھتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] "اور ہم نے ثمود کو ایک اونٹنی (بطور) واضح نشانی دی تھی۔"

اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ امام علی بن حسین اور قتادہ رحمہما اللہ نے "مَبْصَرَةً" پڑھا۔ "مَبْصَرَةٌ" اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں بہت زیادہ تبصر ہوتا ہے، جس طرح کہتے ہیں کہ "اَلْوَلَدُ مَجْبَنَةٌ وَّمَبْخَلَةٌ"[2] جب کہ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ مفعلہ کا وزن کثرت کے لیے آیا کرتا ہے۔ مثلاً: جس جگہ قبریں بہت ہوتی ہیں تو اس کو مقبرہ بولتے ہیں۔ خربوزے کی فالیز کو مبطخہ کہتے ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مبصرہ" بہ معنی "مضيئة واضحة"[3] ہے، یعنی روشن و ظاہر۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اضاءت معنوی تو سب نشانیوں میں ہے اور حسی بھی ہے بعض میں اور وہ ید بیضا ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إبصار" کی "آیات" کی طرف نسبت مجازاً ہے، اس لیے کہ انہیں کے سبب سے دیکھا جاتا ہے تو گویا وہ خود دیکھنے والی ہوئیں۔

﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ﴾ محاورے میں بولتے ہیں: "جَحَدَ حَقَّهٗ" اور بِحَقِّهٖ"

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٦٢۔ ١٦٣) فتح القدير (٤/ ١٦٩) [2] فتح القدير (٤/ ١٦٩) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٩٥)

یعنی اس کے حق کا انکار کیا، دونوں کے ایک معنی ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرفِ با زائد ہے [1] اور حرفِ واؤ حالیہ ہے اور کلمۂ "قد" مقدر ہے، اور استیقان میں ایقان سے زیادہ مبالغہ ہے، کیوں کہ اس میں حرفِ سین زیادہ ہے، اور حرف کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دال ہوتی ہے۔ ﴿ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ ﴿جَحَدُوْا﴾ کی ضمیر سے حال ہے، بہ معنی "ظَالِمِيْنَ لَهَا وَمُسْتَكْبِرِيْنَ عَنْهَا" معنی یہ ہیں کہ ان آیتوں کی تکذیب کی اور ان کا اقرار نہ کیا، حالاں کہ ان کے دلوں نے اس بات کا خوب یقین کر لیا کہ وہ اللہ کے پاس سے ہیں، اس حال میں ان کا انکار کیا کہ وہ ظلم کرنے والے تھے ان پر، جیسے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ﴾ [الأعراف: ٩] "اس لیے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ بے انصافی کرتے تھے۔"

آیتوں پر ظلم اس طرح کیا کہ ان کو ان کے بلند رتبے سے اتارا اور ان کا نام جادو رکھا اور اس حال میں کہ تکبر کرنے والے تھے ان پر ایمان لانے سے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ﴾ [الأعراف: ٣٦] "اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا۔" کسی نے کہا ہے کہ دونوں علت کی بنا پر منصوب ہیں، یعنی ان کو آیات کی تکذیب پر اُکسانے والا اور اس کا باعث ظلم اور علو ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ ظلم اور علو کے سبب سے انھوں نے آیتوں کو جھٹلایا۔ یہ بھی جائز ہے کہ دونوں مصدر محذوف کی صفت ہوں۔

"أَيْ: جَحَدُوْا بِهَا جُحُوْدًا، ظُلْمًا وَّعُلُوًّا" یعنی انھوں نے آیتوں کا بالکل انکار کیا ایسا انکار جو ظلم اور علو تھا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "وَجَحَدُوْا بِهَا ظُلْمًا وَّعُلُوًّا، أَيْ: شِرْكًا وَّتَكَبُّرًا عَنْ أَنْ يُّؤْمِنُوْا بِمَا جَاءَ بِهِ مُوْسَى، وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ أَنَّهَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" [2] یعنی انھوں نے شرک اور تکبر کے مارے آیتوں کا انکار کیا اس بات سے کہ اس شے پر ایمان لائیں جس کو موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے، حالاں کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ آیتیں اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہیں۔

﴿فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ اس میں خوب غور و فکر کریں، کیوں کہ اس میں عبرت لینے والوں کے لیے عبرت ہے۔ ان کا انجام یہ ہوا کہ یہاں تو ان کے لیے دریا میں ایسی ہولناک شکل میں غرق کیا جانا ہوا اور آخرت میں آگ میں جلایا جانا ہوا۔ اس کا ذکر صرف اس لیے نہیں کیا کہ ان کے حالات بتائے جائیں، بلکہ اس لیے کیا کہ اس کا مقصد اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ یہ ہر دیکھنے والے کے لیے عبرت ہے اور ہر بدوی اور حضری کے درمیان مشہور ہے۔

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿كَيْفَ﴾ خبر مقدم ہے ﴿كَانَ﴾ کی اور ﴿عَاقِبَةُ﴾ اس کا اسم ہے اور جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر نزعِ خافض، اس لیے کہ وہ معلّق ہے "اُنْظُرْ" بہ معنی "تَفَكَّرْ" کا۔ پھر جب اللہ پاک

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ١٦٣) [2] معاني القرآن (٤/ ١١١) فتح القدير (٤/ ١٧٠)

موسیٰ علیہ السلام کے قصے سے فارغ ہوا تو داود اور سلیمان علیہما السلام کا قصہ شروع کیا۔ یہ قصہ اور اس سے پہلے اور اس کے بعد اس آیت کریمہ کے بیان اور تقریر کے لیے ہے: ﴿ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴾، چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

اور بلاشبہ ہم نے داود اور سلیمان کو (خاص) علم دیا تھا، اور ان دونوں نے کہا: تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی⑮ اور داود کا وارث سلیمان بنا اور اس نے کہا: اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے، اور ہمیں ہر چیز دی گئی ہے، بلاشبہ یہ تو صاف صاف (اللہ کا) فضل ہے⑯ اور سلیمان کے پاس اس کے سارے لشکر، جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے جمع کیے گئے، پھر وہ الگ الگ تقسیم کیے جاتے تھے⑰ حتی کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! تم اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ، کہیں سلیمان اور اس کے لشکر تمھیں کچل نہ ڈالیں، جبکہ وہ (اس کا) شعور بھی نہ رکھتے ہوں⑱ چناں چہ سلیمان اس (چیونٹی) کی بات پر مسکرا کر ہنس دیا اور کہا: اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے

[1] فتح البیان (۱۰/ ۱۲۔ ۱۹)

والدین پر انعام کی ہے، اور اس بات کی بھی کہ میں ایسے نیک کام کروں جو تو پسند کرے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل کر ⑲

داود وسلیمان علیہما السلام کا تذکرہ:

وارث ہوئے یعنی نبی ہوئے اور بادشاہ ہوئے باپ کی جگہ اور بیٹے تھے۔ وہ اس مقام پر نہ ہوئے۔ ہر چیز میں سے دیا، یعنی جو چیزیں دنیا میں درکار ہیں، وہ دیں۔ چیونٹی کی آواز کوئی نہیں سنتا اور ان کو معلوم ہوگئی، ان کے باپ پر تو ہزاروں احسان تھے اور ماں پر بھی کچھ ہوئے۔ ایک تو مشہور ہے کہ بڑی پارسا تھیں، کہتے ہیں کہ وہی ہیں جن کا ذکر سورت صٓ میں ہے، اور اس چیونٹی کی بات سن کر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ انتہیٰ۔

داود علیہ السلام اور ان کے فرزندِ ارجمند سلیمان علیہ السلام اللہ پاک کے دو بندے اور دو نبی ہیں، جن پر اللہ نے نعمتِ جزیلہ، مواہبِ جلیلہ اور صفاتِ جمیلہ کا انعام کیا اور ان کو دنیا اور آخرت کی سعادت دی۔ دنیا میں تو اُن کو حکومت، سلطنت اور مکمل اختیار دیا اور دین میں نبوت اور رسالت عطا فرمائی۔ لہٰذا اللہ پاک اس کی خبر دیتا ہے اور اسی لیے یوں فرماتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم بن یحییٰ بن ہشام سے ذکر کیا ہے کہ ابراہیم نے کہا: مجھے میرے باپ نے میرے دادا سے خبر دی کہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ جو نعمتیں دے اور ان پر وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے تو اس کی حمد ان نعمتوں سے بہت افضل ہے، دیکھو! خود کتاب اللہ میں یہ نکتہ موجود ہے۔ پھر یہی آیت لکھی: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ پھر لکھا کہ ان دونوں پیغمبروں کو جو نعمت دی گئی تھی، اس سے افضل نعمت اور کیا ہوگی۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ ﴾ یعنی داود کا وارث ملک و نبوت میں سلیمان ہوا۔ مال کی وراثت مراد نہیں، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو اکیلے سلیمان علیہ السلام خاص نہ کیے جاتے داود علیہ السلام کی باقی اولاد میں سے۔ اس لیے کہ داود علیہ السلام کی سو بیبیاں تھیں، لیکن اس سے مراد حکومت اور نبوت کی وراثت ہے۔ بے شک انبیاء کے مالوں کی وراثت نہیں کی جاتی۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی خبر دی اور ارشاد فرمایا: « نَحْنُ مَعَاشِرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ فَهُوَ صَدَقَةٌ »[2] یعنی ہم خاص انبیاء کے گروہ کی میراث نہیں لی جاتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ سلیمان علیہ السلام خبر دیتے ہیں

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٥٤)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٩٢٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٥٧) سنن النسائي الكبریٰ (٤/ ٦٤)

کہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ہیں جو اس نے کی ہیں، اس میں پوری حکومت اور عام سلطنت اور تمکینِ عظیم ہیں، یہاں تک کہ انسانوں، جنوں اور طیور کو ان کا فرماں بردار کر دیا اور وہ پرندوں اور حیوانوں کی زبان بھی جانتے تھے۔ یہ ایک ایسی شے ہے جو کسی کو نہیں ملی ہمارے علم میں جس کی اللہ و رسول نے خبر دی ہے۔

جاہل، نادان اور نالائق لوگوں میں سے جس شخص کا یہ خیال ہے کہ سلیمان علیہ السلام سے پہلے حیوان آدمیوں کے بولنے کی طرح بولتے تھے، جیسا کہ بہت سے لوگ اس قسم کی بکواس کرتے ہیں تو یہ قول بغیر علم کے ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو سلیمان علیہ السلام کو اس بات کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ سارے لوگ پرندوں اور جانوروں کی باتیں سنتے تھے اور جو کچھ وہ کہتے تھے اس کو سمجھتے تھے، حالاں کہ بات ویسی نہیں ہے جو ان کا زعم اور قول ہے، بلکہ جانور اور پرندے اور تمام مخلوق جس وقت سے پیدا ہوئی ہے، اس وقت سے لے کر آج تک اسی شکل اور طریق پر ہوتی آئی ہے، لیکن اللہ پاک نے پرندوں وغیرہ کی بات چیت سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دی۔ پرندے ہوا میں ایک دوسرے سے جو بات چیت کرتے ہیں اور مختلف اقسام و اصناف کے حیوانات جو کچھ بولتے ہیں، وہ اس سب کو سمجھتے تھے۔ اسی لیے سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ یعنی من جملہ ان چیزوں کے جن کی طرف ایک بادشاہ کو ضرورت ہوتی ہے۔

﴿إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ﴾ یعنی بے شک یہ اللہ کا ہم پر ظاہر اور واضح فضل ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ داود علیہ السلام میں سخت غیرت تھی، جس وقت وہ نکلتے تو دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔ پھر کوئی ان کے گھر والوں پر داخل نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ وہ واپس لوٹ کر آئیں۔ وہ ایک دن نکلے اور دروازے بند کر دیے گئے، پھر ایک عورت آئی اور گھر کی طرف جھانکنے لگی تو اس وقت گھر کے اندر ایک مرد کھڑا ہوا تو اس عورت نے ان لوگوں سے کہا جو گھر میں تھے کہ یہ مرد کہاں سے گھس آیا، حالاں کہ گھر بند ہے؟ واللہ! ہم داود علیہ السلام کے ساتھ فضیحت ہوں گے۔

پھر داود علیہ السلام آئے تو وہ مرد گھر کے درمیان میں کھڑا ہوا ہے۔ داود علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تو کون ہے؟ تو اس نے کہا کہ وہ ایسا شخص ہے جو بادشاہوں سے نہیں ڈرتا اور نہ دربانوں سے روکا جا سکتا ہے۔ داود علیہ السلام نے کہا: تُو تو واللہ! ملک الموت ہے، مرحبا اللہ کے امر کو۔ پھر داود علیہ السلام اپنے مکان میں داخل ہوئے، یہاں تک کہ ان کی جان قبض کی گئی۔ جب ان کے کام سے فراغت کی گئی اور اُن پر سورج طلوع ہوا تو سلیمان علیہ السلام نے پرندوں سے کہا کہ داود علیہ السلام پر سایہ کرو، پرندوں نے ایسا سایہ کیا کہ اس زمین پر اندھیرا چھا گیا۔ پھر سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ تم ایک ایک کر کے اپنے پر سمیٹ لو۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! طیور نے کس طرح کیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ سمیٹ کر بتلایا

کہ اس طرح۔ اور غالب ہوئے تھے ان پر اس دن مضرحیہ۔[1] امام ابو الفرج ابن جوزی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مضرحیہ سرخ گدوں کو کہتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴾ یعنی سلیمان کے لیے ان کے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے۔ مراد یہ ہے کہ ایک بڑی عظمت اور شان کے ساتھ وہ ان کے درمیان سوار ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑی شان وشوکت اور دبدبہ کے ساتھ آدمیوں کے مجمع میں سوار ہوئے۔ ان کے اردگرد آدمیوں ہی کا لشکر رہتا تھا اور جن مرتبے میں ان کے بعد تھے۔ پرندوں کا مرتبہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے سر پر ہوتے تھے، اگر گرمی ہوتی تو اپنے پروں سے ان پر سایہ کرتے تھے۔

﴿ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اول ان کے پچھلوں پر روکے جاتے تھے، تاکہ جس کا جو مرتبہ مقرر کیا گیا ہے، اس سے کوئی آگے نہ بڑھ جائے۔ غرض یہ کہ ہر ایک اپنے مثل میں رہے، چل بچل نہ ہونے پائے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر صنف پر وزعہ مقرر کیے گئے تھے، وہ ان کے اگلوں کو بعد والوں کی طرف ہٹاتے تھے، تاکہ چلنے میں آگے نہ بڑھ جائیں، جس طرح کہ آج کل بادشاہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ "وزعة" جمع ہے "وَازِعٌ" کی۔ "وَازِعٌ" باز رکھنے والے کو کہتے ہیں اور سرہنگ اور سالارِ لشکر کو کہتے ہیں۔[2] مطلب یہ ہے کہ لشکر کے ہر حصے میں افسر اور سردار مقرر تھے کہ وہ اپنے اپنے لشکر کا نظم وضبط اور نگرانی کرتے تھے کہ کوئی بے مثل آگے پیچھے نہ ہونے پائے۔

قولہ تعالیٰ ﴿ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ﴾ یعنی چلتے چلتے سلیمان علیہ السلام اپنے ساتھ کے لشکروں کے ہمراہ جب ایک چیونٹیوں کے میدان کے پاس پہنچے تو: ﴿ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اس چیونٹی کا نام حرس تھا اور وہ اس قبیلے سے تھی جس کو بنو الشیصان کہتے تھے اور وہ لنگڑی تھی اور بھیڑیے کے برابر تھی۔ غرض یہ ہے کہ اس چیونٹی کو یہ ڈر ہوا کہ کہیں گھوڑے اپنی ٹاپوں سے ان کو پیس نہ ڈالیں، لہٰذا اس نے ان کو حکم دیا کہ اپنے گھروں میں گھس جائیں۔

سلیمان علیہ السلام نے اس کی یہ بات سمجھ لی تو وہ اس کی بات سے مسکرا کر ہنس پڑے اور کہا: ﴿ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ ﴾ یعنی اے میرے رب! تو مجھے اس بات کا الہام کر کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جس کا تو نے مجھ پر احسان فرمایا ہے کہ مجھے پرندوں اور حیوانوں کی بولی سکھائی ہے اور میرے ماں باپ پر کہ وہ تیرے مطیع اور فرماں بردار ہوئے اور تجھ پر ایمان لائے اور اس بات کا

---

[1] مسند أحمد (۲/ ۴۱۹) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ "مطلب بن عبداللہ" کا سماع سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۵۷)

کہ میں ایسے نیک کام کروں جن کو تو دوست رکھتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ ﴿ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾[1] یعنی جس وقت تو مجھے وفات دے تو مجھ کو اپنے نیک بندوں کے ساتھ ملا دے اور اپنے اولیاء میں سے رفیقِ اعلیٰ کے ساتھ۔

مفسروں میں سے جس کسی نے یہ کہا ہے کہ یہ وادی شام کی زمین میں تھی، یا شام کے علاوہ کسی زمین میں تھی، اور یہ چیونٹی مکھی کی طرح دو بازو والی تھی، یا اس کے سوا اَور اقوال تو ان کا کچھ حاصل نہیں۔ نوف بکالی سے مروی ہے کہ "كَانَ نَمْلُ سُلَيْمَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَمْثَالَ الذِّيَابِ" یعنی سلیمان علیہ السلام کی چیونٹیاں بھیڑیوں کی طرح تھیں۔ اسی طرح میں نے اس کو یائے مثناۃ تحتانی کے ساتھ لکھا ہوا دیکھا ہے اور حال یہ ہے کہ وہ بیائے موحدہ ہے، (یعنی بیائے مثناۃ تحتانی تصحیف ہے اور صحیح ذباب بیائے موحدہ ہے، یعنی وہ چیونٹیاں مثل مکھیوں کے تھیں۔ واللہ أعلم.) غرض یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی بات سمجھ لی اور مسکرا کر ہنس پڑے اور یہ ایک نہایت ہی عظیم بات ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو الصدیق ناجی سے روایت کیا ہے کہ سلیمان بن داود علیہما السلام نکلے، پانی مانگ رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنی پشت پر چت لیٹی ہوئی ہے اور اپنے پاؤں آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے کہہ رہی ہے: "اَللّٰهُمَّ إِنَّا خَلْقٌ مِنْ خَلْقِكَ، وَلَا غِنَى بِنَا عَنْ سُقْيَاكَ، وَإِلَّا تَسْقِنَا تُهْلِكْنَا" یعنی اے اللہ! ہم تیری مخلوق میں سے ایک خلق ہیں اور ہم تو تیرے پانی پلانے سے بے نیاز نہیں ہیں اور اگر تو ہم کو پانی نہیں پلائے گا تو ہم کو ہلاک کر دے گا۔

چنانچہ سلیمان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لوٹ چلو، اب یقینی طور پر تمھارے علاوہ کسی اور کی دعا سے تمھیں پانی دیا گیا۔[2]

امام مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ انبیا علیہم السلام میں سے کسی نبی کو ایک چیونٹی نے کاٹا تو اس کے حکم سے چیونٹیوں کے قریہ، یعنی بستی اور مسکن کو جلا دیا گیا تو اللہ نے اس کی طرف وحی بھیجی کہ ایک چیونٹی کے کاٹنے سے تم نے اُمتوں میں سے ایک اُمت کو ہلاک کر دیا جو تسبیح کرتی تھی، ایک چیونٹی کو کیوں نہیں ہلاک کیا؟[3] مطلب یہ ہے کہ اگر ہلاک ہی کرنا تھا تو ایک کو کرتے سب کا کیا قصور تھا کہ سب کے گھر کو جلا ڈالا۔[4] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اٰتَیْنَا ﴾ کے معنی "أَعْطَيْنَا" یعنی ہم نے داود علیہ السلام کو اور اس کے بیٹے سلیمان علیہ السلام کو علم عطا کیا۔ علم کی تنوین یا تو نوع کے لیے ہے، یعنی ہم نے ان کو ایک طرح کا علم دیا، یا تعظیم کے لیے ہے، یعنی ان کو کثیر علم دیا۔ کسی نے کہا: دین کا علم اور حکم مراد ہے۔ کسی نے کہا: فیصلہ کرنے کا اور سیاست کا علم۔ کسی

[1] تاريخ دمشق (٢٢/ ٢٦٥۔ ٢٦٦)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٥٨)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤١)
[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٧٢۔ ٤٧٤)

نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام کا علم پرندوں کی تسبیح ہے اور سلیمان علیہ السلام کا علم پرندوں اور جانوروں کی بولی ہے۔

داود علیہ السلام کے اُنیس (۱۹) بیٹے تھے۔ سلیمان علیہ السلام ان میں سے ایک ہیں۔ داود علیہ السلام سو برس زندہ رہے، ان کے اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ۵۶۹ برس کی مدت کا دورانیہ ہے۔ سلیمان علیہ السلام پچاس سے کچھ اوپر برس زندہ رہے، ان کے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک ہزار سات سو برس کی مدت ہے۔ "تحبیر" میں اسی طرح ذکر کیا گیا ہے۔

﴿ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ حرفِ واو محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ اس لیے کہ یہ مقام حرفِ فا کا مقام ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَلَقَدْ آتَيْنَاهُمَا عِلْمًا فَعَمِلَا بِهِ، وَقَالَا شُكْرًا لِّلّٰهِ: وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ" یعنی بے شک ہم نے دونوں کو علم دیا تو انھوں نے اس پر عمل کیا اور ان میں سے ہر ایک نے کہا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾۔ اس تقدیر کی تائید یہ بات کرتی ہے کہ زبان کے ساتھ شکر اسی وقت اچھا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے دل کا عمل ہوا ہو۔ دل کا عمل یہی طاعت کرنے اور معصیت کو چھوڑنے کا ارادہ کرنا ہے۔

﴿ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو علم اور نبوت کے ساتھ فضیلت دی اپنے بندوں پر اور اس بات میں بھی فضیلت دی کہ طیور، جن، انسان اور شیطانوں کو ہمارا فرماں بردار کر دیا۔ یہ فضیلت ہمیں ان بہت سے ایمانداروں پر دی گئی جن کو علم نہیں ملا، یا جن کو ہمارے علم جیسا علم نہیں ملا۔ انھوں نے یہ بات جو کہی تو اللہ کی نعمت کو بیان کرنے کے لیے اور شکر کے طور پر کہی۔ اپنی جان کو سب پر فضیلت نہیں دی، یہ انھوں نے تواضع اور فروتنی کے لیے کیا۔ ظاہری نظمِ قرآنی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اشیائے مذکورہ کی تسخیر داود اور سلیمان علیہما السلام دونوں کے لیے تھی۔

﴿ فَضَّلَنَا ﴾ کی تفسیر میں امام محلی، خازن اور خطیب رحمہم اللہ نے اشیائے مذکورہ کا ذکر کیا ہے۔[1] آیت میں کئی باتوں پر دلیل ہے۔ ایک تو اس بات پر کہ علم ایک عزت والی شے ہے، اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ دوسرے علم کے حاملین اور اہلِ علم سب سے مقدم ہیں۔ تیسرے جن نعمتوں کا اللہ پاک اپنے بندوں پر انعام فرماتا ہے، علم کی نعمت ان سب سے بڑی اور جلیل القدر ہے۔ چوتھے جس شخص کو علم عطا ہوا تو اس کو بہت سے بندوں پر فضیلت ملی اور اس کو بہت زیادہ شرف بخشا گیا۔

نبی اکرم ﷺ نے جو علماء کو « وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ » فرمایا ہے[2] تو اسی لیے کہ عالم لوگ شرف اور مقام میں انبیاء کے قریب ہیں، کیوں کہ جس کام کے لیے انبیاء مبعوث ہوئے ہیں، اس کے ساتھ قائم ہونے والے یہی علماء ہیں۔ پانچویں

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٩٥) تفسير الخازن (٥/ ١٣٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٩٧)

یہ کہ اس بڑی نعمت کے سبب سے علماء پر لازم ہے کہ جو شے اللہ پاک نے ان کو عطا فرمائی ہے، اس پر اللہ کی حمد کریں اور شکر بجا لائیں اور یہ اعتقاد کریں کہ جس طرح ان کو بہت سے لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے، اسی طرح ان پر بھی ان کی طرح اور لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے۔ ﴿ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴾ [یوسف: ٧٦] ''ہر صاحبِ علم کے اوپر ایک زیادہ علم والا ہے۔'' کو پیشِ نظر رکھیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ جو کچھ ہیں، ہم ہی ہیں۔

امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا: ''كُلُّ النَّاسِ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ'' [1] یعنی سب لوگ عمر سے زیادہ سمجھ رکھتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ باوجود اپنے علم و فضل کے دوسرے کے زیادہ عالم ہونے کے قائل ہوئے۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا قول ذکر کیا ہے، [2] جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس کے بعد یہ کہا ہے کہ جو بات انھوں نے سمجھی اس پر آیت دال نہیں ہے۔ آیت تو اس بات پر دال ہے کہ داود اور سلیمان علیہما السلام نے اللہ کی ان نعمتوں پر حمد کی، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو فضیلت دی۔ پھر کہاں سے دلالت کرتی ہے کہ اللہ کی حمد اس کی نعمت سے افضل ہے۔ [3] انتھی

کاتب الحروف ۔عفا اللہ عنہ۔ عرض کرتا ہے کہ جب صاحبِ فتح القدیر کی غرض یہ ہے کہ عمر ثانی نے جو اس آیت پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ اللہ کی حمد اس کی نعمت سے افضل ہے، ٹھیک نہیں ہے، حالاں کہ ان کا استدلال بالکل ٹھیک ہے اور کیوں نہ ہو، ان کے فضائل و مناقب جو ہیں، وہ تو بجائے خود مذکور ہیں، صرف ان کا عمرِ ثانی ہونا ایک ایسی فضیلت ہے کہ سارے فضائل کی سرتاج۔ ان کی غرض یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو جو نعمتیں داود اور سلیمان علیہما السلام کو عطا فرمائیں، وہ کسی اور بندے کو نہیں دیں۔

پھر اللہ پاک نے ان کی طرف سے نقل فرمایا کہ انھوں نے اس پر اللہ کی حمد کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی حمد ایک ایسی شے ہے کہ ان ساری نعمتوں کے عوض ہو گئی۔ ان کے بعد اللہ پاک کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائے اور وہ نعمت بالضرور ان نعمتوں سے کم درجے کی ہو گی۔ پھر وہ بندہ اس پر اللہ کی حمد کرے تو یقینی طور پر اس کی حمد، اس کی نعمت سے افضل ہو گی، کیوں کہ اللہ کی حمد تو ایسی شے ہے کہ ان دونوں کی نعمتوں سے مقدم (آگے بڑھی ہوئی) ہو گئی۔ ان کے سامنے اس بندے کی نعمت کی کیا وقعت ہے۔ حمد کے نعمت سے افضل ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نعمتیں تو فانی ہیں اور اللہ کی حمد باقی ہے۔ باقی رہنے والی چیز یقینی طور پر فانی سے افضل ہے۔ ﴿ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴾ [الکھف: ٤٦] ''اور آپ کے رب کے ہاں باقی رہنے والی نیکیاں ہی ثواب میں بہتر ہیں اور اُمید لگانے کے اعتبار سے (بھی) بہتر ہیں۔'' اس کی دلیل ہے۔

[1] سنن البیهقي الکبریٰ (٧/ ٢٣٣) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] فتح القدیر (٤/ ١٧٨) فتح البیان (١٠/ ٢٠)

عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اس وقت ایک حکایت یاد آئی۔ شاید "روض الریاحین" میں ہے کہ ایک وقت سلیمان علیہ السلام اپنے خادموں اور نوکروں چاکروں کے ساتھ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے جا رہے تھے، ایک شخص راستے میں جا رہا تھا، اس نے یہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر تعجب سے کہا کہ ملک تو یہی ہے، یعنی جس کا نام بادشاہت ہے وہ یہی ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے اس کی بات سن لی تو فرمایا کہ ایک دفعہ "سبحان اللّٰه" کہہ دینا اس سب سے بہتر ہے، کیوں کہ یہ فانی ہے اور اس کا ثواب باقی ہے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے آخر قول میں یہ الفاظ ہیں: "وَأَيُّ نِعْمَةٍ أَفْضَلُ مِمَّا أُعْطِيَ دَاوُدُ وَسُلَيْمَانُ علیہما السلام" اگر صاحبِ فتح القدیر اس میں ذرا سا تامل فرماتے تو اُن کے استدلال کا پتا لگ جاتا۔ بھلا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ایسے شخص ہیں کہ ان کا استدلال بے معنی ہو۔ معاذ اللّٰه۔ ہماری سمجھ کا قصور ہے۔ عفا الله عنا و عنهم، اللهم أرنا الحق حقا، و الباطل باطلا، اللهم فصل و سلم و بارك عليه وعلىٰ آله و صحبه أجمعين آمين.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ ﴾ یعنی سلیمان علیہ السلام داود علیہ السلام کے علم و نبوت کے وارث ہوئے، یا کتب کے وارث ہوئے، اس بارے میں وہ ان کے قائم مقام ہوئے، باقی اولاد نہ ہوئی۔ امام قتادہ اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا کہ داود علیہ السلام کے انیس (۱۹) بیٹے مذکر تھے، ان میں سے سلیمان علیہ السلام نبوت کے وارث ہوئے۔ اگر مراد مال کی وراثت ہوتی تو سلیمان کا خاص کر ذکر نہ کیا جاتا، کیوں کہ اس میں ساری اولاد برابر ہے۔[1] اسی طرح جمہور مفسرین نے کہا ہے۔ چنانچہ یہ وراثت مجازی وراثت ہے، جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ»[2]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام داود علیہ السلام کی نبوت، ملک اور علم کے وارث ہوئے[3] اور وہ چیز دیے گئے جو داود علیہ السلام کو دی گئی تھی اور اُن کے لیے ہوا، جنوں اور شیاطین کی تسخیر زیادہ کی گئی اور حکومت کے لحاظ سے ان سے اعظم تھے اور اُن سے اقضیٰ تھے، یعنی فیصلہ کرنے میں ان سے بہتر تھے اور داود علیہ السلام از روئے تعبد (عبادت) سخت تر تھے سلیمان علیہ السلام سے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر کرنے والے تھے۔

﴿ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ ﴾ ﴿ عُلِّمْنَا ﴾ اور ﴿ اُوْتِيْنَا ﴾ کی ضمیروں میں سلیمان اور داود علیہما السلام دونوں مراد ہیں۔ (قاله في الجمل) اللہ پاک نے جن نعمتوں کا سلیمان علیہ السلام پر انعام کیا اور اُن کے ساتھ ان کو مخصوص فرمایا، ان کا بیان کرنے اور شکر کرنے کے لیے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ لوگو! ہم پرندوں کی بولی سکھائے گئے ہیں۔ ﴿ مَنْطِقَ الطَّيْرِ ﴾ سے مراد اس شے کا سمجھنا ہے جس کا ہر پرندہ ارادہ کرتا ہے، جس وقت وہ آواز کرتا ہے اور ان معانی کا سمجھنا جو اس کے جی میں ہیں۔

پرندوں کی آواز کا نام منطق اس لیے رکھا ہے کہ اس سے فہم حاصل ہوتا ہے، جس طرح کہ آدمیوں کے بات

[1] فتح القدير (٤/ ١٧١) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٥٤)

کرنے سے فہم حاصل ہوتا ہے۔ ﴿مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ کا ذکر پہلے اس لیے کیا کہ یہ ان کے لیے ایک خاص نعمت ہے، اس میں کوئی اور ان کا شریک نہیں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ سے مراد کلامِ طیر ہے۔ چنانچہ کلامِ طیر آدمی کی منطق کی طرح ٹھہرایا گیا ہے۔[1] آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس شے کو سمجھائے گئے ہیں جو پرندے کہتے ہیں۔ اس عبارت کا مقتضا یہ ہے کہ سلیمان اور داود علیہما السلام دونوں پرندوں کی آوازیں جانتے تھے اور ان کی مراد کو سمجھتے تھے۔ خطیب نے کہا: "عُلِّمْنَا، أَيْ: أَنَا وَأَبِيْ بِأَيْسَرِ أَمْرٍ وَّأَسْهَلِهِ" یعنی میں اور میرا باپ ہم نہایت سہل طور پر سکھائے گئے ہیں۔

(جمل میں کہا ہے کہ آیتِ کریمہ ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ ...﴾ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ داود وسلیمان علیہما السلام دونوں ہی پرندوں کی بولی جانتے تھے، حقیقت بھی اس طرح ہی ہے، لیکن داود علیہ السلام خصوصاً ان کی تسبیح کو اور سلیمان علیہ السلام خاص طور پر ان کی بولی کو سمجھتے تھے۔ خازن رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا﴾ اس علم سے ایک تو قضا و فیصلے اور سیاست کا علم ہے۔ نیز بطور خاص داود علیہ السلام کے پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کو سمجھنے کا علم اور سلیمان علیہ السلام کے خصوصاً پرندوں اور جانوروں کی بولی سمجھنے کا علم ہے۔[2]) تفسیر بیضاوی میں ہے کہ متعارف میں، یعنی عرفِ عام اور محاورے میں نطق ومنطق ہر وہ لفظ ہے جس کے ساتھ تعبیر کی جاتی ہے، اس شے سے جو دل میں ہے، خواہ یہ لفظ مفرد ہو یا مرکب، مفید ہو یا غیر مفید۔ کبھی اس کا اطلاق ہر اس شے پر ہوتا ہے جس کے ساتھ آواز کی جاتی ہے تشبیہ کی بنا پر یا تبع کی بنا پر، جیسے عرب کا یہ قول ہے: "نَطَقَتِ الْحَمَامَةُ" یعنی کبوتری نے آواز دی، اور اسی باب سے یہ ہے کہ حیوان کو ناطق اور جماد کو صامت کہتے ہیں، اس لیے کہ حیوانی آوازیں اس لحاظ سے کہ وہ تخیلات کے تابع ہیں، عبارتوں کے قائم مقام کی گئی ہیں خاص کر ان میں وہ آواز ہوتی ہے جو اُن کی اغراض کے مختلف ہونے کے سبب سے مختلف ہوتی ہے۔ اس طرح سے کہ جو اُن کی جنس سے ہوتا ہے، وہ اس کو سمجھ لیتا ہے۔ شاید سلیمان علیہ السلام جب کسی حیوان کی آواز سنتے ہوں تو اپنی قوتِ قدسی سے اس غرض کو جان لیتے ہوں، جس کے لیے اس نے آواز کی اور اس غرض کو جس کا اس نے قصد کیا ہو۔[3] انتھٰی.

("صوت" کی تشبیہ "نطق" کے ساتھ کسی امر پر دلالت کرنے میں ہے، اس صورت میں استعارہ مصرحہ ہوگا، یا آواز کرنے والے کی تشبیہ انسان سے دی ہے تو استعارہ بالکنایہ ہوگا اور "نطق" کا اثبات اس کے لیے تبع سے تخییل ہے، مراد مشاکلت ہے۔ "نَطَقَتِ الْحَمَامَةُ" تشبیہ کی مثال ہے اور ناطق وصامت تبع کا بیان ہے حیوان اور جماد کے لیے، چنانچہ ناطق کا اطلاق بالتبع حیوان کے واسطے ہے، یعنی واسطے مشاکلت کے، کیوں کہ جب جماد کا نام صامت رکھا گیا حقیقتاً تو اس کے غیر کا نام ناطق رکھا گیا مشاکلت تقدیری کے واسطے۔ كذا في القنوي)

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٧١) [2] تفسير الخازن (٥/ ١٣٥) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٦١)

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام سارے حیوانوں کی بولی کو جانتے تھے، صرف طیر کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان کے لشکروں میں سے ایک لشکر پرندوں کا تھا، جو سایہ کرنے کے لیے ان کے ساتھ چلا کرتا تھا، لہٰذا کثرتِ مداخل اور زیادہ آمد و رفت کی وجہ سے خاص کر کے ان کا ذکر کر دیا۔ امام قتادہ اور شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو خاصتاً پرندوں ہی کی بولی کا علم تھا، اگر کوئی کہے کہ چیونٹی کی بولی تو وہ سمجھتے تھے؟ تو یہ اعتراض نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ چیونٹی بھی جملہ طیور سے ہے، بہت وقت اس کے پر نکل آتے ہیں تو وہ اُڑنے لگتی ہے، اسی طرح کی وہ چیونٹی تھی، جس کی بات انھوں نے سنی تھی اور سمجھی تھی۔[1]

اس بارے میں ایک حدیث ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے زہد میں اور امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اور امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے ابو الصدیق ناجی سے اس کو روایت کیا ہے، پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے، کچھ الفاظ کا فرق ہے، اس روایت میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: «اَللّٰھُمَّ إِنَّا خَلْقٌ مِنْ خَلْقِكَ لَیْسَ بِنَا غِنًی عَنْ رِّزْقِكَ، فَإِمَّا أَنْ تَسْقِیَنَا وَإِمَّا أَنْ تُھْلِکَنَا»[2] امام خازن اور نسفی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیروں میں بعض طیور کی بولی کا ذکر کیا ہے اور جو قمری وغیرہ کہتی ہے اس کا بیان بھی کیا ہے، اسی طرح امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔[3] چوں کہ وہ روایتیں صحیح اسناد کے بغیر تھیں اور متصل نہیں تھیں، اس لیے ہم نے ان کو چھوڑ دیا، کیوں کہ تنقیح (صاف) کرنے والوں کے لیے اس میں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے۔

﴿ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ یعنی جس شے کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے، وہ سب ہم کو دی ہے، جیسے: علم، نبوت، حکمت، مال، تسخیرِ جن، انس، طیر، ہوائیں، وحشی جانور، چوپائے اور ہر وہ شے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے نونِ عظمت کے ساتھ فرمایا، یعنی صیغۂ متکلم دوسرے کے ساتھ بولا، حالاں کہ مراد خود انہی کی ذات ہے۔ تو اس سے غرض اپنے حال کا بیان ہے کہ میں سب کا مطاع ہوں، سارے میرے مطیع و فرماں بردار ہیں، کوئی میری مخالفت نہیں کرتا۔ جمع کا صیغہ انھوں نے تکبر اور تعظیمِ نفس کے لیے استعمال نہیں کیا، جس طرح کہ دنیا کے بادشاہ تکبر اور تجبر کی راہ سے خود کو "ما بدولت" کہتے ہیں۔ امام جعفر بن محمد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام مشارق و مغاربِ ارض کی بادشاہت دیے گئے، چنانچہ وہ سات سو برس اور چھے مہینے بادشاہ رہے، (تحبیر کی عبارت اوپر گزر چکی ہے، جس کے مطابق پچاس برس سے کچھ اوپر زندہ رہے۔ والله أعلم.)

سارے اہلِ دنیا کے مالک ہوئے، ہر شے ان کو عطا ہوئی اور اُن کے وقت میں صنائعِ معجبہ، (یعنی تعجب میں ڈالنے والی چیزیں بنائی گئیں) یہاں تک کہ جب اللہ نے ارادہ کیا کہ ان کو قبض کرے تو اُن کی طرف وحی کی کہ

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٧٢) [2] الدر المنثور (٦/ ٣٤٥)

[3] تفسير الخازن (٥/ ١٣٦) تفسير النسفي (٣/ ٢٠٦) تفسير القرطبي (١٣/ ١٦٥۔ ١٦٦)

امانت رکھ دے، یعنی اللہ کا علم وحکمت، اپنے بھائی کے پاس۔ داود علیہ السلام کی اولاد چار سو اسی مرد تھے نبی بلا رسالت کے۔[1] امام ذہبی رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول باطل ہے۔ سلیمان علیہ السلام کی عظمتِ ملک کے بارے میں قرطبی رحمہ اللہ وغیرہ سے قصے مروی ہیں۔[2] ان میں سے کچھ بھی ذکر کر کے دل خوش نہیں ہوتا، لہٰذا اُن کے ذکر سے باز آنا زیادہ بہتر ہے۔

﴿ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی بے شک یہ منطقِ طیر کی تعلیم اور ہر شے کا دیا جانا، جس کا ذکر کیا گیا یہ ایسا واضح اور ظاہر فضل ہے جو کسی سے پوشیدہ نہیں، یا یہ فضل ہماری فضیلت کو ظاہر کرنے والا ہے۔ یہ بات شکر ادا کرنے کے لیے کہی نہ کہ فخر کے طور سے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ ﴾ ﴿ حُشِرَ ﴾ کے معنی جمع کے ہیں، یعنی سلیمان علیہ السلام کے لیے جمع کیے گئے اس کے مختلف قسم کی جنسوں کے لشکر، اس کی مختلف جگہوں سے۔ مفسرین نے لشکر کی مقدار کے بارے میں طویل تحریریں کی ہیں، ان میں بہت سوں نے ایسا مبالغہ کیا ہے کہ عقلیں اس کو بعید جانتی ہیں اور وہ نقل کے لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہیں۔ بالفرض اگر صحیح ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں اس سے بھی بڑھ کر اور زیادہ ہو سکتا ہے۔

﴿ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ہر گروہ کے لیے "وَازِعِیْن"، یعنی داروغہ اور سردار تھے کہ وہ ان کے آگے آنے والوں کو آخر پر لوٹاتے تھے کہ اپنے اپنے مرتبے پر ٹھہریں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے لشکروں میں وزیر لوگ تھے، ان کو "نُقَبا" کہتے ہیں، یعنی لشکر کے سردار اور افسر جو اول لشکر کو آخر پر رد کرتے تھے، تا کہ چلنے میں آگے نہ بڑھ جائیں۔ جب کوئی شخص کسی کو باز رکھتا ہے اور روکتا ہے تو عرب محاورے میں اس وقت یوں بولتے ہیں: "وَزَعَهٗ يَزَعُهٗ وَزْعًا: كَفَّهٗ فَاتَّزَعَ" یعنی اس نے اس کو روکا تو وہ رُک گیا اور "أَوْزَعَهٗ بِالشَّيْءِ" کے معنی ہیں کہ فلاں نے فلاں کو شے کے ساتھ برانگیختہ و آمادہ کیا۔ "وَاسْتَوْزَعْتُ اللّٰهَ شُكْرَهٗ فَأَوْزَعَنِيْ" کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اس کے شکر کا الہام مانگا تو اس نے مجھے اس کا الہام کیا۔ لڑائی میں "وَازِعٌ" اس شخص کو کہتے ہیں جو لشکر کی صفوں میں مقرر ہوتا ہے، ان میں سے جو آگے بڑھتا ہے اس کو روکتا ہے۔ "وَازِعٌ" کی جمع "وَزَعَةٌ" آتی ہے، اسی معنی سے کسی شاعر کا قول ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَزَعْهُ لُبُّهٗ وَحَيَاؤُهٗ فَلَيْسَ لَهٗ مِنْ شِيْبِ فَوْدَيْهِ وَازِعُ

جس شخص کو اس کی عقل اور حیا و شرم معاصی سے باز نہیں رکھتی تو اس کو اس کے سر کے دونوں کناروں کی سفیدی باز رکھنے والی نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ اصل میں معاصی اور بے ہودہ باتوں سے باز رکھنے والی عقل اور حیا ہوتی ہے، جب اس نے باز نہ رکھا تو سر کے بالوں کا سفید ہونا کیا باز رکھے گا۔ کسی اور نے کیا خوب کہا ہے:

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٦٤٣) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٣٧۔ ٤٣٨)

وَلَا يَزَعُ النَّفْسَ اللَّجُوجَ عَنِ الْهَوَى مِنَ النَّاسِ إِلَّا وَافِرُ الْعَقْلِ كَامِلُهُ

یعنی جس شخص کی عقل وافر کامل ہے، وہی جھگڑالو نفس کو خواہش سے باز رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بے عقل اور کم عقل نفسانی خواہشات کا غلام اور مطیع ہوتا ہے۔

غرض کہ "وزع" کے معنی باز رکھنے کے اور اول و آخر لشکر کے جمع کرنے کے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ توزیع بہ معنی تفریق سے ماخوذ ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "اَلْقَوْمُ أَوْزَاعٌ: أَيْ طَوَائِفُ" یعنی لوگ گروہ گروہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ يُوْزَعُوْنَ ﴾ کے معنی "يُدْفَعُوْنَ" ہیں۔[1] ان کا دوسرا قول پہلے گزر چکا ہے۔ آیتِ کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ امام اور حاکم وازعین کو رکھیں، تاکہ وہ لوگوں کو باہم کسی پر دستِ تطاول دراز کرنے سے باز رکھیں اور منع کریں، تاکہ کوئی بھی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرنے پائے، کیوں کہ خود حکام سے یہ کام ممکن نہیں، ایک آدمی اکیلا یہ کام کس طرح کر سکتا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ وَازِعٍ، أَيْ: مِنْ سُلْطَانٍ يَكُفُّهُمْ"[2] یعنی لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کا کوئی بادشاہ ہو کہ ان کو ظلم و زیادتی سے باز رکھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ﴾ یہ وہ ﴿ حَتّٰۤى ﴾ ہے جس کے بعد کلام شروع کیا جاتا ہے اور اپنے سے پہلے کلام کی انتہا ہوتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ لشکر روکے جاتے تھے، اس اخیر کے پاس حاضر ہونے تک، وہ اخیر یہی ان کا وادیِ نمل پر آنا ہے، یعنی پھر وہ چلتے رہے، اس حال میں کہ ان کا بعض بعض کی مفارقت سے روکا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب وہ اس جگہ پر آئے جہاں پر بہت سی چیونٹیاں تھیں۔ ﴿ عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ﴾ متعلق ہے ﴿ اَتَوْا ﴾ سے۔ کلمۂ ﴿ عَلٰى ﴾ کے ساتھ اس لیے متعدی کیا گیا ہے کہ وہ لوگ ہوا پر اٹھائے ہوئے تھے، چنانچہ وہ بلند تھے، یعنی زمین سے اوپر کی جانب میں تھے۔ یا معنی یہ ہیں کہ جب انھوں نے اس وادی کو عبور کیا اور اس کے آخر میں پہنچے۔ (یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ "أَتَيْتُ عَلَيْهِ إِذَا قَطَعْتَهُ وَبَلَغْتَ آخِرَهُ")

سارے قاریوں نے ﴿ وَادِ ﴾ پر وقف کیا ہے، بدون حرفِ یا اتباعِ رسم کے واسطے، اس لحاظ سے کہ التقائے ساکنین کی وجہ سے وہ حذف نہیں کیا گیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴾ [الفجر: ٩] "اور ثمود کے ساتھ جو وادی میں چٹانیں تراشتے تھے۔" مگر کسائی کہ اس نے بہ حرفِ یائے تحتیہ وقف کیا ہے، کہا اس لیے کہ حذف کا موجب صرف التقائے ساکنین تھا بوجہ وصل کے۔ کعب نے کہا ہے کہ ﴿ وَادِ النَّمْلِ ﴾ طائف میں تھی۔ امام قتادہ اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شام میں۔[3] اس وادی کی چیونٹیاں چھوٹی تھیں۔ یہی نمل معروف یا بڑی تھیں، یعنی بختی اونٹوں کی طرح یا مکھیوں کی طرح پہلا قول مشہور ہے۔ (ذكره الحفناوي)

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٠١) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ١٦٨) [3] فتح القدير (٤/ ١٧٢)

نمل ایک معروف حیوان ہے۔ اس کا احساس اور سونگھنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے، یہاں تک کہ چیونٹی شے کو دور سے سونگھ لیتی ہے اور اپنا قوت (غذا) ذخیرہ کر رکھتی ہے شدتِ ادراک کی وجہ سے۔ دانے کے دوٹکڑے کر دیتی ہے اُگنے کے خوف سے اور ٹوٹے ہوئے دانے کے چار ٹکڑے کر دیتی ہے اس خوف سے کہ جب دانے کے دوٹکڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اُگ پڑتا ہے اور سال بھر میں جتنا جمع کرتی ہے اس کا آدھا کھاتی ہے اور آدھے کو باقی رکھ چھوڑتی ہے۔

﴿ قَالَتۡ نَمۡلَةٌ ﴾ ﴿ اِذَآ ﴾ کا جواب ہے، گویا جس وقت اس نے سلیمان علیہ السلام کے لشکروں کو وادی کی طرف متوجہ دیکھا تو بھاگی اور ساری چیونٹیوں کو اس طرح ندا کر کے آگاہ کیا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰكِنَكُمۡ لَا يَحۡطِمَنَّكُمۡ سُلَيۡمٰنُ وَجُنُوۡدُهٗ وَهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴾ یہ نملہ چیونٹیوں کی بادشاہ تھی اور یہ بات اس نے نصیحت اور خیر خواہی کے طور پر کہی، ایسے قول سے کہ وہ حروف اور آوازوں پر مشتمل تھا۔ یہ چیونٹی لنگڑی تھی، دو بازو والی۔ یہ ان حیوانات میں سے ہے جو جنت میں داخل ہوں گے، سلیمان جمل نے اس کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ چیونٹی مادہ تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ ﴿ قَالَتۡ ﴾ صیغہ واحد مؤنث غائب کا ہے، اس فعل کا اس کی طرف اسناد کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ مؤنث تھی۔

حکایت:

امام زمخشری رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ قتادہ رحمہ اللہ پر ٹھہرے اور قتادہ رحمہ اللہ کہہ رہے تھے کہ مجھ سے پوچھو، مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ جس کسی نے جو مسئلہ پوچھنا ہے سو پوچھو۔ امام صاحب نے کسی شخص کو حکم دیا کہ وہ قتادہ رحمہ اللہ سے پوچھے کہ سلیمان علیہ السلام کی نملہ نر تھا یا مادہ تھی؟ اس شخص نے پوچھا تو قتادہ رحمہ اللہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر کسی نے امام صاحب سے پوچھا تو فرمایا کہ وہ مادہ تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ نے کس طرح پہچانا، فرمایا: اللہ پاک نے ﴿ قَالَتۡ ﴾ فرمایا ہے، اگر مادہ نہ ہوتی تو "قال" فرماتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نملہ مثل حمامة (کبوتر) و شاۃ (بکری) کے ہے، اس بات میں کہ یہ نر اور مادہ دونوں پر برابر بولے جاتے ہیں اور نر اور مادہ کے درمیان علامت سے تمیز کی جاتی ہے، مثلاً: نر کہنا منظور ہو تو کہتے ہیں: "حَمَامَةٌ ذَكَرٌ" اور مادہ کہنا ہو تو کہتے ہیں: "حَمَامَةٌ أُنْثَى".[1] انتہیٰ

امام ابو حیان رحمہ اللہ نے اس کا یوں رد کیا ہے کہ ﴿ قَالَتۡ ﴾ میں تا کا الحاق اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ نملہ مادہ تھی، بلکہ مذکر میں ﴿ قَالَتۡ نَمۡلَةٌ ﴾ کہنا صحیح ہے، اس لیے کہ اگر ﴿ نَمۡلَةٌ ﴾ تا کے ساتھ ہے تو یہ اس قسم سے ہے کہ اس میں مذکر کی مؤنث سے تمیز نہیں کی جاتی فعل تذکیر و تانیث کے ساتھ، بلکہ ذکر یا اُنثی کے ساتھ اس کی خبر دے کر تمیز ہوتی ہے۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اس قصے کو ذکر فرمایا ہے، لیکن عبارت میں کچھ فرق ہے، آخر میں یہ کہا ہے کہ "هُوَ وَهِيَ"[3] ان کی غرض یہ ہے کہ جن لفظوں میں مفرد و جمع کا فرق صرف حرفِ تا سے ہوتا ہے اور مذکر اور

[1] الكشاف (٣/ ٣٦١) [2] البحر المحيط (٧/ ٥٩) [3] تفسير النسفي (٣/ ٢٠٧)

مؤنث پر برابر ان کا اطلاق ہوتا ہے، ان میں مذکر ومؤنث کی تمیز دو طرح سے ہوتی ہے: ایک ذکر یا اُنثی کہنے سے، یا مذکر ومؤنث کی ضمیر استعمال کرنے سے، گویا اس میں امام ابو حیان کے قول کا رد ہے۔

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ﴿ قَالَتْ نَمْلَةٌ ﴾ میں ﴿ نَمْلَةٌ ﴾ کا لفظ مؤنث حقیقی ہے، علامتِ تانیث کی وجہ سے، اس لیے کہ ﴿ نَمْلَةٌ ﴾ کا اطلاق مذکر ومؤنث پر کیا جاتا ہے، پھر جب اس کی تمیز کا ارادہ کیا جاتا ہے تو کسی اور خارجی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے "نَمْلَةٌ ذَكَرٌ وَنَمْلَةٌ أُنْثَى" اور اسی طرح "حَمَامَةٌ" اور "يَمَامَةٌ" کا لفظ ہے مونثاتِ لفظیہ سے، پھر وہی قصہ امام صاحب کا امام رازی سے نقل کیا ہے، ان الفاظ سے کہ "ذَكَرَ الْإِمَامُ أَنَّ قَتَادَةَ دَخَلَ الْكُوفَةَ... الخ" اس کے بعد "انتهى" کہہ کر یہ کہا ہے کہ تانیث ایک لفظی ہے اور ایک معنوی ہے، لفظی کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے لحوق میں علامتِ تانیث کے ساتھ فعل کے بالکل بہ دلیل اس بات کے کہ طلحہ وحمزہ، جبکہ اسمِ علم ہوں مذکر کے تو "قَامَتْ طَلْحَةُ وَحَمْزَةُ" کہنا جائز نہیں ہے، چنانچہ یہ بات متعین ہوگئی کہ علامتِ تانیث کا لحوق صرف تانیث معنوی کے سبب سے ہوتا ہے۔ اس نملہ کا نام طاخیۃ ومنذرہ تھا۔[1] (ذكره النسفي) کسی نے کہا ہے کہ جرمی۔[2] (ذكره الخازن). امام حسن، امام طلحہ اور معمر بن سلیمان رحمہ اللہ نے "اَلنَّمُلُ" اور "اَلنَّمُلَةُ" بفتحِ نون وضمِ میم بروزن "رَجُلٌ" و "سَمُرَةٌ" پڑھا ہے۔ سلیمان تیمی نے دونوں کو بضمتین پڑھا ہے۔[3]

"نملة" کے اس قول میں گیارہ قسم کی بلاغت ہے: پہلی نوع ندا بہ حرفِ یا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ کلمہ "أَيُّ" کے ساتھ کنایہ کیا ہے۔ تیسرے ہائے تنبیہ کے ساتھ تنبیہ کی ہے۔ چوتھے اپنے قول میں نمل کا نام لیا۔ پانچویں ﴿ اُدْخُلُوْا ﴾ کا امر کیا۔ چھٹے ﴿ مَسٰكِنَكُمْ ﴾ کی تصریح کی، چونکہ نمل نے اس خطاب کو سمجھا، اس لیے ان کو خطاب کیا عقلاء کے خطاب کی طرح۔ "مساكن" سے مراد وہ جگہ ہے، جہاں چیونٹیاں رہتی ہیں۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے "أُدْخُلْنَ مَسَاكِنَكُنَّ" پڑھا ہے اور شہر بن حوشب نے "مَسْكَنَكُمْ"۔[4] ساتویں نوع یہ ہے کہ ﴿ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ ﴾ کہہ کر ڈرایا۔ "حطم" "كسر" کو کہتے ہیں۔ "كسر" بہ معنی شکستن ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "حَطَمْتُهُ حَطْمًا أَيْ: كَسَرْتُهُ كَسْرًا فَانْحَطَمَ وَتَحَطَّمَ أَيْ: تَكَسَّرَ" یعنی میں نے فلاں شے کو اس طرح توڑا کہ وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی۔ "تحطيم" بہ معنی "تكسير" ہے۔

"حطام" وہ شے ہے جو خشک ہونے سے ٹوٹ جاتی ہے، ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ یہ نہی ظاہر میں تو سلیمان علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو ہے، یعنی لشکروں کو اور حقیقت میں نمل کو ہے، یعنی تم ایسی جگہ مت رہو کہ وہ تمھیں پیس ڈالیں، جس طرح کہ یہ قول ہے: "لَا أَرَيَنَّكَ هٰهُنَا"۔ یہ نہی مستانف ہے ماقبل سے، اس کو اعراب کا کچھ تعلق

[1] تفسير النسفي (٣/ ٢٠٧) [2] تفسير الخازن (٥/ ١٣٨) [3] فتح القدير (٤/ ١٧٣) [4] تفسير القرطبي (١٣/ ١٧٠)

نہیں۔ یا جملہ امر سے بدل ہے، یعنی ﴿ اُدْخُلُوْا ﴾، یا امر کا جواب ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وجہ نہ بنے گی، مگر اعمش کی قراءت کی بنا پر، کیوں کہ اس نے "لَا یَحْطِمْکُمْ" بہ جزم بغیر نون تاکید کے پڑھا ہے، اور نون تاکید کے ساتھ جائز نہیں ہے، مگر شعر میں۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شعر میں قلیل ہے۔ امام حسن، امام ابو رجاء، قتادہ اور عیسیٰ ہمدانی رحمہم اللہ نے بضمِ "یا"، فتحِ "حا" اور تشدیدِ "طا" پڑھا ہے۔ امام ابن ابی اسحاق، یعقوب اور ابو عمر رحمہم اللہ نے ایک روایت میں بہ سکونِ نونِ تاکید پڑھا ہے۔[1]

آٹھویں نوع یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو خاص کیا۔ نویں یہ ہے کہ ﴿ وَجُنُوْدُهٗ ﴾ کہہ کر عموم کیا۔ اس کی مراد یہ ہے کہ "لَا یَحْطِمَنَّکُمْ جُنُوْدُ سُلَیْمَانَ"، لیکن اس طرح نہ کہا اور ﴿ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ﴾ کہا، اس لیے کہ اس میں مبالغہ زیادہ ہے۔ دسویں یہ ہے کہ اپنے قول سے اشارہ کیا: ﴿ وَهُمْ ﴾۔ گیارھویں یہ ہے کہ ﴿ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ کہہ کر عذر کر دیا۔ یہ جملہ موضع نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ يَحْطِمَنَّكُمْ ﴾ کے فاعل سے، یعنی وہ تم کو پیس نہ ڈالیں، اس حال میں کہ ان کو تمھارے پیس ڈالنے کا علم نہ ہو اور تمھارے مکان کی خبر نہ رکھتے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو علم ہوگا تو ایسا نہ کریں گے۔ یہ بات عذر کے طور پر ان کو موصوف بہ عدل کر کے کہی، گویا وہ اس بات کو جان چکے تھے کہ نبی معصوم ہوتا ہے اور اس کا لشکر محفوظ۔ چنانچہ ان سے ان حیوانوں کا پیس ڈالنا واقع نہ ہوگا، مگر بھول کر۔ اس میں اس بات پر عظیم تنبیہ ہے کہ انبیا علیہم السلام اور ان کے اصحاب کی عصمت کی حفاظت کا ارادہ اور اہتمام کرنا واجب ہے اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ فرقہ رافضیہ جو ظلم اور ہضم و کسرِ حقوق کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی طرف کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت و عترت کے حق میں تو یہ لوگ اس چیونٹی سے بھی کم عقل اور رائے میں ضعیف تر ہیں، کیوں کہ اس نے تو سلیمان علیہ السلام کے جنود میں عدل کا اعتقاد کیا اور یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے حق میں ظلم کے معتقد ہوئے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بہ کجا

کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ چیونٹیاں اس کا شعور نہیں رکھتیں کہ سلیمان علیہ السلام اس کی بات کو سمجھتے ہیں۔ یہ قول نہایت بعید ہے۔ ﴿ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا ﴾ محذوف پر تفریع ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَسَمِعَ قَوْلَهَا الْمَذْكُوْرَ فَتَبَسَّمَ"، یعنی نملہ نے جو بات کہی تھی، سلیمان علیہ السلام نے اس کو سن لیا تو ابتدا میں مسکرائے اور آخر میں ہنس پڑے۔ جمہور کی قراءت ﴿ ضَاحِكًا ﴾ ہے۔ یہ حالِ موکدہ ہے، اس لیے کہ "ضحك" "تبسم" کی نسبت زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی نے کہا: حالِ مقدر ہے، اس لیے "تبسم" "ضحك" کا شروع ہے۔ کسی نے کہا: چوں کہ تبسم کبھی غضب کے طور پر ہوتا ہے، اس لیے "ضحك" اس کو واضح کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا "ضحك" صرف تبسم ہوتا ہے۔ ابن سمیفع نے "ضِحْكًا" پڑھا ہے کہ "ضِحْكًا" مصدر منصوب ہوگا فعل محذوف کا، یا موضعِ حال میں ہوگا۔[2]

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٧٣) [2] فتح القدير (٤/ ١٧٣)

تبسم وضحک وقہقہہ ان میں سے ہر ایک سے منہ کھل جاتا ہے، لیکن پہلا تو یہ ہے کہ اس میں بغیر آواز کے منہ کا کھلنا ہے، اس میں بالکل آواز نہیں ہوتی۔ دوسرا منہ کا ہلکی آواز کے ساتھ کھلنا ہے اور تیسرا زور کی آواز سے منہ کا کھلنا ہے۔ ان کے ہنسنے کا سبب یا تو یہ ہے کہ اس کے قول وفہم سے تعجب کیا اور اس بات سے کہ وہ اُور چیونٹیوں کے ڈرانے میں کامیاب ہوگئی۔ یا اپنا عدل ظاہر ہونے کی وجہ سے خوش ہوئے۔ یا اس بات سے خوشی ہوئی کہ اللہ پاک نے ان کو ایسی شے عطا کی جو کسی کو عطا نہیں فرمائی، وہ یہی کہ انھوں نے چیونٹی کی بات سمجھ لی۔ یا آدمی جب کوئی ایسی شے دیکھتا ہے یا سنتا ہے جس کو پہلے سے نہیں جانتا تو تعجب کرتا ہے اور ہنستا ہے۔ غرضیکہ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی بات تین میل کی مسافت سے سنی تھی، ہوا اس آواز کو اٹھا لائی تھی۔

پھر جب وہ چیونٹیوں کی وادی کے قریب پہنچے تو اپنے لشکر کو روک لیا، یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے گھروں میں گھس گئیں۔ ان کے لشکر میں سوار اور پیادہ دونوں قسم کے لوگ تھے۔[1] جمل نے ذکر کیا ہے کہ اس وقت کے سوا وہ اور اُن کا لشکر ایک فرش (بچھونے) پر سوار ہوتے تھے اوز ہوا ان کو لے کر چلتی تھی، لیکن اس وقت ان کے سوار اور پیدل چلنے کا سبب وہ ہے جسے خطیب نے اشارتاً بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام تیز ہوا کو حکم دیتے تو ان کو اٹھا لیتی، پھر نرم ہوا کو حکم فرماتے تو وہ اُن کو ایک ماہ کی راہ لے کر چلتی، اللہ پاک نے ان کے پاس اس حال میں وحی بھیجی کہ وہ زمین اور آسمان کے درمیان جا رہے تھے کہ میں نے تیرے ملک (بادشاہت) میں اضافہ کیا، اس طرح کہ خلائق میں جو بھی کوئی کچھ بات کرے گا تو اس کو ہوا لائے گی، پھر تجھے اس کی خبر دے گی۔

نقل کیا گیا ہے کہ ایک کشتکار (کسان) پر اُن کا گزر ہوا تو اس نے کہا کہ البتہ یقینی طور پر آلِ داود عظیم ملک دیے گئے ہیں۔ ہوا نے یہ بات سلیمان علیہ السلام کے کان میں ڈال دی تو وہ اترے اور کشتکار کی طرف چلے اور کہا کہ میں تیری طرف چل کر آیا ہوں، تاکہ تو اس شے کی تمنا نہ کرے جس پر تو قادر نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا: البتہ ایک تسبیح جس کو اللہ تعالیٰ قبول فرمالے اس چیز سے بہتر ہے جو آلِ داود کو دی گئی۔ سلیمان علیہ السلام ان لوگوں کے ہمراہ پیدل چلتے رہے جو اُن کے ساتھ تھے، یہاں تک کہ وادیِ نمل کے قریب آئے۔ الخ

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تو کہے کہ سلیمان علیہ السلام اور اُن کے لشکروں سے یہ کیسے تصور ہوسکتا ہے کہ وہ حطم کریں گے (کچل دیں گے) حالاں کہ وہ تو ہوا کی پشت پر ایک فرش کے اوپر ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ گویا انھوں نے وادی کے ختم ہوتے ہی اترنے کا ارادہ کیا، اس لیے چیونٹی نے کہا: ﴿ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ﴾ کیوں کہ جب تک ہوا زمین وآسمان کے درمیان انھیں اٹھائے ہوئے ہے تو اس وقت تک ان کے حطم کا خوف نہیں کیا جاسکتا۔[2] سلیمان جمل نے ذکر کیا ہے کہ امام ابو اسحاق ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے بعض کتب میں دیکھا ہے

[1] تفسیر الجلالین (١/ ٤٩٦) [2] تفسیر الخازن (٥/ ١٣٨)

کہ سلیمان علیہ السلام نے نملہ سے کہا: تو نے چیونٹیوں کو کیوں ڈرایا، کیا تو نے میرے ظلم سے خوف کیا۔ کیا تو نے نہ جانا کہ میں یقینی طور پر نبیِ عدل ہوں، پھر تو نے اس طرح کیوں کہا: ﴿ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ﴾؟

پس نملہ نے کہا: کیا تو نے میرا قول نہیں سنا: ﴿ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ اس کے باوجود میں نے حطمِ نفوس کا ارادہ نہیں کیا، میں نے جو ارادہ کیا ہے وہ حطمِ قلوب کا ہے، اس خوف سے کہ وہ اس جیسی شے کی تمنا کریں جو تم کو عطا ہوئی ہے اور دنیا کے ساتھ آزمائش میں پڑیں اور تمھاری بادشاہت کی طرف نظر کرنے کی وجہ سے تسبیح اور ذکر اللہ سے باز رہ جائیں۔ پھر جب وہ سلیمان علیہ السلام کے ساتھ بات کر چکی تو دوڑتی ہوئی اپنی قوم کی طرف چلی اور کہا: کیا تمھارے پاس کوئی چیز ہے جس کو ہم اللہ کے نبی کی طرف ہدیہ کریں؟ چیونٹیاں بولیں: ہمارے پاس جو چیز ہے وہ تو ایک بے وقعت چیز ہے جس کا ہم ان کو ہدیہ دیں۔ واللہ! ہمارے پاس کچھ نہیں سوائے ایک بیر کے۔ وہ بولی: اچھا ہے تم اس کو میرے پاس لے آؤ، وہ اس کو لے آئیں تو اس نے اس کو اپنے منہ میں اٹھا لیا اور اس کو کھینچتی ہوئی لے چلی۔ اللہ پاک نے ہوا کو حکم دیا تو اس نے اس کو اٹھا لیا اور فرش پر جو جن، انسان، علما اور انبیاء علیہم السلام تھے، ان سب کو چیرتی پھاڑتی آئی، یہاں تک کہ ان کے روبرو کھڑی ہوئی۔ پھر وہ بیر اپنے منہ سے ان کے منہ میں رکھ دیا اور یہ اشعار پڑھنے لگی:

أَلَمْ تَرَنَا نُهْدِيْ إِلَى اللّٰهِ مَالَهُ وَإِنْ كَانَ عَنْهُ ذَا غِنًى فَهُوَ قَابِلُه
وَلَوْ كَانَ يُهْدَى لِلْجَلِيْلِ بِقَدْرِهِ لَقَصَّرَ عَنْهُ الْبَحْرُ يَوْمًا وَسَاحِلُه
وَلٰكِنَّنَا نُهْدِيْ إِلَى مَنْ نُحِبُّهُ فَيَرْضَى بِهَا عَنَّا وَيُشْكَرُ فَاعِلُه
وَمَا ذَاكَ إِلَّا مِنْ كَرِيْمِ فِعَالِهِ وَإِلَّا فَمَا فِيْ مُلْكِنَا مَا يُشَاكِلُه

''کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ہم اللہ کی جناب میں اس کے دیے ہوئے مال سے ہدیہ پیش کرتے ہیں، اگرچہ وہ اس سے بے پروا ہے مگر پھر بھی اسے شرفِ قبولیت بخش دیتا ہے۔ اگر کسی عظیم القدر کو اس کی حیثیت کے مطابق ہدیہ پیش کیا جاتا ہوتا تو سمندر اور اس کا ساحل بھی اس کے ادا کرنے سے قاصر رہتے، مگر ہم بے دھڑک اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کر دیتے ہیں جس سے ہم محبت کرتے ہوتے ہیں، لہٰذا وہ اس ہدیے کے سبب ہم سے راضی ہو جاتا ہے اور ہدیہ پیش کرنے والا مشکور ہوتا ہے۔ اس حقیر سے ہدیے کو قبول کرنا اس کی طرف سے ذرہ نوازی ہے، ورنہ اس کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے اس کے شایانِ شان ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔''

پس سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ''بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكُمْ، فَهُمْ بِتِلْكَ الدَّعْوَةِ أَشْكَرُ خَلْقِ اللّٰهِ وَأَكْثَرُ خَلْقِ

اللّٰہِ۔"[1] غرضیکہ سلیمان علیہ السلام اس کی بات سن کر مسکرا کر ہنس پڑے اور یہ دعا فرمائی: ﴿ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰى وَالِدَیَّ ﴾. ﴿ اَوْزِعْنِیْٓ ﴾ کے معنی لفظ ﴿ یُوْزَعُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں ابھی گزر چکے ہیں۔ کشاف میں ہے ﴿ اَوْزِعْنِیْٓ ﴾ کی حقیقت یہ ہے: "اِجعَلْنِي أَزَعُ شُكْرَ نِعْمَتِكَ عِنْدِيْ وَأَكُفُّهُ وَأَرْتَبِطُهُ لَا يَنْفَلِتُ عَنِّيْ حَتّٰى لَا أَنْفَكُّ شَاكِرًا لَّكَ"[2] انتھٰی. یعنی اے میرے رب! کر مجھ کو کہ میں تیری نعمت کے شکر کو اپنے پاس باز رکھوں اور اس کو روکوں اور باندھ رکھوں مجھ سے چھوٹ نہ جائے، یہاں تک کہ میں ہر دم تیرا شاکر رہوں۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَوْزِعْنِیْٓ ﴾ کے معنی "أَلْهِمْنِيْ" ہیں۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔[4] محاورے میں بولتے ہیں: "فُلَانٌ مُوْزَعٌ بِكَذَا، أَيْ مُوْلَعٌ بِهٖ" یعنی فلاں شخص فلاں شے کا فریفتہ اور شیفتہ ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی اصل "وزع" سے ہے۔ گویا یوں کہا کہ تو مجھے اس شے سے روک جو تجھے خفا کرے۔[5] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو مجھ کو اس بات سے روک کہ میں تیری ناشکری کروں۔[6] یہ تفسیر فعل لازم کے ساتھ ہے۔

﴿ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ ﴾ ﴿ اَوْزِعْنِیْٓ ﴾ کا مفعولِ ثانی ہے۔ نعمت سے مراد نبوت، ملک اور علم ہے۔ ﴿ وَعَلٰى وَالِدَیَّ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اس بات کی دعا مانگی کہ جو نعمت اللہ پاک نے ان کے والدین کو عطا فرمائی، اس کے شکر کا ان کو الہام کرے، جس طرح کہ خود اُن کی نعمت کے شکر کا ان کو الہام کیا، اس لیے کہ والدین پر انعام بھی ان پر انعام ہے اور اس لائق ہے کہ ان کی طرف سے اللہ پاک کا شکر ادا کیا جائے۔ اہلِ کتاب نے کہا ہے کہ ان کی والدہ زوجۂ اوریا بروزن "قوتلا" ہے جس کے ساتھ اللہ پاک نے داود علیہ السلام کا امتحان کیا تھا۔[7]

(قاله القرطبي والله أعلم بصحته)

پھر یہ بات طلب کی کہ اللہ پاک لواحق نعم (موجودہ نعمتوں) کو سوابق نعم (سابقہ نعمتوں) کے ساتھ ان کے لیے ملا دے، خاص کر وہ نعمتیں جو دینی ہیں، چنانچہ کہا: ﴿ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ ﴾ یعنی اے اللہ! تو مجھے اس بات کا الہام کر کہ میں نیک کام کروں اپنی بقیہ عمر میں، جس کو تو مجھ سے پسند فرمائے۔

پھر یہ دعا کی کہ اللہ پاک ان کو آخرت میں صالحین کے زمرے کے ساتھ شامل کرے، کیوں کہ یہ وہی انتہا ہے جس کو کہ طلب کیا جاتا ہے۔ کہا: ﴿ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾ یعنی تو مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل کر، مراد انبیاء علیہم السلام ہیں یا صلحائے عباد۔ معنی یہ ہیں کہ تو مجھ کو داخل کر اُن کے زمرے میں اور

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٧١۔ ١٧٢) [2] الكشاف (٣/ ٣٦٢) [3] فتح القدير (٤/ ١٧٣)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٥٨) فتح القدير (٤/ ١٧٨) [5] تفسير القرطبي (١٣/ ١٧٦) [6] معاني القرآن (٤/ ١١٢۔ ١١٣)
[7] تفسير القرطبي (١٣/ ١٧٦)

میرا نام ان کے ناموں میں ثبت کر اور میرا حشر ان کے زمرے میں کر، دارِ صالحین کی طرف کہ وہ بہشت عنبر سرشت ہے۔ یا کلمۂ ﴿ فِيْ ﴾ "مع" کے معنی میں ہے۔ صالح کامل وہی ہے جو اللہ پاک کی نافرمانی نہیں کرتا اور نہ معصیت کا کام کرتا ہے، نہ اس کا ارادہ کرتا ہے، نہ اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہ ایک درجۂ عالی ہے۔

الٰہی! اور میں تجھ سے اسی شے کی دعا کرتا ہوں جس کی دعا اس نبیِ کریم نے کی ہے پس تو اس کو مجھ سے قبول کر اور اس کا مجھ پر تفضّل فرما، پس بے شک میں اگرچہ عمل میں کمی کرنے والا ہوں، لیکن تیرا فضل جو بہت وسیع ہے، پس فوز بالخیر (کامیابی) کا سبب وہی ہے اور میرے نزدیک تیری رحمت میرے اپنے عمل سے زیادہ ارجیٰ ہے (جس کی زیادہ اُمید کی جائے)۔ پس یہ آیتِ کریمہ بہت بلند آواز اور واضح تر بیان سے پکار رہی ہے کہ جنت میں داخلہ جو متقین کا ٹھکانا ہے محض تیرے تفضّل سے ہے نہ کہ اُن کے عمل کے سبب سے، جس طرح کہ تیرے رسولِ کریم رؤف و رحیم صادق و مصدوق ﷺ نے فرمایا ہے۔ اس حدیث میں جو اُن سے صحیح میں ثابت ہوئی ہے: « سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاعْلَمُوْا أَنَّهُ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ أَحَدٌ بِعَمَلِهِ » قَالُوْا: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟! قَالَ: « وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ »[1]

پھر جب اس میں داخلہ تیرے ہی فضلِ واسع سے ہے تو اس کی تجھ سے طلب کرنے کو ترک کرنا عجز ہے اور تیری طرف توسل کرنے میں کمی کرنا تضییع ہے۔ پھر اللہ پاک نے بلقیس کا قصہ شروع کیا اور جو کچھ اس کے اور سلیمان علیہ السلام کے درمیان گزرا اس کا بیان کیا۔ یہ سب کچھ ہد ہد کی دلالت اور معرفت سے ہوا۔[2] چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝٢٠ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝٢١

اور اس نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا: کیا بات ہے کہ میں ہد ہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں (کیا وہ موجود ہے) یا وہ غیر حاضروں میں ہے (20) (یہی بات ہے تو) میں اسے ضرور سخت سزا دوں گا، یا اسے ذبح ہی کر دوں گا یا وہ میرے پاس کوئی واضح دلیل لائے (21)

سلیمان علیہ السلام کا پرندوں کا جائزہ لینا اور ہد ہد کی غیر حاضری:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ وغیرہما نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ ہدہد مہندس (انجینئر) تھا۔ مہندس اندازہ لینے والے کو کہتے ہیں۔ ہنداز سے مشتق ہے ہنداز اندازہ کا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٨)
[2] فتح البيان (١٠/ ١٩۔ ٢٨)

معرب ہے، حرفِ زا کو سین کر لیا ہے۔ فارسی ''مُعَرَّب'' ہے۔ سلیمان علیہ السلام کو پانی پر آگاہی دیا کرتا تھا جس وقت وہ بیابان میں ہوتے تو اس کو طلب فرماتے تو وہ زمین کی تہ میں سے ان کے لیے پانی کو دیکھتا جس طرح کہ آدمی روئے زمین پر کسی ظاہر شے کو دیکھتا ہے اور پہچان لیتا ہے کہ اس کے بعد کی روئے زمین سے کتنی پیمائش ہے۔ پھر جب وہ اُن کو اس پر آگاہ کر دیتا تو سلیمان علیہ السلام جنوں کو حکم دیتے۔ پھر وہ اس جگہ کو ان کے لیے کھودتے، یہاں تک کہ اس کی تہہ سے پانی نکالا جاتا۔

ایک دن سلیمان علیہ السلام ایک زمین بیابان میں اترے تو انھوں نے پرندوں کی خبر لی، یعنی حاضری لی، تاکہ ہدہد کو دیکھیں۔ اس کو نہ پایا۔ چنانچہ فرمایا: کیا ہے کہ ہدہد نظر نہیں آ رہا، کیا وہ غائب ہے؟ ایک دن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی کے مثل حدیث بیان کی، لوگوں میں خارجیوں کا ایک شخص تھا، اس کو نافع بن ارزق کہتے تھے، یہ شخص سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر اعتراض بہت کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے ان سے کہا: اے عبداللہ بن عباس! ٹھہر آج میں غالب ہوا۔ وہ بولے: کیوں؟ کہا: تو تو ہدہد کے بارے میں یہ بتاتا ہے کہ وہ پانی کو زمین کی تہہ میں دیکھتا ہے، حالاں کہ لڑکا اس کے لیے دانا رکھتا ہے جال میں اور جال پر خاک ڈال دیتا ہے۔ پھر ہدہد آتا ہے کہ اس کو لے لے تو وہ جال میں پھنس جاتا ہے، پھر لڑکا اس کو شکار کر لیتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ یہ جائے گا اور کہے گا کہ میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر رد کیا ہے تو البتہ میں اس کو جواب نہ دیتا۔ پھر اس سے فرمایا: تیری خرابی ہو: ''إِنَّهُ إِذَا نَزَلَ الْقَدَرُ عَمِيَ الْبَصَرُ وَذَهَبَ الْحَذَرُ'' یعنی جس وقت قدر نازل ہوتی ہے تو بینائی اندھی ہوتی ہے اور بچاؤ جاتا رہتا ہے۔ نافع بن ارزق کہنے لگا: اللہ کی قسم! اب میں قرآن کی کسی شے میں تجھ سے کبھی جھگڑا نہ کروں گا۔[1] (یہاں اس قصے کے ذکر سے کیا مراد ہے کوئی مناسبت سمجھ میں نہیں آئی۔ واللہ أعلم. شاید یہ غرض ہو کہ اللہ پاک نے حیوانات میں قدرت کے عجائب رکھے ہیں، ایک ہدہد ہے کہ زمین کی تہہ میں پانی کو دیکھتا ہے اور خارجی نے اس کا انکار کیا تھا۔ اس کا یہ انکار قابلِ توجہ نہیں ہے، کیوں کہ اللہ پاک بڑی قدرت والا ہے، اس نے اپنی مخلوق میں بڑے بڑے عجائب رکھے ہیں۔ چنانچہ یہ سانپ کا قصہ ہے کہ اس کی آنکھ میں سلائی پھیرنے سے یہ تاثیر ہوئی کہ جو کوئی اس سلائی کو اپنی آنکھوں میں پھیرے تو زمین آئینے کی طرح ہو جائے۔ مومن لوگ اللہ پاک کی قدرت کو مانتے ہیں، مگر خارجی رافضی بدعتی لوگوں کی ہیے کی پھوٹی ہوئی ہیں، اس لیے اکابر کی بات کا جلد انکار کر بیٹھتے ہیں اور سمجھتے نہیں ہیں۔ اللهم اهدنا الصراط المستقيم، صراط الذين أنعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين. آمین)

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ترجمۂ عبداللہ برزی میں ذکر کیا ہے کہ یہ شخص اہلِ برزہ سے تھا باغاتِ دمشق میں سے اور صالح لوگوں میں سے تھا، پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتا تھا اور کانا تھا۔ اسّی (۸۰) برس کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٥٩_ ٢٨٦٠)

ابن عساکر رحمہ اللہ نے بسندِ خود تا ابوسلیمان بن زید روایت کیا ہے کہ ابوسلیمان نے عبداللہ سے اس کے کانا ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے انکار کیا، پھر اس نے کئی مہینے اس پر اصرار کیا تو اس نے اس کو خبر دی. کہ اس کے پاس اہلِ خراسان میں سے دو شخص اترے جمعہ کے روز قریہ برزہ میں اور اس سے وادیِ برزہ کے بارے میں پوچھا۔ عبداللہ نے کہا: میں نے وہ وادی ان کو دکھا دی تو انھوں نے مجامر نکالے، یعنی عود دان اور ان میں بہت سا بخور جلایا، یہاں تک کہ وہ وادی دھوئیں سے بھر گئی، پھر وہ عزیمت پڑھنے لگے اور ہر طرف سے سانپ ان کی طرف آنے لگے۔ وہ ان میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک سانپ ہاتھ بھر کے قریب آیا اور اس کی آنکھیں اشرفی کی طرح چمکتی تھیں تو وہ بہت ہی خوش ہوئے اور کہا کہ حمد ہے اس اللہ کی جس نے ہمارا سال بھر کا سفر ضائع نہ کیا اور عود دانوں کو توڑ ڈالا اور اس سانپ کو پکڑ لیا۔ پھر اس کی آنکھ میں ایک سلائی ڈالی۔ پھر اس سلائی سے ان دونوں نے سرمہ لگایا میں نے ان سے سوال کیا کہ میرے بھی سرمہ لگا دیں تو انکار کیا۔ میں نے ان سے الحاح وزاری کی اور میں نے کہا کہ میری آنکھوں میں ضرور لگا دو اور ان کو دولت وسلطنت کی دھمکی دی تو انھوں نے میری سیدھی آنکھ میں وہ سلائی پھیر دی۔ جس وقت وہ میری آنکھ میں لگی تو میں نے اپنے نیچے زمین کی طرف نظر کی، میں آئینے کی طرح اس کے نیچے کی چیز کو دیکھتا تھا۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ تو ذرا دیر ہمارے ساتھ چل تو میں اُن کے ساتھ چلا اور وہ مجھ سے باتیں کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ جب میں گاؤں سے دور ہوا تو انھوں نے مجھے پکڑا، پھر میری مشکیں باندھیں اور ایک نے اپنا ہاتھ میری آنکھ میں گھسایا، پھر اس کو پھوڑ ڈالا اور پھینک دیا اور چل دیا۔ میں اسی طرح مشکیں بندھا ہوا پڑا رہا، یہاں تک کہ ایک گروہ کا مجھ پر سے گزر ہوا تو میرا بندھن کھولا گیا۔ میری آنکھ کا یہ قصہ گزرا ہے۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے ہدہد کا نام عنبر تھا۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام جس وقت صبح کو اپنی مجلس میں آتے، جس میں وہ بیٹھا کرتے تھے تو پرندوں کی خبر لیتے۔ جس بات کا لوگ زعم کرتے ہیں اس میں یہ ہے کہ پرندے ان کے پاس باری باری آتے تھے۔ ہر قسم علاحدہ آتی تھی، ہر روز ایک پرندہ۔ چنانچہ انھوں نے نظر کی تو پرندوں کی تمام اصناف کو دیکھا جو حاضر تھے، مگر ہدہد کو نہ دیکھا تو فرمایا: ﴿ مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآىِٕبِيْنَ ﴾ یعنی میری بصر اس سے چوک گئی یا وہ غائب رہا اس لیے حاضر نہ ہوا؟

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا ﴾ امام اعمش رحمہ اللہ نے "عن المنهال بن عمرو عن سعيد عن ابن عباس" روایت کیا ہے، "يَعْنِي نَتْفَ رِيْشِهِ"[2] مراد عذابِ شدید سے اس کے پروں کا اُکھاڑنا ہے۔ عبداللہ بن شداد نے کہا ہے کہ اس کے پروں کو اُکھاڑنا ہے اور اس کو دھوپ میں ڈال دینا ہے اور اسی طرح سلف میں سے بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ مراد اس کے پروں کو اُکھاڑنا ہے اور اس کو پڑا ہوا چھوڑ

[1] تاريخ دمشق (٦٧/ ٤٦۔ ٤٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٦١۔ ٢٨٦٢)

دینا ہے کہ اسے چھوٹی بڑی چیونٹیاں کھا جائیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ ﴾ سے مراد اس کا قتل کرنا ہے۔ ''سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ'' سے مراد واضح عذر ہے۔ امام سفیان بن عیینہ اور عبد اللہ بن شداد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب ہدہد آیا تو پرندوں نے اس سے کہا کہ تجھے کس شے نے پیچھے رکھا ہے، سلیمان علیہ السلام نے تو تیرے خون کی نذر کی ہے؟ تو وہ بولا کہ آیا استثناء کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا: ہاں، یوں کہا ہے: ﴿ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ ہدہد بولا کہ اب تو میں نے نجات پا لی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''إِنَّمَا دَفَعَ اللّٰهُ عَنْهُ بِبِرِّهِ بِأُمِّهِ'' یعنی اللہ نے جو اس سے بلا دفع کی تو اس سبب سے کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ احسان کیا کرتا تھا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ تَفَقَّدَ ﴾ اس شے کی طلب و تلاش کرنے کو کہتے ہیں جو تجھ سے غائب ہے اور اس کے احوال کا جاننا۔ ''طیر'' اسم جنس ہے ہر اس شے کے لیے جو اُڑتی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ سلیمان علیہ السلام نے طیور میں سے جو گم تھے ان کو تلاش کیا اور جو اُن میں سے غائب ہو گئے تھے ان کا حال دریافت کیا۔ طیور سفر میں اُن کے ساتھ رہتے تھے اور اپنے پروں سے ان پر سایہ کیا کرتے تھے۔ فرمایا: ﴿ مَا لِيَ لَاۤ اَرَى الْهُدْهُدَ ﴾ یعنی ہدہد کو کیا ہے کہ میں اسے نہیں دیکھتا؟ یہ عبارت کلامِ مقلوب میں سے ہے جسے عرب لوگ بہت استعمال کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ قلب کا دعویٰ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ استفہام ہے اس مانع کا جو ہدہد کے دیکھنے سے ان کو واقع ہوا ہے۔

گویا یوں فرمایا: کیا ہے مجھے کہ میں اس کو نہیں دیکھتا ہوں، آیا کسی چھپانے والے کے سبب سے کہ وہ اس کو مجھ سے چھپا رہا ہے، یا کسی اور وجہ سے؟ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کے سفر میں ایک ہی ہدہد تھا۔[2] ہدہد ایک معروف پرندے کا نام ہے۔ پھر ان کو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ غائب ہے تو فرمایا: ﴿ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآىِٕبِيْنَ ﴾۔ کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ ہے بہ معنی ''بَلْ'' اضرابیہ کے، یعنی بلکہ وہ غائب ہے اور اس کے غائب ہونے کی وجہ سے میں اس کو نہیں دیکھتا ہوں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی قصۂ مذکورہ بالا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''إِذَا جَاءَ الْقَضَاءُ، وَنَزَلَ الْقَدَرُ، ذَهَبَ اللُّبُّ، وَعَمِيَ الْبَصَرُ''[3] ''جب تقدیر میں کسی کام کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو عقل ماری جاتی ہے اور آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔'' ابن کثیر، ابن محیصن، کسائی، ہشام اور ایوب رحمہم اللہ نے ''مَالِيَ'' بہ فتحِ یائے تحتیہ پڑھا ہے۔

اسی طرح ان سب نے سورت یٰسٓ میں ﴿ مَا لِيَ لَاۤ اَعْبُدُ ﴾ بہ فتحِ یا پڑھا ہے اور امام حمزہ، اور یعقوب رحمہما اللہ نے دونوں جگہ بہ اسکانِ یا پڑھا ہے۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا: اس واسطے کہ اس جگہ کا ''مَالِيَ'' استفہام ہے اور

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٦٣۔ ٢٨٦٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٧٤۔ ٤٧٥) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ١٧٨)

[3] تفسير البغوي (٦/ ١٥٢۔ ١٥٣)

سورت یٰس میں نفی کا ہے۔ امام ابو حاتم اور ابو عبید رحمہ اللہ نے اسکان کو اختیار کیا ہے۔[1] غرضیکہ پھر جب اس کے غائب ہونے کی تصدیق ہو گئی تو فرمایا: ﴿ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ ﴾۔ اس عذابِ شدید میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ابن جریج رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اس کے سارے پر اُکھاڑے جائیں۔ اسی کے مثل تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ امام یزید بن رومان رحمہ اللہ نے کہا: وہ یہ ہے کہ اس کے دونوں بازوؤں کے پر اُکھاڑے جائیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس کے اضداد کے ساتھ اسے قید کریں۔ حقیقت میں اس سے بڑھ کر اور کیا عذاب ہوگا۔ کسی نے خوب کہا ہے: ع

روح را صحبتِ ناجنس عذابے ست الیم "روح کو ناجنس کے ساتھ قید کر دینا دردناک عذاب ہے۔"

کسی نے کہا ہے کہ اپنی خدمت سے اس کو روک دینا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کو دھوپ میں ڈال دینا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے اور اس کے اِلف (دوست یا محبوب یا اس کی مادہ) کے درمیان جدائی کر دینا ہے۔ کسی نے کہا: یعنی اس کے لیے اپنے اقران، یعنی ہمسروں کی خدمت کرنا لازم کر دینا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کو قفس میں رکھ چھوڑنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ چیونٹیوں کے آگے ڈال دینا ہے کہ اسے کھا جائیں۔ کلمۂ ﴿ عَذَابًا ﴾ اسم مصدر ہے یا مصدر ہے بنا بر حذفِ زوائد، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴾ [نوح: ١٧] "اور اللہ ہی نے تمھیں زمین سے (خاص انداز سے) اُگایا؟"

"ذبح" سے مراد اس کے حلقوم کا قطع کرنا ہے۔ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ گناہ کے مطابق سزا ہوتی ہے نہ کہ جسم کی مقدار پر۔ سلیمان علیہ السلام کو جو ہدہد کا عذاب کرنا حلال ہوا تو اس میں انھوں نے مصلحت دیکھی، جس طرح کہ کھانے کے لیے یا دوسرے فائدوں کے لیے جانوروں اور پرندوں کو ذبح کرنا حلال ہے اور جب کہ ان کے لیے پرندے مسخر کیے گئے تو تسخیر مکمل نہیں ہوتی مگر تادیب اور سیاست کے ساتھ۔ امام حسن رحمہ اللہ سے جو مروی ہے کہ اس ہدہد کا نام عنبر تھا، چناں چہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حسن رحمہ اللہ کے واسطے کہاں سے آیا، اسی طرح وہ جو اُن سے مروی ہے کہ نملہ کا نام حرس تھا، حالاں کہ حسن رحمہ اللہ جھوٹ بات کو نقل کرنے کے لیے سب لوگوں سے بڑھ کر دور بھاگنے والے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ صحیح ثابت نہیں ہوا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حسن رحمہ اللہ کے واسطے کوئی اسناد متصل نہیں ہے سلیمان علیہ السلام تک، نہ اُن کے کسی صحابی تک تو یہ علم اہلِ کتاب سے ماخوذ ٹھہرا اور ہم کو حکم ہے کہ ہم اُن کی نہ تصدیق کریں نہ تکذیب۔

پھر اگر کوئی رخصت لینے والا اُن سے روایت کرنے کی رخصت لے، اس حدیث کی وجہ سے جو مروی ہے کہ «حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ»[3] تو یہ حدیث بلاشک اس بات میں نہیں ہے جو اللہ سبحانہ کی کتاب کی

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٧٩) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٤٣) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧٤)

تفسیر سے متعلق ہے، بلکہ یہ ان قصوں میں سے ہے جو اُن کو واقع ہوئے اور اُن سے ذکر کیے جاتے ہیں۔ ہم اس قسم کی بات پر بار بار تنبیہ کر آئے ہیں کہ تفاسیرِ غریبہ سے کنارہ کرنا چاہیے۔[1]

﴿ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ ﴾ صرف ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ نونِ تاکید مشددہ پڑھا ہے اور اس کے بعد نون وقایہ کا۔ باقی قراء کی قراءت صرف نونِ مشددہ کے ساتھ ہے اور وہ نون تاکید کا ہے، عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے یہ نونِ مشددہ مفتوحہ غیر موصولہ بہ یا پڑھا ہے۔[2]

﴿ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ اس سے مراد واضح حجت ہے اس کے غائب رہنے پر۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: "اَلسُّلْطَانُ الْمُبِيْنُ، خَبَرُ الْحَقِّ الصِّدْقُ الْبَيِّنُ"[3] "سلطان مبین سے مراد حق، سچ اور واضح خبر ہے۔" ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہر سلطان قرآن میں حجت ہے اور اس آیت کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا: اور کون سلطان تھا ہد ہد کے واسطے۔[4] یعنی سلطان سے مراد حجت ہے نہ وہ سلطان جس کے معنی ملک (حکومت، غلبہ) ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے جو قسم کھائی تو حقیقت میں وہ پہلی دو باتوں سے ایک پر بہ تقدیر نہ ہونے تیسری کے۔ پہلی دو باتوں کے درمیان کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ تخییر کے لیے ہے اور تیسری بات میں اس کے اور پہلی دو باتوں کے درمیان تردید کے لیے ہے۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: اگر تو کہے کہ انھوں نے تین باتوں میں سے ایک پر قسم کھائی ہے تو ان کا اپنے دو فعل پر قسم کھانا ایسا ہے کہ اس میں کچھ گفتگو نہیں ہے، لیکن اول تو ان کا ہد ہد کے فعل پر قسم کھانا کس طرح ٹھیک ہوگا۔ انھوں نے کہاں سے جان لیا کہ وہ ظاہر حجت لے کر آئے گا تو میں اس کا یہ جواب دوں گا جب کہ انھوں نے تین باتوں کو اس حکم میں کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ کے ساتھ پرو دیا جو قسم ہے تو ان کی بات کا رجوع اس قول کی طرف ہوا کہ البتہ تین باتوں میں سے ایک ضرور ہوگی، یعنی اگر وہ حجت لے کر آیا تو نہ اسے عذاب ہوگا اور نہ ہی ذبح ہوگا اور اگر وہ حجت لے کر نہ آیا تو دو باتوں میں سے ایک ہوگی اور اس میں جاننے کا دعویٰ نہیں ہے۔[5] انتھٰی.

دوسرا کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ معنی میں اس طرف راجع ہے کہ ﴿ اِلَّا ﴾ کے معنی میں ہے اور یہ قید ہے پہلے کے ہر دو امروں میں۔ گویا یوں کہا کہ البتہ میں اس کو عذاب دوں گا، مگر اس صورت میں کہ وہ میرے پاس حجت لائے، یا البتہ میں اس کو ذبح کروں گا، مگر اس صورت میں کہ وہ میرے پاس ظاہر حجت لائے۔[6]

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٧٨۔ ١٧٩) [2] فتح القدير (٣/ ١٧٥) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٦٣)
[4] تفسير الطبري (١٩/ ٤٤٤) [5] الكشاف (٣/ ٣٦٣) [6] فتح البيان (١٠/ ٢٨۔ ٣٠)

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ
مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا
يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٢٤﴾ اَلَّا
يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿٢٥﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ
الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٢٦﴾

ابھی کوئی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا تھا کہ (ہد ہد آ گیا اور) اس نے کہا: میں نے (وہ کچھ) جان لیا ہے جس کے بارے میں آپ نہیں جانتے، اور میں آپ کے پاس سبا سے ایک سچی خبر لایا ہوں (22) بلاشبہہ میں نے دیکھا کہ ایک عورت ان پر حکومت کرتی ہے، اور اسے (ضرورت کی) ہر چیز عطا کی گئی ہے اور اس کا تخت عظیم الشان ہے (23) میں نے اسے اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سوا سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے پرکشش بنا دیے ہیں، پھر انھیں راہ (حق) سے روک دیا ہے، چناں چہ وہ ہدایت نہیں پاتے (24) یہ کہ وہ اس اللہ کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین میں چھپی چیزیں نکالتا ہے، اور وہ (سب کچھ) جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو (25) اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی بہت بڑے عرش کا مالک ہے (26)

ہد ہد کی دربارِ سلیمانی میں حاضری اور توحید پر ایک زبردست تقریر:

سلیمان علیہ السلام کو اس ملک کا مفصل حال پہلے نہیں پہنچا تھا، اب پہنچا۔ سبا ایک قوم کا نام ہے، ان کا وطن عرب میں یمن کی طرف تھا۔ ہر قسم کی چیز جو وہ دی گئی تھی، اس میں مال واسباب اور حسن و جمال بھی آ گیا۔ اس کے بیٹھنے کا تخت ایسا پُر تکلف تھا کہ اس وقت کسی بادشاہ کے پاس نہیں تھا۔ ہدہد کی روزی ہے ریت میں سے کیڑے نکال کر کھاتا ہے، نہ دانا کھائے نہ میوہ، اس کو اللہ کی اسی قدرت سے کام ہے۔ انتہٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ عورت بلقیس دختر شراحیل ملکۂ سبا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی ماں جنّنی تھی اور اس کے دونوں قدموں کا پچھلا حصہ چوپائے کے کھر کی طرح تھا۔ شاہی خاندان

سے تھی۔ امام زہیر بن محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ بلقیس دختر شراحیل بن مالک بن الریان ہے، اس کی ماں فارعہ جنیہ ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلقیس دختر ذی شرخ ہے۔ (تفسیر فتح البیان میں ذی شرح ہے) اس کی ماں بلتعہ ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایتِ مجاہد ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ صاحبہ سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ایک لاکھ قیل تھے، یعنی سردار۔ ہر قیل کے ماتحت ایک لاکھ تھے۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ملکہ سبا کے ماتحت بارہ ہزار قیل تھے اور ہر قیل کے ماتحت ایک لاکھ لڑنے والے تھے۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے معمر نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے خبر دی کہ وہ عورت شاہی خاندان سے تھی، اس کو مشورہ دینے والے لوگ تین سو بارہ تھے، اس میں ہر آدمی بارہ ہزار پر سردار تھا اور وہ اس زمین میں تھی جو صنعاء سے تین میل کے فاصلے پر تھی اور اسے مآرب کہتے ہیں: "وَهٰذَا الْقَوْلُ هُوَ أَقْرَبُ عَلَى أَنَّهُ كَثِيرٌ عَلَى مَمْلَكَةِ الْيَمَنِ"[1] والله أعلم.

(یعنی یہ آخری قول کہ اس کے مشیر تین سو بارہ آدمی تھے اور ہر آدمی بارہ ہزار پر سردار تھا، قیاس کے قریب ہے پہلے دو قولوں کی نسبت اور ریاست یمن کے لحاظ سے یہ تعداد بھی بہت ہوتی ہے۔ اس بیان سے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا مقصد پہلے دو قولوں پر طعن کرنا ہے کہ ان میں تعداد بہت مبالغے کے ساتھ بیان کی گئی ہے، کیوں کہ عقلاً مملکتِ یمن میں اتنی گنجایش نہیں ہے۔ مصحح.)

﴿ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ یعنی متاعِ دنیا میں سے ہر چیز دی گئی تھی۔ یعنی اُن چیزوں میں سے جن کی ہر برسرِ اقتدار حکمران کو ضرورت ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ساز و سامان میں سے جو بھی ایک ذی اقتدار بادشاہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب اس کے پاس موجود تھا۔

﴿ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴾ یعنی اس کا ایک بڑا ہولناک تخت (اصل کا لفظ عظیم ہائل ہے۔ یہ کلمہ تعریف میں بھی بولتے ہیں۔ جب کوئی شے نہایت عمدہ اور بڑی ہوتی ہے تو آدمی اس کو دیکھ کر ہول میں پڑ جاتا ہے۔ ہائل بایں معنی اس کو بولتے ہیں جس طرح کہ غایت درجے کے ذکی وفطین وخردمند کی تعریف میں کہتے ہیں کہ آفت ہے، بلا ہے، قیامت ہے، آتش کا پرکالہ ہے۔ محاورۂ عربی میں ایسے شخص کو "داهة من الدهاة" کہتے ہیں۔ "رہبوت خیر من رحموت" بھی اس معنی سے ہے) تھا، جس پر وہ بیٹھتی تھی۔ وہ تخت سونے اور قسم قسم کے ہیروں اور موتیوں سے مزین تھا۔ زہیر بن محمد رحمہ اللہ نے کہا: "كَانَ مِنْ ذَهَبٍ وَّصَفْحَتَاهُ مَرْمُولٌ بِالْيَاقُوتِ وَالزَّبَرْجَدِ"، یعنی وہ تخت سونے کا تھا، اس کی دونوں اطراف یاقوت اور زبرجد سے بنی ہوئی تھیں۔ اس کا طول اسّی گز اور عرض چالیس گز تھا،[2] اس کی

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٦٥۔ ٢٨٦٦) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٧٦) تفسیر ابن ابی حاتم میں امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی قول میں (صنعاء سے تین میل) کے بجائے (تین دن) کا ذکر ہے۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تین میل کے الفاظ ہی ذکر کیے ہیں۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٦٧)

خدمت صرف عورتیں کیا کرتی تھیں۔ چھے سو عورتیں اس کی خدمت پر مقرر تھیں۔ علمائے تاریخ نے کہا ہے کہ یہ تخت ایک بڑے رنگ کیے ہوئے بلند مضبوط محل میں تھا، اس میں تین سو ساٹھ طاق تھے، اس کے مشرقی جانب اور اسی کے مثل اس کے مغربی جانب اس کی بناوٹ اس طرح پر کی گئی تھی کہ سورج ہر دن ایک طاق سے داخل ہو اور اس کے مقابل کے طاق سے غروب ہو۔ وہ اس کو صبح و شام سجدہ کیا کرتے تھے، اسی لیے یوں کہا ہے: ﴿ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴾

قولہ: ﴿ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ شیطان نے ان کے لیے اعمال کو مزین کر دیا، ان کو راہِ حق سے روکا تو وہ اس بات کی راہ نہیں پاتے کہ اللہ کے لیے سجدہ کریں، یعنی راہِ حق کو نہیں پہچانتے، وہ راہ یہی ہے کہ سجدے کو اکیلے الٰہ کے لیے خالص کرنا، نہ کہ اس شے کے لیے جس کو اس نے پیدا کیا کواکب وغیرہ سے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ [حم السجدة: ٣٧] ”اور اسی (اللہ) کی نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند بھی ہیں۔ تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، اگر واقعی تم اسی کی عبادت کرتے ہو تو تم اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان (سب) کو پیدا کیا ہے۔“ بعض قراء نے ”أَلَا يَا اسْجُدُوْا“ پڑھا ہے ”أَلَا“ کو استفتاحیہ ٹھہرایا اور کلمۂ ”یا“ کو ندا کے واسطے ٹھہرایا ہے اور منادیٰ کو حذف کیا ہے، اس کے نزدیک تقدیر یہ ہے: ”أَلَا يَا قَوْمِ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ“ یعنی خبردار اے میری قوم! اللہ کے واسطے سجدہ کرو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ”يَعْلَمُ كُلَّ خَبِيئَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ“ یعنی اللہ پاک آسمان و زمین میں ہر پوشیدہ شے کو جانتا ہے۔ اسی طرح امام عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔ سعید بن مسیّب نے کہا کہ ”خبء“ پانی ہے اور اسی طرح عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”خَبْءُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ“ وہ رزق ہیں جو ان میں رکھے گئے ہیں۔ مطر یعنی بارش تو آسمان سے اور نبات یعنی سبزہ زمین سے۔[1] یہ قول ہدہد کے کلام سے مناسب ہے جس میں اللہ پاک نے وہ خاصیت رکھی ہے جس کا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ پانی کو دیکھتا ہے کہ وہ زمین کی تہہ میں اور اس کے اندر بہہ رہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ بندے جن قولوں اور فعلوں کو چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں، وہ ان کو خوب جانتا ہے۔ یہ قول اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴾ [الرعد: ١٠] ”(اللہ کے نزدیک) مساوی ہے تم

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٦٨_ ٢٨٦٩)

میں سے جو کوئی آہستہ بات کہے یا بلند آواز سے کہے، اور جو رات (کی تاریکی) میں چھپنے والا ہو یا دن (کی روشنی) میں چلنے والا ہو۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾ یعنی وہ ذات جس کو پکارتے ہیں اللہ ہے اور وہ وہ ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ۔ وہ بڑے تخت کا رب ہے، یعنی مخلوقات میں اس سے بڑی کوئی شے نہیں ہے۔ چوں کہ ہدہد خیر کی طرف دعوت دینے والا تھا اور اللہ وحدہ کی عبادت کی طرف، اس کے لیے سجدہ کرنے کی طرف، اسی لیے اس کے قتل کی ممانعت کی گئی ہے۔ چناں چہ امام احمد، ابو داود اور ابن ماجہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار جانوروں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے: چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد، یعنی ممولا چڑیا۔[1] اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع توضیح یہ ہے کہ جمہور نے "مَكُثَ" بہ ضم کاف پڑھا ہے بابِ "قَرُبَ" سے اور صرف عاصم نے بہ فتح کاف بابِ "نَصَرَ" سے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: "مَكَثَ يَمْكُثُ مَكُوْثًا مِثْلُ قَعَدَ يَقْعُدُ قُعُوْدًا" اور ضمیر ہدہد کی طرف راجع ہے۔ دونوں قراءتوں میں معنی یہ ہیں کہ ہدہد زمانۂ غیر بعید ٹھہرا، یعنی زیادہ دیر تک غائب نہ رہا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ضمیر سلیمان علیہ السلام کی طرف راجع ہے، معنی یہ ٹھہرے کہ وہ تفقد و توعد کے بعد ایک غیر طویل زمانہ تک ٹھہرے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

﴿ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ ﴾ احاطہ شے کے جاننے کو کہتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں سے یہاں تک کہ اس پر کوئی معلوم شے مخفی نہ رہے۔ شاید عبارت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَمَكَثَ الْهُدْهُدُ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَجَآءَ، فَعُوْتِبَ عَلٰى مَغِيْبِهٖ فَقَالَ مُعْتَذِرًا عَنْ ذٰلِكَ: أَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ" یعنی پھر ہدہد نے بہت دیر نہ کی، پھر آیا تو اسے غائب رہنے پر عتاب کیا۔ پھر اس نے اس کا عذر کر کے یہ کہا کہ میں نے وہ بات جانی جو تو نے نہ جانی اور اس شے کو پہنچا جس کو نہ تو اور نہ تیرا لشکر پہنچا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: معنی یہ ہیں کہ میں اس شے پر مطلع ہوا جس پر تو مطلع نہیں ہوا۔[4] اللہ پاک نے ہدہد کو اس بات کا الہام فرمایا تو اس نے اس کے ساتھ سلیمان علیہ السلام کا مقابلہ کیا، باوجود اس کے کہ ان کو علمِ کثیر اور نبوت کی فضیلت دی گئی تھی۔ اس سے غرض ان کی آزمایش اور امتحان تھا، ان کے علم میں اور انھیں اس بات سے آگاہ

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٣٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٢٤) صحيح الترغيب والترهيب. ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٧٦۔ ٤٧٧) [3] فتح القدير (٤/ ١٧٥) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٦٤)

کرنا تھا کہ اُن کے لشکر کے ایک ادنیٰ نے اس شے کو جان لیا جس کو خود انھوں نے نہ جانا، تاکہ ترکِ اعجاب میں ان کے ساتھ لطف ہو جائے۔ اللہ پاک نے جو بلقیس کے مکان کو سلیمان علیہ السلام سے مخفی رکھا، حالاں کہ ان کے درمیان مسافت قریب تھی۔ چنانچہ یہ اخفا کسی مصلحت کی وجہ سے تھا، جس طرح کہ یوسف علیہ السلام کی جگہ کو یعقوب علیہ السلام پر مخفی رکھا۔ اس میں روافض کے قول کے بطلان پر دلیل ہے کہ امام پر کوئی شے مخفی نہیں رہتی اور نہ اس کے وقت میں اس سے بڑھ کر کوئی عالم ہوتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''تا'' کا ادغام ''طا'' میں جائز ہے تو یوں کہا جائے ''أَحَطُّ'' اور ''طا'' کا ادغام تا میں تو یوں کہیں ''أَحَتُّ''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ ﴾ جمہور نے ''سَبَا'' کو منصرف پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ایک شخص کا نام ہے، اس کی طرف قوم کی نسبت کی گئی ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے بہ فتح ہمزہ و ترک صرف پڑھا ہے اس بنیاد پر کہ شہر کا نام ہے، یعنی بہ تاویلِ بلدہ۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے شخص کے نام ہونے کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ سبا شہر کا نام ہے، جو معروف بہ مآربِ یمن ہے، اس کے اور صنعاء کے درمیان تین دن کی راہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک عورت کا نام ہے، اس کے نام پر شہر کا نام رکھ دیا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: صحیح یہ ہے کہ سبا ایک شخص کا نام ہے، جس طرح کہ کتاب ترمذی میں فروہ بن مسیک مرادی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ثابت ہوا ہے۔[1]

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات امام زجاج رحمہ اللہ پر مخفی رہی، اس نے مثل خبطِ عشوا کے خبط کیا ہے۔ خبط جانور کے ہاتھ پاؤں مارنے کو کہتے ہیں، اسی معنی سے یہ مثل ماخوذ ہے: ''خَبَطَ خَبْطَ عَشْوَاءَ'' عشوا وہ اونٹنی ہے، جس کی بینائی میں ضعف ہوتا ہے، یہ مثل اس شخص کے لیے بولتے ہیں جس کو صحیح اور غلط میں تمیز نہیں ہوتی۔ گویا وہ مثل کمزور نظر والی اونٹنی کے ہے کہ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا پھرتا ہے، سیدھا راستہ اس کو نہیں ملتا۔

حکایت:

امام فراء رحمہ اللہ کا یہ زعم ہے کہ رواسی نے امام ابو عمرو بن العلاء رحمہ اللہ سے سبا کا پوچھا تو ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا: میں نہیں جانتا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: ابو عمرو اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں کہ وہ یہ بات کہیں، یعنی ابو عمرو رحمہ اللہ بڑے جلیل القدر آدمی ہیں، ان کی یہ شان نہیں ہے کہ ایسی ادنیٰ بات سے اپنی بے علمی بیان کریں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: سبا میں قول وہی ہے جس میں توقیف آئی ہے کہ وہ اصل میں ایک شخص کا نام ہے۔ پس اگر تم اس کو منصرف پڑھو تو اس لیے ہے کہ نام ہے علاقے کا اور اگر غیر منصرف پڑھو گے تو قبیلہ کا نام ٹھہراؤ گے مثل ثمود کے، مگر امام سیبویہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا منصرف ہونا مختار ہے۔[2] انتہیٰ.

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۲۲) [2] تفسير القرطبي (۱۳/ ۱۸۱۔ ۱۸۲)

فتح القدیر اور فتح البیان میں فرمایا ہے کہ بے شک سبا یمن میں ایک شہر کا نام ہے جس میں بلقیس تھی اور ایک شخص کا نام بھی ہے جو قحطان سے تھا۔ وہ شخص سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان بن ہود ہے، لیکن اس جگہ مراد یہ ہے کہ ہدہد سلیمان علیہ السلام کی طرف اس شے کی خبر لایا، جس کا اس نے شہرِ سبا میں معائنہ کیا تھا، اس کا بیان آگے آتا ہے۔[1]

اسی بات کی وضاحت اور تائید اس اثر سے ہوتی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا کہ سبا زمینِ یمن میں ہے۔ اس کو مآرب کہتے ہیں، اس کے اور صنعاء کے درمیان تین رات کی راہ ہے۔[2]

﴿ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴾ یعنی ہدہد سلیمان علیہ السلام کے پاس آیا اس شہر سے ایک حقیقی خبر لے کر۔ نبا ایک عظیم الشان خبر کو کہتے ہیں۔ ﴿ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ ﴾ محاسنِ کلام میں سے ہے، اس کا نام بدیع رکھتے ہیں۔ اس جگہ یہ کلام الفاظ اور معانی دونوں کے لحاظ سے حسین اور بدیع ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اگر "بنبأ" کی جگہ "بخبر" رکھا جائے تو معنی صحیح ہوں گے اور اس جگہ "بخبر" کی جگہ جو ﴿ بِنَبَاٍ ﴾ رکھا گیا ہے تو یہ زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ نبا میں خبر کی نسبت اضافہ ہے کہ جس کے مطابق وصفِ حال ہے۔ غرضیکہ جب ہدہد نے سلیمان علیہ السلام سے کہا جو کچھ کہا تو انھوں نے کہا کہ وہ خبر کیا ہے؟ تو اس نے عرض کی: ﴿ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ ﴾ یہ عورت بلقیس بنت شراحیل ہے۔

یہ قول امام حسن رحمہ اللہ، امام قتادہ اور زہیر بن محمد رحمہم اللہ سے مروی ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ بنت ذی شرح ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کا نام بلقیس بنت ذی شیرہ ہے اور وہ ہلباء شعراء تھی،[4] یعنی اس کے بدن پر بال تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ یعرب بن قحطان کی نسل سے تھی۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بلقیس کے ماں باپ میں سے ایک جنی تھا۔[5] (أخرجه ابن عساكر و ابن مردويه و أبو الشيخ و ابن جرير)

﴿ تَمْلِكُهُمْ ﴾ کی ضمیر سبا کی طرف راجع ہے، اس بنا پر کہ سبا کی تاویل قوم اور شہر کے لوگوں سے کی جائے۔ اور یہ جملہ پہلے جملے کے بیان اور تفسیر کے مثل ہے، یعنی وہ نبائے یقین اس عورت کا ان کی مالک ہونا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدہد نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ اہلِ سبا کی مالک و بادشاہ ہو رہی ہے۔ اس کا باپ زمینِ یمن کا بادشاہ تھا اور اس کے سوا اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔

﴿ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ میں مبالغہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ آلات اور ساز و سامان اور اشیاء وغیرہ جن کی بادشاہ لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے، ان میں سے ہر شے اسے دی گئی تھی۔ یہ وہ عام ہے جس سے مراد خصوصیت ہے۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٧٥) [2] فتح القدير (٤/ ١٧٩)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٦٤) [4] مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٣٣٧)
[5] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧٤) الدر المنثور (٦/ ٣٥١) اس کی سند میں "سعید بن بشیر" ضعیف راوی ہے۔

کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کے وقت میں دنیا کا جو اسباب و مال و منال وعدّہ تھا، اس میں سے ہر ایک سے کچھ اس کو دیا گیا تھا جو اس کے حال کے لائق تھا۔ تقدیرِ عبارت یہ ہے: "أُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ فِي زَمَانِهَا شَيْئًا" چنانچہ کلمۂ "شَيْئًا" کو حذف کر دیا ہے، اس لیے کہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔

﴿ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴾ یعنی اس کا ایک کبیر اور ضخیم تخت ہے، یعنی بہت بڑا۔ کسی نے کہا: اس جگہ عرش سے مراد حکومت و سلطنت ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس کے بارے میں فرمایا ہے: "أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا" اگر کوئی کہے کہ بلقیس کے تخت کو عظیم کہا اور اللہ کے عرش کو بھی عظیم فرمایا، اس میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلقیس کے تخت کو جو عظیم فرمایا تو یہ عظمت اس کی ان دنیا کے بادشاہوں کی مناسبت سے ہے جو دوسری جگہ میں ہیں۔ اس لیے کہ وہ ایسا تھا جیسا کہ کہا ہے کہ سونے اور چاندی سے بنایا گیا تھا اور موتی اور یاقوت سرخ، زبرجد سبز اور زمرد سے جڑا ہوا تھا۔ اس کا طول اسّی گز اور عرض چالیس گز اور بلندی تیس گز کی تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ سونے کا ایک بڑا تخت تھا اور اس کے پائے جوہر اور موتیوں کے تھے۔ بہت خوبصورت اور قیمتی تھا۔[1] اس پر سات گھر تھے، ہر گھر پر ایک دروازہ بند تھا۔ رہا عرشِ الٰہی کا عظیم ہونا تو وہ بہ نسبت ساری مخلوقات کے ہے۔ ساتوں آسمان اور ساتوں زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے، ان سب سے بڑا ہے۔ اس کے سامنے اُن کی ذرا بھی وقعت نہیں ہے، لہٰذا دونوں میں واضح اور عظیم فرق ہے۔

﴿ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ ﴾ "وَجَدْتُّ" بہ معنی "لَقِيتُ وَأَصَبْتُ" ہے اس لیے ایک مفعول کی طرف متعدی ہوا ہے، یعنی میں نے اس کو اور اس کی قوم کو اس حال میں پایا کہ وہ سورج کو پوجتے ہیں اور اللہ پاک کی عبادت سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معبود برحق کی عبادت چھوڑ کر غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ لوگ مجوس تھے۔ کسی نے کہا: "زنادقہ"۔ ("زنادقہ" زندیق کی جمع ہے۔ "زندیق" بد مذہب کو کہتے ہیں۔ "زندقہ" اسم ہے، زند سے معرب ہے۔ زندان کی کتاب کا نام ہے۔ كذا في الصراح)

﴿ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ ﴾ یعنی سورج کی پوجا اور باقی کفریہ اعمال جو وہ کر رہے ہیں شیطان نے یہ کام اُن کو اچھے کر دکھائے ہیں۔ ﴿ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ ﴾ یعنی اس نے یہ اعمال اچھا کر دکھانے کے سبب سے راہِ راست سے اُن کو روک رکھا ہے، وہ راہ یہی اللہ پر ایمان لانا ہے اور اس کو زبان سے ایک کہنا اور دل سے ایک جاننا ہے۔ راہِ حق یہی ہے۔ ﴿ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴾ چنانچہ وہ اس کی طرف راہ نہیں پاتے ہیں۔

ہدہد نے جو ان امور کی طرف راہ پائی کہ اللہ پاک کو پہچانا اور اس کے لیے سجدہ کرنے کو واجب جانا اور سورج کو سجدہ کرنے کو حرام سمجھا تو یہ اس سے کچھ بعید نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اس کو اللہ پاک کی طرف سے الہام ہے، جس

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٤٤٧)

طرح کہ اس کو اور اس کے سوا دوسرے پرندوں اور حیوانات کو اللہ پاک نے ایسے معارف کا الہام فرمایا ہے کہ بڑی بڑی عقلوں والے اُن کی طرف راہ نہیں پاتے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت سے یہ بات لازم ہے کہ وہ ایک عورت بادشاہ تھی جو یمن کے شہروں پر بڑی حکومت اور بڑے تخت والی تھی اور کافروں کی قوم میں سے ایک کافرہ تھی۔

﴿ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ ﴾ جمہور نے ﴿ اَلَّا ﴾ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو لوگ ﴿ اَلَّا ﴾ کو تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں ان کے نزدیک ﴿ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ پر وقف غیر تام ہے، اس لیے کہ معنی یہ ہیں کہ زینت دی ان کے لیے شیطان نے اس بات کی کہ وہ اللہ کے لیے سجدہ نہ کریں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَلَّا"، "أَنْ" ہے، اس پر "لَا" داخل ہوگیا ہے اور جائے نصب میں ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: زَيَّنَ لَهُمْ أَنْ لَّا يَسْجُدُوْا" بہ معنی "لِئَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ"۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: موضعِ نصب میں ہے اور "صَدَّهُمْ" اس میں عامل ہے۔ "أَيْ: فَصَدَّهُمْ أَلَّا يَسْجُدُوْا" بہ معنی "لِئَلَّا يَسْجُدُوْا" پس دونوں وجہوں کی بنا پر مفعول لہ ہے، یعنی شیطان نے ان کے واسطے زینت دی، یا ان کو شیطان نے روکا اس لیے کہ سجدہ نہ کریں اللہ کو۔

یزیدی نے کہا ہے کہ ﴿ اَعْمَالَهُمْ ﴾ سے بدل ہے اور موضعِ نصب میں ہے، (یعنی "زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ عَدَمَ السُّجُوْدِ لِلّٰهِ") امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بنا پر موضع جر میں ہے کہ ﴿ عَنِ السَّبِيْلِ ﴾ سے بدل ہے، یا اس میں عامل ﴿ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ ہے۔ "أَيْ: فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ إِلَى أَنْ يَّسْجُدُوْا لِلّٰهِ" اخیر کی دو وجہوں پر کلمۂ "لا" زائد ہے، جس طرح کہ ﴿ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ ﴾ [الأعراف: ۱۲] "تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا۔" میں زائد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ان کو اللہ کے واسطے سجدہ کرنے سے روکا، یا وہ اس طرف راہ نہیں پاتے کہ اللہ کو سجدہ کریں۔

قراءتِ جمہور کی بنا پر یہ آیت سجدے کی جگہ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تو اُن کی طرف سے ترکِ سجود کی خبر دی ہے، جو شیطان کی تزئین کی وجہ سے چھوڑا تھا، یا شیطان کے روکنے سے، یا راہ پر آنے سے منع کرنے سے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ وجہ روکنا ہے اور امام فراء رحمہ اللہ نے اس کو ترجیح دی ہے کہ ﴿ زَيَّنَ ﴾ کی علت ہے۔ کہا: ان کے واسطے شیطان نے ان کے عمل مزین کیے، تاکہ سجدہ نہ کریں۔ (اصل میں "لِئَلَّا يَسْجُدُوْا" ہے، پھر لام کو حذف کر دیا۔)

امام زہری اور کسائی رحمہما اللہ نے "أَلَا" بہ تخفیف پڑھا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: میں اشیاخ (بڑوں) کو تخفیف ہی کے ساتھ پڑھتے ہوئے سنتا تھا قصدِ امر کی بنا پر۔ چنانچہ اس قراءت کی بنا پر کلمۂ "أَلَا"، حرفِ تنبیہ و استفتاح ہے اور اس کے مابعد حرفِ ندا اور "اُسْجُدُوْا"، فعل امر۔

اس قراءت کی بنیاد پر حق لکھنے کا یہ تھا کہ یوں ہوتا "أَلَا يَا اسْجُدُوْا"، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے الف کو کلمۂ یا سے اور ہمزۂ وصل کو "اُسْجُدُوْا" سے لکھنے میں گرا دیا اور "یا" کو "اُسْجُدُوْا" کے سین سے ملا دیا تو اب لکھنے کی صورت

یہ ہوگئی: ﴿ اَلَا یَسْجُدُوْا ﴾ اور منادیٰ محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أَلَا یَا هٰؤُلَاءِ اسْجُدُوْا"، یعنی خبردار اے لوگو! سجدہ کرو۔ عرب لوگ اپنے کلام میں منادیٰ کو بہت حذف کیا کرتے ہیں، ان کے اشعار میں بہ کثرت واقع ہوا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قراءت تخفیف کی مقتضی ہے وجوبِ سجود کو تشدید کی نہیں ہے۔ امام ابو حاتم اور ابو عبید رحمہما اللہ نے قراءتِ تشدید کو اختیار کیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قراءت بہ تخفیف کے لیے ایک وجہ حسن ہے، مگر اس میں اتنی بات ہے کہ سبا کے حال سے خبر کا انقطاع ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد اُن کے ذکر کی طرف رجوع ہے اور قراءتِ تشدید ایک خبر ہے کہ بعض اس کا بعض کے بعد پیہم آتا ہے، اس کے درمیان میں کچھ انقطاع نہیں ہوتا اور اسی طرح امام نحاس رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے، تخفیف کی بنا پر جملہ "أَلَا یَا اسْجُدُوْا"، کا معترضہ ہوگا ہدہد کے کلام سے، یا سلیمان علیہ السلام کے کلام سے، یا اللہ پاک کے کلام سے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "هَلَّا تَسْجُدُوْا" بتائے فوقیہ ہے، یعنی تم کیوں سجدہ نہیں کرتے ہو۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "أَلَّا تَسْجُدُوْا" بہ فوقیہ ہے۔[1]

﴿ اَلَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی اللہ پاک وہ ہے جو اس شے کو ظاہر کرتا ہے جو زمین و آسمان میں پوشیدہ اور مخفی ہے۔ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "خَبَأْتُ الشَّيْءَ أَخْبَأُهُ خَبأً"، اور "خَبْءٌ" وہ شے ہے جس کو تو نے چھپایا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تفسیر میں آیا ہے کہ اس جگہ "خبء" اس معنی میں ہے کہ قطر (بارش) تو آسمان سے اور نبات (سبزہ) زمین سے۔ کسی نے کہا ہے کہ "خبء الأرض" سے مراد زمین کے خزانے اور نبات ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "خَبْءَ" "سِرَّ" ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: مراد وہ شے ہے جو آسمانوں اور زمین میں غائب ہے۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ اور عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے "الْخَبَ" پڑھا ہے بہ فتحِ بائے موحدہ بدون ہمزہ تخفیف کے لیے۔ عبداللہ، عکرمہ اور مالک بن دینار رحمہم اللہ نے "الْخَبَا" بالف پڑھا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عربیت میں یہ جائز نہیں ہے، اس کا یوں رد کیا ہے کہ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے عرب سے حکایت کیا ہے کہ الف ہمزہ سے بدلا جاتا ہے، جبکہ اس سے پہلے ساکن ہو۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "یُخْرِجُ الْخَبْءَ مِنَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ" ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: "من" اور "في" ایک دوسرے کے آگے پیچھے آتے ہیں۔ موصول میں کئی وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ محلِ جر میں ہے لفظِ اللہ کی صفت ہے، یا اس سے بدل ہے، یا اس کا بیان ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ محلِ نصب میں ہے بنا بر مدح۔ تیسرے یہ ہے کہ محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یعنی "هُوَ الَّذِيْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ"

اخراجِ خبء میں اللہ پاک کی قدرتِ تامہ پر دلیل ہے، جملۂ ﴿ وَیَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴾ ﴿ یُخْرِجُ ﴾ پر معطوف ہے۔ جمہور نے دونوں فعلوں کو بیائے تحتیہ پڑھا ہے اور جحدری، عیسیٰ بن عمر، حفص اور کسائی رحمہم اللہ نے بتائے فوقیہ صیغۂ خطاب میں۔ پہلے کی وجہ یہ ہے کہ اگلی ضمیریں غائب کی ہیں۔ رہی قراءتِ ثانی تو اس کی وجہ یہ ہے

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ١٨٤۔ ١٨٦) فتح القدير (٤/ ١٧٦۔ ١٧٧)

کہ امام زہری اور کسائی رحمہ اللہ کی قراءت میں سجدے کا امر ہے اور اس کا ان کو خطاب ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ اسی خطاب کے تتمہ (آخری حصہ) سے ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک اس خفی کو نکالتا ہے جو عالمِ انسانی میں ہے، اس سبب سے کہ وہ اس کو خوب جانتا ہے، جس طرح کہ نکالتا ہے اس شے کو جو آسمان و زمین میں مخفی ہے۔[1] اس میں اللہ تعالیٰ کے علم کے اثبات کی دلیل ہے۔

اعلان کا ذکر دائرۂ علم کے وسیع ہونے کے لیے کیا ہے، مقصد اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ کسی چیز کو پوشیدہ رکھنا یا اس کو ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے دونوں برابر ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کلام کا مقصد اُن لوگوں کی تردید کرنا ہے جو اللہ پاک کے سوا سورج وغیرہ کو پوجتے ہیں، اس لیے کہ عبادت کی مستحق تو وہی ذات پاک ہے جو اُن پر قادر ہے جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں اور جو تمام معلومات کا عالم ہے۔[2] غرضیکہ جب ہدہد اللہ پاک کی صفت بیان کر چکا، یعنی ایسے اوصاف بیان کر چکا جو اس کی عظیم قدرت اور جلیل القدر بادشاہت اور وسعتِ علم پر دال تھے تو اس کے بعد وہ وصف ذکر کیا جو اس کی توحید کے وجوب اور اس کی عبادت کی تخصیص پر دلالت کرتا ہے۔

چنانچہ کہا: ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾ جمہور نے ﴿ الْعَظِيْمِ ﴾ کو بہ جر پڑھا ہے، اس بنا پر کہ عرش کی صفت ہے۔ ابن محیصن نے بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ رب کی صفت ہے۔[3] خاص کر عرش کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ تمام مخلوق میں سے سب سے بڑا ہے، جس طرح کہ مرفوع حدیث سے ثابت ہوا ہے۔[4] یہاں تک ہدہد کا کلام ہے، لیکن قولہ: ﴿ اَلَّذِيْ يُخْرِجُ ﴾ سے لے کر اس جگہ تک ﴿ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ ﴾ کے تحت میں داخل نہیں ہے، یعنی یہ کلام اس قبیل سے نہیں ہے کہ اس کو ہدہد نے تو جانا اور سلیمان علیہ السلام نے نہیں جانا، کیوں کہ اس مضمون کو وہ بھی جانتے تھے، بلکہ ان کا علم اس بارے میں ہدہد کے علم سے بھی زیادہ کامل اور مکمل تھا۔ ہدہد نے جو یہ اس کا ذکر کیا تو اس کی غرض اپنے اعتقاد کا بیان کرنا ہے، جس پر وہ قائم ہے اور دین میں اپنی سختی اور پختگی کو ظاہر کرنا ہے۔[5] بالجملہ جب ہدہد اپنی تقریر سے فارغ ہو چکا تو سلیمان علیہ السلام نے اس سے فرمایا:

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾
اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ
مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ
كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٩﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ١٨٧۔ ١٨٨) فتح القدير (٤/ ١٧٧) [2] تفسير الخازن (٥/ ١٤٣)
[3] تفسير القرطبي (١٣/ ١٨٩) [4] السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٩) [5] فتح البيان (١٠/ ٣١۔ ٣٧)

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

سلیمان نے کہا: ہم جلد ہی دیکھیں گے آیا تو نے سچ کہا یا تو جھوٹوں میں سے ہے﴿27﴾ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان کی طرف ڈال دے، پھر ان سے ہٹ (کر بیٹھ) جا، سو دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں﴿28﴾ (بلقیس نے) کہا: اے سردارو! بلاشبہ میری طرف ایک گرامی نامہ ڈالا گیا ہے ﴿29﴾ بے شک وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور بے شک اس کا آغاز اللہ کے نام سے ہے جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے﴿30﴾ یہ کہ تم میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو، اور فرماں بردار ہو کر میرے پاس چلے آؤ﴿31﴾

سلیمان علیہ السلام کا ملکۂ سبا کے نام خط:

میرا خط انھیں دے دے اور پھر اُن کے پاس سے ہٹ آ، یعنی آپ ان کی نظروں سے بچ، لیکن وہاں کا ماجرا دیکھ کر آ۔ ہدہد خط لے گیا اور بلقیس جہاں اکیلی سوئی ہوئی تھی، سوراخ میں سے لے جا کر خط اس کی چھاتی پر رکھ دیا۔ کہتے ہیں کہ خط سنہرے کاغذ پر لکھا ہوا تھا، انھیں جو یہ کہا کہ مسلمان ہو کر میرے پاس آ جاؤ تو اُن کو دینِ حق سکھانا منظور تھا۔ انتھی[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک سلیمان علیہ السلام کے اس قول کی خبر دیتا ہے جو انھوں نے ہدہد سے کہا، جب اس نے ان کو اہلِ سبا اور ان کی ملکہ کی خبر دی۔ کہا ہم دیکھیں گے آیا تو نے یہ خبر دینے میں سچ کہا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے، یہ اس لیے تاکہ جو وعید میں نے تجھ کو سنائی ہے اس سے خلاصی پا جائے۔ ﴿ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے بلقیس اور اس کی قوم کو ایک خط لکھا اور وہ خط ہدہد کو دیا تو اس نے اس کو اٹھا لیا۔ کسی نے کہا: اپنے بازو میں جس طرح کہ پرندوں کی عادت ہے۔ کسی نے کہا: اپنی چونچ میں پکڑ لیا اور اُن کے شہر کی طرف چل دیا۔ بلقیس کے گھر میں اس کے خلوت کدہ کی طرف گیا جس میں وہ تنہا ہوتی تھی، پھر اس خط کو اس کی طرف ڈال دیا، ایک سوراخ میں سے جو اس کے سامنے تھا، پھر ادب اور ریاست کی وجہ سے ایک طرف کو ہٹ آیا۔ بلقیس نے جو بات دیکھی اس سے حیران ہوگئی، اس سے اس کے دل میں ڈر اور خوف پیدا ہوا، پھر اس نے خط کو لیا، اس کی مہر کھولی اور اس کو پڑھا تو اس میں یہ لکھا ہوا تھا: ﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

پھر اس وقت اس نے اپنے امراء، وزراء اور دولت و مملکت کے بڑوں کو جمع کیا اور ان سے کہا: اے دربار والو! میرے پاس ایک خط کریم (بڑا باعزت) ڈالا گیا ہے۔ اس کے خط کا حال عجیب ہے، جو اس نے دیکھا کہ ایک پرندہ اس کو لے کر آیا اور اس کو اس کی طرف ڈال دیا۔ پھر ادب کے مارے اس سے پیچھے ہٹ گیا، یہ ایک ایسی بات ہے

کہ کوئی بادشاہ اس قسم کی قدرت نہیں رکھتا، نہ اس کو اس قسم کا کام کرنے پر کوئی اختیار ہے۔ پھر وہ خط اُن پر پڑھا۔ چنانچہ وہ لوگ پہچان گئے کہ وہ اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور اس سے مقابلہ کرنے کی ان میں کسی طرح کی طاقت نہیں ہے اور یہ خط نہایت بلاغت، وجازت اور فصاحت میں ہے، اس لیے کہ نہایت آسان اور حسین اور مختصر سی عبارت میں پورا مقصد حاصل ہو گیا ہے۔

علماء رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ سلیمان علیہ السلام سے پہلے کسی نے "بسم الله الرحمن الرحيم" نہیں لکھا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابن بریدہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، وہ اپنے باپ سے راوی ہیں، کہا: میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ چل رہا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں ایک آیت کو جانتا ہوں جو مجھ سے پہلے اور سلیمان علیہ السلام کے بعد کسی نبی پر نازل نہیں ہوئی۔ میں نے عرض کی: یا نبی اللہ! وہ کون سی آیت ہے؟ فرمایا: میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے بتاؤں گا۔ پھر آپ مسجد کے دروازے تک پہنچے۔ پھر اپنا ایک پاؤں نکالا تو میں نے جی میں کہا کہ آپ بھول گئے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف توجہ کی اور فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ [1] یہ حدیث غریب ہے اور اس کی اسناد ضعیف ہے۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" لکھا کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے "بسم الله الرحمن الرحيم" لکھنا شروع کر دیا۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "لَا تَجْبَرُوْا عَلَيَّ"۔ عبد الرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: "لَا تَمْتَنِعُوْا وَلَا تَتَكَبَّرُوْا عَلَيَّ"۔[3] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مُوَحِّدِيْنَ"۔ دوسروں نے کہا: "مُخْلِصِيْنَ" سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا: "طَائِعِيْنَ"[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع وضاحت یہ ہے: ﴿ قَالَ سَنَنْظُرُ ﴾ جملہ مستأنفہ ہے اور سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ جب ہدہد اپنی تقریر پوری کر چکا تو سلیمان علیہ السلام نے کیا کہا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے اس سے فرمایا: جو قصہ تو نے ہمیں بتایا ہے، ہم اس میں نظر کریں گے، سوچیں سمجھیں گے اور معرفت حاصل کریں گے۔

"نظر" تامل و تصفح کو کہتے ہیں، یعنی غور و فکر کرنا، سوچنا سمجھنا، چھان بین کرنا۔ اس میں اس بات کی ہدایت ہے کہ مخبروں کی تقلید کر کے ان کی خبر کو قبول نہ کرے، بلکہ اس خبر میں بحث کرے اور حقائق کا کشف فرمائے، جبکہ وہ تحقیق کرنے اور تفتیش کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ محض مخبر کی خبر پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس کی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۷۳) اس کی سند میں "عبدالکریم ابو امیہ" سخت ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۷۳) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسیر الطبري (۱۹/ ۴۵۳)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۷۴) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۷۷۔ ۴۷۸)

خوب تحقیق و بحث کرے، اس کے بعد اگر سچ نکلے تو اس پر عمل کرے ورنہ خیر۔

﴿ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ یہ جملہ استفہامیہ محلِ نصب میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ سَنَنْظُرُ ﴾ کا مفعول ہے اور کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ متصلہ ہے۔ یعنی ہم اس بات کو دیکھیں گے کہ آیا جو بات تو نے کہی ہے، اس میں تو سچا ہے یا جھوٹا۔ ایسے مقام میں نہایت مختصر اور مشہور جملہ "أَمْ كَذَبْتَ فِيهِ" ہے۔ اس کے باوجود یوں نہ کہا بلکہ ﴿ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر مبالغہ ہے، اس لیے کہ معنی یہ ہیں یا تو اُن لوگوں میں سے ہے جو متصف بہ کذب ہیں اور کذب ان کا خلق اور عادت ہو گیا ہے۔ یہ اس کو مفید ہے کہ وہ پورے طور پر کاذب ہے اور جو کوئی ایسا ہے تو اس پر وثوق نہیں کیا جاتا۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تغییر یعنی اسلوب کا بدلنا مبالغے کے لیے ہے اور فواصلِ آیات پر محافظت کے لیے ہے۔[1] پھر جس نظر اور غور کا سلیمان علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا اس کا بیان فرمایا: ﴿ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ﴾ یعنی تو میرا یہ خط لے جا، پھر اس کو اہلِ سبا کی طرف ڈال دے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "أَلْقِه" میں پانچ وجہیں ہیں: ایک تو اثبات یائے تحتیہ لفظ میں، یعنی: "اَلْقِهِيْ"۔ دوسرے یا کا حذف اور اثباتِ کسرہ تاکہ یا پر دلالت کرے، یعنی "أَلْقِهِ" تیسری بہ ضمِ "ہا" و اثباتِ واو۔ یعنی "أَلْقِهُوْ"۔ چوتھی بہ حذفِ واو و اثباتِ ضمہ تاکہ واو پر دال ہو، یعنی "أَلْقِهُ"۔ پانچویں بہ اسکان ہا، یعنی "اَلْقِهْ"۔ اس پانچویں لغت کے ساتھ امام ابوعمرو، حمزہ اور ابوبکر رحمہم اللہ نے پڑھا ہے۔ قالون نے بہ کسرِ ہا پڑھا ہے، فقط بدوں حرفِ یا، اور ہشام سے دو وجہیں مروی ہیں: اثباتِ یا لفظ میں، اور حذفِ یا مع کسرۂ ہا۔ باقی قراء نے بہ اثباتِ یا پڑھا ہے۔[2] لفظ میں کلمۂ ﴿ هٰذَا ﴾ میں احتمال ہے کہ صفت ہو "كِتَابِيْ" کی، یا اس سے بدل ہو، یا اس کا بیان ہو۔ سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو جو خط لے جانے کے لیے مخصوص فرمایا تو اس لیے کہ قصے کی خبر دینے والا وہی تھا اور اس لیے کہ اس میں فہم اور علم کے آثار دیکھے، وہ اس کے مقتضی تھے کہ وہ پیغام رسانی کے لائق ہے۔

﴿ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ ﴾ یعنی خط ڈال کر پھر ان کے پاس سے ایک طرف ہو جا اور اُن سے قریب ٹھہر۔ اس کو یہ حکم اس لیے دیا کہ خط دینے کے بعد ایک طرف ہو جانا بہترین آداب میں سے ہے جس کے ساتھ بادشاہوں کے قاصدوں کی تربیت کی جاتی ہے اور مراد ایسی جگہ میں یکسو ہو جانا ہے کہ وہاں سے ان کی بات چیت سنی جا سکے، تاکہ جو بات سنے اس کی خبر سلیمان علیہ السلام کو دے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ تَوَلَّ ﴾ کے معنی لوٹ آنا ہے سلیمان علیہ السلام کی طرف، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ اس کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ یعنی تو ان باتوں میں غور و فکر کر جو بعض بعض سے کرتے ہیں اور باہم ایک دوسرے کو جواب دیتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "كُنْ قَرِيبًا مِّنْهُمْ فَانْظُرْ مَا الَّذِي يَرُدُّونَهُ مِنَ الْجَوَابِ"[3] یعنی تو اُن سے قریب رہ، پھر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٦٥) [2] معاني القرآن (٤/ ١١٦) فتح القدير (٤/ ١٨٠) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٧١)

﴿ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا ﴾ یہاں عبارت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ پھر ہدہد گیا تو اس نے وہ خط اُن کی طرف ڈال دیا۔ پھر بلقیس کو سنا کہ وہ یوں کہہ رہی ہے: اے دربار والو! ﴿ اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴾۔ "مَلَأٌ" کہتے ہیں اشراف کو، وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ آنکھوں کو بھر دیتے ہیں۔ ﴿ اُلْقِيَ ﴾ کا فاعل محذوف ہے۔ کہا ہے کہ اگر اس نے ہدہد کا مشاہدہ نہیں کیا تو اس صورت میں فاعل کا حذف اس لیے ہے کہ اس کو فاعل کے بارے میں لاعلمی تھی اور اگر ہدہد کو اس نے دیکھ لیا تھا تو اس کے ایک حقیر سا پرندہ ہونے کا ذکر نہ کیا۔ ﴿ كَرِيْمٌ ﴾ کے معنی ہیں مکرم و معظم۔ خط کو ﴿ كَرِيْمٌ ﴾ کے ساتھ موصوف کیا، اس لیے کہ وہ ایک بڑے شخص کے پاس سے آیا، جو اس کے جی میں عظیم تھا۔

چنانچہ اس نے سلیمان علیہ السلام کے اجلال کے لیے ان کے خط کو معظم کہا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس لیے کہ اس میں ایسا کلام تھا جو حسین تھا اور اس کا بیان اور ادا بہت خوب اور مرغوب تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس لیے کہ وہ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ سے شروع کیا گیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس لیے کہ اس کی حالت عجیب و غریب تھی، یعنی اس وجہ سے کہ ایک پرندہ اس کو لے کر آیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس خط پر سلیمان علیہ السلام کی مہر لگی ہوئی تھی اور خط کی کرامت اور شرافت اور بزرگی اس کی مہر ہوتی ہے، چناں چہ یہ بات مرفوعاً مروی ہے۔[1] ابن مقنع نے کہا ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کو خط لکھے اور اس پر مہر نہ لگائے تو یقیناً اس نے اس کی سبکی کی۔[2]

پھر اس خط میں جو مضمون شامل تھا، بلقیس نے اس کا بیان کیا اور کہا: ﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ ﴾ یعنی وہ خط اللہ کے بندے سلیمان بن داود کا بلقیس ملکۂ سبا کی طرف ہے، وہ یہ ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ یعنی جس بات پر وہ خط مشتمل ہے وہ یہ ہے کہ شروع کیا گیا ہے اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ اس نے جو خط کو کرم کے ساتھ موصوف کیا تھا تو اس میں اس کے سبب کی طرف اشارہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ہدہد خط لے کر چلا، یہاں تک کہ جب اس کے تخت کے درمیان پہنچا تو اس کو اس کی طرف ڈال دیا، پھر وہ اس پر پڑھا گیا تو اس میں یہ تھا: ﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾[3]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا میمون بن مہران رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" لکھا کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر آپ نے "بسمله" لکھنا شروع کیا[4] اور اس کے بعد "اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى"

قولہ: ﴿ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ ﴾ یعنی اور "بسم الله" کے بعد یہ ہے: "أَمَّا بَعْدُ فَلَا تَتَكَبَّرُوْا عَلَيَّ"، یعنی تم مجھ پر بڑائی نہ کرو، جس طرح کہ جابر بادشاہ کرتے ہیں۔ کلمۂ "أَنْ" مفسرہ ہے یا مصدریہ اور کلمۂ "لا" ناہیہ ہے یا نافیہ اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٩٢) [2] روح المعاني (٤/ ١٩٩)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٧١) [4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

جملے کا محل رفع ہے۔ اس بنا پر کہ کتاب سے بدل ہے، یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یعنی "هُوَ أَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ"۔ جمہور نے ﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ ﴾ ہر دو کو کسر کے ساتھ پڑھا ہے استیناف کی بنا پر۔ امام عکرمہ اور ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے ہر دو کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے بنا بر اسقاطِ حرفِ جر اور سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے "أَنْ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَأَنْ بِسْمِ اللّٰهِ" ہر دو ضمیر کے حذف اور ہر دو کے اسکان کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ دونوں "أَنْ" مفسرہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "وَأَنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ" حرفِ واو کے اضافے کے ساتھ پڑھا۔ یہ قراءت سیدنا ابی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ امام اشہب عقیلی اور ابن سمیفع رحمہ اللہ نے "أَنْ لَّا تَغْلُوْا" غینِ معجمہ کے ساتھ پڑھا ہے، جو غلو سے ماخوذ ہے، غلو حد سے بڑھنے کو کہتے ہیں۔[1]

﴿ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴾ یعنی اور آؤ تم میرے پاس اس حال میں کہ مطیع اور فرماں بردار ہو دین کے لیے اور اس شے پر ایمان لانے والے ہو جس کو میں لے کر آیا ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس عبارت میں کچھ زیادہ نہیں کیا جس کی اللہ پاک نے اپنی کتاب میں تصریح فرمائی ہے اور اسی طرح انبیاء مختصر لکھا کرتے تھے: "لَا يُطِيْلُوْنَ وَلَا يُكْثِرُوْنَ" نہ طول کرتے تھے نہ کثرت۔ کسی نے کہا ہے کہ "طَبَعَهٗ سُلَيْمَانُ بِالْمِسْكِ" یعنی اس خط پر مشک کا ایک ٹکڑا موم کی طرح رکھ دیا۔ پھر اس پر اپنی مہر لگا دی تھی۔[2]

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

بلقیس نے کہا: اے سردارو! میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو، کسی معاملے کا قطعی فیصلہ میں اس وقت تک نہیں کرتی جب تک تم میرے پاس موجود نہ ہو (اور مجھے مشورہ نہ دو) ﴿32﴾ انھوں نے کہا: ہم قوت والے اور سخت جنگجو ہیں، اور (فیصلے کا) تمام اختیار آپ کے پاس ہے، آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں ﴿33﴾ اس نے کہا: بلاشبہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل

[1] فتح القدير (٤/ ١٨١) [2] فتح البيان (١٠/ ٣٧ـ ٣٩)

ہوتے ہیں تو اسے خراب کرتے اور اس کے باعزت لوگوں کو ذلیل کرتے ہیں اور یہ بھی اسی طرح کریں گے (34) اور بے شک میں ان کی طرف کوئی ہدیہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں قاصد کیا (جواب) لے کر لوٹتے ہیں؟ (35)

ملکۂ سبا کا اپنے سرداروں سے مشورہ اور سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں ہدیہ:

یعنی یہ بادشاہ بھی ایسا ہی کریں گے، یعنی بستی کو اُجاڑ دیں گے اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیں گے۔ ہدیہ بھیج کر چاہا کہ اس بادشاہ کا شوق معلوم کرے جس چیز پر ہے، مال یا خوبصورت آدمی یا اور اسباب۔ سب قسم کی چیزیں بھیجی تھیں۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس وقت بلقیس نے سلیمان علیہ السلام کا خط پڑھا تو اپنے کام میں اور اس حکم کے بارے میں جو خط میں اسے دیا گیا تھا، اپنے سرداروں میں مشورہ طلب کیا اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ يَاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴾ یعنی یہاں تک کہ تم حاضر ہو اور مشورہ دو۔ وہ بولے: ﴿ نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ﴾ یعنی انھوں نے اپنی تعداد اور اپنی قوت اور ہمت کی طرف توسل کیا (وسیلہ پکڑا) مطلب یہ ہے کہ ہماری فوج بہت ہے اور ساز و سامان لڑائی کا بہت ہے اور ہم بڑے لڑنے والے اور زور آور ہیں، اگر تو لڑائی کا حکم دے تو ہم خوب لڑیں گے۔

پھر اس کے بعد اپنا کام اس کے سپرد کیا اور اس طرح بولے: ﴿ وَالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴾ یعنی ہمارے واسطے کوئی مانع نہیں ہے نہ ہم کو کچھ خوف ہے، اگر تو چاہے تو اس کا قصد کر اور اس سے لڑ، ہم کو اس سے کوئی مانع نہیں ہے اور اس کے بعد پھر کام تیرے سپرد ہے۔ لہٰذا تو ہمارے حق میں اپنی رائے اور سوچ سے کام لے، ہم اس کی بجا آوری کریں گے اور اس کو مانیں گے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ انھوں نے اپنا معاملہ ایک "عِلجَه" کے سپرد کیا، (علج کہتے ہیں گبر کو جس کا کوئی دین نہیں ہے) کہ جس کی چھاتیاں ہل رہی ہیں۔[1]

پھر جب انھوں نے اس سے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا تو وہ رائے میں اُن سے زیادہ دور اندیش تھی اور سلیمان علیہ السلام کا حال خوب جانتی تھی اور اسے اس بات کا خوب علم تھا کہ ان کے لشکروں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی اس میں طاقت و ہمت نہیں ہے اور جنوں اور انسانوں اور طیور کے ساتھ، جو اُن کے مسخر اور فرماں بردار ہیں، کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور خط کا قصہ جو ہدہد کے ساتھ آیا تھا، اس سے ایک عجیب و غریب اور نئے امر کا مشاہدہ کر چکی تھی۔ یہ سب امور اس کے پیشِ نظر تھے، ان پر نظر کر کے ان سے کہا کہ میں ڈرتی ہوں کہ ہم ان سے لڑیں اور اُن سے رک رہیں تو وہ اپنے

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۷٦)

لشکر لے کر ہم پر چڑھائی کر دیں اور ہمارے ہم راہیوں کو ہلاک کر ڈالیں اور تمھارے والی کو ہلاکت اور بربادی پہنچے نہ کہ ہمارے غیروں کو، اسی لیے اس نے یوں کہا: ﴿ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا ﴾

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی جس وقت وہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں، "عَنْوَةً" یعنی قہر اور غلبے سے تو اس کو برباد کر دیتے ہیں۔[1] ﴿ وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ﴾ یعنی اور قصد کرتے ہیں ان لوگوں کا جو اس میں والی اور لشکر ہیں تو ان کی انتہا درجے کی ذلت کرتے ہیں، یا تو قتل کرتے ہیں یا قید کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بلقیس نے تو یہ کہا: ﴿ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ﴾ رب عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴾[2] پھر اس نے مصالحت ومہادنت (صلح) ومسالمت ومخادعت (ایک دوسرے کو چھوڑ دینا) ومصانعت کی طرف رجوع کیا تو یوں کہا: ﴿ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ یعنی میں اس کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں جو ایسے آدمی کے لائق ہے اور دیکھتی ہوں کہ اس کے بعد اس کا جواب کیا ہوتا ہے۔ شاید وہ اس کو قبول کرلے اور ہم سے باز رہے، یا ہم پر کچھ خراج مقرر کر دے کہ ہم اسے ہر سال وہ پہنچا دیں اور ہم اس کے لیے اس کا لازمی انتظام کریں اور وہ ہم سے جنگ کرنے اور ہمیں قتل کرنے سے باز رہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے دین اور شرک میں کیا عقل والے تھے۔ "عَلِمَتْ أَنَّ الْهَدِيَّةَ تَقَعُ مَوْقِعًا مِّنَ النَّاسِ" یعنی اس نے یہ بات جان لی کہ ہدیہ لوگوں کے نزدیک ایک بڑے موقع میں واقع ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور غیر واحد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر وہ ہدیہ قبول کرے تو وہ بادشاہ ہے، پھر تم اس سے لڑو اور اگر وہ اس کو قبول نہ کرے تو نبی ہے، پھر تم اس کی پیروی کرو۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ "مَلَأُ" بہ معنی اشراف ہے، یعنی اے شریف لوگو! تم مجھے مشورہ دو اور اس معاملے میں جو صحیح بات ہے وہ مجھ سے بیان کرو اور ایسا جواب دو جو دور اندیشی اور احتیاط کا تقاضا ہو۔ مشورہ کو فتویٰ اس لیے فرمایا کہ اس معاملے کا حل ہے جو اس کے لیے مشکل ہے۔ عبارت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ پھر جب بلقیس نے خط پڑھا تو اپنی قوم کے شرفاء کو جمع کیا، یہ لوگ تین سو بارہ آدمی تھے، ان میں سے ہر ایک کے بہت سے پیروکار تھے اور اُن سے کہا: اے شریفو! میری طرف ایک خط ڈالا گیا ہے۔ اے شریفو! مجھے مشورہ دو۔ لفظ ﴿ قَالَتْ ﴾ دوبارہ اس لیے ذکر کیا ہے کہ جو بات اس نے ان سے کہی، اس کا اور زیادہ اہم ظاہر کرنا منظور تھا۔

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٧٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٥٥) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٧٧)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٧٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٧٨)

پھر اس نے ادب میں اور اُن کے دل مائل کرنے کے لیے اور زیادہ اہتمام کیا، تا کہ وہ لوگ اس کی خالص خیر خواہی کریں اور صحیح مشورہ دیں۔ چنانچہ کہا: ﴿ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴾ یعنی اے شریفو! میری عادت اور تمھارے ساتھ طرزِ عمل یہ ہے کہ کوئی بھی کام ہو، میں اس کے بارے میں فیصلہ اور قطعی حکم تمھارے حاضر ہونے اور مشورہ کے بغیر نہیں کرتی۔ مطلب یہ ہے کہ میرا تم پر دار و مدار ہے۔ میں تمھارے بغیر ایک تنکا بھی نہیں ہلاتی۔ پھر جب اس نے ان سے یہ بات کہی تو انھوں نے یہ جواب دیا: ﴿ نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ﴾ یعنی ہم آدمیوں کی تعداد اور ساز و سامان کے لحاظ سے بڑی قوت والے ہیں اور لڑائی کے وقت اور دشمن سے مقابلے کے وقت ہم سخت لڑنے والے ہیں اور ہماری شجاعت، بہادری اور قوت ایسی ہے کہ ہم اپنی جانوں کو اور اپنے شہر اور حکومت کو بچا لیں گے۔ غرضیکہ انھوں نے لڑنے کا مشورہ دیا، پھر کام کو اسی کے سپرد کیا، کیوں کہ اس کی رائے کی درستی اور عقل و قوت کو خوب جانتے تھے۔ چنانچہ کہا: ﴿ وَالْاَمْرُ اِلَيْكِ ﴾ یعنی معاملہ تیرے سپرد ہے۔ ﴿ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴾ لہٰذا تو غور و فکر کر، تو ہمیں جو بھی حکم دے گی وہ ہم سنیں گے اور بجا لائیں گے۔

پھر جب اس نے یہ بات سنی کہ معاملہ اس کے سپرد کر دیا گیا ہے تو وہ لڑائی پر راضی نہ ہوئی، بلکہ صلح کی طرف مائل ہوئی اور صلح کی طرف راغب ہونے کا سبب بیان کیا اور کہا: ﴿ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا ﴾ یعنی بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کے مکانات کو خراب اور ویران کر ڈالتے ہیں اور اس کی مجالس اور عمدہ جگہوں کو بگاڑ دیتے ہیں اور اس کے اموال کو ضائع کر دیتے ہیں اور اس کی جمعیت کو منتشر کر دیتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس وقت اس کو زبردستی اور قہر سے لیتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2]

﴿ وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ﴾ یعنی اس کے اشراف کو ذلیل کرتے ہیں اور اُن کے مرتبے گھٹا دیتے ہیں تو وہ اس وقت ذلیل ہو جاتے ہیں اور یہ کام اسی لیے کرتے ہیں کہ اُن کی حکومت اور سلطنت مکمل ہو جائے اور اُن کا دباؤ مستحکم ہو جائے، اُن کا رعب دلوں میں جم جائے۔ اس کا مقصد اس سے اپنی قوم کو ڈرانا ہے کہ کہیں سلیمان علیہ السلام آ نہ جائیں اور اُن کے شہر میں داخل نہ ہو جائیں۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَذِلَّةً ﴾ پر وقف تام ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس کے قول کی تحقیق اور تصدیق کے لیے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴾[3] اس بنا پر یہ جملہ مستأنفہ ٹھہرے گا، اس کے لیے اعراب کا کوئی محل نہ ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ بلقیس کے تتمۂ کلام سے ہے تو یہ پھر اسی کے کہے ہوئے قول کا حصہ ہوگا، گویا اس نے اپنی پہلی بات کی تاکید اس سے کی کہ بادشاہ لوگ ایسا فعل کیا کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ یہ کام ان کی پکی عادت ہے جو بدلتی نہیں ہے۔ اس نے یہ بات اس لیے کی کہ وہ خود ایک

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٧٦)　[2] معاني القرآن (٤/ ١١٩)　[3] تفسير القرطبي (١٣/ ١٩٥)

قدیم بادشاہی خاندان سے تھی اور یہ امر اس کا سنا اور دیکھا ہوا تھا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو شخص زمین میں فساد کرتا پھرتا ہے، اس نے اس آیتِ کریمہ سے حجت پکڑی ہے، حالاں کہ جو کوئی کسی حرام چیز کو مباح کرے تو وہ یقیناً کافر ہو جاتا ہے اور جب اس کے لیے تحریف کے طریقے سے قرآن شریف سے حجت پکڑے تو بے شک اس نے دو کفر کو جمع کر لیا۔ انتھی۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ سُوْءِ الْفَهْمِ.

پھر جب بلقیس نے مقدمہ اُن کے سامنے پیش کیا تو اس کے نزدیک جو عمدہ اور صحیح رائے تھی اس کو واضح طور پر ان سے بیان کیا تو کہا: ﴿ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ ﴾ یعنی میں اس شخص کو اپنا قاصد ہدیہ کے ساتھ بھیج کر آزماتی ہوں، ایسا ہدیہ جو اعلیٰ قسم کے اموال پر مشتمل ہوگا، لہٰذا اگر وہ بادشاہ ہے تو ہم اس کو اس سے راضی کر لیں گے اور اس کے کام سے کفایت میں رہیں گے اور اگر وہ نبی ہے تو وہ اس کام سے راضی نہ ہوگا، کیوں کہ اس کا اصل مقصد اور مطلب یہی دین کی طرف دعوت دینا ہے تو اس صورت میں ہمیں اس کے سوا اس کی چیز اس سے نجات نہیں دے گی کہ ہم اس کا کہنا مان لیں، اس کے پیرو ہو جائیں اور اس کا دین قبول کر لیں اور اس کی چال چلیں۔ اسی لیے یوں کہا: ﴿ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ یعنی پھر میں دیکھتی ہوں کہ جو قاصد ہدیہ لے کر گئے ہیں، وہ کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں، ہدیہ قبول ہوتا ہے یا واپس آتا ہے، پھر جو اس جواب کا تقاضا ہوگا، وہی کروں گی۔ بلقیس ایک عقل مند ہوشیار اور تجربہ کار عورت تھی۔ مفسرین نے اس ہدیے کا ذکر بہت طوالت سے کیا ہے۔ سب قسم کے رطب و یابس اقوال ذکر کیے ہیں۔ روایت سے جو ثابت ہوئے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس نے سونے کی ایک اینٹ بھیجی تھی۔ پھر جب قاصد لوگ ہدیہ لے کر آئے تو دیکھا کہ شہر کی دیواریں سونے کی تھیں۔ یہ ان کا وہی قول ہے: ﴿ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴾

ثابت بنانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس نے سونے کے تختے دیباج کے ظرفوں میں بھیجے تھے۔ (اصل روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: "صَفَائِحُ الذَّهَبِ فِيْ أَوْعِيَةِ الدِّيْبَاجِ" یعنی سونے کے پتر ریشمی گاڑھے کپڑوں میں رکھے ہوئے تھے۔) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لونڈیوں کا ہدیہ بھیجا تھا۔ ان کا لباس غلمان کا تھا اور غلمان بھیجے کہ لباس ان کا لونڈیوں کا لباس تھا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: دو گھوڑے ہدیہ بھیجے تھے، ہر گھوڑے پر ایک غلام اور ایک لونڈی تھی اور ہر گھوڑے پر ایک قسم کا ساز و سامان تھا، جو دوسرے پر نہ تھا۔[1] سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہدیہ جواہر تھے۔ اس کے سوا اور اقوال ہیں، ان کے ذکر میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔[2]

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۷۷۔ ۲۸۷۹) [2] فتح البیان (۱۰/ ۴۰۔ ۴۱)

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ۝۳۶ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝۳۷

چناں چہ جب قاصد سلیمان کے پاس پہنچا، تو سلیمان نے کہا: کیا تم مال کے ساتھ میری مدد کرنا چاہتے ہو، مجھے اللہ نے جو دیا ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو اس نے تمھیں دیا ہے، بلکہ تم خود ہی اپنے ہدیے کے ساتھ خوش رہو (36) تو ان کی طرف لوٹ جا، اب ہم ضرور ان پر ایسے لشکروں سے چڑھائی کریں گے کہ ان (تمھارے لوگوں) میں ان کے خلاف لڑنے کی طاقت نہ ہوگی اور ہم ضرور انھیں ذلیل کر کے وہاں سے نکال دیں گے، اور وہ خوار ہوں گے (37)

ملکۂ سبا کے ہدیے پر سلیمان علیہ السلام کا دھمکی آمیز جواب:

اور کسی پیغمبر نے اس طرح کی بات نہیں فرمائی، ان کو حق تعالیٰ کی سلطنت کا زور تھا، جو یہ فرمایا۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: سلف وغیرہم کے بہت سے مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس نے ان کی طرف ایک عظیم ہدیہ بھیجا تھا سونے، جواہر اور موتیوں وغیرہ کا۔ بعض نے کہا ہے کہ سونے کی ایک اینٹ بھیجی تھی۔ صحیح یہ ہے کہ ان کو سونے کا ایک برتن بھیجا تھا۔ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ لونڈیاں غلمان کے لباس میں اور غلمان لونڈیوں کے لباس میں بھیجے تھے اور اس نے کہا کہ اگر وہ ان کو ان سے پہچان لے گا تو نبی ہے۔ کہا گیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے ان کو حکم دیا تو انھوں نے وضو کیا، چنانچہ لڑکی تو اپنے ہاتھ پر پانی ڈالنے لگی اور لڑکا بھرنے لگا، لہٰذا اس سے انھوں نے تمیز کر لیا۔[1] کسی نے کہا: بلکہ لڑکی تو اپنے ہاتھ کے اندرونی حصے کو دھونے لگی اس سے پہلے کہ ظاہر کو دھوئے اور لڑکے نے اس سے اُلٹ کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ لڑکیاں تو اپنی ہتھیلیوں سے کہنیوں کی طرف دھونے لگیں اور لڑکے اپنی کہنیوں سے ہتھیلی کی طرف۔ ان سب کے درمیان کوئی منافات نہیں، یعنی ان روایتوں میں تضاد نہیں۔ واللہ أعلم.

بعض نے ذکر کیا ہے کہ اس نے ان کی طرف ایک پیالہ بھیجا تھا کہ اس کو شیریں پانی سے بھر دیں کہ وہ نہ آسمان کا ہو نہ زمین کا۔ سلیمان علیہ السلام نے گھوڑے دوڑائے، یہاں تک کہ وہ پسینے پسینے ہو گئے، پھر اس پانی سے وہ پیالہ بھر دیا اور ایک منکا (تفسیر بیضاوی میں ہے: "جَزْعَةٌ مُعَوَّجَةُ الثَّقْبِ"[2] یعنی ٹیڑھے سوراخ کا ایک منکا جس میں دھاگا ڈالنا مشکل تھا۔ واللہ أعلم.) بھیجا تھا اور ایک دھاگا، تاکہ اس کو اس میں پرو دیں، پس انھوں نے پرو دیا۔

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٧٧)
[2] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٦٧)

یہ تھا یا نہ تھا یہ اکثر باتیں اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ جو کچھ وہ لے کر آئے تھے، سلیمان علیہ السلام نے اس کی طرف بالکل نظر نہ کی، نہ ہی اس کی کچھ پروا فرمائی، بلکہ اس سے اعراض کیا اور اس پر انکار کر کے اس طرح فرمایا: ﴿ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ﴾ یعنی کیا تم میری مصانعت اور رفاقت کرتے ہو مال سے اور مجھے رشوت دیتے ہو کہ میں تم کو تمھارے شرک اور ملک پر چھوڑ رکھوں۔

﴿ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ﴾ یعنی اللہ پاک نے مجھ کو جو ملک اور مال اور لشکر عطا کیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو تمھارے پاس ہے۔ ﴿ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴾ یعنی تم ہی ہو جو ہدیوں اور تحائف کے لیے فرماں بردار ہو جاتے ہو۔ رہا میں تو تم سے صرف اسلام یا تلوار، یعنی تلوار سے مقابلہ ہی قبول کروں گا۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے عن المنہال بن عمرو عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے شیاطین کو حکم دیا تو انھوں نے ان کے لیے سونے اور چاندی سے ملمع کر کے ہزار محل تیار کر دیے، پھر جب بلقیس کے قاصدوں نے یہ معاملہ دیکھا تو بولے کہ یہ ہمارے ہدیے کو کیا کرے گا۔[1] اس میں یہ بات ہے کہ ایلچیوں اور قاصدوں کے لیے بادشاہوں کا تیاری کرنا اور زینت ظاہر کرنا جائز ہے۔

﴿ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ ﴾ یعنی تو اُن کی طرف ان کا ہدیہ لے کر لوٹ جا۔ ﴿ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا ﴾ یعنی ہم اُن کے پاس ایسے لشکر لے کر آئیں گے کہ ان کے ساتھ لڑنے کی ان کو کسی طرح کی طاقت نہ ہوگی۔ ﴿ وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً ﴾ اور قسم اللہ کی! ہم ان کو بے عزت کر کے ان کے شہر سے نکال دیں گے۔ ﴿ وَهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ اور وہ ذلیل وخوار ہوں گے۔ پھر جب اس کے قاصد ہدیہ لیے ہوئے اور سلیمان علیہ السلام کی تقریر یاد کیے ہوئے اس کی طرف لوٹ کر آئے تو اس نے اور اس کی قوم نے ان کا حکم سنا اور مانا اور ذلیل وخوار ہو کر اپنے لشکروں کے ساتھ اُن کی طرف چلے۔ سلیمان علیہ السلام کی تعظیم کرتے ہوئے اور اُن کی دین میں فرماں برداری کی نیت کرتے ہوئے۔ سلیمان علیہ السلام کو جب اُن کا اپنی طرف آنا ثابت اور متحقق ہوا تو اس سے خوش ہوئے اور اس بات نے ان کو مسرور کیا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان معانی کی وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ ﴾ یعنی جب بلقیس کا قاصد جو ہدیے کے ساتھ بھیجا گیا تھا سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا اور اس کا نام منذر بن عمرو ہے۔ ﴿ جَآءَ ﴾ کی ضمیر سے مراد جنس ہے۔ یہ قاصدوں کی ایک جماعت ہونے کے منافی نہ ہوگا۔ چناں چہ ان کا ایک جماعت ہونے پر بلقیس کا یہ قول دلالت کرتا ہے: ﴿ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جَآءُوْا سُلَيْمَانَ“ بہ صیغۂ جمع ہے،[3] یعنی قاصدوں کی ایک جماعت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئی۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٧٩) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٧٨۔ ٤٧٩) [3] تفسیر الطبري (١٩/ ٤٥٨)

جملہ: ﴿ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ﴾ مستانفہ ہے، سوالِ مقدر کا جواب ہے اور ہمزہ استفہامِ انکاری کے لیے ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے ان سے کیا کہا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ وہ ان کی امداد مال سے کرنا چاہتے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر کے فرمایا: کیا تم میری امداد مال سے کرتے ہو اس کے باوجود کہ میرے پاس مال کی کثرت اور سلطنت کا غلبہ ہے۔ ہرگز نہیں، مجھے تمھاری امداد کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ حمزہ نے نونِ وقایہ میں نونِ اعراب کے ادغام کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی "أَتُمِدُّونِّ". باقی قاریوں نے دونوں کے ساتھ پڑھا ہے بغیر ادغام کے۔ رہی یائے تحتیہ تو امام نافع، ابوعمرو اور حمزہ رحمہم اللہ وصل میں ثابت رکھتے ہیں اور وقف میں حذف کرتے ہیں اور ابن کثیر رحمہ اللہ دونوں حالتوں میں ثابت رکھتے ہیں اور باقی قراء دونوں میں حذف کرتے ہیں۔ نافع سے مروی ہے کہ وہ ایک نون سے پڑھتے ہیں۔

﴿ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ﴾ امام ابوعمرو، نافع اور حفص رحمہم اللہ نے "أَتَانِيَ" بیائے مفتوحہ پڑھا ہے اور یعقوب رحمہ اللہ نے باثباتِ حرفِ یائے تحتیہ وقف میں اور بحذفِ یا وصل میں۔ باقی قراء نے وصل و وقف میں بدوں یا پڑھا ہے۔[1] یہ جملہ نفیِ متقدم کی تعلیل ہے، یعنی مجھے تمھارے مال کی کچھ حاجت نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے مجھے نبوت و علم اور عظیم ملک اور کثیر مال عطا فرمایا ہے۔ وہ اس مال سے بہتر ہے جس میں سے یہ ہدیہ ہے۔

پھر انکار کر کے پہلے تو اضراب کیا اور وہ جو اس ہدیے سے از راہِ فخر و تکبر خوش ہوتے ہیں، ان پر ان کو زجر و توبیخ اور سرزنش کر کے فرمایا: ﴿ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ اس ہدیے سے تم ہی خوش ہوتے، فخر کرتے ہو اور اتراتے ہو، جبکہ میں اس سے خوش نہیں ہوتا، دنیا میری حاجت میں سے نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے اس میں سے مجھے وہ کچھ عطا کیا ہے جو جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیا اور اس کے باوجود نبوت کے ساتھ میری عزت افزائی فرمائی۔ اس اضراب سے مراد اس سبب کا بیان کرنا ہے جو ان کو ہدیہ بھیجنے کا باعث ہوا۔ وہ سبب بھی بیان کیا اور اس کے ساتھ ہی ان کو حقیر اور نیچا بھی کر دیا۔

پھر سلیمان علیہ السلام نے قاصد سے فرمایا: ﴿ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ ﴾ یعنی تو بلقیس کی طرف لوٹ جا اور اس کی قوم کی طرف، اور ہدیہ جو تو لایا ہے اسے بھی لے جا۔ یہاں اکیلے کو خطاب کیا اور پہلے جماعت کو مخاطب کیا تھا؟ یا تو اس لیے کہ جو شخص لوٹ کر جائے گا وہ ہی صرف قاصد ہے، یا اس جگہ قاصدوں کے سردار کو مخاطب کیا اور پہلے خطاب میں اس کے ساتھ سب کو خطاب کیا تھا تفننِ کلام کے لیے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "اِرْجِعُوْا" بصیغۂ جمع پڑھا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِرْجِعْ ﴾ کی ضمیر سے ہدہد مراد ہے۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ١٨٢)

﴿ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ ﴾ میں قسم محذوف کا جواب ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: میں نے ابن کیسان کو سنا، وہ کہتے تھے کہ یہ لام تاکید کا اور لام امر کا اور لام خفض کا ہے۔ یہ قول ماہر نحویوں کا ہے، کیوں کہ وہ شے کو اس کی اصل کی طرف لوٹاتے ہیں اور یہ بات صرف اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جو عربیت کا ماہر ہو۔[1]

﴿ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا ﴾ یعنی واللہ! اگر وہ میرے پاس مطیع اور فرماں بردار ہو کر نہ آئیں گے تو ہم ان کے پاس ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ کرنے کی اُن میں کسی طرح بھی طاقت نہ ہوگی۔ یہ جملہ "جُنُوْد" کی صفت ہے اور محلِ جر میں ہے۔ ﴿ قِبَلَ ﴾ کی حقیقت مقابلہ و مقاومت ہے، یعنی وہ اس بات پر قادر نہ ہوں گے کہ ان کا مقابلہ کریں اور جملہ ﴿ وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ ﴾ جوابِ قسم پر معطوف ہے۔ ﴿ اَذِلَّةً ﴾ حال ہے، یعنی البتہ ہم ان کو ان کی اس زمین سے، جس میں وہ ہیں، نکال دیں گے، یعنی سبا سے، اس حال میں کہ وہ ذلیل و خوار ہوں گے، اس کے بعد کہ وہ عزت دار تھے۔

جملہ ﴿ وَهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ حال ثانی ہے اور موکد ہے اول کا، اس لیے کہ صغار کا معنی ذلت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ صغار سے مراد قید کرنا اور غلام بنانا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صغار وہ اہانت (توہین) ہے جس کے سبب سے ذلت ہوتی ہے۔ غرضیکہ جب قاصد ہدیے کے ساتھ ہی بلقیس کی طرف لوٹ کر آیا تو اس نے سلیمان علیہ السلام کی طرف چلنے کی تیاری کی، تاکہ دیکھے کہ وہ اس کو کس بات کا حکم کرتے ہیں اور جبرائیل علیہ السلام نے ان کو اس کی خبر دے دی۔[2]

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝۳۸ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝۳۹ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۣ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝۴۰

اس (سلیمان) نے کہا: اے سردارو! تم میں سے کون ہے جو ان کے میرے پاس مطیع ہو کر آنے سے پہلے اس (بلقیس) کا تخت میرے پاس لے آئے؟ (38) جنوں میں سے ایک دیو (طاقت ور جن) نے کہا: وہ میں آپ کو لا دیتا ہوں، اس سے پہلے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں،

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٠١) فتح القدير (٤/ ١٨٣) [2] فتح البيان (١٠/ ٤٢۔ ٤٣)

اور بلاشبہ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں، امانت دار بھی ہوں (39) اس نے کہا: جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ آپ کی پلک جھپکنے سے بھی پہلے وہ تخت میں آپ کو لا دیتا ہوں، پھر جب سلیمان نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا: یہ میرے رب کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ کیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری، اور جو کوئی شکر کرے تو بس وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے اور جو کوئی ناشکری کرے تو بلاشبہ میرا رب بڑا بے پروا نہایت فیاض ہے (40)

پلک جھپکنے سے پہلے ملکۂ سبا کے تخت کی سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضری:

اس کا تخت لانے کے لیے کہا، اس لیے کہ کافر جو ایمان نہیں لایا تو اس کا مال زبردستی سے حلال ہے، جب وہ مسلمان ہو گیا تو حلال نہیں۔ اپنی مجلس سے اُٹھیں، یعنی دربار سے، اس کو پھر ایک عرصہ لگتا، اور امانت دار اس لیے کہا ہے کہ اس تخت میں بیش قیمت جواہرات لگے ہوئے تھے۔ یہ جو فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے تو یہ اس لیے کہ اللہ کا فضل ہے کہ میرے رفیق اس درجے کو پہنچے ہیں جن سے کرامت ہونے لگی کہ تخت کو ظاہر اسباب سے نہیں لایا۔ پلک جھپکائیں، یعنی آنکھ کسی طرف دیکھنے کے بعد پھر اپنی طرف دیکھے۔ اس کے پاس کتاب کا علم تھا، یعنی وہ شخص اللہ کے اسما اور کلام کی تاثیر رکھتا تھا، اس کا نام آصف تھا اور وہ سلیمان علیہ السلام کا وزیر تھا۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے یزید بن رومان سے روایت کیا ہے، کہا: پھر جب قاصد لوٹ کر اس کی طرف وہ بات لے کر گئے جو سلیمان علیہ السلام نے کہی تھی تو اس نے کہا: واللہ! یہ یقینی طور پر بادشاہ نہیں ہے اور ہمیں اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی کسی طرح کی طاقت نہیں ہے اور ہم اس سے مکابرہ (مقابلہ) کر کے کچھ بنا نہ لیں گے اور اُن کو کہلا بھیجا کہ میں اپنی قوم کے سرداروں کو لے کر تمھارے پاس آتی ہوں، تاکہ دیکھوں کہ تمھارا کیا معاملہ ہے اور وہ دین کیا ہے جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو۔ پھر اس نے حکم دیا کہ اس کا تختِ سلطنت جس پر وہ بیٹھا کرتی تھی اور وہ سونے کا تھا اور یاقوت و زبرجد اور موتیوں سے جڑا ہوا تھا، وہ سات گھروں کے اندر رکھا گیا، ایک گھر کے اندر دوسرا اور اسی طرح تیسرا اور چوتھا۔

پھر جس شخص کو اس کے اہتمام اور حفاظت پر مقرر کیا اس سے کہا کہ جو شے تیرے ذمے ہے اس کی خوب حفاظت کرنا اور اللہ کے بندوں میں سے کوئی بھی اس تک نہ پہنچے اور نہ ہی اسے کوئی دیکھے جب تک میں لوٹ کر تیرے پاس نہ آ جاؤں۔ پھر سلیمان علیہ السلام کی طرف روانہ ہوئی۔ ملوکِ یمن کے بارہ ہزار سردار تھے، ہر سردار کے ماتحت ہزار ہا آدمی تھے۔ سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو بھیجنا شروع کیا کہ اس کے روانہ ہونے کی اور راستے کی اور انتہا کو پہنچنے کی خبر ہر رات دن اُن کے پاس لے کر آئیں، یہاں تک کہ جب وہ قریب پہنچی تو جو جن اور انسان اُن کے نزدیک تھے، ان

میں سے جو اُن کے زیرِ دست تھے، ان کو جمع کیا۔

پھر فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جب سلیمان علیہ السلام کو یہ خبر پہنچی کہ وہ آنے والی ہے اور اس کے تخت کا ان سے ذکر ہو چکا تھا تو وہ اُن کو پسند آ گیا تھا اور وہ سونے کا تھا، اس کے پائے موتی اور جواہر کے تھے، اس کے پردے دیباج اور حریر سے بنائے گئے تھے اور اس پر نو مغالیق (کوٹھڑیاں) تھے۔ چنانچہ اس بات کو مکروہ جانا کہ اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد اسے لیں اور اللہ کے نبی یہ جان چکے کہ جب وہ اسلام لے آئیں گے تو اُن کے مال اور خون حرام ہو جائیں گے۔ اس لیے فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴾ اسی طرح امام عطا خراسانی، سدی اور زہیر بن محمد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴾ چنانچہ حرام ہو جائیں گے مجھ پر ان کے مال ان کے اسلام کے سبب سے۔

﴿ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: مَارِدٌ مِّنَ الْجِنِّ" یعنی سرکش جن۔ شعیب جبائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا نام کوزن تھا۔ اسی طرح محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ نے یزید بن رومان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور اسی طرح امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا: وہ ایسا تھا گویا ایک پہاڑ ہے۔

﴿ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مقام سے مراد مجلس ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مَقْعَد" یعنی جائے نشست۔ امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے جلوس فرماتے تھے دن کے شروع سے لے کر سورج ڈھلنے تک، اس دوران میں مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے اور دوسرے احکام دیتے تھے اور کھانا بھی کھا لیتے تھے۔

﴿ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ میں قوی اور زور آور ہوں، اس کے اٹھانے میں امانت دار ہوں، ان جواہرات وغیرہ میں جو اس میں ہیں۔[1] سلیمان علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ میں تو اس سے بھی جلدی چاہتا ہوں۔ اس جگہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس تخت کو حاضر کرنے سے سلیمان علیہ السلام کی مراد ملک کی عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنا تھا جو اللہ پاک نے ان کو بخشا تھا اور ان لشکروں کی عظمت کو ظاہر کرنا تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مسخر کر دیے تھے۔ یہ چیزیں نہ ان سے پہلے کسی کو دی گئیں اور نہ ان کے بعد کسی کے لیے ہوں گی اور چاہیے کہ بلقیس اور اس کی قوم کے نزدیک ان کی نبوت پر یہی بات حجت ٹھہرائی جائے، کیوں کہ یہ امر ایک بڑا خارقِ عادت ہے کہ اس کے تخت کو جوں کا توں اس کے ملک سے اس سے پہلے لے آئیں کہ وہ اُن کے پاس حاضر ہوں۔ ایک تو خود تخت کا اتنی دور سے بعینہٖ آ جانا ایک بڑی خارقِ عادت بات ہے۔

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۸۲۔ ۲۸۸۵)

پھر اس نے اس کو قفل وغیرہ سے بند کیا تھا اور اس پر محافظ اور پہرے چوکی والے لوگ مقرر کیے تھے، اس کے باوجود کسی کو خبر نہ ہو اور آ جائے۔ بالجملہ پھر جب سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو اس سے بھی زیادہ جلدی چاہتا ہوں تو ﴿ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ شخص آصف نام کے ہیں جو سلیمان علیہ السلام کے کاتب ہیں۔ اسی طرح محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے یزید بن رومان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ آصف بن برخیا ہیں۔ صدیق تھے، اسم اعظم جانتے تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ انسانوں میں سے ایک مومن تھا، اس کا نام آصف تھا۔ اسی طرح امام ابو صالح، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ وہ انسانوں میں سے تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا نام اسطوم تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ اس کا نام بلیخا تھا۔ امام زہیر بن محمد رحمہ اللہ نے کہا: وہ انسانوں میں سے ایک مرد ہے۔ اسے ذوالنور کہتے ہیں: عبداللہ بن لہیعہ کا زعم یہ ہے کہ وہ خضر علیہ السلام ہیں،[1] یہ قول نہایت غریب ہے۔

غرضیکہ وہ کوئی بھی ہو، اس نے کہا: ﴿ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ﴾ یعنی تو اپنی نگاہ اٹھا اور اپنی بصر کو اتنا دراز کر جس پر تو قدرت رکھتا ہے، پھر تیری نگاہ تھکنے نہ پائے گی، مگر حال یہ ہے کہ وہ تخت تیرے پاس حاضر ہو گا۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا: تو دراز کر اپنی بصر کو۔ وہ اپنی انتہا کو نہ پہنچے گی کہ میں اس کو تیرے پاس لے آؤں گا۔ چنانچہ ذکر کیا ہے کہ اس شخص نے سلیمان علیہ السلام سے کہا ہے کہ یمن کی طرف نظر کریں جس میں مطلوب تخت ہے۔ پھر وہ کھڑا ہوا، اس نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اس نے کہا: ”یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ“ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس نے کہا: ”یَا إِلٰهَنَا وَإِلٰهَ كُلِّ شَيْءٍ إِلٰهًا وَّاحِدًا لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ: اِئْتِنِي بِعَرْشِهَا“ کہا: پھر وہ ان کے آگے آ کھڑا ہوا۔

امام مجاہد، سعید بن جبیر، محمد بن اسحاق اور زہیر بن محمد رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس سے سوال کیا کہ بلقیس کا عرش اس کے پاس لے آئے اور وہ یمن میں تھا اور سلیمان علیہ السلام بیت المقدس میں تو وہ تخت غائب ہو گیا اور زمین میں غوطہ لگایا، پھر سلیمان علیہ السلام کے آگے سے نکل آیا۔ عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ سلیمان علیہ السلام نے نہ جانا، مگر حال یہ ہے کہ اس کا تخت اُٹھا کر لایا جا رہا ہے ان کے روبرو۔ کہا:[2] اور یہ شخص جو اس کو لے آیا عابدینِ بحر سے تھا۔ پھر جب سلیمان علیہ السلام نے اور اُن کے دربار والوں نے اس کا معائنہ کیا اور اس کو اپنے نزدیک پڑا ہوا دیکھا تو فرمایا: ﴿ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ ﴾ یعنی یہ مجھ پر اللہ پاک کی نعمتوں سے ہے، تاکہ مجھے جانچے۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۸۵۔ ۲۸۸۶) تفسیر الطبري (۱۹/ ٤٦٥۔ ٤٦٦)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۸٦۔ ۲۸۸۸)

﴿ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ﴾ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ﴾ [الجاثية: ١٥] ''جس نے نیک عمل کیا تو اپنے (فائدے کے) لیے ہی کیا اور جس نے برا کیا تو اس کا وبال اسی پر ہے۔'' اور اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴾ [الروم: ٤٤] ''اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو وہ اپنے ہی لیے راہ ہموار کر رہے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴾ یعنی میرا رب بندوں سے بے نیاز ہے اور ان کی عبادت سے بے نیاز ہے۔ ﴿ كَرِيْمٌ ﴾ یعنی فی نفسہٖ بزرگ ذات ہے گو اس کو کوئی نہ پوچھے، کیوں کہ اس کی عظمت اور بزرگی کسی کی طرف نیاز مند نہیں ہے۔ یہ قول ایسا ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ [إبراهيم: ٨] ''اور موسیٰ نے کہا: اگر تم کفر کرو گے اور وہ سب لوگ بھی جو زمین میں ہیں تو بے شک اللہ بے پروا اور لائق تعریف ہے۔'' صحیح مسلم میں ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «يَا عِبَادِيْ لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ مِّنْكُمْ مَا زَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا، يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ مِّنْكُمْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا، يَا عِبَادِيْ! إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيْهَا لَكُمْ ثُمَّ أُوَفِّيْكُمْ إِيَّاهَا فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَّجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ» [1] ''یعنی اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے اور پچھلے اور تمھارے انسان اور جن کسی متقی تر شخص کے دل پر ہو جائیں، یعنی سب ایسے ہو جائیں، جیسا تم میں سے متقی شخص کا دل ہوتا ہے تو یہ میرے ملک میں کچھ زیادہ نہ کرے گا۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اول اور آخر اور تمھارے انسان اور جن اس طرح ہو جائیں، جیسے تم میں سے سب سے زیادہ فاجر شخص کا دل ہوتا ہے تو یہ میرے ملک میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ اے میرے بندو! وہ تو تمھارے اعمال ہیں، میں ان کو تمھارے لیے شمار کرتا ہوں۔ پھر میں تم کو ان کا بھرپور بدلہ دوں گا، پس جو شخص خیر کو پائے تو چاہیے کہ اللہ کی حمد کرے اور جو کوئی اس کے سوا پائے تو چاہیے کہ وہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرے۔'' [2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس اُن کے قبضے میں جو جن اور انسان وغیرہما تھے، ان سب سے فرمایا: اے دربار والو! تم میں سے کون میرے پاس اس کے مطیع ہو کر آنے سے پہلے اس کا عرش لے آتا ہے؟ عرشِ بلقیس سے مراد وہ تخت ہے جس کی عظمت کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ جس وقت یہ بات فرمائی اس وقت وہ بیت المقدس

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٧٩۔ ٤٨١)

میں تھے اور اس کا تخت یمن کے شہر سبا میں تھا۔ اس کے اور بیت المقدس کے درمیان دو ماہ کی راہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے جو تخت لینے کا ارادہ کیا اس سے پہلے کہ وہ مسلمان ہوں اور اُن تک پہنچیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس وقت حربی تھے اور جب وہ اور اس کی قوم مسلمان ہو جائیں گے تو ان کا مال ان کی رضا کے بغیر لینا حرام ہو گا، کیوں کہ اسلام ان کے مال کو بچاتا ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمام روایات سے ظاہر یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے یہ بات اس کے ہدیہ آنے اور اس کو واپس کرنے اور ہدہد کا خط دے کر بھیجنے کے بعد فرمائی۔ اس قول پر جمہور مفسرین ہیں۔[1]

کسی نے کہا: اس کے آنے سے پہلے اس کا تخت طلب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کو وہ قدرت دکھائیں جو اللہ پاک کی طرف سے انھیں حاصل تھی اور اس کو اپنی نبوت پر دلیل ٹھہرائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی عقل کا امتحان لیں، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا ﴾ چناں چہ آیندہ اس کا ذکر آئے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ہدہد کی سچائی کا امتحان کریں اس بات میں کہ جو اس نے تخت کی عظمت بیان کی تھی؛ کیا وہ سچ ہے؟ لیکن اکثر لوگ پہلے قول پر ہیں۔

﴿ عِفْرِيْتٌ ﴾ کو جمہور نے بکسرِ عین وسکونِ فا و کسرِ رائے مہملہ وسکونِ مثناۃ تحتیہ و بتائے فوقیہ پڑھا ہے۔ امام ابو رجا، عیسیٰ ثقفی، ابن سمیفع اور ابو السماک رحمہ اللہ نے "عِفْرِيَةٌ" پڑھا ہے۔ بہ فتحِ تحتیہ بعد اس کے تائے تانیث جو کہ ہا سے منقلب ہے۔ یہ قراءت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بہ فتحِ عین پڑھا ہے اور یہ شاذ ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک فرقے نے "عِفْرٌ" بکسرِ عین پڑھا ہے، جمع اس کی "عِفَارٌ" ہے۔ ﴿ عِفْرِيْتٌ ﴾ مارد، غلیظ، شدید اور قوی کو کہتے ہیں، یعنی سرکش درشت اور سخت زور آور۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "دَاهِيَةٌ" یعنی کاردان اور زیرک۔ (صراح میں کہا ہے: سرکش، متکبر، درشت، قوی ہیکل اور دلیر۔) امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شدید کو کہتے ہیں، جبکہ اس کے ساتھ خباثت اور دہاء ہو۔ "عِفْرٌ"، "عِفْرِيَةٌ" اور "عِفْرِيْتٌ"[2] غرض یہ ہے کہ یہ تینوں الفاظ اس شخص کے لیے بولے جاتے ہیں جو سخت اور درشت ہو اور اس میں خباثت، مکر، ہوشیاری اور کاردانی ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عِفْرِيْتٌ ﴾ جن کے رئیس اور سردار کو کہتے ہیں۔ ﴿ عِفْرِيْتٌ ﴾ کا لفظ عرب کے شعروں میں بھی آیا ہے اور "عِفْرِيَةٌ" ذو الرمہ کے شعر میں واقع ہوا ہے۔

پھر خاص اس عفریت کے نام میں اختلاف ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے ذکر کیا ہے کہ اس کا نام کودن تھا۔ (فتح البیان میں کوزیٰ ہے۔ واللہ أعلم۔ اور تفسیر ابن کثیر میں کوزن بزائے معجمہ ہے۔)[3] امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذکوان۔[4] کسی نے کہا ہے کہ دعوان۔ کسی نے کہا ہے کہ صخر مارد۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۲۰۲)
[2] فتح القدیر (٤/ ۱۸۳)
[3] فتح البیان (۱۰/ ٤٤) تفسیر ابن کثیر ۳/ ٤٨٠)
[4] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۲۰۳)

کا ہے۔ پہاڑ کی طرح تھا، اپنا پاؤں انتہائے نظر کے قریب رکھتا تھا، سلیمان علیہ السلام کا مسخر تھا۔ ﴿ اٰتِيْكَ ﴾ یہ صیغۂ فعل مضارع واحد متکلم ہے، اس کی اصل ''أَأْتِيكَ'' دو ہمزہ کے ساتھ ہے۔ پھر دوسرے کو الف سے بدل لیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صیغۂ اسم فاعل ہے۔ ﴿ مَقَامِكَ ﴾ سے مراد وہ مجلس ہے جس میں وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھتے تھے۔ یہ وقت صبح سے دو پہر تک تھا۔

﴿ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ ﴾ کتاب سے مراد وہ کتابیں جو سلیمان علیہ السلام سے پہلے انبیاء پر نازل کی گئیں، جیسے: تورات شریف کہ موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس شخص کا نام آصف بن برخیا تھا، بمد وقصر، یہ بنی اسرائیل میں سے تھا۔ سلیمان علیہ السلام کا وزیر اور دوست تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کا کاتب تھا اور اولیاء اللہ میں سے تھا، اس کے ہاتھوں پر بہت سی خارقِ عادت باتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک کا اسمِ اعظم جانتا تھا کہ جس وقت اس کے ساتھ اللہ پاک سے سوال کیا جائے تو وہ عطا کرے اور جب اس کے ساتھ دعا کی جائے تو قبول ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ کوئی اور فرشتہ۔ کسی نے کہا ہے کہ خضر علیہ السلام۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک فرقے نے کہا: خود سلیمان علیہ السلام مراد ہیں۔ اس بنا پر ﴿ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ ﴾ کا خطاب عفریت کو ہوگا۔ گویا عفریت نے جو بات کہی تھی سلیمان علیہ السلام نے اس کو بطی (دیر کرنے والا) سمجھا۔ پھر اس کو حقیر کرنے کے لیے اس کو یہ بات فرمائی کہ میں پلک جھپکنے سے پہلے اس کو تیرے پاس لے آتا ہوں۔[1] اس کے سوا اور اقوال بھی ہیں جن کی کچھ اصل نہیں اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

امام ابو عبید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں اس طرح ہے: ''قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ: أَنَا أَنْظُرُ فِيْ كِتَابِ رَبِّيْ، ثُمَّ آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَّرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ'' کہا: پھر اس عالم نے کچھ کلام کیا تو تخت ایک سرنگ میں گھس گیا زمین کے نیچے، یہاں تک کہ ان کے پاس آ کر نکل آیا۔[2] ''طَرف'' سے مراد اجفان کا ہلانا ہے۔ (اَجفان جمع جفن، یعنی آنکھ کی پلک، مراد چشم کا غلاف ہے) اور ان کو دیکھنے کے لیے کھولنا ہے۔ ارتداد کا مطلب اجفان کا طرف سے مل جانا ہے۔ چونکہ اجفان کا مل جانا ایک امر طبعی ہے اور قصد یعنی ارادے پر ہی موقوف نہیں ہے۔ اس لیے ''رد'' پر ''ارتداد'' کو اختیار کیا، یعنی ﴿ يَرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ﴾ کہا اور ''تَرُدَّ إِلَيْكَ طَرْفَكَ'' نہ فرمایا۔ قاموس میں ہے کہ ''طَرف'' کا اطلاق جس طرح آنکھ کی نظر پر کیا جاتا ہے، اسی طرح خود آنکھ پر بھی اطلاق کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ ''طَرف'' بہ معنی ''مطروف'' ہے، یعنی وہ شے جس کو نظر کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''طَرف''، خود جفن ہی

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٠٥) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٦٥) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٨٧) الدر المنثور (٦/ ٣٦١)

ہے، اس کے ساتھ سرعتِ امر سے تعبیر کی ہے، یعنی جو کام تیزی سے ہو۔ جس طرح کہ تو اپنے صاحب سے کہتا ہے کہ اس کام کو لمحہ بھر میں کر دے۔ (قالہ مجاهد)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس شخص نے سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ تو آسمان کی طرف نظر کر۔ انھوں نے پلک نہیں ماری تھی، یہاں تک کہ وہ اس کو لے آیا، پھر اس کو ان کے رو برو رکھ دیا۔[1] معنی یہ ہیں یہاں تک کہ طرف (آنکھ کی پلک) تیری لوٹ آئے اس کے آسمان کی طرف دراز کرنے کے بعد۔ ان قولوں میں سے پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ پھر تیسرا قول وہ ہے جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ملکۂ سبا کا تخت زمین و آسمان کے درمیان نہیں چلا، لیکن زمین اس کو لے کر شق ہوگئی اور وہ زمین کے نیچے چلا، یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام کے سامنے ظاہر ہوگیا۔[2]

﴿ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ ﴾ کہا ہے کہ اس میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ پھر سلیمان علیہ السلام نے اس شخص کو اِذن دیا تو اس نے اللہ پاک سے دعا کی، پھر اس کو لایا۔ پھر جب سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو اپنے پاس حاضر دیکھا تو فرمایا: ﴿ هٰذَا ﴾ یعنی تخت کا حاضر ہونا اور اس کا ثابت ہونا بغیر حرکت اور آواز و کھڑکھڑاہٹ کے آ کھڑا ہونا، گویا ایک مدت پہلے سے رکھا ہوا ہے، ﴿ مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ﴾ مجھ پر میرے رب کا فضل و احسان سے ہے۔ ﴿ لِيَبْلُوَنِيْٓ ﴾ تاکہ وہ مجھے جانچے۔ ﴿ ءَاَشْكُرُ ﴾ کہ آیا میں اس پر اللہ کا شکر کرتا ہوں اور اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ وہ میری قوت اور استطاعت سے بڑھ کر اس کے فضل سے ہے اور کیا میں اس کے حق کے ساتھ قائم ہوتا ہوں۔ ﴿ اَمْ اَكْفُرُ ﴾ یا میں ترکِ شکر کر کے ناشکری کرتا ہوں اور اس کے ساتھ قیام نہیں کرتا۔ یا اس بارے میں اپنے نفس کے لیے کوئی فعل اور تصرف ثابت کرتا ہوں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لِيَبْلُوَنِيْٓ ﴾ کے معنی یہ ہیں، تاکہ مجھے دیکھے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔[3] کسی اور نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: تاکہ مجھے اپنا عبادت گزار بنائے۔ یہ مجاز ہے ابتلاء میں اصل اختبار (آزمانا، امتحان کرنا) ہوتا ہے۔

﴿ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ﴾ اس لیے کہ شکر کرنے کی وجہ سے وہ اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اس پر نعمت مکمل کی جائے اور ہر دم کی جائے، کیوں کہ شکر موجود نعمت کی قید ہوتا ہے اور مفقود (نہ ہونا) نعمت کی صید۔ معنی یہ ہیں کہ شکر کا نفع اور ثواب شکر کرنے والے ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴾ اور جس نے ناشکری کی تو میرا رب اس کے شکر سے بے نیاز ہے۔ کریم ہے عقوبت میں، ترکِ معاجلت میں، یعنی اس کی ناشکری پر سزا کی جلدی نہیں کرتا کہ جو نعمتیں اس کو عطا کر رکھی ہیں کہ ان کو اس سے جلد سلب کر لے، ایسا نہیں کرتا، بلکہ وہ کریم ہے کرم فرماتا ہے۔[4]

[1] فتح القدير (٤/ ١٨٤) [2] الدر المنثور (٦/ ٣٦١) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٠٦) [4] فتح البيان (١٠/ ٤٣۔ ٤٦)

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ
لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿41﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ
هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿42﴾ وَصَدَّهَا
مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ
كٰفِرِيْنَ ﴿43﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً
وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ڛ قَالَتْ
رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿44﴾

سلیمان نے کہا: تم اس کے لیے اس کے تخت کی شکل بدل دو، ہم دیکھتے ہیں آیا وہ راہ پاتی ہے یا وہ ان لوگوں میں سے ہے جو راہ نہیں پاتے (41) پھر جب وہ آئی تو کہا گیا: کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ بولی: گویا کہ یہ وہی ہے، اور ہمیں اس سے پہلے ہی علم ہو چکا تھا اور ہم تابعدار بن گئے تھے (42) اور اسے (عبادتِ الٰہی سے) اس چیز نے روک رکھا تھا جس کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتی تھی، کیوں کہ وہ کافر قوم میں سے تھی (43) اس سے کہا گیا: تو محل میں داخل ہو جا، پھر جب اس نے اس کو دیکھا تو اسے گہرا پانی سمجھا اور اپنی دونوں پنڈلیوں سے (کپڑا) اُٹھا لیا، سلیمان نے کہا: بلاشبہ یہ تو شیشوں سے جڑا صاف محل ہے، اس نے کہا: اے میرے رب! بے شک (اب تک سورج کی عبادت کر کے) میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اور (اب) میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی فرماں بردار ہوگئی ہوں (44)

ملکہ سبا کی عقل کا امتحان اور اس کی ذہانت و دور اندیشی کا بیان:

پھیر بدل کرنا، یہ کہ وہ جڑاؤ تھا، اس کا جڑاؤ اتار کر کسی اور طریقے سے جوڑا اور بلقیس کی عقل کو آزمانا مقصود تھا اور اپنا معجزہ دکھانا۔ ہم مسلمان ہو چکے تھے، یعنی اس معجزے کی حاجت نہ تھی۔ سلیمان علیہ السلام دیوان خانے میں بیٹھے تھے، اس کا فرش پتھروں کے بجائے شیشے کا تھا، دور سے ایسے لگتا تھا جیسے لہراتا ہوا پانی۔ اس نے پانی میں بیٹھنے کے لیے اپنی پنڈلیاں کھول لیں۔ سلیمان علیہ السلام نے آواز دی کہ یہ شیشوں کا فرش ہے، پانی نہیں ہے۔ اس کو اپنی عقل کی کمی اور اُن کی عقل کا کمال معلوم ہوا، سمجھی کہ دین میں بھی جو یہ سمجھے ہیں وہی صحیح ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے سنا تھا کہ اس کی پنڈلیوں پر

بکری کی طرح بال ہیں، اس طرح معلوم کر لیا کہ وہ بات سچ تھی، اس کی دوا تجویز کی نورہ۔ کہتے ہیں کہ وہ پری کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی، یہ اس کا اثر تھا۔ انتہٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب سلیمان علیہ السلام کے پاس بلقیس کا تخت لایا گیا، اس کے آنے سے پہلے تو انھوں نے حکم دیا کہ اس کی بعض چیزیں بدل دی جائیں، تاکہ اس کی معرفت کو جانچیں اور اس کو دیکھنے کے وقت اس کے ثبات کو پرکھیں کہ آیا وہ سمجھ جاتی ہے کہ وہ اس کا تخت ہے یا یہ کہتی ہے کہ یہ میرا عرش نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "نَزَعَ مِنْهُ فُصُوصَهُ وَمَرَافِقَهُ" یعنی اس کے نگ اور اس کے منافع کی چیزیں اُکھاڑی گئیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اس کو حکم دیا تو بدلا گیا، اس میں جو سرخ تھا اسے زرد کر دیا گیا اور جو زرد تھا اسے سرخ اور جو سبز تھا وہ سرخ کیا گیا، ہر شے اپنے حال سے بدل دی گئی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں کچھ بڑھایا گیا اور کچھ گھٹایا گیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا اسفل (نیچے کا حصہ) اوپر کر دیا گیا اور اس کا آگے کا حصہ پیچھے کر دیا گیا اور اس میں بڑھایا اور گھٹایا گیا۔[1] پھر جب وہ آ گئی تو اس سے کہا گیا: ﴿ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ﴾ یعنی اس کا تخت اس کے سامنے پیش کیا گیا، حالاں کہ اس میں بہت سی کمی بیشی کر دی گئی تھی۔

ملکۂ سبا میں ثباتِ عقل تھا اور اس میں دانش وزیرکی، کاردانی، احتیاط اور دور اندیشی تھی تو اس نے اس پر یہ نہیں کہا کہ یہ تخت وہی ہے اس کے بُعدِ مسافت کے سبب سے اور نہ ہی یہ کہا کہ وہ کوئی اور تخت ہے، اس لیے کہ اس نے اس کے آثار اور صفات دیکھے، اگرچہ اس کا تغیر و تبدل کیا گیا اور اس کا روپ بدلا گیا۔ چنانچہ کہا: ﴿ كَاَنَّهٗ هُوَ ﴾ یعنی اس کے مشابہ اور لگ بھگ ہے۔ یہ بات اس کی عقل اور احتیاط کی انتہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات سلیمان علیہ السلام کہہ رہے ہیں[2] اور قولہ تعالیٰ: ﴿ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴾ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کے قول میں سلیمان علیہ السلام کے تتمۂ قول سے ہے، یعنی سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ کہ ہم دیے گئے علم اس سے پہلے اور ہم تھے مسلمان اور بلقیس کو اللہ وحدہ کی عبادت سے اس شے نے روک رکھا تھا جس کو وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی۔ ﴿ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴾ وہ تھی کافروں کی قوم سے۔

یہ بات جو امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے کہی اچھی ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی یہی بات کہی ہے۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ بھی احتمال ہے کہ ﴿ صَدَّهَا ﴾ میں ضمیر سلیمان علیہ السلام کی طرف یا اللہ عزوجل کی طرف راجع ہو۔[3] تقدیر یہ ہو کہ اور روکا اس کو اس چیز سے جس کو وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے، یعنی انھیں غیر اللہ کی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۹۰) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۹۲) [3] تفسیر الطبري (۱۹/ ۴۷۲)

عبادت سے باز رکھا، بے شک وہ کافروں کی قوم میں سے تھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مجاہد رحمہ اللہ کے قول کی یہ بات تائید کرتی ہے کہ اس نے جو اسلام ظاہر کیا تو وہ اس کے محل میں داخل ہونے کے بعد کیا، چناں چہ آیندہ آتا ہے۔[1]

ملکۂ سبا سلیمان علیہ السلام کے شیش محل میں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ﴾ اس کا قصہ یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے شیاطین کو حکم دیا تھا تو ان کے لیے ایک بڑا محلِ قواریر، یعنی شیشوں کا بنایا تھا اور اس کے نیچے پانی جاری کیا تھا، لہٰذا جو کوئی اس کے حال کو نہیں جانتا تھا وہ خیال کرتا کہ وہ پانی ہے، لیکن شیشے چلنے والے کے اور اس کے درمیان حائل ہو جاتے۔ اس محل کے بنانے کا جو سبب سلیمان علیہ السلام کے ذہن میں تھا اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ چنانچہ کسی نے تو یہ کہا ہے کہ جب انھوں نے اس کا عزم کیا کہ بلقیس سے نکاح کریں اور اس کو اپنے لیے برگزیدہ فرمائیں تو اُن سے اس کا حسن و جمال ذکر کیا گیا، لیکن اس کی دونوں پنڈلیوں میں ہلب عظیم ہے، یعنی بڑے بڑے بال ہیں اور اس کے قدموں کا پچھلا حصہ سمِ ستور کی طرح ہے۔ لہٰذا یہ بات ان کو بری لگی، اس لیے یہ محل بنایا، تاکہ معلوم کرلیں کہ وہ بات صحیح ہے یا نہیں۔ امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ وغیرہ کا قول اسی طرح ہے۔

پھر جب وہ داخل ہوئی تو اس نے اپنی پنڈلیاں کھولیں۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کی پنڈلیاں اور قدم سب لوگوں سے بڑھ کر خوبصورت ہیں، لیکن اس کے دونوں پاؤں پر بال دیکھے، اس لیے کہ وہ ایک رانی ہے کہ اس کا کوئی خاوند نہیں ہے۔ پھر انھوں نے یہ چاہا کہ اس کے یہ بال جاتے رہیں، اس پر اُن سے کسی نے استرے کا کہا تو بلقیس بولی کہ میں اس کی طاقت نہیں رکھتی ہوں اور سلیمان علیہ السلام نے اس بات کو مکروہ سمجھا اور جنوں سے کہا کہ استرے کے علاوہ کوئی ایسی شے بتاؤ جس سے یہ بال دور ہو جائیں، اس پر جنوں نے ان کے لیے نورہ (بال صفا پاؤڈر) بنایا، پہلے پہل انہیں کے لیے نورہ (بال صفا پاؤڈر) بنایا گیا۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، محمد بن کعب قرظی، سدی اور ابن جریج رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[2]

ملکۂ سبا کو اسلام کی دعوت اور اس کے مسلمان ہونے کا بیان:

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے یزید بن رومان سے روایت کیا ہے کہ پھر اس سے کہا کہ محل میں داخل ہو، تاکہ اسے ایک ایسا ملک دکھائیں جو اس کے ملک سے زیادہ عزیز ہے اور ایک ایسی سلطنت جو اس کی سلطنت سے عظیم تر ہے۔ پھر جب اس نے اس کو دیکھا تو اسے پانی سمجھا اور اپنی پنڈلیاں کھولیں، وہ اس بات میں شک نہیں کرتی تھی کہ وہ پانی

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ٤٨١) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧٣ـ ٤٧٤) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٩٤ـ ٢٨٩٥)

ہے، اس میں گھسے گی، اس پر اس سے کہا گیا کہ وہ تو ایک شیشوں سے جڑا ہوا محل ہے۔ پھر جب وہ سلیمان علیہ السلام کے رو برو کھڑی ہوئی تو اس کو اللہ وحدہ کی عبادت کی طرف بلایا اور وہ جو اللہ کے سوا سورج کی پوجا کرتی تھی، اس بارے میں اس پر عتاب فرمایا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس وقت علجہ نے محل دیکھا تو پہچان گئی کہ واللہ! یقیناً اس نے ایک ایسا ملک دیکھا کہ اس کے ملک سے زیادہ عظیم تھا۔[1]

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بعض اہلِ علم سے روایت کیا ہے، وہ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام نے محل بنانے کا حکم دیا، شیاطین نے ان کے واسطے شیشوں سے بنایا، سفیدی میں ایسے گویا وہ پانی ہے، پھر اس کے نیچے پانی چھوڑا، پھر ان کے لیے اس میں ان کا تخت رکھا گیا۔ پھر انھوں نے اس پر جلوس فرمایا اور طیور اور جن اور انسان اُن کے رو برو کھڑے ہوئے۔ پھر اس سے کہا کہ محل کے اندر چلو، تا کہ اسے وہ بادشاہت اور سلطنت دکھائیں جو اس کے ملک سے زیادہ تر عزیز اور غالب ہے اور وہ سلطان جو اس کی سلطان سے عظیم تر ہے۔ جب اس نے اس محل کو دیکھا تو اس کو گہرا پانی خیال کیا اور اپنی پنڈلیاں کھولیں۔ اس کو شک نہیں تھا کہ وہ پانی ہے، یعنی اسے یقین تھا کہ وہ پانی ہے اور اس میں گھسے گی۔ اس سے کہا گیا کہ وہ تو شیشوں سے جڑا ہوا ایک محل ہے۔

پھر جب وہ سلیمان علیہ السلام کے رو برو کھڑی ہوئی تو اسے اکیلے اللہ عزوجل کی عبادت کی طرف بلایا اور وہ جو اللہ کے سوا سورج کو پوجتی تھی، اس بارے میں اس پر عتاب کیا تو اس نے زنادقہ کی بات کہی۔ اس پر سلیمان علیہ السلام اس کی بات کو ایک بڑی بھاری بات سمجھ کر سجدے میں گرے اور اُن کے ساتھ سب لوگ سجدے میں جھکے۔ پھر جب انھوں نے اپنا سر اٹھایا تو فرمایا: تیری خرابی ہو تونے کیا کہا تھا؟ وہ بولی کہ میں نے جو کہا تھا اس کو بھلا دی گئی۔ پھر کہا: ﴿ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ چنانچہ وہ اسلام لے آئی اور اس کا اسلام اچھا ہوا۔[2]

امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک غریب اثر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ کہا ہم کو حدیث بیان کی حسن بن علی نے زائدہ سے، کہا مجھے حدیث بیان کی عطا بن سائب نے، کہا ہم کو حدیث بیان کی مجاہد نے اور ہم ازد میں تھے (ازد یمن کے ایک قبیلے کے باپ کا نام ہے، اس کو ازدِ شنوءہ بھی کہتے ہیں اور ایک ازدِ عمان ہے۔ تیسرا ازد السَّراۃ ہے۔ واللّٰه أعلم یہاں کون سا ازد مراد ہے) کہا ہم کو حدیث بیان کی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے، فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام اپنے تخت پر بیٹھا کرتے تھے، پھر ان کے آس پاس کرسیاں رکھی جاتی تھیں تو اُن پر انسان بیٹھتے، پھر جن، پھر شیاطین بیٹھتے۔ پھر ہوا آتی تو اُن کو اٹھاتی، پھر طیور ان پر سایہ کرتے، پھر صبح کو وہ اتنی دیر چلتی جتنی دیر میں سوار اترنے کی خواہش کرتا ہے، اتنے وقت میں ایک ماہ کی راہ طے کر لیتے اور زوال کے بعد ایک ماہ کی راہ طے کرتے۔ اس درمیان میں کہ وہ ایک دن اپنے کسی سفر میں تھے کہ انھوں نے طیور کی حاضری لی تو ہدہد کو گم

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٩٥۔ ٢٨٩٤) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧٣)

پایا۔ فرمایا: کیا وجہ ہے کہ ہدہد مجھے نظر نہیں آ رہا، یا وہ غائب ہونے والوں سے ہے۔ البتہ میں اس کو سخت عذاب کروں گا، یا البتہ اسے ذبح کر ڈالوں گا، یا میرے پاس کوئی ظاہر حجت لے آئے۔ چنانچہ ان کا اس کو عذاب کرنا یہ تھا کہ اس کے پَر اُکھاڑ ڈالیں، پھر اسے زمین میں ڈال دیں کہ وہ نہ کسی چیونٹی سے نہ زمین کے اور کیڑوں مکوڑوں سے محفوظ رہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیثِ مجاہد کی مثل ذکر کیا۔

﴿ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴾ پھر پڑھا یہاں تک کہ اس قول تک پہنچے: ﴿ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا ﴾ اور لکھا: ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ بلقیس کی طرف ﴿ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴾ پھر جب ہدہد نے بلقیس کی طرف خط ڈالا تو اس کے دل میں یہ بات ڈال دی گئی کہ وہ ﴿ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴾ ہے۔ ﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ ﴾ ﴿ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴾، ﴿ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ ﴾، ﴿ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا ﴾، ﴿ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ پھر جب ہدہد سلیمان علیہ السلام کے پاس آیا تو انھوں نے فرمایا: ﴿ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ﴾، ﴿ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ ﴾ پھر جب انھوں نے غبار کی طرف نظر کی۔ ہم کو خبر دی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے، کہا: سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کے اور اُن لوگوں کے درمیان تھا جو اس کے ساتھ تھے، جبکہ نظر کی غبار کی طرف، جیسا کہ ہمارے اور حرہ کے درمیان ہے، یعنی فاصلہ اتنا تھا۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: اور امام مجاہد رحمہ اللہ اس وقت ازد میں تھے۔ سلیمان علیہ السلام نے کہا: ﴿ اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا ﴾ اور سلیمان علیہ السلام اور اس تخت کے درمیان، جبکہ غبار کی طرف نظر کی تھی، دو ماہ کی راہ تھی۔

﴿ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ﴾ کہا: اور سلیمان علیہ السلام کے لیے ایک مجلس تھی، اس میں لوگوں کے لیے بیٹھتے تھے، جس طرح کہ امراء بیٹھا کرتے ہیں۔ پھر اُٹھتے تھے۔ عفریت نے کہا کہ میں اس کو آپ کے پاس لے آؤں گا، اس سے پہلے کہ آپ اپنے مقام سے اٹھیں۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: میں اس سے زیادہ جلدی چاہتا ہوں۔ اس پر اس شخص نے کہا جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں اپنے رب کی کتاب کی طرف نظر کرتا ہوں، پھر میں اس کو آپ کے پاس لے آتا ہوں اس سے پہلے کہ آپ کی نظر آپ کی طرف پھر آئے، یعنی پلک جھپکنے کے وقت میں۔

پھر اس کا تخت سلیمان علیہ السلام کے قدم کے اور کرسی کے نیچے سے نکل آیا۔ پھر جب انھوں نے اس تخت کو دیکھا تو کہا: ﴿ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝40 قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝41 فَلَمَّا جَاۗءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ﴾ کہا: پھر جب وہ آ گئے تو اُن سے دو باتوں کا سوال کیا: سلیمان علیہ السلام سے عرض کی کہ میں ایسا پانی چاہتی ہوں جو نہ آسمان کا ہو نہ زمین کا۔ سلیمان علیہ السلام سے جب کوئی کسی شے کا سوال کرتا تو پہلے انسانوں سے

پوچھتے، پھر جن سے، پھر شیاطین سے۔ کہا: پس شیاطین نے کہا: یہ آسان ہے، گھوڑے دوڑاؤ، پھر ان کا پسینہ لو، پھر اس سے برتن بھر دو۔ کہا: پس حکم دیا تو گھوڑے دوڑائے گئے، پھر ان کا پسینہ لیا، پھر اس سے برتن بھر دیا۔ کہا: اور اس نے اللہ عزوجل کے رنگ کا سوال کیا۔ کہا: پس سلیمان علیہ السلام اپنے تخت سے کود پڑے، پھر سجدے میں گرے تو کہا: اے رب! اس نے مجھ سے ایک ایسے امر کا سوال کیا ہے کہ البتہ وہ بڑا معلوم ہوتا ہے میرے دل میں کہ میں اس کا ذکر تجھ سے کروں تو فرمایا: تو لوٹ جا، پس یقیناً میں نے تیری کفایت کر دی۔ پھر وہ اپنے تخت کی طرف لوٹ آئے۔ فرمایا: تو نے کس بات کا سوال کیا تھا؟ وہ بولی: میں نے آپ سے سوال نہیں کیا مگر پانی کا، پھر اپنے لشکروں سے فرمایا کہ اس نے کیا بات پوچھی تھی؟ وہ بولے کہ اس نے تو آپ سے پانی کا سوال کیا تھا۔ کہا: اس کو سب بھول گئے۔ اور شیاطین نے کہا کہ سلیمان علیہ السلام چاہتے ہیں کہ اس کو اپنی ذات کے لیے قرار دیں۔ چنانچہ اگر انھوں نے اس کو اپنی ذات کے لیے قرار دیا، پھر ان کے درمیان کوئی بچہ پیدا ہوا تو ہم اُن کی بندگی سے چھٹکارا نہ پائیں گے۔ پھر انھوں نے ایک محل شیشوں سے جڑا ہوا بنایا، جس میں مچھلیاں تھیں۔ کہا کہ پھر اس کو کہا گیا کہ محل کے اندر چل۔ پھر جب اس نے اس کو دیکھا تو اسے پانی سمجھا اور اپنی پنڈلیاں کھول دیں تو ناگاہ وہ بالوں والی تھیں، اس پر سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ برا ہے۔ پھر کون سی شے ان بالوں کو دور کر دے گی؟ جن بولے کہ ان کو استرہ دور کر دے گا تو فرمایا کہ استرے کا اثر برا ہے۔ کہا: پھر شیاطین نے نورہ بنایا۔ کہا: چنانچہ وہ پہلے شخص ہیں جن کے لیے نورہ بنایا گیا۔ پھر ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے کہا: ''مَا أَحْسَنَهُ مِنْ حَدِيثٍ'' یعنی یہ کیا اچھا قصہ ہے! حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قصہ سخت منکر ہے۔ شاید یہ عطاء بن سائب کا وہم ہے جو اس نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نام سے بیان کر دیا ہے۔ زیادہ قرینِ قیاس امر یہ ہے کہ یہ اہلِ کتاب کے دفاتر سے لیا گیا ہے جو کعب اور وہب نے مسلمانوں میں رائج کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمائے کہ انھوں نے بنی اسرائیل کی حال و مستقبل کی عجیب و غریب خبریں اس امت میں رائج کر دیں۔ لہٰذا ایسے قصوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وہ تو جدت پسند تھے۔ تحریف کرنا، گھڑ لینا ان کی عادت میں داخل تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس سے مستغنی کر دیا ہے، ہمیں وہ باتیں پہنچائیں جو نفع میں، وضاحت میں اور بیان میں ان کی باتوں سے بہت اعلیٰ و ارفع ہیں۔ وللّٰه الحمد والمنة۔[1]

کلامِ عرب میں ﴿ صَرْحٌ ﴾ کی اصل قصر ہے، یعنی محل اور ہر بلند عمارت۔ اللہ پاک نے فرعون، لعنه اللّٰه، کی طرف سے خبر دی ہے کہ اس نے اپنے وزیر ہامان سے کہا تھا: ﴿ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴾ [المؤمن: ٣٦۔ ٣٧] ''تو میرے لیے ایک بلند عمارت بنا، تاکہ میں راستوں تک

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٨٢۔ ٤٨٣)

پہنچوں۔ یعنی آسمانوں کے راستوں تک، پھر میں موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں، اور بے شک میں تو اسے جھوٹا خیال کرتا ہوں اور اسی طرح فرعون کے لیے اس کا برا عمل پرکشش بنا دیا گیا اور اسے (سیدھے) راستے سے روک دیا گیا اور فرعون کی چال تو بس تباہ و برباد ہو کر رہی۔'' اور صرح یمن میں ایک بلند محل ہے۔

﴿ مُمَرَّدٌ ﴾ وہ ہے جو مضبوط و محکم بنایا گیا چکنا۔ ﴿ مِنْ قَوَارِيْرَ ﴾ یعنی شیشوں سے۔ تمرید بنا سے مراد اس کی تملیس ہے، یعنی اس کا چکنا اور صاف بنانا اور مارد ایک قلعہ ہے دومۃ الجندل میں۔ غرض یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس ملکہ کے لیے ایک بڑا اونچا محل شیشوں کا بنایا، تاکہ اسے اپنی سلطنت و تمکن اور اقتدار کی عظمت دکھائیں۔ پھر جو کچھ اللہ پاک نے سلیمان علیہ السلام کو عطا کیا تھا اس کو بلقیس نے دیکھا اور جس حال اور شان و شوکت میں وہ تھے اس کی جلالت اور بزرگی کو ملاحظہ کیا اور اُن کے حال میں غور و فکر کیا تو اللہ پاک کے امر کی مطیع اور فرمانبردار ہوگئی اور پہچان گئی کہ وہ ایک نبیِ کریم اور عظیم بادشاہ ہیں اور اللہ عزوجل کی فرماں بردار ہوگئی اور بولی: ﴿ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ﴾ ظلم سے مراد اس کا کفر و شرک ہے، اور اس کا اور اس کی قوم کا اللہ پاک کے سوا سورج کو پوجنا، جیسے گزر چکا ہے۔ ﴿ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی میں دینِ سلیمان علیہ السلام کی تابع ہو کر اس کی عبادت کے لیے فرماں بردار ہوگئی جو اکیلا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اس کا ایک اندازہ رکھا ہے۔ ﴿ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴾ [الفرقان: ۲] ''پھر اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے: ﴿ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا ﴾ یہ جملہ ﴿ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ﴾ پر معنی میں معطوف ہے اور مقصود ﴿ قَالَ ﴾ سے متعلق کا عطف ہے تو یہ کہہ دینا کافی تھا کہ ﴿ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا ﴾۔ ﴿ قَالَ ﴾ کا تکرار (دوبارہ لانا) ضروری نہیں تھا، لیکن ﴿ قَالَ ﴾ کا تکرار اس لیے کیا ہے کہ ﴿ قَالَ ﴾ کا متعلق مختلف ہے، کیوں کہ پہلے میں تو ﴿ قَالَ ﴾ کا متعلق اللہ تعالیٰ کی ثنا اور دوسرے کا متعلق حال ہے تخت بلقیس کا۔ یہ ﴿ قَالَ ﴾ کے مکرر ذکر کرنے کی وجہ ہے۔

تنکیر کہتے ہیں تغیر کو اور شے کو اس طرح پر کر دینا کہ پہچانی نہ جائے۔ تنکیر تعریف کی ضد ہے، اسی معنی سے منتقل کر کے مصطلح (اصطلاح) اہلِ عربیت کی طرف لے گئے ہیں، یعنی علمائے نحو، معانی اور بیان کے ہاں جو تعریف اور تنکیر بولتے ہیں تو وہ اسی معنی سے لی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنے ہاں کے لوگوں سے فرمایا کہ اس کے تخت کو ایسی حالت میں تبدیل کر دو کہ بلقیس اس کو اوپرا سمجھے اور جس وقت اسے دیکھے تو پہچان نہ سکے۔ پھر اس تغییر میں اقوال ہیں، اس میں سے پہلا قول ذکر ہو چکا۔

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۸۱۔ ۴۸٤)

امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس کو تبدیل کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ شیاطین نے ان سے کہا تھا کہ اس کی عقل میں کچھ خلل ہے تو انھوں نے چاہا کہ اس کا امتحان لیں۔[1] کسی نے یہ کہا ہے کہ جن اس بات سے ڈرے کہ سلیمان علیہ السلام اس سے نکاح کر لیں۔ پھر اس سے ان کا کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے سلیمان علیہ السلام کی اولاد کے مسخر رہیں گے، اس لیے ان سے کہہ دیا کہ وہ ضعیف العقل ہے اور اس کا پاؤں گدھے کے پاؤں کی طرح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے چاہا کہ اس پر ظاہر کر دیں کہ جن ان کے مسخر ہیں۔

﴿ نَنْظُرْ ﴾ بجزم امر کا جواب ہے۔ جمہور نے جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے، بنا بر استیناف۔[2] ﴿ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ یعنی ہم دیکھیں گے کہ اپنے تخت کو پہچاننے کی طرف یا اللہ پر ایمان لانے کی طرف راہ پاتی ہے یا نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تا کہ ہم اس کی عقل کو دیکھیں۔ تو وہ ثابت العقل پائی گئی۔[3]

﴿ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ﴾ یعنی پھر جب بلقیس آئی سلیمان علیہ السلام کی طرف تو خود انھوں نے یا اُن کے حکم سے کسی اور نے اس سے کہا کہ کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے جس کو تو اپنے محل میں چھوڑ آئی ہے اور اس پر دروازے بند کر کے پہرے دار اس پر مقرر کر کے آئی ہے؟ ہمزہ استفہام کا ہے۔ ''هٰذَا عَرْشُكِ'' نہ کہا، تا کہ اس کے لیے تلقین وتعلیم نہ ہو جائے تو اس کی عقل کا امتحان پورا نہ ہو۔ وہ بولی: گویا یہ وہی ہے۔ یہ جواب اس نے بہترین جواب دیا، نہ تو ہو بہو کہا، یعنی یہ وہی ہے اور نہ ''لَيْسَ بِهٖ'' کہا، یعنی یہ وہ نہیں ہے۔

یہ بات اس کی عقل کو ظاہر کرتی ہے کہ جس بات میں دو امر کا احتمال تھا اس میں نہ پڑی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ پہچاننے اور اوپرا سمجھنے اور تعجب کرنے لگی اس بات پر کہ وہ تخت سلیمان علیہ السلام کے پاس ہے۔ اس لیے اس نے ﴿ كَاَنَّهٗ هُوَ ﴾ کہا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس نے پہچان لیا، لیکن اس نے ان پر شبہہ ڈالا، جس طرح انھوں نے اس پر شبہہ ڈالا۔ اگر اس سے ''أَهٰذَا عَرْشُكِ'' کہتے تو وہ بھی ''نعم'' کہتی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ دانا تھی، اس نے سوچا اگر میں کہوں کہ یہ وہی ہے تو ڈرتی ہوں کہ جھوٹی سمجھی جاؤں اور اگر کہوں کہ نہیں ہے تو بھی ڈرتی ہوں کہ مجھے جھوٹا سمجھیں۔ اس لیے اس نے کہا ﴿ كَاَنَّهٗ هُوَ ﴾۔[4]

﴿ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴾ کسی نے کہا ہے کہ یہ بلقیس کے کلام میں سے ہے، یعنی ہم کو سلیمان علیہ السلام کی نبوت کی سچائی کے بارے میں اس معجزے سے پہلے علم دیا گیا تھا جو انھوں نے تخت کے بارے میں دکھایا اور ہم اُن کے حکم کے مطیع اور فرماں بردار تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ سلیمان علیہ السلام کے قول میں سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا علم بلقیس سے پہلے ہم کو دیا گیا۔ کسی نے کہا کہ علم اس کے اسلام کا اور فرمانبردار ہو کر آنے کا اس کے

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٠٧) [2] فتح القدير (٤/ ١٨٦) [3] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧٠) [4] فتح القدير (٤/ ١٨٦)

آنے سے پہلے۔ کسی نے کہا کہ یہ قول سلیمان علیہ السلام کی قوم کے کلام میں سے ہے۔ دوسرا قول باقی اقوال سے زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام زہیر بن محمد رحمہ اللہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔[1]

﴿ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ یہ سلیمان علیہ السلام کے کلام میں سے ہے یا سابقین احتمالین کی بنا پر بلقیس کے کلام میں سے ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے ایک اور احتمال ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ پاک کے کلام میں سے ہے۔ اس شے کا بیان ہے جو اُسے اسلام کے ظاہر کرنے سے روکتی تھی، جس کی وہ مدعی تھی۔ اس صورت میں ﴿ صَدَّ ﴾ کا فاعل ﴿ مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ ﴾ ہے، یعنی اس کو ایمان کے ظاہر کرنے سے اس شے نے روکا جس کو وہ پوجتی تھی؛ یعنی سورج۔[2] امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اس کو اسلام کی طرف پیش قدمی کرنے سے اس کے اللہ کے سوا پوجنے نے روکا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ صَدَّ ﴾ کا فاعل اللہ پاک ہے۔ "أَيْ: مَنَعَهَا اللّٰهُ مَا كَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ دُوْنِهٖ"

اس صورت میں کلمۂ ﴿ مَا ﴾ کا محل نصب میں ہوگا، یعنی اس کو اللہ پاک نے اس چیز سے روکا جس کو وہ پوجتی تھی اس کے سوا۔ کسی نے کہا ہے کہ فاعل سلیمان علیہ السلام ہیں، یعنی انھوں نے اس کو اس شے سے روکا جس کو وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی۔[3] لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور بیان کے لیے جملہ مستأنفہ ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا اور جملہ ﴿ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴾ جملۂ اول کی علت ہے۔ یعنی اللہ کی عبادت سے پیچھے رہنے کا سبب اور جس کو وہ پوجتی تھی اس سے اس کے پیچھے رہنے کا سبب یہ ہے کہ وہ اس قوم میں سے تھی جو کافر ہیں اور کفر میں پکے اور مضبوط ہیں۔ اسی لیے وہ ان کے درمیان رہتے ہوئے اپنے اسلام کو ظاہر کرنے پر قادر نہ ہوئی، بلکہ اس وقت تک کہ سلیمان علیہ السلام کی حکومت میں داخل ہوئی۔ جمہور نے ﴿ اِنَّهَا ﴾ بالکسر پڑھا ہے اور امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بالفتح پڑھا ہے۔ اس قراءت میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ جملہ ﴿ مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ ﴾ سے بدل ہے۔ دوسری یہ ہے کہ تقدیر "لِأَنَّهَا كَانَتْ" ہے۔ پھر تعلیل کا حرف ساقط ہو گیا ہے۔

امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ صَرْحٌ ﴾ محل کو کہتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ صَرْحٌ ﴾ صحن کو بولتے ہیں۔ محاورے میں کہتے ہیں: "هٰذِهٖ صَرْحَةُ الدَّارِ وَقَاعَتُهَا" یعنی یہ گھر کا صحن ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ صَرْحٌ ﴾ "بَلَاط" کو کہتے ہیں۔ ("بَلَاط" وہ پتھر ہیں جو گھر کے صحن میں بچھائے جاتے ہیں۔) وہ اس کے واسطے بنایا گیا تھا شیشوں سے اور اس کے نیچے پانی جاری کیا گیا تھا اور اس میں مچھلیاں چھوڑی گئی تھیں۔ ﴿ صَرْحٌ ﴾ کی اصل "تَصْرِيْحٌ" سے ہے۔ "تصریح" بہ معنی کشف ہے۔ کِذبِ صراح ظاہر و مکشوف دورغ (جھوٹ) کو کہتے ہیں۔ اسی طرح لومِ صراح کھلی ہوئی ملامت کو بولتے ہیں۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے غریب میں حکایت کیا ہے کہ صرح ہر بلند و بالا عمارت ہے۔[4]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٩٢)
[2] تفسیر أبي السعود (٦/ ٢٨٨)
[3] تفسیر القرطبي (١٣/ ٢٠٨)
[4] فتح القدير (٤/ ١٨٧)

﴿ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ﴾ ﴿ لُجَّةً ﴾ کہتے ہیں "مُعْظَمُ الْمَاءِ"، کو، یعنی گہرا پانی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ لُجَّةً ﴾ بہ معنی بحر ہے،[1] یعنی پھر جب اس نے صرح کو اپنے آگے دیکھا تو اس کو پانی خیال کیا اور اسی لیے اپنی پنڈلیاں کھولیں، تاکہ پانی میں گھسے اس خوف سے کہ تر ہو جائیں گی۔ تو دیکھا کہ اس کی پنڈلیاں سب عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھیں، اس کے بارے میں جو جنوں نے کہہ رکھا تھا اس سے صحیح و سالم تھیں۔ سوائے اس کے کہ اس کے بال بہت تھے۔

پھر جب اس نے یہ کام کیا اور اس حد تک پہنچی تو سلیمان علیہ السلام نے اس سے اپنی نگاہ کو پھیرنے کے بعد اس سے کہا: ﴿ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ﴾ یعنی یہ تو ایک صرح ہے اور چھت والا بنایا گیا ہے، شیشوں کی چھت ڈالی گئی ہے، جو کوئی اس سے گزرنا چاہتا ہے اسے اپنے کپڑے سمیٹنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ﴿ مُمَرَّدٌ ﴾ محکوک مملس کو کہتے ہیں، یعنی چکنا صاف، اسی معنی سے بغیر ڈاڑھی والے کو "أَمْرَد" بولتے ہیں اس کا چہرہ چکنا ہونے کی وجہ سے۔ جس وقت کسی شخص کی ڈاڑھی نہیں نکلتی تو اس کو "تَمَرَّدَ الرَّجُلُ" کہتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی طرح سے جس درخت کے پتے نہیں ہوتے تو اس کو شجرۂ مرداء بولتے ہیں۔[2] عمارت میں تمرید تملیس و تسویہ کو کہتے ہیں، یعنی جو مکان صاف چکنا ہوتا ہے اس کو ﴿ مُمَرَّدٌ ﴾ بولتے ہیں اور ﴿ مُمَرَّدٌ ﴾ بہ معنی مطول بھی ہے۔ اس معنی سے حصن و قلعہ کو مارد کہا گیا ہے۔

﴿ قَوَارِيْرَ ﴾ "قَارُوْرَةٌ" کی جمع ہے، یعنی شیشہ۔ "قَارُوْرَةٌ" کا اطلاق عورت پر ہوتا ہے، اس لیے کہ بچہ اور منی اس کے رحم میں قرار پکڑتی ہے جس طرح کہ کوئی شے برتن میں قرار پذیر ہوتی ہے، یا عورت کے ضعف اور ناتوانی کی وجہ سے کانچ کے برتن سے تشبیہ دے کر اس کو "قَارُوْرَةٌ" کہتے ہیں۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ عورت سے "قَارُوْرَةٌ" اور "قَوْصَرَةٌ" کے ساتھ کنایہ کرتے ہیں۔ (ان کے سوا یہ ہیں: نعجہ، شاۃ، قلوص، سرحہ، حرث، نعل، نمل، عتبہ، فراش، قید، ظلہ اور جارد۔ امام ثعالبی رحمہ اللہ نے "کتاب الکنایات" میں ان کو ذکر کیا ہے اور قرآن شریف اور حدیث شریف اور عرب کے فصحاء سے ان کی سند ذکر کی ہے۔) اسی باب سے سید غلام علی آزاد بلگرامی رحمہ اللہ کا یہ قول ہے:

يَا حَادِيَ الْعَيْسِ رِفْقًا بِالْقَوَارِيْرِ كَمْ مِنْ قُلُوْبٍ رِقَاقٍ أَثَرَ عَيْسِهِمْ

یعنی بہت سے دل رقیق و نازک ان کے اونٹوں کے پیچھے آ رہے ہیں، اے اونٹوں کے ہانکنے والے! ان زنانِ نازک اندام کے حال پر لطف و کرم کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ اونٹ تیرے گانے کی آواز سن کر مست ہو کر رقص الجمل کریں اور جو اُن پر سوار ہیں وہ نزاکت کے مارے شیشے کی طرح ٹوٹ پھوٹ جائیں۔ ادھر تو یہ ہو اور ادھر جو نرم بدن ان کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں وہ ٹوٹ جائیں۔ سید صاحب مرحوم نے اس لفظ کا اقتباس حدیث شریف سے فرمایا

[1] فتح القدير (٤/ ١٨٧) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٠٩)

ہے۔ حدیث شریف میں «رُوَيْدَكَ بِالْقَوَارِيرِ» آیا ہے[1] یا «رِفْقًا بِالْقَوَارِيرِ»[2] معنی ایک ہی ہیں۔ بالجملہ اس جگہ ﴿قَوَارِيْرَ﴾ سے مراد شیشے کا گھر ہے۔

پھر جب بلقیس نے یہ بات سنی تو مطیع اور فرماں بردار ہوگئی اور بولی: ﴿رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ﴾ یعنی اے میرے رب! میں نے اپنی جان کا برا کیا، کیوں کہ میں تیرے غیر کو پوجتی رہی، یعنی سورج کو، کیوں کہ وہ اس کی پرستش کیا کرتی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس گمان کے سبب سے جو میں نے سلیمان علیہ السلام کے بارے میں کیا تھا، اس لیے کہ اس نے وہم کیا تھا کہ سلیمان علیہ السلام نے اس کو ڈبونا چاہا ہے دریا میں۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

﴿وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ یعنی اور فرماں بردار ہوئی سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اس کی تابع ہو کر اور اللہ کے واسطے اس کے دین میں داخل ہو کر، وہ اللہ جو سارے جہان کا رب ہے۔ دین سے مراد اسلام ہے۔ پہلے ﴿رَبِّ﴾ میں خطاب کیا، پھر یہاں خطاب سے غیبت کی طرف التفات کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی غرض یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنی معرفت کو ظاہر کرے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس نے التفات اس لیے کیا کہ اس اسم شریف میں سارے اسماء پر دلالت ہے اور اس لیے کہ یہ ذات پاک کا علم ہے۔ امام ابن منذر، عبد بن حمید اور ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ وغیرہم نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل اثر میں یہ بات روایت کی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس کے بعد اس سے نکاح کر لیا۔ امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے کہا: "مَا أَحْسَنَهُ مِنْ حَدِيثٍ" یہ اثر پہلے مذکور ہو چکا ہے، اس میں نکاح کا ذکر نہیں ہے۔ شاید دوسری روایت میں ہو۔ پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا قول ذکر کیا ہے، یہ قول بھی پہلے مذکور ہو چکا ہے۔[3]

اس کے بعد فتح القدیر و فتح البیان میں فرمایا ہے کہ یہ کلام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا ایک شعبہ ہے اس تقریر کا جس کو ہم اس تفسیر میں بار بار ذکر کر آئے ہیں اور کئی جگہ اس پر متنبہ بھی کر چکے ہیں۔ میں یہ خیال کرتا تھا کہ میرے سوا اس بات پر کسی نے تنبیہ نہیں کی ہے۔ اللہ کی تعریف ہے، اس موافقت پر جو ایسے حافظ منصف سے ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ بلقیس کا حال اس کے اس قول تک منتہی ہوا کہ اس نے ﴿اَسْلَمْتُ﴾ کہا۔ اس کے بعد کسی کو کچھ علم نہیں ہے، کیوں کہ اس کے بعد کا حال نہ تو قرآن شریف میں مذکور ہے نہ کسی صحیح حدیث میں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں اور عقیلی رحمہ اللہ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: پہلا وہ شخص جس کے لیے حمام بنائے گئے سلیمان علیہ السلام ہیں۔[4] بطریقِ دیگر اُن سے مرفوعاً مروی ہے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٢٣)

[2] مسند الحميدي (٢/ ٥٠٨) [3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[4] التاريخ الكبير للبخاري (١/ ٣٦٢) الضعفاء الكبير للعقيلي (١/ ٦٨) اس کی سند میں "اسماعیل بن عبدالرحمٰن" ضعیف راوی ہے۔

اس طریق کو امام طبرانی نے اور ابن عدی رحمہ اللہ نے کامل میں اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے شعب میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: سب سے پہلا شخص جو حمام میں داخل ہوا وہ سلیمان علیہ السلام ہیں۔ پھر جب اس کی گرمی پائی تو کہا: ''أَوَّهْ! مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ''[1] ''آہ! (یہ گرمی تو) اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہے۔'' مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام جب بادشاہ ہوئے تو وہ تیرہ برس کے تھے اور جب وفات پائی تو ترپن برس کے تھے۔ بلقیس کی بادشاہت ختم ہوئی سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت کے ختم ہونے کے سبب سے۔ ''فَسُبْحٰنَ مَنْ لَا انْقِضَاءَ لِدَوَامِ مُلْكِهِ''[2] پاک ہے وہ ذات جس کی سلطنت کو زوال نہیں ہے؟ پھر اللہ پاک نے صالح علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور بلاشبہ ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو تو اسی وقت وہ لوگ دو فریق (مومن اور کافر) ہو کر جھگڑنے لگے (45) صالح نے کہا: اے میری قوم! تم بھلائی (رحمت) سے پہلے برائی (عذاب) کیوں جلدی طلب کرتے ہو؟ تم اللہ سے مغفرت کیوں نہیں طلب کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے؟ (46) انھوں نے کہا: ہم تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو منحوس سمجھتے ہیں، صالح نے کہا: تمھاری نحوست و مصیبت تو اللہ کے پاس (اس کے اختیار میں) ہے، بلکہ تم لوگ تو آزمائے جا رہے ہو (47)

صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کا بیان:

دو فریق، یعنی ایک ایمان والے اور ایک منکر، جیسے مکے کے لوگ پیغمبر کے آنے سے جھگڑنے لگے۔ بدشگونی، یعنی کفر کی شامت سے تم پر سختی پڑی ہے کہ دیکھیں سمجھتے ہو یا نہیں۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک ثمود کے حال کی اور جو اُن کے نبی صالح علیہ السلام کے ساتھ ہوا، اس کی

[1] المعجم الأوسط (١/ ١٤٦) الکامل لابن عدي (١/ ٢٨٥) شعب الإیمان (٦/ ١٦٠) اس کی سند میں ''اسماعیل بن عبدالرحمٰن'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ٢٧٠٤)

[2] فتح البیان (١٠/ ٤٦۔ ٥٠)

خبر دیتا ہے۔ جب اللہ پاک نے ان کو ان کی طرف بھیجا تو انھوں نے ان کو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی طرف بلایا۔ پھر وہ دو فرقے ہو کر جھگڑنے لگے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ دو فرقوں سے مراد مومن اور کافر ہیں،[1] جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٧٥۔ ٧٦] ''اس کی قوم کے وڈیرے، جنھوں نے تکبر کیا، کمزور سمجھے جانے والے ایمان داروں سے کہنے لگے: کیا تم یہ بات جانتے ہو کہ واقعی صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہے؟ انھوں نے کہا: (ہاں) بلاشبہ ہم اس چیز پر ایمان لانے والے ہیں جس کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا جنھوں نے تکبر کیا: بے شک ہم اس چیز کا انکار کرنے والے ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ﴾ یعنی اے میری قوم! تم عذاب کے حاضر ہونے کو کیوں مانگتے ہو اور اللہ سے اس کی رحمت کیوں طلب نہیں کرتے ہو؟ اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ﴾ یعنی تم اللہ سے مغفرت کیوں نہیں مانگتے، شاید تم پر رحم ہو۔ وہ بولے: ہم نے تیرے چہرے پر خیر و بھلائی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی ان لوگوں کے چہروں پر جنھوں نے تیری پیروی کی ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ اُن کی شقاوت اور بدبختی کی وجہ سے جب اُن میں سے کسی کو کوئی برائی پہنچتی تو وہ یہی کہتا کہ یہ صالح اور اس کے اصحاب کی طرف سے ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''تَشَاءَمُوا بِهِمْ''[2] یعنی ان کی بدشگونی سمجھتے۔ یہ ویسی بات ہے جس کی اللہ پاک نے قومِ فرعون کے سلسلے میں خبر دی ہے: ﴿ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٣١] ''پھر جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے: یہ ہمارے ہی لیے ہے اور اگر انھیں بدحالی آلیتی تو اسے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست ٹھہراتے۔ خبردار! ان کی نحوست اللہ کے پاس (مقدور) ہے اور لیکن ان میں اکثر (لوگ) نہیں جانتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ [النساء: ٧٨] ''اور اگر انھیں کوئی بھلائی ملے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کی طرف سے ہے۔ کہہ دیجیے: یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔'' یعنی بھلائی اور برائی ہر ایک اللہ پاک کی قضا و قدر سے ہے۔ نیز اللہ پاک نے بستی والوں کی طرف سے خبر دی جب ان کے پاس پیغمبر آئے: ﴿ قَالُوْۤا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٩٩)

وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۱۸۔ ۱۹]
''وہ کہنے لگے: ہم تو تمھیں منحوس خیال کرتے ہیں، اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمھیں ضرور سنگسار کر دیں گے اور تمھیں ہماری طرف سے ضرور دردناک سزا پہنچے گی۔ انھوں نے کہا: تمھاری نحوست تو تمھارے ساتھ ہی ہے، کیا اگر تمھیں نصیحت کی جائے (تو یہ نحوست ہے؟ ہرگز نہیں!) بلکہ تم لوگ ہی حد سے بڑھنے والے ہو۔''

پھر ان لوگوں نے یوں کہا: ﴿ اِطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ یعنی اللہ اس کہنے پر تم کو بدلہ دے گا۔ ﴿ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلکہ تم ایک قوم ہو کہ جانچے جاتے ہو طاعت اور معصیت کے ساتھ۔[1] ظاہر یہ ہے کہ ﴿ تُفْتَنُوْنَ ﴾ سے مراد ''تُسْتَدْرَجُوْنَ'' ہے، یعنی تم مہلت دیے جاتے ہو اس گمراہی میں جس میں تم پھنسے ہوئے ہو۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ ﴾ معطوف ہے ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ ﴾ پر اور حرفِ لام توطیہ قسم کا ہے ''أَيْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ''۔ یہ قصہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس بیان کا حصہ ہے: ﴿ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [النمل: ٦] ''اور (اے نبی!) بلاشبہہ آپ کو تو ایک کمال حکمت والے، خوب جاننے والے کی طرف سے یہ قرآن سکھایا جاتا ہے۔'' ثمود اس قبیلے کے باپ کا نام ہے جس میں صالح علیہ السلام ہیں۔ یہ شخص ان کا دادا ہے، اس جگہ اس سے مراد خود قبیلہ ہے۔ ثمود کو عادِ ثانیہ کہتے ہیں۔ رہے عادِ اولیٰ تو وہ قومِ ہود ہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ دونوں کے درمیان سو برس کا زمانہ ہے۔ صالح علیہ السلام دو سو اسی برس زندہ رہے۔ ﴿ صٰلِحًا ﴾ عطفِ بیان ہے ﴿ اَخَاهُمْ ﴾ کا۔

﴿ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ﴾ رسالت کی تفسیر ہے۔ کلمۂ ﴿ اَنِ ﴾ مفسرہ ہے یا مصدریہ۔ ''أَيْ: بِأَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ'' یعنی اللہ کی قسم ہے! بلاشبہہ یقیناً مقرر بھیجا ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو، اس بات کے ساتھ کہ تم اللہ ہی کو پوجو اور اس کی توحید کو اختیار کرو۔ ﴿ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ کلمۂ ''إِذَا'' فجائیہ بہ معنی ناگہاں ہے، یعنی اس کے رسول ہو کر آتے ہی فرقہ بندی اور جھگڑا پیدا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ ادھر سے وہ تو رسول ہو کر آئے، اُدھر سے ان کے آتے ہی دو فرقے جھگڑنے لگے۔ فریقین سے ان کے مومن اور کافر مراد ہیں۔ ہر فریق اس بات پر جھگڑنے لگا جس پر وہ تھا اور خیال کرنے لگا کہ حق اس کے پاس ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے درمیان جھگڑا اس بات میں تھا کہ آیا صالح علیہ السلام اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں یا نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک فریق تو صالح علیہ السلام ہیں اور دوسرا فریق اُن کی ساری قوم۔ یہ قول ضعیف ہے۔

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٩٩) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٨٤)

فریقین کے جھگڑنے کی حکایت سورت اعراف کی اس آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے: ﴿ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۷۵] ''اس کی قوم کے وڈیرے، جنھوں نے تکبر کیا، کمزور سمجھے جانے والے ایمان داروں سے کہنے لگے: کیا تم یہ بات جانتے ہو کہ واقعی صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہے؟ انھوں نے کہا: (ہاں) بلاشبہہ ہم اس چیز پر ایمان لانے والے ہیں جس کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے۔''

بالجملہ صالح علیہ السلام نے ان کے کافر لوگوں سے جنھوں نے ان کی تکذیب کی یہ فرمایا: ﴿ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: سیئہ سے مراد عذاب ہے اور حسنہ سے رحمت۔[1] معنی یہ کہ تم ایمان کو کیوں موخر کرتے ہو جو تمھاری طرف ثواب کو کھینچ کر لاتا ہے اور کفر کو مقدم کرتے ہو جو تمھاری طرف سزا کو کھینچ لاتا ہے۔ وہ لوگ اپنے کفر کی زیادتی کی وجہ سے کہا کرتے تھے: اے صالح! تو ہم پر عذاب لے آ۔ عذاب کو جو سیئہ کے ساتھ موصوف کیا ہے تو یہ مجازاً ہے، یا تو اس لیے کہ عذاب سیئہ کے لوازمات سے ہے، یا مکروہ ہونے میں اس کے مشابہ ہے۔

﴿ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ یعنی اللہ سے مغفرت کیوں طلب نہیں کرتے اور شرک سے توبہ کرتے اس اُمید پر کہ تم پر رحم کیا جائے۔ یا رحم کیے جاؤ تو عذاب نہ کیے جاؤ، اس لیے کہ خیر کا جلد مانگنا شر کے جلد مانگنے سے بہتر ہے۔ اس صحیح ارشاد اور نرم کلام کے بعد اُن کا جواب یہ ہوا کہ بولے: ﴿ اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ﴾ یعنی ہم نے تجھ سے اور اُن لوگوں سے جنھوں نے تیرا کہنا مانا ہے بدشگونی لی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کو تجھ سے بدبختی اور تنگی اور سختی پہنچی۔ یہ اس لیے کہا ہے کہ ان پر قحط پڑا تھا، چنانچہ صالح علیہ السلام سے بدفالی لی۔ عرب لوگ سب سے بڑھ کر بدفالی کا اور شگون لینے کا اعتبار کرتے تھے اور سب سے زیادہ اس کی وجہ سے مشقت میں پڑتے تھے۔ جس وقت کسی سفر کا یا کسی کام کا ارادہ کرتے تو پرندے کو اس کے گھونسلے سے اڑاتے۔ پھر اگر وہ سیدھی طرف اُڑتا تو سفر کرتے اور جس کام کا ارادہ کیا تھا اس کو کر لیتے اور اگر وہ بائیں طرف اُڑتا تو اس سفر کو یا اس کام کو ترک کر دیتے تھے۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ رائے کو ضرر دینے والی اور تدبیر کو بگاڑنے والی کوئی شے بدفالی کے اعتقاد سے بڑھ کر نہیں ہے۔ جس شخص نے یہ خیال کیا کہ گائے کی یا کوے کی آواز قضا کو رد کرتی ہے، یا اللہ کی تقدیر کو دور کرتی ہے تو یقیناً اس نے نادانی کی۔[2] درحقیقت یہ بہت اچھی بات کہی ہے۔ بھلا دنیا جہان کے کاروبار میں ان اُمور کو کیا دخل ہے۔ معاذ اللہ۔ اسی لیے حدیث شریف میں طیرہ کو شرک فرمایا ہے۔[3] تطیر وتشاؤم فالِ بد لینے کو کہتے ہیں: ﴿ اطَّيَّرْنَا ﴾

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸۹۸) [2] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۲۱٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۹۱۰) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱٦۱٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۵۳۸) صحيح الجامع، رقم الحديث (۳۹٦۰)

کی اصل "تَطَیَّرۡنَا" ہے۔ اسی طرح کسی نے پڑھا ہے کہ حرفِ تا کو طا میں ادغام کیا ہے، چوں کہ مدغم ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور ساکن کے ساتھ ابتدا متعذر (مشکل) ہوتی ہے، اس لیے اس کے اول میں وصل کا ہمزہ لایا گیا ہے۔

غرضیکہ جب انھوں نے یہ کہا کہ تمھاری شومی، نحوست اور سبز قدمی سے ہم کو بلا پہنچی ہے تو صالح علیہ السلام نے ان سے فرمایا: ﴿ طٰٓئِرُكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ ﴾ یعنی جو کچھ بھلائی برائی تم کو پہنچتی ہے وہ اللہ پاک کے حکم سے ہے اور وہ تم پر لکھی ہوئی ہے۔ امر و قضائے الٰہی کا نام طائر اس لیے رکھا ہے کہ حتمی قضا کے نازل ہونے سے بڑھ کر سریع (تیز رفتار) کوئی شے نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ یہ بدفالی کے سبب سے نہیں ہے جس کے ساتھ تم بدفالی لیتے ہو، بلکہ اس کا سبب اللہ پاک کے پاس ہے، یعنی وہ شے جس کو اللہ تعالیٰ تم پر مقدر فرماتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو شومی تم کو پہنچی ہے وہ تمھارے کفر کے سبب سے اللہ پاک کے پاس سے ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ طٰٓئِرُكُمۡ ﴾ بہ معنی "عَمَلُکُمۡ" ہے، اس کا نام طائر رکھا ہے، اس کے آسمان کی طرف تیزی سے چڑھنے کے سبب سے۔

پھر جس حال میں وہ مبتلا تھے، صالح علیہ السلام نے اس کا سبب خوب واضح کر کے بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تُفۡتَنُوۡنَ ﴾ یعنی بلکہ تم ایک قوم ہو کہ تمھارا امتحان لیا جاتا ہے، بھلائی برائی سے تمھاری جانچ ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کہ تم عذاب کیے جاتے ہو اپنے گناہوں کے سبب سے۔ کسی نے کہا کہ تمھارا غیر تم کو فتنے میں ڈالتا ہے، یا شیطان تم کو اس بدفالی کے ساتھ جس میں تم پڑتے ہو تمھیں فتنے میں ڈالتا ہے، یا اس چیز کے ساتھ جس کے لیے تم بدفالی لیتے ہو۔ پس "طائر" کے ذکر سے اس شے کی طرف اضراب کیا (پھرے)، جو سبب داعی تھی طائر کی طرف۔ چوں کہ ﴿ اَنۡتُمۡ ﴾ کی ضمیر مقدم ہے، اس کی رعایت کر کے صیغۂ خطاب سے ﴿ تُفۡتَنُوۡنَ ﴾ فرمایا ہے اور اگر بعد میں جو کچھ ہے اس کا خیال کیا جاتا تو "یُفۡتَنُوۡنَ" بصیغۂ غائب فرمایا جاتا، یہ بھی جائز ہے، لیکن مرجوح ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا تم کہتے ہو کہ "أَنۡتَ رَجُلٌ تَفۡعَلُ وَیَفۡعَلُ، وَنَحۡنُ قَوۡمٌ نَقۡرَءُ وَیَقۡرَءُوۡنَ"[1]

وَكَانَ فِي الۡمَدِيۡنَةِ تِسۡعَةُ رَهۡطٍ يُّفۡسِدُوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ وَلَا يُصۡلِحُوۡنَ ۝٤٨ قَالُوۡا تَقَاسَمُوۡا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهۡلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوۡلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدۡنَا مَهۡلِكَ اَهۡلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ۝٤٩ وَمَكَرُوۡا مَكۡرًا وَّمَكَرۡنَا مَكۡرًا وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ۝٥٠ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكۡرِهِمۡ ۙ اَنَّا دَمَّرۡنٰهُمۡ وَقَوۡمَهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝٥١ فَتِلۡكَ بُيُوۡتُهُمۡ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوۡا ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۝٥٢

[1] فتح البیان (۱۰/ ۵۰۔ ۵۲)

وَ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ۝۵۳

اور اس شہر میں نو سرغنے تھے، وہ زمین میں فساد پھیلاتے رہتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے 48 انھوں نے کہا: تم آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور صالح اور اس کے اہل خانہ پر شب خون ماریں گے، پھر ہم اس کے وارث سے کہیں گے کہ ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے، اور بلاشبہ ہم سچے ہیں 49 اور انھوں نے ایک چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی، اور وہ شعور بھی نہ رکھتے تھے 50 پھر آپ دیکھیں! ان کی چال کا انجام کیا ہوا، بلاشبہ ہم نے ان (نو سرغنوں) کو اور ان کی سب قوم کو تباہ و برباد کر دیا 51 چناں چہ یہ ہیں ان کے گھر خالی (اُجڑے اور ویران) پڑے ہوئے، اس لیے کہ انھوں نے ظلم کیا، بلاشبہ اس میں نشان (عبرت) ہے، ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں 52 اور ہم نے انھیں نجات دی جو ایمان لائے اور وہ (اللہ سے) ڈرتے تھے 53

قومِ صالح علیہ السلام کے فسادی سرداروں کی چال اور قومِ ثمود کی تباہی:

وہ سمجھتے نہ تھے، یعنی ان کے ہلاک ہونے کے اسباب پورے ہو چکے تھے۔ جب تک شرارت اللہ کو نہیں پہنچتی اس وقت تک عذاب نہیں آتا۔ ان کے مکانات ظلم کی وجہ سے اجڑے پڑے ہیں۔ یہی حال ہے ان کافروں کا۔ انتہٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ثمود کے سرکش سرداروں کی خبر دیتا ہے جو اپنی قوم کو گمراہی اور کفر اور صالح علیہ السلام کی تکذیب کی طرف بلاتے تھے۔ انجام کار اُن کا یہ ہوا کہ اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور صالح علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا اس طریقے سے کہ رات کے وقت اُن پر اور اُن کے گھر والوں پر ایک دم حملہ کر دیں، پھر ان کو دھوکے سے قتل کر ڈالیں، پھر ان کے قریبی رشتے دار دعویٰ کرنے والوں سے کہہ دیں کہ ان کو ان کے حال کی کچھ بھی خبر نہیں اور یہ خبر جو انھوں نے ان کو دی کہ اس حال کا انھوں نے مشاہدہ نہیں کیا، پس اس میں وہ البتہ سچے ہیں۔

اللہ پاک فرماتا ہے کہ ثمود کے شہر میں نو شخص تھے جو زمین میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔ چوں کہ یہ لوگ ثمود کے بڑے اور سردار تھے، اس لیے یہی لوگ ان کے کام پر غالب ہو گئے تھے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔[1] یعنی جن کی رائے اور مشورے سے یہ کام ہوا وہ یہی ہیں۔ قبحهم الله ولعنهم اور بے شک اللہ پاک نے ان کو مقبوح اور ملعون کیا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے عن ابی مالک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ ان نو آدمیوں کے یہ نام ہیں: رُعَمی،

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧٧)

رعیم، ہرم، ہریم، داب، صواب، مسطع، قدار بن سالف عاقر الناقہ۔[1] یعنی وہ جو اپنے ہاتھ سے اس برے کام کا مرتکب ہوا۔ کاتب حروف ۔عفا اللہ عنہ۔ عرض کرتا ہے کہ مصحح مصر نے حاشیۂ ابن کثیر مطبوع پر لکھا ہے: "قَوْلُهُ: هٰؤُلَاءِ التِّسْعَةُ الخ" كَذَا بِأَصْلِهِ وَالْمَعْدُوْدُ ثَمَانِيَةٌ وَهِيَ مُخَالِفَةٌ لِّمَا فِي الْكَشَّافِ وَالْخَطِيْبِ فَحَرِّرْ وَانْظُرِ التَّاسِعَ. انتہٰی

واقعی مصحح صاحب سچ فرماتے ہیں کہ ایک نام رہ گیا ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "مفحمات الأقران في مبهمات القرآن" میں لکھا ہے: امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام سدی رحمہ اللہ کے طریق سے عن ابی مالک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا کہ اُن کے نام یہ ہیں: رعمیٰ، رعیم، ہرمی، ہریم، داب، صواب، رباب، مسطع، قدار بن سالف عاقر الناقہ بعض نے ان کو دو بیتوں میں یوں نظم کیا ہے:

رَبَابٌ وَغَنَمٌ وَالْهُذَيْلُ وَمُصْدَعٌ . عُمَيْرٌ سَبِيْطٍ عَاصِمٌ وَقِدَارُ

وَسَمْعَانُ رَهْطُ الْمَاكِرِيْنَ بِصَالِحٍ أَلَا إِنَّ عُدْوَانَ النُّفُوْسِ جَوَارُ

شیخ جمال الدین ابن ہشام کے خط سے میں نے اس کو اسی طرح نقل کیا ہے اور ان کے آبا کے نام علی الترتیب یہ ہیں: مہرع، غنم، عبد رب، مہرج، کردہ، صدقہ، مخرمہ، سالف اور صفی۔[2] انتهى كلام السيوطي

اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴾ [القمر: ۲۹] "پھر انھوں نے اپنے (ایک) ساتھی کو پکارا تو اس نے (تلوار) پکڑی، پھر اس نے کونچیں کاٹیں (اور اسے مار ڈالا)۔" نیز فرمایا: ﴿ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴾ [الشمس: ۱۲] "جب اُٹھ کھڑا ہوا اس قوم کا بڑا بدبخت۔" عبد الرحمٰن نے کہا: مجھے خبر دی یحییٰ بن ربیعہ صنعانی رحمہ اللہ نے، کہا: میں نے عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کو سنا، وہ کہتے تھے: ﴿ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴾ کہا: وہ درہموں کو کترا کرتے تھے، یعنی ان میں سے لے لیا کرتے تھے، گویا وہ ان سے معاملہ کرتے تھے بطور عدد کے، جس طرح کہ عرب معاملہ کیا کرتے تھے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے یحییٰ بن سعید عن سعید بن المسیب روایت کیا ہے کہ سونے اور چاندی کا قطع کرنا فساد فی الارض سے ہے۔[3] اس حدیث میں، جس کو ابو داود رحمہ اللہ وغیرہ نے روایت کیا ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سکۂ مومنین کے کسر سے ممانعت فرمائی ہے جو ان کے درمیان جنگ میں جائز ہے،[4] یعنی مسلمانوں میں جس روپیہ اور اشرفی کا رواج ہے اس کا کاٹنا درست نہیں ہے، ہاں اگر اس میں کسی طرح کا دھوکا ہو تو کاٹنا درست ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کا فروں

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۰۰) [2] مفحمات الأقران في مبهمات القرآن (۱/ ۷۹۔ ۸۰) [3] تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۰۱)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۴۴۹) اس کی سند میں "محمد بن فضاء" ضعیف اور "فضاء بن خالد" مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۴۷۰۶)

اور فاسقوں کی صفت تھی کہ زمین میں ہر طریقے سے فساد کیا جائے، جس پر ان کو قدرت ہوتی، اُن میں سے یہ ہے جو ان اماموں نے ذکر کیا ہے اور اس کے سوا اور ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ﴾ یعنی آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ اور اللہ کے نبی صالح علیہ السلام کے قتل پر بیعت کرو کہ جو شخص اس سے رات کو ملے تو دھوکے سے اس کو مار ڈالے، چنانچہ اللہ پاک نے ان کے ساتھ تدبیر کی اور ان کا حادثہ انہیں پر لوٹا دیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ تَقَاسَمُوْا ﴾ بہ معنی "تَحَالَفُوْا" ہے، یعنی انھوں نے باہم قسم کھائی صالح علیہ السلام کی ہلاکت پر۔ چنانچہ وہ اُن تک نہ پہنچے، یہاں تک کہ وہ اور اُن کی ساری قوم ہلاک ہوگئی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "تَوَاثَقُوْا عَلٰى أَنْ يَّأْخُذُوْهُ لَيْلًا فَيَقْتُلُوْهُ" یعنی انھوں نے باہم اس بات پر پکا عہد کیا کہ ان کو رات کے وقت پکڑ لیں، پھر ان کو قتل کر ڈالیں۔

ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ وہ لوگ اس درمیان میں کہ جلد جلد صالح علیہ السلام کی طرف جا رہے تھے کہ دھوکے سے ان کو مار ڈالیں کہ اللہ پاک نے ان پر ایک پتھر بھیجا جس نے ان کو ساکن کر ڈالا، یعنی مار ڈالا۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالی تھیں۔ کہا: جب اس کا عقر کر چکے، یعنی کونچیں کاٹ چکے اور یہ عہد کر چکے کہ البتہ ہم شب خون ماریں گے صالح علیہ السلام اور اُن کے گھر والوں پر، پھر ان کو قتل کر ڈالیں گے، پھر ہم صالح کے اولیاء سے کہہ دیں گے: ہم تو کسی ایسی بات پر حاضر نہ تھے اور نہ ہم کو اس کا کچھ علم ہے۔ اللہ پاک نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔[1]

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ نو لوگ جب اونٹنی کی کونچیں کاٹ چکے تو کہنے لگے: آؤ اب صالح کو قتل کر ڈالیں۔ پھر اگر وہ سچا ہے تو ہم اپنے مرنے سے پہلے اس کو مار چکیں گے اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کو اس کی اونٹنی کے ساتھ ملا چکیں گے۔ پھر وہ رات کو ان کے پاس شب خون مارنے کے لیے آئے تو فرشتوں نے پتھروں سے اُن کے سر پھوڑ دیے۔ پھر جب انھوں نے اپنے اصحاب پر دیر لگائی تو وہ صالح علیہ السلام کے پاس آئے اور دیکھا کہ جو لوگ اُن پر شب خون مارنے کے لیے آئے تھے، ان کے سر پتھروں سے کچلے ہوئے پڑے ہیں۔ صالح علیہ السلام سے کہا کہ تو نے ان کو قتل کیا ہے۔ پھر ان کو مارنے کا قصد کیا تو اُن کے رشتے دار انھیں بچانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہتھیار لگا لیے اور ان سے کہا: واللہ! تم اس کو کبھی بھی قتل نہ کر سکو گے، حالاں کہ اس نے تم سے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ تم پر عذاب نازل ہوگا تین رات میں۔ پھر اگر وہ سچا ہے تو تم اپنے رب کو خود پر زیادہ خفا مت کرو اور اگر وہ جھوٹا ہے تو تم اپنے ارادے سے ورے رہو گے۔ چنانچہ اس رات وہ لوگ اُن کے پاس سے لوٹ گئے۔[2]

امام عبدالرحمن بن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صالح علیہ السلام نے اُن

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۰۱۔ ۲۹۰۲) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۰۰)

سے فرمایا: ﴿ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴾ [هود: ٦٥] ''تم اپنے گھروں میں تین دن فائدہ اُٹھالو۔ یہ ایسا وعدہ ہے جس میں جھوٹ نہیں بولا گیا۔'' وہ بولے: صالح علیہ السلام کا یہ زعم ہے کہ وہ ہم سے تین دن تک فارغ ہو جائے گا، جب کہ ہم اس سے اور اس کے گھر والوں سے تین رات سے پہلے ہی فارغ ہو جائیں گے۔ صالح علیہ السلام کی ایک مسجد تھی حجر (منازلِ ثمود جو شام کے قرب و جوار میں ہیں، ان کا نام حجر ہے۔) میں پہاڑ کے شگاف کے نزدیک، وہ اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہاں ایک غار تھی، وہ لوگ رات کو اس کی طرف چلے کہ جب وہ نماز پڑھنے کے لیے آئے گا تو اسے مار ڈالیں گے۔ پھر جب اس سے فارغ ہو چکیں گے تو اس کے گھر والوں کی طرف رجوع کریں گے تو اُن سے فارغ ہوں گے۔

اللہ پاک نے ان کے اھضب جبال (ھضب وہ پہاڑ ہے جو زمین پر بچھا ہوا ہوتا ہے، اللہ پاک نے ایک بڑی چٹان اس پہاڑ سے اُن پر بھیجی) سے ان پر پتھر بھیجا تو وہ ڈرے کہ ان کے سر کچل دے، لہٰذا وہ جلدی سے اس غار میں گھس گئے، پھر وہ پتھر آ کر ان پر بند ہو گیا اور وہ اسی غار میں رہے۔ پس ان کی قوم نہ جانتی تھی کہ وہ کہاں ہیں اور وہ نہ جانتے تھے کہ اُن کی قوم سے کیا معاملہ کیا گیا۔ اللہ پاک نے ان کو یہاں عذاب کیا اور ان کو وہاں۔ صالح علیہ السلام کو اور اُن کے ساتھ والوں کو اللہ پاک نے نجات دی۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾۔ ﴿ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ یہ اُن کے گھر ہیں، خالی پڑے ہوئے ہیں ان میں کوئی نہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ مدینہ سے مراد وہ شہر ہے جس میں صالح علیہ السلام تھے، وہ شہر حجر ہے۔ اس جگہ مفسروں نے اسی طرح کہا ہے اور سورۃ الحجر میں گزر چکا ہے کہ وہ مدینہ اور شام کے درمیان ایک وادی ہے اور وہ دیارِ ثمود ہیں۔ ﴿ تِسْعَةُ رَهْطٍ ﴾ سے مراد نو مرد یا نو شخص ہیں ان کے شرفاء میں سے۔ اس اعتبار سے کلمۂ ﴿ رَهْطٍ ﴾ ﴿ تِسْعَةُ ﴾ کا تمیز واقع ہوا ہے نہ اس کے لفظ کے اعتبار سے۔ ﴿ تِسْعَةُ ﴾ کی ﴿ رَهْطٍ ﴾ کی طرف اضافت بیانی ہے، یعنی نو شخص کہ وہ رھط ہیں۔

رھط جماعت کا اسم ہے، پس گویا وہ رؤسا تھے کہ اُن میں سے ہر ایک کی تابع ایک جماعت تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ دس سے کم مردوں کو ﴿ رَهْطٍ ﴾ بولتے ہیں کہ اُن میں عورت نہیں ہے۔ ''رھْط'' ہا کے سکون سے زیادہ فصیح ہے بہ نسبت ''رَهَط'' بالفتح کے۔ یہ ایک جمع ہے کہ اس کا واحد نہیں ہے اس کے لفظ سے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رَهْطٍ ﴾

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٠٣۔ ٢٩٠٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٨٤۔ ٤٨٦)

سات سے دس تک ہے اور سات سے کم تین تک نفر ہے۔ ثعلب نے کہا ہے کہ رہط، نفر، قوم، معشر اور عشیرہ کے معنی جمع ہیں، اس کے لفظ سے اس کا واحد نہیں ہے اور یہ مردوں کے لیے ہوتا ہے عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ ابن سکیت نے کہا ہے کہ رہط وعترت کے ایک معنی ہیں۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رَهْطٍ ﴾ دس سے اوپر چالیس تک ہے۔ ابن فارس رحمہ اللہ نے بھی اسی کو نقل کیا ہے۔

﴿ رَهْطٍ ﴾ کی جمع "أَرهُط وأَرَاهِطُ" آتی ہے۔ غرضیکہ یہ نو مرد قدار عاقرِ ناقہ (اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والے) کے اصحاب ہیں۔ یہ لوگ صالح علیہ السلام کی قوم کے سرکش تھے۔ ان نو آدمیوں کے ناموں میں بڑا اختلاف ہے، اس کا ذکر کر کے طول دینے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ فی الجملہ کچھ اختلاف اوپر بیان ہو چکا ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کی یہ صفت ذکر فرمائی کہ ﴿ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴾ یعنی ان کا حال و شان اور عمل یہی زمین میں فساد برپا کرنا تھا، نہ صرف اس شہر میں بلکہ ہر جگہ۔ اور فساد بھی ایسا کہ اس میں اصلاح کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کا کام صرف فساد ہی فساد تھا، اصلاح کی بو تک ان میں نہیں تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ لوگ لوگوں کی عیب جوئی کیا کرتے تھے اور اُن کے عیب تلاش کرتے تھے اور اپنی شرم گاہوں کا ستر نہیں کیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ خود ظلم کرتے تھے اور ظلم سے منع نہیں کرتے تھے۔

﴿ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ ﴾ یعنی بعض نے بعض سے کہا کہ اللہ کی قسم کھاؤ، یہ معنی اس بنا پر ہیں کہ ﴿ تَقَاسَمُوْا ﴾ صیغۂ امر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ صیغہ فعل ماضی کا ہو اور ﴿ قَالُوْا ﴾ کا مفسر ٹھہرے۔ گویا کسی نے پوچھا کہ انھوں نے کیا کہا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ انھوں نے باہم قسم کھائی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ تَقَاسَمُوْا ﴾ ﴿ قَالُوْا ﴾ کی ضمیر سے حال ہو بہ تقدیر کلمۂ "قد" یعنی انھوں نے یہ بات کہی درانحالیکہ باہم قسم کھانے والے تھے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿ تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ ﴾ پڑھا ہے۔ بغیر ﴿ قَالُوْا ﴾ کے۔[2]

﴿ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ﴾ میں حرمِ لام توطئہ قسم کا ہے۔ اہل سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان پر ایمان لائے تھے اور وہ چار ہزار آدمی تھے، یعنی اللہ کی قسم! البتہ ہم آئیں گے ناگاہ اس کے پاس اور اس کے اہل کے پاس رات کے وقت، پھر ان کو رات میں قتل کر ڈالیں گے۔

﴿ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ ﴾ جمہور نے دونوں فعلوں کو بہ نونِ متکلم پڑھا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس قراءت کو اختیار کیا ہے۔ امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے دونوں کو بتائے فوقیہ پڑھا ہے اس بنا پر کہ بعض کا بعض کو خطاب ہے، اس کو امام ابو عبید رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے اور امام مجاہد اور حمید رحمہما اللہ نے دونوں کو بیائے غیبت پڑھا ہے۔ ولی سے مراد صالح علیہ السلام کے وہ رشتے دار ہیں جو خون کے ذریعے سے ولی ہیں۔ ﴿ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ ﴾ امام حفص اور سلمی رحمہما اللہ نے

---

[1] الكشاف (٣/ ٣٧٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧٨)

بہ فتحِ میم و لام پڑھا ہے اور امام ابوبکر اور مفضل رحمہ اللہ نے بہ فتحِ میم و کسرِ لام پڑھا ہے[1] اور کسی نے بہ ضمِ میم و فتحِ لام پڑھا ہے، یہ تین قراءتیں ہوئیں۔

پہلی اور تیسری کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ پھر ہم البتہ اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے اہل کی ہلاکت کے وقت یا اُن کو ہلاک کرنے کے لیے حاضر نہیں ہوئے اور نہ ہم جانتے ہیں کہ اس کو اور اس کے اہل کو کس نے قتل کیا ہے۔ دوسری قراءت کی بنا پر اگر وہ ظرف ہے تو معنی یہ ہیں کہ ہم اس کی جائے ہلاکت میں حاضر نہیں تھے۔ جائے ہلاکت میں حاضر نہ ہونا اس بات پر دال ہے کہ بالاولیٰ وہ اُن کے قتل میں حاضر نہیں ہوئے۔

﴿ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾ یعنی ہم نے جو یہ بات کہی کہ ہم ان کے قتل میں حاضر نہیں ہوئے، بے شک اس بات میں ہم البتہ سچے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس گروہ نے باہم اس بات کی قسم کھائی کہ صالح علیہ السلام اور اُن کے اہل پر شب خون ماریں۔ پھر ان کے اولیاء کے پاس اس بات کا انکار کر جائیں کہ انھوں نے نہ وہ کام کیا، نہ اس کو دیکھا، یہ اُن کی طرف سے مکر تھا، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَكَرُوْا مَكْرًا ﴾ یعنی انھوں نے اس طرح باہم قسم کھانے کے ساتھ ایک مکر کیا۔[2] وہ مکر یہی ہے کہ انھوں نے صالح علیہ السلام کے اچانک مار ڈالنے کی تدبیر چھپائی۔ ﴿ وَمَكَرْنَا مَكْرًا ﴾ یعنی ہم نے ان کو ان کے فعل کا بدلہ دیا، چنانچہ ان کو ہلاک کر ڈالا۔ ﴿ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ یعنی اور وہ نہیں جانتے تھے اللہ کی تدبیر کو جو اُن کے ساتھ کی۔ مکر کے بدلے کا نام جو مکر رکھا تو یہ استعارے کے طور پر ہے، جو مشاکلت کی طرف منضم ہے، یعنی مشابہت سے ملا ہوا ہے، جیسا کہ کشاف میں اور اس کی شروح میں ہے۔ یعنی مکر کے بدلے کو مکر کے ساتھ تشبیہ دی اس اعتبار سے کہ وہ بدلہ یہ ہے کہ خفیہ طریقے سے ضرر دی جائے، کیوں کہ مکر کہتے ہیں قصداً تکلیف دینے کو، دھوکا، حیلہ اور تدبیر کے طریقے سے۔

﴿ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ﴾ یعنی پس دیکھ اس شے کو جس کی طرف اُن کا کام پہنچا، جس کی بنیاد انھوں نے مکر پر رکھی تھی اور نظر کر اس شے کی طرف جو اس کی وجہ سے ان کو پہنچی۔ ﴿ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ جمہور نے بکسرِ ہمزہ "إِنَّا" پڑھا ہے۔ اور امام حمزہ، کسائی، اعمش، حسن، ابن ابی اسحاق اور عاصم رحمہم اللہ نے بہ فتح، یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ چنانچہ جس نے بکسر پڑھا ہے تو اس نے اس کو استیناف قرار دیا ہے۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسر سے پڑھنے والے نے استیناف کیا ہے اور اس سے ماقبل کی تفسیر کرتا ہے۔ گویا اسے عاقبت کا تابع ٹھہرایا ہے۔ مثلاً یوں کہا کہ بالآخر یہ ہوا کہ ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ اور فتحہ کی بنا پر تقدیر یہ ہے کہ "بِأَنَّا" اور "لِأَنَّا" اور ﴿ كَانَ ﴾ تامہ اور ﴿ عَاقِبَةُ ﴾ اس کا فاعل۔ یا ﴿ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ ﴾ بدل ہو ﴿ عَاقِبَةُ ﴾ سے، یا خبر ہو مبتدائے محذوف کی۔ "أَيْ: هِيَ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ"، یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ كَانَ ﴾ ناقصہ ہو اور ﴿ كَيْفَ ﴾ اس کی خبر۔ یا خبر اس کی ﴿ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ ﴾ ہو۔

---

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٢١٦) فتح القدیر (٤/ ١٨٩۔ ١٩٠) [2] معاني القرآن (٤/ ١٢٤)

امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "أَنْ دَمَّرْنَاهُمْ" ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ان نو شخصوں کو ہلاک کیا رمی سے، یعنی فرشتے ان کو پتھر مارتے تھے اور وہ پتھروں کو دیکھتے تھے فرشتوں کو نہیں دیکھتے تھے، اور اُن کی قوم کو ہلاک کیا جو اُن نو کے ساتھ نہ تھی اس فعل کی مباشرت کے وقت جبرائیل علیہ السلام کی چنگھاڑ سے، (یعنی جس وقت وہ صالح علیہ السلام کے گھر ان کو قتل کرنے کے لیے ننگی تلواریں لے کر آئے۔) کلمۂ ﴿ اَجْمَعِيْنَ ﴾ معطوف اور معطوف علیہ دونوں کی تاکید ہے، معنی یہ ہیں کہ ان میں سے کوئی نہ بچا، نہ اُن کے افراد میں سے کوئی شخص عذاب سے بچ سکا۔

﴿ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ﴾ یہ جملہ اپنے ماقبل کا مقرر و مؤکد ہے۔ جمہور نے ﴿ خَاوِيَةً ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے بنا بر حال۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: پس دیکھ اُن کے گھروں کی طرف اس حال میں کہ وہ خاویہ ہیں، یعنی اجڑے ہوئے ہیں۔ امام فراء اور نحاس رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے، یعنی وہ اپنے گھر والوں سے خالی پڑے ہوئے ہیں، اُجاڑ ہو رہے ہیں، ان میں کسی رہنے بسنے والے کا اتا پتا نہیں ہے۔ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جب پیٹ خالی ہو تو کہتے ہیں: "خَوَى الْبَطْنُ"۔ یا یہ معنی ہیں کہ گرے پڑے ہیں، یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جب ستارہ ساقط ہوتا ہے، گرتا ہے تو بولتے ہیں: "خَوَى النَّجْمُ"۔ امام کسائی اور ابو عبیدہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ خَاوِيَةً ﴾ کا نصب بنا بر قطع ہے۔ اصل یہ ہے: "فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمُ الْخَاوِيَةُ" پھر جب اس سے الف و لام قطع کیا گیا تو منصوب ہو گیا اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح: ﴿ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ﴾ [النحل: ٥٢] "اور اسی کی اطاعت دائمی ہے۔" عاصم بن عمر، نصر بن عاصم، جحدری اور عیسیٰ بن عمر رحمہم اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے، یعنی "خَاوِيَةٌ" اس بنا پر کہ "تلك" کی خبر ہے اور ﴿ بُيُوْتُهُمْ ﴾ بدل ہے یا عطفِ بیان۔ یا خبر ہے "تلك" کی اور "خَاوِيَةٌ" دوسری خبر ہے۔[1] ﴿ بِمَا ظَلَمُوْا ﴾ میں حرفِ ما سببیت کے لیے ہے، یعنی ان کے گھر اُن کے ظلم کے سبب سے ویران اور خراب پڑے ہیں۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی بے شک اس ہلاک کرنے میں البتہ ایک بڑی عبرت ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ ﴿ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴾ یعنی اور بچا لیا ہم نے ان کو جو ایمان لائے اور اللہ پاک سے ڈرتے تھے اور اس کے عذاب اور سزا سے خوف کھاتے تھے۔ یہ لوگ صالح علیہ السلام اور اُن کے ساتھ والے ہیں۔ یہ لوگ حضر موت کی طرف نکلے، پھر جب اس میں داخل ہوئے تو صالح علیہ السلام نے وفات پائی۔ اس لیے اس کا نام حضر موت رکھا گیا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: چار ہزار آدمی تھے جو اُن کے ہمراہ تھے، پھر انھوں نے ایک شہر کی بنیاد رکھی، جس کو حاضوراء کہتے ہیں۔[2] پھر اللہ پاک نے لوط علیہ السلام کا قصہ بیان کیا، چنانچہ فرمایا:

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢١٧۔ ٢١٨) فتح القدير (٤/ ١٩٠) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢١٨) فتح البيان (١٠/ ٥٢۔ ٥٥)

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾
اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا
اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾
فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ قُلِ
الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ
اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ ؕ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ
مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا
كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ
يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ؕ

اور (یاد کریں) لوط کو جب اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم بے حیائی (بدکاری) کرتے ہو جب کہ تم دیکھتے ہو (کہ یہ بے حیائی ہے)؟ 54 کیا تم شہوت رانی کے لیے (اپنی) عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس آتے ہو؟ بلکہ تم تو نادان لوگ ہو 55 پھر اس کی قوم کا اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ انھوں نے کہا: آلِ لوط کو اپنی بستی سے نکال دو، کیوں کہ یہ لوگ تو بڑے پاک صاف بنتے ہیں 56 پھر ہم نے اسے اور اس کے اہلِ خانہ کو نجات دی، سوائے اس کی بیوی کے، ہم نے فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہو گی 57 اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) سخت بارش برسائی، تو ڈرائے گئے لوگوں پر (پتھروں کی) بدترین بارش برسائی گئی تھی 58 (اے نبی!) کہہ دیجیے: تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے، اور اس کے ان بندوں پر سلام ہے جنھیں اس نے چن لیا، کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنھیں لوگ شریک ٹھہراتے ہیں؟ 59 (کیا یہ معبودانِ باطلہ بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان سے پانی اُتارا؟ پھر ہم نے اس سے ایسے پر رونق باغ اُگائے جن کے درخت اُگانے کی تمھیں قدرت

نہ تھی، کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ بلکہ (یہ) وہ لوگ ہیں جو (غیر اللہ کو اللہ کے) برابر ٹھہراتے ہیں ﴿60﴾

قوم لوط کا ذکر:

یعنی دیکھتے ہو کہ یہ بدکاری کیسا برا کام ہے۔ سلیمان علیہ السلام کے قصے میں فرمایا کہ ہم ایسے لشکر لائیں گے جن کا سامنا نہ کر سکیں گے۔ وہی بات ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اور مکے والوں میں اور صالح علیہ السلام پر نو شخص متفق ہوئے کہ رات کو حملہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بچایا اور اُن کو کھپایا اور مکے کے لوگ بھی یہی چاہ چکے، لیکن کچھ نہ کر سکے۔ جس رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تھی، کافر لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر گھیرے ہوئے تھے کہ صبح کو اندھیرے میں نکلیں تو سب مل کر مار ڈالیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکل گئے اور اُن کو کچھ نہ سوجھا اور قوم لوط نے چاہا کہ اُن کو شہر سے نکال دیں، یہ بھی چاہ چکے۔ اللہ تعالیٰ نے خود نکلنے کا بتا دیا اور اسی میں کام بنا۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف اور پیغمبر پر سلام بھیج کر اگلی بات شروع کرنی لوگوں کو سکھا دی۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے بندے اور رسول لوط علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو اس بات سے ڈرایا کہ وہ ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہیں، جس کو اُن سے پہلے بنی آدم میں سے کسی نے نہیں کیا، اس بے حیائی کے کام کی وجہ سے اُن پر کہیں اللہ پاک کا عذاب اور سزا اور نقمت نہ نازل ہو۔ وہ خبیث کام اغلام کرنا ہے، یعنی عورتوں کی صحبت چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرنا ہے۔ یہ ایک فاحشۂ عظیم ہے کہ مرد مردوں سے کام نکالیں اور عورتیں عورتوں سے۔ چناں چہ فرمایا: ﴿ اَتَاْتُوْنَ الْفٰحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی کیا تم بے حیائی کرتے ہو اور تمھارا بعض بعض کو دیکھتا ہے۔ ﴿ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ﴾ [العنکبوت: ۲۹] ''اور تم اپنی مجلسوں میں برے کام (بے حیائی) کرتے ہو؟''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴾ یعنی کیا دوڑتے ہو مردوں پر للچا کر عورتیں چھوڑ کر، کوئی نہیں تم ایسے لوگ ہو کہ نہیں پہچانتے کسی شے کو نہ طبیعت کی راہ سے نہ شریعت کی رو سے، جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴾ [الشعراء: ۱۶۵۔ ۱۶۶] ''کیا تم (جنسی تسکین کی خاطر) جہان کے مردوں کے پاس آتے ہو؟ اور تم اپنی بیویاں چھوڑ دیتے ہو، جنھیں تمھارے رب نے تمھارے لیے پیدا کیا ہے، بلکہ تم لوگ حد سے گزرنے والے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ ﴾ یعنی وہ لوگ اس کام کے کرنے سے جس کو تم کرتے ہو اور تم کو

تمھارے کام پر برقرار رکھنے میں حرج سمجھتے ہیں تو تم اپنے درمیان سے ان کو نکال دو، کیوں کہ وہ تمھارے ساتھ رہنے کے لائق نہیں ہیں کہ تمھارے شہر میں بسیں۔ چناں چہ ان کے نکالنے کا ارادہ کیا۔ ﴿ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴾ [محمد: ۱۰] ''اللہ نے انھیں ہلاک کر دیا اور کافروں کے لیے اسی طرح کی سزائیں ہیں۔''

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴾ یعنی پھر نجات دی ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو مگر اس کی عورت کہ مقدر کیا ہم نے اس کو ہلاک ہونے والوں سے اپنی قوم کے ہمراہ، کیوں کہ وہ ان کی مدد گار تھی، ان کے دین اور طریقے پر اس طور پر کہ ان کے افعالِ بد پر راضی تھی۔ اپنی قوم کو لوط علیہ السلام کے مہمانوں کی خبر دے دیا کرتی تھی، تاکہ وہ ان کی طرف آئیں، یہ بات نہ تھی کہ وہ خود ایسا کرتی تھی۔ اس کا بے حیائی کے کام نہ کرنا اللہ کے نبی علیہ السلام کی تعظیم کے لیے تھا، اس کی کرامت و تعظیم کے لیے نہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے انبیاء کے ننگ و ناموس کو محفوظ رکھتا ہے۔ اسی لیے آیا ہے کہ کسی نبی کی بیوی نے زنا نہیں کیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ﴾ أي: ﴿ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴾ [هود: ۸۲۔ ۸۳] ''ان پر کھنگر کے پتھر تہ بہ تہ برسائے۔ جو تمھارے رب کے ہاں سے نشان زدہ تھے۔ اور وہ (پتھر یا سزا یا بستی) ان ظالموں (قریشِ مکہ) سے دور نہیں۔'' نیز اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴾ یعنی پھر کیا برا برساؤ تھا ان ڈرائے گئے لوگوں کا، جن پر حجت قائم ہو چکی اور انذار اُن کی طرف پہنچ چکا۔ پھر انھوں نے رسول کی مخالفت کی اور اس کو جھٹلایا اور اسے اپنے درمیان سے نکال دینے کا ارادہ کیا۔

﴿ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ﴾ اللہ پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرماتا ہے کہ الحمدللہ کہیں، یعنی اللہ پاک کی حمد کریں، اس کی نعمتوں پر جن کا اس نے اپنے بندوں پر انعام کیا ہے، اس کی نعمتیں اتنی ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا، اور ان اعلیٰ صفات اور اسمائے حسنیٰ پر اس کی حمد کریں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ متصف ہے اور حکم فرماتا ہے کہ اللہ کے بندوں پر سلام کریں جن کو اس نے برگزیدہ کیا ہے اور پسند فرمایا ہے، یہ لوگ اس کے رسل کرام اور انبیائے عظام ہیں۔ علیهم من الله سبحانه أفضل الصلاة و أكمل السلام۔

عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے کہ ﴿ عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ﴾ سے انبیاء علیہم السلام مراد ہیں۔[1] یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الصفت: ۱۸۰۔ ۱۸۲] ''آپ کا رب، عزت کا مالک، ان باتوں سے پاک ہے جو وہ (مشرک) بیان کرتے ہیں۔ اور تمام رسولوں پر سلام ہے۔ اور سب تعریفیں اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہیں۔'' امام ثوری اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم ہیں، اسی کے مثل سیدنا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۰۶)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[1] ان دونوں قولوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں، اس لیے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم "عباد الله الذين اصطفى" ہوئے تو انبیاء علیہم السلام تو بطریقِ اولیٰ ان میں سے ہوں گے۔

مقصد یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو اپنے اولیا اور احباب کو نجات دی اور اُن کی نصرت اور مدد فرمائی اور اپنے دشمنوں پر ذلت اور عذاب اور وبال اور قہر نازل فرمایا تو پہلے اس بات کا اپنے رسول ﷺ اور اُن کے متبعین سے ذکر کیا، اس کے بعد اُن کو حکم دیا کہ اللہ پاک کے سارے افعال پر اس کی حمد کریں اور اس کے برگزیدہ اور نیک اور پسندیدہ بندوں پر سلام بھیجیں۔ امام ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے بہ طریقِ سدی عن ابی مالک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ یہ لوگ اصحابِ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کے لیے ان کو برگزیدہ فرمایا ہے[2] -رضي الله تعالىٰ عنهم أجمعين۔

﴿ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ استفہامِ انکاری ہے، مشرک لوگ جو اپنے پوجنے میں اللہ کے ساتھ اور معبود پوجتے ہیں اس بات کا ان پر انکار کیا ہے۔ یعنی کیا اللہ پاک بہتر ہے یا وہ جن کو اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں، ہرگز نہیں اللہ پاک ہی بہتر و برتر ہے، وہی وحدہ لاشریک لہ عبادت کا مستحق ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کیے جانے کے لائق نہیں۔ پھر اللہ پاک نے یہ بیان شروع کیا کہ پیدا کرنے، رزق عطا کرنے اور تدبیر کرنے کے ساتھ وہی متفرد ہے، یعنی وہ اکیلا ہی یہ کام کرتا ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور۔ ان کاموں میں اس کا کوئی شریک اور وزیر نہیں ہے، وہی خالق ہے، وہی رازق ہے، وہی مدبر ہے۔

توحید کے چند ایک دلائل کا بیان:

ارشاد فرمایا: ﴿ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾ بھلا یہ اونچے اونچے صاف و شفاف آسمان کس نے بنائے اور کس نے ان کو گھمایا اور یہ روشن اور چمکتے دمکتے ہوئے چھوٹے بڑے تارے اُن میں کس نے لگائے اور یہ زمین کا وسیع و عریض اور طویل فرش کس نے بچھایا اور اس کو یہ کثافت و دبازت اور جماؤ کس نے دیا اور یہ اونچے نیچے سخت و نرم دشوار گزار پہاڑ کس نے اس میں پیدا کیے اور یہ جنگل و بیابان کس نے بنائے اور یہ طرح طرح کی کھیتیاں کس نے اُگائیں اور یہ گونا گوں درخت کس نے لگائے اور قسم قسم کے پھل اور میوے کس نے پیدا کیے اور اس میں میٹھے اور کھارے دریا کس نے جاری کیے اور انواع و اقسام کے حیوانات جن کی شکلیں مختلف ہیں کس نے پیدا کیے؟ یہ سب اسی ایک ذات پاک وحدہ لاشریک لہ کے بنائے ہوئے ہیں، وہی ان کا خالق، رازق اور مدبر ہے۔

﴿ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾ یعنی اور اتار دیا اس نے تمھارے لیے آسمان سے پانی اور اس کو بندوں کے لیے رزق اور روزی ٹھہرایا، ﴿ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ﴾ یعنی پھر اُگائے ہم نے اس پانی سے باغ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٠٦)
[2] كشف الأستار عن زوائد مسند البزار (٣/ ١٦١)

تروتازہ، خوبصورت، خوش شکل جن کو دیکھنے سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور ہو۔ ﴿ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ﴾ یعنی تم ایسے نہیں ہو کہ اس کے درختوں کو اُگانے کی قدرت رکھو، اس پر تو صرف خالق و رازق ہی قدرت رکھتا ہے، جو صرف اسی اکیلے کا کام ہے اور اسی کا خاصا ہے نہ کہ اس کے سوا اصنام اور شریک یہ کام کر سکتے ہیں، جیسا کہ یہ مشرک لوگ بھی اس کا اقرار کرتے ہیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [الزخرف: ۸۷] ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انھیں کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [العنکبوت: ٦٣] ''اور البتہ تحقیق اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر کس نے زمین کی موت (ویرانی) کے بعد اس پانی سے اسے زندہ (تروتازہ) کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔'' یعنی یہ لوگ خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان سب کاموں کا کرنے والا وہی وحدہ لاشریک لہ ہے۔ پھر وہ اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجتے ہیں، ان چیزوں میں سے جن کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ نہ پیدا کر سکیں نہ رزق دے سکیں، حالاں کہ اس بات کا مستحق کہ تنہا اسی کی عبادت کی جائے وہی ہے، جو اکیلا ہی پیدا کرنے اور رزق دینے میں متفرد ہے۔

اس لیے یوں فرمایا: ﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ یعنی کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے کہ اس کی عبادت کی جائے؟ حالاں کہ تم پر اور ہر عقل والے پر یہ بات کھل گئی ہے کہ خالق و رازق وہی ہے۔ مفسروں میں سے بعض کہتے ہیں کہ ﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ کیا اللہ کے ساتھ کوئی معبود ہے، جس نے یہ کام کیا ہے؟ یہ معنی بھی پہلے معنی کی طرف رجوع ہوتے ہیں، اس لیے کہ جواب کی تقدیر یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہاں ایسا کوئی نہیں ہے، جس نے اس کے ساتھ یہ کام کیا ہو، بلکہ وہی اس کام کے ساتھ متفرد ہے۔ چنانچہ کہا جائے گا، پھر تم اس کے ساتھ اس کے غیر کو کیوں پوجتے ہو، حالاں کہ پیدا کرنے اور رزق دینے اور تدبیر میں تو وہی مستقل و متفرد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ﴾ [النحل: ۱۷] ''بھلا جو (اللہ سب کچھ) تخلیق کرتا ہے، وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو (کچھ بھی) تخلیق نہیں کرتا؟'' اور اس جگہ جو اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾ تو ان سب آیتوں میں ﴿ اَمَّنْ ﴾ کی تقدیر یہ ہے: ''أَمَّنْ يَّفْعَلُ هٰذِهِ الْأَشْيَاءَ كَمَنْ لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْهَا'' یعنی کیا جو شخص یہ چیزیں کرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جو اُن میں سے کسی شے پر قادر نہیں ہے۔ یہ معنی سیاق سے معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ آیت میں دوسرے جملے کا لفظوں میں ذکر نہیں ہوا ہے۔ اس لیے کہ کلام کے انداز اور قوت میں وہ شے ہے جو یہ بات بتاتی ہے اور اللہ پاک یوں فرما چکا ہے: ﴿ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾

پھر دوسری آیت میں یہ فرمایا ہے: ﴿ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴾ یعنی وہ اللہ کے لیے عدیل اور نظیر ٹھہراتے

ہیں اور اسی طرح یہ فرمایا ہے: ﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ﴾ [الزمر: ۹] ”کیا (یہ مشرک بہتر ہے یا وہ) جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے اور قیام کرتے ہوئے عبادت وفرماں برداری کرتا ہے، جبکہ وہ آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی اُمید بھی رکھتا ہے؟“ یعنی کیا وہ شخص جو ایسا ہے اس جیسا ہے، جو ایسا نہیں ہے اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ [الزمر: ۹] ”کہہ دیجیے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہوسکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔“

نیز فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الزمر: ۲۲] ”کیا پھر جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہے، (وہ سخت اور تنگ دل کافر کے برابر ہوسکتا ہے؟) چناں چہ ہلاکت ہے ان کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد کے معاملے میں سخت ہیں، وہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ﴾ [الرعد: ۳۳] ”کیا پھر وہ (اللہ) جو ہر نفس (کے اعمال) پر نگران ہے جو اس نے کمائے۔“ یعنی کیا وہ شخص جو خلق کے افعال پر اور ان کے حرکات وسکنات پر حاضر ہے اور غیب کو جانتا ہے، خواہ وہ جلیل (بڑا) ہو یا حقیر ہو، اس شخص کی طرح ہے جو نہ جانتا ہے نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے، یعنی یہ بت جن کو انھوں نے پوجا ہے اللہ کے سوا۔ اور اسی لیے یہ فرمایا ہے: ﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ ﴾ [الرعد: ۳۳] ”اور انھوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں۔ کہہ دیجیے: ان کے (کمالات اور) نام تو لو۔“ اسی طرح یہ ساری آیاتِ کریمات ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع وضاحت یہ ہے کہ ﴿ وَلُوْطًا ﴾ فعل مقدر سے منصوب ہے اور ﴿ اَرْسَلْنَآ ﴾ پر معطوف ہے: ”أَيْ: وَأَرْسَلْنَا لُوْطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ“ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ ظرف ہے اسی فعل مقدر کا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ظرف ہو ”اُذْكُرْ“ مقدر کا، اور قوم سے مراد اہلِ سدوم ہیں۔ ﴿ اَتَاْتُوْنَ الْفٰحِشَةَ ﴾ فاحشہ سے مراد وہ فعل ہے جو قبح، شناعت اور زشتی میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے، وہ یہی لواطت و اغلام ہے۔ ﴿ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، متضمن ہے تاکیدِ انکار کو اور سخت ڈانٹ کو مفید ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے بھیجا لوط کو۔ یا ذکر کر لوط کا، جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم انتہائی بے حیائی کا کام کرتے ہو اور حالاں کہ تم یقینی طور پر جانتے ہو کہ وہ انتہا درجے کی بے حیائی کا فعل ہے۔ یہ فعل تمھارے سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے کہ تم اس کی برائی کو خوب جانتے ہو پھر اس کے

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۸۶۔ ۴۸۸)

مرتکب ہوتے ہو۔ یہ معنی اس بنا پر ہیں کہ ﴿ تُبْصِرُوْنَ ﴾ بصرِ قلب بہ معنی علم سے ہو، یا بصر بہ معنی نظر ہے، یعنی آنکھ کا دیکھنا، اس لیے کہ وہ لوگ مارے تمرد اور سرکشی کے فاحشہ کرتے وقت ستر نہیں کرتے تھے اور کھلم کھلا اس کو کیا کرتے تھے۔ اس قصے کی تفسیر پورے طور پر سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔

﴿ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ﴾ (خلیل وسیبویہ کا مختار قول تخفیفِ ہمزہ ہے۔) اس میں دوبارہ ڈانٹ کی گئی ہے اس بات کی تصریح کے ساتھ کہ وہ فاحشہ لواطت ہے، جس کو پہلے مبہم ذکر کیا تھا اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا یہ فعل اس قسم سے ہے کہ اس کا بیان، بیان کرنے والے کو عاجز کر دیتا ہے اور وہ اس کی برائی کی حقیقت تک نہیں پہنچتا ہے اور نہ کوئی عقل منداس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اس کام کو کوئی کرتا ہے۔ پھر اس کی یہ علت بیان کی کہ ﴿ شَهْوَةً ﴾ یعنی تم اس فعلِ بد کو صرف خواہش اور لذت کے لیے کرتے ہو۔ اس علت کے بیان کرنے سے غرض یہ ہے کہ ان کو انسانیت کے درجے سے اتار کر جانوروں کے درجے کی طرف لے گئے کہ جس میں نہ اولاد کا ارادہ ہوتا ہے نہ پارسائی کا۔ اس معنی کی بنا پر ﴿ شَهْوَةً ﴾ کا نصب بنا برعلت ہے۔ تقدیر ''لِلشَّهْوَةِ'' ہے، یعنی مفعول لہ ہے ﴿ تَاْتُوْنَ ﴾ کا، یا صفت ہے مصدر محذوف کی۔ ''أَيْ: إِتْيَانًا شَهْوَةً'' یا بہ معنی حال ہے ''أَيْ: مُشْتَهِيْنَ لَهُمْ مِنْ دُوْنِ النِّسَاءِ'' یعنی تم آتے ہو مردوں سے آنا شہوت کا، یا اس حال میں کہ خواہش کرنے والے ہو ان کی، تجاوز کرنے والے ہو عورتوں سے، جو اس کا محل ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے طرفین سے برا کیا۔ فعل اور ترک دونوں میں بدکار و گناہ گار ہوئے۔

﴿ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴾ یعنی تم ایک قوم ہو کہ اس فعل کے حرام ہونے سے جاہل ہو۔ یا اپنے فعل کے انجام سے اور اس گناہ کے عذاب سے ناواقف ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ جہل سے مراد سفاہت اور حماقت ہے جس پر وہ قائم و دائم تھے۔ یا یہ معنی ہیں کہ تم اُن لوگوں کا سا فعل کرتے ہو جو اس کی قباحت کو نہیں جانتے۔ رہی یہ بات کہ ﴿ تَجْهَلُوْنَ ﴾ صفت ہے قوم کی اور لفظ موصوف کا لفظ غائب ہے تو صفت موصوف کے مطابق کیوں نہ ہوئی؟ تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ اور ﴿ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴾ میں غیبت و خطاب دونوں جمع ہوئے، چناں چہ خطاب کو غیبت پر غلبہ دیا گیا، اس لیے کہ خطاب قوی تر اور راسخ تر ہے، کیوں کہ اصل یہ ہے کہ کلام حاضر لوگوں کے درمیان ہو۔ کسی نے یوں کہا: اگرچہ ﴿ تَجْهَلُوْنَ ﴾ ﴿ قَوْمٌ ﴾ کی صفت ہے، لیکن چوں کہ قوم خطاب کی جگہ میں ہے، اس لیے اس کو بصیغۂ خطاب کہا۔

﴿ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ ﴾ کو جمہور نے بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ كَانَ ﴾ کی خبر مقدم ہے اور اسم اس کا ﴿ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا ﴾ ہے۔ امام ابن ابی اسحاق رحمہ اللہ نے برفع ''جَوَابُ'' پڑھا ہے (اس میں حسن رحمہ اللہ بھی شریک

ہیں۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت ضعیف ہے) اس بنیاد پر کہ ﴿ كَانَ ﴾ کا اسم ہے۔ اور خبر اس کی ﴿ إِلَّآ أَنْ قَالُوْٓا ﴾ ہے، یعنی پھر اُن کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ﴿ أَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ﴾ یعنی تم لوط کو اور اس کے اہل کو اپنی بستی سے نکال دو۔ اہل سے مراد اُن کی دو بیٹیاں اور مومن بیوی ہیں۔ اس قول میں قوم نے ان کو اپنے پاس بسانے کا احسان رکھا ہے، اس کی یہ وجہ ہے کہ جب لوط علیہ السلام اپنے چچا ابراہیم علیہ السلام کے ہمراہ بابل کی سرزمین سے شام کی طرف آئے تو ابراہیم علیہ السلام تو فلسطین میں اترے اور لوط علیہ السلام سدوم میں۔ چناں چہ سدوم کے لوگ اُن کی قوم ہوئے اس لحاظ سے کہ وہ اُن کی طرف بھیجے گئے اور اُن کے پاس رہے، اس کے باوجود کہ وہ اجنبی تھے اور اُن میں سے نہ تھے۔

گویا قوم نے ان کو اپنے پاس بسانے کا احسان رکھا کہ ہم نے تو اس کو اپنی بستی میں بسایا اور وہ ہمارے فعل کو برا کہنے لگا تو اس کو نکال دو، وہ یہاں رہنے کے لائق نہیں ہے۔ "قرية" کی اضافت "کُم" کی ضمیر کی طرف جنس کے لیے ہے، اس لیے کہ ان کی بستیاں پانچ تھیں، ان میں سب سے بڑی بستی سذوم تھی۔ اس کو دالِ مہملہ و معجمہ کے ساتھ، یعنی دونوں طرح بولتے ہیں۔ غرضیکہ بعض نے بعض سے کہا کہ ان کو نکال دو۔ پھر اس نکالنے کی وجہ یہ بیان کی: ﴿ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴾ یعنی اس لیے کہ یہ لوگ مردوں کی پیٹھوں سے بچتے ہیں اور باز رہتے ہیں، یہ بات استہزا کے طور پر کہی۔

﴿ فَأَنْجَيْنٰهُ وَأَهْلَهٗٓ ﴾ پھر ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو اس عذاب سے بچا لیا جو اس کی قوم پر واقع ہوا۔ لوط علیہ السلام اپنے اہل کو لے کر ان کی زمین سے نکلے، اللہ پاک نے ان کے لیے زمین کو طے کر دیا، یہاں تک کہ نجات پائی اور ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔ ﴿ إِلَّا امْرَأَتَهٗ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴾ سوائے اس کی عورت کے کہ ہم نے اس کا مقدر عذاب میں باقی رہنے والوں میں سے کیا تھا۔ "قَدَّرْنَا" کے معنی "قَضَيْنَا" ہیں۔ جمہور نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور عاصم نے بہ تخفیف پڑھا ہے۔ اور معنی دونوں کے ایک ہیں، باوجود اس کے کہ لفظ کا اضافہ معنی کے اضافے کی دلیل ہوتا ہے۔[2]

﴿ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ﴾ یعنی جو لوگ ان میں سے ان بستیوں سے خارج تھے، ان پر ہم نے پتھر برسائے، ہر پتھر پر اس پتھر والے کا نام لکھا ہوا تھا، یہ پتھر جلی ہوئی مٹی کے تھے۔ ﴿ مَطَرًا ﴾ کی تاکید اس بات پر دال ہے کہ یہ "مطر" شدید اور یہ برساؤ نئی قسم کا تھا، پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ ﴿ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴾ مخصوص بالذم محذوف ہے۔ "أَيْ: مَطَرُهُمْ" یعنی پھر کیا برا برساؤ ہوا ان لوگوں کا جو ڈرائے گئے۔ چنانچہ انھوں نے نہ سمجھا بوجھا اور نہ ہی انذار (ڈرائے جانے) کو قبول کیا۔ اس سب کا بیان سورۃ الاعراف اور سورۃ الشعراء میں گزر چکا ہے۔ ﴿ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾۔ امام فراء رحمہ اللہ

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٥/ ١٨٣) [2] فتح القدير (٤/ ١٩٢)

نے کہا ہے کہ اہلِ معانی نے کہا ہے کہ لوط علیہ السلام سے کہا گیا کہ تو اُن کے ہلاک ہونے پر الحمد للہ کہہ۔ مفسرین کی ایک جماعت نے اس کا خلاف کیا ہے اور یوں کہا ہے کہ یہ ہمارے نبی ﷺ کو خطاب ہے کہ تو پہلی کافر اُمتوں کی ہلاکت پر الحمد للہ کہہ۔

﴿ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ﴾ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ قرآن شریف نبی اکرم ﷺ پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے ساتھ وہی مخاطب ہیں، مگر وہ شے جس کے معنی صحیح نہ ہوں مگر ان کے غیر کے لیے۔[1] ﴿ عِبَادِهِ ﴾ میں چار قول ہیں: امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انبیاء اور مرسلین مراد ہیں۔ دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الصافات: ۱۸۱] ''اور تمام رسولوں پر سلام ہے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ مراد اصحابِ نبی ﷺ ـرضي الله عنهم أجمعين- ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی اُمت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سابقین و لاحقین کے کل مومنین ہیں۔[2] یہ چار قول ہوئے، امام کرخی رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کیا ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کو عام پر محمول کیا جائے کہ انبیا اور اُن کے متبعین اس میں داخل ہو جائیں۔

نہر میں کہا ہے کہ جب اللہ پاک اس سورت میں اس کے قصوں سے فارغ ہوا تو اپنے رسول ﷺ کو امر فرمایا کہ اللہ پاک کی حمد کریں اور برگزیدہ لوگوں پر سلام بھیجیں، گویا یہ اس خطبے کا شروع ہے، جو آگے آتا ہے۔ اس میں ان دلائل اور براہین کا ذکر ہے جو اللہ سبحانہ کی وحدانیت، علم اور قدرت پر دال ہیں، یعنی ﴿ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ ... الآية ﴾ انتہیٰ۔

اس کا حاصل یہ تعلیم ہے کہ ہر کلام کرنے والا اور منشی ہر ذی شان کام میں سب سے پہلے برکت کے طور پر اللہ پاک کی حمد کرے اور چیدہ و برگزیدہ لوگوں پر سلام بھیجے اور اس کے بعد اپنا مطلب بیان کرے۔ ﴿ آٰللّٰهُ ﴾ میں دو وجہیں ہیں کہ اس جگہ کے سوا اور پانچ جگہ قرآن شریف میں جاری ہوتی ہیں: (ایک تو سورت یونس میں ﴿ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ ﴾ دوسری اور تیسری سورت یونس میں ﴿ آٰلْـٰٔنَ ﴾ دو جگہ، چوتھی اور پانچویں سورۃ الانعام میں ﴿ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ ﴾ دو جگہ۔ قاله الحفناوي) ایک تو تسہیلِ ہمزۂ ثانیہ کی مقصورۃً، دوسرے ہمزۂ ثانیہ کو الف ممدودہ بہ مدِ لازم سے بدلنا، یعنی کیا وہ اللہ جس کے افعال و صفات ذکر کیے گئے جو اس کی عظمت اور قدرت پر دال ہیں۔

﴿ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ بہتر ہے یا وہ بت جن کو وہ اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں؟ اس میں مشرکوں کو تبکیت (سرزنش) ہے اور کفار کے ہلاک کرنے کے بعد اُن پر الزامِ حجت ہے۔ اس سے غرض ان کو ڈانٹنا، دبانا اور عاجز کرنا اور ان پر حجت لازم کرنا ہے کہ دیکھو اللہ پاک تو وہ قدرت والا ہے جس نے یہ کام کیے۔ اتنی اُمتوں کو جو ہر بات میں تم سے بڑھی ہوئی تھیں، رسولوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ہلاک کر ڈالا اور نیست و نابود کر دیا کہ سوائے نام کے کچھ نشان اُن کا باقی نہ رہا۔ تم کہو تمھارے بت جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، انھوں نے کیا کام کیا؟ ان کے

---

[1] تفسير القرطبي (۱۳/ ۲۲۰) [2] تفسير البغوي (٦/ ۱۷۱)

پاس اس کا کچھ جواب نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ باپ دادا کی پیروی کرتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت میں کچھ جواب نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ محض بے حقیقت ہیں، ان سے اپنی مکھیاں تو اڑائی نہیں جاتیں غیر کا کیا بھلا یا برا کریں گے۔ اللہ پاک سے بہتر ہونے کا کیا ذکر ہے!! یہاں جو خیر کا لفظ فرمایا ہے، تو یہ خیریت اپنے اصلی معنی پر نہیں ہے، بلکہ ایسی ہے جیسی اس شعر میں ہے:

أَتَهْجُوْهُ وَلَسْتَ لَهُ بِكُفُوٌ فَشَرُّكُمَا لِخَيْرِكُمَا الْفِدَاءُ

لہٰذا اس آیت میں جو خیر کا لفظ فرمایا ہے تو وہ تہکم (مذاق) کے باب سے ہے، ان کے ساتھ استہزاء کیا ہے، کیوں کہ ان کے بتوں میں تو دراصل کسی طرح کی خوبی اور خیر نہیں ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے کہ عرب لوگ اس طرح بولتے ہیں: "اَلسَّعَادَةُ أَحَبُّ إِلَيْكَ أَمِ الشَّقَاوَةُ" حالاں کہ شقاوت میں اصلاً کوئی خیر نہیں ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: کیا اللہ کا ثواب بہتر ہے یا سزا اس کی جس کو تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو؟ کسی نے کہا ہے کہ یہ بات اُن سے ان کے اعتقاد کی بنا پر کہی ہے، اس لیے کہ وہ اس بات کا اعتقاد رکھتے تھے کہ بتوں کی عبادت میں خیر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس استفہام سے مراد خبر ہے۔ جمہور نے "تُشْرِكُوْنَ" بتائے فوقیہ پڑھا ہے خطاب کی بنا پر۔ امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام ابو عمرو، عاصم اور یعقوب رحمہم اللہ نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کلمۂ "أم" اس کے شروط کے پورے ہونے کی وجہ سے متصلہ عاطفہ ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أَيُّهُمَا خَيْرٌ" یعنی اللہ بہتر ہے یا وہ شے جس کو شریک کرتے ہیں، اور کلمۂ ﴿ خَيْرٌ ﴾ یا تو اسم تفضیل ہے کفار کے زعم کی بنا پر اور الزامِ خصم کی بنا پر، یا صفت ہے اس میں کچھ تفضیل نہیں ہے۔

کلمۂ "ما" بہ معنی "الذي" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مصدریہ ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ پہلے جملے سے مضاف محذوف ہے۔ "أَيْ: تَوْحِيْدُ اللّٰهِ خَيْرٌ أَمْ شِرْكُكُمْ" یعنی اللہ کی توحید بہتر ہے یا تمھارا شرک؟ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ اس شخص کے واسطے بہتر ہے جس نے اس کو پوجا، یا بت اس شخص کے واسطے جس نے ان کو پوجا۔[2] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں مشرکوں کو سرزنش ہے اور اُن کے ساتھ مذاق اور استہزاء ہے، اس لیے کہ انھوں نے بتوں کی عبادت کو اختیار کیا اللہ پاک کی عبادت پر، اور اختیار اسی کو کیا جاتا ہے جس میں زیادہ خیر اور فائدہ خیال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کلام میں ان کو ان کی انتہائی ضلالت اور جہالت سے آگاہ کرنا ہے۔[3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ جس وقت اس آیت کو پڑھتے تو فرماتے: «بَلِ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى وَأَجَلُّ وَأَكْرَمُ»[4]

﴿ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾ میں کلمۂ "أم" منقطعہ ہے، اس لیے کہ یہاں متصلہ ہونے کی شرط

---

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٢٢١) [2] تفسیر الخازن (٥/ ١٥٣) [3] تفسیر الرازي (٢٤/ ١٧٦)

[4] شعب الإیمان (٢/ ٣٧٢۔ ٣٧١) امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف بیان کی ہیں۔

نہیں ہے، وہ شرط یہ ہے کہ ہمزہ اس پر مقدم ہو، اس لیے یہ "أم" بہ معنی "بل" اضرابیہ و ہمزہ استفہامِ توبیخی کے ہے۔ یہ "أم" لکھائی میں اس جگہ اور چار جگہ ما بعد میں متصل لکھا جاتا ہے اور اس کا منفصل لکھنا تحریف ہے۔ (قالہ الحفناوي)۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی تقدیر یہ ہے: "أَآلِهَتُكُمْ خَيْرٌ أَمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَقَدَرَ عَلٰى خَلْقِهِنَّ" یعنی کیا تمھارے معبود بہتر ہیں یا وہ جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے اور ان کے پیدا کرنے پر قادر ہوا؟ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا ان بتوں کا جن کو تم پوجتے ہو پوجنا بہتر ہے یا اس کو پوجنا جس نے عالمِ جسمانی کو پیدا کیا۔ ان معانی کی بنا پر "أم" متصلہ ہوگا اور اس میں توبیخ اور سرزنش کے معنی ہوں گے، جس طرح کہ پہلے جملے میں تھے۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے ﴿ اَمَّنْ ﴾ بہ تخفیفِ میم پڑھا ہے۔

﴿ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾ اور اتار دیا تمھارے لیے ایک قسم کا پانی، یعنی آبِ باراں۔ ﴿ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآىِٕقَ ﴾ پھر ہم نے اس سے باغ اُگا دیے۔ ﴿ حَدَآىِٕقَ ﴾ "حَدِيْقَةٌ" کی جمع ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حَدِيْقَةٌ" وہ باغ ہے جس کے گرد دیوار ہو اور اگر اس کے گرد دیوار نہ ہو تو وہ بستان ہے، حدیقہ نہیں ہے۔ امام قتادہ اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَدَآىِٕقَ ﴾ سے مراد نخل ہیں، یعنی کھجوروں کے باغ۔[1]

﴿ ذَاتَ بَهْجَةٍ ﴾ یعنی حسین منظر اور رونق والے، خوبصورت بارونق۔ بہجت وہ حسن ہے کہ جو اس کو دیکھے تو اس سے خوش ہو۔ جمع کے صیغے سے "ذَوَاتِ بَهْجَةٍ" نہیں فرمایا، اس لیے کہ اس سے مراد باغات کی جماعت ہے۔ کلام کو صیغۂ غائب سے صیغۂ حاضر کی طرف پھیرا، اس لیے کہ اس سے تاکید منظور ہے، مقصد خاص اپنی ذات کے ساتھ فعل کو خاص کرنا اور اس بات کی خبر دینا ہے کہ ایسے باغوں کو جن کی قسمیں اور رنگ اور مزے اور شکلیں مختلف ہیں باوجود اس کے کہ ان کو ایک پانی پلایا جاتا ہے، اس کام پر صرف وہی قدرت رکھتا ہے جو وحدہ لاشریک لہ ہے۔

پھر اس اختصاص کے معنی کو اس قول سے مزین کیا: ﴿ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ﴾ یعنی ان کا اُگانا ہمارا ہی کام ہے۔ تم نہیں ہو کہ ان کے درختوں کو اُگاؤ، ان کے پھل لگانے اور اُن میں باقی عجیب و غریب صفات پیدا کرنے کا کیا ذکر!! مطلب یہ ہے کہ صرف درختوں کا اُگانا ہی تم سے نہیں ہو سکتا تو اُن میں اور جو عجیب قسم کی صنائع، یعنی کاری گریاں ہیں، ان کو تم کیا بنا سکو گے۔ اس نفی کے معنی اس بات سے انکار ہے، یعنی کسی بشر کے لیے یہ کام ممکن اور درست نہیں اور نہ اس سے بن سکتا ہے۔ اس کے مقدور میں داخل نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس سے عاجز ہے کہ کسی شے کو عدم سے وجود کی طرف نکالے۔ اس کا کسی غیر اللہ سے حاصل ہونا، بالکل محال ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرکے فرمایا: ﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ یعنی کیا ہے کوئی معبود اللہ کے ساتھ جس کے بعض افعال کا ذکر ابھی ہو چکا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ قرین کیا جائے اور اس کے لیے عبادت

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٢٢١) فتح القدير (٤/ ١٩٢۔ ١٩٣)

میں شریک ٹھہرایا جائے؟ ہرگز نہیں۔ کسی نے "أَإِلٰهًا" بہ نصب پڑھا ہے، اس تقدیر کے ساتھ: "أَتَدْعُوْنَ إِلٰهًا مَّعَ اللّٰهِ؟" یعنی کیا تم کسی معبود کو اللہ کے ساتھ پکارتے ہو؟ استفہامِ انکاری ہے، یعنی اس کے ساتھ کوئی معبود نہیں ہے، اسی طرح آیندہ چار جگہ میں بھی استفہامِ انکاری ہے۔

پھر ان کی زجر و توبیخ سے اعراض کر کے ان کے حالِ بد کا بیان کرنے کی طرف توجہ فرمائی، اس طرح کہ صیغۂ حاضر سے صیغۂ غائب کی طرف التفات کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ یہ ایک قوم ہیں کہ اللہ کے ساتھ اس کے غیر کو برابر کرتے ہیں، یا حق سے باطل کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ خطاب کے بعد ﴿ بَلْ هُمْ ﴾ فرمانا، ان کی رائے کے غلط ہونے کا بڑا ثبوت اور اظہار ہے، مطلب یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر مبالغہ ہے۔ (محاورے میں یہی ہے کہ جب کسی کی رائے کی غلطی بتانا منظور ہوتا ہے تو پہلے اس سے مخاطب ہو کر بات چیت کرتے ہیں اور اس پر دلائل قائم کرتے ہیں، پھر اس کی طرف سے منہ پھیر کر غیر سے اس کا حال بیان کرتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ وہ خطاب کے قابل نہیں۔) پھر اللہ پاک نے زمین کے احوال سے اور جو اشیا روئے زمین پر ہیں، ان کے احوال سے استدلال شروع کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۶۱﴾

(کیا یہ بت بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جس نے زمین ٹھہرنے کے لائق بنائی، اور اس کے درمیان نہریں بنائیں اور اس کے لیے اس نے پہاڑ بنائے، اور دو سمندروں کے درمیان آڑ رکھی؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) الٰہ ہے؟ (نہیں!) بلکہ ان کے اکثر علم نہیں رکھتے (61)

بہترین قرار گاہِ زمین کے فوائد کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا ﴾ بھلا کس نے کیا زمین کو قرار پکڑنے والی ساکن و ثابت، یعنی ٹھہری ہوئی جمی ہوئی کہ نہ جھکتی ہے نہ ہلتی ہے اپنے لوگوں کو لے کر اور نہ اُن کو لے کر کانپتی ہے، کیوں کہ اگر وہ کانپتی رہتی تو کوئی ذی حیات اس پر زندگی نہ بسر کر سکتا اور نہ اس کا جینا خوش گوار ہوتا، بلکہ اللہ پاک نے اپنے فضل و رحمت سے اس کو ایک ایسا جما ہوا فرش بنایا ہے کہ نہ ہلتا ہے نہ ڈولتا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ

[1] فتح البیان (۱۰/ ۵۵۔ ۵۹)

صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ﴾ [المؤمن: ٦٤] ''اللہ وہ ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے قرارگاہ اور آسمان کو چھت بنایا اور اس نے تمھاری صورتیں بنائیں تو بہت اچھی صورتیں بنائیں اور اس نے تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا ﴾ اور اس کے رخنوں اور دراڑوں میں شیریں اور پاک پانی کی ندیاں بنائیں اور اس میں اُن کو پھاڑا اور گردش دی، ان میں سے کچھ بڑی ہیں، کوئی چھوٹی اور کوئی اوسط درجے کی اور اُن کو اپنے بندوں کی بہتری اور ضرورت کے مطابق مشرق اور مغرب اور جنوب و شمال میں جاری کیا ان کی اقلیموں اور طرفوں میں۔ زمین کے اطراف میں جس جگہ ان کو پیدا کیا ان کی روزی ان کی حاجت کے مطابق ان کی طرف کھینچ لایا۔

﴿ وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ ﴾ اور اس میں اونچے اونچے پہاڑ رکھے، تاکہ زمین کو جمائیں اور ثابت رکھیں، تاکہ ان کو لے کر ہل نہ جائے۔ ﴿ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ﴾ یعنی اور میٹھے اور کھارے پانی کے درمیان آڑ رکھی، تاکہ ان کو خلط ملط ہونے سے روکے، تاکہ یہ اس سے اور وہ اس سے خراب نہ ہو جائے، اس لیے کہ اللہ کی حکمت کا یہی تقاضا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صفت پر باقی رہے، جو اس سے مقصود ہے، کیوں کہ شیریں دریا تو یہی ندیاں ہیں، جو لوگوں کے درمیان بہہ رہی ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ شیریں ہوں حیوان اُن میں سے پئیں اور سبزیوں اور پھلوں کو ان سے پانی دیا جائے اور کھاری دریا وہ ہیں جو زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ کھاری اور کڑوے ہوں، تاکہ زمین کی بدبودار چیزوں سے ہوا خراب نہ ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَّجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٥٣] ''اور وہی (اللہ) ہے جس نے دو سمندر ملائے، یہ بہت لذیذ و شیریں ہے (پیاس بجھانے والا) اور یہ بہت کڑوا کھاری ہے، اور اس نے ان دونوں کے درمیان ایک پردہ اور مضبوط آڑ رکھی۔'' اور اسی لیے یہ فرمایا ہے: ﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ یعنی کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے، جس نے یہ کام کیے یا اس کی عبادت کی جائے قولِ اول اور آخر کی بنا پر اور دونوں باہم ایک دوسرے کو لازم ہیں اور صحیح ہیں۔ ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی ان میں سے اکثر جو اپنے پوجنے میں اس کے غیر کو پوجتے ہیں، جانتے نہیں ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ کہ ﴿ قَرَارًا ﴾ سے مراد مستقر ہے، یعنی زمین کو پھیلایا اور برابر کیا اور ایسا کر دیا کہ انسانوں اور جانوروں کو اس پر قرار مل سکے، اس طریقے سے کہ زمین کے بعض حصے کو پانی سے خالی کر دیا، اس حالت کے مطابق جس پر ان کے فائدے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ جملہ ﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا ﴾ اور اس کے بعد کے

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٨٨)

تین جملے ﴿ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾ سے بدل ہیں۔ اس قول کی طرف کوئی شے مجبور کرنے والی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اس قول کے قائل ہونے کی ضرورت ہو، بلکہ یہ جملہ اور اس کا مابعد وہ اضراب و انتقال ہے تقریع اور توبیخ سے ساتھ اس کے ماقبل کی طرف تقریع و توبیخ کے دوسری شے کے ساتھ۔

﴿ وَجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا ﴾ ﴿ جَعَلَ ﴾ بہ معنی خلق ہے، یا بہ معنی "صَیَّرَ"۔ پہلے کی بنا پر ﴿ خِلٰلَهَآ ﴾ ظرف ہوگا متعدی بیک مفعول، اور دوسرے کی بنا پر مفعولِ ثانی ہوگا اور مفعولِ اول ﴿ اَنْهٰرًا ﴾ ٹھہرے گا۔ اول کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ اجزائے زمین کے درمیان نہریں پیدا کر دیں۔ دوسری کی بنا پر یہ معنی ہوں گے کہ نہریں اس کے وسط میں کر دیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے پہلے معنی کو اختیار کیا ہے۔[1] "خلال" بہ معنی وسط ہے۔ اس کی تحقیق اللہ تعالیٰ کے اس قول کے تحت گزر چکی ہے: ﴿ وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴾ [الکھف: ٣٣] "اور ان کے درمیان ہم نے ایک نہر بہائی۔"

﴿ وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ ﴾ یعنی اس کے لیے جمے ہوئے پہاڑ بنا دیے کہ اس کو روکیں اور حرکت کرنے سے باز رکھیں۔ ﴿ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ﴾ بحرین سے مراد میٹھے اور کھارے دریا ہیں، یعنی ان کے درمیان اپنی قدرت سے ایک معنوی مانع بنا دیا، وہ مانع اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس لیے کہ وہاں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں جو محسوس ہو، چناں چہ مشاہدے میں اسی طرح ہے، پس ان میں کا ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں ہوتا ہے۔ نہ تو شیریں کھارے کو متغیر کرتا ہے اور نہ کھارا شیریں میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا بیان سورۃ الفرقان میں گزر چکا ہے۔[2]

﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ یعنی جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ اس پر سوائے اللہ پاک کے کوئی اور قدرت نہیں رکھتا تو آیا کوئی ایسا معبود موجود ہے کہ اس جیسا کام کرتا ہے اور اس جیسی خلق پیدا کرتا ہے؟ ہرگز نہیں، پھر وہ کیوں کر اس کے ساتھ ایسی چیز کو شریک کرتے ہیں، جو نہ ضرر دیتی ہے اور نہ نفع پہنچاتی ہے؟! ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ اُن کے اکثر لوگ اپنے رب کی توحید کو نہیں جانتے اور نہ ہی اس کی سلطنت اور غلبہ قدرت کو پہچانتے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے انسان کی حاجت کے ساتھ استدلال کیا کہ عام طور پر انسان اللہ پاک کا محتاج ہے۔[3] چناں چہ ارشاد فرمایا:

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾

(کیا یہ بت بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جو مجبور و لاچار کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے، اور وہ اس کی تکلیف دور کر دیتا ہے، اور وہ تمھیں زمین میں جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ تم کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو (62)

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٥٠٢) [2] رقم الآية (٥٣) [3] فتح البيان (١٠/ ٦٠ ـ ٦١)

مشکل کشا حاجت روا ایک خدا ایک خدا!:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس بات سے آگاہ فرماتا ہے کہ سختیوں کے وقت جس کو پکارتے ہیں اور جو حادثات کے وقت موجود ہوتا ہے، وہ وہی اللہ پاک کی ذات ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧] ''اور جب سمندر میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ جنھیں تم اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہو، گم ہو جاتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ﴾ [النحل: ٥٣] ''پھر جب تمھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم آہ و فغاں کرتے ہو۔'' اسی طرح یہاں فرمایا ہے: ﴿ أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ ﴾ یعنی وہ کون ہے کہ مضطر اور بے قرار صرف اسی کی طرف پناہ لیتا ہے اور اس کے سوا کوئی ضرر رسیدہ لوگوں کے ضرر کو دور نہیں کرتا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ابو تمیمہ ہُجیمی سے روایت کیا ہے وہ بلہجیم کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں، کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ کس طرف بلاتے ہیں؟ فرمایا: میں اللہ وحدہ کی طرف بلاتا ہوں کہ اگر تجھے کوئی ضرر پہنچے، پھر تو اس کو پکارے تو وہ تجھ سے دور کر دے اور وہ ہے کہ اگر تو کسی بیابان زمین میں اپنی سواری کو گم کر دے، پھر تو اس کو پکارے تو وہ اسے تمھاری طرف پھیر لائے اور وہ ہے کہ اگر تجھے قحط سالی پہنچے، پھر تو اسے پکارے تو وہ تیرے واسطے کھیتی اُگا دے۔ کہا: میں نے عرض کی: آپ مجھے وصیت فرمائیں۔ فرمایا کہ کسی کو گالی مت دے اور نیک کام میں بے رغبتی مت کر، اگرچہ یہ کہ تو اپنے بھائی سے ملے: « وَأَنْتَ مُنْبَسِطٌ إِلَيْهِ وَجْهَكَ » یعنی اس حال میں کہ تو ہشاش بشاش اور کشادہ پیشانی والا ہو اور اگرچہ یہ ہو کہ تو اپنے ڈول میں سے پانی مانگنے والے کے برتن میں ڈال دے اور اپنا تہ بند آدھی پنڈلی تک باندھ، پھر اگر تو نہ مانے تو دونوں ٹخنوں تک باندھ لے اور تو تہ بند کو لٹکانے سے بچ، کیوں کہ تہ بند کا لٹکانا خیلہ میں سے ہے، یعنی تکبر سے اور اللہ خیلہ کو دوست نہیں رکھتا۔[1]

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے اس کو بوجہ دیگر روایت کیا ہے، اس میں صحابی کا نام بھی ذکر کیا ہے، یعنی جابر بن سلیم ہجیمی رضی اللہ عنہ، کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ ایک چادر سے گوٹ مارے ہوئے تھے اور اس کا ہدب آپ ﷺ کے دونوں قدموں پر پڑا ہوا تھا، (یعنی اس کا پلو وہ کنارہ جو خوبصورتی کے لیے بغیر بنے ہوئے چھوڑ دیا جاتا ہے)، پھر میں نے کہا: تم میں سے محمد رسول اللہ ﷺ کون ہے؟ آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اپنی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں جنگل والوں سے ہوں اور مجھ میں ان کی جفا یعنی سختی اور درشتی ہے، چنانچہ آپ مجھے وصیت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھ، اگرچہ تو اپنے بھائی سے کشادہ چہرہ، یعنی خندہ پیشانی سے ملے اور اگرچہ تو اپنے ڈول میں سے مانگنے والے کے برتن میں تھوڑا پانی ڈال دے اور اگر کوئی تجھے اس چیز کے ساتھ گالی دے جو وہ تجھ میں جانتا ہے تو تو اسے اس چیز کی گالی نہ دے جو تو اس میں جانتا ہے، چنانچہ بے شک

[1] مسند أحمد (٥/ ٦٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١١٠٩)

اس میں ایسا ہوگا کہ تیرے لیے تو اس کا اجر ہوگا اور اس پر اس کا گناہ ہوگا اور تہ بند کو لٹکانے سے بچ، بے شک تہمد کا لٹکانا مخیلہ ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ مخیلہ کو دوست نہیں رکھتا اور تو کسی کو گالی مت دے۔

پھر میں نے اس کے بعد کسی کو گالی نہیں دی اور نہ بکری کو گالی دی نہ اونٹ کو۔ امام ابو داود اور نسائی رحمہما اللہ نے اس حدیث شریف کے کئی طریق روایت کیے ہیں۔[1] "وَعِنْدَهُمَا طَرَفٌ صَالِحٌ مِنْهُ" یعنی ان دونوں کتابوں میں یہ حدیث اس قدر تفصیل سے نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک معتد بہ ٹکڑا اور اس کا اکثر مضمون ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبیداللہ بن ابی صالح رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ طاؤس رحمہ اللہ مجھ پر میری عیادت کرنے کے لیے داخل ہوئے تو میں نے اُن سے کہا: اے ابوعبد الرحمان! تم میرے لیے دعا کرو۔ (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: "فَقُلْتُ لَهُ: أُدْعُ اللّٰهَ لِيْ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، فَقَالَ: أُدْعُ لِنَفْسِكَ... إلخ" اس پر محشی مصر نے لکھا ہے: "قَوْلُهُ: أُدْعُ اللّٰهَ لِيْ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، فَقَالَ: أُدْعُ... الخ. فِيْ نُسْخَةٍ: أُدْعُ اللّٰهَ لِيْ، قَالَ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ! أُدْعُ... إلخ انتهىٰ مصححه" اس سے غرض یہ ہے کہ ایک نسخے میں کلمہ "قال" زائد ہے، سہو کاتب سے زیادہ ہو گیا ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ طاؤس جلیل القدر تابعی ہیں، چالیس حج کیے، مستجاب الدعوۃ تھے۔ ۱۰۶ھ میں انتقال فرمایا۔ رحمه الله) اس پر وہ بولے کہ تو اپنے نفس کے لیے خود دعا کر، بے شک وہ پہنچتا ہے پھنسے ہوئے کی پکار کو، جبکہ وہ اس کو پکارتا ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا: میں نے کتاب اول میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "بِعِزَّتِيْ أَنَّهُ مَنِ اعْتَصَمَ بِيْ فَإِنْ كَادَتْهُ السَّمٰوٰتُ بِمَنْ فِيْهِنَّ وَالْأَرْضُ (اصل میں اسی طرح ہے۔ شاید "الْأَرْضُوْنَ" ہو۔ یا مراد ارض سے جنس ہو) بِمَنْ فِيْهِنَّ فَإِنِّيْ أَجْعَلُ لَهُ مِنْ بَيْنِ ذٰلِكَ مَخْرَجًا، وَمَنْ لَّمْ يَعْتَصِمْ بِيْ فَإِنِّيْ أَخْسِفُ بِهِ مِنْ تَحْتِ قَدَمَيْهِ الْأَرْضَ، فَأَجْعَلُهُ فِي الْهَوَاءِ، فَأَكِلُهُ إِلٰى نَفْسِهِ"[2] یعنی مجھے اپنی عزت کی قسم ہے! بے شک جو شخص مجھے مضبوطی سے تھام لے، پس اگر مکر کریں اس کے ساتھ آسمان اور جو اُن میں ہیں اور زمین ہمراہ اُن کے جو اُن میں ہیں تو بے شک میں اس کے لیے اس کے درمیان میں سے نکلنے کی راہ پیدا کر دوں گا، اور جو شخص مجھے مضبوطی سے نہ تھامے تو بے شک میں اس کو اس کے قدموں کے نیچے سے دھنسا دوں گا زمین میں، پھر اس کو ہوا میں کروں گا، پھر اس کو اس کے نفس کے سپرد کر دوں گا۔

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ایک شخص کے ترجمے میں ذکر کیا ہے۔ امام ابوبکر محمد بن داود دینوری معروف دقی صوفی نے اس شخص سے حکایت کی ہے۔ اس شخص نے کہا ہے کہ میں دمشق سے زبدانی شہر تک اپنے خچر کرائے پر دیتا تھا، ایک دفعہ ایک شخص میرے ساتھ سوار ہوا، پھر ہم کسی ایسی راہ سے گزرے، جو ویران تھی، اس پر کوئی آمد و رفت نہ

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٨٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٤٨٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١١٠٩)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٠٩ـ ٢٩١٠)

تھی تو اس شخص نے کہا کہ تو اس راہ پر چل، کیوں کہ وہ قریب تر ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس میں تجربہ نہیں تو وہ بولا: بلکہ وہ قریب تر ہے۔ پھر ہم اس راہ میں چلے تو ایک دشوار گزار جگہ پر پہنچے اور ایک گہری وادی میں اور اس میں بہت سے لوگ قتل کیے ہوئے پڑے تھے۔ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ خچر کا سر پکڑ، یہاں تک کہ میں اتروں۔ پھر وہ اترا اور دامن سمیٹا اور اپنے کپڑے اپنے اوپر جمع کیے اور ایک چھری ننگی کی جو اس کے پاس تھی اور میرا قصد کیا تو میں اس کے آگے بھاگا اور وہ میرے پیچھے لگا تو میں نے اسے اللہ کی قسم دلائی اور کہا کہ تو خچر لے لے اور اس کا سامان بھی جو اس کے اوپر ہے۔ اس نے کہا کہ وہ تو میرا ہی ہے، میں تو تجھے قتل کرنا چاہتا ہوں۔ پھر میں نے اس کو اللہ سے اور اس کی سزا سے ڈرایا تو وہ نہ مانا، پھر میں اس کے آگے مطیع اور فرماں بردار ہو گیا اور میں نے کہا: اگر تو مناسب سمجھے تو مجھے چھوڑ دے، یہاں تک کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ کہا: جلدی کر، پھر میں نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا تو قرآن مجھ پر بند ہو گیا، اس سے مجھے ایک حرف بھی نہ آیا، میں کھڑا ہو کر حیران رہ گیا اور وہ کہہ رہا ہے: آ فارغ ہو۔

پھر اللہ نے میری زبان پر یہ آیت جاری کر دی: ﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ ﴾ پس اچانک ایک سوار آ گیا وادی کے سوارخ میں سے، اس کے ہاتھ میں ایک برچھی تھی، اس نے اس شخص کو مارا تو وہ نشانے پر لگی اس کے دل کے، یعنی اس کے دل ہی پر لگی تو پچھڑا ہوا گر پڑا۔ پھر میں اس سوار سے لپٹ گیا اور میں نے کہا: قسم ہے اللہ کی! تو کون ہے؟ کہا کہ میں اس ذات کا بھیجا ہوا ہوں جو پھنسے ہوئے کی پکار کو پہنچتا ہے، جب وہ اس کو پکارتا ہے اور دور کرتا ہے برائی کو۔ پھر میں نے خچر کو اور اس بوجھ کو جو اس پر لادا ہوا تھا لیا اور صحیح سالم لوٹ آیا۔[1]

قصہ ایک مجاہد کا:

اور میں نے ترجمۂ فاطمہ بنت الحسن ام احمد عجلیہ میں ذکر کیا، (یہ قول ابن عساکر رحمہ اللہ کا ہے) کہا: کسی غزوے میں ایک دن کفار نے مسلمانوں کو ہزیمت دی، ایک عمدہ گھوڑا اپنے مالک کو لے کر کھڑا ہو گیا، یہ شخص خوش حال اور صالح لوگوں میں سے تھا تو اس نے اس گھوڑے سے کہا: تجھے کیا ہو گیا ہے تیری خرابی ہو! میں نے تو تجھے ایسے ہی دن کے لیے تیار کیا تھا تو گھوڑے نے کہا: مجھے کیا ہے کہ میں قصور نہ کروں جب کہ حال یہ ہے کہ تو تو دانہ اور چارہ سائیسوں کے سپرد کرتا ہے، وہ مجھ پر ظلم کرتے ہیں، مجھے تھوڑا سا کھلاتے ہیں۔ مالک نے کہا: تیرے لیے مجھ پر اللہ کا عہد ہے کہ آج کے بعد میں تجھے اپنی گود میں چراؤں گا، (یعنی اپنے روبرو کھلاؤں گا) پھر اس وقت وہ چل نکلا اور اس کے مالک نے نجات پائی۔ اس کے بعد وہ شخص اس کو اپنے سامنے کھلاتا تھا۔ یہ خبر لوگوں میں مشہور ہو گئی، لوگ اس کا قصد کر کے آنے لگے، تا کہ اس سے یہ خبر سنیں۔ شاہِ روم کو یہ خبر پہنچی تو اس نے کہا: وہ شہر ظلم نہیں کیا جاتا جس میں یہ آدمی ہوتا ہے۔ اس نے حیلہ اور تدبیر کی، تا کہ اس کو اپنے شہر میں حاصل کرے۔ اس کے پاس مرتدوں میں سے ایک

[1] تاریخ دمشق (٦٨/ ٢٥١۔ ٢٥٢)

شخص تھا، اس کو اس شخص کی طرف بھیجا۔ پھر جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس سے یہ بات ظاہر کی کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس کی نیت اچھی ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ عہد لے لیا اور خوب پختگی کر لی، پھر ایک دن وہ دونوں نکلے، دریا کے کنارے کنارے جا رہے تھے، ایک اور شخص شاہِ روم کی طرف سے تھا، اس سے اس مرتد نے وعدہ کیا تھا، تاکہ اس کو قید کرنے میں باہم ایک دوسرے کی مدد کریں، جب ان دونوں نے اسے گھیر لیا کہ اسے پکڑیں تو اس نے اپنی آنکھ آسمان کی طرف اٹھائی اور کہا: "اَللّٰھُمَّ إِنَّهُ إِنَّمَا خَدَعَنِيْ بِكَ فَاكْفِنِيْهُمَا بِمَا شِئْتَ" یعنی الٰہی! اس نے تو مجھے تیرے نام کے ساتھ دھوکا دیا ہے تو ان دونوں سے میری کفایت کر، جس چیز کے ساتھ تو چاہے۔ کہا: پھر دو درندے نکلے اور اُن دونوں کو پکڑ لیا اور وہ شخص صحیح سالم لوٹ آیا۔[1]

خلافتِ ارضی کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ﴾ یعنی اللہ پاک خلیفہ کرتا ہے ایک قرن کو اس قرن کے لیے جو اس سے پہلے ہو چکا ہے اور خلف کو سلف کا خلیفہ کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴾ [الأنعام: ١٣٣] ''اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے، اور تمھارے بعد جنھیں چاہے جانشین بنا دے، جیسے اس نے تمھیں دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ ﴾ [الأنعام: ١٦٥] ''اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض پر اونچے درجے عطا کیے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ﴾ [البقرة: ٣٠] ''اور (یاد کرو) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

یعنی میں کرنے والا ہوں زمین میں ایک قوم کہ بعض ان کا بعض کا خلیفہ ہو گا، جس طرح کہ اس کی تقریر ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اسی طرح یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ﴾ یعنی پیدا کرے گا ایک امت کو بعد ایک اُمت کے اور ایک گروہ کو ایک گروہ کے بعد اور ایک قوم کو ایک قوم کے بعد اور اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی وقت میں ایجاد کر دیتا اور بعض کو بعض کی ذریت سے نہ کرتا، بلکہ اگر چاہتا تو اُن کو سب کے سب پیدا فرما دیتا، جس طرح کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور اگر چاہتا تو اُن کو بعض کی ذریت بعض سے کرتا، لیکن کسی کو نہ مارتا، یہاں تک کہ سب کی وفات ایک وقت میں ہوتی۔ پس زمین اُن سے تنگی کرتی اور ان کی روزی اور کسب ان پر تنگ ہو جاتے اور بعض کو بعض سے ضرر پہنچتا، لیکن اس کی حکمت اور قدرت کا تقاضا ہوا کہ ان کو ایک نفس سے پیدا کرے۔ پھر ان کو بہت زیادہ تعداد میں کر دے اور اُن کو کر دے قرون بعد قرون کے اور اُمتیں بعد اُمتوں کے، یہاں تک کہ اجل پوری

[1] تاریخ دمشق (٧٠/ ٩)

ہو جائے اور مخلوق فارغ ہو جائے، جس طرح کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو مقدر فرمایا ہے اور جس طرح کہ ان کا شمار کیا ہے اور ایک ایک کو گن رکھا ہے۔ پھر قیامت قائم کرے گا اور ہر عامل کو اس کے عمل کی پوری جزا دے گا، جبکہ کتاب اپنی اَجل کو پہنچے گی۔ اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ﴾

﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ یعنی کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے جو اس پر قدرت رکھتا ہے؟ یا کوئی معبود ہے جو اللہ کے ساتھ پوجا جائے؟ حالاں کہ یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ان کاموں کے کرنے کے ساتھ صرف اللہ وحدہ لاشریک ہی متفرد ہے، اس کا ہرگز کوئی شریک نہیں ہے۔ ﴿ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی کیا ہی کم ہے ان کا نصیحت پذیر ہونا، اس بات میں جو اُن کو حق کی طرف ہدایت کرتی ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف انھیں راہ بتاتی ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان ہے کہ "مضطر" "اضطرار" سے اسم مفعول ہے۔ "اضطرار" افتعال کے وزن پر ہے ضرورت سے۔ ضرورت وہ حاجت ہے، جو پناہ لینے کی طرف نیاز مند کرنے والی ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "اِضْطَرَّهٗ إِلٰى كَذَا" یعنی فلاں کو فلاں شے کی طرف مضطر اور نیاز مند کیا۔ اور مضطر وہ کرب اور تکلیف میں مبتلا شخص ہے جس کو تکلیف اور کرب، بے قراری اور سختی پہنچی ہے کہ نہ تو اس سے نکل سکتا ہے نہ اس پر صبر کر سکتا ہے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا پورا پورا مصداق ہو رہا ہے، عجب قسم کی سخت آزمایش میں مبتلا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مضطر سے مراد مذنب ہے، یعنی کون پہنچتا ہے گناہ گار کی پکار کو، جب وہ استغفار کرے اور اپنے گناہ کی بخشش مانگے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد مظلوم ہے، یعنی کون پہنچتا ہے اس شخص کی پکار کو، جو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے اور اپنی کوئی نیکی نہیں پاتا، سوائے توحید کے اور وہ اس سے ایک بڑے خطر پر ہے۔ کسی نے کہا: مضطر وہ شخص ہے کہ اس کو کوئی ضرر اور گزند پیش آیا ہے۔ فقر یا بیماری سے، یا روزگار کے حادثات میں سے کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ تو اس نے اس کو اس طرف مضطر کیا ہے کہ اللہ پاک کے سامنے گڑگڑائے اور زاری کرے۔

﴿ اَلْمُضْطَرَّ ﴾ میں الف لام جنسی ہے، استغراقی نہیں ہے، اس لیے کہ بعض مضطرین کی دعا کبھی قبول نہیں ہوتی، کسی ایسی بات کی وجہ سے جو دعا کی قبولیت سے مانع ہوتی ہے، کسی ایسے سبب سے جسے بندہ وجود میں لاتا ہے اور وہ اس کے اور اس کی دعا کی قبولیت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ ورنہ بے شک اللہ تعالیٰ مضطر کی دعا کو قبول کرنے کا ضامن ہو چکا ہے، جب کہ وہ اس کو پکارے اور وہ اپنی ذاتِ مقدس سے اس کی خبر دے چکا ہے۔ مضطر کی دعا کو قبول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اضطرار جو اس کو حاصل ہوا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کے سوا سے بے نیازی اور اخلاص

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۸۸۔ ۴۹۰)

پیدا ہوتا ہے اور اللہ پاک اس بات کی خبر دے چکا ہے کہ وہ ﴿ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ [البينة: ٥] کی دعا قبول فرماتا ہے گو وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔

چناں چہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴾ [یونس: ٢٢] ''حتی کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انھیں (سواروں کو) پاکیزہ (موافق) ہوا کے ساتھ لیے چلتی ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں، تو اچانک ان (کشتیوں) پر طوفانی ہوا آ پہنچتی ہے اور لہریں ان پر ہر طرف سے امڈ آتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک وہ (طوفان میں) گھیر لیے گئے ہیں (تو اس وقت) خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے ہوئے اسے پکارتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس (طوفان) سے نجات دی تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے۔'' دیکھو اللہ پاک نے ان کی ضرورت کے وقت اُن کی دعا اُن کے اخلاص کی بدولت قبول کی، باوجود اس کے کہ اس کو خوب علم ہے اس بات کا کہ وہ پھر اپنے شرک کی طرف رجوع کریں گے۔

﴿ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ ﴾ یعنی اور دور کرتا ہے سوء کو۔ ''سُوْء'' سے مراد وہ شے ہے جو بندے کو بری لگتی ہے بغیر تعین کے، کوئی سی چیز ہو۔ کسی نے کہا: ''سُوْء'' سے مراد نقصان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جور وظلم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک برائی کو دور کر دیتا ہے۔ وہ کوئی سی برائی ہو انسان سے، خواہ وہ مضطر ہو یا غیر مضطر۔ اس صورت میں عطف عام کا خاص پر ہوگا۔ مضطر کا خاص کر اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ حاجت مند ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کا زیادہ تر اہتمام ہے۔

﴿ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر قرن کو خلیفہ کرتا ہے اس قرن کا جو اس سے پہلے تھا، اس کے منقرض ہونے کے بعد، یعنی اس کے گزر جانے کے بعد، یعنی یہ کہ ایک قرن کو ہلاک کرتا ہے اور دوسرے قرن کو پیدا کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ تمھاری اولاد کو تمھارا خلیفہ کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کا خلیفہ کرتا ہے۔ مسلمان کافروں کی زمین اور شہروں میں اترتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ تم کو زمین میں جنوں کا خلیفہ کیا ہے۔

﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ یعنی کیا کوئی اور معبود ہے اس اللہ پاک کے ساتھ جو تم کو ایسی ایسی بڑی نعمتیں عطا کرتا ہے۔ ﴿ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ کلمۂ ''ما'' زاید ہے واسطے تقلیل قلیل کے، یہ بالکل نہ ہونے کا کنایہ ہے، پس مراد ان کے ذکر کرنے کی بالکل نفی ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی ذکر کرنے کی نفی ہے۔ قلت کا استعمال نفی کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی تم بہت ہی کم نصیحت پذیر ہوتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بالکل نصیحت پذیر نہیں ہوتے، باوجود

اس کے کہ تم پر ایسی ایسی کھلی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ جمہور نے صیغۂ مخاطب کی بنا پر بتائے فوقیہ پڑھا ہے۔ امام ابوعمرو، ہشام اور یعقوب رحمہ اللہ نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے بنا بر خبر بہ نظر ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ کے۔[1]

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۶۳

(کیا یہ بت بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جو تمھیں خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ دکھاتا ہے اور جو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے بشارت والی ہوائیں بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ اللہ ان سے بلند و بالا ہے، جنھیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں (63)

ستاروں اور ہواؤں کے فوائد:

یعنی کون راہ بتاتا ہے تم کو جنگل اور دریا کی تاریکیوں میں آسمانی اور زمینی دلیلوں سے جو پیدا کی گئی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾ [النحل: ١٦] ''اور (دیگر) نشانیاں (بنائیں) اور تاروں سے بھی لوگ راہ پاتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٩٧] ''اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے، تاکہ تم ان کے ذریعے سے خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ پاؤ، تحقیق ہم نے اپنی آیتیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو علم رکھتے ہیں۔'' رحمت سے مراد بادل ہے، جس میں پانی ہوتا ہے، اللہ پاک اس سے فریاد رسی فرماتا ہے اپنے بندوں کی، جو قحط زدہ اور ذلیل و ناامید ہو رہے ہیں۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: کون ارشاد کرتا ہے اور کون تم کو اندھیری راتوں میں راہ بتاتا ہے، جب تم سفر کرتے ہو، جنگل میں یا دریا میں تمھارے مقاصد کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ خشکی کے ظلمات سے مراد وہ صحرا اور بیابان ہیں جن میں کوئی علامت اور نشانی نہیں ہوتی اور ظلماتِ بحر سے مراد لجج بحار ہیں، یعنی دریاؤں اور سمندروں کی گہرائیاں، ان کی تشبیہ ظلمات سے اس لیے دی ہے کہ ان میں وہ چیز نہیں ہے جس سے راہ پائیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم کو رات میں تاروں سے راہ بتاتا ہے اور دن میں علاماتِ زمین سے۔ اس جگہ رحمت سے مراد مطر ہے، یعنی وہ ہوائیں جو مطر کے آگے اور اس کے نزول سے پہلے آتی ہیں، یعنی بارش برسنے سے پہلے۔ ﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ یعنی کیا کوئی الٰہ اللہ

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٢٢٥) فتح البیان (١٠/ ٦١۔ ٦٢) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٩٠)

کے ساتھ یہ کام کر سکتا ہے اور اس کو وجود میں لا سکتا ہے؟ ﴿ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی اللہ منزہ، متقدس، پاک اور برتر ہے، اس شے کے وجود سے جس کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٦٤﴾

(کیا یہ بت بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جو مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے لوٹائے گا، اور وہ جو تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) الٰہ ہے؟ کہہ دیجیے: اگر تم سچے ہو تو اپنی کوئی دلیل لے آؤ (64)

اللہ تعالیٰ کی کامل قدرت کے دلائل کا بیان:

یعنی وہی اپنی قدرت و سلطان سے خلق کو شروع میں بناتا ہے، پھر اس کو دہراتا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿١٢﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴾ [البروج: ١٢۔ ١٣] ”بے شک آپ کے رب کی پکڑ نہایت سخت ہے۔ بے شک وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ [الروم: ٢٧] ”وہی ہے جو اول بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ تو اس پر بہت ہی آسان ہے۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان و زمین سے بارانِ آسمان کے ساتھ جس کو وہ اتارتا ہے، اور زمین کی برکات کے ساتھ جس کو وہ اُگاتا ہے، تمھیں رزق دیتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿١١﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴾ [الطارق: ١١۔ ١٢] ”قسم ہے بار بار بارش برسانے والے آسمان کی۔ اور پھٹنے والی زمین کی۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ﴾ [الحديد: ٤] ”وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا۔ وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے، اور جو چیز آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے۔“

اللہ تبارک و تعالیٰ آسمان سے بابرکت پانی اتارتا ہے، پھر اس کو چلاتا ہے زمین میں چشموں کی صورت میں، پھر اس کے سبب سے زمین سے طرح طرح کی کھیتیاں اور قسم قسم کے میوے اور پھول اور اس کے سوا اور کئی قسم کی

چیزیں نکالتا ہے۔ ﴿ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴾ [طٰهٰ: ٥٤] ''تم کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ، بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔'' اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ یعنی کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے، جس نے یہ کام کیا؟ اس کے بعد یہ فرمایا: ﴿ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ﴾ یعنی تو کہہ کہ تم اس شے کی صحت پر جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کہ اور معبودوں کی بھی عبادت ہے، اپنی دلیل لاؤ۔ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو۔ حالاں کہ یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ان کے پاس نہ کوئی حجت ہے نہ کوئی برہان۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۚ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ١١٧] ''اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو یقیناً اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، بے شک کافر فلاح نہیں پائیں گے۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ وہ لوگ اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ اللہ پاک خالق ہے، لہٰذا ان کو اعادے کا الزام دیا، یعنی جبکہ وہ ابتدا پر قادر ہے تو اعادے پر تو بطریقِ اولیٰ قادر ہوگا۔ آسمان سے روزی دینا پانی کے ساتھ ہے اور زمین سے روزی دینا روئیدگی کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کیا وہ بہتر ہے جو یہ سارے کام کرتا ہے یا وہ جس کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو، ان چیزوں میں سے جو ان کاموں میں سے کسی شے پر قدرت نہیں رکھتا۔ کیا کوئی اور معبود اللہ کے ساتھ ہے جس کو تم اس کا شریک ٹھہراؤ؟ تم اس بات پر اپنی عقلی یا نقلی دلیل لاؤ کہ اللہ پاک کا کوئی شریک ہے۔ یا اس پر کوئی حجت لاؤ کہ وہاں کوئی ایسا کاریگر ہے جو اس کی کاریگری کی مثل بنا سکتا ہے، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی معبود ہے اور اشیائے مذکورہ میں سے کوئی شے اس نے بنائی ہو۔ اس میں کفار کو سرزنش ہے اور ان کے ساتھ استہزاء ہے۔ نبی کریم ﷺ سے کفار نے قیامت قائم ہونے کا وقت پوچھا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:[2]

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

کہہ دیجیے: آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی بھی غیب (کی بات) نہیں جانتا، اور وہ (خودساختہ معبود) تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ (قبروں سے) کب اُٹھائے جائیں گے (65) بلکہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٩٠۔ ٤٩١) [2] فتح البیان (١٠/ ٦٢)

آخرت کے بارے میں ان کا علم ختم ہو چکا، بلکہ وہ آخرت کے متعلق شک میں ہیں، بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں ﴿66﴾

عالم الغیب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے:

آخرت کے بارے میں عقل دوڑا کر تھک گئے، اس کی حقیقت نہ پائی، کبھی شک کرتے ہیں، کبھی منکر ہوتے ہیں۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے رسول ﷺ کو اس بات کا حکم دیتا ہے کہ ساری خلق کو یہ بات بتا دیں کہ آسمان و زمین والوں میں سے غیب کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے۔ ﴿ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ میں استثناء منقطع ہے، یعنی اس کو کوئی نہیں جانتا، مگر اللہ عزوجل، کیوں کہ اس کے ساتھ وہی وحدہ لا شریک لہ متفرد ہے، جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ”اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (چھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو؟“ نیز فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ [لقمان: ٣٤] ”بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے جو (ماؤں کے) پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ خوب جاننے والا، خوب باخبر ہے۔“ اس بارے میں آیتیں بہت زیادہ ہیں۔

﴿ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ یعنی جو مخلوقات آسمانوں اور زمینوں میں رہتی بستی ہیں، ان کو قیامت کے وقت کی خبر نہیں ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ﴾ [الأعراف: ١٨٧] ”وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری (حادثہ) ہوگی۔ وہ (قیامت) تمھارے پاس بس اچانک ہی آئے گی۔“ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی ہیں: جس شخص نے یہ زعم کیا کہ نبی اکرم ﷺ اس شے کو جانتے ہیں جو کل ہوگی تو یقیناً اس نے اللہ پر ایک بڑا بہتان لگایا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو یوں فرماتا ہے: ﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾[1]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٧) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩١٣)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے تو ان تاروں کو تین کاموں کے بنایا ہے: ان کو آسمان کے لیے زینت بنایا، اور انھیں اس لیے بنایا کہ ان سے راہ ملے اور ان کو بنایا کہ شیطانوں کے لیے مار ہو۔ پھر جو کوئی اُن میں ان کے سوا غور وخوض کرے تو یقیناً وہ اپنی رائے کا قائل ہوا اور چوک گیا اپنے حصے سے اور اپنے حصے کو ضائع کیا اور اس شے کا تکلف کیا جس کا اس کو علم نہیں ہے اور بے شک کچھ لوگ جو اللہ پاک کے امر سے جاہل ہیں، ان لوگوں نے ان تاروں سے کہانت نکال لی ہے، یعنی جو شخص فلاں فلاں تارے میں شادی کرے تو ایسا ایسا ہو اور جو کوئی فلاں فلاں تارے میں سفر کرے تو ایسا ایسا ہو اور جو کوئی فلاں فلاں تارے میں پیدا ہو تو ایسا ایسا ہو۔ مجھے قسم ہے (اصل لفظ "وَلَعَمْرِيْ" ہے، یہ لفظ قسم میں مستعمل ہوتا ہے، موحد آدمی جب اس کلمے کے ساتھ قسم اٹھائے گا تو اس کی مراد خالقِ عمر ہوگی)، میرے خالقِ عمر کی! کوئی تارا نہیں ہے، مگر اس میں پیدا کیا جاتا ہے سرخ رنگ کا اور کالے رنگ کا اور چھوٹے قد کا اور لمبے قد کا اور خوبصورت اور بدصورت اور نہیں ہے علم اس تارے کا اور اس دابہ کا اور اس پرندے کا کچھ بھی غیب سے۔ اللہ پاک اس بات کا حکم جاری کر چکا ہے کہ وہ لوگ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں وہ غیب کو نہیں جانیں گے، اس کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ ﴿ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾[1] (رواه ابن أبي حاتم عنه بحروفه و هو كلام جليل متين صحيح)

قولہ تعالیٰ: ﴿ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی منتہی ہوگیا ان کا علم اور اس کے وقت کی معرفت سے عاجز ہوگیا۔ اور لوگوں نے یوں پڑھا ہے: "بَلْ أَدْرَكَ عِلْمُهُمْ" یعنی برابر ہوا علم ان کا اس میں، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا جب اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کا وقت پوچھا تھا: جس شخص سے اس کا پوچھا گیا، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، یعنی اس کے دریافت کرنے میں سائل اور مسئول کا علم برابر ہے عاجزی میں۔ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ اِدّٰرَكَ ﴾ بہ معنی "غَابَ" ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی "بِجَهْلِهِمْ بِرَبِّهِمْ، يَقُوْلُ: لَمْ يَنْفُذْ لَهُمْ عِلْمٌ فِي الْآخِرَةِ" "ان کے اپنے رب سے جاہل ہونے کے سبب، یعنی یہ لوگ اللہ سے ناواقف ہونے کے باعث آخرت کے بھی منکر ہیں کہ ان کا علم آخرت تک پہنچتا ہی نہیں۔" ایک قول ہوا۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے عن عطاء الخراسانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "حِيْنَ لَمْ يَنْفَعِ الْعِلْمُ" اسی کے امام عطاء خراسانی اور سدی رحمہما اللہ قائل ہیں[2] کہ ان کا علم مدرک و کامل نہ ہوگا، مگر قیامت کے دن جبکہ وہ ان کو نفع نہ دے گا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [مریم: ۳۸] "وہ لوگ کیا ہی خوب سننے والے اور کیا ہی خوب دیکھنے والے ہوں گے، جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے! لیکن آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں۔" سفیان نے عن عمرو بن عبید عن الحسن سے روایت کیا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۱۳)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۸)

ہے کہ وہ یوں پڑھتے تھے: "بَلْ أَدْرَكَ عِلْمُهُمْ" کہا: بلکہ مضمحل ہو گیا ان کا علم دنیا میں جب کہ آخرت کا معاینہ کیا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ﴾ ضمیر ﴿ هُمْ ﴾ راجع ہے طرف جنس کے اور مراد کافر لوگ ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴾ [الكهف: ٤٨] "اور وہ آپ کے رب کے سامنے صف بستہ پیش کیے جائیں گے (کہا جائے گا:) یقیناً تم ہمارے پاس (ایسے) آئے ہو، جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا، بلکہ تم سمجھتے تھے کہ ہم تمھارے لیے وعدے کا کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے۔" "أَيْ: اَلْكَافِرُوْنَ مِنكُمْ" (ظاہر یہ ہے کہ "اَلْكَافِرُوْنَ مِنكُمْ" ﴿ زَعَمْتُمْ ﴾ کے مخاطبین کا بیان ہے۔) اسی طرح یہاں فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ﴾ یعنی وہ لوگ اس کے وجود اور واقع ہونے میں شک کرنے والے ہیں۔ ﴿ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ وہ بڑی جہالت اور نابینائی میں ہیں، اس کے حال اور شان سے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جو مخلوقات آسمانوں اور زمین میں موجود اور ثابت، سکونت پذیر اور قرار پذیر ہیں، یعنی فرشتے، جن اور انسان، ان میں سے کوئی بھی غیب نہیں جانتا ہے، وہ غیب جو صرف اللہ پاک ہی کے علم کا خاصا ہے اور جس کے ساتھ صرف اللہ پاک ہی مستاثر و مستبد و مستقل ہے۔ ﴿ إِلَّا اللّٰهُ ﴾ کا استثناء منقطع ہے اور ﴿ إِلَّا ﴾ بہ معنی "لٰكِنْ" ہے، یعنی لیکن اللہ اس کو جانتا ہے۔ ﴿ إِلَّا ﴾ کا ما بعد تمیمی کی لغت کی بنا پر مرفوع ہے، جس طرح کہ اس مصرع میں ہے ؎

إِلَّا الْيَعَافِيْرُ وَإِلَّا الْعِيْسُ

کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَعْلَمُ ﴾ کا فاعل ﴿ إِلَّا ﴾ کا ما بعد ہے اور کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ اس کا مفعول ہے اور ﴿ الْغَيْبَ ﴾ ﴿ مَنْ ﴾ سے بدل ہے۔ تقدیر یہ ہے: "لَا يَعْلَمُ غَيْبَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا اللّٰهُ" یعنی جو لوگ آسمان و زمین میں ہیں ان کے غیب کو اور جو چیزیں ان میں واقع ہوتی ہیں، ان کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ استثناء متصل ہے کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ سے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ اتصال کا تقاضا ہے کہ اللہ پاک "مَنْ فِيهِمَا" میں سے ہو اور یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ إِلَّا اللّٰهُ ﴾ ﴿ مَنْ ﴾ سے بدل ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ إِلَّا ﴾ کا ما بعد صرف اس لیے مرفوع ہوا ہے کہ اس کا ما قبل جحد یعنی نفی ہے، جیسے یہ قول ہے: "مَا ذَهَبَ أَحَدٌ إِلَّا أَبُوكَ"۔ یہ قول بھی امام زجاج رحمہ اللہ کے قول کی طرح ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے اس کو نصب دیا ہے تو بنا بر استثناء نصب دیا ہے۔[3]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩١٤_ ٢٩١٥) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٩١_ ٤٩٢) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٢٥_ ٢٢٦)

﴿ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ میں ضمیر کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ کی طرف راجع ہے۔ مختار یہی ہے اس لیے کہ کلام کا سیاق ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کا حال بیان کرنے کے لیے ہے۔ کسی نے کہا: ضمیر کفار کی طرف پھرتی ہے، یعنی کفارِ مکہ وغیرہم، اس لیے کہ اس سے پہلے بہت سی آیتیں انہیں کی توبیخ کے لیے ذکر کی گئی ہیں۔ کلمۂ ﴿ اَيَّانَ ﴾ مرکب ہے "أَيّ" اور "أَنْ" سے، لیکن عدمِ ترکیب اصل ہے۔ کلمۂ ﴿ اَيَّانَ ﴾ سے استفہام زمان کا ہوتا ہے مثل "مَتَی" کے، مگر اس کا استعمال تفخیم کے مواضع میں ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴾ [القيامة: ٦] "پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا۔" سلمی نے "إِيَّانَ" بکسر ہمزہ پڑھا ہے۔ یہ بنی سلیم کی لغت ہے۔ غرضیکہ ﴿ اَيَّانَ ﴾ منصوب ہے ﴿ يُبْعَثُوْنَ ﴾ سے اور معلق ہے ﴿ يَشْعُرُوْنَ ﴾ کا۔ چنانچہ یہ اور اس کا ما بعد محلِ نصب میں ہے بنا بر نزعِ خافض، تقدیر یہ ہے: "وَمَا يَشْعُرُوْنَ بِوَقْتِ بَعْثِهِمْ" معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین والے یا کفارِ مکہ وغیرہم نہیں جانتے کہ کب قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

﴿ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ جمہور نے ﴿ اِدّٰرَكَ ﴾ پڑھا ہے، اس کی اصل تدارک ہے، حرفِ تا کو دال میں ادغام کیا ہے اور ہمزۂ وصل اس لیے لائے ہیں کہ ابتداء ساکن سے ممکن ہو۔ ابو جعفر، ابن کثیر، ابو عمرو اور حمید رحمہ اللہ نے "بَلْ أَدْرَكَ" پڑھا ہے "إِدْرَاكٌ" سے۔ عطاء بن یسار، سلیمان بن یسار اور اعمش رحمہم اللہ نے "بَلَ ادَّرَكَ" پڑھا ہے فتحِ لامِ "بل" وتشدیدِ دال۔ امام ابن محیصن رحمہ اللہ نے "بَلْ أَأَدْرَكَ" بنا بر استفہام۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو رجا، شیبہ، اعمش اور اعرج رحمہم اللہ نے "بَلَى إِدَّارَكَ" باثباتِ یای تحتیہ در "بَلْ" و ہمزۂ قطعی و تشدیدِ دال۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے "بَلْ تَدَارَكَ" پڑھا ہے۔[1]

آیت کے معنی یہ ہیں: "بَلْ تَكَامَلَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ" یعنی ان کا علم آخرت میں کامل ہوگا، اس لیے کہ جس شے کا ان کو وعدہ دیا گیا تھا اس سب کو دیکھیں گے اور اس کا معائنہ کرلیں گے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "تَتَابَعَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ"۔ دوسرے کے یہ معنی ہیں کہ "كَمُلَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ مَعَ الْمُعَايَنَةِ"، یعنی ان کا علم آخرت میں معائنہ کے ساتھ کامل ہوگا۔ اور یہ اس وقت ہوگا کہ علم اُن کو نفع نہ دے گا اس واسطے کہ وہ دنیا میں تکذیب کرنے والے تھے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کی بنا انکار کے معنی پر مبنی ہے۔ اس پر بعد کی آیت سے استدلال کیا ہے: ﴿ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴾ یعنی اُن کے علم نے آخرت کے علم کو دریافت نہ کیا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "بَلْ ضَلَّ وَغَابَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ"، یعنی بلکہ ان کا علم آخرت کے بارے میں کھو گیا اور غائب ہوگیا۔ لہٰذا ان کے لیے اس میں کچھ علم نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے چار قول مروی ہیں: ایک یہ ہے: "بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ حِيْنَ لَا يَنْفَعُ الْعِلْمُ"۔ دوسرا یہ ہے: "لَمْ يُدْرِكْ عِلْمُهُمْ"۔ تیسرا یہ ہے کہ

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٢٦) فتح القدير (٤/ ١٩٥)

انھوں نے اس کو بہ ہمزۂ استفہام پڑھا ہے۔ چوتھا یہ ہے: ''بَلْ غَابَ عِلْمُهُمْ''۔[1] تیسری قراءت کے معنی پہلی کے مثل ہیں، اس لیے کہ ''افتعل'' و ''تفاعل'' کبھی ایک معنی کے لیے آتے ہیں۔ چوتھی قراءت انکار کے معنی میں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک اچھی وجہ ہے۔ گویا اس کو مکذبین کی طرف بطور استہزاء کے متوجہ کیا ہے۔

﴿ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ﴾ یعنی بلکہ وہ آج دنیا میں آخرت کے بارے میں شک میں ہیں۔ پھر اس سے اس شے کی طرف رخ پھیرا جو اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ چناں چہ فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ وہ آخرت سے اندھے ہیں۔ لہٰذا اس کے دلائل سے کسی شے کا ادراک نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے کہ جن بصیرتوں سے دلائل کا ادراک ہوتا ہے، وہ بینائیاں مختل ہو رہی ہیں، یعنی ان میں خلل واقع ہو گیا ہے۔ ﴿ عَمُوْنَ ﴾ ''عم'' کی جمع ہے۔ ''عم'' وہ ہے جو دل کا اندھا ہو۔ مراد آخرت کے بارے میں اُن کی جہالت کا بیان کرنا ہے ایسے طور پر کہ جو چیزیں آخرت کے علم کی طرف پہنچاتی ہیں، ان میں کسی شے کی طرف بھی راہ یاب نہیں ہوتے ہیں۔ چناں چہ جس شخص نے کہا ہے کہ پہلی آیت کا یہ معنی ہے کہ ان کا علم معاینہ کے ساتھ کامل اور مکمل ہوا تو پھر ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ ﴾ کو اس حالت پر محمول کیا جائے کہ جس پر وہ دنیا میں تھے، اور جس شخص نے کہا ہے کہ آیت کے پہلے حصے کے معنی ان کے ساتھ استہزا ہے اور اُن کے لیے سرزنش ہے تو ﴿ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ ... الخ ﴾ کو مقید کرنے کی حاجت نہ ہو گی کہ اسے ان کی دنیا کی حالت کے ساتھ ہی مقید کیا جائے۔ اس تقریر سے ان آیتوں کے معنی اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ بیان تو فتح القدیر اور فتح البیان کا تھا،[2] لیکن باوجود اس کے ویسی وضاحت نہیں ہوئی جیسی چاہیے تھی۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ امام محلی، بیضاوی اور نسفی رحمہم اللہ سے خوب وضاحت کر دی جائے، تا کہ آیت کا مضمون اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔ فی نفسہٖ آیتِ کریمہ اس کی قراءت کے اختلاف کے ساتھ مشکل ہے۔

امام محلی رحمہ اللہ نے دو قراءتیں ذکر کی ہیں، ایک تو ''أَدْرَكَ'' بہ وزن ''أَكْرَمَ'' اور دوسری ''اِدَّارَكَ'' بہ تشدید دال، اس کی اصل تدارک ہے حرفِ تا کو دال سے بدل کیا اور دال کو دال میں ادغام کیا، ہمزۂ وصل شروع میں لایا گیا، تا کہ ابتدا بالساکن ممکن ہو اور ﴿ بَلْ ﴾ بہ معنی ''هَلْ'' ہے استفہامِ انکاری کے لیے۔ پہلے کے معنی یہ ہیں: آیا، پہنچا اور لاحق ہوا۔ دوسرے کے یہ معنی ہیں: آیا، متتابع ہوا اور متلاحق ہوا،[3] ان کا علم ساتھ آخرت کے، یہاں تک کہ اس کے آنے کے وقت کا سوال کیا۔ بات یوں نہیں ہے، یعنی آخرت کا علم ان کو حاصل نہیں ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اس کی تصدیق نہ کی اور نہ اس کا اعتقاد کیا، بلکہ وہ تو اس سے شک میں ہیں، بلکہ وہ تو اس سے اندھے ہیں۔ اندھے پن سے مراد دل کا اندھا پن ہے، (یعنی دل کی آنکھوں میں خلل کی وجہ سے آخرت

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩١٤) الدر المنثور (٦/ ٣٧٤)
[2] فتح القدیر (٤/ ١٩٤۔ ١٩٥) فتح البیان (١٠/ ٦٣۔ ٦٥)
[3] تفسیر الجلالین (١/ ٥٠٢)

کے دلائل کا ادراک نہیں کر پاتے۔) اس جملے میں اول جملے سے زیادہ تر مبالغہ ہے۔ ﴿ عَمُوْنَ ﴾ اصل میں "عَمِیُوْن" ہے حرفِ یا پر ضمہ ثقیل تھا۔ اس کو منتقل کر کے میم کو دیا اس کے کسرے کے حذف کے بعد۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ فِيْ ﴾ میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ فِيْ ﴾ اپنے معنی پر ہے، یعنی ظرفیت۔ اور ﴿ اِدّٰرَكَ ﴾ اگرچہ لفظ میں ماضی ہے، لیکن معنی کے لحاظ سے مستقبل ہے، اس لیے کہ وہ آیندہ قطعاً ہونے والا ہے، جس طرح کہ ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ ﴾ میں ہے۔ اس بنا پر کلمۂ ﴿ فِيْ ﴾ ﴿ اِدّٰرَكَ ﴾ سے متعلق ہو گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ فِيْ ﴾ با کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر خود ﴿ عِلْمُهُمْ ﴾ سے متعلق ہو گا۔ جیسے: "عِلْمِيْ بِزَيْدٍ كَذَا" ہے۔ الحاق کے معنی ہیں: در رسیدن اور تتابع کے معنی ہیں: پیا پے شدن۔ غرضیکہ امام محلی رحمہ اللہ نے ایک نہایت آسان راہ اختیار کی ہے، وہ یہی ہے کہ ﴿ بَلْ ﴾ کو بہ معنی "ھل" کہا ہے، ان کے سوا اور مفسرین نے دشوار گزار راہ لی ہے، وہ یہ ہے کہ ﴿ بَلْ ﴾ کو اپنے اصلی معنی پر رکھا جائے، یعنی اضراب و انتقال کرنا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے یہی راہ اختیار کی ہے۔ امام نسفی رحمہ اللہ نے بھی یہی قراءتیں ذکر کی ہیں، کہا ہے کہ ﴿ اِدّٰرَكَ ﴾ بہ معنی "اِنْتَهٰى" و "تَكَامَلَ" ہے۔ اس محاورے سے ماخوذ ہے: "أَدْرَكَتِ الْفَاكِهَةُ" جب میوہ پورا پک جاتا ہے اس وقت یوں بولتے ہیں اور ﴿ اِدّٰرَكَ ﴾ کے معنی ہیں "اِسْتَحْكَمَ" یعنی کامل اور مستحکم ہوا ہے، ان کا علم آخرت کی حالت اور معنی میں۔ مطلب یہ ہے کہ بے شک ان کو اس بات کے ساتھ استحکام اور تکاملِ علم کے اسباب حاصل ہو چکے ہیں کہ قیامت ہونے والی ہے اور وہ اس کی معرفت پر قدرت دیے گئے ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ شک کرنے والے ہیں اور جاہل اور نادان بنے ہوئے ہیں۔ یہ مضمون ہے ﴿ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴾ کا۔

اور تینوں اضراب ان کے احوال کی تنزیل کے لیے ہیں، یعنی ان کے احوال کے درجے بیان کرنے کے لیے ہیں اور ان کی جہالت اور نادانی کو دہرانے کے لیے ہیں۔ پہلے تو اُن کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ ان کو بعث کے وقت کی خبر نہیں ہے، پھر یہ وصف کہ وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ قیامت ہونے والی ہے۔ پھر یہ بات کہ وہ شک وشبہہ کرنے میں خبطی ہیں اور اس خبط کو زائل نہیں کرتے، حالاں کہ انھیں اس کو دور کرنے کی طاقت ہے۔ پھر ان کا سب سے برا وصف بیان کیا کہ وہ اندھے ہیں اور آخرت کو اُن کے اندھا ہونے کا مبتدا و منشا ٹھہرایا، اسی لیے ﴿ عَمُوْنَ ﴾ کو کلمۂ "مِنْ" سے متعدی کیا، جو ابتدائے غایت کے لیے آتا ہے۔ اس کو کلمۂ "عَنْ" سے متعدی نہیں کیا جو مجاوزت کے لیے ہے۔ مطلب یہ کہ ان کے اندھے پن کا منشا و مبتدا آخرت ہے، اس لیے کہ ان کو آخرت اور جزا کے کفر اور انکار ہی نے غور وفکر کرنے سے روکا ہے۔

پہلے اللہ پاک نے یہ بات بیان فرمائی کہ وہی وحدہ لا شریک لہ علمِ غیب کے ساتھ مختص ہے اور بندوں کو غیب کی کسی شے کا علم نہیں ہے۔ اس کے بعد مشرکوں کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ بعث کا انکار کرتے ہیں، باوجود اس کے

کہ اس کا علم رکھنے کے اسباب مستحکم ہیں اور اس کی معرفت حاصل کرنے کی قدرت اُن کے پاس ہے۔ ان دو مضمونوں کی مناسبت یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے یہ بات ذکر کی کہ بندے غیب نہیں جانتے اور یہ اُن کی عاجزی اور علم کی کمی کا بیان ہوا تو اس کے ساتھ یہ بات بیان کر دی کہ ان کے پاس تو اس سے بھی زیادہ عاجزی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو چیز ہونے والی ہے اس کا ہونا ضروری ہے، وہ ہوئے بغیر نہ رہے گی، یعنی ان کے اعمال کی جزا ملنے کا وقت۔ ایسی پکی اور یقینی شے کو کہتے ہیں کہ نہ ہوگی، باوجود اس کے کہ اس کے واقع ہونے کی معرفت حاصل کرنے اور اس کا علم مستحکم ہونے کے اسباب ان کے پاس موجود ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا عاجزی ہوگی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ معنی ہوں کہ ان کے علم کے مستحکم اور مکمل ہونے کا وصف مذاق کے طور پر کیا ہو، جس طرح کہ کوئی بہت ہی بڑا جاہل ہو اور اس کو استہزا کے طور پر کہیں کہ ”مَا أَعْلَمَكَ“، یعنی تو تو کیا بڑا عالم ہے۔

اسی طرح یہاں فرمایا ہے: ﴿بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ یعنی بلکہ ان کا علم آخرت کے بارے میں کامل و مستحکم ہوا ہے۔ یہ اس انداز سے ہے کہ انھوں نے اس میں شک کیا اور اس کے ثابت ہونے سے اندھے ہوئے جو ایک طریقہ شروع سے چلا آ رہا ہے کہ لوگ اسے جانتے ہیں تو اس کا کیا ذکر کہ اس کے واقع ہونے کے وقت کو جانیں پہچانیں، جس کی معرفت کی کوئی راہ ہی نہیں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ادّٰرَكَ﴾ بہ معنی ”اِنْتَهَى وَفَنِيَ“ ہو۔ یعنی آخرت کے بارے میں ان کا علم ختم اور فانی ہوگیا۔ یہ معنی اس محاورے سے لیے گئے ہیں: ”أَدْرَكَتِ الثَّمَرَةُ“ یعنی میوہ منتہی و فانی ہوگیا، کیوں کہ میوے کا پک جانا اس کی وہ انتہا ہے کہ اس کے نزدیک وہ ختم ہو جاتا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے اس کی یہ تفسیر فرمائی ہے: ”اِضْمَحَلَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ“ یعنی آخرت کے بارے میں ان کا علم مضمحل ہوگیا ہے۔ تیسری قراءت ”تَدَارَكَ“ ہے۔ اس محاورے سے ماخوذ ہے: ”تَدَارَكَ بَنُوْ فُلَانٍ“ یہ اس وقت بولتے ہیں، جب قبیلے کے لوگ یکے بعد دیگرے ہلاک ہو جائیں۔[1]

امام بیضاوی رحمہ اللہ کی تقریر بھی اسی کے لگ بھگ ہے اور کئی قراءتیں زیادہ ذکر کی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ کسی نے ”بَلْ ءَأَدْرَكَ“ پڑھا ہے دو ہمزہ کے ساتھ۔ دوسری ”آ أَدْرَكَ“ بادخالِ الف درمیان ہر دو ہمزہ۔ تیسری ”بَلْ أَتدَارَكَ“۔ چوتھی ”بَلَى أَدْرَكَ“۔ پانچویں ”بلیٰ آأَدْرَكَ“، چھٹی ”أَمْ تَدَارَكَ“۔ ساتویں: ”أَمْ أَدْرَكَ“۔ ان میں سے جس میں صریح استفہام ہے یا متضمن ہے، جیسے ”أم“ تو وہ انکار ہے۔ ”أم“ یہاں منقطعہ ہے متصلہ نہیں ہے، اس کے معنی ”بل“ اور ہمزۂ انکار کے ہیں اور جس میں ”بلیٰ“ ہے تو وہ اثبات ہے ان کے شعور کا اور ادراک کے ساتھ شعور کی تفسیر ہے، جو ”بلیٰ“ کے بعد واقع ہے بطور تہکم و استہزا کے اور ما بعد اس کا اضراب ہے تفسیر سے، یعنی تہکم سے، مفسر سے نہیں ہے، یعنی شعور سے، کیوں کہ وہ اپنے حال پر باقی ہے، یہ اضراب اس لیے ہے کہ شعور کی نفی میں

[1] تفسير النسفي (٣/ ٢٢٠۔ ٢٢١)

مبالغہ ہو اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ آخرت کے بارے میں ان کا شعور یہ ہے کہ وہ اس میں شک کرنے والے ہیں، بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں۔ یا ان کے شعور کا رد اور انکار ہے تو اس صورت میں مفسر، یعنی شعور سے اضراب (پھرنا) ہوگا اور اس کا انکار ہوگا۔[1] بالجملہ جب اللہ پاک نے یہ بات ذکر کی کہ مشرک لوگ بعث کے بارے میں شک میں ہیں اور اس کے دلائل میں نظر کرنے سے نابینا ہو رہے ہیں تو چاہا کہ جو ان کا انتہائی درجے کا شبہہ ہے، اس کو بیان کر دے، وہ مردوں کو مٹی ہو جانے کے بعد زندہ کرنے کو بعید جاننا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿٦٧﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِىْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

اور کافروں نے کہا: کیا جب ہم اور ہمارے آباء و اجداد مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں (پھر قبروں سے) نکالا جائے گا؟ 67 بلاشبہ ہمیں اور اس سے پہلے ہمارے آباء و اجداد کو بھی یہ وعدے دیے جاتے رہے ہیں، لیکن یہ تو محض پہلے لوگوں کے افسانے ہیں 68 کہہ دیجیے: تم زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟ 69 اور (اے نبی!) آپ ان پر غم نہ کریں اور نہ ہی جو وہ مکر و فریب کر رہے ہیں (اس پر) تنگ دل ہوں 70

کفار کا حیات بعد الممات کا انکار اور اس کا جواب:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مشرکوں میں سے جو لوگ بعث کے منکر ہیں، اللہ پاک ان کے بارے میں خبر دیتا ہے، انھوں نے جسموں کے دوبارہ زندہ ہونے کو بعید سمجھا ہے ان کی ہڈیاں اور ریزہ ریزہ اور مٹی ہو جانے کے بعد۔ پھر کہا ہے کہ ہم کو اور ہمارے باپ دادا کو پہلے سے اسی قسم کا وعدہ مل چکا ہے، یعنی ہم اور ہمارے آباء ہمیشہ سے اس کو سنتے چلے آئے ہیں، ہم اس کی نہ کوئی حقیقت دیکھتے ہیں اور نہ ہی کسی طرح اس کا واقع ہونا۔

﴿ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسٰطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ جسموں کے دوبارہ زندہ ہونے کا وعدہ ایک قوم نے اگلے لوگوں سے اور اُن کی کتابوں سے لیا ہے، بعض نے بعض سے اس کو لے لیا ہے، اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ انھوں نے جو کفر اور قیامت کے نہ ہونے کا جو خیال کیا تھا، اللہ پاک نے ان کو اس کا یہ جواب دیا کہ اے نبی!

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٧٥)

تو اُن سے کہہ دے کہ ملک میں پھرو اور مجرموں کا انجام دیکھو، یعنی جنھوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور امرِ معاد وغیرہ جس کو وہ لے کر آئے اس کی تکذیب کی، ان پر اللہ کا عذاب اور سزا اور وبال، نقمت اور عقوبت کیسے نازل ہوئی اور اُن کے درمیان سے اپنے رسلِ کرام کو بچا لیا اور ان مومنین کو بچا لیا جو اُن کے پیرو ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ بات اس شے کے سچے اور صحیح ہونے پر دال ہے جس کو رسول لے کر آئے تھے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کی تسلی فرمائی کہ تو اُن لوگوں پر غم نہ کر جو اس شے کی تکذیب کرتے ہیں جس کو تو لے کر آیا ہے اور مت افسوس کر اُن پر اور اُن پر حسرت کرتے کرتے تیری جان نہ جاتی رہے اور تو اس سے تنگ دل نہ ہو جو وہ تیرے ساتھ مکر کرنے کے لیے اور اس شے کو رد کرنے کے لیے جو تو لایا ہے، کرتے ہیں، کیوں کہ بے شک اللہ تیری تائید کرنے والا ہے اور تجھے مدد دینے والا ہے اور تیرے دین کو غالب کرنے والا ہے، اس شخص پر جو اس کا مخالف اور دشمن ہے زمین کے مشارق و مغارب میں۔[1] وصدق سبحانه و تعالى قد فعل ذلك في عهده الشريف و عهد خلفائه و من بعدهم وله الحمد و المنة على نصر أولياءه وخذل أعدائه، اللهم انصر من نصر دين محمدﷺ، واخذل من خذل دين محمدﷺ آمين، آمين، آمين، اللهم فصل و بارك وسلم على النبي الكريم وعلى آله الطاهرين المطهرين و صحبه الميامين.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ إِذَا ﴾ میں عامل فعل محذوف ہے، "مُخْرَجُوْنَ" اس پر دال ہے، تقدیر یہ ہے: "أَنُبْعَثُ أَوْ نُخْرَجُ إِذَا كُنَّا" "مُخْرَجُوْنَ" نے اس میں عمل نہ کیا، اس لیے کہ ہمزۂ استفہام اور کلمۂ ﴿ إِنَّ ﴾ اور لامِ ابتداء ان کے درمیان متوسط ہو گیا ہے۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے بدو استفہام پڑھا ہے، مگر ہمزہ کی تخفیف کی ہے۔ امام عاصم اور حمزہ رحمہما اللہ نے بھی بدو استفہام پڑھا ہے، مگر دونوں ہمزوں کی تحقیق فرمائی ہے۔ امام نافع رحمہ اللہ نے بیک ہمزہ۔ امام ابن عامر، ورش اور یعقوب رحمہم اللہ نے "أَإِذَا" بدو ہمزہ اور "إننا" دونون کے ساتھ پڑھا ہے بنا بر خبر۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے نافع کی قراءت کو راجح کہا ہے اور دو استفہام کے جمع کرنے پر رد کیا ہے۔[2] معنی آیت کے یہ ہیں کہ کفار نے اس بات کو اوپرا اور بعید سمجھا کہ اپنی قبروں سے مٹی ہو جانے کے بعد زندہ ہو کر نکلیں۔

پھر اس دوبارہ زندہ ہونے کے بعید ہونے کی تاکید اس بات سے کی جو بعث کی تکذیب ہے تو یوں کہا: ﴿ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ﴾ یعنی البتہ مقرر اس بعث کا وعدہ دیے گئے ہم اور ہمارے باپ دادا

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٩٢) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٢٨)

اس سے قبل کہ محمد ﷺ نے ہم کو اس کا وعدہ دیا، حالاں کہ اس وعدے پر بہت زمانہ بیت چکا اور اس میں سے کچھ بھی واقع نہ ہوا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی کچھ حقیقت نہیں، صرف ایک بے حقیقت بات ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو انکار کی تقریر و تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ اس کی مزید تقریر کے لیے اس کو قسم سے شروع کیا ہے۔

﴿ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسٰطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یہ بعث کا وعدہ صرف اگلوں کی نقلیں اور اُن کی جھوٹی بنائی ہوئی باتیں ہیں جن کو لکھ رکھا ہے، ان کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ سورۃ المومنون میں ﴿ اَسٰطِيْرُ ﴾ کی تحقیق گزر چکی ہے۔[2] پھر اللہ پاک نے ان کو بعث کی خبروں کو، جن کو انبیاء لے کر آئے، قبول نہ کرنے پر وعید سنائی۔ چناں چہ ان کو حکم دیا کہ گذشتہ اُمتوں کے حالات میں نظر و غور کرو، جنھوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی اور اس کی وجہ سے جو عذاب اُن پر آیا اور اُن کا انجام کیسا ہوا۔ لہٰذا ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ یعنی زمین میں چلو پھرو تو دیکھو کہ اخبارِ بعث جس کو انبیاء۔علی نبینا و علیهم الصلاة و السلام۔ لے کر آئے، اس کے جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔

"نظر" کے معنی یہ ہیں کہ اپنی آنکھوں سے ان کے آثار کا مشاہدہ کرو، کیوں کہ مشاہدہ کرنے میں زیادہ اعتبار ہوتا ہے اور عقل مند لوگوں کے لیے عبرت ہوتی ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اپنے دلوں سے اور دل کی آنکھوں سے نظر کرو کہ رسولوں کے جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ زمین میں چلنے پھرنے کا ان کو حکم فرمایا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ پہلے معنی مراد ہیں۔ اس میں ان کو تکذیب پر ڈانٹا گیا ہے اور اس بات سے ڈرایا گیا ہے کہ تکذیب کی وجہ سے، جیسا عذاب ان سے اگلے لوگوں پر نازل ہوا، ویسا ہی ان پر بھی نازل ہو۔

﴿ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ ﴾ "حزن" کا سبب یا تو کسی امر کا فوت ہونا ہوتا ہے ماضی میں، یا کسی مکروہ چیز کی آیندہ زمانہ میں توقع ہے، یعنی استہزا کرنے والے جو ایمان نہیں لائے اور زمانۂ ماضی میں وہ کفر پر ڈٹے اور جمے رہے اس پر تو اے نبی! رنج مت کر اور آیندہ زمانے میں جو وہ مکر کریں گے، اس سے تو مغموم اور مہموم نہ ہو۔ یہ معنی ہیں: ﴿ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴾ کے۔ ﴿ ضَيْقٍ ﴾ بہ معنی حرج ہے۔ حرج تنگی کو کہتے ہیں۔ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "ضَاقَ الشَّيْءُ"۔ "ضَيْقًا" بہ فتح اور "ضِيقًا" بالکسر اس کو دونوں طرح پڑھا ہے اور یہ دونوں دو لغت ہیں۔ ابن سکیت رحمہ اللہ (یوسف ابو یعقوب بن السکیت۔ سکیت لقب ہے ان کے باپ اسحاق کا، یہ اکابر اہلِ لغت میں سے ہیں۔ امام فراء اور ابن اعرابی رحمہما اللہ وغیرہ سے اخذ کیا ہے۔ ۲۴۳ یا ۲۴۴ یا ۲۴۶ ہجری میں وفات پائی خلافتِ متوکل میں یا قبل متوکل کے۔ كذا في نزهة الألباء في طبقات الأدباء) نے کہا: عرب لوگ بولتے ہیں: "فِيْ صَدْرِ فُلَانٍ ضَيْقٌ وَضِيْقٌ"۔ "ضَيق" وہ شے ہے جس سے سینے تنگ ہوتے ہیں۔

[1] رقم الآية (٨٣)

نکتہ:

اس جگہ ﴿ لَا تَكُنْ ﴾ کو نون کے ثبوت کے ساتھ پڑھا ہے بنا بر اصل اور قرآن شریف میں یہ نون اس مضارع سے بیس جگہ حذف کیا گیا ہے، ان میں سے نو کا شروع تو حرفِ تا سے ہے اور آٹھ کا حرفِ یائے تحتیہ سے اور دو کا حرفِ نون سے اور ایک کا ہمزے سے، وہ یہ ہے ﴿ وَلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴾[مریم: ۲۰] ''اور نہ میں بدکار ہی ہوں۔'' اس آیت کی تفسیر سورۃ النحل کے آخر میں گزر چکی ہے۔[1]

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ
عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝
وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا
يَشْكُرُوْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا
يُعْلِنُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ
كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

اور وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو یہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہو گا؟ (71) آپ کہہ دیجیے: جو عذاب تم جلدی طلب کرتے ہو، ہوسکتا ہے (اس میں سے) کچھ تمھارے قریب آ لگا ہو (72) اور بے شک آپ کا رب لوگوں پر بہت فضل (فرمانے) والا ہے، لیکن ان کے اکثر شکر نہیں کرتے (73) اور بلاشبہ آپ کا رب (وہ باتیں) جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں (74) اور آسمان و زمین میں غائب کوئی چیز ایسی نہیں جو کھلی کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو (75)

منکرینِ قیامت کے ایک سوال کا جواب:

مشرکوں نے جو قیامت کا سوال کیا اور اس کے واقع ہونے کو بعید سمجھا، اللہ پاک اس بارے میں اُن کی طرف سے خبر دیتا ہے اور فرماتا ہے: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ اللہ پاک نے ان کو اس کا یہ جواب دیا: ﴿ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴾

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''أَنْ يَّكُوْنَ قَرُبَ أَوْ أَنْ يَّقْرُبَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُوْنَ'' یعنی اے نبی! تو کہہ دے شاید قریب ہوئی یا قریب ہو تمھارے لیے بعض چیز جس کی تم جلدی کرتے ہو۔ اسی طرح

[1] رقم الآية (١٢٧) فتح البيان (١٠/ ٦٥۔ ٦٦)

امام مجاہد، ضحاک، عطاء خراسانی، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے[1] اور اس آیت سے بھی یہی مراد ہے: ﴿ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ ۖ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ قَرِيبًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥١] ''اور کہیں گے: وہ کب ہوگا؟ کہہ دیجیے: اُمید ہے کہ وہ قریب ہو۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ﴾ [العنكبوت: ٥٤] ''یہ لوگ آپ سے جلد عذاب مانگ رہے ہیں اور بلاشبہہ جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔''

﴿ رَدِفَ لَكُم ﴾ میں جو حرفِ لام داخل ہوا ہے تو اس لیے کہ ﴿ رَدِفَ ﴾ میں ''عَجِلَ لَكُمْ'' کے معنی شامل ہیں، جیسا کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ایک روایت میں ان سے مروی ہے کہ ﴿ رَدِفَ لَكُم ﴾ کی تفسیر میں ''عَجِلَ لَكُمْ'' کہا ہے۔[2] پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ ﴾ یعنی بے شک تیرا رب البتہ لوگوں پر صاحبِ فضل ہے، یعنی اس بات میں کہ ان پر اپنی نعمتیں کامل کرتا ہے، ان کو بھرپور نعمتیں عطا فرماتا ہے، باوجود اس کے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور باوجود اس کے کہ اس پر اس کا شکر نہیں کرتے مگر ان میں سے تھوڑے۔

﴿ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴾ یعنی وہ ضمائر اور سرائر (پوشیدہ چیزوں) کو ایسا جانتا ہے، جیسا ظاہر چیزوں کو جانتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سَوَاءٌ مِّنكُم مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَن جَهَرَ بِهِ ﴾ [الرعد: ١٠] ''(اللہ کے نزدیک) مساوی ہے تم میں سے جو کوئی آہستہ بات کہے یا بلند آواز سے کہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى ﴾ [طه: ٧] ''وہ ہر راز اور (اس سے بھی) پوشیدہ تر بات کو جانتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴾ [هود: ٥] ''آگاہ رہو! جب وہ اپنے کپڑے اوڑھتے ہیں (تب بھی) وہ (اللہ) جانتا ہے جو وہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں، بے شک اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے۔''

پھر اس بات کی خبر دی کہ وہ آسمانوں اور زمین کے غیب کا جاننے والا ہے اور غیب کا اور حاضر چیز کا عالم ہے۔ غیب وہ شے ہے جو بندوں سے غائب ہے اور شہادت وہ ہے جس کا انھوں نے مشاہدہ کیا ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی نہیں ہے کوئی شے آسمانوں اور زمین میں، مگر وہ کتابِ مبین میں ہے۔[3] یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴾ [الحج: ٧٠] ''کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، بلاشبہہ یہ (سب کچھ) کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے، بے شک یہ اللہ پر بالکل آسان ہے۔''[4] (كذا في ابن كثير)

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩٢) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩١٨)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩٢)
[3] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩٤)
[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٩٢۔ ٤٩٣)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ کفار کہتے ہیں کہ یہ عذاب جس کا تم ہم کو وعدہ دیتے ہو کب ہے، اگر تم اس میں سچے ہو تو بتاؤ؟ یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہے جو مومن ہیں۔ جس وقت تو کسی کے پیچھے سوار ہو تو اس وقت عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: ”رَدِفْتُ الرَّجُلَ وَأَرْدَفْتُهُ“ یعنی میں اس کے پیچھے سوار ہوا اور جب کوئی شخص کسی کے پیچھے آتا ہے تو بولتے ہیں: ”رَدِفَه“۔ امام ابن شجرہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ رَدِفَ لَكُمْ ﴾ کے معنی ہیں: ”تَبِعَكُمْ“. اور کہا کہ اسی معنی سے عورت کی سرین کو ”رِدْفُ الْمَرْأَةِ“ کہتے ہیں، کیوں کہ وہ اس کے پیچھے سے اس کا تابع ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے ”أَرْدَفَهُ“ ایک لغت ہے ”رَدِفَهُ“ میں مثل ”تَبِعَهُ وَأَتْبَعَهُ“ کے، دونوں کے ایک معنی ہیں۔ خزیمہ بن مالک بن نہد نے کہا ہے:

إِذَا الْجَوْزَاءُ أَرْدَفَتِ الثُّرَيَّا ظَنَنْتُ بِآلِ فَاطِمَةَ الظُّنُونَا

یہاں ”أَرْدَفَتْ“ بہ معنی ”رَدِفَتْ“ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ رَدِفَ لَكُمْ ﴾ کے معنی ”دَنَا لَكُمْ“ ہیں اور اسی لیے ﴿ لَكُمْ ﴾ کہا گیا ہے۔ امام اعرج رحمہ اللہ نے ”رَدَفَ“ بالفتح پڑھا ہے (یعنی بہ فتح دال)، یہ ایک لغت ہے اور بالکسر زیادہ مشہور ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ”أَزِفَ لَكُمْ“ پڑھا ہے۔[1] امام ابوالسعود رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ”عَسَى وَلَعَلَّ وَسَوْفَ“ بادشاہوں کے وعدوں میں یقین کے طور پر ہیں، یعنی اُن کے وعدوں اور وعید میں جس بات پر یہ کلمے داخل ہوتے ہیں تو وہ بات قطعی اور یقینی ہوتی ہے اور وہ جو ان کلموں کو بولتے ہیں تو اس سے ان کی غرض وقار کا اظہار کرنا ہوتا ہے اور اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ ایسے لوگوں سے یہ رمز اور اشارہ تصریح کی طرح ہے ان کے غیر کی نسبت۔

اسی بنا پر اللہ پاک اپنی وعید کو جاری فرماتا ہے۔[2] معنی یہ ہیں، اے نبی! تو اُن کافروں سے کہہ دے کہ شاید یہ عذاب جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا ہے، تمھارے پیچھے پیچھے ہو اور تم کو ملنے والا ہو۔ اس صورت میں حرفِ لام زاید ہوگا تاکید کے لیے۔ یا ﴿ رَدِفَ لَكُمْ ﴾ بہ معنی ”اِقْتَرَبَ لَكُمْ وَدَنَا مِنْكُمْ“ ہے (یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے)[3] تو اب زائد نہ ہوگا۔

﴿ بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ﴾ مرفوع ہے اس بنا پر کہ ﴿ رَدِفَ ﴾ کا فاعل ہے، مراد بعض وہ عذاب ہے جس کی تم جلدی کرتے ہو، یعنی شاید قریب ہو چکا ہو، نزدیک ہو گیا ہو، پاس آ لگا ہو اس عذاب کا بعض حصہ۔ کسی نے کہا: اس عذاب سے روزِ بدر قتل کا عذاب مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عذابِ قبر مراد ہے۔ پھر اللہ پاک نے عذاب

[1] فتح القدير (٤/ ١٩٧۔ ١٩٨) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٩٨) [3] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩٢)

کی تاخیر میں اپنے فضل کا ذکر کیا: ﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ ﴾ یعنی بے شک تیرا رب لوگوں پر تاخیرِ عقوبت کر کے فضل کرتا ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کیا جائے اور عقوبت کی تاخیر اللہ تعالیٰ کے جملہ افضال اور انعام میں سے ہو، لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے ہیں، اس کے فضل اور انعام کا۔ اور اس کے احسان کا حق نہیں پہچانتے۔

پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ وہ جانتا ہے اس چیز کو جو اُن کے سینوں میں ہے۔ چنانچہ فرمایا: اور بے شک تیرا رب البتہ جانتا ہے اس شے کو جس کو ان کے سینے چھپاتے ہیں۔ عقوبت میں تاخیر اس لیے نہیں ہے کہ ان کا حال اس پر مخفی ہے۔ جمہور نے ﴿ تُكِنُّ ﴾ تائے فوقیہ کی پیش سے پڑھا ہے "أَكَنَّ" سے، اور امام ابن محیصن، ابن سمیفع اور حمید رحمہ اللہ نے بہ فتحِ تا وضمِ کاف پڑھا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "كَنَنْتُهُ" یعنی میں نے اس سے شے کو چھپایا۔

﴿ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴾ کے معنی "وَمَا يُظْهِرُوْنَ" ہیں، یعنی وہ ان کے اقوال و افعال کو جانتا ہے جن کو ظاہر کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جانتا ہے اِس کام کو جو انھوں نے رات اور دن میں کیا ہے۔[1]

﴿ غَآئِبَةٍ ﴾ من جملہ صفاتِ غالبہ ہے اور حرفِ تا مبالغے کے لیے ہے، جس طرح روایۃ وعلامۃ میں ہے۔ کسی نے کہا: یہ وہ تا ہے جو مصادر پر داخل ہوتی ہے، جیسے: "عاقبة و عافية"۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی نظیر ذبیحہ ونطیحہ ورمیہ ہے، اس بات میں کہ یہ اسماء ہیں، صفات نہیں ہیں۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس جگہ غائبہ سے مراد قیامت ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: اس عذاب کا علم ہے جس کی وہ جلدی کرتے ہیں۔ اللہ پاک کے نزدیک وہ مبین ہے، اگرچہ خلق سے غائب ہے۔

امام ابن شجرہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غائبہ اس جگہ وہ سب کچھ ہے جس کو اللہ پاک نے اپنی خلق سے مخفی کیا ہے اور اُن سے غائب رکھا ہے۔ ام الکتاب میں مبین ہے، پھر کیوں کر کوئی شے اس میں سے اس پر مخفی رہ سکتی ہے۔ من جملہ اس کے وہ عذاب ہے جس کی وہ جلدی کرتے ہیں، کیوں کہ اس کا تو ایک وقت مقرر ہے اور ایک اجل معین ہے، اس کا علم اللہ پاک کے پاس ہے۔ پھر اس کی جو مدت اور وقت مقرر کیا گیا ہے، اس سے پہلے اس کی جلدی کیوں مچاتے ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آسمان و زمین میں کوئی ایسی ظاہر اور پوشیدہ چیز نہیں ہے جس کو وہ نہ جانتا ہو۔[4] مفسرین نے کہا ہے کہ کوئی غائب شے اور کوئی ایسا امر آسمان و زمین میں جو خلق سے غائب ہو ایسا نہیں ہے جو کتابِ مبین اور لوحِ محفوظ میں موجود نہ ہو۔[5]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩١٨) [2] الكشاف (٣/ ٣٨٦) [3] فتح القدير (٤/ ١٩٨)
[4] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩٤) [5] فتح البيان (١٠/ ٦٦۔ ٦٨)

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ
هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ
رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى
وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَمَآ اَنْتَ
بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا
فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ
دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا
يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر وہ باتیں بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں (76) اور بلاشبہ یہ (قرآن) مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے (77) بے شک آپ کا رب ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کرے گا، اور وہ نہایت غالب ہے، بہت علم والا ہے (78) لہٰذا (اے نبی!) آپ اللہ پر توکل کریں، بلاشبہ آپ واضح حق پر ہیں (79) آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے، اور نہ آپ بہروں کو (اپنی) پکار سنا سکتے ہیں، جبکہ وہ پیٹھ کے بل پھر جائیں (80) اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے راہِ ہدایت پر لا سکتے ہیں، آپ تو بس انھیں ہی سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں، تو وہی فرماں بردار ہیں (81) اور جب ان پر (قربِ قیامت کے وعدے کی) بات پوری ہو جائے گی تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے، وہ ان سے کلام کرے گا کہ بے شک یہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے (82)

قرآنِ مجید بنی اسرائیل کے اختلاف کو واضح کرتا ہے اور باعثِ ہدایت و رحمت ہے:

بنی اسرائیل میں بعضے قصے کئی طرح روایت تھے، قرآن میں اسی طرح فرمایا جو صحیح تھا۔ اکثر عقیدے اکثر مسئلے جو بنی اسرائیل میں تھے، اس میں سے جو صحیح تھے، ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ جس جانور کو نکالنے کا ذکر کیا وہ جانور قیامت سے پہلے مکے میں صفا پہاڑ کے پھٹ جانے سے اس میں سے نکلے گا، لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور سچے ایمان والوں کو چھپے منکروں سے جدا جدا کر دے گا کوئی نشانی بتا کر۔ انتھیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنی کتابِ عزیز کی اور اس ہدایت و بیان و فرقان کی خبر دیتا ہے، جس پر وہ مشتمل ہے۔ فرماتا ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو یعنی حاملینِ تورات و انجیل کو سناتا ہے اکثر چیزیں جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں، جس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں اور باہم ایک دوسرے کے مخالف ومباین ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہود نے تو افتراء و بہتان کیا اور نصاریٰ نے غلو کیا اور حد سے بڑھ گئے تو قرآن پاک قولِ وسط، عدل اور حق لے کر آیا کہ وہ ایک بندے ہیں اس کے بندوں سے اور ایک نبی و رسول ہیں اس کے انبیاء ورسل کرام علیہم السلام سے ـعلى نبينا وعليه وعليهم أفضل الصلاة و أكمل السلام۔ كما قال سبحانه و تعالى: ﴿ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴾ [مريم: ٣٤] ''یہ ہے عیسیٰ ابن مریم، (یہی ہے) حق کی بات جس میں وہ لوگ شک کرتے ہیں۔''

اس کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی: ﴿ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی جو لوگ اس پر ایمان لائے ہیں ان کے دلوں کے لیے ہدایت ہے اور عملیات میں ان کے لیے رحمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو سختیاں اگلی اُمتوں پر تھیں وہ اس نے دور کر دیں، آسان آسان کام بتا دیے۔ ذرا سی محنت پر بہت زیادہ ثواب اسی کا خاصا ہے۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ﴾ یعنی بے شک تیرا رب قیامت کے دن ان میں اپنے حکم سے فیصلہ کرے گا۔ ﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴾ اور وہ غالب ہے اپنے انتقام میں اور اپنے بندوں کے افعال اور اقوال کو خوب جانتا ہے۔ اپنے مکمل علم سے اور فیصلے سے ان کو پورا پورا بدلہ دے گا۔ ﴿ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ لہٰذا تو اپنے سارے کاموں میں اللہ پاک پر بھروسا کر اور اپنے رب کی رسالت پہنچا دے۔

﴿ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴾ تو تو سچی پکی کھلی بات پر ہے، گو تیری مخالفت کرے جو بھی کرے، ان پر بدبختی اور شقاوت لکھی جا چکی ہے اور تیرے رب کی بات ان پر ثابت ہو چکی ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں گے، اگرچہ ان کے پاس ہر قسم کی نشانی آ جائے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ یعنی تو مردوں کو ایسی شے نہیں سنا سکتا، جو اُن کو نفع دے۔ اسی طرح یہ لوگ ہیں کہ ان کے دلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور اُن کے کانوں میں کفر کا بوجھ ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ﴾ یعنی تیرا کہا تو وہی مانے گا جو سمیع و بصیر ہے، نافع شنوائی اور بینائی رکھتا ہے دل اور بصیرت میں، اور مطیع و فرماں بردار ہوتا ہے، اور فروتنی کرتا ہے اور اللہ پاک کے واسطے اور اس شے کے لیے جو رسولوں کی زبان پر آئی ہے اللہ پاک کی طرف سے، اُس سے دبتا ہے، یعنی اس کو مانتا ہے۔

دابۃ الأرض کا ذکر:

﴿ دَآبَّةً ﴾ سے مراد وہ جانور ہے جو آخر زمانے میں نکلے گا، جب کہ لوگ بگڑ جائیں گے اور اللہ پاک کے

حکموں کو چھوڑ دیں گے اور دینِ حق کو بدل ڈالیں گے تو اللہ پاک ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالے گا۔ کسی نے کہا: مکہ مکرمہ سے۔ کسی نے کہا: اور جگہ سے، چنانچہ اس کی تفصیل آیندہ آئے گی۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔ پھر وہ لوگوں سے باتیں کرے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے: ''أَيْ: تُكَلِّمُهُمْ كَلَامًا، أَوْ تُخَاطِبُهُمْ مُخَاطَبَةً'' یعنی ان سے مخاطب ہو کر باتیں کرے گا۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان سے کلام کرے گا، پھر کہے گا: ﴿ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ یہ قول سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول محلِ نظر ہے اور یہ کسی پر مخفی نہیں ہے، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ''۔[1] ایک روایت میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ ''تَجْرَحُهُمْ'' یعنی لوگوں کو زخم لگائے گا اور ایک روایت میں ان سے یہ مروی ہے، فرمایا: ''كِلَا تَفْعَلُ'' یعنی ''هٰذَا وَهٰذَا''[2] یعنی باتیں بھی کرے گا اور زخم بھی لگائے گا۔ یہ قول حسن ہے اور کچھ تضاد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اس ''دابہ'' کے ذکر میں بہت سی احادیث اور آثار وارد ہوئے ہیں، ان میں سے جو ہم کو میسر ہوئے، ہم ان کا ذکر کرتے ہیں۔ وباللہ المستعان.

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجرے سے برآمد ہوئے اور ہم باہم قیامت کے حال کا ذکر کر رہے تھے تو فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو: سورج کا مغرب کی طرف سے نکلنا اور دخان اور دابہ اور یاجوج ماجوج کا نکلنا اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا نزول اور دجال کا نکلنا اور تین خسف (زمین میں دھنسنا) ایک خسف مغرب میں اور ایک مشرق میں اور ایک جزیرۂ عرب میں اور ایک آگ جو قعرِ عدن سے نکلے گی، وہ لوگوں کو ہانکے گی یا جمع کرے گی، ان کے ساتھ رات بسر کرے گی جہاں وہ بسر کریں گے اور قیلولہ (دوپہر کو آرام کرنا) کرے گی ان کے ساتھ جہاں وہ قیلولہ کریں گے۔[3]

(وهكذا رواه مسلم وأهل السنن من طرق عن فرات القزاز عن أبي الطفيل عامر بن واثلة عن حذيفة مرفوعا، وقال الترمذي: حسن صحيح، ورواه مسلم أيضا من حديث عبد العزيز بن رفيع عن أبي الطفيل عنه موقوفاً والله أعلم)

طریقِ دیگر:

امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے طلحہ بن عمرو اور جریر بن حازم رحمہما اللہ سے روایت کیا ہے، چنانچہ طلحہ نے تو یوں کہا کہ مجھے خبر دی عبداللہ بن عبید اللہ عمیر لیثی نے اس بات کی کہ ابو الطفیل نے اس کو حدیث بیان کی حذیفہ بن اسید غفاری ابو شریحہ سے اور جریر نے یوں کہا ہے کہ عبداللہ بن عبید نے روایت کی آل عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک شخص سے۔

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩٩۔ ٥٠٠) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٦) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٩٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٠١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣١١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٨٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٥٥) مسند أحمد (٤/ ٦)

طلحہ کی روایت کردہ حدیث مکمل اور خوب تر ہے۔ کہا: رسول اللہ ﷺ نے دابہ کا ذکر کیا تو فرمایا: «لَهَا ثَلَاثُ خَرَجَاتٍ مِنَ الدَّهْرِ» یعنی وہ تین بار نکلے گا: ایک دفعہ تو وہ اقصائے بادیہ، یعنی بادیہ کی بستی سے دور ایک جنگل میں نکلے گا، اس کا ذکر قریہ میں داخل نہ ہوگا۔ قریہ سے مراد مکہ ہے۔ پھر ایک زمانۂ دراز تک وہ چھپا رہے گا۔ پھر وہ اس کے قریب ایک دفعہ اور نکلے گا تو اس کا ذکر گاؤں والوں میں پھیلے گا، پھر اس کا ذکر قریہ، یعنی مکے میں داخل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «ثُمَّ بَيْنَمَا النَّاسُ فِي أَعْظَمِ الْمَسَاجِدِ عَلَى اللّٰهِ حُرْمَةً، وَأَكْرَمِهَا الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ لَمْ يَرُعْهُمْ إِلَّا وَهِيَ تَرْغُو بَيْنَ الرُّكْنِ وَالْمَقَامِ» (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن خازن میں یوں ہے: "لَمْ يَرُعْهُمْ إِلَّا وَهِيَ فِي نَاحِيَةِ الْمَسْجِدِ تَدْنُو وَتَدْنُو"[1] واللّٰه أعلم) تَنْفُضُ عَنْ رَأْسِهَا التُّرَابَ فَارْفَضَّ النَّاسُ عَنْهَا شَتّٰى وَمَعًا وَلَقِيَتْ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ" (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن اس میں تصحیف معلوم ہوتی ہے یا تو یہ "بَقِيَتْ" ہے یا "تَثْبُتُ" ہے، مطلب یہ ہے کہ سب لوگ اس کو دیکھ کر بھاگ جائیں گے، مگر ایک گروہ باقی رہ جائے گا۔ واللّٰه أعلم) وَعَرَفُوا أَنَّهُمْ لَمْ يُعْجِزُوا اللّٰهَ (اور جگہ "لَنْ يُعْجِزُوا اللّٰه" ہے) فَبَدَأَتْ بِهِمْ فَجَلَّتْ وُجُوهَهُمْ حَتّٰى جَعَلَتْهَا كَأَنَّهَا الْكَوْكَبُ الدُّرِّيُّ وَوَلَّتْ فِي الْأَرْضِ لَا يُدْرِكُهَا طَالِبٌ وَلَا يَنْجُو مِنْهَا هَارِبٌ حَتّٰى أَنَّ الرَّجُلَ يَتَعَوَّذُ مِنْهَا بِالصَّلَاةِ فَتَأْتِيهِ مِنْ خَلْفِهِ فَتَقُولُ: يَا فُلَانُ الْآنَ تُصَلِّي؟ فَيُقْبِلُ عَلَيْهَا فَتَسِمُهُ فِي وَجْهِهِ، ثُمَّ تَنْطَلِقُ وَيَشْتَرِكُ النَّاسُ فِي الْأَمْوَالِ وَيَصْطَحِبُونَ فِي الْأَمْصَارِ يُعْرَفُ الْمُؤْمِنُ مِنَ الْكَافِرِ حَتّٰى أَنَّ الْمُؤْمِنَ لَيَقُولُ: يَا كَافِرُ اقْضِنِي حَقِّي وَحَتّٰى أَنَّ الْكَافِرَ لَيَقُولُ: يَا مُؤْمِنُ اقْضِنِي حَقِّي. وَرَوَاهُ ابْنُ جَرِيرٍ مِنْ طَرِيقَيْنِ عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ أَسِيدٍ مَوْقُوفًا[2] وَاللّٰهُ أَعْلَمُ وَرَوَاهُ مِنْ رِوَايَةِ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ مَرْفُوعًا وَإِنَّ ذٰلِكَ فِي زَمَانِ عِيسَى بْنِ مَرْيَمَ وَهُوَ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ[3] وَلٰكِنْ إِسْنَادُهُ لَا يَصِحُّ.

یعنی پھر لوگ اس دوران کہ وہ مسجد حرام میں ہوں گے، جو مسجد تمام مساجد سے زیادہ عظمت اور عزت والی ہے اللہ کے نزدیک حرمت کے طور پر، اُن کو کوئی چیز گھبراہٹ میں نہ ڈالے گی، مگر حال یہ ہے کہ وہ دابہ مرتفع ہوگا اور حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان والی جگہ کو بھرے گا اور اپنے سر سے مٹی کو جھاڑتا ہوگا، پس لوگ اس سے متفرق ہو جائیں گے، یعنی جدا جدا ہو کر اور اکٹھے ہو کر اور مومنین کی ایک جماعت ملے گی، جو اس بات کو پہچان لے گی کہ وہ اللہ

[1] تفسير الخازن (٥/ ١٥٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩٧۔ ٤٩٨)
[3] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩٨) اس کی سند میں ''رواد بن جراح عن سفیان الثوری'' ضعیف راوی ہے۔

کو عاجز نہیں کر سکتے، چنانچہ وہ ان سے شروع کرے گا تو اُن کے چہروں کو روشن ستارے کی طرح روشن کر دے گا اور وہ زمین میں پھرے گا نہ اس کو کوئی پکڑ سکے گا اور نہ کوئی بھاگنے والا اس سے بچ سکے گا، یہاں تک کہ آدمی نماز کے ساتھ اس سے پناہ لے گا تو وہ اس کے پیچھے آئے گا۔ پھر کہے گا: اے فلاں اب تو نماز پڑھتا ہے، پس وہ اس کی طرف متوجہ ہوگا، اس کے چہرے میں داغ دے گا۔ پھر وہ چلا جائے گا اور لوگ مالوں میں شریک ہوں گے اور شہروں میں ساتھ یعنی اکٹھے رہیں گے، مومن کافر سے پہچانا جائے گا، یہاں تک کہ مومن کہے گا: اے کافر! تو میرا حق ادا کر اور کافر کہے گا: اے مومن تو میرا حق ادا کر۔[1]

حدیثِ دیگر:

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث یاد رکھی کہ میں اس کو اب تک نہیں بھولا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے کہ بے شک نشانیوں میں سے سب سے پہلی نشانی سورج کا مغرب سے نکلنا ہے اور دابہ کا چاشت کے وقت لوگوں پر نکلنا ہے، ان میں جونسی پہلے ہو گی تو دوسری فوراً ہی اس کے بعد ظاہر ہو گی۔[2]

حدیثِ دیگر:

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چھے چیزوں کے ظاہر ہونے سے پہلے پہلے اپنے اعمال کے ساتھ مبادرت کرو، یعنی جلدی جلدی عمل کر لو: پہلی چیز سورج کا مغرب سے نکلنا ہے، دخان، دجال، دابہ، خَاصَّةَ أَحَدِكُمْ أَوْ أَمْرَ الْعَامَّةِ[3] (تفرد بہ)۔ صحیح مسلم کے دوسرے الفاظ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہیں: «بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ سِتًّا: اَلدَّجَّالَ وَالدُّخَانَ وَدَابَّةَ الْأَرْضِ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَأَمْرَ الْعَامَّةِ وَخُوَيْصَةَ أَحَدِكُمْ»[4]

("خویصة" سے مراد حادثۂ موت ہے، جو ہر انسان کے ساتھ خاص ہے۔ "خویصة" تصغیر ہے "خاصة" کی۔ حادثۂ موت کو "خویصة" بہ تصغیر فرمایا ہے، اس لیے کہ جو اُمور اس کے بعد پیش ہوں گے، جیسے: بعث اور عرض اور حساب، ان کے مقابلے میں موت ایک حقیر چیز ہے۔ حادثۂ موت سے پہلے پہلے جلدی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ موت کے واقع ہونے سے پہلے اعمالِ صالح میں مشغول ہو، ان کا خوب اہتمام کرے۔ امرِ عامہ سے مراد وہ فتنہ ہے جو تمام لوگوں کے لیے عام ہو، یا وہ امر جس کے ساتھ عام لوگ متبد و مستقل ہوں، اس کا ظہور اُن کی طرف

---

[1] مسند الطیالسي (١/ ١٤٤) اس کی سند میں "طلحہ بن عمرو" ضعیف اور دوسری سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٤١)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٤٧)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٤٧)

سے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ فتنے کے واقع ہونے سے پہلے عملِ صالح کر لے۔ کسی نے کہا مراد قیامت ہے لیکن قیامت کا ان نشانیوں میں سے ہونا ٹھیک نہ ہوگا مگر بتکلف۔[1] كذا في مجمع البحار)

حدیثِ دیگر:

ابن ماجہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سِتًّا: طُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَالدُّخَانَ وَالدَّابَّةَ وَالدَّجَّالَ وَخُوَيْصَةَ أَحَدِكُمْ وَأَمْرَ الْعَامَّةِ»[2] (تفرد به)

حدیثِ دیگر:

امام ابو داود طیالسی نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "دابة الأرض" نکلے گا اور اس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی ہوگی۔ چنانچہ کافر کی ناک کو عصا کے ساتھ داغ دے گا اور مومن کے چہرے کو انگوٹھی کے ساتھ روشن کر دے گا، یہاں تک کہ لوگ خوان پر جمع ہوں گے مومن اور کافر الگ الگ پہچانے جائیں گے۔ (حدیث شریف کے الفاظ « فَتَخْطِمُ أَنْفَ الْكَافِرِ » ہیں۔ "خطم" ماخوذ ہے: "خَطَمْتُ الْبَعِيْرَ" سے، یہ اس وقت بولتے ہیں جب تو اونٹ کو خط کے طور پر ناک سے ایک رخسار کی طرف داغ دے۔) (ورواه الإمام أحمد عن بهز وعفان ويزيد بن هارون ثلاثتهم عن حماد بن سلمة به) اور الفاظ یہ ہیں کہ اور خاتم کے ساتھ کافر کی ناک کو داغ دے گا۔ اور مومن کے چہرے کو عصا کے ساتھ روشن کر دے گا۔ یہاں تک کہ ایک دستر خوان والے لوگ جمع ہوں گے تو کہے گا: یہ اے مومن! اور کہے گا: یہ اے کافر![3] (ورواه ابن ماجة عن أبي بكر بن أبي شيبة عن يونس بن محمد المؤدب عن حماد بن سلمة به)

حدیثِ دیگر:

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن بریدہ عن ابیہ سے روایت کیا ہے۔ بریدہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے مکے کے قریب بادیہ میں ایک جگہ میں لے گئے تو اچانک وہ ایک خشک زمین تھی، اس کے گردا گرد ریت تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دابة" اس جگہ سے نکلے گا۔ "فَإِذَا فِتْرٌ فِيْ شِبْرٍ". "فتر" اس فاصلے کو کہتے ہیں جو انگوٹھے اور تشہد کی انگلی کے درمیان ہوتا ہے اور شبر ایک بالشت ہوتا ہے، یہ اس جگہ کی پیمائش بتائی ہے۔ ابن بریدہ نے کہا: میں نے اس سے کئی برس بعد حج کیا تو ہم کو اپنا ایک عصا دکھایا تو وہ میرے اس عصا سے اتنا اتنا تھا۔[4] عبد الرزاق نے کہا:

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٣/ ٦٨١) [2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٥٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٥٩)

[3] مسند الطيالسي (١/ ٣٣٤) مسند أحمد (٢/ ٢٩٥۔ ٤٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٦٦) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٢٤١٣)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٦٦) اس کی سند میں "خالد بن عبید" ضعیف راوی ہے۔

ہم کو خبر دی معمر نے قتادہ سے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ ایک جانور ہے روئیں والا، اس کے چار پاؤں ہیں، وہ تہامہ کی بعض وادیوں سے نکلے گا۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن عطیہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ نے کہا ہے کہ "دابّة" کوہِ صفا کی دراڑ سے نکلے گا۔ "كَجَرْيِ الْفَرَسِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ لَمْ يَخْرُجْ ثُلُثُهَا"[1] (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن اس میں کچھ خلل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تین دن میں نکلے گا، ہر دن تہائی حصہ نکلے گا۔ تین دن میں پورا نکل چکے گا، یہ معنی حسن رحمہ اللہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قول سے معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ تین دن نکلتا رہے گا گھوڑے کے دوڑنے کی طرح، حالاں کہ ابھی اس کا تہائی حصہ نہ نکل چکا ہوگا، اس سے غرض اس کی تیز رفتاری اور طول کا بیان کرنا ہے کہ برابر تین دن تیز گھوڑے کی طرح دوڑتا ہوا نکل رہا ہے اور ابھی تک ایک تہائی نہیں نکل چکا ہے۔)

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے ابان بن صالح سے روایت کیا ہے، کہا کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے کسی نے "دابّة" کے متعلق پوچھا تو کہا کہ "دابّة" ایک پتھر کے نیچے سے نکلے گا محلّہ جیاد میں۔ (جیاد مکے کے اسفل میں ایک جگہ ہے۔) "وَاللّٰهِ لَوْ كُنْتُ مَعَهُمْ أَوْ لَوْ شِئْتُ لَقَرَعْتُ بِعَصَايَ إِلَى الصَّخْرَةِ الَّتِي تَخْرُجُ الدَّابَّةُ مِنْ تَحْتِهَا"۔ (اصل میں اسی طرح ہے، مصحح مصر نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے: "أَوْ لَوْ شِئْتُ بِعَصَايَ. كَذَا بِالنُّسَخِ بِأَيْدِينَا وَحَرِّرَ الرِّوَايَةَ. انتهى" سچ کہتے ہیں: عبارت میں خلل ہے۔ یوں معنے ہو سکتے ہیں، کہا: اگر میں لوگوں کے ہمراہ ہوتا یا یوں کہا: اگر میں چاہتا تو اپنے عصا سے اس پتھر کی طرف اشارہ کر دیتا جس کے نیچے سے دابہ نکلے گا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: "لَوْ شِئْتُ أَنْ أَضَعَ قَدَمِي عَلَى مَوْضِعِ خُرُوجِهَا لَفَعَلْتُ"[2]) کسی نے کہا: اے عبداللہ بن عمرو! پھر وہ کیا کرے گا؟ فرمایا کہ مشرق کی طرف منہ کرے گا، پھر ایک چیخ مارے گا، وہ اس میں نفوذ کر جائے گی، یعنی اس کی چیخ مشرق و مغرب میں پہنچ جائے گی۔ پھر شام کی طرف منہ کرے گا تو ایک چیخ مارے گا، وہ اس میں نفوذ کر جائے گی۔ پھر یمن کی طرف منہ کرے گا تو ایک چیخ مارے گا، وہ اس میں نفوذ کر جائے گی۔ پھر مکے سے چلے گا تو عسفان میں صبح کرے گا۔ کسی نے کہا کہ پھر کیا کہا؟ کہا: پھر میں نہیں جانتا ہوں۔[3] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دابہ شبِ مزدلفہ میں نکلے گا۔[4] (رواه ابن أبي حاتم و في إسناده ابن البيلمان)

امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ عزیر علیہ السلام کے کلام سے حکایت کیا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ سدوم کے نیچے سے ایک دابہ نکلے گا، جو لوگوں سے کلام کرے گا، ہر ایک اس کو سنے گا۔ حاملہ عورتیں مدت پوری ہونے سے پہلے بچہ جن دیں گی اور میٹھا پانی کڑوا ہو جائے گا اور دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے اور حکمت جلا دی

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٥)
[2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٣٦۔ ٢٣٧)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٣۔ ٢٩٢٤)

جائے گی اور علم اُٹھا لیا جائے گا اور وہ زمین جو اس کے متصل ہو گی وہ بات کرے گی اور اس زمانے میں لوگ اس شے کی اُمید کریں گے جس کو حاصل نہ کر سکیں گے اور تھکیں گے اس شے میں جس کو نہ پائیں گے، اور عمل کریں گے اس شے میں جس کو نہ کھائیں گے۔ (رواہ ابن أبي حاتم عنه)

نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ دابۃ میں کل لون سے ہو گا (یعنی اس میں ہر قسم کا رنگ ہو گا، یا ہر جانور کی ایک شے اس میں ہو گی، چناں چہ آیندہ اس کی تفصیل آئے گی۔ واللہ أعلم) اس کے دونوں سینگوں کے درمیان کا فاصلہ ایک فرسخ ہو گا سوار کے لیے۔[1] (فرسخ فرسنگ کا معرب ہے۔ فرسنگ ایک معلوم مسافت کا نام ہے، یعنی کوس اور میل۔ منتہائے درازیِ بصر کو کہتے ہیں، زمین سے، اور فرسنگ کے تین حصوں میں سے ایک حصے کا نام ہے۔ کذا في الصراح)۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مثل حربۂ ضخمہ کے ہے، یعنی موٹی برچھی۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا کہ وہ ایک جانور ہے کہ اس کے ریش اور زغب ہیں۔ ریش پروں کو اور زغب پروں کے نیچے نرم پروں کو کہتے ہیں اور اس کا سم ہے اور اس کی دم نہیں ہے اور ڈاڑھی ہے۔ وہ تین دن تک تیز رفتار گھوڑے کی طرح نکلے گا اور ابھی اس کا تیسرا حصہ نہ نکلا ہو گا۔ (رواہ ابن أبي حاتم)

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے ابو الزبیر رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے "دابّۃ" کا وصف بیان کیا تو کہا کہ اس کا سر بیل کے سر کی طرح ہے اور آنکھ سور کی آنکھوں کی طرح ہے اور کان ہاتھی کے کان کی طرح ہے اور سینگ بکری کے سینگ کی طرح ہے اور گردن شتر مرغ کی گردن کی طرح ہے اور سینہ شیر کے سینے کی طرح ہے اور رنگ تیندوے کے رنگ کی طرح ہے اور کوکھ بلی کی کوکھ کی طرح ہے اور دُم مینڈھے کی دُم کی طرح ہے اور پاؤں اونٹ کے پاؤں کی طرح ہیں، دو جوڑوں کے درمیان بارہ گز کا فاصلہ ہے، اس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی نکلے گی، پس کوئی مومن باقی نہ رہے گا مگر اس کے چہرے میں موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے ایک نکتہ کر دے گا، پھر وہ نکتہ پھیلے گا، یہاں تک کہ اس کا چہرہ سفید ہو جائے گا اور کوئی کافر باقی نہ رہے گا، مگر اس کے چہرے پر سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی سے ایک سیاہ نکتہ کر دے گا پھر یہ نکتہ پھیلے گا، یہاں تک کہ اس سے اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا، یہاں تک کہ لوگ بازاروں میں اس طرح خرید و فروخت کریں گے کہ اے مومن! یہ شے کتنی قیمت کی ہے اور اے کافر! یہ شے کس قیمت کی ہے اور یہاں تک کہ گھر والے اپنے دستر خوان پر بیٹھیں گے تو اپنے مومن کو اپنے کافر سے پہچان لیں گے، پھر دابہ ان سے کہے گا: اے فلاں! خوش ہو جا تو اہلِ جنت سے ہے اور اے فلاں! تو اہلِ نار سے ہے۔ چنانچہ یہ ہے اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴾[2]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٥۔ ٢٩٢٦) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٤) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٩٣۔ ٤٩٦)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے: ﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ بنی اسرائیل سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہمارے نبی کریم ﷺ کے زمانے میں موجود ہیں۔ ﴿ يَقُصُّ ﴾ سے مراد وضاحت اور تخصیص کے ساتھ بیان کرنا ہے۔ اسی لیے خاص کر کے لفظ ﴿ اَكْثَرَ ﴾ کا ذکر فرمایا، یعنی جس شے میں وہ اختلاف کر رہے ہیں، یہ قرآن شریف اس کے اکثر کو صراحت سے بیان کرتا ہے اور اقل، یعنی تھوڑے اور قلیل کو رمز اور اشارے سے بیان کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیان تمام باتوں کا کرتا ہے، صرف صراحت کے ساتھ بیان اور اشارے کے ساتھ بیان کا فرق ہے۔

اس بنا پر یہ آیت، یعنی آیتِ باب اور یہ آیت باہم متفق ہو گئیں: ﴿ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو؟'' کوئی فرق نہ رہا۔ جن چیزوں میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مختلف ہو گئے ہیں اور کئی گروہ ہو گئے ہیں، کسی نے افراط کیا، کسی نے تفریط۔ اسی طرح عزیر علیہ السلام کے بارے میں ہیں۔ دوسرے تشبیہ اور تنزیہ کے بارے میں۔ تیسرے جنت و نار کے احوال کے بارے میں۔ غرضیکہ ان اُمور میں مختلف ہو کر بہت سے فرقے فرقے ہو گئے، گروہ گروہ بن گئے، جتھے جتھے الگ ہو گئے اور آپس میں ایسا بغض پیدا ہوا کہ ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرنے لگا، ایک دوسرے سے بَری اور بے زار ہونے لگا۔

چنانچہ یہ قرآن پاک نازل ہوا، جس حق میں وہ اختلاف کرتے ہیں اس کا خوب صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے، اگر یہ لوگ اس کو لیں تو اس میں ایسی شے پائیں جو اُن کے اختلاف کو دور کر دے اور ان کے تفرق کو دفع کر کے سب کو ایک راہِ حق پر لگا دے، کیوں کہ وہ تو بہ آوازِ بلند پکار رہا ہے: ﴿ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [آل عمران: ٦٤] ''ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے۔'' ؏

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

رب الارباب نے تو عام دعوت دی، لیکن اس کے قبول کرنے والے وہی ہیں جو بڑے بختاور ہیں، اسی لیے ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی بے شک یہ قرآن شریف البتہ ہدایت اور راہنمائی ہے گمراہی سے اور رحمت ہے عذاب سے ان لوگوں کے لیے جو اللہ عز و جل پر ایمان لائے اور اس کے رسولِ کریم ﷺ کی پیروی کی۔ خاص کر ان کا ذکر اسی لیے کیا ہے کہ اس سے نفع لینے والے یہی ہیں، انھیں میں سے وہ حضراتِ بابرکات

ہیں جو بنی اسرائیل میں مشرف بہ ایمان ہوئے اور اسلام کا مرصع تاج اپنے سر پر رکھا اور عملِ صالح کا لباس زیب تن کیا، یہ لوگ تو کامیاب وکامران ہوئے اور درجاتِ عالیات کو پہنچے۔

اب رہے اختلاف کرنے والے تو اُن کے لیے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهِ ۚ ﴾ یعنی بے شک تیرا رب قیامت کے دن بنی اسرائیل میں سے اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کرے گا اپنے حکمِ عدل وحق کے ساتھ۔ چنانچہ جو حق پر ہوگا اسے جزائے خیر دے گا اور جو باطل پر ہوگا اس کو سزا دے گا۔ غرضیکہ قیامت کے دن جس طرح ساری خلائق کا فیصلہ عدل سے ہوگا، اسی طرح ان اختلاف کرنے والوں کا فیصلہ بھی عدل وانصاف سے ہوگا۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اُن کے درمیان دنیا میں فیصلہ کرے گا اور جن باتوں کی انھوں نے تحریف کی ہے ان کو ظاہر کر دے گا۔ جمہور نے ﴿ بِحُكْمِهِ ﴾ پڑھا ہے بہ ضمِ حا وسکونِ کاف۔ حکم بہ معنی عدل وحق ومحکوم بہ ہے، اب وہ شبہہ دور ہو گیا کہ قضا اور حکم ایک شے ہیں تو اس کا فائدہ کیا ہوا۔ اور جناح نے بکسرِ حا وفتحِ کاف پڑھا ہے، اس بنا پر کہ حکمت کی جمع ہے۔[1]

پھر اگر کوئی کہے کہ اس قدر بے شمار خلق کا فیصلہ کس طرح کرے گا اور عدل کیسے ہوگا؟ تو فرمایا: ﴿ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴾ یعنی وہ ایسا غالب ہے کہ کوئی اور اس پر غالب نہیں ہو سکتا، لہٰذا کسی کے لیے اس کی مخالفت ممکن نہ ہوگی، جیسی کہ دنیا میں کافروں نے اس کے نبیوں اور رسولوں کی مخالفت کی۔ پھر کوئی کہے کہ اتنی خلق کا حکم اور فیصلہ جاننا ایک بڑی مشکل بات ہے تو فرمایا: ﴿ الْعَلِيمُ ﴾ یعنی جس بات کے ساتھ وہ حکم کرے گا اس کو جانتا ہے، وہ بڑا جاننے والا ہے۔ اس کو ہر شے کی خوب خبر ہے۔

﴿ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ﴾ میں حرفِ "فا" ماقبل پر ترتیبِ امر کے لیے ہے، یعنی امر "بتوکل" متفرع ہے عزیز وعلیم پر۔ اس لیے کہ یہ اوصاف ہر شخص پر اس بات کو واجب کرتے ہیں کہ جس ذات پاک کی یہ صفات ہوں اپنے سارے امور اسی کے سپرد کر دے۔ معنی یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تو کسی کی پروا مت کر، اپنا کام اللہ کو سونپ دے اور اسی پر بھروسا کر، بے شک وہ تیرا ناصر اور مددگار ہے۔

پھر توکل کرنے کا حکم دینے کی دو وجہ ذکر فرمائیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ﴾ یعنی حق ظاہر، مراد دینِ حق ظاہر وواضح ہے کہ جس سے کسی طرح کا شک وشبہہ چپکتا نہیں ہے۔ یا "مبین" بہ معنی مظہر ہے، یعنی حق ظاہر کرنے والا باطل کا۔ مطلب یہ ہے کہ تو اللہ پر بھروسا کر اور اُن کی عداوت اور دشمنی کی کچھ پروا مت کر، اس لیے کہ تُو تو کھلے حق پر ہے اور حق والا اس کے لائق ہے کہ اللہ پر وثوق کرے اور اس کی نصرت وتائید اور حفاظت پر اعتماد کرے۔

پھر دوسری وجہ ذکر فرمائی: ﴿ إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ ﴾ یعنی تو مردہ دلوں کو یعنی کافروں کو نہیں سنا سکتا۔ اس میں

---

[1] روح المعاني (٢٠/ ١٨)

ان کی متابعت اور مدد سے آپ کی طمع کو بالکل ختم کرنا ہے۔ ﴿ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ﴾ اور تو بہروں کو اپنی پکار نہیں سنا سکتا، یعنی تو اللہ پر بھروسا کر اور اُن کی پروا مت کر۔ اس لیے کہ جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ سننے سے کسی قسم کا نفع حاصل کرنے کے بارے میں ان کی حالت مردوں جیسی ہے، یا اُن کی حالت بہروں کی طرح ہے، جو نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں اور نہ راہ پاتے ہیں تو یہ اس بات میں ایک قوی سبب ہوا کہ اُن کی کچھ پروا نہ کی جائے، نہ اُن کو کسی گنتی اور شمار میں لایا جائے۔ کفار کو مردوں سے تشبیہ دی جن کو کسی طرح کی حس نہیں ہوتی اور نہ کچھ عقل ہوتی ہے اور بہروں سے جو نہ نصیحتیں اور وعظ سنتے ہیں اور نہ اللہ کی طرف پکارنے کا جواب دیتے ہیں۔ امام ابن محیصن، حمید، ابن کثیر اور ابن ابی اسحاق رحمہ اللہ نے "لَا یَسْمَعُ" بیائے تحتیہ مفتوحہ وفتحِ میم پڑھا ہے۔ فاعل اس کا "الصُّمَّ" ہے۔ باقی قراء کی قراءت بضمِ فوقیہ وکسرِ میم ہے "أَسْمَعَ" سے۔[1]

پھر اللہ پاک نے تشبیہ کی تکمیل و تاکید کے لیے ایک جملہ ذکر کیا اور فرمایا: ﴿ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴾ یعنی جبکہ وہ منہ موڑیں حق سے پوری طرح منہ موڑنا، اس لیے کہ بہرا جب سامنے منہ کیے ہوئے ہوتا ہے تو بھی پکارنے کو نہیں سنتا، پھر جب وہ پیٹھ کیے ہوئے اور منہ موڑے ہوئے ہو تو پھر کیسے سنے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہرہ جس وقت پیٹھ دے کر پھرے اور تب تو اس کو پکارے تو وہ نہیں سنتا ہے۔ اسی طرح کافر ہے، وہ اس شے کو جس کی طرف پکارا جاتا ہے، یعنی ایمان اس کو نہیں سنتا ہے۔[2] ظاہر طور پر مردوں کے سننے یا سنانے کی نفی عام ہے، چنانچہ اس عموم سے خاص نہ ہوگا مگر وہی جو دلیل کے ساتھ وارد ہوا ہے، جس طرح کہ صحیح میں وارد ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بدر کے کنویں میں مقتولوں کو خطاب کیا تو آپ سے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! آپ تو ایسے جسموں سے باتیں کر رہے ہیں جن کی روحیں نہیں ہیں[3] اور اسی طرح وہ ہے جو وارد ہوا ہے کہ میت اپنے ساتھ آنے والوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے، جب وہ لوٹتے ہیں۔[4]

پھر اللہ پاک نے کفار کے لیے اندھوں کی مثال بیان کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَآ أَنتَ بِهَٰدِى الْعُمْىِ عَن ضَلَٰلَتِهِمْ ﴾ یعنی تو اس شخص کو راہ نہیں بتا سکتا جس کو اللہ تعالیٰ نے اندھا کر دیا ہے، ایسا راہ بتانا کہ جو شے اس سے مطلوب ہے، یعنی ایمان وہ اس کی طرف پہنچا دے اور یہ بات تیری قدرت اور وسعت میں نہیں ہے۔ اسی طرح کی یہ آیت ہے: ﴿ إِنَّكَ لَا تَهْدِى مَنْ أَحْبَبْتَ ﴾ [القصص: ٥٦] "(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔" جمہور نے باضافتِ "هادي" پڑھا ہے طرف ﴿ الْعُمْىِ ﴾ کے اور یحییٰ بن حارث اور ابو حیان رحمہما اللہ نے بہ تنوین، یعنی "هَادٍ" پڑھا ہے اور حمزہ نے "تَهْدِيْ" بہ صیغۂ فعل مضارع پڑھا ہے۔ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کے

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٣٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢١) تفسير البغوي (٦/ ١٧٦)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٥٧) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٠)

الفاظ میں یوں ہے: "وَمَا أَنْ تَهْدِيَ الْعُمْيَ" [1] ﴿ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا ﴾ یعنی تو نہیں سناتا ہے، مگر اس شخص کو جو قرآن کی تصدیق کرتا ہے اللہ کے علم میں نہ اس شخص کو جو کفر کرتا ہے۔

جملہ ﴿ فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ ایمان کی تعلیل ہے، یعنی وہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، اس لیے کہ وہ مطیع اور فرماں بردار ہیں، اللہ کی توحید کو خالص کرنے والے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے قیامت کے کچھ احوال اور علامات ذکر کر کے بندوں کو ڈرایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ ﴾ اس وقوعِ قول کے معنی میں اختلاف ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ "وَجَبَ الْغَضَبُ عَلَيْهِمْ" یعنی جب ان پر غضب واجب ہوا۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "حَقَّ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِأَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ" یعنی جب اُن پر اس بات کے ساتھ قول ثابت ہو چکا کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ کسی نے کہا کہ "حَقَّ الْعَذَابُ عَلَيْهِمْ"۔ کسی نے کہا: "وَجَبَ السَّخَطُ" یعنی جب اُن پر عذاب ثابت ہو چکا، یا غصہ واجب ہو چکا۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "قول" سے مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ قرآن شریف ناطق ہے کہ قیامت آئے گی اور اس میں طرح طرح کی ہولناکیاں ہوں گی، جس کے آنے کی وہ لوگ جلدی کیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ جب علماء کے مرنے اور علم کے جانے اور قرآن شریف کے اٹھا لینے کے ساتھ قول واقع ہوگا، یہ اس وقت ہوگا جب لوگ نیک بات کا حکم نہ کریں گے اور بری بات سے نہ روکیں گے۔ یہ قول عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ہے۔ [2] (وأخرجه ابن مردويه عنه مرفوعا)

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ﴿ وَقَعَ الْقَوْلُ ﴾ کی تفسیر اس شے کے ساتھ کی ہے جو نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی تھی، وہ یہ ہے: ﴿ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ ﴾ [3] [هود: ٣٦] "تیری قوم میں سے کوئی ہرگز ایمان نہیں لائے گا، سوائے اس کے جو (پہلے) ایمان لا چکا ہے۔" حاصل یہ ہے کہ ﴿ وَقَعَ ﴾ سے مراد "وَجَبَ" ہے، اور ﴿ اَلْقَوْلُ ﴾ سے مراد مضمونِ قول ہے۔ یا مفعول پر مصدر کا اطلاق کیا گیا ہے، یعنی مقول اور جواب شرط کا یہ ہے: ﴿ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ یعنی جس وقت مذکورہ امور واقع ہوں گے تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے۔ اس "دابّة" میں اختلاف ہے بہت سے اقوال پر:

ایک قول یہ ہے کہ وہ دابہ صالح علیہ السلام کی ناقہ کا بچہ ہے، وہ قیامت کے قریب نکلے گا اور من جملہ اشراط و علامات سے ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ایک دابہ مزغبہ ذاتِ شعر و قوائمِ طوال ہے، یعنی وہ ایک ایسا جانور ہے جس کے نرم نرم پَر ہوں گے اور بال ہوں گے اور لمبے لمبے پاؤں ہوں گے، اس کو جساسہ کہتے ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ بنی آدم کی خلقت پر ایک دابہ ہے، اس کا سر سحاب میں ہے اور اس کے پاؤں زمین میں ہیں۔ چوتھا قول وہی ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ اس میں کئی جانوروں کی مشابہت ہوگی اور شاید یہ وہی

[1] فتح القدير (٤/ ١٩٩) [2] الدر المنثور (٦/ ٣٧٧) [3] تفسير الطبري (١٩/ ٤٩٦)

جساسہ ہے۔ پانچواں یہ ہے کہ یہ دابہ وہ ثعبان ہے جو جدارِ کعبہ پر مشرف ہے، جس کو عقاب نے اُکھیڑا تھا، جب کہ قریش نے بنائے کعبہ کا ارادہ کیا تھا۔ مراد یہ ہے کہ یہ وہی ہے جو آخر زمانے میں نکلے گا۔ چھٹا قول یہ ہے کہ وہ ایسا جانور ہے جس کی دم نہیں ہے اور اس کی ڈاڑھی ہے۔ ساتواں قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دابہ پشم اور پَر والا ہے۔ "مُؤَلَّفَةٌ فِيهَا مِنْ كُلِّ لَوْنٍ، لَهَا أَرْبَعُ قَوَائِمَ تَخْرُجُ بِعَقَبٍ مِنَ الْحَاجِّ" یعنی اس کے پَر مولف ہوں گے، بعض پر بعض مجتمع ہوں گے، اس میں ہر جانور کی مشابہت ہوگی، اس کے چار پاؤں ہوں گے، حاجیوں کے عقب میں نکلے گا۔ آٹھواں یہ ہے کہ وہ ایک انسان ناطق متکلم ہے، اہلِ بدعت سے مناظرہ کرے گا، کافروں سے گفتگو کرے گا۔ اس قول میں بُعد ہے۔ ان کے سوا اور قول ہیں کہ ان کو ذکر کر کے طول دینے میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور فرمایا ہے کہ وہ سب سے زیادہ صحیح قول ہے، اس کی تعیین اور صفت میں بہت اختلاف ہے، ہم نے اس کو کتاب "تذکرہ" میں ذکر کیا ہے۔[1] انتھٰی۔ اس کی جگہ میں اختلاف ہے کہ وہ کس جگہ سے نکلے گا: ایک قول یہ ہے کہ مکے میں کوہِ صفا سے نکلے گا، وہ شق ہو جائے گا، پھر اس سے نکلے گا۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا ہے۔[2] دوسرا یہ ہے کہ وہ کوہِ ابوقبیس سے نکلے گا۔ تیسرا یہ ہے کہ تین بار نکلے گا: ایک نکلنا تو بعض جنگلوں میں ہوگا، یہاں تک کہ لوگ اس کے بارے میں لڑیں گے اور خون کی کثرت ہوگی۔ پھر وہ چھپ جائے گا اور بستیوں میں نکلے گا۔ پھر نکلے گا سب سے عظیم باعزت و باشرف مسجد سے۔ چوتھا یہ ہے کہ حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان سے نکلے گا۔ پانچواں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ تہامہ (مکہ کے نزدیک ایک مشہور جگہ) کی وادیوں سے نکلے گا۔[3] چھٹا یہ ہے کہ کوفہ کی مسجد سے نکلے گا، جس جگہ تنور نے جوش مارا تھا۔ ساتواں یہ ہے کہ طائف کی زمین سے نکلے گا۔ آٹھواں یہ ہے کہ شعب اجیاد (تفسیر ابن کثیر میں اس جگہ لفظ جیاد واقع ہوا ہے[4]) کے ایک پتھر سے نکلے گا۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا ہے۔[5] نواں یہ ہے کہ کعبے کی ایک دراڑ سے نکلے گا۔ دسواں یہ ہے کہ سدوم کے دریا سے نکلے گا۔ یہ قول امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ کا ہے۔[6]

نکتہ:

﴿دَآبَّةً﴾ کی تعبیر جو اسمِ جنس سے کی اور اس کی کیفیت کو تنوینِ تفخیمی کے ساتھ مبہم رکھا تو اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ اس کا حال عجیب وغریب ہے اور اس کے اوصاف بیان نہیں ہو سکتے، گویا وہ ایک ایسی شے ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٣٥_ ٢٣٦) فتح القدير (٤/ ١٩٩_ ٢٠٠)
[2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٣٦)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٥)
[4] تفسير ابن كثير (٩/ ٢٩٢٥)
[5] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٥)
[6] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٥_ ٢٩٢٦)

قولہ تعالیٰ: ﴿ تُكَلِّمُهُمْ ﴾ کے معنی میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جو لوگ اس وقت موجود ہوں گے ان سے کلام کرے گا کہ سارے دین سوائے دینِ اسلام کے باطل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سے ایسی بات کہے گا جو انھیں بری لگے گی۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سے عربی میں یہ کہے گا: ﴿ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[1] یعنی لوگ ہماری آیتوں کا یقین نہیں کرتے تھے۔ ﴿ بِاٰيٰتِنَا ﴾ سے مراد "بِخُرُوْجِهَا" ہے۔ اس لیے کہ دابہ کا خروج من جملہ آیات ہے۔

ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ تُكَلِّمُهُمْ ﴾ بہ معنی "تُحَدِّثُهُمْ" ہے، یعنی ان سے باتیں کرے گا۔ تیسرا قول ان کا یہ ہے کہ اس نے کسی سے پوچھا کہ ﴿ تُكَلِّمُهُمْ ﴾ زبان سے بات کرنا ہے یا "کلم" بہ معنی زخم لگانے سے ہے؟ تو فرمایا: واللہ! وہ یہ سب کرے گا، مومن سے تو باتیں کرے گا اور کافر کو زخمی کرے گا۔[2] جمہور نے ﴿ تُكَلِّمُهُمْ ﴾ "تکلیم" سے پڑھا ہے۔ اس پر سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ کی قراءت دال ہے۔ "تُنَبِّئُهُمْ"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابوزرعہ، ابورجا اور امام حسن رحمہ اللہ نے "تَكْلِمُهُمْ" بہ فتحِ فوقیہ وسکونِ کاف پڑھا ہے۔ "کلم" بہ معنی جرح سے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "تَسِمُهُمْ وَسْمًا" یعنی ان کو داغ دے گا۔ کسی نے "تَجْرَحُهُمْ" یعنی ان کو زخم لگائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ جمہور کی قراءت "کَلْم" بہ فتحِ کاف وسکونِ لام بہ معنی جرح سے ماخوذ ہے اور تشدید تکثیر کے لیے ہے۔ یہ امام ابوحاتم رحمہ اللہ کا قول ہے۔[3]

امام عبد بن حمید اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "نہیں ہے یہ کوئی حدیث اور نہ کوئی کلام، لیکن وہ ایک داغ ہے جو وہ اس شخص کو لگائے گا جس کا حکم اسے اللہ کرے گا۔ اس کا نکلنا ہوگا صفا سے شبِ منیٰ کو، لوگ چیخیں گے اس کے سر اور دم کے درمیان، نہ ٹلے گا کوئی ٹلنے والا اور نہ نکلے گا کوئی نکلنے والا، یہاں تک کہ جس وقت وہ اس شے سے فارغ ہو جائے گا جس کا اللہ نے اس کو حکم دیا ہے۔ پھر ہلاک ہوگا جو کوئی ہلاک ہوگا اور نجات پائے گا جو کوئی نجات پائے گا تو اس کا پہلا قدم جو وہ رکھے گا وہ انطاکیہ میں ہوگا۔"[4]

(اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: « فَيَضُجُّوْنَ بَيْنَ رَأْسِهَا وَذَنَبِهَا، لَا يَدْحَضُ دَاحِضٌ وَلَا يَجْرَحُ جَارِحٌ » ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوں ہے: « فَيُصْبِحُوْنَ بَيْنَ رَأْسِهَا وَذَنَبِهَا لَا يَدْحَضُ دَاحِضٌ وَلَا يَخْرُجُ خَارِجٌ » یعنی وہ تو شبِ منیٰ کو نکلے گا، پس لوگ اس کے سر اور دم کے درمیان صبح کریں گے، نہ ٹلے گا کوئی ٹلنے والا اور نہ نکلے گا کوئی نکلنے والا۔ یا "يَصِيْحُوْنَ" ہے، یعنی چیخیں گے چلائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ سب لوگ اس کے پاس موجود ہوں گے۔ واللہ أعلم۔ کوئی صحیح نسخہ ملے تو ناظر مقابلہ کر کے درست کر لے۔)

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٠٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٦)

[3] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٣٧ ـ ٢٣٨) [4] الدر المنثور (٦/ ٣٧٨) فتح القدير (٤/ ٢٠١)

امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''نکلے گا دابہ، پھر ان کے ناکوں پر داغ دے گا، پھر وہ تم میں عمر دیے جائیں گے، یہاں تک کہ آدمی سواری کا جانور خریدے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ تو نے اس کو کس سے خریدا ہے؟ تو وہ کہے گا کہ اس شخص سے جس کی ناک پر داغ دیا گیا تھا۔''[1] اس کے بعد فتح البیان میں بعض وہی حدیثیں نقل کی ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ پھر کہا ہے کہ دابہ کی صفت، اس کے نکلنے کی جگہ اور جو کام وہ کرے گا اور کب نکلے گا، اس کے بارے میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، بعض تو صحیح ہیں، بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف۔

رہا اس کا نکلنا اور اس کا قیامت کی نشانیوں میں سے ہونا تو اس بارے میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ صحیح ہیں۔ بعض ان میں سے وہ ہیں جو صحیح میں ثابت ہوئی ہیں، جس طرح کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے: « لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَرَوْا عَشْرَ آيَاتٍ وَذَكَرَ مِنْهَا الدَّابَّةَ » یہ صحیح مسلم میں ہے اور سننِ اربعہ میں۔ اور جیسے یہ حدیث ہے: « بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ... الخ » یہ بھی صحیح مسلم میں ہے اور سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث: « إِنَّ أَوَّلَ الْآيَاتِ خُرُوْجًا طُلُوْعُ الشَّمْسِ...الخ » یہ بھی صحیح مسلم میں ہے۔ چناں چہ یہ سب حدیثیں پہلے بیان ہو چکی ہیں۔[2]

جمہور نے قولہ تعالیٰ: ﴿ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ کو بکسر ''إِنَّ'' پڑھا ہے بنا بر استیناف۔ کوفے والوں نے اور امام ابن ابی اسحاق رحمہ اللہ نے بفتح ''أَنَّ'' پڑھا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فتح کی بنا پر معنی یہ ہیں: ''بِأَنَّ النَّاس''. سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے ''بِأَنَّ'' پڑھا ہے حرفِ با کے ساتھ۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''أَنَّ'' کا محل نصب ہے اس پر فعل کے وقوع کے سبب سے، یعنی وہ دابہ ان کو خبر دے گا اس بات کی کہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں کرتے تھے۔ اس قراءت کی بنا پر دابہ جس بات کے ساتھ لوگوں سے کلام کرے گا، وہ بات یہی ہے کہ ﴿ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ چنانچہ پہلے ہم اس طرف اشارہ کر آئے ہیں۔

رہی کسرے کی قراءت تو اس کی بنیاد پر جملہ مستانفہ ٹھہرے گا، چنانچہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ جملہ دابہ کے کلام سے نہ ہوگا۔ مفسرین کی ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے اور امام کسائی اور فراء رحمہما اللہ نے اس پر جزم کیا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسرہ ''إِنَّ'' کا تقدیرِ قول کی بنا پر ہے: ''أَيْ: تَقُوْلُ إِنَّ النَّاسَ... الخ''[3] چنانچہ اس تقدیر پر پہلی قراءت کے معنی دوسری کی طرف راجع ہوں گے۔ اس آیت میں ''ناس'' سے مراد علی العموم آدمی ہیں تو اس میں ہر مکلّف داخل ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد خاص کفار ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ کفارِ مکہ، یعنی دابہ لوگوں کو خبر

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٦٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٢)

[2] ان سب کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٣٨)

دے گا کہ مکے والے قرآن پر ایمان نہ لائے، جو مشتمل ہے بعث، حساب اور عتاب پر۔ یہ امام خازن اور محلی رحمہ اللہ کا قول ہے،[1] لیکن یہ قول غیر ظاہر ہے، اس لیے کہ دابہ کا آخر زمانے میں یہ خبر دینا کہ مکے والے جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کا انکار کیا اور اُن کے زمانے میں تھے، وہ لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ اس میں کوئی فائدہ نہیں، چنانچہ زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ "ناس" کو ان لوگوں پر محمول کیا جائے جو دابہ کے نکلنے کے وقت موجود ہوں گے، جیسا کہ جمہور مفسرین نے کہا ہے۔

بالجملہ دابہ کے نکلنے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام منقطع ہو جائے گا اور نہ کوئی تائب باقی رہے گا نہ کوئی تائب اور نہ کوئی کافر ایمان لائے گا، جس طرح کہ اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی تھی کہ ﴿ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ ﴾ [هود: ٣٦] مطلب یہ ہے کہ اس وقت کوئی ایسا شخص پایا نہ جائے گا کہ اللہ پاک کی طرف رجوع کرے اور اپنی غفلت سے بیدار ہو اور گناہ گاروں میں سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول نہ کی جائے گی اور نہ کسی کافر کا ایمان مقبول ہو گا۔[2]

صاحبِ "إشاعة في أشراط الساعة" رحمہ اللہ نے "دابة الأرض" کا خوب بیان کیا ہے، اس کے حلیے، سیرت اور خروج کو مفصل لکھا ہے، اکثر حدیثیں وہی نقل کی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ کچھ اقوال زیادہ بھی لکھے ہیں۔ خروج کی جو مختلف روایتیں وارد ہوئی ہیں ان میں خوب جمع (تطبیق) کی ہے۔ لفظ تنبیہ لکھ کر کہا ہے کہ ان روایتوں کے درمیان جمع دو وجہ سے ہے: ایک یہ کہ اس کے واسطے تین بار نکلنا ہے، بعض میں تو وہ قومِ لوط کے شہر سے نکلے گا اور اس نکلنے کی تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ وہ اقصائے بادیہ سے نکلے گا اور بعض اودیۂ تہامہ سے (تہامہ کے جنگلوں، وادیوں) سے نکلنے کی تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے جس کے مطابق وہ ورائے مکہ اور یمن سے نکلے گا، اس لیے کہ حجاز یمانیہ ہے اور اسی وجہ سے مکہ مکرمہ کو یمانیہ کہا گیا ہے۔ اور اخیر بار کے نکلنے میں کہا ہے کہ وہ مکہ سے نکلے گا۔ اس کی عظمتِ جثہ اور طول کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ صفا، مروہ اور اجیاد کے درمیان سے نکلے، کیوں کہ وہ تین دن تک ٹھہرے گا یا کچھ زیادہ۔ اس کی تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ وہ مروہ، صفا، اجیاد اور مسجد سے نکلے گا۔ وباللہ التوفیق.

جمع کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ان سب جگہوں سے ایک ہی گھڑی میں نکلے گا خرقِ عادت کے طور پر۔ مثالی صورتوں میں یہ بات مثال محسوس کی تحقیق پر مبنی ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اسی بنا پر ان دو آدمیوں کے حق میں جنھوں نے طلاق کی قسم کھائی تھی، یہ فتویٰ دیا کہ ان میں سے کسی کی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ ہر شخص نے یہ قسم کھائی تھی کہ شیخ عبدالقادر طحطوحی رحمہ اللہ نے اس کے پاس رات بسر کی، ایک خاص رات میں کہا ہے کہ یہ مسئلہ قدیم سے واقع ہو چکا ہے اور علما نے اس میں عدمِ حنث (قسم نہ ٹوٹنے) کا فتویٰ دیا ہے۔ انتہٰی.

---

[1] تفسیر الخازن (٥/ ١٥٧) تفسیر الجلالین (١/ ٥٠٤) [2] فتح البیان (١٠/ ٦٨۔ ٧٣)

پھر میں نے دیکھا کہ ابن علان نے اپنی تفسیر ''ضیاء السبیل'' میں ان الفاظ کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے: یہ ''دابہ'' بیک وقت تمام شہروں ملکوں سے نکلے گا۔ زمین میں یہ مختلف نوعیت کا ہوگا، ایک نہیں ہوگا۔ اس قول کی بنا پر یہ ''دابہ'' اسمِ جنس ہے۔ انتھٰی۔ اور جب ہم مثالی صورتوں کے تعدد کے قائل ہو جائیں تو یہ جنسیت کے قول سے مستغنی کروے گا، وباللّٰہ التوفیق، انتھی۔[1] جناب توفیق ابو الوفا الصدیق صاحب فتح البیان رحمہ اللہ نے ''حجج الكرامة و اقتراب الساعة وأذاعه'' وغیرہ اپنے مؤلفات ممتعہ میں ''دابة الأرض'' پر خوب کلام کیا ہے۔ فجزاه الله سبحانه خير الجزاء و غفرله و برد مضجعه آمين۔ غرضیکہ اللہ پاک نے پہلے روزِ قیامت کی نشانیوں کا بیان کیا، پھر اس کے بعد روزِ محشر کی ہولناکیوں کا کچھ مجمل ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد کیا:

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ حَتّٰۤى إِذَا جَآءُوْ قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا أَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾

اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گروہ اکٹھا کریں گے، جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے، پھر ان کی درجہ بندی کی جائے گی(83) حتی کہ جب وہ سب (میدانِ محشر میں) آ پہنچیں گے تو اللہ فرمائے گا: کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا تھا، جبکہ تم نے علم سے ان کا احاطہ نہ کیا تھا، یا تم کیا کرتے رہے تھے؟(84) اور ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر (وعدۂ عذاب کی) بات پوری ہو جائے گی، تو وہ (کچھ بھی) نہیں بول سکیں گے(85) کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات بنائی، تاکہ وہ اس میں آرام وسکون کریں اور دن کو روشن (بنایا)۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں(86)

روزِ قیامت ظالموں کو اکٹھا کیے جانے کا بیان:

گھیر گھار کر لائیں گے، یعنی ہر گناہ والے ایک جتھا ہوں گے۔ انتھٰی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ

---

[1] الإشاعة لأشراط الساعة (۱/ ۳۱۹۔ ۳۲۵)

اللہ پاک روزِ قیامت کی خبر دیتا ہے اور ان لوگوں میں سے ظالموں کے حشر کی خبر دیتا ہے، جو اللہ کے رسولوں اور اس کی آیتوں کو جھٹلانے والے ہیں کہ یہ لوگ گھیر کر اللہ عزوجل کے روبرو لائے جائیں گے، تاکہ جو کچھ انھوں نے دنیا میں کیا اس کے بارے میں اُن سے پوچھے اُن کی ملامت، سرزنش، تصغیر، تحقیر اور تذلیل کے لیے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا ﴾ یعنی جس دن ہم ہر قوم اور زمانے سے ایک جماعت کو گھیر لائیں گے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتی تھی۔ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ﴾ [الصافات: ٢٢] ''(اے فرشتو!) اکٹھا کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا، اور ان کے جوڑوں کو۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴾ [التکویر: ٧] ''اور جب روحیں (جسموں سے) ملا دی جائیں گی۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''يُدْفَعُوْنَ''۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''وَزَعَةٌ: يُرَدُّ أَوَّلُهُمْ عَلٰى آخِرِهِمْ'' عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا: ''يُسَاقُوْنَ''۔[1] مطلب اس سب کا یہ ہے کہ ان کے لیے روکنے اور انتظام کرنے والے لوگ ہوں گے کہ وہ ان کا نظم وضبط کریں گے اول کو آخر پر رد کریں گے کہ چل بچل نہ ہونے پائیں، اپنے اپنے مثل سے برابر ہانکے جائیں، کوئی ان میں سے آگے پیچھے نہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ جس وقت اس انتظام واہتمام سے آئیں گے اور اللہ عزوجل کے روبرو اس مقام پر کھڑے ہوں گے جہاں ان سے سوال ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ﴿ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی پھر وہ اپنے اعتقاد اور اعمال کے بارے میں پوچھے جائیں گے، چوں کہ وہ اہلِ سعادت سے نہ تھے اور ایسے تھے جیسے کہ اللہ پاک نے ان کے بارے میں خبر دی ہے: ﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴾ [القیامۃ: ٣١۔ ٣٢] ''نہ تو اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ بلکہ اس نے (حق کو) جھٹلایا اور منہ موڑا۔'' تو اس وقت ان پر حجت قائم ہوگی اور اُن کے لیے کوئی عذر نہ ہوگا کہ اسے پیش کریں، چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ [المرسلات: ٣٥۔ ٣٧] ''یہ (وہ) دن ہے کہ (لوگ) بول نہیں سکیں گے۔ اور نہ انھیں اذن ملے گا کہ وہ معذرت کر سکیں۔ اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے تباہی ہے۔'' یعنی وہ مبہوت ومتحیر ہو جائیں گے۔

پھر ان کے لیے کچھ جواب نہ ہوگا اس لیے کہ وہ تو دارِ دنیا میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے اور اب اس ذات کی طرف پھیر لائے گئے جو عالم الغیب والشہادہ ہے اور جس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنی قدرتِ تامہ وسلطانِ عظیم اور شانِ رفیع کے بارے میں بتایا جس کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کے حکموں کی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٢٧)

فرماں برداری اور اس کے نبیوں کی تصدیق واجب ہے، اس حق میں جس کو وہ لے کر آئے۔ کون سا حق جس سے کسی طرح کا مفر نہیں ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ ﴾ یعنی کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے رات بنائی، تاکہ اس کی تاریکی میں چین حاصل کریں اور اس کے سبب سے ان کی جانیں سکون پکڑیں اور دن بھر کام کاج کرنے سے جو تھکاوٹ ہوئی ہے، اس کی تکلیف سے آرام حاصل کریں۔ ﴿ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ﴾ یعنی اور بنایا ہم نے دن کو روشن، چنانچہ بسبب اس کی روشنی کے اپنے معاش اور کسب میں چلیں پھریں۔ سفر کریں تجارت کریں اس کے سوا اپنے اَور کام کریں جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے۔ ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ میں عامل فعل محذوف ہے یعنی ''اُذْكُرْ''۔ اس کا خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے۔ ''حشر'' بہ معنی جمع ہے، کہا ہے کہ اس حشر سے مراد حشرِ عذاب خاص ہے حشرِ کلی کے بعد جو ساری خلق کو شامل ہے اور کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ فوج مثل زمرہ و قوم کے جماعت کو کہتے ہیں۔ راغب نے اس کو مقید کیا ہے، کہا کہ فوج وہ جماعت ہے جو جلدی چلنے والی ہو۔ یہ تو اس کی اصل تھی، پھر اس کا اطلاق کیا گیا، گو نہ صرف چلنا ہو اور نہ تیز بھاگنا، اس کی جمع ''أَفْوَاجٌ'' و ''فُوُجٌ'' ہے۔

﴿ مِمَّنْ يُّكَذِّبُ ﴾ کا ''من'' بیانیہ ہے۔ ﴿ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کا اول ان کے آخر پر روکا جائے گا، ان کے ساتھ چلنے کے لیے، مطلب یہ ہے کہ پہلے لوگ ٹھہرائے جائیں گے، تاکہ پچھلے ان سے مل جائیں اور سب جمع ہو جائیں، پھر ہانکے جائیں گے۔ اس سے مراد اُن کی تعداد کی کثرت اور چاروں طرف میں پھیلاؤ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يُوْزَعُوْنَ ﴾ بہ معنی ''يُدْفَعُوْنَ'' ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[1] چنانچہ اس کی تحقیق اسی سورت میں پورے طور پر گزر چکی ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں: اے نبی! تو اس دن کا ذکر کر جس دن ہم اُمتوں میں سے ہر اُمت کی ایک جماعت کو جمع کریں گے، جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتی تھی۔ اس وقت ان کا اول اُن کے آخر کی طرف دھکیلا جائے گا، یا اُن کو ان کی طرف دفع کیا جائے گا، یعنی تو ان کو ڈرانے اور خوف دلانے کے لیے ان سے اس کا ذکر اور بیان کر۔

امام ابو السعود نے کہا: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ابو جہل، ولید بن مغیرہ اور شیبہ بن ربیعہ اہلِ مکہ کے آگے ہانکے جائیں گے اور اسی طرح باقی اُمتوں کے قادہ، یعنی قائد، پیشوا اور سردار اُن کے آگے آگے

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۴۹۶۔ ۴۹۷)

آگ کی طرف ہانکے جائیں گے۔[1] شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس دن کا ذکر کر جس دن ہم تمام انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں سے ان لوگوں کو جمع کریں گے جو مکذبین کے زمرے میں شامل ہوں گے اور ہماری آیتوں کو جو ہمارے نبیوں پر اتاری گئی تھیں جھٹلاتے تھے اور ان آیتوں کی تکذیب کرتے تھے جو ہماری وحدانیت پر دال ہیں، ان کی جانوں میں اور آفاق میں۔ پھر اُن کے پہلے گروہ روکے جائیں گے ان کے آخر گروہ پر، تاکہ جمع ہو جائیں اور پھر حساب کی جگہ کی طرف ہانکے جائیں گے۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ﴾ یہاں تک کہ جس وقت وہ حساب کی جگہ پر آئیں گے۔ ﴿قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا ان کی زجر و توبیخ اور ملامت کے لیے: کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا جن کو میں نے اپنے رسولوں پر اتارا اور اُن کو حکم دیا کہ وہ تمھاری طرف پہنچا دیں، حالاں کہ وہ تمھاری سمجھ میں نہ آ چکی تھیں، بلکہ پہلے ہی پہل تم نے ان کی تکذیب کی اس حال میں کہ تم ان سے جاہل تھے، ان میں غور و فکر کرنے والے نہ تھے اور نہ ہی ان کے صحیح اور باطل ہونے پر استدلال کرنے والے تھے، محض اپنے تکبر، سرکشی اور عناد کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ پر جرأت کی بنا پر اور اس کے رسولوں پر جرأت کی بنا پر۔ اس میں انتہا درجے کی ملامت اور دھمکی ہے، اس لیے کہ جس شخص نے کسی شے کی تکذیب کی، حالاں کہ وہ ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آ چکی تو وہ بے شک جھوٹا ہے اپنی تکذیب میں اور اس نے اپنی جہالت اور ناانصافی کا اقرار کیا اور اپنے سوئے فہم اور کم فہمی کا اعتراف کیا۔

اسی قبیل سے وہ شخص ہے جو شرعی علوم میں سے کسی علم کی مذمت کے درپے ہے، یا اس علم کی مذمت کے لیے ارادہ کرتا ہے جو شرعی علوم کے مقدمات میں سے ہے، یا وسیلہ ہے کہ اس کے سبب سے ان علوم کی طرف پہنچا جاتا ہے اور اُن کی معرفت اور ان کے معانی سمجھنے میں زیادہ بصیرت بخشتا ہے، جیسے: لغتِ عربی کے سارے علوم۔ یہ بارہ (۱۲) علم ہیں اور علمِ اصولِ فقہ، کیوں کہ اس سے احکامِ شرعیہ کا استنباط، ان کے تفصیلی دلائل کی طرف توصل کیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ قواعدِ کلیہ لغت کے بیان پر مشتمل ہے اور اسی طرح ان علوم میں سے جن علوم کا زیادہ فائدہ ہے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھنے کے لیے۔

لہٰذا جو کوئی ایسے علوم کی مذمت کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو یقیناً اس نے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ جاہل اور نادان ہے اور علومِ شرعیہ میں ابطل طریقے سے جھگڑا کرنے والا ہے اور طعن کرنے والا ہے۔ وہ اس کا مستحق ہے کہ کوئی عذاب سزا کے طور پر اس پر نازل ہو کہ اس کو اس کی جہالت اور گمراہی کی وجہ سے زجر و توبیخ کرے اور جس شے کو وہ جانتا پہچانتا نہیں ہے اور نہ ہی اس کی حقیقت سے واقف ہے، اس پر طعن کرنے سے اس کو باز رکھے، تاکہ وہ دوسرں کے لیے عبرت ہو جائے اور ایک نصیحت بن جائے کہ جو لوگ اس کی طرح ضعیف العقل اور رکیک الدین اور

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٣٠٢)

جھوٹ کے طور پر متلبس بعلم ہیں، اس سے نصیحت پذیر ہوں۔ ﴿ اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ "أم" منقطعہ بہ معنی "بل" ہے، یعنی بلکہ کس شے کو تم کرتے تھے، یہاں تک کہ اس نے تم کو آیتوں میں نظر کرنے اور اُن کے معانی میں غور وفکر کرنے سے باز رکھا۔ یہ استفہام ان کے لیے سرزنش کے طور پر ہے۔

﴿ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴾ یعنی ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر عذاب واجب ہوا، ایسے ظلم کی وجہ سے جو ہر قسم کے ظلم سے بڑھ کر ہے، یعنی شرک باللہ۔ چنانچہ وہ اس وقت کچھ نہیں بولتے، جب ان پر قول واقع ہو جاتا ہے، یعنی ان کے لیے کوئی عذر نہیں ہے جس کو پیش کریں۔ یا یہ معنی ہیں کہ عظیم ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ بولنے پر قادر نہیں ہوتے ہیں۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی، اس لیے وہ نہ بولیں گے۔ غرضیکہ پہلے تو اللہ پاک نے ان کو قیامت کے دن کی ہولناکیوں سے ڈرایا، اس کے بعد اس شے کا ذکر کیا جو توحید، حشر اور نبوت پر ایسی دلیل ہو کہ جس میں ہدایت کے لیے مبالغہ ہو اور معذرت ہو۔

لہٰذا فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ ﴾ یعنی کیا انھوں نے نہیں جانا کہ ہم نے رات کو سکون وچین اور قرار پکڑنے کے لیے اور سونے کے لیے بنایا ہے، اس طرح سے کہ اس میں تاریکی ہے اور اندھیرے کی وجہ سے معاش کے لیے اس میں دوڑ دھوپ نہیں کرتے۔ ﴿ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ﴾ اور دن کو روشن بنایا، تاکہ اس میں اپنے معاش کو دیکھیں جس کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور جس کا حاصل کرنا ان کے لیے ضروری ہے۔ دن کو "إبصار" یعنی دیکھنے کے ساتھ موصوف کیا، حالاں کہ یہ وصف لوگوں کا ہے، تو اس سے غرض دن کی روشنی میں مبالغہ کرنا ہے، گویا وہ دن ایسا روشن ہے کہ خود اس شے کو دیکھتا ہے جو اس میں ہے، چنانچہ کلام میں اسناد عقلی ہے، یعنی "إبصار" کا اسناد زمان کی طرف کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ عبارت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ مُظْلِمًا لِيَسْكُنُوْا" "مُظْلِمًا" کو اس لیے حذف کر دیا کہ "مُبْصِرًا" اس پر دال ہے۔ اس کی تحقیق سورۃ الشعراء اور یونس میں گزر چکی ہے۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی بے شک یہ بات جس کا ذکر ہوا اس میں البتہ ان لوگوں کے لیے علامتیں اور دلالتیں ہیں، جو ایمان لاتے ہیں اللہ پاک پر۔ اس آیتِ کریمہ میں موت کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے کے برحق ہونے کی دلیل ہے، اس لیے کہ جو ذات پاک اس بات پر قادر ہے کہ روشنی کو تاریکی سے ڈھانپ دیتا ہے اور تاریکی کو روشنی سے، وہ موت کے بعد دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے، اس میں کیسے دلیل نہ ہوگی، حالاں کہ جو کوئی اس بات میں غور کرے گا کہ رات دن آتے جاتے ہیں، ایک کے بعد دوسرا آتا ہے اور یہ کہ رات دن کا مختلف ہونا ایسی حکمتوں پر مبنی ہے جن کو سمجھنے سے عقلیں حیران ہوتی ہیں اور اللہ پاک کے سوا کوئی اُور ان کا احاطہ نہیں کر سکتا اور

جو کوئی زمین کے چاروں طرف اور اُفقوں پر رات کی تاریکی کے بدلنے کا مشاہدہ کرے گا، جو موت کے مشابہ ہے۔ دن کی روشنی کے ساتھ جو زندگی کے مشابہ ہے اور یہ بھی معائنہ کرے گا کہ نیند جو موت کی بہن ہے جاگنے کے ساتھ بدلتی ہے، جو زندگی کی طرح ہے تو وہ اس بات کا یقین کر لے گا کہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے اور اللہ پاک ان لوگوں کو اُٹھا کھڑا کرے گا جو قبروں میں ہیں اور وہ اس بات کا یقین کر لے گا کہ بے شک اللہ پاک نے اس کو ایک نمونہ اور دلیل ٹھہرایا ہے، جس سے اس بات پر دلیل پکڑی جاتی ہے کہ ساری آیات حق ہیں اور اللہ پاک کے پاس سے نازل ہوئی ہیں۔[1] (قاله أبو السعود) پھر اللہ پاک نے قیامت کی ایک اور نشانی ذکر کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ
فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ۸۷ وَتَرَى
الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ
اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۸۸ مَنْ
جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ
اٰمِنُوْنَ ۸۹ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ
هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۹۰

اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے (سب) گھبرا جائیں گے، سوائے اس کے جسے اللہ چاہے، اور (یہ) سب عاجز ہو کر اللہ کے حضور جائیں گے (87) اور آپ پہاڑوں کو دیکھیں گے تو ان کو جامد (اپنی جگہ جمے ہوئے) سمجھیں گے، جبکہ وہ بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہوں گے، یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو پختہ اور مضبوط بنایا، بے شک وہ باخبر ہے اس سے جو تم کرتے ہو (88) جو شخص نیکی لائے گا، تو اس کے لیے اس سے زیادہ بہتر (بدلہ) ہو گا، اور وہ اس دن ہر گھبراہٹ سے بے خوف ہوں گے (89) اور جو شخص برائی لائے گا تو ان کے منہ آگ میں اوندھے کر دیے جائیں گے (اور کہا جائے گا:) تم بس اسی کا بدلہ پاؤ گے جو تم عمل کرتے تھے (90)

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٣٠٣) [2] فتح البيان (١٠/ ٧٤_ ٧٦)

قیامت کی ہولناکیوں کا تذکرہ:

ایک بار صور پھونکے گا تو سب مر جائیں گے اور دوسرا پھونکے گا تو جی اُٹھیں گے، اس کے بعد جو پھونکے گا تو گھبرا جائیں گے اور پھونکے گا تو بے ہوش ہو جائیں گے اور پھونکے گا تو ہوشیار ہو جائیں گے۔ صور پھونکنا بہت بار ہے۔ پہاڑوں کا بادلوں کی طرح چلنا قیامت میں ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا﴾ [طٰهٰ: ١٠٥] ''میرا رب انھیں اُڑا کر بکھیر دے گا۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس دن کی ہولناکی کی خبر دیتا ہے جس دن فزع کا نفخہ صور میں پھونکا جائے گا۔ صور وہ ہے جیسا کہ حدیث شریف میں مروی ہے کہ وہ ایک قرن ہے جس میں پھونکا جائے گا۔ حدیثِ صور میں آیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس میں پھونکے گا وہ اسرافیل علیہ السلام ہے۔ چنانچہ وہ اس میں پہلا نفخہ فزع (گھبراہٹ) کا پھونکے گا اور وہ دنیا کی عمر کے آخر میں ہوگا، جب کہ قیامت قائم ہوگی زندہ رہ جانے والے لوگوں پر جو شریر ہوں گے تو اس سے ہر ایک جو آسمانوں اور زمین میں ہے گھبرا جائے گا، مگر جس کو اللہ چاہے۔ یہ لوگ شہداء ہیں، بے شک وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس اُن کو رزق ملتا ہے۔

امام مسلم بن حجاج نے یعقوب بن عاصم بن عروہ بن مسعود ثقفی سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے سنا اور اُن کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: یہ کیا حدیث ہے جو تو بیان کرتا ہے کہ ''إِنَّ السَّاعَةَ تَقُوْمُ إِلَى كَذَا وَكَذَا''؟ فرمایا: ''سبحان الله'' یا ''لا اله الا الله'' یا اس طرح کا کوئی اور کلمہ کہا۔ البتہ میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ کسی کو میں کسی شے کی بھی حدیث بیان نہ کروں، میں نے تو یہ کہا ہے کہ ایک زمانۂ قلیل کے بعد عن قریب تم دیکھو گے ایک بہت بڑا امر۔ بیت اللہ خراب ہو جائے گا اور ہوگا اور ہوگا۔ پھر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں دجال نکلے گا، پھر وہ ٹھہرے گا چالیس، میں نہیں جانتا کہ چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال۔ پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو بھیجے گا۔ گویا وہ عروہ بن مسعود ہیں تو وہ دجال کو تلاش کریں گے اور اسے ہلاک کر ڈالیں گے۔ پھر لوگ سات برس ٹھہریں گے، اس مدت میں دو آدمیوں کے درمیان عداوت نہ ہوگی۔ پھر اللہ شام کی طرف سے ایک سرد ہوا بھیجے گا تو روئے زمین پر کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے گا جس کے دل میں ذرہ برابر خیر یا ایمان ہوگا مگر وہ اس کی روح کو قبض کر لے گی۔ یہاں تک کہ اگر تم میں سے کوئی کسی پہاڑ کے جگر میں داخل ہوگا تو وہ ہوا بھی وہاں داخل ہو جائے گی اور اس کی روح کو قبض کر لے گی۔ کہا: میں نے ان باتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ کہا: پھر شریر لوگ باقی رہ جائیں گے پرندوں کی سبکی میں اور درندوں کی عقلوں میں، وہ کسی نیک بات کو نہیں پہچانیں گے اور کسی بری بات کو نہ چھوڑیں گے۔ شیطان ان کے روبرو صورت بن کر آئے گا اور کہے گا: کیا تم کہنا نہیں مانتے ہو؟ وہ کہیں گے: پھر تو ہم کو کیا حکم کرتا ہے تو وہ ان کو بتوں کی عبادت کا حکم کرے گا۔

"وَهُمْ فِيْ ذٰلِكَ دَارٌّ رِزْقُهُمْ، حَسَنٌ عَيْشُهُمْ" یعنی وہ اس حال میں ہوں گے کہ ان کی روزی مینہ کی طرح برس رہی ہوگی، ان کی گزران بہت خوب ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود بت پرستی کے خوب آسودگی کے ساتھ گزر ہوگی۔ پھر صور پھونکا جائے گا تو اس کو کوئی نہیں سنے گا "إِلَّا أَصْغَى لِيتًا وَرَفَعَ لِيتًا" مگر گردن کے ایک حصے کو جھکائے گا اور دوسرے حصے کو اٹھائے گا۔ ("لیت" بکسرِ لام بہ معنی صفحۂ گردن ہے، یعنی سننے والا خوف اور دہشت کے مارے بے ہوش ہو جائے گا تو اس کے قویٰ ساقط ہو جائیں گے۔ وہ ایک لیت کو جھکائے گا اور ایک لیت کو اٹھائے گا، جس کو صور کی چنگھاڑ پہنچتی ہے، اس کا حال ایسا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ پہلی بات جو اس سے ظاہر ہوگی وہ یہ ہے کہ اس کا سر احد شقین کی طرف، یعنی ایک طرف گر پڑے گا، چنانچہ اصغاء کی نسبت اس کی طرف اختیاری فعل کی نسبت ہے۔ كذا في مجمع البحار)

کہا: اور سب سے پہلے جو اس کو سنے گا وہ وہ شخص ہے جو اپنے اونٹوں کے حوض کو مٹی سے لیپ کر رہا ہوگا، یعنی اس کو درست کر رہا ہوگا، پھر وہ بے ہوش ہو جائے گا اور لوگ بے ہوش ہو جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ بارش کو بھیجے یا اتارے گا، گویا وہ طَلّ ہے یا کہا کہ ظِل۔ شک کرنے والا النعمان ہے، جو یعقوب سے روایت کرتا ہے۔ ("طَلّ" بطائے مہملہ وہ شے ہے، جو آسمان سے نازل ہوتی ہے بغیر بادل کے یعنی شبنم، اور طل ہلکی بارش کو بھی کہتے ہیں، زیادہ صحیح "طَلّ" بطائے مہملہ ہے اور یہی اس کے موافق ہے، جو حدیث میں مروی ہے کہ مطر مردوں کی منی کی طرح ہو گا۔[1] كذا في مجمع البحار)

چنانچہ اسی مطر سے لوگوں کے جسم اُگیں گے۔ پھر صور میں اور پھونک پھونکی جائے گی تو اسی وقت لوگ دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر کہا جائے گا: اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ، یعنی جلد دوڑو۔ ﴿وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَّسْئُولُونَ﴾ یہ فرشتوں سے کہا جائے گا، یعنی ان کو ٹھہراؤ ان سے پوچھ گچھ ہوگی۔ پھر کہا جائے گا: «أَخْرِجُوا بَعْثَ النَّارِ» یعنی آگ میں بھیجے جانے والے لوگوں کو نکالو۔ پھر کہا جائے گا: "مِنْ كَمْ؟" یعنی فرشتے پوچھیں گے کہ کتنوں میں سے کتنے نکالے جائیں؟ تو کہا جائے گا کہ ہر ایک ہزار سے نو سو ننانوے۔ کہا: چنانچہ وہ دن ایسا ہوگا کہ بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور یہ وہ دن ہے کہ جس میں پنڈلی کھولی جائے گی۔[2]

(سلف کے نزدیک کشفِ ساق، یعنی پنڈلی کے کھولے جانے میں توقف واجب ہے، یعنی اس کی تاویل نہ کی جائے، صرف اس پر ایمان لانا واجب ہے، اس کی کیفیت اللہ پاک جانے۔ بعض نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ کشفِ ساق سے شدت وسختی مراد ہے اور وہاں نہ کوئی ساق ہے نہ کوئی کشف ہے۔ محاورۂ عرب میں اس کی اصلیت یہ ہے کہ کوئی شخص جب کسی سخت امر میں پڑ جاتا ہے تو بولتے ہیں: "شَمَرَ سَاعِدَهُ وَكَشَفَ عَنْ سَاقِهِ"[3] كذا في مجمع البحار)

---

[1] مستدرك الحاكم (٤/ ٥٤١) مجمع بحار الأنوار (٣/ ٤٥٧) امام حاکم اور امام ذہبی ؒ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٤٠) [3] مجمع بحار الأنوار (٣/ ١٤٩)

اس حدیث میں جو یہ آیا ہے: «فَلَا يَسْمَعُهُ أَحَدٌ إِلَّا أَصْغَى لِيتًا وَّرَفَعَ لِيتًا» چنانچہ لیت صفحۂ گردن کو کہتے ہیں، یعنی جو کوئی اس کو سنے گا تو وہ اپنی گردن کو جھکائے گا، تاکہ آسمان سے اس کو اچھی طرح سے سنے۔ لہٰذا یہ تو نفخۂ فزع ہے، پھر اس کے بعد صعق کا نفخہ ہے، یعنی موت کا نفخہ۔

پھر اس کے بعد قیام کا نفخہ ہے، یعنی رب العالمین کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا اور یہی ہے سب خلائق کا قبروں سے زندہ ہونا اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴾ اس کو صیغۂ اسم فاعل کے ساتھ مد کے ساتھ پڑھا ہے اور مد کے بغیر بصیغۂ فعل بھی۔ ﴿ كُلٌّ ﴾ "كُلُّ وَاحِدٍ" کے معنی میں ہے اور ﴿ دٰخِرِيْنَ ﴾ بہ معنی "صَاغِرِيْنَ مُطِيْعِيْنَ"، یعنی اس کے حکم سے کوئی بھی پیچھے نہ رہے گا، ایک ایک کر کے سب کے سب ذلیل اور مطیع ہو کر حاضر ہوں گے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ ﴾ [بني إسرائیل: ٥٢] "جس دن وہ (اللہ) تمھیں بلائے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے تعمیلِ ارشاد کرو گے۔" نیز فرمایا: ﴿ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴾ [الروم: ٢٥] "پھر جب وہ تمھیں زمین میں سے ایک ہی بار پکارے گا تو تم یکا یک (باہر) نکل آؤ گے۔"

حدیثِ صور میں ہے کہ تیسرے نفخے میں اللہ حکم دے گا روحوں کے بارے میں تو وہ صور کے سوراخوں میں رکھی جائیں گی، پھر اسرافیل علیہ السلام اس میں پھونکیں گے، اس کے بعد کہ جسم اپنی قبروں میں اور اپنی جگہوں میں اُگ چکے ہوں گے، پھر جس وقت صور میں پھونکا جائے گا تو روحیں اُڑیں گی، اس حال میں کہ مومنوں کی روحیں تو نور سے چمکتی ہوں گی اور کافروں کی روحوں پر تاریکی چھا رہی ہو گی۔ پھر اللہ عزوجل فرمائے گا: قسم ہے میری عزت اور جلال کی کہ البتہ لوٹ جائے ہر روح اپنے جسم کی طرف، تو روحیں اپنے جسموں کی طرف آئیں گی۔ پھر وہ اُن میں آہستہ آہستہ داخل ہوں گی، جیسے سانپ کے کاٹے ہوئے میں زہر آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ پھر وہ اپنی قبروں میں سے خاک جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔[1] اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴾ [المعارج: ٤٣] "جس دن وہ قبروں سے دوڑتے نکلیں گے، جیسے وہ آستانوں کی طرف دوڑ رہے ہوں۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ یعنی تو دیکھے گا پہاڑوں کو گویا وہ اس حال پر ثابت اور باقی ہیں جس پر وہ تھے، حالاں کہ وہ اس طرح گزر رہے ہیں جس طرح بادل گزرتے ہیں، یعنی وہ اپنی جگہوں سے ٹل جائیں گے۔ جیسے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴾ [الطور: ٩۔ ١٠] "(وہ واقع ہوگا) جس دن آسمان زور سے حرکت کرنے لگے گا۔ اور پہاڑ تیزی سے چلنے لگ جائیں گے۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا

[1] شعب الإیمان (١/ ٣٠٩۔ ٣١٢) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہے۔

صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴾ [طه: ١٠٥۔ ١٠٧] ''اور وہ آپ سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے: میرا رب انھیں اُڑا کر بکھیر دے گا۔ پھر وہ اس (زمین) کو چٹیل میدان (بنا) چھوڑے گا۔ آپ اس میں نہ کوئی کجی دیکھیں گے اور نہ اُبھری جگہ۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ﴾ [الكهف: ٤٧] ''اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور آپ زمین کو صاف کھلی (میدان کی طرح) دیکھیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنی قدرتِ عظیم سے یہ کام کرتا ہے، وہ قدرت جس نے ہر شے کو مضبوط کیا ہے، یعنی اس نے مخلوق کو استحکام اور مضبوطی بخشی ہے اور اس میں حکمت رکھی ہے۔ ﴿ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ یعنی بندے جو کچھ خیر وشر کرتے ہیں وہ اس کو خوب جانتا ہے اور اس پر ان کو پوری پوری جزا دے گا۔

نیک بختوں اور بدبختوں کی جزاء وسزا کا بیان:

پھر اللہ پاک نے نیک بختوں اور بدبختوں کا حال بیان کیا جو اس دن ہوگا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''حسنة'' سے مراد اخلاص ہے۔ امام زین العابدین رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' ہے[1] اور اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے کہ اس کے لیے اس کی نیکی کا دس گنا ہے۔ ﴿ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴾ یعنی اس دن نیک بخت لوگ گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ ﴾ [الأنبياء: ١٠٣] ''بڑی گھبراہٹ انھیں غم ناک نہیں کرے گی۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ [حم السجدة: ٤٠] ''کیا پھر جو شخص آگ میں ڈالا جائے گا، وہ بہتر ہے یا وہ جو روزِ قیامت امن کے ساتھ آئے گا؟'' نیز فرمایا: ﴿ وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴾ [سبا: ٣٧] ''اور وہ بالا خانوں میں امن سے رہیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ﴾ یعنی جو کوئی اللہ پاک سے گناہ گار ہو کر ملے گا، جس کے پاس کوئی نیکی نہ ہوگی، یا اس کی بدیاں اس کی نیکیوں سے بڑھی ہوں گی، ہر ایک کو اس کے مطابق جزا ملے گی۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ، انس بن مالک رضی اللہ عنہم، امام عطاء، سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، ابراہیم نخعی، ابو وائل، ابو صالح، محمد بن کعب، زید بن اسلم، زہری، سدی، ضحاک، حسن، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ ان سب نے کہا ہے کہ ''سيئة'' سے مراد شرک ہے۔[2] الٰہی سیدی مولائی! تو اپنے فضل وکرم ورحم سے ہم سب کو شرکِ جلی وخفی سے بچانا، سچا پکا مومن صالح کر کے دنیا سے

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٠٨)

[2] تفسير الطبري (١٩/ ٥٠٧۔ ٥٠٩) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٣٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٩٧۔ ٤٩٩)

اٹھانا اور توبہ وعمل صالح کی توفیق دینا۔ وما ذلك عليك بعزيز آمين. اللهم فصل و سلم و بارك على سيدنا و مولانا و شفيعنا سيد المرسين محمد، و علىٰ آله و صحبه عدد ما علمت وزنة ما علمت وملء ما علمت، آمين.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع وضاحت کے یہ ہے کہ ﴿ يَوْمَ يُنْفَخُ ﴾ معطوف ہے ﴿ يَوْمَ نَحْشُرُ ﴾ پر اور اسی کے ناصب متقدم سے منصوب ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "ذٰلِكُمْ يَوْمٌ يُّنْفَخُ فِيْ الصُّوْرِ"[1] یعنی مبتدائے محذوف کی خبر ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ صور ایک قرن ہے، جس میں اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے۔ سورۃ الانعام میں اس پر پورا مفصل کلام گزر چکا ہے۔[2] صور میں تین نفخے ہیں: پہلا نفخۂ فزع ہے اور دوسرا نفخۂ صعق ہے اور تیسرا نفخۂ بعث ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دو نفخے ہیں اور نفخۂ فزع دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو راجع ہوگا نفخۂ صعق کی طرف یا نفخۂ بعث کی طرف۔ امام قشیری اور قرطبی رحمہما اللہ وغیرہما نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نفخہ جو اس جگہ مذکور ہے، وہ "یوم النشور" کا ہے،[3] یعنی قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے کا ہے۔

﴿ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہر کوئی جو آسمانوں میں ہے اور ہر کوئی جو اس وقت زندہ ہوگا، جس کو موت پہلے نہیں آ چکی، یا وہ مردہ ہے، لیکن اپنی قبر میں زندہ ہے، جیسے انبیاء و شہداء ہیں، تو وہ ایسا ڈرنا ڈریں گے جو انھیں موت کی طرف لے جائے گا، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴾ [الزمر: ٦٨] "تو جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے بے ہوش ہو جائے گا، سوائے اس کے جسے اللہ چاہے، پھر اس میں دوسری بار پھونکا جائے گا تو وہ یکا یک کھڑے (ہو کر) دیکھنے لگیں گے۔" اور اس شے کی شدت کی وجہ سے جس کو سنیں گے جگہ سے اُکھڑ جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ فزع سے مراد ندا کو قبول کرنا اور اس کی طرف جلدی کرنا اور دوڑنا ہے، یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے: "فَزِعْتُ إِلَيْكَ فِيْ كَذَا"۔ یعنی میں نے تیری طرف تیزی کی فلاں کام میں جب کہ تو اس کی اجابت کی طرف جلدی کرے، لیکن پہلا قول آیت کے معنی کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے۔ رہی یہ بات کہ "فَزِعَ" میں ماضی کے ساتھ تعبیر کی، باوجود اس کے کہ وہ مضارع، یعنی ﴿ يُنْفَخُ ﴾ پر معطوف ہے تو غرض اس سے تحققِ وقوع پر آگاہ کرنا ہے جیسا کہ اس بارے میں علمائے بیان نے ذکر کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ معنی پر محمول ہے، اس لیے کہ معنی "إِذَا نُفِخَ" ہیں۔[4]

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٣٩) [2] رقم الآية (٧٣) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٤٠) [4] فتح القدير (٤/ ٢٠٤)

﴿ اِلَّا مَنْ شَآءَاللّٰهُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس نفخے کے وقت اللہ پاک جس کا گھبرانا نہ چاہے گا تو وہ نہ گھبرائے گا۔ جس کے لیے یہ استثناء واقع ہوا ہے، اس میں اختلاف ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ چنانچہ کسی نے تو یہ کہا ہے کہ وہ انبیاء اور شہداء ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ملائکہ۔ کسی نے کہا ہے کہ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ حورِ عین اور جہنم کے داروغہ لوگ ہیں اور عرشِ معلیٰ کے اٹھانے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ سارے مومنین ہیں، ما بعد کے قول کی دلیل سے: ﴿ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴾۔ ممکن ہے کہ استثناء ان سب کے لیے ہو جن کا ذکر ہو چکا ہے، اس سے کوئی مانع نہیں ہے۔

قاضی بیضاوی نے بھی مذکورہ اقوال ذکر کیے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کا اضافہ کیا ہے، اس لیے کہ ان کو ایک بار بے ہوشی ہو چکی ہے۔ اس کے بعد کہا ہے: شاید وہ شے مراد ہے جو اس کو عام ہو،[1] کیوں کہ خصوصیت کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ انتہیٰ۔ پس فزع ان سب لوگوں کو غشی اور بے ہوشی تک نہ پہنچائے گا، بلکہ اس درجے سے کم ہوگا۔ جمہور نے "آتُوْهُ" پڑھا ہے بصیغۂ اسم فاعل اور ضمیر کی طرف مضاف جو اللہ پاک کی طرف راجع ہے۔ امام اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ، حفص اور عاصم رحمہ اللہ نے "أَتَوْهُ" پڑھا ہے بصیغۂ فعل ماضی اور اسی طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پڑھا ہے اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے "كُلٌّ أَتَاهُ" پڑھا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے بصیغۂ فعل ماضی پڑھا ہے تو اس نے لفظ ﴿ كُلٌّ ﴾ کی بنا پر واحد کا صیغہ کیا ہے اور جس نے بصیغۂ اسم فاعل پڑھا ہے تو اس نے ﴿ كُلٌّ ﴾ کے معنی کی بنا پر جمع کا صیغہ کیا ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے زجاج رحمہ اللہ کا قول ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ ظاہری طور پر غلط ہے، اس لیے کہ دونوں قراءتوں میں توحید نہیں ہے، یعنی واحد کا مفہوم۔ بلکہ توحید صرف قراءتِ قتادہ میں ہے۔ کاتبِ حروف، عفا اللہ عنہ، عرض کرتا ہے کہ مراد زجاج کی یہی قراءتِ قتادہ ہے۔ اب نہ غلط ظاہر ہے نہ غیر ظاہر۔ امام زجاج رحمہ اللہ ایسے نہیں ہیں کہ ﴿ اٰتَوْهُ ﴾ کو واحد کا صیغہ بتائیں، ان کی مراد وہی ہے۔

﴿ دٰخِرِيْنَ ﴾ جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اس کے معنی "صَاغِرِيْنَ وَذَلِيْلِيْنَ" ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[2] امام اعرج رحمہ اللہ نے "دَخِرِيْنَ" الف کے بغیر پڑھا ہے،[3] اس کا نصب بنا بر حال ہے۔ مراد ذلت و ہیبت کا صغار ہے جبار سے، چنانچہ یہ طائعین اور عاصین دونوں کو شامل ہوگا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد عبودیت اور غلامی کی ذلت ہے۔ گناہوں اور معاصی کی ذلت مراد نہیں اور یہ ساری خلق کو عام اور شامل ہوگی، جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾ [مریم: ۹۳] "آسمان و زمین میں جو بھی ہیں سب کے سب اللہ کے غلام بن کر ہی آنے والے ہیں۔" قاموس میں کہا

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٨٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٣٢) [3] فتح القدير (٤/ ٢٠٤)

ہے: ”دَخَرَ الشَّخصُ كَمَنَعَ وَفَرِحَ دَخْرًا وَّدُخُورًا صَغُرَ وَذَلَّ“.[1] وَأَدْخَرْتُهُ بِالْأَلِفِ لِلتَّعْدِيَةِ“ اس کی تفسیر سورۃ النحل میں گزر چکی ہے۔[2]

جملہ ﴿ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً ﴾ معطوف ہے ﴿ يُنْفَخُ ﴾ پر اور ﴿ تَرَى ﴾ میں رسول اللہ ﷺ کو یا ہر اس شخص کو خطاب ہے جو رویت کی صلاحیت رکھتا ہے اور ﴿ تَحْسَبُهَا ﴾ بہ فتح و کسرِ سین دونوں طرح ہے۔ (اہلِ کوفہ نے بہ فتحِ سین اور باقی قاریوں نے بالکسر پڑھا ہے۔) اور محلِ نصب میں ہے اس بنا پر کہ حال ہے ﴿ تَرَى ﴾ کی ضمیر سے، یا اس کے مفعول سے، اس لیے کہ رویت بصری ہے، ایک مفعول اس کو کافی ہو جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ ﴿ تَرَى الْجِبَالَ ﴾ سے بدل ہے، لیکن اس میں ضعف ہے اور ﴿ جَامِدَةً ﴾ ”تحسب“ کا مفعولِ ثانی ہے۔ غرضیکہ یہ قیامِ قیامت کی تیسری نشانی ہے، معنی یہ ہیں کہ تو نے دیکھا پہاڑوں کو اس حال میں کہ تو اُن کو خیال کرے کہ وہ اپنی جگہ پر قائم اور ساکن ہیں۔ (”جامدة“ کی تفسیر ”قائمة“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔)[3]

جملہ ﴿ وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ محلِ نصب میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ جَامِدَةً ﴾ سے حال ہے، یعنی تُو تو ان کو قائم سمجھتا ہے، حالاں کہ وہ تیز تیز چل رہے ہیں بادلوں کی طرح، جن کو ہوائیں چلاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عظیم اور بڑی چیز اور بڑا اجتماع جس کی کثرت اور عظمت کی وجہ سے نظر اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہوتی ہے اور اس کے کناروں کا ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہونا نظر کے احاطہ کرنے میں نہیں آتے، وہ ٹھہرے ہوئے نظر آتے ہیں، حالاں کہ وہ چل رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح قیامت کے دن پہاڑوں کا چلنا ہے، ان کی عظمت کی وجہ سے ان کا چلنا دکھائی نہیں دیتا۔ جس طرح کہ بادلوں کا چلنا ان کی عظمت کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہاڑ جمع کیے جائیں گے اور چلائے جائیں گے اور وہ آنکھ سے دیکھنے میں ایسے لگیں گے کہ اپنی جگہ پر قائم ہیں، حالاں کہ وہ چل رہے ہوں گے۔[4] امام نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا اور اسی طرح اجرامِ عظام، یعنی بڑے جسم جو کثرتِ تعداد میں ہوں، وہ جب ایک سمت میں حرکت کرتے ہیں تو اُن کی حرکت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کے لگ بھگ قاضی بیضاوی نے بھی فرمایا ہے۔[5] امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قیامت کے دن ہوگا۔ اسی کے مثل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴾[6] [النبأ: ٢٠] ”اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب (ریت) کی طرح ہو جائیں گے۔“

امام ابو السعود نے کہا ہے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جو نفخۂ ثانیہ کے بعد واقع ہوں گی، جس وقت خلق دوبارہ زندہ کی جائے گی۔ اللہ زمین کو بدل دے گا، اس کی ہیئت کو تبدیل کر دے گا اور پہاڑوں کو اُن کی قرار گاہوں سے چلائے گا، اس ہولناک ہیئت پر جس کا ذکر ہو چکا ہے، تا کہ اہلِ محشر ان کا مشاہدہ کریں، اگرچہ نفخۂ اولیٰ کے وقت ریزہ ریزہ و پاش پاش ہو چکے ہوں گے، لیکن اُن کا چلانا اور زمین کا برابر کرنا جو ہوگا وہ نفخۂ ثانیہ کے بعد ہوگا۔ چنانچہ

---

[1] القاموس المحيط (١/ ٥٠٠) [2] رقم الآية (٤٨) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٣٣)
[4] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٤٢) [5] تفسير النسفي (٣/ ٢٢٤) تفسير البيضاوي (٤/ ٢٨٠) [6] فتح القدير (٤/ ٢٠٥)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۰۵] ''تو آپ کہہ دیجیے: میرا رب انھیں اُڑا کر بکھیر دے گا۔'' اس پر ناطق ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی اس پر ناطق ہے: ﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ ﴾ [ابراھیم: ۴۸] ''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔'' اس لیے داعی یعنی اسرافیل علیہ السلام کا اتباع اور خلق کا اللہ پاک کے سامنے پیش ہونا جو ان آیتوں میں مذکور ہے وہ نفخہ ثانیہ کے بعد ہی ہو گا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً وَّحَشَرْنٰهُمْ ﴾ [الکھف: ۴۷] ''اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور آپ زمین کو صاف کھلی (میدان کی طرح) دیکھیں گے، اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے۔'' کی تفسیر میں کہا ہے کہ صیغہ ماضی کا معطوف میں ہونا اس کے باوجود کہ معطوف علیہ صیغہ مستقبل میں ہو یہ بات بتانے کے لیے ہے کہ حشر تسییر و رویت پر مقدم ہے، گویا یوں کہا گیا کہ ہم ان کا حشر کر چکے، پہلے اس سے یہ بات تو ہو چکی اب یہ سنو۔ کہا ہے کہ نفخے سے نفخہ اولیٰ مراد ہے اور نفخہ فزع وہ ہے جس کے بعد ہی انتہائی ہولناکیوں کے مارے موت ہو گی۔ جس طرح اس آیت میں ہے: ﴿ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ [الزمر: ۶۸] چنانچہ اس کا اثر انہیں لوگوں کے ساتھ خاص ہو گا، جو اس کے وقوع کے وقت زندہ ہوں گے نہ کہ وہ اُمتیں جو اس سے پہلے مر چکی ہیں اور یہ بات جائز رکھی ہے کہ اتیان داخرین سے مراد اُن کا امر الٰہی کی طرف رجوع ہونا اور ان کا مطیع ہونا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ بات اس قسم سے ہے کہ قرآن شریف کی بارگاہِ عالی جاہ ایسی باتوں سے پاک صاف رکھی جائے۔ اس سے بڑھ کر بعید یہ قول ہے کہ اس نفخہ سے مراد نفخہ فزع ہے جو نفخہ صعق سے پہلے ہو گا اور اس آیت سے یہی مراد ہے: ﴿ وَمَا يَنْظُرُ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴾ [صٓ: ۱۵] ''یہ لوگ تو بس ایک (ہولناک) چیخ کا انتظار کر رہے ہیں، جس میں کوئی وقفہ نہیں ہو گا۔''

پھر اللہ پاک ان پہاڑوں کو چلائے گا تو وہ بادلوں کی طرح چلیں گے، پھر وہ سراب ہو جائیں گے اور زمین اپنے لوگوں کو لے کر خوب ہلے گی اور وہ اس کشتی کی طرح ہو جائے گی جو دریا میں بندھی ہوئی ہے، یا ایک لٹکی ہوئی قندیل کی طرح جس کو ہوائیں ہلا رہی ہیں۔ یہ قول اس قسم سے ہے کہ اس کو مقام سے قطعاً کوئی ربط نہیں ہے، حق بات جس سے مفر نہیں وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، وہ باتیں جو اس بارے میں نص ہیں، ان میں سے وہ آیت ہے جو آگے آتی ہے: ﴿ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴾[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ ﴿ صُنْعَ اللّٰهِ ﴾ کا نصب مصدریت کی بنا پر ہے، یہ خلیل اور سیبویہ وغیرہما کے نزدیک ہے، یعنی فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر یہ ہے: "صَنَعَ اللّٰهُ ذٰلِكَ صُنْعًا"، فعل کو حذف کر کے مصدر کو فاعل کی طرف مضاف کر دیا ہے اور یہ مصدر جملہ ماقبل کے مضمون کا موکد ہے،

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٣٠٤_ ٣٠٥)

اس لیے کہ ماقبل میں جو مذکور ہوا ہے وہ یہی نفخِ صور ہے جو فزعِ عام کا اور ساری مخلوق کے میدانِ محشر میں حاضر ہونے کا باعث ہوا ہے۔ اور پہاڑوں کا چلنا ہے اور یہ سب امور اللہ پاک کی کاری گری سے ہیں، اس کے سوا اور کوئی احتمال نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نصب اغراء (اُکسانا، اُبھارنا) کی بنا پر ہے: ''أَيْ: اُنْظُرُوْا صُنْعَ اللّٰہِ'' یعنی اللہ پاک کی کاری گری کو دیکھو۔ مخاطب لوگوں کو نظر کرنے پر آمادہ کرنا ہے کہ دیکھو اللہ سبحانہ نے کیا کیا عجیب و غریب کاری گری کی ہے۔

﴿ اَلَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے ہر شے کی صنعت کو اِحکام بخشا ہے، اس کو پختہ اور مضبوط بنایا ہے۔ محاورۂ عرب میں ''رَجُلٌ تَقِنٌ'' اس شخص کو کہتے ہیں جو اشیاء کا حاذق و ماہر ہوتا ہے۔ اتقان کے معنی ہیں: کسی شے کو اس کے کامل تر حالات پر لانا۔ یہ معنی اس محاورے سے ماخوذ ہیں: ''تَقِنَ أَرْضَہُ'' یہ جب بولتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی زمین کی طرف مٹی ملا ہوا پانی کھینچ لائے، تاکہ زراعت کے قابل ہو جائے اور اس زمین کو ''أَرْضٌ تَقِنَةٌ'' بولتے ہیں اور اس کے ساتھ اس فعل کے کرنے کو ''تقن'' کہتے ہیں اور جو شے اس میں سے تالاب میں یا زمین میں پھینکی جاتی ہے، اس کو بھی ''تقن'' بولتے ہیں۔ (كذا ذكر السمين)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''أَتْقَنَ أَيْ: أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ صُنْعَهُ وَخَلْقَهُ وَأَوْثَقَهُ''[1] یعنی ہر شے کی صنعت و پیدایش کو حسین و خوبصورت کیا اور اس کو مضبوط و محکم بنایا۔ اتقان کے معنی کا حاصل یہی ہے کہ ہر شے کو اس کے مادے کے مطابق حسین و محکم بنایا اور اس کو اکمل حال پر پیدا کیا ہے کہ اس کے پیدا کرنے کا جو مقصد ہے وہ مکمل طور پر اس سے حاصل ہو۔

پھر جو کچھ اللہ پاک نے بنایا اور ہر شے کو اتقان و مضبوطی بخشی، اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ ﴿ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ خبیر وہ ہے جو ظاہر اور باطن سے خوب واقف ہوتا ہے، یہ نہیں کہ تم کو ہر لحاظ سے مکمل بنا کر چھوڑ دیا ہے اور تم سے بے خبر ہو رہا ہے کہ تم جو چاہو سو کرو، بلکہ اس کو تمھارے کھلے اور چھپے کی خوب خبر ہے اور جس کی یہ صفت ہے وہی ہر شے کو اس کی مکمل حالت پر بنا سکتا ہے۔ جمہور نے خطاب کی بنا پر تائے فوقیہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر، ابو عمرو اور ہشام رحمہم اللہ نے بیائے تحتیہ بنا بر خبر پڑھا ہے۔[2] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اسے اس بات کی خوب خبر ہے کہ اس کے دشمن اس کی کیا کیا نافرمانی کرتے ہیں اور اس کے دوست کیا کیا اطاعت اور فرماں برداری کرتے ہیں۔[3]

پھر خلق کے اعمال و افعال اور ان کی جزا کی یہ تفصیل فرمائی: ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ﴾ الف ولام جنسی ہے، یعنی جو کوئی قیامت کے دن نیکی کی جنس لے کر آئے گا وہ کوئی سی نیکی کیوں نہ ہو تو اس کے لیے اللہ پاک کے پاس اس نیکی سے بہتر اور افضل جزا اور ثواب ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کے لیے خیر ہے جو اس نیکی

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٠٦) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٤٤) [3] تفسير الجلالين (١/ ٥٠٥)

کی بدولت اسے حاصل ہو گی۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا: اس جگہ ”حسنة“ سے مراد ”لا إله إلا الله“ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اخلاص ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ادائے فرائض ہے، لیکن اس کو عام پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے اور تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ (یہ قول صاحبِ فتح القدیر وغیرہ کا ہے، اس کا جواب آیندہ آئے گا۔) اگرچہ بعض سلف تخصیص کے قائل ہوئے ہیں۔ چنانچہ آیندہ اس کا بیان آتا ہے۔ کہا ہے کہ جملہ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا﴾ ﴿اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ﴾ کا بیان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ﴾ کا بیان ہے۔

غرضیکہ جو لوگ قیامت کے دن نیکی لے کر آئیں گے تو اُن کو ان کی نیکی سے بہتر اور زیادہ ثواب ملے گا اور اُن کی یہ عزت کی جائے گی جو فرمایا ہے: ﴿وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ﴾ یعنی وہ اس دن گھبراہٹ سے بے خوف ہوں گے۔ امام عاصم، حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے بہ تنوین ﴿فَزَعٍ﴾ اور بہ فتح میم ﴿يَّوْمَىِٕذٍ﴾ پڑھا ہے اور نافع نے بہ فتحِ میم بغیر تنوین پڑھا ہے۔ باقی قراء نے باضافت ”فَزَعِ“ پڑھا ہے ”يَوْمِئِذٍ“ کی طرف۔ امام ابوعبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مجھے زیادہ پسند ہے، اس لیے کہ تمام تر تاویلوں سے عام ہے، کیوں کہ اس کے معنی اس دن کی ساری فزع سے امن ہے اور تنوین کے ساتھ معنی یہ ہیں کہ ایک فزع سے امن ہے نہ کہ دوسری فزع سے۔[1] کسی نے اس ترجیح کو اس طرح رد کیا ہے کہ فزع تو مصدر ہے اور کثیر کو شامل ہے، چنانچہ جو وجہ ذکر کی ہے، اس سے ترجیح تمام نہیں ہوتی تو اب دونوں قراءتیں ایک معنی میں ہوں گی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ فزع سے مراد وہی فزعِ اکبر ہے جو اس آیت میں مذکور ہے: ﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ﴾ [الأنبياء: ١٠٣] ”بڑی گھبراہٹ انھیں غم ناک نہیں کرے گی۔“ سورت ہود میں اس بارے میں پورے طور پر کلام گزر چکا ہے۔

﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ﴾ صحابہ اور ان کے بعد کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس جگہ ”سيئة“ سے مراد شرک ہے، یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہ بات اہلِ تاویل کے درمیان متفق علیہ ہے۔ تخصیص کی وجہ یہ قول ہے: ﴿فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ﴾ اس لیے کہ یہ جزا صرف شرک کی ہوتی ہے، یعنی جو سزا یہاں مذکور ہے وہ شرک جیسے گناہ کے لیے ہوتی ہے۔ ”سيئة“ کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ شرک لے کر آئیں گے تو وہ آگ میں اپنے منہ کے بل اُوندھے ڈالے جائیں گے۔ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: ”كَبَبْتُ الرَّجُلَ“ جبکہ تو اسے اس کے منہ کے بل ڈال دے۔ ”فَانْكَبَّ وَأَكَبَّ“ پھر وہ اوندھا گر پڑے۔ ”وجوہ“ کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ تمام اعضاء میں سے منہ شرف اور بزرگی کی جگہ ہوتا ہے، جب وہی اوندھا ڈال دیا گیا تو دوسرے اعضا بطریقِ اولیٰ ڈال دیے گئے۔

امام عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا﴾ فرمایا: وہ لا الہ الا اللہ ہے۔ ﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ

[1] فتح القدير (٤/ ٢٠٥)

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا
وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٩١﴾
وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن
ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿٩٢﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ
آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾

(آپ کہہ دیجیے:) بس مجھے تو حکم ہوا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے رب کی عبادت کروں، جس نے اسے حرمت بخشی ہے، اور ہر شے اسی کے لیے ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہو جاؤں (91) اور یہ کہ میں قرآن پڑھوں، پھر جس نے ہدایت پائی تو بس وہ اپنی ہی ذات کے لیے ہدایت پاتا ہے، اور جو گمراہ ہوا تو آپ کہہ دیجیے: میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں (92) اور کہہ دیجیے: تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جلد ہی تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا، پھر تم انھیں پہچان لو گے اور جو کچھ تم عمل کرتے رہے ہو آپ کا رب اس سے غافل نہیں (93)

عبادتِ الٰہی کا حکم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک خبر دیتا ہے اور اپنے رسول ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ یوں کہیں: ﴿ إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ﴾ جس طرح اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي شَكٍّ مِّن دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ [یونس: ١٠٤] ''کہہ دیجیے: اے لوگو! اگر تم میرے دین سے (متعلق) شک میں ہو تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا، جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، لیکن میں تو اللہ کی عبادت کرتا ہوں وہ جو تمھیں وفات دیتا ہے اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہو جاؤں۔'' ربوبیت کی اضافت جو بلدہ کی طرف فرمائی ہے، تو اس کی عزت و شرف اور اعتناء اہتمام کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ ﴿٣﴾ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ﴾ [قریش: ٣۔ ٤] ''لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے انھیں بھوک میں کھانا کھلایا اور اُنھیں خوف سے امن دیا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ الَّذِي حَرَّمَهَا ﴾ یعنی مجھے تو یہی حکم ہے کہ میں اس شہر کے مالک کو پوجوں، جس نے اس کو

حرام کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جو شرع اور قدر کے طور پر حرام ہوا ہے تو اسی کے حکم سے ہوا ہے، اسی نے اس کو حرمت اور عزت بخشی ہے، جیسا کہ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ بے شک یہ شہر ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دن سے حرمت والا بنایا ہے جس دن کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ چنانچہ وہ اللہ کی حرمت سے روزِ قیامت تک حرام ہے، اس کے کانٹے نہ کاٹے جائیں اور اس کا شکار نہ مارا جائے اور اس کی گری پڑی چیز نہ اٹھائی جائے، مگر وہ شخص اسے اٹھا سکتا ہے جو اس کو پہچنوائے اور اس کی باریک تر گھاس نہ کاٹی جائے (یعنی گیلی گھاس۔)[1] الحدیث الشریف بتمامہ، صحاح وحسان ومسانید میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے ایک جماعت کے طرق سے جو اس کو قطعی اور یقینی بناتے ہیں۔ چنانچہ کتاب الاحکام میں اپنی جگہ پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ وللہ الحمد والمنة.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ ﴾ عطفِ عام کے باب سے ہے خاص پر، یعنی وہ اس شہر کا رب ہے اور ہر شے کا رب اور مالک ہے "لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ"۔ ﴿ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴾ یعنی اور مجھ کو اس بات کا حکم ہے کہ میں موحدین اور مخلصین میں سے ہوں جو اس کے حکم کے مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ ﴿ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ﴾ یعنی اور مجھے اس بات کا حکم ہے کہ لوگوں پر قرآن کو پڑھوں اور ان کو قرآن پہنچاؤں، جیسا کہ یہ قول ہے: ﴿ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ مِنَ الْاٰیٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ ﴾ [آل عمران: ۵۸] ''(اے نبی!) یہ جو ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں، آیتیں ہیں اور حکمت والی نصیحت ہے۔'' اور یہ قول ہے: ﴿ نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [القصص: ۳] ''ہم آپ کو موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔'' یعنی میں پہنچانے والا اور ڈرانے والا ہوں۔

﴿ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴾ یعنی میں ان رسولوں کا مقتدی ہوں جنھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا اور اُن پر ادائے رسالت کے کام کی جو ذمے داری تھی اس کے ساتھ قائم ہوئے اور اپنے ذمے سے بری ہو گئے۔ ان کی اُمتوں کا حساب اللہ پاک پر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ ﴾ [الرعد: ۴۰] ''آپ کے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہی ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴾ [هود: ۱۲] ''آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ﴾ یعنی سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو کسی کو عذاب نہیں کرتا، مگر اس پر حجت قائم کرنے کے بعد اور اس کی طرف ڈرانے والا بھیجنے کے بعد۔ اسی لیے یوں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٣)

فرمایا ہے: ﴿ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا ﴾ جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴾ [حم السجدة: ٥٣] ''جلد ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق (دنیا) میں بھی اور خود اُن کی ذات میں بھی دکھائیں گے، حتی کہ ان کے لیے واضح ہو جائے گا کہ بے شک یہ (قرآن) حق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں کہ بے شک آپ کا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴾ یعنی بلکہ وہ شہید ہے ہر شے پر۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اے لوگو! تم میں کوئی ہرگز اللہ کے ساتھ دھوکا نہ کھائے، بے شک اللہ تعالیٰ اگر غفلت کرنے والا ہوتا کسی شے کا تو مچھر اور رائی کے دانے اور ذرے سے غفلت کرتا۔[1] نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ غفلت کرنے والا ہوتا کسی شے سے تو وہ اس شے سے غفلت کرتا جس کو ابن آدم کے دونوں قدموں کے نشان سے ہوائیں مٹا دیتی ہیں۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ان دو شعروں کو پڑھا کرتے تھے، یا یہ خود انہی کے ہیں یا کسی اور کے:

إِذَا مَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْمًا فَلَا تَقُلْ ... خَلَوْتُ وَلٰكِنْ قُلْ عَلَيَّ رَقِيْبُ
وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ يَغْفُلُ سَاعَةً ... وَلَا أَنَّ مَا يَخْفٰى عَلَيْهِ يَغِيْبُ[3]

("يَخْفَى: أَيْ: يَظْهَرُ" خفا اضداد سے ہے) یعنی جب کبھی تو کسی دن زمانے میں تنہا ہو تو ایسا مت کہہ کہ میں تنہا ہوں، لیکن یوں کہہ کہ مجھ پر تو ایک نگہبان ہے اور مت خیال کر اللہ پاک کو کہ وہ گھڑی بھر کے لیے غافل ہوتا ہے اور نہ اس بات کا خیال کر کہ جو شے اس پر ظاہر ہے، وہ اس سے غائب ہو جاتی ہے، ہرگز نہیں۔ واللہ! باللہ! اس سے کوئی شے مخفی نہیں ہے، نہ اس سے کوئی شے غائب ہوتی ہے، نہ وہ کسی شے کو بھولتا ہے: ﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى ﴾ [طٰہٰ: ٥٢] ''میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔'' آخر تفسیر سورۃ النمل۔ وللّٰه الحمد والمنة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان سے یہ کہہ دیں: ﴿ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ ﴾ ان کو اس بات سے آگاہ کرنے کے لیے کہ دعوت کا کام ایسا پورا ہو چکا کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور اس کے بعد اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا کہ اللہ پاک کی عبادت میں مشغول ہوں اور اس کے مراقبے میں مستغرق ہو جائیں اور ان کی کچھ پروا نہ کریں، وہ راہ پر آئیں یا نہ آئیں، سدھریں یا بگڑیں، تا کہ یہ تنبیہ اس بات کا باعث ہو کہ وہ اپنی جانوں کے کام کا اہتمام کریں اور جو کھلی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٣٧) اس کی سند میں ''ابو امیہ ثقفی'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٢١٤)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٣٧) [3] تفسیر ابن كثير (٣/ ٤٩٩۔ ٥٠٠)

نشانیاں دیکھ چکے ہیں ان میں غور وفکر کریں اور سوچیں سمجھیں۔

معنی یہ ہیں کہ اے نبی! تو ان سے کہہ دے کہ مجھے تو یہی حکم ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کو عبادت کے ساتھ خاص کروں، اسی اکیلے کو پوجوں۔ ''بلدۃ'' سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[1] باقی شہروں میں سے اس شہر کو اس لیے خاص فرمایا کہ اس میں اللہ پاک کا بیتِ حرام اور خانہ ذوالمجد والاکرام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام شہروں سے زیادہ محبوب اور پسند ہے۔ ﴿ اَلَّذِیْ ﴾ موصول صفت ہے ﴿ رَبَّ ﴾ کی۔ جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے اس بنا پر کہ ''بلدۃ'' کی صفت ہے، سیاق جس پر دال ہے وہ یہی ہے کہ ﴿ رَبَّ ﴾ کی صفت ہے۔ اسی لیے جمہور کی قراءت واضح ٹھہری۔

﴿ حَرَّمَهَا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اس شہر مبارک کا مالک وہ ہے جس نے اس کو حرمِ امن قرار دیا ہے کہ اس میں نہ خون بہایا جائے اور نہ کسی پر ظلم کیا جائے، نہ اس کے کانٹے کاٹے جائیں، نہ اس کا شکار بھڑکایا جائے اور نہ اس کا نرم اور سبز گھاس کاٹا جائے۔ مکہ مکرمہ کو جو رب کی اضافت کے ساتھ خاص فرمایا گیا تو اس کے شرف اور بزرگی کے لیے اور اس کی شان کی تعظیم کے لیے ہے، ورنہ اللہ پاک تو عرش سے لے کر فرش تک سب کا رب، مالک اور خالق ہے۔ اب ﴿ وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ ﴾ کے منافی نہ ہوگا، یعنی جو رب اس شہر مبارک کا ہے تمام چیزیں اسی کی خلق، ملکیت ہیں اور اسی کے قبضے میں ہیں۔

﴿ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴾ یعنی مجھے حکم ہے کہ ان لوگوں میں سے ہوؤں جو اللہ پاک کے مطیع اور فرماں بردار ہیں اور اسی کی اطاعت کرتے ہیں، اسی کا حکم بجا لاتے ہیں اور اسی کی منع کی ہوئی چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ ﴿ اَنْ اَكُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ میں اسی شے پر ثابت قدم اور قائم و دائم ہوں جس پر میں ہوں۔ ﴿ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ﴾ اور مجھے یہ حکم ہے کہ میں ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت کروں، تاکہ اس کے اندر جو حقائق اور نکات کے خزانے چھپے ہوئے ہیں وہ ذرا ذرا کر کے مجھ پر کھلتے جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں قرآن کی تلاوت مراد نہیں ہے، بلکہ ایمان کی طرف دعوت کی تلاوت مراد ہے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

جمہور نے ﴿ اَنْ اَتْلُوَا ﴾ باثباتِ واو پڑھا ہے حرفِ لام کے بعد، یہ تلاوت بہ معنی قراءت سے ماخوذ ہے، یا تلو بہ معنی اتباع سے، اس آیتِ کریمہ کی طرح: ﴿ اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ [الأنعام: ١٠٦] ''(اے نبی!) آپ اس وحی کی پیروی کریں جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے (نازل) کی جاتی ہے۔'' عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ''أَنْ أَتْلُ'' پڑھا بحذفِ واو، یہ حکم ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ اسی طرح کی ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: ہم اس قراءت کو نہیں پہچانتے، یہ سارے مصاحف کے مخالف ہے۔[1] بالجملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس شے پر پوری طرح قیام کیا، جس کا آقا کو حکم دیا گیا۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٣٦) [1] فتح القدير (٤/ ٢٠٦)

﴿ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ﴾ یعنی پس بالعموم راہ یاب ہوا یا اس شے کے ساتھ راہ یاب ہوا، جس کو میں اس پر پڑھتا ہوں، پھر اس چیز پر عمل کیا جو اس میں ہے، یعنی اللہ پر ایمان لانا اور اس کی شریعت اور احکام پر عمل کرنا۔ تو وہ راہ نہیں پاتا مگر اپنے نفس کے لیے، کیوں کہ اس کا نفع اسی کی طرف راجع ہے نہ کہ میری طرف۔ ﴿ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴾ یعنی اور جو کوئی گمراہ ہوا کفر کے ساتھ اور ہدایت سے منہ موڑا تو تو اس سے کہہ دے کہ میں جو ہوں سو ڈرانے والوں سے ہوں اور میں اس کو تمھاری طرف پہنچا کر تمھیں ڈرا چکا، مجھ پر اس کے سوا اور کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَنْ ضَلَّ ﴾ کا جواب محذوف ہے، یعنی جو کوئی گمراہ ہوا تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ ﴿ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴾ کو جواب کے قائم مقام کیا، اس لیے کہ وہ اس کی علت کے مثل ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آیتِ قتال نے اس کو منسوخ کر دیا۔

﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ یعنی اور کہہ کہ ساری حمد اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس کی نعمتوں پر جن کا اس نے مجھ پر انعام کیا، یعنی نبوت اور علم وغیرہ اور مجھ کو اس کا بوجھ اُٹھانے کی توفیق دی ہے اور اس کے احکام ساری خلق کی طرف پہنچانے کی توفیق دی ہے۔ ﴿ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ من جملہ ان باتوں کے ہے جن کے کہنے کا نبی اکرم ﷺ کو حکم ہوا ہے، یعنی اللہ تم کو عن قریب اپنی کھلی نشانیاں دکھائے گا، جن کی اطلاع قرآنِ مجید نے دی ہے، وہ نشانیاں خود تم میں اور تمھارے غیر میں ہوں گی۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دکھانا بدر کے دن ہوا کہ مارے جانا اور قید ہونا اور فرشتوں کا ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر مارنا ان کو دکھایا۔ کسی نے کہا ہے کہ آیات سے مراد وہ نشانیاں ہیں، جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی وہ نشانیاں ہیں جو آخرت میں ہوں گی، پھر ان کا یقین کر لیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد چاند کا شق ہونا ہے اور دخان اور اللہ تعالیٰ کی وہ سزائیں ہیں جو دنیا میں ان پر نازل ہوئیں۔

﴿ فَتَعْرِفُوْنَهَا ﴾ یعنی پھر تم اللہ پاک کی آیات اور قدرت اور وحدانیت کے دلائل کو پہچان لو گے، یہ پہچان لینا کافروں کے لیے فائدہ مند نہ ہوگا، اس لیے کہ انھوں نے ان کو اس وقت پہچانا کہ ان سے ایمان قبول نہیں، یہ موت کے حاضر ہونے کا وقت ہے۔ پھر اللہ پاک نے سورت کو اس قول پر ختم کیا:

﴿ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ یہ کلام اللہ پاک کی طرف سے ہے، یہ اس کلام میں داخل نہیں ہے جس کے کہنے کا نبی اکرم ﷺ کو حکم ہے۔ اس میں شدید قسم کا ڈرانا ہے اور تہدیدِ عظیم (بہت خوف دلانا) ہے۔ اہلِ مدینہ وشام اور حفص نے عاصم سے بتائے فوقیہ پڑھا ہے بنا بر خطاب۔[1] باقی قراء نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ تفسیرِ ابوالسعود میں ہے کہ یہ کلام مسوق ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ماقبل کا مقرر ہے۔[2] یائے تحتانی کی قراءت کی بنا

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٤٧) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٣٠٧)

پر تو یہ محض ایک وعید ہے، یعنی تیرا رب ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے، لہٰذا تو یہ گمان مت کر کہ ان کے عذاب میں جو تاخیر ہو رہی ہے تو یہ اس لیے ہے کہ وہ اُن کے اعمالِ بد سے غافل ہے۔ اور تائے فوقیہ کی بنا پر فرمانبرداروں کو وعدہ ہے اور نافرمانوں کو وعید ہے، یعنی تیرا رب ان نیکیوں سے غافل نہیں ہے جو تو کرتا ہے اور اے کافرو! وہ ان بدیوں سے غافل نہیں ہے جن کو تم کرتے ہو، چنانچہ ہر ایک کو اُن کے عمل کی سزا و جزا ضرور دے گا۔[1]

الحمد لله والمنة کہ سورۃ النمل کی تفسیر ۱۸/ رجب ۱۳۱۱ ہجری روز جمعہ شب شنبہ کو تہجد کے وقت محلّہ امیر گنج من محلات شاہ جہان آباد بھوپال میں تمام ہوئی۔ كَاتِبُهُ وَمُؤَلِّفُهُ الْعَبْدُ الرَّاجِيْ رحمة ربه الباري ذوالفقار أحمد نقوي الشاهجهان آبادي البوفالي غفرالله له ولوالديه، وأحسن إليهما وإليه، اللهم اغفر و ارحم سيدنا أبا الوفاء الصديق صاحب ترجمان القرآن مغفرة ظاهرة وباطنة لا تغادر ذنبا آمين. اللّٰهم اغفرلنا و ارحمنا و أحسن عواقبنا في الأمور كلها و أجرنا من خزي الدنيا و عذاب البرزخ و عذاب الحشر، ويسر أمورنا و اشرح صدورنا و اقض ديوننا و انصرنا على أعدائنا، وثبتنا بالقول الثابت في الحياة الدنيا و في الآخرة. اللهم إنا نسألك العفو و العافية في الدين و الدنيا، اللهم اغفرلنا وتب علينا، اللهم ارزقنا شهادة في سبيلك، واجعل موتنا ببلد رسولك يوم الجمعة، آمين. اللهم فصل وسلم و بارك على سيدنا و مولانا محمد سيد المرسلين، و على آله و صحبه أجمعين آمين عدد ما علمت وزنة ما علمت وملأ ما علمت، والحمد لله أولا و آخراً و ظاهراً و باطناً.

---

[1] فتح البیان (۱۰/ ۸۱۔ ۸۳)

یادداشت

ہماری دیگر مطبوعات

سلسلۂ مطبوعات (1-15)

مجموعہ رسائلِ عقیدہ

تالیف
نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ
(۱۸۳۲ء — ۱۸۹۰ء)

تسہیل و تخریج
حافظ عبد اللہ سلیم
حافظ شاہد رفیق

3 جلدیں // صفحات: 1800

سلسلۂ مطبوعات (16-19)

مجموعہ علومِ قرآن

تالیف
نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ
(۱۸۳۲ء — ۱۸۹۰ء)

تسہیل و تخریج
حافظ عبد اللہ سلیم
حافظ شاہد رفیق

مجلد // صفحات: 912

سلسلۂ مطبوعات (20)

تفسیر ترجمان القرآن
بلطائف البیان

تالیف: نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ
(۱۸۳۲ء — ۱۸۹۰ء)

تصحیح و تنقیح و نظر ثانی
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

تسہیل
جناب محمد یحییٰ قریشی

تخریج
حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی
حافظ حامد اشفاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

6 جلدیں // معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (21-27)

مجموعہ مقالات و فتاویٰ

علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ

ترتیب و تحقیق
فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس حفظہ اللہ
فاضل مدینہ یونیورسٹی

تخریج
حافظ شاہد رفیق
فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 712

سلسلۂ مطبوعات (28)

مجموعۂ فتاویٰ

اُستاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ محدث غازی پوری رحمہ اللہ

(1337-1260ھ)

تحقیق: حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

❋ مجلد // ❋ صفحات: 760

سلسلۂ مطبوعات (29)

مجموعۂ فتاویٰ

محدث العصر علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ

تحقیق: حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

❋ مجلد // ❋ صفحات: 672

سلسلۂ مطبوعات (30-40)

عقائد و عبادات کے متعلق گیارہ نایاب رسائل کا مجموعہ

مجموعۂ رسائل

اُستاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ محدث غازی پوری رحمہ اللہ

(1337-1260ھ)

تحقیق: حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

❋ مجلد // ❋ صفحات: 708

سلسلۂ مطبوعات (41-46)

مجموعۂ رسائل

سیرت سید الانبیاء | [illegible] سید المرسلین | برہان الحق | نجاۃ الاسلام | قدامت اہل حدیث | مقالات و مضامین

استاذ المناظرین

مولانا احمد دین گکھڑوی

(۱۹۰۰ء — ۱۹۷۳ء)

تحقیق

حافظ عبداللہ سلیم

❋ عمدہ طباعت ❋ مجلد (صفحات: 696)

سلسلۂ مطبوعات (47)

تذکرۂ محدث العصر

علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ

تالیف

عبدالرشید عراقی

❋ مجلد // ❋ صفحات: 312

سلسلۂ مطبوعات (48)

اضافہ شدہ جدید اِڈیشن

استاذ المناظرین

مولانا احمد دین گکھڑوی رحمہ اللہ

تالیف: مولانا محمد اسحاق بھٹی

❋ مجلد // ❋ صفحات: 360

سلسلۂ مطبوعات (49)

برِصغیر میں

اہلِ حدیث کی اوّلیات

تالیف: مولانا محمد اسحاق بھٹی

مجلد // صفحات: 208

سلسلۂ مطبوعات (50)

قرآن مجید پر عیسائی مبلغین کے اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب...

ایک نایاب دستاویز پہلی بار منظر عام پر

برہان التفاسیر

لإصلاح سلطان التفاسیر

تالیف: شیخ الإسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری

مجلد // صفحات: 432

سلسلۂ مطبوعات (51)

ارمغان

مولانا محمد اسحاق بھٹی

تالیف

حمید اللہ خان عزیز

مجلد // صفحات: 948

سلسلۂ مطبوعات (52)

اہلِ حدیث کا منہج

اور

احناف سے اختلاف کی حقیقت و نوعیت

تالیف: فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

مجلد // صفحات: 288

سلسلۂ مطبوعات (53)

تاریخ و تعارف

دار الحدیث رحمانیہ دہلی

تالیف: فضیلۃ الشیخ مولانا اسعد اعظمی

نقد: مولانا محمد اسحاق بھٹی

مجلد // صفحات: 352

سلسلۂ مطبوعات (54)

جاوید احمد غامدی کے تصورِ حدیث و سنت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

فتنۂ غامدیت

تالیف: فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

مجلد // صفحات: 368

سلسلۂ مطبوعات (55)

شیخ الکل سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے تلامذہ کرام کا تذکارِ جمیل

دبستانِ نذیریہ

تالیف: محمد تنزيل الصديقي الحسيني

2 ● معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (56)

تحریکِ اہلِ حدیث کی دینی و ملی تگ و تاز اور اکابر کا دلنشین تذکرہ

ہمارے اَسلاف

تالیف

مولانا محمد یوسف انور حفظہ اللہ

مجلد ● صفحات: 408

سلسلۂ مطبوعات (57)

اردو تحریر و انشا میں سرزد ہونے والی اغلاط کی اصلاح

زبانِ خامہ کی خامیاں

تالیف: علیم ناصری رحمہ اللہ اضافہ: محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

پیش لفظ: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نظرثانی: محسن فارانی

مجلد ● صفحات: 224

سلسلۂ مطبوعات (58)

سلفیانِ برصغیر کے پہلے تنظیمی سربراہ اور دبستانِ نذیریہ کے ممتاز رکن استاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ محدث غازی پوری رحمہ اللہ کے احوال و آثار اور دینی خدمات کا تذکرہ

یادگارِ سلف

حافظ شاہد رفیق

فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد ● صفحات: 592

سلسلۂ مطبوعات (59)

دلچسپ واقعات اور سبق آموز حکایات پر مبنی طلبائے علم کے لیے ایک راہنما تحریر

دینی تعلیم و تربیت کے اصول و آداب

تالیف: مولانا عبدالرؤف خان رحمانی جھنڈانگری رحمہ اللہ

کارڈ کور ● صفحات: 118

سلسلۂ مطبوعات (60)

سوئے منزل

تالیف: مولانا عبدالخالق مدنی

کارڈ کور ● صفحات: 304

سلسلۂ مطبوعات (89)

جائزة الأحوذي

في التعليقات على

سنن الترمذي

تالیف: العلامة المحدث أبي النصر ثناء الله بن عيسى خان المدني

★ 4 جلدیں // ★ معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (90)

الوصائل

في

شرح الشمائل

تالیف: العلامة المحدث أبي النصر ثناء الله بن عيسى خان المدني

★ مجلد // ★ صفحات: 672

سلسلۂ مطبوعات (91)

خطبہ غدیر خم

اور

اہل بیت کے حقوق

تالیف: مولانا ارشاد الحق اثری

★ مجلد // ★ صفحات: 144

سلسلۂ مطبوعات (92)

مقام صحابہ رضی اللہ عنہم

تالیف

مولانا ارشاد الحق اثری

★ مجلد // ★ صفحات: 264

سلسلۂ مطبوعات (93)

فضائل صحابہ و اہل بیت

اور

مسائل محرم الحرام

علمائے پاک و ہند کی تقریظات کے ساتھ مصدقہ ایڈیشن

تالیف: فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

★ مجلد // ★ صفحات: 320

سلسلۂ مطبوعات (94)

برصغیر میں

اصحاب الحدیث

ایک مطالعہ

تالیف

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

★ مجلد // ★ صفحات: 464

سلسلۂ مطبوعات (95)

حضرت مولانا صمصام رحمہ اللہ کے منظوم رسائل اور نعتیہ قصائد کا مکمل مجموعہ

دیوانِ صمصام

شاعرِ توحید و سنّت

حضرت مولانا علی محمد صمصام رحمہ اللہ

مجلد // صفحات: 662

سلسلۂ مطبوعات (96)

نماز کے مختلف اذکار اور دعائیں

تالیف: فضیلۃ الشیخ طارق بن محمد القطان حفظہ اللہ

ترجمہ: حافظ عبداللہ سلیم حفظہ اللہ

کارڈ کور // صفحات: 96

سلسلۂ مطبوعات (97)

ایمان افروز وصیتیں

تالیف

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

ترجمہ

شیخ الحدیث مولانا عمر فاروق سعیدی حفظہ اللہ

مجلد // صفحات: 336

سلسلۂ مطبوعات (98)

وحدتِ ادیان کا باطل نظریہ

تالیف: فضیلۃ الشیخ بکر بن عبداللہ ابو زید رحمہ اللہ

ترجمہ: مولانا عبداللہ کوثر حفظہ اللہ

کارڈ کور // صفحات: 96

سلسلۂ مطبوعات (99)

فتاوی محمدیہ

استاذ الاساتذہ مفتی عبید اللہ عفیف حفظہ اللہ

2 جلدیں // معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (100)

تلخیص

الجامع الكامل

في

الحديث الصحيح الشامل

المرتب على أبواب الفقه

تأليف

أ. د. محمد عبد الله الأعظمي المعروف بالضياء

أستاذ الحديث الشريف وعميد كلية الحديث

بالجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة سابقاً والمدرس بالمسجد النبوي

6 جلدیں // معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (116)

عقیدہ سلف کا ترجمان اور اسلامی عقائد وافکار کا مستند ماخذ

صریح السنہ

تالیف: امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ

ترجمہ: حافظ محمد اسحاق طاہر حفظہ اللہ

✱ کارڈ کور // ✱ صفحات: 80

سلسلۂ مطبوعات (117)

تذکرہ
مولانا عبدالحق محدث ملتانی رحمہ اللہ
اور
ان کا خانوادۂ علمی

تالیف: حافظ ریاض احمد عاقب اثری حفظہ اللہ

تقدیم: محدث العصر مولانا محمد رفیق اثری حفظہ اللہ

✱ مجلد // ✱ صفحات: 592

سلسلۂ مطبوعات (118)

قرآن مجید کا مستند ترجمہ اور مختصر تفسیر

قرآن کریم مترجم ومحشی

ترجمہ وحواشی

مولانا فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ — حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

نظر ثانی

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر رحمہ اللہ — حافظ عبدالحمید ازہر رحمہ اللہ

✱ مجلد // ✱ صفحات: 735

سلسلۂ مطبوعات (119)

تاریخ حیات حضرت الامام السید محمد نذیر حسین صاحب مرحوم محدث دہلوی

الحیاۃ بعد المماۃ

تالیف: مولانا فضل حسین بہاری رحمہ اللہ

تدوین وحواشی: محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

✱ مجلد // ✱ صفحات: 512

سلسلۂ مطبوعات (120)

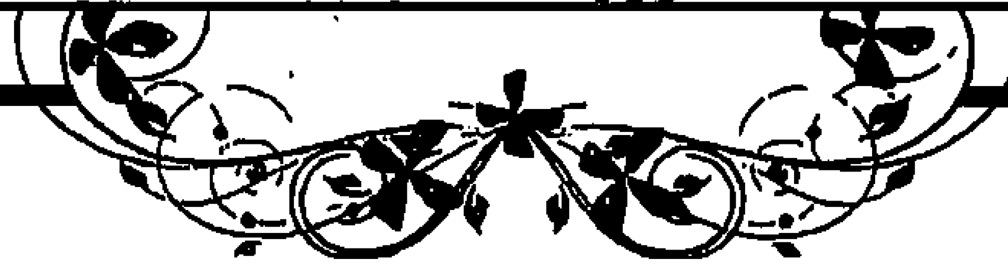
نفل نمازیں

تالیف

فضیلۃ الشیخ راشد حسن مبارکپوری

(استاذ جامعہ اسلامیہ، فیض عام، مئو)

مجلد // صفحات: 424



سلسلۂ مطبوعات (121)

الحاد

وسائل، خطرات اور علاج

تالیف

ڈاکٹر صالح بن عبد العزیز سندی

(استاذ عقیدہ، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ)

ترجمہ و تعلیق

شعبان بیدار صفاوی

(استاذ جامعہ محمدیہ، مالیگاؤں، انڈیا)

کارڈ کور // صفحات: 112

